قوت القلوب

پوری اسلامی تاریخ میں تصوّف پر ایک مُستند اور لازوال اوّلین کتاب،
آج تک تصوف پر جتنی تصانیف لکھی گئیں سب کی سب اس عظیم کتاب سے ماخوذ ہیں
امام غزالی، شاہ ولی اللہ اور تمام جیّد علماءِ کرام نے اس جامع کتاب سے استفادہ کیا۔

جلد دوم

تالیف

شیخ ابوطالب محمد
بن عطیہ حارثی المکی

ترجمہ

محمد منظور الوجیدی

قوت القلوب
جلد دوم

پوری اسلامی تاریخ میں تصوّف پر ایک مستند اور لازوال اوّلین کتاب
آج تک تصوّف پر جتنی تصانیف لکھی گئیں سب کی سب اس عظیم کتاب سے ماخوذ ہیں۔
امام غزالی، شاہ ولی اللہ اور تمام جیّد علماء کرام نے اس جامع کتاب سے استفادہ کیا۔

تالیف

شیخ ابو طالب محمّد بن عطیہ حارثی المکی

ترجمہ

محمّد منظور الوحیدی

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

Code No. ISBN – 969 – 31 – 0081 – 6

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پرنٹرز

اشرفیہ پارک - فیروز پور روڈ لاہور

سے چھپوا کر چوک انارکلی، لاہور سے شائع کیا۔

اشاعت اوّل : ۱۹۸۳ء

اشاعت دوم :- ۱۹۸۸ء

مقام اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

مقامِ توکّل و احوالِ متوکّلین

یہ ساتواں مقامِ یقین ہے

مقاماتِ یقین میں سے اعلیٰ ترین مقام اور احوالِ مقربین میں سے اعلیٰ ترین حال توکل کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ۔[1] (بیشک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے)

چنانچہ متوکل کو اپنا حبیب بنایا اور اس پر اپنی محبت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ۔[2] (اور اللہ پر چاہیے کہ توکل کرنے والے بھروسہ کیا کریں)

اس میں متوکل کو اپنی طرف رفعت بخشی اور مزید (نعمت) اپنی جانب سے کی۔ ایک جگہ فرمایا:

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔[3] (اور جو کوئی بھروسہ رکھے اللہ پر تو وہ اس کو بس ہے)

یعنی اللہ تعالیٰ ہی کافی مددگار ہے۔ اب جس کے لیے اللہ تعالیٰ ہی (ہر امر میں) کفایت کرنے والا ہو تو سمجھ لو کہ وہ اس کے لیے کافی و شافی ہے اور جس حال میں وہ ہے وہ نہیں پوچھا جاتا۔ اب اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا آدمی، رحمٰن تعالیٰ کے بندوں سے ہے اور وصفِ رحمت کی طرف خدا تعالیٰ نے ان کی نسبت کی اور یہ خواص بندے ہیں کہ ان کے لیے وصفِ کفایت کی ضمانت دی اور کتاب اللہ میں انہی کی صفت بیان کی:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا۔[4] آخر تک (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں)

انہی لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے اس دارِ محن میں کفایت فرمائی اور انہیں اپنے فضل سے برائیوں سے محفوظ رکھا۔ فرمایا:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔[5] (کیا اللہ بس نہیں اپنے بندے کو)

---

[1] آل عمران آیت ۱۵۹ [2] ابراہیم آیت ۱۲ [3] الطلاق آیت ۳
[4] الفرقان آیت ۶۳ [5] الزمر آیت ۳۶

اور یہ صرف عباد عدد سے ہی نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ إِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ، لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا۔[1]

(کوئی نہیں آسمان و زمین میں جو نہ آوے رحمٰن کا بندہ ہو کر، اس پاس ان کا شمار ہے اور گن رکھی ہے ان کی گنتی ،

بعض صحابہؓ و تابعینؒ کا فرمان ہے :

" توکل کرنا نظامِ توحید اور جمعیتِ معاملہ ہے ۔"

بعض سلفؒ سے مروی ہے :

فرمایا کہ میں نے خواب میں ایک بصرہ کے عابد کو دیکھا تو پوچھا :

" اللہ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ؟"

انہوں نے بتایا :

" اس نے مجھے بخش دیا اور مجھے جنت میں داخل کر دیا ۔"

میں نے پوچھا :

" آپ نے وہاں پر کس عمل کو افضل ترین پایا ؟"

فرمایا : " توکل اور کم امیدی ، ان دو پر پکے رہو ۔"

حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں :

" ایمان کی چوٹی (بلندی) یہ (تین باتیں) ہے :

۱۔ اخلاص

۲۔ توکل

۳۔ اور پروردگار کریم کے حکم پر تسلیم و رضا ۔"

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے :

" توکل سے زیادہ کوئی مقام زیادہ قابلِ عزت و رفعت نہیں ۔"

انبیاء علیہم السلام کو حقیقی توکل عطا ہوا اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا اسے صدیقین و شہداء لے اڑے ۔ اب جس کا اس میں سے کچھ چیز سے بھی تعلق ہو گیا وہ صدیق یا شہید ہے ۔

ابو سلیمان دارانیؒ ایک بلند پایہ عارف تھے ، فرماتے ہیں :

---

[1] مریم آیت ۹۳ ، ۹۴

"توکل کے سوا مجھے ہر مقام میں قدم کا شرف حاصل ہُوا مگر توکل مبارک میں مجھے صرف سُونگھنے کی ہوا ہی حاصل ہے۔"

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی:

"اللہ تعالیٰ پر ایمان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ پر توکل ہو۔ اس لیے کہ اللہ پر توکل ہی بندے کو محبُوب خدا بناتا ہے اور ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا، اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ہے اور اللہ کی ہدایت سے ہی بندے کو رضائے الٰہی کی موافقت حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی رضا کی موافقت سے بندے پر اللہ کا کرم ہوتا ہے۔"

حضرت لقمانؑ نے یہ بھی فرمایا:

"جو اللہ پر توکل کرے اور قضائے الٰہی کو تسلیم کرلے اور ہر معاملہ اللہ کو سونپ دے، اللہ کی تقدیر پر راضی رہے تو اس نے دین کو قائم کیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو بھلائی کمانے کے لیے فارغ کر لیا اور ایسے اخلاقِ صالحہ پر قائم ہُوا جو بندے کے ہر معاملہ کی اصلاح کر دیتے ہیں۔"

ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ علمائے ابدال میں سے تھے، فرمایا:

"سارے کا سارا علم، عبادت کا ایک دروازہ ہے اور سارے کا سارا تقویٰ، زہد کا ایک دروازہ ہے اور سارے کا سارا زہد، توکل کا ایک دروازہ ہے۔"

فرمایا: "چنانچہ توکل کی کوئی حد و انتہا نہیں کہ کہیں جا کر ختم ہو جاتا ہو۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً۔

اس کی وضاحت کرتے ہُوئے فرمایا:

احسن عمل سے مراد "صادق ترین توکل" ہے۔

فرمایا: "تقویٰ اور یقین ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں اور توکل اس کا کانٹا ہے، اسی کے ذریعہ کمی بیشی کا پتہ چلتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ [1]

(سو ڈرو اللہ سے جہاں تک سکو)

اس کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا:

(استطاعت کا مطلب یہ ہے) کہ "اس کے سامنے اظہارِ فقر و فاقہ کرے۔" اور

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ [2]

(ڈرو اللہ سے جیسا چاہیے اس سے ڈرنا)

کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا: "توکل کے ساتھ اس کی عبادت کرو۔"

[1] تغابن آیت ۱۶ [2] آل عمران آیت ۱۰۲

توکّل پر طعن نہ کرو

ابو یعقوب سنوسی نے فرمایا؛
" اہل توکل پر طعن نہ کرو اس لیے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے خواص ہیں جنہیں خصوصیت سے نوازا گیا اب یہ اللہ کی طرف ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس پر اکتفا کر لیا۔ دنیا و آخرت کے تمام غموں سے آرام پا چکے۔"

فرمایا؛ " جس نے توکل پر طعن کیا اس نے ایمان پر طعن کیا۔ اس لیے کہ یہ اس کے ساتھ اتصال رکھتا ہے۔ اور جس نے اہل توکل سے محبت کی اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی۔

متوکل کا حال

چنانچہ توکل کی ابتدا یہ ہے کہ انسان، وکیل تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور وہ عزیز حکیم ہے۔ اپنی بڑائی و عظمت کے باعث عطا فرماتا ہے اور اپنے حکم کے باعث روکتا ہے۔ اس کی عزت سے بندہ عزت مند اور اس کے حکم پر بندہ راضی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متوکلین کو آگاہ کرتے ہوئے فرمایا؛

وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ [1] (اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے حکمت والا)

جس نے عزت پائی اس نے اس کے دیے پر عزت پائی اور جس سے اپنی حکمت سے روکا اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اب جب ایک عبد ذلیل نے ملک جلیل تعالیٰ کا مشاہدہ کیا اور کہ وہی ذات تعالیٰ عدل، تدبیر اور تقدیر کی خالق و مالک ہے۔ اس کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہر چیز کی اس کے ہاں مقررہ مقدار ہے۔

وَ کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ [2] (اور ہر چیز کی ہے اس کے پاس گنتی)

وہ اسے مقررہ مقدار پر نازل فرماتا ہے اور وکیل تعالیٰ کا مشاہدہ کیا کہ وہ تمام مخلوق کا مالک و مختار ہے آسمانوں کے خزانے اسی کے ہیں۔ احکام و عجائب قدرتوں کا مالک ہے۔ زمین کے خزانے اور دل، ہاتھ اور تمام اسباب مشاہدہ اسی کی ملکیت ہیں۔ آسمانی خزانے یعنی جو اس نے روزی تقسیم فرمائی اور زمین کے خزانوں کو مخلوق کے ہاتھوں میں دیا۔

وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ [3] (اور آسمانوں میں ہے روزی تمہاری اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا)

وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ [4] (اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کو)

وَ لٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ [5] (اور لیکن منافق نہیں سمجھتے)

---

[1] انفال آیت ۴۹
[2] الرعد آیت ۸
[3] الزاریات آیت ۲۲
[4] الزاریات آیت ۲۰
[5] منافقون آیت ۷

چنانچہ بندے نے یقین کر لیا کہ ہر چیز کی ملکیت اسی کے قبضہ میں ہے اور وہی کان و آنکھ کا مالک ہے۔ دن رات کے تغیرات کی طرح ہاتھوں اور دلوں کو بدلتا ہے۔ وہ اہل یقین کے احکام اور حسنِ تدبیر کا مالک ہے۔ وہی احکم الحاکمین ہے اور وہی بہترین روزی رسان ہے۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ[1] (اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنے والا یقین رکھتے لوگوں کو)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ[2] (پھر قائم ہوا عرش پر تدبیر کرتا کام کی، کوئی سفارش نہ کر سکے مگر جو پہلے اس کا حکم ہو)

اس وقت بندے نے اپنے مالک ذوالجلال والاکرام کی جانب نظر کی تو اس کی طرف نظر سے وہ توانا ہوا اور اسی کی عطا کردہ توانائی سے اسے عزت ملی۔ اس کے قرب کے باعث وہ مستغنی ہوا اور اس کی حضوری کے باعث اسے یہی شرف حاصل ہو گیا۔

حدیث میں آتا ہے،

"یقین کا غنا، کافی ہے"۔

اس وقت اس نے ہر معاملہ میں حق تعالیٰ پر ہی نظر رکھی۔ اس پر توکل کیا اور ہر کام میں اسی پر بھروسہ رکھا معمولی چیز عطا ہوئی تو اس پر قناعت و صبر کیا اور اس سے راضی رہا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اس کے سوا کسی سے طمع نہ رکھا، اس کے سوا کسی سے امید نہ رکھی اور عطا میں اس کے علاوہ کسی پر نظر نہ رکھی۔ روکنے میں اسی کی حکمت پر نگاہ رکھی۔ فراخی و تنگی میں صرف اسی کی قدرت پر نظریں رہیں۔ اب اس کی عبادت درست ہوئی۔ اس کی توحید خالص ہوئی۔ خالق کی معرفت سے مخلوق کو جانا اور معبود و رازق تعالیٰ سے ہی رزق مانگا اور اللہ کے اس فرمان کو سامنے رکھا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ[3] (جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے)

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ (بیشک جن کو پوجتے ہو اللہ کے سوا مالک نہیں روزی کے،

---

[1] مائدہ آیت ۵۰

[2] یونس آیت ۳

[3] اعراف آیت ۱۹۴۔

لَکُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ وَ اعۡبُدُوۡہُ[1] سو تم ڈھونڈو اللہ کے ہاں روزی اور اس کی بندگی کرو)

اس وقت وہ ایسا بن جائے گا کہ کسی مخلوق کی حمد نہیں کرے گا اور ان کی مدح و مذمت سے کنارہ کش ہو جائیگا اس لیے کہ خدا نے ہی عطا کیا اور خدا نے ہی روکا۔ وہی اول عطا کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شکر کرنے کا حکم دیا۔ اس لیے اخلاقِ الٰہی کی تابعداری کرتے ہوئے شکر کرے گا۔ اور سنتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کے لیے شکر کرے گا کیونکہ اگر مذمت و ناراضگی سے کام لے تو یہ بات خدا کی ناموافقت اور خواہشِ نفس کی موافقت بن جاتی ہے اور نیز اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے والوں کی مدح فرمائی اور بخل کرنے والوں کی مذمت کی۔

حمد و شکر میں فرق یہ ہے کہ حمد مفرد ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے مناسب ہے۔ اس کا معنی ہے اس بات کا اعتراف کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ سے ملی اور اس میں اللہ کے لیے اس نعمت کے ذریعہ حسنِ معاملہ کا اعتراف ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس لیے فرمایا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ[2] (سب حمد اللہ کے لیے ہے پالنے والا تمام جہانوں کا)

یعنی تمام حمد صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور اس کے لیے مناسب بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ رب العلمین (تمام جہانوں کا پروردگار) ہے۔

حدیث میں ہے:

"حمد، رحمٰن عز و جل کی چادر ہے۔" اور شکر دراصل واسطوں کے لیے اسرارِ دعا اور ثناء ظاہر کرنا ہے اور یہ بات والدین میں مشترک ہے۔ اور جو لوگوں میں سے شکر کے اہل ہیں ان کے لیے بھی یہ مخصوص ہے۔

یوسف بن اسباطؒ سے مروی ہے۔ بتایا کہ مجھے حضرت ثوریؒ نے فرمایا:

"مقامِ شکر پہچان کر ہی شکر کرنا۔"

میں نے عرض کیا:

"وہ کس طرح؟"

فرمایا: "جب تجھے نیکی کی توفیق ہو جائے تو تُو اس پر اپنے سے زیادہ مسرور ہو اور تُو اپنے آپ سے بہت حیا کرنے والا ہو۔ اب شکر کر، ورنہ نہیں۔"

حضرت ابراہیمؒ نے اپنے احباب میں سے کسی سے دو درہم مانگے۔ اس کے پاس نہ تھے۔ مجلس میں ایک

---

[1] العنکبوت آیت ۱۷

[2] فاتحہ آیت ۱

نوجوان نے دو صد دراہم کی تھیلی پیش کی مگر انہوں نے قبول نہ کی اور فرمایا ؛

"کیا ہر آدمی جو ہمارے لیے کچھ خرچ کرے ہم قبول کرلیں ؟ ہم صرف اسی سے لیتے ہیں کہ جس پر ہم سے زیادہ نعمتِ خدا دیکھتے ہیں۔ جس میں ہم لے رہے ہیں۔"

ایک طویل واقعہ حضرت حسنؓ سے مروی ہے، کہ

"ایک آدمی نے ان کے لیے بہت سا مال ان کی خدمت میں پیش کیا مگر انہوں نے واپس کردیا۔ جب وہ چلا گیا تو ہاشمؒ اور قصؒ نے کہا ؛

"اے ابو سعیدؒ ! مجھے آپ پر تعجب ہے۔ تُو نے ایک آدمی کا احترام واپس کر دیا اور وہ غمگین ہو کر واپس چلا گیا۔ حالانکہ آپ مالک بن دینار اور محمد بن واسع سے بار ہا لیتے رہتے ہیں۔"

حضرت حسن نے فرمایا ؛

" مالک (بن دینار) اور ابن واسع سے ہم جو مال لیتے ہیں وہ اس میں اللہ پر نظر رکھتے ہیں اور یہ بے چارہ جو دے رہا ہے اس میں ہم پر نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس کا مال واپس کر دیا۔" اب تو کسی کی مذمت نہیں کریگا اور نہ ہی کسی سے بغض رکھے گا اس لیے کہ روکنے کا باعث تو خدا ہی ہے۔ وہی مانع اوّل ہے اور جس طرح نعمت عطا کرنے میں اس کی حکمت ہوتی ہے اسی طرح روک دینے میں بھی اس کی حکمت ہوتی ہے۔ اب اگر تو کسی بندے کی مذمت و تنقیص کرتا ہے تو یہ دیکھ لو کر یہ مولائے کریم سے ہُوا۔ اب اسے اس کی موافقت ہُوئی اور عطا میں اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ کو دیکھ رہا ہے اور اپنے کرم کے باعث اس کی تعریف فرماتا ہے اور روکنے و ناپسندیدہ حال میں اپنی مشیت کو دیکھ رہا ہے اور اپنی حکمت اور اظہارِ احکام کے حکمِ تقدیر کے باعث نافرمانوں اور بخیلوں کی مذمت فرماتا ہے۔ اس نے اپنا امر ظاہر کر دیا اور زارِ قدر کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ مومن نے اس کے امر پر عمل کیا اور جو اس نے اپنے لیے مخصوص کر لیا اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

بعض علمائؒ نے اللہ تعالیٰ کا حکم بتایا ؛

"اگر ابنِ آدم میرے بغیر کسی سے نہ ڈرے تو میں اسے اپنے سوا کسی سے نہ ڈراؤں ، اور اگر ابن آدم میرے سوا کسی دوسرے سے امید نہ رکھے تو میں اس (کا معاملہ) اپنے سوا کسی کے سپرد نہ کروں۔"

اس سے بڑھ کر ایک فرمان آتا ہے ؛

"جب انسان کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو دنیا میں وہ اللہ کے سوا جس جس چیز سے ڈرتا تھا اس کی شکل قبر میں بنا دی جاتی ہے اور وہ اسے قیامت تک (ڈرا ڈرا کر) پریشان کرتی رہے گی۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں ؛

"جو اللہ سے ڈرے، ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔"

مشائخ فرماتے ہیں،

"مخلوق کے لیے خوف دراصل خالق تعالیٰ سے خوف میں کمی کی سزا ہے اور یہ بات کم سمجھی کی علامت ہے۔

اس لیے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد اسی مفہوم میں ہے،

لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَهۡبَةً فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ[۱] (البتہ تمہارا ڈر زیادہ ہے، ان کے دل میں اللہ سے، یہ اس لیے کہ وہ لوگ نہیں سمجھتے)

اب جب بندے پر اللہ تعالیٰ کا کامل خوف چھاتا ہے تو وہ ہر مخلوق سے بے حد بے خوف ہو جاتا ہے اور مخلوق کے دلوں میں یہ خوف چلا جاتا ہے۔ اب جب وہ ان سے نہیں ڈرتا تو مخلوق اس سے ڈرنے لگتی ہے۔ اس طرح جب بندے کو کامل مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے مشاہدہ پر قائم ہوتا ہے اور کون مع اللہ پائے جانے کے بعد وہ اپنے مشاہدہ سے بھی غائب ہو جاتا ہے اور اسے بھی نہیں دیکھتا۔ اور جب ملک تعالیٰ اس کا دل معاینہ ملک تعالیٰ کے لیے فارغ کر دیتا ہے تو قیوم تعالیٰ اس کا حصہ پادشاہی عطا کرتا ہے۔

حضرت سنیدؒ نے یحییٰ بن ابی کثیرؒ سے نقل کیا کہ تورات میں لکھا ہے،

"وہ ملعون ہے جس کا اعتماد اپنے جیسی مخلوق پر ہو۔"

اور سنیدؒ نے فرمایا،

"مطلب یہ ہے کہ اگر یوں کہے،

"اگر فلاں نہ ہوتا تو میں برباد ہو جاتا۔ اگر یوں یوں نہ ہوتا تو ایسے نہ ہوتا۔" اس طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ "اگر ایسا نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔" یہ بھی شرک سے ہے۔

روایت میں آتا ہے،

"لو (اور اگر) سے بچتے رہو، اس لیے کہ یہ شیطان کے کام کا افتتاح کرتی ہے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے،

"سوف (عنقریب) بھی شیطانی لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

فَلَمَّا نَجّٰهُمۡ اِلَى الۡبَرِّ اِذَا هُمۡ يُشۡرِكُوۡنَ[۲] (پھر جب بچا لایا ان کو زمین کی طرف اسی وقت لگے شریک کرنے)

---

[۱] حشر آیت ۱۳ [۲] العنکبوت آیت ۶۵

تو اس کی توضیح میں فرمایا گیا، اس کے فارّ (بھاگنے والے) ملّاح ہیں۔

اسی طرح فرمایا،

وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ [1] (اور بہت لوگ اللہ پر یقین نہیں لاتے مگر ساتھ شریک بھی کرتے ہیں)

فرمایا کہ یوں کہتے ہیں،

"اگر کُتّے نہ بھونکتے اور مرغوں کی آواز نہ آتی تو ہم چور کو پکڑ لیتے"۔

توکل کا انعام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"جس نے کسی بندے کے ذریعہ عزت حاصل کی۔ اللہ نے اسے ذلیل کر دیا"۔

ایک حدیث میں آتا ہے،

"اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسے توکل کا حق ہے تو تمہیں روزی دے جیسے کہ پرندے کو روزی دیتا ہے کہ وہ صبح خالی معدہ جاتا ہے اور پیٹ بھرا واپس آتا ہے اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ ہل جاتے"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں،

"پرندے کی جانب دیکھو، نہ کھیتی کرتا ہے نہ کھیتی کاٹتا ہے اور نہ ذخیرہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے روز روز روزی دیتا ہے۔ اب اگر تم یوں کہو کہ ہمارے پیٹ بڑے ہیں تو چوپاؤں کو دیکھ لو کہ کیونکر اس مخلوق کو ان کے لیے مقدر فرما دیا"۔

مشائخ فرماتے ہیں،

"جانداروں میں سے صرف تین ہی ذخیرہ کرتے ہیں،

۱۔ چیونٹی

۲۔ چوہا

۳۔ ابنِ آدم"

ابو یعقوب سوسیؒ فرماتے ہیں،

"اللہ پر توکل کرنے والوں کے رزق بغیر کسی محنت و مشقت کے خاص بندوں کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ اپنے علم و اختیار سے جاری کرتا ہے اور دوسرے لوگ (غیر متوکل) محنت و مشقت میں پڑے ہیں"۔

---

[1] یوسف آیت ۱۰۶

فرمایا، "اگر توکل کرنے والا کسی سبب کو یا مدح یا مذمت کو دیکھے، پھر توکل چھوڑ بیٹھے تو اس کا توکل درست نہیں توکل کی ابتداء ترکِ اختیار ہے۔ متوکل صحیح راہ پر ہے۔ مخلوق سے اس کی تکلیف اٹھا دی۔ اب وہ ان کے سامنے شکایت نہیں کرتا اور نہ ان میں سے کسی کی مذمت کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ رکاوٹ اور عطاء ایک ذات تعالیٰ سے آتی دیکھتا ہے۔ اب وہ دوسروں سے ہٹ کر اسی کا ہو کر رہ گیا۔"

سہلؒ سے پوچھا گیا،

"توکل کا ادنیٰ درجہ کیا ہے؟"

فرمایا، "امیدیں چھوڑ دینا اور اوسط یہ ہے کہ (اسباب) اختیار کرنے چھوڑ دے۔"

پوچھا گیا،

"اعلیٰ درجہ کیا ہے؟"

فرمایا، "صرف اسی کو پہچانے جس نے توکل دیا اور ترکِ اختیار عطا فرمایا۔" چنانچہ ایک طویل کلام فرمایا۔

لوگوں کی چار اقسام ہیں

مشائخ میں سے بعض کا فرمان ہے،

"تمام بندے اپنے مولائے کریم کا دیا رزق ہی کھاتے ہیں مگر مشاہدات میں مختلف ہیں۔ بعض ذلت کے ساتھ رزق کھاتے ہیں بعض مشقت اٹھا کر رزق کھاتے ہیں۔ بعض انتظار کر کے رزق حاصل کرتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو کسی انتظار اور مشقت و محنت اور ذلت کے بغیر ہی رزق حاصل کرتے ہیں۔ اب جو ذلت سے رزق کھاتے ہیں وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے ذلت میں پڑتے ہیں اور وہ ان کے لیے خرچ کرتے ہیں جو لوگ محنت اٹھا کر رزق حاصل کرتے ہیں۔ وہ صنعت کار اور دست کاری کا کام کرنے والے لوگ ہیں کہ انہیں مشقت اٹھانا پڑتی ہے، تب روزی ملتی ہے۔ جو لوگ انتظار کر کے روزی حاصل کرتے ہیں وہ تاجر لوگ ہیں۔ ایک "تاجر انتظار کر رہا ہے کہ اس کا مال فروخت ہو گویا اس کو انتظار کی سزا دی گئی اور جو لوگ بغیر کسی ذلت و محنت اور انتظار کے رزق حاصل کرتے ہیں وہ صوفیائے کرام ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ غالب حکمت والے کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے عزت کے ساتھ حصہ لیتے ہیں اور جو لوگ پادشاہوں سے کھاتے ہیں، یہ ایسا طبقہ ہے کہ جس نے اپنی ارواح اور ضمیر ان کے سامنے فروخت کر دیا۔ یہ بہت ہی بدبخت گروہ ہے۔ یہ سخت ذلت و رسوائی میں ڈوب مرے۔"

ایک روایت آتی ہے،

"مخلوق، اللہ تعالیٰ کی عیال ہے چنانچہ جو اس کی عیال (مخلوق) کے لیے زیادہ نفع بخش ہو وہ اللہ تعالیٰ کو محبوب تر ہے۔"

ایک بزرگ سے اس مندرجہ بالا حدیث کا مطلب دریافت کیا گیا تو فرمایا:

"یہ مخصوص ہے اور عیال اللہ اس کے خواص ہیں۔"

پوچھا گیا: "کس طرح؟"

فرمایا: "اس لیے کہ لوگوں کی چار اقسام ہیں:

۱۔ تجار

۲۔ تجارت

۳۔ صناع

۴۔ زراعت۔"

اب جو ان میں سے نہ ہو تو وہ اللہ کے عیال ہیں اور جو ان کے لیے زیادہ نافع ہے وہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور امرِ واقعہ بھی اسی طرح ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حقوق لازم فرمائے اور انہی کے لیے اموال میں زکوٰۃ فرض کی کیونکہ انہیں عیال اللہ کہا۔ ان کے لیے کچھ تجارت و صنعت نہیں۔ ان کی معاش کی ذمہ داری "تاجروں اور صنعت کاروں پر ڈال دی۔ دیکھیے ایک تاجر (امیر) اور صانع (امیر) کو زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"غنی کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں اور نہ ہی صاحبِ قوت کمانے والے کے لیے جائز ہے۔" چنانچہ کمانے کو غنا کا درجہ دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ [1] (اور بنا دیں تم کو اس میں روزیاں اور ان کو جن کو تم روزی نہیں دیتے)

اس فرمان پر غور سے معلوم ہوا کہ جن کے وہ رزق پہنچانے والے نہیں۔ وہ لوگ ہیں کہ جن کی زمین میں معیشت نہیں۔ حضرت عامر بن عبداللہ فرماتے ہیں:

"میں نے کتاب اللہ میں تین آیات پڑھیں اور اپنے حال کے معاملے میں ان سے نصرت حاصل کی۔ پہلے اس فرمانِ الٰہی سے استعانت کی۔

إِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ (اور اگر پہنچا دے اللہ تجھ کو کچھ تکلیف، تو کوئی نہیں اس کو کھولنے والا اس کے سوا، اور اگر چاہے تجھ پر کچھ بھلائی

---

[1] الحجر آیت ۲۰

بِفَضْلِہٖ[1] (تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو)

اب میں سمجھ گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ضرر دینے کا ارادہ کر لیا تو کوئی نفع دینے پر قادر نہیں اور اگر اس نے بھلائی دینے کا ارادہ کر لیا تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور ایک فرمان یہ ہے :

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ[2] (تو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو)

اب میں غیر اللہ سے غافل ہو کر اللہ ہی کے ذکر میں مشغول ہو گیا اور ایک فرمان یہ ہے :

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُہَا[3] (اور کوئی پاؤں چلنے والا زمین پر، مگر اللہ پر ہے اس کی روزی)

اللہ کی قسم جب سے میں نے یہ آیت پڑھ لی میں نے اپنے رزق کا اہتمام نہیں کیا اور آرام مل گیا۔

حضرت سہل بن عبد اللہؒ فرمایا کرتے :

" جب متوکل کوئی سبب دیکھتا ہے تو وہ اسے سختی سے ہٹاتا ہے۔"

ایمان کے چار ارکان

اور فرمایا :

" ایمان کے ساتھ اسباب نہیں ہوتے بلکہ اسباب تو اسلام میں ہوتے ہیں۔" مطلب یہ ہے۔ حقیقی ایمان میں اسباب پر نظر اور اسباب میں سکون نہیں ہوتا۔ ان پر نظر رکھنا اور مخلوق میں طمع رکھنا، مقامِ اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو فرمایا :

" ایمان کے چار ارکان ہیں۔ ان کے بغیر ایمان ٹھیک نہیں ہوتا جیسے کہ ایک بدن، ہاتھوں اور پاؤں کے بغیر صحیح بدن نہیں بنتا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا۔

۲۔ اسی کے فیصلہ کو تسلیم کر لینا۔

۳۔ ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دینا۔

۴۔ اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا۔"

اب متوکل کا حال یہ ہوتا ہے کہ بندوں کی جانب تانک جھانک سے دل کو فارغ و مطمئن کر دیتا ہے۔ مخلوق کے قبضہ میں جو چیزیں ہیں ان میں لالچ سے الگ ہو کر ان فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کا دل کامل طور پر اللہ مقلب و مدبر تعالےٰ

---

[1] یونس آیت ۱۰۷ [2] البقرۃ آیت ۱۵۲

[3] ہود آیت ۶

کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ مصرف مقدر کریم کی قدرت میں مصروف ہو کر رہ جاتا ہے۔ عدمِ اسباب اسے کسی چیز کی مذمت پہ آمادہ نہیں کرتا۔ حق کہنے اور اس پر عمل کرنے سے کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

(ایسا نہیں ہوتا کہ) وہ لوگوں سے حیا کرتے ہوئے یا ان سے لالچ رکھتے ہوئے یا ان سے نفع کٹ جانے کے ڈر سے حق کو چھوڑ دے۔ ضروریات اور فاقوں کے ابتلاء اسے باطل کی طرف مائل کرنے اور لوگوں کی خواہشات کے سامنے گرنے پر یا حق سے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ نہ ہی وہ اللہ کے دشمن سے دوستی رکھنے، یا اللہ کے دوست سے دشمنی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے تاکہ ایسا کر کے کچھ فائدہ حاصل کر لے یا لوگوں کے شکریہ کا مستحق بن جائے اور نہ ہی کسی صنعت کار کو دیکھ کسی لالچ میں آکر ایسا کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ صانع اوّل تعالیٰ پر نظر رکھتا ہے۔ وہ کسی مصنوع کی صنعت پر نگاہ تک نہیں کرتا کیونکہ دائمی مشاہدہ حاصل ہے وہ ازلی صنعتِ (حکمِ قدر) کو سمجھتا ہے۔ وہ مخلوق کی کسی عادت پر مطمئن نہیں ہوتا۔ مخلوق کی کسی بات پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ رزق، نفع اور نقصان سب کا مالک ایک اللہ ہے۔ یہ فرض توکل کے مفہومات سے ہے اور اگر تو دیکھے کہ ایک بندہ استحباب تو الگ رہا توکل کی اس حد سے بھی رہ گیا تو اس کے یقین میں کمزوری آگئی۔

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ بلند پایہ اہل توکل پر توکل کو توڑنے والی خواہشات نے حملہ کیا تو انہوں نے ان اسباب کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ان کی جڑیں ختم کر دیں اور ترکِ اسباب کا یقین کر کے شہروں اور اوطان کو چھوڑ کر ہزاروں کا مال اور محبوب اشیاء کو ہاتھوں سے برباد کر کے ویرانوں میں چلے گئے۔ چنانچہ جہاں سے خرابی داخل ہوئی وہیں سے نکال باہر پھینکی اور اس کی الٹ صورت اختیار کر کے علاج کیا۔ حتیٰ کہ گاہے ظاہری علم سے مفارقت کر لی۔ علومِ باطن پر عمل کرتے ہوئے ظاہری علوم کے خلاف کر لیا۔ اپنے احوال کے مطابق مشاہدہ کے حکم پر عمل پیرا ہوئے۔ اس لیے کہ اہلِ ظاہر کسی معاملہ میں ان پر حجت نہیں بلکہ وہ ان باتوں میں ان پر حجت ہیں کیونکہ ایمان ظاہر اور باطن دو حصہ ہے اور علم کے بھی دو حصے ہیں۔ محکم اور متشابہ۔ نیز اہل حق (اہلِ باطن) ہی درست حقیقت و توفیق تک رسائی حاصل کرنے میں زیادہ بلند درجہ رکھتے ہیں اور اقرب الی الصواب ہیں اور یہ انعام صحتِ توکل کی رعایت رکھنے، وفائے عہد اور اپنے حال کے احکام پر عمل کرنے کی خاطر ہوا تاکہ ان کے قلوب، غیر اللہ کے ساتھ سکون پذیر نہ ہوں اور غیر اللہ کی طرف ان کے قصد و عزائم نہ جائیں۔ اب ان کے نفوس کو اللہ کے ساتھ سکون ملتا ہے۔ یہ حضرات عوام کی خواہشات کی طرف نہیں جاتے اور نہ ہی ان کے دھوکہ میں آتے ہیں۔ ان کے قلوب مطمئن ہو چکے۔ اب عوام کے دھوکہ میں آکر یقین کمزور نہیں کرتے اور ایمان کو برباد نہیں کرتے۔ قلوب ہی جائے کشف و مشاہدہ ہیں۔ ان حضرات نے قلوب کو بچا لیا ورنہ اصل مال ہی تباہ ہو جاتا اور حال ہی ختم ہو جاتا اور خدانخواستہ اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا امید رکھتے، اور کس چیز کو قائم کرتے؟ یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں اہل خرد ہی سمجھتے ہیں اور بہ ظاہری آنکھیں ان کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔

توکل کا مفہوم

ایک مقربؒ سے حقیقتِ توکل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا، کہ اس کا مطلب "توکل سے فرار ہے"۔ یعنی توکل کے کسی ایک مقام پر ساکن ہو کر نہ رہ جائے۔ یعنی توکل کرے مگر اپنے توکل پر نظر بھی نہ کرے۔ اس لیے کہ اس کے باعث اسے کفایت ملی یا عافیت ملی یا بچا۔ چنانچہ انہوں نے "توکل پر نظر" کرنے کو توکل میں ایک مرض قرار دیا جس سے فرار لازم ہے تاکہ اس کی نظر ہمیشہ وکیل تعالیٰ پر سیدھی رہے اور کوئی خلل نہ آنے پائے اور رکاوٹ کے بغیر اس کے مشاہدہ میں رہے۔ چنانچہ اب اس کے اور وکیل تعالیٰ کے درمیان کوئی غیر چیز نہ ہوگی کہ جس پر بھروسہ کرے یا جس کی طرف دیکھے یا اس کی رہنمائی کرے۔ حتّٰی کہ اس کا وہ طریق یعنی توکل بھی نظروں سے غائب ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ[1] (بھلا کون پہنچتا ہے اضطرار والے کی پکار کو جب اس کو پکارتا ہے)

اس فرمان کی توضیح کرتے ہوئے ایک عارفؒ فرماتے ہیں، فرمایا:

"مضطر وہ ہے کہ جب وہ اپنے مولائے کریم کے سامنے کھڑا ہو کر دستِ سوال دراز کرے تو اپنے اور اللہ کے درمیان کوئی نیکی نہ پائے کہ جس کے عوض کسی چیز کا مستحق بنے اور یوں دعا کرے:

هَبْ لِیْ مَوْلَایَ بِلَا شَیْءٍ۔ (اے میرے آقا، میرے پاس کچھ نہیں، تو عطا فرما)

چنانچہ مولائے کریم کے سامنے افلاس کی پونجی پیش کر دے اور تمام اعمال میں اس کا حال افلاس پیش کرنے کا ہو۔ یہ ہی مضطر (پریشان حال) ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کی صفت بیان کی کہ یہ متقی اور خائفین ہیں اور انہیں ہی دعوت و ارشاد کے منصب کے قابل قرار دیا اور بتایا کہ یہ لوگ اپنے اور اس کے درمیان کوئی سبب اور کوئی سفارش نہیں سمجھتے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ انہیں کلامِ الٰہی سے ڈراؤ اور انہیں اپنے سامنے کیا اور اپنے کلام کا مخاطب بنا دیا جیسے کہ جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے تھے اور ان سے خطاب فرماتے۔ فرمایا:

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ[2] (اور خبر کر دے اس قرآن سے جن کو ڈر ہے کہ جمع ہوں گے اپنے رب کے پاس، ان کا کوئی اس کے سوا حمایتی، نہ سفارش والا، شاید وہ بچتے رہیں)

---

[1] النمل آیت ۶۲ [2] انعام آیت ۵۱

پھر ہم جیسوں کھیل کود میں اور فریب و غفلت میں پڑے ہوؤں کو مثالیں دے کر اور ڈراتے ہوئے اور دھمکی دیتے ہوئے فرمایا:

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا[1]

(اور چھوڑ دے جنہوں نے ٹھہرایا اپنا دین کھیل اور تماشا، اور بہکے دنیا کی زندگی پر)

ایک عالم ربانی سے پوچھا گیا:

"توکل کیا ہے؟"

فرمایا: "حول و قوت سے بری ہو جانا اور حول، قوت سے سخت تر ہے یعنی حول کے ساتھ حرکت اور قوت کے ساتھ حرکت پر پختہ رہنا اور ابتدائے فعل کا نام حرکت ہے"۔ یعنی اس کے ساتھ حرکت کی جانب نظر بھی نہ کر۔ اس لیے کہ محرک وہی اول تعالیٰ ہے اور حرکت کے بعد ثبات پر نظر نہ کر، اس لیے کہ مثبت آخر تعالیٰ بھی وہی ہے۔ اب اولیت و آخریت کی حقیقت اس کے ساتھ تیرا مشاہدہ ہے کہ نظرِ یقین کے ساتھ وہی اول و آخر ہے۔ یعنی اس وقت ہی شہادتِ وکیل تعالیٰ سے تیرا توکل صحیح ہوگا"۔

ایک بار فرمایا:

"ترکِ تدبیر کا نام توکل ہے اور ہر تدبیر کی اصل رغبت و لالچ ہے اور ہر رغبت و لالچ کی اصل طولِ امیدی ہے اور طولِ امیدی اصل میں دنیا میں زندہ رہنے کی محبت سے ہے اور یہی شرک ہے۔" یعنی جب تو وصفِ بقاء میں رب تعالیٰ کا شریک بننے کی کوشش کرے گا تو یہ شرک ہوا۔

فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اپنے آپ سے ان پر حجاب نہیں رکھا۔ البتہ ان کی تدبیر کو ہی ان کا حجاب بنا دیا"۔

ترکِ تدبیر میں ان کے فرامین کثرت سے ملتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ۔ اور یہ ضروری ہے کہ ہم اس کا مفہوم سمجھ لیں۔ ترکِ تدبیر کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو کچھ عطا فرمایا اور اس کے لیے مباح کر دیا۔ اس میں تصرف کرنا ہی چھوڑ دے اور یہ مفہوم ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ وہ خود ہی فرماتے ہیں کہ:

"جس نے کمانے پر طعن کیا اس نے سنت پر طعن کیا اور جس نے ترکِ کسب پر طعن کیا اس نے توحید پر طعن کیا"۔

اب ترکِ تدبیر سے ان کی مراد ترکِ آرزو ہے اور جب کوئی بات واقع ہوگئی تو یہ کہنا کہ یہ کیوں ہوا! اور ایسے

---

[1] انعام آیت ۷۰

کیوں نہ ہوا، یا اگر ایسے ہوتا تو ایسے ہو جاتا۔ اس قسم کی باتیں چھوڑنا ہی ترکِ تدبیر کی تفسیر ہے کیونکہ ایسا کلام علمِ ازلی اور قدرتِ نافذہ اور شہادتِ حکمت پر اعتراض و جہالت کی بات ہے اور مشیت الٰہی اور اس کے مطابق اس کے جریانِ حکم سے غفلت کی دلیل ہے۔ اب مطلب یہ ہُوا کہ جو باقی ہے اور جو آئندہ ہونے والا ہے اس میں تدبیر ترک کر دے یعنی اپنی عقل و علم سے اس میں پریشان ہونا چھوڑ دے ورنہ یہ بات تجھے تیرے موجودہ حال شدہ حال سے محروم کر دے گی۔ جو حال تجھ پر لازم ہُوا آخر آئندہ کے احکام و تغیر سے بھی محرومی ہوگی اور اگر کمی زیادتی میں تقدیر پر راضی رہا تدبیر چھوڑ دی۔ ایک وقت سے دُوسرے وقت کی طرف انتقال میں یا ایک بندے سے دوسرے بندے کی طرف تقدیم و تاخیر میں تقدیر پر راضی اور ترکِ تدبیر پر کاربند رہا۔ پھر تُو اس معاملہ میں ایسے ہی ہوگا جیسے کہ ماضی میں تھا۔ دیکھیے ایک انسان گزشتہ کی تدبیر نہیں کر سکتا۔ فرمایا،

"اس لیے انسان کو چاہیے کہ مستقبل میں ہونے والے معاملہ کی تدبیر بھی چھوڑ دے۔ یعنی جیسے گزشتہ کی تدبیر ترک کر چکا۔ آئندہ میں آرزوؤں کو ختم کر دے۔ اب اس کے نزدیک دونوں حال برابر ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے نیز بندہ اس کے احکام و افعال کو تسلیم کرنے والا اور اقدار میں اپنے مولائے کریم پر راضی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انجام سے جاہل ہے۔ اس مفہوم میں تدبیر چھوڑنا یقین کہلاتا ہے۔ اور یقین ہی جائے معرفت ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ یقین کے قلوب کو جگہ بنایا جس میں بقدرِ مکان جو ان کے مناسب ہوتا ہے۔

فرمایا کرتے تھے،

"اے مسکین بندے! اللہ تھا اور تُو نہ تھا اور پھر اللہ ہوگا اور تُو نہ ہوگا۔ اس لیے اب یہ کیوں کہتا پھر رہا ہے۔ میں میں! آج یوں ہو جا جیسے کہ تُو نہ تھا۔ اس لیے کہ اللہ آج بھی ایسے ہی ہے جیسے تھا۔"

یہ بھی فرمایا کرتے تھے،

"ترکِ تدبیر کا نام زہد ہے۔"

اس سے مراد ترکِ اسباب ہے جو کہ تدبیر کا باعث بنتے ہیں اور سبب کو دُور کر دینا مراد ہے کہ جو تدبیر کا موجب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اسباب جمع کرنے اور اسباب پر یقین کرنے والا بن کر رہ جائے۔ یہی ترکِ تدبیر ہے اس مقام میں تدبیر کا مطلب تمیز ہے اور احکام پر قائم رہنا اور اشیاء کا اپنے اپنے مقام پر رکھنا ہے۔ اب اشیاء پائی جانے کے ساتھ ساتھ بندہ ایسا کس طرح نہیں ہو سکتا جبکہ وہ عاقل صاحبِ تمیز، علم کے ساتھ عبادت گزار اور احکام پر عمل پیرا ہونے کا پابند بھی ہو؟ بلکہ ان کا فرمان یہ ہے کہ "اشیائے مدبّرہ کو ترک کر دو۔ اسبابِ ممیّزہ میں زہد اختیار کرو تاکہ تم سے تدبیر و تقدیر ساقط ہو جائے۔ اب اس کے ترک سے تارکِ تدبیر

ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے احکام تجھ سے ساقط ہو گئے۔ ان پر چلنے اور ان میں نظر کی زحمت سے آرام مل گیا۔ ترکِ تدبیر کی یہی توضیح ہے اور یہی اہلِ توکل کا حال ہے اور جس کی کفایت ہو چکی، متوکل اس کا اہتمام نہیں کرتا۔ جیسے کہ جب انسان صحت یاب ہوجائے تو دوا نہیں کرتا۔ البتہ گاہے مرض آنے سے پیشتر جیسے وہ پرہیز کرتا ہے اسی طرح یہ بندہ وہ حالت آنے سے پیشتر پرہیز کیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا[1] (اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی)

اور فرمایا:

وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا اللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَاِیَّاکُمْ[2] (اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں رکھتے اپنی روزی، اللہ روزی دیتا ہے ان کو اور تم کو)

چنانچہ متوکل یقین کے ساتھ جان جاتا ہے کہ اسے جو روزی ملتی ہے چاہے ایک ذرّہ بھر ہو۔ یہ اس کے خالق کریم کی جانب سے ہے اور اسی کی روزی اسے ملے گی اور اس کی قسمت کا مال اسے مل کر رہے گا چاہے وہ کس حال میں ہو اور اس کا مال کبھی بھی کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا اور اس طرح دوسرے کا مال اور دوسرے کا حصہ کبھی بھی مجھے نہیں مل سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی قسمت اور حصہ کی طرف دیکھا کہ یہ سب مولائے کریم سے ہے نہ کہ نظرِ یقین کے ساتھ دیکھے کہ جسکے وہ ذمہ دار ہُوا اور یہ تین میں سے ایک مشاہدہ ہے اور اگر اس کا مشاہدہ قریب ہُوا تو وہ اپنی قسمت و نصیب اس صحیفہ میں دیکھے کہ جو اس کی پیدائش کے موقع پر صورت بننے کے وقت لکھا گیا اور اس میں اس کی روزی، اس کی عمر، اس کا کام، خوش بخت ہے یا بدبخت؛ سب لکھا گیا۔

اب اگر وہ بدبخت ہے تو مخلوق میں سے اسے کوئی بھی خوش بخت نہیں بنا سکتا اور اگر وہ خوش بخت ہے تو کوئی اسے بدبخت نہیں بنا سکتا۔ اسی طرح اگر اسے مولائے کریم عطا کرے تو کوئی روک کر اسے محروم نہیں کر سکتا۔ اور اگر خدا تعالیٰ ہی اس سے روک دے تو کوئی اسے دے کر مرزوق (روزی دیا ہوا) نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ یہ لکھا جا چکا اور یہ کام ہو چکا۔ اب اگر اس کو مشاہدہ حاصل ہوا تو لوحِ محفوظ پر دیکھے گا جس سے فراغت ہو چکی یہ اصل کتاب ہے اور اس سے یہ صحیفہ لکھا گیا۔ اب اس کا یقین یہ ہُوا کہ اس کا رزق لوحِ محفوظ پر لکھا ہے اور یہ جان لے گا۔ کسی قوت و حیلے سے اس میں بیشی نہیں کی جا سکتی ہے اور کسی عجز و سکینت سے اس میں کمی نہیں کی جا سکتی

---

[1] ہود آیت ۶

[2] العنکبوت آیت ۶۰

جیسے کہ اس کا یہ یقین کہ اگر اس میں لکھا ہے کہ یہ اہلِ جنت سے ہے تو وہ ہر صورت اس میں داخل ہو کر رہے گا چاہے جیسا بھی عمل کرے اس لیے کہ اس کا نام لوحِ محفوظ میں لکھا جا چکا اور اس میں اس کا نشان ہو چکا۔

فرمایا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔[۵]

(اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے پیچھے کہ آخر زمین مالک ہوں گے میرے نیک بندے)

اب آثار (و واقعات) لکھے جا چکے۔ ہر چیز سے روزی تین مقامات میں ایک بار ہی لکھی جا چکی تاکہ نصیب قلب کو تسکین مل جائے اور علم کے لحاظ سے معاملہ موکد ہو جائے۔

۱۔ یہ ذکرِ اوّل یعنی لوح محفوظ میں لکھا گیا۔

۲۔ پھر زبرِ اولیٰ یعنی پہلے صحائف میں لکھا گیا۔

۳۔ پھر ہماری اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا جس کے ذریعہ ہم نے گزشتہ معاملات کو جانا۔

اب اگر ہر بندے کا مشاہدہ، اس کے مقام سے بلند ہو اور قرب و عُلو میں اس کے معبود سے اور اس کی جگہ سے بلند ہو تو وہ یہ ذکر کردہ باتیں پیدائشِ لوح سے پہلے علمِ الٰہی میں مقرر اور طے شدہ دیکھے گا اور اب اس کا دل پُرسکون ہو جائے گا اور وہ علمِ الٰہی کی طرف اور اس کے حق میں فیصلۂ ازلی کی طرف مطمئن ہو جائے گا۔ اس لیے روایت میں آیا:

"دنیا میں زہد یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس پر تجھے اس سے زیادہ وثوق ہو جو تیرے ہاتھ میں ہے اور مصیبت کا ثواب تجھے اس میں زیادہ مرغوب ہو کہ کاش! یہ تیرے لیے باقی رہتی۔" یعنی مشاہدہ کے باعث تیری حرص ختم ہو جائے اور مخلوق میں تیرا طمع جاتا رہے۔ یہی رضا و زہد ہے۔

توکل میں دو مقام ایک ساتھ جمع ہیں۔ جو اللہ کے پاس ہے وہ رزق تجھے ہر حال میں مل کر رہے گا اور یہ وہ ہے جو اللہ کے ہاں تیرے لیے ہے اور یہ علمِ الٰہی میں معلوم ہے۔ اس میں تغیر نہیں آتا اور یہ تین طرح پر ہے:

۱۔ جو تُو نے کھا لیا اُسے ختم کر دیا۔

۲۔ جو تُو نے پہن لیا اُسے بوسیدہ کر دیا۔

۳۔ جو تُو نے صدقہ کیا اسے آگے بھیجا۔

دنیا و آخرت میں یہی مال تیرا ہے اور بس! اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[۵] انبیاء، آیت ۱۰۵

"ابن آدم کہتا ہے: میرا مال۔"

یعنی آپؐ نے ابنِ آدم کی جہالت و غفلت پر تعجب کیا پھر فرمایا:

"تیرا صرف وہ مال ہے۔"

اب تین طرح کے مال کا ذکر فرمایا اور ہر ایک کے ساتھ اس کی غایت کی شرط لگا دی۔ فرمایا:

"جو تُو نے کھایا سو فنا کر دیا یا تو نے صدقہ کیا۔ سو اسے آگے بھیجا۔"

چنانچہ آپؐ نے فنا کرنے، بوسیدہ کرنے اور آگے بھیجنے کی شرط لگا دی۔ پھر اس کے بعد فرمایا:

"اس کے علاوہ جو ہے وہ وارث کا مال ہے۔"

یعنی ان تین اوصاف پر بندے کی روزی ہے اور یہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اسے پہنچ کر رہے گی۔

اور جو مال اللہ تعالیٰ کے بندے کے قبضہ میں دے رکھا ہے گا ہے وہ اس کا مال نہیں ہوتا بلکہ یہ مال اس کے پاس امانت ہوتا ہے اور بعد میں کسی دُوسرے کو دینا ہوتا ہے یہ آدمی چاہے پچاس برس تک اسے جمع کیے رکھے اور اس کا مالک بنتا پھرے مگر وہ کسی دوسرے بندے کے لیے ہے اور اس کی مالکیت کے دعویٰ کی صرف یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے خزانہ یا اس کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ حالانکہ وُہ اس کا مالک نہیں اور اس کا دعوائے ملکیت سراسر خدا سے جاہل ہونے اور کم سمجھی کے باعث ہے اور حکمتِ الٰہی سے غافل ہونے کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے کیونکہ اگر وُہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت سے آگاہ ہوتا تو جان لیتا کہ اس کا صندوق، دراصل زمین میں ایک خزانۂ الٰہی ہے اور جب تک چاہے گا وہ اس کے پاس رہنے دے گا اور پھر جدھر چاہے گا اسے لے جائے گا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ [1] (ٹھہراؤ اور کہیں سپرد)

اور فرمایا:

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ [2] (ہر چیز کا ایک وقت ٹھہر رہا ہے)

ایک جگہ فرمایا:

وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [3] (اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے)

---

[1] انعام آیت ۹۹

[2] انعام آیت ۶۷

[3] منافقون آیت ۷

رزق مل کر رہے گا

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح مروی ہے:

(فرمایا) "بے شک رزق بندے کو تلاش کرتا ہے جیسے کہ اس کی موت اسے تلاش کرتی ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اور بیشک ہر بندے کی روزی (طے شدہ) ہے جو ضرور اسے مل کر رہے گی۔ اب جس نے اس پر قناعت کی اور راضی ہوا اس کے لیے اس میں برکت کی گئی۔ اور جس نے اس پر قناعت نہ کی اور راضی نہ ہوا اس کیلئے اس میں برکت نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے لیے وسعت ہوئی۔"

(مشائخ) فرماتے ہیں:

"اگر بندہ روزی سے اس طرح بھاگے جیسے کہ موت سے بھاگتا ہے تو بھی اسے جا لے گی۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کو وصیت فرمائی اور اس میں فرمایا:

"جب تُو مانگے تو اللہ تعالیٰ سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ سے مدد چاہ اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تیرے لیے نہیں لکھا۔ اگر ساری مخلوق مل کر چاہے کہ تجھے نفع پہنچائے تو وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گی اور جو (نقصان) اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے نہیں لکھا اگر وہ کوشش کریں کہ تجھے نقصان پہنچائیں تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔ صحیفے لپیٹ دیے گئے اور قلمیں خشک ہو گئیں۔"

اب جس کو طے شدہ قسمت کا مشاہدہ ہو گیا اس سے تمام فکر دور ہو گئے اور وہ مخلوق کی طرف نظریں کرنے سے آرام پا گیا اور مخلوق اس کی تکلیف سے آرام پا گئی۔ وہ ان سے الگ ہو کر اپنے مولائے کریم کی عبادت میں مصروف ہو گیا۔ یہ خطاب خداوندی سمجھ گیا اور ان لوگوں میں ہوا کہ جنہوں نے دعوت پر لبیک کہا اور دعوت کو قبول کر کے خدا کی طرف آ گئے۔

بتاتے ہیں کہ ایک آدمی ہر صبح کو حضرت عمر بن خطابؓ کے دروازے سے لگا ہوتا، حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ مانگنے آیا ہے۔ فرمایا:

"تو نے عمر کی طرف ہجرت کی یا اللہ کی طرف؛ جا، جا کر قرآن سیکھ، وہ تجھے عمرؓ کے دروازے سے مستغنی کر دے گا۔"

وہ آدمی چلا گیا اور کچھ مدت غائب رہا۔ حضرت عمرؓ نے اسے نہ دیکھا تو اس کے بارے میں معلوم کیا۔ آپؓ کو اطلاع دی گئی۔ آخر وہ حاضر ہوا اور اس نے عوام سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور عبادت میں مصروف ہو چکا تھا حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"میں نے تجھے گم پایا تو بڑا اشتیاق پیدا ہوا۔ آخر تمہیں کس چیز نے ہم سے غافل کر دیا؟"

اس نے کہا،

"میں نے قرآن پڑھا اس نے مجھے عمرؓ سے اور آلِ عمرؓ سے مستغنی کر دیا"

حضرت عمرؓ نے فرمایا،

"اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے تُو نے اس میں کیا پایا؟"

اس نے کہا،

"میں نے یہ آیت پائی؛

وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ[1] (اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا)"

تو میں نے کہا،

"میرا رزق آسمان میں ہے اور میں زمین میں تلاش کرتا پھرتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ رو پڑے یہ بات ان کے لیے نصیحت تھی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ اسے دوستوں کی طرح سمجھتے اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سُنا کرتے۔

ایک آدمی بشر بن حارثؒ کے پاس آیا اور کہا،

"میں نے شام کے سفر پر جانے کا ارادہ کیا ہے اور میرے پاس زادِ راہ نہیں۔ آپؒ کا کیا خیال ہے؟"

فرمایا، "اے خدا کے بندے! جدھر ارادہ ہے نکل جا۔ جو تیرا نہیں وہ تجھے نہیں دے گا تو جو تیرا ہے وُہ تجھ سے نہیں روکے گا۔"

ایک آدمی نے فضیلؒ سے اپنی حالت کی شکایت کی۔ آپؒ نے فرمایا:

"اے بندے! غیر اللہ کو مدبر بنانا چاہتا ہے!"

حضرت حسنؒ فرمایا کرتے تھے،

"توکل ہی رضا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَ قَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا[2] (اور ٹھہرادیں اس میں خوراکیں اس کی)

---

[1] الزاریات آیت ۲۲

[2] حٰمٓ السجدہ آیت ۱۰

اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اجسام پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے رزق پیدا فرمائے۔"

چنانچہ متوکل اپنے آقا سے کل آئندہ کا رزق نہیں مانگتا جیسے کہ اس کا مولائے کریم اس سے کل آئندہ کے عمل کا مطالبہ نہیں فرماتا اور قسمت کے مقررہ ضمانت دادہ رزق میں توکل کرنا، عوام کا توکل ہے۔ خواص اس کے ذکر سے بھی حیا کرتے ہیں اور اس کی فراخی سے عزت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ یہ بات حق ہے۔ کہ تمہارا رزق آسمان پر ہے جیسے کہ اس نے یہ فرمایا کہ اس کا کلام حق ہے۔ چنانچہ ذات کے ساتھ قسم ذکر کر ان دونوں کو حق ہونے میں جمع کر دیا سوائے باقی تمام افعال کے۔ یہ اس لیے کیا تاکہ مخلوق، اسباب و آلات کو دیکھ اطمینان رکھے اور تاکہ ان دونوں میں شبہ و شک اٹھ جائے اور ان دونوں کے حق ہونے کا یقین حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔[1] (سو قسم ہے رب آسمان اور زمین کی کہ یہ بات تحقیق ہے)

اور فرمایا:

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِىْ وَرَبِّىْٓ۔[2] (اور خبر لیتے ہیں کیا سچ ہے یہ بات، تو کہہ اللہ قسم میرے رب کی یہ سچ ہے)

یعنی یہ رزق (حق ہے)، فرمایا:

اِنَّهٗ لَحَقٌّ۔ (یہ بات تحقیق ہے)

دنیا و آخرت کا ایک تقابل

قرآن مجید میں صرف پانچ مقامات پر ہی قسم بالذات تعالیٰ ہی آتی ہے:

۱۔ سورۂ نساء میں تسلیم احکام پر قسم آتی ہے۔ فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔[3] (سو قسم ہے تیرے رب کی، ان کو ایمان نہ ہوگا جب تک تجھی کو منصف جانیں جو جھگڑا اٹھے آپس میں)

---

[1] الذاریات آیت ۲۳

[2] یونس آیت ۵۳

[3] النساء آیت ۶۵

۲۔ سورۂ تغابن میں کافروں اور ان کے پیروکاروں کو دوبارہ اٹھانے پر قسم کھائی۔ فرمایا:

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ، قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ [۱] (دعویٰ کرتے ہیں منکر کہ ہرگز ان کو اٹھانا نہیں، تو کہہ تو کیوں نہیں۔ قسم ہے میرے رب کی)

۳۔ سورۂ واقعہ میں سائلٌ سائلٌ پر، کہ ان سے بہتر مخلوق لے آئے گا۔ فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ [۲] (سو میں قسم کھاتا ہوں مشرق و مغرب والوں کی) سے لے کر بِمَسْبُوْقِيْنَ تک۔

۴، ۵۔ اور وہ دونوں گزشتہ قسمیں (یعنی فَوَرَبِّ السَّمَآءِ اور اِيْ وَرَبِّيْ کی دو گزشتہ قسمیں۔ یہ کل پانچ ہوئیں) اور باقی تمام اقسام افعال کے ساتھ ہیں۔ مزید برآں ہر بندے کا مخلوق میں سے سرپرست اس کو خوراک دینے کا پابند کیا گیا ہے اور اگر اس کی کمائی اور اس کے ہاتھ سے اسے روزی نہیں ملی تو دوسرے کی کمائی اور دوسرے کے ہاتھ سے اسے روزی ملی مگر خواص آخرت کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اخروی امور اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں منہمک ہو چکے اور اگر یہ اس کام کو نہ اٹھائیں گے تو ان کے لیے دوسرے بھی مصروف نہ ہوں گے اور دنیا میں ان کے علاوہ دوسرے ان کے عوض کچھ نہ کریں گے۔ فرمایا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى [۳] (اور انسان کے لیے صرف وہی ہے جو اس نے کمایا)

اور فرمایا:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ۔ [۴] (کتنے منہ اس دن آسودہ ہیں، اپنی کمائی سے راضی)

اور فرمایا:

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى [۵] (اور پچھلا گھر بہتر ہے اور رہنے والا)

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ [۶] (اور اللہ چاہتا ہے آخرت)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ [۷] (جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی بڑھا دیں ہم اس کو اس کی کھیتی)

اور دنیا کی روزی کے بارہ میں یہ بات نہیں فرمائی اور "زیادتی" کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں جو عطا کیا اس پر

---

[۱] تغابن آیت ۷ — [۲] معارج آیت ۴۰ — [۳] النجم آیت ۳۹
[۴] الغاشیۃ آیت ۸، ۹ — [۵] اعلیٰ آیت ۱۷ — [۶] انفال آیت ۶۷
[۷] الشوریٰ آیت ۲۰

محاسبہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قسم میں زیادتی نہیں ہوتی۔

بتاتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ آخرت کی نیت پر دنیا عطا کرتا ہے اور دنیا کی نیت پر آخرت عطا نہیں فرماتا۔" اور یہ اس لیے کہ آخرت کا درجہ بلند ہے اور دنیا ایک ذلیل چیز ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"یاد رکھو کہ حرثِ دنیا سے مراد مال ہے اور حرثِ آخرت (آخرت کی کھیتی) سے مراد عمل صالح ہے۔"

ایک فرمان ہے:

"آخرت میں زیادتی بلندیٔ درجات ہے جس کی نیت وقصد آخرت کے لیے ہو اور اس کے لیے عمل کرتا ہو۔"

چنانچہ خواص اس میں مصروف ہوئے جو ان کو فرمایا گیا اور جس پر دوسرے ان کے لیے عمل پیرا نہیں ہیں۔ چنانچہ دوسروں کو اس میں ان کی جگہ رکھا گیا نیز ان کے دنیاوی اسباب سے اس سے اس کے مثل نے نیابت کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں مروی ہے کہ:

"میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی خاطر پیدا کیا اور آدم (علیہ السلام) کو میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاطر پیدا کیا اور میں نے جو بھی پیدا کیا وہ آدمؑ کی خاطر پیدا کیا۔ جس کو میں نے ان کی خاطر پیدا کیا اب جو اس میں مشغول ہوا تو میں نے اس پر اپنے سے حجاب ڈال دیا اور جو ان سے (الگ ہوکر) مجھ میں مشغول ہوئے تو میں نے جو اس کی خاطر پیدا کیا اس کی طرف چلایا۔"

خواص کا توکل

خواص کا توکل ایک یہ بھی ہے کہ کسی کی طرف سے قول وفعل کی طرف ایذاء پہنچنے پر صبر کرے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں حکم دیا:

فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ[1] (سو پکڑ اس کو کارساز، اور صبر کر جو کہتے ہیں)

اور اس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا قول ذکر کیا۔ فرمایا:

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ[2] (اور ہم صبر کریں گے ایذاء پر جو ہم کو دیتے ہو، اور اللہ پر بھروسہ چاہیے بھروسہ والوں کو)

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فرمایا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ[3] (وہ لوگ تھے جن کو ہدایت دی اللہ نے، سو تو چل ان کی راہ)

---

[1] مزمل آیت ۹، ۱۰ [2] ابراہیم آیت ۱۲ [3] احقاف آیت ۳۵

اور فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ [1] (سو صبر کرو جیسے کہ صبر کیا ہمت والے رسولوں نے، اور ان کے لیے جلدی نہ کر)

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"جب تک ایک آدمی کے لیے مخلوق کی طرف مدح و مذمت دونوں برابر نہ ہو جائیں اور دونوں کا اثر ختم ہو کر نہ رہ جائے تب تک اسے توکل میں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اسے ایذا دی جائے تو وہ ایذا پر صبر کرے۔ اس طرح وہ مخلوق پر نظر رکھنے سے دور ہو کر خالق کریم کے علم کی طرف سکون و اطمینان حاصل کرتا ہے۔"

پھر حسنِ معاملہ پر استقامت دکھانا اور مقابلہ کی خواہش ترک کرنا اور اللہ سے حیاء کرتے ہوئے اس کی بزرگی کی خاطر اس سے خوف کھاتے ہوئے اور اس کی محبت کے باعث اس پر پختہ رہنا صبر ہے۔ ظاہر و باطن میں ایسا رہنے کے اعتبار سے ان کی توصیف ہوئی۔ ظاہر کے بارے میں فرمایا:

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ [2] (خوب اجر ملا کام والوں کو جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں)

جب انہیں علم ہوا تو علم کی بناء پر صبر کیا۔ پھر اس معاملہ میں ہر طرح اللہ پر توکل کیا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے خوب خوب اجر و انعام سے نوازا اور باطن کے بارے میں ان کا ذکر یوں فرمایا:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا [3] (ہم جو تم کو کھلاتے ہیں نرا اللہ کا منہ چاہنے کو، نہ ہم تم سے چاہیں بدلا اور نہ چاہیں شکرگزاری)

چنانچہ خوف نے ان سے طلب ہی ختم کر دی اور فرمایا:

مِنْكُمْ (تم سے)

یہ ایک عجیب اور اعلیٰ ترین توجیہ ہے اور یہ باطن آیت ہے گا ہے اس کا مطلب یوں ہوتا کہ:

لَا نُرِيْدُ بَدَلًا مِّنْكُمْ۔ (ہم تم سے بدلہ نہیں مانگتے)

جیسے کہ فرمایا:

---

[1] احقاف آیت ۳۵

[2] العنکبوت آیت ۵۸، ۵۹

[3] الدھر آیت ۹

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ [۱] (اور اگر ہم چاہیں، نکالیں تم میں سے فرشتے، رہیں زمین میں تمہاری جگہ)

یہ مطلب نہیں کہ بشر سے اور تم سے فرشتے بناتے بلکہ تمہاری جگہ فرشتے بسانا مراد ہے۔ یہ آیت میں دو وجوہ میں سے ایک ہے اور یہ دونوں میں سے اعلیٰ ترین توجیہ ہے۔

اور ظاہری توجیہ یہ ہے کہ کاف اور میم کھلانے والوں کے اسما ہیں یعنی ہم تم سے کچھ جزا نہیں مانگتے اور نہ ہی شکر مانگتے ہیں یعنی نہ ہی حسن ثنا کے طلبگار ہیں اور جب ان سے عوض اور بدلہ کا مطالبہ نہیں کیا اور یوں کہا:

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا [۲] (ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے)

اور ان پر خوب خوب عنایت فرمائی اور بتا دیا:

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا [۳] (اور پلائی ان کو، ان کے رب نے شراب جو دل کو دھوئی، یہ ہے تمہارا بدلا اور کمائی تمہاری نیک لگی)

جب انہوں نے کسی بدلے اور شکریے تک کا مطالبہ نہیں کیا تو انہیں پاک مشروب عطا کیا اور ان کی محنت کو اپنے ہاں مشکور فرمایا۔

پھر حکم تسلیم کرنے اور اس پر راضی رہنے میں توکل کا درجہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وکیل حاکم تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے حکم تسلیم کیا اور فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ [۴] (حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے، اس پر مجھ کو بھروسہ ہے)

اس لیے کہ جب بندہ کسی نفس کی مراد چیز کو چاہتا ہے تو کہا ہے ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہر ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا مگر اسے ہر چیز کے لیے مولائے کریم کے ارادہ کا یقین ہوتا ہے اور ہر چیز کارساز کریم کے ارادہ میں ہے تو اب بندے کو چاہیے کہ اس کا ارادہ کرے جس کا ارادہ اس کا مولا کریم کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے ہر ارادہ سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ بندے کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنے آقا کریم کی مراد کو محبوب تر اور بہتر سمجھے۔ اس لیے کہ مولائے کریم نے جو ارادہ فرمایا اس میں بندے پر کچھ سزا نہیں اور نہ ہی اس میں اس کی ناراضگی ہے کیونکہ یہ چیز اللہ کی محبوب اور اس کی پسندیدہ ہے۔ اب اس کے لیے یہی موزوں بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت، اس کی محبت و پسند پر مقدم رکھے کیونکہ تمام امور کا انجام اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ کو

---

[۱] الزخرف آیت ۶۰
[۲] الدھر آیت ۱۰
[۳] الدھر آیت ۲۱، ۲۲
[۴] یوسف آیت ۶۷

عزت بخشی اور اس عاجل و ذلیل دنیا سے اُنہیں دُور رکھا اور فرمایا:

وَ الۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ[1] (آخر بھلا ہے ڈر والوں کا)

چند اقوالِ مبارکہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں مروی ہے،

"جب تیری چاہت نہیں ہوئی تو جو ہوگا اسے واپس کر دے اور اگر تو نے اپنی چاہت پر اصرار کیا تو تُو نے (اپنے آپ کو) اپنی چاہت میں تھکا دیا اور ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔"

حضرت حسنؓ سے مروی ہے:

"میں نے چاہا کر اہل بصرہ میرے عیال ہوں اور دینار کا سولھواں حصہ میرے پاس ہو، یہ انتہائی توکل کی بات ہے اور یہ حال صرف احکام کو تسلیم کرنے اور جیسے بھی آئیں ان پر راضی ہونے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ کلام عقلوں سے بالاتر ہے۔"

حضرت وہیب بن ورد مکی فرمایا کرتے تھے،

"اگر آسمان تانبے کا اور زمین سکّے کی بن جائے پھر بھی میں رزق کا اہتمام کروں تو مجھے گمان ہوگا کہ میں مشرک ہوں۔" اور یہ قول ہے کہ:

"جس نے کل آئندہ کی روزی کا اہتمام کیا اور آج اس کے پاس کل (آئندہ) کی خوراک ہے تو اس پر ایک گناہ لکھا گیا۔"

حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں:

"اگر روزے دار دن کی ابتدأ میں رات کے کھانے کا اہتمام کرے تو اس پر ایک گناہ لکھا گیا۔"

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے تھے، کہ

"اس سے روزہ دار کے روزہ میں کمی واقع ہو جائے گی۔"

اور فرمایا،

"میں بصرہ کے ایک بڑے قبرستان کو جانتا ہوں کہ ان کے مردوں پر جنت کی روزی صبح و شام پیش کی جاتی ہے اور وُہ لوگ جنت میں اپنے مکانات بھی دیکھ رہے ہیں مگر وہ لوگ ایسے غم و کرب میں ہیں کہ اگر وُہ غم اہلِ بصرہ پر بانٹ دیا جائے تو سب مرجائیں۔"

پُوچھا گیا: "کیوں؟"

---

[1] اعراف آیت ۱۲۸

فرمایا،" اس لیے کہ (دنیا میں) وہ جب صبح کا کھانا کھا لیتے تو کہا کرتے کہ ہم رات کو کیا چیز کھائیں گے اور جب رات کا کھا لیتے تو کہا کرتے کہ ہم صبح کیا چیز کھائیں گے؟"

ایک بار فرمایا،

"ان کو توکل سے کچھ حاصل نہ تھا۔" اور یہ فضائل توکل کے مقامات ہیں اور اس سے بلند ایسے مقامات ہیں جو صدیقین کے مکاشفہ میں آئے اور جن کا عارفین کو مشاہدہ ہوا کہ انہیں عطا کیے گئے۔ مگر کتاب میں ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔

مثلاً انہیں کُنْ عطا ہوا اور یہ انہیں اسم (اعظم و یا اسم مخصوص) پر اطلاع کے ذریعہ عطا ہُوا۔ چنانچہ کَانَ کی خاطر یعنی (خدا کی عظمت و عزت) کی خاطر اس پر توکل کرتے ہُوئے اور اس کی قدرت میں معارضہ سے حیاء کرتے ہُوئے اور تقدیر میں رغبت دکھاتے ہُوئے یا امرِ تکوین میں اس سے مشابہ بات میں رغبت کی خاطر "کُنْ" ہونے میں زہد اختیار کیا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس کی تدبیر زیادہ پختہ و یقینی ہے اور وُہ نتائج سے خوب واقف و آگاہ ہیں اور وہی حضرات ہماری استطاعت و علم سے بڑھ کر تعظیم و بندگی بجا لاتے ہیں۔ اور غذا کے معاملہ میں اس پر توکل کرنا تو فرض توکل ہے۔ یہ حضرات وکیل تعالیٰ کے ساتھ اس کے ذکر سے بھی حیاء کرتے ہیں۔ اس طرح شیریں و تلخ اقدار اور حکمت و عدل کے طور پر خیر و شر کی تقدیر کے تسلیم کرنے میں بھی یہی معاملہ ہے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"ہر چیز قضاء و قدر سے ہے حتّٰی کہ عجز و سمجھ بھی (قضا و قدر سے) ہے۔ اور جیسے فرمایا:

"جان لے جو تُو کھو بیٹھا، وُہ تجھے پہنچنے والا ہی نہ تھا اور جو تجھے مل گیا وُہ تجھ سے خطا ہونے والا ہی نہ تھا۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے؛

وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ۔[1] (اور ہر چھوٹی اور بڑی لکھنے میں آچکی)

فرض اور مستحب توکل

چنانچہ ان اشیاء کا علم اور ان پر قلبی اور دماغی سکون اور یہ کہ رائے و عقل میں اضطراب نہ آنے پائے اور تمثیل و تشبیہ دے کر نزاع نہ کیا جائے۔ یہ تمام باتیں اہل یقین کے ہاں فرائضِ ایمان میں سے ہے اور جب تک بندہ ان سب کو تسلیم نہ کرلے اس وقت اس کا ایمان صحیح نہیں ہوتا۔ البتہ یہ توکل میں کچھ چیز نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں؛

---

[1] القمر آیت ۵۳۔

" قدر، اصل میں نظامِ توحید ہے جس نے کتاب اللہ کی تصدیق کی اور قدر کو جھٹلایا تو اس کا تکذیب بالقدر کا فعل حقیقت میں اس کی توحید میں خامی کی علامت ہے"۔

چنانچہ انہوں نے تمام اقدار پر ایمان لانے کو بتایا کہ یہ سب مشیتِ الٰہی اور حکمِ الٰہی سے ہیں اور جیسے ایک دھاگہ دانوں کو پروتا ہے اسی طرح توحید اس میں نظم رکھتی ہے۔ چنانچہ جب دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے تو تمام دانے گر پڑتے ہیں۔ فرمایا:

" اسی طرح جب کوئی آدمی قدر کی تکذیب کرے گا تو اس کا ایمان جاتا رہے گا"۔

چنانچہ توکل کی دو قسمیں ہوئیں: فرض توکل اور مستحب توکل۔ فرضِ توکل کا تعلق ایمان سے ہے۔ یعنی تمام اقدار کو تسلیم کرنا اور یہ سب قادرِ کریم کی طرف سے ہیں اور یہ یقین رکھنا کہ یہ تمام اقدار، دراصل اسی کریم تعالیٰ کا فیصلہ و قدر ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جو آدمی اختلافی امور میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم (فیصل) نہیں مانتا۔ وہ مومن نہیں ہے۔ فرمایا:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [1]

(سو قسم ہے تیرے رب کی، ان کو ایمان نہ ہوگا۔ جب تک تجھی کو منصف جانیں جو جھگڑا اٹھے آپس میں، پھر نہ پاویں اپنے جی میں خفگی تیرے فیصلے سے اور قبول رکھیں مان کر)

اب جو آدمی حاکمِ اوّل اور قاضی اجلّ تعالیٰ کی نافرمانی کرے تو وہ سب سے بڑا بے ایمان ہے اور توکل کی فضیلت کا تو مشاہدۂ وکیل کے بعد ہی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے کہ یہ آدمی مقامِ معرفت میں ہوتا اور منظرِ یقین سے دیکھ رہا ہوتا ہے جیسے کہ ایک نیک بندے کا فرمان قرآن مجید میں ذکر کیا گیا:

فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ۔

چنانچہ اس کے سامنے خدا تعالیٰ کی عظیم قدرت و قوت تھی اور اس نے غالب تعالیٰ کی شوکت کی خبر دی۔ گویا یوں کلام تھا کہ یوں کیوں ہے تو بھی تو ہمارے جیسا ایک کمزور آدمی ہے، تو اس نے جواب دیا:

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ [2] (میں نے بھروسہ کیا اللہ پر، جو رب ہے میرا اور تمہارا)

گویا اس سے توکل کی تشریح معلوم کی گئی کہ اس کا کیا سبب ہے تو اس نے مشاہدۂ وکیل سبحانہ، کا ذکر کیا کہ

---

[1] النساء آیت ۶۵

[2] ہود آیت ۵۶

تمام رُوئے زمین کے جانداروں کی پیشانیاں اس کے قبضہ میں ہیں اور فرمایا:

وَ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا۔ (کوئی نہیں پاؤں دھرنے والا مگر اس کے ہاتھ میں چوٹی اس کی)

پھر اس میں اس کے عدل کے بارے میں لوگوں نے پوچھا اور حکمت کا سوال کیا کہ اگرچہ وہ خیر و شر، نفع و نقصان کے ہر امر میں بندوں کی پیشانیوں پر قابض ہے تو یہ بات اس کے عدل میں ہے اور ٹھیک ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (بیشک میرا رب ہے سیدھی راہ پر)

اور فرضی توکل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ عَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ [۱] (اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر یقین رکھتے ہو)

اور اسی طرح فرمایا:

اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ [۲] (اگر تم یقین لائے ہو اللہ پر، تو اس پر بھروسہ کرو، اگر ہو حکم بردار)

اور اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ [۳] (اور اللہ پر بھروسہ چاہیے بھروسہ والوں کو)

اور ایک جگہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ [۴] (اللہ چاہتا ہے توکل والوں کو)

اسباب و اواسط معانی حکمت کے طور پر ہیں
یہ ثبوت حکم و قدرت کا باعث نہیں ہیں

اللہ تعالیٰ حکمت و قدرت کا مالک ہے۔ وصفِ قدرت سے اشیاء کو ظاہر فرمایا اور مفاہیمِ حکمت سے اشیاء کو جاری کیا۔ اس کے ثابت شدہ حکم کو متوکل ساقط نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس نے اس اعتبار سے قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ کر لیا کہ وہ سبحانہٗ حکیم ہے۔ حکمت اس کی صفت ہے اور متوکل آدمی اشیاء کو حاکم جاعل، نافع اور ضار

---

[۱] المائدہ آیت ۲۳ — [۲] یونس آیت ۸۴

[۳] ابراہیم آیت ۱۲ — [۴] آل عمران آیت ۱۵۹

نہیں سمجھتا ورنہ اس کی توحید میں شرک کا مرتکب ہوگا. اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور قدرت اس کی صفت ہے اور وہی حاکم و جاعل اور ضار و نافع ہے. اس کے اسماء میں کوئی شریک نہیں اور اس کے احکام میں کوئی اس کا مددگار نہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [1] (حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے)

وَ لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا [2] (نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو)

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَ مَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ [3] (اور نہ ان کا ان دونوں کا ساجھا، اور نہ ان میں کوئی اس کا مددگار)

ظہیر کا مطلب ہے چیز پر مددگار۔

چنانچہ متوکل آدمی اس کے مشاہدہ کے ساتھ، اشیاء پر ایک قدرتِ الٰہی ہے اور وہ تقدیر و تدبیر کے ساتھ منفرد ہوتا ہے۔ ملک و مملوک کے ساتھ قائم، اور وہ بھی تصریف و تقلیب میں وجوہِ حکمت سے آگاہ ہوتا ہے۔ یعنی محکوم (بندے) پر احکام واقع کرنے اور مرسوم (بندے) پر ثواب و عذاب ڈالنے کے لیے اشخاص و امثال پیدا کرنے کے لیے اسباب و واسطوں کے تصریف و تقلیب میں وجوہِ حکمت سے آگاہی رکھتا ہے اور یہ اس طرح سے ہے کہ متوکل آدمی، اللہ کے حکمِ اوّل کا اعتراف بھی کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ ہر قدر اللہ سے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ احکامِ شریعت پر قائم اور مطالباتِ علم سے وابستہ رہتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سُن رہا ہے کہ،

لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْـَٔلُوْنَ [4] (اس سے پوچھا نہ جائے جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے)

اور اللہ تعالیٰ نے تمام ظاہر کردہ مخلوقات میں اپنے حکم میں قدرت چھپا دی۔ چنانچہ اشیاء میں اس کی حکمت ہویدا ہوئی اس لیے کہ جن کے لیے حکمت کا اظہار ہوا ان پر احکام واپس آئے اور سب معاملہ اس کی طرف راجع ہونے کے باعث اشیاء میں اس کی قدرت مخفی ہوئی۔ اس لیے کہ صنعتِ باطن کے باعث، صنعتِ ظاہری خوب پختہ ہوئی اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ [5] (کاریگری اللہ کی، جس نے سادھی ہے ہر چیز)

---

[1] انعام آیت ۵۷ [2] الکہف آیت ۲۶ [3] سبا آیت ۲۲ [4] الانبیاء آیت ۲۳
[5] النمل آیت ۸۸

یعنی اس کی باطنی صنعت نے ظاہری صنعت کو پختہ کیا۔

پھر فرمایا:

وَ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّهٗ۔

یعنی ہر ظاہری و باطنی معاملہ اس کی طرف جانے والا ہے۔

فَاعۡبُدۡهُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡهِ[۱] (سو اس کی بندگی کر اور اس پر بھروسہ رکھ)

یعنی ہر معاملہ میں اس پر توکل کر۔

عالم ربانی

چنانچہ ایک صاحب توکل عارف کو صنعتِ باطن کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس مشاہدہ پر قائم ہوتا ہے اور حکمتِ ظاہرہ میں اسے علمِ شرع ہوتا ہے۔ وہ نام و رسوم (ظاہرہ) کو مانتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ افضلیت بخش عبادت میں یہی شہادتِ توحید ہے اور یہ علمائے ربانیین کا مقام ہے ویسے تو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا ہر آدمی اللہ پر توکل کرنے والا ہے مگر ہر بندے کا توکل، اس کے یقین کے درجہ پر ہوتا ہے۔ خواص کا توکل وُہ ہے جو ہم نے مشاہدہ اور مفاہیم رضا کے بیان میں ذکر کیا اور عوام کا توکل وُہ ہے جو ہم نے خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لانے کی بحث میں بیان کیا۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے بتایا کہ میں ہی رازق ہوں جیسے کہ میں خالق ہوں اور جیسے کہ زندہ کرنے والا اور مارنے والا بھی میں ہی ہوں۔ چنانچہ حکمت و قدرت کی ترتیب کے ساتھ ان چار کو ایک ہی جگہ ملا کر ذکر فرمایا۔ اب ان کا حکم کیونکر مختلف ہو سکتا ہے یا اسباب و واسطوں کے آنے سے بعض کا وصف ہی کیوں ظاہر ہو۔ فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ ثُمَّ رَزَقَکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ[۲] (اللہ وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر تم کو روزی دی، پھر تم کو مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا)

اب جس طرح آخری تین میں بنانے والا اور ظاہر کرنے والا ایک ہی ہے۔ اس طرح چوتھے میں یعنی رزق دینے والا بھی وہی خدا کریم ہے۔

قدرتِ الٰہی اور اعمالِ عباد

آپ یہ نہیں کہتے کہ:
"میرے باپ نے مجھے پیدا کیا۔" چاہے وہ تیری پیدائش کا سبب ہے اور نہ ہی تم یُوں کہتے ہو کہ "فلاں نے مجھے زندہ کیا اور فلاں نے مارا،" چاہے زندہ کرنے

---

[۱] ہُود آیت ۱۲۳

[۲] الروم آیت ۴۰

یا قتل کرنے میں وہ واسطہ ہی ہو۔ اس لیے کہ یہ کلام شرک ہے اور اس کی برائی واضح ہے اس لیے یہ کلام نہیں کیا جاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ[1] (بھلا دیکھو جو تم منی ڈالتے ہو اب تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں)

اور ایک جگہ فرمایا،

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ[2] (بھلا دیکھو تو، جو بوتے ہو، کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کرنے والے)

چنانچہ منی ڈالنے اور کھیتی کرنے کو ہماری جانب منسوب کیا۔ اس لیے کہ یہ اعمال ہیں اور ہم بندے اور عمل کرنے والے ہیں اور یہ (اعمال) ہماری صفات ہیں۔ ان کے احکام ہم پر آتے ہیں مگر پیدائش کرنے اور کھیتی اگانے کو اپنی جانب منسوب فرمایا۔ اس لیے کہ یہ امور اس کی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں اور اللہ ہی قدرت والا حکمت والا ہے۔

اسی طرح کتاب اللہ میں ذکر کردہ تمام اعمال و اکتسابی باتیں اعضائے عمل اور آلاتِ کاسبہ کی جانب منسوب ہیں اور قدرت و ارادہ اس کی اپنی صفات ہیں۔ اس لیے کہ وُہ مریدِ اوّل و قادرِ اعلیٰ ہے۔ اب اندازِ کلام کو خوب سمجھ لو اور ایسا نہ ہو کہ شکوک و شبہات کے باعث تمہارا قلب گمراہی میں پھسل پڑے اور لگا ہے بندہ یوُں کہنے لگتا ہے،

"فلاں نے مجھے دیا اور فلاں نے روکا۔"

یہ باتیں شرکِ خفی کی ہیں اور یہ باتیں اس لیے کی جاتی ہیں کہ اسباب کا ان کے ہاتھوں پر ظہور ہوتا ہے اور واسطوں کے ذریعہ دینا لینا کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ (اسباب و واسطے) سبب تعالیٰ سے حجاب بنا دیے گئے اور معطی و مانع تعالیٰ ان سے مستور ہو گیا۔ اہل یقین کے نزدیک اس کی بُرائی و قباحت بھی پہلے کے شرک جیسی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ رازق میں ہی ہوُں اور دُوسرا کوئی رازق نہیں جیسے کہ یہ بتایا کہ خالق میں ہوُں دُوسرا کوئی خالق نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ[3] (کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوا، روزی دیتا تم کو)

---

[1] الواقعہ آیت ۵۹

[2] واقعہ آیت ۶۳، ۶۴

[3] فاطر آیت ۳

اور لفظ پر لفظ نہیں لائے اگر اچھا ہوتا تو فرماتا ؛ یخلقکُمْ ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے خُوب وضاحت کر دی اور فرمایا کہ رزق کا خلق سے اقتران و اتصال ہے اور یہ دونوں قدرت کی طرف سے اسباب ہیں۔ اب متوکل نے یقین کر لیا کہ اللہ پر لازم نہیں تھا کہ وُہ اسے پیدا کرتا۔ مگر جب پیدا کر لیا تو اب اسے روزی دینا ذمہ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مروی ہے ؛

"کیا میں ایک مخلوق پیدا کروں گا اور اسے روزی نہ دوں گا ؟"

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ؛

"جس کو تو (اے اللہ) عطا کرے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس سے تو روکے اسے کوئی دینے والا نہیں۔ اور کوشش کرنے والے کو تجھ سے کوشش نفع مند نہیں ہو سکتی۔"

جب لوگوں کا یہ کہنا ہوا کہ ؛

"میری محنت اس طرح کی تھی اور میں نے ایسی محنت کی تو پھل نکلا اور ملا" یعنی مختلف انواعِ اسباب کو (اصل عطاء) بنا لیا۔ (تو آپ نے مندرجہ بالا کلماتِ مبارکہ سے ان کی نفی کی یعنی محنت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ دے رہا ہے) اور نماز میں اس کی نفی فرمائی اور اس ڈر سے کہ ان میں شرکِ خفی نہ آ جائے۔ انہیں سُنا کر یہ دُعا پڑھی اور گویا بتا یا کہ بندے کی محنت کچھ نہیں کر سکتی جب تک اللہ نہ عطا کرے۔ اللہ تعالےٰ نے بھی اس طرح فرمایا ؛

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ؕ[1] (گمان نہیں کرتی صحیح بات میں کچھ اللہ کو معلوم ہے)

بعض علماء کا بھی اس معنیٰ میں قول آتا ہے ؛

"جس نے طلب و تلاش میں محنت کی اور طمع کیا اور اے اللہ ! تیری طرف سے رکاوٹ ہُوئی تو اسے طلب و حرص میں اس کی محنت کچھ نفع نہ دے گی۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ؛

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ؕ[2] (مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور رکھتا ہے)

اس کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہُوئے فرمایا ؛

"عارفین کے دِلوں سے اسباب مٹا دیتا ہے اور قدرت ثبت کر دیتا ہے۔ غافلین کے دلوں سے مشاہدہ مٹا دیتا ہے اور ان کے دلوں میں اسباب کو ثبت کر دیتا ہے۔"

---

[1] یونس آیت ۳۶

[2] الرعد آیت ۳۹

یہ بھی فرمایا :

"اللہ تعالیٰ نے نفس متحرک حالت میں پیدا کیا۔ پھر اسے سکون اختیار کرنے کا حکم دیا اور یہی ابتلا ہے۔ اب اگر اس نے عصمت کے ساتھ تدارک کر لیا تو اسے سکون مل گیا اور یہ انعام خصوصی ہے اور اگر اپنی طبع و جبلت کے مطابق متحرک ہوا تو یہی ذلت و رسوائی ہے۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی :

"اپنا تمام لالچ اللہ کی طرف کر دے۔ اگر وہ چاہے تو تجھے عطا کرے اور چاہے تو روک دے۔ اس لیے کہ تیرا حیلہ تیری (قسمت کے معاملہ) میں اضافہ نہیں کر سکتا اور اللہ نے تیرے لیے جو طے کر دیا اس میں تو ہرگز کمی بھی نہ کر سکے گا۔"

اور اپنی پیدایش کے ساتھ اپنی روزی کے بارے میں بھی نصیحت حاصل کرو۔ اگر تجھ میں ہمت ہو کہ تو اپنے حیلہ سے اپنی پیدائش میں اضافہ کر سکتا تو تو اپنی روزی میں بھی اضافہ کر سکتا ورنہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی مخلوق کو پیدا فرمایا اور روزی تقسیم کی۔ اب تو ان دونوں میں سے کسی میں بھی ہرگز اضافہ نہیں کر سکتا۔

بعض بڑے بڑے جبار، توانا اور تیز آدمی ہوتے ہیں مگر ان کا فقر ہی بڑھتا جا رہا ہے۔ بعض بہت ہی عاجز، کمزور اور گئے گزرے ہوتے ہیں مگر ان کا مال بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اگر حیلہ سے کمی بیشی ہو سکتی تو ہر معاملہ میں توانا آدمی کمزور سے بڑھ جاتا، مگر اللہ ہی ہے جو پیدا کرتا اور روزی دیتا ہے اور کوئی بندہ ان میں سے کسی چیز کا کچھ بھی مالک نہیں۔

ایک بادشاہ نے اپنے زمانہ میں ایک حکیم سے پوچھا :

"یہ کیا بات ہے کہ عقلمند کو محروم اور احمق کو دولت مند دیکھتا ہوں ؟"

فرمایا :"صانع تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ اپنے آپ کی طرف رہنمائی کر دے۔ اب اگر ہر عاقل دولت مند ہو جاتا تو عقل میں یہ بات آتی کہ عاقل آدمی اپنے آپ کا خود روزی رسان ہے اور احمق نے اپنے آپ کو خود محروم رکھا۔ جب لوگوں نے اس کے برعکس معاملہ دیکھا تو جان گئے کہ صانع تعالیٰ ہی روزی رسان ہے۔

لوگوں کو بُرا مت کہو

اس مفہوم میں مطرفؒ کی حدیث میں آتا ہے جو کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ سے روایت ہے کہ ایک روز آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا :

"یاد رکھو اس مال کے عطا کرنے میں ایک فتنہ ہے اور اس کے روک رکھنے میں بھی ایک فتنہ (ابتلا) ہے۔

ایک آدمی اپنے چچیرے بھائی کے پاس صبح جاتا ہے اور ایسی حاجت کا سوال کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے لکھ دی۔ چنانچہ وہ اسے روکنے کا مالک نہیں۔ اب وہ اسے عطا کرتا ہے اور یہ آدمی اس کا تشکر کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی خوب تعریف کرتا ہے۔ پھر آئندہ سال اس کے پاس آ کر ایک حاجت کا سوال کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے

اس کے لیے نہیں لکھی اور وہ اسے دینے کا مالک نہیں جیسے کہ پہلے سال میں وہ اسے روکنے کا مالک نہ تھا۔ اب (اس سال) اسے روک لیتا ہے جو اس کے لیے نہیں لکھی گئی تو یہ آدمی واپس آکر اس پر ایک گناہ ڈالتا ہے اور اس کی مذمت و برائی بیان کرتا ہے حالانکہ اس مال کے ملنے میں اس کے لیے ایک ابتلاً ہے اور اس کے روکنے میں بھی ایک ابتلاً ہے۔"

اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ و لم آل۔ یعنی فتنہ سے مراد امتحان ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا اور اس کے ذریعہ اہل یقین کا خیر کے لیے اور غافلین کا یوں امتحان ہوتا ہے کہ دیکھیں اب کیسے عمل کریں گے۔

اہل یقین کا طریق یہ ہے کہ وہ اسباب سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور تسبب پر تعجب کرکے ایمان و ہدایت میں بلند تر درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں عطاء و منع میں معطی مانع واحد تعالیٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور شرعی احکامات میں حکمت ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اب ان کے لیے دو مقام ثابت ہیں:

۱۔ اس کا شکر

۲۔ اس پر صبر

اور غافلین میں اس سے اضطراب و پریشانی پیدا ہوتی ہے اور وہ اسباب اور ہاتھوں کی طرف نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ دینے والوں کی مدح کرتے ہیں اور نہ دینے والوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ناقص ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے دونوں جماعتوں کے لیے مال ایک آزمائش بن گیا۔ اس طرح ان کا ایمان کھل کر سامنے آتا ہے اور ان کے قلبی تقویٰ کا امتحان ہو جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"ایک بندہ رات کو کسی ایسے دنیاوی کام یعنی ایسی تجارت وغیرہ کا ارادہ کرتا ہے کہ اگر اسے کرلے تو اس میں اس کی بربادی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر سے اس کی طرف نظر فرماتا ہے اور اسے اس (کام) سے ہٹا دیتا ہے۔ اب صبح کو وہ پریشان و غمگین حالت میں ہوتا ہے۔ پڑوسی کے ساتھ بدفالی لیتا ہے۔ مجھ سے کون سبقت کر گیا؟ کس نے مجھے فریب دیا؟ مگر یہ سب اللہ کی رحمت ہے کہ اللہ نے ایسا کرکے اس پر رحم فرمایا۔

اخلاص کی ایک عجیب تشریح

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"یہ بات اخلاص کی ہے کہ اللہ کی عبادت کرنے پر تو لوگوں سے مدح سننا پسند نہ کرے۔ اور جو اللہ نے تجھے روزی عطا کی اس کی وجہ سے ان لوگوں کی مدح نہ کرے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے،

"یہ یقین کی بات ہے کہ اللہ تجھے جو کچھ عطا کرے تو اس پر کسی (آدمی) کی مدح نہ کرے اور اللہ تجھے جو نہ دے اس کی وجہ سے کسی کی مذمت نہ کرے۔"

اور فرمایا:

"صبر، نصف ایمان ہے اور شکر، نصف ایمان ہے۔ اور یقین، سارا ایمان ہے۔"

حدیثِ افک میں ہے۔ یہ معمر بن ابان نے حمران سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے عروۃ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

"میرے والدین میرے پاس کھڑے ہوئے اور انہوں نے مجھے بوسہ دیا۔ میں نے کہا: تم دونوں کی حمد کے بغیر، اور تمہارے صاحب کی حمد کے بغیر، میں اللہ کی حمد کرتی ہوں جس نے مجھے عزت بخشی اور میری برأت فرمائی۔"

ایک دوسری (سند کی) حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) کو فرمایا:

"اٹھو، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر بوسہ دو۔"

فرماتی ہیں کہ میں نے کہا:

"اللہ کی قسم! میں یہ نہیں کروں گی اور میں صرف اللہ کی حمد کرتی ہوں۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے ابوبکر، اسے رہنے دو۔"

چنانچہ لوگوں کے گزشتہ ذکر کردہ اقوال (اگر ایسا ہوتا، یہ کیوں ہوا! فلاں نے دیا، فلاں نے روکا وغیرہ ایسے اقوال) صفتِ یقین اور کمیٔ معرفت کے باعث ہوتے ہیں۔ اگر اس قسم کے اقوال انسان کے باطن میں سرایت کر کے راسخ ہو جائیں اور کثرت سے اس قسم کے اقوال و افعال سرزد ہونے لگیں تو وہ حقیقی ایمان کھو بیٹھتا ہے جیسے کہ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں۔ (لگا ہے ایسا ہوتا ہے کہ) "ایک آدمی گھر سے نکلتا ہے اور اس کے پاس اس کا ایمان بھی ہوتا ہے پھر گھر کو واپس آتا ہے تو اس کے پاس کچھ بھی ایمان نہیں ہوتا۔ اس آدمی سے ملاقات ہوئی جو اس کے کچھ بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں اس سے کہا، تو ایسا قابل اور لائق فائق ہے اور دوسرے سے ملا تو بھی ایسی ایسی باتیں کیں آخر گھر واپس آیا شاید اس سے حاصل کچھ نہ کیا ہو مگر اسی پر اللہ کو ناراض کر لیا۔"

تورات میں مروی ایک روایت کا مفہوم ایک بزرگؒ سے دریافت کیا گیا۔ روایت یہ ہے کہ:

"جس نے دولت کے سامنے تواضع وانکساری کی اس کا دو تہائی دین جاتا رہا" تو اس کی وضاحت کرتے ہُوئے فرمایا:

" اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان میں تین باتیں ہیں. عقد یعنی پختہ ارادہ کرنا۔ فعل اور قول ۔ اب جب اس نے دولت کے سامنے اس کی دولت کی وجہ سے انکساری و تواضع کی تو اس کی تعریف (قول) اور حرکت (فعل) کے باعث دو تہائی دین کھو بیٹھا اور عقد کا حصہ باقی رہ گیا۔ چنانچہ روزی میں واسطوں کو ان کے ثبوت کے باعث جَعل (بنانے) میں ابتدائیں قرار دیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسباب کے طور پر ظاہر فرمایا اور ان میں اپنا اظہار فرمایا" چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ [1] (تو کہہ، وفات دیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا، جو تم پر تعین ہے)

پھر اسے اٹھا کر اپنا آپ ظاہر فرمایا کہ:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا [2] (اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں، جب وقت ہو ان کے مرنے کا)

اسی طرح فرمایا:

اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ [3] (بھلا دیکھو تو جو بوتے ہو)

اس میں واسطوں کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا:

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا [4] (ہم نے ڈالا پانی اوپر سے پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر)

پھر وضاحت کی اور فرمایا:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا [5] (پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ)

اس کے بعد توحید کے بارے میں فرمایا:

فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا [6] (پھر پھونک دی ہم نے اس عورت میں اپنی رُوح)

اور نفخِ روح کرنے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے:

---

[1] السجدہ آیت ۱۱
[2] الزمر آیت ۴۲
[3] واقعہ آیت ۶۳
[4] عبس آیت ۲۵، ۲۶
[5] مریم آیت ۱۷
[6] انبیاء آیت ۹۱

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ [۱] (پھر جب ہم پڑھنے لگیں، تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے)

ہر چیز کا اللہ ہی مالک ہے

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس فرمان

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ (نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کہ اس کے ساتھ جلدی کرے) (یعنی جلدی نہ سیکھ لے)

اسی طرح فرمایا:

لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا [۲] (تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں)

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹا دیا۔ اب اپنا ذکر فرمایا اور انہیں اپنے رب تعالیٰ کا مشاہدہ حاصل تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا:

لِيَهَبَ لَكِ ۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ تجھے بیٹا دے۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول مروی ہے۔ فرمایا:

لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ [۳] (میرے اختیار میں نہیں مگر میری جان اور میرا بھائی)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَا اَخَاهُ [۴] (اور بخشا ہم نے اس کو اپنی مہر سے بھائی اس کا)

ورنہ حقیقی طور پر انہیں اپنی جان کی اور بھائی کی ملکیت حاصل نہیں تھی کیونکہ حقیقی مالک صرف خدا تعالیٰ ہے اور یہ دو وجوہ میں سے ایک توجیہ تھی کہ جب وَ اَخِیْ مقام نصب میں ہو اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ وَ اَخِیْ کو حالتِ رفعی میں تسلیم کیا جائے۔ اب معنی یہ ہو گا کہ

وَ اَخِیْ اَیْضًا لَا يَمْلِكُ اِلَّا نَفْسَهٗ ۔ (اور میرا بھائی بھی صرف اپنی جان کا مالک ہے کہ اسے پیش کر دے)

اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ وضاحت فرمائی:

اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (قتل کرو مشرکوں کو)

اور اسی طرح واسطہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ [۵] (لڑو ان سے تاکہ اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے)

---

[۱] قیامہ آیت ۱۸ [۲] مریم آیت ۱۹ [۳] مائدہ آیت ۲۵ [۴] مریم آیت ۵۳
[۵] توبہ آیت ۱۴۔

پھر توحید کا ذکر کیا اور فرمایا:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ [1] (سو تم نے انہیں نہیں مارا اور لیکن اللہ نے انہیں مارا)

اسباب ثابت کرتے اور حقائق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (اور تو نے نہیں پھینکی جب پھینکی اور لیکن اللہ نے پھینکی)

اور واسطوں کا ذکر کیا اور فرمایا:

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا [2] (پس تو تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے، یہی چاہتا ہے اللہ کہ انہیں ان چیزوں سے عذاب کرے)

اسی طرح فرمایا:

اَلَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (جس نے سکھایا قلم کے ساتھ)

پھر فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ (رحمٰن نے قرآن سکھایا)

اور فرمایا:

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ (اس کو بیان سکھایا)

فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ (بے شک ہمارے اوپر اس کا بیان ہے)

اور املاک ثابت کرنے اور انہیں عوض میں فروخت کرنے کے بارہ میں ارشاد ہے اور یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ [3] (بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کے جان اور اموال خرید لیے)

چنانچہ اب جس مال کی انہیں ملکیت دی گئی۔ یہ جائز ہوا کہ ملکیت ہو اور فروخت ہو۔ فرمایا:

---

[1] انفال آیت ۱۷

[2] توبۃ آیت ۵۵

[3] توبۃ آیت ۱۱۱

اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ[1] (مگر جن کو مالک ہوجائیں تمہارے ہاتھ)

اور عارفین کے نزدیک حقیقی فاعل صرف اللہ عزوجل ہی ہے۔ اس لیے کہ حقیقی فاعل وہ ہے جو کسی آلہ یا سبب سے مدد حاصل کیے بغیر جو چاہے کر سکے اور وہ اللہ ہی ہے۔

عارفینؒ فرماتے ہیں کہ دو فاعلوں سے ایک فعل سرزد نہیں ہوتا ورنہ یہ شرک ہوجائے گا۔ اس لیے کہ دوسرا فاعل جو کہ فعل کا مظہر ہے۔ اس کے ہاتھ پر فعل ظاہر ہُوا۔ اس کے واسطہ سے فعل جاری ہوا۔ یہ حادث ہے اور پہلا فاعل قدیم ہے اور وہی (پہلا فاعل) ہی حقیقی فاعل ہے۔ جیسے کہ ان کے نزدیک حقیقی مالک ہی ہر چیز کا خالق ہے اور جو اس کے قبضہ میں ہے وہ مُلک ہے۔ اس لیے کہ جو اس کے ہاتھ میں ہے وہ اس نے پیدا نہیں کیا۔ جیسے کہ اس کے ہاتھ پر جاری ہونے والا فعل، مفعول ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی اوّل، قیوم بنفسہٖ ہے وہ دوسرے کی استعانت کا محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیدائش اور زندگی کے لیے اپنی حکمت و عزت کے ساتھ واسطہ بنایا اور وہ ہی ملک الارحام (فرشتہ ارحام) ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"وہ رحم میں داخل ہوکر نطفہ کو ہاتھ میں لیتا ہے پھر اسے ایک بدن میں بدل دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے: اے پروردگار! مذکر ہے یا مونث؟، سیدھا ہے یا ٹیڑھے (راہ) پر؟ پھر اللہ جو چاہتا ہے فرماتا ہے اور فرشتہ صورت گری کرتا ہے۔"

دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

"فرشتہ تخلیق (بواسطہ) کرتا ہے۔ پھر اس میں رُوح پھونکی جاتی ہے شقاوت کے یا سعادت کے ساتھ۔"

بتاتے ہیں جس فرشتہ کو رُوح کہا جاتا ہے وہی اجساد میں ارواح داخل کرنے پر مامور ہوتا ہے اور بتاتے ہیں کہ وہ اپنے خاص انداز پر سانس لیتا ہے اور اس کا ہر سانس رُوح بن کر جسم میں داخل ہوجاتا ہے اس لیے اس فرشتہ کو رُوح کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف کرتے ہُوئے فرمایا:

اَلۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ ۔ (پیدا کرنے والا، تصویر بنانے والا)

پھر فرمایا:

اَلۡخَالِقُ ۔ (پیدا کرنے والا)

---

[1] النساء آیت ۲۴

اور فرمایا:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ۔ (موت اور زندگی کو پیدا کیا)

اور زندوں کے لیے واسطے بنائے جیسے کہ موت کے لیے واسطہ بنایا یعنی اسرافیل علیہ السلام اس پر مامور ہیں۔ وہ دوبارہ صور پھونکیں گے تو ہر مرا ہوا زندہ ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا:

یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ[1] (جس دن پھونکیں گے صور میں)

اور اپنے آپ کی یہ توصیف فرمائی کہ "میں ہی زندہ کرنے والا مارنے والا ہوں"۔

بعض روایات میں ہے کہ موت کے فرشتے اور زندگی کے فرشتے کا مناظرہ ہوا۔

فرشتۂ موت نے کہا:

"میں زندوں کو مارتا ہوں"۔

اور فرشتۂ زندگی نے جواب دیا:

"میں ہر مُردہ کو زندہ کرتا ہوں"۔

آخر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف وحی فرمائی:

"تم دونوں اپنے اپنے کام پر لگے رہو، میں نے کوئی صنعت تمہارے قبضہ میں نہیں دی بلکہ میں ہی مارنے والا اور میں ہی زندہ کرنے والا ہوں۔ میرے سوا نہ کوئی مارنے والا ہے اور نہ کوئی زندہ کرنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ سے یہ بھی منقول ہے:

"میں خود ہی اپنے آپ پر رہنما ہوں اور مجھ سے زیادہ مجھ پر کوئی زیادہ رہنمائی کرنے والا نہیں"۔ اور ان واسطوں کے وجود نے اس کو ممتنع نہیں کیا کہ ہر چیز میں اللہ سبحانہ اول ہو اور ہر چیز کا وہی تنہا فاعل ہو۔ کسی چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں اور کسی مسلمان کا یہ قول نہیں ملتا کہ "فرشتے نے مجھے پیدا کیا" اور نہ کسی نے یہ کہا کہ "مجھے عزرائیل نے مارا" اور "مجھے اسرافیل نے زندہ کیا"۔ اس طرح ایک صاحبِ یقین موحد کو یوں نہیں کہنا چاہیے کہ "فلاں نے مجھے عطا کیا اور فلاں نے مجھ سے روکا"۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ "فلاں نے مجھے روزی دی" اور "فلاں کو مجھ پر قدرت ہوئی"۔ اگرچہ واسطہ وہی بنا ہو اور اس کے ہاتھوں پر یہ فعل جاری ہو رہا ہو، اس لیے کہ عطا ہی رزق ہے اور منع ہی قدرت ہے اور اسماءِ الٰہی میں ان کے نزدیک غیر اللہ کو شریک نہیں کرتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی عطا کرنے والا، روکنے والا اور نافع و ضار ہے جیسے کہ

---

[1] طٰہٰ آیت ۱۰۲

وہی مارنے اور زندہ کرنے والا ہے۔ اس کی ملکیت میں کوئی شریک نہیں۔ پیدا کرنے اور روزی دینے میں مخلوق میں سے کوئی اس کا مددگار نہیں۔ عارفین کے نزدیک ایسا سمجھنا، توحید میں کمی کی علامت ہے اور یہ شرک خفی ہے جیسے کہ روایت میں ہے:

"میری اُمت میں شرک، اندھیری رات میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے"۔

واسطوں کو بھلا دو

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ [1] (اور یقین نہیں لاتے بہت لوگ اللہ پر، مگر ساتھ شریک بھی کرتے ہیں)

اس کا مفہوم واضح کرتے ہوئے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"اقرار کے ساتھ ایمان لانے والا کہ اللہ ہی تقدیر و تدبیر کا مالک ہے اور اسباب پر اعتماد کرنا اور اسباب کی طرف افعال لوٹانے میں شرک پایا جاتا ہے اور یہ مشرک کا کام ہے اور لا الٰہ الا اللہ اخلاص کے ساتھ پڑھنے والا وہ ہے جو یوں سمجھے کہ "اللہ کے بغیر کوئی دینے والا اور روکنے والا نہیں"۔ "اللہ کے بغیر کوئی ہدایت دینے والا اور گمراہ کرنے والا نہیں"۔ عارفین کے نزدیک یہ ایک ہی انداز اور ایک ہی مشاہدہ میں ہوتا ہے کہ (لا الٰہ الا اللہ، لا معطی و لا مانع ولا ھادی و لا مضل الا اللہ یعنی اللہ کے بغیر کوئی دینے والا، کوئی روکنے والا، کوئی ہدایت دینے والا اور کوئی گمراہ کرنے والا نہیں) اور یہ اقرار ابتدائے توحید ہے اور اگر کہیں ہادی، مضل، معطی اور مانع کہا گیا تو وہ خدا کے اذن اور مشیت و حکم کے بعد ہی کہا گیا جیسے کہ فرمایا:

اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ [1] (سب سے بہتر بنانے والا)

خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ [2] (بہتر روزی دینے والا)

اس لیے کہ اسی نے انہیں پیدا کیا۔ ان کی تخلیق کو پیدا کیا۔ اس نے انہیں روزی دی اور ان کے رزق کی روزی دی۔ اسی طرح اللہ نے انہیں ہدایت دی اور ان کے ذریعہ ہدایت دی۔ انہیں گمراہ کیا اور ان کے ذریعہ گمراہ کیا۔ اس کی ہدایت کے ساتھ انہیں ہدایت دی اور اس کو گمراہ کرنے سے وہ اس کے ارادہ کے بعد گمراہ ہوئے جیسے کہ اس کے پیدا کرنے سے وہ پیدا ہوئے اور اس کے روزی دینے سے انہیں روزی ملی۔ دیکھیے اس آیت کی گزشتہ تفسیر پر غور کریں۔

---

[1] المنون آیت ۱۴
[2] مائدہ آیت ۱۱۴

وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ[1] (اور جب تو بناتا ہے مٹی سے، جانور کی صورت میرے حکم سے)

اور فرمایا:

لَوْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ[2] (اگر راہ پر لاتا ہم کو اللہ، البتہ ہم تم کو راہ پر لاتے)

اسی طرح فرمایا:

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ[3] (پھر ہم نے تم کو گمراہ کیا ہم تھے آپ گمراہ)

چنانچہ مشاہدہ کے ذریعہ بندہ شرک خفی سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور یہ بات اس حقیقی لا الہ الا اللہ کا قول ہے۔ یعنی تصدیق کے بعد حقیقی اقرار یہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس نے قلبی طور پر اللہ کو خدا مانا اور اس کی عبادت کی، اس کی خدائی کو تسلیم کیا اور اقرار کیا کہ اللہ کے بغیر کوئی خدا نہیں۔ پھر یہ الفاظ زبان سے نکالے کہ لا شریک لہٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) یعنی وہ اپنی قدرت و وحدت میں تنہا ہے۔ اس کی سلطنت میں کوئی مخلوق اس کی شریک نہیں۔ پھر پکی بات کی اور کہا:

لَهُ الْمُلْكُ۔ یعنی تمام موجودات اسی کی ملکیت ہیں۔

وَ لَهُ الْحَمْدُ۔ یعنی ہر عطاء و منع میں ساری حمد کا مقدار وہی اللہ ہی ہے اور غیر اللہ اس کا مستحق نہیں۔

اور هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

یعنی خلق و امر پر قادر ہے۔ تمام قدرت کا مالک اور ساری مخلوق اسی کی ہے۔ اپنی مخلوق کو جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور واسطوں کی مثال ایسے ہے جیسے کہ صانع کے ہاتھ میں آلہ ہوتا ہے۔

دیکھو، یہ نہیں کہا کرتے کہ رانپی نے جوتا بنایا اور نہ یہ کہتے ہیں کہ کوڑے نے آدمی کو مارا بلکہ کہا کرتے ہیں کہ موچی نے جوتا بنایا اور فلاں نے کوڑے کے ساتھ آدمی کو مارا۔ اگرچہ یہ افعال کے براہ راست واسطے ہیں مگر صانع کے ہاتھوں میں یہ آلات ہیں۔

اس طرح مخلوقات، ظاہر میں اسباب کا سامنا کرتی ہے اور ......

وَ اللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ[4] (اور اللہ نے ان کے گرد سے گھیر لیا ہے)

اور وہ لطیف قدرت اور محض مشیت کے ساتھ قادر و فاعل ہے۔ دیکھیے لوگ کہا کرتے ہیں۔

---

[1] مائدہ آیت ۱۱۰
[2] ابراہیم آیت ۲۱
[3] الصّٰفّٰت آیت ۳۲
[4] البروج آیت ۲۰

"امیر نے مجھے یہ دیا، اس نے مجھ کو یہ خلعت دیا" چاہے امیر نے اپنے ہاتھوں سے نہ دیا ہو بلکہ ملازم کے ہاتھ سے دیا ہو۔ اب یہ بات مناسب نہ ہوگی کہ یوں کہا جائے کہ امیر کے نوکر نے یہ عطا کیا۔ اس لیے کہ یہ فعل اس کے ہاتھوں پہ جاری ہوا اور عطاء کا براہِ راست تعلق اس سے تھا کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ نوکر نہ کسی چیز کا مالک ہے اور امیر کی اجازت کے بغیر وہ اس کی مملوکہ اشیاء میں تصرف کرنے کا بھی مجاز نہیں۔ ہاں اگر کوئی یہ پوچھے کہ امیر نے کس کے ہاتھ مجھے یہ چیز بھیجی یا عطیہ کس کے ذریعہ دیا؟ اب سائل لانے والے (مامور بندے) کے بارے میں پوچھ رہا ہے تو اس صورت میں جائز ہے کہ کہہ دے کہ "فلاں نوکر کے ہاتھ بھیجا۔" اور اگر ایسا نہ ہو اور فقط عطیہ کا اظہار مقصود ہو اور یہ کہا کہ "امیر نے مجھے فلاں بندے کے ذریعے دیا" تو یہ کلام لغو ہے کیونکہ بادشاہ کے ساتھ ساتھ مامور بندے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اس لیے کہ مقصود، بادشاہ سے عطیہ ملنے کا اظہار ہے۔ اب جس بندے کے ہاتھوں دیا اس کا ذکر کرنا بے معنی اور لغو حرکت ہے خوب سمجھ لو۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو کھجور دی اور فرمایا:

"اسے لے لو، اگر تو اس کے پاس نہ آتا تو یہ تیرے پاس آتی۔"

حالانکہ کھجور خود چل کر نہیں آیا کرتی مگر پھر بھی یہ نہیں فرمایا کہ ایک آدمی اس کو لے کر تیرے پاس آتا۔" اس لیے کہ اس کی ضرورت نہ تھی۔

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو فرمایا جس نے کہا تھا:

"میں اللہ کی طرف رجوع کر کے آتا ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (رجوع) کر کے نہیں آتا" تو فرمایا:

"اس نے حق کو پہچان لیا۔"

اور اللہ تعالیٰ نے اسباب کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ اسباب کا تعلق ان کے ساتھ ہے اور ثواب و عذاب کے احکام اسباب پر ہی لوٹ کر آتے ہیں۔ اس لیے ان کا تذکرہ غیر مناسب نہ ہوا ورنہ تو احکام اللہ تعالیٰ پر لوٹ آتے۔ اس سے فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ [1] (بیشک وہی کرے پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ)

یعنی حاکم سے احکام آتے ہیں اور وہ انہیں محکوم پہ نافذ کرتا ہے۔ چنانچہ مُردوں اور زندوں سے اظہارِ امکان

---

[1] البروج آیت ۱۳۔

کا باعث یہی ہے تاکہ اللہ جو حاکم ہے وہ محکوم نہ ہو جائے۔ (اس پر حکم نہ لوٹے) وہ مامور نہ ہو جائے حالانکہ وہ غالب و آمر ہے۔ اس طرح یہ احکام محکومات و ماموارت پر آئے۔

اسی سے فرمانِ الٰہی ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ[1] (جو تم کے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وُہ رہتا ہے)

چنانچہ سب اس کے پاس اور اس کے خزانہ میں ہیں۔ البتہ اس نے ہماری طرف دینا کی نسبت اس لیے کی تاکہ ہم پر اس کے احکام آئیں اور ہمیں اس میں زاہد بنائے اور آخرت کی نسبت اپنی طرف اس کی خصوصیت و فضیلت کے باعث کی تاکہ ہمیں اس کا راغب بنائے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام سے خبر دی۔ فرمایا:

اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ[2] (جب تو بناتا ہے مٹی سے)

اور اسی طرح فرمایا:

وَ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا[3] (اور ان کو اس میں کھلاؤ)

چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خالق (پیدا کرنے والے) کا نام دیا۔ اس لیے کہ ان کے ہاتھ پر اللہ نے پیدا فرمایا اور انہیں رازق کا نام دیا۔ اس لیے ان کی روزیاں ان کے ہاتھوں پر جاری کیں۔ میرے نزدیک اس کی مثال قرآن مجید میں یوں آتی ہے۔ فرمایا:

وَ هُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا[4] (اور ہلا اپنی طرف سے کھجور کی جڑ، اس سے گریں گی تجھ پر پکی کھجوریں)

اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ حضرت مریمؑ کے ہلانے سے کھجوریں نہیں گر سکتی تھیں۔ یعنی کھجوریں گرانے میں ان کا جَعل اور فعل کارگر نہ تھا بلکہ اللہ تعالٰی نے ان کے ہاتھ ان کا شرف ظاہر فرمایا اور ان کے ہاتھ کو کھجوریں گرانے کا آلہ قرار دیا۔

اسی طرح ایک فرمان ہے:

---

[1] النحل آیت ۹۶ [2] مائدہ آیت ۱۱۰

[3] النساء آیت ۵

[4] مریم آیت ۲۵

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ [1] (لات مار اپنے پاؤں سے، یہ چشمہ نکلا نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو)

چنانچہ دو چشمے نکلے۔ ایک سے پیا اور دوسرے میں غسل کیا مگر دونوں چشموں کو جاری کرنے میں ان کے پاؤں کے فعل کو دخل نہ تھا۔

لبید (شاعر) نے غیر اللہ کی نفی کی اور کہا ؎

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ

(یاد رکھو، اللہ کے سوا ہر چیز فانی و باطل ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ پڑھا تو فرمایا:

"سچ کہا اس نے"۔ (لبید نے)

اور دوسرے الفاظ یوں مروی ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا:

"سچا ترین شعر وہ ہے جو شاعر نے کہا ؎

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ"

(یاد رکھو، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ اشیاء میں واسطے اور اسباب کا ہونا حق ہے۔ اس کے باوجود آپؐ نے فرمایا:

"سچا ترین شعر وہ ہے جو شاعر نے کہا"

یہ دراصل توحید کو واضح کرنے اور واحد تعالیٰ کی توحید بیان کرنے کے لیے فرمایا۔ آپ نے یہ فرمایا حالانکہ آپ کا عہد تکذیبِ انبیاء و ابطال کتب (سماوی) کے قریب کا دور تھا مگر جب اشیاء معدوم ہونے کے بعد موجود ہوئیں اور موجود ہونے کے بعد پھر فنا ہوں گی تو ایسی چیز کو باطل سے تشبیہ دی۔ جس کی ابتداء میں کچھ حقیقت نہ تھی اور انجام میں اس کا کچھ نشان نہ ہوگا بلکہ اللہ ہی اول و آخر ہے وہی ازل و ابدی ہے۔ وہی حق ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا ان صفات کا مالک نہیں۔ سبب تعالیٰ اور اول کریم کے ساتھ ساتھ اسباب و اواسط کا بھی ذکر اس طرح ہے جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ مثلاً

"اللہ نے یوں فرمایا"۔ اور "نوح علیہ السلام نے یوں کہا"۔ اور "یوسفؑ نے یوں کہا"۔ یہ تمام

---

[1] ص آیت ۴۲

جملے درست ہیں۔ جب تم یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ قائل اوّل اور تمام کہنے والوں سے پہلا کہنے والا اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے وصف کے ساتھ متکلم اور اپنے علم کی خبر دے رہا ہے۔ یہ وقتِ خاص میں بند نہیں۔ یہ محدود اور حادث نہیں اور اگر تم یوں کہو کہ "صالحؑ نے فرمایا"، "شعیبؑ نے فرمایا" تو یہ واسطے ہیں۔ تو انہوں نے ظہورِ اسباب اور حدوثِ اوقات کے ساتھ کلام کیا۔ اس طرح واسطوں میں اسباب کا معاملہ ہے کہ یہ اول و مبدی تعالیٰ سے دوسرے یعنی ثانوی ہیں۔

اس سے اہلِ بدعت پر شبہ ہوا اور وہ خلقِ قرآن کے قائل ہو گئے۔ اگر ان پر یہ شبہ نہ آتا۔ چنانچہ اللہ احکم الحاکمین کے قول سے پہلے قولِ قائلین بنایا اور قِیلاً کو قولِ الٰہی سے پہلے ثابت کیا اور وہ ان سے قول ہے۔ اس لیے کہ قدمِ کلام کی انہوں نے نفی کر دی۔ چنانچہ جس غلطی سے بھاگے تھے اس سے بڑی جہالت میں جا گرے۔ وہ لوگ اپنے گمان کے مطابق، ایک دوسرا قدیم ثابت کرنے سے دُور ہوئے۔ چنانچہ پہلے حادث ثابت کرنے میں اور دوسرے قدیم کو حادث بنانے میں گر پڑے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند تر ہے۔ جو ظالم لوگ کہتے ہیں وہ پاک ہے۔ صبح و شام اس کی پاکیزگی ہے اور جہالت کے باعث وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ان لوگوں کا قول، قولِ الٰہی کے بعد کا ہے۔ اب ان کا قول اس تعالیٰ کے قول سے ہوا اور قول میں وہی سبحانہٗ تعالیٰ ہوا۔ اس طرح کہ وُہ قِدم میں اور سابق علم میں وہ ہی اول ہے اور یہ (قائلین) قول میں ثانی بن گئے۔ اس طرح کہ یہ افعال سے حادث ہیں اس طرح ضعفِ یقین کے باعث غافلین پر شبہ آیا۔ اس لیے کہ آغازِ فعل میں مانعین اور خرچ کرنے والوں کو دیکھا۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں پر منع و عطاء کا معاملہ ظاہر فرمایا۔ اب انہوں نے اپنی توحید میں کمی کے باعث روکنے والوں اور عطاء کرنے والوں پر نظر کی۔ اور انہیں اسماءِ الٰہی میں شریک کر لیا جیسے کہ اہلِ بدعت نے صفاتِ الٰہی میں شرک کیا کہ اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی کے مشاہدہ سے ان پر حجاب پڑ گیا جیسے کہ اہلِ زیغ پر توحیدِ الٰہی کی حقیقت سے حجاب پڑا۔ البتہ اہلِ زیغ کا شرک ایسی گمراہی ہے کہ وہ ملت میں پھیل جاتی ہے اور یہ شرکِ جلی ہے اور کمزور یقین والوں کا شرک، غفلت و جہالت ہے۔ وہ ملت سے انہیں خارج نہیں کرتا اس لیے کہ یہ شرکِ خفی ہے۔

بتاتے ہیں کہ ایک عالمؒ نے ایک آدمی کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب امام فارغ ہوا تو ان کو کمانے والے لباس میں دیکھا اور کہا:

"اے شیخ! آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟"

انہوں نے فرمایا:

"ٹھہرو، میں اپنی نماز دُہراؤں جو تیرے پیچھے پڑھی۔ پھر جواب دوں گا۔"

اسی مفہوم میں ایک دوسرا واقعہ منقول ہے کہ ایک صاحب مسجد میں معتکف ہو گئے اور ان کا ذریعہ معاش معلوم نہ تھا۔ لوگوں کو نماز پڑھانے والے امام نے پوچھا:

"اگر تو کمائے اور پھر زندگی گزارے تو یہ تیرے لیے افضل ہے۔"

انہوں نے جواب نہ دیا۔ اس نے دُوسرے وقت میں دوبارہ یہی کہا تو فرمانے لگے:

"مسجد کے پڑوس میں ایک یہودی نے روزانہ مجھے دو روٹی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مقدار پر قناعت کر لی اور کاروبار چھوڑ دیا۔"

امام نے کہا:

"اگر وہ اپنے وعدے میں سچا ہے تو مسجد میں تمہارا ٹھہرنا، تمہارے لیے بہتر ہے۔"

اس آدمی نے کہا:

"اے خدا کے بندے! اگر تو لوگوں کا امام نہ بنے اور لوگوں کے اور خدا تعالیٰ کے درمیان (امامت کا واسطہ) نہ اختیار کرے۔ اس لیے کہ تیری توحید ناقص ہے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے۔"

نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ ہے

مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک صدیق کو وحی فرمائی: "میری خاطر لطیف فطانت اور مخفی لطف حاصل کر اس لیے کہ میں ان دونوں کو پسند کرتا ہوں۔"

انہوں نے عرض کیا:

"اے اللہ! لطیف فطانت کیا ہے؟"

فرمایا: "اگر تیرے اوپر مکھی گرے تو جان لے کہ میں نے اسے گرایا۔ اب مجھ سے دُعا کر کہ اسے ہٹا دوں۔"

عرض کیا گیا:

"اور مخفی لطف کیا ہے؟"

فرمایا: "اگر تیرے پاس گھن لگا لوبیا آئے تو یاد رکھ کہ میں نے تجھے یاد کیا۔"

ہم نے جو ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی عطا کرنے والا، روکنے والا، نافع اور ضار ہے۔ اسی طرح وُہ ہی خالق و رازق ہے۔ جیسے چاہے، جب چاہے اور جس کو چاہے پیدا کرے اور روزی دے۔ یہ عام مومنین کے عقد و علم میں ہے مگر ان میں حکمت سے جہالت اور عالم سے غفلت بھی پائی جاتی ہے۔ وُہ اسے اپنی عادات کی جانب لے جاتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ انہیں عام اپنی مروّج عادات پر ہی روزی ملے یا ان کی اپنے پسندیدہ ذرائع اور سمجھ میں آنے والی راہوں کے ذریعہ عقلی لحاظ سے روزی ملے اور فخر و غرور، طویل امیدی اور الفت کے

انداز پر روزی حاصل ہو۔ ذلت و انکساری اور فقر و مسکنت کے انداز پر روزی حاصل کرنا پسند نہیں کرتے اور یہ لوگ اپنے تمام امور کو اللہ ہی کے سپرد نہیں کرتے اور نہ اس کی تدبیر و تقدیر پر کامل رضا مندی دکھاتے ہیں کہ وہی انہیں روزی دے۔ جیسے چاہے دے اور جس ذریعہ سے چاہے دے، چنانچہ یہ (عوام مومنین) مشاہدۂ یقین سے بُعد کے باعث اور ان پر نفسانی اخلاق کے تسلط ہوجانے کے بعد، ان عام مومنین کے اخلاق پر جابروں کا اخلاق اور طور طریقہ غالب آگیا۔

واسطہ کی مدح و مذمت چھوڑ دو

وہ جانتے بھی ہیں کہ تمام مخلوق اور زمین کا مالک صرف اللہ ہی ہے اور اسی ہی کی حمد و سلطنت ہے۔ پھر بھی (عوام کا) یہ طریقہ ہے کہ وہ غیر اللہ میں لالچ رکھتے اور غیر اللہ سے امیدیں باندھتے ہیں۔ گاہے ثقیل حقائق کے موقع پر انہیں پریشانی ہو جاتی ہے اور اطمینانِ قلب نہیں رہتا بلکہ مصائب و فاقے آنے پر ان پر شدید قلق و اضطراب چھا جاتا ہے اور خالق تعالیٰ کی خاطر صبر سے کام نہیں لیتے۔ اسباب دیکھنے سے گاہے ان کی زبانوں پر مدح و فرحت جاری ہو جاتی ہے اور نہ ملنے پر ان کی زبانیں مذمت اور غم سے بھر جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں علم کا مشاہدہ نہیں ہوتا اور غفلت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ بات ان کے ضعفِ یقین اور نقصِ توحید کی دلیل ہے اور ان کی معرفت صرف سمع و خبر کی معرفت ہے اور مشاہدہ و خبر کی معرفت انہیں حاصل نہیں۔ اہلِ یقین نے اسے علم و قدرت میں اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کرلیا۔ حکمت کے جاری ہونے اور مخلوق پر ثواب و عقاب آنے کے لیے اسباب و واسطہ کو ثابت کیا مگر عوام نے اس میں شرک کیا اور اہل یقین نے حسنِ یقین، قوتِ مشاہدہ، صبرِ جمیل اور حقیقت رضا کی برکت سے بلند تر درجہ حاصل کیا۔ چنانچہ انہیں قلبی سکون حاصل ہُوا اور ان کے نفوس مطمئن ہو گئے جبکہ ان پر آفات و مصائب آئیں اور ابتلاء میں ڈالنے والے کے مشاہدہ کے باعث، ابتلا میں ثابت قدم رہے۔ وُہ خوب سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جیسے چاہے تدبیر فرماتا ہے انہیں یقین میں ایک مقام حاصل ہُوا اور توکل کا حال مل گیا۔ رضا سے بہرہ ور ہُوئے اور ان مفاہیم کے حقائق سے بہ نکل کر ان کے علوم میں داخل ہُوئے اور عوام مومنین کا حال یہ ہے کہ فرضی توکل میں وُہ بھی اہلِ یقین کے ساتھ ہیں مگر اہل یقین عوام سے آگے بڑھ کر بلندی و رفعت پر جا پہنچے اور شرف و فضیلت حاصل کی۔ عوام مومنین وہیں (فرضی توکل) پر ٹھہرے رہے۔ ضعفِ یقین اور حجاباتِ اسباب کے باعث وہ بلندی تک رسائی نہ پا سکے اور مقربین نے بڑھ کر شرف حاصل کرلیا۔

وَ یُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ [1] (اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی)

[1] ہود آیت ۳

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ[1] (وہ لوگ کئی درجے ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتے ہیں)

ایک عالمؒ فرماتے ہیں،

"عوام پر تو اسباب کا حجاب پڑ گیا اور اسباب پر اس تعالیٰ نے خواص کے سامنے اپنا آپ سامنے کر کے حجاب ڈال دیا۔ اب وہ اسباب کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔"

حضرت سری سقطیؒ سے منقول ہے۔ فرمایا،

"تین کے ساتھ یقین ظاہر ہوتا ہے،

۱۔ مقاماتِ ہلاکت میں حق پر قائم رہنا۔

۲۔ آفات آنے پر خدا تعالیٰ کے امر کو تسلیم کر لینا۔

۳۔ نعمت جانے پر قضاء پر راضی رہنا۔"

ان سے پہلے یوسفؒ بن اسباط کا فرمان ہے،

"جس میں تین باتیں پائی گئیں اس کا ایمان کامل ہو گیا،

۱۔ جب خوش ہو تو اس کی خوشی اسے باطل کی طرف نہ لے جائے۔

۲۔ جب غضبناک ہو تو اس کا غضب اسے حق سے نہ ہٹا دے۔

۳۔ جب اسے قدرت و شوکت حاصل ہو تو جو چیز اس کی نہیں اس پر قبضہ نہ جما بیٹھے۔"

کاروبار اور تصرف ممنوع نہیں

اگر توکل صحیح ہو تو کاروبار کرنا اور تصرف کرنا کچھ نقصان دہ نہیں۔ ایسا کرنے سے نہ اس کے مقام میں کمی آتی ہے اور نہ ہی اس کے حال میں نقص واقع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا[2]

(اور بنا دیا ہم نے دن روزگار کو)

ایک جگہ فرمایا،

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ[3]

(اور بنا دیں اس میں تم کو روزیاں، تم تھوڑا شکر کرتے ہو)

---

[1] آل عمران آیت ۱۶۳

[2] النبا آیت ۱۱

[3] اعراف آیت ۱۰

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

" سب سے حلال (کھانا) وُہ ہے جو بندہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتا ہے اور ہر بیع (کاروبار) درست ہے۔ (یعنی گناہ نہیں ہے)

سلفؒ کے نزدیک تاجر سے دست کار زیادہ محبوب تھا اور ان کے نزدیک ایک تاجر ایک بے کار آدمی سے زیادہ محبوب تھا۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں :

" میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بالکل بے کار ہو۔ نہ دنیا کے کام میں لگے اور نہ ہی آخرت کے کام میں ہو"

مزید برآں توکل ایمان کی شرط ہے اور اسلام کا وصف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ [1] (اگر تم یقین لائے ہو اللہ پر تو اس پر بھروسہ کرو اگر ہو فرمانبردار)

چنانچہ خدا پر ایمان رکھنے اور اس پر اسلام لانے میں اس پر توکل کرنے کو شرط ٹھہرایا اور اگر متوکل کا حال ایسا ہو کہ جو آئے اس میں تصرف کرے، اسباب میں داخل ہے مگر اپنے تصرف میں مسبب الاسباب پر نظر رکھتا ہے اس پر اعتماد کرتا ہے۔ ہر حرکت میں اس پر وثوق کیے ہے۔ مولائے کریم جو اس کے سامنے لاتا ہے اس میں رہ رہا ہے اور اس تعالیٰ کی جانب توجہ کیے ہوئے، خوب سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق میں یہ تمام منافع ڈالے ہیں اور اس نے انہیں اپنی حکمت کے خزانے بنایا۔ اس نے انہیں روزی کی کنجیاں بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ (کاروبار میں) سنت و آثارِ سلف پر چل رہا ہو۔ عیاشی اور تنعم سے بچتا ہو تو ایسے آدمی کے لیے کاروبار اس حالت سے بہتر ہے کہ اس کے توکل میں کوئی خرابی آجائے اور پھر معاملہ بگڑ جائے۔

ایک عالمؒ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ پاؤں کے ساتھ آٹا پیستے تھے۔ حالانکہ چالیس برس تک انہوں نے کاروبار چھوڑے رکھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ :

" آپ نے کاروبار چھوڑ دیا تھا پھر اس میں کیوں داخل ہوئے ؟"

تو فرمایا :

" اے بندۂ خدا ! جب ہم نے توکل کی عزت دیکھی تو ہم نے لوگوں کے مال پر نظر رکھنے کی ذلت پر صبر نہ کیا"

چنانچہ جو کسب میں جو بھی آفات میں مبتلا ہو جائے اور اسے کاروبار سے منقطع کر دے تو وہ کاروبار سے

---

[1] یونس آیت ۸۴ -

کنارہ کش ہو جائے۔ الغرض لوگوں کے مال پر نظر رکھنے اور مانگنے کی عادت ڈالنے سے بہتر یہ ہے کہ کاروبار کرے اور جو آدمی کسی راہ پر چلتا ہے تو وہ پہنچ ہی جاتا ہے چاہے اس کی راہ کس قدر طویل ہو اور جس آدمی پر توکل ایسا چھا جائے کہ اسے وکیل تعالیٰ پر نظر رکھ کر بٹھا ہی دے۔ اس کا قلب مخلوق سے فارغ اور خالق تعالیٰ کا شاغل ہو تو اس کے لیے توکل افضل ہے اور یہ قریب راہ ہے۔ ایسا آدمی مقرب ہے اور مخلوق کے مال میں طمع رکھ کر نفس کی عیاشی اور مانگنے کے خیال سے اور خواہشِ نفس کی تابعداری کرتے ہوئے ترکِ کسب کرنے والا طریقِ تصوف پر چلنے والا نہیں۔ یہ راہ نہ قریب ہے اور نہ دور۔ بلکہ وہ سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ

"تم میں کا ایک آدمی اپنا کلہاڑا اور رسی لے اور پہاڑ میں جا کر لکڑیاں کاٹ لائے (اور بیچ کر) کھائے اور صدقہ کرے۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگے اور وہ اسے دیں یا نہ دیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں سے استغناء حاصل کرو چاہے مسواک چاب کر ہی ہو سکے۔"

اور فرمایا:

"جو میرے لیے ایک خصلت کی ضمانت دے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ لوگوں سے نہ مانگے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جو کاروبار پر انکار کرے اس نے سنت پر طعن کیا اور جس نے کاروبار سے ہٹ کر بیٹھ جانے پر انکار کیا تو اس نے توحید پر طعن کیا۔"

اور فرمایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخلوق کی طرف بھیجا گیا اور لوگوں کی کئی اقسام ہیں جیسے کہ آجکل وہ ہیں ان میں بعض تاجر ہیں، بعض صنعت کار اور بعض کاروبار سے الگ ہو کر رہنے والے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں سے مانگتے ہیں اور بعض لوگوں سے نہیں مانگتے۔ چنانچہ آپؐ نے کسی تاجر سے یہ نہیں فرمایا کہ تجارت چھوڑ دو اور نہ کاروبار سے الگ ہونے والے کو کاروبار کرنے کا حکم دیا بلکہ ان کے احوال میں ہی انہیں ایمان و یقین کی دعوت دی اور انہیں تدبیر میں خدا کے ساتھ چھوڑ دیا۔ چنانچہ ہر آدمی نے اپنے اپنے حال میں عمل کیا۔

ایک متوکل فرماتے ہیں:

"جو آدمی تین روز تک بھوک پر صبر نہ کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ ترکِ کسب پر وہ ہمت نہ کر سکے جبکہ کاروبار پائے۔"

نیز فرمایا: "جس نے اسباب کھو دیئے اس کا دل کمزور ہو گیا یا ان کا وجود اس کے قلب کے لیے ان کے نہ ہونے

سے زیادہ باعثِ سکون ہو اس کے لیے کاروبار سے الگ ہونا ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ ایسی حالت میں غیر اللہ کی انتظار کی صورت بن جاتی ہے۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں :

" جس پر نوروز فاقہ آئے اور پھر مخلوق کے مال میں اس کے دل میں طمع یا میلان آئے تو اس کے لیے مسجد سے زیادہ بازار افضل ہے۔"

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں :

" ایسے بندے میں کچھ بھلائی نہیں کہ گھر میں بیٹھا ہو اور اس کا دل دروازے کی کھٹکھٹاہٹ پر لگا ہو کہ کب کوئی (روزی کا سبب) آکر دروازہ کھٹکھٹائے۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں :

" جب بندے کے لیے سبب اور عدمِ سبب دونوں برابر ہو جائیں اور اس کا قلب عدم (سبب) پر بھی مطمئن و پرسکون ہو اور (عدمِ سبب) اسے اللہ سے غافل نہ کرے۔ نہ ہی اس کے عزم میں انتشار واقع ہو۔ ایسے آدمی کے لیے ترکِ کسب افضل اور گھر میں (کاروبار سے الگ ہو کر) بیٹھنا افضل ہے تاکہ وہ اپنے حال میں مصروف رہے اور آخرت کے لیے تیاری کرتا رہے۔ اس کا توکل میں صحیح مقام ہے۔

حضرت سہلؒ سے پوچھا گیا :

" بندے کے لیے توکل کب صحیح ہوتا ہے ؟"

فرمایا : " جب اس کے بدن میں تکلیف آئے، مال میں کمی واقع ہو جائے اور وہ اس کی جانب توجہ بھی نہ کرے اور نہ ہی غمگین ہو بلکہ اپنے حال میں مشغول رہے اور اوامرِ خداوندی بجالانے پر نظر رکھے۔"

حضرت ابراہیم خواصؒ متاخرین میں اہلِ توکل کے امام گزرے ہیں۔ فرمایا :

" تین مقامات ایسے ہیں کہ یہاں زادِ راہ لینا، آدابِ توکل میں سے ہے :

۱۔ مسجد میں بیٹھنا

۲۔ کشتی پر سوار ہونا

۳۔ قافلہ کے ساتھ چلنا۔"

حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا :

" جب عالم کا روزگار نہ ہو تو وہ ظالموں کا وکیل و کارندہ ہوتا ہے اور عابد کا روزگار نہ ہو تو وہ اپنے دین کے عوض کھاتا ہے اور جاہل کا روزگار نہ ہو تو وہ فاسقوں کا سفیر ہوتا ہے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ بعض وہ ہیں جن کو ان کی اخروی فکر، دنیاوی معاش سے غافل کر دیتی ہے۔ یہ فائزین کا درجہ ہے۔

۲۔ ایک وہ طبقہ ہے کہ جس کی معاش آخرت کے لیے اسے مشغول کر دے۔ یہ ناجین کا حال ہے۔

۳۔ ایک گروہ وہ ہے کہ جن کی دنیاوی معاش، انہیں آخرت سے غافل کر دیتی ہے۔ یہ برباد ہونے والوں کی صفت ہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

"رزق دو ہوتے ہیں:

۱۔ وہ رزق جو تجھے تلاش کرے۔

۲۔ وہ رزق جس کو تو تلاش کرے۔"

ایک عالمؒ نے اس کی وضاحت کی اور فرمایا:

"جو رزق تجھے تلاش کرتا ہے وہ غذا کا رزق ہے اور جس رزق کو تو تلاش کرتا ہے وہ تملیک کا رزق ہے یعنی غذا اسے زاہد کی تلاش تو کرتا ہے۔"

ابو یعقوب سوسیؒ ایک بلند پایہ متوکل تھے۔ فرمایا:

"توکل کے تین مقامات ہیں:

۱۔ عام

۲۔ خاص عام

۳۔ خاص خاص۔"

جو اسباب میں گھس گیا علم کو استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھا اور یقین کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ وہ عام ہے۔ جس نے اسباب کو ترک کیا اللہ پر توکل کیا اور یقین میں پختہ رہا وہ خاص عام ہے۔ جو یقین پائے جانے کے باعث اسباب سے نکل گیا پھر دوسرے کے لیے اسباب میں داخل ہو کر تصرف کیا تو یہ خاص الخاص مقام توکل ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشرۂ مبشرہ صحابہ کرام اور دوسرے بلند پایہ صحابہ عظامؓ کا مقام ہے۔ یقین نے انہیں دنیا سے صاف بچائے رکھا اور علم نے انہیں دوسروں کے لیے اسباب میں داخل کیا۔ ان پر دوسروں کے احوال لائے گئے اور حقیقی یقین پر علم کے ذریعہ انہوں نے توسع اختیار فرمایا۔ اسی لیے حضرت خواصؒ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"خواص جب دوسروں کیلئے اسباب میں داخل ہوتے ہیں تو دراصل ان پر احوالِ غیر لائے جاتے ہیں اور انہیں دوسروں کی طرف روزی پہنچانے والا بنایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ حضرات ان کی خاطر اسباب میں تصرف کرتے ہیں ورنہ یہ اسبابِ (دنیا) سے بالکل بیزار و بے تعلق ہوتے ہیں۔"

حضرت جنیدؒ کے استاد حضرت ابو جعفر حدادؒ ایک متوکل بزرگ تھے۔ فرمایا:

"میں نے بیس سال تک توکل کو چھپائے رکھا۔ مگر بازار سے بھی جدا نہ ہُوا۔ ہر روز ایک دینار اور دس دراہم کماتا۔ ایک دانق لے کر رات گزارتا اور ایک قیراط پر چین نہ آتا۔ اسے لے کر حمام میں جاتا اور رات ہونے سے پہلے اسے ختم کر دیتا بلکہ رات سے پہلے پہلے سارا مال اپنے قبضہ سے باہر کر دیتا۔"

حضرت جنیدؒ، حضرت ابو جعفر کی موجودگی میں توکل کے بارے میں کلام نہ فرماتے۔ کہا کرتے:

"مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ یہ موجود ہوں اور میں توکل کے بارے میں کلام کروں۔"

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقراء کو پاس رکھنے اور انہیں اللہ کی طرف رجوع رکھنے کی خاطر دینے میں شرط لگا دی کہ مانگیں نہیں اور لوگوں کے احوال پر نظریں نہ جمائے۔ اس لیے کہ مانگنا، ایک فقیر آدمی کے لیے بڑی ذلت اور دنیا کے لیے حرص کی دلیل ہے اور بندوں کی طرف نظریں اٹھانا غلط طمع ہے اور غیر اللہ کی طرف نظر کرنا ہے اور ایسے ہے جیسے کہ گھروں میں دروازے سے نہ آئے (یعنی سیدھی راہ سے بے راہ ہی ہے)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"لوگوں سے مانگنا فواحش میں سے ہے۔ اس کے سوا کسی فحش بات کو جائز نہیں کیا گیا۔"

ہدیہ قبول کرنے کے آداب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو بے نیاز رہا اللہ تعالیٰ نے اسے غناء عطا فرما دیا اور جس نے عفت اختیار کی اللہ نے اسے عفت عطا کی۔ اور جس نے اپنے اوپر مانگنے کا دروازہ کھول کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر فقر کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ فقراء صادقین کے لیے ہدیہ لینے کی اجازت ہُوئی بلکہ جب انہوں نے پاک رہنے اور فضیلت کے طور پر میلان اور سوال سے اجتناب رکھا تو اس کے عوض ان کے لیے ہدیہ قبول کرنا مستحب ہُوا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ اہل بیت کے لیے غنائم کے مالوں میں سے خُمس (پانچواں حصّہ) مقرر ہُوا مگر باقی صدقات (واجبہ) ان پر حرام کر دیئے گئے۔ ان کی فضیلت و شرف کے باعث ایسا حکم ہُوا۔"

ایک بار حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے ابو بکر مروزیؒ کو حکم دیا کہ فلاں فقیر کو کچھ دو اور وہ چیز اس کی مزدوری سے زائد تھی اس نے واپس کر دی۔ جب چلا گیا تو امام احمدؒ نے فرمایا:

"لپک کر اسے لو اور اسے دے کر آؤ۔ اب وُہ لے لے گا۔"

بتاتے ہیں کہ مروزیؒ نے اسے جا لیا اور وُہ چیز اسے دے دی، اس نے لے لی۔ امام احمدؒ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا کہ پہلی بار اس نے کیوں واپس کی؟ اور دوسری بار کیوں لے لی؟۔

فرمایا، " اس کا اس طرف میلان آگیا تھا۔ اس لیے اس نے واپس کر دی اور یہ اچھا کیا۔ جب وُہ چلا گیا تو اب اس کا نفس مایوس ہوگیا۔ اس لیے اب قبول کر لی۔"

حضرت خواص رحمۃ اللہ علیہ کو جب کسی بندے میں ہدیہ دینے کی امید ہوتی (یعنی اس کے ہدیہ پر نظر ہوتی کہ دے گا) یا ڈرتے کہ نفس اس کا عادی ہو جائے گا۔ تو اس سے کچھ بھی قبول نہ کرتے۔ اور فرمایا کرتے:

" صوفی پیشہ ور نہیں ہوتا۔"

اور یہ سب باتیں اس وقت ہی خوب ہوتی ہیں کہ جب آدمی تنہا ہو اور اگر اہل و عیال بھی ہوں تو پھر سہولت و وسعت موجود ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں کہ اپنے اہل و عیال کے لیے کچھ لے جیسے کہ وُہ دُوسروں کے لیے لیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے اہل و عیال دراصل عیال اللہ ہیں۔ اللہ نے انہیں اس کے سپرد کیا۔ اس کے ہاتھ پر ان کی روزی جاری فرمائی۔ اب اگر ان کے لیے تلاش کرے اور ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے محنت کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر لازم کر دیئے تو اس سے اس کے حال میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی۔

کاروبار کرنا، توکل کے منافی نہیں

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ بن ربیع اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے درمیان مواخات قائم کی تو حضرت سعدؓ نے انہیں کہا:

" میں اپنے مال اور اہل میں آپ کا حصہ الگ کرتا ہوں۔"

حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا،

" اللہ تعالیٰ آپ کے مال و اہل میں برکت کرے۔ مجھے بازار کا راستہ دکھا دیں۔"

چنانچہ انہوں نے یہ دن کام کیا اور کچھ گھی اور پنیر لائے۔ اب اگر بازاروں میں جانے سے توکل میں نقص آتا تو حضرت عبدالرحمٰنؓ جو امام متوکلین ہیں ایسا نہ کرتے۔ بلکہ انہوں نے یہ چاہا کہ نفس پر مشقت ڈالیں اور عیش سے پرہیز کریں۔ جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو فرمایا:

" تنعم (عیش کی زندگی) سے بچتے رہو۔ اس لیے کہ اللہ کے بندے تنعم میں نہیں رہتے۔"

حضرت فضالہ بن عبید مصر کے امیر تھے مگر یہ پریشان حال، غبار آلود اور برہنہ پاؤں رہتے۔ ان سے پُوچھا گیا:

" آپ اس طرح کیوں رہتے ہیں؟"

فرمایا : "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (زیادہ) آرام دہ زندگی سے منع فرمایا اور ہمیں حکم دیا کہ گاہے برہنہ پاؤں بھی ہو جایا کرو۔"

پھر حضرت عبدالرحمٰن رضؓ نے اخوت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے بھائی کا ایثار قبول کر لیا اور اللہ تعالٰی نے بھی ان کا ایثار پسندیدہ قرار دیا اور اس کے ساتھ محبوبین کا وصف بیان فرمایا۔

حضرت عبدالرحمٰن رضؓ سے بلند تر مقام حضرت امام الائمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ جب صحابہؓ نے ان کی خلافت تسلیم کر کے ان کی بیعت کی تو وہ بغل میں کپڑا داب کر بازار میں گئے اور کپڑا فروخت کرنے کے لیے آوازیں دینے لگے۔ خلافت کے اہل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ بھی ان کے کامل ترین حال میں ملتا ہے، اور انہیں جانشین نبوت (خلافت) بھی ملی۔ آخر مسلمان جمع ہوئے اور انہوں نے اسے ناپسند کیا اور ان کے لیے اس قدر وظیفہ مقرر کر دیا کہ جو عام مسلمان گھرانے کا ہوتا ہے۔ نہ زیادہ اور نہ کم۔ جب سب اس پر راضی ہوئے اور ان کا خرچ عام مسلمانوں نے برضا و رغبت ادا کیا تو وہ امورِ خلافت میں مصروفیت اور مسلمانوں کے معاملات میں مشغولیت کے باعث بازار سے الگ ہو گئے۔

دیکھیے حضرت ابوبکرؓ نے کس طرح اپنا حق ادا کیا اور اپنے اہل و عیال کا لازم حق ادا کیا اور اس قدر رفعت کے باوجود تواضع اختیار کی اور مخلوق کو نظروں سے گرا دیا۔ آخر کار مسلمانوں نے ان کے کاروبار کرنے کو ناپسند کیا تو انہوں نے ایک دوسرے حکم کے باعث کاروبار چھوڑ دیا۔ اس طرح حکم اول کے ساتھ ساتھ توکل ہوتا ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالٰی کوئی دوسرا راستہ کھول دے تو اسی راہ پر چلنا چاہیے۔

بعض علمائے سلفؒ کا فرمان ہے ،

"ان کے پاس لوگ جمع ہوتے اور وہ انہیں خطاب فرمایا کرتے" چنانچہ فرمایا کرتے :

"اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے گھر والے ، سبزی کے ایک چھلکے تک کے ضرورت مند ہیں تو میں تم پر کلام نہ کروں گا۔"

یہی بات اس کے لیے دلیل و برہان کا کام دیتی ہے کہ جو اہل توکل پر ترکِ کسب کے باعث انکار کرنے پر ادھار کھائے ہوئے نہیں ہے اور اپنے نفس کے لیے حجت اور اپنی بے کاری کے لیے عذر کا متلاشی نہیں۔ اور علماء کو دین کے مسائل واضح کرنے ہی پڑتے ہیں اور دلیل و برہان کے ساتھ حقیقتِ علمی وانکشاف کرنی ہی پڑتی ہے۔ الغرض کاروبار اور اسبابِ کسب ایسی راہیں ہیں کہ جن کے ذریعہ اللہ تعالٰی مخلوق کو روزی دیتا ہے۔ یہ چیزیں خود روزی رساں اور عطا کرنے والی نہیں بلکہ یہ واسطوں کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے کہ ایک انسان دوسرے کو عطا کرنے کے لیے واسطہ ہوتا ہے۔

چنانچہ اسباب استعمال کرنے والا اہل یقین آدمی خوب جانتا ہے کہ عطا کرنے والا اور روکنے والا صرف اللہ سبحانہٗ ہی ہے۔ اور وہی اصل مسبب و رزاق ہے۔ تصریف میں وہی اول ہے اور تقلیب میں وہی آخر ہے۔ اس کا دل تقسیم کنندہ تعالیٰ کی طرف نظر کیے ہے اور اس کا نفس تقسیم پر مطمئن ہے۔ اس کا قلب اپنے حصہ پر قانع و راضی ہے۔ اس کا جسم اس معلوم میں متحرک ہے۔ جس کی طرف اس کا رُخ کیا گیا اور جو اس کے لیے سبب بنایا گیا اور وُہ اپنے مقام سے آگاہ ہے اور جو اس سے مراد ہے اسے خوب سمجھتا ہے۔ اپنے حال پر اور جس میں محنت کر رہا ہے اور خاص کر کے جو اس پر لازم ہوا اس پر راضی ہُوا۔ اور جو چیز متوکل کے لیے باعثِ نقصان ہے اور اسے حدِ توکل سے نکال باہر کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کثرتِ مال کی خاطر مشتبہ کمائی میں بھی انہماک کر لے یا جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کے لیے کمائے یا تقدیر پر ناراضگی ظاہر کرے جبکہ اسے اس کی مرضی نہ ملے یا اپنے عامل کو نصیحت کرنا چھوڑ دے کہ وہ چاہے حیلہ کرتا رہے۔ یا مخلوق کی طرف میلان رکھے یا کسی سبب میں طمع رکھے۔ ان تمام احوال میں توکل صحیح نہیں ہو سکتا۔

ایک عالمؒ کا فرمان ہے،

"جب آدمی کاروبار کے لیے بازار میں داخل ہوا اور اسے دوسرے کے درہم سے اپنا درہم زیادہ محبوب ہے تو وہ کاروبار میں اہلِ اسلام کے لیے باعثِ نصیحت ہے۔" ان کے نزدیک ایسا کرنے والا توکل سے خارج ہے اور علم کی کمی ہو یا غلبہ ہوئی ہو تو آفات و تکالیف آنے اور دکھوں کے وبرپا ہو جانے سے وُہ توکل سے نکل جاتا ہے اور یہ آدمی لوگوں پر توکل کرنے لگتا ہے یعنی ان میں طمع رکھتا ہے یا ان کے سامنے تصنع کیا جاتا ہے یا اپنے بدن کی صحت اور دوامِ عافیت پر توکل کرتا ہے اور اسے اپنی محنت سے ہی روزی ملتی ہے یا یہ آدمی اپنے مال پر توکل کرتا ہے یعنی اسے مال پر وثوق و اطمینان ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں فقیر ہو گیا تو روزی ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ مال پر بخل دکھاتا اور اس کام کے لیے اس قدر اور اُس کام کے لیے اس قدر مال جمع کیے رکھتا ہے۔

یہ ایسے امور ہیں کہ انسان کو توکل سے باہر نکال دیتے ہیں اور لگتا ہے یہ اسبابِ (مخرج از توکل) اس قدر دقیق اور مخفی ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے علمائے راسخین کی نظروں سے بھی اوجھل ہو جاتے ہیں کہ جنہیں یقین حاصل ہوتا ہے اور جو دوامِ مشاہدہ کے مقام پر فائز بھی ہوتے ہیں۔

اب جو آدمی ان اسباب و اشخاص کی طرف نظر رکھے یا ان سے مانوس ہو اور مطمئن ہو تو ان کے پائے جانے سے اس کے دل کو قوت حاصل ہو گی اور ان کے فقدان پر اسے قلبی اضطراب و دہشت یا کمزوری ہو گی۔ یاد رکھیے کہ یہ بات اس کے توکل میں نقص ہے۔

حضرت بشرؒ بن حارث سے مروی ہے۔ فرمایا،

" بندہ یہ آیت پڑھتا ہے،

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" تو نے جھوٹ بولا۔ تو خاص کر کے میری ہی عبادت نہیں کرتا اور نہ خاص کر کے مجھ ہی سے مدد چاہتا ہے اگر تو صرف میری ہی عبادت کرتا ہوتا تو میری رضا پر اپنی خواہش کو ترجیح نہ دیتا۔ اور اگر تو صرف مجھ سے ہی مدد چاہتا تو اپنی حول وقوت (توفیق وقوت) کی طرف اور نہ ہی اپنے مال وجان کی طرف پُرسکون ہوتا۔"

جب تجارت میں خرابیاں پیدا ہو جائیں

ہمارے اس زمانہ میں بازاروں میں کاروبار کرنے اور تصرف کرنے سے الگ ہونا حقیقت میں صبر و قناعت کے لیے زیادہ معاون ہے اور ایسا آدمی ایسے کاروبار کرنے والے سے افضل و اکمل ہے کہ جسے اس بات کا ڈر ہے کہ خدا کی معصیت و نافرمانی کے بغیر مال نہیں کما سکوں گا اور کھلم کھلا شبہ میں جا پڑوں گا یا مسلمان بھائیوں سے خیانت ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اسبابِ معاش کے ساتھ ساتھ علمی شرائط کو قائم رکھنا دشوار ہو رہا ہے۔ کاروبار میں کثرت سے آفاتِ دینی داخل ہو چکیں۔ اس لیے بازار والوں سے اس ناپسندیدہ وصف کے ساتھ اختلاط نہ رکھنا سلامتی کے زیادہ قریب ہے تاکہ وہ ان ناپسندیدہ اشیاء کو نہ دیکھے اور نہ براہِ راست ان سے ملوث ہو کیونکہ دیکھنے کے ساتھ حکم متعلق ہوتا ہے اور حرام کی مثال برائی کی طرح ہے کہ جب تو اسے نہ دیکھے گا تو اس کا حکم ہی ساقط ہو جائے گی۔ اور خبر دیکھنے کی طرح نہیں ہُوا کرتی اور صرف پڑوسی پن براہِ راست ملوث ہونے کی طرح نہیں ہوتا اور نہ ہی دیکھنے والا، خبر دینے والے کی طرح ہوتا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک آدمی کعبہ سے دُور ہے۔ اس کا رُخ کعبہ کی سمت کی جانب ہے مگر ٹھیک قبلہ رُخ نہیں ہو سکا تو اس کی نماز جائز ہے مگر جو آدمی (مکہ میں ہے) اور کعبہ کو دیکھ رہا ہے تو اگر اس کا رُخ ٹھیک قبلہ کی طرف نہ ہُوا تو اس کی نماز ادا ہی نہیں ہوگی اور کاروبار فرض نہیں ہے۔ البتہ اگر اہل وعیال ہوں یا کسی دوسرے مباح طریق سے بقدرِ ضرورت کفالت نہ ہوتی ہو یا (کاروبار نہ) ہونے سے وہ فرض سے ہی منقطع ہو جاتا ہو۔ اور ادائیگی فرض میں کمزوری آتی ہو تو ان حالات میں کاروبار فرض ہے۔

حضرت بشرؒ بن حارث نے کاروبار ترک کر دیا تھا اور وہ حلال میں کلام فرماتے اور حلال کھانے پر سختی کرتے ان سے پُوچھا گیا،

"اے ابونصر! تم کہاں سے کھاتے ہو؟"

فرمایا: "جہاں سے تم کھاتے ہو لیکن جو کھاتا بھی ہو اور روتا بھی ہو۔ وہ اس آدمی کی طرح نہیں ہے کہ جو کھاتا ہو اور ہنستا ہو۔"

ایک بار فرمایا:

"اور لیکن ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے چھوٹا ہے اور ایک لقمہ دوسرے سے چھوٹا ہے۔"

حضرت ثوریؒ کے پاس پچاس دینار تھے۔ وہ ان سے کاروبار کرتے تھے۔ آخر کار یہ دینار لیے اور اپنے بھائیوں میں تقسیم کر دیئے اور کاروبار ترک کر دیا۔ بتاتے ہیں کہ یہ کام انہوں نے اس وقت کیا کہ جب ان کے گھر والے وفات پا گئے اور کسی بندے کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے اہل و عیال کا حال اپنے حال پر ڈال لے۔ ہاں اگر وہ بھی اختیار و پسند میں اسی کی طرح ہوں تو اجازت ہے کہ انہیں بھی فقر پر صبر حاصل ہو۔ فقر کی فضیلت سے اس طرح آگاہ ہوں جیسے کہ یہ آگاہ ہے تو اجازت ہے کہ انہیں اپنی عادت پر چلائے اور ان کی خاطر بھی کاروبار ترک کر دے۔ اس لیے کہ اب حال میں وہ بھی اسی کی طرح ہوئے کہ انہوں نے مطالبات ہی ساقط کر دیئے اور سلفؒ کی ایک جماعت نے ایسا بھی کیا ہے۔

بعض عارفینؒ غیر معلوم کو معلوم پر افضل سمجھتے ہیں اور ترکِ کسب کو افضل نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ یہ معلوم ہے اور یہ حضرات، معلوم کے پائے جانے پر سکونِ قلبی کو ایک مرض قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر غیر معلوم کے ساتھ قلب پرسکون ہوا اور جمعیتِ خاطر قائم رہی۔ حالِ معدوم میں اس کا طمع کٹ گیا تو یہی مقام ہے۔

میرے نزدیک اس کی وضاحت یہ ہے کہ صرف عدمِ معلوم کے ساتھ فضیلت نہیں ہوتی جیسے کہ کاروبار سے صرف الگ ہونا باعثِ فضیلت نہیں بلکہ حالِ مقام کے باعث شرف حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر صاحبِ معلوم ہی بہتر معرفت اور قوی تر یقین رکھتا ہو تو اسے غیر معلوم والے پر افضلیت ہوگی اور مقام کے درجہ پر حال ہیں معلوم پائے جانے پر سکونِ قلب و اطمینانِ نفس کوئی مرض نہیں ہوگا۔ البتہ اس کے ساتھ رفعتِ مقام اور فضیلتِ حال نہیں ملتا۔ اس لیے کہ مخلوق میں طمع رکھنا اور معلوم بقدرِ کفایت پائے جانے کے ساتھ ساتھ قلبی انتشار میرے نزدیک اور مشائخؒ کے نزدیک باعثِ نقص ہے اور مخلوق سے لالچ ختم کر دینا اور عدم کے ساتھ جمعیتِ خاطر رکھنا جماعتِ صوفیا کے نزدیک افضل و اعلیٰ درجہ ہے۔

ترکِ کسب

حضرت خالدؓ کے دونوں بیٹوں حبہؓ و سواءؓ کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (خالدؓ کے بیٹوں کو) فرمایا:

"جب تک تمہارے سر حرکت کر رہے ہیں، رزق سے ناامیدی نہ رکھنا، اس لیے کہ ابنِ آدم کو اس کی

ماں سرخ جلتی ہے اس پر چھلکا تک نہیں ہوتا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے روزی عطا کرتا ہے۔"

ایک آدمی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور عطا کی اور فرمایا:

"اگر تو اس کے پاس نہ آتا تو یہ تیرے پاس آتی۔"

اور مشائخ فرماتے ہیں کہ اگر بندہ روزی سے بھاگ کھڑا ہو تو بھی وُہ اسے جا لے گی جیسے کہ موت سے بھاگنے والے کو موت جا پکڑتی ہے اور جب تک فرشتۂ موت سامنے نہ آئے اس وقت تک روزی بندے سے منقطع نہیں ہوتی۔ اس وقت دنیا کی روزی ختم ہو جاتی ہے اور آخرت کی روزی کھل جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی روزی کا آخری حصہ آخرت کی روزی کے آغاز کے ساتھ ملا ہوتا ہے اور اس (اخروی) روزی کا کوئی انجام نہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ دستوائیؒ نے فرمایا:

"اگر کوئی بندہ، اللہ سے دعا کرے کہ مجھے روزی نہ دینا تو اللہ اس کی یہ دعا قبول نہیں کرتا اور اسے فرماتا ہے: "اے جاہل میں نے تجھے پیدا کیا اور یہ ضروری ہے کہ میں تجھے ہمیشہ روزی بھی دُوں۔"

ان سے خوراک (قوت) کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

"وُہ (تعالیٰ) زندہ ہے جو کبھی نہیں مرے گا۔"

کہا گیا: "میں نے قوام (خوراک) کے بارے میں معلوم کیا تھا۔"

فرمایا: "قوام تو علم ہے۔"

کہا: "ہم نے غذا کے بارے میں سوال کیا تھا۔"

فرمایا: "غذاء تو ذکر ہے۔"

کہا گیا: "ہم نے بدن کی خوراک کے بارے میں پُوچھا تھا۔"

فرمایا: "میاں، تجھے جسم کی کیا پڑی ہے؟ چھوڑ، جس نے اسے پہلے (پیدا کیا) اور کارسازی کی وُہ بعد میں بھی کارسازی کرتا رہے گا۔ اس پر کوئی مرض آئے تو اُسے بنانے والے کے پیش کر دے۔ دیکھتے نہیں کہ جب کسی چیز کی خرابی ہوتی ہے تو بنانے والے کے سپُرد کر دیتے ہیں کہ وہ اسے درست کر دے۔"

حضرت خواصؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سہلؒ سے منقول ہے:

"اللہ تعالیٰ خواص پر فاقہ ڈالتا ہے اور انہیں مخلوق کا محتاج بناتا ہے کہ وہ ان میں طمع رکھیں اور لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے کہ انہیں مت دینا، چنانچہ ان کے ہاتھوں سے انہیں محروم کر کے انہیں اپنی طرف لاتا ہے جب وُہ لوگوں سے نا امید ہو کر اللہ کی طرف آتے ہیں تو انہیں وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے انہیں گمان بھی نہیں ہوتا۔"

خواص کی علامت یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز میں میلان رکھیں تو اسے اپنے آپ پر حرام کر لیتے ہیں اور جب انہیں کسی بندے کی طرف سکون نظر آتا ہے تو اسے اپنے پر مسلط کر لیتے ہیں تاکہ ان کا سکون اللہ ہی کی جانب ہو کر رہ جائے

سلف کا طریق تھا کہ اگر انہیں کسی سبب کا انتظار ہوتا اور اس انتظار کے بعد وہ چیز ان کے پاس آتی تو اسے واپس کر دیتے۔ بعض کا طریقہ یہ تھا کہ اسے صدقہ کر دیتے اور اپنے آپ کو سزا دینے کی خاطر اس میں سے کچھ نہ کھاتے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ ، اپنے بھائیوں کے سامنے توحید و معرفت کے علم میں کلام فرماتے ۔ ایک نوجوان نے پُوچھا :

" روٹی کہاں سے آتی ہے ؟"

فرمایا : " اس کا ہاتھ پکڑ لو اور صوفیا کے پاس لے جاؤ تاکہ وُہ اسے ادب سکھائیں۔"

حضرت معروف ابو محفوظ کرخیؒ سے مروی ہے کہ ان کے پاس ذکر کیا گیا کہ حضرت بشرؒ کے لیے جب اسباب کھلتے ہیں تو انہیں انقباض و تنگی محسوس ہوتی ہے۔ فرمایا ،

" میرے بھائی بشرؒ کو تقویٰ نے پابند کر لیا اور مجھے معرفت نے نشاط بخشی ۔" البتہ حضرت معروفؒ صرف ضرورت کے وقت ہی سبب اختیار فرمایا کرتے تھے اور بقدر ضرورت ہی مال حاصل کرتے۔ ذخیرہ نہ بناتے اور نہ ہی طویل امیدیں باندھتے بلکہ ان کی حالت یہ تھی کہ ایک نماز کے بعد دُوسری نماز کے وقت تک زندہ رہنے کی امید بھی نہ باندھتے۔

جب وُہ ظہر کی نماز ادا کر لیتے تو پڑوسیوں سے کہا کرتے ،

" کسی دُوسرے آدمی کا بندوبست کر و جو تمہیں نمازِ عصر پڑھائے ۔"

فرمایا کرتے :

" میں اپنے مولائے کریم کے گھر میں مہمان ہوں۔ اگر اس نے کھلایا تو جب وُہ کھلائے گا میں کھاؤں گا اور اگر اس نے مجھے بھُوکا رکھا تو صبر کروں گا تا آنکہ وہی مجھے کھلائے ۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ فرمایا کرتے تھے ؛

" متوکل آدمی نہ مانگتا ہے نہ رد کرتا ہے اور نہ ذخیرہ کرتا ہے ۔"

ذخیرہ اندوزی اور توکل

اگر توکل صحیح ہو اور اللہ کے لیے اور اللہ کی راہ میں ذخیرہ کر رہا ہو تو پھر توکل کے ساتھ ساتھ ذخیرہ کرنا کچھ

نقصان نہیں دیتا جبکہ اس کا مال (جمع شدہ) اپنے مولائے کریم کی رضا پر موقف پڑا ہو۔ اپنے نفسانی مزے لوٹنے اور خواہشات کی خاطر جمع نہ کیا ہو۔ اس صورت میں یہ ان حقوق اللہ کی ادائیگی کے لیے ذخیرہ ہے جو اس کے ذمہ ہیں۔ چنانچہ جب کوئی حق دیکھے تو اس میں خرچ کرے اور حقوق اللہ کی ادائیگی، بندے کے مقامات میں کمی نہیں کرتی۔ بلکہ اضافہ و ترقی کا باعث ہوتی ہے۔

بعض اصحابِ بشر بن حارثؒ سے مروی ہے کہ:

"ایک روز میں ان کے پاس دن کے وقت تھا۔ ان کے پاس ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آیا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور رنیلی گالیں تھیں (یعنی نحیف و کمزور تھے) حضرت بشرؒ ان کے لیے کھڑے ہو گئے۔

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے ان کو کسی کے لیے کھڑے ہوتے نہ دیکھا تھا۔

راوی بتاتے ہیں کہ حضرت بشرؒ نے مجھے چلو بھر دراہم دیئے اور فرمایا:

ہمارے لیے عمدہ اور اعلیٰ قسم کا کھانا خرید لاؤ اور ایسی بات پہلے مجھے کبھی نہ فرمائی تھی۔ بتاتے ہیں کہ ہم نے خوب کھانا کھایا اور کافی کھانا بچ گیا۔ باقی ماندہ کھانا اس آدمی نے سمیٹا اور کپڑے میں ڈال کر لے گیا۔ راوی بتاتے ہیں کہ مجھے اس کی حرکت پر تعجب ہوا اور میں نے اسے پسند نہ کیا۔ اس لیے کہ حضرت بشرؒ نے اسے اس کی اجازت نہ دی تھی اور نہ ہی اس نے اجازت مانگی۔ اس کے بعد حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"شاید تم نے اس کے فعل کو ناپسند اور نادرست سمجھا ہے؟"

میں نے عرض کیا:

"ہاں، اس نے باقی کھانا بغیر اجازت لے لیا۔"

فرمایا: "اسے جانتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: "نہیں۔"

فرمایا: "یہ ہمارے بھائی فتح موصلی ہیں۔ آج یہ ہماری ملاقات کے لیے موصل سے آئے۔ ان کا ارادہ ہوا کہ ہمیں توکل سکھائیں کہ جب توکل صحیح ہو تو اس کے ساتھ ساتھ ذخیرہ کچھ نقصان نہیں دیتا اور ترک ذخیرہ اندوزی بھی مقامِ توکل میں سے ایک کم امید کا حال ہے اور گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ طول امیدی کے ساتھ ساتھ توکل بھی صحیح ہوتا ہے بشرطیکہ اس لیے طویل امیدی رکھے کہ زیادہ دن زندہ رہ کر وہ اللہ تعالیٰ کی خوب خوب عبادت کرے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اہلِ رجاء اور اہل انس حضرات میں سے ایک جماعت کا طریق یہ ہے۔ اور اگر وہ نفسانی مزہ لینے اور دنیاوی فوائد حاصل کرنے کی خاطر لمبی عمر چاہے تو یہ دنیا میں زہد کرنے میں کمی کی دلیل ہے اور اس کا یہ نقص توکل پر بھی اثر انداز ہوگا اور جس قدر زہد میں کمی ہوگی اسی قدر توکل میں

کمی آجائے گی اور یہ بات نہیں کہ زہد میں جو اضافہ ہو اس حساب سے توکل میں بھی اضافہ ہو جائے۔ اس لیے کہ زہد، خواص کے توکل کی شرط ہے اور توکل کرنا عمومِ زہد کی شرط نہیں۔ اس طرح ہر صاحبِ مقامِ توکل یقیناً زاہد ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر زاہد مقامِ توکل بھی رکھتا ہو کیونکہ توکل مقام ہے اور زہد حال ہے۔ مقامات، مقربین کے لیے ہوتے ہیں اور احوال، اصحابِ یمین کے لیے ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ جس کو حقیقی زہد ملا تو اسے یقیناً توکل بھی عطا ہوگا کیونکہ حقائقِ احوال اور احوال کا ثابت رہنا اور اہلِ احوال کے لیے ان کا دوام اختیار کرنا اور ان کے قلوب کے ساتھ ان احوال کا لازم ہو جانا مقامات کہلاتا ہے اور جب متوکل کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ایک ماہ یا دو ماہ زندہ رہنے کی امید رکھے تو اس کے لیے اس مدت تک کے لیے ذخیرہ اندوزی بھی جائز ہے البتہ خواص کے نزدیک طویل امیدی اسے حقیقتِ توکل سے باہر نکال دے گی اور میرے نزدیک وہ حدِ توکل سے نہیں نکلے گا مگر متوکل کے لیے چالیس روز سے زیادہ امیدِ بقا ناپسندیدہ ہے اور جس آدمی نے لوگوں سے میلان کاٹنے اور قلب کی اصلاح اور نفس کو سکون دینے کے لیے ذخیرہ کیا اور معلوم کے ساتھ اسے سکون ملتا ہے تو اس کے لیے ذخیرہ اندوزی افضل ہے اور جو آدمی اپنے گھر والوں کے لیے ذخیرہ کرے تاکہ ان کو قلبی سکون حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ سے وہ راضی رہیں اور ان کا حکم اس سے ساقط ہو جائے تاکہ وہ فارغ ہو کر اللہ کی عبادت کر سکے تو ایسی ذخیرہ اندوزی افضل ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ ایسا کر کے وہ اپنے پروردگار کی حکم برداری کر رہا ہے اور اس رعایا کی نگرانی کر رہا ہے جس کے بارے میں اس سے پرسش ہوگی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال کے لیے اپنے اہل و عیال کے لیے ذخیرہ فرمایا تاکہ یہ مسنون ہو جائے اور حضرت ام ایمن وغیرہا کو کل آئندہ تک کے لیے بھی ذخیرہ کرنے سے منع کیا، اور حضرت بلالؓ کو بھی ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا تاکہ اہل مقامات اس میں ان کی اقتدا کریں جیسے کہ مروی ہے،

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور آپؐ کے پاس دو چادریں تھیں"۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ قصیر الامل (زندہ رہنے کی کم سے کم امیدیں باندھنے والے) تھے۔ آپؐ کی یہ حالت تھی کہ پیشاب کرتے تو پانی ملنے سے پہلے ہی تیمم کر لیتے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ پانی قریب ہی ہے"۔

... [illegible] مایا،

... [illegible] اس تک نہ پہنچ سکوں"۔

مگر آپؐ کا وہ فعل مبارک اس لیے تھا کہ آپؐ کی امت میں سے بعض لوگ طولِ امل کے باعث ہلاک نہ

ہو جائیں۔ اور (ایک سال کی ذخیرہ اندوزی کا فعل) ان کے لیے باعثِ نجات بن جائے۔ اس بحث سے واضح ہو گیا کہ ذخیرہ اندوزی میں عارفین کے مشاہدہ کے مطابق وسعت و تنگی کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ شریعت میں رخصت و عزیمت دونوں ہیں۔ دین کے عزائم قوی لوگوں کے لیے ہیں اور کمزوروں کے لیے رخصتیں ہیں۔

حضرت خواصؒ اہل توکل میں گاہے لطیف باتیں فرماتے اور بتاتے کہ ذخیرہ اندوزی، انسان کو حدِ توکل سے باہر نکال دیتا ہے اور چار چیزیں اس سے مستثنیٰ کرتے اور فرمایا کرتے کہ ان کی ذخیرہ اندوزی، حالِ توکل کے کمال سے ہے۔ اس لیے کہ یہ امورِ دین میں سے ہیں:

۱۔ چمڑے کا تھیلا اور رسی
۲۔ سوئی
۳۔ دھاگے
۴۔ قینچی۔"

حضرت سہلؒ کم امیدی اور طویل امیدی میں ذخیرہ اندوزی کی مثال دیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے:

"جو آدمی ذخیرہ اندوزی ترک کرتا ہے اس کی مثال اُس آدمی کی طرح ہے جو یہ کہتا ہے کہ میرا ارادہ ابلہ (قریب نزجگہ) جانے کا ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ ایک روٹی لے لو۔ اب اگر وہ کہے کہ میں عبادان (ذرا دور کا مقام) جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تو اسے کہا جاتا ہے کہ دو روٹیاں لے لو۔ اور اگر وہ کہے کہ میرا ارادہ عسکر جانے کا ہے تو کہا جاتا ہے کہ چار روٹیاں لے لو۔ فرمایا کہ اس طرح کم امیدی اور طویل امیدی پر ترکِ ذخیرہ ہونا چاہیے۔"

کم امیدی کے بارے میں ایک عجیب تر روایت منقول ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضرؑ دونوں ایک جگہ جمع ہوئے۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے بھوک کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا:

"بیٹھیے۔" وہ بیٹھ گئے۔ حضرت خضرؑ نے کچھ پڑھا تو ایک ہرن بھاگا ہوا آیا اور دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ پھر آدھ آدھ تقسیم ہو گیا۔ حضرت خضرؑ کے سامنے آدھ بھنا ہوا آن پڑا اور حضرت موسیٰؑ کے سامنے آدھ کچا ہرن آن پڑا۔ حضرت خضرؑ نے کہا:

"اٹھیے، آگ جلائیے اور اپنا حصہ بھون لیجیے۔" اور حضرت خضرؑ خود کھانے لگے۔ حضرت موسیٰؑ نے بھون کر کھایا۔ پھر پوچھا:

"تمہارے سامنے بھنا ہوا کیوں گرا؟"

انہوں نے کہا:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں مجھے کچھ امید باقی نہ رہی۔"

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی سے اہل زہد کی فضیلت میں اس قدر کمی آجاتی ہے جس قدر ذخیرہ اندوزی حقیقی زہد میں مانع ہو۔

حضرت شہر بن حوشب نے ابو امامہؓ سے روایت کیا ایک فقیر کے ذکر میں کہ جس کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور اسامہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا۔ انہوں نے اسے غسل دیا اور اس کی چادر کا اسے کفن پہنایا۔ جب اسے دفن کر چکے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:

"قیامت کے روز یہ اٹھے گا اور اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا اور اگر اس میں ایک خصلت نہ ہوتی تو اس کو یوں اٹھایا جاتا کہ اس کا چہرہ چاشت کے سورج (روشن آفتاب) کی طرح چمکتا ہوگا۔"

صحابہؓ نے پوچھا:

"اے اللہ کے رسولؐ! وہ کیا عادت تھی؟"

فرمایا: "یہ روزے دار، قیامِ شب کرنے والا اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والا ہے۔ مگر جب سردی کا موسم آتا تو گرمیوں کے لیے ایک جوڑا جمع کر لیتا اور جب گرمیوں کا موسم آتا تو آئندہ سردیوں کے لیے ایک جوڑا جمع کر لیتا۔" پھر فرمایا:

"سب سے کم چیز تمہیں یقین اور عزیمتِ صبر کی ملی ہے اور جس کو ان دو میں سے حصہ ملا اسے کچھ پروا نہیں کہ اس کا کس قدر قیامِ شب اور دن کا روزہ رہ گیا۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا قیامت قائم ہوئی اور لوگ گروہ در گروہ مختلف طبقات کے اعتبار سے جنت میں جا رہے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ کی طرف دیکھا جو سب سے بہترین صورت پر اعلیٰ ترین درجہ پر تھا اور اپنی راہ پر سب سے زیادہ تیزی سے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہ افضل ترین گروہ ہے۔ میں ان میں ہی ہوں۔ بتاتے ہیں کہ میں نے آگے بڑھ کر ان میں ملنے اور ان کے ہمراہ ان کے راستہ پر چلنے کے لیے قدم بڑھایا تو دیکھا کہ فرشتوں نے انہیں گھیر رکھا ہے اور مجھے روک دیا اور کہا:

"اپنی جگہ ٹھہرو، حتیٰ کہ تیرے ساتھی آجائیں اور تو ان کے ہمراہ جنت میں جائے۔"

میں نے کہا:

"تم مجھے اس سے کیوں روکتے ہو کہ میں ان میں سے ہو جاؤں۔"

فرشتوں نے جواب دیا ؛

" یہ صرف ان کا راستہ ہے جن کے پاس صرف ایک قمیص تھی اور ہر چیز میں سے صرف ایک ایک تھی اور تیری دو قمیصیں ہیں اور ہر چیز تیرے پاس دو دو ہیں۔ یہ بزرگ بتاتے ہیں کہ میں روتے ہوئے غمزدہ حالت میں جاگ گیا اور اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اب ہر چیز میں سے صرف ایک ایک ہی کا مالک ہوں گا۔"

حضرت حذیفہ مرعشیؒ فرماتے ہیں کہ میں چالیس برس تک صرف ایک قمیص کا ہی مالک رہا اور سلفؒ میں کثرت سے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ جب وہ نیا کپڑا بناتے یا کوئی دوسری چیز لیتے تو پہلی چیز کو اور پہلے کپڑے کو اپنی ملکیت سے نکال دیتے اور ایک ہی چیز کے ذریعہ کئی کام نکالتے۔ یہ سب باتیں حقیقی زہد میں داخل ہیں اور یہ متوکلین کا شرف و فضل ہے۔

ایک خبرِ مشہور میں ہے ؛

اہلِ صفہ میں سے ایک (صحابیؓ) کا انتقال ہوا تو ان کے کفن کے لیے کچھ نہ ملا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

" اس کے کپڑوں کی تلاشی ہو۔"

بتاتے ہیں کہ ہم نے ان کے تہ بند سے دو دینار پائے۔ آپؐ نے فرمایا ؛

" یہ دو داغ لگانے کے مقام ہیں۔"

حالانکہ دوسرے مسلمان وفات پاتے اور مال چھوڑتے مگر آپؐ یہ ارشاد نہ فرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا حال زہد کا تھا اور فقر کا اظہار تھا۔ اس لیے ذخیرہ اندوزی کو معیوب قرار دیا۔

توکل اور دوا کا استعمال

دوا توکل کے منافی نہیں

علاج کرانا اور دوا پینا، انسان کے توکل میں کچھ کمی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم دیا اور اس میں خدا تعالیٰ کی حکمت ہونے کی خبر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

" ہر مرض کی دوا ہے جس نے اسے جان لیا اس نے جان لیا اور جو اس سے ناواقف رہا وہ اس سے ناواقف رہا سوائے سام کے۔ (یعنی موت کے سوا)۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

" اے اللہ کے بندو! دوا کیا کرو۔"

آپؐ سے پوچھا گیا کہ کیا دوا اور جھاڑ، تقدیر کو کچھ بھی لوٹا سکتے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"یہ (دوا یا جھاڑ) بھی تقدیرِ الٰہی میں سے ہے۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے،

"میں فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرا، انہوں نے کہا: اپنی امت کو پچھنے لگوانے کا حکم دیں۔"

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے اس کا حکم دیا اور فرمایا:

"سترہ، انیس اور اکیس (۱۷، ۱۹، ۲۱) - (قمری) تاریخوں کو پچھنے لگوایا کرو، تم پر خون اس قدر جوش نہ مارے کہ تمہیں ہلاک کر دے۔" ان ایام میں خون جوش مارنے سے معلوم ہُوا کہ ان تاریخوں میں پچھنے لگوانا چاہئیں مگر میں سمجھتا ہُوں کہ یہ اہل حجاز کے لیے تاریخیں ہیں۔ اس لیے کہ وہاں گرمی زیادہ ہوتی ہے جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دھوپ زدہ پانی کے بارے میں فرمان ہے کہ "اس سے برص پیدا ہوتی ہے۔" میں نے سُنا ہے کہ یہ خاص کر کے حجاز میں ہے۔

سلف صالحین کی عادت تھی کہ وہ ہر ماہ ایک بار پچھنے لگواتے یہاں تک کہ ان کی عمر چالیس سے اوپر ہو جاتی اور وہ مہینے کے آخر میں پچھنے لگوانا پسند کرتے۔

ایک خبرِ منقطع میں ہے کہ،

"جس نے مہینے کی سترہ تاریخ کو منگل کے روز پچھنے لگوائے اس کے لیے یہ سال بھر کی مرض سے دوا ہے۔"

اہل بیت کے طریق سے مروی ہے کہ،

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر شب کو سُرمہ ڈالتے اور ہر ماہ میں پچھنے لگواتے اور ہر سال دوا پیتے۔"

دوا پینے میں رخصت و وسعت ہے اور دوا نہ پینے میں دشواری اور عزیمت ہے اور اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصت کو قبول کیا جائے جیسے کہ وہ اس کو پسند کرتا ہے کہ عزائم کو لیا جائے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ[1] (اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل) یعنی تنگی نہیں۔

اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو معنی کر کے دوا لینے والا افضل ہوتا ہے؛

۱۔ اس کی نیت، اتباعِ سنت کی ہے۔

---

[1] الحج آیت ۷۸

۲۔ اللہ نے جو رخصت دی اسے لے رہا ہے اور دینِ حنیف کی وسعت کو قبول کر رہا ہے" جناب رسول اللہؐ نے کئی صحابہؓ کو دوا لینے اور پرہیز کرنے کا حکم دیا۔ بعض کی رگ کاٹی ۔ (فصد لیا) بعض کو داغا۔ حضرت علیؓ کی آنکھیں سُوج گئیں تو انہیں فرمایا:

"اس (یعنی تازہ کھجور) سے نہ کھاؤ اور اس سے کھاؤ۔ اس لیے کہ یہ تیرے زیادہ موافق ہے۔ یعنی حریرہ کھا لو جو کہ آٹے یا جَو سے پکایا گیا ہے۔" اس طرح بچھو وغیرہ کے ڈسے کا بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا علاج کا حکم دیا ہے۔

مروی ہے:

"جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ کے سر میں درد ہو جاتا ہے اور مہندی لگایا کرتے۔"

ایک روایت میں ہے:

"جب آپؐ کو پھنسی نکلتی تو آپؐ اس پر مہندی لگاتے۔" حالانکہ آپؐ سب سے زیادہ متوکل اور اتقویٰ ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپؐ نے دوسروں کا علاج فرمایا اور تاکہ یہ سنت ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم آپؐ کی سنت سے اعراض نہیں کر سکتے اور نہ ہی آپؐ کے مقصود سے بے رغبت ہوں گے۔ اس لیے کہ آپؐ نے یہ ہمارے لیے کیا اور بے رغبت ہو کر آپؐ کے ایک فعل کو لغو نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی ایسا کرنا درست ہے کہ حقیقی توکل کے وہم میں انسان آپؐ کی سنت سے ہی اعراض کر بیٹھے اور شرع پر طعن کرنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری اوامر اس لیے ہیں تاکہ مخلوق ان کا اتباع کرے۔ آپؐ نے شدید گرمی کے موسم میں سفر میں روزہ رکھا۔ آپؐ کے سر پر پانی ڈالا گیا اور آپؐ ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہے تاکہ روزہ دار کو ٹھنڈے پانی سے آرام پانے کی رخصت مل جائے۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ ایک جماعت نے روزہ رکھا ہے اور وُہ تکلیف میں ہیں۔ آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور پی لیا (افطار کر لیا) اس پر لوگوں نے بھی افطار کر لیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی خاطر اپنا مخصوص حال ترک فرما دیا۔ آپؐ کو بتایا کہ کچھ لوگوں نے افطار نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا: "یہ لوگ نافرمان ہیں۔"

دوا کرنے والا دُوسرے معنی میں اس طرح افضل ہے کہ وہ عبادت کرنے کے لیے جلدی سے صحت یاب ہونا چاہتا ہے تاکہ جلدی ہی اپنے مولائے کریم کی بندگی اور اس کے اوامر کی اطاعت میں لگ جائے۔ چنانچہ ایک صاحب کو کہا گیا:

"اگر آپ یہ دوا لیں تو صحت یاب ہو جائیں۔"

اُنہوں نے جواب دیا: "میں دوا نہیں کروں گا۔ مجھے میرا خدا ہی بغیر دوا کے صحت عطا کرے گا۔"

بتاتے ہیں کہ ان کی مرض طویل ہو گئی۔ لوگوں نے کہا،

"اس مرض کی دوا بڑی مشہور اور مجرب ہے۔ اگر آپ دوا لیں تو صحت یاب ہو جائیں۔"

انہوں نے کہا:

"میں دوا نہیں لوں گا۔"

آخر کار وہ دائمی مریض ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وحی کی،

"میری عزت کی قسم، جب تک تو وہ دوا نہ کھائے جو لوگوں نے بتائی ہے میں تجھے صحت نہ دوں گا۔"

اب فرمایا:

"جو تم نے دوا بتائی تھی میری وُہ دوا کرو۔" آخر انہوں نے دوا لی اور صحت یاب ہو گئے۔ انہیں جی میں کھٹکا ہُوا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی،

"کیا تم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ مجھ پر تیرے توکل کی وجہ سے میری حکمت باطل ہو جائے کہ جو میں نے جڑی بُوٹیوں میں اشیاء کے فوائد ڈال کر رکھی ہے۔"

بعض روایات میں ہے کہ:

ایک نبیؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بیماری کی فریاد کی، اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی،

"انڈے کھاؤ۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

ایک نبیؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کمزوری کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی:

"دودھ کے ساتھ گوشت کھاؤ۔ اس لیے کہ ان دونوں میں قوت ہے۔"

ایک شیخ کا فرمان ہے کہ: میرا خیال ہے ضعف باہ کا معاملہ تھا۔

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ،

ایک بادشاہ کسی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ وہ ساری مملکت میں مقبول اور نیک بادشاہ تھا۔ اللہ تعالےٰ نے شعیاء نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی:

"اسے کہو: انجیر کا پانی پیو، تیری مرض کے لیے اس میں شفاء ہے۔"

اس سے ایک عجیب تر واقعہ مروی ہے کہ،

ایک قوم نے اپنے نبیؑ کے سامنے شکایت کی کہ ہماری اولاد بدصورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: "اپنی حاملہ عورتوں کو بہی کھلاؤ اس لیے کہ وُہ بچے کو خوبصورت کرتا ہے۔" چنانچہ وُہ لوگ حاملہ عورتوں کو

یہی کھلاتے اور نفاس والیوں کو تر کھجوریں کھلاتے۔ واللہ اعلم۔ یہ طریقہ حمل کے تیسرے چوتھے ماہ ہونا چاہئے۔ ان سب باتوں کے باوجود قوی لوگوں کے لیے ترکِ دوا افضل ہے اور دین کے عزائم میں سے ہے اور اصحابِ عزم صدیقین کا طریق ہے اس لیے کہ دین میں دو طریق ہوتے ہیں:

۱۔ علیحدگی اور عزیمت کا طریقہ

۲۔ اور وسعت و رخصت کا طریقہ اب جو قوت رکھتا ہو۔

وہ عزیمت کی راہ پر چلے وہ اقرب و اعلیٰ راہ ہے اور مقربین اور سابقین یہی لوگ ہیں اور جو آرام و سہولت کی راہ پر چلے تو یہ متوسط راہ ہے مگر یہ دور ہے اور یہ اصحاب یمین لوگ ہیں اور یہی مقتصدین ہیں اور اہل ایمان میں طاقتور اور کمزور، نرم اور سخت دونوں ہوتے ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"طاقتور مومن، اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے زیادہ محبوب ہے اور ہر بھلائی میں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اہل ایمان میں بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں پتھر سے زیادہ سخت ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دُودھ سے زیادہ نرم ہیں۔"

قوی مومنین کا وصف بیان فرمایا:

"مومن کی مثال کھجور کے درخت کی سی ہے کہ اس کے پتے نہیں گرتے۔" (یعنی سیدھا اور مضبوط ہوتا ہے)

اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم میں فرمایا:

اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ[۱] (اس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنی آسمان میں ہے)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن کی مثال ایک بالی کی طرح ہے جس کو ہوائیں دائیں بائیں الٹتی پلٹتی رہتی ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلانے والے مومن کا وصف بیان کیا اور فرمایا:

"مومن کی مثال ایک کھجور کی طرح ہے جس نے عمدہ کھائی اور عمدہ رکھی۔" اور کھانا مانگنے والے مومن کی مثال دی اور فرمایا:

"مومن کی مثال اس چیونٹی کی طرح ہے جو گرمیوں میں سردیوں کے لیے جمع کرتی ہے۔"

---

[۱] ابراہیم آیت ۲۴۔

چنانچہ ضعف و قوت میں اہل ایمان کے مختلف درجات ہیں۔ اس طرح بزدلی اور بہادری، صبر اور واویلا کرنے کے معاملہ میں اہل ایمان کے مختلف مراتب ہیں۔ کہاں وُہ کہ جس میں کھجور جیسی بلندی و قوت ہو۔ اس کا دل مضبوط ہو۔ اس کا عزم آسمان پر ہو۔ پھل کھلائے اور ذخیرہ نہ بنائے اور کہاں وُہ آدمی جو ضعف میں چیونٹی کے مشابہ ہو۔ کھانا مانگے اور ذخیرہ کرتا پھرے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کی فضیلت بتائی اور ان کی تعریف کی۔ اس لیے کہ وُہ گنڈا (تعویذ) نہیں کراتے۔ نہ دغواتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور بتایا کہ یہ لوگ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ چنانچہ توکل کی علت بیان کی اور بتایا کہ انہوں نے یہ تمام کام توکل کرتے ہوئے چھوڑ رکھے۔ پھر حضرت عکاشہؓ نے عرض کیا کہ دُعا کیجیے میں ان میں سے ہوجاؤں۔ آپؐ نے دعا کی۔ کیونکہ آپؐ نے ان کا یہ طریق دیکھا اور ان کا زادِ راہ بھی دیکھا اور قوتِ (توکل) بھی دیکھا۔ چنانچہ انہیں اس کا اہل قرار دیا۔ پھر ایک دُوسرے آدمی نے عرض کیا کہ میرے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے کردے۔ اب مقامات جُدا جُدا ہوتے ہیں ان کی اقتدا نہیں کی جاتی اور نہ ہی ان میں مماثلت کی جاتی ہے جیسے کہ ان کی جانب (لازمی طور پر) بلایا بھی نہیں جاتا۔ اس لیے کہ یہ باتیں، اتحادِ قریب کے باعث قلبی وجدان ہوتے ہیں اور مشاہدہ حبیبؐ کے باعث مشاہداتِ غیبی ہوتے ہیں۔ اب جب آپؐ نے اس کا یہ طریق نہ دیکھا۔ اس کے ہمراہ اس کا زادِ راہ نہ پایا اور اس کا اہل نہ پایا تو اسے اپنی حد پر ٹھہرایا اور اس کے ضعف کے باعث ویسا ہی حکم دیا۔ مگر بڑے خوب صورت انداز سے اس کی درخواست کا جواب دیا۔ اس لیے کہ آپؐ حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

چنانچہ فرمایا:

"تجھ سے اس پر عکاشہؓ سبقت لے گیا۔"

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک دانا حاکم دیکھے کہ ایک گواہ کمزور ہے تو وُہ کہے کہ ایک دوسرا گواہ بڑھا دو، اور صراحت کے ساتھ گواہ کو مجروح نہ بتائے۔ اب اگر وہ عادل ہوتا تو قبول کرلیتا اور مزید گواہ کا مطالبہ نہ کرتا ورنہ مقامات ان کے لیے تنگ نہیں ہیں جو سبقت کرنے والے ہوں اور نہ ہی رسول بخل کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی گواہی دی۔ فرمایا:

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ [1] (اور غیب کی بات پر نہیں بخیل)

البتہ اس میں قوت کا مشاہدہ نہیں ہُوا اور اس مشقت کو اٹھانے میں کمزوری واضح تھی۔ اس لیے اسے

---

[1] التکویر آیت ۲۴

خطرہ میں نہیں ڈالا۔ آپؒ نے کئی احادیث میں داغنے کی ممانعت فرمائی اور ایک آدمی نے اپنے بھائی کی دوا کی مگر وہ اسی مرض میں فوت ہو گیا۔ آپؒ نے اسے فرمایا: "اگر وہ صحت یاب ہو جاتا تو تُو کہتا کہ میں نے اسے صحت دی"۔ یہ اس وجہ سے فرمایا کہ آپؒ جانتے تھے کہ بعض لوگوں کے جی میں یہ خیال آتا ہے کہ نفع و شفاء دراصل دوا کے فعل ہیں۔ حالانکہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلند پایہ محقق موحدین نے اس خیال کے آجانے کے خطرہ کی وجہ سے دوا نہیں لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہا:

"اے پروردگار، دوا اور شفاء کہاں سے ہے؟"

فرمایا: "مجھ سے"۔

عرض کیا گیا، "پھر یہ اطباء کیا کرتے ہیں؟"

فرمایا: "روزی کھاتے ہیں اور میرے بندوں کے دل بہلاتے ہیں۔ حتیٰ کہ میری شفاء آجاتی ہے یا میری (طرف سے) قبضِ (روح ہو جاتی ہے)۔"

ترکِ علاج اعلیٰ مقام ہے

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے،

"جو توکل کا عقیدہ رکھے اور اس راہِ (توکل) پر چلے۔ اس کے لیے زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ شربتوں اور دوسری ادویہ کے ذریعہ علاج چھوڑ دے"۔

حضرت عمران بن حصینؓ بیمار ہو گئے۔ لوگوں نے اشارہ کیا کہ داغ دینا چاہیے۔ انہوں نے انکار کیا۔ لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار زیادتنے زیادہ اصرار کیا۔ وہ حاکم تھا۔ آخر انہوں نے دغوالیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے،

"میں ایک نور دیکھتا تھا اور ایک آواز سنتا تھا مگر جب دغوایا تو یہ سب چیزیں مجھ سے کٹ گئیں"۔

ایک روایت میں ہے کہ فرشتے ان کی زیارت کو جاتے اور وہ ان سے انس حاصل کرتے۔ مگر جب دغوایا تو پھر فرمایا کرتے،

"ہم نے کئی بار دغوایا مگر اللہ کی قسم نہ ہم نے فلاح پائی اور نہ کامیاب ہوئے"۔ پھر اس سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ اعزاز دوبارہ فرمایا جو فرشتوں کے معاملہ کا تھا۔

مطرف بن عبداللہؒ فرماتے ہیں،

"دیکھیے، اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا اعزاز دوبارہ فرمایا جس کے فقدان کے بارے میں نے بتایا تھا"۔ اب اگر ان کے نزدیک یہ گناہ ہوتا تو اس پر نادم نہ ہوتے اور نہ توبہ کرتے اور اگر یہ بات باعثِ نقصان نہ ہوتی تو ملائکہ کو ان سے کیوں ہٹا دیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ بیمار ہوئے ۔ عرض کیا گیا:
"فرمائیں تو آپؓ کے لیے کسی طبیب کو بلائیں؟"
فرمایا، "طبیب نے مجھے دیکھا ہے اور فرمایا ہے کہ:
"میں جیسے چاہتا ہوں کرتا ہوں!"
ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو بیماری کی حالت میں کہا گیا:
"کیا شکایت ہے؟"
فرمایا: "گناہوں کی شکایت ہے۔"
پوچھا گیا، "تو پھر کیا چاہتے ہیں؟"
فرمایا، "اپنے رب کی مغفرت!"
کہا گیا: "کیا کوئی طبیب بلا لائیں؟"
فرمایا، "طبیب ہی نے مجھے بیمار فرمایا۔"
حضرت ابوذرؓ کی آنکھیں متورم ہو گئیں۔ عرض کیا گیا:
"کاش! آپ ان کی دعا کریں؟"
فرمایا: "میں ان کی بجائے (دوسرے معاملہ) میں مصروف ہوں۔"
کہا گیا، "کاش! آپ اللہ تعالیٰ سے صحت و عافیت کی دعا کریں۔"
فرمایا، "میں نے ان دونوں (آنکھوں) سے زیادہ ضروری چیز کی دعا کرتا ہوں۔"
حضرت ابومحمدؒ سے کہا گیا،
"ایک بندے کا توکل کب صحیح ہو سکتا ہے؟"
فرمایا، "جب اس کے بدن میں تکلیف آئے اور اس کے مال میں کمی ہو جائے۔ پھر بھی اس طرف توجہ نہ کرے۔ اپنے حال میں انہماک رکھے اور خدا تعالیٰ کے اوامر کی بجا آوری کرتا رہے۔"
حضرت ربیع بن خیثمؒ کو فالج ہو گیا۔ عرض کیا گیا:
"کاش! آپ علاج کرائیں!"
فرمایا، "میں نے ارادہ کیا تھا مگر پھر مجھے قوم عاد اور ثمود اور ان کے درمیان کی کئی صدیوں کی وہ اقوام یاد آئیں کہ جن کو تکالیف ہوئیں۔ ان میں اطباء بھی تھے مگر دوا کرنے والے اور دوا کرانے والے سب ہلاک ہو گئے اور کسی کو یہ (دوا اور) تعویذ گنڈے کام نہ آئے۔"

حضرت عبدالواحد بن زیدؒ کو فالج گر گیا اور اٹھنے سے معذور ہو گئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اوقاتِ نماز میں صحت دے دیا کرے۔ اس کے بعد حالتِ مرض اچھا یا کرے۔ چنانچہ جب نماز کا وقت ہوتا تو جیسے رسی سے بندھا ہوا آزاد ہوتا ہے۔ اس طرح اُٹھ کھڑے ہوتے اور جب نماز ختم ہو جاتی تو دوبارہ فالج کی حالت طاری ہو جاتی جیسے کہ پہلے تھی۔

بے شمار صدیقین اور سلف صالحین نے دوا نہیں کی مگر یہ خواص حضرات ہیں۔ دیکھیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ستر ہزار ان حضرات کا ذکر فرمایا کہ وُہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ پھر ان کا وصف بیان کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ دغواتے ہیں اور نہ گنڈے کراتے ہیں۔ حضرت عکاشہؓ بن محصن اسدی کھڑے ہُوئے اور عرض کیا:

"اللہ کے لیے دعا کیجیے کہ مجھے ان میں سے کر دے۔"

آپؐ نے دعا فرمائی۔ ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور عرض کیا:

"میرے لیے بھی دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے کر دے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"عکاشہؓ تم پر سبقت کر گیا۔"

چنانچہ آپؐ بخل کی وجہ سے نہیں رُکے بلکہ وجہ یہ ہے کہ خواص اور قوی حضرات کی راہ پر عوام اور کمزور لوگ نہیں چل سکتے۔ جیسے کہ گا ہے خواص نے عوام کی راہ میں بھی زہر کیا۔

اور اس سے عجیب تر واقعہ یہ سنا۔ ایک عارفؒ نے بتایا کہ:

"جب بندہ بخار میں مبتلا ہو۔ اس وقت وہ صاف ترین دل سے ہوتا ہے۔"

اور اس سے ایک زیادہ عجیب تر واقعہ آتا ہے کہ:

"حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات ہُوئی۔ یہ ویران علاقہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھوک کا ذکر فرمایا تو حضرت خضرؑ نے کہا:

"بیٹھیے، دعا کرتے ہیں۔"

حضرت خضرؑ نے کچھ پڑھا تو اچانک ایک ہرن آیا اور آدھ آدھ تقسیم ہو کر دونوں کی طرف گر گیا۔ حضرت خضرؑ کے سامنے بھنا ہُوا ہرن گرا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کچا ہرن پڑا تھا۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا:

"اُٹھیے، جس طرح اس کا فکر سوار کیا تھا اب اس (کو پکانے) کی زحمت بھی اٹھائیے۔ آگ جلائیے اور اپنا حصہ بھون کر کھائیے۔"

راوی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ جلائی اور اپنا حصّہ بھون کر کھایا۔ فارغ ہونے کے بعد حضرت خضرؑ سے فرمایا:

"آپ کا حصّہ بُھنا ہوا کیوں آیا؟"

فرمایا: "اس لیے کہ دنیا میں مجھے کچھ امید (خواہش) باقی نہ رہی تھی۔"

ایک بار فرمایا:

"اس مخلوق میں مجھے کچھ حاجت باقی نہیں رہی۔"

حضرت سہلؒ کا مذہب یہ تھا کہ دوا نہ کی جائے۔ چاہے عبادات سے کمزوری آجائے اور فرائض سے بھی کمی ہو جائے۔ یہ عبادات کی خاطر دوا کھانے سے افضل ہے۔

انہیں ایک بیماری لاحق ہوئی تو وہ دوا نہ کھاتے۔ حالانکہ لوگ اس مرض میں دوا کھایا کرتے۔

جب وہ کسی بندے کو دیکھتے کہ مرض کے باعث بیٹھنے یا نیکی کے کاموں میں معذور ہونے پر وہ دوا کرتا ہے تاکہ نماز میں کھڑا ہو سکے اور نیکی کے کام کر سکے تو اس پر تعجب کرتے اور فرماتے:

"اپنے حال پر راضی رہ کر اس کا بیٹھ کر نماز پڑھنا، قوت حاصل کرنے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے لیے دوا کرنے سے افضل ہے۔"

دوا پینے کے بارے میں ان سے پُوچھا گیا تو فرمایا:

"جو آدمی کچھ دوا کرے تو یہ کمزوروں کے لیے اللہ کی طرف سے رخصت ہے اور جو کچھ بھی دوا نہ کرے تو وہ افضل ہے۔ اس لیے کہ اگر اس نے کچھ دوا کھائی۔ حتیٰ کہ ٹھنڈا پانی بھی پیا تو اس سے پرسش ہو گی کہ کیوں پیا؟ اور جس نے ان میں کچھ حصّہ نہ لیا اس پر پرسش نہیں۔"

اور فرمایا: "جس نے ٹھنڈا پانی نہ پیا اس سے پرسش نہیں۔"

فرمایا: "جس نے ہمیشہ ٹھنڈا پانی استعمال کیا اس پر پرسش موجود ہے۔"

امراض کے فائدے

اس کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک افضل ترین عمل یہ ہے کہ بندے کی قوت کمزور پڑ جائے۔ حتیٰ کہ اس میں حرکت کی تاب نہ رہے۔ اور یہ سب اللہ کے لیے ہو اور قلبی عمل کا ایک ذرہ مثلاً توکل، رضا اور صبر اعضائے ظاہری کے پہاڑ جیسے اعمال سے بھی بہتر ہے۔ یہ اہلِ بصرہ کا مذہب ہے کہ وہ بھوک اور بیداری کے ذریعہ قوت کم کرتے ہیں تاکہ نفس کمزور ہو جائے کیونکہ ان کے نزدیک نفسانی قوت میں شہوانی قوت اور صفاتِ نفس کا غلبہ ہوتا ہے اور اس سے نافرمانیاں، کثرتِ خواہش، طولِ رغبت اور دنیا میں لالچ اور دنیا میں زندہ رہنے کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں: "جب اللہ تعالیٰ نفس پر امراض ڈالتا ہے اور وہاں سے کہ جہاں ہمیں گمان نہیں ہوتا تو امراض دُور کرنے کے لیے علاج نہ کراتے اس لیے کہ مرض انتہائی کمزوری کا نام ہے اور شہوت کو ختم کرنے کا بہت ہی عمدہ طریقہ ہے۔ فرمایا کرتے:

"اجسام کی امراض رحمت ہیں اور دلوں کی امراض سزا ہیں۔"

ایک بار فرمایا:

"بدنی امراض تو صدیقین کے لیے ہیں۔"

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے:

"تو مومن کو دیکھے گا کہ اس کا قلب خوب صحت مند اور بدن بہت ہی بیمار ہے اور منافق کو دیکھے گا کہ اس کا بدن خوب صحت منداور دل سب سے زیادہ بیمار ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

"کیا تم زور آور گدھوں کی طرح ہونا چاہتے ہو کہ نہ تم بیمار ہو نہ تکلیف آئے؟"

مشائخ فرماتے ہیں:

"مومن کو بدن میں مرض ضرور ہوتا ہے یا اس کے مال میں کمی و نقصان آتا رہتا ہے۔" اور ایک قول یہ ہے کہ:

"وہ کسی (مرض وغیرہ) کے غلبہ یا ذلّت سے خالی نہیں ہوتا۔" (یعنی کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی ہی ہے تاکہ اللہ کی طرف رجوع کیے رکھے)

اور اگر بندہ دوا نہ لے تو اسے کئی نیک اعمال حاصل ہوتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کے امتحان پر صبر کی نیت کرتا ہے اس کی قضا پر راضی رہنے، اس کے حکم کو تسلیم کرنے کی نیت کرتا ہے۔ چونکہ یہ صاحبِ یقین ہے۔ اس لیے اس کے نزدیک یہ بہتر ہے اور اس کی حکمت اور آخرت میں اس کا بہتر ہونا سمجھ چکا ہے۔

ایک یہ عمل ہے کہ اس کا مولائے کریم اس سے باخبر ہے اور اس پر نظرِ کرم کیے ہوئے ہے اور اسے حُسنِ اختیار سے نواز رہا ہے۔ چنانچہ اس نے امراض کے ذریعہ اسے نافرمانیوں سے روک دیا جیسے کہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے:

"فقر میرا جیل خانہ ہے اور مرض میری قید ہے۔ میں اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا ہوں اس کے ذریعہ بند کرتا ہوں۔ چنانچہ اگر دوا کرے اور اسے صحت دے دی جائے تو یہ خطرہ ہے کہ اس کا نفس طاقت ور ہو جائے اور خواہشِ نفس اسے برباد کر دے۔ اس لیے کہ عافیتوں میں ہی نافرمانیاں کی جاتی ہیں اور ایک

نافرمانی سے ایک سال کی مرض بہتر ہے۔"

ایک عارفؒ سے ایک آدمی کی ملاقات ہوئی۔ عارفؒ نے اسے کہا:

"میرے بعد تو کیسے تھا؟"

اس نے کہا:

"خیرو عافیت سے تھا۔"

انہوں نے فرمایا:

"اگر تو نے اللہ کی نافرمانی نہیں کی تو تو عافیت میں ہے اور اگر تو نے اللہ کی نافرمانی کی تو نافرمانی سے بڑھ کر کون سی بیماری ہو سکتی ہے؟ جس نے نافرمانی کی وہ عافیت میں نہ رہا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب عراق میں عجمیوں کی ان کی عید کے روز زیبائش دیکھی تو پوچھا:

"یہ کیا ہے جس کو انہوں نے ظاہر کیا؟"

لوگوں نے بتایا:

"اے امیرالمومنین! یہ ان کی عید کا دن ہے۔"

فرمایا: "جس دن ہم اللہ کی نافرمانی نہ کریں ہمارے لیے وہ عید کا دن ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان حق ہے:

وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ[۵۱] (اور بے حکمی کی بعد اس کے کہ تمہیں دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز)

یعنی عافیتیں اور غنا محبوب تھا جو انہیں دکھایا گیا۔

بعض کا فرمان ہے کہ یہ فرعون کا کلام مراد ہے کہ اس نے کہا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى[۵۲] (میں ہوں رب تمہارا سب سے اوپر)

اور یہ طویل عافیتوں کے باعث تھا کہ چار سو برس تک اس کے سر میں درد بھی نہ ہوا اور نہ ہی اس کے بدن میں کوئی مرض ہوا اور نہ اسے کوئی درد ہوا۔ آخر اس نے رب ہونے کا دعویٰ کر دیا اور اگر اسے شقیقہ کا درد یا کوئی اور درد روزانہ ہوتا تو رب ہونے کے یہ سب دعوے بھول جاتا۔

---

۵۱ آل عمران آیت ۱۵۲

۵۲ النّٰزعٰت آیت ۲۴۔

یہ یاد رکھیں کہ انسان جس طرح مال کی وجہ سے سرکشی کرتا ہے اسی طرح صحت و عافیتوں کی وجہ سے بھی سرکشی کرتا ہے کیونکہ جس طرح وہ مال حاصل کرکے مستغنی ہوتا ہے اسی طرح وہ عافیت حاصل کرکے بھی مستغنی ہوتا ہے اور اس ہر ایک میں فتنہ و ابتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ[1] (کوئی نہیں، آدمی سر چڑھتا ہے، اس سے کہ دیکھے آپ کو محفوظ)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو باتوں میں بہت لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں:

۱۔ صحت

۲۔ فراغت۔"

البتہ حالتِ عافیت میں عصمت اور گناہوں سے بچنا ایک دوسری نعمت ہے جیسے کہ غنار کی حالت میں عصمت بھی نعمت کی نعمت ہے۔ یہ اس فرمانِ الٰہی کی دو توجیہوں میں سے ایک توجیہ ہے۔ فرمایا:

أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا[2] (ضائع کیے تم نے اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں)

اس طرح امراض کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان سے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے اور اگر امراض سے نفرت کی تو کثرت سے گناہ اس کے ذمہ باقی رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے:

"بندے پر ہمیشہ بخار اور آفت آتے رہیں گے حتیٰ کہ وہ زمین پر چلتا ہے اور اس پر کچھ بھی گناہ باقی نہیں رہتا۔"

ایک روایت میں ہے،

"ایک دن کا بخار سال بھر کا کفارہ ہے۔" اور اس مفہوم میں ایک بہترین کلام جو سُنا وُہ یہ ہے۔ فرمایا:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دن کا بخار، سال بھر کی قوت ختم کر دیتا ہے۔"

ایک فرمان یہ ہے:

"انسان میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ ایک دن کا بخار تمام جوڑوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب ہر جوڑ کے عوض ایک دن کا کفارہ بن جاتا ہے۔"

---

[1] العلق آیت ۶، ۷

[2] احقاف آیت ۲۰

اور جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخار کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ذکر فرمایا تو حضرت زید بن ثابت رضؓ نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ مجھے ہمیشہ بخار رہا کرے۔

بتاتے ہیں کہ پھر ہر روز انہیں بخار رہنے لگا۔ آخر ان کا انتقال ہوگیا اور انصار کی ایک جماعت نے بھی ایسی دعا کی تھی اور جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ جس کی دو شرافت والیاں (یعنی آنکھیں) لے جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت سے کم پر راضی نہیں۔"

بتاتے ہیں کہ میں نے انصار کو دیکھا وُہ نابینا پن کی دُعا کرتے تھے۔

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بخار آیا اور آپ پر آ جانے کی اجازت مانگی تو فرمایا:

"اہل قبا کی طرف جاؤ۔"

اس فرمانِ الٰہی کی ایک توجیہ یہی ہے۔ فرمایا:

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا[1] (اس میں وُہ مرد ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں)

یعنی امراض کے ذریعہ گناہوں سے پاک ہونا چاہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا:

"جو آدمی اپنے جسم و مال پر مصائب آنے کو ناپسند کرے۔ وُہ عالم نہیں ہے۔" اس لیے کہ اس میں اس کے گناہوں کے کفارہ کی امید ہے اور صدیقین تو بدنی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور منافقین قلبی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدنی امراض میں وہ گناہوں اور سرکشی سے کمزور ہو جاتے ہیں اور قلبی امراض میں اخروی اعمال اور یقین سے کمزوری واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً[2] (اور بھر دیں ان کو اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی)

یعنی ظاہری عافیتیں اور باطنی ابتلاء اس لیے کہ یہ اخروی نعمتیں ہیں۔

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شدید ابتلاء زدہ آدمی کو دیکھا تو دُعا کی:

"اے پروردگار! اس پر رحم فرما دیجئے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی:

---

[1] توبہ آیت ۱۰۸

[2] لقمان آیت ۲۰

"جس کے ساتھ میں اس پر رحم کر رہا ہوں اس پر سے (یہ ہٹا کر) کیونکر اس پر رحم کروں؟" اس مفہوم کی تصدیق کرتے ہوئے ارحم الراحمین تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ[1] (اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور کھول دیں جو تکلیف ہے ان پر، مقرر لگے جائیں اپنی شرارت میں بہکے)

یعنی بتایا کہ ان پر لطف و رحمت کے باعث ہی ترکِ رحمت کی ہے۔

حضرت عبدالواحدؒ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ہمراہ بصرہ کے قریب گئے۔ چلتے چلتے وہ ایک پہاڑ کی کھوہ میں پہنچے۔ ایک آدمی جذام کا شکار ہو کر پڑا تھا۔ اس کے بدن سے پیپ اور خون بہہ رہا تھا اور بہت ہی ناتواں ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا

"کاش! تو بصرہ میں آ کر اس مرض کا علاج کرالے۔"

اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر میرے بارے میں کہا:

"اے میرے مولا! تُو نے ان لوگوں کو مجھ پر کیوں مسلط کر دیا کہ مجھے تجھ پر ناراض کرنا چاہتے ہیں اور تیری قضا کو میرے دل میں ناپسند بناتے ہیں۔ اے میرے مولا! میں اس گناہ کی معافی مانگتا ہوں۔ تجھے عتاب کا حق ہے میں کبھی بھی اس گناہ کی طرف نہ آؤں گا۔"

بتاتے ہیں کہ پھر اس نے چہرہ پھیر لیا اور ہم اسے چھوڑ کر چلے آئے۔

حسبِ مرتبہ ہی ابتلاء ہوتا ہے

حدیث میں ہے:

"ہم انبیاء کے گروہ کا تمام لوگوں سے زیادہ سخت ابتلاء (امتحان) ہوتا ہے۔ پھر جو درجہ بدرجہ مشابہ ہو، بندے کا امتحان اس کے ایمان کی مقدار پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایمان مضبوط ہو تو اس پر ابتلاء بھی سخت آتا ہے اور اگر اس کا ایمان کمزور ہو تو اس پر ابتلاء بھی ہلکا ہوتا ہے۔ جیسے کہ تم سونے کو آگ میں جانچتے ہو تو بعض خالص سونا نکلتا ہے اور بعض اس سے کم درجہ کا ہوتا ہے، اور بعض سیاہ جلا ہوا نکلتا ہے۔"

اہل بیت کے طریق سے ایک حدیث آتی ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اُسے ابتلاء میں ڈالتا ہے۔ اب اگر اس نے صبر کیا تو اسے چن لیتا ہے اور اگر راضی ہو گیا تو اسے برگزیدہ بنا لیا۔"

---

[1] المومنون آیت ۷۵

امراض کا ایک فائدہ یہ ہے کہ صحت کے ایام میں وہ جو جو اعمال صالحہ کرتا تھا فرشتہ اس کے وہ اعمال صالحہ اب بھی لکھتا ہے اور جو جو نیکیاں کرتا رہتا تھا فرشتہ اب ان سے بہتر نیکیاں اور اعمال صالحہ درج کرتا ہے اس لیے کہ صحت کے ایام میں گاہے اعمال میں کوئی خرابی آجاتی تھی اور اب اللہ تعالیٰ کی پسند ہے کہ اس نے اسے تکالیف میں ڈال دیا اور یہ اس کے اپنے انتخاب سے بہتر ہے کہ وہ اپنے انتخاب پر اللہ کے سامنے اعمال صالحہ پیش کرے۔ اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہے۔ فرمایا:

"افضل ترین عمل وہ ہے کہ جس پر جانوں کو کراہت ہو"

بتایا کہ اس سے مراد جان و مال پر آنے والی آفات ہیں جن کو انسان ناپسند کرتا ہے۔ حالانکہ وُہ ان کے لیے بہتر ہے۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَعَسَىٰٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (اور شاید تم کو بُری لگے ایک چیز اور وُہ بہتر ہو تم کو، اور
وَعَسَىٰٓ اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ[1] شاید تم کو خوش لگے ایک چیز، اور وُہ بری ہو تم کو)

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ انسان فقر، افلاس اور گمنامی کو ناپسند کرتا ہے۔ حالانکہ آخرت میں وُہ اس کے لیے بہتر ہے اور انجام میں سب سے محمود ہوتا ہے اور گاہے وُہ غناء، عافیت اور شہرت کو پسند کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ کے ہاں یہ بات اس کے لیے بری اور انجام میں خراب ہوتی ہے۔

حدیث میں یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے:

"میرے بندے کے لیے وہ نیکی لکھو جو یہ کرتا تھا۔ اس لیے کہ اب یہ میری قید میں ہے۔ اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو اس کے گوشت کے بدلہ میں بہتر گوشت عطا کروں گا اور اس کے خون سے بہتر خون دوں گا اور اگر میں نے اسے وفات دی تو اسے اپنی رحمت کی طرف وفات دوں گا۔" چنانچہ بدل کر دنیا دراصل اللہ تعالیٰ کے حسنِ اختیار کی صفت ہے کہ دنیا و آخرت اور اس بندے کی خواہش سے بہتر چیز عنایت فرمائے گا۔

شفاء صرف اللہ کے قبضہ میں ہے

توکل اور ترکِ توکل میں اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا، توکل میں سمجھتا ہے کہ بیماری کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب وقت ختم ہوگا تو مریض اس وقت یقیناً صحت یاب ہو جائے گا۔ البتہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرماتا ہے کہ اگر اس نے دوا لی تو اس کو مثلاً دس روز میں شفاء دوں گا اور اگر دوا نہ لی تو بیس روز میں جا کر شفاء دوں گا، تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو مباح کیا اس رخصت کو حاصل کر سکے۔ اب وہ جلدی دس روز میں ہی صحت یاب ہونے کی کوشش کرے گا

---

[1] البقرہ آیت ۲۱۶

تاکہ جلدی صحت حاصل ہو جائے اور عافیت جلدی پا سکے اور یہ بھی اعتقاد ہو کہ صحت دوا میں نہیں اور نہ ہی خود دوا نفع دیتی ہے بلکہ اللہ ہی صحت دینے والا اور وہی نفع دینے والا ہے۔ اب شفاء و نفع خدا کا فعل ہے۔ البتہ لطیف حکمت کے باعث اسے دوا کے ذریعہ عطا کیا۔ اس کے سوا دوسرا کوئی یہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی دوا اس پر قادر ہے کیونکہ جڑی بوٹیوں کی جبلت میں یہ رکھ دیا گیا۔ ان میں اسباب ڈالنے والا ہی ان کی جبلت بنانے والا ہے اس لیے کہ ان میں یہ رکھنا اور ان کی یہ خاصیت، کسی طبیب کے عمل سے نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ عمل کرتا ہے اور شفاء اور مریض کے درمیان جمع کرتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھوں پر اس کی روزی کا سبب ظاہر ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ [1] (اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو)

اسی طرح عارفین کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ روٹی سیر نہیں کرتی اور پانی سیراب نہیں کرتا جیسے کہ مال مستغنی نہیں کرتا اور عدم، محتاج نہیں بناتا۔ اس لیے کہ اللہ ہی کھلانے پلانے والا ہے۔ وہی سیر کرنے اور سیرابی دینے والا ہے جیسے کہ وہی غنی کرنے والا اور محتاج کرنے والا ہے جسے چاہے اور کھانے پینے میں سیری اور سیرابی وہی ڈالنے والا ہے اور نفس میں اپنی حکمت و رحمت سے وہی غناء و فقر ڈالنے والا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ ہی بھوکا اور پیاسا کرنے والا ہے۔ چنانچہ بھوک و پیاس پر کھانا اور پانی لیا جاتا ہے تو وہی ان میں اثرات ڈالتا ہے جیسے کہ وہی دن پر رات اور رات پر دن بھیجتا ہے۔ چنانچہ ہر دلیل دوسرے پر غالب آکر اسے بہا لے جاتی ہے۔ موحدین کے نزدیک یہ بات رات دن کی طرح اور ان کے مساوی ہے۔

علاج میں کیا نیّت کرے؟

امراض و ادویہ، ایک چیز کو اس کی ضد پر ڈال کر اسے قلب سے زائل کر دیتی ہیں۔ یہ سب اللہ کے اذن سے ہوتا ہے اور عوام میں ان باتوں میں شرک دراصل چیونٹی سے مخفی تر ہے۔ اہل یقین اور توحید صحیح سمجھنے والے حضرات، ان سب سے بری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی ایک توجیہ یہی مفہوم ہے،

اَلَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى [2] (جس نے دی ہر چیز کو اس کی صورت، پھر راہ دکھائی)

یعنی ہر رنگ اور ہر جنس کو اس کی خلقت و طبیعت دی۔ یعنی ہر چیز کو نفع و نقصان کے لیے صورت و وصف عطا کیا۔

---

[1] الصّٰفّٰت آیت ۹۶

[2] طٰہٰ آیت ۵۰

اب اگر بیمار نے صحت یابی کے لیے جلدی کی اور وہ صحت پا گیا تو یہ قضائے الٰہی اور قدرتِ خداوندی ہے کہ سرعت کے ساتھ اسے صحت مل گئی۔

اور اگر صحت حاصل کرنے اور علاج میں اس کی غرض مولائے کریم کی عبادت کرنا اور اس کے اوامر پر کاربند ہونا ہو تو یہ بات اس کے لیے مزید ثواب و اجر کا باعث ہے اور اس کے مقامِ توکل میں کچھ کمی نہ ہوگی۔

اگر نفسانی مزوں اور عافیتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے صحت چاہے تو یہ بات دنیا کے دروازوں میں سے ایک ہے اور مباح دنیا میں داخلہ ہے۔ اس سے وُہ توکل کی فضیلت اور حقیقی توکل سے نکل گیا اور جس قدر اس کا دنیا میں رہنا قص ہے۔ اس قدر اس کے توکل میں کمی آجائے گی۔

اور اگر سرعتِ تندرستی سے اس کا مقصد نفس کو قوی کرنا ہے تاکہ خواہشِ نفس پُوری کر سکے اور مولائے کریم کی نافرمانی کرے تو اس کی بدنیتی اور بُرائی کے عزم پر اسے سزا ملے گی۔ مباح سے ممنوع کی جانب جانکلا۔ اب وہ توکل کی حد اور ابتداً سے بھی باہر ہوگیا۔ یہ بات مذموم اور قابلِ نفرت دنیا کے دروازوں میں سے ہے۔

اگر اس کی نیت یہ ہو کہ جلدی صحت ہو جائے تاکہ خرچ کرنے کے لیے اور خدا کے کاموں میں لگانے کیلئے رقم جمع کرنے کا کاروبار کرنے اور کمانے میں لگے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ اگر بقدرِ ضرورت میں کوشش کرے اور کمزور اہل و عیال پر خرچ کرے اور ضرورت کی بنا پر ایسا کرے تو یہ حق ہے اور یہ پہلے طبقہ کے ساتھ ہے اور یہ بھی اخروی امور میں سے ایک ہے اس پر اسے اجر ملے گا اور اسے توکل سے خارج نہ کرے گا۔

اور اگر کثرتِ مال اور فخر و غرور کرنے کے لیے کمائے اور اس کی پرواہ نہ کرے کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا تو یہ آدمی نافرمانیوں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ یہ اللہ تعالیٰ سے دُور کرنے اور دنیا میں برباد ہونے کا بہت بڑا دروازہ ہے اور عام لوگوں کے علاج وغیرہ میں یہی نیت ہوتی ہے۔ اب اگر متوکل آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرتے ہُوئے اور خدا کی رضا و حکم اور اس کے ابتلاء پر مطمئن رہ کر دوا استعمال نہ کی اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ ہر مرض کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ جب وُہ وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے صحت لوٹ آئے گی۔ البتہ یہ بیس روز کے بعد ہوگا تو وہ صبر کرتا اور راضی رہتا ہے اور اپنے آپ کو دس دن مزید دُکھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور قضائے الٰہی پر راضی رہنا اور اس کے ابتلاء پر صبر کرتا ہے۔ اس کے ابتلاً پر حسنِ ظن رکھتا ہے اور اس کی قضاء پر کوئی تہمت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کے اعتبار پر حسنِ ظن رکھنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قضائے الٰہی میں تہمت نہ لگائے۔

مرض پر صبر کرنا

اور یہ کیوں نہ ہو جبکہ اس میں نص بھی آئی ہے کہ ایک آدمی نے کہا:
"اے اللہ کے رسولؐ مجھے نصیحت فرمائیے!"

فرمایا: " اللہ پر کسی چیز میں تہمت نہ رکھو کہ جس کا تجھ پر وہ فیصلہ کر دے۔"

اس مفہوم کی ایک اور روایت آتی ہے جس میں اس میں شدت ہے۔ فرمایا:

" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جو میرے ابتلاء پر صبر نہ کرے، میری قضاء پر راضی نہ ہو اور میری نعمتوں کا شکر نہ کرے اسے چاہیے کہ میرے سوا کسی دوسرے کو رب بنالے۔"

اور مرض پر صبر کرنا دراصل دنیا میں زہد کی ایک راہ ہے، یعنی جس قدر نفسانی نعمتوں میں اس کی رغبت کم ہوگی۔ اس قدر اسے زہد حاصل ہوگا کیونکہ بدن بھی ملکیت میں سے ہے اور جس قدر یہ کم ہوگا، اس قدر دنیا کی کمی ہوگی اور قلب ملکوت کی چیز ہے۔ یہ جس قدر زیادہ ہوگا اس قدر آخرت میں اضافہ ہوگا اور مزید برآں یہ بات صبر کا ایک دروازہ ہے کہ جس قدر کمی آئے اس پر صبر کرتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ[1] (اور نقصان سے مالوں کے اور جانوں کے)

یعنی بیماریاں اور امراض۔ اور پھر فرمایا:

وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۔ (اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو)

یعنی مالوں میں کمی پر یعنی مال چلے جانے پر۔ اس طرح اس کا مال سے انفصال ہونے پر اسے زہد کہا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جلدی صحت یاب ہونے میں نافرمانیاں ہو جانے سے بے خوف نہیں ہوتا۔ اب جب مرض کا وقتِ مقررہ ختم ہوگا تو وہ بغیر دوا کے ہی اللہ کے اذن سے صحت یاب ہو جائے گا اور مرض کی حالت میں اسے تجدیدِ توبہ، گناہوں پر افسوس کرنے، کثرتِ استغفار، حسنِ نعمت، کم امیدی اور کثرت کے ساتھ موت یاد کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔

روایت میں ہے:

" لذتوں کو مٹانے والی کو کثرت سے یاد کرو۔" یعنی موت کو خوب یاد رکھو اور موت یاد رکھنے کے سلسلہ میں سب سے بڑی باعث چیز امراض ہیں۔" چنانچہ بتاتے ہیں:

" بخار موت کا پروانہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ[2] (کیا نہیں دیکھتے کہ وہ آزمانے میں آتے ہیں ہر برس ایک بار یا دو بار)

---

[1] البقرہ آیت ۱۵۵ [2] توبہ آیت

یعنی امراض اور مختلف تکالیف سے ان کی آزمائش کی جاتی ہے۔

مشائخ بتاتے ہیں کہ اگر کوئی بندہ دوبار بیمار ہوا اور وہ پھر بھی توبہ نہ کرے تو موت کا فرشتہ کہتا ہے:

"اے غافل! تیرے پاس مجھ سے یکے بعد دیگرے قاصد آیا مگر تو نے قبول نہ کیا۔"

اور سلفؒ کی یہ عادت تھی کہ ان پر سال گزر جاتا اور ان کے مالوں پر کوئی خسارہ وغیرہ نہ آتا تو انہیں گھبراہٹ ہوجاتی۔

مومن پر چالیس دن ایسے نہیں گزرتے کہ اس کو کوئی پریشانی یا تکلیف نہ پہنچے۔ سلف صالحینؒ اتنی مدت کسی تکلیف کے بغیر گزرتے دیکھ کر وہ پریشان ہوجاتے۔

حضرت عمارؓ نے ایک عورت سے نکاح کیا وہ بیمار نہ ہوتی تھی۔ آپؓ نے اسے طلاق دے دی۔

ایک عورت نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ساتھ نکاح کی درخواست کی۔ اس کی خوب تعریف کی گئی۔ آپؐ نے اس سے نکاح کا ارادہ کر لیا۔ کسی نے بتایا کہ یہ عورت کبھی بیمار نہیں ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا:

"ہمیں ایسی کی ضرورت نہیں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر درد وغیرہ کا ذکر کیا تو ایک آدمی بولا:

"سر درد کیا چیز ہے میں اسے نہیں جانتا؟"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھ سے دور ہوجا۔ جو کسی دوزخی آدمی کو دیکھنا چاہے وہ اس کو دیکھ لے۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے:

"بخار در اصل نارِ دوزخ سے مومن کا حصہ ہے۔" (جو دنیا میں مل گیا اور آخرت میں آزادی حاصل ہوگئی)

حضرت انس اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ:

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا قیامت کے روز شہداء کے ساتھ دوسرے بھی ہوں گے؟"

فرمایا: "ہاں، جس نے ہر روز بیس مرتبہ موت کو یاد کیا۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"جو اپنے گناہوں کو یاد کرے تو اسے غمگین بنا دیں۔" اور اگر اس نے دوا چھوڑ دی اور بغیر دوا کے صحت یاب ہوگیا تو یہ قضائے الٰہی اور قدرتِ خداوندی ہے کہ دیر سے صحت ہوئی۔

مقامِ وبا میں جانے کی ممانعت

جس سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف تشریف لائے تو اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلافِ رائے ہوا۔ جب آپؓ جابیہ پہنچے تو

شام سے خبر آئی کہ وہاں بہت سخت وبا ہے اور موت کا بازار گرم ہے۔ لوگ ٹھہر گئے اور دو گروہ بن گئے۔ بعض کی رائے ہوئی کہ ہم وبا، میں داخل نہ ہوں گے۔ ایسا کرنا ہلاکت میں پڑنا ہے اور یہ بات جانیں ہلاک کرنے کا باعث ہوگی۔"

دوسرے گروہ نے کہا:

"بلکہ ہم داخل ہوں گے اور اللہ پر توکل کریں گے اور تقدیر سے نہیں بھاگیں گے اور نہ موت سے راہِ فرار اختیار کریں گے ورنہ ایسے ہوں گے جن کے بارے میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ[1] (کیا تو نے نہ دیکھے وہ لوگ جو نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے)

آخر سب نے حضرت عمرؓ کی جانب رجوع کیا اور ان کی رائے معلوم کی۔ حضرت عمرؓ نے واپس جانے والوں اور مقامِ وبا میں داخل نہ ہونے والوں کی موافقت فرمائی۔ دوسروں نے کہا:

"کیا ہم اللہ کی تقدیر سے بھاگیں گے؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا:

"ہاں، اللہ کی تقدیر کی طرف!" (بھاگیں گے)

اس کے بعد مثال دی اور فرمایا:

"دیکھو، اگر تم میں سے کسی کا بکریوں کا گلہ ہو۔ اس کی دو وادیاں ہوں۔ ایک سرسبز وادی ہو اور دوسری خشک وادی ہو تو اب اگر یہ شاداب وادی میں چرائے گا تو کیا قدرِ الٰہی کے ساتھ نہیں ہوگا؟ اور اگر خشک وادی میں چرائے گا تو بھی قدرِ الٰہی کے ساتھ چرائے گا۔"

اس پر یہ گروہ خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلایا تاکہ ان کی رائے معلوم کریں۔ بتاتے ہیں کہ وہ موجود نہ تھے اور جس جگہ ٹھہرے تھے وہاں انہیں دیر ہوگئی۔ حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھی اس رائے پر پختہ ہوگئے۔ اب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی رائے معلوم کرنا تھا۔ جب صبح کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ملاقات ہوئی تو ان سے حضرت عمرؓ نے پوچھا تو انہوں نے کہا:

"اے امیرالمومنین! میرے پاس اس سلسلہ میں کچھ ہے جو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ اکبر"۔

---

[1] البقرہ آیت ۲۴۳

آپؐ فرماتے ہیں کہ:

"جب تم سنو کسی علاقہ میں وبا ہے تو اس (علاقہ) میں نہ جاؤ اور جب کسی علاقہ میں تم ہو اور وہاں وبا ہو تو اس سے بھاگ کر وہاں سے نہ نکلو۔"

حضرت عمرؓ کو رائے کی موافقت پر خوشی ہوئی اور مسلمان جابیہ سے واپس آ گئے۔

علاج اور ترکِ علاج دونوں جائز ہیں

دوا کرنا اور دوا نہ کرنا دونوں جائز ہیں۔ ان میں ایک تو صبر کرنے والوں اور برداشت کرنے والے کا طریق ہے اور یہ ترکِ کسب کا طریق ہے۔ بھوک جو کہ بدن کی مرض ہے اس کے وقت کمانا تاکہ بندہ روٹی کی جلدی کرے اور بھوک کا علاج کرے۔ یہ جائز ہے تاکہ اس کا توکل مجروح نہ ہو کیونکہ یہ جائز ہے اور اس کا امر بھی دیا گیا ہے اور اگر کمانے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ عبادت پر قوت حاصل ہو جائے۔ اللہ کی راہ میں محنت کر سکے۔ نیکی اور پرہیزگاری پر مدد مل سکے تو یہ باعثِ شرف و فضیلت ہے۔ اور اگر کمانے سے مقصود ہو کہ شہوتوں کے لیے اور نفسانی مزے لوٹنے کے لیے کھائے تو اس کے توکل میں اس قدر نقصان ہوگا اور اسے حقیقی توکل سے خارج کر دے گا۔ اب یہ ایک دنیاوی طریق ہے البتہ یہ مباح ہے اور اگر کمانے سے اس کا مقصد یہ ہو کہ کثرتِ مال ہو جائے۔ مال جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کا ارادہ ہو تو یہ اپنی کمائی میں نافرمان اور اپنے پروردگار کا مخالف ہوگا اور یہ خواہشِ نفس کی سب سے بڑی راہ ہے۔ پھر اگر نہ کمائے اور بھوک پر صبر کرے اور کمی و فقر پر راضی ہو جائے تو اس کی روزی تو ہر صورت میں اپنے وقت پر آئیگی۔ چاہے روزی تھوڑی سی ہو اور وسعت نہ ہو۔ البتہ یہ اعلیٰ صبر، حسنِ رضا، سکونِ نفس اور اطمینانِ قلب کا محتاج ہے۔ اگر یہ مفاہیم پائے گئے تو یہی توکل ہے۔ اس طرح وہ حسنِ یقین، رازق پر وثوق رکھے اور آخرت میں زیادہ نفع بخش اور افضل کام میں مصروف ہونے کے باعث ترکِ کسب میں وہ اعلیٰ درجہ کا مالک ہے اور اگر (بھوک کی وجہ سے) اس کی ہمت ٹوٹ جائے۔ اس میں اضطراب آ جائے اور قضائے الٰہی کو ناپسند کرنے لگے اور اس طرح واویلا مچائے اور شکایات کا دفتر کھولنے پر تل جائے تو ایسے آدمی کے لیے کمانا ہی افضل ہے اور ایسا آدمی ترکِ کسب میں خرابی اٹھائے گا۔ اس طرح مرض کی وجہ سے شکوہ و شکایت کرنے لگے۔ حکمِ الٰہی پر ناراض ہو جائے اور مرض کی وجہ سے لوگوں میں اس کی حالت بدل جائے اور بداخلاق ہو جائے تو ایسے آدمی کے لیے دوا کرنا افضل ہے اس لیے کہ دوا نہ کرکے یہ مزید نقصان اٹھائے گا۔

عمرو بن قیس، عطیہ سے اور وہ ابو سعید خدریؓ سے اور وہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"یہ بات کمزوریِ یقین کی ہے کہ تو اللہ کی ناراضگی لے کر لوگوں کو راضی کرے اور اللہ کے دیے ہوئے رزق پر لوگوں کی تعریف کرے اور اللہ تعالیٰ جو تجھے نہ دے اس پر لوگوں کی مذمت کرے۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ کے رزق کو

ایک حریص کا لالچ نہیں کھینچ سکتا اور نہ ہی کراہت کرنے والے کی کراہت اسے ہٹا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حلم وجلال کے ساتھ رضا ویقین میں آرام وفرحت رکھ دی اور شک وناراضگی میں غم وحزن رکھ دیا۔

متوکل کا مشاہدہ یکساں رہتا ہے

چاہے حالات کیسے ہی بدل کر آئیں

خواص کے نزدیک ان کے اپنے ہاتھوں اور اپنی کمائی کے ذرائع سے آنے والی روزی اور جو دوسروں کے ہاتھوں اور دوسروں کی کمائی کے ذریعہ سے روزی آتی ہے۔ یہ دونوں نظرِ یقین کے ساتھ یکساں ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک عطا کرنے والا ایک ہی ہے اور ساری عطا روزی ہے۔ اس لیے کہ ہاتھ دراصل عطا کرنے کے ظروف ہیں۔ اب یہ برابر بات ہے۔ چاہے تیرا ہاتھ ظرف ہو یا دوسرے کا ہاتھ ظرف ہو اور کاروبار چاہے تیرا اپنا کاروبار ہو یا غیر کا کاروبار ہو۔ یہ سب تیری روزی ہے۔ مزید برآں ہر چیز کے لیے ایک حکم ہے اور ہر چیز میں ایک حکمت ہے اور ہر چیز میں ایک نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ۔ (یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قدو قامت ستون جیسے تھے۔ جن کے برابر شہر میں کوئی شخص پیدا نہیں کیا گیا)

ان کے ہاتھوں سے بننے اور ان کے ان سے فارغ ہونے کے بعد ان کی تخلیق کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ ان دونوں جیسے معاملات میں ان کے نزدیک یہ بات برابر ہے۔ چاہے قدرتِ الٰہی کے ہاتھ سے ظاہر ہوا اور اس میں کوئی واسطہ یا مخلوق نہ تھی یا وُہ چیز جو حکمت اور ترتیبِ عرف کے باعث ان کے ہاتھوں ظاہر فرمائی۔ یہ دونوں برابر ہیں اس لیے کہ قدرت بھی عطا کرنے کی ظرف ہے اور یہ ظرفِ عطا کے مقام پر ہے کہ جس کے ساتھ عطا ظاہر ہوئی۔ چنانچہ یہ بھی بندوں کے ہاتھوں یعنی انسان کے اپنے ہاتھوں اور دوسروں کے ہاتھوں کی طرح ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت وحکمت دراصل ملکوت وملک کے خزانوں میں سے دو خزانے ہیں۔ چنانچہ یہ تین مفاہیم یعنی

۱۔ جو تیرے ہاتھ یا تیرے کسب سے ظاہر ہوا یا

۲۔ غیر کے ہاتھ کی کمائی سے ظاہر ہوا، یا

۳۔ جس کو معتاد طریقہ کے بغیر اور کسی واسطہ کے بغیر قدرت نے ظاہر کیا۔

یہ تینوں صورتیں اہلِ یقین کے نزدیک یکساں ہوتی ہیں۔ ایمانِ کامل، یقینِ محکم اور مشاہدۂ تام کے باعث وُہ ایک کو دوسری صورت پر ترجیح نہیں دیتے۔ اس لیے کہ یہ سب ایک ہی حکیم اور ایک ہی قادر سے حکمتِ کاملہ اور قدرت

نافذہ ہے۔

واسطوں سے ظاہر ہونے والا اور قدرت کا براہِ راست ظاہر کردہ امور، علماء کے نزدیک یکساں ہے۔ چنانچہ اولیاء و صدیقین کی کرامات اور جوابات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں وہی ہوتا ہے جو قدرت انہیں ظاہر کرے یا ضرورت و فاقہ کے وقت بغیر مانگے اور میلانِ نفس کے بغیر جو جو مخلوق کے ہاتھوں ان کی خاطر خرچ وغیرہ ظاہر ہُوا۔ ان کے نزدیک کرامات ہیں یہ دونوں مساوی ہیں اور اجابتِ معاملات میں یہ ان دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور ان سب کو قدرت کے نشانات سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ عارفین کو طرح طرح کے پہنچنے والے ارزاق کا مشاہدہ ہوا کہ یہ ارزاق ان کے پاس امانت ہیں اور تھوڑا تھوڑا مال اہلِ حق کو دیا جائے البتہ عارفین کرام ان سے خود نہیں مانگتے اور اس مال کا مطالبہ نہیں کرتے۔ اگرچہ ان کے نزدیک ان میں حسن ادب ہے اور حسنِ ادب کے باعث ہی انہوں نے مطالبہ ترک کر دیا۔ انہیں اپنے رازق پر کامل یقین ہوتا ہے کہ وُہ ان کا حصّہ کامل طور پہ عطا کرے گا، چنانچہ جیسے کہ انہوں نے اس کی طرف سے سخاوت پر نظر رکھی اسی طرح اس کے قدیم وعدہ ازلی پر یقین رکھا۔

اسی طرح انہیں ان کا حصّہ ادا کرنے والے اصحابِ مشاہدہ کا حال ہے جنھوں نے ان کے حقوق ادا کیے وُہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ان کی امانتیں انہیں ادا کیں اور ان کے حقوق ادا کیے اور ایسا کر کے انہیں اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اصحابِ حقوق کے حقوق ادا کر کے انہیں فرحت حاصل ہوتی ہے اور وہ حسنِ توفیق اور ادائیگی حقوق میں اعانت پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں جیسے کہ کسی آدمی پر بہت بڑی مقدار میں قرض ہو اور وہ اسے ادا کر دے تو اس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور اسے خوشی ہوتی ہے۔ یہ معرفت میں مقام پانے والوں کا حال ہے اور یقین کے باعث انہیں یقین کا حال حاصل ہوتا ہے۔ توکل کی دولت حاصل کرنے والوں کا یہ بلند تر مشاہدہ ہے۔

توکل کی زہد سے مشابہت

یاد رکھیے توکل روزی میں کچھ بھی کمی نہیں کرتا۔ البتہ یہ فقر میں اضافہ کرتا ہے اور بھوک و فاقہ کو بڑھاتا ہے اور یہ بات متوکل کی روزی ہے اور اس مخصوص انداز پر زاہد کے لیے یہ اخروی روزی ہے کہ وُہ دنیا سے محروم رہتا ہے۔ کثرتِ مال سے بچا رہتا ہے اور دنیاوی وسعت سے دُور رہتا ہے اور توکل و زہد ہی اس حالت کا باعث ہوتے ہیں۔ اب دنیا جس قدر اس سے دُور ہوتی ہے آخرت میں اس کے اسی قدر درجات بلند ہوتے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"دنیا کی کمی آخرت کا اضافہ ہے اور دنیا کی زیادتی آخرت کا نقصان ہے۔ جس آدمی کو دنیا میں سے کچھ ملا، اسی قدر آخرت میں اس کا درجہ کم ہوگیا چاہے وُہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صاحبِ شرف ہو۔"

ایک فرمان یہ ہے کہ:

"میری زمین میں دنیا و آخرت دو سوتنیں ہیں جس نے ان میں سے ایک کو راضی کیا اس نے دُوسری کو ناراض کیا۔"

ایک آدمی نے ایک عالمؒ سے کہا:

"میں ایک محلہ میں کام کرتا تھا وہاں میرے سوا دُوسرا کوئی سبزی فروش نہ تھا۔ آخر ایک دوسرا سبزی فروش میرے مقابلہ میں آگیا مجھے خطرہ ہے کہ ایسا ہونے کی وجہ سے میرے رزق میں کچھ کمی آجائے گی۔"

انہوںؒ نے فرمایا:

"یہ بات تیرے رزق میں سے کچھ بھی کمی نہیں کر سکتی۔ البتہ تیری فراغت میں اضافہ کر دے گی تو زیادہ وقت اس حالت میں بیٹھے گا کہ کچھ فروخت نہ ہوگی۔"

ایک جماعت نے توکل کا دعویٰ کیا مگر وہ اس راہ میں غلطی میں جا پڑے۔ ان لوگوں نے خوراک و لباس میں عیاشی سے کام لیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس طرح سے ان کی روزی میں تو کمی ہوگی نہیں اور انہیں یہ وہم ہوگیا کہ دوسرے لوگ زہد و توکل سے ناواقف ہیں۔

مرض ظاہر کرے یا چھپائے؟

جو آدمی دوا نہ لے اس کے لیے افضل یہ ہے کہ اپنی مرض پوشیدہ رکھے۔ اس لیے کہ یہ نیکی کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ نیز یہ اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان ایک معاملہ ہے اس کو پوشیدہ رکھنا ہی افضل اور باعثِ سلامتی ہے۔ ہاں اگر ظاہر کرنے میں کوئی بہتر نیت ہو یا وہ امام ہو اور لوگ اس کا کلام سن کر اور نقش پا پر چل کر ہدایت پاتے ہو اور وہ آدمی معرفت میں پختہ ہو، مرض بتا رہا ہو اور اس کا قلب خدا کی تقدیر پر راضی ہو یا ان لوگوں میں سے ہو جو ابتلاء و تکلیف کو نعمت سمجھتے ہوں اور نعمتِ الٰہی کا ذکر کر کے ثواب و اجر بتانا چاہتا ہو تو ان صورتوں میں ظاہر کرنا جائز ہے اور جس کا حال ناقص ہو، اپنے آقا کی شکایت کرنے لگ جاتا ہو۔ ایسے آدمی کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوا نہ کرے اور مرض کو ظاہر نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح دوا سے نفس کو آرام آتا ہے اس طرح شکوہ و شکایت کرنے سے بھی ابتلاء سے نفس کو آرام ملتا ہے اور کوئی عالم ایسی حرکت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ بندے کے سامنے دفترِ شکایت کھولنے کی بجائے مولائے کریم نے اس کے دوا پی کر آرام پانے کو جائز قرار دے دیا کیونکہ مرض کا اظہار کرنے میں یہ خطرہ ہے کہ تصنع کرے یا مرض میں مبالغہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ۔ (صبر اچھا ہے)

فرمایا: "جس میں شکوہ نہ ہو (وہ صبرِ جمیل ہے)"

اور بعض کا فرمان ہے:

"جس نے شکوہ کیا اس نے صبر نہیں کیا۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا گیا:

"آپ کی بینائی کس وجہ سے چلی گئی؟"

فرمایا: "(حالاتِ) زمانہ اور طویل غموں کی وجہ سے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

"تُو نے میری مخلوق کے سامنے میری شکایت کی۔"

عرض کیا:

"اے پروردگار! میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔"

حضرت طاؤس اور حضرت مجاہد فرماتے ہیں:

"حالتِ مرض میں مریض پر کراہنا بھی لکھ دیا جاتا ہے" (کہ کیوں؟)

فرمایا: "اور سلف صالحین مریض کا کراہنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے کہ یہ دراصل شکوہ کا ایک اندازِ اظہار ہے۔"

مشائخ فرماتے ہیں، کہ

"حضرت ایوب علیہ السلام سے ابلیس کو مرض میں صرف "کراہنا" ہی مل سکا، چنانچہ اس "کراہنے" کو ہی اس نے اپنا حصّہ سمجھ لیا۔"

حدیث میں ہے:

"جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دو فرشتوں کی طرف وحی فرماتا ہے کہ میرے بندے کو دیکھو وہ اپنے تیمارداروں سے کیا کہہ رہا ہے؟ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور ثنائے خیر بیان کرے تو اس کے لیے تم دعا کرو اور اگر شکایت کرے تو دونوں فرشتے کہتے ہیں،

"ایسے ہی ہوگا۔"

بعض عابدین نے اس وجہ سے عیادت کرنے کو بھی ناپسند کیا۔ انہیں ڈر تھا کہ شکایت نہ ہو جائے اور مرض کے معاملہ میں کلام میں مبالغہ نہ ہو جائے کہ اصل مرض سے زیادہ بتا دے اور یہ بات دو ابتلاؤں کے درمیان ایک نعمت پر ناشکری بن جائے گی۔

بعض صالحینؒ کا یہ طریقہ تھا کہ جب بیمار ہوتے تو گھر کا دروازہ بند کر لیتے تاکہ کوئی آدمی اندر نہ آئے یہاں تک کہ صحت ہو جاتی، پھر باہر نکلتے۔ حضرت فضیلؒ اور وہیبؒ ایسا ہی کرتے۔ حضرت بشرؒ فرمایا کرتے تھے :

"میں چاہتا ہوں کہ عیادت کرنے والوں کے بغیر ہی بیمار ہوں۔"

حضرت فضیلؒ نے فرمایا،

"میں صرف تیمارداروں کی وجہ سے بیماری کو ناپسند کرتا ہوں۔"

صالحینؒ میں سے درجۂ امامت کے منصب پر فائز حضرات کو ہم نے دیکھا۔ انہوں نے ایسے کیا ہے اور اگر اس کا قلب راضی ہو، اللہ کا شکر ادا کرتا ہو، آفاتِ نفس نہ پائی جائیں اور اظہارِ مرض سے مقصود اپنے اللہ کریم کے سامنے عاجزی اور زاری ظاہر کرتا ہو یا اہلِ ایمان کی دعائیں لینا چاہے یا اسے نعمت سمجھے اور اس پر زبان سے شکر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو ان صورتوں میں مرض کا اظہار و بیان جائز ہے۔

منقول ہے کہ حضرت بشرؒ بن حارث ایک حکیم صاحب عبدالرحمٰن کو اپنے دردوں کا حال بیان کرتے اور کئی اشیاء کے ساتھ حالت بتاتے۔ بتاتے ہیں کہ حضرت احمد بن حنبلؒ اپنے امراض بیان کرتے اور فرماتے،

"میں اپنے اندر واقع قدرتِ الٰہی بیان کرتا ہوں۔"

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے :

"جب مریض اللہ عزوجل کی حمد و شکر کرے۔ پھر مرض کا ذکر کرے تو یہ شکوہ نہ ہوگا۔"

حضرت احمدؒ بن حنبل سے جب مرض کے بارے پوچھا جاتا تو وہ بتاتے نہ تھے۔ پھر حضرت حسنؒ کے قول کی طرف رجوع کر لیا۔ اس کے بعد ان کا یہ طریقہ ہو گیا کہ اللہ کی حمد و ثناء بیان کر کے کہا کرتے :

"ایسے ایسے محسوس کرتا ہوں۔"

منقول ہے کہ حالتِ مرض میں حضرت علیؓ سے کسی نے کہا :

"آپ کیسے ہیں ؟"

فرمایا : "بُری حالت میں۔"

لوگ ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یعنی اُنھوں نے اس کو بُرا کلمہ خیال کیا۔

فرمایا : "میں اللہ پر صبر کرتا ہوں۔" یعنی اللہ کے سامنے اپنا عجز و احتیاج ظاہر کرنا پسند کیا اور یہ بھی بتانا چاہا کہ ایسا کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ بہت کثرت سے ہیں جن سے ان کا حال پُوچھا جاتا ہے تو وُہ کہتے ہیں، "خیریت سے ہیں۔" جیسے کہ حضرت ثوریؒ نے فرمایا :

"علم دراصل وثوق کے ساتھ رخصت ہے ورنہ سختی و شدت کو ہر کوئی مستحسن سمجھتا ہے۔ گویا حضرت علیؓ نے

چاہا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب اور اظہارِ قوت سے ممانعت واضح کردیں کیونکہ یہ روایت ہے کہ وہ بیمار ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا وہ دعا کر رہے تھے :

"اے اللہ! مجھے تکلیف پر صبر عطا کر۔"

آپؐ نے فرمایا :

"تم نے اللہ تعالیٰ سے تکلیف مانگی بلکہ اللہ سے عافیت مانگو۔"

یہی وجہ ہے کہ حضرت مطرفؒ فرماتے ہیں :

"عافیت رہے اور شکر کروں مجھے یہ بات ابتلاء میں پڑکر صبر کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔" اس لیے کہ ابتلاء تو قوی لوگوں کی راہ ہے اور اہلِ خوف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ قوی عزیز تعالیٰ کے سامنے اپنی قوت اور برداشت کا اظہار کرنے سے ڈرتے ہیں۔

شافعیؒ ایک بار مصر میں سخت بیمار پڑے اور کہنے لگے،

"اے اللہ! اگر اس میں تیری رضا ہے تو اس میں اضافہ فرما۔"

ایک عالم ربانی یعنی حضرت ادریس بن یحییٰ معافریؒ نے انہیں لکھا ،

"اے ابو عبداللہ! تو اہلِ ابتلاء میں سے نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔"

چنانچہ انہوں نے اپنے پہلے کلام سے رجوع کرلیا اور توبہ و استغفار کیا۔ اس کے بعد یہ دعا کرتے ،

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَتِيْ فِيْمَا اَحْبَبْتَ۔ (اے اللہ میری بھلائی اس میں کر دے جس کو تو پسند کرے)

عبادت کے لیے ترکِ کسب کی افضلیّت

گاہے عبادت میں مصروفیت کی وجہ سے تارکِ کسب افضل ہوتا ہے جیسے کہ متقدمین دنیا میں زاہد کو حلال روزی کمانے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پر فضیلت دیتے تھے۔

حضرت حسنؒ سے پوچھا گیا،

"دو آدمی ہیں ؛ ایک دستکاری میں لگا ہے اور دوسرا عبادت میں مشغول ہے۔ ان دونوں میں سے کون سا افضل ہے ؟"

فرمایا ، "سبحان اللہ ، یہ دونوں برابر کیونکر ہو سکتے ہیں۔ یاد رکھو عبادت کی خاطر فارغ ہونے والا ہی افضل ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"موت کی نصیحت ، تقویٰ کا غناء اور عبادت کا شغل کافی ہے۔"

تارکِ کسب اللہ تعالیٰ پر توکل و وثوق کرتے ہُوئے، مقامِ توکل کا لحاظ کرتے، فقر پر صبر کرتے۔ دنیا سے الگ ہو کر آخرت میں مصروف ہوتے اور ابتلاء کا دُکھ سہتے ہُوئے یہ خوب سمجھتا ہے کہ دنیا میں اس کے مولائے کریم نے روزی کی کفالت کا وعدہ فرمایا اور مجھے آخرت کے عمل میں لگا دیا۔ اب اگر میں اپنے آخرت کے کام میں مصروف ہُوا تو دنیا کی ضرورت پُوری کرنے کا کام کرنے کے لیے کسی کو کھڑا کر دے گا اور اگر متوکل تصرفِ دُنیا نہ کرے گا تو دوسرا اس کے لیے تصرف کرے گا اور اگر اس نے آخرت کی ذمہ داری پُوری ادا نہ کی اور عمل نہ کیا تو دُوسرا کوئی بھی اس کی جگہ اس کے لیے کام نہیں کرے گا۔ دنیا کے کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کفالت کا وعدہ فرمایا تھا۔ اب اگر یہ دنیا کا کام نہ کرے گا تو دُوسرا کرے گا جیسے چاہے گا۔ دنیاوی عمل جس کی کفالت کا وعدہ ہے اس کے اور اخروی ذمہ داری (اعمالِ اخرویہ) کے درمیان یہی فرق ہے۔

دنیاوی رزق جس کی کفالت کا وعدہ ہے اس کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ [1] (اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں رکھتے اپنی روزی، اللہ روزی دیتا ہے ان کو اور تم کو)

اور اخروی رزق جو اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى [2] (اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا)

توحید کے بعد متوکل خوب جانتا ہے کہ یہ چاروں چیزیں ایک چیز کی طرح ساتھ ساتھ ہیں اور یکدم ساتھ ساتھ ہی واقع ہوتی ہیں۔ مقررہ روزی میں اضافہ نہیں ہوتا اور یہ وقتِ معلوم کے اندر ملتی ہے۔ نہ روزی بڑھے، اور نہ کسی سبب سے وقت میں تقدیم و تاخیر ہو۔ یہ لکھا جا چکا ہے۔ اس میں قلب و تغیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ رازق تعالیٰ کے فضل سے روزی ہے اور جس وقت کے اندر عطاء کا فضل نمودار ہوتا ہے وہ ایک ظرف میں ہوتا ہے اور سبب دراصل تقسیم کرنے والے کی حکمت ہے اور اثر دراصل روزی دیئے جانے والے کی حد ہے۔ اب جب متوکل نے اس کو سمجھ لیا تو اب تصرف کیا تو حکم کے ساتھ تصرف کیا۔ اگر بیٹھا تو علم کے ساتھ بیٹھا۔ اس کے نزدیک تصرف و قعود (تصرف کرنا اور تصرف سے ہٹ کر فارغ بیٹھنا) دونوں برابر ہیں۔ اس لیے کہ اپنے علمِ حال کے اقتضاء کے مطابق حکم پر قائم ہے۔ وُہ جائے تصرف و جائے قعود کے حکم سے آگاہ ہے۔ اب اگر مولائے کریم نے اسے دوسروں کی بجائے اپنی عبادت میں مصروف کر دیا تو اس کا سارا انہماک بندوں کے

---

[1] العنکبوت آیت ۶۰

[2] النجم آیت ۳۹

معاملہ کی بجائے مولائے کریم کی عبادت میں ہو جاتا ہے۔ اب وہ جیسے چاہتا ہے اور جہاں سے چاہتا ہے اس کی روزی اسے پہنچاتا ہے اور جس بندے کے ہاتھ سے چاہتا ہے بھیجتا ہے۔ اسے حدود کے تجاوز سے محفوظ کرتا ہے۔ فرمایا،

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ [1]

(خبرداری کرنے والی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی خبرداری سے)

اس کی کارسازی فرماتا ہے اور ممنوعات میں پڑنے سے اس کو بچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیائے کرام کا ذکر کیا اور فرمایا،

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ [2]

(اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی)

یہ بندہ مخلوق سے ہٹ کر اپنے معبود کی عبادت میں مشغول ہے۔ مملوک کے معاملات سے جُدا ہو کر ملک تعالیٰ کے معاملہ (عبادت) میں مصروف ہے۔ دنیا سے دُور ہو کر آخرت میں لگا ہے۔ یہی افضل آدمی ہے اور یہ ان لوگوں میں داخل ہے جن کو خدا تعالیٰ کی کفایت حاصل ہے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جس نے تمام فکروں کو (ختم کر کے) ایک ہی فکر کر لیا۔ اللہ اس کی آخرت میں کافی ہے۔" اور جس نے غیر اللہ کو مقصود بنا کر وادیٔ ہلاکت میں قدم رکھا۔ اس سے یہ آدمی نکل گیا جیسے کہ ہلاک ہونے والوں کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جس نے صبح کی اور اس کا فکر غیر اللہ ہے۔ اسے اللہ سے کچھ (کفایت) نہیں"۔ اور ایک قول میں ہے،

"اور جس نے طرح طرح کے فکر لگا لیے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پروا نہیں کہ وُہ کسی وادی میں ہلاک ہُوا۔"

اور اگر متوکل کا یہ حال ہو کہ اس کی روزی اپنے ہاتھ سے اور اپنی کمائی سے مل رہی ہو تو یہ ایک خزانۂ ملک ہے اور یہ ایک بندۂ ملک ہے۔ جو روزی اسے دُوسرے کے ہاتھ سے ملتی تھی وُہ اسے اپنے ہی ہاتھ سے مل رہی ہے اب چاہے روزی اس کی طرف چل کر آئے یا اس کو روزی کی طرف چلایا۔ اس لیے کہ جس (روزی) سے تو ملا، وُہ تجھے بھی ملی اور دونوں حالوں میں بندہ کو اللہ پر توکل ہے۔ دونوں معنوں میں وہ اس کی جانب نظر کیے ہُوئے اور اس کے حکم پر پابند ہے۔ دونوں حکموں میں خدا تعالیٰ کی پسند سے آگاہ ہے۔ اب جس نے اللہ تعالیٰ پر وثوق کرتے ہُوئے اس پر اطمینان رکھتے ہُوئے یا گناہوں کے ڈر سے اور احکامِ کسب پر چل نہ سکنے کی وجہ سے کاروبار ترک کر دیا تو اس کی نیکی ایسے ہی ہے جیسے کہ اس آدمی کی نیکی جس نے اللہ کی خاطر ایک عمل کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکِ عمل میں بھی ایک اچھی نیت کی ضرورت ہے۔

---

[1] النساء آیت ۳۴

[2] الاعراف آیت ۱۹۶

اور خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جو آدمی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ وہی افضل ہے اور سب سے زیادہ پرہیزگار وُہ ہے جس کو اس کی سب سے زیادہ معرفت حاصل ہو۔ چاہے وہ کاروبار میں لگا ہو یا کاروبار سے الگ ہو۔ یہی واضح بات ہے۔

حضرت عبداللہ بن دینار کی حدیث میں عمرو بن میمونؒ سے مروی ہے۔ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"تم جانتے ہو، تمہارے رب نے کیا فرمایا؟"

انہوں نے جواب دیا:

"اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ خوب جانتے ہیں۔"

فرمایا، "جب اپنے عرش پر قرار پکڑا۔ اس نے اپنی مخلوق کی طرف نظر کی (اور فرمایا) میرے بندو، تم میری مخلوق ہو اور میں تمہارا رب ہُوں۔ تمہارے رزق میرے قبضہ میں ہیں۔ اب جس کی میں نے تمہارے لیے کفالت کرلی اس میں اپنی جانوں کو نہ کھپاؤ اور مجھ سے رزق مانگو اور میرے لیے اپنی جان لگا دو اور اپنی ضروریات میرے سامنے رکھو۔ میں تم پر رزق (بارش کی طرح) بہا دوں گا۔"

"کیا تم جانتے ہو تمہارے ربّ نے کیا فرمایا؟"

(صحابہؓ) نے عرض کیا،

"اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔"

فرمایا: "میرے بندے خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا اور وسعت کر، میں تجھ پر وسعت کروں گا۔ اور تنگی نہ کر ورنہ میں تجھ پر تنگی کروں گا۔ رزق کے دروازے عرش کے ساتھ ہیں۔ وُہ نہ دن کو بند ہوتے ہیں اور نہ رات کو بند ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں ان سے ہر بندے کی نیت، خاندان، صدقہ اور خرچ کے مطابق اس کے لیے روزی اتارتا ہوں۔ جس کا زیادہ (خاندان و خرچ و صدقہ) ہے اس کے لیے زیادہ اتارتا ہُوں اور جس کا کم ہے اس کے لیے کمی کرتا ہُوں۔ جس نے روک دیا اس پر روک دیتا ہُوں۔"

اے زبیرؓ، اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو پسند کرتا ہے اور تنگی کرنے کو ناپسند فرماتا ہے۔ کھا اور کھلا اور تنگی نہ کر، ورنہ تجھ پر تنگی کر دے گا۔ دشواری نہ کر، ورنہ تجھ پر دشواری کریگا بھائیوں کو کھلا، نیک لوگوں کی عزّت کر، پڑوس سے جوڑ اور بدمعاشوں کے ساتھ نہ چل۔ (ایسا کرکے) تو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مجھے وصیت ہے اور میری تجھے وصیّت ہے یعنی زبیر بن عوام کو۔ بازار، بھگوڑوں کے دسترخوان ہیں۔ جو اس کی خدمت (عبادت) سے بھاگتا ہے، اس کی مجلس سے راہِ فرار پکڑتا ہے، اس کے معاملہ میں سُستی

دکھاتا ہے اور اس کی تجارت میں بُزدلی دکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان (بازاروں) سے کھلاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے،

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ [1]

(اور میں نے جو بنائے ہیں جن اور آدمی، سو اپنی بندگی کو، میں نہیں چاہتا ہوں ان سے روزینہ) اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں)

بعض متقدمین اہل عرب کا فرمان ہے: فرمانِ خداوندی ہے کہ،

"میں نہیں چاہتا کہ وہ میری مخلوق کو روزی دیں" اس لیے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ۔ (بے شک اللہ ہی روزی دینے والا ہے)

یعنی ان کا روزی رساں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ جب وہ اس کی عبادت کریں تو اپنے آپ کو روزی بھی دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تین وجوہ کا ذکر کیا۔ ایک اپنے لیے چُن لی، یعنی عبادت۔ اور اس پر کفایت (رزق وغیرہ ہے) اور بندے کے لیے ایک پسند کرلی۔ یعنی اس کا عبادت گزار رہے اور ایک سے پاک و بلند ہُوا۔ یعنی بندہ اسے کھانا مہیا کرے اور عام بندوں کو تیری بات میں لگا دیا کہ وہ اپنے آپ کو کھانا مہیا کریں، یعنی کاروبار کریں اور اپنے اور زمین میں مخلوق کے درمیان اس کی ایک مثال دی۔ فرمایا،

وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [2] (اور اس کی کہاوت سب سے اُوپر آسمان و زمین میں)

اب بندہ اپنے رب کے ہمراہ دو حکمتوں کے ساتھ رہا،

۱۔ ان دونوں میں سے ایک اپنے لیے پسند کرلی، یعنی عبادت، اور یہ معاملہ ہے اور اس پر روزی ہے جیسے چاہے اور جب عطا کرے یہ رحمٰن تعالیٰ کے بندے ہیں اور دنیا کے بندے نہیں ہیں۔

۲۔ جو بندے میں کیا کہ وہ اپنے لیے کاروبار کرے اور اس طرح انہی کے اعضائے سے ان کی روزی رکھی۔ اور اس وصف پر ان کی تعریف بھی کی۔ یہ عام بندے ہیں۔ ان میں سے بعض دنیا کے بندے ہیں اور بعض خواہش کے بندے ہیں اور مولا کریم ان تینوں احوال میں اپنے بندوں کے ساتھ رہا جو اس کے لیے مباح کر دیے اور اپنے اور ان کے درمیان اس کی مثال دی۔ جس کو بھی اس نے اختیار کیا ان کے لیے وہی ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ بعض مخلوق کے ساتھ اللہ کریم کا ایسا سلوک ہے کہ وہ اپنے بندے کو فرمائے،

---

[1] الزاریت ۵۶، ۵۷

[2] الروم آیت ۲۷۔

"جا اور مجھے کھلا، اس لیے کہ تو میرا بندہ اور میری ملکیت ہے۔ جس طرح میں تیری جان کا مالک ہوں اسی طرح تیری کمائی کا بھی مالک ہوں"۔ یہ مذکورہ صورت ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک و بلند تر ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَ مَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنَ۔ (اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلاویں)

جیسے کہ آقا اپنے غلاموں سے چاہتا ہے۔ پھر آقا ان میں سے کسی غلام کو کہے، جا، اپنے آپ کو کھلا اور اپنی غذا میں وسعت کر۔ میں نے تیرے لیے یہ جائز کر دیا اور تیری کمائی تجھے بخش دی۔ یہ میری طرف تیرے لیے روزی ہے اور تجھ پر میری طرف سے احسان ہے۔ اس کے ساتھ وہ غلام مکاتب ہوا کہ غلام کو آزادی دی اب آقا آزاد کرنے والا ہو گیا اور اس کو اس کا ولاء (آزاد کرنے پر وراثت وغیرہ کا حق) حاصل ہو گیا اور اسے وراثت میں تصرف کا اب بھی اختیار ہے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ آزاد کرنے والے کی طرح کتابت کر کے اس نے اس پر احسان فرمایا۔ اگرچہ غلام نے اپنی آزادی کی خاطر اپنی کمائی کے ذریعہ محنت کی، مگر آقا، اس کی کمائی کا اور اس کی جان کا مالک ہے۔ جب مالک ہوا تو اس کا محسن بھی ہوا۔ یہ عام بندوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ حال ہے۔ اس لیے کہ وہی ان کا مولائے حق ہے اور وہ اس کے مملوک بندے ہیں۔ چنانچہ اس نے فرمایا:

"جاؤ، کماؤ اور اپنے آپ کو کھلاؤ، میں نے تمہیں یہ روزی دی اور تمہیں یہ روزی عطا کر دی"۔

یہ دوسری صورت ایسی ہے کہ بلند درجہ پر فائز ہونے کے باعث خواص کو اس سے پاک رکھا۔ انہیں اپنی اور مخلوق کی خدمت سے الگ کر کے اپنی عبادت میں مصروف کر دیا۔ ان کی ہر ضرورت میں کفایت کر کے ان کی کارسازی کی اور جن امور میں غیروں کو ڈالا۔ ان کو ان میں نہیں ڈالا بلکہ ان کی روزیاں اپنے جس بندے کے چاہا سپرد کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہی مفہوم ہے:

مَا اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ[1] (میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ)

یعنی میں یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ اپنے آپ کو رزق دیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ[1] (بیشک اللہ وہی ہے رزق دینے والا)

یعنی دوسروں کو ان تک روزی پہنچانے پر مقرر فرما کر انہیں رزق دیا اور صاف بتایا کہ:

وَ مَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنَ[1] (اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلاویں)

اس بار کا اسم کتنی بہا ہے اور یہ خاص ارادہ ہے عام ارادہ نہیں۔ یعنی یہ ابتلاء و محبت کا ارادہ ہے۔

---

[1] الذاریات آیت ۵۶، ۵۷۔

مطلب ہوا کہ ما احب ان یطعمون - اور یہ اس کے خواص بندوں کے ساتھ مخصوص ہیں - جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔ (اور میں نے جو بنائے ہیں جنّ اور آدمی، سو اپنی بندگی کو)

یہ آیت اس کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان میں سے جس نے اس کی عبادت کی۔ اس سے مراد اہل ایمان جن و انسان ہیں۔ عام اور ساری مخلوق مراد نہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ آقا کریم ہم میں سے کسی کو یہ کہے،

"میری خدمت کرو اور تیرا کھانا میرے ذمّہ ہے۔ تیرا میری خدمت کرنا اپنے لیے کمانے کی جگہ ہوگا۔" یہ اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پسند فرمایا اور جس کے لیے چاہا اسے اس کی محبت دی۔ خواص عاملین بندوں کو جو اس کے عالم ہیں اس کے لیے منتخب فرمایا اور جن کو اپنے آپ کے لیے کمانے میں لگا دیا وہ ان سے الگ ہیں۔ یہی خدا تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ مَا اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ۔ (سوا اپنی بندگی کو، میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ)

یعنی وہ خود کما کر اپنے آپ کو کھلائیں جو میں نے ان کے لیے جائز کر دیا تاکہ وہ دوسروں کی طرح ہو جائیں، جن کے بارے میں کہا تھا کہ جاؤ، کماؤ، میں نے تجھ سے یہ چاہا کہ تو اپنی کمائی کے ذریعہ اپنے آپ کو روزی دے اور میں نے تجھے یہ بخش دیا۔ یعنی میں نے انہیں عبادت کے لیے پیدا کیا اور اس کام کے لیے انہیں پیدا کیا۔

"چنانچہ ہر آدمی کے لیے وہی آسان ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا۔" اب جو عبادت کے لیے بنا اور اس کام کے لیے پیدا ہوا، اس کے لیے یہی کام آسان ہو گیا اور جس کو دنیا کے لیے بنایا گیا اور اس کے لیے پیدا کیا گیا، اس کے لیے یہی آسان کیا گیا۔

روایت میں ہے،

"اللہ تعالیٰ نے ہر صانع اور اس کی صنعت کو پیدا کیا۔"

بتاتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے عدم میں مخلوق کو ظاہر کیا تو ان کے لیے تمام صنائع کو ظاہر فرمایا - پھر انہیں اختیار دیا۔ چنانچہ ہر آدمی نے اپنی صنعت پسند کر لی۔ جب انہیں وجود میں (دنیا میں) ظاہر کیا تو ہر ایک پر اپنا پسند کردہ جاری ہو گیا - بتایا کہ، "ایک گروہ نے کچھ چیز اختیار نہ کی۔" انہیں فرمایا: "تم بھی پسند کر لو۔" انہوں نے جواب دیا،

"ہم نے کچھ عجیب چیز نہیں دیکھی کہ اسے پسند کر لیں"

فرمایا، "اس کے بعد ان کے سامنے مقاماتِ عبادات ظاہر کر دیے" تو اس گروہ نے کہا،

"ہم نے تیری عبادت پسند کر لی۔"

اس پر فرمایا،

"مجھے میری عزت و جلال کی قسم، میں خاص کر انہیں تم سے لے لُوں گا اور تمہارے سامنے انہیں ضرور مسخر کر دوں گا۔"

حدیث میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی فرمائی،

"جو میری خدمت کرے تُو اس کی خدمت کر اور جو تیری خدمت کرے تُو اسے تھکا دے۔" چنانچہ عبادت ہی اصل خدمت ہے اور اس سے ان کا قول ہے:

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ لَكَ نُصَلِّیْ وَ نَسْجُدُ وَ اِلَیْكَ نَسْعٰی وَ نَحْفِدُ۔ (ہم خاص کر کے تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیری ہی نماز پڑھتے ہیں، تجھے ہی سجدے کرتے ہیں اور تیری طرف ہی لپک کر آتے ہیں اور جلدی کرتے ہیں)

یعنی تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے اوامر پر کاربند ہیں۔ جیسے کہ فرمایا،

بَنِیْنَ وَ حَفَدَۃً [1] (بیٹے اور پوتے)

یعنی یہ دونوں خادم ہیں۔ یہ ایک صورت ہے۔ اور عبادت کا مطلب ہوتا ہے "خدمت انکساری و تواضع کے ساتھ۔" اور عرب کہا کرتے ہیں،

طریق معبد: یعنی ایسا راستہ جس پر کثرت سے لوگ چلے ہوں اور خوب روندا گیا ہو۔

اور کہا کرتے ہیں،

بعیر معبد: یعنی جب ایک اونٹ سفر کر کے اور بوجھ اٹھا اٹھا کر کمزور ہو چکا ہو۔ اس سے ایک قبیلہ کا قول ہے کہ،

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ [2] (کیا ہم مانیں گے دو آدمیوں کو ہمارے برابر کے، اور ان کی قوم کرتی ہے ہماری بندگی)

یعنی بنی اسرائیل ہمارے خادم ہیں۔ ہم انہیں ذلیل کرتے ہیں اور انہیں مزدوری اور مشقت میں لگائے رکھتے ہیں۔

---

[1] النحل آیت ۷۲
[2] مومنون آیت ۴۷

ایک عارفؒ کا فرمان ہے،

"اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ایک جماعت کے دلوں پر نظر فرمائی اور انہیں اپنی معرفت کے قابل نہ دیکھا اور نہ ہی اپنے مشاہدہ کے لیے مناسب جگہ دیکھی تو ان پر رحم کرکے انہیں عبادات اور اعمالِ صالحہ عطا فرمائے۔ پھر اپنی مخلوق میں سے ایک دوسرے گروہ کے قلوب پر نظر فرمائی تو ان کے اعضا کو اپنی عبادت کے مناسب نہ دیکھا اور نہ ہی اپنے معاملہ کے اہل جگہ دیکھی تو انہیں دنیا کے کام میں لگا دیا اور اہلِ دنیا کے لیے ان کی ساری عبادت (ذلت) ہوتی ہے"۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے،

"دینار و درہم کا بندہ ہلاک ہوا، بیوی کا بندہ ہلاک ہوا، جُبّے کا بندہ ہلاک ہوا"۔ یعنی جو لوگ ان چیزوں کیلئے محنت کرتے اور دولت سمیٹتے ہیں وہ ہلاک ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں ہے،

"میں نے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی خاطر پیدا کیا اور آدم (علیہ السلام) کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خاطر پیدا کیا اور باقی میں نے جو کچھ پیدا کیا وہ اولادِ آدم کی خاطر پیدا کیا۔ اب ان میں سے جو اس میں مصروف ہوا، جس کو میں نے اس کی خاطر پیدا کیا ہے تو اسے اپنے سامنے (اس کے لیے) حجاب بنا دوں گا۔ اور ان میں سے جو میری (عبادت) میں مصروف ہوا اس کے لیے جو اس کی خاطر پیدا کیا اس کو چلا کر لاؤں گا"۔

اگر متوکل کا مکان ہو تو؟

اگر صاحبِ توکل کا ایک مکان بھی ہو تو جب باہر نکلے اسے قفل لگا دے، تاکہ سنت و اثر کی تابعداری ہو جائے اور جس چیز (غفلت) سے پرہیز کا حکم ہوا اور جس کی حفاظت کا حکم ہوا اس کی پرہیز و حفاظت بھی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ [1] (اے ایمان والو! کرلو اپنی خبرداری)

اور فرمایا،

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ [2] (اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں)

ایک حدیث میں ہے،

"اسے (اونٹنی کو رسی سے) باندھ دو اور توکل کرو"۔ اور ایسا کرنا توکل کے لیے کچھ نقصان دہ نہیں بشرطیکہ اس کا دل، اللہ تعالیٰ پر مطمئن ہو اور مخلوق پر سکون پذیر نہ ہو۔ سواری رکھنے یا اسے ضائع کرنے کے معاملہ میں

---

[1] النساء آیت ۷۱

[2] مائدہ آیت ۴۹

وہ خدا کی حسنِ تدبیر پر راضی و خوش ہو۔ اپنی حفاظت پر اسے وثوق و اطمینان نہ ہو۔ اگر اللہ پسند کرے تو اپنے گھر میں اس چیز کے بقاء کو پسند کرے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ایک چیز کے معاملہ میں مقام توکل تک رسائی عطا کرتا ہے تو پھر اسے ہر چیز میں توکل عطا فرماتا ہے جیسے کہ بندہ اس وقت ہی توبہ کرنے والا اور خدا کا محبوب ہوسکتا ہے جبکہ ہر چیز کے ساتھ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آئے اور اس کے سامنے توبہ کرے۔ یعنی تمام اشیاء کے ساتھ اور تمام اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرے۔ اس وجہ سے خدا کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ [1] (اللہ چاہتا ہے توکل والوں کو)

جیسے کہ فرمایا،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ [2] (اللہ کو خوش آتے ہیں توبہ کرنے والے)

اور یہ فرمان بھی ہے:

وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ [3] (اور اللہ پر بھروسہ چاہیے بھروسہ والوں کو)

یعنی جو آدمی ایک چیز کے معاملہ میں خدا پر توکل کرتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ ہر چیز میں خدا ہی پر توکل کرے۔ یہی احسن صورت ہے۔

ایک صورت اور ہے وہ یہ ہے کہ جو آدمی اشیاء میں اس پر توکل کرے وہ ہر توکل میں اس پر توکل کرے۔ اس لیے کہ چیزیں میں وکیل تعالیٰ ایک ہے۔ اب چاہیے کہ ہر چیز میں اس پر ایک سا ہی توکل ہو۔

الغرض توکل کرنا، مقاماتِ انبیاء میں سے بلندترین مقام ہے۔ یہ صدیقین و شہداء کے درجات عالیہ میں سے ہے۔ جس کو یہ ملا اسے توحید مل گئی، اس کا ایمان کامل ہوا اور وہ مزید انعام کی راہ پر ہے۔ دقیق شرک اور شیطان کے مخفی اثرات اس سے دور ہو گئے اور شیطانی تسلط سے وہ صاف بچ گیا۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ [4]

(اس کا زور نہیں چلتا ان پر جو یقین رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اس کا زور انہی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں)

---

[1] آل عمران آیت ۱۵۹

[2] البقرۃ آیت ۲۲۲

[3] ابراہیم آیت ۱۲

[4] النحل آیت ۹۹، ۱۰۰

یعنی جو شیطان سے دوستی رکھتے ہیں اس پر اس کا داؤ چلتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۔ (اور جو اس کو شریک ٹھہراتے ہیں)

یعنی اللہ سبحانہ، و تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والوں پر شیطانی اثرات ہوتے ہیں چنانچہ صرف ایمان سے ہی شیطانی تسلط کی نفی نہیں کی بلکہ جب یقین میں مقامِ توکل پر جا پہنچا۔ پھر جا کر شیطانی تسلط سے آزاد ہونے کی خبر دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے توکل کی خوب وضاحت کی اور اس کی تفصیلات سامنے رکھ دیں۔ اس لیے کہ جس کو مشاہدۂ وکیل تعالیٰ کی حقیقت پر توکل کا کوئی مقام بھی ملا اس کے لیے تمام مقاماتِ یقین درست ہوگئے، اور تمام احوالِ تقویٰ کا معاملہ ٹھیک ہُوا جیسے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے:

"توکل ہی سارا ایمان ہے!"

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح تمام مقامات والے حضرات پر ابتلا آتے ہیں۔ اسی طرح اہل توکل پر بھی اسباب، اشخاص، اغراض اور دوسرے مفاہیم کے اعتبار سے ابتلاء آجاتے ہیں۔ اس پر شیطانی تسلط و احاطہ تو نہیں ہوتا البتہ شیطان کی طرف سے ٹھونکا اور حرکت سی باقی رہتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ توکل میں اس کی صداقت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ آخر کار ان تمام امور میں وہ وکیل تعالیٰ پر اپنی نظریں لگا دیتا ہے تاکہ اسے صادقین مقربین کا اجر ملے یا اس کا دعوائے توکل کا پول کھل جائے اور اس کا کذب کھل کر سامنے آجائے۔ آخر اسے توبہ کا راستہ نظر آئے، جیسے کہ فرمایا:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ[1] (تاکہ بدلہ دے اللہ، سچوں کو ان کے سچ کا)

اہل توکل کو یہی اجر کافی ہے کہ ان کا حسب صادق ہو اور ان کا شعار خلعتِ صدق کا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ[2] (اور عذاب کرے منافقوں کو اگر چاہے یا توبہ ڈالے ان کے دل پر)

چنانچہ ان دعویداروں کا بہترین حال یہ ہے کہ یہ توبہ کریں اور اس کے ذریعہ یہ لوگ اپنے ظلم سے نکل سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ[3] (کیا یہ سمجھے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر، کہ ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے)

---

[1] احزاب آیت ۲۴ [2] احزاب آیت ۲۴ [3] العنکبوت آیت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی سنتِ قدیمہ کا ذکر فرمایا جو کہ پہلے لوگوں پر بھی جاری رہی۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ [1]

(اور ہم نے جانچا ہے اُن کو، جو ان سے پہلے تھے، سو البتہ معلوم کرے گا اللہ جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹا)

اور فرمایا:

وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا [2]

(اور تو نہ دیکھے گا اللہ کی رسم بدلتی ہوئی)

چنانچہ متوکل کو چاہیے کہ باہر جاتے وقت یہ بات کہہ دے اور اس کے علاوہ امر وسنت پر چلتے ہوئے دروازہ بند کرے اور یہ کہے اے اللہ میرے مکان میں جس قدر مال ہے اگر تو نے کسی کو اس پر مسلط کر دیا تو یہ تیری راہ میں صدقہ ہے جو بھی اسے لے جائے۔

مال چوری ہو جائے تو سات کام کرو

اب اگر کسی نے تیرے گھر سے تیرا مال نکال لیا اور لے کر چلا گیا تو اس میں تجھے سات کام کرنے ہوں گے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے باعث خدا پر توکل کو قبول کرو جیسے وہ چاہے تدبیر کرے۔ دنیا کا نقصان ہوا، مال گیا، تمہارے لیے یہ خدا کا انتخاب ہے اسے قبول کرو۔ کیا خبر، مال رہتا اور تو فتنہ میں مبتلا ہو جاتا!

۲۔ اللہ تعالیٰ نے پسند کیا کہ بندے پر یہ حال آجائے۔ اس کی محبوب چیز گُم کر کے اس کا امتحان لے تاکہ اس کی صداقت و تسلیم کھل جائے یا بندے کا جھوٹ سامنے آجائے۔ اب اگر اس نے خدا تعالیٰ کے حُسنِ ابتلاء پر اس کی حمد و ثنا کہی، شکر ادا کیا اور اسے اضطراب لاحق نہ ہوا تو اسے شاکر و راضی بندے کا اجر ملے گا جیسے کہ بعض انبیاء سے مخفی علم میں مروی ہے۔ کہا:

"اے پروردگار! تیرے دوست کون ہیں؟"

فرمایا: "وہ لوگ کہ جب میں ان سے ان کی محبوب چیز لے لیتا ہوں تو وہ مجھ سے مصالحت کرتے ہیں (راضی ہو کر حکم تسلیم کر لیتے ہیں)"

۳۔ اگر اسے اضطراب ہو اور وہ داویلا مچانے پر آمادہ ہو تو اپنے نفس سے مجاہدہ کرے اور صبر و سکوت سے کام لے اور اللہ پر حُسنِ ثناء کرے۔ بندوں کے سامنے شکایت کرنا چھوڑ دے تو اسے صبر و مجاہدہ کرنے والوں کا

---

[1] العنکبوت آیت ۳

[2] الفتح آیت ۲۳

اجر ملے گا۔

۴۔ اگر یہ اس مقام میں نہ ہو اور نہ ہی پہلے مقام میں ہو تو اس کے دعویٰ کا باطل ہونا کھل گیا۔ اس کی زندگی میں پوشیدہ کذب ظاہر ہو گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اعتراف کر لیا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے معذرت کی اور خضوع اختیار کیا۔ چنانچہ اعلام و بیان کے اعتبار سے یہ مزید صورت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ قضائے الٰہی کو ناپسند کرنے اور کمی صبر کے باعث کذاب ہے جو خزانہ اس کے قبضہ میں تھا خدا نے اسے دوسرے کی طرف منتقل کیا۔ اس پر اس کی ناراضگی نے بتایا کہ یہ توکل میں جھوٹا ہے۔ اس کا قبضہ بھی خزانۂ الٰہی میں سے ہے اور جو چیز یہاں سے ہٹی وہ اس کی ہے ہی نہیں۔ یہ تو اس کے پاس امانت تھا جس پر اسے غم ہو رہا ہے۔ آخر کار اپنی امانت واپس لے لی اور دوسرے آدمی کو اپنی یہ امانت دے دی یا اسے دے دیا۔ جس کے لیے یہ روزی تھا اس لیے کہ متوکل آدمی خوب سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب دنیاوی ملکیت کا کوئی جسم دیتا ہے اور اخروی ملکوت کی کوئی چیز عطا کرتا ہے اور یہ بات متوکل کے لیے آخرت کی روزی ہے۔ پھر اگر وہ ضعفِ یقین اور لالچ کی وجہ سے اخروی رزق پر ترجیح دے گا کیونکہ اس کا زہد ناقص ہے۔ یہ بات صرف طمع اور شدید حرص و لالچ کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو اس کے پاس تھا اصل میں وہ کسی کی امانت تھی۔ اہلِ توکل کے نزدیک یہ سب باتیں گناہ ہیں اور اہلِ یقین کے نزدیک اس پر توبہ و استغفار کرنا چاہیے اس لیے کہ متوکل آدمی جانتا ہے کہ جب اسے دنیا کی کوئی چیز یا قلوب میں ملکوتِ آخرت سے کچھ ملے گا تو وہ اسے کبھی نہ لے گا۔

اب دنیا میں جو کچھ ہے وہ اس کے ختم ہونے تک اس کے دوسرے ساتھی کے لیے رہے گی۔ آخر کار یہ ختم ہو جائے گی اور جو اخروی انعام ملے گا مثلاً ایمان، علم اور عمل، اسے کبھی واپس نہ لے گا بلکہ اس میں ابدالاباد تک اضافہ و نمو ہی ہوتا رہے گا اور گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیاوی اور اخروی چیز امانت دی جاتی ہے۔ اس قسم کو دنیا میں ضرور واپس لیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حکمت نے اس کی واپسی لازم کر دی جیسے کہ اس کے کرم نے عطا شدہ کو باقی رکھنا لازم فرما دیا۔

اب صاحبِ یقین متوکل کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کے پاس رکھے ہوئے خزانۂ امانت کو دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو وہ اس پر غمگین ہو کر بیٹھ جائے۔ اور نہ ہی اس امانت پر کسی ابتلا کے آنے سے اور دوسرے کے قبضہ میں دینے پر غمزدہ ہو۔ اس لیے کہ جو کچھ گھر سے نکلا وہ ایک چیز ہے اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و آزمائش پائی جاتی ہے۔

اگر ایسی چیز گم ہو جائے تو اس پر غمزدہ ہونا عارفین کے نزدیک گناہ اور جرم ہے اور مومنین کے نزدیک خیانت ہے۔ اس سے بھی وہ توبہ و استغفار کرتے ہیں جیسے کہ وہ گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ

اس بیان کردہ کا انہیں مشاہدہ حاصل ہے۔ نیز انہیں دنیا کھو جانے پر غمزدہ ہونے اور دنیا مل جانے پر خوشی منانے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں باتیں ہو کر رہیں گی۔ اس لیے کہ وہ اس سے آگاہ ہے، اسے کتب الٰہی سے علم حاصل ہُوا۔ چنانچہ قرآن کریم سے اسے یقین ہو گیا۔ فرمایا،

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا[1] (کوئی آفت نہیں پڑی ملک میں اور نہ آپ تم میں، جو نہیں لکھی ایک کتاب میں پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں)

اب جس قدر اموال و نفوس میں نقصان ہو گا وُہ فیصلۂ ازلی میں لکھا جا چکا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا۔

یعنی مخلوق پیدا کرنے سے پہلے یا زمین پیدا کرنے سے پہلے یا لوگوں کو پیدا کرنے سے پہلے یا مصیبت پیدا کرنے سے پہلے۔

پھر فرمایا،

لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ۔ (تا کہ تم غم نہ کھایا کرو اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور نہ ریجھا کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا)

اس لیے کہ جس قدر چیز ملنے پر فرحت ہوتی ہے اسی قدر چیز کھو جانے پر غم ہوتا ہے۔ کیا بندے کو اس پر حیا نہیں آتی کہ وہ امرِ الٰہی کے الٹ کام کرتا ہے یا جس چیز کو اس کا مولائے کریم پسند نہیں کرتا اسے یہ پسند کر رہا ہے۔ جو چیز اس کی نہیں اس کے جانے پر غمزدہ ہے۔ امانت واپس لینے پر افسوس کرتا ہے یا جو چیز اس کی نہیں وُہ ملنے پر خوش ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے یہ خبر نہیں کہ یہ اس کے پاس رہنے کیلئے دیا گیا یا مستعار دیا گیا کہ اس سے واپس لے لیا جائے گا۔ اب جب وہ چیز اللہ تعالیٰ نے اس سے واپس لے لی تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کی نہ تھی بلکہ یہ اس کے پاس امانت تھی۔ اب غمزدہ ہُوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا یقین مشکوک ہے۔ اس کا علم جہالت ہے اور جس چیز میں اسے بے رغبتی دکھانی چاہیے تھی اس کی خواہش کر رہا ہے۔ اب اس کے ساتھ کیا شک ہے؟ اسے وہم ہو گیا کہ وُہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ مستغنی ہونے والے اور اقویا کے درجات کا دعویدار ہے۔ تغیرات میں خدائی تقدیر کے جاری ہونے والے مقامات کا مشاہدہ کرنے والوں میں سے ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے مگر جب معلوم ہو گا کہ یہ جھُوٹا ہے

---

[1] الحدید آیت ۲۲، ۲۳

تو جھوٹوں جیسی کمسنت دکھائے گا۔ توبہ کا خالی دعویٰ کرنے والوں کی طرح توبہ کرے گا اور صادقین جیسا کلام نہیں کرے گا اور خدا کے محبوب بندوں کی طرح عمل نہیں کرے گا۔ خدا تعالیٰ کا ایسا کرنا اس کے لیے تادیب ہے اور مزید انعام کا باعث ہے اور یہ ناقصین کے لیے باعث مزید ہے۔

۵۔ اسے ہر (چوری ہونے والے یا ضائع ہونے والے) درہم کے عوض سات سو درہم عطا ہوں گے گویا اس نے اس قدر مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اس لیے کہ اس نے ایسی نیت کر لی تھی۔ اسی طرح اگر اس کے گھر سے (چوری یا ضائع) نہ ہُوا تب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان سے استنباط کیا جائے تو اسے یہ اجر ملے گا کہ جس نے عزل کرنا چھوڑ دیا پھر اس کا نطفہ ٹھہرے تو اس کے لیے ایک لڑکے کا اجر ہے جو اس جماع سے پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو۔ چاہے لڑکا پیدا نہ ہو تو کہا، تو اسے پیدا کرتا ہے تو اسے روزی دیتا ہے۔ تیری طرف اس کی زندگی اور تیری طرف اس کی موت ہے۔ اس نے اس کا نطفہ ٹھہرایا اور تیرے لیے اس کا اجر ہے۔

۶۔ اگر اس نے اپنے گھر کے تمام مال کو صدقہ قرار دیا تو لینے والا بھائی گناہگار نہ ہوگا۔ اب اس کو دُہرا اجر ملے گا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے بھائی پر شفقت کی، نافرمانوں پر نظرِ کرم کی کہ انہیں اس کی خبر بھی نہیں اور اپنے مولائے کریم کے اخلاق (عفو و ستاری) پر چلا اور عفو کی برکت سے احسان کرنے والوں کا درجہ پالیا اہلِ تقویٰ کے مقام پر جا پہنچا اور یہ ان میں سے ہوگیا جن کا اجر اللہ پر ہے۔ اب اس کے لیے وُہ وہ انعام مخفی رکھے ہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ اس لیے کہ اس نے جان لیا کہ معاملہ کس طرح جاری ہُوا اور مال اٹھانے والا سوءِ قضا کا شکار ہُوا اور یہ اس سے بچ گیا کہ وُہ خود (چرانے والا) آدمی نہ بنا۔ اس صورت میں یہ مبتلاء و آفت زدہ لوگوں پر رحم کرے گا اور خود بچ جانے پر خدا کی حمد کہے گا۔ الغرض یہ آدمی خدا کے شکر میں مصروف ہو کر ظالم پر بددعا کرنے سے غافل ہو جائے گا۔

ایک عارفؒ اپنے ایک ساتھی کو فرماتے ہیں:

"اہلِ معرفت نے ظالموں سے ملامت کو ساقط کر دیا ؟"

میں نے کہا، "میں تو نہیں جانتا۔"

فرمایا، "اس لیے کہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ان کا امتحان لیا اور ظالموں پر ان کے باعث ابتلاء ڈال دیا۔ چنانچہ اہلِ معرفت نے ان پر رحم کیا۔" یہ بات اپنے ظالم بھائی کی مدد کرنے یعنی فرمانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہے۔ فرمایا:

"اپنے بھائی کی مدد کر، چاہے وُہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔" یعنی اس کو ظلم سے روک دے۔ اب جب اس نے

اسے معاف کر دیا تو گویا ظلم سے روک دیا کیونکہ اگر اسے مال لے جاتے دیکھ لیتے تو اس کو روکتے یا اس کو بخش دیتے اب معاف کرنا گویا اسے دیکھنے کی طرح ہُوا۔

۷۔ جو چیز کھو جائے اس میں زہد اختیار کرے۔ حضرت ابوسلیمان دارانیؒ کو مالک بن دینارؒ سے روایت پہنچی کہ انہوں نے حضرت مغیرہؒ کو فرمایا:

" جاؤ، گھر سے وہ چھاگل اٹھا لو۔ مجھے اس کی کچھ ضرورت نہیں۔" انہوں نے یہ انہیں ہدیہ کیا تھا اور انہوں نے قبول کر لیا تھا۔

انہوں نے پوچھا: "کیوں"؟

فرمایا: " اس لیے کہ شیطان مجھے وسوسہ ڈال رہا ہے کہ اسے چور لے گیا اور حضرت مالکؒ اپنے مکان کا دروازہ بند نہ کرتے اور صرف ایک کھجور کی رسی لگا دیتے اور فرماتے:

" اگر کتے نہ ہوں تو میں یہ بھی نہ لگاؤں۔"

حضرت ابوسلیمانؒ نے فرمایا:

" یہ بات صوفیوں کے ضعفِ قلب کے باعث ہوتی ہے۔ جب اس نے دنیا میں زہد کر لیا تو اب اس فکر میں کیوں رہے کہ کوئی لے جائے گا؟"

اور بات بھی ایسے ہی ہے جیسے کہ ابوسلیمانؒ نے فرمایا:

" اس لیے کہ جب زہد صحیح ہو تو اس میں رضا آجاتی ہے اور مالکؒ کے فرمان کی بھی توجیہ ہے کہ انہیں یہ بات ناپسند ہے کہ کوئی چور ایسا کرکے اللہ کی نافرمانی کرے اور یہ خدا کی نافرمانی کا سبب بن جانے۔ البتہ توکل و رضا کی وجہ سے ابوسلیمانؒ کا قول بلند درجہ کا قول ہے۔ ہم نے جو یہ ذکر کیا کہ گھر سے چوری ہونے والے مال پر ایسا طریقہ رکھے۔ یہ طریقہ ہر مال کے بارے میں ہے۔ چاہے وطن میں چوری ہو یا سفر میں ایسا ہو جائے حتیٰ کہ جان اور دوسرے معاملات میں آنے والی ہر آفت میں ایسا ہی کرے۔ اگر ایسا کیا اور دل سے یہ نیت کر لی ثواب چاہے ظاہر کرے یا مخفی رکھے۔ اس نے یہ درجہ پا لیا۔ یہ آدمی تمام لوگوں سے زیادہ حسنِ ایمان و یقین کا مالک ہے۔ دنیا کھو جانے پر اس کو سب سے کم غم و افسوس ہے۔ بہترین رضا اور اعلیٰ ترین مشاہدہ پر ہے۔ جس نے اس نعمت کو دیکھا اس پر اس کا شکر لازم ہُوا اور جس قدر ایمان و یقین کمزور ہوگا اسی قدر غم و حسرت زیادہ ہوگی، اسی قدر شکر سے محروم ہوگا اور اسی قدر شکایات کا دفتر زیادہ کھولے گا۔

الغرض مصائب ایسی محنت ہے کہ جو دنیا میں انسان کے زہد و رغبت کا معاملہ کھول دیتی ہے۔ دیکھئے حدیث میں دُعا آتی ہے:

وَ اَسْاَلُكَ مِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا۔ (اور میں تجھ سے ایسا یقین مانگتا ہوں کہ اس کے باعث ہم پر دنیاوی مصائب آسان ہو جائیں)

اب اگر دنیا کھو جانے پر غم زیادہ ہو گا تو یہ بات دنیا کی محبت اور محبوب تعالیٰ پر ضعفِ یقین کی علامت ہے۔ دنیا کھونے پر غم آسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی زاہد ہے اور اپنے پروردگار پر اس کا یقین قوی ہے اگر گھر واپس آنے کے بعد اہل توکل اپنا سامان موجود پائے تو اس سے توکل میں کچھ نقص نہیں آتا۔ البتہ اس کی نیت پر اسے اجر ضرور مل گیا اور میں اس قول کو نہیں جانتا کہ،

"اگر ایک آدمی گھر سے نکلے یا سواری سے الگ ہو یا سفر میں جائے تو اس کا یہ عقیدہ یا قول کہ یہ چیزیں اس کیلئے نہ نفع دے سکتی ہیں نہ نقصان دے سکتی ہیں" اور اگر کسی چیز کے بارے میں اللہ نے باقی رکھنے کا حکم دیا ہے تو وقت سے پہلے وہ ضائع نہیں ہو سکتی اور اگر اللہ نے اس کے ضائع کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے "تو اس کی وجہ سے اس چیز کو باقی رکھنے کی نیت ترک نہ کرے۔ اس کے باوجود توکل میں اس کو ایک حال حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ جس کے بارے میں اس نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا اور اس کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔ پھر اس نے اسے واپس کیا۔ تقویٰ میں یہ بات مستحب نہیں کہ اسے لے کر اس کا مالک بن جائے اور نہ ہی یہ بات حسنِ ادب میں داخل ہے کہ اس میں رجوع کرے۔ اس لیے کہ اس نے اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کر دیا۔ اگر رجوع کیا تو توکل میں کمی نہ ہو گی۔ اس لیے کہ دونوں حالوں میں اس نے کارسازِ کریم کے سپرد کر دیا تھا اب اس نے اسے واپس کر دیا جیسے کہ ابتداء میں عطا کیا تھا۔ اب دوبارہ عطا فرمایا۔

منقول ہے کہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی اونٹنی چوری ہو گئی۔ انہوں نے تلاش کی، تھک گئے تو فرمایا:

"اللہ کی راہ میں!"

آخر مسجد میں آئے۔ دو رکعت نماز ادا کی تو ایک آدمی نے آ کر کہا،

"اے ابوعبدالرحمٰن آپؓ کی اونٹنی فلاں جگہ ہے۔"

انہوں نے جوتے پہنے اور اٹھے، پھر اتار دیے اور کہا،

"اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ (میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں)"۔ اور بیٹھ گئے۔

کسی نے کہا،

"آپ جا کر اسے کیوں نہیں پکڑ لیتے؟"

فرمایا: "میں نے اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا ہے۔"

بعض سلف سے مروی ہے۔ فرمایا:

"میں نے ایک شب کو اپنے ایک فوت شدہ بھائی کو خواب میں دیکھا تو پوچھا:
"اللہ نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا؟"
کہا:" مجھے بخش دیا اور مجھے جنت میں داخل کیا۔ میرے سامنے جنت میں میرے مکانات پیش کیے گئے" اور بتایا کہ اس کے باوجود وہ غمگین اور پریشان تھے۔ میں نے پوچھا:
"تو جنت میں داخل ہو گیا، تیری بخشش ہو گئی پھر بھی غمگین ہے؟"
انہوں نے گہری سانس لی اور کہا:
"میں قیامت تک غمگین رہوں گا۔"
میں نے پوچھا: "کیوں؟"
فرمایا: "جب میں نے جنت میں اپنے مکانات دیکھے تو میرے سامنے علیین کے بلند مقامات پیش کیے گئے میں نے ان جیسے اعلیٰ مقامات کبھی نہیں دیکھے۔ مجھے خوشی ہوئی اور میں نے ان میں جانے کا ارادہ کیا تو ان کے اوپر سے ایک آواز دینے والے نے آواز دی:
"اسے ان سے ہٹا دو، یہ (مقامات) اس کے لیے نہیں ہیں۔ یہ ان کے لیے ہیں کہ جو اعضائے سبیل کرتا ہو۔"
پوچھا گیا، "اعضائے سبیل کیا ہے؟"
مجھے بتایا گیا: "جب ایک چیز تجھ سے کھو جاتی تو تو کہہ دیتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے۔ پھر تو اس میں رجوع کر لیتا اور اگر تو اسے جانے دیتا تو ہم بھی تجھے جانے دیتے۔"
مروی ہے کہ حضرت ربیع بن خیثم کا گھوڑا چوری ہو گیا۔ یہ گھوڑا بیس ہزار کا تھا۔ یہ نماز پڑھ رہے تھے نماز نہ توڑی اور نہ ہی اس کی تلاش میں پریشان ہوئے۔ لوگ افسوس کرنے کے لیے آئے تو فرمایا:
"میں نے چور کو کھولتے ہوئے دیکھا۔"
پوچھا گیا: "تو پھر آپ نے اسے کیوں نہ ڈانٹا؟"
فرمایا: "میں اس سے زیادہ پسندیدہ کام میں مصروف تھا یعنی نماز میں تھا۔"
بتاتے ہیں کہ لوگ چور پر بددعا کرنے لگے تو فرمایا:
"ایسا مت کہو، خیر خواہی کی بات کہو۔ میں نے تو یہ گھوڑا اس پر صدقہ کر دیا۔"
ایک بزرگ کی کچھ چیز چوری ہو گئی تو لوگوں نے کہا:
"آپ ظالم پر بددعا کیوں نہیں کرتے؟"

فرمایا: "میں نہیں چاہتا کہ میں اس کے خلاف شیطان کا مددگار بنوں۔"
پوچھا گیا: "اگر وہ چوری کردہ سامان آپ کو واپس کر دے تو کیا آپ لے لیں گے؟"
فرمایا: "میں اس کی طرف نظر بھی نہیں کروں گا۔ میں نے تو یہ چیز اس کے لیے حلال کر دی۔"
ایک بزرگؒ سے کہا گیا:
"جس نے آپ پر ظلم کیا۔ آپ اس پر بددعا کریں۔"
فرمایا: "مجھ پر کسی نے ظلم نہیں کیا۔"
پھر فرمایا: "اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اب اس بیچارے کو اپنا ظلم کافی نہیں کہ میں اس کی برائی میں اضافہ کروں؟"
ایک مسلمان کا مال چلا گیا۔ لوگ آ کر افسوس کرنے لگے۔ کہا:
"تم دنیا کھو جانے پر کیوں افسوس کرتے ہو۔ خدا کی قسم! ساری دنیا کھو جانے پر مجھے کچھ بھی غم نہیں ہوتا۔ اب اس میں سے ذرا سی کھو گئی تو کیوں غم ہوتا ہے؟"
پوچھا گیا: "کیوں؟"
اس پر شکر میں مصروفیت نے اس کے غم سے غافل کر دیا۔ سلفؒ کا طریقہ تھا کہ جب کوئی چور ڈاکو وغیرہ ان پر ظلم کرتا تو فرماتے:
"ہم پر یہ اللہ کا انعام ہے کہ ہمیں ظالم نہیں بنایا اور ہمیں مظلوم بنا کر ہمیں اس ظلم کے باعث چھن جانے پر اعلیٰ درجہ دیا۔"
بعض سلفؒ تو ظالم کو بُرے الفاظ میں یاد کرنے یا اس پر بددعا کرنے سے بھی ڈرتے کہ کہیں ان کے ظلم سے تجاوز نہ ہو جائے۔
ایک روایت ہے:
"جس نے ظالم پر بددعا کی اس نے انتقام لے لیا۔"
بعض لوگ اگر سلفؒ کے سامنے حجاج کو گالی دیتے تو فرماتے:
"اس کو گالی دینے میں غرق نہ ہو جاؤ۔ اس لیے کہ جو آدمی حجاج کی عزت سے کھیلے گا خدا اس کے لیے انصاف کرے گا جیسے کہ اس نے جس کا مال لیا اس سے انصاف کر کے واپس لے گا۔"
حدیث میں ہے:
"بندہ ظالموں پر ظلم کرتا ہے۔ وہ ظالم کو گالی دیتا اور بُرا کہتا رہتا ہے۔ آخر کار اس کے ظلم کی مقدار پر

جا پہنچتا ہے۔ پھر جس قدر بڑھتا ہے ظالم کا اس پر مطالبہ ہو جاتا ہے اور مظلوم سے اس کو بدلے کر دیا جائیگا۔"

ایک عالم نے ایک آدمی سے کہا جس نے ڈاکہ پڑنے اور مال لٹ جانے کی شکایت کی۔ فرمایا:

" اگر تجھے تیرے مال کے غم سے زیادہ یہ غم نہیں کہ کوئی مسلمان ایسا ہو جس کے لیے یہ مال حلال ہو تو پھر تو مسلمانوں کو کیا نصیحت کرے گا؟"

حضرت علی بن فضیل خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے ان کے دینار کسی نے چوری کر لیے۔ ان کے والد رونے لگے اور آہیں بھرنے لگے۔

فرمایا: " دیناروں پر رو رہے ہیں؟"

انہوں نے کہا: " نہیں، اللہ کی قسم، بلکہ مجھے اس بیچارے (چور) کا غم ہے کہ قیامت کو اسے پرسش ہو گی اور اس کے لیے کوئی دلیل (آزادی) نہ ہو گی۔"

اس مفہوم میں ایک بزرگ سے کہا گیا:

" جس نے آپ پر ظلم کیا اس پر آپ بددعا کریں۔"

فرمایا: " میں اس پر غم کرنے کی مصروفیت کے باعث اس پر بددعا سے غافل ہوں۔"

اگر متوکل کو چرایا ہوا مال واپس کر دیا گیا تو افضل بات یہ ہے کہ اس کا مالک نہ بنے بشرطیکہ اس نے اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا ہو تاکہ امضائے سبیل ہو جائے (یعنی اسے چھوڑ دے) اور اگر اس نے اٹھانیوالے پر صدقہ کر دیا تھا تو اب دیکھے اگر وہ فقیر ہے اور احتیاج نے اسے خیانت کرنے اور چوری کرنے پر آمادہ کیا تو اس پر صدقہ رہنے دے اور اگر وہ ایسا نہیں تو کسی دوسرے کو دے دے۔ بعض سلفؒ کا طریق یہ تھا کہ چیز چوری ہو جاتی تو فرمایا کرتے:

" اگر اٹھانے والا فقیر ہے تو اس پر صدقہ ہے۔ اگر ضرورت مند ہے تو اسے حلال ہے۔"

ایک شیخ بتاتے ہیں کہ مکہ میں ایک عابد بزرگؒ پر کسی حاجی نے تہمت رکھی کہ انہوں نے اس کی ہمیانی (دنانیر کی پیٹی) چرالی اس لیے کہ وہ اس کے برابر میں کھڑے تھے۔ انہوں نے پوچھا:

" اس میں کتنا مال تھا؟" اس نے بتا دیا وہ گھر گئے اور اس قدر مال لے کر اسے دے دیا۔ اس کے بعد اس حاجی کے ساتھیوں نے بتایا کہ انہوں نے اس کے ساتھ مذاق کیا۔ اس کی ہمیانی اٹھالی اور وہ سو رہا تھا۔ آخر وہ حاجی اور اس کے ساتھی آئے اور ان کا مال انہیں واپس دیا مگر انہوں نے فرمایا:

" جو مال میں نکال دیتا ہوں اس کو واپس لینے کا عادی نہیں ہوں۔ یہ تمہارا ہے۔" یہ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

انہوں نے فرمایا: "اسے لے لو"۔ مگر انہوں نے انکار کیا۔ آخر کار انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا۔ ان کے دو لڑکے تھے اور اس مال کی تھیلیاں بنا کر انہیں دیں اور ایک قوم کی طرف بھیجا اور سارا مال تقسیم کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اسے اللہ کی راہ میں دینے کی نیت کر لی تھی جیسے کہ تم کسی فقیر کو روٹی یا پیسہ دینے کی نیت کر لو۔ اب مناسب بات یہی ہے کہ اس میں رجوع نہ کیا جائے۔ اگر یہ سائل نہ لے تو اسے الگ کر دے اور دوسرے سائل کے لیے رکھ دے۔ اہل ایمان کا یہی اخلاق ہونا چاہیے مگر افسوس آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ اخلاق و طرق ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اعمالِ خیر کے یہ مبارک انداز معدوم ہو چکے ہیں۔ جس نے ان پر عمل کیا اس نے انہیں پھر سے زندہ کیا اور پہلے ادوار میں اولیاء اللہ کا یہی طریق رہا ہے۔

احکامِ متوکل کی ایک بحث

متوکل کون ہے؟ یاد رکھیے اسباب میں خدا تعالیٰ پر توکل کرنا بندے کے لیے انہیں باقی رکھنے کا باعث نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے باعث اسے ترجیح و حفاظت ملتی ہے اور نہ ہی اس کی دنیا کی بہتری کے لیے یہ کچھ بتاتا ہے بلکہ ایسا کرنا تلف و ضائع کرنے کے قریب معاملہ ہے کیونکہ توکل دراصل زہد کا ساتھی ہے۔ خواص کے نزدیک یہی مسئلہ ہے۔ بندے کی بھلائی و صداقت واضح ہونے اور دنیا کی اشیاء کی نفی کا ذکر کیا۔ فرمایا:

فَمَآ أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا[1]

(پس جو کچھ دیے گئے ہو تم کسی چیز سے، پس فائدہ ہے دنیا کی زندگی کا)

اب اگر اس کا مال ضائع ہو گیا اس نے صبر کیا یا شکر کیا یا راضی ہو گیا تو یہ توکل میں سچا ہے۔ اگر اہل توکل سچے ہوں تو حالِ توکل میں ان کا یہی طریقہ ہوتا ہے اور اگر صبر سے عاجز رہا اور پریشان ہو گیا تو توکل کے معاملہ میں جھوٹا ہے۔ اس کو چاہیے کہ چیز گم ہو جانے پر اضطراب و پریشانی محنت و مشقت کر کے دور رکھے اور نفس پر مجاہدہ کرے۔ اور تمام اعمال میں ایسی آفات کو دور رکھے۔ اگر اللہ نے اس کا مال محفوظ رہنے دیا تو یہ اس پر خدا کی شفقت و نرمی ہے اور اس کو ضائع کر کے حقیقتِ حال کھول دینے کی بجائے خدا نے ستاری سے کام لیا۔ دنیا میں اس کو عزت دیے رکھی تاکہ اپنے حال میں اس مال کے ساتھ اطمینان رکھے اور اس راہ پر اسے قلبی سکون حاصل رہے۔ یہ کمزور لوگوں کا مقام ہے اور اگر دنیا میں کچھ کمی کر دی گئی تو یہ آدمی انبیاء علیہم السلام کے الامثل فالامثل اصحابِ ابتلاء کے مقام پر آ گیا۔ اگر امتحان نہ ہوتا تو صادقین (سچ بننے والوں) کی کثرت ہو جاتی۔

---

[1] الشوریٰ آیت ۳۶۔

اسی طرح ترکِ علاج کے معاملہ میں خدا پر توکل کا مسئلہ ہے کہ نہ جھپٹ کر صحت میں جلدی مچائے اور نہ ہی امراض میں کمی کرنے اور انہیں دور کرنے میں اضطراب ظاہر کرے بلکہ ان میں زیادتی ہی ابتلاء کے قریب تر معاملہ ہے۔ فرمایا:

وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ[1] (اور تو کہ خالص کرے اللہ ان لوگوں کو کہ ایمان لائے اور مٹا ڈالے کافروں کو)

جو آدمی دنیاوی جان و مال میں نقصان ہونے کو نعمت نہ سمجھے جس پر شکر لازم ہوتا ہے اور منع کو عطاء نہ گردانے۔ وہ شکر ضائع کرنے کی وجہ سے اس نعمت سے جاہل ہے۔ اب اس نے نعمت سے جاہل رہ کر اور شکر ضائع کرکے تمام دنیا سے زیادہ نقصان کر دیا اور مجھے خطرہ ہے کہ اس پر لطیف قسم کا محق ہوگا اور محق کا مطلب چیز کا نقصان یعنی بالکل ضائع ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان

وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ۔ (اور مٹا ڈالے کافروں کو)

اب اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے شکرانِ نعمت کے کفران کی مقدار پر کیا چیز ختم کرے گا اور کم کر دے گا۔

اور فرمایا:

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ[2] (اور البتہ ہم تم کو آزمائیں گے ایک چیز کے ساتھ، ڈر سے، بھوک سے مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری دے صبر کرنے والوں کو)

غرض ان پانچ اشیاء جن کا اضافہ دنیائے کامل ہے۔ ان میں کمی آجانا ہی آخرت میں اضافہ ہے نہ کہ دنیا کی ضد ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ[3] (اور جو کچھ نزدیک اللہ کے ہے، بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے واسطے ان لوگوں کے کہ ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں)

چنانچہ انہوں نے اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہوئے مصائب پر صبر کیا۔ پھر وکیل تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہوئے اور اس پر حسنِ ظن رکھ کر اپنے صبر میں توکل کیا۔ پھر کامل حال کے لیے اور اس میں رفعتِ مقام کے ذریعہ توکل میں

---

[1] آل عمران آیت ۱۴۱

[2] البقرۃ آیت ۱۵۵ [3] الشوریٰ آیت ۳۶

صبر کیا۔ چنانچہ صبر کرنا توکل میں پہلا مقام ہے۔ مشاہدۂ قضا ہو تو یہ بات ابتلا ہے اور شکر اس سے بلند تر ہے۔ یعنی ابتلاء کو نعمت سمجھنا شکر ہے اور رضا کا مقام اس سے بھی بالاتر ہے اور یہ اعلیٰ ترین توکل ہے۔ اہل محبت، متوکلین کا یہ مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عام متوکلین کا وصف بیان کیا،

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [۱] (اور البتہ آخرت کا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے کہ پرہیزگاری کرتے ہیں۔ کیا پس نہیں سمجھتے تم)

اب جو اللہ تعالیٰ سے ڈرا اس کے خطاب کو سمجھا وہ ہر پہنچنے والی حالت میں اس پہ توکل کرے گا۔ کھو جانے پر ناامید ہوگا اور دنیا مل جانے پر شاداں و فرحاں نہ ہوگا۔ یہ زہد کا وسط اور توکل کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خواص کی تعریف کی اور فرمایا:

وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔

گاہے انہیں اپنی طرف بلا کر فانی اشیاء میں زہد کی ترغیب دی یعنی باقی میں راغب اور فانی میں زاہد بنایا آخر وہ خطاب کو سمجھے۔ یہ اہل خرد ہیں۔ ان کی اپنی طرف نسبت کی۔ اپنا وصف باقی بتایا کہ اس میں راغب ہو جائیں کیونکہ ان کا اس پر توکل ہے اور جو ان کے پاس (دنیا) ہے۔ اس کی نسبت ان کی طرف کی تاکہ اس میں زہد اختیار کریں۔ ان کا وصف فنا بتایا کیونکہ اپنے نفوس میں وہ زہد اختیار کر چکے۔ اس لیے کہ انہوں نے خدا کے سامنے انہیں فروخت کر دیا ہے۔ اب جو کسی چیز کے مالک نہیں ہیں ان کا جان و مال آقا کریم کا ہے۔ اس نے یہ سب خرید لیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ خدا کے چاہنے والے بن گئے اور انہیں ایسا عوض عطا فرمایا جو باقی رہنے والا ہے۔ فرمایا،

مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ [۲] (جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہو جاتا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے)

توکل کی مزید فضیلت

یہ یقین جانیے کہ اگر اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کی ساری مخلوقات کو ایسے آدمی کی طرح کر دیں جو اس کے کرم سے سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا دانش ور اور سب سے بڑا حکیم ہو۔ پھر تمام مخلوق کی قوتوں کے برابر ہر ایک میں علم و حکمت و عقل بھر دے بلکہ کئی گنا اضافے کر دے۔ پھر ان کے سامنے امور کے انجام کھول دے۔ مخفیات پر انہیں مطلع کر دے۔ نعمتوں کے بواطن سے آگاہ کر دے۔ سزاؤں کی باریکیاں اور

---

[۱] انعام آیت ۳۲ [۲] النحل آیت ۹۶

دنیا و آخرت میں پوشیدہ لطیف امور پر آگاہی عطا کر دے۔ پھر انہیں فرمائے:

میں نے تمہیں جو علوم و عقول دیے اور معاملات کے انجام کا مشاہدہ کرایا۔ اس کی مدد سے تدبیرِ ملکی کرو۔ پھر اس میں ان کی مدد کرے اور انہیں قوت دے تو بھی ان کی تدبیر خدا تعالیٰ کی اس تدبیر خیر و شر اور نفع و ضرر سے ایک مچھر کے پَر بھی نہ بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی مچھر کے پر بھر گھٹا سکتی ہے اور نہ ہی ان کی عقلیں اور ان کے مشاہدات اس تدبیر کے علاوہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس تقدیر و تقلیب کو بدل سکتے ہیں۔

وَ لٰکِنْ لَّا یُبْصِرُوْنَ۔ (اور لیکن نہیں دیکھتے)

اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے اسے عقول کی ترتیب پر اور عام معتاد و عرف کے امور پر جاری کیا۔ معروف اسباب و اواسط پر چلا اور عقلی طبیعت و جبلت کے مطابق اسے جاری کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ عواقب و سرائر اور اجر و ثواب مخفی کر دیے۔ چنانچہ حُسنِ تدبیر و تقدیر نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس لیے اہل توکل کے سوا عام لوگ حکم سے جاہل رہے۔ فرمایا:

وَ مَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ[1] (اور نہیں سمجھتے ان کو مگر علم والے)

بتاتے ہیں کہ خدا کی سب سے چھوٹی جاندار مخلوق اور بے جان مخلوق مچھر اور رائی ہیں مگر ان میں سے ہر ایک میں تین سو ساٹھ حکمتیں ہیں۔ جس قدر مخلوق میں بڑائی اور فوائد زیادہ ہوں گے۔ حکمتوں میں اضافہ ہوگا اور کئی طرح کی ہدایت و شرح ہوگی۔

جن کو پردہ ہٹنے سے قلبی مشاہدہ حاصل ہُوا۔ اگر وہ لوگ بہت سی تمنائیں کریں اور ان کی تمناؤں کے مطابق ان کی آرزوئیں پوری کر دی جائیں تو خدا کی تدبیریں ان کی رضا اور اس کی حُسنِ تدبیر کو سمجھنا ان کے لیے آرزوئیں کرنے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی احکم الحاکمین ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمنائیں کرنے والے انسان کو جاہل بنا کر زجر کیا کہ اس کا یقین کمزور ہے۔ اور فرمایا:

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ٥ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰی۔[2] (کیا ملتا ہے آدمی کو جو آرزو کرے۔ پس اللہ کے لیے ہے پچھلا گھر اور پہلا)

یعنی دونوں تمنائیں کرنے کی ممانعت کر دی۔ اس لیے کہ فرمایا:

وَ لَوِاتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ[3] (اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے۔ البتہ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے بگڑ جائیں)

---

[1] عنکبوت آیت ۴۳ [2] النجم آیت ۲۴، ۲۵ [3] المومنون آیت ۷۱

الغرض متوکل آدمی، اللہ سے محبت کرنے والا اپنے پروردگار سے خوش اور اسی کی ملکیت پر فرحاں ہوتا ہے اس پر شاداں ہے کہ اول و آخر سب اللہ کا ہے وہ جیسے چاہتا ہے ان میں حکم فرماتا ہے اور بندہ عاجز ہے۔ یہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔ یہ محبت میں پہلا مقام ہے۔ چنانچہ خالق علیم خبیر بصیر تعالیٰ کی حُسنِ تدبیر کے باعث یہ ساری مخلوقات کو کافی ہے۔ لوگ حکمت کو جاننے، حکم و رحمت کا مشاہدہ کرنے اور ایسی بصیرت و یقین حاصل کرنے کے محتاج ہیں کہ جس کی وجہ سے انہیں قلبی سکون حاصل ہو جائے اور قلق و اضطراب لاحق نہ ہو۔ یہ مذکورہ بات اہل یقین کے نزدیک ہے۔ البتہ عوام اس لطفِ تدبیر اور باطنِ تقدیر کے راز کا مشاہدہ کریں گے یعنی موت کے بعد ایسا ہوگا اور یہ رازِ قدر ہے اور لطائفِ مقدر تعالیٰ سے ہے جن کو آخرت میں دیکھے گا۔

دنیا میں کمی پر زمین و آسمان کے مخفی عجائبات کھل جائیں جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے علمائے ربانیین کو دے رکھی ہے تو جو ظاہر ہوا اس پر اور جو مخفی ہُوا اس پر ہر طرح شکر و حمد ہے۔ ان دونوں میں نعمت ہے ان میں سے ہر ایک حالت میں حکمت و رحمت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے علمائے ربانیین کو اپنے اخلاق سے متصف فرمایا۔ وہ صرف اسی قدر علم ظاہر کرتے ہیں جو کھل گیا اور یہ معرفت، معلوم رازِ قدر کے معیار پر ہی حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ[1]

(اور نہیں کوئی چیز مگر نزدیک ہمارے ہیں خزانے اس کے اور نہیں اتارتے ہم اس کو مگر ساتھ اندازہ معلوم کے)

اس خطاب سے انہوں نے ادب سیکھا اور اس کے سامنے باادب ہو گئے۔

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"تو جب تُو اوپر سے اشیاء کا ملاحظہ کرے تو تُو ان کا دُوسرا لالچ پائے گا۔"

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"جب تُو تمام اشیاء کو ایک شے کی طرح ایک ہی خزانہ سے دیکھے تو تُو نے وُہ دیکھا جو نہیں سُنا گیا اور وُہ سمجھا جو مخلوق نہیں سمجھا۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"تُو اس وقت ہی عجب دیکھے گا۔ جب تو عجب دیکھے گا۔ اگر تُو نے عجب نہ دیکھا تو تُو نے عجب دیکھا۔"

---

[1] الحجر آیت ۲۱۔

توکل کی ایک عجیب تشریح

علمائے ربانیین، خدا تعالیٰ پر اس لیے توکل نہیں کیا کرتے کہ وہ ان کی دنیا کی حفاظت کرے۔ نہ ہی اس لیے توکل کرتے ہیں کہ انہیں اپنے مقصود تک رسائی حاصل ہو جائے اور نہ خدا کو پابند بناتے ہیں کہ وہ ان کی پسند کے مطابق فیصلہ فرمائے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ان کی ناپسندیدہ ہٹا کر اپنے احکام کے اجراء کو بدل دے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ان کی عقلوں میں نہ آسکنے والی اپنی مشیت ہی بدل دے۔ نہ یہ کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں میں ابتلاء و امتحان کا سابقہ طریقہ ہمارے بارے میں اختیار نہ کرے۔ ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ ان سب باتوں سے بزرگ و بالاتر ہے۔ وہ اس میں خدا سے ہی سمجھ و عرفان حاصل کرتے ہیں۔ اگر کوئی عارف ان مندرجہ بالا میں سے کسی بات کا خدا پر توکل رکھنے میں معاملہ کرے تو عارفین کے نزدیک یہ گناہ کبیرہ ہے اور اس سے توبہ واجب ہے اور اس کا توکل معصیت ہے۔ بلکہ عارفین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی پر اپنے نفوس کو صابر بناتے ہیں اور جیسے بھی احکام جاری ہوں ان کے نفوس صبر کرتے اور ان کے قلوب راضی رہتے ہیں۔

ایک آدمی مالک بن انسؓ سے عرض کیا:

" اے ابو عبداللہ! میں نے کعبہ کے پردوں سے چپک کر ہر گناہ سے توبہ کی اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔"

فرمایا: "تیرا ناس ہو، اس سے بڑی نافرمانی کون سی ہے کہ تُو اللہ پر قسم دیتا ہے کہ وہ تیرے اندر اپنا حکم نافذ نہ کرے۔"

اس مفہوم پر ایک عالمؒ نے ایک حکیمؒ کے اشعار پڑھے:

لَمَّا رَأَيْتُ الْقَضَا جَارِيًا   لَا شَكَّ فِيهِ وَلَا مِرْيَةٌ

تَوَكَّلْتُ حَقًّا عَلَى خَالِقِي   وَأَلْقَيْتُ نَفْسِي مَعَ الْجِرْيَةِ

(جب میں نے قضا کو جاری ہوتے دیکھا کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں)

(تو میں نے اپنے خالق پر توکل کیا اور جاری ہونے والے حکم کے سامنے اپنا آپ ڈال دیا)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہُوئے انھوں نے ان کے لیے خدا کی ناپسندیدہ کو ناپسند کیا اور یہ ناپسندیدگی صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث ہے۔ ان کی ناپسندیدگی خدا کے حکم کے اکرام کے باعث ہے نہ کہ قضا سے نفرت کرتے ہُوئے ایسا کرتے ہیں۔ وُہ یہ بھی نہیں کہتے کہ "جو تُو ناپسند کرتا ہے اس کا فیصلہ کر دیا اور جو تُو نے فیصلہ کرتا ہے اس کو ناپسند کرتا ہے" اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالاتر ہے۔ وُہ قول و عقد میں ایسا خطاب کرنے سے شدید خوف کھاتے ہیں بلکہ اس میں بھی اس کی حکمت سمجھتے اور اس کے حکم پر صبر کرتے ہیں۔ علماء اس پر

بھی توکل کرتے ہیں کیونکہ وہ متوکلین کو پسند کرتا ہے نیز وہی اس بات کا حقدار ہے کہ ہر معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے اور اس کے احکام کو تسلیم کر لیا جائے کیونکہ وہی وکیل اوّل اور کفیل اجلّ ہے۔ فرمایا:

وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ[1] (اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ[2] (پھر عرش پر قرار پکڑا۔ کام کی تدبیر کرتا ہے۔ کوئی سفارش کرنے والا نہیں مگر اس کے اذن کے بعد)

اور اس کلام کو سمجھا۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ[3] (اور کون بہتر ہے اللہ تعالیٰ سے، حکم ہیں، واسطے اس قوم کے کہ یقین لاتے ہیں)

اور اس خطاب پر غور کیا:

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ۔

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں توکل کا حکم دیا گیا۔ اسے مندوب قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ ایمان متحقق ہوا۔ فرمایا:

فَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ[4] (کیا پس جو کھڑا ہے اوپر ہر جان کے کہ خبردار ہے ساتھ اس چیز کے کہ کماتے ہیں)

اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ ..... وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ[5] (یا کون شخص مالک ہے سننے کا اور دیکھنے کا..... اور کون تدبیر کرتا ہے کام کی)

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا[6] (اور نہیں چلنے والا بیچ زمین کے، مگر اللہ پر اس کا رزق ہے)

وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ[7] (اور آسمان میں ہے رزق تمہارا اور جو کچھ وعدہ دیے جاتے ہو تم)

پھر اس پر اپنے آپ کے ساتھ قسم کھا کر فرمایا کہ یہ حق ہے۔ چنانچہ اس سے جہاد کرتے ہوئے عارفین نے

---

[1] الزمر آیت ۶۲
[2] یونس آیت ۳
[3] مائدہ آیت ۵۰
[4] الرعد آیت ۳۳
[5] یونس آیت ۳۱
[6] ہود آیت ۶
[7] الذاریات آیت ۲۲

توکل کیا۔ مخفی شکوک تک دُور کرنے والے یقین، تہمت سے بچتے ہُوئے اور خدا پر وثوق رکھتے ہُوئے توکل کیا۔ بعض کا توکل ان سب امور کے لحاظ سے اعلیٰ تر ہے اور بعض کا توکل ان میں سے بعض کے مشاہدہ پر ہے۔ الغرض ہر بندے کا توکل اس کی معرفت کے مطابق ہے اور ہر ایک کو اس کے نمودار ہونے والے معاملہ کے مطابق معرفت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ہر آدمی اس سے قُرب کے مطابق ہی اس کی اطاعت کرتا ہے اور ہر ایک کو اس کے مقدارِ علم قرب کے مطابق ہی قرب حاصل ہے۔ جس قدر کہ اسے خزانۂ مخفی سے کینونت (ہونے) سے آگاہی ہے۔ گویا جس پر اس کی عنایت ہے اس کے علم پر ہی اسے توکل حاصل ہوا۔ اس کے بعد رازِ قدر ہے۔ خلاصہ یہ ہُوا کہ ہر بندے کو اس کے مقام و حال کے مطابق ہی مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے معاملہ کے مطابق ہی اسے جزا و اجر ملتا ہے۔

وَ اللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ[1] (اور اللہ دگنا کرتا ہے واسطے جس کے چاہے)

ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ[2] (یہ لوگ اللہ کے ہاں درجوں پر ہے اور اللہ دیکھنے والا اس کو جو کرتے ہیں)

لَھُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ ھُوَ وَلِیُّھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ[3] (ان کے لیے ہے گھر سلامتی کا، ان کے رب کے ہاں اور وہ ان کا دوست ہے بوجہ اس کے کہ وہ عمل کرتے تھے)

چنانچہ ان کے لیے "دارالسلام" جائے اجتماع ہے۔ ان کے درجات جس طرح دنیا میں مختلف تھے، اور وہ سب دنیا میں جمع تھے اسی طرح جنت میں درجات مختلف ہوں گے اور ملکوت میں انہیں اپنے ہاں خاص کارسازی فرما کر انہیں بلندی و رفعت عطا کرے گا اور حُسنِ معاملہ کی توفیق بخشے گا۔

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ[4] (اللہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ دکھاتا ہے اس کو اپنی طرف جو رجوع کرتا ہے)

خواص میں سے بعض اس کی عظمت و جلالتِ شان کے باعث توکل کرتے ہیں۔ بعض اس کے وعدہ کے یقین کے باعث توکل کرتے ہیں تاکہ ان کی صداقت ثابت ہو جائے۔ گویا موعود چیز اس کے ہاتھ سے لے لی۔ جب اللہ فرماتا ہے:

---

[1] البقرۃ آیت ۲۶۱

[2] آل عمران آیت ۱۶۳

[3] انعام آیت ۱۲۷ [4] الشوریٰ آیت ۱۳۔

وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ [1] (اور کون اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے)

اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا [2] (تحقیق ہے اس کا وعدہ لایا ہوا)

بعض اس لیے توکل کرتے ہیں کہ انہیں اس کی عظمت و غلبہ کا مشاہدہ ہوتا ہے تو وہ تسلیم کرتے ہیں۔ بعض کا توکل اس لیے ہوتا ہے کہ جو اس کا ان میں ہے۔ ان پر اس کی حفاظت رہے۔ بعض کا توکل، ان کی حفاظت و عصمت کے تحفظ رہنے کے لیے ہوتا ہے۔

بعض کا توکل اس لیے ہے کہ انہیں اس کے حسنِ معرفت کا مشاہدہ حاصل ہے۔ بعض اس کے حسنِ معاملہ کے باعث تسلیم کرتے ہوئے توکل کرتے ہیں۔ بعض نے اس کے حسنِ تدبیر اور پختہ تقدیر کے باعث سب کچھ اس کے سپرد کر دیا۔ اور تفویض کرتے ہوئے توکل کیا۔ بعض خواص کا توکل اس لیے ہے کہ اس کی توحید اور مشاہدۂ قیومت کا تقاضا یہی ہے۔ یہ سب اولیاء کرام کے طرق اور محبوبانِ خدا کے مشاہدۂ قرب اور معرفتِ قریب تعالیٰ کے انداز ہیں۔ بعض کا مقام دوسروں سے بلند و برتر ہوتا ہے اور بعض کا مشاہدہ قریب تر اور بلند تر ہوتا ہے۔

اعلیٰ ترین توکل، تعظیم و جلالتِ شان کی خاطر توکل کرنا ہے اور متوسط وہ ہے جس نے محبت و خوف کے باعث توکل کیا اور توکل کا کمترین درجہ یہ ہے کہ اس کا محبوب بننے اور اس کے احکام کو تسلیم کرتے ہوئے توکل کرے۔

عوام کا توکل ہم ذکر کر چکے ہیں۔ عارفین تو اس کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتے اور اس کے تصور سے بھی دور رہتے ہیں۔ عوام کا توکل دلوں میں ہی ہوتا ہے۔

صدیقین مقربین خواص الخواص کے توکل کا ذکر ہم نے نہیں کیا۔ اس لیے کہ کوئی بڑا صاحبِ عقل بھی اس کا متحمل نہیں ہوتا اور صرف روایاتی کتاب میں اس کا ذکر نہ درست ہے نہ ممکن ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات ایک جاہل منکر ذہن کا آدمی اس پر نکتہ چینی کرنے لگے گا اور اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست ہے۔

جس کو اس کی معرفت حاصل ہوئی وہ اس کی خاطر واجبات میں داخل ہو گیا اور اس کے وصف کے لیے مدح میں انہوں نے رغبت کی تاکہ انہیں ایسا وصف حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے کارساز کریم ان کی تعریف کرے اور اس کے باعث انہیں اس کا قرب و محبت حاصل ہو۔

توکل کب صحیح ہوتا ہے؟

اگر متوکل آدمی دنیا کی بھلائی اور اخروی درجات اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ غیر مطلوب کا قصد نہ کرے۔ سب

---

[1] توبہ آیت ۱۱۱

[2] مریم آیت ۶۱

امور میں اللہ تعالیٰ کے ہی معاملہ سپرد کر دے تو ایسا کرنے سے توکل میں کچھ کمی نہیں آتی۔ البتہ اسے اجابتِ دعا سے آگاہ ہی حاصل رہنی چاہیے۔ اس لیے کہ گاہے منع بھی اجابت و قربت بن جاتا ہے جبکہ عطا کرنے سے وُہ غفلت و بُعد میں مبتلا ہو جاتا ہو کیونکہ بھلائی اس میں ہے جس کو بندہ نہیں جانتا اور گاہے علم الٰہی میں اس کا حُسنِ انجام بندے کے نزدیک ناپسندیدہ حالت میں ہوتا ہے اور بندہ جس نقد نفع کو سمجھتا ہے اس میں حُسنِ انجام نہیں ہوتا۔ اب بندے پر لازم ہے کہ حاکم تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرلے اور قاسم تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہو جائے۔

اب اگر اس نے کثرتِ دنیا کی خاطر مانگا یا بغیر ضرورت کے مانگا یا وُہ مانگا جس میں اس کے لیے قلبی اصلاح اور قربِ خداوندی نہیں تو ایسا کرنا اُسے اس قدر حقیقی توکل سے نکال دے گا۔ جس قدر زہد سے خارج کرے گا اور اگر مانگنے سے ہٹ کر ذکر اللہ میں معروف ہو جائے تو مانگنے سے زیادہ اسے ملے گا اور اگر وکیل تعالےٰ سے حیاء کرتے ہُوئے خاموش ہو گیا تو پھر وہ کافی مددگار رہے۔ اب اس نے کفایت کا مشاہدہ کر لیا اور جمیع تصرف کے ساتھ راضی ہو گیا۔ یہ مشاہدۂ قیومیت کا سامنا کرنے کا مقام ہے اور یہ مقربین کا حال ہے۔ متوکل آدمی اگر اپنی روزی کی طرف میلان کرے تو توکل میں یہ بات کچھ مضر نہیں۔ اس لیے کہ انسان کمزور اور فاقہ والا پیدا ہُوا۔ اس کا رزق معلوم ہے اور اسے حاصل کیے بغیر چارہ نہیں، معلوم کی تقسیم ہو چکی (یعنی حصہ بٹ گیا) اب اپنے حصہ کی طرف میلان دراصل قاسم تعالیٰ کی طرف میلان ہے اور اس کا یہ میلان اپنے آقا کی عظمت و کارسازی کی جانب ہے۔ ہاں البتہ اگر اس میں زیادہ کا لالچ رکھے۔ قناعت سے نکل جائے، عادت کی طلب کرے۔ وقت سے قبل ہی ایک چیز کی خواہش کرے یا وقتِ مقررہ تک اس کی تاخیر ناپسند سمجھے تو ایسا کرنا، اس کے توکل میں معیوب بات ہے اور اس کے زہد میں بھی کمی آجائے گی اور اگر روزی ہی کی جانب میلان رکھنے سے توکل میں نقص آتا تو خرید و فروخت کرنے والے کو ہم ناقص سمجھتے اور مرض میں علاج کرانے والے کو جاہل قرار دیتے۔ اس لیے کہ اس میں رزق کی طرف میلان اور صحت کی طرف اشراف پایا جاتا ہے۔ ایسا کر کے وہ تابعین کو ضعیف بتائے گا۔ علاج کرانے والے صحابہ و سلف صالحین پر طعن کرے گا اور انہیں توکل و زہد سے خارج بتائے گا حالانکہ توکل و زہد میں انہیں بلند مقامات حاصل تھے۔ البتہ اخروی معاوضہ کی جزاء کی طرف میلان و اشراف کرنا اسے توکل سے خارج نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ اسی سے اسے اشتیاق ہُوا۔ البتہ حقیقی اخلاص سے نکل گیا، اور صدیقین اہل توکل کے بلند درجہ تک رسائی حاصل نہ کر سکے گا۔

گاہے یہ اس کے مقدارِ حال میں اضافہ کرتی ہے۔ ہاں البتہ مخلص محبین میں داخل نہیں کرتی اور نہ ہی اسے مقربین کے بلند درجات تک لے جاتی ہے اور دنیا میں اس سے بھی زہد اختیار کیے بغیر توکل صحیح نہیں ہوگا۔ زہد کی ابتداء، حرام میں رغبت ختم کرنا ہے اور متوکل کے احوال کی ابتداء، خوراک میں توکل کرنا، پھر

حی الذی لا یموت (زندہ جو نہیں مرے گا یعنی خدا تعالیٰ) کے حکم پر صبر و استقلال دکھانا ہے۔
توکل کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ احکام میں تسلیم رکھے اور لوگوں میں مسابقت کے معاملہ میں خدا کے حکم پر راضی رہے یعنی اپنے نفس کو پھینک کر فراموش کر دے۔ خدا کے ذکر میں مصروف ہو کر اس کی محبت میں ڈوب کر نفس سے غافل ہو جائے اور توکل کی حقیقت تو وکیل تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جب اس کی (ہاتھ) قدرت ظاہر ہو تو اس میں ان کے ہاتھ غائب ہو جائیں۔ اب تُو نے اس پر تواضع کے ساتھ توکل کیا۔ اب تیرا توکل قبول ہوا اور تُو نے تسلیم دکھائی تو یہ قبول ہوئی اس لیے کہ وہ تیرے سامنے ایک وصف کے ساتھ جلوہ گر ہو گا جو تجھ پر ایک حکم لازم کر دے گا اور حکم تجھے حاکم تعالیٰ کی طرف مجبور کر کے لے جائے گا اور یہ وصف تجھے وکیل کے سامنے لا کھڑا کرے گا جیسے کہ حاکم تجھے حکم کی طرف مجبور کر کے لے جاتا ہے اور جو چاہتا ہے تجھ پر اور تیرے لیے جاری کر دیتا ہے۔
اس لیے اعلیٰ ترین توکل یہ ہے کہ تُو اس سے حیا کرتے ہوئے توکل کرے اور تیرے لیے اس کے توکل عطا کرنے کو حسنِ تدبیر سمجھے۔ اس لیے کہ ایسا توکل اس نے تجھے ہی عطا فرمایا اور تیری ہی کارسازی فرمائی۔ اب اس کا اقتضاء یہ ہے کہ تو اس کے لیے صبر دکھائے یا اس کی طرف تفویض کرے یا اس سے رضا دکھائے یا تسلیم رکھے یا تُو اپنے نفس کے لیے تدبیر سے آرام پائے یا تُو اپنی تقدیر و تمناؤں کے اہتمام کرنے کو ختم کر ڈالے۔
وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ[1] (اور جو کوئی اللہ پر توکل کرے پس وہ اسے کفایت ہے) اور حسب کا معنی حسیب ہے۔ اُسے جو چاہے اور جیسے چاہے بنائے۔ کہا گیا ؛
حَسْبُہٗ ؛ یعنی توکل کافی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ تمام مقامات میں سے توکل کافی ہے۔
ایک قول ہے ؛
اللہ حسبہٗ ؛ یعنی اللہ باقی تمام سے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو بتاتے ہوئے اور جماعت کی تسلی کرتے ہوئے فرمایا ؛
اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ۔ (تحقیق اللہ پہنچنے والا ہے اپنے ارادے کو)
یعنی جو اس پر توکل کرے اس میں اپنا حکم نافذ کرتا ہے اور جو توکل نہ کرے اس میں بھی اپنا حکم نافذ کرتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا وہ اس کے لیے کافی ہے یعنی اس کے دینوی اور اخروی امور میں اس کی مدد کرنے والا ہے اور جو خدا پر توکل نہیں کرے گا وہ اپنی قسمت میں ایک مچھر کے پر جتنا بھی اضافہ

---

[1] الطلاق آیت ۳ ۔

نہیں کر سکتا جیسے کہ توکل کرنے سے اس کی روزی میں ذرہ بھر کمی نہیں آتی۔ البتہ توکل کرنے والوں کو خدا کی طرف مزید ہدایت ملتی ہے اور تقویٰ کی وجہ سے یقین میں ان کا مقام بلند ہو جاتا ہے اور انہیں عزت ملتی ہے۔ غیر متوکل کا یقین ناقص ہو جاتا ہے اور اس پر ایسے غموم آتے ہیں کہ جن کی وجہ سے اس کی جمعیتِ خاطر ختم ہو جاتی ہے اور فکری پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔

توکل کرنے کی برکت سے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اس پر اپنی رضا و محبت و کفایت فرماتا ہے توکل صادق میں خدا تعالیٰ نے اس کی ضمانت دی۔ جس نے حسنِ تفویض والوں کو ہر پریشانی سے بچا لیا۔ البتہ انتخابِ ترجیح کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

دنیا و آخرت کے امور میں سے جس قدر چاہتا ہے، جب چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے کرتا ہے اور وہاں سے دیتا ہے کہ جہاں کا بندے کو علم نہیں۔ اس لیے کہ بندہ موجود ہے اس پر دونوں جہانوں میں احکام جاری ہوں گے۔ بندہ دونوں جگہوں میں خدا تعالیٰ کے لطف و رحمت اور اس کے کرم کا محتاج ہے۔

وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ۔ (اور اللہ ہی غنی اور حمد والا ہے)

جو کہ ابتداد کرنے والا اور دوبارہ پیدا کرنے والا ہے۔

ابو محمد سہل سے پوچھا گیا،

"بندے کا توکل کب صحیح ہوتا ہے؟"

فرمایا، "جب وہ یہ جان لے کہ اس کی اپنے نفس کے لیے تدبیر سے ..س کے مولائے کریم کی اس کے لیے تدبیر زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس کے مولائے کریم کی اس پر نظر، اس کی اپنی نظر سے زیادہ بہتر ہے۔ اب اُسے چاہیے کہ گزشتہ کا غم چھوڑ دے اور آئندہ کی تمنا ترک کر دے۔ اس طرح تدبیر ہی ختم کر دے۔

وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (اور اللہ کے اختیار ہے آخر ہر کام کا)

اور ہر حالت میں اس کی حمد و شکر ہے۔

مقامِ رضا کے احکام

اللہ تعالیٰ پر یقین کے مقامات میں سے سب سے بلند ترین مقام خدا تعالیٰ سے رضا کا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ[1] (کیا بدلہ ہے نیکی کا مگر نیکی)

---

[1] الرحمٰن آیت ۶۰

اب جس نے اللہ تعالیٰ سے حسنِ رضا رکھا خدا تعالیٰ اسے رضا کی جزا دے گا۔ چنانچہ رضا کا تقابل رضا سے کیا۔ اور یہ انتہائی اجر اور انتہائی عطا ہے۔ فرمانِ خداوندی اسی طرح ہے :

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ۔ (اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوئے)

اللہ تعالیٰ نے رضا کو باغاتِ عدن سے بلند فرمایا۔ حالانکہ یہ اعلیٰ ترین جنت ہے جیسے کہ ذکر کی نماز پر فضیلت بتائی۔ فرمایا :

وَ مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ[1] (اور مکان ستھرے رہنے کے باغوں میں، اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی)

جیسے کہ فرمایا :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ[2] (بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور بری بات سے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا)

اہلِ ذکر کے نزدیک ذکر کرنا مشاہدہ ہے۔ اب نماز میں مذکور تعالیٰ کا مشاہدہ تو نماز سے بھی بڑھ کر ہے اور آیت کی دو توجیہات میں سے ایک یہ تھی اور دوسری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندے کا ذکر کرنا، بندے کے اللہ کے ذکر سے بڑھ کر ہے۔

ابو عبداللہ ساجیؒ نے فرمایا :

" اللہ کی مخلوق میں بعض ایسے بندے بھی ہیں جو صبر سے بھی حیا کرتے ہیں اور وہ تقدیر کے مواقع میں رضا کے ساتھ جلدی سے ملتے ہیں۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے :

" میں ایسے ہو چکا ہوں کہ مجھے صرف مواقعِ قضا میں فرحت ہوتی ہے۔"

چنانچہ اللہ عزوجل سے راضی رہنے والے ہی خدا کے ذاکرین ہیں کہ جو وہ چاہے اور جس پر راضی ہو، وہ بھی راضی ہو جائیں۔ اس طرح ذکرِ اکبر کرنے والوں کی جزا بھی رضوانِ اکبر ہے۔ اس فرمان کی یہ ایک توجیہ ہے۔ فرمایا :

" جس کو میرے ذکر کی مصروفیت نے مجھ سے مانگنے سے روک کر دیا۔ مانگنے والے کو جو دوں گا ان سے زیادہ بہتر اس کو دوں گا۔" یعنی اس کو رضا عطا کروں گا اس لیے کہ سائلین اپنے لیے مانگتے ہیں۔ ان کو معافی عطا فرماتا ہے۔

---

[1] التوبۃ - آیت ۷۲

[2] العنکبوت آیت ۴۵

اور ذاکرین نے اس کا ذکر کیا۔ ان کو خدا تعالیٰ سے رضا عطا ہوئی۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ میں اسے اپنی جانب نظر کا انعام دوں گا۔ اس لیے کہ ذکر ہی مشاہدہ میں داخل کرتا ہے۔ چنانچہ تقابل کرکے آج کی خدا کی جانب نظر کو کل (آخرت میں) اپنی طرف نظر بتائی جیسے کہ فرمانِ خداوندی میں وصف کا وصف کے ساتھ تقابل کیا گیا:

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ[1] (کتنے منہ اس دن روشن ہیں ہنستے خوشیاں کرتے)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہمارے لیے ہمارا پروردگار ہنستے ہوئے تجلی فرمائے گا۔" اور ذکر کا مطلب، قربِ سمع ہے اور سمع، نظر کی طرف لے جاتی ہے اور رضا دراصل موقن کا حال ہے اور یہ یقین ہی حقیقتِ ایمان ہے۔ اس وجہ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے لیے یقین کے ساتھ رضا میں عمل کر، اگر ایسا نہ ہو سکے تو جس کو تُو ناپسند کرتا ہے اس پر صبر میں بہت بھلائی ہے۔" یعنی انہیں اعلیٰ ترین مقام تک لے گئے۔ پھر انہیں متوسط مقام تک لائے۔ اس طرح آپ نے حضرت ابن عمرؓ کو فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اسے دیکھ نہ رہا ہو تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" اس میں آپ نے مشاہدہ یعنی احسان کو مندوب فرمایا۔ اس لیے کہ انہوں نے یہی پوچھا تھا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے۔" پھر انہیں صبر و مجاہدہ کی طرف لائے اور یہ ایمان ہے اور مقامِ علم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہو اور اس کے بعد کوئی مقام نہیں کہ جس کی توصیف کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے عطاءِ نظر سے بڑھ کر اپنی رضا کو فرمایا۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے لیے تجلی فرمائے گا اور کہے گا،

"مجھ سے مانگو!"

وہ جواب دیں گے،" تیری رضا!"

چنانچہ ان کا رضا کا سوال، نظر کے بعد ہوگا۔ یہ رضا کی عظیم فضیلت کی دلیل ہے نیز رضا کے باعث ہی انہیں دوام لقا حاصل ہوئی کہ جب رضا ہی باعثِ نظر (باعثِ دیدار) ہے تو انہوں نے دوامِ رضا کی درخواست کی تاکہ قرب و نظر کو دوام مل جائے۔ اس طرح کرکے انہوں نے ابتداء ہی میں کامل نعمت کی درخواست کی۔ یہ مطلب

---

[1] عبس آیت ۳۸، ۳۹

صحیح نہیں بنتا کہ تیری رضا اس سے بڑی ہے اور نہ ہی کسی کتاب میں حقیقی معاملہ کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ یہ (دیدار) صفاتِ ذاتِ تعالیٰ میں سے کسی ایک وصف کے کشف پر ہوگا جس سے بندے پر ہیبتِ ربانی چھا جائے گی، اور اس کا خوف، دلوں سے حجاب میں ہے اور اس کی حکمت راز ہائے غیبی میں سے ہے۔ اہلِ خوف کے لیے خاص معرفت کی وجہ سے دنیا میں یہ چیز ثواب و اجر ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا؛

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ[1] (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی، یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرا اپنے رب سے)

جنت میں تین انعام

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے؛

وَ لَدَیْنَا مَزِیْدٌ۔

اس میں بعض مفسرین کا فرمان ہے؛

"اہلِ جنت کو وقتِ مزید میں رب العلمین کے ہاں سے تین تحفے عطا ہوں گے۔

۱۔ اللہ کی جانب سے ایسا ہدیہ ملے گا کہ جنت میں ان کے پاس ویسا ہدیہ نہ ہوگا۔ یہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے؛

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَہُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ[2] (سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے ان کے واسطے جو ٹھنڈک ہے آنکھوں کی)

۲۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے سلام ہوگا۔ یہ بات ان کے ہدیہ میں اضافہ کر دے گی اور وہ فرمانِ الٰہی یہ ہے؛

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ الرَّحِیْمِ۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوگا کہ "میں تم سے راضی ہوں"۔ یہ بات انہیں ہدیہ اور سلام سے بھی افضل ہو گی اور اس کے بارہ میں فرمانِ خدا تعالیٰ یہ ہے:

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ[3] (اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی)

یعنی جن نعمتوں میں وہ اب ہیں ان سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کی رضا کا انعام ہے۔

مروی ہے کہ؛

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان کی ایک جماعت سے فرمایا: "تم کیا ہو؟"

---

[1] البیّنہ آیت ۸

[2] السجدہ آیت ۱۷ [3] التوبہ آیت ۷۲

انہوں نے کہا : " ہم مومن ہیں ۔"

فرمایا : " تمہارے ایمان کی کیا علامت ہے ؟"

انہوں نے کہا : " ہم تکلیف پر صبر کرتے ، فراخی میں شکر کرتے اور مواقعِ قضا پر راضی رہتے ہیں ۔"

فرمایا : " کعبہ کے رب کی قسم ! تم مومن ہو ۔"

ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" حکماء علماء ہیں ۔ قریب ہے کہ فقاہت کے باعث انبیاء ہوجاتے ۔"

چنانچہ وصفِ رضا کے بعد ان کے ایمان کی شہادت دی ۔ اس طرح لقمان حکیم نے بھی رضا کو شرطِ ایمان بتایا کہ اس کے بغیر ایمان درست نہیں ہوتا ۔ چنانچہ وصیت میں فرمایا :

" ایمان کے چار ستون ہیں ان کے بغیر ایمان درست نہیں ہوتا ۔ جیسے کہ دو ہاتھوں اور دو پاؤں کے بغیر جسم درست نہیں ہوتا ۔ اور ان میں سے خدا تعالیٰ کی تقدیر پر رضا کا ذکر کیا ۔"

رضا کا ایک واقعہ

اسرائیلیات میں منقول ہے کہ ایک عابد نے ایک طویل زمانہ تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ فلاں چرواہی عورت جنت میں تیری بیوی ہوگی ۔ یہ عابد اس عورت کی تلاش میں نکلا ۔ آخر اسے پا لیا اور تین روز اس کا مہمان بننے کی اجازت لی تاکہ اس کا عمل دیکھے ۔ یہ عابد شب بیدار تھا مگر وہ عورت رات بھر سوتی رہتی یہ ہمیشہ روزہ سے ہوتا مگر وہ عورت افطار کیے رکھتی ۔ (فرائض کے علاوہ نفلی روزوں کی عادی نہ تھی) ۔ اس نے پوچھا :

" میں نے جو دیکھا کیا تیرا اس کے علاوہ بھی کوئی عمل ہے ؟"

اس نے کہا :

" خدا کی قسم ! صرف یہی عمل ہے جو تو نے دیکھا ۔ اس کے سوا میں تو کچھ نہیں جانتی مگر یہ بار بار کرید کرتا رہا کہ یاد کرو آخر وہ کہنے لگی : " مجھ میں ایک عادت ضرور ہے کہ اگر میں تنگی میں ہوں تو میں نے فراخی ہونے کی تمنا ہی کبھی نہیں کی اور اگر میں مرض میں ہوں تو میں نے صحت ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی ۔ اگر میں دُھوپ میں ہوں تو سایہ میں آنے کی تمنا نہیں کرتی ۔"

بتاتے ہیں عابد نے اپنے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا :

" کیا یہ خصلت ہے ؟ اللہ کی قسم ! یہ بہت مبارک اور اعلیٰ خصلت ہے جس سے عابد لوگ عاجز رہ گئے ۔"

رضا کا انعام

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے :

" جو آسمان سے زمین پر نازل ہونے والی چیز پر راضی رہا اسے بخش دیا گیا ۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ایمان یہ ہے کہ حکم پر صبر کرے اور تقدیر پر راضی رہے۔"

محمدؒ بن حویلب، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"بھلائی یہ ہے کہ بندے کو جو اللہ نے اس کا حصہ لگا دیا اس پر رضا عطا کی۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"خوشخبری ہے اسے، جس کو اسلام کی طرف ہدایت ملی اور اس کی روزی بقدرِ کفایت ہے اور وُہ اس پر راضی ہُوا۔ اللہ اس سے تھوڑے سے عمل پر راضی ہو گیا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل بیت کے طریق سے مروی ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے اس کو ابتلاء میں ڈالتا ہے۔ اگر اس نے صبر کیا تو اسے چُن لیتا ہے اور اگر راضی ہو گیا تو اس کا انتخاب کر لیتا ہے۔ صبر سے اجتباء اور رضا سے اصطفاء ملتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا، مخلوق پر رحم کرنا، سلامتیٔ قلب، مسلمانوں کو نصیحت کرنا اور سخاوتِ نفس دراصل صدیقین ابدال کا مقام ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا:

"اپنے رب سے کسی ایسے معاملہ کی دعا کریں کہ ہم وُہ کریں تو وُہ ہم سے راضی ہو جائے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

"میرے خدا، جو یہ کہہ رہے ہیں اسے تُو نے سُن لیا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اے موسیٰؑ! انہیں کہہ دو، تم مجھ سے راضی رہا کرو، میں تم سے راضی رہوں گا۔"

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں اس کی تائید ملتی ہے۔ "جو یہ چاہے کہ جو اللہ کے ہاں اس کے لیے ہے اسے دیکھے تو وُہ دیکھے کہ جو خدا کا اس کے نزدیک درجہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو وہی درجہ دیتا ہے جو وہ اس کو اپنے جی میں دیتا ہے۔"

ایک حسن حدیث جو مسند کی طرح ہے حماد بن سلمہؒ سے، انہوں نے ثابت بنانیؒ سے، انہوں نے انسؓ بن مالک سے روایت کی:

"قیامت کے روز اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک گروہ کو پَر لگا دے گا۔ وہ قبروں سے نکل کر اُڑتے ہُوئے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اس میں آزاد پھرتے ہوں گے اور جیسے چاہیں گے نعمتوں سے لُطف اندوز ہوں گے۔"

فرمایا: انہیں فرشتے پوچھیں گے:

"کیا تم نے حساب دیکھا؟"

وہ کہیں گے: "ہم نے کوئی حساب نہیں دیکھا"

وہ پوچھیں گے: "کیا تم نے پل صراط پار کیا؟"

وہ کہیں گے: "ہم نے پل صراط نہیں دیکھا"

انہیں پوچھیں گے: "تم نے دوزخ دیکھا؟"

وہ کہیں گے: "ہم نے کچھ چیز نہیں دیکھی"

فرشتے پوچھیں گے: "تم کس کی امت سے ہو؟"

وہ کہیں گے: "امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہیں"

فرشتے کہیں گے: "ہم تمہیں اللہ کی قسم دیتے ہیں۔ بتاؤ تم دنیا میں کیا اعمال کرتے تھے؟"

وہ جواب دیں گے: "ہمارے اندر دو خصلتیں تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہمیں اس درجہ تک پہنچا دیا"

وہ پوچھیں گے: "وہ دو کیا ہیں؟"

وہ کہیں گے: "وہ یہ تھیں:

۱۔ جب ہم خلوت میں ہوتے تو خدا کی نافرمانی کرنے سے حیا کرتے۔

۲۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ جو دیتا اس تھوڑے سے پر بھی راضی ہو جاتے۔"

فرشتے کہیں گے: "تم اس کے واقعی حقدار ہو!"

ہمارے شیخ کی کتاب میں حضرت انسؓ سے یہی مروی ہے اور اس میں فرمایا:

"لطائفة من امتی (میری امت کا ایک گروہ ایسا ہوگا) اس سے اس کے باسند ہونے پر دلیل ہے۔

روایت میں ہے:

"جو (آدمی) اللہ کی طرف سے قلیل روزی پر راضی ہوا اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے قلیل عمل پر راضی ہو گیا"

ہمارے ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"میں مُردوں میں سے ایک دنیا (گروہ) کو جانتا ہوں کہ وہ اپنی قبروں میں ہی جنت میں واقع اپنے مکانات دیکھ رہے ہیں۔ ان پر جنت سے صبح و شام غذائیں آتی ہیں مگر وہ برزخ میں ایسے غم و کرب میں مبتلا ہیں کہ اگر اسے اہل بصرہ پر تقسیم کیا جائے تو سب بصرہ والے مر جائیں"

پُوچھا گیا: "ان کے اعمال کیا تھے؟"

فرمایا: "یہ مسلمان تھے مگر انہیں توکل اور رضا سے کچھ حصہ بھی حاصل نہ تھا۔"

فرضِ رضا کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"تم اللہ تعالیٰ کو اپنے قلوب سے رضا دو تو تم اپنے فقر کا ثواب حاصل کرلوگے ورنہ نہیں۔"

رضا کی علامات

لقمانؑ نے رضا کو توحید سے ملایا اور اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہُوئے فرمایا:

"میں تجھے ایسی خصال کی وصیت کرتا ہُوں جو تجھے اللہ کے قریب کردیں گی اور اس کی ناراضگی سے دور کردیں گی۔ پہلی یہ کہ تو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائے۔ دوسری یہ کہ پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر معاملہ میں اللہ کی تقدیر پر راضی رہے۔"

اور اپنی وصیت میں فرمایا:

"جو اللہ پر توکل کرے اور اللہ کی تقدیر پر راضی رہے اس نے ایمان قایم رکھا اور بھلائی کمانے کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں فارغ ہو گئے اور اس نے اخلاقِ صالحہ قایم رکھے جو بندے کے معاملہ کو درست کرتے ہیں۔ الغرض رضا سے ہی تمام امور میں مقدر پر قلبی سرور رہوتا ہے۔ ہر حالت میں نفس کو فرحت و سکون رہتا ہے۔ دنیا میں آنے والی ہر آفت و پریشانی کے موقع پر قلب مطمئن رہتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی تقسیم پر بندے کو قناعت بلکہ فرحت و شادمانی حاصل ہوتی ہے۔ مولائے کریم کے نافذکردہ احکام پر مسرّت ہوتی ہے۔ ہر چیز میں بندہ مولائے کریم کے حکم کو تسلیم کرلیتا ہے۔ اس کے حکم پر راضی رہ کر اپنے قبضہ کی ہر چیز مولائے کریم کے حوالہ کر دیتا ہے۔ ملک کریم تعالیٰ کی کسی مملوک بندے کے سامنے شکایت نہیں کرتا۔ حبیب تعالیٰ کے کسی فعل پر بیزاری نہیں دکھاتا اور ہر چیز میں قریب تعالیٰ کا حُسنِ صنعت دیکھتا ہے۔"

اہل رضا کے نزدیک یہ بات بھی رضا کی علامت ہے کہ بندہ یہ نہ کہے کہ آج شدید گرمی ہے اور یہ نہ کہے کہ آج سخت سردی کا دن ہے اور نہ ہی یہ کہے فقر ایک ابتلاء و تکلیف ہے اور نہ یہ کہے اہل و عیال بھی ایک آفت اور بوجھ ہے اور حرفت ایک مشقت اور محنت ہے۔ ان باتوں میں قلب کو ہلکان نہ کرے بلکہ قلب سے رضا و تسلیم رکھے۔ ذہن کو مطمئن اور اطاعت گزار بنالے۔ اور تدبیر کی شیرینی پائے۔ مقدر حکم کو بہتر سمجھے جیسے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا:

"میں ایسا ہو چکا ہوں کہ مجھے صرف مواقعِ تقدیر کے انتظار میں ہی مسرّت ملتی ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"فقر اور غنا، دو سواریاں ہیں۔ مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ ان دو میں سے کسی پر سوار ہو گیا۔ اگر فقر ہے تو اس میں

صبر ہوگا اور اگر غناء ہے تو اس میں سخاوت ہے۔"

احمد بن ابی حواریؒ نے فرمایا کہ میں نے ابو سلیمان کو بتایا:

"فلاں آدمی کا قول ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ شب جس قدر پہلے سے ہے اس سے طویل تر ہو جائے۔"

فرمایا: "اس نے اچھا کہا اور بُرا کہا اس نے عبادت کے لیے طوالتِ شب کی تمنا کر کے اچھا کہا اور جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اسے پسند نہ کر کے بُرا کیا۔"

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا:

"مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میں کس حال میں صبح کروں اور شام کروں، تکلیف میں یا فراخی میں!"

ایک روز اپنی بیوی حضرت عاتکہؓ سے ناراض ہو کر فرمایا:

"واللہ! میں تجھے دُکھ دوں گا۔"

وہ کہنے لگیں: "کیا تم مجھے اسلام سے پھیر سکتے ہو اس کے بعد کہ مجھے اللہ نے اس کی ہدایت دی؟"

فرمایا: "نہیں"۔

کہنے لگیں: "پھر مجھے کس بات کا دُکھ دو گے؟"

حضرت جعفر بن سلیمان ضبعیؒ نے بتایا کہ حضرت سفیان ثوریؒ نے ایک روز حضرت رابعہؒ کے پاس یہ کہا:

"اے اللہ! ہم سے راضی ہو جا!"

رابعہؒ کہنے لگیں: "اللہ سے حیا نہیں آتی اس سے رضا مانگتے ہو اور خود اس سے راضی نہیں ہوتے؟"

کہا: "میں اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں۔"

جعفرؒ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت رابعہؒ سے پوچھا،

"ایک بندہ خدا تعالیٰ سے کب راضی ہوتا ہے؟"

فرمایا: "جب مصیبت پر اسے ایسی ہی مسرت ہو جیسے کہ نعمت پر اسے مسرت ہوتی ہے۔"

حضرت فضیلؒ بن عیاض فرماتے ہیں:

"جب اس کے نزدیک عطاء و منع دونوں برابر ہو جائیں تو وہ راضی ہو گیا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں ہے:

"میرے اولیاء تو دنیا کے غم سے بہت دُور رہتے ہیں۔ اس لیے کہ غم تو ان کے قلوب سے میری مناجات کی شیرینی لے جائے۔"

ان واقعات میں یہ بھی آتا ہے:

" اے داؤدؑ! دنیا کے اہتمام سے دُور رہنا، اپنے اولیا سے میری محبت یہ ہے کہ وُہ رُوحانی ہوجائیں اور غم نہ کریں غم سے دُور رہو اور مال کا اہتمام نہ کرو جبکہ تمہارا مقصود و مطلوب میں ہُوں ۔"

بتاتے ہیں کہ" دُنیا میں جس کو سب سے زیادہ فکر (دنیا) ہوگا اسے آخرت میں سب سے زیادہ غم ہوگا اور جو دنیا میں سب سے کم غم و اندیشہ (دنیا) رکھتا ہوگا اسے آخرت میں سب سے کم غم ہوگا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

" تقدیر پر ایمان رکھنا، غم و اندیشہ کو دُور کر دیتا ہے ۔"

یہ یاد رکھیے کہ دنیا کی فرحت انسان کے دل سے آخرت کا فکر نکال دیتی ہے اور دُنیا پر غم کرنا، اخروی نعمت کھو جانے پر غم کے سامنے حجاب بن جاتا ہے ۔

حضرت رابعہؒ کے سامنے ایک عابد کا ذکر ہُوا جس کا اللہ کے ہاں ایک بلند درجہ تھا اور اس کی خوراک کسی بادشاہ کے گھر کے پھینکے ہُوئے کُوڑے کے ڈھیر سے تھی ۔ ایک آدمی نے ان کے سامنے کہا:

" جب اس عابد کا اللہ کے ہاں یہ بلند درجہ ہے کہ اگر یہ اس خوراک کے علاوہ کہیں اور جگہ سے خدا تعالیٰ کے سامنے خوراک مانگے تو کچھ مضربات نہیں ۔"

حضرت رابعہؒ نے فرمایا:

" خاموش رہو، بےکار آدمی، اولیا، اللہ خدا تعالیٰ کو اپنے پسندیدہ مقام کی روزی کا پابند نہیں کرتے کہ وہاں سے دو، بلکہ جہاں سے وُہ پسند کرے اس پر راضی رہتے ہیں ۔"

احمد بن ابی حواریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ابوسلیمان نے فرمایا:

" اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اپنے بندے سے اس پر راضی ہُوا جس پر بندہ اپنے آقاؤں سے راضی ہُوا۔"

میں نے پُوچھا: " وہ کس طرح؟"

فرمایا: " مخلوق بندے کی مراد کیا یہی نہیں ہے کہ اس کا آقا کریم اس سے راضی ہو جائے؟"

میں نے کہا: " ہاں ۔"

فرمایا: " تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت یہ ہے کہ وُہ اس سے راضی ہو جائیں ۔"

اعمشؒ بتاتے ہیں کہ مجھے ابو وائلؒ نے فرمایا:

" اے سلیمان! ہمارا پروردگار خوب رب ہے اگر ہم اس کی اطاعت کریں تو وُہ ہمارے خلاف نہیں کرتا اس مفہوم پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا (اور دعا سنتا ہے ایمان والوں کی اور بھلے کام

الصّٰلِحٰتِ [۱]

کرتے ہیں)

یعنی انہیں عطا کرے گا اور انہیں استجابت یعنی طاعت سے نوازے گا۔ جیسے کہ فرمایا:

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي [۲]

(تو چاہیے کہ حکم مانیں میرا)

جب وہ اس کی استجابت (اطاعت) کریں گے تو وہ ان کی دعا قبول فرمائے گا۔ یعنی انہوں نے اس کی اطاعت کی وہ ان کی پسندیدہ باتوں میں ان کی بات مان لے گا۔ یہ توضیح اس آیت کی ایک توجیہ ہے جیسے کہ فرمایا:

وَاَوْفُوا بِعَهْدِي اُوفِ بِعَهْدِكُمْ [۳]

(اور پورا کرو اقرار میرا، میں پورا کروں اقرار تمہارا)

یہ اس قرأت پر تاویل ہے:

هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ يُطِيعَكَ۔

حضرت ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ حواریوں کو معرفتِ ربانی حاصل تھی اور وہ یہ نہیں کہہ رہے تھے کہ کیا اللہ اس پر قادر ہے؟ اور اس کا معنی یہ ہے کہ کیا تیرا رب تیری اطاعت کر سکتا ہے؟ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایک روایت منقول ہے۔

رضائے خدا کس میں ہے؟

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں:

"جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، ہر چیز اس کی مطیع بن گئی اور جو اللہ سے ڈرا، ہر چیز اس سے ڈرنے لگی۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ہے:

"اے پروردگار! مجھے وہ بات بتائیے کہ جس میں تیری رضا ہو کہ اس پر عمل کروں۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

"میری رضا تیری ناپسندیدگی میں ہے اور جو تجھے ناپسندیدہ ہے اس پر تو صبر نہیں کرتا۔"

عرض کیا: "اے پروردگار! مجھے وہ بتادیں۔"

فرمایا: "تیری رضا، میری قضا کے ساتھ تیرے راضی رہنے میں ہے۔"

ایک دوسرے طریق پر مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا، کہا:

---

[۱] الشوریٰ آیت ۲۶

[۲] البقرۃ آیت ۱۸۶

[۳] البقرۃ آیت ۴۰

"کاش ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کس چیز میں ہمارے پروردگار کی رضا ہے کہ ہم وہ کریں۔"
اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:
"انہیں کہہ دو میری رضا میری قضا پر ان کے راضی رہنے میں ہے۔"
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناجات میں ہے:
"اے پروردگار! تجھے تیری کون سی مخلوق زیادہ محبوب ہے؟"
فرمایا: "وہ کہ جس سے میں اس کی محبوب (چیز) لے لوں تو وہ مجھ سے مصالحت کر لے۔"
پوچھا: "کون سی مخلوق پر تو زیادہ ناراض ہے؟"
فرمایا: "جو مجھ سے کسی معاملہ میں بھلائی مانگے۔ پھر جب میں اس کے لیے کوئی فیصلہ کر دوں تو وہ میری قضاء پر ناراض ہو۔"

ان سب سے زیادہ سخت یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"میں اللہ ہوں۔ میرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ جو میرے ابتلاء پر صبر نہیں کرتا اور میری قضاء پر راضی نہیں ہوتا اور میری نعمتوں پر شکر نہیں کرتا تو اسے چاہیے کہ میرے سوا (کسی دوسرے کو) رب بنا لیں۔"
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے باسند روایت ہے اور اس میں ایسی ہی شدت ہے۔ فرمایا: اللہ فرماتا ہے کہ:
"میں نے مقادیر کا اندازہ کر دیا، تدبیر کر دی، صنعت پختہ کر دی۔ اب جو راضی رہا اس کے لیے میری طرف سے رضا ہے۔ جب وہ میری ملاقات کرے گا اور جو ناراض ہوا اس کے لیے میری طرف سے ناراضگی ہے جب وہ مجھ سے ملے گا۔"

عدمِ رضا کی سزا

حدیث میں ہے:
"حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سب سے پہلے یہ لکھا گیا:
"میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو میرے حکم پر راضی ہوا، میری قضاء کو تسلیم کیا اور میرے ابتلاء پر صبر کیا، میں نے اسے صدیق لکھا اور قیامت کے روز اس کا حشر صدیقین کے ساتھ کروں گا۔"
ایک خبر مشہور میں یہی مفہوم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
"میں نے خیر و شر کا اندازہ کر دیا اور ان دونوں کو اپنے بندوں کے ہاتھوں پر جاری کر دیا۔ اب اس کیلئے خوشخبری ہے جس کو بھلائی کے لیے پیدا کیا اور اس کے ہاتھوں پر بھلائی جاری کر دی اور اس کے لیے ہلاکت ہے۔ جس کو شر کے لیے پیدا کیا اور اس کے ہاتھوں پر شر جاری کیا۔ پھر ہلاکت ہے۔ پھر ہلاکت ہے اس کیلئے

جو یہ کہے کیوں اور کیسے ؟"

گزشتہ زمانہ کے واقعات میں ہے کہ ایک نبیؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دس برس تک بھوک اور فقر کی فریاد کی۔ مگر کبھی بھی ان کی دُعا قبول نہ ہوئی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی فرمائی:

تو شکایت کیوں کرتا ؟ زمین و آسمان پیدا کرنے سے پہلے میرے نزدیک تیرا آغاز ہی ایسا تھا اور اسی طرح میرا حکمِ ازلی ہو چکا۔ میں نے دنیا کی پیدائش سے پہلے تیرے بارے میں یہی فیصلہ کر دیا تھا۔ اب کیا تو چاہتا ہے کہ تیری وجہ سے دنیا کی پیدائش بدل دوں ؛ یا تو جو میں نے تجھ پر مقدر کر دیا اسے بدل دوں ؟ اور تیری پسند میری پسند پر بڑھ جائے۔ تیری مراد میری مراد سے بالاتر ہو جائے ؛ میری عزت و جلال کی قسم ، اگر تیرے سینہ میں دوبارہ خلجان واقع ہوا تو میں دیوانِ نبوت سے تیرا نام مٹا دوں گا۔"

مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعض چھوٹے بچے ان کے جسم پر چڑھتے اور اترتے۔ ایک بچہ ان کی پسلیوں پر پاؤں رکھتا جیسے کہ سیڑھی ہو اور سر تک چڑھ جاتا۔ پھر پسلیوں کے سہارے اُتر آتا۔ بتاتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سر جھکائے خاموش رہتے اور سر بھی نہ اٹھاتے۔ ایک بچے نے عرض کیا:

"ابا جان ! دیکھیے یہ بچہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے ؟ آپ اسے منع کیوں نہیں کرتے ؟"

فرمایا : " بیٹا ، میں نے وہ دیکھا ہے جو تم نے نہیں دیکھا۔ میں نے وُہ جانا ہے جو تم نہیں جانتے۔ میں نے ایک ہی حرکت کی تھی کہ دارِ عزت (جنت) سے دارِ ذلت (دنیا) میں اتار دیا گیا۔ دارِ نعمت سے نکال کر دارِ شقاوت میں ڈال دیا گیا۔ اب ڈرتا ہوں کہ دُوسری حرکت کروں تو وُہ دکھ پہنچے جس کی خبر نہیں۔"

ایک روایت میں ہے کہ یُوں فرمایا :

"اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ پر ضمانت لی ہے کہ اگر میں نے زبان کی حفاظت کی تو مجھے دوبارہ اس گھر میں داخل کر دے گا جہاں سے نکالا گیا ہُوں۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ نے فرمایا :

" مخلوق کو یقین کا اس قدر حصہ حاصل ہے جس قدر انہیں رضا سے حصہ حاصل ہے اور رضا سے اس قدر حصہ حاصل ہے جس قدر ان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندگی ہے" (یعنی ذکر اللہ میں گزرتی ہے)

حضرت عطیہ نے ابُو سعیدؓ سے ، انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا :

" اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم و جلال سے رضا و یقین میں آرام و فرحت ڈال دی اور شک و ناراضگی میں غم و حزن رکھ دیا۔"

مذمت کی ممانعت | یہ بھی رضا کی علامت ہے کہ کسی مباح چیز کی مذمت نہ کرے اور اس میں عیب نہ نکالے۔

جبکہ اللہ نے ہی اسے یہ دینے کا فیصلہ فرما لیا۔ تمام صنعت میں صانع تعالیٰ پر نظر رکھے۔ سنعت و حکمت کی عمدگی کو دیکھے۔ چاہیے یہ بات اسے عام عقلی عادت سے نہ نکالے۔ بعض عارفین تو ان اشیاء کو خدا تعالیٰ سے حیاء ہیں کرتے ہیں کہ حیاء کرتے ہوئے ایسا کرے۔ بعض کا فرمان ہے کہ یہ بات خدا تعالیٰ کے ساتھ حسنِ اخلاق ہے بعض نے اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے ادب قرار دیا۔

جب یہ ایسے ہی ہوں تو بھی خدا تعالیٰ کے سامنے مباح اشیاء کی مذمت و عیب جوئی بد اخلاقی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بے ادبی کا انداز ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ایک گناہ اس میں یہ ہے کہ ایسا کرنا خدا تعالیٰ سے کمیٔ حیاء کی علامت ہے اور یہ وضاحت اس حدیث کا ایک مفہوم ہے۔ حدیث یہ ہے:

"حیاء کی کمی کفر ہے۔" یعنی یہ بات کفرانِ نعمت میں داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لطف و کرم اور فضل فرمایا اور نعمت دی۔ اس میں عیب نکالے اور اس کی مذمت کرے اس لیے کہ یہ اس کی اپنی خواہش کے خلاف یا اس سے کم درجہ پر کی ہے یہ بات کفرانِ نعمت ہے اور منعم تعالیٰ سے کمیٔ حیاء کا نشان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر شکر کا حکم دیا تھا اس نے کفران سے بدل دیا کیونکہ اگر کوئی آدمی تیری دعوتِ طعام کرے پھر تو اس میں عیب نکالے یا مذمت کرے وہ اس کو ناپسند کرے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کو بھی یہ بات ناپسندیدہ ہے اور یہ چیز معانیٔ صفات الٰہی کی معرفت میں داخل ہے۔

اس فرمان "تم میں سے اپنے رب کا زیادہ صاحب عرفان وہ ہے جو اپنے کو زیادہ پہچانے" کے مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ جب تو مخلوق کے معاملہ میں اپنے نفس کی صفات سے آگاہی حاصل کر لے گا تو اس سے اپنے خالق کی صفات جان لے گا۔ بعض اہلِ رضا کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اشیاء کی مذمت و عیب جوئی کرنا صانع تعالیٰ کی غیبت سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اس کی صنعت اور اس کی حکمت کا نتیجہ ہے۔ اس کے علم و تدبیر کا حکم اور اس کی مقادیر کی تدبیر ہے۔ وہ حاکم الحاکمین ہے، خیر الرازقین اور بہتر پیدا کرنے والا ہے۔ ہر چیز میں اس کی کامل حکمت ہے۔ ہر صنعت میں اس کی صنعت جاری ہے کیونکہ جب تم اس کی صنعت پر عیب لگاؤ گے اور اس کی مذمت کرو گے تو یہ بات صانع تعالیٰ تک جاتی ہے اس لیے کہ اس کی صنعت ہے۔ اس کی حکمت سے یہ ظاہر ہوئی۔ اس لیے کہ صنعت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا اور نہ ہی اس کی پیدائش میں اس کی صنع ہے۔ اہل تقویٰ کا یہ طریق رہا ہے کہ وہ کسی بندے کی صنعت پر عیب نہیں لگاتے۔ اس لیے کہ اس کی غیبت کرنا انہیں پسند نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر راضی رہنے والا، اس کے سامنے باادب رہتا ہے۔ اس کے گھر میں اس کا مقابلہ کرنے یا اس کے حکم پر اعتراض کرنے سے حیاء کرتا ہے۔ گھر کے مالک کو اختیار ہے جو چاہے حکم کرے اور حاکم جیسے چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ بندہ اپنے مولا کریم کے حکم و سلوک پر

راضی اور اس کے حکم کو تسلیم کیے ہُوئے ہے۔

اسرائیلیات میں ہے:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے صحابہؓ کی ایک جماعت کے ہمراہ ایک کتّے کے مردار کے پاس سے گزرے۔ (صحابہؓ) نے اپنی اپنی ناک ڈھکی اور کہنے لگے: "اف اف! کس قدر گندی بُو ہے"۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ناک نہیں ڈھکی اور فرمایا:

"اس (مردار) کے دانتوں کی کیا تیز سفیدی ہے"۔ یعنی انہیں (خدا کی) غیبت کرنے سے منع کیا اور یہ سبق دیا کہ اشیاء میں عیب جوئی ترک کرنے کا کیا انداز ہے اور خود یہ مشاہدہ کیا کہ یہ صنعت اس کے صانع کی ہے وہی اس کے مطابق تغیر وتقلب فرماتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"آپ نے کبھی کسی کھانے کا عیب نہیں نکالا۔ اگر کھانے کو جی چاہا تو کھا لیا ورنہ چھوڑ دیا۔"

حضرت انسؓ نے فرمایا:

"میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس برس تک خدمت کی۔ میں نے اپنے آقا سے بہتر کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ آپ نے مجھے کسی چیز کے بارے میں کبھی نہیں فرمایا کہ:

"یہ کیوں کیا؟" اور جو کام نہیں کیا اس کے بارے میں کبھی نہ فرمایا:

"یہ کیوں نہیں کیا؟" اور نہ ہی کسی معاملہ میں یہ فرمایا:

"کاش! ایسا نہ ہوتا۔" اور نہ یہ فرمایا کہ

"کاش! ایسا ہو جاتا۔"

فرمایا کرتے تھے:

"اگر ایک چیز کا فیصلہ ہُوا تو وہ ہو گیا۔"

خدا پر راضی رہنے والے صاحبِ یقین اور صاحبِ مشاہدہ آدمی کا یہی طریقہ ہے۔ ان دقائق پر نظر رکھنے اور اس پر قائم رہنے کے باعث ایک جماعت کو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقامِ مقربین تک سربلندی عطا ہُوئی۔ ان میں سستی وغفلت کر کے بعض کے قلوب بگڑ کر رہ گئے۔ حتیٰ کہ وہ محبت ورضا کے قابل بھی نہ رہے۔ یہی وُہ مفاہیم ہیں جن کے ذریعہ انسان اللہ کے ہاں بھلائی اور رفعت حاصل کر سکتا ہے اور حضرت سہلؒ نے اس تدبیر کی جانب ارشاد فرمایا:

"مخلوق کی تدبیر نے انہیں اللہ عزوجل سے حجاب میں ڈال دیا۔"

بتاتے ہیں کہ ایک آدمی کسی عارف کا سفر میں ہمراہ ہوگیا۔ اس نے کچھ فضول کام کیا کہ ایک چیز کو دوسری جگہ رکھا۔ عارف نے انہیں فرمایا،

" تو نے کیا کیا؟ تو نے ایسا کام کیا جس کی نہ ضرورت تھی نہ یہ سنت ہے تو کبھی بھی میری رفاقت نہ کر اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی آدمی اس سے توبہ و استغفار کرنا بھی چھوڑ دے۔ اللہ پر رضا دکھانے والوں کے اعمال کا اجر، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے اجر سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کا اجر سات سو گنا تک بڑھتا ہے مگر طالبِ رضا کا اجر بے شمار اور بے حد و حساب ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ؛

وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہیے)

فرمانِ خداوندی ہے ؛

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً۔ (کہ وہ اس کو دوگنا کر دے کئی برابر)

یعنی ایک نیکی کا اجر لاکھوں تک ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ[1] (اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے اللہ کی خوشی چاہ کر، اور اپنا دل ثابت کر کر، جیسے کہ ایک باغ ہے بلندی پر)

چنانچہ جنت میں کئی بالیں اور دانے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ؛

وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہتا ہے)

یہ لوگ اہل رضا ہیں۔ یہی لوگ ایسے ہیں کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اس کی خاطر قرضِ حسنہ دیا۔ ان کو کئی کئی گنا عطا ہوا۔

اب جس نے اللہ تعالیٰ سے اس کی حکمت سمجھی جس میں حکم دیا گیا اس میں اسے خدا کی معیت حاصل ہے اسے جس کا مشاہدہ ہوا اس کو تسلیم کیسے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار (علم) سے اشیاء کو پیدا فرمایا اور اپنی مشیت کے ساتھ انہیں ظاہر کیا۔ مقدور اس سے ہیں اور انجامِ امر اس کی طرف ہے۔ اپنی خواہش میں اسے نفس کی معیت حاصل نہیں اور نہ ہی عقل و سمجھ میں اسے عادت و عرف کی رفاقت حاصل ہے۔

---

[1] البقرة آیت ۲۶۵

ایک عارفؒ کا فرمان ہے :

"میں نے رضا کے سوا ہر مقام سے ایک حال حاصل کیا مگر رضا سے مجھے صرف سونگھنے کی حد تک ہی مل سکا اور اس پر بھی میرا یہ حال ہو گیا کہ اگر ساری مخلوق کو جنت میں داخل کر دے اور مجھے آگ میں ڈال دے تو بھی میں خدا سے راضی ہوں۔"

ایک عارفؒ کا کلام اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ فرمایا:

ان سے پوچھا گیا:

"کیا آپ کو انتہائی رضا حاصل ہے؟"

فرمایا: "انتہائی نہیں۔ البتہ رضا سے ایک مقام حاصل ہے کہ اگر مجھے دوزخ پر پل بنا کر ڈال دیا جائے اور مخلوق اس پر سے گزر کر جنت میں جائے پھر مخلوق کے عوض میرے (جسم) ساتھ دوزخ کو بھر دیا جائے تو بھی میں اس کے اس حکم کو پسند کروں گا اور اس کی طرف سے اس تقسیم پر راضی ہوں۔"

روذباریؒ سے مروی ہے کہ میں نے ابو عبداللہ بن جلاؒ دمشقی سے کہا کہ فلاں کا یہ قول ہے کہ:

"میں نے یہ چاہا کہ میرا بدن قینچیوں سے کاٹا جائے اور یہ مخلوق اس کی اطاعت کرے۔" اس کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا: "خدا کے بندے، اگر یہ قول مخلوق پر شفقت و رحم کرتے ہوئے کہا تو میں سمجھتا ہوں اور اگر بطریق تعظیم واکرام کہا تو میں نہیں سمجھتا۔"

بتاتے ہیں کہ پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔

ملائکہ کا سلام

حضرت عمران بن حصینؓ کو استسقاء بطن کا مرض ہو گیا اور وہ تیس برس تک پشت کے بل پڑے گھائل رہے۔ نہ اٹھ سکتے اور نہ بیٹھ سکتے۔ ان کی چارپائی کی رسیوں کو کاٹ کر پاخانہ و پیشاب کے لیے ان کے نیچے سے سوراخ کر دیا گیا۔ حضرت مطرفؒ یا ان کے بھائی حضرت علاؒ ان کے پاس گئے تو ان کا حال دیکھ کر رونے لگے۔ انہوں نے پوچھا:

"کیوں روتے ہو؟"

عرض کیا:

"میں آپ کو اس شدید تکلیف کی حالت میں دیکھ کر رو پڑا۔"

فرمایا: "مت رو۔ اس لیے کہ میرا محبوب ترین ہی اللہ کا محبوب ترین ہے۔"

پھر فرمایا:

"میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے نفع دیں مگر میری موت تک اسے مخفی رکھنا۔"

(فرمایا) کہ فرشتے میری ملاقات کو آتے ہیں۔ میں ان سے انس حاصل کرتا ہوں۔ وہ مجھ کو سلام کہتے ہیں۔ میں ان کا سلام سنتا ہوں۔"

عمران رحمۃ اللہ علیہ نے یہ چاہا کہ انہیں بتا دیں کہ بھائی یہ تکلیف سزا نہیں۔ اس لیے کہ ایسی نشانی تو درجہ و رحمت ہے اور سزاؤں کی آفات کے ساتھ ایسی نشانیاں اور ایسی حلاوت نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس حالت میں قلوب پر نسیم غیب چل کر مزید انعام سے نوازتی ہے۔ انہیں چونکہ ان پر غم ہوا اس لیے انہوں نے انہیں خوشخبری دی کہ ایسا نہ چاہیے کہ نہ ذکر حبیب ہو اور نہ ملاقات طبیب تعالیٰ کی محبت کا تذکرہ ہو۔ جیسے ایک محب کا شعر ہے:

يَا حَبِيْبًا بِذِكْرِهٖ نَتَدَاوٰى وَصِفُوْهٖ بِكُلِّ دَاءٍ عَجِيْبِ

مَنْ اَرَادَ الطَّبِيْبَ سَرَّ اِذَا لَهٗ اُعْتُلَّ اِشْتِيَاقًا اِلٰى لِقَاءِ الطَّبِيْبِ

مَنْ اَرَادَ الْحَبِيْبَ سَارَ اِلَيْهِ وَجَفَا الْاَهْلَ دُوْنَهٗ وَالْقَرِيْبِ

لَيْسَ دَاءُ الْمُحِبِّ دَاءٌ يُدَاوٰى اِنَّمَا بُرْؤُهٗ لِقَاءُ الْحَبِيْبِ

(اے وہ حبیب کہ جس کی یاد سے ہم علاج کرتے ہیں اور اس کے انتخاب سے، ہر عجیب مرض کا)

(جس نے طبیب کو ملنا چاہا وہ خوش ہوا، جب بیمار ہوا طبیب کی ملاقات کے شوق میں)

(جو حبیب کو ملنا چاہے وہ اس کی طرف چل پڑا اور گھر والوں کی جفا اس کے پیچھے اور قریب)

(محب کا مرض قابلِ علاج مرض نہیں ہوتا اس کی صحت تو حبیب کی ملاقات میں ہے۔)

رضا کا عجیب منظر

بتایا کہ ہم حضرت سوید بن شعبہ کے پاس بیمار پرسی کرنے کے لیے آئے۔ ہم نے انہیں ایک کپڑا اوڑھے ہوئے دیکھا۔ ہم سمجھ نہ سکے کہ اس کے نیچے کچھ چیز ہے۔ آخر اسے اٹھایا گیا تو ان کی بیوی نے کہا،

"تجھ پر قربان، ہم تمہیں کیا کھلائیں؟ کیا پلائیں؟"

انہوں نے فرمایا:

"لیٹنا طویل ہو گیا۔ ران کی ہڈیاں کمزور پڑ گئیں اور میں لاغر ہو چکا۔ اتنے اتنے روز تک کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں" یعنی چند ایام بتائے۔ پھر فرمایا،

"اور مجھے اسی میں مسرت ہے کہ اس سے ناخن بھر بھی کمی نہ ہو۔"

حضرت حذیفہؓ مرضِ وفات میں تھے تو فرمانے لگے،

"اپنا گلا گھونٹ لو، تیری عزت کی قسم، تو خوب جانتا ہے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔"

جب موت کا وقت آیا تو فرمایا،

"ایک دوست فاقہ کی حالت میں آیا، جو نادم ہُوا اس نے فلاح پائی"۔ حضرت ابُو ہریرہؓ سے بھی ایسے ہی کلمات منقول ہیں۔

جب حضرت سعدؓ مکہ میں تشریف لائے تو لوگ ان کے پاس دوڑ دوڑ کر آئے اور ان سے دعائیں کرانے لگے۔ ان کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ یہ دوسروں کے لیے دُعا کرتے اور یہ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دُعا فرمائی تھی۔ عبداللہ بن سائبؓ فرماتے ہیں کہ میں بچّہ تھا، ان کے پاس حاضر ہُوا اور تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اور فرمایا:

"تُو اہلِ مکہ کا قاری ہے؟"

میں نے عرض کیا: "ہاں"

پھر واقعہ بتایا اور آخر میں فرمایا کہ: میں نے ان سے عرض کیا:

"چچا، آپ لوگوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ کاش! اپنے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی بینائی دوبارہ بحال فرمادے۔"

وُہ مسکرا دیے اور فرمایا:

"اے بیٹے! میرے نزدیک میری بینائی سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی قضاء بہتر ہے۔"

مروی ہے کہ سلفؒ میں سے ایک بزرگ کا لڑکا تین روز تک گم رہا۔ اس کی کچھ خبر نہ مل سکی۔ ان سے کہا گیا:

"کاش آپ اللہ سے دعا کریں کہ بیٹے کو آپ کے پاس پہنچا دے۔"

فرمایا: "فیصلہٗ خداوندی پر میرا اعتراض کرنا، بیٹے کی گمشدگی زیادہ سخت بات ہے۔"

ایک عابدؒ فرماتے ہیں:

"میں نے ایک گناہ کیا۔ تیس برس سے اس پر رو رہا ہُوں اور اس گناہ سے توبہ کرتے ہُوئے بڑی ریاضت کر رہے تھے"۔ پُوچھا گیا:

"وہ کیا گناہ تھا؟"

فرمایا: "ایک بار میں نے ایک ہونے والی بات کے بارے میں یہ کہہ دیا تھا کہ "کاش! یہ نہ ہوتی"۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"اگر اللہ تعالیٰ میرے بارے میں ایک چیز کا فیصلہ فرمادے تو مجھے "کاش یہ فیصلہ نہ ہوتا" کا جملہ کہنے سے یہ زیادہ پسند ہے کہ میرا جسم قینچیوں سے کاٹا جائے۔"

حضرت بشر حافیؒ نے فرمایا:

"عبادان میں مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ تکلیف نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں رخساروں پر بہ چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی ذاکر و شاکر تھا۔ بتاتے ہیں کہ اچانک وُہ خدا کی محبت میں بے ہوش ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی گود میں اس کا سر رکھا اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے لگا کہ اس کی تکلیف دُور فرما دے۔ اسے افاقہ ہُوا اور میری دُعا سُنی تو کہا:

"یہ کون فضول آدمی ہے جو میرے اور میرے رب کے درمیان حائل ہو رہا ہے؛ اور خدا کی مجھ پر آنیوالی نعمتوں میں اعتراض کر رہا ہے؛"

بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنا سر ہٹا لیا۔

بشر بتاتے ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ جس بندے پر میں تکلیف دیکھ رہا ہُوں اس تکلیف کی نعمت میں بندے پر اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

عبدالواحد بن زیدؒ کو کسی نے بتایا کہ یہاں ایک آدمی نے پچاس برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ وہ اس کی طرف گئے اور فرمایا:

"میرے دوست! بتاؤ تم اس پر قانع ہو گئے؛"

اس نے کہا: "نہیں"

فرمایا: "کیا تو اس سے مانوس ہو گیا؛"

کہا: "نہیں"

فرمایا: "کیا تو اس تعالیٰ پر راضی ہو گیا؛"

کہا: "نہیں"

فرمایا: "تو کیا اس کی وجہ سے خوب خوب نماز و روزہ کا معاملہ رہا ہے؛"

اس نے کہا: "ہاں"

فرمایا: "اگر تجھ سے مجھے شرم نہ آئی تو بتا دوں کہ تیری پچاس سال کی محنت برباد ہو چکی۔ یعنی تجھے اس طویل عبادت سے قُرب حاصل نہیں ہُوا کہ تُو مقامِ مقربین حاصل کر سکتا اور اعمالِ قلبی میں اضافہ ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے ساتھ ایسا ہی سلوک فرماتا ہے۔ البتہ تو خدا کے نزدیک اصحابِ یمین میں سے ہے۔ اس لیے کہ عوام کی نیکیوں میں ظاہری اعمال سے اضافہ ہوتا ہے۔ اور گاہے ایک آدمی اپنے مقام میں صاحبِ اخلاص ہوتا ہے چاہے اس سے اوپر کئی درجات ہوں۔

ابن محیریزؒ ایک شامی عابد اور عالم تھے۔ ان سے معنی کے اعتبار سے ایک دقیق کلمہ مروی ہے۔ اس کا

مفہوم سامعین وحاضرین کی سمجھ میں نہ آسکا اور اس میں وضاحت در وضاحت کی ضرورت ہے۔ بتاتے ہیں کہ فرمایا:

"تم میں ہر ایک کو ملے گا اور شاید اس نے اسے جھٹلا رکھا ہو۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کسی کو سونے کی انگلی مل جائے تو دکھانے کی خاطر اس کے ساتھ اشارے کیا کرے گا اور اگر اس کو کچھ تکلیف پہنچے تو اسے چھپانے لگ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ سونا دنیاوی زینت ہے اور اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مذمت فرمائی اور ابتلاء اہل آخرت کی زینت ہے اور اللہ تعالیٰ نے آخرت کی تعریف فرمائی یعنی جب خدا تعالیٰ تجھے دنیاوی زینت دیتا ہے تو اسے ظاہر کرتا اور اس پر فخر کرتا ہے اور جب تجھے اُخروی زینت عطا کرتا ہے۔ یعنی مصائب و آفات آتے ہیں تو انہیں ناپسند کرتا ہے اور چھپاتا پھرتا ہے کہ لوگ تجھ پر عیب نہ لگائیں، یہ کافی دلیل ہے کہ تُو دنیا اور اس کی زینت سے محبت کرتا ہے اور ابتلاء کو ناپسند کر کے خدا تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے۔ جس کی اس توصیف سے اسے رد کرتا ہے یہ بات انسان کو زہد در رضا میں داخل کرتی ہے اور اس پر آتی ہے کہ جو لوگوں سے حیا کرتے ہوئے فقر و ابتلاء کو چھپاتا ہے تاکہ لوگ اس پر عیب نہ دھریں۔ مخلوق پر نظریں رکھنے کی وجہ سے یہ اس کے ضعفِ یقین کی علامت ہے اور اس پر بھی یہ کلمہ صادق آتا ہے کہ جو خدا تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنے کے بغیر اور کسی نیت کے بغیر ہی غناء ظاہر کرتا پھرے۔ ایسا کرنا بھی حبِ دنیا پر نظریں ہونے کی وجہ سے ہے۔

حضرت ابو سلیمانؒ دارانی کا بھی ایسا ہی ایک قول ہے۔ فرمایا:

"تین مقامات کی کوئی حد و انتہا نہیں:

۱۔ زہد

۲۔ ورع

۳۔ رضا۔"

ان کے بیٹے سلیمانؒ بھی عارف تھے۔ ان کا قول ان سے مختلف ہے بلکہ بعض کے نزدیک ان کا اپنے والد سے بھی بڑا درجہ ہے۔ ان کا فرمان ہے:

"ہاں، جو آدمی ہر چیز میں پرہیزگاری کرے اسے حدِ ورع تک رسائی حاصل ہوئی اور جس نے ہر چیز میں زہد اختیار کیا اسے حدِ زہد تک رسائی حاصل ہوئی اور جو ہر چیز میں اللہ پر راضی ہو گیا اسے حدِ رضا تک رسائی حاصل ہوئی۔"

اہل رضا میں سے کوئی آدمی اخروی مزید انعامات یا عبادت کرنے کی خاطر دنیاوی بہتری کی دُعا کرے،

اور ہر چیز میں خدا کی احتیاج ہی دکھائے تو ایسا کرنا اس کے لیے مقامِ رضا میں نقص نہیں بنتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خدا کی رضا ہے اور مخلوق اس سے مانگتی رہے کہ اس کی مدح کا تقاضا ہے۔ اگر مولائے کریم سے اپنا حصہ مقررہ کا سوال کرے اور اس کا قرب چاہتے ہوئے، اس سے محبت کرتے ہوئے اور اس کو سب ماسوا پر ترجیح دیتے ہوئے مانگے تو یہ زیادہ فضیلت و شرف کی بات ہے۔ اس لیے کہ اس کا تمام قلبی میلان اور فکری معاملہ اللہ تعالیٰ کی جانب جا چکا اور یہ بات اہلِ رضا کے مشاہدہ کی مقدار پر ہی ہوتی ہے اور یہ مقربین کا مقام ہے اور اس کے حال کا تقاضا ہے۔ اس لیے کہ اسے اس کے وقتِ حال میں اس کے علم پر عمل کے بارے میں پرسش ہوگی جیسے کہ اس کی تمام عمر میں اس کے علوم کے تمام اعمال کے بارے میں پرسش ہوگی۔ یہ اصل ہے اسے خوب سمجھ لو اور یہ اہلِ تصوف کا طریق ہے اور سلف صالحینؒ میں عارفین کا بھی عمل رہا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک ایسا کرکے اخروی یا دنیوی خیر مانگنا مضر نہیں۔ البتہ بعض کا اختلاف ہے اور دعا کرنے والا اپنی دعا میں خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کر رہا ہو، اس کے ذکر میں مصروف دوسروں سے غافل، اس کا شیدا ہو تو اسے اس پر بھی اجر ملے گا بلکہ یہ اس پر لازم ہے۔ اجر و ثواب کی بجائے واجبات میں منہمک ہو چکے ہیں۔ یہی افضل ہے اور یہ اہلِ محبت کا مقام ہے۔ یہ اپنے مشاہدہ پر قائم ہے اور یہ سابقہ ذکر کردہ حال کے مقتضا میں داخل ہے جو اپنے وقت میں علم پر عمل کے ساتھ حاصل ہوا۔

افضل کون

تین اہل مقام بندوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان میں سے افضل کون ہے؟:

۱۔ جو بندہ، اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق میں موت کو پسند کرتا ہے۔

۲۔ ایک بندہ، مولائے کریم کی عبادت کی خاطر زندہ رہنے کو پسند کرتا ہے۔

۳۔ ایک بندہ یہ کہتا ہے کہ میں خود کچھ بھی پسند نہیں کرتا بلکہ میرا آقا میرے لیے جو پسند کرے اس پر راضی ہوتا ہوں۔ اگر وہ چاہے تو مجھے ہمیشہ زندہ رکھے اور چاہے تو کل ہی موت دے دے۔

بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ایک عارفؒ کے پاس فیصلہ لینے گئے اس نے فرمایا:

"صاحبِ رضا ان میں سے افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ قلیل ترین فضول کام میں ہوگا۔" اور معاملہ میں بھی ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ اس نے اعتراض و طلبِ خیر ہی کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ بغیر طلبِ خیر کے ہی گھر میں داخل ہوگیا۔ اس طرح اس کا نکلنا بھی بغیر طلب (طلبِ خیر کے بغیر) کے مفہوم پر ہوگا۔ اس لیے کہ مقامِ رضا کا درجہ مقامِ شوق سے اعلیٰ ہے اور اس کے بعد اس کا درجہ افضل ہے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی خاطر موت کو پسند کرتا ہے۔ یہ محبت میں اور زندگی میں حقیقی زہد کا مقام ہے۔

حدیث میں ہے: "جس نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات پسند کی، اللہ تعالیٰ نے اس کی ملاقات پسند کی" اور

جو آدمی کثرتِ عبادت و ریاضت کی خاطر زندگی کو پسند کرتا ہے۔ وُہ ان دونوں کے بعد کی فضیلت کا مالک ہے اس کا مقام عصمت میں حُسنِ ظن و قوتِ رجاء کا ہے۔

مزید برآں اس کو قرب میں وانُس میں تنظر حاصل ہے۔ اس سے اس کا مقام اعلیٰ ہوا۔ اس کے باعث اس کے نفس کو سکون حاصل ہوا اور ابتلاؤں میں کمی ہُوئی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایمان کے اعتبار سے افضل ترین مومن" یا فرمایا "ایمان کے اعتبار سے کامل ترین مومن وُہ ہے جس کی عمر طویل ہُوئی اور اس کا عمل اچھا ہُوا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا مقتضا، تو اعمال ہی ہیں کیونکہ قول و عمل ہی حقیقتِ ایمان ہے۔ اس کے بعد کوئی قابلِ فرحت اور قابلِ رشک مقام نہیں (بلکہ نرا) زندہ رہنے کی خواہش تو فائدۂ نفسانی اور اتباعِ خواہش کے لیے ہے۔

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ کمزور لوگوں پر اس راہ سے نفسانیت چھا جاتی ہے۔ ان میں مرض مخفی ہوتا ہے، یعنی وُہ لوگ نفس اور دنیاوی مزہ و آرام کی خاطر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اس کو اصل میں زندگی سے محبت ہے۔ اس کی خاطر طویل امید اور موت سے طبعی نفرت کی وجہ سے زندہ رہنا چاہتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت و عبادت کی خاطر زندگی کو پسند کرتا ہے۔ یہ مخفی شہوت ہے۔ اس شہوت کو نکالنے کے لیے دُنیا میں حقیقی زہد کی ضرورت ہے۔ اس تیسرے طریق میں صرف ایک عارف، زاہد اور یقین پر دائمی مشاہدہ رکھنے والے ہی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے اور جو آدمی خواہشِ نفس اور دنیا کی محبت کا مریض ہو، اسے طریق و مقام میں کچھ حصہ حاصل نہیں۔

ایک روز حضرت وہیب بن وردؒ، سفیان ثوریؒ اور یوسف بن اسباطؒ ایک جگہ بیٹھے تھے۔ حضرت ثوریؒ نے فرمایا:

"آج سے پہلے میں اچانک موت کو ناپسند کرتا تھا مگر آج میں پسند کرتا ہوں کہ مر جاؤں۔"

حضرت یوسفؒ نے فرمایا:

"وُہ کیوں؟"

فرمایا: "فتنہ میں پڑ جانے کے ڈر سے۔"

حضرت یوسفؒ نے فرمایا:

"مگر میں طویل زندگی کو ناپسند نہیں کرتا۔"

حضرت ثوریؒ نے فرمایا: "تم موت کو کیوں ناپسند کرتے ہو؟"

فرمایا: "شاید مجھے کوئی ایسا دن مل جائے کہ اس میں توبہ کر لوں اور نیک عمل کر لوں۔"

حضرت وہیبؒ سے پوچھا گیا:

"آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "میں کچھ بھی اختیار نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ کی پسند ہے وہی مجھے پسند ہے۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت ثوریؒ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا:

"کعبہ کے رب کی قسم، روحانیت ہے۔" یعنی روحانیین کا مقام انہیں حاصل ہے۔ یہ لوگ ہی اہل روح و ریحان اور اہلِ محبت و رضوان مقربین ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ۔[1]

(تو راحت ہے اور روزی ہے)

یعنی ان کو نسیمِ قرب اور خوشبوئے محبت کا ریحان و آرام حاصل ہے۔ مزید برآں حبیب اللہ تعالیٰ نے اصحابِ یمین کے لیے یہ فرمایا کہ انہیں سختی اور ہولناکی سے سلامتی ہے تو مقربین کا درجہ سب سے بلند ہے اور خود ہی یہ واضح ہو گیا کہ مقربین کو ہر ہولناکی سے اُن کے مشاہدۂ قریب تعالیٰ کے باعث آرام و راحت ہو گی)، اور قُربِ حبیب کے باعث انہیں ریحان و آرام ہے۔ اس کے باعث انہیں بلندی اور رفعت حاصل ہوئی۔ بعض صوفیاء کا فرمان ہے،

"اشیاء میں رازِ عارف اس طرح ٹھہرا ہے جیسے کہ کنویں میں پانی ہے کہ ایک مقام کو چھن نہیں بیتا اور اگر نکالا جائے تو نکل آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کی اللہ مذمت کرے۔ اگر اہل رضا بھی اس کی مذمت کریں اور جو اللہ کے نزدیک ناپسند ہو تو اس کو یہ بھی ناپسند کریں تو ایسا کرنے سے ان کی رضا میں کچھ نقص نہیں آتا۔ جبکہ یہ نیکوکار ہوں اور اپنے مولا کریم کے تابعدار ہوں اور اگر اپنے حال پر راضی نہ رہے تو دین و آخرت میں نقصان ہو گا یا اگر کثرتِ دنیا، جمع مال اور ذخیرہ اندوزی کو ناپسند کریں تو اس سے ان کی رضا مجروح نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وُہ لوگ زہد کے باعث ایسا کر رہے ہیں اور ان تمام امور میں وہ علم کے مطابق کام کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے بارے میں احکام سے خُوب آگاہ ہے۔ اپنے آپ پر سب سے زیادہ غیرت والا ہے اور ساری مخلوق سے زیادہ مشاہدہ کا مالک ہے۔ اس کی مثلِ اعلیٰ ہے۔ چنانچہ وُہ اس بناء پر احکام کا مشاہدہ کرتا ہے اور جب محکوم حد سے گزرتا ہے تو اس کی مذمت کرتا ہے اور اپنی مشیت کا علم نافذ فرماتا ہے۔ حکمت و عدل کے طور پر نافرمانوں پر ناراض ہوتا ہے جیسے کہ عطاء میں ہاتھ کا مشاہدہ کرتا ہے اور خرچ کرنے والوں کی تعریف

---

[1] الواقعہ آیت ۸۸۔

فرماتا ہے اور توفیق دے کر قضا کے ساتھ اپنا ارادہ جاری کرتا ہے اور عالمین پر اپنا فضل و کرم فرماتا ہے۔ اس طرح جو بندہ اس سے راضی ہے اس کے حکم کا تابع ہے۔ اس کے فرامین کا اتباع کرتا ہے، اس کی تقدیر کو تسلیم کرتا، اس کی تدبیر پر راضی، اس سے آگاہی حاصل کرتا، مشروع پر عمل پیرا، اس کے رسول کا اطاعت گزار ہے۔ مولائے کریم نے جس کی مذمت کی اس کی مذمت کرتا ہے۔ مولائے کریم کی مدح کے باعث کسی کی مدح کرتا ہے۔ خاص کر کے اپنے نفع کے لیے ایسا نہیں کرتا۔ اس کا بھی یہی حال ہے اور اگر وہ دین بتائے یا مصائب کا ذکر کرے تو اگرانہیں نعمتیں سمجھتا ہو، پھر ان کے تذکرہ میں کچھ نقصان نہیں جبکہ اس کا قلب راضی، فرمانبردار ہو اور قضا پر برہم اور ناراض نہ ہو۔ رضا کا آغاز، صبر ہے۔ پھر قناعت کا، پھر زہد کا، پھر محبت کا اور پھر توکل کا درجہ ہے۔ چنانچہ رضا، متوکل کا ایک حال ہے اور توکل رضا کا ایک مقام ہے۔

حضرت فضیلؒ نے فرمایا:

"جب بندے کے نزدیک عطا و منع برابر ہو جائیں تو یہ رضا ہے۔"

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جب عدم و وجود اور صحت و مرض میں قلب کی حالت مختلف نہ ہو (بلکہ یکساں رہے) تو وہ راضی ہو گیا۔"

منع بھی عطا ہے

حضرت ثوریؒ کا فرمان ہے:

"اللہ کی منع بھی عطا ہے۔ اس لیے کہ وہ بخل اور عدم کے بغیر منع کرتا ہے۔ اس کی منع دراصل خیر و حسن نظر ہے۔" اور واقع بھی اسی طرح ہے۔ اس لیے کہ حقیقی منع وہ ہے کہ کسی کے پاس تیرا مال ہو اور وہ نہ دے یا تو اس پر کسی چیز کا حق رکھتا ہو اور وہ تجھے نہ دے اور جو آدمی اس پر حق ہی نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی اس کے ہاں تیرا مال ہے۔ اس لیے کہ ہر چیز سے قبل وہ تھا۔ ہر چیز کو ظاہر کرنے والا وہی ہے۔ جس کو ظاہر کیا اس کا مالک بھی وہی تعالیٰ ہے۔ مخلوق کا مختار بھی وہی ہے۔ اس کی مخلوق میں سے کسی کو نہ کچھ اختیار حاصل ہے اور نہ ہی اس کے حکم میں کسی کو کچھ اشتراک حاصل ہے۔ مخلوق اور امر اسی کا ہے۔ اس کے حکم میں کوئی شریک نہیں اور بندہ تو کچھ قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔ اب جو چیز بھی اس نے اس کے لیے مقرر کی یہ اسی کی عطا ہے البتہ مقادیر، اقسامِ احکام، تغیراتِ تدبیر میں کمی بیشی فرمادی۔ کہیں شیرینی اور کہیں تلخی ہے۔ کہیں لطف اور کہیں غایت ہے۔ کہیں شدت اور کہیں آسانی ہے۔ کہیں طبیعت کے غیر موافق خواہش کی مخالفت ہے، اور کہیں نفس کے مطابق و موافق معاملہ ہے۔

چنانچہ احکام پر صبر دکھانا، مومنین کا مقام ہے اور احکام پر راضی رہنا، اہل یقین کا مقام ہے، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ (اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنے والا یقین رکھنے

يُوْقِنُوْنَ[۱] لوگوں کو)

وَ اصْبِرْ حَتّٰی يَحْكُمَ اللّٰهُ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ[۲] (اور ثابت رہ جب تک فیصلہ کرے اللہ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے)

یہ یاد رکھیے کہ اہل یقین کے احوال، محبین کے احوال اور متوکلین کے مشاہدہ میں رضا، دراصل اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں داخل ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کی قضا ہے۔ اس کی مملوک میں وہی ہوگا جو اس کی قضا و فیصلہ ہے۔

رضا پر پختہ رہو

عارفین پر لازم ہے کہ قضا کے باعث اس پر راضی رہیں۔ پھر یہ بات تفصیل علم اور ترتیب احکام کی طرف جاتی ہے کہ جو خیر و نیکی ہو وہ مامور ہے یا مندوب۔ بندہ اس پر راضی ہو اور شرع و فعل کے اعتبار سے اس کو پسند کرے۔ اس پر شکر لازم ہے اور جو شر ہو اس سے ممانعت ہے اور اس پر تہدید ہے۔ بندے پر لازم ہے کہ عدل و تقدیر کے طور پر اس پر راضی رہے۔ اپنے مولا کریم کی حکمت و حکم سمجھ کر اسے تسلیم کرے۔ اس پر لازم ہے کہ اس سے رکے اور اس کے باعث گناہ اور ظلم کا اعتراف کرے اور اس کی وجہ سے الحکام سزا پر رضا رکھے اور اس نے تو اکتسابی طور پر اپنے اعضا کے ساتھ یہ جرم کیا اور رضا رکھے کہ اللہ کو میرے خلاف حجت حاصل ہے اور اس میں میرے پاس کچھ عذر نہیں اور راضی رہے کہ یہ بات اللہ عزوجل کی مشیت میں ہے۔ اگر چاہے گا تو اس کے رحم و کرم سے معافی ہو جائے گی اور اگر چاہا تو عدل و حق کے ساتھ سزا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نفس سے فعلی طور پر نہیں بلکہ نیت کے لحاظ سوءِ قضا پر راضی رہے اور اس کے باعث اللہ تعالیٰ سے راضی رہے اور اس کی وجہ سے نفس کے ساتھ رضا کا معاملہ نہ کرنے لگ جائے۔ اس لیے کہ اہل یقین اور اہلِ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ وُہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ساقط نہیں کرتے اور معصیت پر انکار کرنے اور زبان و قلب کے ساتھ معصیت کو ناپسند کرنے پر انکار نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ایمان نے یہ فرض قرار دیا اور شریعت میں یہ بات موجود ہے۔ مزید برآں حبیب تعالیٰ نے بھی نافرمانیوں کو ناپسند کیا۔ اب جس طرح پسندیدہ امور میں وُہ اللہ تعالیٰ کی موافقت اور اطاعت کرتے ہیں۔ اس طرح ناپسندیدہ امور میں بھی خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں یعنی جس کو خدا تعالیٰ ناپسند کرے اسے یہ بھی ناپسند کرتے ہیں اور مقامِ یقین، ایمانی فرائض کو ساقط نہیں کرتا اور مشاہدۂ توحید، شرائع نبی کو ساقط نہیں کرتا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] المائدہ آیت ۵۰

[۲] یونس آیت ۱۰۹

کا اتباع ساقط کرتا ہے۔ جس نے ایسا گمان کر لیا اس نے اللہ اور اس کے رسول پر افترا باندھا اور اہلِ یقین اور اہلِ محبت پر جھوٹ بولا۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ کی مذمت کی جو کہ دنیا پر راضی ہُوا، نافرمانیوں پر راضی ہُوا اور سابقین سے پیچھے رہ جانے پر راضی ہوگیا۔ چنانچہ فرمایا:

رَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا[1] (راضی ہُوئے دنیا کی زندگی پر، اور اس پر چین پکڑا)

یہاں ان کی مذمت کی اور فرمایا:

وَ لِتَصْغٰی اِلَیْہِ اَفْئِدَۃُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَ لِیَرْضَوْہُ وَ لِیَقْتَرِفُوْا مَا ھُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ[2] (اور تاکہ جھکیں اس طرف دل ان کے، جو یقین نہیں رکھتے آخرت کا، اور وہ اس کو پسند کریں اور تاکیے جائیں غلط کام کر رہے ہیں)

اور اسی طرح ان کی مذمت کی اور فرمایا:

رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ[3] (خوش لگا انہیں کہ رہ جائیں ساتھ پچھلی عورتوں کے)

یعنی عورتوں کے ساتھ اور خوالف کا لفظ جمع مونث کا لفظ ہے اور اسی طرح فرمایا:

وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَفْقَھُوْنَ[4] (اور مہر ہُوئی ان کے دلوں پر، سو یہ سمجھتے نہیں)

اور جو آدمی اپنے گناہوں اور منکرات پر راضی ہُوا یا دوسروں کے گناہوں پر راضی ہُوا۔ گناہوں کی وجہ سے اس سے محبت کی دوستی رکھی اور ان پر اس کی مدد کی یا یہ دعویٰ کیا کہ یہ مقامِ رضا میں ہے۔ اس پر رضا ہے یا یہ ان اہلِ رضا کا حال ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے توصیف و مدح کی ہے تو ایسا آدمی بھی ان میں داخل ہے، جن کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی اور جو خدا کے مغضوب ہیں۔ حدیث میں ہے:

"برائی پر رہنمائی کرنے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے:

"ایک بندہ گناہ سے غائب ہوگا مگر اس پر اس کے کرنے والے کی طرح بوجھ ہوگا۔"

---

[1] یونس آیت ۷
[2] الانعام آیت ۱۱۴
[3] التوبۃ آیت ۹۳
[4] التوبۃ آیت ۸۷

پوچھا گیا، "وہ کس طرح ؟"

فرمایا، "اسے اس کی خبر پہنچتی ہے اور وہ اس پر راضی ہوتا ہے۔"

حدیث میں ہے،

"اگر ایک بندہ مشرق میں قتل ہوجائے اور دوسرا آدمی مغرب میں اس کے قتل پر راضی ہوا تو وہ اس کے قتل میں شریک ہے۔"

مرسل طریق کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حسن حدیث مروی ہے،

"جس نے دین میں اپنے سے اُونچے کی طرف اور دنیا میں اپنے سے نیچے کی طرف نظر کی اللہ تعالیٰ اس کو صابر شاکر لکھے گا اور جس نے دین میں اپنے سے نیچے کی طرف اور دنیا میں اپنے سے اُونچے کی طرف نظر کی، اللہ تعالیٰ اسے نہ صابر لکھے گا نہ شاکر۔"

غفلت و بطالت کا نام رضا نہیں

متاخرین میں سے بعض بے کار اور غافلین نے باب رضا میں سخت غلطی کی ہے حالانکہ انہیں نہ اس کا علم ہے اور نہ ہی اس کا یقین حاصل ہے۔ چنانچہ رضا کی سمجھ نہ ہونے کی وجہ سے اور جہالت کے باعث وہ معصیت اور ہوائے نفس کو بھی رضا ہی کہے جا رہا ہے۔ یہ اس کی بے علمی، بدعلمی اور متشابہات پہ چلنے کی دلیل ہے اور وہ دراصل قول و فعل میں ایک جدت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس کے ذریعہ فتنہ پیدا کر کے اپنی غرض حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس نے عمر ضائع کر دی۔ اب چاہتا ہے کہ دوسروں کا وقت بھی ضائع ہوجائے۔ معصیت اور ہوائے نفس کو رضا سمجھنا ایک فاش غلطی ہے اور بے کاری میں مبتلا ہونا خود ایک باطل کام ہے۔ رضا دراصل اللہ تعالےٰ کی عدم معصیت اور عدم مخالفت (یعنی اتباع) میں ہے مثلاً دنیا کے احوال میں کمی آجائے۔ جان و مال یعنی بیوی بچوں میں نقصان آئے جن کی وجہ سے مشقت آتی ہے اور نفس کو اس سے کراہت محسوس ہوتی ہے اور جن میں صبر کر کے انسان کو آخرت میں مزید انعام ملتا ہے اور ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا نہیں آتی۔ نہ ہی اس کے کرنے والے پر وعید و مذمت ہے۔

چاہے ایک بطال و بے کار آدمی بخل کی وجہ سے یا کسی ایسی تنگی کے باعث ایسا استدلال کرتا ہے، یا دنیا کی وسعت حاصل کرنے کی خاطر ایسا کرنا اور فقر پر اس کو ترجیح دیتا ہے یعنی خرچ کرنے اور مقبوضہ میں زہد اختیار کرنے سے اجتناب کر کے اپنے اس حال پر رضا کا دعویٰ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو ہو رہا ہے اس پر اعتراض نہ کیا جائے۔ یہ نفسانی دھوکہ اور شیطانی مکر و فریب ہے۔ اور یہ ایک بندۂ خواہش کا قول ہے۔ اس لیے کہ رضا، انسان کو فقر و تنگی اختیار کرنے سے نہیں روکتا کیونکہ اہل رضا کو زہد کی فضیلت و شرف اور اس کے

اوصاف و علامات سے خوب آگاہی ہوتی ہے۔

چنانچہ اہلِ رضا جب نعمت و کثرت (کثرتِ دنیا) کو ناپسند کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ وسعت و فراخی کا حکم نہیں دیں گے۔ کیونکہ رضا کا یہ کام نہیں ہے کہ بندے کو مستحب سے باز رکھے اور نہ ہی رضا کا یہ کام ہے کہ ناپسندیدہ پر آمادہ کرے۔ ایسی باتیں کرنا در اصل مخلوق کے اعتراضات سے بچنے کے لیے نفسانی انداز ہیں مگر مالک تعالیٰ کے سامنے کوئی عذر نہ چلے گا۔ اور خالق تعالیٰ سے اس میں سلامتی نہ مل سکے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس کے چھن جانے میں حسنِ صبر کیا جائے اور اس کے ملنے پر شکر کیا جائے۔ اسی میں ہی رضا درست ہوتی ہے کیونکہ رضا کا مقام، صبر و شکر سے بالاتر ہے اور اہلِ صبر و شکر کے درجات میں اضافہ کا باعث ہے۔

اگر بندے کا یہ حال ہو کہ دین میں کمی آرہی ہو اور دنیا میں اضافہ ہو رہا ہو۔ پھر وہ اپنے حال پر راضی رہے تو اس کی رضا، اس کا بدترین عمل ہے۔ اس لیے کہ یہ امرِ الٰہی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ ابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ۔[1] (ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ)

اور فرمایا،

یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ۔[2] (ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ)

فرمایا:

سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔[3] (دوڑو اپنے رب کی معافی کو)

اور فرمایا:

وَ سَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ۔[4] (اور دوڑو اپنے رب کی معافی کو)

اسی طرح فرمایا:

وَ فِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔[5] (اور اس پر چاہیے کہ رغبت کریں رغبت کرنے والے)

ایک جگہ فرمایا:

یُسَارِعُوْنَ اِلَی الْخَیْرٰتِ وَھُمْ لَھَا سٰبِقُوْنَ۔[6] (وہ دوڑ دوڑ لیتے ہیں بھلائیاں اور وہ پہنچے ان سب سے آگے)

---

[1] المائدہ آیت ۳۵
[2] بنی اسرائیل آیت ۷
[3] حدید آیت ۲۱
[4] [illegible]
[5] المطففون آیت ۲۶
[6] [illegible]

چنانچہ مسارعت و مسابقت کو مندوب فرمایا اور پیچھے رہ جانے اور علائق دنیا سے چپک کر رہ جانے کی مذمت کی۔ یہ مومنین کا طریقہ ہے اور اس میں اہل یقین کے مقامات ہیں۔ حضرت سری سقطیؒ نے صرف اس وجہ سے بازار جانا بھی چھوڑ دیا اور دنیا میں زہد اختیار کر لیا کہ ایک بار وہ مصیبت کے مقام پر کلمۂ رضا یعنی الحمدللہ کہہ بیٹھے حالانکہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ کہنا تھا۔

واقعہ اس طرح ہُوا کہ انہیں بازار میں آگ لگ جانے کی اطلاع ہُوئی اور کسی نے بتایا کہ آپ کی دکان بھی جل گئی۔ وہ رات کو باہر نکلے تو کسی نے کہا کہ :

اے ابوالحسن ! لوگوں کی دکانیں جل گئیں مگر آپ کی دکان بچ گئی۔

انہوں نے کہا :

"الحمدللہ"۔ پھر اس میں غور کیا تو فرمایا :

"میں نے اپنا مال بچ جانے پر الحمدللہ کہا اور مسلمان بھائیوں کے اموال تباہ ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے دکان کا تمام سامان صدقہ کر دیا تاکہ اس کلمہ کا کفارہ ہو جائے۔ بازار سے نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل پر انہیں انعام دیا اور وہ دنیا میں زاہد بن گئے اور انہیں مقامِ محبت کا بلند تر درجہ عطا فرمایا۔ اور ترکِ رضا سے انہیں رضا تک رسائی عطا فرمائی۔ بتاتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے :

"میں نے ایک کلمہ زبان سے نکالا تھا، تیس سال سے اس سے استغفار کر رہا ہُوں۔ یعنی الحمدللہ اس موقعہ پر کہہ دیا تھا۔"

دوستی اور دشمنی کا معیار

حدیث میں آتا ہے :

"جو مسلمانوں کے امور کا خیال نہ رکھے (یعنی مسلمانوں کے امور سے لاپرواہی برتے) وہ مسلمانوں میں سے نہیں۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے کہ :

"پختہ ترین ایمان برہنہ ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر بغض رکھنا۔" اس کو پختہ ترین ایمان قرار دیا۔ اس لیے کہ اس کا ایمان کے ساتھ تعلق و بندھن ہے۔ شیطان اسے نہ کھول سکتا ہے اور نہ ہی اسے اس پر تسلط حاصل ہو سکتا ہے جیسے کہ اسے عقدِ ایمان کھولنے پر قدرت حاصل نہیں۔ کیونکہ اس وقت اللہ ہی حائل ہو کر اسے باز رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دلوں میں ایمان لکھ کر رُوح کے ساتھ تائیدِ ایمان کے لیے کارسازی فرمائی اور اللہ کی خاطر محبت میں اس کی موالات و کارسازی ہے اور جان و مال اور قول و فعل کی مدد ہے اور اللہ کی خاطر بغض میں اس کا ترک ہے۔ چنانچہ بدعتی، کھلے بدکار اور ظالم آدمی سے

بغض رکھنا، اس کی دوستی و نصرت نہ کرنا اہلِ ایمان پر واجب ہے۔ اس لیے اولیاء اللہ کی موالات اور اعدائے الٰہی سے عداوت پختہ تریں برہنہ ایمان ہُوا۔ کیونکہ گاہے ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ تو نافرمانیوں سے بغض رکھتا ہے مگر شیطانی غلبہ کے باعث تو خود مولائے کریم کی نافرمانی اور حکم عدولی کرجاتا ہے ورنہ خود تُو نافرمانیوں کی وجہ سے ان سے دوستی و محبت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ شیطان کو تیرے ایمانی عقد کھول دینے پر تسلط حاصل نہیں ہوسکا۔ جیسے کہ تجھ سے ایک فعل کرانے پر تسلط مل گیا اور اس طرح اسے ابھی تجھ پر یہ غلبہ بھی نہیں ملا کہ تو حرام کو حلال اور مستحسن سمجھنے لگ جائے اور برائی کو ہی دین بنا لے اور توبہ کرنا بھی بندکر دے اور نہ اسے ابھی ایسا غلبہ حاصل ہُوا کہ تو اپنے آپ پر نگرانی چھوڑ دے اور نافرمانیوں پر راضی ہوجائے۔ البتہ گاہے گاہے نافرمانیوں سے تیرا اتصال کرا دینے پر اسے تسلط ملا ہے اور اگر خدانخواستہ شیطان کو تجھ پر ایسا تسلط و غلبہ مل گیا کہ تو فاسقوں سے محبت و دوستی کرنے لگا۔ ان کی برائی پر ان کا حامی و مددگار بن گیا۔ یا حرام کا ازتکاب کرکے اسے حلال سمجھنے لگا یا حرام پر راضی ہوگیا اور اسے ہی دین بنا لیا تو یاد رکھ جس طرح رات سے دن جدا ہے اسی طرح ایمان تجھ سے جدا ہوگیا۔ اب تو کسی درجے میں ایمان نہیں رکھتا یعنی کچھ بھی ایمان باقی نہ رہا۔ اس لیے کہ ان عقود کا تعلق برہنہ ایمان سے ہے۔

کافروں سے دوستی نہ رکھو

دیکھیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ[1]

(نہ پکڑیں مسلمان کافروں کو رفیق، مسلمانوں کو چھوڑ کر، اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ کا کوئی نہیں)

یا تُو نے خدا تعالیٰ کا فرمان نہیں سُنا:

لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ[2]

(مت پکڑو یہود و نصاریٰ کو رفیق، وہ آپس میں رفیق ہیں ایک دُوسرے کے اور جو کوئی تم میں ان سے رفاقت کرے وُہ انہی میں ہے)

اسی طرح فرمایا:

لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ

(نہ پکڑو کافروں کو رفیق مسلمان چھوڑ کر، کیا لینا چاہتے ہو

---

[1] آل عمران آیت ۲۸

[2] المائدہ آیت ۵۱

الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا[1] (اپنے اوپر اللہ کا الزام صریح)

یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنے آپ اور انہیں آگ میں ڈال دینے کی قطعی حجت دو۔

اس طرح فرمایا:

وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ[2] (اور بے شک ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ دوست ہے ڈر والوں کا)

اور فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ[3] (اور اس طرح ہم ساتھ ملا دیں گے، گنہگاروں کو ایک دوسرے کے بدلہ ان کی کمائی)

پھر فرمایا:

وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ[4] (اور چلے سب مسلمانوں کی راہ سے (الگ) سو ہم اس کو حوالے کریں گے وہی طرف جو اس نے پکڑی اور ڈالیں گے اس کو دوزخ میں)

حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے میثاق میں ہر مومن سے وعدہ لیا کہ وہ ہر منافق سے بغض رکھے اور ہر منافق سے وعدہ لیا کہ وہ ہر مومن سے بغض رکھے۔"

ایک خبر مشہور میں ہے:

"انسان اس کے ساتھ ہے جس سے محبت رکھے اور اس کے لیے ہے جو اس نے اس سے اکتساب کیا۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"جس نے دنیا میں جس قوم سے محبت اور دوستی رکھی قیامت کے روز وہ اس کے ہمراہ آئے گا۔"

---

[1] النساء آیت ۱۴۴

[2] الجاثیہ آیت ۱۹

[3] الانعام آیت ۱۳۰

[4] النساء آیت ۱۱۵

اسی مفہوم میں یہ فرمان ہے :

"پختہ ترین برہنہ ایمان ہے ۔ اللہ کی خاطر محبت کرنا اور اللہ کی خاطر بغض رکھنا"

اور اس کا مخفی سبب یہ ہے کہ اہل ایمان تجھ سے محبت رکھیں اور منافق تجھ سے بغض رکھیں ۔ یہ بات تیرے پختہ ترین برہنہ ایمان کی دلیل ہے ۔ اس لیے کہ فرمان یہ ہے :

" حب فی اللہ ، ایسی اصلاح کرتا ہے کہ منافق تجھ سے بغض رکھیں جیسے کہ تُو ان سے بغض رکھتا ہے ۔ گویا تجھے اہل ایمان کے نزدیک محبوب بناتا ہے ۔ آخر وہ بھی تجھ سے محبت کرتے ہیں اور منافقین کے نزدیک تجھے مبغوض بناتا ہے ۔ آخر وہ تجھ سے بغض کرنے لگتے ہیں یعنی ان سے دُور رہ کر ، ان کے ساتھ دوستی ترک کرکے اور انہیں نصیحت کرنے کے باعث تیرے اور ان کے درمیان بغض ہو جاتا ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمہارا ایمان مضبوط ہے کہ تو اللہ کی اطاعت کرنے میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کی کہ وہ ان سے محبت رکھتا ہے اور وہ اس سے محبت رکھتے ہیں ۔ ایسا کرنے سے تو مداہنت اور نفاق سے دُور رہے گا اور اخلاص و تقویٰ کے قریب رہے گا ۔ اب اگر تو ایسا کرے گا تو وہ تیرے ساتھ بغض رکھیں گے اور تجھ پر بگڑے رہا کریں گے ۔ یہ بات خدا تعالیٰ کے اس فرمان کے مفہوم پر ہے ۔

أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ [1] (کافروں پر زور آور نرم دل ہیں آپس میں)

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِينَ [2] (نرم دل ہیں مسلمانوں پر اور زبردست ہیں کافروں پر)

اور اسی طرح اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

قٰتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً [3] (لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے کافروں سے اور چاہیے کہ انہیں معلوم ہو تمہارے اندر سختی)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

" میرے بندوں میں سے مجھے وہ زیادہ محبوب ہیں جو کہ سحری کے وقت مجھے یاد کرتے ہیں اور فاجرین کو میرا مبغوض بناتے ہیں "۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے بغض ظاہر کرتے ہیں اور اعلانِ عداوت کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ اس سے

---

[1] الفتح آیت ۲۹

[2] المائدہ آیت ۵۴

[3] التوبۃ آیت ۱۲۳

بغض رکھنے لگتے ہیں۔ جب وہ اس سے بغض کرتے ہیں تو اللہ ان سے بغض کرتا ہے یعنی بغض و ناراضگی کے ذریعہ ان کو سزا ملتی ہے۔

حضرت نوری ؒ فرمایا کرتے تھے:

"جب تو ایک آدمی کو دیکھے کہ وہ پڑوسیوں میں محبوب ہے تو جان لے کہ یہ منافق ہے۔"

ابو ادریس خولانی ؒ سے حضرت کعب احبار نے پوچھا:

"یہ خولانی (شام) کے علماء میں سے تھے۔ اپنی قوم میں کیسے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا:

"وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میری عزت کرتے ہیں۔"

حضرت کعبؓ نے فرمایا:

"پھر تورات کی بات درست نہ نکلی۔"

حضرت خولانی ؒ نے پوچھا:

"تورات میں کیا ہے؟"

فرمایا: "تورات میں ہے کہ عالم آدمی کو اس کے پڑوسی پسند نہیں کرتے۔"

ایک سالکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عارف سے عرض کیا:

"میں خدا سے بہت غافل ہوں، نیکیوں کی طرف سست و کاہل ہوں۔ کوئی نصیحت فرمایئے کہ میں اس کی تلافی کروں۔"

فرمایا: "بھائی اگر تو اولیاء اللہ سے محبت کر سکے اور ان کا تقرب و الفت حاصل کر سکے تو یہ کر، شاید وہ تم سے محبت کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر روز ستر بار اولیاء اللہ کے قلوب پر نظرِ رحمت فرماتا ہے۔ شاید کسی روز اُن کے ساتھ محبت کے باعث تیری جانب بھی نظرِ رحمت فرما دے اور تجھے دنیا و آخرت کی پریشانیوں اور تحیر سے پناہ دے دے جبکہ تیری اس پر براہ راست نظر نہیں۔"

اور مشائخ بتاتے ہیں کہ صدیقین و شہداء کے قلوب کی طرف اللہ تعالیٰ کی براہ راست نظرِ رحمت ہوتی ہے۔ پھر اس قوم کے قلوب کی طرف نظرِ رحمت ہوتی ہے جو ان کے قلوب میں ہے اور اس طرح قلوب در قلوب پر نظرِ رحمت پڑتی ہے۔ میرے نزدیک عزیمت دینی اور اہلِ تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ اعدائے الٰہی کے ساتھ بغض رکھا جائے اور اہل بدعت اور ظالموں سے نفرت کی جائے تاکہ وہ بھی تجھ پر ناراض و غضبناک رہیں۔ یہ بھی نیکی میں داخل ہے جیسے کہ تیرا اولیاء کرام سے محبت رکھنا اور ان کا تجھ سے محبت رکھنا نیکی ہے اور یہ

امور بھی اللہ تعالیٰ کی دوستی و ولایت حاصل کرنے کے باعث ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا مروی ہے:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عِنْدِیْ یَدًا فَیُحِبَّهٗ قَلْبِیْ۔ (اے اللہ کسی فاجر کا مجھ پر احسان نہ کرنا کہ میرا دل اس کو پسند کرنے لگے)

ایک حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ کو ایک ہزار دینار اور دس کپڑے بھیجے۔ انہوں نے واپس کر دیے اور فرمایا:

"میں ایسے آدمی سے مال قبول نہیں کرتا جو حلال (کی پروا کیے) بغیر مال لے اور اسے ناحق میں خرچ کرے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فاجر کا ہدیہ اسے واپس کر دو۔ وہ نہ سمجھے کہ تم اس کے عمل پر راضی ہو۔" اور اس زہد میں اپنا مال کم کر رکھو جبکہ مداہنت کرنا ابوابِ دنیا میں سے ایک اہم باب ہے تو (فاجر کا ہدیہ واپس کرنا اور اس سے بغض رکھنا) ابوابِ دین میں سے ایک اہم باب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ اہل دنیا کا عیش و آرام عروج و کمال پر پہنچتا ہے اور یہ بات الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کا دوسرا مفہوم ہے۔ اور یہ ایک دقیق توجیہ ہے مطلب یہ ہے کہ جب مکاشفہ ہوا تو علمائے آخرت کے نزدیک موجود ظاہر و واضح ہو گیا۔ اور جو لوگ فاسقوں سے محبت رکھتے اور ان سے امن کے متلاشی ہیں ظالموں کے ظلم کے ڈر سے مداہنت کرتے اور ان کا اتباع کرتے ہیں۔ اس حرکت کو علاماتِ نفاق قرار دیا۔ فرمایا:

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْكُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْآ اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِیْهَا۔ (اب تم دیکھو گے ایک اور لوگ چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی قوم سے بھی، جس بار بلائے جاتے ہیں فساد کرنے کو الٹ جاتے ہیں اس ہنگامہ میں)

دوسرے مفہوم میں فرمایا:

فَتَرَى الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ [1]

یعنی منافقین کے دلوں میں بیماری بیٹھے گا۔

یُسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ ۔ (دوڑ کر ملے جاتے ہیں ان میں)

یعنی کافروں کے ساتھ مخفی طور پر جاتے ہیں کہ:

---

[1] النساء آیت ۹۱ ۔

يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰىٓ اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ[1] (کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش)

یعنی ہمیں خطرہ ہے کہ کافروں کا مسلمانوں پر تسلط نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا:

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ۔ (سو شاید اللہ جلدی بھیجے فیصلہ یا حکم اپنے پاس سے)

اس لیے اہلِ ایمان اور اہلِ سنت کو محبوب رکھیں اور منافقین اور اہلِ بدعت سے بغض رکھیں۔ جو آدمی اہلِ ایمان کی موافقت میں تیزی دکھانا چاہتا ہے۔ اسے چاہیے کہ ظالموں کی اتباع و موافقت سے رُکے۔ ان کے سامنے مداہنت اختیار نہ کرے تاکہ اس کا ایمان نفاق سے بچا رہے اور وُہ گمراہی سے بچ جائے۔ جس نے اعدائے الٰہی سے محبت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کی نفی فرمائی اور جس نے دشمنانِ خدا سے بغض رکھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے ایمان و یقین کی تائید و تثبیت کی۔ فرمایا:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ۔[2] (تُو نہ دیکھے گا کوئی لوگ جو یقین رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر، پھر دوستی کریں ایسوں سے، جو مخالف ہوں اللہ کے اور اس کے رسول کے)

اور جس جاہل نے یہ کہا کہ گاہے نافرمانیوں کے ساتھ بھی رضائے خدا ہوتی ہے یا طاعات کے علاوہ امور میں بھی رضائے الٰہی پائی جاتی ہے تو اس جاہل نے معصیت اور مخالفتِ الٰہی کو نیکی اور اطاعت کے برابر کردیا حالانکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی شرائع کو ساقط کرنا اور گرادینا ہے۔ یہ بات اللہ کے حرام کو حلال قرار دینا ہُوا۔ اور اس کے اوامر و نواہی کی تکذیب و ابطال بن گیا۔

حدیث میں آتا ہے:

"اللہ کے ہاں بدترین آدمی وُہ ہے جو مومن کی بُرائی کا اقتداء کرتا ہے اور اس کی نیکی کو چھوڑ دیتا ہے۔"

ایک عالم فرماتے ہیں:

"جس نے علماء کے شواذ اٹھائے (یعنی انہیں یاد رکھا اور ان پر عمل کیا) اس نے بہت بڑا شر اُٹھایا۔"

نیک کاموں میں حُسنِ ادب یہ ہے کہ جب کوئی نیک کام کرے تو یُوں کہے:

"اے مولائے کریم، تو نے مجھ سے عمل کرایا، تیری توفیق و قوت اور مدد سے میں نے تیری اطاعت کی۔

---

[1] المائدہ آیت ۵۲

[2] المجادلۃ آیت ۲۲

اس لیے کہ میرے اعضاء تیرے لشکر ہیں۔" اور اگر بُرائی کر بیٹھے تو یُوں عرض گزار ہو:

"میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ میں نے اپنی خواہش اور شہوت کے باعث ظلم کیا۔ میرے اعضاء نے یہ بُرائی کی۔ یہ میری ہی بُری صفات ہیں۔" پھر یہ عقیدہ رکھے کہ اس کی تقدیر و مشیت سے ہُوا جو اس کا فیصلہ تھا۔ اب دونوں معنوں میں تُو نے اپنے مولائے کریم کی رضا کی موافقت کی اور وُہ دونوں حالوں میں قول و عقد کے ساتھ اس کی رضا پر عامل ہُوا۔ ایسا کرنے سے نیکی کے کاموں میں تیرا عُجب و تکبّر جاتا رہے گا اور ظلم کر بیٹھنے میں تیرا اپنے نفس پر ناراض ہونا اور اعترافِ ظلم صحیح ہو گا مگر جاہل پر یہ مشاہدہ بہت بوجھل ہے۔ جاہل آدمی جب نیکی کرتا ہے تو اپنی قوت و زور پر نگاہ کرتا ہے اور تکبّر کے باعث برباد ہو جاتا ہے۔ اور عجب کے باعث اس کا عمل بھی ضائع ہو گیا۔ اور اگر برائی کر بیٹھتا ہے تو گناہ کا اعتراف نہیں کرتا اور اپنے نفس پر ظلم کا اقرار نہیں کرتا، نہ ہی اس کی توبہ صحیح ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے عمل پر رضائے الٰہی ہوتی ہے۔ گمراہی کے مشاہدہ سے ہم اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ فرماتے ہیں:

"جب ایک بندہ نیکی کر کے کہتا ہے، اے پروردگار! تُو نے ہی مجھ سے عمل کرایا" تو اللہ تعالیٰ اس پر مزید انعام فرماتا ہے اور کہتا ہے:

"تو نے عمل کیا۔" اور جب بندہ اپنے نفس پر نظر کر کے کہتا ہے کہ میں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (نہیں)۔ "بلکہ میں نے تجھ سے عمل کرایا۔" فرمایا کہ:

جب ایک آدمی بُرائی کر کے کہتا ہے کہ یہ تیری تقدیر و تیرا ارادہ تھا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تو نے ظلم کیا اور تو نے اپنی خواہش و شہوت کے باعث نافرمانی کی۔" اور اگر بندہ یہ اقرار کرے:

"میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اپنی جہالت کے باعث نافرمانی کی"، تو اللہ تعالیٰ اس سے حیاء کرتا ہے اور فرماتا ہے:

بلکہ میری تقدیر اور میری قضاء تھی اور تیرے اپنے نفس پر اعترافِ ظلم کے باعث تجھے بخش دیا۔" اہلِ عمل کا یہی ادب ہے اور اہلِ علم کا یہی مشاہدہ ہے اور یہ بات اس فرمان میں داخل ہے:

"تم میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے والا وہی ہے جو اپنے نفس سے زیادہ آگاہ ہے" اور اس طرح جو انسان اعتراف و تواضع کرے اس کو محبوب رکھتا ہے اور یہ اس فرمانِ الٰہی کا ایک مفہوم ہے۔

فرمایا:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا (اور بعضے مانیں اپنا گناہ، ملایا ایک کام نیک اور

صَالِحًا وَ اٰخَرَ سَیِّئًا۔ لہ

دوسرا بد)

مطلب یہ ہے کہ بُرے عمل کے بعد اعتراف کرنا یہاں مراد ہے۔ اس لیے کہ اس کا ذکر گزر چکا اور اس کے بعد نیکی کرنا دراصل اعتراف ہے۔

صابر شاکر کون ہے؟

ہم آغازِ کلام میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کر چکے ہیں جس میں فرمایا،

"جس نے دین میں اپنے سے بلند تر کی جانب دیکھا اور دنیا میں اپنے سے کم تر کی طرف (دیکھا)۔ اللہ تعالےٰ اس کو صابر شاکر لکھے گا اور جس نے دین میں اپنے سے کم تر کی طرف اور دنیا میں اپنے سے برتر کی طرف دیکھا، اللہ تعالیٰ اُسے نہ صابر لکھے گا اور نہ شاکر۔ اگر اس روایت پر غور و فکر کریں تو چار باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اگر دیکھنے والا اہل آدمی ہو تو خالی ہاتھ نہ رہے گا۔ اس لیے کہ یا وہ سیرتِ متقدمین کے باعث قلب و نظر سے اسے دیکھے گا جو دنیا میں اس سے برتر ہے تو اپنے حال پر شکر کرے گا۔ اپنی روزی پر قناعت کرے گا۔ یہ معرفتِ قناعت کے باعث صابر شاکر شمار ہوگا۔ یہ آدمی اس پر راضی ہے کہ فضول مال مجھ سے دُور رہا۔ طویل حساب دینے سے بچ گیا اور یا دین کے معاملہ میں اپنے سے بلند و بالا پر نظر کرے گا تو اپنے آپ کو نیک اعمال اور اچھے کاموں پر آمادہ کرے گا اور کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اپنے نفس کی کم ہمتی پر اسے بُرا سمجھے گا۔ پھر دوسرے دو امور پر ایک دوسرے انداز سے نظر کرے گا۔ یعنی اپنے سے کم تر دنیا والے، فقر و فاقہ میں مبتلا آدمی پر نظر کرے گا تو اس پر شکر کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل و کرم فرمایا۔ اپنے احسان سے مجھے کفایت و وسعت بخشی۔ پھر ایک دوسرے مفہوم سے دین کے معاملہ میں اپنے سے کم تر پر نظر کرے گا۔ ظالموں، بُرے آدمیوں، اہلِ بدعت اور اہل زیغ کو دیکھ کر اللہ کا شکر کرے گا اور اللہ کے فضل و رحمت پر خوش ہوگا اور اس بات پر شکر ادا کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ابتلاء سے بچایا، ہدایت دی اور حسنِ اسلام کی توفیق عطا فرمائی اب بھی یہ صابر شاکر شمار ہوگا۔ اس طرح بندوں کی چار اقسام ہو جائیں گی۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ انسان کو بصیرت و سمجھ عطا فرمائے۔

دُو ہی قابلِ رشک ہیں

یہ حدیث اس کی شاہد ہے آپؐ نے فرمایا،

"دُو ہی قابلِ رشک ہیں،

۱۔ وُہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ حکمت عطا کرے اور وُہ اسے لوگوں میں تقسیم کرے اور انہیں (علم و حکمت) سکھائے۔

لہ التوبۃ آیت ۱۰۲

۲۔ وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ مال عطا کرے اور وہ اسے حق میں خرچ کرنے پر لگ جائے۔"
ایک دوسری حدیث کے الفاظ یہ آتے ہیں:
"اور وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ قرآن عطا کرے اور دن میں اور رات میں اسی پر قائم ہو کہ (دوسرا آدمی یوں کہے: جس طرح اس کو دیا اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی دے تو میں بھی وہی کروں جیسے وہ کر رہا ہے۔"
چنانچہ اعمالِ خیر حسد کی طرف اسے مندوب فرمایا اور جو اعمالِ خیر خدا تعالیٰ کو پسندیدہ ہیں ان پر حسد کرنے والوں کو فضیلت و شرف ملتا ہے۔

اس قسم کے اعمالِ خیر کے معاملات میں حسد (رشک) کرنے پر اسے طلبِ خیر اور اشتیاقِ خیر کے باعث مقامِ رضا میں مزید درجے حاصل ہوں گے اور جس پر مفہومات و مطالب اُلٹ گئے۔ وہ انجام امور کے بارے میں جاہل رہا۔ اس پر غفلت کا غلبہ ہو گیا اور اس پر جہالت چھا گئی۔ اب اس کی یہ حالت ہو گی کہ دنیا کے معاملہ میں اپنے سے بالاتر پر نظر رکھے گا اور اس پر رشک کرتا پھرے یا خود اس کی جگہ ہونا چاہے گا یا اپنے اُوپر کے انعاماتِ الٰہی کو معمولی سمجھے گا اور مختصر قسمت پر عیب دھرے گا۔ اور اپنے درجہ میں کمی پر راضی ہو جائے گا۔ اس کے لیے کوئی معذرت گھڑ کر نیکیوں میں تیزی دکھانے سے رہ جائے گا اور شاید یہ بھی ہو جائے کہ ایسا کرکے عُجب و کبر میں مبتلا ہو جائے۔ اپنے آپ کو افضل سمجھنے لگے اور شکر نہ کرکے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگ جائے اس لیے کہ اس صورت میں وہ نہ صابر ہے اور نہ ہی شاکر ہے اور یہ بات منافقین کے اوصاف میں سے ہے اور برباد و ہلاک ہونے والوں کا مقام ہے کیونکہ مومن کی صفات تو صبر و شکر ہیں اور اس شہر (بغداد) کا اسی مفہوم پر وصف بیان کیا گیا۔ اس لیے اللہ ہی سے مدد کی درخواست ہے۔

اغنیاء کی بستیوں سے دُور رہو

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں:
"میں نے مشرق و مغرب کی سیاحت کی مگر بغداد سے بڑھ کر بُرا شہر نہیں دیکھا۔"
پوچھا گیا: "اے ابوعبدالرحمٰن! یہ کیسے بُرا ہے؟"
فرمایا: "یہ ایسا شہر ہے جہاں نعمت پر عیب لگایا جاتا ہے اور نافرمانی کو معمولی چیز سمجھا جاتا ہے۔"
انہی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب ابنِ مبارکؒ خراسان تشریف لائے تو کسی نے پُوچھا:
"بغداد کے لوگوں کو آپ نے کیسا دیکھا؟"
فرمایا: "میں نے وہاں یہی دیکھا کہ سپاہی غضبناک ہے اور تاجر حریص ہے اور قاری پریشان و حیران ہے۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ہر روز ایک دینار کا صدقہ اس نیت سے کرتے کہ خدا تعالیٰ انہیں بغداد سے نکال کر لے جائے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سولہ دینار صدقہ کرتے۔

امام شافعیؒ نے بغداد کے بارے میں فرمایا، "یہ دُنیا ہے۔"

ایک قول ان سے یہ بھی منقول ہے:

"ساری دنیا دیہات کی ہے اور اس کا شہر بغداد ہے۔"

حضرت یونس بن عبدالاعلیٰؒ سے مروی ہے۔ بتایا کہ مجھے امام شافعیؒ نے فرمایا:

"یونس، تم نے بغداد دیکھا؟"

میں نے کہا، "نہیں۔"

فرمایا: "نہ تُو نے دُنیا دیکھی اور نہ لوگ دیکھے۔"

صوفیاء کی ایک جماعت نے بغداد کی مذمت کی جن میں عمر بن عبدالعزیزؒ اور کعب الاحبارؒ بھی داخل ہیں۔

حضرت عمرؒ نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے پُوچھا:

"کہاں رہتے ہو؟"

اس نے کہا: "عراق میں۔"

فرمایا: "وہاں کیا کرتے ہو؟" مجھے یہ معلوم ہُوا ہے کہ عراق میں جس نے رہائش اختیار کی اس پر کوئی آفت آگئی۔

حضرت کعب احبارؒ نے ایک روز عراق کا ذکر کیا اور فرمایا:

"اس میں انیس حصہ شر ہے اور اس میں مرض عضال پایا جاتا ہے اور جو آدمی کسی ایسے شہر میں سکونت رکھے جہاں برائی زیادہ ہو، کھلم کھلا نافرمانی کی جاتی ہو تو وہ آدمی یہاں مطمئن نہ ہوگا اور پریشان رہے گا اور اگر نیکی کا طلبگار ہے تو وہاں سے نکل آنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے زاری کرے گا اور اگر وہ بڑے خاندان یا کسی مجبوری کے باعث وہیں رہنے پر مجبور ہے اور نکلنے کی راہ نہیں پاتا اور اسے دین کی سلامتی کا یقین ہے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے باعث اس کے ہاں معذور اور قابلِ معافی ہے۔ جبکہ وُہ اپنے مقام میں پختہ اور اپنے حال پر راضی ہو اور یا پھر اس کا مقام، مقامِ خواہش ہے۔ اور یا مختلف دنیاوی اسباب و فتن کے باعث ایسا کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا (کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ اس میں

فِيهَا[1] (ہجرت کرو)

اس کی تفسیر میں ہے کہ جب تو کسی ایسے شہر میں ہو جہاں نافرمانیاں کی جاتی ہوں تو وہاں سے نکل کر دوسرے شہر میں چلا جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ جب ایک بندہ کسی ایسے شہر میں ہو جہاں کہ دینداروں سے برائی کم اور کمزور ہو اور برائی پر یہ انکار تو کرے تو وہاں سے نکل جانا واجب ہے۔ پھر کمزور لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے عذر اور امیدِ عفو کا ذکر کیا۔ فرمایا:

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا[2] (اور واسطے ان کے جو مغلوب ہیں مرد اور عورتیں اور لڑکے، جو کہتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں لوگ اس کے)

اللہ تعالیٰ ان کا تمام وصف بتاتے ہوئے اور انہیں دوسروں سے مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا:

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ[3] (نہ کر سکتے ہیں تلاش، اور نہ جانتے ہیں راہ، سو ایسوں کو امید ہے کہ اللہ معاف کرے)

اور رضا اس وقت صحیح ہوتی ہے کہ جب تمام نفسانی خواہشات سے بچا رہے اور رضا کی ابتداء قناعت ہے۔

ایک عارف فرماتے ہیں:

"بندہ اس وقت ہی قانع کہلا سکتا ہے کہ جب ہر قسم کی دنیاوی فراخی اور نعمت اس کے گھر کے دروازہ پر آئے اور اس کے سامنے پیش کی جائے تو وہ اس کی طرف نظر بھی نہ اٹھائے اور نہ اس کے لیے دروازہ کھولے بلکہ اپنے حال پر قناعت رکھے۔ اللہ پر راضی کا حال عصمت کا ہوتا ہے اور یہ وانع رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ پر رضا کی ابتداء رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ[4] (بے شک نفس سکھاتا ہے برائی مگر جو رحم کیا میرے رب نے)

---

[1] النسآء آیت ۹۷

[2] النساء آیت ۷۵

[3] النساء آیت ۹۸، ۹۹

[4] یوسف آیت ۹۳

اور ایک جگہ فرمایا:

لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ[1] (کوئی بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے مگر جس پر رحم کرے)

چنانچہ اللہ کی طرف سے بندے کو عصمت کا انعام ملنا، اس پر خدا کی رحمت کی دلیل ہے۔ پھر رحمت اسے مقامِ محبت میں داخل کرے گی اور محبوبین پر رحمت ہے۔ پھر محبت اسے رضا تک رفعت عطا کرے گی۔ چنانچہ محبوب تعالیٰ کے مشاہدہ سے محبت ہی اس کا مقام ہو جائے گا اور باقی تمام امور میں تغیر و تصریف کے معاملہ میں رضا اس کا حال ہوگا۔ کتاب الرضا کے بیان میں یہ آخری کلمات ہیں۔

احکامِ محبت اور اہلِ محبت کا بیان

یہ نواں مقامِ یقین ہے

اہلِ محبت کی فضیلت

مقاماتِ عارفین میں سب سے بلند مقام محبت کا ہے اور یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اپنے مخلص بندوں کو مخصوص کرنا ہے اور اس کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا انتہائی اور عظیم ترین فضل و کرم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ۔ (وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں)

پھر فرمایا،

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ (یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے)

مفہوم میں یہ خبر ابتدا کے ساتھ متصل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ محبت مومنین کی تعریف یہ کی کہ ان پر فضل ہے اور ان دونوں کے درمیان کا معترضہ کلام دراصل محبوبین کا وصف ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو آگ کا عذاب نہیں کرتا۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تصدیق کی اور خالی دعوائے محبت کرنے والوں پر رد کیا اور ان کے خلاف حجت قائم کی۔ فرمایا:

---

[1] ہود آیت ۴۳

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ [1] (تُو کہہ تو پھر کیوں عذاب کرتا ہے تم کو تمہارے گناہوں پر، بلکہ تم انسان ہو اس کی پیدائش میں)

حضرت زید بن اسلمؒ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ بندے سے محبت کرتا ہے۔ آخر اس کی محبت اس درجہ تک جا پہنچتی ہے تو فرماتا ہے جو چاہو کرو، میں نے تجھے بخش دیا۔"

حضرت اسمٰعیل بن ابان نے حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرے تو گناہ اس کو ضرر نہیں دیتا اور گناہوں سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے جیسے کہ اس کا کچھ گناہ نہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ [2] (بیشک اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے)

اللہ تعالیٰ محبت کے لیے گناہوں کی مغفرت کی شرط لگائی۔ فرمایا:

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ [3] (اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا)

چنانچہ اللہ پر ہر ایمان رکھنے والا، اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والا ہے۔ مگر اس کی محبت اس کے ایمان کی مقدار پر اور اس کے مشاہدہ کے کشف کے مطابق ہے اور محبوب تعالیٰ اس کے لیے ایک وصف پر تجلی کے مطابق ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی توحید مقبول ہوئی۔ وہ امرِ الٰہی اور حکم پر پختہ ہے اور تسلیم کر رہا ہے۔ یہ حالت صرف محبت سے ہی ہو سکتی ہے چاہے محبوبین کے اقسام کے مطابق اہل محبت کے درجات مختلف ہوں۔ البتہ جس طرح معرفت حاصل کرنے والا، معرفت سے چھوٹا نہیں ہوتا اور کوئی بڑا بھی توبہ سے بالا نہیں ہے اسی طرح کوئی چھوٹا بھی محبت سے ناقص نہیں ہوتا۔ چاہے وہ تمام علوم پر آگاہ ہو جائے پھر بھی توبہ سے بالا و مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اہل ایمان کی شدتِ محبتِ الٰہی کا نقشہ کھینچا اور فرمایا،

---

[1] المائدہ آیت ۱۸

[2] البقرہ آیت ۲۲۲

[3] آل عمران آیت ۳۱

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ[1] (اور ایمان والوں کو اس سے زیادہ محبت اللہ کی)

اور فرمانِ خداوندی میں محبت میں ان کے تفاوت کی دلیل ملتی ہے۔ اس لیے کہ اشد فا شد کا معنی اس بات پر دلالت کرتا ہے اور یوں نہیں فرمایا:

شدید والحب للّٰہ۔ (اللہ کی محبت شدید ہے)

اس سے مشابہ فرمان ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[2] (معزز عزت اللہ کے ہاں اس کو بڑی جس کو ادب بڑا)

چنانچہ تقویٰ میں ایک دوسرے سے بڑھ کر فوقیت کی مقدار پر ان کے اکرام کے مختلف درجات بتائے اور یہ نہیں فرمایا کہ:

ان الکرام المتقون۔ (باعزت و متقی لوگ)

کیونکہ ایسا کرنے سے تقویٰ و اکرام کا تفاوت واضح نہ ہوتا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ جس کو پسند کرتا ہے اس کو بھی دنیا دیتا ہے اور جس کو پسند نہیں کرتا (اس کو بھی دنیا دیتا ہے) اور ایمان صرف اس کو ہی دیتا ہے جس کو پسند کرتا ہے" (محبوب رکھتا ہے) جب محبتِ خداوندی میں معرفت و مشاہدہ میں اضافہ کے باعث اہلِ ایمان کو بلند درجہ عطا ہوتا ہے۔

اہلِ محبت کب ہوگا؟

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی محبت کو ایمان کی شرط قرار دیا۔ فرمایا کہ

"اللہ اور اس کے رسول کی محبت ان دونوں کے علاوہ سب سے بڑھ بڑھ کر ہو" اور ایک حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اللہ اور اس کا رسول، اس کو ان دو کے علاوہ سب سے زیادہ محبوب نہ ہو"

ایک دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ شدید تاکید اور زیادہ وضاحت سے فرمان ہے:

"اللہ کی قسم! بندہ تب تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو اپنے اہل،

---

[1] البقرۃ آیت ۱۶۵

[2] الحجرات آیت ۱۳

مال اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں "

اور ایک دوسری روایت یہ ہے کہ:

" اور تیری اپنی جان سے "

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ مشروعہ میں خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

" اللہ سے محبت کرو کہ اس نے تم پر اپنی نعمتیں فرمائیں اور خدا کی محبت کے باعث مجھ سے محبت رکھو "

اس میں خدا تعالیٰ کی فرضِ محبت پر دلالت کرتی ہے اگرچہ انتہائی فضائل و شرف میں اہلِ ایمان کے درجات مختلف ہیں اور سب سے افضل ترین نعمت جو عطا ہوئی وُہ معرفت کی نعمت ہے۔ چنانچہ مشاہدہ سے ہونیوالی محبت افضل ترین ہے اور اللہ سے محبت رکھنے والوں کے لیے مختلف درجات ہیں۔ بعض بلند تر درجہ پر ہیں، اور بعض کا درجہ دوسروں سے کم ہے۔ اب سب سے زیادہ محب بندہ اس کے اخلاق پر سب سے بلند و بہتر درجہ پر ہے۔ مثلاً علم، حلم، عفو، حُسنِ خلق، مخلوق کی پردہ پوشی میں سب سے بلند درجہ پر ہوتا ہے اور ان صفات کے معانی سے سب سے زیادہ آگاہی رکھتا ہے اور معانیِ صفات میں منازعت سے سب سے زیادہ الگ رہنے والا ہوتا ہے تاکہ ان میں شرک نہ کرے مثلاً تکبر، حسد، حبِ مدح، غنا، و عزت کی محبت، شہرت و ذکر کی خواہش سے بالکل الگ رہتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وُہ سب سے زیادہ محبت کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ محبوب تعالیٰ کا محبوب ہے اور آپؐ کی سنن کا سب سے زیادہ متبع اور آپؐ کے طریق کا سب سے زیادہ پابند ہوتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا:

" اے اللہ کے رسولؐ! میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں "

آپؐ نے فرمایا:

" پھر فقر کے لیے تیار رہو "

اس نے کہا:

" میں اللہ سے محبت کرتا ہوں "

آپؐ نے فرمایا:

" پھر ابتلاء کے لیے تیار رہو "

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابتلاء ڈالنا، اخلاقِ الٰہی (ابتلاء ڈالنے والے) سے ہے۔ چنانچہ اللہ کی محبت بتائی تو آپؐ نے ابتلاء کی خبر دی تاکہ اس پر صبر کرے۔ جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے:

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔

اس میں اس کے احکام و ابتلاء پر دلالت ہے اور فقر دراصل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے ہے۔ جب آپؐ کی محبت کا ذکر کیا تو آپؐ نے اپنے اوصاف کی طرف رہنمائی کی تاکہ ان کا اقتدار کرے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا آتی ہے ؛

" مجھے حالتِ مسکینی میں زندہ رکھ ، حالتِ مسکینی میں وفات دے اور مساکین کی جماعت میں دوبارہ اُٹھا۔"

کثرتِ ذکر علامتِ محبت ہے

محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کو کثرت کے ساتھ یاد کرے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ مولائے کریم کو بندے سے محبت ہے اور مخلوق پر افضل ترین نعمت و احسان یہی ہے کہ (اسے توفیقِ ذکر حاصل ہو جائے)۔

حدیث میں آتا ہے ؛

" ہر دن میں اللہ کا صدقہ ہوتا ہے جو وہ مخلوق پر فرماتا ہے اور مخلوق پر کیے گئے صدقہ میں افضل ترین یہ (صدقہ) ہے کہ اسے ذکر اللہ کا القاء فرمائے۔"

حضرت سفیانؒ کی حدیث میں ہے جو مالک بن معول سے روایت کی ؛

" پوچھا گیا ؛

" اے اللہ کے رسولؐ کون سا عمل افضل ترین ہے ؟ "

فرمایا : " محارم سے پرہیز کرنا اور یہ کہ تیری زبان ہمیشہ ذکر اللہ سے تر رہے۔"

جس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے محبت رکھنے کا حکم دیا۔ اس طرح آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے کہ محبت کا تقاضا یہی ہے کہ کثرت سے ذکر کرے۔ چنانچہ فرمایا ؛

" کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کر، حتیٰ کہ لوگ کہیں کہ تو دیوانہ ہے۔"

ایک روایت ہے ؛

" کثرت سے اللہ کا ذکر کرو حتیٰ کہ منافق لوگ کہنے لگیں کہ تم ریاکار ہو۔"

حضرت ابُوسلمہ مدنیؒ نے اپنے والد ماجد سے ، پھر ان کے دادا سے روایت کیا کہ : " ایک روز جنابِ رسول اللہؐ مسجد قباء میں تشریف لائے اور طویل حدیث بیان کرتے ہوئے آخر میں بتایا ؛

" جس نے اللہ کی خاطر تواضع اختیار کی ، اس کو (خدا نے) بلندی بخشی اور جس نے تکبر کیا اس کو ذلیل کیا اور جس نے کثرت سے اللہ کا ذکر کیا اللہ نے اس سے محبت کی ۔"

آپ نے بتایا کہ ذاکرین ہی سبقت کرنے والے اور مقربین ہیں اور انہیں مقامِ نبوت تک بلند کیا۔ یعنی ان کے

گناہ معاف کر دیے اور انہیں رفعتِ ذکر بخشی جبکہ ذکر ہی اس فرمان میں موجبِ محبت ہے۔

" چلتے جاؤ، مفردین سبقت کر گئے۔"

پوچھا گیا،

" مفردین کون ہیں ؟"

فرمایا،" ذکر اللہ کے شیدائی۔ ان سے ان کے بوجھ ہلکے کر دیے گئے۔ قیامت کے روز وہ ہلکے پھلکے ہو کر آئیں گے۔"

حبِ لقاء محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان، محبوب کی برملا ملاقات چاہے۔ دارالسلام کا مکاشفہ اور محبوب کا قرب تلاش کرے یعنی موت کا اشتیاق رکھے۔ اس لیے کہ یہی ملاقات کا ذریعہ ہے۔ اور دیدار تک جانے کا دروازہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے،

" جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات پسند کرتا ہے۔"

حضرت حذیفہؓ نے موت کے وقت فرمایا،

" ایک حبیب فاقہ کی حالت میں آیا جو نادم ہوا۔ اس نے فلاح نہ پائی۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

" حبِ ملاقات کے بعد بندے میں کثرتِ سجود سے زیادہ کوئی خصلت خدا تعالیٰ کو محبوب نہیں۔" جب حبِ ملاقات کو مقدم فرمایا۔

اللہ تعالیٰ حقیقتِ صدق کے لیے اس کی راہ میں قتل (یا مقاتلہ) ہونا شرط قرار دیا اور بتایا کہ وہ اپنے محبوب کے قتل (یا مقاتلہ) کو پسند کرتا ہے۔ فرمایا،

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ [1]

(اللہ پسند کرتا ہے اُن کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر، جیسے وہ دیوار ہو سیسہ پلائی گو)

اس سے پہلے فرمایا،

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

(تم کیوں وہ کہتے ہو جو تم کرتے نہیں)

اور انہوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کی محبت کی محنت قتل قرار دی اور

---

[1] الصف آیت ۴۔

محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کی جان و مال لے لی۔ فرمایا:
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔ (وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں سو قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں)

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:
"حق ثقیل ہوتا ہے مگر اس کے بوجھل پن کے باوجود ہلکا ہوتا ہے اور باطل ہلکا ہوتا ہے مگر اس کے ہلکا پن کے باوجود سخت و شدت والا ہوتا ہے۔ اگر تو نے میری وصیت کی حفاظت کی تو موت سے زیادہ کوئی غائب چیز تجھے محبوب نہ ہوگی اور وہ تو تجھے مل کر رہے گی اور اگر تو نے میری وصیت کو ضائع کر دیا تو موت سے زیادہ کوئی غائب چیز قابلِ نفرت و بغض نہ ہوگی مگر تو اس (موت) کو ہٹا نہیں سکتا۔"

حضرت ثوریؒ اور بشرؒ بن حارث فرمایا کرتے تھے:
"موت کو صرف شک کرنے والا ہی ناپسند سمجھتا ہے۔" اور واقعہ بھی ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ ایک حبیب کسی حالت میں بھی محبوب سے ملاقات کو ناپسند نہیں سمجھتا اور یہ محبت وہی پاتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے کامل محبت کرے محبت ہوگی تو خدا تعالیٰ کا اشتیاق پیدا ہوگا اور پھر شوقِ غیب میں پریشان قلب ہو جائے گا اور اس کی ملاقات کو پسند کرے گا۔"

منقول ہے کہ ابو حذیفہ بن عتبہ بن زمعہ نے جب اپنے آزاد کردہ حضرت سالم کو متبنّٰی بنایا تو قریش نے انہیں اس پر ملامت کی اور کہا:
"کیا تم قریش کی ایک باعزت خاتون کا ایک غلام سے نکاح کر رہے ہو؟"
فرمایا: اللہ کی قسم، میں نے حضرت سالمؓ کا اس سے قصداً نکاح کیا اور میں خوب جانتا ہوں کہ حضرت سالمؓ اس سے بہتر ہیں۔"

انہیں یہ کلام بڑا شاق گزرا اور پوچھا:
"یہ کیسے ہے حالانکہ یہ تیری بیٹی ہے اور وہ (سالمؓ) تیرے آزاد کردہ غلام ہیں؟"
فرمایا: "میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:
"جو ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جو کامل دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے تو سالمؓ کی طرف دیکھے۔"
اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بعض مومنین، کچھ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو (کامل کی بجائے) بعض ترجیح دیتا ہے اور اس میں اس اعتبار سے محبت ہے۔ بعض مومنین کامل دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر ما سوا سے خدا کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی اس کا عابد ہے اور اس کو خدا

ماننے والا ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی معبود ہے اور نہ ہی اس کے سوا کوئی خدا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انہیں مشاہدۂ صفات کے مطابق کامل یا بعض قلبی محبت حاصل ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نعیمان کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا جاتا ہے۔ آپؐ اسے معصیت کا ارتکاب کرتے پاتے ہیں۔ ایک روز آیا تو اس پر حد لگائی۔ ایک آدمی نے اس پر لعنت کی اور کہا:

"بڑا بُرا آدمی ہے۔ بار بار کثرت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے لایا جاتا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایسا مت کہو، کیونکہ وُہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے" چنانچہ آپؐ نے اسے مخالفت کے باوجود محبت سے نہیں نکالا۔

اہلِ محبت کی مزید علامات

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"حبِ ایمان، ظاہرِ قلب میں ہو یعنی فواد میں ہو تو وُہ مومن اللہ تعالیٰ سے متوسط محبت کرنے والا ہے۔ حبِ ایمان، دل کے اندر داخل ہوگا تو اس کے باطنِ قلب میں پختہ محبت ہوگی۔ اس محبت کو دیکھا جائے گا۔ اگر وہ تمام خواہش پر اللہ تعالیٰ ہی کو ترجیح دے اور خدا کی محبت، بندے کی خواہش پر غالب آجائے، حتیٰ کہ ہر چیز میں خدا کی محبت ہی بندے کی محبت بن جائے تو وُہ صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کا محب ہے جیسے کہ صحیح معنی میں اس کا مومن ہے اور قلب کی حالت اس سے کم درجہ پر ہو تو اسے محبت کا اسی قدر حصہ حاصل ہے۔ علاماتِ محبت میں سے واضح تر علامت یہ ہے کہ قلبی ذخائر پر محبوب تعالیٰ کو ترجیح دے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے محبین کی ایثار کرنے کے ساتھ توصیف فرمائی۔ فرمایا:

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً [1] (محبت کرتے ہیں اس سے جو وطن چھوڑ آئیں ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دل میں غرض کسی چیز سے)

پھر فرمایا:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ۔ (اور ترجیح دیتے ہیں ان کو اپنی جانوں پر)

اور فرمایا:

تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا [2] (قسم اللہ کی، تجھ کو پسند رکھا اللہ نے ہم سے)

---

[1] الحشر آیت ۹۔

[2] یوسف آیت ۹۱۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں؛

"ظاہرِ قلب ہی اسلام کا محل ہے اور باطنِ قلب، مکانِ ایمان ہے۔" اس سے محبت میں اہل محبت کا فرق معلوم ہو گیا۔ اس لیے کہ ایمان کا درجہ اسلام پر بڑا ہے اور باطن کا درجہ ظاہر سے بڑا ہے"۔

بعض بصری علمائے قلب اور فواد میں فرق بتایا۔ فرمایا؛

فواد سے مراد، قلب کا پہلا اور وہ حصہ ہے کہ جو باریک اور پتلا ہے اور قلب سے مراد اصل جرم ہے جو وسیع ہے۔

ایک بار فرمایا؛

"قلب میں دو جوف ہیں ظاہری جوف کا نام فواد ہے اور یہ عقل کا نام ہے اور باطنی جوف کا نام قلب ہے اور اس میں سمع و بصر کی قوت ہے اور یہیں سے فہم و مشاہدہ ہوتا ہے اور یہی محلِ ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ۔ (لکھ دیا ایمان اُن کے دلوں میں)

اور فرمایا؛

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ۔[1] (اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جس کے لیے دل ہے یا کان لگائے دل لگا کر)

چنانچہ محبتِ اسلام، مخلوق پر فرض ہے اور یہ اللہ کی اطاعت و محبت کی خاطر ادائیگی فرائض اور محارم سے پرہیز کرنے کے ذریعہ ہے اور مقربین کی محبت، اخلاقِ ذات کی معرفت اور معانی صفات کے مشاہدہ سے ہوتی ہے اور یہ خواص کے ساتھ مخصوص ہے اور اس میں اصول یہ ہے کہ محبت، معرفت کے ساتھ ہو۔ اس لئے کہ معرفت عام و خاص دو قسم کی ہے۔ خواص عارفین کو خاص محبت حاصل ہے اور عوام کو عام محبت حاصل ہے۔

منقول ہے کہ جب زلیخا نے ایمان قبول کیا حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے نکاح کیا تو زلیخا ان سے الگ ہو گئی اور تنہا ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئی۔ حضرت یوسفؑ انہیں دن کے وقت اپنے بستر پر بلاتے تو وہ رات کا وعدہ کرتی اور اگر رات کو بلاتے تو وہ دن پر ٹال دیتی۔ آخر کہنے لگی:

"اے یوسفؑ! میں خدا کی معرفت سے پہلے تجھ سے محبت کرتی تھی اور جب میں نے خدا کی معرفت حاصل کر لی تو اس کی محبت نے غیر اللہ کی محبت کو نہ رہنے دیا اور اس کا بدل میں نہیں چاہتی۔ آخر حضرت یوسفؑ نے اسے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے اور مجھے بتایا ہے کہ تیرے ہاں دو لڑکے پیدا ہوں گے اور خدا تعالیٰ ان دونوں کو نبی بنائے گا۔"

---

[1] قٓ آیت ۳۷۔

زلیخا نے کہا:

"اگر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اس کا حکم دیا ہے اور مجھے اس کا ذریعہ بنایا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتی ہوں" اور پھر ان کے پاس آئی۔

ایک عالمِ ربانی فرماتے ہیں:

"جب توحید کامل ہوئی تو محبت کامل ہوئی اور جب محبت آئی تو توکل کامل ہوا۔ اب اس کا ایمان کامل ہوا، اور فرض میں اخلاص آیا۔ اس کو یقین کا نام دیا گیا ہے۔"

فرضِ محبت کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا:

"جب تجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تو اللہ سے محبت کرتا ہے تو خاموش ہو جا۔ اس لیے کہ اگر تو نے "نہیں" کہہ دیا تو یہ کفر ہوگا۔ اور اگر تو نے "ہاں" کہہ دیا تو تیرا وصف، محبین جیسا ہے نہیں۔ اس لیے خدا کی ناراضگی سے بچو۔"

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"جنت میں اہلِ معرفت اور اہلِ محبت سے بڑھ کر کسی کو اعلیٰ نعمت نہ ملے گی اور جس نے معرفت و محبت کا دعویٰ کیا مگر ان میں سے اسے کچھ حاصل نہیں دوزخ میں اس سے بڑھ کر کسی پر عذاب نہ ہوگا۔"

ایک عالمؒ نے اس سے بڑھ کر فرمایا:

"ہر صاحبِ مقام کو امید ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے گا اور خدا تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔ مگر جس نے معرفت و محبت کی معرفت کا دعویٰ کیا۔ اس سے ہر ہر بال پر مطالبہ ہوگا۔ ہر ہر حرکت و سکون، ہر نظر اور ہر کھٹکے تک پر مطالبہ ہوگا کہ کیا اللہ تعالیٰ کے لیے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں تھا اور اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل تھی۔"

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے؟ یہ بھی یاد رکھیے کہ خدا تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت ایسی نہیں جیسے کہ مخلوق کی محبت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بندوں کی محبت سات مفاہیم کے باعث پیدا ہوتی ہے:

۱۔ طمع سے۔

۲۔ جنس کے باعث۔

۳۔ نفع کے باعث۔

۴۔ وصف کی وجہ سے۔

۵۔ خواہش کے لیے۔

۶۔ قریبی رشتہ کی خاطر۔

۷۔ اس کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرنے کی وجہ سے۔

یہ حدود و شئی ہیں جس سے شئی مشابہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان تمام سے پاک ہے اور ان میں سے کسی چیز سے موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں حادث مفاہیم کے باعث، یہ اسباب بھی حادث ہیں، اور اسباب آنے کی وجہ سے محبتین سے یہ امور پیدا ہوتے ہیں اور اگا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اوصاف بدلنے سے معاملہ بھی بدل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کے کلمہ حسنہ کی وجہ سے اسباب سے پہلے سے ہے۔ تمام حادثات سے قدیم ہے۔ اس میں کبھی بھی تغیر نہ ہوگا اور نہ ہی انقلاب واقع ہوگا۔ اس لیے کہ فرمانِ خداوندی ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ[1] (اور آگے دی تھی ہم نے ابراہیم کو، اس کی نیک راہ، اور ہم اس کی خبر رکھتے ہیں)

اسی طرح فرمایا:

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ[2] (اس نے نام رکھا تمہارا مسلمان حکمبردار پہلے سے)

اور فرمایا:

اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ[3] (کہ ان کو ہے پائے صدق اپنے رب کے ہاں)

اور آیات کے آخر میں فرمایا:

فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ[4] (بیٹھے سچی بیٹھک میں نزدیک بادشاہ کے جس کا سب پہ قبضہ ہے)

اور اس کی طرف سے قدمِ صدق سے پہلے ان کا قدم مناسب نہیں جیسے کہ یہ بات نامناسب ہے کہ اس کے ان کے علم سے پہلے اپنے سے وہ عمل کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا علم، معلوم سے پہلے ہے اور اولیاء سے اس کی محبت، اولیاء کی محبتِ الٰہی سے پہلے ہے۔ پھر یہ (محبت) اس کے ایک حاکم کی خاصیت اور اس کے ایک فضل میں اضافہ ہے اور اس کے انعام کا تتمہ ہے اور یہ مخلصین کے لیے خالص اور اہلِ ایثار کے لیے مخصوص ہے۔ اہلِ خلوص کے لیے قدمِ صدقِ سابق کے باعث جائے صدق کی طرف رجوع کناں ہے۔ اس کا کوئی عقلی

---

[1] الانبیاء آیت ۵۱۔

[2] الحج آیت ۷۸۔

[3] یونس آیت ۲۔

[4] القمر آیت ۵۵۔

سبب نہیں اور نہ یہ کسی عمل کے باعث ہوتا ہے بلکہ یہ رازِ تقدیر، لطفِ قادر تعالیٰ کے طریق پر چلتا ہے اور رازِ تقدیر، لطفِ قادر تعالیٰ کے طریق پر چلتا ہے اور رازِ تقدیر کا کھول دینا کفر ہے اور اسے صرف ایک نبی یا صدیق ہی جانتا ہے جس پر خدا تعالیٰ ظاہر کرے وہی اس سے آگاہ ہوتا ہے اور جو بات اسباب کے ذریعہ خبروں میں ظاہر ہوئی وُہ طریقِ احباب ہے اور اہلِ خرد میں سے اہلِ قرب کے وُہ مقامات ہیں اور اس کی حسنِ توفیق، حفاظتِ عصمت سے بندے کے لیے محبت ظاہر ہوتی ہے اور اس کے علمی غرائب اور مخفی الطاف سے یہ واضح ہوتی ہے۔ ہر چیز میں وُہ اس کی جانب تیزی دکھاتے ہیں۔ ہر چیز سے الگ ہو کر اس پر ان کی نظر رہتی ہے۔ ہر چیز سے زیادہ وہی ان کے قریب ترین ہے۔ اس کے پسندیدہ امور پر چلتے ہیں۔ انہیں اس کے مفاہیم صفات پر آگاہی حاصل ہے۔ اس کی لطیف معرفت ان کے لیے اس کا مخفی خزانۂ اسرار ہے۔ براطنِ انعام سے ان کے افکار کھلتے ہیں۔ ان کا شکر خالص اور ذکر حقیقی ہوتا ہے۔ نظرِ یقین کے مکاشفہ کے باعث یہ اہلِ محبت کی راہیں ہیں۔

جب اللہ بندے سے محبت کرے تو؟

مشائخ فرماتے ہیں:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے اپنی خدمت (عبادت) میں لیتا ہے اور جب اسے اپنی عبادت میں لگا لیتا ہے تو اسے الگ کر لیتا ہے۔"

ایک قول یہ ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس پر نظر کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر نظر فرماتا ہے تو اسے عذاب نہیں دیتا۔" ایسی بعض باتیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہیں۔

ایک روایت میں ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو ابتلاء میں ڈالتا ہے اور جب اس سے ازحد محبت کرتا ہے تو اسے اقتناء میں ڈالتا ہے۔"

پوچھا گیا: "اقتناء سے کیا مراد ہے؟"

فرمایا: "اس کا نہ اہل و عیال چھوڑتا ہے اور نہ مال چھوڑتا ہے۔" چنانچہ محبتِ اول کی طرف سے یعنی اللہ کی طرف سے اس کے بندے کے لیے محبت مزید ایثار کا باعث ہے اور ایسے احکام کا باعث ہے جو اللہ سے ظاہر ہوتے ہیں یعنی بندہ خدا تعالیٰ کی خوب عبادت میں لگ جاتا ہے یا اسے حقیقی علم عطا فرماتا ہے، جیسے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن کے مقابلہ میں یوسفؑ کے ساتھ خدا کی (زیادہ) محبت معلوم کی تو کہا:

تَاللهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللهُ عَلَيْنَا۔ (اللہ کی قسم، اللہ نے تمہیں ہم پر چن لیا)

پھر کہا،

وَ اِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ۔ (اور ہم ہی گناہگار تھے)

چنانچہ انہوں نے اپنی سابقہ غلطیوں کا ذکر کیا اور یہ اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو ان کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کا وصف بتایا اور فرمایا،

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ [۱] (کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو میں خوب نگہبان ہوں خبردار)

اور ان پر عطا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّ عِلْمًا وَ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ [۲] (ہم نے اسے حکم اور علم دیا اور اس طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں)

چنانچہ سابقہ احسان بتائے جس کی وجہ سے اسے ترجیح دی اور انبیاء علیہم السلام نے کہا:

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ [۳] (ہم یہی آدمی ہیں جیسے تم، لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر چاہے)

اور فرمایا،

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ [۴] (اللہ چن لیتا ہے فرشتوں سے پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں سے)

حدیث میں آتا ہے،

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس پر ابتلاء ڈالتا ہے۔" یعنی اس کو آزماتا ہے۔ اگر اس نے صبر کیا تو اسے چن لیتا ہے۔ (اجتبا)، اور اگر راضی ہو جائے تو اس کو منتخب (اصطفا) کر لیتا ہے۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"جب تو اپنے آپ کو دیکھے کہ تو اللہ سے محبت کرتا ہے اور خدا کو دیکھے کہ وہ تجھے ابتلاء میں ڈال رہا ہے۔

---

[۱] یوسف آیت ۵۵

[۲] یوسف آیت ۲۲

[۳] ابراہیم آیت ۱۱

[۴] الحج آیت ۷۵

تو سمجھ لے کہ وہ تجھے پاک و صاف کرنا چاہتا ہے۔"

ایک سالکؒ نے اپنے شیخؒ سے عرض کیا:

"مجھ پر کچھ محبت کا اثر پڑا ہے۔"

شیخؒ نے فرمایا:

"بیٹا! کیا تجھے اس کے علاوہ کسی محبوب کا ابتلاء آیا کہ تو نے اس محبوب چیز پر خدا تعالیٰ ہی کو ترجیح دی ہو؟"

اس نے کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "پھر محبت کے خیال میں نہ رہو۔ اس لیے کہ محبت اسے ہی عطا کرتا ہے جس کو پہلے ابتلاء میں ڈال کر آزما لیتا ہے۔"

حُبِ خدا کی علامت، حُبِ قرآن ہے

محبت الٰہی کی دلیل یہ ہے کہ انسان محبوب تعالیٰ کے کلام سے محبت رکھے۔ قلب و گوش پر بار بار لائے۔ ایک سالکؒ کا واقعہ ہے انہوں نے بتایا کہ میں نے بُرے ارادہ میں تلاوت مناجات پائی تو دن رات قرآن کی تلاوت میں مصروف ہوا۔ پھر انقطاع واقع ہو گیا اور تلاوت بند کر دی۔ بتاتے ہیں کہ میں نے خواب میں کسی کو یہ کہتے سنا:

"اگر تجھے میری محبت کا گمان ہے تو تو نے میری کتاب پر (تلاوت بند کر کے) کیوں جفا کی؟ دیکھتے نہیں کہ اس میں میرا کیسا لطیف عتاب ہے؟" بتاتے ہیں کہ بیدار ہوا تو میرے دل میں قرآن کی محبت بھرپور طور پر تھی اور دوبارہ پہلی حالت پر لوٹ آیا۔

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"ایک بندہ اس وقت تک سالک نہیں ہو سکتا جب تک کہ جو بھی ارادہ کرتا ہے اسے قرآن مجید میں نہ پالے۔"

حضرت ابن مسعودؓ کا فرمان ہے:

"تم پر لازم ہے کہ صرف قرآن ہی مانگا کرو۔ اگر وہ قرآن سے محبت رکھتا ہے تو وہ اللہ سے محبت رکھتا ہے۔ اور اگر قرآن سے محبت نہیں رکھتا تو وہ اللہ سے محبت نہیں رکھتا۔"

حبِ قرآن کی ایک علامت یہ ہے کہ اہل قرآن سے محبت رکھی جائے (یعنی قرآن تلاوت کرنیوالوں سے محبت رکھی جائے۔ .... اور رات کے حصوں میں اور دن کے اطراف

میں کثرت سے اس کی تلاوت کرے۔"

حضرت سہلؒ بن عبداللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت، قرآن سے محبت رکھنا ہے اور قرآن سے محبت اور اللہ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی علامت یہ ہے کہ آپؐ کی سنت سے محبت رکھے اور سنت سے محبت کی علامت، آخرت سے محبت رکھنا ہے۔ اور آخرت سے محبت کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے صرف زادِ راہ اور بقدرِ ضرورت ہی لے جو آخرت تک لے جانے میں معاون ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ۔[1] (اے ایمان والو! جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ آگے لادے گا ایک لوگ، کہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں)

یعنی مرتد نہ ہوں گے اور اُن کی طرح دین سے پھرنے والے نہ ہوں گے۔

يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔[2] (بدل دے گا کوئی لوگ سوائے تمہارے پھر وہ نہ ہوں گے تمہاری طرح)

اس لیے بندے کو دین سے پھرنے والا نہ ہونا چاہیے بلکہ پختہ ہو۔ مولائے کریم کی محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ حبیب تعالیٰ کا قرب بخشنے والے تمام اخروی امور کو نفسانی خواہشات اور دنیا پر مقدم رکھے۔ نفسانی مزے لینے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پابندی کرے۔ اپنی خواہش پر اللہ کی محبت کو ترجیح دے اور ماموراتِ منہیات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے۔ علمائے ربانیین اور اولیاء کرام کے سامنے تواضع اختیار کرے۔ دنیاداروں اور دنیا کو ترجیح دینے والوں کے سامنے اکڑ کر رہے۔ جیسے کہ ابن مبارکؒ سے پوچھا گیا:

"تواضع کیا چیز ہے؟"

فرمایا:" متکبرین کے مقابلہ میں تکبر کرنا۔"

فتح بن شخرف نے فرمایا: کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو پوچھا:

---

[1] المائدہ آیت ۵۴

[2] محمد آیت ۳۸

"کوئی بھلائی کی نصیحت فرمائیے"

فرمایا: "فقراء کے سامنے اغنیاء کی تواضع اللہ سے ثواب کی امید پر کس قدر خوب ہے اور اللہ تعالےٰ پر وثوق رکھتے ہوئے فقراء کا اغنیاء پر تکبر کرنا اس سے خوب تر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبین کا وصف بنایا کہ وُہ اولیاء اللہ کے سامنے تواضع کرتے اور اعدائے اسلام کے سامنے اکڑ کر رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین کا بہتر وصف ہی بتاتا ہے۔ جب محبوب کے لیے تواضع بہتر ہے اور دشمن کے سامنے اکڑنا دراصل ذلیل پر عزت کی طرح ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وصف بتایا کہ اولیاء کے سامنے تواضع کرتے اور اعدائے اسلام پر اکڑتے ہیں، اور محبوب کے سامنے اکڑنے کی بُرائی دشمنِ اسلام کے سامنے تواضع کی بُرائی کی طرح ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی تعریف بُرائی پر نہیں کرتا۔"

جان و مال قربان کرنا، علامتِ محبت ہے

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ محبوب کی راہ میں جان و مال قربان کر کے قرب حاصل کرے اور اس کی رضا حاصل کرے۔ ہر چیز اس سے الگ ہو جائے جو اسے قرب کی طرف تیزی سے روکے۔ جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے:

وَ عَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی [1] (اور میں اے پروردگار تیری طرف جلدی آیا کہ تو راضی ہو)

اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فرمان میں حکم دیا۔

وَ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً۔ [2] (اور چھوٹ جا اس کی طرف سب سے الگ ہو کر)

اس کے دو معنی ہیں:

۱۔ اخلاص اختیار کر کے اور خدا کو ہر چیز پر ترجیح دے کر ہر غیر سے جُدا ہو جا اور اللہ تعالیٰ کی جانب آ جا۔

۲۔ جو بھی تجھے خدا سے روکے اسے کاٹ کر الگ کر دے اور اس سے جُدا ہو جا یعنی ہر رکاوٹ کو دُور کر کے اس تک رسائی حاصل کر۔

یہ دو باتیں محبت پر زبردست رہنما ہیں۔ پھر محبت میں کسی ملامت کا ڈر نہ رکھے۔ چاہے کوئی اسے محبت پر ملامت کرے یا نفس پر مشقت ڈالنے، گھر چھوڑنے اور مال کو ستو کرنے پر ملامت کرتا رہے اور نہ ہی محبت کے بارے میں کسی کی مدح کی طرف توجہ دے اور اگر کوئی اہل و عیال اور مال پر خدا کو ترجیح کے فعل کی

---

[1] طٰہٰ آیت ۸۴ [2] المزمل آیت ۸۔

ستائش کرے تو اس کی طرف نہ توجہ کرے اور نہ اس کی خواہش رکھے۔ پھر تنہائی کے ساتھ واحد تعالیٰ اور اور روح میں انس حاصل کرے، تملقِ مناجات میں لگی رہے۔ کلام اللہ میں مست رہے اور احکام الٰہی گزرنے پر خوش رہے، عبادت کا مزہ پاتا رہے اور ابتلا کو نعمت گردانے۔

حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں:

"میں نے بیس برس تک قرآن میں مشقت برداشت کی اور بیس برس تک متنعم ہوا۔"

اہل محبت کو غیر اللہ میں سکون نہیں ملتا

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ محبوب کے سوا کہیں سکون نہ پائے صرف محبوب تعالیٰ ہی اس کے لیے سکون ہو۔ امام ابو محمدؒ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک محب کی خیانت، عوام کی نافرمانی سے سخت تر ہے اور وہ یہ کہ وہ غیر اللہ میں سکون و انس پائے۔"

برخ جو سیاہ رنگ کا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے وسیلہ سے بارش کی دعا فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی:

"برخ ہمارا خوب بندہ ہے مگر اس میں ایک عیب ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:

"اے پروردگار! وہ کیا عیب ہے؟"

فرمایا:

"اسے نسیم سحر اچھی لگتی ہے اور اس سے سکون حاصل کرتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھے وہ (میرے سوا) کسی دوسری چیز کی طرف سکون حاصل نہیں کرتا۔"

اس موقع پر سکون سے مراد استراحت اور انس ہے اور اس کے علاوہ مواقع پر سکون سے مراد ایک چیز کی طرف نظر کرنا اور اس پر ناز کرنا اور اس پر مطمئن ہو کر اسی کا ہو کر رہنا ہے۔

ایک عارفؒ کے سامنے یہ ذکر کیا گیا تو فرمایا:

"اس سے مراد برخ نہ تھے بلکہ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو (سمجھانا) مراد تھا۔ اس لیے کہ انہیں مقامِ محبت پر رکھا گیا تھا۔ اب ان کو براہِ راست خطاب کرنے سے حیا فرمائی اور برخ کا ذکر ان کے سامنے کر دیا اور میں نے یہ پوچھا تھا کہ حضرت موسیٰ کو ان کا عیب کیوں بتایا۔ انہوں نے اپنا عیب خود کیوں نہ بتایا تو یہ جواب دیا۔ چنانچہ اہلِ محبت مقربین کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی متنعم ہوتے ہیں۔

انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف راحت و سکون ملتا ہے۔ اس طرح کہ ان کا ابتلاٗ بھی اسی سے ہوتا ہے۔ اگر غیر اللہ میں یہ باتیں پائیں تو غفلت کے باعث یہ ان پر گناہ بن جائے گا۔ البتہ ان پر غفلت لائی جاتی ہے تاکہ وہ خدا کی طرف جھک جائیں اور توبہ کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دیتا ہے۔

مروی ہے کہ ایک عابدؒ نے جنگل میں ایک طویل مدت تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ پھر ایک پرندے کو دیکھا کہ اس نے ایک درخت میں جھونپڑا بنا لیا تھا وہاں آکر ٹھہرتا اور چہچہاتا۔ اس عابدؒ نے کہا،

" اگر میں جائے عبادت کو بدل کر اس درخت کے قریب لے جاؤں تو اس پرندے کی آواز سے انس حاصل کروں۔"

اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی اور فرمایا؛

" فلاں عابد کو کہہ دو کہ تُو نے میری مخلوق سے انس طلب کیا۔ میں تیرا ایک درجہ کم کر دوں گا اور تو کبھی کسی عمل سے بھی اسے حاصل نہ کر سکے گا۔"

اس لیے صدقِ محبت اور خلوصِ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ حبیب تعالیٰ سے مانوس ہو، سب سے الگ ہو کر اس کا بن جائے۔ اس سے براہِ راست راحت چاہے۔ اس کی عبادت میں لگ کر چین لے۔ تنہائی میں مناجات کر کے اس سے آرام پائے۔ موافقت و اطاعت کے غلبہ کے باعث ترکِ مخالفت میں ہی نعمتوں کا مزہ چکھے جیسے کہ ایک محب کے اشعار مروی ہیں؛

اَلَذُّ جَمِیْلَ الصَّبْرِ عَمَّا الَذّہٗ

وَ اَھْوٰی لِمَا اَھْوَاہُ تَرْکًا فَاتْرُکُہٗ

(لذت سے صبرِ جمیل لذیذ تر ہے۔ اور اس کی خاطر ترکِ خواہش ہو تو خواہش ترک کرتا ہوں)

اسی طرح ایک شعر یہ بھی مروی ہے؛

وَ اَتْرُکُ مَا اَھْوٰی لِمَنْ قَدْ ھَوَیْتُہٗ

وَ اَرْضٰی بِمَا یَرْضٰی وَ اِنْ سَخِطَتْ نَفْسِیْ

(جس سے محبت ہوئی اس کی خاطر میں نے خواہش چھوڑ دی۔ جس پر وہ راضی ہے میں راضی ہوں چاہے میرا نفس ناراض ہو)

پھر حبیب تعالیٰ کی طرف ہی اسے اطمینان ملتا ہے۔ قربِ تعالیٰ پر دھیان دینے، اس پر دوامِ نظر اور اس کے ذکر میں رہنے میں سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جس نے اسے پہچان لیا اس نے اس سے محبت کی اور جس نے اس سے محبت کی اس نے اس کی طرف نظر رکھی اور جس نے اس پر نظر رکھی وہ اس کی

طرف مائل رہا۔ دیکھئے فرمانِ الٰہی ہے:

وَانْظُرْ اِلٰی اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا[1]

(اور دیکھ اپنے ٹھاکر کو جس پر سارا دن لگا بیٹھا تھا)

اطاعتِ حبیبؐ، علامتِ محبت ہے

فرائض و فضائلِ محبت میں سے ایک یہ ہے کہ حبیب تعالےٰ جس کو پسند کرے اس کی پسند میں اس کی محبت کی خاطر اس کی اطاعت کرے جیسے کہ حضرت صہیبؓ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ صہیبؓ پر رحم کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے تو اس کی نافرمانی نہ کرے"۔ یعنی اس کی خدا سے محبت ہی اُسے نافرمانی سے باز رکھ رہی ہے۔ نہ کہ خوف اس کا باعث ہے۔ چنانچہ حضرت صہیبؓ خدا تعالیٰ کی محبت کے باعث اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت صہیبؓ فرمایا کرتے تھے:

"میرے اندر سے میری خدا کے ساتھ محبت نے وُہ چیز نکال دی ہے جو دُوسری کوئی چیز نہ نکال سکتی یعنی خوف دلانے کی صفات اور امید دلانے کے افعال کا مفہوم نکال دیا"۔

ایک عالم" کا فرمان ہے:

"ایثار، محبت کا شاہد ہے۔ چنانچہ محبت کی علامت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے آپ پر ترجیح دے"۔ اور فرمایا:

"ایسا نہیں ہوتا۔ جو بھی طاعتِ الٰہی کا عمل کرے وُہ اللہ کا محبوب بن جائے بلکہ جس سے خدا تعالیٰ نے منع فرمایا اس سے پرہیز کرنے والا محبوبِ خدا ہوتا ہے اور واقعہ بھی ایسے ہی ہے اس لیے کہ ترکِ مخالفت سے ہی محبت واضح ہوتی ہے۔ اور کثرتِ اعمال سے محبت کا پتہ نہیں چلتا۔ جیسے کہ فرمان ہے:

"نیکی کے کام تو نیک و بد سب کرتے ہیں۔ البتہ نافرمانیوں سے صدیق ہی پرہیز کرتے ہیں"۔

ایک قول یہ ہے:

"افضل ترین نیکی یہ ہے کہ نیکیوں پر استقلال دکھائے اور نیکی پر استقلال دکھانا، ستر گنا تک بڑھاتا ہے اور برائیوں سے پرہیز پر استقلال دکھانا، سات سو گنا اجر ملتا ہے۔ گویا وُہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے قائم مقام ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امتحان میں ہُوا اور نفس کے کہنے سے دباؤ پڑا اگر جب اس نے خواہش کو ترک کیا تو اس نے نفس کو چھوڑ دیا۔ اب اس میں اس کا قلیل ترین حال یہ ہے کہ دنیا میں زہد رکھے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اس وجہ سے اس کی نیکیوں میں سات سو گنا اضافہ ہو گیا۔ اس وجہ سے ترکِ مخالفت

---

[1] طٰہٰ آیت ۹۷۔

کے باعث اس کے لیے محبت ثابت ہوئی۔ اس وجہ سے فرمانِ الٰہی ہے:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ[1] (اور جو کوئی ڈرا کھڑا ہونے سے اپنے رب کے آگے، اس کو ہیں دو باغ)

چنانچہ اس کی محبت کے باعث اسے دوسروں پر فضیلت دی اور اس میں ایک عجیب ترین روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضرؑ کو پوچھا:

"آپ کو اس درجہ تک کیونکر رسائی حاصل ہوئی؟"

انہوں نے فرمایا:

"تمام نافرمانیوں کو چھوڑ دینے کے ذریعہ فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ[2] (اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کے مال خرید لیے)

اس میں حضرت ابو محمدؒ کا قول ہے کہ فرمان یہ ہے کہ:

"ان کی جانوں کی عیش و زندگی، میری ملاقات ہے اور یہ ان کا نقد مزہ ہے۔"

خدا کے سامنے ہی فریاد کر کے آرام پانا اور صرف تنہا اللہ ہی کے علم کی جانب استراحت پانا، اسی کی طرح اخلاصِ عمل دکھانا، اس میں حسنِ ادب سے کام لینا، یعنی اسے مخفی رکھنا اور شدائد و آفات کے احکام کو پوشیدہ رکھنا، الطاف و انعامات کو ظاہر کرنا، اس کی نعمتوں میں خوب فکر سے کام لینا، اس کے مخفی الطاف، غرائبِ صنعت، عجائبِ قدرت پر کثرت سے غور کرنا اور ہر حال میں اس کی حمد و ثنا کرنا، اس کے فضل و انعام کو پھیلانا اور ابتلا پر صبر کرنا، یہ سب محبت کی علامات ہیں۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے یہ بندہ اس کے اہل اور اس کے اولیاء میں سے ہو چکا۔ کہا ہے اپنے اولیاء پر عتاب فرماتا ہے۔ اس لیے کہ اسے ان سے تمکنت اور ان کا اس کے ہاں ایک مقام ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا بدل نہیں مانگتے۔ اس لیے کہ ان کا چین ذات اقدس تعالیٰ کے سوا اور کہیں ہے ہی نہیں۔ ان کا مقصود بھی وہی ہے اور ان کا سارا غم و فکر بھی وہی تعالیٰ ہے جیسے کہ ایک محب کا قول ہے:

"میری ہلاکت تجھ سے ہے اور میری ہلاکت تجھ پر ہے میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور تیرا ہی مجھے شوق ہے۔

---

[1] الرحمٰن آیت ۴۶

[2] التوبہ آیت ۱۱۱

اگر تجھے تلاش کیا تو تُو نے تھکا دیا، اور اگر تجھ سے بھاگا، تو تُو نے مجھے تلاش کر لیا۔ مجھے تیرے ساتھ راحت نہیں اور تیرے سوا کہیں مجھے استراحت نہیں۔"

گوناگوں اعمالِ خیر میں حلاوت پاکر اور شرح صدر کے ساتھ تیزی دکھانا محبت کی علامت ہے جیسے کہ روایت میں ہے،

"بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ آخر میں اس سے محبت کرتا ہوں۔" اس کی قضا پر راضی رہنا بھی محبت کی نشانی ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اس کے افعال کو اچھا سمجھنا ہے۔"

اسے یاد کرنا اور ذاکرین سے محبت رکھنا، ذکر اللہ کرنے والوں کی مجالس میں بیٹھنا، اس کی طرف فریاد و دُکھ پیش کرنا، مخلوق کو دل سے خالی کرنا اور ہر چیز میں خالق تعالیٰ پر نظریں رکھنا، ہر چیز میں تیزی سے اللہ کی طرف دوڑنا، ہر چیز میں اس سے انس حاصل کرنا، اس کا ذکر کثرت سے کرنا اور ہر چیز کے ساتھ اسے یاد کرنا علاماتِ محبت میں سے ہیں۔

نمازِ تہجد، علامتِ محبت

تہجد میں طویل عبادت کرنا بھی محبت کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے (حدیث قدسی میں) مروی ہے،

"جس نے میری محبت کا دعویٰ کیا، مگر جب رات چھائی تو مجھ سے (غافل ہو کر) سو گیا۔ اس نے (دعویٰ میں) جھوٹ بولا۔" البتہ بعض نے شب بیداری کو اس کے مقام میں رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اس وقت ہے کہ جب اسے مقام شوق میں کھڑا کرے اور جب اس کی سکینت نازل ہو اور قرب میں اسے انس ملے تو اس کی نیند و بیداری برابر ہے۔ پھر فرمایا:

میں نے محبین کی ایک جماعت کو دیکھا کہ رات کو بیداری سے زیادہ ان کی نیند ہوتی اور امام المحبین، سید المحبوبین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس قدر نیند فرماتے اس قدر قیام فرماتے اور کا ہے قیام سے زیادہ نیند فرماتے اور کوئی شب ایسی نہیں گزری کہ جس میں آپؐ نے نیند نہ فرمائی ہو۔

مال خرچ کرنا، علامتِ محبت ہے

دنیا میں زہد اختیار کرتے ہوئے حبیب تعالیٰ کی طرف مال خرچ کرکے آنا اور تمام نفسانی خواہشات پر حق کو ترجیح دے کر اللہ کی طرف آجانا بھی علامتِ محبت ہے۔

حضرت جنیدؒ کا فرمان ہے:

"محبت کی علامت یہ ہے کہ دائمی نشاط واشتیاق رہے کہ بدن پر ضعف طاری ہو جائے مگر دل پہ ضعف طاری نہ ہو۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"محبت سے عمل ہو تو اس میں تساہل نہیں آتا۔"

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"اللہ کی قسم، اللہ کا محب کبھی بھی اس کی اطاعت سے پیاسا نہیں رہا (ہمیشہ عمل پیرا رہا) چاہے کس قدر بڑے بڑے وسائل لے کر آئے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت و نصیحت کرنا بھی محبتِ خدا کی نشانی ہے اور اس پر صبر کرنا چاہیے کہ فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ [۱]

(بیشک انسان خسارے میں ہے سوائے ان کے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے)

اس لیے کہ محبین کا مقام یہ نہیں ہوتا چاہیے کہ فرمان ہے۔

یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ وَ لَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْهَا فَیُحْفِکُمْ تَبْخَلُوْا وَ یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ [۲]

(دے گا تم کو تمہارے اجر اور نہ مانگے گا تم سے تمہارے مال، اگر مانگے تم سے وہ مال، پھر تنگ کرے تو تم بخیل ہو جاؤ اور تمہارے دل کی خفگیاں کھول دے)

یعنی اگر تمہارا محبوب تم سے مال کا مطالبہ کرے، تم پر سختی کرے اور اس پر تمہارے بغض نکال باہر کر دے۔

حضرت ابن عباسؓ کی قرأت میں یوں ہے:

وَ یخرج اَضغانکم۔

یعنی تمہارے اموال۔ اب اگر ان منفعار میں صرف مال کی محبت کا ہی شرک پایا جائے اور خدا سے غفلت ہو کر انہیں مال کی محبت کا مرض ہو تو مخلص محبین کے مقابلہ میں یہ لوگ بہت زیادہ خسارے میں رہ گئے۔ صالحین کو جو جو انعام و اکرام عطا ہوئے یہ لوگ ان سے محروم رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ اہلِ محبت سے ان کے جان و مال لیتا ہے۔ آخر کار ان کے لیے محبوب تعالیٰ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور تاکہ وہ صرف اس کی عبادت کریں۔

---

[۱] العصر آیت ۲، ۳

[۲] الفتح آیت ۳۶، ۳۷

یہ سب اس کی محبت کے باعث اور ان کی محبت واضح کرنے کی خاطر ہوتا ہے تاکہ ان کے صدق و صبر کا امتحان بھی ہو جائے۔ اللہ کریم سخی ہے وُہ تمام و کامل چیز طلب فرماتا ہے۔ وُہ غیور ہے اپنی محبت میں شرک پسند نہیں کرتا اس لیے جس کو اس کی معرفت حاصل ہُوئی وہی اس پر صبر دکھائے گا۔ جس نے صبر دکھایا وہی اس سے محبت کرے گا۔ جس کو اس پر یقین ہوگا وہی اس کے حکم پر راضی ہوگا۔ ہاں یہ منظور ہے کہ وہ اہل اخلاص محبین سے ان سب چیزوں کا مطالبہ فرماتا ہے اور یہ سب اس کے نظامِ حکمت کا معاملہ ہے۔

ایک محبوب نے جان و مال خرچ کر کے بہت ہی مشقت اٹھائی تھی اور اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا۔ ان سے پُوچھا گیا:

"آپ میں محبت کے اس حال کا کیا سبب ہے؟"

فرمایا:

"میں نے مخلوق کی زبان سے مخلوق کو خطاب کرتے ایک کلمہ سُنا وُہ مجھ پر یہ ابتلا لے آیا۔"

پوچھا: "وُہ کلمہ کیا تھا؟"

فرمایا: "ایک محب اپنے محبوب کے پاس خلوت میں بیٹھا تھا۔ محب کہہ رہا تھا: اللہ کی قسم، میں کامل قلب کے ساتھ تجھ سے محبت کرتا ہوں اور تو کامل قلب کے ساتھ مجھ سے اعراض کیے ہُوئے ہے۔ اس پر محبوب نے جواب دیا:

"اگر تو میرا عاشق ہے تو مجھ پر کیا خرچ کرتا ہے؟"

اس نے کہا:

"میرے محبوب! میں جس جس چیز کا مالک ہُوں تجھے اس کا مالک بناتا ہُوں۔ پھر میں اپنی رُوح بھی تجھ پر خرچ کر کے ختم کر دیتا ہُوں۔

پھر میں نے سوچا: ایک مخلوق دُوسری مخلوق سے اور ایک بندہ دوسرے بندے سے ایسی محبت کرتا ہے تو ایک مخلوق اپنے خالق سے اور بندہ اپنے معبود سے کیسی محبت کرے؟ بس یہی بات اس کا سبب بن گئی۔ چنانچہ اہلِ محبت نے اموال کو جانوں میں داخل کر کے خدا کے ساتھ فروخت کر دیا اور اس کی محبت کی خاطر جانوں اور ان کے علاوہ سب کو بیچ دیا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں عمدہ قرار دے کر خرید لیا۔ اب محبت کی علامت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان سے جان و مال خرید لیا اور فروخت کی علامت یہ ہے کہ یہ ان سے الگ ہو گئے۔ اب جب انہوں نے ان چیزوں کو لپیٹ کر الگ کر دیا تو اب اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے دلوں میں کچھ خواہش نہ رہی۔ اب خدا نے انہیں خرید لیا۔

یہ یاد رکھیں کہ نفسانی آفات ہی امراضِ نفسانیہ کہلاتی ہیں اور نفوس کو ان امراض سے پاک کرنا ہی ان کا علاج ہے۔ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا[1] (مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوارا)

چنانچہ جب آفات سے پاک کیا تو یہ پاک ہو گئے اور جب شہوات سے پاک کر کے اسے تقویٰ کے لیے تیار کیا تو گویا اسے خرید لیا اور ہر نفسانی مرض کا علاج ہے۔ ہلکی مرض کا علاج ہلکا اور سخت مرض کا علاج شدت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ جہاں مرض آئے وہیں اس کا علاج بھی کر لو کر اس کے برعکس معاملہ سے یا اس کی جڑ کاٹ کر علاج کرو خریدکردہ نفوس کی نشانیاں یہ ہیں کہ وہ محبوب ہوتے ہیں، حبیب تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے، اس کی عبادت میں مصروف، اس کی کثرت سے حمد و ثناء کرنے والے اس کے سامنے حسنِ ادب کے ساتھ دائمی طور پہ نماز پڑھنے والے، اس کی پسند پر حکم کرتے اور اس کی ناپسند سے منع کرتے ہیں، حدود اللہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ علمِ توحید اور قیومیت قدرت کے اسرار و اخفاء کے باعث عقلی درجات پر علم کو مرتب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ عقل ایک حد ہے اور یہ علمِ محبت کے اخفاء سے ہے۔ چنانچہ محبین کے نزدیک وُہ ایسے ہے جیسے کہ انبیاءؑ کی زبان مبارک کے ذریعہ اعضائے ظاہر پر احکام مشروع ہُوئے اور ان کی حفاظت کا حکم دیا گیا کہ پابندی کرو۔ فرمایا :

وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ (اور جو کوئی بڑھے اللہ کی حدوں سے، تو اس نے بُرا کیا اپنا)

وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ[2] (اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ[3] (بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں توبہ کرنے والے اور خوش آتے ہیں ستھرائی والے)

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (اور اللہ پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" جو یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے اسے چاہیے کہ وُہ دُنیا میں زہد اختیار کرے۔"

---

[1] الطلاق آیت ۱

[2] الحجرات آیت ۱۱

[3] البقرہ آیت ۲۲۲

اس لیے محبت الٰہی کا طمع رکھنے والا دنیا میں زہد کرنے سے پہلے اس کا طمع نہ رکھے۔ یہ اوصافِ محبین میں سے ہیں۔ محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت میں ہی لگا رہے اور قلب و نظر کو اس کی محبت میں مرکوز کر دے۔ جس میں مولائے کریم کی رضا ہو صرف اسی کی خواہش رکھے اور اپنے آقا کریم کی رضا کو اپنی خواہش سمجھے

ایک عالم سے مروی ہے:

"جب تو دیکھے کہ وہ تجھے مخلوق سے متوحش کر رہا ہے۔ تو جان لے کہ وہ تجھے اپنے ساتھ مانوس کرنا چاہتا ہے۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی "میرا سب سے محبوب ترین بندہ وہ ہے جو کسی عوض و عطاء کے بغیر میری عبادت کرے مگر رب تعالیٰ اس کا حق ضرور پہنچائے گا۔"

حضرت وہب نے زبور سے نقل کیا:

"اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے جنت (کے لالچ) یا دوزخ (سے بچنے کی خاطر میری عبادت کی۔ اگر میں جنت پیدا نہ کرتا اور نہ دوزخ (پیدا کرتا) تو کیا میں بندگی کے قابل نہ تھا؟ " اور کہا قال

حقیقی محب کون ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ہے کہ، جب تو کسی متقی آدمی کو تلاشِ رب تعالیٰ میں منہمک دیکھے تو (سمجھ) کہ اسے اس نے غیر اللہ سے غافل کر دیا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ہے:

اللہ تعالیٰ کا محب، نصب (قیام) کو پسند کرتا ہے۔"

ان کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ عبادت گزاروں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے جو عبادت کر کر کے کمزور اور بوسیدہ (لکڑی کی طرح) ہو چکے تھے۔ پوچھا:

"تم کیا ہو؟"

انہوں نے جواب دیا:

"ہم عبادت گزار ہیں۔"

فرمایا: "کس وجہ سے تم نے عبادت کی؟"

کہا: "اللہ کی آگ کے ڈر سے، ہمیں اس سے خوف ہوا۔"

فرمایا: "اللہ پر حق ہے کہ جس سے تم ڈرے اس سے تمہیں بچائے۔"

پھر وہ ایک دوسرے گروہ کے پاس سے گزرے جو اس سے زیادہ عبادت گزار تھا۔ پوچھا:

"تم نے کس وجہ سے عبادت کی؟"

کہا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت کا شوق دیا اور جو انعامات اللہ نے اپنے اولیاء کے لیے وہاں رکھے ہیں، ان کا اشتیاق دیا۔ ہم اس کی امید رکھتے ہیں۔"

فرمایا: "اللہ پر حق ہے کہ جس کی تم نے امید رکھی وہ تمہیں عطا کرے۔"

پھر ایک دُوسرے گروہ کے پاس سے گزرے اور پوچھا:

"تم کیا ہو؟"

انہوں نے جواب دیا:

"ہم اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں ہم نہ اس کی آگ سے ڈر کر اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی جنت کی امید کے باعث عبادت کرتے ہیں بلکہ اس کی محبت وجلال کے باعث اس کی عبادت کرتے ہیں۔"

فرمایا: "تم واقعی اللہ کے اولیاء ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔" چنانچہ آپ نے ان میں قیام فرمایا۔

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ پہلوں نے فرمایا:

"تم ایک مخلوق سے ڈرے اور تم نے ایک مخلوق کی اُمید باندھی۔" اور اس آخری گروہ سے فرمایا:

"تم ہی مقربین ہو۔"

تابعین کی ایک جماعت سے بھی ایسے اقوال مروی ہیں۔ ابو حازم مدنیؒ فرمایا کرتے تھے:

"مجھے اپنے رب سے حیا آتی ہے کہ سزا کے ڈر سے اس کی عبادت کروں اور ایک بُرے غلام کی طرح ہو جاؤں کہ جس کو کام پر اجر نہ ملے تو کام نہ کرے بلکہ میں تو اس کی محبت کے باعث اس کی عبادت کرتا ہوں۔"

اس مفہوم کا کلام حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے:

"تم میں کسی کو بُرے غلام کی طرح نہ ہونا چاہیے کہ اگر اسے ڈر ہو تو کام کرے اور نہ ہی بُرے مزدور کی طرح ہونا چاہیے کہ اگر اجرت نہ ملے تو کام نہ کرے۔"

حضرت معروفؒ کے کسی بھائی نے معروفؒ سے پُوچھا:

"کس بات نے آپ کو مخلوق سے منقطع ہونے اور عبادت میں مشغول ہو جانے پر آمادہ کیا؟"

وُہ خاموش رہے۔ اس پر میں بولا:

"شاید موت کی یاد کے باعث؟"

فرمایا: "موت کیا چیز ہوتی ہے؟"

میں نے کہا:

"قبر و برزخ کی یاد کے باعث؛"

فرمایا: "قبر کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا:

"دوزخ کے ڈر اور جنت کی امید کی خاطر؛"

فرمایا: "یہ کیا چیزیں ہیں؟ یہ سب چیزیں واحد تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ اگر تو اس سے محبت کرتا ہے تو وہ تجھے یہ سب چیزیں بھلا دے گا اور اگر تیرے اور اس کے درمیان معرفت ہے تو ان سب کے عوض وہ تجھے کافی ہے۔"

اللہ کو مطلوب رکھو

حضرت علی بن موفق سے منقول ہے۔ فرمایا:

"میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھے جنت میں داخل کیا گیا۔ میں نے ایک آدمی کو دسترخوان پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے دائیں بائیں دو فرشتے بیٹھے اس کے منہ میں ہر عمدہ چیز کے نوالے ڈال رہے ہیں اور وہ کھا رہا ہے اور جنت کے دروازہ پر ایک آدمی کو دیکھا وہ قوم کے چہروں کو غور سے دیکھ رہا ہے بعض کو اندر جانے دیتا ہے اور بعض کو روک دیتا ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر خطیرۃ القدس پہنچا تو عرش پر ایک آدمی کو آنکھیں گاڑے دیکھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف نظریں کیے کھڑا تھا اور آنکھیں جھپکتا بھی نہ تھا۔ میں نے رضوان (ایک فرشتہ) سے پوچھا:

"یہ کون ہے!"

بتایا: "یہ معروف کرخیؒ ہیں۔ انہوں نے نہ دوزخ کے ڈر سے عبادت کی اور نہ جنت کے شوق میں عبادت کی بلکہ اللہ سے محبت کرتے ہوئے عبادت کی۔ اس لیے انہیں قیامت تک کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف نظر رکھنے کی اجازت مل گئی۔"

میں نے پوچھا:

"دوسرے دو کون ہیں؟"

فرمایا: "آپ کے بھائی بشر بن حارثؒ اور احمد بن حنبلؒ۔" اور یہ صدیقین میں سے ابدال کا مقام ہے۔ ابدال انبیاء کے مقام پر اور شہداء کے درجات پر اس وقت مرتبہ ملتا ہے کہ ہر حالت میں ان کے قلوب پر محبت الٰہی غالب آکر رہ جائے۔ چنانچہ وہ غیر سے غافل، خدا کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ کی یاد کے سوا ہر چیز کو فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ حضرات صرف اللہ ہی کی خاطر عبادت کرتے ہیں اور یہی مقربین ہیں اور ان کیلئے

جنت میں خالص و اعلیٰ نعمتیں ہیں اور جنہوں نے اختلاط کیا ان کے لیے مختلط نعمتیں ہیں اور یہ اصحابِ یمین ہیں جیسے کہ انعاماتِ جنت کا ذکر فرمایا:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ[1] (بے شک نیک لوگ ہیں آرام میں، تختوں پر بیٹھے دیکھتے، پہچانے تو ان کے منہ پر تازگی آرام کی ان کو شراب پلائی جاتی ہے مہر زدہ)

پھر مقربین کے مشروب کا ذکر کیا اور

وَ مِزَاجُهٗ۔

یعنی ابرار کے مشروب کا مزاج۔

مِنْ تَسْنِیْمٍ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔ (اوپر سے پڑی، ایک چشمہ ہے جس سے مقربین پیتے ہیں)

یعنی مقربین اسے خالص حالت میں پئیں گے اور اصحابِ یمین کے لیے اختلاط کر دیا جائے گا۔ چنانچہ مقربین کے مشروب کے امتزاج سے ہی ابرار کا مشروب خوش کن ہوگا۔ اس لیے ابرار کی وصف بیان کی تو فرمایا:

اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ[2] (بے شک لکھا نیکوں کا ہے اوپر والوں پہ)

پھر فرمایا:

یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ[3] (اس کو دیکھتے ہیں فرشتے نزدیک والے)

چنانچہ حسنِ علم، ان کی صفتِ اعمال و علوِ کتاب صرف مقربین کی شہادت سے ہے اور جو دنیا میں زاہد تھے اور ان کے قریب تھے۔ انہیں کے علوم ان کے عمل کے باعث اعلیٰ ہوں گے۔ ان کے مشاہدہ کے باعث ان کے اعمال کو رفعت حاصل ہوگی اور ان کے قرب کے باعث یہ بھی مزید انعامات پائیں گے۔

کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ[4] (جیسا نئے سرے سے بنایا یا پھر اس کو دہرائیں گے)

اور فرمایا:

جَزَآءً وِّفَاقًا[5] (بدلہ ہے پورا)

یعنی ان کے اعمال کے موافق اجر ملے گا اور ایک جگہ فرمایا:

سَیَجْزِیْهِمْ اِنَّهٗ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ[6] (وہ ان کو سزا دے گا جن تقریروں کی، وہ حکمت والا ہے خبردار)

---

[1] المطففین آیت ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵۔ [2] المطففین آیت ۱۸ [3] المطففین آیت ۲۱
[4] الانبیاء آیت ۱۰۴ [5] النبا آیت ۲۶ [6] انعام آیت ۱۴۰

یعنی دنیا میں ان کے وصف کے مطابق انہیں اجر ملے گا۔

اب جو اس دارِ فنا میں جس کی نعمت، طیبات ملک ہیں کل آئندہ اس طرح ملک اس کی نعمت ہوگی اور جس کی اس میں نعمت وروح، طیبِ ملک کے ساتھ ہے وہ کل ملیک تعالیٰ کے ہاں جائے صدق میں ہوگا۔ جیسے کہ ابو سلیمان دارانی کا قول ہے،

" آج جو آدمی، اپنے نفس میں مشغول ہُوا وُہ کل بھی اپنے نفس میں مشغول ہوگا اور جو آدمی آج اپنے پروردگار (کی عبادت) میں مشغول ہُوا وہ کل بھی اپنے پروردگار کے (انعامات وغیرہ) کے ساتھ مشغول ہوگا۔"

حضرت رابعہ عدویہ اہل محبت سے تھیں۔ حضرت ثوریؒ ان کی مجلس میں بیٹھا کرتے اور کہا کرتے،

" اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو عجائباتِ حکمت عطا فرمائے۔ ہمیں بھی ان کی تعلیم دیں۔"

وُہ فرماتیں،

" تم اچھے آدمی ہو، کاش کہ تم دنیا سے محبت نہ کرو۔" حالانکہ حضرت ثوریؒ عالم تھے اور دنیا میں زاہد تھے مگر حدیث لکھتے اور لوگوں کو سناتے اور (حضرت رابعہ) اس کو ابوابِ دنیا میں سے ایک باب کہتیں۔

ایک روز حضرت ثوریؒ نے انہیں پُوچھا،

" ہر بندے کی ایک شرط ہوتی ہے اور ہر ایمان کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ آپ کے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟"

(رابعہؒ نے) فرمایا،

" میں اللہ کی عبادت خوف کھاتے ہُوئے نہیں کرتی کہ ایک بری لونڈی بن جاؤں جو ڈرے تو کام کرے اور نہ ہی جنت کی محبت کی خاطر عبادت کرتی ہوں کہ ایسی بُری لونڈی بن جاؤں جس کو دیا جائے تو کام کرے بلکہ میں تو اس کی محبت واشتیاق کے باعث عبادت کرتی ہُوں۔"

حضرت حماد بن زیدؒ نے ان سے کہا،

" کوئی ضرورت ہو تو بتائیں وُہ پُوری کردوں؟"

(رابعہؒ نے) فرمایا،

" میں دنیا کے مالک سے دنیا مانگنے میں حیا کرتی ہُوں اور تو مالک ہی نہیں اس سے کیوں طلب کرتی؟"

عبدالواحد بن زیدؒ نے انہیں پیغامِ نکاح بھیجا تو کہا،

" اے شہوت والے، اپنے جیسی شہوت والی تلاش کرلے۔ میرے اندر تُو نے شہوت کی کیا چیز دیکھی؟"

محمد بن سلیمان بصرہ کا حاکم تھا اس نے ایک لاکھ پر پیغامِ نکاح بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ہر ماہ دس ہزار دیا کروں گا۔

حضرت رابعہؒ نے اسے لکھا،

اگر تو میرا غلام بن جائے اور تمام مملوکہ اشیاء کا مجھے مالک بنا دے تو بھی میں راضی نہیں ہو سکتی کہ پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاؤں۔"

محبت کے مفہوم میں ان کے اشعار اہل بصرہ اور دوسروں نے نقل کیے ہیں جن میں جعفر بن سلیمان ضبعی، سفیان ثوریؒ، حماد بن زید اور عبدالواحد بن زید رحمہم اللہ تعالیٰ زیادہ مشہور ہیں۔ فرمایا: ؎

أُحِبُّكَ حُبَّيْنِ حُبَّ الْهَوٰى ۔۔۔ وَ حُبًّا لِأَنَّكَ أَهْلٌ لِذَاكَا

فَأَمَّا الَّذِيْ هُوَ حُبُّ الْهَوٰى ۔۔۔ فَشُغْلِيْ بِذِكْرِكَ عَمَّنْ سِوَاكَا

وَ أَمَّا الَّذِيْ أَنْتَ أَهْلٌ لَهُ ۔۔۔ فَكَشْفُكَ لِلْحُجُبِ حَتّٰى أَرَاكَا

فَلَا الْحَمْدُ فِيْ ذَا وَ لَا ذَاكَ لِيْ ۔۔۔ وَ لٰكِنْ لَكَ الْحَمْدُ فِيْ ذَا وَذَاكَا

(میں تجھ سے دو محبتیں رکھتی ہوں۔ محبتِ خواہش اور ایک محبت وہ ہے کہ جس کا تو اہل ہے)

(اب جو محبِ ہوٰی ہے وہ ایسی ہے کہ تیرے سوا سب سے غافل ہو کر تیری یاد میں مشغول ہوں)

(اور جس کا تو اہل ہے وہ تیرے حجابات کھولنا ہے۔ حتیٰ کہ میں تیرا دیدار کروں)

(نہ اس میں میری کچھ تعریف ہے اور اس میں۔ بلکہ اِس میں بھی اور اُس میں بھی تیری ہی حمد ہے)

چنانچہ حضرت رابعہؒ کا قول "حب الھوٰی" اور "حب انت اھل لہٗ" کا قول ایسا ہے کہ دو محبتوں میں فرق کیا۔ یہ جملے تفصیل طلب ہیں تاکہ جو نہیں سمجھتا وہ سمجھ جائے اور جسے مشاہدہ نہیں اسے خبر ہو جائے۔ یہ تسمیہ اور ایسا وصف کرنا دراصل ایسے ذوالعقول کا انکار ہے۔ جن کو اس میدان میں کچھ ذوق حاصل نہیں اور نہ ہی ان کا اس میں کچھ حصہ ہے۔ البتہ ہم اس پر آمادہ کریں گے اور جو سمجھے اسے بتائیں گے یعنی جو حبِ ہوٰی کو سمجھے۔ اشعار کا مطلب یہ ہے:

"میں نے تیرا دیدار کیا اور خبر و سمع سے نہیں بلکہ نظرِ یقین کے مشاہدہ کے ساتھ تجھ سے محبت کی اور نہ ہی انعامات و احسانات کے طریق پر تصدیق کر کے محبت کی ہے کہ جب مجھ پر اختلاف کے باعث افعال بدلتے تو میری محبت بھی بدلتی رہتی بلکہ میری محبت بطریقِ عیان ہے۔ میں نے تیرا قرب حاصل کیا، تیری جانب بھاگی، تجھ میں مشغول ہوئی اور تیرے سوا ہر ایک سے کٹ گئی۔ اس سے پہلے میری کئی مختلف خواہشات تھیں۔ جب میں نے تیرا دیدار کیا تو سب کو ختم کر کے ایک کر دیا۔ اب تو ہی میرا کل دل اور تمام محبت بن گیا۔ چنانچہ تو نے اپنے سوا مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ اس کے باوجود میں اس محبت پر کسی اجر کا حق نہیں رکھتی اور نہ اس بات کی اہل ہوں کہ مقامِ رضوان میں آخرت میں تیری طرف برملا نظر کر سکوں۔ اس لیے کہ میری تیرے ساتھ محبت ایسی ہے کہ اس پر کچھ اجر لازم نہیں آتا بلکہ مجھ سے تیری خاطر ہر چیز میں لازم کرتی ہے کہ اس میں میں تیرے حق کی تاب و سکت کبھی بھی نہیں

رکھتی۔ اس لیے کہ میں تجھ سے محبت کر چکی۔ چنانچہ مجھے خوفِ تقصیر لاحق ہُوا جیسے تو نے آج میرے ہاں ابتداء میں مجھے اپنا دیدار کرایا۔ اس طرح آخرت میں تو نے اپنے ہاں مجھے اپنا دیدار کرایا۔ دنیا میں جو مجھ پر فضل فرمایا اس پر بھی تیری ہی حمد ہے اور اپنے ہاں آخرت میں جو فضل فرمایا اس میں بھی تیری ہی حمد ہے۔ وہاں اور یہاں کہیں بھی میری کچھ تعریف نہیں۔ اس لیے کہ تیری وجہ سے ان دونوں تک رسائی حاصل ہُوئی۔ دونوں میں تیری ہی حمد و ثنا ہے۔ اس لیے کہ دونوں تک تو نے رسائی عطا فرمائی۔ مذکورہ محبت دراصل اہلِ تحقیق محبین کا وجدان ہے اس لیے کہ حضرت رابعہؒ کے اس قول پر یہی گمان ہوتا ہے کیونکہ مقامِ محبت میں انہیں بلند درجہ حاصل تھا۔ واللہ اعلم

ہم نے اس بحث کو مجمل طور پر بیان کیا ہے اور اس کتاب میں اس کی وضاحت کرنا مناسب نہیں۔ اور نہ ہی ہم اس کی وضاحت کریں گے اور جو آدمی اس مقام کا اہلِ محبت نہ ہو اور صرف محبت کا دعویدار ہی ہو۔ محبوب تعالیٰ سے اجر کا طلب گار ہو اور محبت کے باعث محبوب تعالیٰ پر کچھ اجر لازم کرتا ہو۔ ایسا آدمی محبت کے بارے میں فریب میں مبتلا ہے۔ اس کی نظر پر حجاب ہے اور دراصل اس کا مقام رجاء کا ہے۔ جس کی ضد خوف ہوتی ہے اور محبت میں اسے کچھ درجہ حاصل نہیں اور محبت اس وقت صحیح ہوتی ہے کہ جب محبت میں اسے ناراضگی کا ڈر ہو ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"جس نے معرفت کا گمان رکھا، اس نے معرفت حاصل نہ کی اور جس کو محبت کا وہم ہُوا اس نے محبت نہ کی"

اہلِ محبت کے خوف

خوف میں ان کے مقامات

محب کو سات خوف ہوتے ہیں

ایک محب کو سات خوف ہوتے ہیں ان میں بعض سخت تر ہوتے ہیں۔ پہلا خوف اعراض کا ہوتا ہے (مولائے کریم کے اعراض کر لینے کا خوف) اور یہ خوفِ حجاب سے سخت تر ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر بُعد کا خوف ہے۔ سورۃ ہود میں اس کا بیان ہُوا اور یہی وُہ خوف ہے کہ جس نے سچے حبیب کو بوڑھا کر دیا جبکہ محبوب تعالیٰ کا یہ فرمان سنا،

اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ۔
(سُن لو! پھٹکار ہے ثمود کو)

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ۔ (سُن لو، پھٹکار ہے مدین پر جیسے پھٹکار پائی ثمود نے)

چنانچہ بعد در بعد کا ذکر کیا اور قرب میں اہلِ قرب کو بُوڑھا کرتا ہے۔ پھر سالک کو خوف سلب اور ایک حد پر وقوف ہو جانے کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ ان سے اظہار و اختیار میں خواص کے لیے ہے۔ چنانچہ عقوبت کے طور پر اس کی حقیقت ان سے سلب کی جاتی ہے اور گاہے اس وقت ہوتا ہے کہ جب محبت کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور

نفس، حقیقی محبت کا وصف ظاہر کرتا ہے اس میں کچھ کمی کر دی جاتی ہے۔ البتہ مایوس نہیں کیا جاتا اور یہ لطیف پوشیدہ تدبیر ہوتی ہے اور ایسے نقصان اور کھو جانے کا خوف ہوتا ہے کہ جس کا تدارک نہ ہو سکے۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ ایک محب بزرگ تھے۔ سیاحت کے دوران انھوں نے یہ شعر سنا، ؎

كُلُّ شَيْءٍ لَكَ مَغْفُوْرٌ سِوَى الْإِعْرَاضِ عَنِّيْ

قَدْ وَهَبْنَا مِنْكَ مَا فَاتَ بَقِيَ مَا فَاتَ عَنِّيْ

(مجھ سے اعراض کے بغیر تجھے بات میں بخش دیا گیا)

(جو تجھ سے رہ گیا ہم نے تجھے بخشا، اور جو مجھ سے رہا، وہ باقی ہے)

یہ شعر سن کر وہ تڑپے اور بے ہوش ہو گئے اور ایک دن رات بیہوش رہے۔ یہ ایک طویل واقعہ ہے اور کئی مقامات طے کرنے کے بعد ایک خاص مقام پر ایسا واقعہ پیش آیا۔ اس کے آخر میں یہ بتایا کہ میں نے پہاڑ سے ایک آواز سنی،

"اے ابراہیم! بندہ ہو جا۔"

بتاتے ہیں کہ "بندہ ہو گیا اور مجھے آرام مل گیا۔" مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا مالک نہ بن۔ ہر غیر اللہ سے آزاد ہو کر صرف ایک کا بندہ بن جا اور کسی چیز کا مالک نہ بن۔ اس لیے کہ تمام اشیاء تو مالک تعالیٰ کے خزانہ میں ہیں۔ اب تو ان کا مالک نہ بن ورنہ مالک تعالیٰ کے سامنے یہ حجاب بن جائے گا اور جس قدر تیری ملکیت ہوگی اسی قدر تو ان (مملوکہ اشیاء) کا قیدی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان معاملہ کی ایک مثال دی۔ فرمایا:

دو آدمی ہیں ان میں سے ایک میں مال، اہل اور شہوات کی آمیزش ہے اور دوسرا خالص و سالم ایک ہی کا بندہ ہے۔ یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ فرمایا،

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ[1]

(اللہ نے بتائی ایک کہاوت، ایک مرد ہے کہ اس میں کئی شریک ضدی اور ایک مرد ہے پورا ایک شخص کا، کوئی برابر ہے ان کی کہاوت، سب خوبی اللہ کو ہے۔ پر بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے)

یعنی اکثر لوگ ایک کی طرح علماء نہیں اور خوفِ فوت سے زیادہ خوفِ تسلی ہے۔ اہلِ خوف کے نزدیک یہ

---

[1] الزمر آیت ۲۹۔

شدید ترین خوف ہے۔ اس لیے کہ اس کی محبت اس کے ساتھ ہے ان کے ساتھ نہیں اور یہ ایک بڑی نعمت ہے جس کا اندازہ معلوم نہیں۔ اب اس پر شکر کیوں کر ہوگا؟ کوئی چیز اس قیمت کی نہیں۔ اس طرح جیسے ان کی محبت اس کے لیے اس کے ساتھ ہے۔ اس طرح ان کا سلو (بے غمی) بھی اس سے اور اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب ان پر اس جگہ سے سلو (بے غمی) آتی ہے جس کو نہیں سمجھتے اور جہاں سے ان پر محبت آئی تھی اور انہیں علم نہ تھا۔ چنانچہ جس طرح تُو نے اس کی خاطر محبت پائی اس طرح اس کے ساتھ ہی سلو پائے گا۔ اب تو اس کے ساتھ ہوگا اور تجھے اسی سے سلو ہوگا اور تجھے یہ خبر نہ ہوگی کہ تجھے کیسے سلو (بے غمی) ملی۔ اس لیے کہ وہ لطائف حکمت کے ساتھ تجھ میں داخل کرتا ہے۔ جیسے کہ تو اس سے محبت کرتا ہے اور اسے سمجھتا نہیں کیونکہ اس نے تجھے باغاتِ رحمت سے اطلاعِ قدرت کے ذریعہ اپنے وصف کا مشاہدہ کرایا۔ آخر تو نے اپنے آپ کو اس کا محب پایا۔ اس طرح محبت لوٹتی ہے جیسے کہ اس سے مکر و حجزیت کے وصف سے تجھ پر حجاب بن کر آئی اور تو نے اپنے قلب کو اس سے غافل و بے غم پایا۔ اس کی مدد و قوت کے نہ ہونے اور کسی حلیب وحید کے نہ ہونے سے، اور اس کی توصیف وہی کر سکتا ہے جو کہ دقیق ابتلا کا عارف ہو اور اس کے خفی مکر و ابتلا سے ڈرنے والا اس کا خطرہ رکھتا ہے۔ جب تو اس کی وجہ سے اس سے غافل و بے غم ہُوا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے تجھے دُور ہٹا دیا اور مردُود کر دیا جیسے کہ جب تو اس سے محبت کرتا تھا تو اس کے ساتھ اس سے محبت کرتا تھا۔ فریب زدہ ہونے کے باعث قلوب پر سرعتِ تقلیبِ قدرت کی وجہ سے مکر سریع کی یہ تحقیقات و وضاحت ہے اور فریب زدہ آدمی پر شقاوت آنے کا یہی مطلب ہے کہ سرعت کی وجہ سے اس کو سمجھ نہیں سکتا اور خیال میں بھی نہیں ہوتا کہ شقاوت مسلط ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

اِذَا لَھُمْ مَّکْرٌ فِیْۤ اٰیَاتِنَا۔

یعنی انعامات پر نافرمانی کرتے ہیں اور فرمایا:

قُلِ اللّٰہُ اَسْرَعُ مَکْرًا۔[1] (کہہ دو، اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے حیلہ)

یعنی اس کی تقلیب مخفی ہے جس نے تمہاری پسند کے انعامات ظاہر کیے اور یہ (انعامات) سزا ہیں اور باطنی انتقام یہ ہے کہ وُہ ظاہری نعمتوں میں آہستہ آہستہ ڈوبے جا رہے ہیں اور سمجھتے تک نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، اور اس سے بڑھ کر خوف بدل جانے کا ہے۔ اس لیے کہ اس میں اختلاط نہیں ہوتا (بلکہ استبدال ہوتا ہے) اور یہ حقیقی استدراج ہے جو کہ محبوب تعالیٰ کی شدید ترین ناراضگی اور از حد بغض کے بعد آیا کرتا ہے۔

---

[1] یونس آیت ۲۱

بُعد اور آسودہ حالی یا غفلت دونوں اس مقام کا مقدمہ ہیں اور ان سب کا آغاز اعراض و حجاب سے ہوتا ہے اور بُعد کے ان مفہومات کے اسباب یہ ہیں کہ ذکراللہ سے انقباض ہونے لگے اور نیکی کرنے میں تنگدلی واقع ہو۔

اور ایسے استدراجی مراتب اگر قوی اور زیادہ ہو جائیں اور ان سب (آفات) کی طرف سے انسان کو لیجاتے ہیں اور اگر کم ہوں اور نیکیوں اور امورِ خیر میں بدل جائیں تو محبت و قربُ کے مقامات میں داخل کر دیتے ہیں جیسے کہ محبوب ربانی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت میں آتا ہے اور کتاب اللہ پر غور کیا جائے تو بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ خواہشات میں گم ہونے والا، خدا تعالیٰ کا مبغوض آدمی ہے۔ ان مندرجہ بالا اوصافِ (گراوٹ) کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ تو غلط سمت چل کر گر گیا اور بزی حالت بدل گئی اور ان مفاہیم سے خوف کھانے کا مطلب یہ ہے کہ تو ایسی خطرناک عادات سے آگاہ ہے اور کتاب میں ان مقامات کی تفصیل مناسب نہیں۔ یہ تو قلب میں اس کے یقین کے باعث واضح ہوتی ہیں اور انسان کی فضیلت کے باعث یہ صاف و صریح ہوتی ہیں اور جو قلبِ اشتراک رکھنے والا اور خواہش کا بندہ ہو۔ وُہ شک کرنے والا ہے اور اس کا اہل نہیں اور اللہ سے ہی مدد کی درخواست ہے

آٹھواں خوف یہ عظیم اور بلندپایہ محبت کے مشاہدہ سے آٹھواں خوف بھی ہوتا ہے جس کا نام غیرمانوس ہے اور سننے میں کم آتا ہے اور اس کی شہرت زیادہ نہیں۔ اس لیے یہ مخفی رہتا ہے اور اس میں گاہے التباس پڑجاتا ہے۔ ہم نے اس کا نام نہیں رکھا۔ اس لیے کہ یہ اس کے مقامِ محبت کا ایک خوف ہے اور مقامِ محبت کا نام ہی اس کا نام ہے۔

چنانچہ بیشتر سامعین پر یہ خوف پوشیدہ رہتا ہے اور وہ اس کا انکار کر دیتے ہیں اور غیر مشاہد پر اس کا کھٹکا ہوتا ہے اور وہ اس کی پیروی کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ مخلوق کی صفات، صفاتِ خالق کے معنی کے ساتھ ملتبس ہوتی ہیں اور انہیں اس سے اس قدر حصہ حاصل ہے جو انہیں علم ہے اور ان پر اپنے علوم کا حجاب ہوتا ہے اور ان سے انہیں مشاہدہ کیسے حاصل ہو؟ اس کے خوف کا اور اس کے مقام کا ذکر کرنا تاکہ اس کی وضاحت ہو جائے۔ یہ ایسی بات ہے کہ جس کو لپیٹ کر مخفی رکھنا، واضح کرنے سے بہتر ہے۔ سوائے اس کے کہ اس سے وضاحت ہو جائے۔ اس لیے کہ تمام مقاماتِ محبت اس مقام کے سامنے ایسے ہیں جیسے کہ سمندر کے مقابلہ میں ایک نہر کی حیثیت ہے۔ جس طرح کہ تمام مشاہداتِ یقین کی حیثیت، توحید کے ساتھ مشاہدہ یقین کے سامنے ہے اور یہ محبت کا ایک معروف وصف ہے۔ اس لیے کہ یہ دراصل حبیب کا محب کی طرف شوق ہوتا ہے اور حضرت رابعہؒ کے ابتدائی قول "حب الھوٰی" کا یہی مفہوم ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"میں دیکھتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش کی جانب تیزی فرماتا ہے۔" (یعنی پوری کر دیتا ہے) اس قول کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو مقامِ محب میں آنے کے بعد آگے بڑھے اس کو اس مقام تک رفعت عطا کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اعلیٰ ترین مشاہداتِ یقین کے باعث مقامِ محبوب میں ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے : ؎

وَ مِنْ بَعْدِ ھٰذَا مَا تَدِقُّ صِفَاتُہٗ ‌ ‌ ‌ وَ مَا کَتْمُہٗ اَحْظٰی لَدَیْہِ وَ اَعْدَلُ
اَلَا اِنَّ لِلرَّحْمٰنِ سِرًّا یُسِرُّہٗ ‌ ‌ ‌ اِلٰی اَھْلِہٖ فِی السِّرِّ وَ السِّتْرُ اَجْمَلُ

(اس کے بعد وہ ہے کہ جس کی صفات بہت مخفی اور دقیق ہیں۔ اس کے نزدیک اس کا اخفاء ہی زیادہ بہتر اور زیادہ عدل کی بات ہے)

(البتہ رحمٰن کا ایک راز ہوتا ہے جو وہ راز کے اہل کو دیتا ہے اور پردہ خوب بات ہے)

ایک محب نے اس مفہوم پر یہ اشعار پڑھے : ؎

فَمِنْكَ بَدَا حُبٌّ بِعِزٍّ تَمَازَجَا ‌ ‌ ‌ بِمَاءِ وِصَالٍ كُنْتَ اَنْتَ وَصَلْتَهٗ
ظَهَرْتَ لِمَنْ اَبْقَيْتَ بَعْدَ فَنَائِهٖ ‌ ‌ ‌ فَكَانَ بِلَا كَوْنٍ لِاَنَّكَ كُنْتَهٗ

(تجھ سے ہی محبتِ عزت تعالیٰ ظاہر ہوئی جو آبِ وصال سے ملی اور تو نے وصال کرایا)

(فنا کے بعد جس کو تو نے باقی رکھا وہی ظاہر ہوا اور اب وہ بغیر کون کے ہے اس لیے کہ تو نے اسے کیا)

ایک عالم" کا فرمان ہے :

"جس نے بغیر خوف کے صرف طریقِ محبت سے اللہ کو پہچانا۔ وہ بسط و ناز کے باعث ہلاک ہوا اور جس نے بغیر محبت کے صرف طریقِ خوف سے اللہ کو پہچانا وہ بُعد و وحشت کے باعث اس سے کٹ کر (ہلاک ہوا) اور جس نے محبت و خوف کے طریق سے اللہ کو پہچانا، اللہ نے اس سے محبت کی اسے قرب و علم و تمکنت عطا فرمائی اور خائفین کے خوف پر حیران نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ حضرات صرف افعالِ شدت اور صفاتِ مخوفہ (خوف دلانے والی صفات) سے ہی آگاہ ہوتے ہیں۔ البتہ محبین کو اخلاق و رحمتِ الٰہی سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان کے خوف پر واقعی حیرت و تعجب ہے۔ خائفین کو ان الطافات و نوازشات کا علم نہیں ہوتا جو اہلِ محبت کو ہوتا ہے مگر محبت کے باوجود وہ خوف کھاتے ہیں اور اس سے محبت بھی رکھتے ہیں۔ اس کی جانب شوق بھی ہوتا ہے اور ڈر و گھبراہٹ بھی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے بسط و قبض دونوں کا احساس کرتے ہیں۔ اس کے اعزاز کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے تواضع بھی اختیار کرتے ہیں۔ اور جس کو قبض کیا جائے اور وہ منقبض ہو جائے اور سہم جائے۔ اس پر کچھ تعجب نہیں۔ تعجب تو اس پر رحم ہے کہ جس کو عزت و تکریم عطا کیجائے

اور وہ تواضع و انکساری اختیار کرے۔ ان لوگوں پر ہی حیرت کی جا سکتی ہے

مقربین کی محبت

محبین کو بسط و فراخی میں انقباض ہوتا ہے اور خائفین، قبض میں سہمے رہتے ہیں۔ محبین پر عزت و تکریم میں انکساری چھا جاتی ہے اور خائفین پر ہیبت و دہشت میں انکساری آتی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اہل محبت کو بلند ترین درجہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ خوف و دہشت تو ابتدائی احوال ہیں۔ چنانچہ ہر محب خدا، خائف بھی ہے اور ہر خائف، محب خدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی ہر خائف کو محبتِ مقربین حاصل نہیں۔ اس لیے کہ اس نے محبت کا مزہ ہی نہیں چکھا کیونکہ خواص کے مقامات میں فرضِ محبت کی عام مسلمانوں کی مقدار کا کچھ اعتبار نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقدار کے باعث احوال کا وجدان نہیں ہوتا اور مشاہداتِ انتقال میں ان کے باعث درجات بلند ہوتے ہیں کیونکہ یہ قوتِ ایمانی کا معاملہ ہے۔ اس کی صحت کے ساتھ یہ مشروط ہے۔ اس کے وجود سے اس کا بھی وجود ہوتا ہے۔

اور محبت، دہشت کو ہٹا نہیں دیتی۔ اس وجہ سے ایک محب، خائف بھی ہوتا ہے کیونکہ محبوب ہیبت والا ہے۔ کہا ہے خائف گزشتہ وصف میں مشغول ہوتا ہے۔ اس وجہ اسے محبت سے انقباض ہو جاتا ہے۔ یہ ابرار کا کشف ہے اور مقربین کے لیے حجاب ہے۔ اس لیے کہ محبین کو خوف کی غذا ملتی ہے اور محبت کی فراخی حاصل ہوتی اور خائفین کو خوف سے وسعت ملتی ہے اور محبت کی خوراک ملتی ہے۔ یہ رجاء و خوف کی طرح ہے اس لیے کہ یہ دونوں ایمان کے اوصاف ہیں۔ البتہ خائف کے حال میں رجاء بھی داخل ہوتی ہے اور اہل رجاءؑ اپنے رجاء میں خوف بھی رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے ترتیبِ مقامات کی صنعت میں ایک عجیب حکم اور لطیف حکمت ہے۔ اسے صرف وہی جانتا ہے جس کو اس کے مشاہدہ کا یقین عطا ہوا۔ اگر مقامِ خوف سے بندے کی طرف بڑھا تو یہ مقربین عارفین کی طرح محبت کرنے والا بندہ ہے اور اگر مقامِ محبت کے ذریعہ اس کی طرف بڑھے تو یہ اصحاب یمین کی سی محبت کرنیوالا محب ہے اور اسے مقاماتِ مقربین کے اہل انس اور اہل شوق محبین کا مقام حاصل نہیں۔ البتہ یہ سب اہلِ یقین صالحین ہیں۔ چاہے اہلِ ظاہر کے ترتیبِ علوم سے ان کے احوال نکل جائیں۔ اس لیے کہ ان کے اقرار کرنیوالوں سے انکار کرنے والے زیادہ ہیں۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ [1] (اور اللہ جیت رہتا ہے اپنے کام اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

---

[1] یوسف آیت ۲۱

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ [1] (لوگ کئی درجے ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتے ہیں)

عاملین کی محبت

بسا اوقات محبت، خوف کا ثواب ہوتی ہے اور اسے بڑھاتی ہے اور یہ عاملین کا مقام ہے
بسا اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ خوف، محبت کا ثواب ہوتا ہے اور اسے بڑھاتا ہے اور یہ عاملین کا مقام ہے۔ اب خوف کے بعد جس کی محبت اضافہ کا باعث ہو وہ مقربین محبوبین میں سے ہے اور جس کا خوف اضافۂ محبت کا باعث ہو وہ ابرار محبین میں سے ہے اور یہی لوگ اصحاب الیمین ہیں۔ ہمارے ایک بصری عالم سے پوچھا گیا،

"محبت افضل ہے یا حیاء؟"

فرمایا، "جو محبت خوف سے پیدا ہو، اس سے حیاء افضل ہے اور جس محبت سے حیاء پیدا ہو وہ حیاء سے افضل ہے۔ اور یہ محبت شوق ہے"۔

محبت کیا اور کہاں سے؟

حضرت جنید کا فرمان ہے:

"محبت ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ کا قلبی قرب ہے جو کہ نور و فرحت حاصل کرنے کے ذریعہ ہو"۔ اور ہم نے مخفی اسماء کی تجلی، صفات کی محبت کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ ظاہری اسماء کی محبت کا ذکر کیا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اسے کسی کتاب میں لکھا جائے اور نہ ہی عوام الناس کے سامنے اسے کھولنا درست ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک رازِ محبت ہے۔ صرف اہل محبت کو ہی اس کا کشف حاصل ہوتا ہے اور وہی اس پر کلام کرسکتا ہے جس پر یہ عطا ہوئی۔ میں نے اسے کسی کتاب میں نہیں دیکھا کیونکہ یہ کتاب سے اخذ نہیں کی جاتی بلکہ یہ تو علماء کی زبانوں سے حاصل کی جاتی ہے اور سینہ بسینہ حاصل ہوتی ہے اور یہ اسی سے مشابہ ہے جیسے کہ ہم نے آٹھویں خوف پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جو اس سے آگاہ نہیں ہم اس کے سامنے اس کی توضیح نہیں کرتے۔

منقول ہے، اوائل میں سے کسی بزرگ نے ایک صدیق سے عرض کیا،

"دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی محبت کا ایک ذرّہ عطا فرمائے"۔

انہوں نے دُعا کر دی اور اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ اس وقت ان کی عقل جاتی رہی، قلب پریشان ہوگیا اور پہاڑوں میں گھومنے لگے۔ سات روز اس حالت میں رہے کہ (مجنون آدمی کی طرح) نہ کسی کے لیے

---

[1] آل عمران آیت ۱۶۳

نفع بخش ہیں اور نہ خود کسی سے نفع لے سکتے ہیں۔ صدیقؓ نے پروردگار تعالیٰ سے دُعا کی،

" اسے پروردگار! اس کی محبت گھٹا کر آدھ ذرہ فرما دے"۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی، ہم نے اس ذرۂ معرفت کا ایک لاکھواں حصہ عطا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت اس نے ذرۂ محبت کی دعا کی تھی اس وقت ایک لاکھ آدمی نے مجھ سے بھی دعا کی تھی۔ میں نے اس کے لیے تیری سفارش تک ان کی دعاؤں کی قبولیت موخر کر دی۔ جب تیری دعا کو قبول کیا تو جیسے میں نے اس کو عطا کیا دوسروں کو بھی عطا کیا اور محبت کا ایک ذرہ ایک لاکھ بندوں میں تقسیم کر دیا۔ اب یہ وہی ہے جو اس سے ملا۔

میں نے کہا: پاک ہے تو، تو احکم الحٰکمین ہے۔ جو تو نے اسے عطا فرمایا اس سے بھی کم کر دے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی گھٹا دیا اور معمولی یعنی عشر عشیر ہی باقی رہنے دیا۔ یعنی ہزارویں کا ایک جزو رہنے دیا۔ ایسا اس کے خوف و محبت اور علم و رجا میں اعتدال آیا اور عارفین کی طرح ہوا۔

شب بیداری علامت محبت ہے

رات کو بیدار رہ کر مولائے جلیل تعالیٰ کے سامنے مناجات کرنا اور محبوب تعالیٰ کی خلوت کی خاطر شام تک بے چینی سے انتظار کرنا بھی محبت کی علامت ہے اور قلبی مناجات دراصل رازہائے وجدان اور مشاہداتِ غیبیہ کا نتیجہ ہے۔

اہلِ صفا کے نزدیک مناجات القلب کے ساتھ ہی ہوتی ہے یعنی غیبی مخفیات کو دیکھنا اور سترِ ملکوت میں جولانی دکھانا اور انوارِ ارواح کے باعث مفاہیم جبروت میں رفعت و بلندی حاصل کرنا اس کے انوارات کی شعائیں اسے اٹھا کر خزائن اسرار میں لے جاتی ہیں اور مناجات دراصل روئیت قرب اور وجودِ انس کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ سے (قدسی) روایت میں ہے۔ فرمایا:

" جس نے میری محبت کا دعویٰ کیا اور جب رات آئی تو وہ مجھ سے (غافل ہو کر) سو گیا۔ اس نے جھوٹ بولا۔ کیا ہر حبیب اپنے حبیب سے خلوت پسند نہیں کرتا؟ اب (دیکھو) میں اپنے احباب کے قریب ہوں ان پوشیدہ (دعا) اور مناجات کو سن رہا ہوں۔ ان کی آہوں اور فریادوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں"۔

علمائے متقدمین سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک صدیق کی طرف وحی کی،

" میرے بعض بندے ایسے بھی ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے مشتاق ہیں اور میں ان کا مشتاق ہوں۔ وہ مجھے یاد کرتے ہیں اور میں ان کی طرف نظر فرماتا ہوں۔ اگر تو ان کی راہ پر چلے گا تو میں تجھ سے محبت کروں گا اور اگر تو ان سے اعراض کرے گا تو میں تجھ سے بغض و ناراضگی رکھوں گا"۔

عرض کیا،

" اے پروردگار ان کی علامت کیا ہے؟"

فرمایا: "وہ دن کو سایہ پر دھیان رکھتے ہیں جیسے کہ ایک شفیق چرواہا اپنی بکریوں کا دھیان رکھتا ہے اور غروبِ آفتاب کی طرح اس طرح میلان رکھتے ہیں جیسے کہ پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف غروب کے وقت میلان کے ساتھ لپکتے ہیں۔ آخر جب رات چھا جاتی ہے اور اندھیرا ہو جاتا ہے، بستر بچھ جاتے ہیں، چارپائیاں لگا دی جاتی ہیں اور ہر حبیب اپنے محبوب کے ساتھ خلوت کرتا ہے تو وہ میرے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میرے سامنے اپنے چہرے بچھا دیتے ہیں، میری کلام کے ذریعہ مناجات کرنے اور میرے انعام کے ساتھ تملق کرتے ہیں۔ کچھ رونے اور چیخنے والے ہیں، کچھ آہیں بھرنے اور فریادیں کرنے والے ہیں، کچھ کھڑے اور بیٹھے ہیں۔ کوئی رکوع و سجود میں ہے۔ جو مشقت اٹھا رہے ہیں وہ میری نظر میں ہیں اور میری محبت کے باعث جو فریادیں کر رہے ہیں میں اسے سن رہا ہوں۔ سب سے پہلے میں انہیں تین (انعام) دیتا ہوں:

۱۔ ان کے قلوب میں میں اپنا نور ڈالتا ہوں، آخر وہ مجھ سے خبریں دیتے ہیں جیسے کہ میں ان سے خبر دیتا ہوں۔

۲۔ اگر آسمان و زمین اور ان دونوں میں جو کچھ ہے وہ ان کے اوزان میں ہو تو بھی میں ان کے لیے کم سمجھوں۔

۳۔ ان پر میں (براہِ راست) متوجہ ہوتا ہوں۔ اب تم سمجھتے ہو کہ جس پر میں توجہ کروں تو کوئی جانتا ہے کہ میں اسے کیا عطا کرنے کا ارادہ کرتا ہوں۔"

اہلِ شوق

مقاماتِ محبت میں سے شوق ایک بلند ترین مقام ہے اور شوق ایسی چیز ہے کہ جس کا اسے شوق ہے اس کے علاوہ میں بندے کے لیے کچھ راحت و نعمت نہیں رہنے دیتا اور اہلِ شوق اپنے مشاہدۂ شوق کے باعث مقربین ہیں۔ حبیب تعالیٰ انہی کے پاس موجود ہوتا ہے اور انہی کے پاس اسے تلاش کرنے کا حکم ہے جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا:

"مجھے ان کے پاس تلاش کرو جن کے دل میری وجہ سے شکستہ ہیں۔"

یہی اہلِ شوق محبین ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حبیب تعالیٰ اپنے وسعت کے ساتھ ان کی عزت افزائی کے لیے قریب ہوا۔ انہیں اس کے قرب سے فرحت ہوئی اور اس کے مشاہدہ میں انہیں نعمت و عیش حاصل ہوئی اور اس کے سامنے حضوری کے باعث انہیں نعمت ملی، پھر اپنی عزت کے لیے غیرت کے باعث ان سے محجوب ہوا تو اس کی وجہ سے ان کے دل ٹوٹ گئے اور سابقہ عادت کی طرف انہیں اشتیاق ہوا۔ چنانچہ ان کی حرمت اس کے پاس ثابت ہوئی اور اپنے اولیاء کو حکم دیا کہ ان (شکستہ دلوں) کو تلاش کرو اور اپنے آپ کو ان کے پاس فرمایا۔ چنانچہ ان محبین کو اس کے قرب کے باعث ناقابلِ بیان فرحت و خوشی حاصل ہوئی اور اس کی خاطر ان کا انکسار و غم بھی بیان سے باہر ہے۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اپنے محب سے اسے بلند مقام دینے کی خاطر اعراض کر لیتا ہے تاکہ اس کے شوق کو تازیانہ لگائے اور اس میں قلق و اضطراب پیدا کرے

اور اعراض میں بھی اسس کی نظر رہتی ہے مگر وہ نہیں جانتے تاکہ وہ اپنے علم کے مطابق اس کی طرف نظر رکھیں. چنانچہ اس کے سامنے ادب کے ساتھ وُہ تھم جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اہلِ شوق میں سے تھے اور اس زیر بحث علم کے اہدال میں سے تھے۔ محبت میں انہیں ایک بلند ترین مقام حاصل تھا اور قرب میں عظیم الشان مکاشفات کے حامل تھے۔ ان کے بارے میں منقول ہے کہ ایک بار فرمایا،

ایک بار میں نے عرض کیا،

" اے پروردگار! اگر تو نے اپنے کسی محب کو اپنی ملاقات سے قبل ہی ایسا انعام دیا کہ جس سے اسس کو قلبی سکون ہوگیا تو مجھے بھی عطا فرما۔ مجھے قلق و اضطراب سنے پریشان کر ڈالا۔" بتاتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا،

" اے ابراہیم، تجھے مجھ سے حیاء نہیں آتی کہ تو مجھ سے ایسی چیز مانگتا ہے کہ میری ملاقات سے پہلے تیرے قلب کو سکون آجائے؟ اور کیا کبھی ایسا ہُوا کہ ایک عاشق کو اپنے محبوب کی ملاقات سے پہلے سکون ہوگیا ہو؟ یا کیا کوئی محب محبوب کے علاوہ چیز کی طرف آرام پاتا ہے؟"

بتاتے ہیں کہ میں نے عرض کیا،

" میں تیری محبت میں مبہوت ہوگیا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا کہوں! مجھے معاف فرمادے اور مجھے بتادے کہ کیسے کہوں؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "یوں کہو:

اَللّٰهُمَّ رَضِّنِيْ بِقَضَائِكَ وَ صَبِّرْنِيْ عَلٰى بَلَائِكَ وَ اَوْزِعْنِيْ شُكْرَ نَعْمَائِكَ۔ (اے اللہ مجھے اپنی قضا پر راضی کردے اور مجھے اپنے ابتلا پر صابر بنادے اور مجھے اپنی نعمتوں پر شکر)

سماع کا حکم

احمد بن عیسیٰ خراز سماع سننے میں بہت مشہور تھے۔ سماع کے وقت وہ تڑپ تڑپ جاتے اور بے ہوش ہوجاتے۔ ان سے بھی اسی مفہوم کی ایک بات مروی ہے۔ اصحاب سہلؒ میں سے ایک بزرگؒ نے بتایا کہ میں نے ان کی وفات کے بعد انہیں (احمد بن عیسیٰ کو) خواب میں دیکھا اور پوچھا:

" اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

انہوں نے کہا،

" مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا: " اے احمد تو نے میرا وصف

اگر ایک مقام پر میں نے تجھے ایسا نہ دیکھا ہوتا کہ تو نے اس وقت خلوص سے مجھے ہی چاہا تھا تو ضرور تجھے عذاب کرتا۔"

بتایا کہ مجھے حجاب خوف کے پیچھے کھڑا کیا۔ میں کانپ گیا اور اس قدر گھبراہٹ ہوئی کہ اسے اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر مجھے حجابِ رضا کے پیچھے کھڑا کیا تو میں نے عرض کیا:

"اے مولا کریم! میں تیرے سوا کوئی نہیں پاتا جو مجھے اٹھائے۔ اس لیے کہ تیرے بھروسہ پر اپنے آپ کو ڈال دیا۔"

فرمایا: "تو نے سچ کہا۔ میرے سوا تو کہاں (اور کس کو) پائے گا کہ تجھے اٹھائے؟"

بتاتے ہیں کہ "پھر مجھے جنت میں لے جانے کا حکم دیا۔"

اس واقعہ میں اہلِ سماع کے لیے سخت خطرہ ہے جو تشبیہ پر سنتے ہیں اور اہلِ فہم کے سننے سے دُور رہتے ہیں۔ اس لیے کہ سماع ایسا علم ہے جو صرف اہلِ صفا کے ہی مناسب ہے جس نے کدورت کی حالت میں سماع کیا اس کے لیے یہ مشقت اور نقصان کی بات ہے جیسے کہ عطا دینے ہاتھوں پر نظر رکھنے والے پر آفات آنے کا ڈر ہوتا ہے۔ اس طرح جب وہ نغمہ و صوت کے طریق پر سماع کرے گا اسے کمیٔ مشاہدہ کی وجہ نقصان کا اندیشہ ہے اس لیے کہ جیسے ہاتھ، روزیوں کا ظرف ہے اسی طرح صوت بھی مفاہیم کا ظرف ہے۔ چنانچہ اہلِ یقین ناظر ایک ہاتھ روزی لیتا ہے مگر (ہاتھ پر) نظر نہیں کرتا اور اہلِ حق سامع ایک آواز سے معانی اخذ کرتا ہے مگر نغمات کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا۔ اب جس نے تشبیہ و تمثیل پر سماع کیا وہ ملحد ہوا اور جس نے شہوت و ہویٰ پر سماع کیا وہ لہو و لعب میں ڈوب گیا اور جس نے صفاتِ حق کے معانی پر مشاہدۂ علم اور استخراجِ فہم کے باعث سماع کیا اور رصدِ آیات پر دلیل سمجھا تو ایسا سامع مزید انعام کا حقدار ہے اور یہی اہلِ توحید کی راہیں ہیں۔

سماع میں حرام، حلال اور مشتبہ تین قسمیں ہیں۔ جس نے شہوت و ہویٰ کے نقطۂ نظر سے نفسانیت کے ساتھ سماع کیا تو یہ حرام ہے اور جس نے اپنی غلام یا بیوی سے مباح طریقہ پر عقلیات کے ساتھ سماع کیا اس میں لہو و لعب آنے کا شبہ ہے۔ البتہ بعض تابعین سے یہ سماع ثابت ہے (مگر وہاں لہو و لعب نہ تھا) اور جس نے مشاہدۂ مفاہیم کے ساتھ قلبی سماع کیا اور ایسے مفاہیم کا مشاہدہ کرتے ہوئے سماع کیا جو دلیل تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں اور کریم تعالیٰ کی راہوں کا مشاہدہ کراتے ہیں۔ ایسا سماع مباح ہے۔ ایک اہل آدمی کے لیے ہی سماع مباح ہے جس کو اس میں ایک خاص مقام حاصل ہو اس کے قلب میں ایک وجدان ہو کہ اس کے ساتھ بندہ مقامِ حزن یا مقامِ شوق پر آجائے یا مقامِ خوف یا مقامِ محبت میں آجائے اور سماع اسے مشاہدہ ملکوت لے جائے اور سماع کے باعث وہ مزید اطاعت گزار بن جائے اور جو آدمی نغمہ کے انداز پر سماع کرے یا صرف

آواز پر لٹو ہو یا لہو و لعب یا استراحت کی خاطر سماع کرے تو ایسا آدمی لہو و لعب میں مبتلا ہے اس کے لیے بھی سماع جائز نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ وہ مقصود نہیں۔

حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے:

"اس گروہ (صوفیا) پر تین مواقع میں رحمت نازل ہوتی ہے:

۱۔ کھانے کے موقع پر۔ اس لیے کہ ان کا کھانا صرف فاقہ ہوتا ہے۔

۲۔ مذاکرہ کے موقع پر۔ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے احوال اور صدیقینؒ کے مقامات کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ سماع کے موقع پر۔ اس لیے کہ یہ وجدان کے ساتھ سماع کرتے ہیں اور حق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"تین چیزوں میں ہمارے اصحاب (جماعتِ صوفیا کے) وجدان سمجھے جاتے ہیں:

۱۔ مسائل کے وقت۔

۲۔ غضب کے موقع پر۔

۳۔ سماع کے وقت۔

ہم نے اس کا ذکر اس وجہ سے کیا ہے کہ یہ بھی بعض اہل محبت کا طریق اور بعض اہل عشق کا یہ بھی حال تھا۔ اگر ہم قطعی انکار کر دیں تو گویا ہم نے اُمت کے نوّے بلند پایہ صادقین کا انکار کیا۔ البتہ بعض نااہل بھی اس میں شریک ہو چکے ہیں۔ جنہوں نے معاملہ کو بدل دیا اور سیدھی راہ سے ہٹ گئے۔

بعض اہلِ سماع کے لیے سماع ایک غذا تھی۔ وہ اسے غذا کی طرح سنتے اور مزید طاعات کرنے کے لیے اس سے قوت حاصل کرتے۔ ایسے بھی گزرے ہیں کہ سماع کے باعث دو دو اور تین تین دن تک بستر لپیٹ دیا اور فاقہ کر کے عبادت میں مصروف رہے۔ پھر جب خوراک کی طرف میلان ہوا تو سماع کے ذریعہ وجدان میں توانائی حاصل کی اور اذکار و عبادات پر طبیعت کو آمادہ کر لیا۔ اس طرح کھانے سے غافل ہو گئے اور نیند کی ضرورت بھی نہ رہی۔ مگر سماع اسی کو درست ہو سکتا ہے جو صاف قلب کے ساتھ سنے، گناہوں سے پاک ہو اور جس نے اس میں لہو و لعب سے کام لیا تو ایسا کرنا اس کی ناقص عقلی کی دلیل ہے۔

ایک بزرگؒ اپنے شیخ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوالعباس خضر کو دیکھا اور پوچھا:

"اس سماع کے بارے میں ہمارے اصحاب کا اختلاف ہے۔ آپ کی اس میں کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "یہ صاف اور شیریں پانی ہے اور صرف علماء ہی اس میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں اور بات بھی

صحیح فرمائی۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ جس کا ڈر ہے وہ مخفی شہوت اور لہو ولعب میں ڈالنے والے نغمہ کا خوف ہے۔"

حضرت حمادؒ نے ابراہیمؒ سے نقل کیا،

"غناء، دل میں نفاق پیدا کرتا ہے۔"

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1] (اور بعض لوگ کھیل کی باتوں کے خریدار ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بہکا دیں)

فرمایا: "لہوالحدیث سے مراد غناء ہے اور واقعی ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ غناء کا سماع حرام ہے اور گانے والی عورتوں کی مزدوری اور ان کی قیمتیں حرام ہیں۔"

اغانی (گانوں) اور قصائد میں فرق ہے اس لیے کہ گانے وہ ہوتے ہیں جن میں عورتوں کا ذکر کر کے مزیدار بنایا جائے اور اس میں غزل کا بھی ذکر کیا کہ غزل میں عورتوں کے اوصاف بیان کر کے خواہشِ نفسانی کی طرف دعوت و رغبت دی جائے۔ چنانچہ جس نے ان معانی کے اعتبار سے سماع کیا تو اس پر سماع حرام ہے اور قصائد وہ ہیں کہ جن سے اللہ کی یاد آجائے اور اس کی طرف اشتیاق پیدا ہو، ایمان میں پختگی پیدا ہو، علی مشاہدات پر لائے، اخروی راہیں اس کے باعث سامنے آجائیں، مقاماتِ صادقین نظر آنے لگیں۔ جو اس انداز سے سماع کرے وہ اہل سماع میں سے ہے۔ اس لیے کہ اس کو اس سے حصہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ[2] (اور ہم نے ہر چیز سے جوڑے پیدا کیے شاید تم دھیان کرو)

چنانچہ کلام کی دو اقسام ہیں:

۱۔ نثر

۲۔ نظم

نثر کلام عوام کا ہے اور منظوم کلام شعراء کا ہے۔ اور جس کے باعث اللہ یاد آجائے اور اس کی وجہ سے ذکر اللہ ہو

---

[1] لقمان ۶۔

[2] الذریت ۵۰۔

تو ایسا کلام اس کی جانب ایک طریق ہے اور حضرت عطاء بن ابی رباح سے لے کر آج کے دن تک سال کے افضل ترین ایام میں یعنی ایام تشریق میں اہل حجاز سماع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انہی ایام میں عبادت و ذکر کا حکم دیا اور کسی عالم نے اس کا انکار نہیں کیا۔

حضرت عطاء کی دو لونڈیاں تھیں۔ ان کے بھائی سنتے اور سماع میں ان کا ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ جو سماع کرے اور اس پر نفسانی صفات کا غلبہ ظاہر ہو، دنیاوی مزے یاد آئیں تو ایسے آدمی پر سماع حرام ہے اور جس نے سماع کیا اور اس کی وجہ سے اسے اللہ کی جانب شوق وانابت پیدا ہو جائے اور اولیاء اللہ کا محب بنائے اس کے لیے یہ ایک ذکر کی صورت ہے۔ اس کے لیے یہ بات دراصل ذکر کی صورت ہے۔

ہمارے ایک عالمؒ سے پوچھا گیا،

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ نے سماع کا انکار کیا اور حضرت جنیدؒ، سری سقطیؒ اور ذوالنونؒ سماع کرتے تھے

فرمایا،

" میں سماع کا انکار کیونکر کر سکتا ہوں جبکہ عبداللہ بن جعفر طیار یعنی ابن ابی طالب نے سماع کیا۔ البتہ میں سماع میں لہو و لعب کا انکار کرتا ہوں اور قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ شیوخ سماع کرتے تھے۔ البتہ ان میں سے بعض علانیہ کی بجائے مخفی طور پر سماع کرتے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ جو اپنے اتباع و اصحاب کی بجائے اپنے اقران و امثال کے ہمراہ سماع کرتے اور فرمایا کرتے،

" ایک پختہ منزل عارفؒ کے لیے سماع درست ہے اور مبتدی سالک کے لیے سماع کرنا ٹھیک نہیں۔"

ایک عالمؒ نے سماع چھوڑ دیا ان سے کہا گیا،

" سماع کیجئے۔"

فرمایا، " کس سے ؟"

عرض کیا گیا، " تو آپ بھی معترض ہیں۔"

فرمایا، " ان کے ہمراہ جو صرف اہل سے اور اہل کے ساتھ سنتے ہیں۔"

حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے مروی ہے۔ فرمایا،

" تین چیزیں مفقود ہو گئیں حالانکہ

۱۔ عفت کے ساتھ ساتھ حسین چہرہ۔

۲۔ دیانت کے ساتھ ساتھ حسنِ کلام۔

۳۔ وفا کے ساتھ حسنِ اخوت۔

حضرت عبداللہ بن جعفر کے سوا ... کیا۔ حضرت ابن زبیر اور مغیرہ بن شعبہ انہی میں داخل ہیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رح سے منقول ہے۔ فرمایا:

"ایک رات کو میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ اس رات کو تاریکی، بارش اور کڑک شباب پرتھی۔ مطاف خالی تھا۔ جب میں طواف کرتے کرتے دروازے تک پہنچا تو دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اعْصِمْنِیْ حَتّٰی لَا اُعْصِیَکَ اَبَدًا۔ (اے اللہ مجھے ایسی عصمت عطا فرما کہ میں کبھی بھی تیری نافرمانی نہ کروں)

بتاتے ہیں کہ میں نے بیت اللہ کے وسط سے کسی قائل کی آواز سنی:

"اے ابراہیم! تو مجھ سے دعا کرتا ہے کہ تجھے عصمت عطا کروں۔ ہر بندہ مجھ سے عصمت مانگتا ہے۔ جب میں انہیں عصمت دوں گا تو کس پر اپنا فضل کروں گا اور کس کو بخشوں گا؟"

حضرت وہب بن منبہ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

"تو کثرت سے مجھ سے دعائیں کرتا رہتا ہے مگر یہ نہیں مانگتا کہ میں تجھے شوق عطا کروں۔"

عرض کیا: "اے پروردگار! شوق کیا ہے؟"

فرمایا: "میں نے اہل شوق کے قلوب اپنی رضا سے پیدا کیے اور اپنے نورِ وجہ مبارک سے اسے مکمل کیا۔ زمین کی جانب میری نظر فرمانے کے مقام پر ان کے اسرار کیے اور ان کے قلوب میں ایسا راہ بنایا کہ وہ اس کے ذریعہ میرے عجائب قدرت دیکھتے ہیں، چنانچہ ہر روز ان میں میرا شوق بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر میں اپنے مکرم ملائکہ کو بلاتا ہوں۔ جب میری طرف آتے ہیں اور میرے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں اور میں کہتا ہوں:

میں نے تمہیں اپنی عبادت کے لیے نہیں بلایا، سر اٹھاؤ۔

مجھے میری عزت اور میرے جلال کی قسم، میرے آسمان ان کے نورِ قلوب سے روشن ہوتے ہیں جیسے کہ اہلِ دنیا کے لیے سورج روشنی دیتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو جو فرمایا کہ:

"تو میرا شوق نہیں مانگتا۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اولیاء کو گاہے ایسا انعام ملتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں ملتا جیسے کہ بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے اور اولیاء کو انبیاء پر فضیلت دینے لگ گئے بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے اس کا ذکر اس لیے فرمایا تاکہ وہ اس کی دعا کریں۔ جب انہیں بتایا تو اپنی طرف مقامِ شوق عطا فرمایا۔ آخر اہل شوق عارفین کے مقامات عبور کیے اور اسے ان کی زبان پر جاری کر کے اس مقام کا شرف واضح کیا اور ان کی

دُعا سے اسے ظاہر کیا تاکہ سُرعتِ اجابت کے باعث اسے شرف و فضل عطا فرمائے جیسے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا قول ہے :

"اور شوق کیا ہے ؟" اس کا یہ مطلب نہیں کہ وُہ شوق سے آگاہ نہ تھے جبکہ انہیں حکمت و نبوت عطا ہُوئی تھی۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہُوئے خاموشی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جہالت کا اعتراف کیا اس لیے کہ وہ علام الغیوب کے پاس تھے اور یہ چاہا کہ حقیقی وصف اسی سے سنیں کیونکہ وہ صادق ترین فرمانے والا ہے اور خوب ترین وصف بتانے والا ہے۔

غیرت کا حال

احوالِ محبین کا عمدہ ترین حال، غیرت کا ہے۔ اس لیے کہ اس نے انہیں اپنی ذات کے مفاہیم پر ظاہر فرمایا اور جب اس سے ان کے قلوب بھرپور ہُوئے تو انہوں نے اس کو دبا رکھا اور اس میں ان کی عقلیں حیران رہ گئیں۔ البتہ یہ خواص اہلِ یقین ہیں اور یہی عوام محبین ہیں اور جب انہیں مقامِ توحید تک رفعت ملی تو وحدانیت کے ساتھ وجود پذیری اور فرد کے ساتھ انفراد کا مشاہدہ انہیں حاصل ہُوا پھر اس نے دیکھا کہ اس کے بغیر کوئی چیز عطا نہیں کرتا اور نہ اس کے سوا کوئی اس مفہوم کا وصف ظاہر کرتا ہے تو غیرت ان کی توحید میں لپٹ گئی۔ جبکہ انہیں یقینِ توحید کی وجہ سے یہ آگاہی حاصل ہُوئی کہ اس کے سوا کسی اس پر نظر نہیں کی اور اس نے صرف اسی کو پہچانا اور اس کے غیب کے حجب میں وُہ ہے اس کے سوا اس پہ کوئی ظاہر نہیں ہوتا۔ اور اس کے ستر سترہ میں ہے۔ صرف اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ ان کے لیے معرفتِ توحید کا مقام، اس پر غیرت کے مقام پر تمام ہُوا۔ جب بات اس وقت حاصل ہوتی ہے کہ جب وُہ موحدین صدیقین کے مقام پر آگاہی و اطلاع پائیں۔

حضرت یحییٰ بن معاذ، ابوتراب نخشبی اور ابو سعید خراز رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی ایک ہی قافیہ پر محب کے اوصاف و ناز کے بارے میں اشعار منقول ہیں اور ان میں معنوی طور پر یکسانیت ہے اور اہلِ محبت سالکین کے اوصاف اختصار اور جامعیت کے ساتھ ذکر کیے۔ ان میں اصحابِ مشاہدہ سالکین کے تقرب و انقطاع کے احوال بتائے گئے۔ حضرت ابوتراب سے یہ اشعار منقول ہیں : ؎

لَا تَخْدَعَنَّ فَلِلْمُحِبِّ دَلَائِلُ ۔۔۔ وَ لَدَيْهِ مِنْ تُحَفِ الْحَبِيْبِ وَ سَائِلُ

مِنْهَا تَنَعُّمُهُ بِمُرِّ بَلَائِهِ ۔۔۔ وَ سُرُوْرُهُ فِیْ کُلِّ مَا هُوَ فَاعِلُ

فَالْمَنْعُ مِنْهُ عَطِيَّةٌ مَقْبُوْلَةٌ ۔۔۔ وَ الْفَقْرُ اِكْرَامٌ وَ لُطْفٌ عَاجِلُ

وَ مِنَ اللَّطَائِفِ اَنْ يُرٰى مِنْ عَزْمِهِ ۔۔۔ طَوْعُ الْحَبِيْبِ وَ اِنْ اَلَحَّ الْعَاذِلُ

وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ يُرٰى مُتَبَسِّمًا ۔۔۔ وَ الْقَلْبُ فِيْهِ مِنَ الْحَبِيْبِ بَلَابِلُ

وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ يُّرٰى مُتَفَهِّمًا — بِكَلَامِ مَنْ يَّحْظٰى لَدَيْهِ السَّائِلُ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ يُّرٰى مُتَقَشِّفًا — مُتَحَفِّظًا مِنْ كُلِّ مَا هُوَ قَائِلُ

(دھوکہ میں نہ رہنا، محبت کے کئی ناز ہیں ۔ اور حبیب کے تحفوں کے اس کے پاس کئی وسائل ہیں)
(ہر ابتلا آنے پر اس سے اس کی نعمت ہے ۔ جو وہ کرتا ہے اس میں اس کی مسرت ہے)
(روک دے تو یہ اس کا مقبول عطیہ ہے ۔ اور فقر دراصل عزت افزائی اور فوری لطف و کرم ہے)
(یہ لطیف بات ہے کہ وہ اطاعتِ حبیب کا عزم کیے رکھتا ہے چاہے ملامت گر ملامت کرتا رہے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ چہرہ تبسم کرتا ہو اور دل میں حبیب کے غم بھرے ہوں)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ وہ سائل کی ہر کلام کو سمجھتا نظر آتا ہے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ وہ ہر قول کو یاد رکھنے والا اور سخت سا ہو)

اور حضرت یحییٰ بن معاذ ؒ سے یہ اشعار مروی ہیں: ؎

وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ تَرَاهُ مُشَمِّرًا — فِیْ خِرْقَتَیْنِ عَلٰی خُطُوْطِ السَّاحِلِ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ حُزْنُهٗ وَ تَحَبُّبُهٗ — جَوْفَ الظَّلَامِ فَمَالَهٗ مِنْ عَاذِلٍ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ تَرَاهُ مُسَافِرًا — نَحْوَ الْجِهَادِ وَ كُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ زُهْدُهٗ فِیْمَا يَرٰى — مِنْ دَارِ ذُلٍّ وَ النَّعِيْمِ الزَّائِلِ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ تَرَاهُ بَاكِيًا — اَنْ قَدْ رَاٰهُ عَلٰى قَبِيْحٍ فَعَائِلٍ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ تَرَاهُ مُسْلِمًا — كُلَّ الْاُمُوْرِ اِلَى الْمَلِيْكِ الْعَادِلِ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ اَنْ تَرَاهُ رَاضِيًا — بِمَلِيْكِهٖ فِیْ كُلِّ حُكْمٍ نَازِلٍ
وَ مِنَ الدَّلَائِلِ ضِحْكُهٗ بَيْنَ الْوَرٰى — وَ الْقَلْبُ مَحْزُوْنٌ كَقَلْبِ الثَّاكِلِ

(یہ بات بھی نازکی ہے کہ اسے دو دو جبّوں میں ساحل کے کناروں پر دیکھے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ رات کے وسط میں اس پر حزن و محبت طاری ہو اور کوئی ملامت گر نہ ہو)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ تو اسے جہاد اور ہر اچھے کام کی طرف جانے والا مسافر دیکھے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ وہ اس دارِ ذلت اور فانی نعمت کو دیکھے تو ان میں زہد کرے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ تو اسے روتا ہوا دیکھے کہ گویا اس نے اپنے کو برے کاموں پر دیکھا ہے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ تو اسے ہر کام ملک عادل تعالیٰ کے سپرد کرتا دیکھے)
(یہ بات بھی نازکی ہے کہ تو اسے ہر نازل ہونے والے حکم میں ملیک تعالیٰ پر راضی دیکھے)

(یہ بات بھی نازکی ہے کہ لوگوں میں ہنستا ہو اور دل ایک مرنے والے بچے پر روتی ہوئی ماں کی طرح رو رہا ہو) اور حضرت ابوسعید خراز سے جو ہم نے روایت کیا۔ وہ ان دونوں مذکورہ میں داخل ہے اور مجھے گمان یہی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوتراب اور یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہما سے ہی اخذ کیا۔ اس لیے کہ وہ دونوں ان سے مقدم ہیں البتہ ان کے اشعار صرف گیارہ ہیں اور یہ تمام مذکورہ علامات و دلالات (ناز) دراصل محبین کے اوصاف ہیں اور اللہ کا ہر محب دراصل اللہ کے اس سے محبت رکھنے سے ہے۔ اس لیے کہ بندے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا پایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی محبت ہے۔ البتہ محبت میں دو مقام ہیں؛

۱۔ مقامِ تعریف

۲۔ مقامِ تعرف

مقامِ تعریف دراصل معرفتِ عوام ہے اور یہ خاص محبت سے پہلے درجہ ہے اور مقامِ تعرف، خواص کی معرفت ہے اور یہ درجہ عوام کی محبت سے بعد کا ہے اور یہ محبت اوّل میں اضافہ کرتی ہے اور یہ خواص کی محبت ہے۔

محبت کے ۲ دو خاص مقام

اور اسی طرح محبت میں دو مقام ہیں۔ ایک مقامِ محب ہے اور اس سے بلند تر مقام مقامِ محبوب ہے۔ یہ ایسے ہی فرق ہے جیسے کہ مرید اور مراد کا فرق ہے اور حقیقت میں دیکھا جائے تو اللہ کا ہر مرید (سالک اور ارادہ کرنے والا) اس کے باعث مراد بھی ہے۔ البتہ انہوں نے "مراد" کے نام کو ایک مخصوص وصف سے متصف بتایا ہے کہ اس کے باعث اس کی پہچان ہو جاتی ہے اور اس وصف کو دیکھ کر مبتدی اور مبادی ہیں، منیب اور مجتبیٰ ہیں، طالب اور مطلوب ہیں، راغب اور مرغوب ہیں، حافظ اور محفوظ میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں اس طرح (حامل اور محمول میں فرق ہے) اور حامل محمول کی طرح نہیں، اور زائر اس کی طرح نہیں جس کی زیارت کی جائے اور اشتیاق، حضور کی طرح نہیں اور نہ ہی محب، محبوب کی طرح ہے۔

ابوموسیٰ دبیلیؒ فرماتے ہیں:

"میں نے شیخ عبدالرحیم کی اخلاص میں بحث کرنے والی کتاب حضرت ابویزید بسطامیؒ کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں انہیں صرف ابو عاصم شامیؒ کا واقعہ شوق ہی خوب خیال کیا۔ یعنی عبدالرحیمؒ نے اپنی کتاب میں اخلاص کا ذکر کیا تو بتایا کہ ابوعاصمؒ سے پوچھا گیا:

"کیا اہلِ شام کا بڑا بزرگ اللہ کا شوق رکھتا ہے؟"

فرمایا: "نہیں"

پوچھا گیا: "کیوں؟"

فرمایا: "وہ غائب کا شوق رکھتا ہے۔ جب غائب، حاضر ہو تو پھر شوق کس کا ہوگا؟"
میں نے کہا:
"شوق ساقط ہو گیا اور یہ مقامِ محبوب ہے۔"

مشاہدہ کے دو مقام

مشاہدہ میں دو مقام ہیں:
۱۔ مقامِ شوق
۲۔ مقامِ انس

چنانچہ مخفی الطاف کے باعث غیب کے پردوں سے مطالعۂ عزت و معائنۂ اوصاف کے باعث قلق و اضطراب کے حال کا نام شوق ہے اور اس میں حزن و انکسار کا مقام ہے اور لطائفِ قدرت کے باعث مکاشفۂ حضور سے قرب کا حال انس کہلاتا ہے اور اس میں سرور و بشارت کا مقام ہے۔

حضرت ضیغم فرماتے ہیں:
"مجھے مخلوق پر تعجب ہے کہ اس نے تیرے بدلے دوسروں کا ارادہ کیوں کیا اور حیرت ہے کہ تیرے سوا کیسے انہیں انس حاصل ہوا؟"

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں:
کمالِ محبت کی علامت یہ ہے کہ قلب میں فرحت و سرور اور شوق و انس کے ساتھ دائمی ذکر اللہ ہو۔ محبتِ نفس پر اسے ترجیح دے اور جو وہ کرے اس پر راضی رہے اور اللہ تعالیٰ سے انس کی علامت یہ ہے کہ خلوت میں مزہ آئے، مناجات میں شیرینی محسوس کرے اور سب سے جدا ہو کر اس کا بن جائے۔ حتیٰ کہ دنیا و مافیہا کو کچھ نہ سمجھے (گویا معدوم جانے) اور اسے مخلوق کے ساتھ انس پر محمول نہ کرے کہ عقلی مراتب پر سلسلہ ہو جائے جیسے کہ محبت کو مخلوق کی محبت پر محمول نہ کرے کہ عقلی مفاہیم کے ساتھ یہ معاملہ ہو کیونکہ یہ انہی کا حال ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سکون و اطمینان ملنے، اس سے حلاوت و استراحت پانے اور جو انہیں وجدان دیا اس سے آرام پانے کا یہ نام ہے اور جس کو انس میں کچھ مقام حاصل نہیں۔ انہی نے اس کا انکار کیا ہے جیسے کہ جس کو محبت میں کچھ معرفت حاصل نہیں اس نے محبت کا انکار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس (منکر) نے اس میں مخلوق کی محبت کا خیال رکھا اور اس کے لیے مخلوق کی صفات کی تمثیل دی اور کہا:
"صرف مخلوق ہی محبت کو پہچان سکتی ہے اور وہی اسے سمجھتی ہے اور یہ صرف خوف و ہیبت کا نام ہے۔"
احمد بن غالب المعروف بہ غلام خلیل کا یہی قول ہے۔ انہوں نے حضرت جنید، ابو سعید اور ثوری رحمہم اللہ کے محبت میں کلام کا انکار کیا۔ حالانکہ نہ یہ سلف کا مذہب ہے اور نہ یہ اہل معرفت کا طریق ہے۔

عامر بن عبداللہ نے اپنے ایک بھائی (سالک) کی طرف لکھا:

"اللہ تعالیٰ تجھے اپنی ذات کے ساتھ انس عطا فرمائے۔"

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ پہاڑ سے اُترے تو کسی نے پُوچھا:

"آپ کہاں سے تشریف لائے؟"

فرمایا: "اللہ کے ساتھ انس سے آیا ہوں۔"

ایک عارفؒ کے اشعار ہیں: ؎

اَلْاُنْسُ بِاللّٰهِ لَا يَحْوِيْهِ بَطَّالٌ وَلَيْسَ يُدْرِكُهُ بِالْحَوْلِ مُحْتَالٌ

وَالْاٰنِسُوْنَ رِجَالٌ كُلُّهُمْ نُجُبٌ وَكُلُّهُمْ صِفْوَةٌ لِلّٰهِ عُمَّالٌ

(اللہ سے انس، باطل آدمی اسے نہیں لے سکتا اور حیلہ کرنے سے بھی یہ حاصل نہیں ہوتا)

(اور انس والے سب شرفاء مرد ہیں اور سب اللہ کے چنے ہوئے عبادت گزار ہیں)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ۔ (جو ایمان لائے اور ان کے قلوب کو اللہ کے ذکر سے اطمینان ہوتا ہے)

فرمایا: "اسی کی طرف پریشان ہو کر جائے اور اسی کے ساتھ مانوس ہو۔ مقامِ انس میں تملق و مناجات ہوتی ہے اور اس کے ساتھ مجالست و محادثت بھی ہوتی ہے اور بسط کا ایک مفہوم بھی اس کے ساتھ حاصل ہوتا ہے اور ناز کی اس نوع کو اللہ تعالیٰ اس میں پسند کرتا ہے جس کو مقامِ انس عطا فرماتا ہے اور صرف اہل انس سے ہی استحسن سمجھتا ہے جیسے کہ مقامِ انس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے:

"اے پروردگار! میرے لیے وُہ ہے جو تیرے لیے نہیں۔"

فرمایا: "وُہ کیا؟"

عرض کیا: "میرے لیے تجھ جیسا (اب) ہے اور تیرے لیے صرف تیری ذات کی مثل ہے (یعنی تو بے مثال ہے)"

فرمایا: "تُو نے سچ کہا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول لِیْ مِثْلُكَ کا مطلب یہ ہے کہ میرے لیے تو ہے جیسے کہ فرمانِ خداوندی ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

مطلب یہ ہے کہ وُہ بے مثال ہے۔ اب اس کی مثل کی مثال کیونکر ہو؟ اس لیے کہ اس کی مثل کی کوئی مثال

نہیں اور عرب لوگ مثل سے مراد ذات شئی لیتے ہیں اور اس سے زیادہ بسط وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کرتے ہوئے عرض کیا :

اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ [1]

(میں نے ان میں سے ایک جی کو قتل کیا ہے۔ سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو قتل کر دیں گے)

اور اس سے بڑھ کر فرمان الٰہی ہے ،

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ۔

تو جواب میں عرض کیا ،

فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ وَ لَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ [2]

(سو پیغام دے ہارون کو اور ان کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ)

اسی طرح فرمان ہے ،

اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ وَ یَضِیْقُ صَدْرِیْ [3]

(میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلاویں اور رک جاتا ہے میرا جی)

یہ احساس اس لیے ہُوا کہ انہیں اللہ نے اپنے سامنے مقام بسط پر کھڑا کیا اور اپنے ساتھ انس عطا کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں اس کا مقام ، مقام محبوب ہے۔ اب اس نے اس کی طرف رہنمائی کی اور اس پر آمادہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دوسرے مقامات پر ایسا کرنا رسول کے سامنے بے ادبی ہے اور جب حضرت یونس علیہ السلام کو مقام خوف و قبض پر رکھا تو ان سے اس بات کا خیال بھی برداشت نہ فرمایا۔ آخر انہیں سمندر میں تین اندھیروں کے اندر مچھلی کے پیٹ میں بند کر دیا گیا اور ان کے بارے میں بتایا کہ ،

لَوْ لَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ [4]

(اور اگر نہ سنبھالتا اس کو احسان تیرے رب کا ، تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر)

ایک قول میں عرا سے مراد قیامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو قول و فعل میں ان کے اتباع سے منع کیا اور فرمایا ،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰی وَ هُوَ مَكْظُوْمٌ [5]

(اب تو ٹھہرا رہ اپنے رب کے حکم کے لیے ، اور مت ہو جیسے کہ مچھلی والا ، جب پکارا اور وہ غصہ میں بھرا تھا)

---

[1] القصص آیت ۳۳ [2] الشعراء آیت ۱۳، ۱۴ [3] الشعراء ۱۲، ۱۳
[4] القلم آیت ۴۹ [5] القلم آیت ۴۸

اور ایک جگہ فرمایا:

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ[1] (ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا اور بعضوں کے درجے بلند کیے)

حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے جب حضرت یوسفؑ کے بارے میں طے کر لیا تو ان کے عزم و سلوک کو بھی برداشت کر لیا اور اس قول کو بھی برداشت کیا کہ:

اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ[2] (مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ اکیلی رہے تم پر توجہ تمہارے باپ کی)

وغیر ذالك ان کے ایسے ایسے کلمات اور افعال کو برداشت کیا اور (گرفت نہ کی) وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا سے لے کر دس آیات کے آخر تک یعنی وَ كَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ تک چالیس سے زیادہ غلطیاں شمار کیں جن میں بعض سخت اور خفیف تھیں اور اگر دقیق استنباط سے کام لیں اور پوشیدہ گناہوں کی پہچان ہو تو گاہے ایک ایک کلمہ میں چار یا پانچ غلطیاں بھی سمجھی جا سکتی ہیں۔ اب چونکہ وہ (برادرانِ یوسفؑ) مقامِ محبت میں سے تھے اس لیے تمام خطائیں معاف کر دیں اور حضرت عزیرؑ کا قدر کے بارے میں ایک سوال بھی برداشت نہ فرمایا۔ حتیٰ کہ ایک قول کے مطابق دیوانِ نبوت سے ان کا نام مٹا دیا گیا۔ ان سب سے بڑھ کر (بنی اسرائیل کے بارے میں) فرمانِ الٰہی ہے:

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ[3] (پھر بنا لیا بچھڑا، نشانیاں پہنچے پیچھے، پھر ہم نے وہ بھی معاف کیا)

اگر معاف کرنے پر آئے تو بڑے بڑے گناہ معاف کر دے اور اس پر کوئی چیز بڑی نہیں اور اگر مضافرہ پر جرح کرے اور مطالبات کرنے لگے تو کوئی ذرّہ اور رائی بھی اس کے مطالبہ سے باہر نہیں اور حقیقت پر غور کریں تو شہنشاہ جبار تعالیٰ کے سامنے گستاخی کوئی چھوٹا جرم نہیں ہوتا۔ دیکھیے ایک آدمی اگر کسی نبی کے سامنے ستر ننگا کرے تو یہ کفر ہے۔ اس لیے کہ اس نے نبوت کے احترام کو روا نہ رکھا۔ اب خدائے عظیم کے سامنے یہ جرم کس قدر سخت ہوگا!

---

[1] البقرہ آیت ۲۵۳

[2] یوسف آیت ۹

[3] النساء آیت ۱۵۴

اگر اس کا فضل و کرم نہ ہو تو معاملہ بگڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ؛

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ۔ (بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

ایک قول یہ ہے کہ جس کے لیے چاہے گا بڑا گناہ بھی بخش دے گا اور جس کے لیے چاہے گا چھوٹے گناہ پر بھی مواخذہ کرے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ ایک جماعت مل کر نافرمانی کرے تو بعضوں کو معاف کر دے اور ان کو معافی دے کر نیکیوں میں بدل دے۔ (تو بھی کر سکتا ہے) اب انہیں یہ گناہ کچھ ضرر نہ دے سکیں بلکہ ان کا انجام باعث مسرت ہو اور بعض کے گناہوں پر گرفت کرے اور انہیں معاف نہ کرے اور گاہے ایسا ہو کہ کوئی عمل ان کے لیے نفع بخش نہ ہو۔ بس بات یہ ہے ؛

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ[1] (اس سے پوچھا نہ جاوے جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے گا)

لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ[2] (اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا)

جب چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے اپنی مخلوق کے بارے میں حکم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی توفیق و قوت نہیں۔

رحمت و گرفت کا عبرتناک منظر

آصف بن برخیا کے لیے اس سے بڑھ کر برداشت فرمایا۔ بتاتے ہیں کہ وہ بہت ہی زیادتی کرنے والا تھا۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہوا اور نہ اس کے گناہ ناقابلِ بیان تھے۔ پھر مولائے کریم نے کرم فرمایا اور ان کو علم و شرف عطا کیا۔ اور اس کے ذریعہ اپنے نبی و خلیفہ کو نصرت عطا کی اور انہیں اپنے نبی کا وزیر بنایا اور اسم اعظم سکھایا تاکہ ایک محب اس کے کرم سے مایوس و ناامید نہ ہو مگر بلعم بن باعورا کو ایک گناہ بھی معاف نہ فرمایا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ بلعم نے دین کے عوض دنیا کمائی اور علم پر خواہش نفس کو لاد دیا۔ آخری گمراہی و ہلاکت میں جا گرا اور اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی مول لی اور آصف کا یہ حال تھا کہ وہ اعضائے ظاہر کے ساتھ اپنے رب تعالیٰ کے سامنے نافرمانیوں میں ملوث تھا اور جب اس نے اللہ کے نشانات کو دیکھا تو حالت بدل لی مگر بلعم نے ایسا نہ کیا۔ عبادات کرنے کی برکت سے آصف کے گناہ دھل گئے۔ اس لیے کہ وہ کامل نیت کے ساتھ گناہوں میں نہ پڑا تھا۔ بتاتے ہیں کہ اسم اعظم کے ساتھ (کرامت) کُنْ بھی عطا فرمائی گئی تھی (کہ کُنْ کہنے پر

---

[1] الانبیاء، آیت ۲۳

[2] الاعراف آیت ۵۴

ایک چیز ہوجائے) ایک قول یہ ہے کہ انہیں اس سے بڑھ کر درجہ حاصل ہُوا۔ پھران آیات سے انہیں جدا کر دیا گیا تو وہ دنیا میں مطمئن ہوا اور مہلکات میں خواہش کی اور سابقہ عبادت و ریاضت کچھ کام نہ آئی۔ یہ سلوک اس لیے کیا کہ کوئی عمل کرنے والا بے خوف نہ رہے اور کوئی عالم اپنے اوپر ہونے والے انعامات پر فخر نہ کرے۔ اور آصف کا حال یہ تھا کہ وُہ کبائر میں مبتلا تھا مگر اللہ نے انہیں ان سے نجات دی اور اپنے انعامات فرمائے اور نشانات عطا کیے اس لیے کہ وُہ مراد تھے اور مقامِ محبوب میں تھے۔ یہ واقعہ حضرت سلیمان نبی اللہ وخلیفۃ اللہ فی الارض علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا۔

بلعم کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ اس کے کئی مقدمات ہیں۔ غرض ایک طویل داستان ہے اور ہر آدمی اس واقعہ سے آگاہ بھی نہیں۔ آصف کی ہدایت کا واقعہ جہاں سے چلتا ہے ہم وہاں سے کلام کرتے ہیں۔ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

" اے عابدین کے سردار کے بیٹے اور اے پسرِ حجۃ الزاہدین تیری خالہ کا بیٹا آصف کب تک نافرمانی کرتا رہے گا اور میں بار بار اس کے بارے میں (درگزر) بردباری سے کام لے رہا ہوں؟ مجھے میری عزت و جلال کی قسم، اگر میں اس پر اپنی نوازشات میں سے ایک نوازش پر ہی مواخذہ کروں تو اسے آج کے لوگوں کیلئے مثال اور آنے والوں کے لیے عبرت بنا دوں "

جب آصف، حضرت سلیمان کے پاس آیا تو انہوں نے اللہ کی وحی کا (مضمون) بتایا۔ وُہ نکلا اور ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ آسمان کی جانب ہاتھ اٹھائے اور کہنے لگا،

" اے میرے معبود، اے میرے مولا، تُو تُو ہے اور میں میں ہوں۔ اگر تو مجھ پر رحمت کے ساتھ نہ لوٹے (توبہ قبول نہ کرے) تو میں کیونکر توبہ کر سکوں گا اور اگر تو مجھے (گناہوں سے) نہ بچائے تو میں کیسے بچ سکوں گا میں ضرور تیری طرح واپس ہوتا ہوں "

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ تُو نے سچ کہا۔ تُو تُو ہے اور میں میں ہوں تو میری طرف لوٹ کر آ (توبہ کر) اور میں نے تیری قبول کرلی اور میں ہی توبہ کرنے والا اور رحم کرنے والا ہُوں۔ یہ کلام دراصل ادلال کی ہے اور اس کے سامنے تملق کرنے اور اسی کی طرف تیزی دکھانے کی ہے۔

اصحابِ اُنس و ادلال محبوبین میں ایک واقعہ برخ اسود کی مناجات کا آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس (برخ) سے کہو کہ وُہ بنی اسرائیل کے لیے بارش کی دُعا کرے۔ اس زمانہ میں سات برس سے قحط سالی کی حالت جاری تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر ہزار (بنی اسرائیل کے افراد) کے ہمراہ مل کر بارش کی دعا کی تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا،

"میں ان کی دعا کیسے قبول کروں جبکہ ان کو گناہوں اور باطنی خبائث نے ڈھانپ رکھا ہے؟ بے یقینی کے ساتھ مجھ کو پکارتے ہیں اور میری تدبیر سے بے خوف ہو چکے ہیں۔ جاؤ، میرے بندوں میں سے ایک بندہ ہے، جس کو برخ کہتے ہیں۔ اس سے کہو کہ وُہ نکل کر (دعا کرے)، میں اس کی دعا قبول کروں گا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی تلاش کی مگر نہ ملا۔ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی راستہ پر جا رہے تھے کہ ایک سیاہ رنگ کا آدمی ملا۔ اس کی پیشانی پر سجدوں کے باعث مٹی کا نشان سجدہ تھا۔ شملہ گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے خداداد نور سے اسے پہچان لیا۔ اسے سلام کہا اور فرمایا:

"تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے عرض کیا:

"میرا نام برخ ہے۔"

فرمایا: "ایک مدت سے ہم تمہاری تلاش میں تھے۔ آؤ اور ہمارے لیے بارش کی دعا کرو۔" چنانچہ وُہ گیا اور اس طرح دعا کی:

"یہ جو ہے وُہ تیرا فعل ہے اور یہ جو ہے وُہ تیرا حلم ہے۔ اب جو تیرے لیے ظاہر ہُوا یہ کیا ہے؟ کیا تیرے پاس بادل کم ہو گئے؟ یا ہواؤں نے تیری اطاعت سے اعراض کر لیا؟ یا جو تیرے پاس تھا وُہ ختم ہو گیا؟ یا گناہگاروں پر تیرا غضب شدید ہو گیا؟ کیا تو گناہگاروں کو پیدا کرنے سے پہلے ہی بخشنے والا نہیں؟ تُو نے رحمت پیدا فرمائی اور مہربانی کا حکم دیا۔ اب جس کا تو حکم کرتا ہے اس کے برخلاف کرتا ہے؟ یا تو ہمیں دکھا رہا ہے کہ تو روکنے والا ہے یا تجھے کھو جانے کا ڈر ہے تو ابھی سزا دے رہا ہے؟"

بتاتے ہیں کہ برخؒ کے دعا کرتے ہی بنی اسرائیل بارش سے بھیگ گئے اور اللہ تعالیٰ نے نصف دن میں پودے اگائے حتیٰ کہ سوار کے برابر جا پہنچے۔"

بتایا کہ اس کے بعد حضرت برخؒ واپس چلے گئے۔ اس واقعہ میں اہل رجاء اور اہل عشق و انس کا بیان ہے اور عابلین اور اطاعت گزاروں کے لیے باعثِ مسرت و طمع معاملہ ہے جیسے کہ ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"حبیب محاسبہ نہیں کرتا اور دشمن شمار میں نہیں لاتا۔"

مروی ہے کہ ایک آدمی گناہوں کی وجہ سے ہلاکت کے دہانے پر کھڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"تو نے میرے سامنے کس قدر گناہ کیے جو میں نے معاف کر دیے اور ان سے کم تر گناہوں کی پاداش میں میں نے کئی اقوام کو ہلاک کر دیا۔"

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ نامِ معصیت میں دو آدمی مشترک ہوتے ہیں مگر اجتباء و عصمت میں دونوں کا فرق

ہو جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام اور ابلیس لعنۃ اللہ علیہ (دونوں پر عصیٰ کا لفظ آیا) مگر حضرت آدم علیہ السلام کو (معاف فرما کر) چن لیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے لیے قولِ ازلی میں ہی اصطفاء و کلمہ حسنیٰ ہو چکا اور ابلیس، اللہ کی رحمت سے مایوس ہو گیا اور سرکشی کی۔ اس کے لیے قولِ سابق میں شقاوت و برائی لکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر عتاب فرمایا کہ ایک بندے سے اعراض کیا اور دُوسرے بندے کی جانب توجہ کی۔

فرمانِ خداوندی ہے:

وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی وَ هُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی [1]

(اور وُہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا اور وُہ ڈرتا ہے۔ سو تو اس سے تغافل کرتا ہے)

اور فرمایا:

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی۔

(وُہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور تجھ پر گناہ نہیں کہ وُہ نہیں سنورتا)

اور دونوں کا رب ایک ہے اور اس طرح ایک گروہ کے پاس بیٹھنے اور اس کی طرف توجہ کرنے کا حکم فرمایا اور دُوسرے گروہ سے اعراض کرنے اور ان کے ساتھ نشست نہ رکھنے کا حکم دیا۔ فرمایا:

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ [2]

(اور جب آویں تیرے پاس ہماری آیات ماننے والے تو کہہ سلام ہے تم پر، لکھی ہے تمہارے رب نے اوپر رحمت کرنی)

وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِیِّ [3]

(اور تھام رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام)

وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ [4]

(اور جب تو دیکھے وہ لوگ کہ بکتے ہیں ہماری آیات میں تو ان سے کنارہ کر، جب تک کہ بکنے لگیں اور کسی بات میں، اور کہیں بھلا دے تجھ کو شیطان تو نہ بیٹھ بعد نصیحت کے بے انصاف قوم کے ساتھ)

---

[1] عبس آیت ۸، ۹، ۱۰
[2] الانعام آیت ۵۴
[3] الکہف آیت ۲۸
[4] الانعام آیت ۶۸

حالانکہ یہ تمام اللہ کے ہی بندے اور مخلوق ہیں۔

دو بندوں کا ایک عجیب فرق محبوب اور محب کے فرق کی مثال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقامات سے معلوم ہو جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا،

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ۔ (اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے)

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ۔ (کیا ہم نے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا،

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھٰرُوْنَ اَخِی[1] (اور دے مجھ کو ایک کام بٹانے والا، میرے گھر کا ہارون میرا بھائی)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا،

وَ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ۔ (اور ہم نے تیرا ذکر بلند کیا)

یعنی شہادت و اعلان میں مجھے ہی قرین سمجھ۔ میں اپنے سوا تیری مدد کسی دوسرے کے سپرد نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ تو میرے اہل سے ہے اور وزیر کا معنی ہے مددگار، یعنی تو میرے اہل سے ہے۔ اس لیے کہ میں نے اپنے ذکر سے تیری مدد فرمائی۔ میں ہی تیرا مددگار و ناصر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا[2] (شاید تجھ کو کھڑا کرے تیرا رب تعریف کے مقام میں)

اس کے مفہوم میں حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے،

" اللہ تعالیٰ آپؐ کو عرش پر بٹھائے گا۔ دنیا میں مشیت الٰہی کے ساتھ عرش مکانِ ربوبیت ہے حالانکہ وہ اپنی قدرت کے باعث اس سے مستغنی ہے اور آخرت میں آپؐ کو عطا فرمائے گا اور آپؐ کو یہ شرف و فضل عطا کر کے بزرگی و جلالتِ شان میں بلند درجہ عطا کرے گا جیسے کہ رسالت میں آپؐ دنیا میں آخر میں مبعوث ہوئے

اور ایک مقام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا،

قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی وَ لَقَدْ (ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ، اور احسان کیا ہم نے

---

[1] طٰہٰ آیت ۲۹، ۳۰

[2] بنی اسرائیل ۷۹

مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى[1] (تجھ پر ایک بار اور)

اس میں تحدید ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی مقامات کے بعد یہ فرمایا ،

وَ قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۔ (اور کہہ! اے پروردگار، میرا علم زیادہ کر)

آپؐ کے لیے کوئی حد نہ رکھی۔ یہ انتہائی مزید انعام ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا ،

رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ[2] (اے رب تو مجھ کو دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں)

یعنی محلِ عبودیت میں دیکھوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا،

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى[3] (بہکی نہیں نگاہ اور حد سے نہیں بڑھی)

فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى[4] (پھر رہ گیا فرق دو کمان کا میانہ یا اس سے بھی نزدیک)

یعنی مکانِ ربوبیت ۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں قرب حاصل کرنے میں فرق ہے۔ ایسے ہی محب اور محبوب کا تقلیب میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ ایک وہ ہے جس نے اپنے مقام میں اپنے نفس کے ہاں جو دیکھا، دُوسرا وُہ ہے جس نے رب تعالیٰ کے ہاں رفعت وعلو میں اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کیا۔ ان دونوں میں کس قدر فرق ہے ؛

ایک وُہ ہے کہ جو شوق کے باعث اس کی جانب تیزی کرتا ہے تاکہ وہ اس سے راضی ہو جائے۔ اور دُوسرا وُہ ہے کہ جس کو شوق کے باعث تیز کیا گیا تاکہ وہ اس پر راضی ہو۔ اس لیے کہ وہ اس پر راضی ہے، ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ ایک وُہ ہے جس نے دیکھا جو دیکھا مگر وہ پختہ نہ رہا بلکہ اس کی تنگ دامنی کے باعث انوارات بہ پڑے اور دوسرا وُہ ہے جس نے دیکھا جو دیکھا ، پھر وُہ پختہ ہو گیا اور انوارات کے لیے اس کا ظرف وسیع ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ محبوب کا حال یہ ہے کہ بہ تمکین میں مقامِ محب سے آگے بڑھ گیا۔ جیسے کہ مکان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلند تر درجہ پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں لامِ ملک داخل کیا اور فرمایا؛

---

[1] طٰہٰ آیت ۳۶، ۳۷

[2] الاعراف آیت ۱۴۳

[3] النجم آیت ۱۷

[4] النجم آیت ۹

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۔ۗ ۱ (اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے)

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۔ۗ ۲ (جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے وہ ہاتھ ملاتے ہیں اللہ سے)

ایک کو اپنے لیے بنایا اور ایک کو شرف وفضل کے طور پر اپنا بدل بتایا ان دونوں میں کس قدر فرق ہے۔

ایک کی مدح اپنے سے جدا کر کے بیان کی اور دوسرے کی مدح اپنے وصف کے ساتھ متصل کر کے بیان کی۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ فصل کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۔ۗ ۳ (اور ڈال دی میں نے تجھ پر محبت اپنی طرف سے، اور تاکہ تو میری آنکھ کے سامنے تیار ہو)

وصل کو بیان کیا اور فرمایا:

لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ۔ۗ ۴ (تاکہ تم لوگ یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور اس کی مدد کرو اور اس کا ادب رکھو)

اسی طرح فرمایا:

وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ۔ۗ ۵ (اور اللہ کا اور اس کے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۔ۗ ۶ (اے موسیٰ! میں نے تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے، اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا، سو لو جو میں نے تجھے دیا اور شاکر رہ)

یعنی میں نے جو تمہیں کلام دیا اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس کے باعث میں نے تجھے لوگوں پر بلند درجہ عطا فرما کر چنا۔ اب اس پر شکر کرو اور نظر کرنا ۔۔۔۔۔۔ تو میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کر دیا۔

حضرت ابن عباس اور کعب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کلام اور رویت باری تعالیٰ کو تقسیم فرما دیا۔ اس خیال کی یوں بھی تائید ہوتی ہے۔

---

۱ طٰہٰ آیت ۴۱ ۲ الفتح آیت ۱۰ ۳ طٰہٰ آیت ۳۹
۴ الفتح آیت ۹ ۵ التوبہ آیت ۶۲
۶ الاعراف آیت ۱۴۴

کہ جس کو کلام عطا کیا وہ اس کے لیے ثابت رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے بارے میں یہی مراد تھا۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے میں ایک ارادہ فرماتا ہے تو اس کو قوت عطا کرتا ہے اور اسے اس میں ثابت قدم رکھتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رویت ثابت کی اور آپؐ کو (دیدار باری تعالیٰ) کی قوت عطا فرمائی۔ اس لیے کہ آپؐ کے بارے میں خدا تعالیٰ کا یہی ارادہ تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مقامِ وصفِ محبوب بیان کیا۔ ان سے پوچھا گیا:

"اپنے اصحاب کے بارے میں کچھ بتائیے؟"

فرمایا، "کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

عرض کیا، "سلمانؓ کے بارے میں۔"

فرمایا، "انہوں نے اوّل و آخر کا علم حاصل کر لیا۔"

عرض کیا، "اور عمارؓ کے بارے میں فرمائیے؟"

فرمایا، "ہڈی کے گودے تک ایمان سے بھرپور ہے۔"

عرض کیا، "حضرت حذیفہؓ؟"

فرمایا، "صاحبِ راز ہیں۔ انہیں منافقین (کو پہچاننے کا) علم عطا کیا گیا۔"

عرض کیا، "اپنے بارے میں بتلائیے؟"

فرمایا، "خاص کر کے میرے بارے میں دریافت کر رہے ہو؟ میں ایسے ہی تھا۔ جب تو نے پوچھا تو مجھے عطا ہوا اور جب تو خاموش ہوا تو میری ابتدا ہوئی۔ یہ مقامِ محبوب ہے۔ اس لیے کہ جب پوچھا تو اس نے سُنا، پھر اس کی دعا قبول کی گئی اور جب خاموش رہا تو اس کی طرف نظر کی اور اس پر رحم و کرم فرمایا۔"

حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ فرمایا،

"جس نے اس سے محبت کی جس کو نہیں پہچانتا۔ وہ اپنے آپ کے ساتھ تمسخر کر رہا ہے۔" یعنی جو آدمی اپنے محبوب کی صفات و اخلاق اور اس کے افعال و احکام سے آگاہ نہیں کہ خبر ہونے کے بعد محبت کرتا اور اس کی رضا کے کاموں میں تیزی دکھاتا اور اس کی ناپسند سے دُور رہتا، ایسا آدمی اپنے آپ سے ہی تمسخر کر رہا ہے۔ اس میں محبین اور عارفین کی کچھ حد و حقیقت نہیں۔ اس لیے کہ افعالِ محبوب کی تقلیب کے باعث وہ محبت بدل جانے سے بے خوف نہیں رہ سکتا اور یہ بھی خطرہ ہے کہ حبیب تعالیٰ کی جانب سے آزمائش اور اختلافِ احکام ہو تو اس کی محبت میں تغیر آ جائے گویا وہ اپنے آپ کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔

اور حقیقی محبت نہیں رکھتا۔ جاہل اہل محبت اس مقام پر محبوب تعالیٰ کے بارے میں بعض اوقات شدید فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اخفائے محبت محبوب تعالیٰ کے جلال و ہیبت اور عزت و عظمت کے باعث محبت کو پوشیدہ رکھنا بھی محبت کی علامت ہے۔ خواص اہلِ خرد محبین کا یہ طریق ہے اور اہل صفاء کے نزدیک یہ وفا کی علامت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت دراصل قلوب کی گہرائیوں میں محبوب کا راز ہے۔ اس کو ظاہر کرنا ایک طرح کی خیانت ہے اور ایسا کرنا ادب و حیا سے محرومی کی علامت ہے کیونکہ اظہار میں تشہیر کا پہلو ہے۔ اس لیے ایسا کرنے میں دعویٰ اور تکبر بھی پایا جاتا ہے۔

ایک عارفؒ کا فرمان ہے،

"سب لوگوں سے اللہ سے زیادہ دور وہ ہے جو اس کی طرف زیادہ اشارہ کرے"۔ یعنی ہر بات میں اس کی طرف اشارات کرے اور ہر ایک کے سامنے تصنع کرتا پھرے۔ گویا بڑا متقی ہے۔ محبین الٰہی اور علمائے ربانیین کے نزدیک اس پر خدا کی ناراضگی ہے۔"

حضرت ذوالنون مصریؒ اپنے ایک دوست کے پاس گئے جو محبت کا ذکر کیا کرتا ہے اور ایک ناقابلِ بیان ابتلاء میں اُسے دیکھا۔ حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا،

"جو آدمی تکلیف کا درد پائے (محسوس کرے) اس نے اس کے ساتھ محبت نہیں کی۔"

اس آدمی نے کہا:

"مگر میں یہ کہتا ہوں کہ جس نے اس کی تکلیف پر مزہ نہیں لیا اس نے محبت نہیں کی۔

حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا:

"مگر میں کہتا ہوں کہ جو اپنے آپ کی محبت کی تشہیر کرے وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔"

آدمی سمجھ گیا اور کہا:

"میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں اور واقعہ بھی ایسے ہی ہے جیسے حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا۔" محبت کی اخلاص کی علامت (عدمِ تشہیر) ہے۔ اس لیے کہ یہ قلبی اعمال سے ہے۔ چنانچہ خوف و خطرہ کا اظہار کرتے رہنے سے اس نعمت کے سلب ہو جانے کا ڈر ہے مکر و استدراج کا خوف بتاتے رہنا، اس کے موجود ہونے کی علامت ہے۔ نفس سے اس کو دور کرنے، ابنائے جنس سے اس کو مخفی رکھنا اور ان باتوں کو ظاہر نہ کرتے پھرنا اس بات کی علامت ہے کہ ان (نفسانی امور) پر ظفریاب ہو چکا۔ اس لیے کہ محبوب تعالیٰ غیور ہے اور عام لوگ ابنائے جنس پر جس قدر تمام محبین پر غیرت کھاتے ہیں۔ حبیب تعالیٰ اپنے آپ پر

اور ظہورِ محبت پر زیادہ غیور ہے۔ بمقابلہ ان کے جو دوسرے لوگ غیر ابنائے جنس پر کرتے ہیں اور در اصل یہ ایک کلام صحو ہے۔ اور جو آدمی اپنے حال اور وجد میں مست ہو تو وہ مغلوب ہے اور مغلوب آدمی معذور ہے۔

ایک آدمی نے ایک محب میں کوئی ایسی چیز دیکھی جسے غلط جانا۔ اس نے ابو محفوظؒ سے پوچھا تو انہوں نے اچھی بات بتائی اور تبسم فرماتے ہوئے کہا:

" بھائی اس کے کئی محب ہیں، چھوٹے بڑے، دیوانے اور اہلِ عقل۔ جس کو تُو نے دیکھا ہے، وہ دیوانوں میں سے ہے۔"

اخفائے ابتلاء حبیب تعالیٰ کے ابتلاء پر راضی رہنا اور اس کے بعد پوشیدہ رکھنا بھی محبت کی علامت ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کے نزدیک راز اور حسنِ ادب ہے۔

حضرت سہلؒ کو ایک تکلیف ہو گئی۔ اس مرض کا لوگ علاج کرایا کرتے ہیں مگر حضرت سہلؒ نے علاج نہ کرایا۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

حبیبؐ کی ضرب، درد نہیں کرتی۔" اور اس وقت وُہ فرمایا۔ تکالیف و امراض کی حالت، محبت تیز ہونا اور ابتلاء آنے پر محبت بڑھنا، علامتِ محبت ہے۔ اس لیے کہ یہ مولائے کریم کا لطف ہے اور اس میں محبوب کریم کا قرب ہے اور ہر ابتلاء آنے پر تکلیف کا احساس کم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قلب پر محبت کا غلبہ ہے۔

ایک محب کا فرمان ہے:

" جب مجھے بخار ہوتا ہے اس وقت میرا ذکر الٰہی خالص ہوتا ہے۔"

ایک محب کے پاس کسی ایسے آدمی کا ذکر ہوا، جو محبت کی طرف نسبت کر رہا تھا تو محب نے اس سے پوچھا:

" جس کی محبت کا ذکر کرتے ہو اس کے علاوہ کا بھی کبھی ارادہ کیا؟"

اس نے کہا: " ہاں۔"

فرمایا: " کیا تو نے ایک رات میں دو یا تین بار کبھی دیدار کیا؟"

کہا: " نہیں۔"

فرمایا: " مجھے حیا محسوس ہوتی ہے ورنہ تجھے بتایا کہ تیری محبت ناقص ہے۔ تو حبیب تعالیٰ کے سوا کا بھی اہتمام کرتا ہے اور اس کا دیدار بھی تجھے نصیب نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: مگر میں اس کی محبت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اس کے باوجود کبھی اس کے غیر کا اہتمام (قصد) نہیں کیا۔ جب سے اس کو پہچانا اور بسا اوقات

ایک شب میں سات سات بار بھی دیدار حاصل ہوا۔

رویت باری تعالیٰ وکرامت

ابراہیم بن ادھمؒ کے درجہ کے ایک محب کا ذکر ہے۔ انہوں نے علم طریق اور وصفِ حال کے بارے میں کلام کیا ہے اور ایک طویل واقعہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

"میں نے ایک صد و بیس بار اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا اور ستر مسائل دریافت کیے۔ ان میں سے مَیں نے چار ظاہر کیے تو لوگوں نے ان کا انکار کیا اور باقی چھپا دیے کہ محب کا ایک وصف یہ ہے کہ محبوب تعالیٰ کے وصف کے بارے میں اسے کفایت وغنا ہے اور ہمارے لیے ناممکن ہے کہ محبوب کا وصف بیان کرسکیں۔ اس لیے کہ اس کا حال بیان سے بالاتر ہے اور جو بندہ محبوب تعالیٰ سے دیکھے سنے اور محبوب سے ہی پکڑے اور سمجھے۔ اس کا وصف کیسے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہی اس کا سمع و بصر اور قلب و ید مویدبن جاتا ہے۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے،

"جب میں اس سے محبت کرتا ہوں کہ اس کا سمع (کان) بن جاتا ہوں۔ جس سے سنتا ہے اور اس کا بصر (آنکھ) بن جاتا ہوں۔ جس سے دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس کے سامنے پکڑتا ہے اور اس کا قلب بن جاتا ہوں۔ جس کے ساتھ سمجھتا ہے۔ اگر مجھ سے مانگے تو عطا کرتا ہوں اور اگر خاموش رہے تو اس کے لیے ذخیرہ کرتا ہوں۔ اگر اس کا نور زمین والوں پر تقسیم کر دیا جائے تو ان کے لیے بہت کافی ہو۔" یہ سب مدارج مقامِ محبوب میں ہیں۔

مشائخ بتاتے ہیں کہ یہ آیات وقدر دراصل رازہائے غیبیہ اور رموزِ خفیہ میں سے ہیں۔ عوام ان کو معجزات و آیات کا نام دیتے ہیں اور یہ اللہ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کی ودیعت شدہ آیات ہیں۔ اس کے بندوں میں اس کی قدرتِ جاریہ ہے۔ اس کی سلطنت میں یہ اس کی عنایات ہیں۔ جب بندوں کو مقامِ محبوب سے مقامِ انس عطا ہو تو ان کے لیے انہیں کھولنا اور ان پر نظر کرنے کا حکم ہے۔ جبکہ وہ مقامِ محبوب سے مقامِ انس میں کھڑے کیے گئے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ باتیں سترھویں (۱۷ویں) مقامِ معرفت میں پائی جاتی ہیں۔ جب بندے کو اس سترھویں مقامِ معرفت تک رسائی حاصل ہوتی ہے تو یہ ظاہر ہوجاتی ہیں اور اس سے اوپر عارفین کے مقامات میں سے تراسی (۸۳) مقامِ معرفت ہیں جو اس سے افضل ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ صدیقین سے ابدال مرسلین کو نہیں بلکہ صالحین سے ابدال انبیا کو ملتے ہیں۔ چنانچہ ابدال انبیاء علیہم السلام پر ابدال مرسلین صلوٰت اللہ علیہم وسلامہٗ کو ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی انبیاء علیہم السلام پر مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہے اور جیسی کہ صدیقین کو ان کے علاوہ ان سے کم درجہ والوں پر فضیلت حاصل ہے۔

اور یہ ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عالمؒ کا فرمان ہے کہ میں نے یہی دیکھا کہ کرامات ہمیشہ سادہ لوح صادقین کے ہاتھوں پر ظاہر ہوئیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میری امت سے جنت میں جانے والے زیادہ تر لوگ سادہ لوح ہیں اور بلند درجہ پر اصحابِ خرد ہیں۔" چنانچہ اصحابِ خرد (اولوالالباب) کو خطاب کی مراجعت حاصل ہے وہ اس پر گواہ ہیں اور کتاب کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ جیسے کہ فرمایا:

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ[1] (اس واسطے کہ نگہبان ٹھہرائے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس پر گواہ تھے)

اور عوام یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اعلیٰ ترین مقامِ معرفت ہے۔ چنانچہ یہ تمام اسرارِ غیبی دراصل حجابات ہیں جو اسے چھپاتے ہیں۔ اس پر صرف مطلوب ہی ظاہر ہوتا ہے اور نفس سے مطلوب چھن چکا۔ اب جس پر کچھ بھی نفسانیت باقی رہ گیا اس نے اپنے نفس کی حرکت وسکون کی جانب مخفی طور پر بھی نظر کی تو یہ اس کے لیے رحمت کے طور پر اس پر حجاب بن گیا۔ اس لیے کہ اگر حجاب ہٹا دیا جائے گا تو وہ حیرت ہوئی میں ہلاک ہو جائے گا اور بحرِ دنیا میں ڈوب کر رہ جائے گا اور اس کی نفسِ محبت اور نظرِ طلب اس پر حجاب ہے۔ حتیٰ کہ جس طرح وہ معصیت میں ظہورِ خلق کو ناپسند کرتا ہے اس طرح وہ اس حجاب کے ہٹ جانے کو ناپسند کرتا ہے اور اس کے غلبہ کے باعث جس طرح وہ ہلاکت سے خائف ہے اس طرح وہ اس سے ڈرے گا اور جب باقی تعالیٰ کے ساتھ باقی اور حی تعالیٰ کے ساتھ زندہ ہوگا تو کسی طلب ونظر اور سبب وفکر کے بغیر ہی اس سے اعراض کرے گا۔ اب اس کے سامنے غیبی خزانے کھلیں گے اور اللہ جو چاہے کرتا ہے۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں جن پر مشاہدہ کا کشف ہوا۔

"میں پوری قوتِ جسمانی اور طاقت خرچ کر کے تیس سال تک قلب واعضا کے اعمال کیے۔ آخر مجھے گمان ہوا کہ اللہ کے ہاں میرے لیے بھی کچھ (درجہ) ہے۔" چنانچہ اپنے طویل واقعہ میں آسمانی مکاشفات بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا:

"آخر میں ملائکہ کی ایک بڑی جماعت میں پہنچا جو اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے برابر تھی (یعنی بڑی جماعت تھی)"

میں نے پوچھا:

"تم کیا ہو؟"

---

[1] سورۃ مائدہ آیت ۴۷

کہا؛" ہم اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ ہم تین لاکھ برس سے یہیں پر اللہ کی عبادت کر رہے ہیں اور ہمارے قلوب میں اللہ کے سوا کبھی خیال تک نہیں آیا اور نہ ہی ہم نے اس کے سوا کسی دُوسرے کو یاد کیا ہے۔"
بتاتے ہیں کہ مجھے اپنے اعمال سے ندامت ہُوئی اور میں نے تمام اعمال ان لوگوں کو بخش دیئے کہ جن پر سزا کا حکم سُنایا گیا ہے تاکہ ان کے دوزخ کے عذاب میں تخفیف ہوجائے۔

محبت، حقیقتِ ذات کے نور سے ہے

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:
" مقامِ محبت کے سوا میں ہر مقام کی تعبیر و توضیح کرسکتا ہوں۔"
پُوچھا گیا: "یہ کیوں؟"
فرمایا:" اس لیے کہ چیز کی تعبیر اس سے لطیف تر سے کی جاتی ہے اور محبت سے لطیف تر کوئی چیز نہیں۔"
حضرت معروفؒ سے پوچھا گیا:
" ہمیں بتائیے، محبت کیا چیز ہوتی ہے؟"
فرمایا:" بھائی، محبت ایسی چیز نہیں کہ لوگوں کی تعلیم سے آجائے۔ بلکہ محبت تو حبیب تعالیٰ کی تعلیم سے آتی ہے۔"

حاذق علماء کا طریقہ یہ ہے کہ وُہ چار مقامات کے حقائق نہیں بتاتے۔ یعنی

۱۔ حقیقتِ زہد
۲۔ حقیقتِ معرفت
۳۔ حقیقتِ محبت اور
۴۔ حقیقتِ اخلاص کے بارے میں عام طور پر خاموش رہتے ہیں۔

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:
"تمام مقامات، انوار افعال وصفات سے ہیں سوائے محبت کے، اور محبت، حقیقتِ ذات کے نور سے ہے۔ اس وجہ سے اس کا وصف و علم کم ہی ملتا ہے اور جان جوکھوں کا کام ہے اور بہت کم ایمان والے ایسے ہیں کہ جنہیں یہ عطا ہو۔ معرفت کی طرح یہ ایک راز ہے۔ جب محبوب ظاہر ہوگا تو تُو اس سے محبت کرے گا جیسے کہ معروف کو دیکھے گا تو پہچان لے گا اور یہ اس کے ساتھ متعلق ہے اور یہ ظاہرِ معرفت کے باعث ظاہر ہے اور باطنِ محبت کے باعث اور وصفِ باطن کی معرفت کے باعث محبت باطنی چیز ہے۔
جو آدمی محبتِ الٰہی کا مقام پالے اسے دوسرے مقامات کی کچھ کمی بھی نقصان دہ نہیں ہوسکتی اور جو

محبت نہ پاسکے وُہ کچھ حاصل کرنے پر خوش نہ ہوتا پھرے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ (اور جو اللہ پر توکل کرے وُہ اسے کافی ہے)

اس کی وضاحت میں بتایا گیا کہ توکل کی طرف راجع ہے۔ چنانچہ تمام مقامات سے توکل ہی اس کے لیے کافی ہے اور توکل دراصل مقامِ محبت کا ایک حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ[۱] (اور رضامندی اللہ کی سب سے بڑی)

اور رضا بھی محبت کا ایک مقام ہے۔ چنانچہ محبت ایسا بلند شان مقام ہے کہ جو توصیف و بیان اور عقل و معرفت سے بالاتر ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ علم باللہ تعالیٰ کی ہی ہو۔ اس طرح جس قلب کا محبوب اللہ تعالیٰ ہو اس سے بڑھ کر بلند پایہ کوئی قلب نہیں اور اس کے معلوم میں زیادہ اعلم اللہ ہی ہے۔

بتاتے ہیں کہ قلب میں ایک حبہ ہے وہی اس کا باطن ہے۔ اس سے محبت چسپاں ہوتی ہے اور اس سے محبت کا نام ملتا ہے اور اس کا اشتقاق حبۃ القلب سے ہے اور اس کو سویدا قلب کہا جاتا ہے اور اسماء میں میم (مثلاً حبۃ کو محبۃ کہنا) دراصل وصف میں مبالغہ کے لیے ہوتا ہے۔ اس سے فرمانِ الٰہی ہے:

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا۔

اس میں انتہائی محبت کا وصف بتایا یعنی محبت نے اس کا شغافِ قلب پھاڑ دیا اور حبۃ القلب تک اثر پہنچ گیا اور خرق الشغاف کا معنی ہے دل کا پردہ پھاڑ دیا اور حبًّا منصوب ہے گویا یُوں کہا:

قَدْ شَغَفَهَا يعنى خَرَقَ شَغَفَهَا۔ (اس کا پردۂ قلب پھاڑ دیا)

پوچھا گیا: "یہ کیا بات ہے؟"

فرمایا:

حُبًّا۔ (محبت کی وجہ سے)

چنانچہ جب محبت بندے کے اس مقام تک پہنچے تو محب کو اپنے اُوپر اختیار نہیں رہتا اور ہمیشہ یہی انداز نہیں ہوتا جیسے کہ ہم نے ذکر کیا۔ گاہے بے قراری و اضطرابِ شدید کی صورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان تعریف و اذکار میں عقل کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ عرب کہا کرتے ہیں:

قد دمغه واراسه وفاده ورکبنه۔

---

[۱] التوبہ آیت ۷۲

اسی طرح عربوں کا یہ قول ہے کہ :

اَشْغُفَہٗ - یعنی حب اس کے پردۂ قلب پر اثر ہو جائے اور پردۂ قلب پھاڑ دے۔ شغاف عین کے ساتھ بھی آتا ہے اور معنی یہ ہے۔ قد شغفھا یعنی قلب کے اوپر تک اور انتہا تک جا پہنچا۔ اس لیے کہ ہر چیز کا اوپر کا اور آخری دور کا مقام شغف کہلاتا ہے۔

مطلب یہ ہُوا کہ محبت اسے آخر تک لے گئی۔ اب وہ اسیرِ محبت ہے اور اس پر غلبۂ حبیب ہے۔ اب وہ اس کا قیدی ہے۔ حبیب تعالیٰ ہی اس پر حکم فرماتا ہے۔ یہ اس سے نہیں بڑھتا۔ اس نے ہر چیز سے قلب خالی کر کے صرف اس کی محبت سے بھر لیا۔ اب یہ بندہ جھوٹ پر قادر نہ رہا۔ اس لیے کہ غلبۂ محبت کا تسلط پختہ ہو گیا۔ اب اس کا پردہ کھولا جاتا ہے۔ اور اس کا وصف الحب بالحب سے ہوتا ہے اور وہ خوفِ محب کی وجہ سے خاموش رہتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جس سے محبت کرے اور وہ ظاہر ہے اور یہ بات مقام شکر اور حالِ شکر میں ہوتی ہے۔

جو اس مقام سے آگاہ نہ ہوگا وہ اس کا انکار کرے گا اور وہی اس کا اقرار کرے گا جس کے قلوب کو اس کی تاپید سے ربط و بندھن حاصل ہو اور قوت و تمکنت کے باعث وہ راز کی حفاظت کرے۔ فرمایا :

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فَارِغًا اِنْ کَادَتْ لَتُبْدِیْ بِہٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِھَا لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ[1]

(اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔ نزدیک ہُوئی کہ ظاہر کر دے بے قراری کو، اگر ہم نے گرہ نہ کر دی ہوتی اس کے دل پر، اس واسطے کہ رہے ایمان والوں سے)

یعنی تاکہ تصدیق کرنے والوں سے ہو جائے اور ہم اس کا بیٹا اسے واپس کریں گے اور یہ نہیں بتائیں گے کہ یہ اس کا بیٹا ہے تاکہ قتل نہ ہو جائے۔ اور اسی طرح اصحاب کہف پر لطف فرمایا۔ ان کے قلوب پر ایمانی محبت غالب آئی۔ فرمایا :

اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[2]

(جب کھڑے ہُوئے، پھر بولے ہمارا رب ہے آسمان و زمین کا)

انہیں خطرہ تھا کہ ایمان ظاہر کر دیا تو قتل ہو جائیں گے تو ایسا انداز اختیار کیا۔ یہ لطائف حکیم تعالےٰ ہیں،

---

[1] القصص آیت ۱۰

[2] الکہف آیت ۱۴

اور علیم کریم کی مخفی صنعت ہے۔ چنانچہ محبین کا یہ طریق ہے کہ وہ غیب و مخفی کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کے ساتھ حفاظت کرتے ہیں۔

حضرت سمنونؒ نے ایک فقیر سے کہا۔ طویل واقعہ ہے۔ فرمایا:

(محب آدمی) "اس کی محبت اور ذکرِ محبت سے فرحت حاصل کرنا ہے"۔

اللہ اور مخلوق کی محبت کا فرق

محبین کا وصف بتاتے ہوئے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ انہیں مقامِ محبت پر رکھا گیا۔ اب ان کے قلوب میں سارے ملک کی قیمت ایک دانے کے برابر بھی نہیں۔ چنانچہ اللہ کی محبت میں غیر اللہ کی محبت بھی رکھنا اہل محبت کے نزدیک شرک ہے اور بعض کے نزدیک خیانت ہے اور یہ بدعہدی ہے اور قلتِ وفا کی علامت ہے۔

حضرت سہلؒ فرماتے ہیں:

"جس نے درہم سے محبت کی وہ آخرت سے محبت نہیں کرتا اور جس نے روٹی سے محبت کی وہ اللہ عزوجل سے محبت نہیں کرتا۔ البتہ باپ اور بیٹے کی محبت اہلِ محبت کو محبین سے باہر نہیں نکالتی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں اس محبت کا ایک حصہ ڈال دیا۔ اسی طرح بیوی کی محبت بھی اہل محبت سے نہیں نکالتی۔ یعنی بیوی پر رحم و کرم کرنا اور شفقت سے پیش آنا کچھ مضر نہیں۔ اس کے علاوہ دنیاوی حاجات اور مصالح کی محبت بھی مضر نہیں، جن کی ضرورت ہوتی ہے اور جن کے بغیر چارہ کار نہیں اور یہ درحاصل جائے محبت الٰہی میں نہیں ہوتیں بلکہ ان اشیاء کا محل عقل ہے۔ میرے نزدیک اللہ کی محبت اور مخلوق کی محبت کے درمیان یہ فرق ہے۔ البتہ سلف میں سے بعض اہل محبت کے نزدیک ایسی محبت بھی انسان کو محبین سے خارج کر دیتی ہے اور اگر ان اشیاء کو خدا تعالیٰ کی مرضیات پر ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی بجائے خواہشات میں ڈوب کر رہ گیا تو یہ طریقہ اسے تمام مشائخ کے نزدیک اگر وہ غیر اللہ سے خوش ہوا اور غیر اللہ کی طرف سکون ملا تو بھی وہ حقیقتِ محبت سے خارج ہو جائے گا۔ اور اگر غیر اللہ چھن جانے پر اسے افسوس ہوا تو بھی وہ حقیقی محبت سے محروم ہے۔

محبین کی عجیب کرامات

ابدال میں سے ایک عارفؒ سے پوچھا گیا:

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ اللہ سے محبت کرتے ہیں؟"

فرمایا: "میں محب نہیں۔ محب معتوب ہوتا ہے بلکہ میں محبوب ہوں"۔

ان سے پوچھا گیا:

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ سات میں سے ایک ہیں؟"

فرمایا: "میں سب سات ہوں۔" اور فرمایا: "یہ یوں ہے کہ جب تم نے مجھے دیکھا تو گویا چالیس ابدال کو دیکھا۔"

پوچھا گیا: "وہ کیسے، آپ تو ایک شخص ہیں؟"

فرمایا: "اس لیے کہ میں نے چالیس ابدال کو دیکھا ہے اور ہر بدل کے اخلاق سے حصّہ لیا۔"

پوچھا گیا: "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ نے حضرت خضرؑ کو دیکھا ہے۔" وہ مسکرا دیے اور فرمایا:
اس پر تعجب نہیں جس نے خضرؑ کو دیکھا بلکہ اس پر تعجب ہے جو خضر کو دیکھنا چاہتا ہے مگر وہ مستور ہو جاتا ہے اور یہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔ قسم ہے جو اللہ کے پاس ہو۔ اسے نہ کوئی بشر دیکھتا ہے اور نہ فرشتہ دیکھتا ہے۔

منقول ہے کہ حجاج کے ڈر سے حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ حبیب عجمیؒ کے پاس چھپ گئے۔ پولیس کا آدمی اندر آنے لگا تو یہ گھبرائے اور دیوار پھاند کر بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت حبیبؒ نے فرمایا:

"اے ابو محمد، بیٹھ جاؤ، دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے؟"

بتاتے ہیں کہ سپاہی اندر آئے تو پوچھا:

"حسن کہاں ہے؟ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ تمہارے ہاں ہے۔"

انھوں نے فرمایا:

"یہاں کچھ نظر آتا ہے؟" پولیس نے تمام گھر کی تلاشی لی اور کچھ نہ دیکھا آخر نکل گئے۔

حضرت حسنؒ نے کہا:

"انھوں نے مجھے کیوں نہیں دیکھا؟"

فرمایا: "تم اللہ تعالیٰ کے پاس تھے اس لیے وہ تجھے نہ دیکھ سکے اور اگر تم میرے پاس ہوتے تو تجھے ضرور دیکھ لیتے۔"

حضرت حسنؒ نے کہا:

"جب پولیس داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ آپ کچھ پڑھ رہے ہیں کیا آپ نے اللہ کا اسم اعظم پڑھا؟"

فرمایا: "نہیں بلکہ میں نے یہ کہا تھا: اے اللہ! اسے اپنے پاس کر لو، حتیٰ کہ وہ اسے نہ دیکھ سکیں۔"

اور یہ اصحابِ حسنؒ میں سے ایک تھے اور حضرت حسنؒ کے درجات ان سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

حضرت ابو یزیدؒ سے پوچھا گیا:

"آپ کوہِ قاف پر گئے؟"

فرمایا: "کوہِ قاف تو کوہِ کاف، کوہِ عین اور کوہِ صاد سب سے معمولی ہے۔"

پُوچھا گیا "یہ کیا چیزیں ہیں؟"

فرمایا، "یہ پہاڑ زیریں زمینوں کو احاطہ کیے ہوئے ہیں ہر زمین کے گرد کوہِ قاف کے برابر ایک پہاڑ ہے جو اس زمینِ دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ پہاڑ تو سب سے چھوٹا پہاڑ ہے اور یہ زمین سب سے چھوٹی زمین ہے۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ کوہِ قاف پر چڑھے اور اس پر حضرت نوح علیہ السلام کی رکھی ہوئی کشتی بھی دیکھی اور امام سہلؒ پہاڑ اور کشتی کے حالات بھی بتاتے تھے۔

اور فرمایا:

"بصرہ میں اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا بندہ بھی ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے اپنا ایک پاؤں اٹھاتا ہے اور اسے کوہِ قاف پر رکھ دیتا ہے اور مشائخ فرماتے ہیں کہ ساری دنیا ایک ولی کے لیے ایک قدم اٹھانے کے برابر ہے اور اللہ کا ایک ولی ایک قدم اٹھائے تو پانچ صد برس کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ ایک پاؤں کو کوہِ قاف پر رکھ کر اور دوسرا پاؤں ایک دوسرے پہاڑ پر رکھ کر ساری زمین عبور کر لیتا ہے۔"

حضرت ابو یزیدؒ سے پُوچھا گیا:

"کیا آپ ستونوں والے قوم ارم کے علاقے گئے؟"

فرمایا، "میں اللہ تعالیٰ کی سلطنت میں ایک ہزار شہروں میں گیا ہوں اور قومِ ارم کا علاقہ ان سب میں معمولی ہے۔ پھر سب کے نام شمار کیے کہ مثلاً بیت، تاویل۔ بارلیس، جابلق، جابرس اور مسک۔

فرمانِ الٰہی ہے:

اَلَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِی الۡبِلَادِ[1] (جو بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں)

گویا ایک قائل کہہ رہا ہے کہ یہ علاقہ یمن میں واقع ہے۔ اس لیے کہ انہیں اپنے علاقوں میں جو معاملہ تھا اس کا خطاب ہُوا۔ فرمایا:

اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ[2] (یا دُور کر دیئے اس ملک سے)

یعنی اپنے علاقے کی سرزمین سے نکال دیا جائے۔ ذات العماد دراصل یمن میں قوم عاد کا ایک شہر ہے یہ ابتر اور شحر کے درمیان واقع ہے۔ بتاتے ہیں کہ اس شہر کی فصیل میں ایک ہزار دروازے ہیں۔ ہر دو

---

[1] الفجر آیت ۸

[2] المائدہ آیت ۳۳

دروازوں کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے اور یہ سونے، چاندی اور یاقوت و زبرجد سے بنے ہُوئے ہیں اس میں ایک ہزار ستون ہیں جو کہ جنات نے عاد بن شداد بن سام بن نوح کے لیے تعمیر کیے تھے۔ جنات نے یہ ستون سمندروں کی گہرائیوں اور چٹانوں سے نکالے۔ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام سے چار ہزار سال پہلے جنّات ان کے لیے مسخر کر دیے گئے تھے۔ جمعہ اور عیدین کی راتوں میں کئی ابدال اس شہر میں جمع ہوتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ یہاں پتھر کے کئی صندوق ہیں ہر صندوق کی لمبائی دس گز تک ہے اور ان میں انبیاء علیہم السلام کی قبریں ہیں۔ ان کے ابدانِ مبارک آج تک صحیح و سلامت ہیں مگر عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔
حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ ہر جمعہ کو ان کی زیارت کیا کرتے تھے اور یہ بھی ایک محبوبِ ربانی تھے، اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتوں کے کئی کرشمے ہیں اور یہ ان میں سے ایک ہے۔

ان سے عرض کیا گیا:

"اللہ کی جانب سے جو تجھے مشاہدہ حاصل ہُوا، کچھ بتائیے" وہ پریشان سے ہو گئے۔

پھر فرمایا:

"تمہارا نفس ہو، تمہارے لیے اس کا جاننا مناسب نہیں"

پوچھا گیا:

"اللہ کی راہ میں اس سے اپنا شدید مجاہدہ بتائیے"

فرمایا:

"یہ بھی جائز نہیں کہ تمہیں بتا دوں"

پُوچھا گیا:

"آغاز میں جو آپؒ نے ریاضت کی اس کے بارے میں ہی کچھ بتائیے"

فرمایا:

"ہاں، بعض معاملات میں میں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف بُلایا مگر میرے نفس نے سرکشی کی"۔
چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ ایک سال تک پانی نہیں پیوں گا اور ایک سال تک لقمہ بھی نہیں چکھوں گا۔
اس طرح یہ نفس چُور ہو کر درست ہو گیا۔

یحییٰ بن معاذؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے نمازِ عشا کے بعد نمازِ فجر تک ایک ہی انداز میں بیٹھے رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ پاؤں پر نظریں جمائے رہے اور پلک تک نہیں جھپکا۔ بتاتے ہیں کہ پھر سحری کے وقت سجدہ کیا اور پھر اٹھ کر بیٹھے اور کہا،

"اے اللہ ایک قوم نے تجھ سے مانگا تُو نے اسے پانی اور ہوا پر چلنا عطا کیا وہ اس پر راضی ہو گئے۔ اور میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ ایک قوم نے تجھ سے مانگا تو نے انہیں زمین کے خزانے عطا کیے اور ان کے سامنے وُہ خزانے ظاہر ہو کر نکل آئے وہ اس پر راضی ہو گئے اور میں اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں۔"
اس طرح انہوں نے بیس سے زاید کراماتِ اولیاء شمار کیں۔

راوی بتاتے ہیں کہ پھر میری طرف توجہ کی تو مجھے دیکھ کر فرمایا:
"یحییٰ ہے؟"
میں نے عرض کیا،
"ہاں، میرے آقا۔"
فرمایا، "تم یہاں کب سے ہو؟"
میں نے عرض کیا،
"نمازِ عشاء سے یہیں ہوں۔" اس پر وُہ خاموش رہے۔
میں نے عرض کیا،
"میرے آقا! کچھ بتائیے۔"

فرمایا: "تمہارے لیے جو مناسب ہے وُہ تمہیں بتاؤں گا۔ اللہ مجھے فلکِ اسفل میں لے گئے اور ملکوتِ سفلی کی سیر کرائی اور زمینیں اور تحت الثریٰ تک دکھایا، پھر فلکِ علوی پر لے گئے اور آسمانوں میں مجھے سیر کرائی۔ اور باغات سے لے کر عرش تک دکھایا۔" پھر مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا،
"مانگو جو تم نے دیکھا۔ میں تمہیں دُوں گا۔"
میں نے عرض کیا،
"اے میرے مولا کریم! میں نے جو بھی دیکھا ان میں سے کسی کو ایسا نہیں سمجھتا کہ مانگوں میں تو تجھے ہی مانگتا ہوں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،
"تُو میرا حقیقی بندہ ہے تو میری عبادت میں سچا ہے۔ میں تیرے ساتھ ضرور ایسا ایسا سلوک کروں گا۔ پھر کئی اشیاء کا ذکر فرمایا۔" یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ: مجھ پر اس بات کا سخت رعب چھا گیا اور مجھے اس سے بڑا تعجب ہُوا۔ میں نے عرض کیا:
"میرے سردار! آپ نے خدا تعالیٰ سے اس کی معرفت کیوں نہ مانگی؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا، مانگو

جو چاہتے ہو اس پر وہ زور سے چلائے اور فرمایا:

"خاموش رہو، تیرا ناس ہو، مجھے ان پر جرأت دلا رہے ہو؟"

حضرت ابو تراب نخشی رحمۃ اللہ علیہ ایک سالک کی عبادت دیکھ کر تعجب کرتے۔ چنانچہ اس کی ضرورت کا بندوبست فرماتے اور سالک عبادت و وجدان میں مشغول رہتا۔ ایک روز حضرت ابو تراب نے فرمایا:

"کاش تم ابو یزیدؒ کو دیکھتے۔"

سالک نے کہا:

"میں اس سے غافل ہو کر (عبادت میں) مصروف ہوں۔"

جب ابو ترابؒ نے بار بار اس پر اصرار کیا اور کہا:

"کاش تم ابو یزیدؒ کو دیکھتے۔" تو سالک جوش میں آکر کہنے لگا:

"تیرا ناس ہو، میں ابو یزیدؒ کو کیا کروں گا۔ میں نے اللہ کو دیکھا۔ اس نے مجھے ابو یزیدؒ سے بے نیاز کر دیا۔"

حضرت ابُو ترابؒ فرماتے ہیں کہ "مجھے بھی جوش آگیا اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا" اور کہا:

"تیرا ناس ہو، اگر تو ابو یزیدؒ کو ایک بار دیکھتا تو تیرے خدا کو ستر بار دیکھنے سے بہتر ہوتا۔" وہ سالک اس پر مبہوت رہ گیا اور اس بات کو غلط خیال کیا اور پُوچھا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا:

"تیرا ناس ہو تُو اللہ کو اپنے ہاں دیکھتا ہے اور وہ تیری مقدار کے مطابق تیرے سامنے آتا ہے اور اگر تو ابُو یزیدؒ کو اللہ کے ہاں دیکھتا (تو دیکھتا) کہ اللہ تعالیٰ اس کی قدر کے مطابق ظاہر ہے۔" بتاتے ہیں کہ وہ سالک بات سمجھ گیا اور کہنے لگا:

"مجھے ان کے پاس لے چلو۔" آخر طویل واقعہ بیان کرتے ہُوئے فرمایا: کہ ہم ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ حضرت ابو یزیدؒ ایک نہر سے نکل کر ہماری طرف آئیں گے۔" بتایا کہ وہ ہمارے پاس سے گزرے۔ انہوں نے پشت پر ایک بالوں والی کھال ڈال رکھی تھی۔ میں نے نوجوان سالک سے کہا:

دیکھو یہ ہیں ابو یزید، بتاتے ہیں کہ سالک نوجوان کی ان پر نظر پڑی تو بے ہوش ہو کر گر گیا۔ ہم نے ہلا کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ بتاتے ہیں کہ ہم نے مل کر اسے دفن کیا اور میں نے ابو یزیدؒ سے پُوچھا:

"اے میرے آقا اس کی آپ پر ایک نظر نے ہی اسے قتل کر دیا؟"

فرمایا: "نہیں، تیرا یہ دوست صادق تھا اور اپنے دل میں اس نے اسے ٹھہرا لیا تھا جو اپنے وصف کے

ساتھ اس کے سامنے منکشف نہیں ہوا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو اس کا ستر قلب کھل گیا اور اس کا وہ تحمل نہ کر سکا اس لیے کہ وہ کمزور سالکین کے درجہ پر تھا اور مر گیا۔ یہ محبوب کے اوصاف ہیں، جس پر مزید انعامات ہوتے۔ محب کریم تعالیٰ نے اسے بغیر حساب کے روزی عطا فرمائی۔ یہ طالب سے مطلوب کی خاطر آسانی اور محبوب تعالیٰ پر محب کی عنایت ہے۔ مقامِ حبیب بہت ہی دقیق و مخفی ہے اور یہ آسانی سے سمجھ نہیں آتا اور ان پر ان کے افعال کے پردے ڈال دیے اور یہ پردے دبیز کر دیے اور ان پر انہی کے اوصاف کے حجابات رکھ دیے۔

اہلِ مقامات، اس کی جانب اشتیاق رکھتے ہیں اور وہ ان کا مشتاق ہوتا ہے۔ اہلِ قرب کی نظریں اس پر مرکوز رہتی ہیں اور وہ ان پر نظر فرمائے ہوتا ہے۔ اہلِ محبت اس کا کلام سننا چاہتے ہیں اور وہ ان کا کلام سننا پسند فرماتا ہے۔ اہلِ احوال اس سے مانگتے ہیں اور وہ ان کے لیے کافی ہے اور پسند فرماتا ہے کہ اس سے مانگیں۔

اہلِ مشاہدہ اس کا دیدار کرتے ہیں اور وہ ان کے قلوب میں ان کو دیکھتا ہے۔ اہلِ آخرت آخرت میں اس کا دیدار کریں گے اور وہ دنیا میں ان پر نظر فرما ہے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

جیسے کہ ہم حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں بیان کر چکے۔ وہ بادشاہ بھی تھے اور اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چودہ اولیاء اللہ کی طرف پیغام بھیجا۔ ان سے کہو کہ مجھ سے کوئی حاجت مانگیں۔ جب انہوں نے ان کو دیکھا تو ان سے علیحدہ ہو گئے تاکہ یہ انہیں عبادت سے غافل نہ کر دیں۔ یہ باتیں ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ اب ان میں سے کسی کا انکار نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اہلِ جنت کو دنیا کے اندر پہلی عطا فرماتا ہے اور وہ ہے "کُن کی عطا" مگر وہ اس کے باقی رکھنے کی خاطر اس میں بھی زہد کرتے ہیں، اور اللہ کی محبت کے باعث اس کو (استعمال کرنا) پسند نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کے علوم سے آگے ہیں۔ جب انہیں کُنْ عطا فرمایا تو انہیں حکم دیا کہ قیامت کے بارے میں کُن کہہ لیں مگر ملاقات ہونے سے پہلے دوزخ اور جنت سے پردہ ہٹانے کے سلسلہ میں کُنْ نہ کہیں۔ اسی طرح کون و مکان سے ماوراء (اشیاءِ غیبیہ) کو ظاہر کرنے کے لیے کُنْ نہ کہیں اگرچہ یہ اشیاء ایک باطن کے لیے واضح ہیں مگر یقین و ایمان کے لیے مخفی بالصنع ہیں۔ وہم کا بھی ان تک گزر نہیں، فکر ان سے دُور رہے اور یہ بھی فرمایا کہ حکمت و عقل سے جن کو مخفی رکھتا ہے انہیں ظاہر نہ کریں۔ اس لیے کہ مخلوقات کے لیے ان کا اظہار مناسب نہیں ہے اور پھر امورِ سلطنت درست نہیں رہتے اور سابقہ تقدیر کی تدبیر بگڑ کر رہ جاتی ہے اور پھر ایسا کرنے سے احکام ساقط ہو جائیں گے اور عوام ہلاکت میں جا پڑیں گے۔

جب انہوں نے یہ اس سے دیکھا اور رجوان پر اس نے مستثنیٰ کیا تو خوب طرح قبول کیا اور تیزی سے اس کی طرف لوٹا دیا اور اس کی مرضیات میں خوب حصہ لیا یعنی انہوں نے اس کے اظہار کے باعث کسی چیز کا اظہار بھی ترک کر دیا (کہ وہی ظاہر کرے تو ظاہر ہو) انہوں نے اس کی خاطر ہر مفہوم کے لحاظ سے زہد اختیار کیا۔ اس کی حکمت کی راہوں میں اس کی تقدیر چلنے پر راضی ہو گئے۔ یہ انتہا درجہ کا زہد و محبت اور مشقت و جہد ہے۔ اللہ بھی انہیں اس کا خوب عوب اجر عطا فرمائے گا اور ان کے لیے اپنے ہاں ذخیرۂ اجر و ثواب جمع کرتا ہے۔

اللہ کا محبّ کون ہے

جب زنگی لوگ بصرہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے قتل عام کیا، لوٹ مار مچائی تو حضرت سہل کے اصحاب ان کے پاس جمع ہوئے اور عرض کیا:

"کاش! آپ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

"اس شہر میں اللہ کے ایسے بھی بندے ہیں کہ اگر وہ ظالموں کے خلاف بد دعا کریں تو ساری زمین پر کوئی ظالم آدمی زندہ نہ رہے اور ایک ہی رات میں سب ظالم ختم ہو جائیں۔ مگر وہ ایسی بد دعا نہیں کرتے۔"

پوچھا: "کیوں"؟

فرمایا: "اس لیے کہ وہ ایسی بات پسند نہیں کرتے جس کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ پھر ان کی قبولیتِ دعا کی ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ جن کا ذکر بیان سے باہر ہے۔"

آخر میں فرمایا:

"اگر وہ اللہ سے دعا کریں کہ قیامت قائم نہ ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت قائم نہیں کرے گا۔"

یہ یاد رکھیے کہ جب ایک بندہ کو اللہ کے ہاں اس قدر بلند درجہ مل جاتا ہے کہ اسے کُن عطا ہوتا ہے تو اس حال کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ یوں دعا کرے:

"اے اللہ جو تو پسند کرتا ہے مجھے اس کی توفیق عطا فرما اور جس کو تو ناپسند کرتا ہے مجھے اس سے بچا لے۔ اس لیے کہ میں ایک جاہل آدمی ہوں حسنِ تدبیر نہیں کر سکتا۔ مقادیر سے آگاہ نہیں اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہوں۔ اپنے قول میں مجھے تفاوت آجانے کا ڈر ہے اور مجھے اپنے ارادہ میں اضطراب کا خوف ہے۔" جب اللہ تعالیٰ اس کو اس کے مقامِ قبولیت تک رسائی عطا کرتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور بات نہیں کرتا۔ اور تسلیم و رضا دکھاتے اور تدبیر پر سرخم کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ جو آدمی اللہ سے محبت کرتا ہے وہ تمام امور کو اس حال پر دیکھتا ہے اور اسے ہی پسند کرتا ہے۔ اس لیے کہ خیر و شر کے مفہوم کے لحاظ سے یہ سب امور تدبیر الٰہی سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ جیسے وہ اپنے وصف کے ساتھ عرش پر مستوی ہوا۔ اس طرح اس نے

تدبیر کو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ رکھا۔ چنانچہ بندوں پر اس نے تدبیر ملک لازم نہیں کی بلکہ انہیں ملک کیلیے صبر و رضا کا حکم دیا۔ اب بندے کا کام یہ ہے کہ سکوت و ادب اختیار کرے اور معاملہ جیسے ہو اسے قبول کر لے بندے کو چاہیے کہ وہ اعتراض بند کر دے اور فضول کام میں حصہ نہ لے۔ اب اسے توکل و رضا کا مقام حاصل ہوگیا یہی وجہ ہے کہ جب امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا :

"خلق سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے ؟" تو فرمایا :

"جس حال پر مخلوق ہے تو یہ ایسی بات کیوں چاہتے ہو جس کو خدا نہیں چاہتا ؟ (یعنی ارادہ الٰہی کے تابع رہو) وہ اپنی صفات کو پسند کرتا ہے ان سے مرادات ظاہر ہوتی ہیں۔ انہی سے احکام ہویدا ہوتے ہیں۔ اب تم ان کے خلاف کیوں چاہتے ہو ؟ جیسے جو ہو گیا وہ لازمی تھا۔ اس طرح جو ہوگا اس کے بغیر بھی چارۂ کار نہیں اور کُن دراصل کان کے نیچے بند و لپٹا ہوا ہے اور اگر کَانَ نہ ہوتا تو یکُن نہ ہوتا۔ چنانچہ ان کے نزدیک کُن سے کَانَ زیادہ محبوب ہے۔ اس لیے کہ یہ اس تعالیٰ کا (حکم و فیصلہ) ہے اور ان کے لیے اور اس کے لیے کَانَ کی طرح کوئی مثال نہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ اَعْيُنٍ [۱] (سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے ان کے واسطے جو ٹھنڈک ہے آنکھوں کی)

اور یہی لوگ اللہ کے محب بندے اور اس کی سلطنت میں اس کی محبت کے باعث زہد کرنے والے ہیں۔ چنانچہ جو مال انہیں ملا اس میں انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ جب یہ فرمان سُنا :

وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ [۲] (اور خرچ کرو جو کچھ تمہارے ہاتھ میں دیا اپنا نائب کر کے)

چنانچہ اللہ کی محبت کے باعث سارا مال اپنی ملکیت سے باہر کر دیتے ہیں۔ یہ ان کے لیے خلعت اور پیچھے چھوڑا ہوا مال بن جاتا ہے اور وہ صرف وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

صدیق کون ؟

جب وہ یہ کہتے ہیں :

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

---

[۱] السجدہ آیت ۱۷

[۲] الحدید آیت ۷

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ[1] (پھر چلے آئے اللہ کے احسان سے اور فضل سے، کچھ نہ پہنچی برائی اور چلے آئے اللہ کی رضا پر)

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ۔ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے)

اس لیے کہ انہوں نے جو کہا اس پر عمل کیا اور ایمان حاصل کیا۔ ایک قول یہ ہے:

"ایمان قول و عمل کا نام ہے اور صرف قول عمل کا نائب نہیں بن سکتا۔" اور جب وہ یوں کہتے ہیں:

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (خاص ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور خاص ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں)

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "تم نے سچ کہا!"

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے سامنے زاری کرتے ہیں۔ مصائب میں اسی کی طرف دوڑتے ہیں اور صرف اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ صادق تعالیٰ نے ان کی تصدیق فرمائی۔ اس لیے وہ صدیقین بن گئے۔

منقول ہے کہ جب بندہ یہ الفاظ کہتا ہے:

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (خاص ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص ہم تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں)

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

"تو نے جھوٹ کہا۔ اگر تو سچ سچ میری ہی عبادت کرتا تو میرے سوا نہ کسی سے امید رکھتا اور نہ میرے سوا کسی سے ڈرتا اور اگر تو واقعی مجھ سے ہی مدد چاہتا تو اپنے مال و اہل کی طرف سکون وچین نہ پاتا۔"

منقول ہے کہ جب ایک بندہ قرآن کی ایک سورت پڑھتا ہے تو اس پر رحمت ہوتی ہے۔ آخر وہ یہ سورت پڑھنے سے فارغ ہوتا ہے تو یہ صدیق ہے جبکہ اس پر عمل بھی کیا ہو اور ایک آدمی ایسا بھی ہے کہ جو قرآن کی سورت پڑھتا ہے تو ختم سورت تک اس پر لعنت برستی ہے جبکہ وہ اس پر عامل نہیں ہوتا۔" چنانچہ یہ کذاب ہے اب ایمان کہاں رہا اور عمل کے بغیر کچھ ایمان نہیں اور نہ ہی یہ آدمی حقیقی مومن ہے۔

اولیائے کرام نے قول پر عمل کیا اور یقین کے ساتھ ایمان کا مشاہدہ کیا۔ جب وہ کہتے ہیں:

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

---

[1] آل عمران آیت ۱۷۴

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ۔

تو اس پر توکل کرتے ہیں اور اس سے راضی رہتے ہیں۔ ان کے سینوں میں اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تم نے سچ کہا"

چنانچہ وہ صدیق ہو جاتے ہیں جیسے کہ جب وہ کسی چیز کو فرماتا ہے: "ہو جا"۔ تو وہ ہو جاتی ہے۔ خوب سمجھ لو۔

جب اس نے کہا:

وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ

تو وہ لوگ مقامِ توکل پر کھڑے ہوئے اور صدق میں ان کے مقامات بن جاتے ہیں۔ اللہ صادق فرماتا ہے کہ

صَدَقْتُمْ۔ (تم نے سچ کہا)

تو وہ صدیق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میرے بندو، تم میرے اہل محبت میں بہترین لوگ ہیں۔ میں تمہارا کارساز ہوں، تم مجھ سے راضی ہو گئے اور میں تمہیں کافی مددگار ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا وصف یہ ہے:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ[۵] (پھر چلے آئے اللہ کے احسان سے اور فضل سے، کچھ نہ پہنچی برائی اور چلے آئے اللہ کی رضا پر)

چنانچہ انہیں چار مقامات کی جزا ملی:

۱۔ نعمت و فضیلت

۲۔ اس پر توکل

۳۔ برائی دور کرنا۔

۴۔ وہ اللہ پر راضی رہے۔

اس لیے انہوں نے رضائے الٰہی کا اتباع کیا۔ رضی اللہ عنہم۔ حبیب کی عادت ہے کہ عذر قبول کر لیتا ہے اور دشمن عذر قبول نہیں کرتا۔ محبوب حساب نہیں کرتا اور بغض والا آدمی اس کو کبھی بھی نہیں بخشتا۔ اس مفہوم پر ایک ادیب نے کہا ہے:

---

[۵] آل عمران آیت ۱۷۴

مَنْ لَمْ یَکُنْ لِلْوِصَالِ اَھْلاً فَکُلُّ اِحْسَانِہٖ ذُنُوْبٌ

(جو آدمی وصال کا اہل نہ ہو۔ تو اس کی ہر نیکی، گناہ ہے)

ایک دوسرے صاحب نے ایک دُوسرا وصف بتایا :

فِیْ وَجْھِہٖ شَافِعٌ یَمْحُوْا سَاءَ تَہٗ مِنَ الْقُلُوْبِ وَ یَاْتِیْ بِالْمَعَاذِیْرٖ

(اس کے چہرہ میں ایسا سفارشی ہے جو دلوں سے بُرائی مٹاتا ہے اور عذر لاتا ہے)

ایک حقیقی سالک کا یہ شعر ہے :

اِنِّیْ جَعَلْتُ مَنْظَرِیْ فِیْ مُھْجَتِیْ وَ جَعَلْتُ وُدَّکَ لِیْ اِلَیْکَ شَفَاعَہ

وَلَوْ اَنَّا وَقْتاً مِنْکَ بِالدَّھْرِ کُلِّہٖ لَکَانَ قَلِیْلاً اَلْفَ عَامٍ بِسَاعَہ

(میں نے اپنے محبوب پر نظریں رکھیں اور میں نے اپنے لیے تیری محبت ہی سفارش بنا لی)

(اور اگر تجھ سے سارا زمانہ ہی وقت ہو تو ہزار برس کی بھی ایک گھڑی چھوٹی دکھائی دے)

جس کو مذکورہ امور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اطلاع نہ ہو وُہ اللہ سے ڈرتا رہے اور زہد اختیار کرے، ظاہری و باطنی طور پر آیات وقدرتِ عظیمہ کے مشاہدہ کے ذریعہ بلند ہمتی رکھے اور معرفت کا دعویٰ نہ کرے اور نہ ہی محبت کے وہم میں گرفتار ہو، اس لیے کہ اس کے پاس صرف فریب وغرور اور ظن وجھوٹ ہے اور جیسے اللہ تعالیٰ بعض اپنے اولیاء کو یقین عطا کرتا ہے۔ اس طرح ایک قوم کو ظنون عطا کرتا ہے۔ واضح آیات اور شواہد یقین کے باعث، آیاتِ قرآن و آیاتِ رسول کے اثبات کے ذریعہ جیسے اللہ تعالےٰ اپنے احباء کو مقامِ محبوب میں حقائق عطا فرماتا ہے۔ اس طرح قلبی امراض کی وجہ سے ایک قوم کو کذب و زور کی باتیں عطا فرماتا ہے (یعنی غلط اوہام میں مبتلا کر دیتا ہے) اور اپنے احباب کو کُن پر اس وقت غلبہ دیتا ہے جبکہ ان کے قلوب سے کوُن منکشف ہو جاتا ہے۔ اور کوُن میں ایسی ایسی ملکوتی انعامات اور اعلیٰ ترین مرغوبات ہیں جن کا الفاظ میں ذکر کرنا مناسب نہیں۔

عوام و خواص کے حجابات

نفسانی آفات اور زینتِ سلطنت فی الاصل عوام کے حجابات ہیں۔ عقلی لذات اور ملکوت کی مرغوبات سے ارواح کی خواہشات، خواص کے حجابات ہیں۔ جن درجات کا قلب مشاہدہ کرتا ہے ان مفاہیم تک بلند ہونا اور جن مخصوص رحمتوں اور مرغوبات کو دیکھتا ہے ان پر ذوق اختیار کرنا، اہل محبت کے قلوب کے حجابات ہیں۔ اس لیے کہ جب یہ حضرت نفسانی شہوات سے دُور ہوگئے اور اللہ کی محبت کے باعث عقلی حجابات بھی اٹھ گئے تو رُوحانی شہوات میں پڑ گئے۔ اب یہ اس وقت تک مواجہت سے باریاب نہیں ہو سکتے اور نہ ہی وصف پر نظر کر سکتے ہیں۔ جب تک روحانی شہوات سے

دُور نہ ہوجائیں اور ان سے حجاباتِ انوار بھی دُور ہوجائیں اور نشان و رسم کو بدل دیں۔

جب مقامات ختم ہوجاتے ہیں فضائل انجام کو جا پہنچتے ہیں۔ نظریں پختہ ہوجاتی ہیں۔ منازل و درجات ساقط ہوجاتے ہیں تو اس وقت طالب گر کر رہ جاتا ہے اور مطلوب غالب آتا ہے۔ رغبت رکھنے والا فنا ہوجاتا ہے اور مرغوب باقی رہتا ہے۔ ان کے لیے اسم کے ساتھ تعلق ظاہر کیا اور یہ آخری حجاب ہے۔ یہ پہلا قرب ہوتا ہے انہیں اس میں ڈال کر دیکھتا ہے کہ وُہ نشان کے معاملہ میں کیا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ واقعہ بنتا ہے کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ۔ الآیۃ

اب ہی اس کے لیے یہ مقام درست ہُوا اور اس مفہوم میں ہے، ؎

ظَھَرَتْ لِمَنْ اَفْنَیْتَ بَعْدَ بَقَائِہٖ   فَصَارَ بِلاَ کَوْنٍ لِاَنَّکَ کُنْتَہٗ

(بقا کے بعد جس کو تو نے فنا کیا وُہ ظاہر ہُوا۔ اب وُہ بغیر کون کے ہے اس لیے کہ تُو نے اسے کیا)

اللہ سے مانگتے ہی رہو

حضرت ابویزیدؒ فرمایا کرتے،

"اگر تجھے موسوی مناجات، عیسوی روحانیت اور خلتِ ابراہیم صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہٗ بھی دے دی جائے تو اس سے بالاتر مانگو۔ اس لیے کہ اس کے پاس اس سے کئی گنا بڑھ کر کئی اعلیٰ درجات ہیں اور اگر تو یہیں ساکن ہو کر رہ گیا تو تیرے سامنے یہ حجاب بن جائے گا اور یہ بھی ابتلا ہے۔ البتہ جیسا حال ہو ویسا ابتلا آیا کرتا ہے۔ جو انبیاؑ سے زیادہ مماثل ہوگا اس پر ابتلا بھی ویسا ہی آیا کرتا ہے اور اگر بندہ تمام مطلوب کی طرف نظر نہ کرے اور نہ ہی ایک مرغوب ہونے پر توقف کرے تو اسے مقامِ محبوب عطا فرماتا ہے اور اسے اپنے سایہ میں جگہ دیتا ہے۔ اس پر اپنا لطف و کرم فرماتا ہے، اس کی طرف نظر فرماتا اور اسکو مواجہت کا شرف عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف رُخ کیا اور واپس نہیں ہُوا اور اس کے قرب کی طرف تیزی دکھائی اور تھکا نہیں اور اس کے چہرہ میں کوئی دُوسرا چہرہ نہ دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہ دیکھا، اس کی قیومیت کے باعث اس کے مشاہدہ میں قائم رہا۔ اہلِ معرفت طالبین کی یہی غایت ہوتی ہے۔

ایک حیرت انگیز زہد

اہلِ محب عارف فرماتے ہیں ؛

"مجھے چالیس حوریں نظر آئیں جو فضاء میں اڑ رہی تھیں ان پر چاندی سونے اور جواہرات میں جڑا ہوا لباس تھا جو کھڑکھڑا رہا تھا۔ میں نے ان پر ایک نظر کی تو چالیس روز کی سزا ملی۔" فرمایا، اس کے بعد پھر مجھے اتنی حوریں نظر آئیں جو پہلی حوروں سے زیادہ حسن و جمال رکھتی تھیں اور مجھے کہا گیا، "ان کی طرف دیکھو۔"

فرماتے ہیں کہ میں نے سجدہ کیا اور سجدہ میں آنکھیں بند کرلیں تاکہ ان پر نظر نہ چلی جائے اور میں نے دعا کی،

"میں تیرے سوا سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں!" میں دُعا و زاری کرتا رہا۔ آخر وہ اوجھل ہو گئیں۔

ہر صدی اور ہر زمانہ میں کثیر تعداد میں اللہ کے ایسے بندے ہوتے ہیں جو زمین پر پھیلے ہوتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں ملتے ہیں اور عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل، مستور اور خستہ حالی کی حالت میں رہتے ہیں۔ عقلیں انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ قلوب میں ان کی حقیقی تعریف نہیں آسکتی۔ حرکت و سکون میں اخلاص پایا جانا ان کا کم درجہ کا وصف ہے اور جو ہمیں حاصل ہے اس کو دیکھیں تو اخلاص ہی بہت بڑی بات ہے۔

اخلاص کیا ہے؟ مخلصین کے نزدیک اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ خالق کے معاملہ سے مخلوق کو نکال دے اب جب انہیں داخل نہ کریں گے تو کیسے نکالیں گے اور نفس پہلی مخلوق ہے اور جب قلب اس سے مکدر نہ ہوگا تو اس سے صاف کیسے ہوگا اور اہلِ محبت کے نزدیک اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ نفس کی خاطر کوئی عمل نہ کرے اور ایک رائی بھر طبعی مزہ کا اس میں دخل نہیں بلکہ ہر عمل صرف اللہ کی تعظیم کرتے ہوئے کرے اور ذوالجلال والاکرام کی محبت میں کسی دُوسرے کو شریک نہ بنائے اور اس کے سوا کسی کے جمال سے قلبی تعلق پیدا نہ کرے۔ اس لیے کہ حُسن و جمال کی انتہا تو یہیں ہے اور یہ بات صرف معرفتِ ذات تعالیٰ سے ہی حاصل ہوتی ہے اور دیدار ذات تعالیٰ سے پہلے معرفت نہیں ملتی۔ اس لیے کہ خبر، دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی اور دیدار صرف نورِ یقین سے حاصل ہوتا ہے اور نفسانی خواہش کے موجود ہوتے ہوئے حقیقی یقین نہیں ملتا۔

جب حجاب کھل جائے اور خواہش پیدا ہو جائے تو یقین کی آنکھ کھلتی ہے۔ چنانچہ نظرِ یقین میں حُسن و جمال اور کمال و بہار کے انوارِ صفات آنکھ کے بعد آنکھ ہیں جیسے کہ نورِ نور کی نسبت سے نور پر نور ہے۔ اور موحدین کے نزدیک اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ،

"مختلف افعال میں مخلوق پر ان کی نظر نہ رہے بلکہ انہیں الگ کر دیں اور مختلف احوال میں مخلوق کے ساتھ سکون و استراحت نہ پائیں (بلکہ ہر فعل میں خدا پر نظر رہے اور اللہ ہی کے ساتھ چین آئے) صدیقین کے نزدیک صدق میں اخلاص یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں پردہ کی دُعا کریں جیسے کہ حضرت بشرؒ سے پُوچھا گیا،

"آپ اس درجہ پر کیسے پہنچے؟"

فرمایا "میں اللہ تعالیٰ سے اپنے حال پر اخفاء کی التجا کرتا رہا۔ یعنی اس سے یہ دُعا کرتا رہا کہ وُہ مجھ پر پردہ رکھے اور میرا معاملہ مخفی رکھے۔"

منقول ہے کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا تو عرض کیا،

"اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کریں۔"

انہوں نے دُعا کی:

"اللہ تعالیٰ تجھ پر نیک کام آسان فرمادے۔"

بتاتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"مزید دُعا فرمائیے۔"

انہوں نے دُعا کی:

"اور تجھ پر ان کو مستور کر دے (یا پردہ ڈال دے)" اس کے دوُ مطلب بتائے جاتے ہیں:

۱۔ وَ سَتَرَهَا عَلَيْكَ ۔ یعنی تو ان نیکیوں کی وجہ سے شہرت نہ ہو۔

۲۔ بعض نے اس کا یہ مطلب بتایا کہ تجھ سے یہ اوجھل رکھے اور تو نیکیوں کی طرف نہ دیکھے۔

ایک بزرگؒ بتاتے ہیں کہ مجھے حضرت خضرؑ سے ملاقات کا شوق تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان سے ملاقات ہو جائے تاکہ مجھے کچھ علم کی بات سکھائے جو میرے لیے ضروری ہو۔

فرمایا کہ میں نے حضرت خضرؑ کو دیکھا تو میرے دل پر یہی آیا کہ انہیں یہ درخواست کروں۔ آخر میں نے یہی بات عرض کی۔

اے ابوالعباس! مجھے ایسی دعا سکھائیں کہ جب میں وہ دعا کروں تو مخلوق کے دلوں سے اوجھل ہو جاؤں اور مخلوق میں میری کچھ بھی قدر و قیمت نہ ہو۔ مجھے کوئی آدمی بھی نیکی اور دیانت کے ساتھ نہ پہچانے۔ (یعنی گمنامی کی حالت میں رہوں)

انہوں نے یہ دُعا بتائی:

اَللّٰهُمَّ اَسْبِلْ عَلَيَّ كَثِيْفَ سِتْرِكَ وَ حُطَّ عَلَيَّ سُرَادِقَاتِ حُجُبِكَ وَ اجْعَلْنِيْ فِيْ مَكْنُوْنِ غَيْبِكَ وَ احْجُبْنِيْ عَنْ قُلُوْبِ خَلِيْقَتِكَ ۔

(اے اللہ مجھ پر اپنا دبیز پردہ ڈال دے اور مجھ پر اپنے حجابات کے پردے نازل کر دے اور مخفی غیب میں کر دے اور اپنی مخلوق کے دلوں میں مجھے مستور کر دے)

پھر وہ غائب ہو گئے اور میں نے انہیں نہیں دیکھا اور اس ملاقات کے بعد دوبارہ ملاقات کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی۔ میں روزانہ یہ دُعا کرتا ہوں اور آخر ان کی گمنامی میں یہ حالت ہوگئی کہ ذمی لوگ بھی ان سے مذاق کرتے۔ راہ چلتے ان پر چیزیں پھینکتے۔ بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ اس میں انہیں راحت ملتی اور انہیں قلبی استقامت حاصل رہتی۔ سلف صالحین میں سے ایک جماعت کا یہ طریق ہے۔ طالب صادق کے

ایک طبقہ کا یہ حال ہے۔ انہوں نے اپنے نفوس کو ہلکا کیا اور ظاہر میں درجے ساقط کیے انہیں مجنون اہل خرد کہا جاتا ہے۔ یہ نفس میں زہد اور حقیقی تواضع ہے۔ البتہ یہ مجنون اولیاء کا زہد اور اہل یقین ضعفاء کی تواضع ہے۔

تکبر کے تین مفہوم
تکبر تین مفاہیم سے ہوتا ہے،
۱۔ نفس پر تعجب کرتے ہوئے تکبر کرنا۔

۲۔ نفسانی عزت بتاتے ہوئے لوگوں کے دلوں میں بڑا بننا۔ یعنی یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں بڑا آدمی شمار ہو اور یہ عادت تکبر کے باعث ہوتی ہے۔

۳۔ اپنی نیکی اور تقویٰ دیکھ کر دل میں بڑا بننا۔ یہ بات بھی تکبر کے باعث ہوتی ہے۔ اسی لیے ایسا آدمی اپنے نفس پر نظر رکھتا ہے اور یہ بات ضعفِ یقین کے باعث ہوتی ہے اور یہ تکبر کا دقیق ترین مفہوم ہے ایک صحیح العقیدہ اور خالص توحید کا آدمی ہی اس سے نجات پا سکتا ہے جو کہ صادق الیقین اور مخلص صالح ہو۔
ظاہری تکبر یہ ہے کہ بڑائی جتائے اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنائے۔ یہ واضح تکبر ہے اور یہ کثیف ترین قلبی حجاب اور قوی ترین نفسانی صفت ہے۔ اس وجہ سے علماء باریک تکبر سے بھی ڈرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ نفس کے لیے تواضع و ذلت مانگی تاکہ مخفی تواضع کے ذریعہ اس کا امتحان لیں اور دقیق ترین کبر سے بھی بچ جائیں اور اعمال میں خلوص آجائے۔

تواضع کا مفہوم
اہلِ تواضع کے نزدیک تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ اصل تواضع وہ ہے جب بندہ واقعی اپنے آپ کو ذلیل و معمولی سمجھے اور ذلت کا صرف بہروپ ہی نہ بھر کر رہ جائے۔ حقیقی تواضع یہ ہے کہ اپنے جی میں اپنے نفس کو ذلیل و حقیر سمجھ کر حقیر جانے اور تواضع کا خالی تکلف نہ کرتا پھرے اور تواضع کی علامت یہ ہے کہ جب اس میں نقص نکالا جائے یا کوئی آدمی اس کا عیب ظاہر کرے تو غضبناک نہ ہو۔ اور کوئی آدمی اس پر کبائر کی تہمت لگا کر اس کی مذمت کرے تو بھی کراہت و غضب نہ کرے اور وجدان میں اسکی توضیح یہ ہے کہ حالتِ ذلت میں ذلت و تواضع کا مزہ نہ پائے اور تواضع کی حالت میں تواضع پر نظر نہ کرے۔
اس لیے کہ یہ اس کی صفت بن گئی۔ اب جو گمنام و متواضع ہوا اور اسے اس کا ذائقہ محسوس ہوا تو وہ تواضع کا صرف بہروپ بھرنے والا ہے۔ جس نے تواضع اختیار کی اور اپنی تواضع پر نظر کی وہ مشکل میں ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے نفس میں ابھی نفس کا زور موجود ہے اور اگر کسی کی طرف سے مذمت ہونے پر غضبناک ہوا یا اپنی مذمت کو ناپسند جانا تو وہ اپنی مدح پر راضی ہونے والا اور اپنی تعریف پر خوش ہونے والا آدمی ہے۔

اگر ان مذکورہ امور میں سے اس کے اندر کچھ پا یا گیا تو ایسا آدمی مذکورہ مقامات سے حجاب میں ہے اور

اور اگر اس نے تواضع اختیار کی اور تواضع و ذلت کا کچھ مزہ نہ چکھا اور نہ ہی ناتوانی کا احساس ہُوا تو اب وُہ صحیح متواضع ہو گیا اور اپنے اندر کسی نقص کی نشاندہی پر مخلوق کی مذمت کے باعث ناراض نہ ہو گا اور نہ ہی مخلوق سے مدح پسند کرے گا۔ اس لیے کہ اپنے نزدیک اس کا درجہ و منزلت ہی جاتی رہی۔ اب تواضع و مسکنت اس کا وصف ہے جو اس سے جُدا نہیں ہوتا اور یہ لازم ملزوم ہیں اور تمام صنائع کی طرح یہ دونوں ان دونوں کی صنائع ہیں۔ کہا ہے ایسا بھی ہُوا کہ ان کے نقص کی طرف نظر نہ ہونے کے باعث ان پر فخر کیا۔ یہ بات نفس پر مکمل قابُو پانے کی دلیل ہے کہ نفس پر قابو پا کر اسے مقہور و عاجز کر دیا اور یہ مقامِ محبوب ہے۔ اس کے بعد تمام عیوب کے مکاشفات حاصل ہوتے ہیں اور اس کی ابتدا یہ ہے کہ قلب میں نورِ حکمت داخل ہوتا ہے اور پھر اس کے قلب سے حکمتوں کا چشمہ جاری ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت عیسٰی بن مریم علیہ الصلوٰۃ و السلام سے مروی ہے۔ فرمایا:

"اے بنی اسرائیل! کھیتی کہاں اُگتی ہے؟"

انہوں نے عرض کیا: "مٹی میں"

فرمایا: "جو میں کہتا ہُوں وُہ حق ہے کہ حکمت بھی صرف اسی قلب میں پیدا ہوتی ہے جو مٹی کی طرح (متواضع) ہو اور جس کا حال عدا کے ساتھ تواضع کا ہو۔ وہ اس کو مانگتا اور اس کو خوب سمجھتا ہے، جیسے کہ متکبر آدمی عزت مانگتا اور اس کو شیریں خیال کرتا ہے اور اگر ایک گھڑی بھر بھی تواضع و ذلت جُدا ہو جائے تو حال کے جُدا ہونے کی وجہ سے اس کا قلب متغیر (و پریشان) ہو جاتا ہے جیسے کہ متکبر آدمی کی عزت میں ذرا فرق آ جائے تو اس کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں اس کے نفس کی زندگی ہے۔

بے شمار بزرگانِ دین نے لوگوں کے سامنے تواضع و ذلت اختیار کی۔ قلوب سے اپنا جاہ و مرتبہ گرایا اور طرح طرح کے حقارت و ذلت کے انداز اختیار کیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا حال صدق کا تھا۔ اس لیے اس حال کے حکم پر چلنے کی ضرورت تھی اور مقتضائے حال کے مطابق اس کے بغیر چارۂ کار نہ تھا۔

ایک بزرگ نے حضرت جنیدؒ کے استاد شیخ ابوالحسن کرینی کے بارے میں بتایا کہ ایک آدمی نے انہیں تین بار کھانے پر بلایا، بلا کر پھر واپس کر دیتا اور وہ واپس ہو جاتے۔ آخر چوتھی بار اس نے انہیں گھر میں داخل کر کے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

"بیس برس سے میں اپنے نفس کی ذلت پر راضی ہوں۔ حتٰی کہ یہ میرے نزدیک کتے کا درجہ رکھتا ہے جس کو بھگایا جائے تو دُور ہو جاتا ہے اور اگر پھر ہڈی ڈال کر بُلایا جائے تو دوبارہ آ جاتا ہے۔"

ایک دُوسرے بزرگ سے مروی ہے۔ فرمایا:

اگر تو پچاس بار مجھے واپس کرے اور پھر بلائے تو میں دعوت قبول کروں گا۔

ایک دوسرے بزرگ نے اپنے استاد سے روایت کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ،

"میں ایک محلہ میں قیام پذیر ہوا تو جلد ہی کے ساتھ میری شہرت ہوگئی اور میرا قلب پریشان ہوگیا۔ محلہ کے وسط میں ایک حمام تھا میں وہاں گیا اور ایک قیمتی لباس تھا اس کو چرا کر پہن لیا اور اس کے اوپر پرانا لباس پہن لیا اور باہر نکل کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا تاکہ لوگ مجھے پہچان لیں۔ آخر انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور پرانا لباس اتروا کر نیچے سے وہ قیمتی لباس نکال لیا اور مجھے تھپڑ مارے اور خوب پیٹا اور پھر میں حمام کا چور مشہور ہوگیا۔ اس طرح میرا نفس پرسکون ہوگیا۔"

بعض صوفیاء کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے پاس آئے اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا،

"اگر یہاں اللہ کی خاطر کچھ ہو؛"

اس نے کہا: "بیٹھیے اور کھائیے!"

فرمایا، "مجھے میرے ہاتھ میں دے دو۔"

اس نے ہاتھ میں دے دیا اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگے۔ اس نے پوچھا: کہ "میرے ہمراہ بیٹھ کر کھانے میں کیا رکاوٹ تھی؟"

کہا، "اللہ کے سامنے میرا حال تواضع اور ذلت کا ہے۔ میں نے اپنے حال سے جدا ہونا ناپسند سمجھا اور گاہے بہ صوفی ہر پیسے والے کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور وہ ان کے ہاتھ میں ہر یہ رکھ دیتا اور عرب لوگ عزت نفس کی وجہ سے ہاتھ میں چیز رکھوانے سے نفرت کرتے ہیں۔ نبوت کے ابتدائی زمانہ میں مہاجرین اولین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تین روز بھوکا رہا اور کچھ نہ کھایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک آدمی کشمش بانٹ رہا ہے۔ میں نے بھی اس سے مانگی تو اس نے کہا، "ہاتھ کرو۔"

میں نے کہا،

"میں عرب آدمی ہوں اور ہاتھ میں نہیں لوں گا۔ اس لیے کسی چیز میں ڈال دو۔"

بتاتے ہیں کہ اس نے ایک پیمانے میں رکھ کر دیے اور پھر انہیں دیے۔ جب میں فارغ ہوا تو اسے یہ برتن واپس کیا۔ اس میں عزتِ نفس کا معاملہ تھا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا،

"تو ایسا آدمی ہے جس میں جاہلیت ہے۔"

اس نے عرض کیا: "باوجود اس کے کہ میری عمر بڑی ہے؟"
فرمایا: "ہاں" اور یہ ایک آدمی سے لڑ پڑا تھا اور اس نے اس پر اپنی بڑائی جتائی تھی۔

تکبر ہو تو ذکر رنگ نہیں لاتا

ہم نے بیدار عقلوں کو متنبہ کر دیا اور زندہ قلوب کو حرکت دی تاکہ جو زندہ رہے دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ اہلِ صدق کے اوصاف اور اہلِ اخلاص کے طرق پر زندہ رہے اور چند کلمات بھی اگر اثر کریں تو طویل کلام سے بہتر ہیں۔ بسطام کے ایک عظیم المرتبہ صاحب نے بتایا جو کسی وقت حضرت ابو یزیدؒ کی مجلس سے جُدا نہ ہوتے۔ ایک روز کہنے لگا:
"اے ابو یزیدؒ! تیس سال گزر گئے ہیں روزے سے ہوں اور افطار نہیں کرتا اور رات کو عبادت کرتا ہوں سوتا نہیں مگر جس علم کی آپ باتیں کرتے ہیں میں اپنے دل میں وہ نہیں پاتا حالانکہ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس علم کو پسند کرتا ہوں۔"
فرمایا: "اگر تو تین سو برس تک بھی روزہ رکھے اور اس قدر رات کو قیام کرے تو بھی اس علم کا ایک ذرہ یک حاصل نہیں کر سکتا۔"
اس نے پوچھا: "وہ کیوں؟"
فرمایا: "اس لیے کہ تجھ پر تیرے نفس کا حجاب ہے۔"
اس نے کہا: "اس کا کچھ علاج بھی ہے؟"
فرمایا: "ہاں"
اس نے کہا: "بتائیے، میں بھی جانوں!"
فرمایا: "تو قبول نہیں کرے گا۔"
اس نے کہا: "آپ بتائیں تو سہی۔"
فرمایا: "ابھی حجام کے پاس جاؤ، سر اور داڑھی منڈاؤ۔ یہ لباس اتار کر دھوتی سی باندھ لو۔ گلے میں باداموں سے بھرا ایک تھیلا لٹکا لو۔ بچوں کو اپنے گرد جمع کر لو اور کہو، جو مجھے گدی پر ایک تھپڑ لگائے گا اسے ایک بادام دوں گا۔ سب لوگوں کے سامنے تمام بازاروں میں جاؤ۔ جو تمہیں جانتے ہیں ان کے سامنے بھی اسی حالت میں جاؤ۔"
وہ بولا: "سبحان اللہ، آپ مجھے ایسی بات کہتے ہیں؟"
حضرت ابو یزیدؒ نے فرمایا:
"تیرا سبحان اللہ کہنا بھی شرک ہے۔"

اس نے کہا: "وہ کیسے؟"

فرمایا: "اس لیے کہ تو نے اپنے نفس کو بڑا سمجھ کر اس پر سبحان اللہ کہا۔"

اس نے کہا: "میں یہ تو نہیں کروں گا۔ کوئی اور دوا بتائیے۔"

فرمایا: "ہر چیز سے پہلے اس عمل سے آغاز کرو۔"

فرمایا: "میں نے کہا تھا نا کہ تم قبول نہیں کرو گے۔"

اس آدمی نے سبحان اللہ کہا تو ان کے نزدیک یہ مشرک تھا اس لیے کہ اس نے نفسانی علامت کے ساتھ سبحان اللہ کہا۔

اور حضرت ابو یزیدؒ خود کہا کرتے تھے،

سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ۔

اور وہ موحد تھے اس لیے کہ وہ ظاہر ہونے والی اولیت کے ساتھ موحد ہوئے۔ اپنے نفس پر نظر رکھنے کے باعث مریض ہو اور لوگوں کی نظریں اس پر ہوں اس لیے وہ مریض ہو جاتے اور وہ ان کی نظروں پر دھیان لگا بیٹھے اور

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ [1] (کوئی نہیں اس کو اللہ کے سوا کھول دکھانے والا)

البتہ یہ مجنون لوگوں کا علاج ہے جو کمزور یقین والوں کے مناسب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ذرہ بھر نظرِ یقین بھی ڈالتا تو اس کے دل سے ہر نظر نکال دیتا اور وہ ہر مرض سے صحت یاب ہو جاتا۔

وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ [2] (اور لیکن اللہ کو کر ڈالنا ایک کام جو ہو چکا تھا تاکہ مرے جو مرتا ہے سوجھ کر)

یعنی شواہدِ حق کے ساتھ ہلاک ہو اور

وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (اور جیوے جو جیتا ہے سوجھ کر)

یعنی شاہدِ حق کے ساتھ زندہ رہے اور

وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ [3] (اور پہنچتی ہے اس کو گواہی اس سے)

---

[1] النجم آیت ۵۸

[2] الانفال آیت ۴۲

[3] ہود آیت ۱۷

اس لیے مذکور باتوں میں سے کسی کا انکار نہ کرنا ورنہ اہلِ ایمان کے علم قدرت و یقین کے کم تر حصہ سے بھی خسارے میں رہے گا۔ اس لیے کہ مومنین کو اس علم سے حصہ حاصل ہوتا ہے مثلاً ہم نے جو ذکر کیا اس کا مشاہدہ کرنا، جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کا ادراک حاصل کرنا اس طرح وجدان و حال اور معاملہ و منازلت اور ذوق و شم بھی اسی سے ہے اور سب سے آخر میں تصدیق و قبول ہے۔ اگر معرفت کا قلیل ترین حصہ بھی نہ مل سکے تو انکار نہ کرے۔ اور اگر معرفت حاصل نہ ہو تو تعرف ظاہر کرے یعنی تسلیم کر لے اور اس کے بعد کچھ مقام نہیں۔

ہم نے جن مقامات کی تشریح کی ہے۔ یہ مقاماتِ یقین ہیں۔ سب سے پہلے مقامِ توبہ ہے اور اس مقامِ محبت تک ہر مقام کا دوسرے کے ساتھ تعلق و ربط ہے۔ اگر بندے کو ایک مقام کی حقیقت عطا کی جائے تو اسے ہر مقام کا حال عطا ہوا اور ہر حال سے مشاہدہ حاصل ہوگا اور ہر مشاہدہ سے علم حاصل ہوگا۔

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ [1] (مگر جس نے گواہی دی سچی اور ان کو خبر تھی)

اور یہ تمام حقیقتِ ایمان میں جمع ہیں۔ اگر بندے کو حقیقی ایمان و یقین عطا ہو۔ حتیٰ کہ وہ حقیقی مومن بن جائے اور علمِ الٰہی میں نہ اس سے پھرے اور نہ تغیر ہو۔ اور اس کا ایمان احسان و عطا ہے مستعار و امانت نہیں کہ اظہارِ التباس یا ارخالِ مکر کے باعث پھر جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان و محنت کے طور پر یہ ہو، اور بدل کو ہی بدلنے والا ہو اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ متبدل یہ ہے بدل ہو تو اس کا سارا یہ حال و رسال اور شہادت و شہادت ہوگی۔ اگرچہ علوم میں ان کا تفاوت ہو اور قرب میں علو حاصل ہوگا اور یہی کمالِ ایمان ہے۔

کمالِ ایمان کی علامات

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کمالِ ایمان کے وصف میں تین حدیثیں یوں مروی ہیں اور یہ ان احوال و افعال کے اصول و اساس ہیں۔

ایک یہ فرمایا:

"بندے کا ایمان تب ہی مکمل ہوتا ہے کہ جب اس کو چیز کی کمی چیز کی کثرت سے محبوب ہو جائے اور جب اس کو غیر معروف ہونا معروف ہونے سے زیادہ پسندیدہ ہو جائے۔"

ایک سچے زاہد کے یہ دو حال ہیں اور حقیقت کی جانب رسائی انہی کے باعث ملتی ہے اور بلند ترین مقام کی یہی بنیاد ہیں۔ ایسا آدمی آخر کار اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتا اور وہ ہی کسی عمل کا دکھاوا کرتا ہے اور جب اس کے سامنے دو باتیں ہوں۔ دنیا کا معاملہ اور آخرت کا معاملہ، تو وہ دنیا کے

---

[1] الزخرف آیت ۸۶

معاملہ پر آخرت کے معاملہ کو ترجیح دیتا ہے۔ اللہ کے سچے محب، اللہ کی عبادت میں صاحبِ خلوص آدمی ہیں اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس میں رغبت رکھنے والا انسان ایسے احوال سے مزین ہوتا ہے۔

اور تیسری حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں تین خصائل نہ آجائیں:

۱۔ جس کو غصہ آئے تو غصہ اسے حق سے باہر نہ کر دے۔

۲۔ جب خوش ہو تو خوشی اسے باطل کی طرف نہ لے جائے۔

۳۔ اور جب اسے قدرت حاصل ہو تو جو اس کا نہیں وہ حاصل نہ کرلے۔ (یعنی ناحق پر قبضہ نہ کرے)"

یہ فرامین درحقیقت عدل، فضیلت، مراقبہ اور زہد کو جامع ہیں اور یہی مقامات سالکین کے اصول ہیں۔

یہ حدیث (مذکورہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی کے مشابہ ہے۔ فرمایا:

"جس کو تین دی گئیں تو اس پر ویسا عطا ہوا جیسے کہ آلِ داؤد پر عطا ہوا (یعنی اس کے مشابہ):

۱۔ خوشی و غضب میں عدل کرے۔

۲۔ غناء و فقر میں میانہ روی اختیار کرے۔

۳۔ پوشیدہ و ظاہر میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔

مذکورہ مقامات ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور جس کو ان میں سے ایک مقام ملا اس کو حال کے لحاظ سب عطا ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا ان سب کا جامع ہے تاکہ بندہ جس پر ایمان لایا اس کی طرف آئے اور توبہ کرے اور جس وعدہ و وعید پر ایمان لایا اس کا دھیان رکھے تاکہ اس کا ایمان حقیقی، پختہ اور صحیح ہو اور اس کا یقین درست ہو جائے۔ اس کی توحید میں استقامت آجائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا[1] (تحقیق جنہوں نے کہا، رب ہمارا اللہ ہے، پھر اسی پر پختہ رہے)

اور فرمایا:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ[2] (سو تو سیدھا چلا جا، جیسا تجھے حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ)

---

[1] حم السجدہ آیت ۳۰

[2] ہود آیت ۱۱۲

ایک جگہ فرمایا؛

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ [1] (پھر مانا اس کو لوط نے اور وہ بولا، میں وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف سے)

چنانچہ جب ایمان لائے تو اس کی جانب گئے یعنی رجوع کیا۔ یعنی توبہ کی۔ پھر جن امور میں توبہ کرتے ہیں تو ان میں زہد اختیار کرتے ہیں تاکہ توبہ صحیح ہو جائے اور نیت میں خلوص آجائے اور یہ توبۃ النصوح بن جائے۔

جیسے کہ فرمانِ الٰہی ہے؛

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ [2] (جو تم پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہتا ہے)

اور فرمایا؛

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۔ (اور آخرت ہی بہتر اور باقی رہنے والی ہے)

فرمایا؛

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ۔ [3] (اور بیچ آئے اس کو ناقص مول پر گنتی کے کئی درہم، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار)

یعنی جب انہوں نے حضرت یوسفؑ کو اپنے قبضہ سے نکال کر الگ کیا اور انہیں چھوڑ کر (یعنی بے رغبت ہو کر) اپنے والد کے پاس آئے اور حضرت یوسفؑ کے بارے میں زہد (بے رغبتی) اختیار کی۔ اس کے بعد جس میں زہد کیا اس میں صبر کرے تاکہ اس کا زہد سچا ہو جائے (یہ نہ ہو کہ چند روز زہد رکھے اور پھر انہی چیزوں میں آن پڑے بلکہ زہد و بے رغبتی پر استقامت و صبر دکھائے)

جیسے کہ فرمایا؛

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے)

اور ایک جگہ فرمایا؛

---

[1] العنکبوت آیت ۲۶

[2] النحل آیت ۹۶

[3] یوسف آیت ۲۰

وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔
(اور اپنے صبر کے لیے صبر کرے)

اس کے بعد جس پر صبر کیا اس پر شکر کرے تاکہ اس کا صبر کامل ہو جائے۔ جیسے کہ فرمایا:
لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔
(اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں)

وَ مَا بِكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔
(اور تمہارے پاس جو نعمت ہے وہ اللہ سے ہے)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔
(اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو)

شکر کے بعد امید و رجاء رکھے تاکہ مزید فضل ملے اور اللہ تعالیٰ اس کے حسن ظن کی وجہ سے اس کے مانگنے سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا جیسے کہ فرمان ہے:
وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ۔
(اور وہ اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے)

اور جو رحمت سے مایوس ہوا اس کی مذمت کی۔ فرمایا:
وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ[1]
(اور اگر ہم آدمی کو اپنی طرف سے رحمت چکھا دیں، پھر ہم اسے اس سے چھین لیں تو وہ ناامید ناشکر ہے)

پھر ڈرے کہ شکر میں کمی نہ رہ جائے۔ اس طرح مزید انعام ملنے میں کمی سے ڈرتا رہے۔ ایسا کرنے سے رجاء میں فرحت ہوگی اور تغیر سے اس کا ڈر و خوف کامل ہو جائے گا اور مزید کے نقصان سے خوف زدہ رہے گا۔ جیسے کہ فرمایا:
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا[2]
(پکارتے ہیں اپنے رب کو خوف اور لالچ سے)

اور اپنے اولیاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:
اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا[3]
(ہم بھی تھے اپنے گھر میں ڈرتے رہتے، پھر احسان کیا اللہ نے ہم پر)

اور جس پر کچھ انعام ظاہر کیا اور وہ فرحت میں پڑ گیا اور اس پر فخر کرنے لگا۔ دوبارہ ابتلاء سے بے خوف ہو بیٹھا۔ اس بات کو بھول گیا کہ وہ ابتلاء میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں اس کی مذمت کی:
وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ
(اور اگر ہم نے اسے تکلیف کے بعد آرام چکھا دیں

---

[1] ہود آیت ۹
[2] السجدہ آیت ۱۶
[3] الطور آیت ۲۶، ۲۷

لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ[1] (جو اسے پہنچیں تو کہے کہ مجھ سے بُرائیاں گئیں تو وہ خوشی کرے بڑائیاں کرتا)

اس کے بعد جس میں خوف کھایا اس میں خدا پر توکل رکھے اور اپنا آپ اس کے سپرد کر دے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے اس طرح ڈال دے کہ وہ جو چاہے اس پر حکم نافذ فرمائے۔ اس لیے فرمان ہے:

وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[2] (اور اللہ پر توکل کرو، اگر تم مومن ہو)

اور فرمایا:

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ[3] (خوب اجر ملا کام والوں کو جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں)

پھر جس پر توکل کیا اور جس کی خاطر اس سے توکل کیا اس پر راضی رہے اس لیے کہ وہی حکمت و تدبیر حسن کا جاننے والا ہے۔ فرمایا:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ۔ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے)

اور فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ[4] (اور کچھ لوگ اپنی جان بیچتا ہے، اللہ کی خوشی تلاش کرتے ہوئے)

پھر جس پر راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوا، اس سے محبت رکھے اس لیے کہ اس کے ماسوا پر اس نے اسی کو پسند کیا اور جب اس کو دیکھا اس کے لیے کافی ہوا۔ ان نو مقامات کا باہمی ارتباط ہے اور کتاب اللہ اس کی دلیل ہے جو حق الیقین، نور مبین ہے جس میں کہیں سے باطل کا گزر نہیں ہو سکتا۔ یہ مقامات اسلام کے پانچ ارکان کی طرح ہیں جیسے ان کا باہمی ربط ہے۔ اس طرح طریقِ مقربین میں مقام خواص میں ان کا بھی باہمی ربط ہے اور مقامِ محبت کے بعد آہستہ آہستہ حسبِ قوت حالِ رضا میں ترقی حاصل ہوتی ہے اور مقامِ محبت میں ہر ایک آدمی اپنے اپنے درجہ پر ہوتا ہے اور حالِ رضا سے بالاتر کوئی معروف مقام نہیں اور نہ ہی مقامِ محبت سے بالاتر کوئی معلوم وصف ہے۔ یہ دونوں باعثِ معرفت اور ان کا منتہا معروف تعالیٰ ہے اور ان کا اقرار مالوف کریم ہے۔ فرمایا:

---

[1] ہود آیت ۱۰
[2] المائدہ آیت ۲۳
[3] العنکبوت آیت ۵۸، ۵۹
[4] البقرہ آیت ۲۰۷

وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی ؕ[1] (اور بیشک تیرے رب کی طرف پہنچنا ہے)

اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِنِ الْمُسْتَقَرُّ ؕ[2] (تیرے رب تک اسی دن کا جا ٹھہرنا)

رضا، طلب، حب اور قرب کی کوئی انتہا نہیں

رضا کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ محبوب تعالیٰ کی کوئی غایت و انتہا نہیں اور جنت میں اہلِ جنت کے لیے رضا مزید انعام ہے اور محبت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ یہ وصف ہے اور صفات کی انتہا نہیں ہوا کرتی اور محب کی طلب بھی بے انتہاء ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ قرب سے ہے اور قرب کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ یہ قریب تعالیٰ کے وصف سے ہے اور قرب کی کوئی حد نہیں۔

اہلِ ایمان کو محبت میں اسی قدر بلند مقامات ملتے ہیں۔ جس قدر ان پر معانی صفات کے ساتھ حبیبؐ کی تجلی ہوتی ہے اور اہلِ رضا کے درجاتِ رضا میں اسی قدر علوّ و رفعت ہوتی ہے جس قدر انہیں علوِ مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور اہلِ علیین کو اسی قدر بلندی ملتی ہے جس قدر ان کو قوتِ ایمان و صفائے یقین حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ؕ[3] (اور تم ہی غالب رہوگے اگر تم ایمان رکھتے ہو)

چنانچہ انہیں اپنے بلند و بالا وصف کے مفاہیم سے عطا فرمایا۔ پھر ان کے وصف کے ساتھ ان کا حصہ بیان کیا۔ فرمایا:

اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ؕ وَ مَآ اَدْرٰىکَ مَا عِلِّیُّوْنَ ؕ[4] (لکھا نیکوں کا ہے اوپر والوں میں اور تجھے کیا خبر ہے کیا ہیں اوپر والے)

چنانچہ عِلِّیُّوْنَ کی رفعت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ یہ وصف میں اسمائے مبالغہ میں سے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اسم ہے اور اس کی جنس سے اس کا واحد نہیں۔ چنانچہ وہ ان کے علوّ میں علیّ (بلند) ہے۔ دارِ ابد میں ان کے علو کے علو میں ان کے ساتھ ہمیشہ بلند ہوتا رہے گا اور وہ لوگ بلند و اعلیٰ ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے وہ اس اعلیٰ تعالیٰ کے ساتھ بلندی حاصل کریں گے اور عِلِّیُّوْنَ ان کی وجہ سے بلند ہوتا رہے گا۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ وہ (اعلیٰ تعالیٰ) ان کے ساتھ ہے۔ فرمایا:

---

[1] النجم آیت ۴۲
[2] القیمۃ آیت ۱۲
[3] آل عمران آیت ۱۳۹
[4] المطففین آیت ۱۸، ۱۹

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰہُ مَعَکُمْ[1] (اور تم رہو گے اوپر اور اللہ تمہارے ساتھ ہے)

مقامِ خُلّت چنانچہ رضائے اوّل جو محبت سے پہلے ہے۔ یہ مقامِ توکل ہے اور محبوب کے محب کا حال، اس کا حال ہے اور محبت کے بعد رضائے ثانی، مقامِ معرفت ہے اور محبوب کا حال، حالِ توکل ہے اور محبت دراصل تمام مقامات سے اعلیٰ تر ہے۔ اس سے بلند صرف مقامِ خُلّت ہے اور یہ خاص معرفت کا ایک مقام ہے۔ اس میں اسرارِ غیبی نفوذ کر جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ مشاہدۂ محبوب سے سرفراز ہوتا ہے یعنی اسے اپنی مشیت کے ساتھ اس کی غیر تبدل مشیت پر اور غیر متغیر علم قدیم پر اپنے علم سے ایک چیز کا احاطہ عطا کرتا ہے۔

اس مقام میں بندے کو بحارِ غیبی اور قدیم میں ہو چکنے والے اسرار اور آئندہ کے عواقب پر اشراف و اطلاع حاصل ہوتی ہے اور مکاشفہ بھی اسی سے ہے اور محبت سے مشاہدہ اس کا مقام ہے اور بندوں کے انجام اور ابد میں بندوں کے ایک ایک حال کے تغیر پر انہیں اشراف واطلاع ملتی ہے۔

حضرت ابُویزید بسطامی اور ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہما کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں یہ مقام ملا اور انہیں یہ حال عطا ہُوا۔

حضرت شقیقؒ اور ابن ادھم بلخیؒ کو بھی ان مفاہیم پر اطلاع حاصل تھی۔ بابی الفیضؒ بھی اس راہ پر گامزن تھے اور ان سے حیرت انگیز اور عقل کو دنگ کر دینے والے عجائبات ظاہر ہُوئے جو کہ اہل چشم کے لیے بصیرت ہیں اور یہ سب چیزیں قلبی عقول کی وجہ سے دلوں سے اوجھل ہیں اور ارواح کی وجہ سے ہی قلوب میں جاگزیں ہیں۔ جب رُوح سے نفس نکل جاتا ہے تو وہ روحانی بن جاتا ہے جیسے کہ رات نکل جائے تو مریض کو چین آجاتا ہے اور جب دل سے عقل جدا ہو جائے تو یہ ربانی ہو کر تمام پریشانیوں سے نجات پا جاتا ہے جیسے ایک عارف کا شعر ہے۔

بِحَیَاتِیْ یَا حَیَاتِیْ لَا تُبْعِدْ قُرُبَاتِیْ
اَخْرِجِ النَّفْسَ مِنَ الرُّوْحِ وَ زَوِّحْ کُرُبَاتِیْ

(اے میری زندگی تجھے قسم ہے، میری قربات کو دُور نہ کر)
(رُوح سے نفس کو نکال دے اور مجھے مصائب سے چین دے)

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

---

[1] سورۃ محمد آیت ۳۵

وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ[1] (اور وہ اس کے علم سے کچھ چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے)

استثناء دراصل وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ پر واقع ہے جو علمی مشاہدہ اور اس کے وصف کے نور سے اور سبحانہ، تعالیٰ کے انوارات و تجلیات سے، جب چاہے یہ مفہوم ایک رازِ توحید ہے جو صرف صاحبِ یقین کے سامنے کھلتا ہے۔ ایک عارفؒ ہی یہ مفہوم ظاہر کرے تو معلوم ہوتا ہے، جو اس پر ہے اس سے آگاہ کرایا، جو اس سے ہے وہ کھولا گیا۔ اب نظر پر نظر ہوگی اور فانوسِ قلب میں چراغ روشن ہوگا۔

شیخ ابوالحسن بن سالم رحمۃ اللہ علیہ کو اس طریق سے مشاہدات و سیاحاتِ غیبی حاصل تھیں اور ان کے سامنے کئی اعیان اُلٹ کر اصل عیان ظاہر ہوئے انہیں طیّ الارض حاصل تھا (یعنی زمین سکڑ جاتی اور ایک قدم میں طویل سفر طے ہو جاتا) انہوں نے ایک ہزار ولی اللہ کو دیکھا اور ہر ایک سے علم حاصل کیا۔ پھر ان کے بعد یہ طریق ہی مٹ کر ناپید ہو گیا اور اس کا نشان ہی جاتا رہا۔ پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ اس طریق اور اہل طریق کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ کیا کوئی اس کا اہل پیدا کرے گا اور اس طریق کے غوامض پر کسی کو آگاہ کرے گا، یا علم ازلی کے غوامض میں اس طریق اور ان اہل طریق کو مخفی و پوشیدہ کر دے گا اور اس طریق کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دے گا؟

اس موضوع پر ہم وہی کہتے ہیں جو امام الائمہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے فرمائی۔ انہوں نے خطبہ میں قیامت قائم ہونے، اہلِ جنت اور اہل دوزخ کے ان دونوں مقامات میں جانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کے بعد وہ اس دنیا کے ساتھ کیا کرنے والا ہے۔ یہ اس کا راز در راز ہے جو حاکم تعالیٰ نے مخفی رکھا!" اور مقامِ خلّت سے بالاتر صرف مقامِ نبوت ہے اور یہ دلوں سے اسی طرح مستور ہے جیسے کہ یہ مقامِ خلت عوام کے دلوں سے مستور ہے۔ اس میں فوت (رہ جانا) نہیں۔ اس لیے کہ اس سے ادراک ہے اور اس پر غم نہیں۔ اس لیے کہ اس سے کوئی حصّہ ہی نہیں، اس لیے کہ اس سے کچھ حصّہ نہیں اور مقامِ خلت ہر حال میں مقامِ محبوب ہوتا ہے۔ اور میں نے علمائے باطن اور عارفین میں سے کسی سے علمِ خلت کے بارے میں کچھ بات نہیں سنی اور نہ ہی کتاب اللہ میں ایسے محبوب کی تعریف و اشارہ دیکھا۔ البتہ روایات و آثار میں اشارات و نکات دیکھے ہیں۔

---

[1] سورۃ بقرۃ آیت ۲۵۵۔

دراصل مقامِ خلت سے بحث کرنے والا کلام حجاب میں ہے۔ البتہ کتاب اللہ کے اسلوبِ خطاب میں یہ مخفی اور پوشیدہ ضرور ہے۔ آیاتِ قرآن میں ایک سربستہ راز ہے جو قلب و نظر سے بھی مستور ہے۔ ساجدین کو کھولنے والا اور اہلِ راز عارفین پر ہویدا ہے۔

اَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [1] (کیوں نہ سجدے کریں اللہ کو، جو نکالتا چھپی چیز آسمانوں میں اور زمین میں)

ایک جگہ فرمایا:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ [2] (کہہ دو، اس کو اتارا ہے اس نے جو جانتا ہے چھپے ہوئے آسمانوں میں اور زمین میں)

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ مقامِ خلت کے بارے میں بتایا کرتے، فرماتے:

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ولی کی طرف وحی فرمائی:

"میں اُسے اپنا خلیل بناتا ہوں جو میری یاد میں سستی و کوتاہی نہ کرے اور میری مخلوق میں سے کسی چیز کو مجھ پر ترجیح نہ دے۔ اگر اسے آگ میں جلایا جائے تو وہ آگ سے جلنے پر درد (کا احساس) نہ پائے اور اگر اسے آروں سے چیرا جائے تو لوہا چھونے کا درد نہ پائے (محسوس تک نہ ہو)۔

خلیلِ حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے:

"اللہ کی خاطر باہم محبت رکھو اور باہم صاف رہو (ایک دوسرے پر) خرچ کرو، اور اسی خاطر اختلاط رکھو۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا کرم نہیں کہ اس نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو خلیل بنایا؟" اس میں انہوں نے آگاہ فرمایا کہ مقامِ خلت دراصل اللہ تعالیٰ کے ازحد فضل و کرم سے ہے۔ اس نے اپنے کرم و احسان سے انہیں یہ مقام عطا کیا اور انہیں یہ بلند درجہ عظمت بخشی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم وسیع اور فضل بہت زیادہ ہے کہ بندے کو حدوں سے بالاتر رفعت بخشتا ہے اور ایک کو حد سے نیچے گرا دیتا ہے۔

اس مقام کے بارے میں حضرت جنیدؒ نے کلام کیا۔ ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا:

"یہ انتہائی محبت ہے اور ایسا بلند مقام ہے جس سے عقل حیراں اور لوگ ساکت ہیں اور یہ علمِ معرفت باللہ میں اعلیٰ ترین مقام ہے۔"

---

[1] النمل آیت ۲۵

[2] الفرقان آیت ۶

فرمایا، "اس مقام میں بندہ جانتا ہے کہ اللہ عزوجل اس سے محبت رکھتا ہے اور ایسا بندہ یوں کہا کرتا ہے،
بحقی علیک و بجاهی عندك ۔
(جو میرا تجھ پر حق ہے اور تیرے نزدیک میرا جو درجہ ہے اس کے واسطہ سے)

اور یوں کہتا ہے،

بحبك لی ۔ (تجھے جو مجھ سے محبت ہے)

فرمایا، "یہی لوگ اللہ تبارک و تعالیٰ پر ناز کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مانوس ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے جلیس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور ان کے درمیان انقباض ہٹا دیا۔ اپنے اور ان کے درمیان وحشت ختم کر دی۔ یہ لوگ ایسا کلام کرتے ہیں کہ عوام کے نزدیک لگتا ہے وہ اللہ کے ساتھ کفر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ اُن سے محبت رکھتا ہے اور اللہ کے ہاں ان کا ایک درجہ و مرتبہ ہے۔"

پھر بعض علماء سے روایت کرتے ہوئے بتایا،

"مگر اہل انس باللہ کو پہچاننے کا کوئی طریقہ نہیں۔"

یہ حضرت جنیدؒ کا کلام ہے۔ حضرت خاقانی مقریؒ سے بھی اس مفہوم کا کلام منقول ہے۔ اگر ہم ان سے یہ روایت نہ کرتے تو ہم اہل خرد پر ڈر کے مارے اس کی شرح بھی نہ کرتے جیسے کہ مجلی کا شعر ہے:

وَ اِنْ اَشْرَحْ ثَنَاءَكَ غَيْرَ اَنِّيْ ۔۔۔ اُجِلُّكَ عَنْ كِتَابٍ فِيْ كِتَابِ

(میں تیری ثنا کی وضاحت کرتا ہوں۔ البتہ میں کتاب میں کتاب سے بھی تیری عظمت زیادہ سمجھتا ہوں۔)

ہمارے شیخ ابوبکر بن جلاء رحمۃ اللہ علیہ نے شیخنا ابو الحسن بن سالم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف خط لکھا اور تحریر کی صورت میں بعض سرائر کے معانی دریافت کیے۔ بتاتے ہیں کہ انھوں نے وہ خط پھینک دیا اور فرمایا:

"یہ مسائل پوچھنے والا کون ہے؟" ان سے عرض کیا گیا کہ

"وہ یہاں نہیں بلکہ مکہ میں ہیں۔"

فرمایا، "وہ خط میں ان مسائل کا جواب نہیں دیں گے۔ اسے کہو، اگر وہ پوچھنا چاہتا ہے تو خود آجائے۔"

ابن جلاءؒ نے بھی یہی فرمایا ہے۔ اس لیے کہ مقامِ خلت وہ ہے جس کو ہم نے پوشیدہ رکھا اور اس کو عظمت دی۔ بندے کو یہ ایک مقام میں مقام کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ وصفِ باطن سے کشف ہو کر ظہورِ تعرف کے ذریعہ معرفتِ خاصہ ہی مقامِ اوّل ہے۔ پھر اس پر خاص محبت آتی ہے اور یہ مقامِ محبوب ہے۔ پھر اس مقام سے بلند ہو کر مقامِ خلت تک رسائی ملتی ہے اور مقامِ خلت میں عرش کی بلندیوں اور قدس کی ہواؤں وغیرہ تک کے رازہائے غیبیہ پر اطلاع و اشراف حاصل ہوتا ہے۔

اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مقامِ عارف میں مقاماتِ معرفت عطا کرتا ہے اور اس میں مقامِ محبوب عطا نہیں کرتا اور گاہے مقامِ محب میں مقاماتِ محبت عطا کرتا ہے اور خلیل عارف کے سوا کسی کو مشاہداتِ خلّت عطا نہیں فرماتا اور جب مقامِ معرفت ملا تو مقامِ محبت کی معرفت ہوئی۔ آخر مقامِ خلّت بھی عطا ہوا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اور عالمِ کون میں مخفی خزانے جو ظاہر ہوئے ان میں سے یہ ایک عزیز ترین مقام ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے وفات سے تین روز پہلے خطبہ دیا اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے صاحب (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو خلیل بنایا جیسے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل بنایا۔" چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محبوب میں درجہ خلیل تک رفعت و بلندی عطا ہوئی جیسے کہ مقامِ محب سے منتقل ہو کر مقامِ محبوب تک رسائی حاصل ہوئی۔ جیسے کہ مقامِ محبوب صفوۃ میں محبت کا اضافہ ہوا۔

اور پہلے مقام کے بارے میں فرمایا:

"بے شک اللہ عزّ وجل نے موسیٰ (علیہ السلام) کو صفی بنایا اور مجھے حبیب بنایا۔" چنانچہ پہلی عطا، خواہش سے صفا ہے۔ پھر صفا کے بعد محبت کی عطا ہے پھر محبت سے بلند وصفِ محبوب کی عطا ہے۔ پھر قوت و استوار کے بعد فعلی طور پر علی الاعلیٰ الکریم کی طرف رفعت ملی اور جب بلند ہوئے تو قریب ہوئے۔ حتّٰی کہ قریب ہو گئے۔

فرمایا:

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى۔[۱] (پھر رہ گیا فرق دو کمان کا میانہ یا اس کے نزدیک)

وطن پیچھے تھا اور خود اس کے چہرہ کے سامنے مواجہت فرما تھے۔

وَ كَانَ مَا كَانَ مِمَّا لَسْتُ اَذْكُرُهٗ فَظُنَّ خَيْرًا وَ لَا تَسْئَلْ عَنِ الْخَبَرِ

(اور ہوا جو ہوا، میں اس کا ذکر نہیں کرتا۔ بہتر ظن رکھو اور خبر کے بارے میں مت پوچھو)

اس لیے کہ ایک علم ایسا بھی ہے جس کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے۔ حتّٰی کہ عالم خود ہی اسے ظاہر کرے اور یہ اس سے ہے۔ چنانچہ یہ مقررہ مقدار میں ظاہر کرتا ہے۔ جس قدر کہ مبدی تعالیٰ نے ظاہر کیا اور جو معید تعالیٰ نے واپس کر دیا اسے واپس کرتا ہے اور جیسے اس کے قریب تھے ویسے ہی اس کے نزدیک خلیل ہیں۔ اب خلّت بھی محبوب میں ایک مقام ہوا جو کہ انتہائے مزید ہے جیسے کہ مقامِ محب پر مقامِ محبوب ہے اور مقامِ محب پر ایک اضافہ ہے جیسے کہ آپؐ کو کدورتِ ہویٰ سے پاک کر کے محبت تک رفعت بخشی اور اے سننے والے اس طرح تجھے بھی صفائی حاصل کرنے کے بعد نصیب سے ایک حصہ، شہادت پر ایک شہادت،

---

[۱] سورۃ النجم آیت ۹

وجد سے ایک وجد اور فقر سے ایک فقرِ نفس عطا کرے گا۔ اس لیے کہ تجھے چھوٹے سے عطیہ پر نبوت کا کثیر حصہ ضائع نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بخوشی عبادت گزاروں اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ انبیاءٔ و صدیقین تک بلند فرمایا اور صدیقین تو نزولِ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام تک رہیں گے اور یہ ابدال ہیں۔ ساری دنیا میں ان کی تعداد تین سو ہے اور جو اللہ چاہے ان میں شہداء و صالحین ہیں۔ ان کے تین طبقات ہیں اور یہ تمام ہی مقربین و سابقین ہیں۔ ان میں سے ایک صدیق کا ایمان، تمام شہداء کے ایمان کی طرح ہے اور ایک شہید کا ایمان، تمام صالحین کی طرح ہے اور ہر صالح کا ایمان، ایک ہزار عوام اہل اسلام مومنوں کے برابر ہے اور خلت میں خلیل کے سوا کوئی شریک نہیں۔ وہ ان خلیل کے ساتھ شریک ہیں نیز یہ مفرد کا فرد کی خاطر اور موحد کا واحد کی خاطر حال ہے اور اگر اس کی نظیر مناسب ہوتی اور کوئی اس کا وزیر ہوتا تو اس بات کے سب سے بڑے مستحق صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تین انعام دیے اور یہ انعامات ان کے سوا کسی کو نہیں دیے۔

مقامِ ابوبکر صدیق رض

ایک یہ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

"میری امت میں جو جو مجھ پر ایمان لایا۔ اللہ تعالیٰ نے (ان سب کے مجموعہ) پر تجھے عطا فرمایا اور اولادِ آدم (از اول تا آخر) میں سے جو جو مجھ پر ایمان لایا اللہ تعالیٰ نے مجھے (ان کے مجموعہ) پر عطا فرمایا۔"

دوسری حدیث یہ ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ کے تین سو خُلق ہیں۔ جس کو توحید کے ساتھ ساتھ ان میں سے ایک بھی حاصل ہُوا وُہ جنت میں داخل ہو گیا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رض نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا میرے اندر ان میں سے ایک خُلق ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"اے ابوبکرؓ! تیرے اندر سب ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سخاوت سب سے محبوب ہے۔"

تیسری حدیث یہ ہے۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں)

"میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو لٹکایا گیا۔ اس کے ایک پلڑے میں مجھے رکھا گیا اور میں سب سے بھاری ہو گیا اور (ابوبکرؓ) ایک پلڑے میں رکھے گئے اور (میری امت لائی گئی وہ دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تو ابوبکر ان سب سے بھاری نکلے۔" صدیق اور رسول کے درمیان صرف درجۂ نبوت کا فرق ہے۔

آج کا تبلب وُہ ہے جو ثانی ثلاثہ کا امام ہے۔ سات اوتاد، چالیس ابدال اور ستر سے تین سو تک

سب ایک پلڑے میں ہوں اور ان سب کا ایمان اس ایک کے ایمان کی طرح ہو۔ یہ در اصل ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بدل ہے اور اس کے بعد کے ثانی ثلثہ ہیں اور یہ آپؓ کے بعد کے تین ابدال خلفاء ہیں۔

اور سات در اصل سات سے دس تک ابدال ہیں۔ پھر تین سو تیرہ انصار و مہاجرین میں سے اہل رحمت و رضوان بدری ابدال ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایسی عظیم فضیلت و رفعت حاصل ہے مگر پھر بھی وہ مقامِ خلت میں حبیب، رسول، مقرب، خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شریک ہونے کے قابل ہیں اور اس مقامِ (محبت) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی شرکت حاصل ہے۔ فرمایا:

"جیسے موسیٰ کو ہارون تھے ایسے ہی علی مجھے بمنزلہ (ہارون) کے ہیں"۔ یہ مقامِ اخوت ہے۔ اس طرح مقامِ خلت میں تفرد میں فرمایا:

"اگر میں لوگوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکرؓ کو خلیل بناتا لیکن تمہارا صاحب (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تبارک و تعالیٰ کا خلیل ہے یعنی اپنے آپ کے بارے میں فرمایا۔ اس لیے کہ آپ واحد تعالیٰ کے لیے واحد اور فرد تعالیٰ کے لیے مفرد ہیں۔ اے دانش والو عبرت حاصل کرو اور خطابِ الٰہی پر غور و فکر کام لو۔"

جس کو صفا سے حصہ ملا اسے محبت سے حصہ ملا اور جس قدر اس کی محبت قوی ہوگی اس قدر اس کی معرفت قوی ہوگی اور جس قدر اسے اس کا عرفان حاصل ہوگا اس قدر اسے معرفت حاصل ہوگی۔ اور معرفت اصلیہ مشائخ کے نزدیک ایک ہے اور یہی مقامات کی اصل اور مشاہدات کا مکان و ظرف ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعہ معروف ہونے والی ذات تعالیٰ ایک ہے۔

البتہ اس کا ابتدائی اور اعلیٰ درجہ ضرور ہوتا ہے چنانچہ خواص مومنین اعلیٰ درجۂ معرفت میں ہوتے ہیں اور یہی مقربین کے مقامات ہیں اور عوام مومنین ابتدائی درجہ میں ہوتے ہیں اور یہ ابرار کے مقامات ہیں اور یہی اصحاب یمین ہیں اور ان میں سے ہر گروہ کو صفاتِ مخوفہ کا سامنا ہوتا ہے جس سے وہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں یا اخلاقِ رجاء کا سامنا ہوتا ہے جن سے وہ رجاء و امید رکھتے ہیں یا اس وقت افعال و املاک کا معاملہ ہوتا ہے اور وہ صبر و شکر کرتے ہیں یا اوصافِ ذات کے مفاہیم آتے ہیں اور محب و متوکل ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ[1] (اور ہر کسی کو ایک طرف ہے کہ منہ کرتا ہے اس طرف، تم سبقت چاہو نیکیوں میں)

---

[1] البقرہ آیت ۱۴۸

محبین کے بارہ مقامات

کہا کرتے ہیں :
" جس کو جس چیز سے محبت ہوگی حشر میں وہ اس کے ساتھ ہوگا " ۔

حدیث میں ہے ،
" آدمی اسی کے ساتھ ہے جس سے اسے محبت ہے اور اس کے لیے وہی ہے جو اس نے گمان رکھا "
ایک حدیث میں ہے ،
" جو آدمی جس مرتبہ پر مرے گا قیامت کو اس پر اٹھایا جائے گا "

چنانچہ کتاب اللہ میں محبین کے کل بارہ مقامات بیان کیے ہیں۔ پانچ مقام تو (اشارۃ النص میں) دلیل و تدبر خطاب سے ملتے ہیں اور سات مقامات ظاہری عقول سے صراحتِ نص کے ساتھ بیان کر دیے گئے ۔

جو سات صراحت کے ساتھ بیان کیے گئے وہ یہ ہیں ،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ [1] (اللہ کو خوش آتے توبہ کرنے والے اور خوش آتے ہیں ستھرائی والے)

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ [2] (اور اللہ پسند کرتا ہے صبر کرنے والوں کو)

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الشّٰكِرِيْنَ [3] (اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے شکر کرنے والوں کو)

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ [4] (اور اللہ پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو)

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ [5] (اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے محسنین کو)

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ [6] (اور اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے توکل کرنے والوں کو)

اور پانچ مقامات جو اشارہ سے بیان کیے وہ یہ ہیں ؛

لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ ۔ (کافروں کو پسند نہیں کرتا)

یعنی مومنین سے محبت رکھتا ہے ۔ اور فرمایا ؛

لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (ظالموں کو پسند نہیں کرتا)

یعنی عدل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ، اور

لَا يُحِبُّ الْفَاسِقِيْنَ ۔ (فاسقوں کو پسند نہیں کرتا)

یعنی سیدھی راہ پر چلنے والوں سے محبت رکھتا ہے اور ایک جگہ فرمایا ،

---

[1] البقرۃ آیت ۲۲۲

لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ۔ (تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

یعنی تواضع کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے، اور

لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ۔ (خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

یعنی ایفائے عہد کرنے والوں اور امانت داروں سے محبت رکھتا ہے۔ یہ محبوبین کے طبقات ہیں جن کو اشارہ اور صراحت کے ساتھ ذکر کیا اور ان اوصاف کی شرح ہی مقاماتِ یقین ہے۔

اس کے ہر مقام میں بکثرت احوال ہیں اور ان میں سے ہر حال در اصل اللہ عزوجل کی طرف ایک طریق ہے اور ہر طریق میں محبین کا ایک گروہ ہے۔ ان کی محبت ان کی معرفت کی مقدار پر ہے اور ان کی معرفت ان کے نزدیک معروف تعالیٰ کی حسنِ آگاہی پر ہے اور اس پر ہے کہ معروف تعالیٰ نے انہیں کیسی آگاہی بخشی۔ ان کے معارف کا یہی مطلب ہے۔ وہ لوگ اپنے یقین کے درجہ پر ہیں اور ان کا یقین اس درجہ کا ہے جس درجہ کی انہیں صفائی ایمان حاصل ہے اور ان کا ایمان اس قدر ہے جس قدر ان پر اللہ کی عنایت و فضل ہے۔ اور جس قدر ان پر اس کا کرم و احسان ہے۔ اس کے بعد رازِ قدر ہے جو مخفی خزانہ ہے۔ محبت سے اوپر کوئی مشہور مقام نہیں اور توبہ سے نیچے کوئی قابلِ ذکر حال نہیں۔ پہلا مقام توبہ کا ہے۔ اس کے ذریعہ ظلم سے نکلتا ہے اور ظلم در اصل شرک کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ[1] (بے شک شرک بڑا ظلم ہے)

اور فرمایا،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ[2] (جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کچھ تقصیر نہیں ملائی۔ انہی کو ہے امن)

یعنی آخرت میں انہیں امن ملے گا۔

وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔

یعنی دنیا میں یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہ واضح ترین خطاب ہے۔

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ[3] (اب دونوں فرقوں میں کس کو چاہیے خاطر جمع)

---

[1] لقمان آیت ۱۳

[2] انعام آیت ۸۳

[3] انعام آیت ۸۲

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ ۔ (جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کچھ تقصیر نہیں ملائی یہی)

یعنی کل مقامِ امین میں یہی لوگ مستحقِ امن ہوں گے اور ایک جگہ فرمان ہے:

وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ[1] (اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں)

چنانچہ ظلم کا انجام و آخر، توبہ کا آغاز ہے اور توبہ کا انجام محبت کا آغاز ہے اور محبت کا انجام معرفت کا آغاز ہے۔ یہی معرفت متصرف ہے اور یہی وہ خاصیت ہے جو پہلی محبت میں اضافہ کرتی ہے۔ معرفت سے بندے کا آخری حصہ اور توحید کا ابتدائی دراصل توحیدِ شاہدین ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں اور یہ متوسط ترین مقام ہے۔ زہد کا آغاز، خواہش کا انجام ہے اور زہد کا انجام، علم کا آغاز ہے اور علم کا آغاز خوف کی ابتدا ہے اور خوف کا انجام محبت کا آغاز ہے اور محبتِ محبوب ہے اور ظالم کے لیے نہ کوئی مقام ہے اور نہ کوئی درجہ ہے اور جس کا کچھ درجہ نہ ہو اس کے لیے کوئی سفارش نہیں اور جس کے لیے کوئی سفارش نہ ہو اس کی کوئی شہادت نہیں اور جس کی کوئی شہادت نہ ہو اس کا کوئی یقین نہیں۔

اب اگر اس کے قلب میں ذرہ بھر ایمان ہوتا تو اسے یہ سزا نہ ملتی۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں داخل ہونے والوں کا وصف بتایا:

"جس کے قلب میں ذرہ بھر بھی ایمان ہوگا اسے دوزخ سے نکال دیا جائے گا۔"

دوسری روایت میں ہے:

"سخاوت، یقین سے ہے اور صاحبِ یقین آدمی آگ میں داخل نہ ہوگا" اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس مذکورہ کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا:

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ[2] (نہیں پہنچتا میرا اقرار بے انصافوں کو)

دوسری جگہ پھر فرمایا:

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا[3] (نہیں اختیار رکھتے لوگ سفارش کا مگر جس نے لے لیا رحمٰن سے اقرار)

---

[1] الحجرات آیت ۱۱

[2] البقرۃ آیت ۱۲۴

[3] مریم آیت ۸۷

تیسری جگہ وضاحت فرمائی :

وَ لَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنْ شَھِدَ بِالْحَقِّ وَ ھُمْ یَعْلَمُوْنَ[1]

(اور اختیار نہیں رکھتے جن کو یہ پکارتے ہیں سفارش کا، مگر جس نے گواہی دی سچی اور ان کو خبر تھی)

اور مکاشفہ کے بعد روایت میں آنے والی کے بارے میں شہادتِ عین کے بعد وجد یقین کے متعلق فرمایا،

وَ کَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَکُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ۔[2]

(اور اسی طرح دکھانے لگے ہم ابراہیم کو سلطنت آسمان وزمین کی اور تا اس کو یقین آئے)

پھر فرمایا،

بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ اِنِّیْ وَجَدْتُّ۔ (ایک یقینی خبر، میں نے پائی)

اور جس طرح مشاہدہ کے بعد یقین ہوتا ہے اسی طرح یقین کے بعد وجد ہوتا ہے اور یقین دراصل ایمان کی حقیقت و کمال کا نام ہے۔ جیسے کہ روایت میں ہے :

"صبر، نصف ایمان ہے اور شکر، نصف ایمان ہے اور یقین، کامل ایمان ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ (میرا وعدہ ظالموں کو نہیں ملتا)

یعنی ظالموں کو مرتبہ و جاہ نہ ملے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ شفاعت نصیب نہیں ہوگی اور ایک قول میں ولایت اور ایک میں امامت نہیں ملے گی اور ظالم آدمی متقی لوگوں کا امام نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اہلِ ایمان جس کا اتباع کرتے ہیں وہ امام متقین ہے اور ظالم آدمی کو آگ کی دھمکی ہے۔ اسے بُرا انجام سُنا دیا گیا۔ اب جو اس سے محجوب ہے، اس کے سامنے کیسے سفارشی ہوگا اور اس کا شاہد کیسے بن سکے گا؟

دیکھیے فرمانِ الٰہی ہے،

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ (اور اللہ کو غافل گمان نہ کرنا، ان سے کاموں سے جو ظالم (لوگ) کرتے ہیں) الخ

سے لے کر وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔[3]

---

[1] الزخرف آیت ۸۶

[2] الانعام آیت ۷۶

[3] ابراہیم آیت ۴۲

اور ساتھ یہ بھی فرمایا ؛

فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ [۱] (پھر ہو جائے دوزخ والوں سے اور یہ ظالموں کی جزا ہے)

پھر اس کو مجمل طور پر بیان فرمایا ؛

وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں)

چنانچہ چھوٹے مظالم سے چھوٹے ظلم کی وجہ سے چھوٹی توبہ ہے اور بڑے مظالم سے بڑے ظلم کی وجہ سے بڑی توبہ ہے اور ظلم دراصل آج دل میں اندھیرا ظلمت ہے اور کل قیامت میں اندھیرا ہوگا اور توبہ انسان کو ظلم سے نکالتی ہے اور ظلم سے نکلنے کی وجہ سے وہ درجاتِ عہد میں داخل ہوگا اور ایفائے عہد کے باعث وہ اصلاح کی کوشش کرے گا اور اللہ تعالیٰ اصلاح کرنے والوں کا عمل ضائع نہیں کرتا ہے جیسے کہ فسادیوں کا کام درست نہیں کرتا۔ جب اس نے صالحات (نیکی کے کام) کیے تو وہ صالحین میں داخل ہو جائے گا اس لیے کہ اسے فضیلت ملی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ؛

وَ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ [۲] (اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی)

پہلے حصہ کی وضاحت اس طرح فرمائی ؛

وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ [۳] (اور اچھے عمل کرے ، ہم انہیں نیک لوگوں میں داخل کریں گے)

اب جو اصلاح کرے اور نیک اعمال رکھے اس کا وہ کارساز ہے اور جس کا کارساز اللہ ہو وہ اس کو سکھائے گا اور اس سے محبت رکھے گا۔ اسے اپنا مکاشفہ عطا کرے گا۔ اس کی حفاظت فرمائے گا اور وہی اس کے لیے کافی ہوگا۔ اسے اپنی پناہ عطا کرے گا۔ اس کا ظاہری حال، خواہش سے عصمت ہوگا۔ مولائے کریم سے اسے عینِ یقین کا بلند ترین مشاہدہ حاصل ہوگا اور جس نے ظلم کے کام کیے اس نے ظلم کیا اور جس نے ظلم کیا اس پر ویسا ہی مسلط کیا۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے اعراض فرمایا۔ اور جس سے اس نے اعراض کیا اس نے فساد کیا اور جس نے فساد کیا اس نے اس کو قطع کیا جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا تھا اور جس نے قطع کیا وہ خود بھی منقطع ہوا اور جو منقطع ہوا وہ ملعون و مردود ہوا اور جو مردود ہوا وہ اندھا و بہرہ کرنے والی خواہش میں دب کر اندھا

---

[۱] المائدہ آیت ۲۹

[۲] ہود آیت ۳

[۳] العنکبوت آیت ۹

اور بہرہ ہُوا اور جو اندھا ہُوا اس نے بصیر کو نہ دیکھا اور جو بہرہ ہُوا اس نے سمیع سے نہ سُنا۔ اب وہ خطاب پر غور کیسے کرے گا جبکہ اس کے قلب پر قفل پڑا ہے اور اس کا عزم اس کی خواہشِ نفس کے سامنے ہتھیار ڈالے ہے اور فتاح علیم تعالیٰ اس سے اعراض کیے ہُوئے ہے۔ اس کا تعلق اس فرمان سے ہے :

نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ؎۱ (اس طرح ہم ساتھ ملا دیں گے گناہ گاروں کا ایک دوسرے کا بدلہ ان کی کمائی کا)

اور فرمایا :

اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ؎۲ (اگر تم کو حکومت ہو کر خرابی ڈالو ملک میں)

تائب کا آغازِ محبت میں ایک حال ہوتا ہے اور توبہ کرنے والوں کا حقیقتِ محبت سے ایک مقام ہوتا ہے اور توبہ کے سلسلہ میں لوگوں کے کئی مقامات ہوتے ہیں یعنی جیسے کہ خواہشِ نفس میں پھنسنے کے لحاظ سے ان کے کئی طبقات ہیں اور محاسنِ صفات کے مشاہدہ کے اعتبار سے محبت میں ان کے مختلف درجات ہیں چنانچہ ہر ایک کے لیے اس کے حُسنِ چہرہ کے مطابق ہی تجلی ہوتی ہے۔ قلوب میں یہ بات ایمانی محاسن سے آتی ہے اور آخرت میں عیاں میں پائے جانے والے محاسنِ وجوہ کے مفاہیم کے اعتبار سے آئے گی۔ اس لیے کہ اس نے انہیں آج جن مفاہیم پر وجدان عطا کیا کل بھی ان پر حکمتِ مشیت اس سے لگے گا۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے یہ اس کے ارادہ کی قدرت ہے۔ ہر چیز پر اس کی رحمت وعلم احاطہ کناں ہے۔ ہر آدمی پر اسی قدر محنت و مجاہدہ لازم ہے جس قدر وہ مبتلائے خواہش ہے اور جس قدر اس کی توبہ صحیح ہے اسی قدر اس کے لیے محبت ثابت ہے اور جس قدر اسے مشاہدہ و مکاشفہ حاصل ہوگا اسی قدر اس سے مجاہدہ ساقط ہو جائے گا۔ چنانچہ اصحابِ مشاہدہ کو آلامِ جہاد سہنے پڑتے ہیں اور انسان کو ابتلاء میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے یقین کو شہادت و یقین تک رسائی مل جاتی ہے۔ یہ عافیت کاملہ اور نعمتِ تامہ ہے اور یہی وُہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیاء و صدیقین و شہداء اور انہی کے بارے میں روایت ہے :

" اللہ کی مخلوق میں بعض خواص بندے بھی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی رحمت کی خوراک دیتا ہے۔ انہیں اپنے سایۂ عافیت میں جگہ عطا کرتا ہے انہیں قتل و ابتلاء سے بچاتا ہے۔ انہیں عافیت کے ساتھ زندہ رکھتا ہے اور عافیت کے ساتھ انہیں جنت میں داخل کرتا ہے۔ یہی لوگ ایسے ہیں جن پر اندھیری رات کے حصّوں کی طرح

؎۱ الانعام آیت ۱۳۰

؎۲ محمد آیت ۲۲

خاطر چھوڑ دیا تو یہ ایک خصلت تُو کے مقابلہ میں پہاڑ بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر راہ راست نظرِ عفو فرمائی، اور ایک نظرِ عفو میں گناہوں کے نو بڑے بڑے پہاڑ اڑا کر نابُود کر دیے گا ہے ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے ایک وصف کو اچھا فرماتا ہے اور اس کے باعث اس کے ایک سو بُرے اوصاف مٹا دیتا ہے جن کا لوگ چرچا کرتے رہتے تھے۔ اس لیے کسی آدمی کو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور جاننے کے بعد کبھی بھی امید ختم نہ کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ وہ سردار کریم ورحیم ہے۔ بندے کو اس کا دروازہ کبھی نہ چھوڑنا چاہیے چاہے وہ کیسا بھی بُرا ہو اور اس کے آنگن سے دور نہ رہے چاہے کس قدر اوصافِ بُعد رکھتا ہو، چاہے وہ بعض ناپسندیدہ امور سے وحشت محسوس کرے مگر پھر بھی اس کی طرف قرب حاصل کرنے میں کوئی تنفر و وحشت کی ناپسندیدہ رکاوٹ دیکھے تو بھی متوحش نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ایسے ہی محبت کرتا ہے کہ وہ جاگ اٹھیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے یہی چاہتا ہے کہ وہ معرفت حاصل کریں اور معرفت کے بعد کام کریں۔ اس لیے کہ معروف تعالیٰ بڑے کرم اور وسیع رحمت وفضل والا ہے۔ اگر اس نے معرفت عطا کی تو کچھ نہ روکے گا اور جو روکا وہ کچھ مضر نہ ہوگا اور اگر معرفت ہی نہ دی تو کچھ نہ دے گا اور جو دیا وہ نفع بخش نہ ہوگا۔

گاہے محبتوں میں اختلاط سا واقع ہو جاتا ہے۔ محبتِ نعمت، محبتِ منعم میں داخل ہو جاتی ہے۔ محبتِ نفس محبتِ خالق نفس پر آجاتی ہے۔ عوام محبین جنہیں نظرِ یقین کا مکاشفہ حاصل نہیں، انہیں شبہ ہو جاتا ہے بندہ نعمتوں سے محبت کر رہا ہوتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ میں منعم تعالیٰ سے محبت کرتا ہوں۔ بندہ اپنے نفس سے محبت رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں مولائے کریم سے محبت رکھتا ہوں۔

اس کی علامت یہ ہے کہ وہ اشیاء ملنے پر پرسکون ہو جاتا ہے۔ موجودات کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اپنی خواہش مل جانے پر راحت و لذت محسوس کرتا ہے۔ گاہے اللہ تعالیٰ اس کی موت سے پہلے اس کا حال کھول دیتا ہے اور گاہے اس کی پردہ پوشی کرتا ہے اور اس کی رسوائی نہیں کرتا۔ آخر اس سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ثواب اور اس کی جزا عطا کرتا ہے اور ان دو باتوں میں صرف اسے ہی فرق محسوس ہوتا ہے جو گہرا علم اور پختہ یقین رکھتا ہو اور اس کا قلب نور سے معمور ہو۔ چشمۂ توحید سے اسے صاف یقین حاصل ہو اور قیومیت کا مشاہدہ کیا ہو۔ اس لیے کہ یہ دراصل صفاتِ غیبیہ اور افعالِ ملکوتیہ کے مشاہدہ کے باب سے ہے اور وہی ذات انتیاد بتانے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ مومنین سے وعدہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا [1] (اے ایمان والو! اگر ڈرتے رہو گے اللہ سے، تو کر دے گا تم میں فیصلہ)

---

[1] الانفال آیت ۲۹

ایک قول کے مطابق، ایسا نور عطا کرے گا۔ جس کے ذریعہ تم شبہات میں فرق کر سکو گے اور اس فرمان میں یہی مخرج ہے جس کی اصحابِ تقویٰ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی۔ فرمایا،

وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا [1]

(اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے، کر دے اس کا گزارہ)

ایک قول یہ ہے کہ ہر تنگی کے معاملے سے نکالے گا۔ چنانچہ اہلِ نظر کے شواہد سے مفاہیم ترجید کی وضاحت بہت ہی مشکل مسئلہ ہے اور فنا میں تفرقہ دبقا، پر بہت سوں کی شہادت بھی ایک پوشیدہ ترین بات ہے اور عام طور پر شنوائی میں نہ آنے والی چیز کی شرح پر بھی اکثر انکار کیا جاتا ہے۔ البتہ جس کو اس سے کچھ حصہ ملا، وہ ان کا مشاہدہ کرے گا۔ جن کو ہم نے اشاروں میں بیان کر دیا اور جس کو ہم نے پوشیدہ رکھا۔ اس کے لیے یہ کھل جائیگا البتہ یہ بات ضرور ہے کہ دل میں دو میں سے ایک طریق غالب آتا ہے۔

خواص نے اللہ کے ساتھ بطریقِ مشاہدہ صفات محبت کی۔ ان کی محبت قلب و وجد کے ساتھ ہے کبھی بھی نہیں بدلتی اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات تک یہ حضرات ثابت قدم ہیں۔ انہیں حضرات نے تعظیم و محبت اور اجلال و کبریا کے طریق پر اس کی عبادت کی۔ ان میں مقربین، محبوبین، خائفین، عاملین، متوکلین اور اہل رضا ہیں اور یہ اعلیٰ ترین مقام ہے اور آخرت میں یہ اللہ کے ہاں اعلون (اعلیٰ وارفع) ہوں گے اور عوام نے بطریق مراجید افعال اس سے محبت کی۔ یعنی نعمتیں، احسانات، سخاوت کے ہاتھ اور فضل وجود دیکھ کر محبت کی۔ ظاہری عافیتوں اور ظاہر شدہ رازوں کے باعث محبت کی۔ ان لوگوں نے شہوت، عادت اور ضرورت کے طور پر اس کی عبادت کی۔ ان کی محبت، اس کی طرف سے نفع و آسائش ملنے کی خاطر ہے۔ یہ اس لیے محبت کرتے ہیں کہ وہ بادشاہ اور ہر چیز کا مالک ہے۔ چنانچہ احکام (واحوال) بدل جانے سے ان کی محبت بھی بدل جاتی ہے۔ یہ لوگ زہد اور اخلاص سے محروم ہیں۔ ان پر نفسانی خواہش کا غلبہ ہے۔ جس نے انہیں خلوص سے محروم رکھا اور صفائی سے دُور رہے۔ یہ ان کے اوصاف ہیں جو ان پر لوٹنے والے ہیں۔ ان کی محبت کے باعث تحول و تقلب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جن افعال سے انہیں محبت ہے ان کی وجہ سے تحول ہے۔ اس لیے پھر جاتے ہیں اور ان پر طرح طرح کے ناپسندیدہ حالات آتے ہیں تو ان میں تغیر آجاتا ہے انہی میں سالکین، عاملین، اہلِ رجاء، اہلِ طمع اور تائبین ہیں اور اصحابِ یمین بھی انہی میں سے ہیں۔

ایک عارف رحمہ کا فرمان ہے؛

"جو محبت بھی کسی عوض سے آئے۔ اگر عوض ختم ہو جائے تو محبت بھی ختم ہو جاتی ہے"۔ چنانچہ ان میں سے

---

[1] الطلاق آیت ۲

بعض نے اپنے مقام میں اپنا حال سمجھ لیا اور محبت و مشاہدہ میں نقص و کمی کا اعتراف کر کے توبہ واستغفار کیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔

بعض کا یقین کمزور تھا۔ انہیں ناقص ہونے کی وجہ سے التباس و شبہ ہوا۔ اس کی محبت، ذات سے متصل صفات کے اعتبار سے نہ ہے اور پردہ کھل جانے پر ایسے آدمی کے بارے میں خطرہ ہے۔ اس لیے کہ یہ مکر و ہلاکت کی راہ ہے اور فریب و مشقت اور شک و فتنہ میں مبتلا ہے۔ ہاں اگر اللہ اپنی رحمت سے تدارک کر دے تو یہ اپنے مقام میں اپنی حد پر ٹھہرے گا اور اسے اپنے حال کی طرف لوٹا دے گا۔ آخر وہ محبت و مشاہدہ کی دوری نہ تو بہ واستغفار کرے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا اور اسے اہل عفو میں داخل کر کے آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ جیسے کہ دنیا میں اس کی پردہ پوشی کی۔ اس طرح اس کی دارین میں رب سے پردے پردے میں ملاقات ہوئی یہ مذکورہ امور صادق محبین کے خوف و خطرات ہیں۔ اس لیے کہ یہ اظہارِ محبت سے ،ظہورِ محبت نہیں۔ اب ایسا آدمی بھی تقلب و فریب میں ہے۔

البتہ محبتِ افعال والوں کی دو قسمیں ہیں؛

ا۔ بعض اس کے افعال کے باعث اس سے محبت رکھتے ہیں سوائے اس صورت کے کہ اس سے کچھ مشاہدہ حاصل ہو جائے تو اس میں اس کو دیکھے۔ اب اس کو بصارت حاصل ہو گی اور مجاہدہ میں کوشش کرے گا۔ اور بقائے حال کی خاطر صفائی محبت میں محنت کرے گا یہ ان دونوں میں اعلیٰ صورت ہے اور یہ عوام اہل آخرت کی محبت ہے۔ جن کو صرف اس کی محبت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اسی کا سوال کرتے ہیں۔

۲۔ بعض پر افعال متغیر ہو جاتے ہیں اور عادت سے نکال دیتا ہے۔ اس پر پے در پے ابتلاء آتا ہے۔ مال و جان میں عافیت کم ہو جاتی ہے اور اس کی صفت باہر نکلتی ہے اور اس سے بیزاری و ناراضگی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ آدمی کا ہے دعوائے محبت میں رسوا ہوتا ہے اور پردہ کے بعد اس کا اصل بھید کھل جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ محبین میں اس کو ایک ذرہ بھر درجہ حاصل نہیں اور یہ اہل دنیا کی محبت ہے۔ اس کی خاطر یہ مشقت اٹھاتے ہیں اور دنیا ہی کا سوال کرتے ہیں۔

عوام و خواص کی محبت

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔ " اللہ کی محبت میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں؛

ا۔ خاص

۲۔ عام "

چنانچہ عوام نے تو خدا تعالیٰ کے دائمی احسان اور کثرتِ انعامات کے باعث اپنی معرفت کے ذریعہ یہ چیز

حاصل کی۔ چنانچہ وہ اسے راضی نہ کرسکے۔ ہاں البتہ ان کی محبت نعم و احسان کی مقدار کے مطابق کم زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور خواص کو عظیم قدرو ندرت اور علم و حکمت کے ذریعہ محبت حاصل ہوئی اور مالک تعالیٰ کے ساتھ تفرد کے باعث محبت ملی۔ جب انہوں نے کامل صفات اور اسمائے حسنہ سے آگاہی حاصل کی تو محبت سے نہ رک سکے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک وہی محبت کا مستحق ہے کیونکہ وہی اس کا اہل ہے۔ چاہے تمام نعمتیں ان سے چھن جائیں۔

بعض لوگ خواہشِ نفس کے محب ہوتے ہیں یا ابلیس لعنۃ اللہ علیہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود شدتِ جہالت و فریب کے باعث اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو محمد ہر آدمی کو یہ کہا کرتے:

"اے دوست!" ان سے میں نے کہا:

"کیا وہ آدمی حبیب نہیں ہوتا اور آپ اسے دوست کہہ دیتے ہیں؟"

انہوں نے میرے کان میں آہستہ سے کہا:

"وہ آدمی یا تو مومن ہو گا یا منافق ہو گا۔ اب اگر مومن ہے تو وہ اللہ عزوجل کا دوست ہے اور اگر منافق ہے تو وہ ابلیس کا دوست ہے۔"

اخروی وعدوں پر دنیا کے نفسانی مزوں کو ترجیح دینا، خواہش سے محبت کی علامت ہے اور دنیا کی باتوں کو اللہ کی محبت پر مقدم رکھے اور محبتِ ہوی اور کراہتِ حق اختیار کرے۔ خوشی میں بُرائی کا حکم دے۔ جو بھلائی کی بات ظاہر ہوتی ہے اس میں جھوٹا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ [1]

(اور شاید تم کو بُری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تم کو اور شاید تم کو خوش لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تم کو)

چنانچہ اس کی محبت کو شر کے ساتھ ملایا اور اس کی کراہت کو خیر کے ساتھ ملا کر ذکر کیا اور عرب کہا کرتے ہیں: النفس کذبۃ یعنی اس سے بکثرت جھوٹ صادر ہوتا ہے یعنی مبالغہ کے ساتھ جھوٹ بولتا ہے۔ اس فرمان کے مفہوم پر

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ [2]

(خرابی ہے ہر طعنے دینے والے عیب چننے والے کے لیے)

---

[1] البقرۃ آیت ۲۱۶

[2] ہمزہ آیت ۱

یعنی کثرت سے عیب جوئی اور طعنہ زنی ہو۔ اسی طرح امر بالسّوء کا مبالغہ کرنا اس کا وصف بتایا:

لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ۔ (البتہ وُہ برائی کا حکم کرنے والا ہے)

یعنی کثرت سے اور بار بار ایسے فعل اس سے سرزد ہوتے ہیں اور دشمن (شیطان) کی محبت دراصل اس کی اطاعت اور موافقت کرنے کا نام ہے۔ اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی و مخالفت ہے اور اس کی جبلت ہی اللہ کی پسند کے برعکس پر ہے اور اللہ نے اسے جس حال پر بنایا وہ اس کے برعکس کو پسند کرتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لیے ابتلاء ہے اور اس کے ذریعہ اللہ کی طرف سے ہم پر بھی امتحان و ابتلاء ہے۔

یہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے جو ایمان عطا کیا، جو صحیح توحید بخشی اور تھوڑا سا بھی جو اخلاص و صدق اور حُسنِ معاملہ عطا فرمایا وُہ اس سے بہتر اور زیادہ نفع بخش ہے جو تیرے لیے ظاہر کیا، تجھے بتایا اور تُو نے جو دیکھا، اور اس کی طلب کی اور اسے اپنے ہاتھ میں لیا اور جس درجہ پر تو فائز ہُوا وُہ تیرا ہے اور جو تو نے طلب ہی نہیں کیا اور نہ ہی اسے حاصل کیا وہ تیرے سوا کسی دوسرے کا ہے کیونکہ گاہے تو آسمان دیکھتا ہے مگر اسے حاصل نہیں کرتا اور یہ زمین جس کے لیے مسخر ہُوئی اسی کی ہے اور گاہے تو دُوسرے کی چیز دیکھتا ہے، مگر وہ تیرے لیے نفع مند نہیں اور نہ ہی تیری طرف سے کفایت کرتا ہے اور جس کو اس پر تسلط حاصل ہُوا اس لیے وُہ نفع بخش ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔

بعض کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جس کا اظہار ہُوا یہ اس کو بخش دیا گیا اور جو اس نے دیکھا اور اس سے آگاہ ہُوا اس کا مالک بن گیا اور اسی کے لیے مخصوص ہو گیا۔

خاطر، حال اور مقام میں فرق

یاد رکھیں۔ ایک ہزار خاطر سے بھی ایک حال نہیں مل سکتا اور ایک ہزار حال سے ایک مقام ملتا ہے اور مقام وُہ ہے جو ثابت رہے اور دوام اختیار کرے۔ خواطر اس طرح گزر جاتے جیسے کہ آندھی میں بادل تیزی سے گزر جائے۔ مثال دیتے ہیں کہ گرمی کا بادل پھٹ جاتا ہے۔ احوال کی مثال ایسے ہے جیسے کہ احوال میں زمانے سرایت کیے ہوتے ہیں۔ ہر سال میں چار زمانے ہوتے ہیں:

۱۔ سرما
۲۔ گرما
۳۔ بہار
۴۔ خزاں

اللہ تعالیٰ کا ہبہ و بخشش وُہ مشاہدہ ہے جس کی قلب میں توقیر و تعظیم ہو اور اعمال جس درجہ کو پختہ بنا دیں ، اس پر خاص علم یا اعلیٰ ترین خلق یا عمدہ حال یا اخلاق صالحین سے پاکیزہ وصف ملے گا جو صالحین خصوصاً اہلِ تقویٰ کے اخلاق ، اہلِ معرفت کے علوم اور مقربین کے مشاہدات و ملاحظات سے ہے اس کو بھی عطا ہو گا۔

اور اس علم کے بارے میں صرف اسی کے سامنے کلام کرنا جائز ہے۔ جس کو اس کا مشاہدہ حاصل ہو اگر علوم قدرت و توحید سے ہو۔ یا اس کو اعمال کر کرکے ، دنیا میں زہد کرکے اور طلبِ آخرت میں محنت کر کے اسے ایک درجہ حاصل ہو جائے۔ اگر یہ علمی پند و نصائح اور فضائل کی جانب سے ہو۔ یہ سب باتیں توبہ کے بعد اور استقامت اختیار کر کے حاصل ہوتی ہے اور علمِ سنّت و جماعت اور آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصول و سنن کے علم کی آگاہی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے ورنہ ایسا آدمی صرف تکلف کرنے والا اور دعوے باندھنے والا ہی شمار ہو گا اور اگر کوئی سُنی سنائی بات بیان کرے تو وُہ حکایت کرنے والا ہے اور صاحبِ حال کا حال بیان کرے تو وہ روایت کرنے والا ہی ہو گا۔

اور صرف زیبائش کرنا یعنی ظاہری لباس ایسا بنا لینا اور دکھلاوا تصنع اختیار کر رکھنا دراصل دنیاوی زینت اور خواہش کی زیبائش ہے۔ اسی طرح تمنا کرنے کا حال ہے یعنی جس کا گمان عقل کرے یا نفس اس وہم میں پڑ جائے اور وہم اس کی قدر کرے یا خناس لعنۃ اللہ علیہ ایسا وسوسہ ڈال دے۔ یہ سب باتیں بیان سے نہیں ہوتیں اور نہ ہی انہیں علمِ یقین سے کچھ درجہ حاصل ہے بلکہ یہ شیطانی وساوس ہیں اور شیاطین کی مجلس کے اثرات ہیں۔ اس لیے کہ گناہوں کی وجہ سے دلوں کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" جو طبیب بن گیا اور طب جانتا نہیں ، پھر اس نے قتل کر دیا تو وُہ ضامن ہے "۔ (یعنی غلط علاج سے مار دیا تو وُہ ضامن ہے) اب لوگوں کو قتل کرنے پر کلام کرنے والا ان کا قاتل ہے اور بے شمار اظہار ایسے ہیں جن کے ساتھ فریب واقع ہوتا ہے اور وہ ظہور بہت ہی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ جس کے ساتھ حقیقت واقع ہو اور اللہ تعالےٰ زبانوں اور اعضاء پر اپنے خزانۂ ملک سے جو چاہتا ہے ظاہر فرماتا ہے۔ یہ خزائن ارض ہیں۔ ان میں تدبیر و حکمت کا معاملہ ہے جیسے کہ سلطنتِ ارضی میں تدبیر و حکمت ہے اور ان خزائن کے علوم ، ظاہری علوم ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے بندوں پہ اللہ تعالیٰ کی حجتیں ہیں اور جو چاہتا ہے خزائنِ ملکوت سے ظاہر فرماتا ہے اور یہ قلوب و بصائر اور خزانے و ذخائر ہیں۔ یہ خزائنِ ملکوت کی طرح ہیں اور وُہ آسمانی خزانے ہیں۔ ان میں قدرت و آیات ہیں جیسے کہ آسمانوں میں ہیں اور ان خزائن کے علوم ، علمِ یقین سے ہیں اور یہی نفع دینے والا باطنی علم ہے۔ جس سے محبت رکھتا ہے اسی کو اس علم کے ساتھ مخصوص فرماتا ہے اور یہی

اولیائے مقربین ہیں۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ[1] (اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں)

وَ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا[2] (اور اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا)

یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ[3] (اپنی رحمت کے خاص کرتا ہے اس پر جس کو چاہے)

اور اللہ بزرگ و عظیم کے بغیر نہ قوت ہے اور نہ استطاعت ہے۔

مقامِ محبت کی تشریح میں یہ آخری کلمات ہیں اور مقاماتِ یقین کی توضیح میں یہ آخری الفاظ ہیں

اسلام کے پانچ ارکان

شہادتِ توحید کی فرضیت و تشریح

سب سے پہلے اہلِ ایمان پر شہادتِ توحید فرض ہے اور اس کے فضائل کی توضیح ضروری ہے اور یہ مقربین کی شہادت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہے اور اہلِ یقین کے لیے فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور انبیاء علیہم السلام نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ؛

فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ[4] (سو جان لے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ)

اور اسی طرح اپنے بندوں کو فرمایا؛

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ[5] (سو جان لے کہ یہ اللہ کے علم کے ساتھ نازل کیا گیا اور یہ کہ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں)

چنانچہ فرضِ توحید یہ ہے کہ دل سے عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور عدد سے نہیں اور اوّل سے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں۔

موجود ہے اس میں کچھ شبہ نہیں۔ حاضر ہے، غائب و غیر موجود نہیں۔ عالم ہے جاہل نہیں۔ قادر ہے عاجز نہیں۔ زندہ ہے مرے گا نہیں۔ قیوم ہے غافل نہیں۔ بردبار ہے، جلدبازی نہیں کرتا۔ سننے دیکھنے والا ہے۔ بادشاہ ہے، اس کی بادشاہی کو زوال نہیں۔ وقت کے بغیر قدیم ہے۔ حد کے بغیر آخر۔ (کوئی حد نہیں)

---

[1] انعام آیت ۵۷ — [2] الکہف آیت ۲۶

[3] آل عمران آیت ۷۴ — [4] محمد آیت ۱۹

[5] ہود آیت ۱۴

رہنے والا ہے اس پر فنا نہیں۔ رہنا اس کی دائمی صفت ہے۔ اس نے اپنی ذات کو پیدا نہیں کیا (یعنی حادث نہیں)، ابد الآباد دائمی ہے۔ اس کے دوام کی کوئی انتہا نہیں۔ دیومت اس کی صفت ہے۔ جو اس نے اپنی ذات کے لیے پیدا نہیں کی (یعنی یہ صفت حادث نہیں)۔ اس کے کون کا آغاز نہیں۔ اس کے قدم کی ابتدا نہیں۔ اس کی ابدیت کا انجام نہیں۔ وہ اپنی اولیت میں آخر ہے اور اپنی آخریت میں اول ہے اس کے اسماء و انوار وصفات نہ مخلوق ہیں اور نہ اس سے جدا ہیں۔

وہ ہر چیز سے آگے ہے، ہر چیز سے پیچھے ہے، ہر چیز کے اوپر ہے، ہر چیز کے ساتھ ہے۔ نفسِ چیز سے بھی ہر چیز کو قریب تر ہے۔ اس کے باوجود وہ اشیا کا محل نہیں اور اشیا بھی اس کے اندر نہیں۔ اس نے عرش پر قرار پکڑا جیسے چاہا اور بغیر کیف وتشبیہ کے قرار پکڑا۔

وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو اس کے سامنے ہے، فضاء اس کے پیچھے ہے۔ ہوا سامنے ہے اور مکان اس کے پیچھے سے ہے اور حوال سامنے ہے اور بعد اس کے پیچھے ہے۔

اور یہ تمام باتیں مخلوقات کے حجابات ہیں۔ زمینوں اور آسمانوں کے ورے سے۔ لطیف اجرام کے ساتھ متصل اور کثیف اجسام سے جدا ہیں اور جن کے لیے اس کی مشیت ہوئی۔ ان کے لیے یہ مقامات ہیں، اور اس فرمان میں داخل ہیں۔

وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ۔ (اور ہم نے ہر چیز سے جوڑے پیدا کیے)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا میں داخل ہیں:

رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمٰوٰتِ وَ مِلْءُ الْاَرْضِ وَ مِلْءُ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ۔ (اے پروردگار! تیری حمد ہے آسمانوں بھر اور زمین بھرا اور اس چیز پر جو اس کے بعد تو چاہے)

اللہ جل جلالہٗ بنفسہٖ ذات منفرد ہے۔ اپنے اوصاف کے ساتھ ایک ہے۔ کسی چیز میں مختلط نہیں ہوتی اور نہ ملتی ہے۔ اپنی تمام مخلوق سے جدا ہے۔ وہ اجسام میں حلول نہیں کرتا اور اعراض اس میں حلول نہیں کرتیں اس کی ذات میں اس کا غیر نہیں اور نہ اس کے غیر میں اس کی ذات کا کچھ حصہ بھی ہے۔ مخلوق میں صرف مخلوق ہی ہے ذات تبارک و تعالیٰ میں صرف خالق کریم ہی ہے۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ اسماء وصفات، قدرت و عظمت اور کلام و مشیت کا مالک ہے۔ اس کے تمام انوار غیر مخلوق اور غیر حادث ہیں اور اپنی تمام صفات و اسماء اور کلام و انوار و ارادہ کے ساتھ ہمیشہ قائم و موجود رہے گا۔ اس پر

کبھی فنا نہیں آئے گی۔ وُہ صاحبِ ملک و ملکوت اور صاحب عزت و جبروت ہے۔ مخلوق و امر و سلطان و غلبہ کا وہی مالک ہے۔ اپنی مخلوق و سلطنت کو اپنے امر سے جو چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ اس کے حکم کے بعد کوئی حکم نہیں دے سکتا۔ اس کی مشیت کے بعد بندے کی مشیت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اگر کسی چیز کے بارے میں وہ چاہے تو وہ ہوگی اور صرف وہی ہوگی جو وہ چاہے گا۔ بندہ اس کی رحمت سے ہی معصیت سے بچتا ہے اور اس کی محبت کے باعث ہی اس کی طاعت و عبادت کی توفیق ملتی ہے۔ ان سب میں وُہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور ان میں سے کسی چیز میں اس کا کوئی مددگار نہیں۔ وعید ڈالنا اس پر لازم نہیں بلکہ معانی میں بھی اسی کی مشیت کا فیصلہ ہے۔

جو احکام ہم پر جاری ہُوئے ان کے سلسلہ میں اس پر کچھ لازم نہیں۔ افعال کے ذریعہ اس کی خبر نہیں ملتی اور نہ ہی قول میں اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی حکمت و عدل کے ساتھ حکیم و عادل ہے۔ یہ دونوں اس کی صفات ہیں۔ اس کی حکمت مخلوق کے مشابہ نہیں۔ اس کے عدل کو بندوں کے عدل پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ جو احکام بندوں پر لازم ہیں وہ اس ذات تبارک و تعالیٰ پر لازم نہیں اور جس طرح بندوں پر اسمائے مذمت آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اسماء مذمومہ سے پاک و بالاتر ہے۔

عقلوں سے بالاتر، وہم و فہم و دانش سے بلند ہے۔ وُہ ایسے ہے جیسے اس نے خود اپنی توصیف فرمائی اور مخلوق کے بیان کردہ وصف سے بالا ہے۔ ہم اس کا وصف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت و مروی روایات کے ساتھ ہی کرتے ہیں اور وُہ ایسا ہے کہ

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔ (اس کی مثل کچھ چیز نہیں)

ہر چیز میں اسماء و صفات کے اثبات میں وُہ بے مثال ہے۔ نفی تمثیل و ادوات میں بھی وہ بے مثال ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس پر کبھی فناء نہیں آئے گی۔ اس کی صفات ہمیشہ اس کے ساتھ قائم رہیں گی۔ ان پر بھی فناء نہیں ہے اور بغیر کسی انتہاء و انجام اور بغیر کسی کیف و تشبیہ و تثنیہ کے ہے بلکہ وہ توحید کے ساتھ یکہ و تنہا اور تفرید کے ساتھ منفرد و واحد ہے۔

اس پر قیاس جاری نہیں ہوتا۔ لوگوں کے ساتھ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ جنس کے ساتھ اس کی صفت بیان نہیں کی جا سکتی۔ کسی حس سے یا کسی چیز کی جنس سے اس کو چھوا اور محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کسی چیز کی طرف اختلاط پذیر نہیں ہوتا۔ اس کے اسماء و صفات و انوار و کلام کے علاوہ ملک و ملکوت کی ہر چیز حادث اور ظاہر کردہ ہے۔ جب قدیم و اول نہ تھا تب بھی وہ تھا بلکہ وہ حادث اوقات اور موقت زمانوں کے ساتھ ساتھ موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ ہی ازل سے ہے اور اس پر فنا نہیں۔ ابدی ہے اس پر عدم نہیں۔ اپنی صفتِ قیومیت کے ساتھ

قیوم ہے۔ اپنی صفات دیموموت کے ساتھ دیموم (دائمی) ہے۔ اوّل کے بغیر اوّل ہے اور ایسے بھی نہیں کہ اوّل (ایک عدد) سے ہو۔ آخر ہے اور آخر کی حقیقت (یعنی انجام ہو جانے کے اعتبار سے) آخر نہیں (بلکہ دائمی ہے) ایک ہے بے نیاز۔ نہ اس نے جنا اور اسی مفہوم میں نہ وہ جنا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خود کسی چیز سے متولد نہیں ہوا اور نہ ہی اس سے کوئی چیز متولد ہوئی۔ (یعنی اس کا کوئی مخلوق جزو (حصّہ) نہیں۔ اسی طرح اس کی ذات سے کچھ چیز پیدا نہیں ہوئی جیسے کہ اس کی ذات کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئی۔ ملحدین جو کہتے ہیں ان سب باتوں سے وہ پاک ہے اور بہت بہت بلند ہے۔

شہادت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضیت

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلْکَبِیْرُ الْمُتَعَالُ۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ[1]

(اور جب لیا اللہ نے اقرار نبیوں کا، پھر جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچ بتائے تمہارے پاس والی کو تو اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے)

ایک جگہ فرمایا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ[2]

(جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)

اور فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ[3]

(بے شک جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے، وہ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے)

اب شہادتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضیت یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ وہ ہر چیز کتاب پر نگہبان ہے اور پہلے نازل ہونیوالی

---

[1] آل عمران آیت ۸۱

[2] النساء آیت ۸۰

[3] الفتح آیت ۱۰

تمام کتب سماوی کی تصدیق کرتا ہے اور آپ کی شریعت پہلی تمام شرائع کی ناسخ ہے اور انہیں محتم کرنے والی ہے سوائے اس کے کتاب اللہ میں وہ رہی اور اس کے موافق تھی اور کتاب اللہ پہلی کتابوں پر شاہد و حاکم ہے اور یہ وہ نبی ہیں کہ جن کی آمد کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو سنائی۔ تورات و انجیل اور دوسری تمام کتب الٰہی میں انہی کا تذکرہ ہے اور انہی کے درجات بیان کیے گئے۔ یہی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ میثاق لیا کہ اگر اس کا زمانہ پایا تو اس پر ایمان لائیں گے اور اس کی مدد و نصرت کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا وعدہ کیا اور ان کی شہادت پر اللہ تعالیٰ نے شہادت دی اور یہ وہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے بارے میں پہلے انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں سے اقرار کیا۔ وہ ان پر ایمان لائیں اور ان کی تصدیق کرنے کا انہیں حکم دیا اور ان کی آمد کی انہیں اطلاع دی اور اگر حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام بھی ان کا زمانہ پائیں تو ان پر بھی آپ کا اتباع لازم ہے اور آپ کی شریعت میں آنا ضروری ہے بنی اسرائیل میں باقی ماندہ یہودی اور وہ عیسائی جو آپ کی رسالت کے منکر ہیں وہ سب کافر ہیں اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب اللہ پر ایمان لانا ان کی اپنی کتابوں کی رُو سے اور ان کے اپنے رسولوں کے احکام کی وجہ سے ان پر فرض ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت ساری مخلوق پر فرض ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ومحبت بھی سب پر فرض ہے۔ آپ کے اوامر کا اتباع اور مناہی سے پرہیز کرنا ساری امت پر فرض ہے اور یہ ایسا واجب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے واجب کیا اور ایسا فریضہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے فرض کردہ احکام کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرض ہے۔

شہادتِ رسالت کے فرائض

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ[1]

(کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) بھی مجھے پائیں تو انہیں بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہو۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] آل عمران آیت ۳۱

"پھر (اگر) وہ دونوں مجھ پر ایمان نہ لائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں آگ میں اوندھا ڈال دے"۔

اسرائیلیات میں مروی ہے کہ ایک آدمی دو سو برس تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا رہا اور اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی و سرکشی میں بڑھ بڑھ کر جرأت و دیدہ دلیری دکھاتا رہا۔ جب وہ مر گیا تو بنی اسرائیل نے اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹ کر ایک کوڑی کے ڈھیر پہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےؑ کو وحی فرمائی:

"اس کو غسل دے کر کفن پہناؤ اور تمام بنی اسرائیل (سب کو لے کر) اس کا جنازہ پڑھو"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ اس بات پر بنی اسرائیل کو تعجب ہوا اور لوگوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا کوئی سرکش اور زیادہ نافرمان نہ تھا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا!

"میں جانتا ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات کا حکم دیا ہے"۔

انہوں نے کہا:

"اپنے رب سے ہمارے لیے معلوم کریں"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگارؔ سے التجا کی۔ اور کہا،

"اے پروردگار! تو جانتا ہے جو یہ کہہ رہے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"انہوں نے سچ کہا کہ اس نے دو سو سال تک میری نافرمانی کی مگر ایک روز اس نے تورات کو کھول کر اس میں میرے حبیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لکھا دیکھا تو اس کو بوسہ دیا اور دونوں آنکھوں پر رکھا۔ میں نے اس لیے اس نام کی قدر کی اور دو سو برس کے گناہ بخش دیے"۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب سے بھی اس مفہوم کی روایت آتی ہے۔ بتایا کہ (دورِ جاہلیت میں) میں ابولہب کا بھائی بنا ہوا تھا۔ جب وہ مرا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دوزخی ہونے کی خبر دی تو مجھے اس پر غم ہوا اور اس کے معاملہ کی فکر ہوئی۔ میں نے دعا کی کہ وہ مجھے خواب میں نظر آئے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا وہ آگ کے شعلوں میں جل رہا تھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں آگ کے عذاب میں مبتلا ہوں اور اس میں نہ کبھی تخفیف ہوتی ہے اور نہ آرام ملتا ہے۔ البتہ راتوں اور دنوں میں پیر کی رات کو مجھ سے عذاب ہٹ جاتا ہے۔ میں نے پوچھا، "وہ کیوں؟"

اس نے بتایا: اس رات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ حضرت آمنہ کی لونڈی نے آکر

مجھے خوشخبری سُنائی تو مجھے اس بات سے خوشی ہوئی اور اس خوشی پر میں نے اپنی ایک لونڈی آزاد کر دی۔ پیر کی رات کو اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ سے عذاب ہٹا دیتا ہے۔"

حقیقی محبت کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ [1] (وہ محبت کرتے ہیں اس سے وہ وطن چھوڑ آئیں ان کے پاس)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (اور اپنی جانوں پر انہیں ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ اپنے آپ پر بھوک ہو)

آپؐ کے آثار وسنن کو ترجیح دے۔ مال جان اور قول سے آپ کی نصرت کرے اور آپؐ سے محبت کی ایک نشانی یہ ہے کہ ظاہری و باطنی طور پر آپؐ کا اتباع کرے۔ ظاہری اتباع یہ ہے کہ فرائض ادا کرے حرام امور سے پرہیز رکھے۔ آپؐ کے اخلاق اپنائے اور آپؐ کے آداب وشمائل پر چلے۔ آپؐ کے آثار و اخبار کی تلاش و پیروی کرے۔ دنیا میں زہد اختیار کرے اور دنیا والوں سے علیحدہ ہو جائے۔ غافل لوگوں اور خواہش کے بندوں سے قطع تعلق کر لے۔ دنیا کی کثرت اور دنیا پر فخر کرنا چھوڑ دے۔ اخروی اعمال میں لگ جائے اور اہل آخرت کا قرب حاصل کرے۔ فقراء سے دوستی و محبت رکھے۔ ان کی مجالس میں کثرت سے جائے، ان سے قرب رہے اور دنیا داروں پر فقراء کو افضل تسلیم کرے۔ حال کا اتباع کرنا مقاماتِ یقین اور مشاہداتِ علومِ ایمان ہے مثلاً خوف ورضا، شکر وحیا، تسلیم وتوکل، شوق ومحبت، اللہ تعالیٰ کے لیے دل کو فارغ کر دینا، تنہا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا فکر رکھنا اور ذکر اللہ میں اطمینان وسکون پانا۔ یہ خواص کے کام ہیں اور باطنِ رسول کے مفاہیم کا کچھ حصہ ہے اور یہی آپؐ کا ظاہری و باطنی اتباع ہے جس کو اس سے کچھ ملا اسے بہت وافر حصہ ملا۔ یعنی فرمانِ الٰہی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (کہہ دو۔ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا)

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے تھے:

"اللہ سے محبت کی علامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] الحشر آیت ۹

کی تابعداری کی علامت، دنیا میں زہد اختیار کرنا ہے۔"

فرمانِ الٰہی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ[1] (اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے سو وہ بھی ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا)

اس کی تفسیر میں بتایا کہ:

"فرائضِ خداوندی کا پابند رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر چلتا رہے" جب ایک آدمی بدعات سے پرہیز رکھے گا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ سے مزین ہوگا تو وہ منزلت میں آپ کے موافق (یعنی آپ کے قریب) ہو جائے گا۔

شہادتِ توحید کے فضائل
سچے اہلِ توحید کی معرفت

صفاتِ الٰہی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ[2]

(اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی حاکم انصاف کا)

ایک جگہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ[3] (اور جو اپنی گواہی پر سیدھے ہیں)

چنانچہ صاحبِ یقین آدمی کی اپنے یقین کے باعث شہادت یہ ہوگی کہ ہر چیز میں اول اللہ تعالیٰ ہی ہے اور ہر چیز سے قریب ترین، اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی عطا کرنے والا، روکنے والا ہے۔ وہی ہادی و مضل ہے اللہ کے بغیر کوئی عطا کرنے والا ہے، نہ کوئی روکنے والا اور نہ نفع و نقصان دینے والا ہے۔ جیسے کہ اللہ کے بغیر کوئی الٰہ (معبود) نہیں۔ اللہ کا اس سے قریب ہونا اس کی طرف ہونا، اس پر قدرت و احاطہ ہونا ہے چنانچہ ہر چیز سے پہلے اس کی نگاہ و فکر اللہ عزوجل کی طرف جاتی ہے۔ ہر چیز میں وہ اسے ہی یاد کرتا ہے اور ہر

---

[1] النساء آیت ۶۹

[2] آل عمران آیت ۱۸

[3]

غیر سے اس کا دل خالی ہو جاتا ہے۔ ہر چیز کے معاملہ میں خدا کی طرف ہی رجوع کرتا ہے اور ہر چیز کو چھوڑ کر صرف اللہ ہی کو معبود و خدا سمجھتا ہے اور یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ بھی اس کے قلب کو زیادہ قریب ہے۔ اس کی رُوح جس قدر زندگی کے قریب ہے اور بینائی آنکھ کے جس قدر قریب ہے اور قرب اس کا وصف ہے۔ تقریب و تقرب کے اعتبار سے یہ معاملہ نہیں۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہُوئے اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور وہ رفیع الدرجات ہے جیسے بھی ہے۔

رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ؕ[1] (اُونچے درجوں کا مالک تخت کا)

اور ثریٰ اور ہر چیز سے اُس کا قُرب ایسے ہے جیسے کہ عرش سے قرب ہے۔ عرش اس کو کسی حس کے ذریعہ لمس نہیں کر رہا اور نہ کسی خیال کے ذریعہ اس کو فکر میں لا سکتا ہے۔ نہ اس کی طرف آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ اور نہ ہی اس کا نیچے سے احاطہ کیے ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے باعث اپنی تمام مخلوق سے حجاب میں ہے اور عرش کو اس سے صرف اس قدر حصہ حاصل ہے جیسے کہ ایک صاحبِ یقین عالم کو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے کہ وہ اس پر ہے۔

اور عرش، اس کے ساتھ معلق ہے ... اور اللہ تعالیٰ اپنے عرش کا احاطہ فرما ہے۔ ہر چیز کے اوپر اور ہر چیز کے تحت کے اوپر ہے۔ چنانچہ وُہی فوق الفوق اور تحت الفوق ہے اور ایسے تحت کے ساتھ اس کی توصیف نہیں کی جا سکتی ہے کہ اس سے اوپر کوئی اور فوق ہو، اس لیے کہ ہر جگہ وہی بلند و بالا و بزرگ ہے۔

اس کے علم و قدرت سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ کسی "جگہ" کے ساتھ اس کی تحدید نہیں کی جا سکتی ہے اور نہ کسی جگہ سے وُہ غیر موجود ہے اور نہ ہی ایک مکان میں (محدود) ہو کر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسفل کے لیے تحت اور اعلیٰ کے لیے فوق ہے۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہر فوق سے اُوپر ہے اور ہر تحت سے اوپر ہے۔ بلندی میں وہی ملائکہ ثریٰ کے اوپر ہے۔ جیسے کہ ملائکہ عرش اور اماکن ممکنات کے اُوپر ہے۔ اس کا مکان اس کی مشیت ہے۔ اس کا وجود، اس کی قدرت ہے۔ عرش اور ثریٰ اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے وُہ مخلوق اسفل اور مخلوقِ اعلیٰ کی نسبت سے بمنزلہ ایک رائی کے ہے جو اس کے ہاتھ میں ہو اور اس سے اعلیٰ و بلند ہے۔ ان پر احاطہ کناں ہے۔ احاطہ اس کی صفت ہے اور وسعت اس کی قدرت ہے۔ علو اس کی عظمت ہے۔ اس کا عقل ادراک نہیں کر سکتی اور

---

[1] المومن آیت ۱۵

نہ ہی وہم وخیال اس کو سمجھ سکتے ہیں۔اس کے علو کی کوئی انتہا نہیں۔اس کی بلندی پر کوئی فوق نہیں۔اس کے قُرب میں کوئی بُعد نہیں۔اس کے وجود .... میں کوئی احساس نہیں۔اس کے شہود (موجود ہونے) میں کوئی مس نہیں۔اس کے موثر ہونے کا ادراک نہیں اور اس کے احاطہ کا کوئی احاطہ (سمجھ) نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے فرمایا :

يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ [1] (ڈر رکھتے ہیں اپنے رب کا اوپر سے)

ایک جگہ فرمایا :

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى [2] (اپنے برتر رب کے نام کی پاکیزگی بیان کر)

اور فرمایا :

أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ۔ (یاد رکھو وہ ہر چیز پر احاطہ کناں ہے)

اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز محجوب نہیں کرسکتی۔کوئی چیز اس پر بعید نہیں۔اپنے وصف کے ساتھ ہر چیز کے قریب ہے اور یہ قدرت ودرک ہے اور اشیاء اپنے اوصاف کے ساتھ دور ہیں۔یعنی بُعد (حجابات کے اعتبار سے بعید شمار ہوتی ہیں)

چنانچہ بُعد اور ابعاد، اس کی مشیئت کا حکم ہے اور حدود و اقطار دراصل اس کی مخلوق کے حجابات ہیں اور مسافت اور مقام ملاقات اس کے غیر کے مکان ہیں اور اطراف و سمتیں دراصل حادثات اشیاء کے مقامات ہیں اور شب و روز متغیرات کے مساکن ہیں اور بُعد و فضا دراصل مخلوق کے مقام ہیں۔توسع اور ہوا دراصل جہانوں کے محل ہیں اور احکام و اقدار اس کی مخلوق پر واقع ہوتے ہیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ مقدار و احکام سے بالاتر ہے۔عقلوں اور اوہام سے ماوراء ہے۔اقدار سے آگے ہے افکار سے اپنی عزت و غلبہ کے باعث مستور ہے۔کسی فکر میں صورت گر نہیں ہوسکتا اور نہ کسی وہم و عقل میں سماتا ہے۔

اس کی ذات و حقیقت عقلوں سے مستور ہے۔عقلیں اس کی صفات کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔وہ بے مثال ہے اور کسی مثال سے اس کی معرفت حاصل کرنا ناممکن ہے۔وہ بے جنس ہے کہ کسی جنس پر قیاس کرلیا جائے۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْأَرْضِ [3] (اور وہ اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ [4] (پھر قائم عرش پر)

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ [5] (اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو)

---

[1] النحل ۵۰ [2] الاعلیٰ ۱ [3] انعام ۳ [4] یونس ۳ [5] الحدید ۴ ۔

نہ مخلوق سے متصل ہے اور نہ اس سے جدا (دور) ہے۔ کون کے لیے جائے مس نہیں اور نہ بعید ہے بلکہ وہ اپنی ذات تعالیٰ کے ساتھ منفرد، اپنے وصف کے ساتھ متحد ہے۔ کسی چیز سے اختلاط پذیر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا کسی چیز سے اقتران ہوتا ہے۔

قرب کے ساتھ ہر چیز سے قریب ہے اور یہ اس کا وصف ہے۔ ہر چیز پر احاطہ کر کے محیط ہے اور یہ اسکی صفت ہے۔ وہ ہر چیز کے ساتھ ہے، ہر چیز کے اُوپر ہے، ہر چیز سے آگے ہے، ہر چیز سے وراء ہے اور (یہ بات، علو در نو کے ساتھ ہے۔ یہ اس کا قرب ہے۔ وُہ حول سے وراء ہے جو کہ حاملینِ عرش سے ورا (پرے) ہے اور وُہ شہ رگ سے قریب ہے جو کہ روح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وُہ ہر چیز کے اُوپر ہے۔ ہر چیز پر احاطہ کناں ہے۔ کوئی چیز اسے محیط نہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ خود کسی چیز کا مکان نہیں اور نہ کوئی چیز اس کا مکان ہے اور ان سب باتوں میں کوئی چیز اس کی مثال نہیں۔ اس کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی مخلوق میں کوئی اس کا مددگار نہیں۔ اس کے بندوں میں سے کوئی اس کی نظیر نہیں اور اس کے انحاد میں کوئی اس کی شبیہ نہیں۔

وُہ اپنی آخریت میں اوّلیت کے ساتھ اوّل ہے اور یہ (اوّلیت) اس کی صفت ہے اور آخریت کے ساتھ اپنی اولیت میں آخر ہے اور یہ (آخریت) اس کا وصف ہے اور باطنیت کے ساتھ اپنے ظہور میں وُہ باطن ہے اور یہ (باطنیت) اس کا قرب ہے اور ظہور کے ساتھ اپنی باطنیت میں ظاہر ہے اور یہ (ظہور) اس کا علو ہے۔

ازل سے ایسے ہی ہے اور ابد تک ایسے ہی رہے گا۔ اس پر تضاد نہیں آتا۔ اس پر حوادث و آباد جاری نہیں ہوتے۔ کمی بیشی سے پاک ہے۔ اپنے آپ کے لیے اپنے اختیار کے ساتھ وُہ عرش پر ہے۔ عرش، اس کی مخلوق اعلیٰ کی حد ہے اور وُہ اپنے عرش کے ساتھ محدود نہیں بلکہ وہ اس سے بلند ہے اور عرش مکان کا محتاج ہے اور رب تعالیٰ اس کا محتاج نہیں۔ جیسے کہ تھا۔ فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔

الرحمٰن اس کا اسم ہے اور استوا، اس کی نعت و صفت ہے جو اس کی ذات کریم سے متصل ہے اور عرش اس کی مخلوق ہے۔ یہ اس کی صفات سے جُدا اور منفصل ہے۔

وُہ ایسے مکان کا محتاج نہیں کہ جو اسے وسیع ہو اور نہ حامل کا محتاج ہے کہ اسے اُٹھائے۔ نہ احاطہ کا محتاج ہے کہ اسے جمع کرے۔ نہ کسی مخلوق کا محتاج ہے کہ اسے موجود کرے۔ وُہ اپنے مخفی لطف کے ذریعہ عرش اور حاملینِ عرش کا حامل (اٹھانے والا) ہے۔ اپنی لطیف صنعت کے ساتھ عرش اور (ملائکہ) محافظین کا جامع ہے۔ اپنے پوشیدہ لطف اور لطیف قرب کے باعث، اپنی مخصوص رحمت کی وجہ سے، اپنے اسماء و

صفات کے مفاہیم کی تجلی سے جس کو چاہا اور جو چاہا وجود بخشا۔ اس نے حَوْل کے پرے سے کَوْن کو ظاہر فرمایا۔ وہ توسع حول میں اپنے بسط کی وجہ سے عرش کو قرار دے رہا ہے اور وہ قدرت و غلبہ کے ساتھ احاطہ کناں ہے۔ اس کی مشیت کے سوا کوئی اس کو وسعت پذیر نہیں ہو سکتا۔ اور وہ صرف اپنے انوارِ صفت میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس نے اسے ہر نشان میں کَوْن بنایا اور ہر اسم کے ساتھ اسے مکان بنایا جو بڑا ہوا وہ ظاہر ہو گیا اور جو دقیق ہوا وہ مخفی رہا۔

اس کے قرب کی وجہ سے اس کی مشیت کے سوا کوئی اسے وسعت پذیر نہیں اور اس کی معرفت اس کے شہود کے بغیر نہیں ہوتی اور اس کا دیدار اس کے نور کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ آج قلوب میں غیبی طور پر اولیاء اللہ کے لیے ہے اور کل وآخرت میں انہیں آنکھوں سے مشاہدہ ہوگا اور اس کی مشیت کے بغیر اس کی معرفت نہیں ملتی۔ اگر چاہے تو ادنیٰ چیز بھی اس کو وسیع ہو اور اگر چاہے تو کوئی چیز بھی نہ رکھے اس کی وسعت۔ اگر وہ چاہے تو ہر چیز اس کو پہچانے اور اگر نہ چاہے تو کچھ چیز بھی اس کو نہ پہچانے۔ اگر وہ پسند کرے تو ہر چیز کے پاس پایا جائے اور اگر نہ چاہے تو کسی چیز کے ساتھ نہ پایا جائے۔

حدود و پیمانوں سے بالاتر ہے۔ قول و اقدار سے بلند ہے۔ بے شمار اور غیر متناہی صفات کا مالک ہے۔ کسی صورت میں بند نہیں۔ کسی ایک صفت کے ساتھ مقید نہیں۔ اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دوبارہ ایک وصف کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہوتا اور دو کے لیے ایک ہی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا اور اس سے ایک ہی معنی کے دو کلمات وارد نہیں ہوتے بلکہ ہر تجلی کی نئی صورت ہوتی ہے۔ ہر بندے کے لیے اس کے ظہور کی صفت جدا ہے ہر نظر سے ایک نیا کلام ہے اور ہر کلمہ کے ساتھ ایک نیا افہام ہے۔

اس کی تجلی کی انتہا نہیں۔ اس کے اوصاف کی کوئی غایت نہیں۔ اس کے کلمات کا انجام نہیں۔ اس کے افہام پر انقطاع نہیں۔ اس کے ان معانی کے لیے کوئی کیفیت نہیں۔ اس لیے کہ توحید میں کَیف ہے ہی نہیں قدرت کی ماہیت نہیں۔ ان اوصاف میں مخلوق اس سے مشابہ نہیں۔ اس لیے کہ ذات تعالیٰ کی کوئی کفو و برابری کرنے والا نہیں۔

جب وہ عیان و ابصار سے مستور ہوا تو اس کی ذات قلوب و افکار سے بالا ہو گئی۔ کسی عقل میں اس کا تخیل نہیں آ سکتا۔ کوئی فکر اس کی صورت نہ لا سکا تاکہ وہم اس پر قابو نہ پا سکے ورنہ وہ مربوط ہو جائے گا حالانکہ وہ رب تعالیٰ ہے اور فکر کے ذریعہ اس پر نظر نہ جا سکے ورنہ وہ مقہور ہوگا۔ حالانکہ وہ غالب ہے۔ عقل اسے نہیں سمجھ سکتی۔ اس لیے کہ وہ عقل کا عاقل ہے۔ احاطہ میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ وہ ہر احاطہ کا احاطہ کناں ہے۔ حتیٰ کہ اپنے احسان سے آخر میں جلوہ گر ہوا جیسے کہ اپنے لطف و کرم سے ازل میں جلوہ گر ہوا۔ اپنی حضوری کے ساتھ

مشاہدہ فرماتا اور اپنے نور کے ساتھ نظر فرماتا ہے اور یہ بات اس کے غیر میں نہیں۔ ایسی تعریف صرف اسی کی کیجا سکتی ہے اور آج اس کے اولیاء کو قلوب میں انوار یقین کے باعث یہ انعام حاصل ہے اور کل دارِ حبیب میں انہیں آنکھوں سے مشاہدہ ہوگا۔ اور جنت میں اس کی عظیم قدرتیں اور لطیف نوازشات ظاہر ہوں گی اور بے انتہا لذیذ مفاہیم کے حامل اسلوب پر ان سے کلام فرمائے گا۔

صفات جلال کے ساتھ تجلی فرماتا ہے۔ حسن وجمال اور بہار وکمال کے مفاہیم کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ ہر نظر یا کلمہ یا قرب یا لطف یا عطف یا حنان یا احسان کے ساتھ ان پر جو نعمت و مسرت اور فضل و کرم فرماتا ہے۔ پہلے معنی کے ساتھ ان کے لیے جمع کر دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے اور جس کی جانب چاہتا ہے اپنے اختیار سے نظر کرتا ہے۔ اشیاء اس کی نظر میں نہ دینے کے طور پر اس پہ ہجوم نہیں کرتیں اور اپنے اختیار سے جس سے چاہتا ہے اعراض کرلیتا ہے۔ اس کی نظر میں نظر آنے والی اشیاء زبردستی طور پر نہیں آتیں۔ وہ اپنی کبریائی وعزت کے باعث نظر میں اعراض کرتا ہے اور اعراض میں بھی اپنے لطائف عطف وکرم کے باعث نظر فرما ہے۔ ملک اس کے قبضہ میں ہے۔ تمام خزانے اس کے کلمہ کے ماتحت ہیں۔ کون اس کی مشیّت میں ہے۔ اور تمام ملکوت اس کے ہاتھ میں ہے۔ جبروت وعظمت اسی کی صفات کی جھلکیاں ہیں۔ اشیاء کا موجود ہونا اسے مجبور نہیں کرتا کہ ان کی جانب نظر کرے جبکہ وہ اعراض کا ارادہ کرے۔ اس لیے کہ وہ قدرت والا اور غالب ہے اور اشیاء کا معدوم ہونا انہیں دیکھنے پر اسے مجبور نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان کا اسے علم ازلی ہے اور خبر دینے کی طرح اس کا علم اسے ہے کیونکہ وہ جبار تعالیٰ ہے۔ موجود و معدوم اس کے غیر کو مجبور کرتے ہیں کہ دیکھیں اس لیے کہ غیر کی حالت یہ ہے کہ وہ نظارہ کرنے میں ناتواں ہے اور اس کے غیر کو عدم مفقود ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے کہ غیر کی حالت یہ ہے کہ وہ موجود ہونے سے عاجز ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے ماسوا سے عزت و رفعت کے باعث مباین ہے۔ اپنے غلبہ کے باعث غیر کا مماثل نہیں اور ایک بات یہ ہے کہ معدوم محجوب کی طرح ہے اور اللہ تعالیٰ تحت الثریٰ کے نیچے کے محجوب و مستور ذرے سے لے کر آسمانوں اور زمینوں کے پرے تک سب کو دیکھتا ہے۔ اس کی نظر سے کچھ بھی مستور نہیں۔ اس کا قرب اس سے مانع نہیں ہوتا۔ وہ ان سے اس کے قرب میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ اس کی قدرت پہ آڑ نہیں بن سکتیں۔ اس کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اس لیے کہ تمام حجابات مخلوق پر ہیں اور وہ خالق کے سامنے حجابات نہیں بن سکتے۔ خالق تعالیٰ کے سامنے اشیاء کے بواطن وغوامض سب منکشف ہیں۔ وہ انجام واواخر کو دیکھتا ہے۔ انتہاء اور ابدالآباد تک اس کے مشاہدہ میں ہے جیسے کہ آج یہ اس کے سامنے ہے۔ یعنی کل دیر برسوں سے لے کر قیامت ہونے والے سب امور سے آگاہ ہے۔ آج یہ معدوم ہیں اور پیدا نہیں ہوئے۔

مگر اس کے مشاہدہ میں ہیں۔ اس لیے کہ اس کا علم، ان کا مشاہدہ ہی ہے کیونکہ اس کے اور اس کے علم کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ آغاز سے انجام تک کون کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے علم کے اعتبار سے اور علم اس کا وصف ہے اور مشاہدہ اس کی صفت و نعت ہے۔ اس لیے کہ اس کا کلام یہ بتاتا ہے وہ شہود ماب پر مشاہد ہے کیونکہ جو اس کا علم ہے اس کا اسے مشاہدہ بھی ہے جیسے کہ جو اس نے کلام فرمایا اس کا اسے علم بھی ہے۔ اب اس کا کلام و علم مختلف نہیں ہوتے اور اس کا علم و مشاہدہ بھی مختلف نہیں ہوتے۔ اب سب باتوں کے باوجود اولیت میں اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا اور نہ کسی دوسرے کو مشاہدہ ہے۔ قدم میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کے سوا کوئی قدیم شاہد نہیں۔

اس کی قوت کی کنہ، اس کی قدرت ہے، اس کی قدرت، اس کا دوامِ بقا ہے، اس کی نظر اس کے وسعتِ علم تک ہے۔ اس کا علم وسعتِ نظر تک ہے۔ اشیاء کی مختلف صفات کے باوجود تمام کا ادراک کرتا ہے۔ اب یہ بات صحیح ہوئی کہ اس نے دیکھا، جانا اور کلام فرمایا۔ اس کی صفات میں ترتیب داخل نہیں، یعنی پہلے اور بعد نہیں ہے۔ نہ ہی وقت و حد کے ساتھ موصوف ہوتا ہے۔ قوت و احکام کے باعث تعقیب سے مشابہ نہیں مثلاً ثُمَّ اور لِمَ اور اِذَا اور حَتّٰی سے پاک ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ وہ اپنی نظر کے ساتھ جانتا ہے اور اپنے علم کے ساتھ نظر فرماتا ہے۔ اس کے نزدیک اوائل و اواخر ایک ہی چیز کی طرح ہیں۔ اس کی تمام صفات احاد کامل اور تام ہیں۔ محدودات کے باعث غیر محدود نہیں۔ مرتبات و موقتات کے ساتھ مرتب و موقت نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا حادث و پیدا کرنے والا نہیں کیونکہ یہ (صفات) اس کے قدم کے ساتھ قدیم، اس کے کون و وجود کے ساتھ موجود و کائنہ ہیں (یعنی وہ قدیم سے ہے اس لیے یہ بھی قدیم سے ہیں) اس لیے کہ صفات میں ترتیب ہونا دراصل مخلوق و آلات کی صفت ہے کیونکہ مخلوق حدود و ترتیب کے ساتھ اور اوقات میں پیدا ہوئی ہے اور تمام صفات میں اللہ تعالیٰ بے مثال ہے۔

چنانچہ اس کی صفات، اس کے قدم کے ساتھ قدیم، اس کے ہونے اور وجود کے ساتھ ہیں اور موجود ہیں اور افعال دراصل حدود، ترتیب و اوقات کے ساتھ ترتیب سے حادث و ظاہر ہوئے۔ اس لیے اولیت میں اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا اور نہ اس کے سوا کسی کو مشاہدہ حاصل تھا۔ قدیم ہونے میں وہ لاشریک ہے۔ وقت و حرارت ہونے سے پہلے ازل و ابد میں اس کا قیوم اس کے سوا کوئی غیر نہیں۔

اس کی صفات، ذی جہات نہیں کہ ایک جہت کی جانب اس کی توجہ ہو کہ ایک صفت حاصل کرے اور دوسری چھوٹ جائے اور نہ اس کی ذات، ذو ذات ہے کہ ایک مکان پہ آئے، دوسرا مکان رہ جائے اور اس طرح مخلوقات کے لیے اس کو ترتیب کا اضطرار ہو جائے (یعنی ایسا نہیں ہے)۔ انکار کے ساتھ وہ تدبیرِ عالم

نہیں کرتا (کہ سوچ سوچ کر ایسا نہیں کرتا) کہ ایک حالت اسے دوسری حالت سے غافل کر دے اور نہ ہی اس پہ اعتراض آتا ہے کہ جو تھا اس سے متغیر ہو جائے اور نہ ہی کسی آلہ کے ساتھ پیدا فرماتا ہے کہ غیر کی مدد لینی پڑے اور نہ ہی قدرت اسے عاجز کرتی ہے کہ براہِ راست ہاتھوں کے لگانے کا ضرورت مند ہو۔

وہ اپنے ہاتھ سے جب چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے۔ اگر چاہے تو کلمہ (کُن) سے پیدا فرمائے ۔ جب چاہے اپنے ارادہ سے پیدا کرے اور جیسے چاہے اپنی صفات کے مفاہیم کے ساتھ پیدا کرے۔

تکوین اسے کلام پر مجبور نہیں کر سکتی اور اس کا کلام جیسے چاہتا ہے ہوتا ہے۔ اس کے خزانے، اس کے کلمہ میں ہیں اور اس کی قدرت، اس کی مشیت میں ہے۔

جب اس نے کلام کیا تو ظاہر فرمایا اور اگر چاہا تو اندازہ کیا اور جب چاہا، ظاہر ہُوا اور جس قدرت کے ساتھ چاہا مستتر ہوا۔ وہ اپنے قرب میں عزیز ہے، اپنے علو میں قریب ہے۔ صفات کے ساتھ اس نے اپنی ذات کو محجوب فرمایا۔ افعال کے ساتھ صفات کو مستور فرمایا۔ ارادہ کے ساتھ علم منکشف فرمایا۔ حرکات کے ساتھ ارادہ ظاہر فرمایا۔ صنعت کے ساتھ صنع کو مخفی رکھا۔ آلات کے ساتھ صنعت کو ظاہر فرمایا۔ وہ اپنے غیب میں باطن ہے . . . . اپنی قدرت و حکمت کے ساتھ ظاہر ہے۔ اپنی حکمت میں پوشیدہ ہے۔ اس کی حکمت، اس کی محکومات کے ساتھ ظاہری شہادت ہے اور یہی اس کی قدرت کی راہیں۔ اس کی صنع، اس کی صنعت میں ایک راز ہے۔ اور یہ اس کی علانیہ مشیّت ہے۔

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

کسی صفت میں اس کی کوئی چیز مثل نہیں اور نہ ہی ماہیت میں اس کے قول کی کوئی مثال پائی جاتی ہے۔

توحید کی تعریف میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک مختصر سا بلیغ ترین جملہ مروی ہے۔ خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"سب حمد اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنی معرفت کی طرف اس کے سوا کوئی راہ رہنے نہ دیا کہ اس کی معرفت کے ادراک سے عاجز ہی رہیں۔"

علم و قولِ سابق

احمد بن ابی حواریؒ نے بعض شامی علماءؒ سے روایت کیا۔ جس نے بتایا کہ:

"اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے مخلوق کو ایسے ہی دیکھا جیسے کہ انہیں پیدا کرنے کے بعد دیکھا۔"

ابو سلیمان دارانیؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"انہیں اطاعت کرنے سے پہلے جنت میں داخل کر دیا اور انہیں معصیت سے پہلے آگ میں داخل کر دیا۔"

(اس لیے کہ علمِ الٰہی، یقینی و قطعی ہے)

ایک بار فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس بات سے بلند ہے کہ مخلوق کے افعال اس میں غضب پیدا کریں بلکہ اس نے ایک قوم کو ان کے پیدا کرنے سے پہلے نظرِ غضب سے دیکھا۔ چنانچہ جب انہیں (عالمِ دنیا میں) ظاہر کیا تو انہیں اہلِ غضب کے اعمال پر لگا دیا۔ آخر انہیں دارِ غضب میں ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ اس بات سے بلند ہے کہ مخلوق کے افعال اسے راضی کر سکیں بلکہ اس نے ایک قوم کو اس کے پیدا کرنے سے پہلے نظرِ رضا کے ساتھ دیکھا۔ چنانچہ جب انہیں (عالمِ دنیا) میں ظاہر کیا تو انہیں اہلِ رضا کے اعمال پر لگا دیا اور انہیں دارِ رضا میں قیام عطا فرمایا۔

فرمانِ الٰہی ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔[1] (کبھی ہُوا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں، جو نہ تھا کچھ چیز، ہکّرار میں آتی)

اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ علمِ الٰہی میں یہ تھا کہ یہ (انسان پیدا) ہوگا۔ گویا لَمْ يَكُنْ کو مَذْكُوْرًا پر معلق کر دیا اور اللہ تعالیٰ دنیا میں ہونے والی کی خبر دیتا ہے اور اس کی خبر دیتا ہے جو قیامت تک ہوگا اور جو بعد میں ہوگا اور یہ خبر اس لفظ کے ساتھ دی کہ یہ ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کے علم میں اول کی طرح آخر بھی برابر ہے۔ اس کے علم میں کوئی ترتیب نہیں۔ نہ حد ہے نہ مسافت ہے اور نہ قدرت میں بُعد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔[2] (اور اللہ سے سچی کس کی بات)

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى۔[3] (کیا اس کے پاس خبر ہے غیب کی، سو وہ دیکھتا ہے)

چنانچہ ان الفاظ کے ساتھ اس کی مذمت فرمائی اور ایک جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔[4] (جو دیکھتا ہے تجھ کو جب تو اٹھتا ہے اور تیرا پھرنا، نمازیوں میں)

یعنی تیرا تقلّب، اور تقلّب کا قیام پر عطف ہے۔ اس لیے یہ منصوب ہے۔

اور تفسیر میں ہے کہ تیرا تقلّب (بدل بدل کر آنا) پاک اصلاب اور پاک ارحام میں۔ ایسا ہرگز نہیں ہُوا کہ

---

[1] الدھر ۱
[2] النساء ۱۲۲
[3] النجم ۳۵
[4] الشعراء ۲۱۸

تیرے آباء میں کوئی بھی بُرا ہو۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ ہے ایک نبی کی صلب سے دوسرے نبی کی صلب میں تیرا صلب انبیاء میں بدل بدل کر آتے رہنا، حتیٰ کہ تجھے بنی اسمٰعیل سے نکال کر (پیدا فرمایا)۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

اللہ تعالیٰ نے اشباح اور ان کو پیدا کرنے سے پہلے ان سے آوازیں سنیں:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا[1] (سن لی بات اس عورت کی جو اپنے خاوند کے بارے میں تجھ سے جھگڑتی ہے)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ کی پیدائش سے پہلے قدم میں اپنے علم میں آوازیں سنیں۔

فرمانِ الٰہی ہے،

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ۔[2] (اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر صورت دی، پھر کہا فرشتوں کو، سجدہ کرو آدم کو)

اور خلق و تصویر دراصل آدم کو سجدہ کرنے کے بعد تھی اور پہلے ہی اس کی خبر دی۔ اس لیے کہ اس کے علم میں یہ پہلے ہی مشاہدہ میں اور ہموار و مستوی تھا کیونکہ ہونا ضرور تھا۔ یہ اس فرمان کے مشابہ ہوا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ[3] (چھ دنوں میں آسمان اور زمین بنائے پھر تخت پر بیٹھا)

اور عرش دراصل آسمان و زمین سے پہلے سے ہے اور عرش پر استواء اس کی صفت ہے جو کبھی زائل نہیں، پھر یہ بھی بتائی کہ اس نے ترتیب موخر کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کَون سے پہلے ہی کَون کا عالم ہے اپنے علم کی جانب ناظر ہے۔ اس کے اور اس کے معلوم کے درمیان کوئی پردہ نہیں جس کا اسے مشاہدہ ہے اس کا سننے والا ہے۔ جو جانا اس کا متکلم ہے۔ علم و قدرت و مشیت کے اعتبار سے اس کی نظر و سمع و کلام تمام کَون سے سبقت کر گئے۔ چنانچہ وُہ ذاتی طور پر ارادہ کرنے والا صاحبِ قدرت و عالم ہونے کے اعتبار سے ذاتی طور پر متکلم و سامع و ناظر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً ایک عالم کے بعد ایک عالم کو ظاہر فرمایا۔

---

[1] المجادلہ ۱

[2] الاعراف ۱۱

[3] الاعراف ۵۴

چنانچہ وہ (مخلوق) اس کی نظر و سمع و کلام پر آئے جیسے کہ اس کے علم و قدرت و مشیت میں تھے اور ذرہ بھر کی زیادتی اور رائی بھر کی کمی نہیں ہوتی۔ دیکھیے وہ اپنی قدرت و علم کے ساتھ قیامت اور اس میں جو ہے سب کو دیکھ رہا ہے اور آخرت اور جو اس کے اندر ہے سب کو اس حقیقت پر دیکھ رہا ہے جیسے اس نے خبر دی۔ عدمِ کَون اس کے دیکھنے میں حائل نہیں اور بُعدِ تاخیر اس پر حجاب نہیں بن سکتی۔ اس طرح جو آج ہو چکا اس کا اس نے (پہلے سے) اس کے ساتھ اپنے علم کے ساتھ اور اس پر اپنی قدرت و احاطہ کے ساتھ قِدم میں مشاہدہ کیا۔ اس کا نہ ہونا اسے مانع نہیں۔ اس کا فقدانِ ظہور اس پر آڑ نہیں بن سکتا اور یہ کہنا جائز نہیں کہ قدیم میں فلاں چیز کا اس نے ادراک نہیں کیا اور آج ادراک کیا جس طرح یہ کہنا جائز نہیں کہ آج اس کا علم بڑھ رہا ہے کہ اس کے بارے میں ازل میں اس کو علم نہ تھا۔ ایسا سمجھا جائے تو وہ غیر مشاہد کا متکلم ہُوا۔ حالانکہ اس کا معلوم اس کے علم میں لپٹا ہُوا ہے یا ایسا کہنے سے یہ بات بن جائے گی کہ جو اس نے بتایا تھا۔ جب وہ چیز ظاہر ہُوئی تو بتائے ہُوئے سے زاید نکلی حالانکہ وہ چیز اس کے قبضہ اور اس کے غیب میں ہے۔ اللہ تو ایسی بات سے پاک و بلند ہے۔ اس لیے کہ اس کی نظر، اس کے وسعتِ علم کے مطابق ہے اور اس کا علم اس کے احاطۂ نظر کے مطابق ہے۔ جس کو اس نے جانا، اس کی طرف وہ اپنے وصف سے نظر کناں ہے۔ اس پر اس کے اوصاف مختلف نہیں ہوتے۔ چنانچہ کَون (ہونے والی چیز) اس کے علم ازلی کے باعث اس کے سامنے موجود ہے اور اس کے علم میں اس کا بیان نہیں۔ اس کے وصف میں اس کا کچھ نشان نہیں۔ اس کے وجودِ کینونت میں کَون کا وجود نہیں۔ اس کے قِدم ازلیت میں اس کے لیے قِدم نہیں۔ وہ کَون کا محل نہیں اور نہ وہ اس میں حال ہے اس لیے کہ اس کی اولیت کون و مکان سے سبقت کر گئی۔ اب ان دونوں کا اس کے قِدم میں کچھ قدم نہیں۔

جیسے کہ اب تعالیٰ انجام و مآل سے لے کر آخرِ احوال تک مشاہدہ فرما ہے۔ اس کی صفات میں اواخر و اوّل کا کچھ فرق نہیں۔ نظر و علم کی ترتیب پر اس کی صفات میں تفاوت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ معلوم ہیں۔ معلوم ہی اس کا علم ہے اور موجود اس کا ارادہ ہے۔ چنانچہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ اشیا کو اس (علم) کے ساتھ پاتا ہے۔ (اشیا) کے ساتھ نہیں پاتا۔ ان کی طرف اپنے علم میں نظر کناں ہے نہ کہ ان کے وجود کے ساتھ، اس لیے وہ ان پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اس کو ان کا احاطۂ علمی حاصل ہے اور کَون ذاتی طور پر لاشئی ہونے کی وجہ سے معدوم ہے۔ اس لیے کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ جیسے وجود کا خالق ہے۔ اس طرح عدم کا بھی خالق ہے۔ اس کے قِدم کے ساتھ ساتھ عدم کو بھی قِدم حاصل نہیں کہ اس کا ثانی پایا جا سکتا اور کوئی ہونے والا ایسا نہیں کہ وہ ذاتی طور پر ہو کہ اس کی اولیت کے ساتھ ساتھ کوئی اوّل بن سکے۔ اللہ واحد متفرد بنفسہٖ ازل میں بھی تنہا ہے

پاک و بلند ہے۔ قدم میں بھی شریک سے پاک ہے۔ پھر اشیاء اپنے نفوس کے لیے ظاہر ہوئیں تو اس کے اظہار کی وجہ سے بعض اشیاء بعض کے لیے ظاہر ہوئیں۔ اس طرح اس کی ایجاد پائی گئی اور اس کے اظہار کے باعث حد و وقت میں ان پر ظاہر ہوئی۔ ان کے لیے نہ اول ہے نہ پہلے ہے بلکہ وہی تعالیٰ کسی اول کے بغیر اوّل ہے۔ اس پر فنا نہیں آئی۔ اور وہی کسی وقت و امد کے بغیر قدیم و ابدی ہے۔ اپنی صفات کے ساتھ قائم ہے اور اس کی صفات اس کے ساتھ قائم و موجود ہیں۔

غیر اللہ کو قدیم سمجھنا شرک ہے

جو آدمی بھی نورِ یقین کے ساتھ اس مذکور بیان کو پڑھے گا۔ اس پر دنیا کے قدیم ہونے کا شبہ بھی نہیں گزر سکتا۔ اس لیے کہ اللہ کے ازلی ہونے میں اس کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا قدیم نہیں ہے اور مذکورہ عبارات سے جسے ہدایت نہ ملے اور عقل پرستی ہی کرتا رہے اور دنیا کے قدیم ہونے کا شبہ اسے ہو جائے تو وہ ملحد ہے۔ اس لیے کہ اس نے ایک حادث کو قدیم سمجھ لیا یا خدا کے قدیم علم کا انکار کیا، جو کہ حادث کے (قدیم میں) پائے جانے کی نفی کرتا ہے اور ایسا عقیدہ صفات کے ساتھ شرک ہے۔ اس لیے کہ عقلی طور پر ان میں ترتیب ہے ہم ایسی گواہی سے بے زار و بری ہیں۔ ایسے آدمی کے دعویٰ کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ قدم میں اس کے کسی شریک ہونے کا انکار کرتے ہیں اور اس ملحدِ عقلی کے مقابلہ میں ہم یقین کے ساتھ موحّد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے یہ کہا کہ:

"اللہ نے اب دیکھا اور پہلے نہ دیکھا۔ یا اب جانا اور پہلے نہیں جانا۔ یا اب کلام کیا اور پہلے کلام نہیں کیا"

تو اس نے صفات کو حادث تسلیم کیا اور معلومات کو ان سے قدیم سمجھا اور حقیقت یہ ہے کہ معلومات اس کے علم میں بند ہیں۔ اس میں ان کا اثر نہیں اور اللہ تعالیٰ بمعہ اپنے علم کے قدیم ہے اور ذاتی طور پر اپنے علم سے معلوم کا واجد ہے۔ اس پر اپنی قدرت کے ساتھ غالب اپنے علم کے ساتھ اس کی طرف نظر کناں ہے۔ اس کا معلوم معدوم نہیں ہوتا اور معلوم کو جب تک اللہ تعالیٰ ہی حادث و موجود نہ کرے۔ وہ ذاتی طور پر معدوم و غیر موجود ہے۔ جب اس نے ظاہر کیا اور جس کے لیے ظاہر کیا وہ ظاہر ہو گئی۔ اور بعض، بعض کے لیے ظاہر ہوئی نہ کہ اپنے لیے۔ اس لیے کہ اسے اس کا علم ہے۔ اب وہ اس سے فارغ ہے (یعنی اس کیلئے تو پہلے سے ظاہر ہے۔) اور اس طرح نہیں کہ اس کی نظر اس کے قریب ہوئی۔

اور اس کا علم اس کی صفت ہے۔ وہ کبھی زائل نہیں ہوا اور وہ اپنے وصف کے ساتھ قائم ہے اور ایسا ناممکن ہے کہ ایک چیز پیدا ہو جائے اور اسے اس کا علم نہ ہو اور ایسا ہونا بھی ناممکن ہے کہ ایک چیز مفقود ہو جائے اور وہ اسے پا نہ سکے۔

معتزلہ، قدریہ اور جہمیہ کے عقائد

جو آدمی مذکورہ نظریات سے جدا ہو گا وہ معتزلہ اور جہمیہ کی نظریاتی گمراہی میں جا گرے گا۔ اس لیے معتزلہ فرقہ ااہ کے اختلاف کے باوجود اس پر متفق ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کو اس وقت دیکھتا ہے جب وہ ہو جاتی ہے۔

البتہ علم میں ان کا اختلاف ہے۔ قدریہ میں عبادیہ کا گروہ جو عباد کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ وُہ یہ کہتا ہے،

"اللہ تعالیٰ ایک چیز کو تب ہی دیکھتا ہے کہ جب وہ ہو جاتی ہے۔" اور ان سے اختلاف کے باوجود جہمیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ "اللہ تعالیٰ کسی چیز کا کلام تب ہی کرتا ہے کہ وہ ہو جائے۔ پھر اس نے کلام پیدا کیا۔" چنانچہ ان لوگوں نے کلام پر کُوْن (ہو جانے) کو مقدم کیا جیسے کہ ان لوگوں نے اسے نظر پر مقدم کیا اور کہا "تمام حدوثِ نظر کے باعث ہیں۔" جیسے کہ انہوں نے یہ کہا کہ کلام و نظر حادث ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ حدوثِ مسمیات کے بعد حدوثِ اسماء کے قائل ہیں۔ اسی طرح اس نے مخلوق کی استطاعت کو ارادۂ خالق پر مقدم کر دیا۔ اس کی وجہ سے یہ ان کے ساتھ شرک میں برابر ہُوئے اور اس شرک کی وجہ سے توحید سے نکل گئے۔

عباد کے ساتھیوں یعنی قدریہ فرقہ کے عبادیہ لوگوں نے بھی نظامیہ اور مریسیہ کے قول سے مشابہت کی اور ان سب کے دل باہم مشابہ ہُوئے، چنانچہ

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ[1] (وہ اتباع کرتے ہیں جو ان سے متشابہ ہوں)

اور معتزلہ کا بھی علم و قدرت و مشیت کی نفی پر اجماع ہے۔ البتہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ عالم ہے اور اس کا علم کسی چیز کا الا مجوز نہیں اور نہ کسی چیز کا موجب ہے۔ چنانچہ انہوں نے علم الٰہی کو مخلوق کے ظن کی طرح کر دیا۔ چنانچہ معتزلہ کا قول ہے،

"علم قدیم کے بغیر عالم ہے۔ بغیر قدرت سابقہ کے قادر ہے۔ بلا ارادۂ سابقہ ارادہ کرنے والا ہے۔" ان لوگوں نے مخلوق کی استطاعت کو مقدم کر دیا اور یوُں کہنے لگے تاکہ انہیں معلومات کی سابقیت لازم نہ آئے اور ارادہ و کلام دراصل افعال کی نعوت ہیں اور یہ دونوں مخلوق ہیں اور جہمیہ کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی وصف کے ساتھ بالکل کلام نہیں کرتا بلکہ وہ اجسام میں اعراض پیدا کرنے کے ذریعہ فضائے کلام کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے۔" ان کے نزدیک یہی توحید ہُوئی: تاکہ وُہ اللہ کے ساتھ ساتھ کسی اور کو قدیم ثابت نہ کر بیٹھیں۔

اہلِ سنت والجماعت کا نظریہ مگر اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک یہ الحاد ہے۔ اس لیے کہ

---

[1] سورۂ آلِ عمران آیت ۷۔

اس میں صفات کے قدیم ہونے کی نفی ہوگئی اور صفات کو حادث سمجھا گیا اور انہیں ذات تعالیٰ سے جدا قرار دیا۔
اللہ کے فضل و کرم سے مذکورہ باتوں میں اہل یقین کو کوئی اختلاف نہیں جیسے کہ صحیح توحید میں ان کا کوئی اختلاف نہیں اور یہ اہل یقین کی شہادت اور مقربین کا ایمان ہے۔ اس لیے مذکورہ امور میں عقلی شبہات میں ہرگز نہ گرنا ورنہ تجھے مشاہدہ سے محرومی ہو جائے گی۔ اس لیے کہ مذکورہ امور کا صرف نورِ عقل سے مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ نورِ یقین سے ان کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ خالق مخلوق کے مشابہ نہیں اور جو بے مثال ہو اس کا مشاہدہ بھی بے مثال کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی نورِ یقین سے مشاہدہ ملتا ہے جو کہ نورِ قادر تعالیٰ سے ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ[1] (اور جس کو اللہ نے نہ دی روشنی اس کو کہیں نہیں روشنی)

مذکورہ وصفِ الٰہی ظاہری توحید ہے جو کہ فرضِ شہادت کا درجہ رکھتی ہے اور عقل کی ترتیب پر نہیں آتی اور نہ ہی عقلی پیمانہ سے اس کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس لیے صفات کی نفی اور مماثلات کے ساتھ صفات کا اثبات نفوس کی رائے میں پایا جاتا ہے جیسے کہ نفوس کی طبائع میں کفر و ضلال موجود ہے جبکہ مشاہدہ ابصار نہ ہو اور تخیلِ افکار میں مشاہدۂ الٰہی نہ پایا جائے اور ظہورِ اسباب میں عادت و عرف جاری ہو۔
ایک صدیق نے حقیقتِ توحید کی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کی تشریح فرما دے تو انہیں بار بار یہی بتایا کہ واحد ہے واحد ہے۔ انہیں اس پر تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:
تو یہ چاہتا ہے کہ عقلیں تیری بات کو قبول کر لیں؟ (تیری دعوتِ توحید باری تعالیٰ کو عقلیں قبول کر لیں)
عرض کیا "ہاں"
فرمایا "مجھے ان سے محجوب کر دو"
عرض کیا "میں تجھے ان سے کیسے محجوب کر دوں جبکہ میں انہیں تیری طرف دعوت دیتا ہوں؟"
فرمایا "اسباب اور اسباب الاسباب میں کلام کرو۔"
بتاتے ہیں کہ پھر انہوں نے ان راہوں سے خدا تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو کثیر تعداد میں لوگوں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔ اور صحتِ توحید تب حاصل ہوتی ہے کہ جب صفات ثابت کرے اور جو صفات شریعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیں سب کو ثابت کرے اور تشبیہ و ماہیت کی نفی کرے۔ جنس کیفیت کی

---

[1] سورۃ النور آیت ۴۰

نفی کرے اور اس پر قلب کو پختہ ایمان وسکون ہوجائے اور خدا کی جانب سے عطا شدہ نورِ یقین کے ساتھ اسے تسلیم کرلے۔ اس لیے کہ خدا کی جانب سے دیے گئے نورِ یقین وعلم سے اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ عقل کے نور وعلم سے اس کا مشاہدہ نہیں ہوتا کیونکہ خالق کا مشاہدہ مخلوق کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ عقل، دنیا کا آئینہ ہے۔ اس کے ذریعہ دنیا کی اشیاء کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور ایمان آخرت کا آئینہ ہے۔ اس سے ذریعہ آخرت کو دیکھا جا سکتا ہے چنانچہ جو اس میں ہے اس کو مان لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا دیدار نورِ یقین کے ساتھ ہوتا ہے اور اس نور میں صفات کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور یہی حقیقی ایمان ہے۔ اور آسمان سے نازل ہونے والی ایک عزیز ترین متاع یہی ہے اور یہی مومنین کے دلوں میں سکینت نازل کرنیوالی ہے۔ جس سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ صفاتِ مومن کی تعریف کے باعث .... کہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں خبریں نہیں دی جاتیں اور ایک دوسرے سے تعارض نہیں کرایا جاتا اور بعض کو بعض پر مرتب نہیں کہا جاتا بلکہ ہر خبر پر ایمان لاتا ہے جو علیحدہ علیحدہ صفات وقدرت میں آتی ہیں۔ جیسے کہ اسلام لا کر تمام پر ایک دم ایمان لاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوا تو بعض کی نفی کر بیٹھے گا یا سب ہی کو باطل سمجھ لے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں تصدیق ویقین ونقل کے ذریعہ اللہ کے فضل وکرم کے باعث ایمان حاصل ہوا اور تقلید وحسن ظن وعقل کے ذریعہ سے ایمان حاصل نہیں کیا۔

چار مسلمہ امور چار باتیں مسلم ہیں:

۱۔ اخبارِ صفات

۲۔ اصولِ عبادات

۳۔ فضائلِ اصحاب

۴۔ فضائلِ اعمال

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر کرم فرمایا انہیں ایمان محبوب وپسندیدہ کیا۔ کفران کے نزدیک ناپسندیدہ اور عیب بنایا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے قلوب پر اپنا فضل فرما کر ان کی کارسازی نہ کرتا تو یہ لوگ بھی حجابات واعیان کے ابتلاء میں پھنس جاتے۔ اغیار واسباب کو دیکھ کر اور قدرت کی نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ اندھیروں میں بھٹک کر رہ جاتے اور بحرِ ہلاکت میں ڈوب مرتے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا ان کے دلوں میں ایمان کو محبوب بنا دیا۔ کفر ومعصیت کو ناپسندیدہ کر دیا۔ اس طرح غیبِ مستور کے باعث اہلِ ایمان کی تعریف کی اور یہی وجہ ہے کہ مشاہدۂ نور کے باعث مقربین سبقت کر گئے۔ فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ (اللہ کام بنانے والا ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ[1] (اندھیروں سے اُجالے میں)

اب اگر وہ ظلماتِ طبع میں نہ ہوتے تو ان پر نورِ یقین سے احسان کیونکر ہوتا؟

روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اندھیرے میں مخلوق کو پیدا فرمایا۔ پھر ان پر نور ڈالا۔ جس کو ملا وہ ہدایت پا گیا اور جس سے رہ گیا وہ گمراہ ہو گیا۔"

ایک فرمان ہے:

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ[2] (مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور رکھتا ہے اور اسی پاس ہے اصل کتاب)

اس کی تشریح میں فرمایا کہ:

"موحدین کے دلوں سے اسباب مٹا دیتا ہے اور اپنا آپ ثابت فرماتا ہے اور ناظرین کے دلوں سے وحدانیت مٹا کر اسباب ثابت کر دیتا ہے۔" اور اگر کسی عارفؒ نے کبھی بھی تحریر میں توحید کی تشریح نہ کی ہوتی اور نہ کسی عالم ربانی نے خطاب کرتے ہوئے توحید کی توضیح کی ہوتی تو عوام علومِ توحید سمجھنے سے عاجز رہ جاتے اور مکاشفہ کے ضعف کی وجہ سے عقلیں انکار پر تل جاتیں اور ہم ایسی ایسی باتیں بیان کرتے کہ عقلیں دنگ رہ جاتیں اور اہلِ دانش مبہوت ہو کر رہ جاتے مگر ہم نے اس بات کو ناپسند کیا کہ جس بات کی طرف کسی نے پہل نہیں کی۔ ہم اس پر قلم اٹھائیں یا ایسی بات ظاہر کریں کہ جس پر عقلیں حیران و پریشان ہو جائیں اور ہمیں لوگوں کی کم نصیبی کا بھی خطرہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سننے والوں کو نفع کی بجائے نقصان ہو اور علمِ توحید کی حقیقت، باطنِ معرفت ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ مخصوص مقرب حبیب کے ساتھ مخصوص صفت کے ساتھ اس کی طرف معروف کا بڑھنا کہ جس کو اس کا تعرف حاصل ہے اور یہ معرفت حاصل کرنا سب کے بس میں نہیں اور افشائے رازِ ربوبیت کفر ہے۔

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"جس نے توحید کی صراحت کی اور وحدانیت کا افشا کیا۔ اس کو قتل کرنا دوسرے کے زندہ کرنے سے افضل ہے۔"

---

[1] البقرہ آیت ۲۵۷

[2] الرعد آیت ۳۹

ایک عارفؒ فرماتے ہیں؛

"رب تعالیٰ کا ایسا راز بھی ہے کہ اگر ظاہر ہوجائے تو نبوت ہی باطل ٹھہر جائے اور نبوت کا ایسا راز ہے اگر وہ کھل جائے تو علم باطل ہوجائے اور علمائے ربانیین کا ایسا راز ہے اگر اسے اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے تو احکام باطل ہوجائیں۔ چنانچہ کتمانِ راز کے ساتھ ہی ایمان و شریعت کا قیام ہے۔ اسی کے ساتھ تدبیر واقع ہوئی۔ امر و نہی کا نظم بھی اسی پر ہے۔

وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ [1]

(اور اللہ جیت رہتا ہے اپنا کام)

اور اس سے اوپر علمِ توحید ہے اور اس سے اسم وحدانی ہے۔ چنانچہ توحید اس کی صفت ہے اور اس سے اوپر علمِ اتحاد ہے اور متحد اس سے وصف ہے اور ان دونوں کے اوپر علمِ وحدانیت ہے اور اس سے واحد اسم ہے اور ان اسماء کی صفات ہیں اور ان اوصاف کے انوار ہیں اور ان کے انوار علوم ہیں اور ان کے علوم، مشاہدات ہیں۔ ان میں سے بعض بلند درجہ کے ہیں۔

وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ [1]

(اور ہر صاحبِ علم سے بڑا علم والا ہے)

پھر ان علوم میں پہلا علم توحید کا ہے، مخلوق کے زیادہ قریب، ان انوار کا ظاہر اور ان مشاہدات کا عموم (علمِ توحید) ہے۔ چنانچہ موحّد اسی سے اسم ہے۔

اور یہیں مخلوق ہویدا اور ظاہر ہوئی۔ یہی وہ توحید ہے کہ جس کے ساتھ موحدین کو تمام مخلوق سے علیحدہ و تنہا کر دیا۔ پھر ان پر اپنی رحمت فرمائی اور مشاہداتِ اوّل یہ ہیں کہ اس کی مخلوق کی توحید سے پہلے رب تعالیٰ کی اپنی ذات کو محض اپنی ذات کے لیے دیکھنا، اس (مخلوق) کی توحید اور اس (رب) کی توحید میں بہت فرق ہے اور ہم نے جو ظاہر کیا اس میں ہی اسے مخفی کر دیا۔ چنانچہ وہ بصائر و افہام سے خزائنِ غیبی میں محجوب ہے۔ تمام علمِ ملکوت سے تجاوز کر گیا اور ان سے پرے خزائنِ جبروت میں ہے اور ہم نے صرف اس قدر علمِ توحید کا ذکر کیا ہے جو کہ قلوب کی غذا ہے اور مزید ایمان کے لیے جس کے بغیر چارہ کار نہ تھا۔

علم کی تین اقسام

امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا؛

"عالم کو تین علوم حاصل ہوتے ہیں؛

۱۔ علمِ ظاہر جس کو وہ اہلِ ظاہر پر صرف کرتا ہے۔

---

[1] یوسف آیت ۲۱

۲۔ علمِ باطن، جس کو صرف اہل لوگوں کے سامنے ہی ظاہر کرتا ہے۔

۳۔ وہ علم جو اللہ اور عالم کے درمیان ایک راز ہے۔ یہی اس کے ایمان کی حقیقت ہے۔ اس کو نہ وُہ اہل ظاہر کے سامنے ظاہر کرتا ہے اور نہ اہلِ باطن کو اس سے آگاہ کرتا ہے"۔

ان سے پہلے سلف میں سے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جو عالم بھی اپنی قوم کے سامنے ایسا علم رکھے جو ان کی عقلوں سے (بالاتر) ہو اور ان کی عقلوں میں نہ آسکے تو وہ علم ان پر فتنہ و ابتلاء بن جاتا ہے"۔

ارکانِ اسلام کی دُوسری تشریح

نماز

سب سے پہلے طہارت کے مسائل بیان کیے جائیں گے اور طہارت میں سب سے پہلے استنجاء کے مسائل اور اس کی سنن و آداب کا ذکر ہوگا۔ پھر نماز کے فرائض وسنن اور نماز کے اوقات میں نمازی پر احکام، دوسرے متعلقاتِ نماز اور نماز کا طریقہ بیان کیا جائے گا۔

استنجاء کے فرائض

اللہ جل شانہ نے فرمایا:

فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ[1]

(اس میں وُہ مرد ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وُہ پاک رہیں، اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کرتا"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"طہارت، نصف ایمان ہے"۔

اور فرمایا:

"نماز کی کنجی طہارت ہے"۔

چنانچہ طہارت کی ابتدا استنجاء سے ہوتی ہے اور اس میں دو فرض اور چار سنتیں ہیں۔

۱۔ ناپاکی دُور کرنا فرض ہے۔

---

[1] التوبہ آیت ۱۰۹

۲- ناپاکی دُور کرنے والی چیز (پانی وغیرہ) پاک ہونا فرض ہے یعنی کسی جانور کا لید نہ ہو اور ایک بار کا مستعمل بھی نہ ہو، کسی مردار کی ہڈی نہ ہو اور کوئلہ سے استنجاء کرنا مکروہ ہے اس لیے کہ اس میں بھی ایک روایت آتی ہے :

اور استنجاء میں چار سنتیں ہیں :

۱- وتر عدد میں ڈھیلے استعمال کرنا یعنی تین یا پانچ یا سات ڈھیلے استعمال کرے۔

۲- پانی کے ساتھ استنجاء کرنا۔

۳- بائیں ہاتھ سے نجاست دُور کرنا۔

۴- ہاتھ کو مٹی پر رگڑنا۔

استنجاء کا طریقہ یہ ہے کہ بائیں ہاتھ میں ڈھیلا لے۔ اسے پیشاب گاہ پر (مقعد پر) آگے سے رگڑتا ہُوا پیچھے لے جائے پھر اسے پھینک دے۔ پھر دُوسرا ڈھیلا لے اور مقعد کے پیچھے سے رگڑتا ہُوا آگے تک لے جائے اور پھر اسے پھینک دے۔ پھر تیسرا ڈھیلا لے اور اسے مقعد کے سوراخ کے ارد گرد گولائی میں رگڑ کر پھینک دے۔ اب اگر اور ڈھیلا لینے کی ضرورت ہو تو پانچ کی تعداد پُوری کرے، اور اگر ایک ہی ڈھیلا کافی ہو تو تین ضرور استعمال کرے اور ایک ہی تین کونوں والے بڑے ڈھیلے سے استنجاء کیا تو وُہ تین ہی کی طرف سے کافی ہے۔

پاخانہ بیٹھنے کا طریقہ

روایت میں ہے :

"جو ڈھیلا استعمال کرے وہ وتر (عدد) میں استعمال کرے۔"

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو دُور نکل جاتے۔ آپؐ قضائے حاجت کے موقع پر ایسے بیٹھتے جیسے آدمی اپنے گھر میں بیٹھتا ہے۔ اس لیے کہ آپؐ کھلی جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ اپنے پیچھے کوئی آڑ لگا لیتے یا دیوار کی آڑ لیتے یا اس جگہ جاتے جہاں پردہ ہو سکتا ہو یا کسی بلند اور بڑے پتھر کی آڑ لیتے اور اس کی طرف پشت کر لیتے۔

پیشاب و پاخانہ کرتے وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی قبلہ رُخ نہ ہوتے اور زمین کے قریب ہونے سے پہلے کپڑا نہ اٹھاتے اور جو آدمی یہ چاہے کہ وہ اپنے ساتھی کے ایسی قریب جگہ پر پیشاب کرے کہ وہ اس کو دیکھ سکے اور اسے محسوس کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ملتی ہے۔ آپ کے فعل سے اس کی اجازت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حیاء والے ہیں۔ آپؐ گاہے پیشاب کر رہے ہوتے اور آپؐ کے ایک طرف کر کے آپؐ کا کوئی صحابیؓ ہوتا

اس طرح آپؐ نے اس میں وسعت فرما دی۔

ایک آدمی ایک اعرابی صحابیؓ سے اُلجھ پڑا اور کہنے لگا:

"میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ تم ٹھیک طریق سے پاخانہ کر سکتے ہو۔"

اس نے کہا:

"ہاں ہاں، میں خوب سمجھتا ہوں۔"

کہا: "اچھا، بتاؤ کیسے کرتے ہو؟"

اس نے کہا:

"(نجاست کا) نشان دُور کرتا ہوں۔ ڈھیلا بن کر کرتا ہوں۔ گھاس کی طرف منہ کر لیتا ہوں۔ ہوا کی طرف پشت کر لیتا ہوں۔ ہرن کے بیٹھنے کی طرح بیٹھتا ہوں اور شترمرغ کی طرح مقعد اونچی کر لیتا ہوں۔"

حضرت سلمانؓ کی حدیث میں ہے:

"ہمیں جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ سکھایا، حتیٰ کہ پاخانہ کرنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ آپؐ نے ہمیں حکم دیا کہ ہڈی اور گوبر کے ساتھ نجاست دُور نہ کریں اور ہمیں پیشاب و پاخانہ کرتے وقت قبلہ رُخ ہونے سے منع فرمایا اور ہمیں حکم دیا کہ پاخانہ کرتے وقت دایاں پاؤں کھڑا رکھو اور بائیں پاؤں پر بیٹھو۔" اور پیشاب کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی آہستہ آہستہ اطمینان سے پیشاب کرے اور قضیب کو حرکت نہ دے ورنہ پیشاب سارے حشفہ پر لگ جائے گا۔ جب پیشاب ختم ہو جائے تو قضیب کو جڑ سے حشفہ کی طرف تین بار نرمی کے ساتھ ملے تاکہ پیشاب کے چھینٹے نہ پڑیں، پھر تین بار ہلکا سا کھینچے اور تین بار کھانسے اور اگر سات سات بار یہ کام کیا تو خوب مبالغہ کیا۔ پھر دائیں ہاتھ میں ڈھیلا لے اور قضیب کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس پر ملے۔ یہاں تک کہ اس کا سرا خشک ہو جائے۔ چنانچہ وہ پاک صاف ہو گیا تو ترارت جاتی رہی اور جس نے زمین پر رگڑ دیا یا کسی دیوار پر رگڑا اور خشک ہو گیا تو بھی کافی ہے۔ اگر مخرج سے دُور ہو کر حشفہ پر پیشاب نہ لگے تو پانی کی بجائے اس قدر بھی کافی ہے۔

مستحب یہ ہے کہ نرم زمین پر یا بوری مٹی پر پیشاب کرے۔ ہوا کی جانب رُخ کر کے یا سخت زمین پر پیشاب کرنا مکروہ ہے تاکہ پیشاب اُلٹ کر اس پر نہ آئے اور بعض فقہائے مدینہ نے ذکر کی تقن سے مشابہت بتائی۔ ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جب تک تو قضیب کو ملتا رہے گا اس سے کچھ نہ کچھ نکلتا رہے گا۔"

اور بتاتے ہیں کہ جب ذکر پر پانی ڈال دیا جائے تو پیشاب ختم ہو جاتا ہے اور ان کے نزدیک جو آدمی

استبرا میں تخفیف رکھنا اور پانی کم استعمال کرنا درست ہے (اس لیے کہ ایسا کرنے سے عوام پر حرج و مشقت کم ہو جاتی ہے)

قضیب کو پانی سے دھونے کے بعد کا ہے ترارت سی محسوس ہوتی ہے (اور (۳) پانی کی دھار سی آیا کرتا ہے اس لیے کہ راستہ تنگ ہوتا ہے اور بعد خارج نہیں ہوتا اور اگر شبہ ہو جائے تو وضو کے بعد چلو بھر پانی شرمگاہ پر چھڑک دے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کیا ہے اور دائیں ہاتھ سے قضیب کو چھونا مکروہ ہے۔

قضیب سے پانچ چیزیں نکلتی ہیں:

۱۔ پیشاب

۲۔ مذی

۳۔ ودی

جب پیشاب دیر تک روکا جائے تو مذی و ودی جیسی چپکنے والی رطوبت نکل آتی ہے۔

۴۔ ہوا

۵۔ منی

پھر منی کے سوا چاروں صورتوں میں وضو کرنا لازم ہے اور منی سے مراد ٹپک کر نکلنے والا سفید مادہ ہے جس کے بعد قضیب میں سستی آجاتی ہے اور شہوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے ہی انسان کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس کے نکلنے پر غسل واجب ہے اور اگر ذکر سے کپڑا یا کنکر نکلے تو وضو کرنا لازم ہے۔ کبھی ہوا مخفی طور پر نکل جاتی ہے۔ اس لیے ہر نماز پر وضو مستحب ہے اور یہ عورت کے لیے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔

وضو کے فرائض

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے ایسے وضو کیا جیسے حکم ہوا"

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"جس نے وضو کیا اور کامل وضو کیا (پھر) دو رکعت نماز پڑھی اور ان میں دنیا کی کسی چیز کا خیال نہ آیا تو اس سے اس طرح گناہ نکل گئے جیسے کہ آج ہی اس کی ماں نے اسے جنا۔"

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"اور ان دو رکعتوں میں اسے سہو نہ ہو تو اس کے تمام سابقہ گناہ بخش دیے گئے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں تمہیں وہ نہ بتاؤں کہ جس کے باعث اللہ تعالیٰ گناہوں کو دور کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے درجات بلند کرتا ہے (نا پسندیدہ حالات ہیں) وضو مکمل کرنا، مسجد کی جانب قدم اٹھانا اور نماز کے بعد (دوسری) نماز کا انتظار کرنا، یہی تمہارا رباط ہے"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک بار (اعضاء دھو کر) وضو فرمایا تو فرمایا: یہ وضو ہے اس کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔ پھر آپؐ نے دو دو بار (اعضاء دھو کر) وضو فرمایا تو فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے دوگنا اجر عطا کرے گا۔ پھر آپؐ نے تین تین بار (اعضاء دھو کر) وضو کیا تو فرمایا: یہ میرا وضو ہے، اور مجھ سے پہلے انبیاء (علیہم السلام) کا وضو ہے اور ابراہیم علیہ السلام کا وضو ہے"۔

طہارت کے فرائض

طہارت کے آٹھ فرائض ہیں:

۱۔ برتن پاک ہو۔

۲۔ پانی پاک ہو۔

۳۔ نیت کرنا۔

۴۔ کتاب اللہ میں دی گئی ترتیب قائم رکھنا۔

۵۔ ہر عضو کو تین تین بار دھونا جس کو دھونے کا حکم ہے۔

۶۔ سر کا مسح کرنا۔

۷۔ چہرہ اور کلائیاں دھوتے وقت ہاتھ نہ جھاڑے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے مسح ہی بن جائے گا (اور غسل نہ ہوگا)۔

۸۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے نہ مارے۔ اس لیے کہ یہ مکروہ ہے البتہ دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر ایک ساتھ چہرے پر ڈالے، پھر اس پر آہستہ آہستہ پانی گرائے اور سر کے بالوں کی جڑوں سے لے کر ڈاڑھی کے ظاہری حصہ تک دھوئے اور لٹکی ہوئی ڈاڑھی پر بھی پانی ڈالے، دونوں کانوں کے درمیان کے سفید حصہ کو اور ڈاڑھی کو غسلِ چہرہ میں داخل کرے اور کلائیاں دھوتے وقت کہنیوں کو بھی دھوئے۔ یہ فرض ہے اور مناسب یہ ہے کہ چہرہ اور کلائیوں سے پانی کے قطرے بہ پڑیں۔

اگر نئے پانی کی تراوت کے ساتھ سر کا مسح کرے تو بھی کافی ہے۔ سر کا مسح سر کے سامنے حصہ سے شروع کرے اور پھر ہاتھ کو پھراتے ہوئے پیچھے کی طرف لے جائے، پھر اسے تالو کی طرف واپس لائے۔ اور سارے سر کا مسح کرے۔ یہ چار باتیں منصوص ہیں اور ترتیب میں جو واؤ آئی ہے اس کے بارے میں میں نے مکہ میں اہل لغت عرب کے بعض فقہا سے سنا کہ :

اگرچہ واؤ جمع کے لیے ہے اور ظاہری طور پر ترتیب کی مقتضی نہیں مگر جب دو چیزوں کے درمیان صرف جمع مراد نہ ہو اور اس کے ذریعہ دو چیزوں میں جمع کرنا محال ہو تو پھر یہ واؤ، ثم کے قائم مقام ہے اور وہ صرف ترتیب ہی کے لیے ہوتی ہے۔

وضو کی سنتیں

وضو میں دس سنتیں ہیں :

۱۔ بسم اللہ الخ پڑھنا۔

۲۔ دونوں ہاتھوں کو دھونا۔

۳۔ کلی کرنا۔

۴۔ ناک میں پانی ڈالنا۔

۵۔ ناک سنکنا یعنی ناک سے پانی نکالنا۔

۶۔ ڈاڑھی کا خلال کرنا۔

۷۔ دونوں کانوں کا مسح کرنا۔

۸۔ ہر عضو کو تین تین بار دھونا۔

۹۔ ہر عضو دھونے وقت دائیں جانب سے ابتدا کرنا (یعنی پہلے دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں دھونا)

۱۰۔ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا۔

طہارت کے فضائل

اعضاء دھونے کے وقت کے اذکار

وضو اس طرح کرے کہ بیٹھ جائے، ستر کو ڈھانپ لے، پانی دھوپ زدہ نہ ہو، اس لیے کہ یہ مکروہ ہے۔ اور نہانے میں کہ اس کی کراہت خاص طور پر حجاز کی سرزمین میں ہے اور خصوصاً گرمیوں کے موسم میں، کامل وضو کرے یہ حدیث کی بات ہے۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے ایک مومن کا وضو تمام راہبوں کی عبادت کے برابر ہے" اور طہارت میں حد سے نہ بڑھے اس کی ممانعت ہے۔ ہر عضو کو تین بار سے زیادہ دھونا حد سے گزرنا ہے، اور حالت وضو میں دوبارہ وضو کرنا نور ہے۔ یعنی چاہے حدث لاحق نہ ہو پھر ہر نماز کے لیے نیا وضو کرے۔ اگر ممکن ہو تو یہ مستحب ہے اور اسے ہر وضو پر دس نیکیاں ملیں گی اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک ہی وضو کے ساتھ پانچوں نمازیں پڑھ لے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کیا ہے اور جب حدث لاحق ہو تو فوراً وضو کر لینا بھی قرب الٰہی کا باعث ہے جبکہ بندہ اس کی نیت کرے اور چاہے اس کے ساتھ کوئی نماز بھی نہ پڑھی ہو"

حدیث میں ہے:

"جب بندہ وضو کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء سے گناہ نکل جاتے ہیں اور نماز اس کے لیے (نماز) نافلہ ہوتی ہے"

اور مستحب یہ ہے کہ جب بھی پیشاب کرے تو وضو کرے بشرطیکہ یہ اس پر مشقت نہ بن جائے اور جب بھی وضو کرے تو دو رکعت نماز ادا کرے اور وضو کرتے وقت اللہ کے ذکر کے سوا دنیا کا کوئی کام نہ کرے اور ہر عضو دھوتے وقت مستحب دعائیں پڑھتا جائے چنانچہ استنجاء سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ مِنَ النِّفَاقِ وَ حَصِّنْ فَرْجِيْ مِنَ الْفَوَاحِشِ۔

(اے اللہ میرا دل نفاق سے پاک کر دے اور میری شرمگاہ کو بے حیائی کے کاموں سے بچا لے)

اور تسمیہ کے وقت یہ کہے:

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

(میں شیطانی وساوس سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ آن موجود ہوں)

ہاتھ دھوتے وقت یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْيُمْنَ وَ الْبَرَكَةَ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشُّؤْمِ وَ الْهَلَكَةِ۔

(اے اللہ میں تجھ سے برکت و خوش بختی کی دعا کرتا ہوں اور بدبختی و ہلاکت سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

کلی کرتے وقت یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى تِلَاوَةِ كِتَابِكَ وَ كَثْرَةِ الذِّكْرِ لَكَ۔

(اے اللہ مجھے اپنی کتاب کی تلاوت اور تیرے کثرت ذکر میں مدد فرما)

ناک میں پانی ڈالتے وقت یہ دُعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اَوْجِدْ لِیْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ وَ اَنْتَ عَنِّیْ رَاضٍ۔

(اے اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور مجھے جنت کی خوشبو عطا کر اور تو مجھ سے راضی ہو)

ناک صاف کرتے وقت یہ پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ رَوَاحِ النَّارِ وَمِنْ سُوْٓءِ الدَّارِ۔

(اے اللہ میں آگ کے (دھوؤں) و بدبو سے اور بُرے گھر سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

چہرہ دھوتے وقت یہ دُعا کرے:

اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِیْ یَوْمَ تَبْیَضُّ فِیْہِ وُجُوْہُ اَوْلِیَآئِکَ وَلَا تُسَوِّدْ وَجْھِیْ یَوْمَ تَسْوَدُّ فِیْہِ وُجُوْہُ اَعْدَآئِکَ۔

(اے اللہ! جس دن تیرے اولیاء کے چہرے سفید (چمکدار) ہوں گے اس روز میرا چہرہ بھی سفید (چمکدار) کر دے اور جس روز تیرے دشمنوں کے چہرے سیاہ ہوں گے اس روز میرا چہرہ سیاہ نہ کرنا)

دایاں ہاتھ (کلائی) دھوتے وقت یہ دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ اٰتِنِیْ کِتَابِیْ بِیَمِیْنِیْ وَ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔

(اے اللہ میرا اعمال نامہ میرے دائیں ہاتھ میں دینا اور میرا حساب آسان فرما دینا)

بایاں ہاتھ دھوتے وقت یہ دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ تُؤْتِیَنِیْ کِتَابِیْ بِشِمَالِیْ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ ظَھْرِیْ۔

(اے اللہ میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تو مجھے میرا اعمال نامہ میرے بائیں ہاتھ میں یا میرے پیچھے سے دے)

سر پر مسح کرتے وقت یہ دُعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ غَشِّنِیْ بِرَحْمَتِکَ وَ اَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَکَاتِکَ وَ اَظِلَّنِیْ تَحْتَ عَرْشِکَ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّکَ۔

(اے اللہ! مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور مجھ پر اپنی برکات نازل فرما اور مجھے اس روز اپنے عرش کے سایہ تلے سایہ عطا کر جس روز تیرے سایہ کے بغیر سایہ نہ ہوگا)

کانوں کا مسح کرتے وقت یہ دُعا کہے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِمَّنْ یَّسْمَعُ الْقَوْلَ

اے اللہ! مجھے ان میں سے کر دے جو بات سنتے اور

فَيَتَّبِعُ اَحْسَنَهُ اَللّٰهُمَّ اَسْمِعْنِیْ مُنَادِیَ الْجَنَّةِ مَعَ الْاَبْرَارِ۔

(خوب عمل کرے اے اللہ مجھے ابرار کے ہمراہ جنت (جانے) کی ندا سنا دے)

پھر گردن کا مسح کرے تو یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ فُكَّ رَقَبَتِیْ مِنَ النَّارِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ السَّلَاسِلِ وَ الْاَغْلَالِ۔

(اے اللہ! میری گردن آگ سے آزاد فرما دے اور میں زنجیروں اور طوقوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

دایاں پاؤں دھوتے وقت یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمَیَّ عَلَى الصِّرَاطِ مَعَ اَقْدَامِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(اے اللہ! پل صراط پر مومنوں کے قدموں کے ہمراہ میرے قدم ثابت فرما (یعنی مجھے ثابت قدمی عطا فرما))

بایاں پاؤں دھوتے وقت یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ تَزِلَّ قَدَمَیَّ عَنِ الصِّرَاطِ يَوْمَ تَزِلُّ فِيْهِ اَقْدَامُ الْمُنَافِقِيْنَ۔

(اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جس روز منافقین کے پاؤں پل صراط پر پھسلیں گے، میرے بھی پاؤں پھسلنے لگیں) (اس سے پناہ مانگتا ہوں)

کلائیاں دھوتے وقت پہلے ہاتھوں کی انگلیاں دھوئے اور ہر دھونے میں دو کہنیوں کو علیحدہ کر لے اور کلائیاں دھوتے وقت نصف کلائی تک اٹھا لے۔ پاؤں دھوتے وقت بھی انگلیوں سے ابتدا کرے اور دونوں پاؤں کی انگلیوں میں میامن سے خلال کرے اور ٹخنوں تک دھو کر ختم کر دے اور پاؤں دھوتے وقت نصف پنڈلی تک لے جائے اور میامن دراصل یمین کا تثنیہ ہے اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی یمین چھنگلی ہے۔ اور بائیں ہاتھ کا یمین اس کا انگوٹھا ہے (یعنی دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے دائیں پاؤں کی انگلیوں میں اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے بائیں پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرے)

جب وضو سے فارغ ہو جائے تو آسمان کی طرف سر اٹھا کر یہ پڑھے:

[illegible] لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْٓءً

([illegible] میں گواہی دیتا ہوں [illegible] اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ تو پاک ہے اپنی حمد کے ساتھ، تیرے بغیر

وَظَلَمْتُ نَفْسِيْ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ فَاغْفِرْلِيْ وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ شَكُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ اَذْكُرُكَ كَثِيْرًا وَّ اُسَبِّحُكَ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا۔

کوئی معبود نہیں۔ میں نے برا عمل کیا۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ میں تیری بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف لوٹ کر آتا ہوں، مجھے بخش دے اور مجھ پر لوٹ آ۔ (توبہ قبول کر لے) بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اے اللہ مجھے خوب توبہ کرنیوالوں میں سے کر دے اور مجھے خوب پاک ہونے والوں میں سے کر دے اور مجھے خوب شکر کرنے والوں میں سے کر دے اور مجھے ایسا کر دے کہ تیرا خوب ذکر کروں اور صبح شام تیری خوب خوب پاکیزگی بیان کروں)

وضو کے بعد ماثور دعاؤں کو ہم نے جمع کر کے لکھ دیا ہے۔ بتاتے ہیں کہ جو آدمی وضو کے بعد یہ دعائیں کرے اس کے وضو پر مہر لگا دی جاتی ہے اور اس کے لیے اسے عرش کے نیچے اٹھا لیا جاتا ہے۔ اب قیامت تک یہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس بیان کرتا رہے گا اور اس کا ثواب اسے ملے گا اور چھوٹے برتن میں وضو کرنا مکروہ ہے۔ سنا ہے کہ جب ایک آدمی وضو کرتا ہے تو شیاطین اسے وسوسے ڈالتے ہیں اور جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان وہاں سے کھسک جاتا ہے اور فرشتے آجاتے ہیں اور اگر وہ آدمی پیتل یا تانبے کے برتن میں وضو کرے تو فرشتے نہیں آتے۔ حضرت ابن عمر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے اس کی کراہت منقول ہے۔ ایک راوی بتاتے ہیں کہ حضرت شعبہؒ نے وضو کے لیے برتن مانگا۔ میں نے انہیں پیتل کے برتن میں پانی دیا تو انہوں نے اس کے ساتھ وضو نہیں کیا اور فرمایا:

"مجھے عبداللہ بن دینار نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے پیتل کے برتن میں وضو کرنا ناپسند فرمایا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھاگل، چمڑے کے برتن اور پتھر کے پیالے سے وضو کیا۔"

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ:
"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور غسل فرمایا۔"
اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ
"ان کے پاس لگن تھا جو تانبے کا تھا۔" اور یہ رخصت کی بات ہے۔

غسلِ جنابت کا طریقہ

برتن کو داہنی جانب رکھے، پھر بسم اللہ پڑھے اور برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھوں پر تین بار پانی ڈالے، پھر شرمگاہ کو دھوئے اور نجاست کو دُور کرے، پھر نماز کا کامل وضو کرے۔ البتہ پاؤں دھونا چھوڑ دے پھر برتن میں دونوں ہاتھ ڈالے اور سینہ اور پیٹ سے لے کر رانوں اور پنڈلیوں تک دائیں حصہ پر تین بار پانی بہائے، پھر اسی طرح پیٹھ اور پیٹ سے لے کر رانوں اور پنڈلیوں تک بائیں جانب تین بار پانی بہائے اور دونوں ہاتھوں سے ایک ساتھ سامنے اور پچھلے حصۂ بدن کو ملے۔ پھر برتن میں ہاتھ ڈال کر سر پر تین بار پانی ڈالے اور انگلیوں کے ساتھ سر کے بالوں میں خلال کرے اور بالوں کو خُوب تر کرے۔ جلد کو صاف کرے۔ پھر اس جگہ سے ذرا ہٹ کر دونوں پاؤں دھولے۔ اب اگر برتن میں مزید پانی ہو تو اسے سارے بدن پر بہالے اور بدن پر ہاتھ ملتا رہے۔ اب اگر پہلے پاؤں دھولے اور اسے پہلے وضو میں داخل کرلے تو کچھ ہرج نہیں اور غسل کے بعد نیا وضو لازم نہیں۔ البتہ شرمگاہ (قضیب) کو ہاتھ لگانے سے پرہیز رکھے اور اگر قضیب کو ہاتھ لگا بیٹھے تو دوبارہ وضو کرے اور اگر کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا غسلِ جنابت میں یاد نہ رہے اور نماز بھی پڑھ لے تو میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ کلی کرکے اور ناک میں پانی ڈال کر دوبارہ نماز ادا کرے اور اگر وضو میں کلی و ناک میں پانی ڈالنا بھول جائے تو نماز کا اعادہ ضروری نہیں اور غسلِ جنابت جس طرح بھی کرے جائز ہے بشرطیکہ سارے بدن پہ پانی بہا کر اسے دھودے اور جو آدمی غسل سے پہلے وضو کرے تو میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ دوبارہ وضو کرلے اور جو آدمی نہر یا دریا میں ڈبکی لگائے تو بھی غسل سے کافی ہے اور مستحب یہ ہے کہ وضو کرلے۔ مردے کا غسل بھی جنابت کے غسل کی طرح ہے۔

کتاب الصلوٰۃ

ارکان و شرائطِ نماز

نماز میں داخل ہونے سے پہلے فرائض (شرائط) سات ہیں:

۱۔ سارا بدن پاک ہو
۲۔ لباس پاک ہو۔
۳۔ جائے نماز پاک ہو۔
۴۔ ستر ڈھانپ رکھا ہو۔ یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک چھپا رکھے۔
۵۔ قبلہ کی طرف رُخ کرنا۔

۶۔ نماز کا وقت ہونا۔

۷۔ عذرِ شرعی نہ ہو تو قیام کرنا۔

نماز کے فرائض اور اس کے اندر بارہ خصائل ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"نماز پڑھنا، جنت کی کنجی ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

تکبیر تحریمہ سے (نماز میں دوسرے تمام کام) حرام ہو جاتے ہیں اور سلام پھیرنے سے (نماز سے) نکل جاتا ہے۔ چنانچہ

۱۔ نیت کرنا

۲۔ لفظِ تکبیر کے ساتھ تکبیر تحریمہ کہنا سب سے پہلا فرض ہے۔ عربوں کے ہاں لفظِ تکبیر کا معنی اِکبار نہیں ہوتا سوائے اس صورت کے کہ یہ افعل اور الافعل کے وزن پر ہو۔ چنانچہ عرب کہا کرتے ہیں: اللہ اکبر، اللہ الاکبر۔ اور یہ نہیں کہا کرتے: اللہ کبیر۔ اور یہ کہہ کر وہ تمام ماسوا سے اکبر مراد نہیں لیتے بلکہ کبیر کا معنی عظیم کا لیتے ہیں اس لیے کہ یہ عجمی لفظ ہے جو کہ معرب ہوا ہے۔ عرب کہا کرتے ہیں: اللہ کبار۔ اور یہ اکبر کا ہم معنی نہیں ہوتا بلکہ یہ کبیر کے ہم معنی ہے اور از حد تعظیم کا لفظ ہے۔ پھر اس کے بعد

۳۔ سورۃ الحمد پڑھے اور اس سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ابتداء کرے۔

۴۔ رکوع کرنا۔

۵۔ اطمینان سے سجدہ کرنا۔

۶۔ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا۔

۷۔ آخری تشہد۔

۸۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا۔

۹۔ پہلا سلام کہنا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جو آدمی رکوع و سجدہ کے درمیان اپنی پیٹھ سیدھی نہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر بھی نہیں کرتا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جو آدمی رکوع و سجود میں پیٹھ سیدھی نہ رکھے اس کی نماز درست نہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو نماز کی حالت میں رکوع و سجود میں پیٹھ سیدھی نہیں کر رہا تھا۔ آپ نے اسے فرمایا:

" واپس جاؤ، نماز پڑھو۔ اس لیے کہ تُو نے نماز نہیں پڑھی۔" پھر جب رکوع و سجود میں اطمینان کا طریقہ سمجھایا اور فرمایا:

" حتیٰ کہ تمہارے جوڑ پر سکون اور ڈھیلے ہو جائیں۔"

حضرت حذیفہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا جو ناقص رکوع و سجود کر رہا تھا۔

انہوں نے فرمایا:

" اگر تو اسی حالت میں مر گیا تو ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کے سوا حالت میں مرے گا۔"

ان دونوں میں سے ایک روایت میں یہ مروی ہے:

" تم کب سے یہ نماز پڑھ رہے ہو؟"

اس نے بتایا: " چالیس برس سے۔"

فرمایا: " تو نے چالیس برس سے نماز نہیں پڑھی۔"

حضرت کعب احبارؓ سے منقول ہے کہ:

" نماز کے تین ۳ حصے ہیں:

۱۔ ایک حصہ طہارت ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ رکوع ہے۔

۳۔ تیسرا حصہ سجدہ ہے۔"

جس نے ان میں سے کسی ایک میں کمی کر دی اس کی تمام نماز ہی قبول نہ ہو گی۔

کہتے ہیں:

" جس کی نماز قبول نہ ہوئی اس کے تمام اعمال مسترد کر دیے جائیں گے۔"

سننِ نماز

نماز میں بارہ سنتیں ہیں:

۱۔ تکبیر تحریمہ کے موقع پر رفع یدین کرنا اور رفع یدین کا طریقہ یہ ہے کہ کاندھوں کے برابر ہتھیلیاں اٹھائے۔ اور دونوں انگوٹھے اپنے کانوں کی لو تک لے جائے اور ہاتھوں کی انگلیاں کانوں کے اوپر کے حصہ کے برابر ہو جائیں۔ ایسا کر کے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین مروی احادیث پر عمل کرے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

"آپ کاندھوں کے برابر ہاتھ اٹھاتے تھے اور آپ کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھاتے تھے اور آپ نے کانوں کی فروع یعنی اوپر کے حصہ تک ہاتھ اٹھایا۔"

اور لفظِ تکبیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہا کو واؤ تک لے جائے بغیر تخفیفِ ضمہ کے ساتھ اسم سے ملا کر پڑھے اور اکبر کے الف کو ہمزہ سا بنا دے اور با اور راء کے درمیان الف نہ پڑھے اور راء پر جزم پڑھے۔ اس کے سوا طریق پر جائز نہیں۔ چنانچہ اس طریق پر اللہ اکبر کہے۔ جب تکبیر کہے تو سامنے کی طرف دھکا دے کر ہاتھ نہ اٹھائے اور کاندھوں پر پیچھے کی طرف بھی نہ لے جائے بلکہ اس کی انگلیاں کانوں کے برابر ہوں۔ پھر تکبیر کہہ کر ذرا سی دیر کے لیے ہاتھ چھوڑ دے اور تکبیر کے آخری حصہ میں ہاتھوں کو چھوڑے۔ (ارسال بدین کرے) تکبیر ختم ہونے سے پہلے ہی ہاتھ نہ چھوڑ دے اور تکبیر سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھوں کو اوپر کھڑا نہ رکھے۔ پھر ارسال کے بعد ہاتھ اٹھا کر بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھے۔

ابتدائی دعائیں

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ جب آپ تکبیر کہتے تو ہاتھوں کو چھوڑ دیتے پھر جب پڑھنے کا ارادہ فرماتے (یعنی پڑھتے وقت) بائیں پر دایاں (ہاتھ) رکھ دیتے اور بائیں ہتھیلی کے گٹے پر گرفت کر لیتے اور انہیں سینہ کے نیچے کے حصہ پر رکھ لیتے۔ پھر آپ یہ دعا کرتے:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ[۱]

(میں نے اپنا منہ کیا اس کی طرف جس نے بنایا آسمان و زمین، ایک طرف کا ہو کر، اور میں نہیں شریک کرنے والا)

پھر یہ دعا کرتے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔[۲]

(اللہ رب العلمین کے لیے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے یہی حکم ہوا اور میں مسلمانوں سے ہوں)

پھر یہ دعا پڑھتے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ وَ تَبَارَكَ اسْمُكَ وَ تَعَالٰی جَدُّكَ وَ لَا اِلٰهَ غَیْرُكَ۔

(اے اللہ تو پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ، تیرا نام برکت والا ہے، تیری شان بلند ہے اور تیرے بغیر کوئی معبود نہیں)

---

[۱] الانعام آیت ۸۰

[۲] انعام آیت ۱۶۳ - ۱۶۴ -

یہ تمام دعائیں مختلف روایات میں آتی ہیں اگر امام کے پیچھے نہ ہو تو ان کو پڑھنا بہتر ہے اور امام کی اقتداء میں یہ سب دعائیں اطمینان سے پڑھنا مشکل ہے اور اس صورت میں امام کی قرأت کے دوران سکتوں میں صرف سورۃ الحمد ہی پڑھے اور امام کے قرأت کرنے کرتے اور رکوع وسجدہ میں تلاوت نہ کرنے لگ جائے۔ اسی طرح امام سے پہلے سر نہ اٹھائے۔ پھر استعاذہ (اعوذ باللہ) پڑھے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی کوئی سی سورت یا تین آیات کے بقدر تلاوت کرے اور سورۃ الحمد ختم کر کے آمین کہنا بہتر طریقہ ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی کیا ہے۔

رکوع وسجود کا طریقہ

پھر تکبیر کہہ کر رکوع کے لیے ہاتھ اٹھائے (رفع یدین کرے) یہ سنت ہے۔ پھر رکوع میں جا کر تسبیحات پڑھے۔ تین بار سے کم تسبیح نہ کہے۔ اگر سات یا دس بار کہے تو یہ کمال ہے۔ بتایا گیا کہ تین بار کمال کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اس لیے کہ دس کی تعداد کمال شمار ہوتی ہے۔ فرمایا:

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ (یہ دس کامل ہیں)

گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کے بعد ہی کم از کم تین تسبیح پڑھے اور یہ تعداد ہاتھ اٹھانے سے پہلے پوری ہو جائے۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا تو پھر یہ قباحت لازم آئے گی کہ ہاتھ رکھتے رکھتے ایک تسبیح اور ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے ایک تسبیح پوری ہو جائے گی اور اصل وقت میں تسبیح ایک ہی بار رہ جائے گی اور یہ مکروہ ہے۔

رکوع کا طریقہ یہ ہے کہ انگلیوں کو کھلا رکھے اور پھیلا کر گھٹنوں کو ہاتھ میں لے لے۔ اپنے پہلوؤں سے بازوؤں کو ہٹا کر رکھے۔ سر زیادہ اونچا نہ ہو اور نہ زیادہ نیچا ہو اور پیٹھ کے برابر سر کو رکھے یعنی اس کی پیٹھ اور سر ایک خط میں سیدھے ہوں۔ نہ نیچے کی جانب جھکا ہوا ہو اور نہ ہی اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہو۔ پھر رفع یدین کرتا ہوا اٹھے اور یہ دعا پڑھے:

سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ۔ (جس نے (اللہ) کی تعریف کی۔ اللہ نے اس کی سن لی)

یہ سنتا ہے پھر یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مِلْءُ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ۔

(اے اللہ تیری ہی حمد ہے آسمانوں اور زمینوں بھر اور جو ان کے درمیان ان بھر، اور اس کے بعد جو چیز تو چاہے اس بھر)

پھر اگر چاہے تو سجدہ میں سات بار تسبیح پڑھے اور تین سے کم نہ کرے اور تین تسبیحات اس طرح پڑھے

کہ زمین پر پیشانی رکھنے کے بعد اور سجدہ سے اٹھانے سے پہلے ہی یہ تعداد پوری ہو جائے ورنہ یہ ایک ہی تسبیح بن جائے گی۔ چہرہ رکھتے رکھتے ایک پڑھ لے گا۔ اور سر اٹھاتے اٹھاتے ایک تسبیح پڑھ ڈالے گا۔ اس طرح ہر سجدہ میں ایک ہی تسبیح باقی رہے گی اور زمین سے کم کرنا غیر مستحب ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں:

"میں نے تمہارے اس امام یعنی عمر بن عبدالعزیزؒ سے زیادہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ نماز پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا اور بتایا کہ ہم ان کے پیچھے رکوع اور سجدہ میں دس دس بار تسبیح پڑھ لیا کرتے تھے اور سجدہ کی حالت میں دونوں ہتھیلیوں کے درمیان سر رکھے۔ اس لیے کہ جب ہتھیلیاں کھلی ہوں تو یہ بھی سجدہ کرتی ہیں۔ بازوؤں کو پہلوؤں سے جدا رکھے۔ پیٹھ سیدھی کر لے اور پیٹ کو رانوں سے اٹھا کر رکھے۔

اور مستحب یہ ہے کہ ہتھیلیاں براہِ راست زمین پر لگائے۔ اس لیے کہ چہرہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی سجدہ کرتی ہیں۔ سجدہ کے لیے اور دونوں سجدوں کے بیٹھنے کے لیے تکبیر کہے اور دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کیے بغیر اٹھے۔ پھر دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا تین بار پڑھے:

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ ارْحَمْنِیْ۔ (اے پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما)

یہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے اور اگر یہ دعا پڑھے تو بھی جائز ہے:

رَبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ تَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ۔ (اے پروردگار! بخش دے اور رحم فرما اور جو تو جانتا ہے اس سے درگزر فرما۔ بے شک تو ہی سب سے زیادہ عزت و کرم والا ہے)

یہ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے اور اگر یہ دعا پڑھے تو بہتر ہے۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَ انْعَشْنِیْ۔ (اے پروردگار! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر، مجھے ہدایت دے۔ میری دلجمعی فرما اور مجھے سوجھا دے)

یہ دعا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ پھر پہلا تشہد پڑھے۔ پھر الف لام کے ساتھ سلام پھیرے۔ یعنی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے اور چہرہ اس قدر گھمائے کہ دائیں بائیں والوں کے سامنے اس کے رخسار آجائیں اور کاندھوں پر اس کی گردن مڑ جائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سلام پھیرا کرتے اور جسم کو قبلہ سے نہ موڑتے تھے۔ اور نہ ہی زمین سے رانوں کو اٹھاتے۔

مدرک نماز کے احکام

جو آدمی چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتیں یا تین رکعتوں والی نماز میں تیسری رکعت پالے۔ اب اس نے

جو پا لیا اُس کا وہی آغازِ نماز ہے۔ اسے چاہیے کہ اُس پر بنا کرے اور جو آدمی امام کے ساتھ قیام کا کچھ حصّہ پالے تو وہ سورہ الحمد پڑھ کر ہی رکوع میں گیا۔ اور اگر امام اس کے رکوع میں جانے سے پیشتر رکوع سے کھڑا ہو جائے تو وہ بعد میں اُس رکعت کو ادا کرے۔

اور جو آدمی امام کے ہمراہ قیام کا کچھ حصّہ بھی نہ پا سکے وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر پھر تکبیر کہے اور رکوع میں جائے۔ اس کی رکعت بن گئی۔ اور اگر امام نے رکوع کیا اور یہ سورۃ الحمد کے علاوہ کوئی دوسری سورت پڑھ رہا ہے تو جہاں ختم ہو وہیں چھوڑ دے اور اس کے بعد رکوع کرے۔

اور جو تشہد میں امام کے ساتھ مل جائے یا سجدہ میں مل جائے تو پہلے کھڑے کھڑے تکبیر تحریمہ کہے۔ پھر بیٹھے اور سجدہ کرے اور جب امام سلام پھیرے تو یہ نئی تکبیر کہے بغیر کھڑا ہو جائے اور کھڑا ہو کر سورۃ الحمد پڑھنا شروع کر دے اور امام کے ساتھ وہی رکعت سمجھے جو اس نے رکوع کے ساتھ ساتھ حاصل کی۔ یعنی اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور وہ امام کے سر اٹھانے سے پہلے حاصل کر چکا تھا۔ رکوع میں پرسکون اس کی رکعت ہو گئی۔

جو آدمی فرض نماز شروع کر دے۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے ذمّہ ایک دوسری نماز بھی لازم تھی تو میرا خیال یہ ہے کہ اُس شروع کردہ کو پُوری کر لے۔ پھر جو یاد آئی اسے پڑھے اور پھر یہی نماز (جو پڑھ چکا ہے) دوبارہ پڑھے۔

نماز کے بعض دُوسرے مسائل

ایک آدمی نمازِ عصر کی جماعت میں شریک ہُوا اور اس نے ظہر نہیں پڑھی تھی تو عصر کی نماز امام کے ہمراہ پڑھ لے۔ پھر نمازِ ظہر ادا کرے اس کے بعد نمازِ عصر دوبارہ پڑھے۔ بعض صحابہ سے ایسا کرنا ثابت ہے اور میرے نزدیک یہ مستحب ہے۔

جو آدمی حالتِ نماز میں بھُول کر کلام کر بیٹھے یا چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعت کے سلام پھیرے اسے چاہیے کہ تشہد کے بعد سہو کے دو سجدے کرے اور اگر وہ (نماز پڑھتے پڑھتے) مسجد سے نکل گیا اور اس میں دیر ہو گئی۔ پھر اسے یاد آیا تو دوبارہ نماز پڑھے (یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیرا اور مسجد سے نکل گیا) جو آدمی قصداً نماز کی حالت میں کلام کرے یا چار رکعت والی نماز میں دو رکعت کے بعد قصداً سلام پھیر دے یا قبلہ سے رُخ ہٹا لے یا اس کا ستر کھل جائے یا حالتِ نماز میں اسے نکسیر پڑے یا اسے یاد آ جائے کہ اس نے سر کا مسح نہیں کیا تھا یا وضو میں ایک عضو نہیں دھویا تھا تو نماز دوبارہ پڑھے۔ جس کی جماعت رہ گئی اب ایک آدمی اٹھ کر نفل پڑھنے لگا اور یہ اٹھ کر اس کے ہمراہ شریک ہو گیا۔ مستحب یہ ہے کہ نماز پڑھانے والا فرض ادا کر رہا ہو۔ اور یہ بات غیر مستحب ہے کہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض کی نیت باندھ دے اور نوافل کی

جماعت مکروہ نہیں۔ اور جس میں جہر سے قرأت کی جاتی ہے۔ اس میں اگر آہستہ پڑھے اور جس میں نخفا کیا جاتا ہے، اس میں جہر سے پڑھ جائے تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں۔

جس کو تین رکعتوں یا دو رکعتوں میں شبہ پڑ جائے کہ کتنی تھیں؛ تو وہ (قلیل تعداد) یعنی دو ہی سمجھے۔

جس کو یہ شک ہو کہ چار تھیں یا تین۔ تو انہیں تین گمان کرے۔ اقل یعنی یقین پر رہے۔ پھر سلام سے پہلے سجدۂ سہو کر لے اور اس پر لازم ہے کہ سجدۂ سہو کے بعد دوبارہ تشہد پڑھے۔ اس کی نماز پوری ہو گئی۔

جس کو سجدۂ سہو کرنا یاد نہ رہا اب اگر نماز کے بعد جلدی ہی یا مسجد سے نکلنے سے پہلے یاد آ گیا تو سجدۂ سہو کرے۔ پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیرے اور اگر دیر ہو گئی یا مسجد سے ہی نکل گیا تو سجدۂ سہو ساقط ہو گیا۔

اندھیرے کی وجہ سے یا رہنمائی نہ مل سکنے کی وجہ سے جس کو قبلہ کی سمت میں شبہ پڑ گیا۔ اس کے بعد اس کے برعکس سمت میں قبلہ ہونے کا علم ہوا تو بہتر یہ ہے کہ دوبارہ نماز پڑھے۔ کمی کی صورت میں سلام سے پہلے سجدہ کرے اور اضافہ کی صورت میں سلام کے بعد سجدہ سہو کرے تو بہتر ہے۔ اگر کمی بیشی ہر دو میں سلام سے پہلے ہی سجدہ سہو کر لے تو خوب ہے۔ یہ سب باتیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ اگر نماز میں اسے وہم آ جاتا ہو یا نماز میں کثرت سے اوہام آئیں تو میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ سلام کے بعد ہمیشہ سجدہ کر لیا کرے۔

جو آدمی نماز پڑھے مگر وضو و طہارت میں ضروری کمی رہ جائے یا نماز کا کوئی فرض رہ جائے تو جب موقع ملے نماز دوبارہ پڑھ لے۔

ایک آدمی نے ایک کپڑے میں نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد معلوم ہوا کہ کپڑا ناپاک ہے۔ اب اگر وقت ہے تو دوبارہ نماز پڑھے اور اگر نماز کا تمام وقت چلا گیا اور دوسری نماز کا وقت آ گیا تو اعادہ کرنا لازم نہیں اور اگر نجاست دیکھ کر بعد میں بھی اعادہ کر لیا تو یہ بہتر ہے۔

جس کے ذمہ کئی نمازیں ادا کرنا باقی ہوں جن میں اس نے کوئی غلطی کی ہو۔ اب اگر ممکن ہو تو ایک ہی وقت میں اور ایک ہی روز میں ادا کرے اور چاہے تو مختلف اوقات میں پڑھ لے۔ البتہ ممنوعہ اوقات میں نماز نہ پڑھے۔ یہ بہتر ہے۔

ایک آدمی کو نماز کی حالت میں معلوم ہوا کہ اس کا کپڑا ناپاک ہے یا وہ قبلہ رُخ نہیں ہے تو فوراً کپڑا پھینک دے اور قبلہ رُخ ہو جائے اور نماز پوری کرے اور اگر دوبارہ پڑھ لے تو یہ مستحب ہے۔

نماز کے احکام و آداب

نماز سے پہلے مسواک کرنا بہت ہی فضیلت کا عمل ہے۔ حدیث میں ہے،

"مسواک کر کے نماز پڑھنا بغیر مسواک کی ستر نمازوں سے درجہ میں افضل ہے"۔ اور بہتر یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے قل اعوذ برب الناس پڑھے تاکہ شیطان سے پناہ مل جائے اور ہر رکعت میں سورۃ الحمد سے پہلے اعوذ باللہ پڑھے۔ اس لیے کہ سورۃ الحمد پڑھتے وقت وہ قرآن پڑھ رہا ہے اور ہر رکعت نماز کی تکبیر کہتے وقت ہاتھ کی انگلیاں ملائے رکھے۔ قیام کی حالت میں پاؤں میں فاصلہ رکھے اور ٹخنے ملا نہ دے۔ بلکہ دونوں پاؤں کے درمیان چار انگلی کا فاصلہ کر دے۔ اس لیے کہ یہ مستحب ہے۔

بعض کا فرمان ہے:

وہ امام کو دیکھتے کہ جب وہ انگلیاں ملا کر تکبیر کہتا ہے۔ اور جب کھڑا ہو کر پاؤں جدا رکھتا ہے۔

بعض کا فرمان ہے کہ اس کے ذریعہ وہ امام کی فقاہت معلوم کرتے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے دیکھا کہ ایک آدمی نے حالتِ نماز میں ٹخنے ملا رکھے ہیں۔ فرمایا:

"اگر یہ ان کے درمیان فاصلہ رکھتا تو سنت پا لیتا"۔

ایک روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفن اور صفد سے منع فرمایا۔

صفن کا مطلب ہے: ایک ٹانگ اٹھانا۔

فرمایا:

اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ۔ (گھوڑے خاصے)

اور صفد کا مطلب ہے دونوں پاؤں ساتھ ملا لینا۔ اسی سے ہے۔

مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (بندھے ہوئے بیڑیوں میں)

اس کا واحد صفد آتا ہے۔

میں نے بعض علماء کو دیکھا کہ وہ تکبیر میں انگلیاں جدا جدا کر لیتے تھے۔ اس سے یہ مطلب لیا کہ روایت میں ہے:

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر کہتے تو اپنی انگلیاں پھیلا لیتے"۔ یعنی نشر اصابعہ نشراً۔ یہ بھی احتمال ہے۔ اس لیے کہ مصدر کے ساتھ اس کی تاکید بھی ہوئی یعنی نشراً کہہ کر تاکید ہوئی۔ اب نشراً سے مراد تفرقہ ہے اور گاہے اس سے مراد جدا جدا کر کے پھیلانا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نشر کا حقیقی مفہوم پھیلانا ہی ہے۔

لہ صٓ آیت ۳۱

لہ صٓ آیت ۳۸

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَ زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ۔ (اور مخمل کے نہالچے کھنڈر رہے)
اس سے مراد تفرقہ و جدائی ہے اور بث کے مفہوم میں یہ ہے:
کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ[1] (بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح)

ایسے ہی فرمایا:
کَاَنَّھُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ[2] (جیسے ٹڈی بکھر پڑی)

جب نشر اب بث کی طرح ہوئی اور بث کا معنی تفرقہ ہے تو نشر کا مطلب بھی فرق (متفرق کر دیا) ہو گیا۔ البتہ اسحٰق بن راہویہ سے نشر اصابعہ فی الصلاۃ نشراً کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا:
آپؐ نے ہاتھ کھولا اور انگلیوں کو ملا کر رکھا۔ مراد یہ ہے کہ آپؐ نے مٹھی بند کر کے نہیں رکھی بلکہ مٹھی کھول کر تکبیر کہی۔ یہ بہتر توجیہ ہے۔ اس لیے کہ نشر فی الحقیقت معنی میں طیّ کی ضد ہے اور قبض کا مطلب طیّ (لپیٹ لینا، بند کر لینا) ہوتا ہے۔

میں نے تین علماء کو دیکھا کہ وُہ تکبیر کہتے وقت انگلیاں کھلی رکھتے ان میں سے ایک ابوالحسنؒ تھے جو کہ مسجد حرام میں امام نماز تھے اور یہ فقیہ تھے۔

میں نے تین بزرگوں کو دیکھا کہ وہ انگلیاں ملا کر رکھتے ان میں ابوالحسن بن سالم اور ابوبکر آجری ہیں اور ابو زید فقیہ کے بارے میں میرا زیادہ یہی گمان ہے اور مجھے جو ان کی تکبیر یاد پڑتی ہے وُہ یہی ہے کہ وُہ بھی تکبیر کے وقت انگلیاں جدا رکھتے اور آمین فضائلِ نماز میں سے ہے۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جیسے امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ اس لیے کہ اگر اس کی آمین فرشتوں کے آمین کہنے کے ساتھ مطابق رہی تو اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔"
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آمین کہتے وقت آواز بلند کرتے اور آمین کے لفظ میں دو لغات ہیں:
۱۔ مد کی
۲۔ قصر کی۔

---

[1] القارعہ آیت ۴
[2] القمر آیت ۷

اور دونوں میں میم مخفف ہے۔ اس لیے کہ اگر میم کو مشدد کر دیا تو معنی الٹ جائے گا۔ پھر اس کا مطلب قاصدین (ارادہ کرنے والے) بن جائے گا۔ جیسے کہ فرمایا:

وَلَآ آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ[1] (اور نہ آنے والوں کو ادب والے گھر کی طرف)

ناف اور سینہ کے درمیان ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے رہے اور گٹے پر گرفت رکھے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا خشوع سے ہے۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

عزیز تعالیٰ کے سامنے میں ایسا کرنے کو ذلت نہیں سمجھتا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، کہ ایسا کرنا تمام رسولوں کی سنت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی وضاحت کی اور اس کے ضمن میں فرمایا:

"دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا" اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام علم اور لطیف معرفت ہے۔ اس لئے کہ سینہ کے نیچے کر کے ایک رگ ہے جس کو ناحر کہا جاتا ہے اس کو صرف علماء ہی جانتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے وانحر کو ناحر سے مشتق فرمایا یعنی اپنا ہاتھ ناحر یعنی اس رگ پر رکھو جیسے کہ کہا جاتا ہے۔ ادمغ اور مراد ہے اصب الدماغ۔ اور اس کو نحر البدن پر قیاس نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کا نماز میں ذکر آرہا ہے۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یہ نحر سے مشتق ہے اور نحر دراصل گلے کے نیچے کی جگہ کا نام ہے جہاں ہنسلی کی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور وہاں ہاتھ نہیں رکھے جاتے۔ سوائے ان اہل لغت کے کہ جنھوں نے یہ کہا کہ وانحر کا معنی یہ ہے کہ اپنے نحر کے باعث قبلہ رخ ہو جا۔ یہ صرف ایک توجیہ ہے اور نماز میں اقعاء نہ کرے یعنی قدموں کے بل بیٹھ کر گھٹنے اٹھا دے۔ ایسا نہ کرے۔ یہ اقعاء میں اہل لغت کا مذہب ہے اور محدثین کے نزدیک اقعاء کا مطلب یہ ہے کہ گھٹنوں پر بیٹھے اور پاؤں کی انگلیوں پر سہارا لے کر اکڑوں بیٹھ جائے اور انگلیوں کا رخ زمین کی طرف کر رکھے۔ یہ محدثین کا مذہب ہے۔

سدل سے پرہیز کرے

سدل اور کف سے پرہیز رکھے۔ سدل کا مطلب یہ ہے کہ دونوں طرف کپڑا زمین پر لٹکا لے اور خود کھڑا ہو۔ کہا کرتے ہیں سدل اور سدن۔ ان دونوں کا ایک مطلب ہے۔ قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ل کو ن میں بدل دیتے ہیں یعنی کپڑا لٹکا دینا اور سدن الکعبۃ بھی اسی سے ہے۔ اس کا واحد سادن آتا ہے۔ سادن سے مراد کعبہ کا مجاور ہے جو کہ اس پر غلاف لٹکایا کرتا تھا اور سدانۃ الکعبۃ سے مراد لٹکایا ہوا غلاف کعبہ ہے اور یہ اہل لغت کا قول ہے۔

---

[1] المائدہ آیت ۲

اور محدثین کے نزدیک سدل سے مراد یہ ہے کہ کپڑا اپنے بدن پر پیٹ لے اور ہاتھوں کو اندر داخل کر دے اور اس حالت میں رکوع و سجود کرے۔ نماز میں یہ یہود کا طریقہ ہے۔ اس لیے ان سے مشابہت کی ممانعت ہوئی اور قمیص بھی اسی مفہوم میں ہے (جبکہ ہاتھ اس کے اندر داخل کر لے)۔

اگر قمیص فراخ ہو تو قمیص کے اندر دونوں داخل کرنے کی حالت میں رکوع و سجود نہ کرے اور سجدہ کی حالت میں قمیص میں ہاتھ ڈالنا مکروہ ہے۔

سدل کے مفہوم میں فقہا کا ایک تیسرا قول بھی ہے کہ:

"دھوتی کا آدھ حصہ سر پر ڈال لے اور انہیں کاندھوں پر ڈالے بغیر دائیں بائیں لٹکتا ہوا چھوڑ دے" یہ متاخرین کا قول ہے مگر میرے نزدیک یہ لاشی ہے اور پہلے دونوں قول بہتر ہیں اور وہی فقہا کا مسلک ہیں۔

نماز کی حالت میں کف کی بھی ممانعت ہے۔ کف سے مراد یہ ہے کہ جب سجدہ کرے تو سامنے سے یا پیچھے سے کپڑا اٹھائے اور قمیص کے اوپر دھوتی باندھنا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی کف میں داخل ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی کراہت منقول ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بعض سے اس کی رخصت بھی مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص کے اوپر عمامہ کا کمربند لگائے رکھنے کی حالت میں نماز پڑھی۔ گاہے سر کے بالوں میں کف ہوتا ہے۔ چنانچہ بالوں میں جوڑا لگا کر نماز نہ پڑھے۔

سات اعضاء پر سجدہ کرو

حدیث میں ہے:

"مجھے حکم دیا گیا کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں اور بال نہ باندھوں اور نہ کپڑا اٹھاؤں (یعنی لباس و بال میں کف نہ کروں)"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی حالت میں اختصار اور صلب سے منع فرمایا۔ اختصار کا مطلب ہے ایک کولھے پر ہاتھ رکھنا اور صلب کا مطلب ہے دونوں کولھوں پر دونوں ہاتھ رکھنا اور حالتِ قیام میں دونوں کلائیوں کے درمیان فاصلہ کر لینا اور سجدہ کرتے وقت یہ چاہیے کہ ہاتھوں سے پہلے گھٹنے زمین پر نہ لگیں اور چہرے سے پہلے دونوں ہاتھ زمین پر لگیں۔ پیشانی اور ناک پر سجدہ کرے۔ اس لیے کہ یہ دونوں ایک ہی عضو ہیں اور پاؤں کے پنجوں پر اٹھے اور اگر کمزور آدمی ہو تو ہاتھوں سے زمین ڈھاسنا لگا لے اور اٹھ جائے حالتِ نماز میں دائیں بائیں نہ دیکھے اور نہ ہی دائیں بائیں توجہ کرے اور نہ ہی کنکھیوں سے دیکھے۔ اگر اس نے کن انکھیوں سے دیکھا تو یہ رخصت کی بات ہے اور سجدے کی جگہ پر نظر رکھے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو قبلہ کی طرف ہی رُخ رکھے اور حالتِ نماز میں بدن کے کسی حصہ سے نہ کھیلے۔

بعض ناپسندیدہ امور

منقول ہے کہ حضرت سعید بن مسیبؓ نے دیکھا کہ ایک آدمی حالتِ نماز میں ڈاڑھی

میں مصروف ہے۔ فرمایا:

اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا۔" اور ایک سند کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسی روایت آتی ہے۔

حالتِ نماز میں مواصلت سے بھی منع کیا گیا اور یہ پانچ میں ہوتی ہے۔ دو امام پر۔ یعنی

۱۔ امام تکبیر کہہ کر متصل بعد قرات شروع نہ کر دے۔

۲۔ قرأت کے ساتھ ہی متصل کر کے رکوع میں چلا جائے۔ اور دو مقتدی پر ہوتی ہیں:

۱۔ امام کی تکبیر کے ساتھ اپنی تکبیر بھی نہ ملا دے۔ یعنی دونوں ایک ساتھ تکبیر کہہ رہے ہوں ایسا نہ کرے اور

۲۔ نہ ہی امام کے سلام کے ساتھ ساتھ سلام کہنا شروع کر دے۔ اور ایک مواصلت امام و مقتدی دونوں میں ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرض کے سلام کو نفل کے سلام کے ساتھ ملا کر نہ کہے بلکہ دونوں میں فرق رکھے۔

ایک فرمان ہے کہ سلام بھی جزم (کھینچنا) ہے اور تکبیرِ تحریمہ بھی جزم ہے اور روایت میں ہے:

"حالتِ نماز میں سات باتیں شیطان سے ہیں:

۱۔ نکسیر

۲۔ اُونگھنا

۳۔ وسوسہ

۴۔ جمائی لینا

۵۔ کھجلی

۶۔ اِدھر اُدھر توجہ کرنا

۷۔ کسی چیز کے ساتھ کھیلنا۔"

اور بعض نے یہ زیادہ فرمایا کہ "بھول جانا اور شک کرنا۔"

بعض سلف کا فرمان ہے کہ

"نماز میں چار باتیں زیادتی اور جفا ہیں:

۱۔ اِدھر اُدھر توجہ کرنا۔

۲۔ چہرہ ملنا۔

۳۔ کنکر ہٹا کر جگہ صاف کرنا۔

۴۔ ایسی راہ و جگہ پر نماز پڑھنا کہ لوگ سامنے سے گزرتے ہوں۔"

بعض نے اس میں اضافہ کر کے فرمایا:

"اور دُوسری صف میں نماز نہ پڑھے جبکہ پہلی صف میں جگہ خالی ہو۔"

حاقن، حاقب اور حازق کو اس حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ حاقن سے مراد جس کو پیشاب کی حاجت ہو۔ حاقب سے مراد جس کو پاخانہ کرنے کی حاجت ہو اور حازق سے مراد وُہ ہے کہ جس کا جُوتا تنگ ہو وہ اس جُوتے میں نماز نہ پڑھے۔ ان تینوں حالتوں میں اس لیے نماز کی ممانعت ہے کہ اس کا قلب انہی امور میں مشغول ہے اور خدا کی طرف انابت نہ ہو سکے گی۔

غصہ کی حالت میں نماز مکروہ ہے اور جو کسی معاملہ میں مصروف ہو اور دل ابھی ادھر مشغول ہو اس کو بھی نماز مکروہ ہے اور کسی کو کوئی شدید جائز حاجت ہو تو جب تک ان سے دل فارغ نہ ہو جائے اور نماز کیلئے سکونِ قلب حاصل نہ ہو جائے تو نماز مکروہ ہے۔ (البتہ ان بہانوں سے نمازیں ٹالتا نہ رہے جیسے کہ آجکل کے بہانے بنانے والے نمازوں سے غفلت برتتے ہیں)

جس کے سامنے کھانا آیا اور اس کا قلب بھوک کی شدت کی وجہ سے کھانے کی طرف مائل ہے تو وُہ پہلے کھانا کھالے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"جب رات کا کھانا سامنے آجائے اور (ادھر) نماز بھی کھڑی ہو جائے تو رات کا کھانا شروع کر دو۔" ہاں اگر وقت تنگ ہو یا دل پُرسکون ہو تو پہلے نماز پڑھ لے۔

ایک روایت میں ہے:

"غضب کی حالت میں تم میں سے کوئی نماز شروع نہ کرے اور جب وُہ غصّہ کی حالت میں ہو تو تم سے کوئی تمہیں نماز نہ پڑھائے (یعنی حالتِ غضب میں امامت نماز نہ کرے)

حضرت حسنؒ فرمایا کرتے تھے:

"جس نماز میں دل حاضر نہ ہو وہ سزا کی طرف زیادہ تیزی سے لے جانے کا باعث ہے۔"

نماز کے فضائل و آداب

اہلِ خشوع کی نماز

نماز میں خشوع رکھے

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ [1] (اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو)

---

[1] طٰہٰ آیت ۱۴

اور فرمایا:

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ ۔ (اور غافلوں میں سے نہ ہو)

فرمایا:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ [1] (نزدیک نہ ہو نماز کے جب تک کہ تم کو نشہ ہو، حتیٰ کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو)

ایک قول یہ ہے کہ "محبتِ دنیا کی بدمستی چھائی ہو"۔

اور ایک قول یہ ہے کہ "دنیا کی مصروفیت میں غرق و بدمست ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ [2] (جو اپنی نماز پر دوام کرتے ہیں)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو دو رکعت پڑھے اور ان دونوں میں دنیا کی کسی چیز کا اپنے جی میں خیال نہ لائے تو اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے گئے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نماز تو مسکینیت، تواضع، رازی، دکھ ظاہر کرنا اور نادم ہونا ہے اور یہ صورت ہے کہ تیرے ہاتھ اٹھے ہوں اور کہہ رہے ہو: "اے اللہ (رحم فرما وغیرہ) اگر ایسا نہ کرے تو یہ خداج ہے"۔ یعنی یہ نماز ناقص ہے۔

پہلی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کا فرمان آتا ہے:

"میں ہر نمازی کی نماز قبول نہیں کرتا بلکہ میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری عظمت کی خاطر تواضع کرے اور مجھ پر تکبر نہ کرے اور میری خاطر بھوکے کو کھانا کھلائے"۔

نماز اس طرح سے پڑھے کہ اپنے اعمال کی وجہ سے اسے یہ بھی ہوش نہ ہو کہ دائیں بائیں کیا چیز ہے۔ بس اللہ کی طرف کامل توجہ ہو۔ اس فرمان کی یہی توضیح فرمائی گئی ہے

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ [3] (جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں)

---

[1] النساء آیت ۴۳ [2] المعارج آیت ۲۳
[3]

حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں:

"چالیس برس سے میں ایسے ہوں کہ نماز کی حالت میں مجھے یہ خبر نہیں ہوتی کہ میرے دائیں بائیں کون ہے جب سے میں نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمان سُنا کہ نماز میں خشوع سے ایک یہ ہے کہ نمازی کو یہ خبر نہ ہو سکے کہ اس کے دائیں بائیں کون ہے۔"

بشر بن حارثؒ سے مروی ہے: بتاتے ہیں کہ حضرت سفیانؒ نے فرمایا:

"جس نے خشوع نہ پایا اس کی نماز فاسد ہو گئی۔"

حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے:

"جو آدمی حالتِ نماز میں قصداً دائیں بائیں والے کو معلوم کرے اس کی کچھ نماز نہیں۔"

اسمٰعیل بن ابی زیاد نے بشر بن حارث وغیرہ سے بھی یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔

حضرت ثوریؒ سے یہ مروی ہے:

"جس نے حالتِ نماز دیوار پر لکھے ہوئے الفاظ یا جائے نماز پر لکھے ہوئے الفاظ پڑھ لیے اس کی نماز باطل ہے۔"

حضرت بشرؒ نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کے اندر ایسا کرنا ایک باقاعدہ کام ہے اور حالتِ نماز میں دائمی سکون چاہیے۔

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ۔ (جو اپنی نماز پر دوام کرنے والے ہیں)

کی توضیح اس طرح کی گئی ہے یعنی نماز میں سکون و طمانیت رہے۔ اور مَآءٌ دَآئِمٌ (یعنی پانی ساکن ہے)

بعض صحابہؓ کا فرمان ہے:

"قیامت کے دن لوگ اپنی اپنی نمازوں کے احوال و ہیئات پر اٹھیں گے کہ جس قدر نماز میں سکون و طمانیت رکھی، نماز میں لذت و مزہ پایا۔ اس قدر ان کی حالتِ حسن قیامت کو ہوگی۔ پھر الفاظ سمجھنے پر دل کا دھیان رکھے۔ تواضع و خشوع رکھے۔ مرعوب ہو کر اعضاء کو پرسکون رکھے۔ کلام اللہ ترتیل سے پڑھے اور معانی پر دھیان دے متکلم کی طرف خوب توجہ رکھے۔ مطلوب پر توقف و رغبت رکھے۔ کتاب اللہ میں رازِ مخفی پر آگاہی کی دعا کرے۔ رحمت و اجر کی آیت پڑھے تو اللہ سے رحمت مانگے اور عذاب کی آیت پڑھے تو ڈرے اور عذاب سے پناہ مانگے۔ اللہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید کی آیت پڑھے تو حمد و ثناء اور تسبیح و تقدیس بیان کرے۔ اگر زبان سے ایسا کرے تو خوب ہے اور اگر دل میں ایسا کرے اور خوب دھیان دے تو یہ زبان کے قائم ہو گئی اور اس کا نفقہ و احتیاج دکھانا بھی سوال ہے یہ اس فرمان کی ایک توجیہ ہے:

يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ[1] (تلاوت کرتے ہیں جو اس کی تلاوت کا حق، وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تلاوتِ قرآن مجید کا یہی حال تھا۔

تکبیر تحریمہ اور انابت

بہتر یہ ہے کہ ارکانِ اسلام ادا کرتے وقت ہر رکن کے وصف میں اس کا دل غرق ہو الفاظِ مناجات کے مفاہیم سے خوب طرح وابستہ ہو۔ جب اللہ اکبر کہے تو یہ سمجھے کہ اللہ ہر ما سوا سے بڑا ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہر چھوٹے سے بڑا ہے بلکہ ہر کبیر سے بھی اکبر ہے۔ کہا کرتے ہیں:

هٰذَا كَبِيْر (یہ بڑا ہے)۔ هٰذَا اَكْبَر (یہ سب سے بڑا ہے)۔

اگر اس کا سارا فکر شاہِ اکبر ہی ہو تو اللہ کا ذکر اس کے قلب میں اس انداز پر ہو گا جیسے کہ فرمایا:

وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے)

اور اس کا قلبی مشاہدہ بھی زبان کے مطابق ہو گا اور اللہ کو ہی سب سے بڑا دیکھے گا۔ اب اس کا قول و نظر یکساں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے نظر کو زبان پر مقدم فرمایا۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ[2] (بھلا ہم نے نہیں دیں اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ)

اب ایسا نہ کرے کہ زبان آگے بڑھ جائے اور نظر پیچھے رہ جائے اور اس کی نیت قول کے مطابق اور پختہ ہو اور وہ حال میں جو کہہ رہا ہے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں اسے متنبہ کیا اور اس پر تہمت قائم کی اور ایسا نہ ہو کہ گویا وہ دوسرے کے قول اللہ اکبر کا حکایت کنندہ کا اندازہ لئے رکھے بلکہ وہ خود اس مفہوم پر پختہ ہو۔ اس کے قلب پر یہ مفہوم مشاہدہ بن جائے۔ اہلِ معرفت کے نزدیک یہ واجب ہے کیونکہ ہر چیز میں ایمان کا مطلب "قول و عمل" دونوں ہوتا ہے۔

جب تو نے اللہ اکبر کہا اور تیرے قلب میں ہر چیز سے بڑا صرف اللہ ہی ہے تو قول پر عمل پیرا ہوا اور وعدہ کی حفاظت کی اور اس مدح میں داخل ہوا کہ،

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[3] (اور جو اپنی امانتوں سے اور اپنے اقرار سے خبردار ہیں)

---

[1] البقرہ آیت ۱۲۱

[2] البلد آیت ۸، ۹

[3] المومنون آیت ۸

اور عہد وہ ہے جو تو نے زبان سے کہا اور حفاظت عہد یہ ہے کہ قلب کے ساتھ وفا رکھے تاکہ اجرِ عظیم کا مستحق ہو۔
فرمایا،

وَ مَنْ اَوْفٰی بِمَا عَاهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔

اور جس کے دل میں دنیا کا فانی چھوٹا سا بادشاہ ملک اکبر سے بھی بڑا ہو اس نے اللہ اکبر کے خدائی فرمان پر عمل نہیں کیا اور نہ ہی یہ حقیقی ایمان ہے۔ اس لیے کہ قول و عمل دونوں کے اعتبار سے ایمان نہ لایا بلکہ صرف قول ہے۔ یہ آدمی مشاہدۂ آخرت سے غافل اور نفس کو نفاسے ہے۔ حالانکہ اس کے لیے آخرت ہی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ فرمایا،

مَا عِنْدَكُمْ یَنْفَدُ۔ (جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا)

یعنی دنیا فنا ہو جائے گی۔

وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔ (اور جو اللہ پاس ہے وُہ باقی رہنے والا ہے)

یعنی آخرت باقی رہنے والی ہے۔

آپ نے فرمایا،

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک نمازیں بنائی گئیں" اس لیے کہ یہ پروردگار کی حاضری ہے۔ اس لیے آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے)

اب مذکور یعنی جس کا ذکر ہوا وُہ سب سے بڑا اور اکبر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز کو یہ بتایا کہ اس سے مقصود میرا ذکر ہے۔ فرمایا،

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ۔ (اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی رکھ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس مفہوم میں روایت آئی ہے کہ

"ذکر اللہ قائم کرنے کے لیے نماز فرض کی گئی اور حج و طواف کا حکم دیا گیا اور مناسک حج سمجھائے گئے"۔
اب جب تیرے دل میں مذکور تعالیٰ ہی مقصود نہ ہو اس کی عظمت و ہیبت مطلوب نہ ہو۔ پھر تیرے ذکر کی کیا قیمت ہے؟

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس بن مالک رضؓ کو فرمایا،

"جب تو ایک نماز پڑھے تو اپنے آپ کو وداع کرنے والے کی طرح نماز پڑھ جو اپنی خواہش کو وداع کر رہا ہو، اپنی عمر کو وداع کر رہا ہو اور اپنے مولائے کریم کی جانب جا رہا ہو"۔ جیسے کہ فرمان ہے،

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا۔[1] (اے انسان! تجھ کو پہنچنا ہے اپنے رب تک پہنچتے ہیں نچ نچ کر)

اور فرمایا،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔[2] (اور اللہ سے ڈرو اور جانو کہ تم اس سے ملنے والے ہو)

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں کر دی گئی"

چنانچہ اکبر تعالیٰ کا دیدار کرتے اور آنکھیں ٹھنڈی کرتے۔ فرمایا،

"جس کو اس کی نماز بے حیائی اور بُرے کام سے نہیں روکتی۔ اس کے لیے اللہ کے ہاں سے دُوری (بُعد) کے سوا کچھ نہ بڑھا" جیسے کہ فرمایا:

"جس نے جھوٹ کہنا اور خیانت نہ چھوڑی تو اللہ کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے"

اس لیے کہ نماز و روزے سے مقصود یہ ہے کہ گناہوں سے الگ ہو جائے۔

نماز کے قائم کرنے اور اسے مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وقت سے پہلے وضو کرے تاکہ اول وقت سے غافل ہو کر نہ رہ جائے اور نماز میں تاخیر نہ ہونے پائے۔

اللہ کی طرف دھیان رکھے

انسان کو چاہیے کہ اس کا قلب، اس کے فکر میں لگا رہے اور اس کا فکر اس کے رب کے ساتھ ہو اور اس کا رب اس کے قلب میں ہو (یعنی ذکرِ رب قلب میں ہو)، چنانچہ اس کے کلام کی طرف نظر رکھے اور اس کے خطاب سے ہم کلام ہو۔ مناجات میں خوب زاری دکھائے۔ اس کی صفات کی معرفت حاصل ہو۔ اس لیے کہ ہر کلمہ کسی اسم یا وصف یا خلق یا حکیم یا ارادہ یا فعل کا مفہوم رکھتا ہے نیز کلمات ہی اوصاف کے مفاہیم بتاتے اور موصوف پر دلالت کرتے ہیں اور ایک عارف کو خطاب کا ہر کلمہ دس جہات سے متوجہ کرتا ہے اور ہر جہت کا ایک مقام ہے۔

ابتدائے جہات کے مشاہدات یہ ہیں۔ ان پر ایمان لائے۔ انہیں تسلیم کرے۔ توبہ کرے۔ ان پر صبر کرے۔ ان پر راضی رہے۔ ان سے ڈرے۔ ان کے باعث رجاء ہو۔ ان پر شکر کرے۔ ان کی محبت ہو اور ان میں توکل کرے۔

---

[1] الانشقاق ۶
[2] البقرہ ۲۲۳

یہ دس مقامات ہی مقامات یقین ہیں اس لیے کہ کلمہ ہی حق الیقین ہے اور یہ تمام معانی ہر کلمہ میں بند ہیں۔
اہل مناجات ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اہل علم انہیں سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ محبوب تعالیٰ کا کلام، دلوں کی زندگی ہے اور اس کے ذریعہ صرف زندہ کو ڈراتا ہے اور قبول کرنے والا ہی زندہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،
اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ [۱] (اے ایمان والو! ما نو حکم اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلائیں تم کو ایک کام پر جس میں تمہاری زندگی ہے)
اور سورۃ احزاب میں جن دس مقامات کا ذکر ہوا جو آدمی ان میں سے گزرا صرف وہی ان دس مقامات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ان میں سے پہلا مقام مسلمین ہے اور آخری مقام ذاکرین ہے۔
مقام ذکر کے بعد یہ دس خطابات ہوتے ہیں۔ ان کے بعد اس پر مناجات ملال نہیں بنتی۔ اس لیے کہ صفائی پا لی گئی۔ اس پر قیام شب گراں نہیں گزرتا اس لیے کہ اسے لذت وافہام حاصل ہے۔ قرب عطف کے باعث اس پر قیام آسان ہوا۔ وہ عتاب پر شیرینئ قرب کی لذت پاتا ہے۔ اب تلاوت میں طول قیام اس کے لیے مختصر ہو گیا جیسے کہ نماز میں قبلہ ایسا غائب ہو جائے کہ وہ اسے نہ دیکھے (بلکہ دیدار الٰہی میں غرق ہو) اس کے پیچھے قبلہ ہو اور وہ اس کے آگے ہو۔ اس طرح قیام اس کے لیے مندرج ہو جاتا ہے اور اس کو حال کی معیت حاصل ہوتی ہے۔

صاحب یقین اور غافل کا فرق

منقول ہے کہ جب ایک صاحب یقین وضو کرے تو شیطان اس سے ڈر کر زمین کے دور دور اطراف میں بھاگ جاتے ہیں اس لیے کہ وہ ملک تعالیٰ کے سامنے حاضری دینے کی تیاری کر رہا ہے۔ جب وہ تکبیر کہتا ہے تو ابلیس بھی اس سے چھپ جاتا ہے۔ ابلیس اور اس صاحب یقین کے درمیان غبار کی آڑ لگا دی جاتی ہے اور اس کو جبار تعالیٰ کی مواجہت کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ جب وہ اللہ اکبر کہتا ہے تو فرشتہ اس کے قلب میں جھانکتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ اس کے قلب میں اللہ کے سوا کوئی بڑا نہیں تو کہتا ہے:
"جیسے تو (زبان سے) کہہ رہا ہے ایسے ہی تو نے قلب میں بھی اللہ کی تصدیق کی۔"
فرماتے ہیں: "پھر اس کے قلب میں ایسا نور جھلکنے لگتا ہے جو ملکوت عرش سے جا ملتا ہے۔ اس نور کی وجہ سے اس کو آسمانی و زمینی ملکوت کا مکاشفہ حاصل ہوتا ہے اور اس نور کے علاوہ زائد طور پر اس کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔"

---

[۱] الانفال آیت ۲۴

فرمایا: "اور جب ایک جاہل غافل آدمی وضو کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیاطین اسے اس طرح ڈراتے ہیں جیسے کہ شہد کے قطرے پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں اور جب وُہ تکبیر کہتا ہے تو فرشتہ اس کے قلب میں جھانکتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے قلب میں اس کے نزدیک ہر چیز اللہ سے بڑی ہے تو فرشتہ اسے کہتا ہے:

"تُو نے جھوٹ بولا، جیسے تیری زبان پر ہے ویسے تیرے دل میں نہیں ہے۔"

بتایا کہ "پھر اس کے دل میں ایک دُھواں نکلتا ہے اور آسمان کے کناروں تک جا پہنچتا ہے اور اس کے دل پر حجاب بن جاتا ہے۔"

بتایا کہ "پھر یہ حجاب اس کی نماز کی طرف لوٹ کر آتا ہے اور شیطان اس کے دل کو نگل جاتا ہے۔ اور اسے مسلسل وسوسے ڈالتا اور اس میں پھونکیں لگاتا رہتا ہے اور اس کے لیے آرائش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نماز سے غافل ہو کر بھول جاتا ہے کہ کیا کر رہا تھا۔"

حدیث میں آیا:

"اگر بنی آدم کے دلوں کے گرد شیاطین نہ گھومتے ہوتے تو وُہ ملکوتِ آسمانی کو دیکھتے۔"

سامنے اور دائیں نہ تھوکو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے قبلہ کی طرف بلغم پڑا دیکھا تو آپؐ سخت غضبناک ہُوئے۔ پھر آپؐ نے کھجور کے گچھے کی جڑ کے ساتھ رگڑ دیا جو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"عنبر لاؤ۔" آخر آپؐ نے اس کا نشان مٹا کر زعفران لگا دیا۔ پھر ہماری طرف توجہ فرما کر کہا:

"تم میں سے کون اسے پسند کرتا ہے کہ اس کے چہرہ پر تھوک دیا جائے؟"

ہم نے کہا:

"ہم میں کوئی یہ (پسند نہیں کرتا)۔"

فرمایا: "تم میں سے جب بھی کوئی آدمی نماز شروع کرتا ہے تو اس کے اور قبلہ کے درمیان اللہ ہوتا ہے۔"

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"اس کو اللہ کی مواجہت حاصل ہے۔ اس لیے تم میں کوئی بھی اپنے سامنے نہ تھوکے اور نہ ہی اپنی دائیں طرف تھوکے، البتہ (ضرورت ہو) تو بائیں طرف یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوک لے اور اگر کوئی ایسی ہی جلدی آن پڑے تو وُہ اپنے کپڑے میں تھوک لے اور اس طرح تھوک دے اور آپؐ نے (تھوک کی) کپڑے کو مل دیا۔"

مروی ہے، "جب ایک بندہ نماز میں کھڑا ہو اور اللہ اکبر کہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو فرماتا ہے کہ میرے

اور میرے بندے کے درمیان پردہ ہٹا دو۔ جب (نماز کے اندر) وہ اِدھر اُدھر توجہ کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"میرے بندے! کس طرف توجہ کر رہا ہے؟ جس طرف تم توجہ کر رہے ہو اس سے میں بہتر ہوں"۔ پھر جب نمازی قیام کرتا ہے تو اس کا دل پچاس ہزار برس طویل روزِ جزا کو رب العلمین کے سامنے کھڑا ہونے کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر دیکھتا ہے کہ وہ ملک جبار تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کو دیکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ غافل نہیں کہ حضوری میں غائب رہے اور جلالِ خداوندی کی شدت محسوس کرتا ہے اور رقیب تعالےٰ کا خوف اس پر رہتا ہے۔ قریب تعالیٰ کی عظمت اس پر حاوی ہوتی ہے۔ جب تلاوت کرے تو اس کا تمام فکر متکلم تعالیٰ کی مرادات پر لگا رہے اور قلب اس کے معانی میں منہمک ہو۔ اگر رکوع کرے تو اس کے دل میں اللہ کی عظمت جاگزیں ہو اور صرف تنہا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اس کے قلب میں کوئی بڑا نہ ہو اور اگر رکوع سے سر اٹھائے تو محمود تعالیٰ کے لیے ہی حمد کا مشاہدہ کرے اور ودود تعالیٰ کا شکر گزار ہو تاکہ اسے مزید انعام ملے اور اس کا قلب رضا پر مطمئن ہو۔ اس لیے کہ یہی حقیقی حمد ہے اور اگر سجدہ کرے تو اس کا قلب رفعت و علوّ میں جائے اور اس فرمان کے ساتھ وہ قربِ الٰہی حاصل کرتا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔

(اور سجدہ کر اور قرب حاصل کر)

سجدہ میں اہل مشاہدہ کے تین مقامات

سجدہ میں اہل مشاہدہ تین مقامات پر ہوتے ہیں:

۱۔ بعض ایسے ہیں کہ جب سجدہ کرتے ہیں تو انہیں ملکوتِ عزت تعالیٰ کا مکاشفہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے قریب تعالیٰ کی طرف رفعت حاصل ہوتی اور قریب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ یہ اہل قرب محبوبین کا مقام ہے۔

۲۔ بعض ایسے ہیں کہ انہیں سجدہ کی حالت میں ملکوت عزت تعالیٰ کا مکاشفہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ قادر اجل تعالیٰ کے اوصاف سے ایک وصف کے نزدیک ثری اسفل پر سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا قلب شکستہ ہوتا ہے اور تواضع و انکساری اختیار کرتا ہے۔ یہ اہلِ خوف عابدین کا مقام ہے۔

۳۔ بعض ایسے ہیں کہ ان کا قلب آسمان و زمین کے ملکوت میں جولانی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خوب اجر حاصل کرتا ہے اور عجائب و غرائب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ اہلِ صدق سالکین کا مقام ہے۔

۴۔ اور ایک [illegible] قسم [illegible] وہ کچھ چیز نہیں اور نہ ہی اس کا قابلِ مدح وصف ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے تمام افکار شاہی [illegible] اور نالوں کے حصوں میں ہی گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے اعلیٰ مشاہدات پر کمین افکار کا پردہ ہے۔ یہ لوگ سیاحت الی اللہ کی بجائے خواہش نفس میں گرفتار ہے۔ اگر یہ نمازی دعا کرتے

تو اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جس کے سامنے دُعا کر رہا ہے اور اس سے اسے امید و رجاء ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ حمد و ثناء اور تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتا ہے۔ دنیاوی حاجت وہ بھول جاتا ہے اور مولائے کریم کی یاد میں منہمک ہو جاتا ہے۔ حُسنِ ثناء میں مصروف ہو کر سوال بھی بھول جاتا ہے۔ اگر یہ دُعا کرنے والا استغفار کرے تو احکامِ تائب میں غور و فکر کرتا ہے اور سابقہ گناہوں پر سوچ بچار کرتا ہے۔ چنانچہ خلوص کے ساتھ توبہ و استغفار کرتا اور نئے سرے سے استقامت کی نیت کرتا ہے۔ اسی توبہ و استغفار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے عزت و فضل ملتا ہے۔ بندے کی ایسی نماز کے بارے میں روایات آتی ہیں کہ:

"جب ایک بندہ نماز شروع کرتا ہے تو اس کے اور اس کے (رب تعالیٰ) کے درمیان پردہ اٹھ جاتا ہے اور اس کو (اللہ تعالیٰ) کی مواجہت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے کاندھوں سے لے کر ہوا تک فرشتے کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے لیے دُعائے رحمت کرتے ہیں۔ اس کی دُعا پر آمین کہتے ہیں اور نمازی کے سر پر آسمان کے کناروں سے نیکی برستی ہے اور ایک ندا کرنے والا ندا کرتا ہے کہ اگر مناجات کرنے والا جانتا کہ کس کے سامنے مناجات کر رہا ہے تو وہ اعراض نہ کرتا اور آسمان کے دروازے نمازیوں کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نمازیوں کی قطاروں کے ذریعہ اپنے فرشتوں پر فخر فرماتا ہے۔" (کہ دیکھو تم اعتراض کرتے تھے اور یہ نمازیوں کی قطاریں ہیں۔)

نماز کے فضائل

تورات میں لکھا ہے:

• اے ابن آدم! تو اس بات سے عاجز نہ آ جا کہ میرے سامنے روتا ہوا نماز پڑھتا ہوا کھڑا ہو۔ میں اللہ تعالیٰ ہوں، جو تیرے دل سے بھی زیادہ (تیرے) قریب ہوں اور غیب سے تو نے میرا نور دیکھا ہے۔

مشائخ بتاتے ہیں:

"اور ہم سمجھتے ہیں کہ نمازی آدمی اپنے قلب میں جو رقت و گریہ اور جو فتوحاتِ غیبیہ پاتا ہے وہ رب تعالیٰ سے اس کے قربِ قلبی کے باعث ہے۔"

ایک آدمی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

"اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ مجھے جنت میں آپ کی رفاقت عطا کرے۔"

آپ نے فرمایا:

"کثرتِ سجود کے ساتھ میری مدد کرو۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر توحید کے بعد نماز سے زیادہ کوئی محبوب ترین چیز فرض نہیں کی۔" اگر نماز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز محبوب ہوتی تو فرشتے اس کے ساتھ اس کی عبادت کرتے۔ فرشتوں میں بعض رکوع میں، بعض سجدہ کی حالت میں، بعض حالتِ قیام میں اور بعض حالتِ قعدہ میں ہیں یا جیسے کہ بعض علماء کا فرمان ہے: "نماز در اصل اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی خدمت (عبادت) ہے۔"

ایک دوسرے عالم کا فرمان ہے:

"نمازی لوگ اللہ کی زمین پر اس کے خدام (عبادت کرنے والے) ہیں۔"

مشائخ فرماتے ہیں کہ:

"آسمانوں میں نماز پڑھنے والے فرشتوں کو خدام الرحمٰن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور وہ فرشتے اس وجہ سے تمام مرسلین فرشتوں پر فخر کرتے ہیں۔"

بتاتے ہیں کہ جب ایک مومن دو رکعت نماز پڑھتا ہے تو فرشتوں کی دس قطاریں اس پر تعجب کرتی ہیں اور ہر قطار میں دس ہزار فرشتے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایک لاکھ فرشتوں پر اس کے ساتھ فخر کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندے میں نماز کے چار ارکان جمع ہیں:

۱۔ قیام

۲۔ قعدہ

۳۔ رکوع

۴۔ سجدہ"

اور یہ چاروں ارکان چالیس ہزار فرشتوں پر منقسم ہیں جو حالتِ قیام میں ہیں۔ وہ قیامت تک رکوع میں نہیں جائیں گے اور سجدہ میں پڑے ہوئے فرشتے قیامت تک سجدہ سے سر نہیں اٹھائیں گے اور اس طرح رکوع و سجدہ والوں کا حال ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے نماز کے دوسرے چھ ارکان بھی اس نمازی بندے میں جمع کر دیے:

۱۔ تلاوت

۲۔ حمد

۳۔ استغفار

۴۔ دعا

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ

۶۔ سلام۔ اور انہیں ساٹھ ہزار فرشتوں پر تقسیم کر دیا۔ اس لیے کہ فرشتوں کی ہر قطار ان چھ اذکار میں سے ایک ذکر میں مصروف ہے۔

جب یہ فرشتے اس بندے کے یہ چھ ارکان دوسرے (چار) اذکار دیکھتے ہیں تو انہیں اس پر تعجب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان پر اس کے ساتھ مباحات و فخر فرماتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے یہ ارکان و اذکار ایک لاکھ فرشتوں پر تقسیم کر رکھے ہیں۔ اس کے باعث ملائکہ پر مومنین کو فضیلت ملی اور اس کے باعث اہل یقین کو تمام مقامات میں گزرنے کے ذریعہ اعمالِ قلبی کے مقاماتِ یقین میں فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے کہ اس بندے میں یہ تمام مقامات جمع ہیں اور ملائکہ میں ایسے نہیں۔ ملائکہ میں نقلِ مقامات نہیں ہوتا بلکہ ہر فرشتہ ایک مقررہ معلوم مقام میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس سے منتقل ہو کر اگلے مقامات مثلاً شکر، خوف و رجاء، شوق و تلق اور خوف و محبت تک نہیں جا سکتا بلکہ ہر فرشتہ کو صرف اس کی قوتوں کے مطابق ہی ایک مقام میں رفعت و مزید حاصل ہے اور ایک صاحبِ یقین بندے کے قلب میں یہ تمام مقامات جمع کر دیے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اولیاء مومنین کی صفات بتاتے ہوئے فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ [۱]

(کامیاب ہوئے ایمان والے، جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو لغو سے اعراض کرنے والے ہیں)

چنانچہ جیسے ان کے ایمان کا ذکر کیا۔ ایسے ہی نماز کے باعث ان کی تعریف فرمائی۔ پھر ان کی نماز میں خشوع کا ذکر کیا اور اس پر تعریف کی جیسے کہ ان کا پہلا وصف نماز کا ہی بتایا اور پھر آخر میں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ [۲] (اور جو اپنی نماز سے خبردار ہیں)

چنانچہ نماز کے ذکر کے ساتھ ہی ان کی صفات کا ذکر ختم کیا۔

مصائب میں جزع و فزع والوں اور مال خرچ کرنے اور بھلائی کے کاموں میں بخل کرنے میں سے جن نمازی بندوں کو مستثنیٰ کیا ان کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ [۳] (مگر وہ نمازی جو اپنی نماز پر قائم ہیں)

---

[۱] المومنون ۱، ۲، ۳ [۲] المعارج ۳۴

[۳] المعارج ۲۲۔

پھر ان کے اوصاف بیان کیے اور آخر میں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[1]

(اور جو اپنی نمازوں سے خبردار ہیں)

اب اگر نماز اس کے نزدیک محبوب ترین عمل نہ ہوتا تو اپنے اولیاء کی صفات میں اسے ہی آغاز و انجام نہ بناتا۔ اولیاء کرام کا وصف یہ بتایا کہ وہ نماز پر دوام و محافظت کرتے ہیں اور خشوع پر ان کی تعریف فرمائی۔ خشوع سے مراد یہ ہے کہ وہ شکستہ دل ہوتے اور تواضع و انکساری اختیار کرتے ہیں، نرم ہوتے ہیں۔ اعضاء کو برائی سے بچاتے ہیں۔ خلق اخلاق اور نیک سیرت ہوتے ہیں۔ نماز پر مواظبت و دوام رکھتے ہیں۔ نماز میں ان کے اعضاء و قلب پرسکون ہوتے ہیں اور محافظت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دل حاضر ہوتا ہے۔ ان کا فہم صاف ہوتا ہے۔ اوقاتِ نماز کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ذرائع کی طہارت کا دھیان رکھتے ہیں۔ پھر نمازیوں کا انجام بیان کیا اور فرمایا:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ[2]

(وہی ہیں میراث لینے والے، جو میراث پائیں گے باغ ٹھنڈی چھاؤں کے، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں)

چنانچہ ان کی پہلی عطا فلاح بتائی یعنی کامرانی و بقاء اور آخری فردوس بتائی جو کہ بہتر پناہ گاہ اور جائے رہائش ہے۔

اور ان کے برعکس دوزخیوں کے بارے میں فرمایا:

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ[3]

(تم کاہے سے پڑے دوزخ میں، وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے)

اور انہی میں سے ایک گروہ کو زجر کی اور فرمایا:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى۔

(پھر نہ یقین دلایا اور نہ نماز پڑھی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے منع کرنے والے کی اطاعت کرنے سے منع کیا گیا۔ پھر آپ کو نماز کا حکم دیا گیا اور بتایا گیا کہ نماز میں ہی خدا تعالیٰ کا قرب ہے۔ فرمایا:

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى[4]

(کیا تُو نے دیکھا وہ جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب نماز کرے)

---

[1] المومنون آیت ۹
[2] المومنون آیت ۹، ۱۰، ۱۱
[3] المدثر آیت ۴۲
[4] العلق آیت ۱۰

پھر فرمایا :

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ [۵۱] (کوئی نہیں، نہ مان اس کا کہا، اور سجدہ کر اور نزدیک ہو)

چنانچہ اس کی مخلوق میں بقاء حاصل کرنے والے اور جنت کے وارث بندے اس کے دارِ غضب سے نجات پانے اور دُور ہونے والے، نماز پڑھنے والے بندے ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے لطف و رحمت سے نجات پانے والے نمازیوں میں کر دے۔ آمین۔

نماز پر پابندی کرنے کی ترغیب

اہلِ یقین نمازیوں کا طریق

نماز کی اہمیت اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا :

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا [۵۲]

(محمد اللہ کا رسول ہے اور جو اس کے ساتھ زور آور ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں، تو دیکھے انہیں رکوع میں اور سجدے میں)

چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند کیا اور صحابہؓ کے لیے نماز کو پسند کیا اور تورات و انجیل میں ان کا یہ وصف بیان فرمایا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمام اعمال سے افضل نماز ہے۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے اعمال سب سے افضل ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا :

"کون سا عمل افضل ترین ہے؟"

فرمایا :

"نماز اپنے وقت کے اندر پڑھنا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

"جب تو ایک آدمی نماز کی حفاظت کرنے والا دیکھے تو اس پر اچھا گمان رکھ اور جب تو اسے نماز ضائع

---

[۵۱] العلق ۱۹

[۵۲] الفتح ۲۹

کرنے والا دیکھے تو وہ (نماز) کے علاوہ (احکام اسلام) کا زیادہ کرنے والا ہے۔"

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے تھے؛

"اے ابنِ آدم! تجھ پر تیرے دین سے کیا گراں ہو سکتی ہے، جب تجھ پر نماز آسان ہو گئی تو یہ اللہ تعالیٰ پر آسان تر ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے؛

"نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔"

اور ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

"کفر اور ایمان (کے درمیان نماز چھوڑنے "(کا فرق ہے)۔

ایک حدیث میں ہے؛

"جس نے پانچوں نمازوں پر ان میں طہارت کامل کر کے ان کے اوقات کی رعایت کر کے حفاظت کی۔ اس کے لیے قیامت کے دن ایک نور اور دلیل ہو گی اور جس نے اس (نماز) کو ضائع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو فرعون و ہامان کے ساتھ اٹھائے گا۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے؛

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا [۱] (نہیں اختیار رکھتے ہیں وہ سفارش کا مگر جس نے لے لیا رحمٰن سے اقرار)

اس کی تفسیر میں فرمایا:

"پانچ نمازیں پڑھے۔ یہ عہد ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ اور سلمانؓ سے مروی ہے؛

"نماز پیمانہ ہے، جس نے پورا کیا اس کے لیے پورا بھرا گیا اور جس نے کم تولا تو تم جانتے ہی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کم تولنے والوں کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔"

حدیث میں ہے؛

"سب لوگوں سے بُرا چور ہے جو کہ نماز کی چوری کرتا ہے۔ اس کا رکوع پورا نہیں کرتا اور نہ اس کا سجدہ پورا کرتا ہے۔"

---

[۱] مریم ۸۷۔

حدیث میں ہے:

"جب ایک آدمی لوگوں میں نماز پڑھے تو خوب کر کے پڑھے اور خلوت میں بُری طرح نماز ادا کرے۔"

ایک روایت میں ہے:

"جب ایک آدمی برملا اچھی کر کے نماز پڑھے اور خلوت میں بہت ہی اچھی کر کے پڑھے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے: یہ میرا حقیقی بندہ ہے۔"

حضرت کعبؓ وغیرہ سے منقول ہے:

"جس کی نماز قبول ہوئی اس کے تمام اعمال قبول ہوئے اور جس پہ اس کی نماز رد کر دی گئی۔ اس پر اس کے تمام اعمال رد کر دیے گئے۔"

مشائخ فرماتے ہیں:

"جس کی پانچوں نمازیں بغیر کسی تلفیق اور جوڑ لگائے قبول ہوئیں .... تو اسے علم ابدال پر اطلاع حاصل ہوتی ہے اسے صدیق لکھا جاتا ہے اور نمازیں قبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ نماز اسے فحشاء و منکر سے بچاتی ہے۔ فحشاء سے مراد کبائر گناہ ہیں اور منکر سے مراد وہ امور ہیں کہ جن پر علماء نے انکار فرمایا۔ جس نے ایسی نماز پڑھی اس کی نماز سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اٹھائی جاتی ہے اور جس کو خواہشات نے جلا رکھا ہے اس کی نماز اس کی سرکشی کی وجہ سے اس پر لوٹا دی جاتی ہے۔ اور وہ (خواہشات میں) ڈوب مرتا ہے۔"

حضرت مالک بن دینارؒ اور ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا:

"جب میں کسی ایسے آدمی کو دیکھتا ہوں جو نماز کو خراب کر کے پڑھتا ہے تو مجھے اس کے اہل و عیال پر رحم آتا ہے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا:

"فرائض در اصل راس المال (اصل زر) ہیں اور نوافل نفع ہیں اور اصل زر صحیح ہو، تب ہی نفع صحیح ہوتا ہے۔"

حضرت ابن عیینہؒ نے فرمایا:

"اصول (فرائض) کو برباد کر کے وصول حرام کر دیا گیا۔"

حضرت علی بن حسینؓ نے فرمایا:

"جس نے پانچوں نمازوں کا ان کے اوقات میں اور کامل طہارت کے ساتھ اہتمام رکھا اس کے لیے دنیا میں کچھ زندگی (کا مزہ) نہیں۔" (یعنی وہ آخرت کا مشاہدہ کر کے آخرت ہی چاہے گا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ جب آپؐ نماز کے لیے وضو کرتے تو آپؐ کے چہرہ انور کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ چہرہ پر زردی چھا جاتی اور آپؐ کانپنے لگتے۔ آپؐ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"تم سمجھتے ہو کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں؛ اور کس کے سامنے حاضری دینے لگا ہوں اور کس سے مخاطبت کرنے لگا ہوں؛"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"نماز میں چار فرائض ہیں (یہ باطنی فرائض ہیں):

۱۔ اجلالِ مقام

۲۔ اخلاص

۳۔ یقینِ تعالیٰ

۴۔ تسلیمِ امر کرنا۔"

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا:

"اللہ کے بہترین بندے وُہ ہیں جو ذکر اللہ کی خاطر سورج، چاند اور سایوں کا دھیان رکھتے ہیں۔"

حضرت وکیعؒ فرمایا کرتے:

"جو آدمی نماز کے وقت سے پہلے اس کی تیاری نہ کرے اس نے اس کی حفاظت نہ کی اور جس نے تکبیر تحریمہ سے سستی کی تو اپنا ہاتھ اس سے دھولے۔"

فرمانِ الٰہی ہے:

سَابِقُوٓا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ [1] (دوڑو اپنے رب کی طرف سے مغفرت کی طرف)

اس کی تفسیر میں فرمایا کہ تکبیر تحریمہ کی طرف تیزی کرو۔

حضرت ابوکاہلؓ کی حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"جو آدمی چالیس روز باجماعت نماز ادا کرے اس کی تکبیر تحریمہ بھی فوت نہ ہو تو اس کے لیے دو براتیں لکھی جاتی ہیں:

۱۔ نفاق سے برأت۔

۲۔ آگ سے برأت۔"

---

[1] الحدید آیت ۲۱۔

حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں؛

"چالیس برس سے میری جماعت میں تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوئی"۔ انہیں حمامۃ المسجد (مسجد کی کبوتری) کہا کرتے تھے۔

وقت سے پہلے نماز کا اہتمام کرو

عبدالرزاقؒ نے فرمایا؛

"بیس سال سے میں نے مسجد ہی میں اذان سنی"۔

اور بتاتے ہیں کہ قیامت کے روز نمازی لوگ گروہ در گروہ جنت کی طرف جائیں گے تو پہلی جماعت کے چہرے موتی کے سے ستارے کی طرح (چمکدار) ہوں گے۔ ملائکہ ان کا استقبال کریں گے اور پوچھیں گے؛

"تم کون ہو؟"

وہ کہیں گے؛

"ہم امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے نمازی ہیں"۔

وہ پوچھیں گے؛

"دنیا میں تمہارے کیا اعمال تھے؟"

وہ کہیں گے؛

"جب ہم اذان سنتے تو طہارت (وضو وغیرہ) کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے اور ہمیں کوئی دوسری چیز اس سے غافل نہ کرتی"۔

فرشتے کہیں گے؛

"تم اسی کے مستحق ہو"۔

پھر ایک دوسرا گروہ آئے گا۔ ان کا حسن و جمال ان سے بڑھ کر ہو گا گویا ان کے چہرے چاند کی طرح ہوں گے۔

فرشتے کہیں گے: "تم کون ہو؟"

وہ کہیں گے: "ہم نمازی ہیں"۔

وہ پوچھیں گے: "تمہاری نماز کیا (کیفیت) تھی؟"

وہ جواب دیں گے: "ہم نماز کا وقت آنے سے پہلے وضو کر لیا کرتے"۔

فرشتے کہیں گے: "تم اسی کے مستحق ہو"۔

پھر تیسرا گروہ آئے گا جو حسن و جمال اور مرتبہ میں ان سے بھی بڑھ کر ہو گا۔ گویا ان کے چہرے تیز روشن

سورج ہیں۔

فرشتے پوچھیں گے:

"تم خوب تر چہرے والے اور اعلیٰ ترین مقام والے ہو، تم کون ہو؟"

وہ کہیں گے:

"ہم نمازی ہیں۔"

وہ پوچھیں گے،

"تمہاری نمازوں کی کیا کیفیت تھی؟"

وہ کہیں گے،

"ہم مسجد میں ہی اذان سنتے تھے۔"

فرشتے کہیں گے:

"تم اس کے مستحق ہو۔"

بعض علماء رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے،

"صلاۃ کو صلاۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بندے اور اللہ عزوجل کے درمیان صلہ اور اللہ کی طرف سے بندے کے لیے مواصلت ہے اور مواصلت و عطا صرف متقی کو ہی ملتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ [1]

(اللہ کو نہیں پہنچتے ان کے گوشت اور نہ لہو، اور لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارا تقویٰ)

اور متقی وہ ہے جس میں خشوع ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اس پر طولِ قیام بوجھ نہ بنے گا اور نہ ہی برائی سے رکنا اور نیکی پر چلنا اس کے لیے گراں ہو گا جیسے کہ فرمایا،

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ [2]

(بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)

نماز میں خشوع کی اہمیت

اہلِ خشوع مومن ہی نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ یہی حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ ان کی جزاء خوشخبری ہے

---

[1] الحج آیت ۳۷

[2] العنکبوت آیت ۴۵

جیسے کہ فرمایا ؛

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (اور مومنوں کو خوشخبری دو)

اہلِ خشوع ہی خائف و ذاکر و صابر اور نماز قائم کرنے والے ہیں۔ اور جب ان میں یہ اوصاف کامل طور پر پائے جائیں گے تو یہ مخبتین (انابت کرنے والے) ہوں گے۔ فرمایا؛

وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ [۱] (اور خوشی سنا عاجزی کرنے والوں کو)

حضرت ابنِ مسعود جب ربیع بن خیثم کی طرف دیکھتے تو کہا کرتے ؛

وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۔ (اور خوشی سنا عاجزی کرنے والوں کو)

اور اللہ کی قسم! اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دیکھتے تو خوش ہوتے۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: "تجھ سے محبت کرتے۔"

بتاتے ہیں کہ بیس برس تک حضرت ابن مسعودؓ کے گھر میں ان کا آنا جانا رہا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی لونڈی یہی سمجھتی رہی کہ وہ نابینا ہیں۔ اس لیے کہ وہ (ربیع بن خیثمؒ) زمین پر نظریں گاڑے گزرتے اور بعض بعد کا خاص خیال رکھتے اور جب وہ دروازہ کھٹکھٹاتے تو لونڈی باہر آکر معلوم کرتی اور انہیں دیکھ کر حضرت عبداللہ کو کہتی؛

"آپ کا نابینا دوست آیا ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ ہنس کر فرماتے ؛

"تیرا ناس، یہ تو ربیعؒ ہیں۔"

ایک روز وہ حضرت ابن مسعودؓ کے ہمراہ لوہاروں (کی بھٹی) کے پاس سے گزرے۔ جب بھٹیوں پر نظر پڑی اور آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے تو انہیں غش آگیا اور بے ہوش ہو کر گر گئے۔ نماز کے وقت تک حضرت ابن مسعودؓ ان کے سرہانے بیٹھے رہے مگر انہیں افاقہ نہ ہوا۔ آخر حضرت ابن مسعودؓ انہیں اپنی پیٹھ پر ڈال کر گھر لائے۔ ان پر دیر تک غشی رہی۔ آخر کار پانچ نمازیں اسی حالت میں گزر گئیں۔ حضرت ابن مسعودؓ ان کے سرہانے بیٹھے رہے۔ اور فرماتے ؛

"اللہ کی قسم، یہ خوف ہے۔"

(حضرت ربیعؒ فرمایا کرتے :

"میں جب بھی نماز میں داخل ہوتا ہوں تو میرا فکر صرف وہ کلمات ہوتے ہیں جو میں کہتا ہوں اور یا جو مجھے

---

[۱] الحج آیت ۳۴

کہا جاتا ہے۔

حضرت عامر بن عبد اللہ بھی اہل خشوع نمازیوں میں سے تھے۔ جب وہ نماز پڑھنے اس وقت اگر ان کی بیٹی کھٹکا کرتی یا عورتیں گھر امور پر باتیں کرتیں تو یہ ان میں کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ سنتے۔

ایک بار ان سے کسی نے پوچھا:

"کیا نماز کے اندر آپ کو کسی چیز کا خیال آتا ہے؟"

فرمایا: "ہاں، اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ میں اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا ہوں اور دو گھروں (جنت و دوزخ) میں سے ایک کی طرف جانا ہے۔"

پوچھا گیا:

"کیا امورِ دنیا میں سے بھی کچھ خیال آتا ہے؟"

فرمایا: "نمازوں میں تم جو (امورِ دنیا کے خیالات) پاتے ہو۔ ان کے پانے کی نسبت مجھے یہ آسان ہے کہ تیرے میرے بدن کو ہر طرف سے چھید ڈالیں"۔

اور فرمایا کرتے:

"اگر پردہ کھل جائے تو میرا یقین زیادہ نہ ہوگا۔" (اس لیے کہ پہلے سے ہی یقین کامل ہے)

حضرت مسلم بن یسارؒ ایک زاہد عابد بزرگ تھے۔ جب وہ نماز شروع کرتے تو گھر والوں کو فرماتے:

"تم جو چاہو بات کرو، اور اپنے راز کھول لو۔ اس لیے کہ میں تمہاری بات سنتا ہی نہیں ہوں"۔

اور فرمایا کرتے:

"تم کیا جانو کہ میرا دل کہاں ہے؟"

ایک روز وہ بصرہ کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے پیچھے سے مسجد کا ایک ستون گر گیا جو چار محرابوں پر تعمیر شدہ تھا۔ بازار والوں نے آواز سنی اور مسجد میں آئے تو وہ خاموشی سے نماز پڑھ رہے تھے جیسے کہ ایک ڈنڈا گاڑ رکھا ہو اور ان کی نماز میں ذرا بھی خرابی نہ ہوئی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگ انہیں مبارک دینے لگے تو انہوں نے فرمایا:

"کس بات کی مبارک دے رہے ہو؟"

انہوں نے کہا:

"اس قدر بڑا ستون آپ کے پیچھے کی طرف گر گیا۔ اور آپ اس سے بچ گئے"۔

فرمایا: "کب گرا؟"

لوگوں نے بتایا،

"آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔"

فرمایا: "مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔"

ایک نمازی کا فرمان ہے،

"نماز آخرت کی چیز ہے، جب میں نماز میں داخل ہوتا ہوں تو دنیا سے نکل جاتا ہوں۔"

ایک بزرگ سے پوچھا گیا،

"کیا نماز میں آپ کو کوئی چیز یاد آتی ہے؟"

فرمایا، "کیا نماز سے بھی کوئی محبوب تر چیز ہو سکتی ہے جو یاد آئے۔"

حضرت ابوالدرداؓ فرمایا کرتے،

"آدمی کی سمجھداری یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اپنی ضرورت پوری کرے تاکہ جب نماز شروع کرے تو اس کا دل ہر چیز سے فارغ ہو۔"

روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے نماز پڑھی اور مختصر سی نماز ادا کی ان سے پوچھا گیا

"اے ابوالیقظان (بیدار رہنے والے)، آپ نے اس قدر ہلکی پھلکی نماز پڑھی؟"

فرمایا، "کیا تم نے دیکھا کہ میں نے حدودِ نماز میں کچھ بھی کمی کی!"

انہوں نے عرض کیا، "نہیں۔"

فرمایا: "میں نے جلدی کر کے شیطانی سہو و وسوسہ کو پیچھے ڈال دیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"بندہ جو نماز بھی پڑھتا ہے (اس میں سے) اس کے لیے نہ تہائی نماز لکھی جاتی ہے نہ نصف (لکھی جاتی ہے، نہ چوتھائی) نہ پانچواں حصہ، نہ چھٹا حصہ اور نہ دسواں حصہ نماز لکھی جاتی ہے۔"

اور فرمایا کرتے،

"بندے کی نماز صرف اسی قدر لکھی جاتی ہے جو اس نے سمجھی۔"

امام عبدالواحد بن زیدؒ نے بھی یہی بتایا اور فرمایا کہ اس پر اجماع ہے اور فرمایا،

"علماء کا اس پر اجماع ہے کہ بندے کے لیے نماز صرف وہی ہے جو اس نے سمجھی۔"

اور حضرت حسنؒ نے فرمایا،

"جس نماز میں تیرا قلب حاضر نہ ہو وہ ثواب کی جانب کے مقابلہ میں سزا کی جانب زیادہ تیزی سے لیجانیوالی ہے۔"

بتلاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما عام لوگوں سے ہلکی نماز پڑھتے تھے۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

نُبَادِرُ بِهَا وَسْوَسَةَ الْعَدُوِّ۔ (ہم ایسا کر کے شیطانی وسوسہ سے آگے بڑھتے ہیں)

منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا:

"بعض ایسے آدمی بھی ہیں کہ اسلام میں ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر اللہ کی خاطر نماز کمال طریق سے نہیں پڑھتے۔" پوچھا گیا: "وہ کیسے؟"

فرمایا: "نماز کے اندر اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ کرنے اس کے سامنے تواضع اور خشوع پورا نہیں کرتے"۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ (اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی)

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (حتیٰ کہ تم سمجھو جو تم کہہ رہے ہو)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کو (دنیا کے) غم و فکر گھیر لیں۔ اللہ کو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کسی وادی میں ہلاک ہوا۔" (یعنی آخرت سے غافل اور دنیا کا ذاکر کہیں بھی برباد و ہلاک ہو کچھ پروا نہیں)۔

فرمانِ الٰہی ہے:

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ[1] (جو اپنی نماز سے غافل ہیں)

حضرت ابوالعالیہ سے اس آیت کی وضاحت پوچھی گئی تو فرمایا:

"یعنی جو نماز میں (غفلت کے باعث) بھول جاتا ہے۔ اور یہ نہیں سمجھتا کہ دو ہوئیں یا ایک (یا تین ہوئیں)"۔

حضرت حسنؒ سے اس کی تفسیر پوچھی گئی تو فرمایا:

"یہ وہ ہے، جو نماز کے وقت سے غافل ہو آخر وقت نکل جائے۔"

اور فرمایا کرتے:

"اللہ کی قسم! اگر انہوں نے نماز چھوڑ دی تو یہ کافر ہوئے۔ البتہ وقت سے رہ جانا سہو ہو کر (الگ بات ہے)"

اس میں بعض سلف کا فرمان ہے:

---

[1] الماعون آیت ۵۔

اس سے مراد وہ ہے کہ جو شروع وقت میں یا باجماعت نماز ادا کرے تو خوش نہ ہو اور اگر وقت کے بعد نماز پڑھے تو اسے غم نہ ہو۔

ایک قول یہ ہے؛

"اس سے مراد وہ ہے کہ جو نماز میں تعجیل کو نیکی اور تاخیر کو گناہ نہ سمجھے۔"

اور کہتے ہیں کہ پانچوں نمازیں ایک دوسری کے ساتھ ملا دی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ گا ہے ایک بندے کی اس طرح کرکے ایک نماز ہی مکمل ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو پچاس نمازیں پڑھتے ہیں تو ان کی پانچ نمازیں ان کے ذریعے سے مکمل ہوتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو جو حکم دیا اس سے پورا پورا لیتا ہے جیسے اس پر فرض کیا ورنہ اس کے تمام نفلی اعمال سے اسے مکمل کرتا ہے۔ اس لیے کہ بندے پر وہی فرض کیا جو اس کی مدد سے اس کی قوت میں ہے اور اپنی رحمت کے باعث طاقت سے بالاتر کا مکلف نہیں بنایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

"فرائض کے ذریعہ میرا بندہ مجھ سے نجات پا گیا اور نوافل کے ذریعہ سے میرے بندے نے میرا قرب حاصل کیا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس طرح کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے؛

"بندہ صرف اس کے ادا کرنے پر ہی مجھ سے نجات پاتا ہے جو میں نے اس پر فرض کیا۔"

ایک وضاحت کرنے والی روایت میں ہے؛

"بندے (کے اعمال میں سے) سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ ہوگا۔ اگر یہ مکمل پائی گئی تو ٹھیک ورنہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے بندے کے نوافل دیکھو۔ چنانچہ اس کے نوافل کے ساتھ اس کے فرائض مکمل کیے جائیں گے۔ پھر باقی تمام فرائض کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا۔ ہر فرض کو اسی طرح کی نفلی جنس کے ذریعہ پورا کیا جائے گا اور اگر فرائض کی طرح نوافل میں بھی نقص و غفلت ہوئی یا نفل ہی نہ ملے تو حساب میں اس کا حال کیسا (خراب) ہوگا؟ (خود ہی سمجھ لو)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے؛

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ۔[1] (کوئی نہیں، پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا)

---

[1] عبس آیت ۲۳۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں بتایا کرتے :

"اس سے مراد کافر ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک قرآن میں جہاں بھی خاص کر کے "انسان" کو نصیحت کی جاتی ہے۔ اس سے مراد کافر ہے (جس کو یاد دلایا جاتا ہے)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[1] (اللہ کسی جان کو نہیں تکلیف دیتا مگر جو اس کو گنجائش ہو)

یعنی اس کی طاقت کے مطابق ہی حکم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ یوں دعا کرتے ہیں :

وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ (اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں اس کی طاقت نہیں)

تفسیر میں آتا ہے کہ اس دعا پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

قد فعلتُ (میں کر دیا یعنی دعا قبول کر لی)

اس مسئلہ پر اختلاف و شبہ ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کی طاقت سے بالاتر کا مکلف نہیں بناتا اور خاص کر کے مومنین پر یہ اللہ کا فضل و نعمت ہے اور اس کی وجہ سے اللہ نے مومنوں کو کافروں پر ترجیح دی اور اسے حق حاصل ہے کہ بعض بندوں کو بعض پر ترجیح دے۔ وہ مالک و مختار ہے۔ فضل کا مالک ہے جس کو چاہے دے۔ اس فرمان کا یہ مطلب ہے :

وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ (اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں اس کی طاقت نہیں)

اسے حق حاصل ہے کہ عدل و حکمت کے باعث کافر پر اس کی طاقت سے بالاتر بوجھ ڈال دے۔ جیسے کہ فرمایا :

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ[2] (اور تیرے رب کی بات پوری سچی ہے انصاف کی۔ اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں)

یعنی اہلِ ایمان کے لیے صدق کے طور پر اور کفار پر عدل کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اخوان یوسفؑ کا ذکر کیا اور فرمایا :

تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا[3] (اللہ کی قسم اللہ نے تجھے ہم پر چن لیا)

یہ اس بات کی نص ہے کہ بعض مخلوق کو بعض پر ترجیح حاصل ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی بات

---

[1] البقرۃ آیت ۲۸۶ [2] الانعام آیت ۱۱۶

[3] یوسف آیت ۹۱

بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ[1] (اور جو ایمان لائے اور نیک عمل، ہم کسی جان کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی گنجائش پر ہی)

یعنی مگر طاقتِ عمل کے سوا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر صرف وہی اعمال فرض کیے جو ان کی استطاعت کے ہیں اور استطاعت سے باہر کے احکام فرض نہیں کیے۔ اہل ایمان کی تخصیص کے بارے میں یہ حضرت ابن مسعودؓ کے الفاظ کی نقل ہے جیسے کہ پہلے شروع میں بتا چکے ہیں۔

اس مسئلہ کی توضیح میں یہ بھی فرماتے ہیں:

"تاویل چاہنے سے متعلق اہل زیغ اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس کا مکلف کیا جو ان کی طاقت کے مطابق تھا۔ اس لیے کہ سب بندے، اللہ کے محتاج ہیں اور کسی حرکت و سکون میں وہ اللہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتے کیونکہ اس کی مشیت کے بغیر ان کی مشیت بھی نہیں۔ اس کی توفیق کے بغیر ان کی کچھ استطاعت نہیں اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی قوت و توفیق نہیں۔ دیکھیے کافروں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ[2] (نہ سکتے تھے سُننا اور نہ تھے دیکھتے)

اور اس طرح فرمایا:

وَ كَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا[3] (اور سن نہ سکتے تھے)

اور جس کو استطاعت ہے اس کے بارے میں فرمایا:

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ[4] (میں تو چاہتا ہوں اصلاح کرنا جہاں تک ہو سکے اور اللہ سے ہی توفیق ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس نے اس طرح نماز پڑھی جیسے اسے حکم دیا گیا۔ اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔"

---

[1] الانعام آیت ۴۲ [2] ہود آیت ۲۰
[3] الکہف آیت ۱۰۱
[4] ہود آیت ۸۸

روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

"میں ہر نمازی کی نماز قبول نہیں کرتا بلکہ میں اس نمازی کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری عظمت کی خاطر تواضع کرے۔ میرے جلال کے باعث اس کا دل خشوع رکھے اور میرے محارم سے اپنی شہوات کو روک لے دن رات میری یاد میں گزارے، نافرمانی پر اصرار نہ کرے، میری مخلوق پر تکبر نہ کرے۔ میری خاطر کمزور پر رحم کرے اور محتاج کی غمخواری کرے۔ اس کے علاوہ اس کی جہالت کو حلم میں اور ظلمت کو نور میں بدل دیتا ہے۔ وہ مجھے پکارتا ہے میں اس کو جواب دیتا ہوں (قبول کرتا ہوں) وہ مجھ سے مانگتا ہے۔ میں اس کو عطا کرتا ہوں۔ وہ مجھ پر قسم کھاتا ہے میں اس کو بری کرتا ہوں (اس کی قسم پوری کر دیتا ہے) میں اپنی قوت پر اسے متوکل بنا دیتا ہوں۔ میں اپنے فرشتوں پر اس کے باعث فخر کرتا ہوں۔ اس کا نور (جو) میرے پاس ہے۔ اگر اہل زمین پر تقسیم کر دیا جائے تو ان کے لیے کافی ہو۔ اس کی مثال فردوس کی طرح ہے جس کا پھل باسی نہیں ہوتا اور نہ اس کا حال متغیر ہوتا ہے۔"

روایت میں ہے،

"کئی قیام شب کرنے والے ایسے ہیں کہ جن کو قیام شب سے (صرف) بیداری و تھکاوٹ ہی نصیب ہوتی ہے۔"

امام کی تلاوت سنو

جو آدمی امام کی اقتداء میں نماز پڑھے اور یہ نہ سمجھے کہ امام نے کیا پڑھا۔ وہ از حد غفلت میں ہے۔ اس لیے کہ وہ قرآن مجید کے سننے کے حکم کا تارک ہے۔ خطرہ ہے کہ اس سے رحمتِ ایزدی ہٹ جائے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دو شرطوں کے ساتھ رحمت کی ضمانت دی ہے،

۱۔ سُنے

۲۔ خاموش رہے۔

ان دونوں مفاہیم میں حکم دیا،

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ [1]

(اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان رکھو اور چپ رہو شاید تم پر رحم ہو)

اور فرمایا،

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا [2]

(پھر جب وہاں پہنچے بولے چپ رہو)

---

[1] اعراف آیت ۲۰۴ [2] الاحقاف آیت ۲۹

اور روایت میں ہے،

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں تلاوت کی تو قرأت میں سے کچھ حصّہ چھوڑ دیا۔ جب آپؐ نے ہماری طرف رُخ کیا تو فرمایا،

"میںؐ نے کیا پڑھا؟"

لوگ خاموش ہو گئے۔ آپؐ نے ابیؓ بن کعب سے پوچھا تو انھوں نے عرض کیا،

"آپؐ نے فلاں سُورت پڑھی اور فلاں آیت چھوڑ دی۔ اب میں نہیں جانتا کہ یہ منسوخ ہو گئی یا اٹھا دی گئی؟"

آپؐ نے فرمایا،

"اے ابیؓ، تو اس کا اہل ہے"۔ پھر آپؐ نے دوسروں کی طرف توجہ فرما کر کہا:

ان اقوام کا کیا حال ہے نمازوں میں حاضر ہوتی ہیں، قطاریں مکمل کرتی ہیں۔ ان کا نبیؐ ان کے سامنے ہے مگر نہیں جانتیں کہ ان پر ان کے رب کی کتاب سے کیا تلاوت کر رہا ہے؟ یاد رکھو بنی اسرائیل نے بھی تمہاری طرح کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبیؑ کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم سے کہہ دو، تم ابدان کے ساتھ میرے سامنے حاضر ہوتے ہو اور اپنی زبانوں سے مجھے (وعدہ وغیرہ) دیتے ہو۔ مگر تم اپنے قلوب مجھ سے غائب (دور) رکھتے ہو جو تم لے کر جاتے ہو وہ بے کار چیز ہے (یعنی خالی ہاتھ جاتے ہو)۔

ہمارے بعض علماء کا فرمان ہے،

"گاہے بندہ اپنے تئیں سجدہ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اس کے ذریعہ اللہ عزوجل کا قرب حاصل کر رہا ہوں، لیکن اگر اس کے سجدہ میں ہونے والے گناہوں کو اہلِ شہر پر تقسیم کیا جائے تو وہ سب ہلاک ہو جائیں"!

پوچھا گیا:

"اے ابو محمدؒ! یہ کیسے؟"

فرمایا: "وہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے مگر اس کا دل کسی خواہش میں اُلجھا ہوتا ہے۔ اس پر کوئی غلط بات غالب ہوتی ہے اور وہ اس میں گرفتار ہوتا ہے:

اور واقعہ بھی ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے میں قُرب کی عزت دری اور رب تعالیٰ کی ہیبت کا نہ ہونا پایا جاتا ہے۔

یہ یاد رکھو کہ تجھ پر نماز کا طویل محسوس ہونا غفلت کی علامت ہے اور چھوٹی نماز سہو ہے۔ اس لیے کہ جب نماز تجھ پر طویل محسوس ہوگی تو یہ بات عدمِ حلاوت اور گرانی پائے جانے اور تیرے اعضاء پر بوجھ ہونے کی دلیل ہے اور جب تو نے نماز چھوٹی محسوس کی تو اس بات کی علامت ہے کہ حدود نماز ناقص رہے اور نماز میں

غفلت وسہو آگیا۔ چنانچہ نماز میں بھول جانا، قصرِ نماز ہے اور نماز میں استقامت یہ ہے کہ حلاوت ولذتِ مناجات کے باعث حسنِ فہم اور جمعیتِ فکر پائے جانے کی وجہ سے نماز طویل محسوس نہ ہو اور نماز میں بیدار ذہن، رعایتِ حدود اور حسنِ قیام کی وجہ سے نماز چھوٹی بھی محسوس نہ ہو۔ یہ اہل صلوٰۃ کا مراقبہ اور اہلِ خشوع کا مشاہدہ ہے۔

نماز میں خیالات آنے کا بیان

نماز کی حالت میں اگر بھلائی کی بات یاد آئے تو بندے کو چاہیے کہ اسے جلدی کرے۔ یہ اللہ تعالےٰ کا محبوب عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی اسے بہتر وقت میں یہ عملِ خیر یاد کرایا اور اگر کوئی مکروہ بات اور باعث ناراضگی بات یاد آئے یعنی ایسا بُرا عمل یاد آئے جس کا وہ عادی رہا ہے تو اس سے پرہیز کرے۔ اس لیے کہ یہ اللہ سے دُور کرنے کا عملِ بد ہے۔ محلِ قرب میں اسے یاد کرانے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر تنبیہ کی اور اسے ترک کرنے پر اُبھارا۔ اس کا ترک کرنا قربِ الٰہی کا باعث ہے اور حسنِ استجابت کی دلیل ہے اور یہی مسلک اللہ تعالیٰ کی جانب والی راہ ہے اور اگر قلب میں کسی خواہش کی تمنا پیدا ہو یا آئندہ یا گزشتہ بُرے کام کی خواہش ہو تو یہ شیطانی وسوسہ ہے اور وہ حسد کے باعث وسوسہ ڈال رہا ہے تاکہ اسے ارکانِ نماز میں سے ہر رکن کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہٹادے اور مناجات میں اسے قلبی چین وسکون نصیب نہ ہو۔ چنانچہ اس پر حجاب ڈال کر نفع سے ہٹاتا اور نقصان میں دھکیلتا ہے تاکہ اُسے اذکارِ نماز میں سے ان مقامات میں سے ہٹادے جن کو پڑھ کر وہ تدبر یا تعظیم یا حمد یا دعا یا استغفار میں سے کچھ عملِ خیر کرے گا۔

اور اگر حالتِ نماز میں معاشی مسئلہ یاد آئے یا تفسیرِ احوال اور مناجات کی حالت کے بارے میں کچھ تدبیر وغیرہ یاد آئے تو یہ نفس کی جانب سے مکر وفکر ہے۔ یہ امورِ دنیا کے وساوس اس کی جانب سے ہیں۔

اور اگر کسی بُرے اور ممنوع کام کرنے کا عزم وخیال آجائے تو یہ اس کی ہلاکت و بُعد کا باعث ہے اور ایسا عزم نفسِ امارہ کے شدید تسلط کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ بُعد کی علامت ہے اور ایسا حجاب دراصل ناراضگی، بُعد اور اعراض کا نشان ہے۔ اگر نمازی حالت میں اس قسم کی باتیں آئیں تو اس پر لازم ہے کہ خوب قوت کے ساتھ ان غلط عزائم کی نفی کرے اور قلب میں ایسے خیالات اُبھرنے نہ دے کہ وہ تسلط پاجائیں اور ان کو سوچے بھی نہیں کہ ان کی طرف میلان ہونے لگیں۔ ان امور کا تذکرہ بھی نہ کرے ورنہ اسے ذکرو بیداری سے نکال کر جہالت وغفلت میں گرادیں گے اور ہر ممنوع عمل کا عزم بھی ممنوع ہے اور اگر ایسا کرنا ناقص ہونے کی علامت ہے اور ہر مباح عمل کا عزم بھی مباح ہے اور اس کا عزم نہ کرنا فضیلت کی بات ہے اور دل پر آنے والے اعمالِ صالحہ کے خیالات پر عمل پیرا ہونے کی نیت ضرور کرلینی چاہیے۔ اس لیے یہ ذکر ومطلوب ہے اور اس کے بعد فارغ ہوکر نماز شروع کرے اور ان کی تدبیر پر غور نہ کرتا رہے کہ کیسے

کروں گا؟ کب کروں گا؟ یا جب کروں گا تو میں کیسے ہوں گا؟ ورنہ آئندہ میں غور کی وجہ سے حال کی انابت سے محروم رہے گا۔ اور یہ بھی شیطان کی جانب سے ایک سرقہ و انقا ہے۔

اگر نمازی نے افکار سے دُور رہنے اور دل کے وساوس کاٹنے کے لیے نفس و شیطان سے مجاہدہ و مقابلہ کیا تو وہ اللہ کی راہ میں مجاہد ہے اور اعدائے الٰہی سے مقابلہ کرنے والا ہے اس کے لیے دو اجر ہیں،

۱۔ کریم تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے نماز کا اجر

۲۔ مردود شیطان سے جنگ وجہاد کرنے کا اجر

اور قوی اہل ایمان کا یہ مقام ہے کہ وُہ شیطان پر بہت سخت ہوتے ہیں۔ جب حالتِ نماز میں انہیں مشاہدہ سے ہٹانے والی چیز کا وسوسہ آئے تو وہ اس چیز سے بالکل الگ کر دیتے ہیں۔ (یعنی اگر مال ہے تو اسے صدقہ کر کے اپنے آپ سے جدا کر دیتے ہیں) اس لیے کہ یہ چیز ان کے قطع و بُعد کا باعث تھی۔ وہ اسے اپنی ملکیت سے الگ کر کے اس میں زہد اختیار کرتے ہیں۔ یہ توفیق ان پر اللہ کا احسان اور مزید انعام کا باعث ہے۔ دنیا میں اہل زہد کے زہد کا ایک سبب یہ بھی ہے تاکہ اسباب سے بھی ان کے قلوب پاک ہو جائیں اور کمانے کے وساوس سے ان کے اعمال نمائش مزین ہیں۔

روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ نماز میں چغے کی بیلوں پر نظر ڈالی تو اسے اتار دیا اور فرمایا:

"اس نے مجھے نماز میں مصروف کیا۔" اور حالتِ نماز میں نئے جوتے کے تسموں پر نظر گئی تو انہیں اتار دیا اور یہ اتار کر دوبارہ پرانے تسمے ڈالنے کا حکم دیا۔ آپ نے جوتا پہنا اور پسند آیا تو سجدہ کیا اور فرمایا "میں نے اپنے رب تعالیٰ کے سامنے تواضع کی تاکہ وُہ مجھ پر ناراض نہ ہو۔ پھر اسے لے کر باہر تشریف لائے اور پہلے ملنے والے سائل کو عطا فرما دیا۔ پھر حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ دو سادے سبتی جُوتے خریدیں۔ چنانچہ آپ نے وُہ جوتے پہنے۔"

اور کمزور اہلِ ایمان کو چاہیے کہ قلبی سرعتِ تیقظ اور ایمانی قوتِ یقین کے باعث نفسانی و شیطانی وساوس میں نہ ڈوبے۔ انہیں دُور کرنے اور کاٹ دینے کی پُوری کوشش کرے۔ اس لیے کہ آفات و غلط خیالات آنے کے ذرائع حسب ذیل ہیں:

۱۔ خواہشِ نفس

۲۔ شیطانی تسلط

۳۔ خواہش کا مقام و تسلط ۔

۴۔ طویل غفلت اور شیطانی قوت ۔

۵۔ نفسانی شہوات کے باعث عبادت میں حلاوت نہ پانا ۔

۶۔ صفات پر شہوات کا غلبہ ۔

۷۔ ضعفِ یقین اور قلبی کمزوری کے باعث نفس اور نفسانی صفات کا غلبہ۔ اس لیے کہ اگر بندے کا یقین قوی ہو جائے تو اس کو شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا نورِ یقین اس کی ظلمتِ خواہش کو بجھا دیتا ہے اور قلب میں نفس اس طرح داخل ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔ جیسے دن میں رات داخل ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔ اس کا مقام مشاہدہ، شیطانی غلبہ و عداوت کو کاٹ کر الگ کر دیتا ہے اور وہ خوب یقین سے جان لیتا ہے کہ اس دنیا کے مقابلہ میں ذکر اللہ اور نماز زیادہ فائدہ بخش اور قابلِ مدح ہیں۔ چنانچہ وہ دنیاوی افکار میں پریشان ہونے کی بجائے ذکر میں کوشاں رہتا ہے اور ان دو مقامات کے بعد کوئی قابل وصف و ستائش مقام نہیں اور قلب میں جو جو فہمِ خطاب و تدبرِ معانی کلام اور مطلوب و مقصود پر یقین حاصل ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعلیم و تنبیہ ہے۔ یہ حسنِ عبادت کی وجہ سے مزید تلاوت، علامتِ اخلاص، برکتِ تدبر و دلیلِ قبول و شکر کا نشان ہے۔ اس لیے جو خوب صاف ہو لے۔ جو صاف ہوا اس میں حصہ لے اور اس کا انتظار و تمنا کرے اور اس سے علیحدہ ہو کر معنی میں فکر کر کے دوبارہ اس میں نہ پڑے ورنہ شیطان اس پر وسوسہ ڈالے گا اور غفلت کے باعث اس میں طمع رکھے گا اور بابِ تمنا سے اس میں اثر انداز ہوگا۔ اس لئے کہ امانی کا اضلال کے ساتھ انسال بتایا گیا اور یہ ابطال کے باعث جھوٹ پر زجر و توبیخ ہے۔ دیکھیے اللہ تعالےٰ اپنے فرمان میں بتاتا ہے:

وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ [1]

(اور میں بہکاؤں گا اور انہیں توقعات کا (لالچ) دوں گا)

پھر اس طرح فرمایا:

وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا [2]

(اور ساجھا کر ان سے مال اور اولاد میں، اور وعدے دے ان کو، اور کچھ نہیں وعدہ دیتا ہے ان کو شیطان مگر دغا بازی)

---

[1] النساء آیت ۱۱۹

[2] بنی اسرائیل ۶۴

پھر اپنے بندوں کو مستثنیٰ فرمایا اور بتایا کہ شیطان کو بندگانِ خدا پر اثر اندازی کی قوت نہیں کیونکہ ان کو اللہ پر توکل حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ خصوصیت کے ساتھ ان کا کارساز ہے اور وہ اللہ کی مدد سے شیطان پر غالب ہیں۔ فرمایا:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا۔

(وہ جو میرے بندے ہیں ان پر نہیں تیری حکومت اور تیرا رب کافی ہے کام بنانے والا)

ایک جگہ فرمایا:

وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا بِاٰیٰتِنَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ [1]

(اور دیں گے تم کو غلبہ پھر وہ نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے، تم اور تمہارے ساتھ ہیں اوپر رہو گے)

اور فرمایا:

اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ [2]

(بے شک اس کا تسلط ان پر نہیں چلتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں)

نماز میں کہاں دھیان رکھے

ہر آنے والے کلمہ پر تدبر و تفکر میں بندے کا گزشتہ فوت شدہ سے ایک شغل و مصروفیت ہے اور جو اس نے سمجھا اس کے سامنے حال میں مصروفیت ایک انقطاع و رکاوٹ ہے اور جو ابھی نہیں پڑھا اس سے جو سمجھا اور جس کی ضرورت تھی۔ اس غیر پر اس سے استدلال کیا۔ یہ ایک بابِ فطانت ہے جو اس کے لیے کھولا جاتا ہے اور تکلم اس کی کنجی ہے۔ پھر بندہ کو ایک دوسری چیز عطا ہوتی ہے جو اس کے لیے زیادہ بہتر ہے یا اس پر لازم ہے۔ اس لیے جو اس نے سمجھا اسے چاہیے اسی کے ساتھ سمجھے۔ جس سے آگاہی حاصل ہوئی اسے چاہیے کہ اس کے ساتھ آگاہی حاصل کرے اور جو تدبر تلاوت کے بغیر اس نے سوچا یا آیاتِ متلوہ کو سمجھے بغیر مصروف ہوا تو یہ بات فہم میں حجاب ہے اور خالص علم سے انقطاع ہے۔ اس لیے اس کو الگ کر دے اور اس سے دور رہے۔

تلاوت میں کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا باطنِ کلام پر تدبر کرے۔ غوامضِ خطاب پر غور و فکر کرے۔ اس کا قلب مفاہیم مرادی پر آگاہی حاصل کرے۔ اس کا فکر وصال ورد کے معاملہ پر غور کرے۔ اس لیے کہ یہ عزیز تعالیٰ

---

[1] القصص ۳۵

[2] النحل ۹۹۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ[1] (بے شک ہم نے سنا قرآن عجیب ، نیک راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے)

انہوں نے ہی سمجھا اور ان کی سمجھ پر ان کی مدح فرمائی اور اس طرح ایک جگہ صاحب تنزیل (اللہ تعالٰی) سے بتایا :

بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ[2] (بلکہ تو رہتا ہے اچنبے میں اور وہ کرتے ہیں ٹھٹھے)

یعنی مجھے قرآن ، اس کی تفصیل و تنزیل پر تعجب ہے اور جاہل لوگ اس پر تمسخر کرتے ہیں۔ اگر تلاوت کی برکت سے نفس متلو کی نظر تلاوت کرنے والے کے سامنے عظمت و قدرت کے مفاہیم میں غور و فکر کا دروازہ کھول دے اور کلام کے واسطہ سے اس کو اخروی وعدہ و وعید کا مشاہدہ حاصل ہو جائے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ اس طرح کہ اس کے دو عمل ہیں :

۱۔ فکر

۲۔ نماز

اور یہ بات عوام مومنین کے لیے مزید انعام کا باعث ہے اور خواص مقربین کے نزدیک یہ کم درجہ کی بات ہے ہاں انہیں اگر اس کے ذریعہ غیبی امور پر آگاہی حاصل ہو جائے اور رازہائے درون پردہ پر اطلاع ہو جائے ۔پھر اسی کی وجہ سے انہیں عزت و جبروت اور اجلال و رہبوت سے مقامات یقین کا مکاشفہ حاصل ہو جائے اور پھر ان کے تدبر و تفکر کے بغیر ہی ان کے سامنے یہ (رازہائے درون پردہ) ہجوم کر کے آجائیں اور مشاہدۂ قدرت تعالیٰ انہیں عطا ہو جائے تو اب ان کی زبان گنگ کر دی جاتی ہے اور ان کی عقلوں کو محو حیرت کر دیا جاتا ہے اور ان کے قلوب کو طلب سے مستغنی بنا دیا جاتا ہے اور ان کا فکر کسی سبب پر بھروسہ و توکل نہیں کرتا۔ وہ اس کی کیفیت ، رویت ، ماہیت معلوم کرنے میں نہیں پڑتے ۔ پھر جب ان سے اس کا حق لیا جاتا ہے تو وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور اس کے باعث عالم اکبر میں اپنا حصہ پاتے ہیں۔ آخر وہ اس کے سامنے ٹھہر جاتے ہیں اور اسی کے پاس وہ گرتے ہیں اور مشاہدہ کے ساتھ پلک بھر بھی نہیں ٹھہرتے اور نہ ہی لمحہ بھر مشاہدہ میں انہیں سکون ملتا ہے تاکہ بیان انہیں مبین تعالیٰ سے نہ ہٹا دے اور خبر انہیں یقین سے غافل نہ کر دے اور شہادت انہیں شہید تعالیٰ سے محجوب نہ کر دے اور بادی و عائد آنے والی چیز اور دوبارہ ظاہر ہونے والا مشاہدہ وغیرہ

---

[1] الجن ۱

[2] الصفت ۱۲

کا عزیز کلام ہے۔ لطیف تعالیٰ کا لطیف کلام، حکیم تعالیٰ کا حکمت والا کلام اور بزرگ کریم کا بزرگ کلام ہے۔ اس کا ظاہر آسان و قریب ہے اور اس کا باطن ایک بحر عمیق ہے۔ سامع ہے اس کو سمجھتا ہے تو اس کے واضح معانی کی بنا پر کہتا ہے کہ میں اسے سمجھ گیا اور جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو دقیق مفاہیم کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے نہیں سنا۔ اس کا بیان ظاہر و واضح ہے۔ اس لیے عاقل یہ گمان کرتا ہے کہ میں سمجھ گیا اور جب اس کی معرفت حاصل کرتا ہے تو یوں ہو جاتا ہے جیسے کچھ نہیں سمجھا۔ اس لیے کہ یہ ایک وسیع و عمیق سمندر ہے۔

ایک گروہ نے اس کی توضیح سنی اور دھوکہ کھا گئے۔ یہ دعویٰ کر دیا کہ ہم خوبی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیا، چنانچہ غیر کو مطلوب بنا بیٹھے اور ابدال کی دعا کرنے لگے اور دوسروں نے اس کی سمع پر کان دھرا اور دعویٰ کیا کہ ہم سمجھ گئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کی اور اس کی سمع سے الگ ہو گئے۔ پھر ہم نے ان کی یہ ساری جہالت بنا دی اور ان کی جرأت پر ہمیں تعجب ہوا۔ پہلے لوگوں کا وصف بیان کیا اور فرمایا:

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ[1]
(اور جب کوئی پڑھے ان پر ہماری آیات، کہیں ہم سن چکے ہم چاہیں تو کہہ لیں ایسا)

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ[2]
(اور جب پڑھیے ان کے پاس آیات ہماری صاف، تو کہتے ہیں جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی، لے آ کوئی اور قرآن اس کے سوا یا اس کو بدل ڈال)

اور دوسروں کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ[3]
(لا ڈالتے ہیں سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں)

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ[4]
(ان کو تو سننے کی جگہ سے کنارے کر دیا ہے)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ[5]
(اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ کہ انہوں نے کہا ہم نے سنا اور وہ سنتے نہیں)

پھر جنات میں سے جن کو سنایا اور سمجھایا۔ ان کا وصف بیان فرمایا اور جنات، انسان سے زیادہ قوت و وصف کے مالک ہیں۔

---

[1] انفال آیت ۳۱
[2] یونس آیت ۱۵
[3] الشعراء آیت ۲۲۳
[4] الشعراء آیت ۲۱۲
[5] انفال آیت ۲۱

انہیں معید و مبدی تعالیٰ سے نہ روک دے بلکہ انہیں مراد و مطلوب سے ہمکنار کیا اور ان سے تشرف (بزرگ پن) کو ساقط کر دیا۔ انہیں معرفت عطا کر کے اعتراف و تعریف سے غافل کر دیا۔ مشاہدہ سے وہ حصہ ملا کر دنیا سے غافل ہو گئے۔ تنہائی کو ایسا پسند کیا کر فوائدِ دنیا کو فراموش کر دیا۔ وسائل رسائی سے ایسے وابستہ ہوئے کر انہیں آگاہی مل گئی اور اب انہیں ان کا رہنما اور رسائی دہندہ انہی میں سے پیدا ہو گیا اور یہ قوی تعالیٰ کے باعث اقویاء غنی تعالیٰ کے ساتھ اغنیاء، موجد تعالیٰ کے لیے واجدین اور ایجاد کنندہ کو کھونے والوں، ذاکر کے ذاکرین اور صابر کے باعث صابرین کا وصف ہے۔

نمازی کو چاہیے کہ نماز پڑھنے سے پہلے ہر طرح کی ضرورت سے فراغت حاصل کر لے اور ایسا کوئی کام باقی نہ رہنے دے جو حالتِ نماز میں اس کے لیے قلبی پریشانی اور فکری انتشار کا باعث بنے تاکہ حالتِ نماز میں اسے قلبی جمعیت اور فکری یکسوئی حاصل رہے۔ اسے فہم خطاب حاصل رہے۔ زبان سے ادا کیے جانے والے کلمات پر دل بھی حاضر رہے اور خوب سمجھ بوجھ کر انابت اختیار کرے۔ کمزور لوگوں کو اس بات کا حکم اس وجہ سے دیا گیا کہ ایسا کر کے وہ شیطان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اولیاء کرام کے ساتھ مسابقت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"کمزور مومن سے طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور ہر بھلائی ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ سے لے کر فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً [1]

(برابر نہیں بیٹھنے والے مسلمان جن کو بدن کا نقصان نہیں اور لڑنے والے اللہ کی راہ میں، اپنے مال سے اور جان سے، اللہ نے بڑائی دی لڑنے والوں کو اپنے مال اور جان سے، ان پر جو بیٹھتے ہیں درجے میں)

اور فرمایا:

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔

(اور سب کو وعدہ دیا اللہ نے خوبی کا)

اسلام کے تیسرے رکن زکوٰۃ کا بیان

کتاب الزکوٰۃ

زکوٰۃ کے چار فرائض ہیں:

۱۔ حریت (یعنی غلام نہ ہو)

۲۔ ملکیت صحیح ہو۔

---

[1] النساء ۹۵

۳۔ نصابِ زکوٰۃ پایا جائے۔

یعنی دو صد درا ہم یا دس دینار (یا ان کے برابر مالِ تجارت قرض سے فارغ) موجود ہو۔

۴۔ اور سال گزر جائے۔

یعنی جس ماہ میں مال آیا تھا وہی ماہ آن پہنچے۔

صدقہ کے فضائل و آداب

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا:

"مال میں زکوٰۃ کے سوا کچھ لازم نہیں۔"

تابعین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حقوق لازم ہیں۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

تابعین کے نزدیک زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حقوق لازم سمجھتے تھے۔ حضرت شعبیؒ کا بھی مذہب ہے۔ ان سے پوچھا گیا:

"کیا زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر کچھ لازم ہے؟"

فرمایا: ہاں۔ سُنا نہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی[1] (اور دے مال اس کی محبت پر قرابت والے کو)

حضرت عطاؒ اور مجاہد رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

اہلِ اسلام کے نزدیک فرض مساوات اور قرض اور اپنے اور اہل کے سلسلہ میں معروف اور نیکی و احسان کے معاملات میں (یعنی زکوٰۃ اور دوسرے مالی لوازمات) سب ضروری اور واجب تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اہل تقویٰ و اہل احسان جن کو آسانی و فراخی حاصل ہے۔ ان پر یہ تمام (مالی فرائض و واجبات و صدقات) لازم ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں)

اور وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ۔ (اور خرچ کرو، اس سے جو ہم نے تمہیں روزی دی)

---

[1] البقرہ آیت ۱۷۷

ان کی تفسیر میں یہ مامور اور واجب حکم ہے اور آیت زکوٰۃ کی وجہ سے یہ حکم منسوخ نہیں ہوا اور یہ مسلمانوں پر حق مسلم کے اندر داخل ہے اور حریت اسلام اور حاجت پائے جانے پر یہ حکم واجب ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں یہ فضیلت کی بات ہے کہ واجب ہوتے ہی آغازِ وقتِ وجوب میں ادا کر دی جائے اور اگر اس کو مناسب اور قابلِ ترجیح مصرف نظر آئے تو وقتِ وجوب سے پہلے ادا کر دے مثلاً اللہ کی راہ میں غزوہ و جہاد پر خرچ کرے یا کسی کا قرض چکا دے جس کو قرض خواہ تنگ کر رہے ہوں یا کسی سخت پریشان حال محتاج آدمی یا مسافر مفلس کی مدد کر دے۔ اگر ان میں سے کسی کو وقت سے پہلے ادا کرے تو یہ بہت ہی افضل و بہتر ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے میں مسارعت الی الخیر کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ایسا کرنا نیکی و تقویٰ کے کام میں تیزی دکھانے اور مامور حکم پر چلنا اور بھلائی کے کام میں بڑھ بڑھ کر حصہ لینے کی دلیل ہے اور ایک بات یہ بھی ہے کہ مال اور صاحبِ مال دونوں دنیاوی حوادث سے محفوظ بھی نہیں۔ تاخیر کرنے میں کئی آفات کا ڈر ہے۔ دنیا میں انقلابات آتے رہتے ہیں۔ نفس پر حالات بدلتے رہتے ہیں۔ دلوں میں تقلیب کا خطرہ رہتا ہے اس لیے نیکی میں جلدی کرنا ہی بہتر ہے اور اگر دو مہینوں میں سے ایک کا آخری حصہ رکھے تو زیادہ افضل ہے اس لیے کہ ان دو میں دوسرے مہینوں کی نسبت زیادہ اجر و فضیلت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے مہینہ کو قرآن مجید نازل ہونے کے ساتھ مخصوص فرمایا اور اس ماہ مبارک میں لیلۃ القدر رکھی کہ جو ایک ہزار ماہ سے بہتر ہے اور اس ماہ کو فرضی روزوں کا محل بنایا اور اس ماہ میں قیامِ شب (تراویح) کے ذریعہ مساجد کو آباد فرمایا۔

حضرت مجاہدؒ فرمایا کرتے تھے:

"رمضان مت کہو، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ میں سے ایک اسم ہے بلکہ شہر رمضان (ماہِ رمضان) کہا کرو۔"

حضرت اسمٰعیل بن ابی زیادؒ نے اسے مرفوع بتایا اور باسند روایت بیان کی اور ذوالحجۃ کا مہینہ ایک مہینہ ہے کہ جس میں پانچ فضائل جمع فرما دیے اور ہماری دانست اور کوئی ایسا دولت مند نہیں کہ جس میں فضیلت کی پانچ باتیں جمع ہوں۔

۱۔ یہ ماہِ حرام ہے۔

۲۔ یہ ماہِ حج ہے۔

۳۔ اس ماہ میں حج اکبر کا دن آتا ہے۔

۴۔ اسی ماہ میں ایامِ معلومات یعنی دس دن آتے ہیں۔

۵۔اور ایامِ معدودات ۔ یعنی ایام تشریق اس میں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ذکر اللہ کا حکم دیا۔

ماہِ رمضان میں افضل ترین ایام آخری عشرہ ہے اور ماہِ ذی الحجہ میں افضل ترین ایام پہلا عشرہ ہے ۔

بعض اہلِ تقویٰ کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ ہر سال ایک ماہ قبل زکوٰۃ ادا کر دے تاکہ سال کے آخر سے تاخیر نہ ہونے پائے۔ اس لیے کہ اگر وہ ایک مقررہ مہینے میں زکوٰۃ ادا کرے۔ پھر آئندہ سال بھی اس ماہ میں زکوٰۃ ادا کرے تو اس سال یہ تیرھواں مہینہ بن جائے گا اور یہ تاخیر ہے ۔ چنانچہ مشائخ فرماتے ہیں کہ اگر مثلاً رجب میں زکوٰۃ ادا کرے تو اسے چاہیے کہ آئندہ سال جمادی الآخرۃ میں ادا کرے تاکہ بغیر کسی زیادتی کے سال کے اختتام پر ادا ہو جائے اور اگر اس سال رمضان المبارک کے مہینہ میں زکوٰۃ ادا کرے تو آئندہ سال شعبان میں ادا کر دے تاکہ سال سے کچھ مدت بھی نہ بڑھنے پائے ۔ یہ بہتر طریقہ ہے ۔ اور اس بات سے پرہیز کرے کہ فرض (زکوٰۃ) کو ہر ماہ تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرے اور بطیبِ خاطر، قلبی مسرت و فرحت کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرے۔ اپنے رب تعالیٰ کے لیے خلوص رکھے۔ اسی کی رضا چاہے، دکھاوا اور تصنّع سے سخت پرہیز رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا مطلع ہونا پسند نہ کرے۔ اللہ کے سوا نہ کسی سے عطا کی امید رکھے اور کسی سے رکاوٹ کا ڈر رکھے بلکہ اللہ تعالیٰ پر نظر رہے۔ اس کی جانب سے حسنِ توفیق سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ جس فقیر نے اس سے زکوٰۃ لی۔ اس نے اس پر نوازش کی اور لینے والے کو دل میں بُرا اور حقیر خیال نہ کرے جیسے کہ ایک عارفؒ کا فرمان ہے :

"میں ایک اعلیٰ صنعت جانتا تھا اور مجھ سے ترکِ کسب کا مطالبہ ہُوا تو دل میں خیال آیا کہ گزران کیسے ہوگا؟ اس پر ایک غیبی فرشتہ کی آواز آئی جس کو میں نے دیکھا نہیں کہ" ہماری طرف کٹ کر آتا ہے اور اپنے بارے میں ہم پر تہمت رکھتا ہے؟ یہ ہم پر ہے کہ ہم اپنے کسی ولی سے تیری خدمت کرائیں یا اپنے کسی دشمن منافق سے (تیری خدمت کرائیں)" اور فقیر کے لیے یہ بات ایک راز ہے جس کو ذکر نہ کرنا چاہیے۔

فرمانِ الٰہی ہے :

لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَ الۡاَذٰی [1] (مت ضائع کرو اپنے صدقات احسان جتا کر اور ایذا دے کر)

اس کی تفسیر میں فرمایا :

" اَلۡمَنِّ یعنی ذکر کر کے اور اَذٰی یعنی اظہار کر کے ۔"

حضرت بشر بن حارث سے مروی ہے :

---

[1] البقرہ ۲۶۴

"جس نے منّ کیا اس کا صدقہ باطل ہو گیا۔"

پوچھا گیا:

"اے ابوالنصر! منّ کیسے ہوتا ہے؟"

فرمایا: "یعنی تو اس کو یاد کرے یا اس کا ذکر کرتا پھرے۔"

بعض کا فرمان ہے:

"منّ سے مراد ہے کہ تو عطا کر کے خدمت لے اور اذٰی کا مطلب یہ ہے کہ تو فقر پہ اسے شرم دلائے۔"

ایک قول یہ ہے: کہ

"منّ یہ ہے کہ تو عطا کرنے کی وجہ سے فقیر پر تکبر کرے اور اذٰی کا مطلب یہ ہے کہ تو سوال کرنے پر جھڑک دے یا نہ دے۔"

حدیث میں ہے:

"افضل ترین صدقہ تنگ دست کی کمائی ہے جو کسی فقیر کو پوشیدہ طور پر دیا جائے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"تین باتیں نیکی کے خزانے ہیں ان میں سے ایک صدقہ کو پوشیدہ رکھنا ہے۔"

باسند طریق سے مروی ہے:

اور یہ بات اس کے دین کے لیے زیادہ سلامتی کی ہے، اس میں آفات کم تر ہے اور ایسا کرنے سے اس کا عمل پاکیزہ تر رہتا ہے۔"

روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ سنانے والے اور دکھاوا کرنے والے سے (صدقہ و عمل) قبول نہیں کرتا اور نہ احسان جتانے والے سے (قبول کرتا ہے)۔"

جیسے کہ منۃ اور سمعۃ (احسان جتانے اور سنانے) کو جمع کیا جیسے کہ سمعہ اور ریا کو جمع کیا اور ان کی وجہ سے اعمال مسترد کیے چنانچہ مسمع (سنانے والا) وہ ہے جو اپنے اعمال کا ذکر کرتا پھرے تاکہ جس نے نہیں دیکھا اسے سنائے۔ یہ بھی دکھاوے کے قائم مقام ہوا۔ اس لیے عمل باطل کرنے میں یہ دونوں برابر ہوئے اس لیے کہ یہ دونوں ضعفِ یقین کے باعث ہیں کیونکہ اس نے مولائے کریم کے سننے اور علم کو کافی نہ سمجھا جیسے کہ دکھاوا کرنے والے نے اللہ کے دیکھنے کو کافی نہ جانا۔ اور اس میں اللہ کے ساتھ شرک کیا اور منّان تعالیٰ کو ان دونوں سے ملا دیا۔ اس لیے کہ احسان جتانے میں دونوں مطلب ہیں۔ اس نے ذکر کیا اور دوسرے نے

سُنا، یا دل میں اس عطا کو دیکھ کر اس پر فخر کیا۔ اگرچہ پوشیدہ طور پر دیا۔ اب اگر اسے ظاہر کیا تو پوشیدگی ت ہٹ گیا اور علانیہ میں لکھا گیا اور اگر اس کا ذکر کیا تو پوشیدہ اور علانیہ دونوں سے منتقل ہو کر ریاء دکھاوا میں لکھا گیا اور اگر صدقہ ظاہر کرنے میں صرف پوشیدہ صدقہ کا اجر ہی ختم ہو جائے تو بھی یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ روایت میں ہے :

"علانیہ صدقہ سے پوشیدہ صدقہ ستر گنا افضل ہے۔"

ایک مشہور روایت میں ہے :

"قیامت کے روز سات آدمی اللہ کے عرش کے سایہ تلے ہوں گے جس روز اس کے سایہ کے بغیر کوئی سایہ نہیں ہو گا۔ ان میں سے ایک وُہ ہے کہ جو صدقہ کرے تو اس کا بایاں ہاتھ نہ جانتا ہو کہ دائیں کے ساتھ اس نے کیا دیا؟"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

"چنانچہ جو وُہ دائیں ہاتھ سے دے اسے بائیں ہاتھ سے مخفی رکھے۔" یعنی وصف (اخفاء) میں مبالغہ کا یہ لفظ ہے اور از حد اخفاء کرے۔ یعنی اپنے آپ سے بھی مخفی رکھے۔ اب غیر سے مخفی رکھنا بدرجہ اولیٰ ہو۔ عرب لوگ ضرب المثل دے کر اور تعجب کر کے کسی چیز میں مبالغہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ اس میں حد سے تجاوز بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت کی۔ انہیں بخیل بتایا اور ان کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ اِلَّا نَقِيْرًا[1] (یا ان کا سلطنت میں کچھ حصہ ہے۔ پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر)

اور نقیر جیسی حقیر چیز کا کوئی بھی خواہش مند نہیں ہوتا اور نہ کوئی اس قدر حقیر چیز عطا کرتا ہے۔ اس لیے کہ نقیر سے مراد کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ایک نقطہ ہے جہاں سے کھجور کا پیڑ پھوٹ کر نکلتا ہے۔ اس جملہ میں خوب غامض اور شدید مفہوم ہے۔ فرمایا:

فاخفیٰ عن شماله۔ (چنانچہ وُہ بائیں سے پوشیدہ رکھے)

یہ ایسا حقیقی خفا ہے کہ نفس میں اس کا خیال بھی نہ آئے اور نہ ہی دل میں کوئی کھٹکا ہو اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ عطا میں وہ اپنے نفس کی طرف قطعاً نظر نہ کرے اور قلب پر اس کا وہم بھی نہ گزرے جیسے کہ رازِ ملکوت میں فرمان ہے:

---

[1] النساء ۵۳

"اللہ تعالیٰ صرف اس پر نظرِ (رحمت) فرماتا ہے جو اپنے نفس کے ساتھ بھی اس کا تذکرہ نہ کرے"۔ یعنی اس کے دل پر بھی اس کا خیال نہ آئے اور نہ اس کا ذکر کرے اور نہ ہی نفس کو اس کی نگاہ ہو بلکہ وہ اس سے غافل ہو جائے گویا اسے اس کی کچھ پروا نہیں۔ اس وقت وہ اس قابل ہے کہ راز پر غائب آئے۔

اگر تو اس پر قادر نہ ہو سکے یعنی اپنا صدقہ اپنے نفس سے بھی نہ چھپا سکے تو اس میں اپنا آپ ہی مخفی کر لے یعنی دینے نہ جانے کہ تُو دینے والا ہے۔ یہ اخلاص میں ایک مقام ہے اور اگر تو نے عطا کرنے میں اپنا ہاتھ ظاہر کیا تو اسے معطیٰ تک چھپا لے۔ یہ حالِ صادق ہے۔ بعض اہلِ اخلاص کا یہ حال تھا کہ وہ فقیر کے ہاتھ میں یا راستہ میں یا اپنے مقامِ نشست میں ایک درہم پانے جو نظر آتا تو انہیں معلوم نہ ہوتا کہ یہ کس کا ہے؛ (اس قدر بے نیاز ہوتے)

بعض کا اپنے کپڑے میں یہ حال تھا کہ وہ سوتے ہوتے اور نہ جانتے کہ یہ کس نے کیا:
جو ایسا کرتا ہے میں نے اسے دیکھا ہے اور جو آدمی دوسرے کے ہاتھ فقیر کو بھیجتا ہے اور اس کی حالت مخفی رکھتا ہے ایسے بے شمار مسلمان گزر چکے ہیں۔

روایت میں ہے:

"پوشیدہ صدقہ (صدقۃ السر)"

ایک قول ہے:

"رات کا صدقہ رب تعالیٰ کا غضب بجھاتا ہے"

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اخفاء افضل ہے اور اسی کی وجہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔

حق سبحانہ، و تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ [1] (اور تم اسے چھپاؤ اور فقراء کو پہنچاؤ تو تم کو بہتر ہے اور اتارتا ہے کچھ گناہ تمہارے)

اور اگر کسی مسکین نے اپنا آپ ظاہر کر دیا اور کھل کر مانگ لیا اور عفت پر ذلت و تبذل کو ترجیح دی تو اس پر احسان کو ظاہر کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اور اگر تو نے سنت کے ارادہ سے اور اس نیت سے زکوٰۃ ظاہر کر دی کہ لوگ اس نیکی میں اقتدار کریں اور دوسروں کو آمادگی پیدا ہو تو بھی بہتر ہے۔ یہ اطعامِ مسکین پر آمادہ کرنے کی

---

[1] البقرہ ۲۷۱۔

طرح ہُوا۔ یہ طریق بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مندوب ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً[۱] (اور جو ہم نے انہیں روزی دی اس سے بہتوں نے خرچ کیا پوشیدہ اور ظاہر)

ایک قول کے مطابق سِرًّا سے مراد تطوع (نفل) ہے۔ اور علانیۃ سے مراد فرض صدقہ ہے۔ اس طرح فرمانِ الٰہی ہے:

وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا[۲] (اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا)

قرضِ حسن یعنی نفل، اور ایک قول میں حلال مراد ہے جیسے کہ فرمایا:

وَ رَزَقَنِیۡ مِنۡهُ رِزۡقًا حَسَنًا[۳] (اور اس نے روزی مجھ کو اچھی)

یعنی حلال رزق۔ اور ایک جگہ فرمایا:

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ۔ (اگر تم کھلی دو خیرات تو کیا اچھی بات)

چنانچہ ظاہر کرنے والے کی نعمتوں کی وجہ سے مدح کی۔ البتہ یہ تب ہی بہتر ہے اور اس کے لیے بہتر ہے کہ جس کے سامنے سوال کرنے والا ظاہر ہوجائے گویا یہ سائل زبان و ہاتھ سے مانگ رہا ہے اور فرمایا:

وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ[۴] (اور اگر چھپاؤ اور فقراء کو پہنچاؤ)

گویا یہ سوال کو بُرا سمجھ رہا ہے اور خواص فقراء کے لیے ہے جو حیاء و عفت کے باعث اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔ اب جس نے اپنا آپ ظاہر کیا اسے ظاہر طور پر دے اور جس نے اپنا آپ چھپایا اسے پوشیدہ طور پر دے۔

اس طرح فاسق کے ستر کا کھلنا ہے جو آدمی تجھ سے اپنا آپ چھپائے اور پردہ رکھے۔ اس کا عیب و پردہ ظاہر کرنا حرام ہے اور اگر اس نے خود ہی اپنا آپ ظاہر کر دیا اور علانیہ (برائی کا) ذکر کیا تو اس پہ ظاہر کرنے میں کچھ حرج نہیں جیسے کہ روایت میں ہے:

---

[۱] الرعد آیت ۲۲

[۲] مزمل آیت ۲۰

[۳] ہُود آیت ۸۸ [۴] البقرہ آیت ۲۷۱

"جس نے حیاء کی چادر اتار دی۔ اس کی کچھ غیبت نہیں۔"

افضل ترین مال کا صدقہ کرنا چاہیے۔ جو مال عمدہ ہو لوگ اس کا ذخیرہ کرتے ہوں۔ اس سے مانوس ہوں۔ اس مال پر مولائے کریم کو ترجیح دے جیسے کہ فرمایا،

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ[1] (خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے)

پھر فرمایا،

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ (اور نیت نہ رکھو گندی چیز پر کہ خرچ کرو)

اور بندے کی مثال دے کر فرمایا،

وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ (اور تم آپ وُہ نہ لو گے مگر جو آنکھیں موند لو)

یعنی ردی مال کو اللہ کی راہ میں دینے کی طرف میلان نہ کرو کہ اگر تم میں سے کسی کو یہ مال دیا جائے تو وہ کراہت وحیاء کرتے ہی یہ لے اور اپنے آپ کے لیے عمدہ مال سے کم درجہ کا مال اللہ کے لیے نہ رکھو یا جس کا لینا تمہیں ناپسند ہو یا دوسرے سے لینا بُرا لگے یا کسی شریف آدمی کو اس کا ہدیہ دینا اچھا نہ سمجھو۔ ایسے مال کو اللہ کے لیے نہ رکھو ورنہ تم نے اپنے آپ کو یا اپنے جیسے بندے کو مولائے کریم پر ترجیح دی۔ اس مفہوم میں فرمان الٰہی ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا[2] (کون شخص ہے جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض)

یعنی عمدہ اور پاک۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک ہی قبول کرتا ہے۔

حضرت ابان کی حدیث میں حضرت انسؓ سے روایت ہے:

"اس بندے کے لیے خوشخبری ہے جس نے وُہ مال خیرات کیا جو اس نے معصیت کے بغیر کمایا۔"

ایک روایت میں ہے،

"ایک درہم، ایک لاکھ درہم سے بڑھ گیا۔"

اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم کو زجر فرمایا جو ناپسندیدہ چیز اللہ کے لیے کرتے ہیں اور ان کی زبانوں کو جھوٹا قرار دیا کہ وہ دعوے باندھتے ہیں کہ نیکی کے وُہ مالک ہیں۔ فرمایا،

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ (اور کرتے ہیں اللہ کا جو اپنے جی میں چاہے اور بتاتی ہیں

---

[1] البقرہ ۲۶۷

[2] البقرہ ۲۴۵

اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ[1] ان کی زبانیں جھوٹ کہ ان کو خوبی ہے آپ ہی ثابت ہوا کہ ان کو آگ ہے)

یعنی وہ آگ کے مستحق ہیں اور آیت میں ایک غریب وقف ہے۔ جس کو صرف مذاق اہلِ عربیت ہی سمجھتے ہیں۔ یہ لا پر وقف آتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے لیے حسنیٰ (نیکی) کے وصف ہونے کی نفی بن جاتا ہے۔ پھر دوبارہ آغاز کیا کہ ان کے لیے آگ ہے (ان لھم النار) یعنی ان کا یہ کام آگ ہے کہ وہ مکروہ چیز کو اللہ کے لیے کرتے ہیں۔ یعنی ان کے جرم و اکتساب کے باعث ایسا ہے۔

اور جب کوئی مسکین آدمی صدقہ لے کر تجھے دعا دے تو تو بھی جواب میں ویسی دعا دے تاکہ اس کی دعا کی جزا بن جائے۔ فرمایا:

" اور تو خالص طور پر صدقہ کرے ورنہ اس کی دُعا تیرے احسان کی جزا بن جائے گی۔ چنانچہ علمائے کرام اس بات کا خاص خیال رکھتے اور یہی طریقہ تواضع کے قریب تر ہے۔ اور یہ بھی سمجھتے رہو کہ تم نے جو اسے دیا اس پر دعا و اجر کے مستحق نہیں ہو۔ اس لیے کہ تم تو معبودِ تعالیٰ کے احکام واجبہ ادا کرنے پر مامور ہو یا یوں سمجھو کہ عطا کرنے والے نے تیری عبادت کے باعث روزی پوری کر دی اور حصہ ادا کر دیا۔"

حضرت عائشہ اور ام سلمۃ رضی اللہ عنہما جب کسی فقیر کو عطا فرماتیں تو قاصد سے کہتیں۔

"جو وہ دعا دے اسے یاد رکھنا۔"

پھر وہ اسی طرح لوٹا کر اس کے لیے دُعا کرتیں اور فرماتیں کہ:

"تاکہ ہمارا صدقہ خالص رہے۔"

حضرت عمر بن خطاب اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل منقول ہے:

یہ مناسب نہیں کہ تو فقیر سے دعا کا تقاضا کرے یا اس سے کہے کہ دعا کرو یا اس کام پر کچھ مدح و ثنا چاہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا قصد میں خرابی کا باعث ہے۔ اور اگر تو نے کثرت سے یہ کیا اور ثناء و مدح کا دباؤ ڈالا تو تیرا صدقہ باطل ہو گیا۔ یہ بات الگ ہے کہ فقیر پر دعا و ثناء لازم تھی مگر وہ تو ایک ایسا عمل کر رہا ہے کہ جس کا اللہ نے حکم دیا اور وہ اللہ کی عبادت کر رہا ہے وہ اپنے اوپر تیرا حق نہیں دیکھتا۔ جب فقیر کو صدقہ دو تو بہت ہی اچھے انداز میں نرمی اور تواضع کے ساتھ صدقہ دو۔ بعض اہلِ ادب کا طریقہ تھا کہ جب وہ کسی فقیر کو کچھ عطا کرتے تو دونوں ہاتھ پھیلا کر چیز دیتے تاکہ فقیر کا ہاتھ اوپر رہے اور اپنے دونوں ہاتھ فقیر کے سامنے زمین پر رکھ دیتے

---

[1] النحل ۶۲

اور قبول کرنے کی درخواست کرتے تاکہ دینے والا ہی سائل بن جائے اور اس کے احترام کے باعث اس کے ہاتھ میں نہ دیتے۔ یہ بات معرفتِ ربانی اور حسنِ ادب کی دلیل ہے۔

اور جو آدمی صدقہ کرکے تعریف و ستائش چاہے اور یہ چاہے کہ اس کا ذکر ہوا کرے تو اس کا صدقہ میں بھی حصہ ہے اور اس کا اجر باطل ہوگیا اور بسا اوقات مدح چاہنے کی وجہ سے اس پر گناہ کا بوجھ بڑھ جاتا ہے اس لیے کہ ذکر و مدح کا حقدار اللہ تعالیٰ ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کی روزی دوسرے بندے کے ہاتھ سے بھیجی ہے۔ اب اگر وہ برابر برابر خلوص دکھاتا تو بہت ہی خوب ہوتا۔

اور اگر ایک فقیر یہ چاہے کہ صدقہ دینے والے کو بطورِ شکر دعائیں دے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ عطا کرتے وقت اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر عطا کرنے پر اس نے اپنے بندے کی تعریف بھی فرمائی ہے۔ تو اسے چاہیے کہ اس طرح دعا دے۔

طَهَّرَ اللّٰهُ قَلْبَكَ فِيْ قُلُوْبِ الْاَبْرَارِ وَ زَكّٰى عَمَلَكَ فِيْ عَمَلِ الْاَخْيَارِ وَ صَلّٰى عَلٰى رُوْحِكَ فِيْ اَرْوَاحِ الشُّهَدَآءِ۔

(اللہ تعالیٰ ابرار کے قلوب میں تیرا دل بھی پاک کرے اور اخیار کے عمل میں تیرا عمل بھی پاک کرے اور شہداء کے ارواح میں تیری رُوح پر بھی رحم فرمائے)

یہ لوگوں کے لیے شکر بھی ہے دعا بھی ہے اور ان کے لیے حسنِ ثنا بھی ہے۔

ایک شکر یہ بھی ہے کہ اگر وہ نہ دیں تو ان کی مذمت نہ کرے اور ان پر عیب نہ دھرے۔ روایت میں ہے:
"جس نے لوگوں کا شکر نہیں کیا۔ اس نے اللہ کا شکر نہیں کیا" اس لیے کہ ایسا کرنے میں دراصل اظہارِ نعمت و اخلاقِ منعم سے آراستہ ہونا ہے اور یہ حسنِ ادب اور اواسط کی حکمتوں کو قائم رکھنے کا معاملہ ہے کیونکہ اس نے ان پر انعام فرمایا۔ پھر ان کی قدر فرمائی یہ اس کا کرم ہے۔

روایت میں ہے:
"صاحبِ یقین بندہ، عطاء میں مولائے کریم کے ہاتھ (قدرت) کا مشاہدہ کرتا ہے۔" چنانچہ وہ حمد کرتا ہے اور وہ متقین کی قدر کرتا ہے۔ اس لیے مولائے کریم نے انہیں ہی ذریعۂ روزی بنایا۔ چنانچہ روایت میں آتا ہے:
"جو تمہیں کوئی اچھا (ہدیہ وغیرہ) بھیجے تو اس کو بدلہ دو۔ اگر اس کی توفیق نہ ہو تو اس کے لیے دعا کر دو۔ حتیٰ کہ تم سمجھ لو کہ تم نے اس کا بدلہ چکا دیا۔" اور عطاء پر اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ہے کہ یقین رکھے کہ یہ سب نعمت صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی اطاعت کرے۔

افضل صدقہ افضل صدقہ وُہ ہے کہ جو خاص طور پر صالح و صادق فقراء کو دیا جائے جو اہلِ تصوف اور اہلِ دین ہوں اور شکوہ و فریاد کرنے والے نہ ہوں بلکہ گمنامی اور حجاب کو پسند کرتے ہوں۔ قرآن مجید:

سے ان کے اوصاف بیان کیے :

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1] (ان فقراء کو جو رک گئے اللہ کی راہ میں)

وُہ خاندان یا تنگیِ معاش یا اصلاحِ قلب یا مال کی کمی کے باعث راہِ آخرت میں رکاوٹ اور تکلیف پائیں۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ۔ (چل پھر نہیں سکتے ملک میں)

اس لیے کہ ان بیچاروں کے بازو کٹے ہیں۔ ایک دولت مند کے لیے مال ایسے ہی ہے جیسے کہ پرندے کے لیے بازو ہوں کہ وہ مال کے زور سے جس ملک میں چاہتا ہے جا سکتا ہے اور جو چاہتا ہے وُہ کر لیتا ہے اور محتاج آدمی مال کی کمی کے باعث بند اور محبوس ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے :

قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا[2] (ہم نے اتاری تم پر پوشاک کہ ڈھانپے تمہارے عیب اور رونق)

اور ایک قول میں معاش مراد ہے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ[3] (جاہل انہیں نہ مانگنے سے انہیں غنی سمجھتا ہے)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لیا جو مال کی کمی کا وصف ظاہر نہیں کرتا۔ اس کے احتیاج کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے کہ وُہ مانگنے سے پرہیز کرتا ہے۔

پھر ان کا وصف بتایا اور مخلوق میں انکی تعریف واضح کی۔ ان کا حال کھولا۔ فرمایا :

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ۔ (تو پہچانتا ہے انہیں ان کے چہرے سے)

چنانچہ سیما ہی ان کی پختہ علامت اور عادت محکم ہے۔ ان کا یہ وصف دکھاوا اور ظاہر ہی نہیں ہوتا۔

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ (نہیں مانگتے لوگوں سے لپٹ کر)

اگر پہچان سکو تو اس علامت سے تم انہیں پہچان لوگے کیونکہ وہ قناعت و عفت کے باعث نہ مانگتے ہیں اور نہ ہی اغنیاء کے ساتھ لپٹتے پھرتے ہیں اور نہ ہی اہل دنیا کے ساتھ لگ کر تملق کرتے ہیں بلکہ وُہ اپنے حال میں تنہا، اپنے یقین کے باعث مستغنی اور اپنے صبر کے باعث یکتا ہیں اور الحاف کا لفظ دراصل لحاف سے مشتق ہے۔ یلتحف بہ (وہ اس کو لپیٹ لیتا ہے) اور بدن سے چپک جاتا ہے۔

---

[1] البقرہ ۲۷۳

[2] الاعراف ۲۶

[3] البقرہ ۲۷۳

چنانچہ فرمایا: وہ اغنیار کے ساتھ چپکے نہیں رہتے جیسے کہ لحاف چپک جاتا ہے۔

اس بات کا خاص خیال رکھو کہ جس فقیر میں یہ صفاتِ بالا پائی جائیں یا اس میں کچھ صفات ہی پائی جائیں۔ اس کو صدقہ دو تاکہ تمہارا عمل پاکیزہ رہے اور وہ تیرے فعل کا شکر ادا کرے اور افضل یہ ہے کہ اجانب سے پہلے انسان اپنے محتاج بھائیوں اور اقربا پر احسان کرے۔

صلہ رحمی کی فضیلت

حضرت علیؓ سے مروی ہے:

"ایک (اجنبی غریب) پر بیس درہم صدقہ کرنے سے مجھے اپنے کسی (قریبی) بھائی پر ایک درہم صلہ رحمی کرتے ہوئے (خرچ کرنا) زیادہ محبوب ہے اور ایک سو درہم صدقہ کرنے سے بیس درہم صلہ رحمی کرتے ہوئے خرچ کرنا زیادہ پسند ہے اور ایک غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب بات یہ ہے کہ میں صلہ رحمی کرتے ہوئے ایک سو درہم خرچ کروں۔" اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اقارب کی طرف صدقات کو ملایا۔ اس لیے اجانب کے مقابلہ میں اقارب پر صدقہ زیادہ افضل ہے جیسے کہ دور والوں کے مقابلہ میں قریب والے پر صدقہ کی افضلیت ہے کیونکہ اس مفہوم میں صلہ رحمی کے بعد صلۂ اخوان سے افضل کوئی بات نہیں۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"افضل ترین عمل، بھائیوں سے صلہ (تعلق) کرنا ہے۔" (کہ ان کی مدد کرے)

اگر کوئی عطا کرے تو اس میں اللہ کی حمد و ثناء اور اس کا شکر ادا کرے اور یہ نعمت اللہ کی جانب سے سمجھے اور واسطہ پر نظر نہ کرے۔ یہی بندہ سب سے بڑا شکر گزار ہے۔ اس لیے کہ حقیقی شکر یہ ہے کہ انسان ہر نعمت کو اللہ کی جانب سے سمجھے اور عبادت میں خلوص رکھے اور اللہ کے سوا عطاء و عمل کی نعمت میں کسی غیر پر دھیان ہی نہ دے۔

اللہ ہی کو منعم جانے

حضرت علیؓ کی وصیت میں ہے:

اپنے اور اللہ کے درمیان کسی (غیر اللہ) کو منعم نہ سمجھو اور غیر اللہ کی نعمت کو اپنے اوپر قرض شمار کرو۔" اور اگر اس قسم کے آدمی نے یہ کہا کہ اگر اسے عطا کرے اور روزی دے تو اس کی مدح کرے۔ دیکھے تو اس کی حمد کرے تو اس نے اس کی حمد نہ کی جس نے اسے روزی دی اور غیر پر نظر رکھی اور عطا کے وقت جس کا ذکر چاہیے تھا اس کی بجائے غیر کا ذکر کیا۔ اس لیے کہ جو آدمی اللہ کی حمد و ثناء کرتا اس کا شکر کرتا ہے اور اس کی روزی پر اسے ہی یاد کرتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ منعم و معطی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اب وہ اسے قریب سے دیکھتا ہے۔ اللہ پر یہ یقین، دوسرے (غیر اللہ) کی دعا سے بہتر و نافع تر ہے۔ اس لیے کہ صاحبِ یقین کے فائدے کا اصل سبب وہی ذات تعالیٰ ہے وہی ذات تبارک و تعالیٰ

ایک چیز کو اپنے حقیقی مقام پر رکھنے والی ہے اور دوسرے آدمی کو جب دیکھتا ہے کہ وہ عطا کرنے والا ہے۔ تو اس کی مدح کرتا ہے۔ یہ لینے والے کے ضعفِ یقین کی علامت ہے۔ اس میں اگر جذبہ نصیحت اور خلقِ الٰہی کا کچھ حصہ بھی ہے تو یقین رکھے کہ اس مال خرچ کرنے والے پر اس کے ضعفِ یقین کی نحوست، اس کی دُعا سے بھی سخت تر ہے اور اگر اس پر خواہش کا غلبہ ہے اور آخرت میں آنے والے نفع سے جاہل ہے تو صدقہ کے باعث افضلیت کے مقابلہ میں مقامِ توحید میں خامی زیادہ خرابی و نقصان کا باعث ہے۔ اس لیے کہ یہ آدمی آخرت اور سزا و جزا پر دھیان نہیں رکھتا اور ایسے کلمات (مدح و دعا) کا طالب ہے جن کی وجہ سے اس کا عمل ہی باطل ہو جائے۔

مزید برآں اگر عطاء میں اس کی نظر عطا کرنے والے آدمی پر رہی تو منع میں بھی اسی خرابی میں مبتلا ہو گا کہ (فلاں نے نہیں دیا) چنانچہ اس کی غیبت کرنے لگ جائے گا اور صاحبِ یقین مشاہدہ کرنے والا ان سب امور میں مطمئن و مامون ہوتا ہے۔

ایک روایت میں ہے:

"صدقہ دراصل سائل کے ہاتھ میں پڑنے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں پڑتا ہے اور وہ تبارک و تعالےٰ خود سائل کے ہاتھ میں رکھتا ہے"۔ اس لیے صاحبِ یقین آدمی کو جاننا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے روزی لے رہا ہے۔ وہ اللہ کے بغیر کسی کی عبادت نہیں کرتا اور جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا۔ اس طرح اس سے مانگتا ہے۔ فرمایا:

فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ۔[1] (سو تم ڈھونڈو اللہ کے ہاں روزی اور اس کی بندگی کرو)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محتاج آدمی کو مال بھیجا اور قاصد کو فرمایا:

"جو وہ دعا کرے اسے یاد رکھنا"

جب اس نے اسے مال دیا تو اس نے دُعا دی:

الحمد لله الذی لا ینسی من ذکره ولا یضیع من شکرہٗ۔ (سب حمد اس اللہ کی ہے جو اسے فراموش نہیں کرتا جس نے اسے یاد کیا اور جو اسے ضائع نہیں کرتا جس نے اس کا شکر کیا)

پھر دعا کی:

---

[1] العنکبوت ۱۷

اے اللہ تو فلاں (یعنی اپنے آپ کے بارے میں کہا) کو نہیں بھولتا۔ اب فلاں کو ایسا کر دے کہ وہ بھی تجھے نہ بھولے۔ یعنی (اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ لَمْ تَنْسَ فُلَانًا فَاجْعَلْ فُلَانًا لَا یَنْسَاکَ۔

جناب رسول اللہ علیہ وسلم یہ سُن کر خوش ہُوئے اور فرمایا؛

"میں جان گیا تھا کہ وُہ یہی کہے گا۔"

حضرت عمر اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہما سے بھی حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہی کلمات مروی ہیں؛

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو فرمایا،

"توبہ کرو۔"

اس نے کہا؛

"میں اللہ کی طرف توبہ کرتا ہوں۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف توبہ نہیں کرتا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"حق سمجھ گیا۔"

واقعۂ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا،

"ہم اللہ کی حمد کرتے ہیں اور تیری حمد نہیں کرتے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر خوش ہُوئے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت کی آیات نازل ہُوئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛

"اٹھو، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر بوسہ دو۔"

انہوں نے جواب دیا؛

"اللہ کی قسم! میں یہ نہیں کروں گی۔ میں اللہ کے بغیر کسی کی حمد نہیں کرتی۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"اے ابوبکرؓ! اسے چھوڑ دو۔"

دُوسری روایت کے الفاظ ہیں:

حضرت عائشہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو کہا؛

"ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں اور نہ تیری حمد کرتے ہیں اور نہ تیرے صاحب کی حمد کرتے ہیں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا بلکہ اس پر آپؐ کو مسرت ہُوئی اور حضرت ابوبکرؓ کو ان سے رُک جانے کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کا وصف بیان کیا کہ جب تنہا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دلوں پر انقباض آجاتا ہے اور جب غیر اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ یعنی بتایا کہ جب توحید کا ذکر ہو تو کفار اس کو ناپسند کرتے ہیں اور غیر کو شریک بنایا جائے تو وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ فرمایا:

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ [1]

(اور جب نام لیجئے اللہ کا نرا، رک جائیں دل ان کے جو یقین نہیں رکھتے آخرت کا، اور جب نام لیجئے اس کے سوا اوروں کا، تب ہی وہ لگیں خوشیاں کرنے)

ایک جگہ فرمایا:

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ۔

(یہ تم پر اس واسطے کہ جب کسی نے پکارا اللہ کو اکیلا تو تم منکر ہوئے)

اور کفر کا مطلب ہے چھپانا۔

وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا۔

(اور جب اس کے ساتھ شریک پکارے تو تم یقین لانے لگے)

اور شرک کا معنی ہے اختلاط کرنا۔ یعنی اللہ کے ذکر کے ساتھ ذکر غیر کا اختلاط کیا جائے۔ پھر فرمایا:

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔

(پس حکم وہی جو کرے اللہ بزرگ برتر)

یعنی اس کے حکم میں مخلوق کو شریک نہ بناؤ۔ اس لیے کہ اپنی عظمت و لطافیت میں وہی بزرگ و برتر ہے، اس کے ملک و عطا میں اس کا شریک نہیں۔ کوئی بندہ اس کا مددگار نہیں (وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے) اس کلام سے ثابت ہوا کہ مومن بندے کا یہ حال ہے کہ جب توحید الٰہی کا ذکر ہو تو اسے قلبی فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے اور وہ ذکر اللہ و توحید خداوندی کے وقت خوش ہوتا ہے اور جب او اسط و اسباب کا ذکر کیا جائے تو یہ بات اسے بری لگتی ہے اور اس کا قلب انقباض محسوس کرتا ہے۔ یہ صحت کی علامت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قلب میں حقیقی توحید موجود ہے یا مخفی شرک پایا جا رہا ہے۔ اسے خوب سمجھ لو۔

بہتر یہ ہے کہ حسبِ استطاعت بہترین اور عمدہ ترین مال کا صدقہ کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک چیز ہی قبول فرماتا ہے اور جس قدر مال پاکیزہ و طیب ہوگا اور جس قدر افضل ترین مقام پر مال خرچ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا صدقہ اس قدر پاکیزہ اور زیادہ بڑھنے والا ہوگا۔

---

[1] المومن ۱۲

ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے صدقہ کو معمولی جانے۔ اس لیے کہ اسے بڑا خیال عُجب کی علامت ہے اور عُجب تمام اعمال کو برباد کرنے والا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ [1] (اور دن حنین کے جب اترائے تم اپنی کثرت پر)

مشائخ بتاتے ہیں کہ انسان جس قدر اپنے اعمال کو معمولی جانے، اللہ کے ہاں وہ اس قدر بڑے شمار ہوتے ہیں اور نافرمانی کو جس قدر بڑی سمجھے، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ اسی قدر معمولی بن جاتی ہے۔

بعض علماءؒ سے مروی ہے،

"نیکی تین باتوں سے مکمل ہوتی ہے:

۱۔ اسے معمولی جانے۔

۲۔ جلدی نیکی کا کام کرے۔

۳۔ اس کو پوشیدہ رکھے۔

سلف صالحین کا طریقہ تھا کہ زکوٰۃ میں اگر سینکڑوں ادا کرتے تو نفلی صدقات کے طور پر ہزاروں خیرات کرتے اور محتاج آدمی کو اس قدر مال عطا کرتے کہ وہ احتیاج سے نکل کر غنی بن جاتا اور اس کے پاس مال باقی بچ جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی ہے:

"بہترین صدقہ وہ ہے جو (حالتِ) غناء باقی رکھے۔"

یعنی محتاج کے لیے وقتی طور پر بھی کافی ہو اور دوسرے وقت میں اس کے استغناء کو قائم رکھے۔ بار بار نہ مانگنا پڑے بلکہ آئندہ مانگنے سے بچ جائے۔ گویا اس نے دوسرا عمل بھی کیا کہ عطا بھی کیا اور آئندہ سوال کی ذلت سے بچا بھی لیا۔ یہ حدیث کا ایک مفہوم ہے۔

اہلِ حاجت کی اقسام

اللہ تعالیٰ نے اہلِ حاجت کے پانچ اوصاف بیان کیے۔ فرمایا:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [2] (اور ان کے مالوں میں حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کا)

اور فرمایا:

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ [3] (پس کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ قناعت کرنے والے

---

[1] التوبۃ ۲۵۔

[2] الذٰریٰت ۱۹۔

وَ الْمُعْتَرَّ [1] اور بے قرار کو)

فرمایا:

فَكُلُوا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ [2] (سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال محتاج کو)

۱۔ سائل وُہ ہے جو ہاتھ پھیلا کر مانگے اور زبان سے اظہارِ سوال کر دے۔

۲۔ محروم وُہ ہے جس کے پاس روزی نہ ہو اور وہ روزی سے محروم ہو۔
ایک قول کے مطابق اس سے مراد وُہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ فن کسب ہو۔ گویا وُہ کمانے اور روزگار سے محروم ہو۔

۳۔ قانع وُہ ہے جو اپنے گھر میں بیٹھ جائے اور بن مانگ جو اللہ تعالیٰ اسے بھیجے اسے لے لے۔ ایک قول میں قناعت دراصل پیٹے وزاری کیے مانگنے کا وصف ہے۔ یعنی عفت وکف کا نام قناعت ہے جو کہ الحاف والحاح کی ضد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عفت رکھ کر مانگے۔

۴۔ مُعتر کا مطلب یہ ہے کہ جو مانگے مگر صراحت نہ کرے۔ ضرورت اسے مانگنے پر مجبور کر رے اور حیاء کی وجہ سے صراحت کے ساتھ کھلم کھلا نہ مانگے۔

۵۔ بائس سے مراد وُہ ہے جو تنگی و مصیبت کا شکار ہو۔ مرض، سردی یا کسی اور طرح کی گردشِ ایام میں مبتلا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فقراء اور مساکین کے درمیان باہمی فضیلت بھی دی۔

اہل علم کا فرمان ہے:
"فقیر وُہ ہے جو نہ مانگے اور مسکین سے مراد مانگنے والا ہے۔"

ایک قول یہ ہے:
"فقیر دراصل محارف کا نام ہے (جس سے روزی بھاگ جائے یعنی بے ہنر ہو) اور مسکین وُہ ہے جو گردشِ ایام کا شکار ہو جائے۔"

یہ لفظ سکون سے مشتق ہے یعنی اس کو فقر نے ساکن کر دیا اور اس کی حرکت ختم کر دی۔ کہا کرتے ہیں:

تمسکن الرجل (آدمی مسکین ہوا)۔
سُکنیٰ (جائے رہائش)۔

---

[1] الحج ۳۶۔
[2] الحج ۲۸۔

جیسے کہ کہا کرتے ہیں ،

ندرع اور ندرع - جبکہ وہ زرہ پہنے - اسی طرح فقیر ہے جبکہ سوال ہی اس کا لباس بن گیا - ان دونوں میں اہل لغت کا اختلاف ہے ۔

بعض کا فرمان ہے ؛

مسکین ، فقیر سے بھی خستہ حال ہوتا ہے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ [1]

(یا محتاج کو جو خاک میں رُلتا ہے)

یعنی مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور مشقت کے باعث مٹی سے جا لگے ۔ یعقوب بن سکیتؒ کا بھی قول ہے ۔ یوسف بن حبیبؒ کا رجحان اس طرف ہے ۔ فرمایا :

ایک بار میں نے ایک اعرابی کو پوچھا ؛

"کیا تو فقیر ہے ؟"

کہا " نہیں ، اللہ کی قسم ، بلکہ مسکین ہوں فقیر سے بھی خستہ حال ۔"

بعض اس کا دوسرا مطلب لیتے ہیں : ذا متربۃ یعنی غنا سے ۔ کہا کرتے ہیں ؛

اَتْرَبَ الرَّجُلُ یعنی وہ مال سے تراب آلود ہوا اور مستغنی ہو گیا ۔ مطلب یہ کہ وہ غنی تھا اور نعمتوں سے مالا مال تھا ۔ پھر محتاج ہو گیا ۔ یہ عطا کرنے کے زیادہ قابل اور بہتر ہے ۔

بعض اہل لغت ذا متربۃ میں بتاتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسکین زیادہ بدحال ہے ۔ کہا ؛ "جب اللہ تعالیٰ نے مسکین کی یہ صفت بیان کی تو معلوم ہُوا کہ ہر مسکین کی یہ صفت نہیں ہوتی ۔ دیکھو اگر تم کوئی کپڑا خریدو اور اس کا وصف جانو تو اس وصف کے ساتھ اس کپڑے کی تعریف کرتے ہوتے ۔ اس لیے کہ ہر کپڑے کا باس ہونا تو پہلے سے ہی معلوم ہے ۔ اس طرح ہر مسکین پر اس کی حالتِ مسکنت کا غلبہ ہے البتہ یہ مسکین دوسرے تمام مساکین سے بڑھ کر اور ان کے برعکس شدید مسکنت میں تھا ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ذا متربۃ کے ساتھ اس کا وصف بیان فرمایا ۔ اس مفہوم کے باعث عراقی فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ لمس سے مراد جماع ہے ۔ فرمایا ؛

فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ [2]

(پھر ٹٹولیں اس کو اپنے ہاتھ سے)

---

[1] البلد ۱۶ -

[2] انعام ۷ -

گا ہے لمس، ہاتھ کے بغیر ہوتی ہے یعنی جماع۔ جب فرمایا:
بِاَیْدِیْھِمْ (ہاتھوں کے ساتھ) تو یہ معنی مخصوص کیا کہ ہاتھ سے لمس اور علمائے مجاز میں سے جس نے
لمس سے مراد ہاتھ سے چھُونا لیا ہے اس طرح اس کا رد کیا۔

دوسروں کا فرمان ہے:
"بلکہ فقیر کا حال مسکین سے خراب ہے اس لیے کہ مسکین کے پاس کچھ تو ہوتا ہے اور فقیر کے پاس کچھ بھی
نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی والوں کے بارے میں فرمایا:
فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ [1] (سو تھی مساکین کی، محنت کرتے تھے دریا)
یہ بتایا کہ ان مساکین کے پاس کشتی تھی اور یہ کافی مالیت کی چیز ہے اور بتاتے ہیں کہ فقیر کو فقیر اس لیے
کہا جاتا ہے کہ حالتِ فقر انسان کی ریڑھ میں سے ایک فقرہ (کڑی) نکال دیتی ہے یعنی شدتِ فقر کے باعث
انسان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ فقار الظہر سے ماخوذ ہے۔ اصمعیؒ کا یہی قول ہے اور میرے نزدیک بھی یہ درست
ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن آٹھ اقسام کے لیے صدقہ جائز بتایا۔ ان میں سب سے پہلے فقراء کا ذکر کیا
اس سے معلوم ہُوا کہ فقیر ہی سب سے زیادہ محتاج اور سب سے افضل ہے۔

ایک جماعت کا فرمان ہے، کہ
"فقیر وہ ہوتا ہے جو فقر کے باعث صاف پہچانا جائے اور مسکین وُہ ہے کہ جس کی بدحالی کو سمجھا نہ جا سکے
اور پردہ داری کی وجہ سے لوگ اس کی (مدد) پرواہ نہ کریں۔"

ایک حدیث میں بھی آتا ہے،
"مسکین وہ نہیں جس کو ایک ٹکڑا، دو ٹکڑے، ایک کھجور اور دو کھجوریں ملیں بلکہ صاحبِ عفت مسکین وہ
ہے جو لوگوں سے نہ مانگے اور (لوگ) بھی اسے سمجھ نہ سکیں کہ اس پر صدقہ ہی کریں۔"
اسی طرح ایک دانا آدمی سے مروی ہے: ان سے پوچھا گیا،
"کون سی چیز شدید ترین ہے؟"
فرمایا:
"دولت مند کی صورت میں فقیر آدمی۔"
ایک دُوسرے حکیم سے پُوچھا گیا،

---

[1] الکہف ۔ ۷۹

"کیا چیز شدید تریں ہے؟"

فرمایا،

"جس کا مال ختم ہو جائے اور اس کی عادت باقی رہے۔"

فقہاء کا فرمان ہے:

"مسکین وہ ہے جس کا کچھ ذریعہ ہو مگر وہ اس سے زیادہ تر کا محتاج ہو۔ اس لیے کہ آمدنی قلیل ہے یا خاندان بڑا ہے۔"

حدیث میں بھی اس کا فقر مروی ہے اور اس کی فضیلت بھی آتی ہے۔ فرمایا،

"اللہ تعالیٰ صاحبِ عفت عیالدار فقیر کو پسند کرتا ہے اور لپیٹ کر مانگنے سے بغض رکھتا ہے۔"

صدقہ کس کو اور کس قدر؟

ایک حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ پیشہ ور مومن بندے کو پسند کرتا ہے" اور یہ تمام اقوال صحیح ہیں۔ چنانچہ افضل تربات یہ ہے کہ سب سے زیادہ محتاج اور سب سے زیادہ افضل آدمی کو زکوٰۃ ادا کرے، یعنی عالمِ ربانی، عبادت گزار اور اللہ کی عبادت میں مصروف ہونے والے، اہلِ دنیا سے الگ رہنے والے اور دنیاوی تجارت سے الگ ہو کر اخروی تجارت میں لگ جانے والوں پر صدقہ کرے۔ پھر عیالدار آدمی کا بقدرِ عیالداری درجہ ہے۔ منفرد آدمی کے مقابلہ میں عیالدار کا درجہ اس لیے زیادہ ہے کہ وہ ایک جماعت ہے اور جماعت پر صدقہ ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل بیت کو دس دس سے زیادہ بکریاں ایک دم دے دیتے۔ حدیث میں بھی ایسے ہی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ،

"آپ بقدرِ خاندان عطاء فرماتے تھے۔ تنہا آدمی کے مقابلہ میں عیالدار کو دوچند عطا فرماتے اور ہر آدمی کو اس کے اہلِ خانہ کے مطابق عطا فرماتے تھے۔"

اس گروہ میں سے ایک بزرگ سے منقول ہے۔ فرمایا،

"ہم نے ایسی اقوام کے ساتھ مصاحبت کی۔ وہ ہم پر ہزاروں کے حساب سے احسان کرتے۔ وہ ختم ہو گئے۔ ان کے بعد دوسرے لوگ آئے۔ ان کا احسان سینکڑوں کے حساب سے ہوتا۔ اب ایسی قوم سے ہمارا واسطہ آن پڑا کہ جن کا احسان (صدقہ) دانیوں کے حساب سے ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ ان سے بدتر لوگ

نہ آسایا ہیں۔"

بعض سلف ؒ سے مروی ہے :

"ہم نے ایسی اقوام دیکھیں جو عمل کرتی تھیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ ایسی قوم نہ آجائے جو کرے نہیں اور صرف باتیں کرے۔" اور اگر کوئی صاحبِ عیال مسکین آدمی ہو اور دیندار بھی ہو تو یہ اہلِ تقوٰی کے لیے غنیمت اور خرچ کرنے والوں کے لیے باعثِ ذخیرہ ہے۔ ایسے آدمی پر صدقہ کرنا حقیقی صدقہ و نیکی ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ابتلاء کی مشقت کے بارے میں پوچھا گیا "وہ کیا ہے ؟"

فرمایا: "کثرتِ عیال اور کمیٔ مال۔"

ایک روایت میں ہے :

"صرف پرہیز گار کا کھانا کھاؤ اور تیرا کھانا بھی صرف پرہیز گار ہی کھائے۔" اس لیے کہ پرہیز گار آدمی اس کے ذریعہ نیکی و تقوٰی پر مدد حاصل کرتا ہے چنانچہ وہ نیت میں اس کو بھی شریک کرتا ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے :

"اپنا کھانا اتقیاء کو اور اپنے اصحابِ معروف مومنین کو کھلاؤ۔"

دوسرے الفاظ یہ مروی ہیں :

"اپنے کھانے پر صرف اسے مہمان بناکر جس سے تُو اللہ کی خاطر محبت رکھتا ہے۔"

ایک صاحبِ یقین آدمی کو چاہیے کہ متقی آدمی اگر اس کا صدقہ و احسان قبول کرے تو مسرت و فرحت پائے۔ اس لیے کہ یہ اس کا عمل ہے۔ اگر اللہ تعالٰی اور اس کے احکام کا عارف آدمی اس کا صدقہ قبول نہ کرے تو اس کے رد کرنے سے اسے غم ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ صدقہ اللہ تعالٰی نے گویا رد کر دیا۔

اگر اس نے کسی فقیر کو کچھ دیا اور اس نے واپس کر دیا۔ اس کی وجہ سے اس کی نظر میں فقیر کا درجہ بڑا ہو گیا۔ تو یہ بات عطا کرنے والے کی رب تعالٰی سے جہالت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ لے لیتا تو اس کی نظر میں فقیر کا درجہ گر جاتا۔ اسے چاہیے کہ اس مال کو پوشیدہ طور پر کسی محتاج تر آدمی کے پاس بھیج دے۔ ایسا کرنا افضل بات ہے۔

اور اگر فقیر آدمی اس کا صدقہ واپس کر دے اور اس کو غم نہ ہو یا ایسا ہونے پر مسرت ہو تو یہ بات صدقہ کرنے اور صدقہ میں کمی اخلاص کے باعث ضعفِ نیت ثابت کرتی ہے۔ اس لیے کہ صادق دینے والا آدمی وہ ہے کہ صدقہ واپس ہونے پر اسے غم لاحق ہو جائے۔

بہتر یہ ہے کہ اگر فقیر اس کا صدقہ واپس کر دے تو اس مال کا مالک نہ بنے بلکہ کسی دوسرے فقیر کو دے دے۔

اس لیے کہ وہ اس مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکال چکا۔ اب اس میں رجوع نہیں ہونا چاہیے اور عطیہ میں فقراء شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اگر اس نے صدقہ کا مال الگ کیا کہ متعین طور پر فلاں فقیر کو دوں گا۔ پھر کسی دوسرے سے ملاقات ہو گئی جو متعین سے افضل یا محتاج تر ہے۔ یا جس کا اس پر حق تھا۔ وُہ ملا تو اگر مال قبضہ سے نہیں نکالا یا صرف وعدہ ہی کر رکھا تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس افضل یا محتاج تر کو دے دے۔ اس میں کچھ حرج نہیں اور اس طرح اگر وہ کسی کے ذریعہ فقیر کو کچھ اعانت بھیجے۔ پھر دل میں کسی دُوسرے کو قابل ترجیح سمجھے تو اسے اجازت ہے کہ مامور سے وہ مال واپس لے کر زیادہ بہتر کو دے دے بشرطیکہ وُہ اسے نافذ نہیں کر چکا یا لینے والے (فقیر) کو اس کی اطلاع نہیں دے چکا۔

اگر ایک عارف اس کا مال قبول کرے تو اسے اپنے حق میں بشارت سمجھے۔ اس لیے کہ یہ اس کے علم کے باعث اللہ کی جانب سے قبول ہُوا کیونکہ عالم ربانی اور ایام اللہ سے آگاہ آدمی تمام افعال اللہ کی جانب سے (انقار ہونے کے بعد) کرتا ہے جیسے کہ اس کا کلام بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس کا قبول ورد اس کے غیر کے قبول ورد کی طرح نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ غیر کی بجائے اسے اللہ کی جانب سے مشاہدہ اعلیٰ ترین وقوی ترین ہوتا ہے اور یہی آدمی توفیق وعصمت کے قریب تر ہے۔

ایک بھائی (بزرگ) فرماتے ہیں:

"ایک فقیر نے ایک غنی کا عطیہ واپس کر دیا۔ وُہ رونے لگا۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا:

"کیا یہ میرا عمل نہیں جو مجھ پر واپس کیا گیا!"

اُن سے کہا گیا کہ دُوسرا تو قبول کر لیتا ہے۔

فرمایا: اس عین جیسا میرے واسطے کہاں!

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ اس لیے ایک مومن ہمیشہ نظرِ یقین سے اور نورِ الٰہی کے ساتھ ہی دیکھتا ہے۔

چنانچہ اس نے منجانب اللہ واپس کر دیا۔

وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ۔[1]

(اور پہنچتی ہے گواہی اس کو اس سے)

اور جاہل آدمی اپنی خواہش کے ساتھ تصرف کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا واپس کرنا اور قبول کرنا برابر ہے۔ اور عارف آدمی اگر لیتا ہے تو رب تعالیٰ کے حکم پر لیتا ہے اور اگر واپس کرتا ہے تو بھی منجانب اللہ واپس کرتا ہے اور انسان پر لازم ہے کہ اگر عطیہ قبول کرے تو اس کی نظر میں لینے والے کی عظمت ورعب بڑھ جائے۔ اس لیے کہ اس نے اسے نیک کام پر مدد دی۔ اس کا عطیہ قبول کر کے عملِ خیر میں تعاون کیا۔ اس لیے اس بات کو اللہ کی جانب سے احسان ونظرِ کرم سمجھے۔

---

[1] ہود - ۱۷

انسان کو چاہیے کہ محتاج فقراء اور اتقیاء کی تلاش کرے۔ اس طرح وہ علمی مقصود تک رسائی حاصل کر سکے گا۔ اگر اس کی اپنی فراست و علم کم ہو تو دوسرے کے فہم و علم سے تعاون حاصل کرے۔ عارف اور صاحبِ نظر آدمی سے مدد حاصل کرے۔ علمائے دنیا سے دُور رہے اور پختہ ایمان والے علمائے آخرت سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس لیے کہ دنیا میں صرف علمائے آخرت ہی پرہیزگار اور زاہد ہیں کیونکہ دنیا کی محبت میں بہت لوگ برباد ہُوئے۔ صرف علمائے آخرت کو ہی نجات حاصل ہُوئی۔ دنیا میں کمی کرنے والے اور پختہ کار علماء ہی آلائشِ دنیا سے بچ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ ۔[1] (اور اپنا دل ثابت کر کر)

یعنی یقین کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے صدقات میں پختہ ہوتے ہیں اور صرف مقامِ یقین پر ہی خرچ کرتے ہیں۔ جہاں انہیں قلبی اطمینان و سکون ہوتا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک صرف صوفی فقراء ہی صدقہ کے لیے قابلِ ترجیح ہے۔ ان سے پُوچھا گیا،

"کاش! آپ عام فقراء پر صدقہ کرتے ؟"

فرمایا، "میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا بلکہ میں دُوسروں پر انہی فقراء صوفیاء کو ہی ترجیح دوں گا۔"

پوچھا گیا، "وہ کیوں ؟"

فرمایا، "اس لیے ان کو صرف اللہ کا ہی فکر ہے۔ جب ان پر فقر و فاقہ آتا ہے تو ان کو فکری پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ اب اگر میں ایک ہزار ایسے آدمی کو دوں جن کو صرف دنیا کا فکر ہے۔ ان کی بجائے ایک ہی کو دوں جس کو صرف اللہ کا فکر ہے تو یہ بہتر ہے"۔ حضرت ابوالقاسم جنیدؒ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے اسے خوب سمجھا اور فرمایا،

"یہ کسی اللہ کے ایک ولی کا کلام ہے !"

پھر فرمایا،

"میں نے ایک مدت دراز سے اس سے اعلیٰ ترین کلام نہیں سنا !"

بتاتے ہیں کہ ایک آدمی کو دکان چھوڑنے کا خیال پیدا ہُوا۔ اس لیے کہ دکانداری کی وجہ سے اس کے حالِ (سلوک) میں کچھ خرابی آنے لگی تھی۔ وہ اپنا مال لے کر حضرت جنید کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا،

---

[1] البقرہ ۲۶۵

"اسے اپنے مالِ تجارت میں لگاؤ اور دکانداری نہ چھوڑو۔ اس لیے کہ تیرے جیسے آدمی کے لیے تجارت نقصان دہ نہیں۔"

بتاتے ہیں کہ یہ ایک سبزی فروش تھا اور فقراء سے اشیاء کی قیمت نہ لیتا تھا۔

حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ خصوصیت کے ساتھ علماء کو عطیات دیا کرتے۔ کسی نے کہا،

"کاش آپ دوسروں کو دیا کریں!"

فرمایا: "مقامِ نبوت کے بعد میں مقامِ علماء سے زیادہ افضل مقام نہیں دیکھتا۔ اب اگر ایک عالم کا قلب کسی ضرورت یا خاندانی حاجات پر تنگ ہو جائے تو وہ نہ علم کی خدمت کر سکتا ہے اور نہ ہی لوگوں کو اطمینان سے تعلیم دے سکتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کی مدد کروں اور ان کی ضروریات پوری کر کے انہیں علم حاصل کرنے کے لیے قلبی فراغت دوں اور لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے سکون حاصل کرنے میں مدد دوں۔ یہی سلف صالحین کا طریق ہے۔"

کسی بندے کو افضل ترین مقام پر مال خرچ کرنے کی توفیق نصیب ہونا ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو یہ توفیق بخشے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کو اپنے حلال مال سے کھانا کھلائے اور جیسے چاہے اپنی قدرت کے ساتھ اس پر علم کی نوازشات کرے۔

اسلام کے چوتھے رکن، روزے کا بیان

روزے کے فرائض یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس پر [illegible] رکھنا لازم [illegible] نے [illegible] کے [illegible] خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور خلوص کا [illegible] بھی یہی [illegible]۔ روزہ یہ ہے کہ طلوعِ فجر صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور جماع سے پرہیز رکھے اور دن کے اوقات میں روزہ توڑنے کا ارادہ نہ کرے۔

روزہ اور روزہ داروں کے فضائل

خواص کا روزہ یہ ہے کہ چھ اعضاء کی حفاظت کرے۔ نگاہیں نیچی رکھے اور دُور تک نظر نہ پھیلائے، حرام آواز نہ سنے۔ نہ گناہ کی طرف میلان کرے۔ اہلِ باطل کے پاس نہ بیٹھے۔ لایعنی اور بے کار باتوں میں زبان نہ چلائے۔ یعنی ایسا کلام نہ کرے کہ اگر لکھا جائے تو اس کے سر پر بوجھ بن جائے۔ اور اگر اسے محفوظ رکھا جائے تو فائدہ نہ دے۔ ایسے لایعنی امور کی طرف دل سے توجہ بھی نہ کرے بلکہ ان کے خیال کو بھی کاٹ دے۔

غیر مناسب کام کی تمنا کرنا بھی چھوڑ دے۔ حرام کام اور فحاشی کی بات سے ہاتھ روک لے۔ غیر مامور اور غیر مندوب کاموں میں ایک قدم بھی نہ اٹھائے۔

جس نے ان چھ اعضاء کی حفاظت کر کے روزہ رکھا اور دو اعضاء یعنی کھانے پینے کے ساتھ افطار کیا اور پھر چاہے جماع بھی کر لیا تو یہ روزہ اللہ تعالیٰ کے ہاں افضل ہے۔ اس لیے کہ ایسا آدمی حدود اللہ کی حفاظت کرنے والا اور صاحبِ یقین آدمی ہے۔

جس نے ان چھ یا ان میں سے بعض کے ساتھ روزہ رکھا اور دو اعضاء بطن و فرج کے ساتھ افطار کیا تو اس نے ضائع زیادہ کیا اور بچایا کم۔ یہ آدمی اگرچہ اپنے تئیں روزہ دار ہے مگر علماء کے نزدیک یہ افطار کی حالت میں ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا:

"آہ، اکیاس کی نیند بھی کیا خوب ہے۔ وہ احمقوں کے قیام و صیام کو کیسا معیوب کرتے ہیں؟ اور فریب زدہ لوگوں کی پہاڑوں جیسی عبادت سے تقویٰ کا ایک ذرّہ بھی افضل ہے۔"

جس نے طعام و جماع کے ساتھ افطار کیا اور اعضاء کو ممنوعات سے روکا۔ وہ ایسے ہے جیسے کہ اس نے ایک ایک ہر عضو دھویا اور نماز پڑھی۔ یہ افضلیت کا تارک ہے البتہ حسنِ عمل کے باعث فرض ادا ہو گیا۔ اصل احکام کی وجہ سے اس کی نماز قبول ہوئی۔ فضیلت میں وہ روزہ دار اور وسعت میں وہ افطار کرنے والا ہے۔

جس نے طعام و جماع سے روزہ رکھا اور ہر قسم کے گناہوں سے ان چھ اعضاء کو بچایا۔ اس نے گویا ہر عضو کو تین تین بار دھویا۔ اس نے فرض اور فضیلت سب حاصل کر لی۔ اس نے امر و مندوب کو مکمل کیا۔ علماءٔ کے نزدیک یہ آدمی اہلِ احسان و صوم میں سے ہے۔ کتاب اللہ میں جن روزہ داروں کی مدح آئی اور جن کو اولی الالباب فرمایا گیا۔ یہ آدمی ان میں سے ہے۔

افضل روزہ یہ ہے کہ مشتبہ اور زاید قسم کے حلال مزوں میں بھی ان اعضاء کو نہ ڈالے۔ عادات کی داعی شہوات کو دُور رکھے۔ صرف قلیل مقدار میں حلال پر افطار کرے۔ اس طریق سے روزہ کا تقدس بڑھے گا۔ روزے کی حالت میں بیوی کو بوسہ نہ دے نہ ہی اس کے ظاہری بدن کے ساتھ بدن ملائے اگرچہ ایسا کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر درجہ میں کمی آجاتی ہے۔ اگر جذبات پر قابو رکھ سکتا ہو تو الگ بات ہے ورنہ ان کاموں سے پرہیز کرنا افضل ہے۔ دن کو کم سوئے اور روزہ کی حالت میں کثرت سے اذکار کرتا رہے اور بھوک و پیاس کا مزہ بھی چکھتا رہے۔

سلف صالحین دو یا تین کھجوریں، کشمش کے چند دانوں اور پانی کے ایک گھونٹ سے سحری کیا کرتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے کہ سحری کی برکات حاصل کرنے کی خاطر چوپائے کا ایک بال دانتوں کی نوک سے چبا لیتے۔

ذکر اللہ کی کثرت کرے اور مخلوق کا ذکر کم کر دے۔ دنیا کا اہتمام ختم کر دے تاکہ روزہ کامل طور پر پاکیزہ روزہ بن جائے۔ کسی سے جنگ وجدال نہ کرے۔ نہ گالی گلوچ کرے۔ اگر کوئی اسے گالی دے یا مارے تو روزے کے احترام میں انتقام بھی نہ لے اور وقت آنے سے پہلے ہی رات کے کھانے کا اہتمام شروع نہ کر دے۔

فرماتے ہیں کہ "اگر وقت آنے سے پہلے ہی یا دن کے پہلے حصہ میں روزہ دار رات کے کھانے کا اہتمام شروع کر دے تو اس پر ایک گناہ لکھا جاتا ہے۔" اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑا سا جو بھی قسمت میں لکھا ہے اس سے افطار کرے اور راضی رہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا خوب شکر کرے۔"

کھانے پینے میں کمی کرنا، افطار میں جلدی کرنا، تاخیر کر کے سحری کھانا بھی باعثِ فضیلت ہے۔ اگر ممکن ہو تو تازہ کھجور سے ورنہ خشک کھجور سے روزہ کھولے۔ اس میں برکت ہے یا پانی کا ایک گھونٹ پی کر افطار کرے یہ پاک کرنے والا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی حکم مروی ہے کہ نماز پڑھنے سے پہلے پانی کے ایک گھونٹ یا دودھ کے ایک چسکہ (گھونٹ) یا چند کھجوروں سے روزہ کھولے۔

ایک حدیث میں ہے:

"کئی روزہ دار ایسے ہیں کہ جن کو روزہ سے صرف بھوک و پیاس کا ہی حصہ ملا۔" اس سے مراد وہ روزہ ہے کہ دن کو روزہ رکھے اور حرام کھانے سے افطار کرے۔" ایک قول میں یہ تشریح کی گئی کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو حلال کھانے سے روزہ رکھے اور غیبت کر کر کے لوگوں کا گوشت کھا کر افطار کرے۔ ایک قول میں بتایا گیا کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو نظر نہ بچائے اور لوگوں سے زبان کی حفاظت نہ کرے۔

بتاتے ہیں کہ روزہ کی حالت میں کسی گھڑی جب بندہ جھوٹ بولتا ہے یا غیبت کرتا ہے یا کسی گناہ کے کام میں لگتا ہے تو اس کا روزہ پھٹ پھٹ جاتا ہے اور اس کا ایک دن کا روزہ، کئی روزوں کی مختلف ساعتوں پر رکھ کر انہیں مکمل کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

"روزہ ڈھال ہے۔ جب تک کہ اسے جھوٹ یا غیبت کے ذریعہ چھوڑ نہ دیا جائے۔"

سلف فرمایا کرتے:

"غیبت سے روزہ ختم ہوجاتا ہے اور مسلمان کو تکلیف پہنچ جاتی تو وہ وضو کرتے تھے۔"
جس کھانے کو آگ نے چھوا ہو (آگ پر پکا ہو) اس کھانے کے بعد وضو کے بارے میں ایک جماعتِ سلف سے مروی ہے:
"ایک ناپاک کلمہ کے بعد وضو کرنا مجھے پاک و حلال کھانے کے بعد وضو کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔"
حضرت بشر ابن حارث نے حضرت سفیان رضی اللہ عنہم سے نقل کیا:
"جس نے غیبت کی اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔"
حضرت لیث نے حضرت مجاہد سے نقل کیا:
"دو باتیں روزہ توڑ دیتی ہیں:
۱۔ غیبت کرنا
۲۔ جھوٹ بولنا۔"
حضرت جابر نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:
"پانچ سے روزہ جاتا رہتا ہے:
جھوٹ، غیبت، چغلی، جھوٹی قسم اور شہوت کے ساتھ دیکھنا۔"
بتاتے ہیں کہ بعض لوگوں کا ایک ماہِ رمضان دس رمضان کے مہینوں اور بیس رمضان کے مہینوں کے ذریعہ مکمل ہوتا ہے جیسے کہ نماز اور زکوٰۃ اور دوسرے فرائض کہ جن کی وجہ سے بندے پر محاسبہ ہوگا۔ اگر یہ (نمازیں وغیرہ) مکمل ہوجائیں تو ٹھیک ورنہ انہیں نوافل کے ذریعہ مکمل کیا جائے گا۔
بتاتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ ہیں کہ جن کا ایک روزہ پانچ دنوں کے ساتھ مکمل ہوتا ہے جیسے کہ ایک نماز پانچ نمازوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے جن کے لیے اوقات مقرر تھے۔
ایک روایت میں ہے:
"جس نے غیبت کی اس نے اپنے روزے کو پھاڑ دیا۔ اسے چاہیے کہ استغفار کر کے روزہ کی پھٹن کی مرمت کرلے۔"
بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی فرض نہیں کی کہ اس کے بغیر دوسرے کے ساتھ راضی ہوا ہو اور جو فرض کیا اس کا مطالبہ کرے گا اور جو لازم کیا اس پر محاسبہ کرے گا اور اکثر گناہوں کو اللہ تعالیٰ کا عفو ختم کر دیتا ہے۔
روزہ کا مقصود صرف بھوک پیاس اٹھانا نہیں بلکہ گناہوں سے پرہیز کرنا مراد ہے جیسے کہ نماز کا حکم دیا

تو بتایا کہ اس کا مقصود فحاشی اور برائی سے بچنا ہے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے۔"

اسلام کے پانچویں رکن، حج کا بیان

حج کے فرائض

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا [1]

(اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر، حج کرنا اس گھر کا جو کوئی پاوے اس تک راہ)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زادِ راہ اور سواری ہونا اس کی تشریح بتانا۔ جب آدمی کے پاس زادِ راہ اور سواری ہو تو اس پر حج کرنا لازم ہے اور اگر اس قدر استطاعت کے بعد حج میں تاخیر کرے تو مکروہ ہے۔ اگر مر جائے اور حج نہ کرے یا اس کے پائے جانے کے بعد عدمِ امکان پر مر جائے تو روزِ موت تک اسی امکان کے پائے جانے کے بعد سے اللہ کا نافرمان شمار ہوا اور اس کا اسلام کامل نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کے ذریعہ اسلام کو مکمل کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے عرفہ کے روز حج کے موقعہ پر یہ آیت نازل فرمائی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [2]

(آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے دین مسلمانی)

حدیث میں ہے:

"جس کو ایک قاطع مرض یا ظالم بادشاہ حج سے نہ روکے مر جائے۔ اور حج نہ کرے تو (اللہ کو) پرواہ نہیں کہ وہ یہودی مرے یا عیسائی مرے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"جو لوگ حج کی استطاعت رکھتے ہوں میں نے ان پر جزیہ لگانے کا ارادہ کیا ہے۔"

حضرت سعید بن جبیرؒ، ابراہیم نخعیؒ، مجاہدؒ اور طاؤسؒ سے مروی ہے:

"اگر تو جانے کہ ایک آدمی دولت مند ہے اور اس پر حج فرض ہے۔ پھر وہ حج کیے بغیر مر جائے تو اس کا

---

[1] آل عمران آیت ۹۷

[2] المائدہ آیت ۳

جنازہ نہ پڑھو۔"

بعض سلفؒ ایسے بھی گزرے ہیں کہ جس کا تنگ حال پڑوسی تھا اور اس نے حج نہیں کیا تو بھی اس کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے۔

حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے،

"جو آدمی اس حالت میں مر جائے کہ نہ اس نے زکوٰۃ دی اور نہ اس نے حج کیا تو وہ دنیا میں دوبارہ واپسی کی درخواست کرے گا۔"

قرآن مجید میں ہے،

قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ ۔[1] (کہا اے رب مجھ کو پھر بھیجو شاید میں کچھ بھلا کام کروں جو پیچھے چھوڑ آیا)

یعنی میں حج کروں گا جو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا،

فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۔[2] (تب کہے اے رب کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو ایک تھوڑی مدت، پھر میں خیرات کرتا اور ہوتا نیک لوگوں میں سے)

فرمایا، یعنی میں زکوٰۃ دوں گا اور حج کروں گا۔

فرمایا کرتے تھے،

یہ اہل توحید پر سخت تر آیت ہے جو آدمی چلنے پر قدرت رکھتا ہو یا مزدوری دے کر سواری لے سکتا ہو۔ راستہ پُرامن ہو اور ہلاکت کا خطرہ نہ ہو تو اس کے لیے حج کرنا فضیلت کی بات ہے۔

پیدل چل کر حج کرنے والے کو ایک ایک قدم پر سات سو نیکیاں ملتی ہیں۔ سوار کو سواری کے ہر قدم پر ستر ستر نیکیاں ملتی ہیں اور علماء کے نزدیک چل سکنا بھی استطاعت میں داخل ہے۔

تمام علماء کے نزدیک حج میں چھ فرائض ہیں۔ تین میں اختلاف ہے یعنی سعی کرنے، شب نحر کو مشعر کے پاس مزدلفہ میں رات گزارنے اور نحر کے دن جمرہ عقبہ کو رمی کرنا ان میں اختلاف ہے۔ تین پر اجماع ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ احرام باندھنا۔

---

[1] المومنون ۹۹۔

[2] المنافقون ۱۰۔

۲۔ عرفات کے میدان میں ٹھہرنا ۔
۳۔ طوافِ زیارت ۔
ان کے علاوہ امور بالاتفاق سنت اور مندوب ہے۔
اس مسئلہ میں میرا مذہب۔ اور بیشتر علماء کا مذہب یہ ہے کہ حج کے چار فرائض ہیں :
۱۔ احرام باندھنا
۲۔ روزِ عرفہ کو زوالِ آفتاب کے بعد میدانِ عرفات میں وقوف کرنا ۔
۳۔ اور روزِ نحر کو طلوعِ فجر سے پہلے وقوف کرنے کی آخری انتہا ہے ۔
۴۔ عرفات میں وقوف کرنے اور جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد طوافِ زیارت ۔

حج کا احرام باندھ کر چاہے تو وقوفِ عرفات سے پہلے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے اور چاہے تو بعد میں سعی کرلے۔ ان کے علاوہ دوسرے مناسک سنت و مستحب ہیں ۔ بعض زیادہ موکد ہیں اور بعض کم۔ ان میں بعض کے ترک پر کفارہ لازم آتا ہے اور بعض کو ترک کرنے میں کچھ حرج نہیں۔

حج میں تین طواف ہوتے ہیں :
ایک طواف فرض ہے ۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو حج باطل ہوگیا ۔ یہ طوافِ زیارت ہے۔
ایک طواف سنت ہے ۔ یہ طوافِ وداع ہے اگر اسے چھوڑ دیا تو اس پر ایک دم (قربانی) لازم ہے اور اس کا حج مکمل ہے ۔
ایک طواف مستحب ہے ۔ یہ طوافِ ورود ہے ۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو کچھ چیز لازم نہ ہوگی۔ ہم نے حج کے فرائض واحکام اور اس کا طریقہ صرف اس قدر ذکر کیا ہے جو اس بحث کے لیے ضروری ہے ۔
احکامِ حج کے سلسلہ میں ہم نے کافی توضیح کر دی ہے۔ حجِ مفرد کے مناسک کے بارے میں ایک شاعر کا قول ہے ۔

حج اور حجاج کے فضائل

حج میں ممنوع کام

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :
اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ[1]
(حج کے کئی مہینے ہیں معلوم ، پھر جس نے لازم کر لیا ان میں حج)

---
[1] البقرہ - ۱۹۷

یعنی جو اپنے آپ پر ان مہینوں میں حج لازم کر کے اس کا احرام باندھ لے۔ یہ مہینے شوال، ذی قعدہ کے اور نو دن ذی الحجہ کے ہیں تو

فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔ (تو بے پردہ نہیں ہونا عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج میں)

الرفث دراصل لغویات، مغلظات بکنا، عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور جماع کی باتیں کرنا ان سب کا یہ جامع نام ہے۔ اور الفسوق، فسق کی جمع ہے۔ یہ اطاعت سے ہر قسم کے خروج اور حدود اللہ کے سلسلہ میں ہر زیادتی کا جامع نام ہے۔ اور الجدال دراصل بغض وعناد اور ریاکاری کا مبالغہ آمیز وصف ہے کہ جس سے بغض پیدا ہوتا ہے اور جس میں کچھ فائدہ بھی نہیں ہے۔ یہ تینوں نام مختصر اور جامع ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مناسکِ حج کو ان سب سے پاک رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ امور گناہوں اور نافرمانیوں کی اصل جڑ ہیں۔

لغت میں حج سے مراد ہے، "جس کی تعظیم کی جائے اس کی طرف قصد کرنا"

عرب کہا کرتے ہیں؛

نحج الی النعمان - یعنی ہم اس کی عظمت وعزت کرتے ہوئے اس کا قصد کرتے ہیں۔ حاجی کو چاہیے کہ جس کا قصد کر رہا ہے یعنی حج کر رہا ہے اس کی عظمت کا خاص دھیان رکھے۔ یعنی اس نام کے مفہوم کا خوب خیال رکھے۔

حج کا ایک مطلب یہ ہے، "ایسی صاف راہ پر چلنا جو انسان کو منزلِ مقصود تک لے جائے اور فائدہ سے ہمکنار کر دے۔"

المحجة سے بمنزلہ نسک کے مشتق ہے اور یہ راستہ کا نام ہے جو منسک سے مشتق ہے۔ یہ اسمائے طریق سے ہے۔ اگرچہ اس کا اصل مذبح آتا ہے اور الناسک کا نام بھی یہیں سے ہے۔ اس کے ناسک آدمی راہِ آخرت پر چلنے والا ہے۔

آدابِ حج

حج میں پہلا افضل کام یہ ہے کہ خالص اللہ کی خاطر حج کرے۔ اس کا مال حلال ہو۔ قلبی مشغولیت اور فکری پریشانی پیدا کرنے والی ہر تجارت سے علیحدہ ہو۔ بس اس کا ایک فکر ہو کہ حج کروں۔ اس کا دل مطمئن اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو۔ ہر خواہش سے دور سامنے نظر رہے اور پیچھے کی طرف دھیان نہ جائے۔ نیت درست ہو۔ مال خرچ کرنے میں طبیعت کو خوشی ہو۔ خرچ اور زادِ راہ فراوانی سے ہو۔ اس لیے کہ حج کے سفر میں خرچ کرنا ایسے ہے جیسے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے ایک درہم کے سات صد ملتے ہیں اور حج بھی اللہ کی راہ میں ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا

مفہوم مروی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ وغیرہ فرماتے ہیں :

"آدمی کی بزرگی اس میں ہے کہ سفرِ حج میں عمدہ زادِ راہ ہو۔"

فرمایا کرتے ،

"افضل ترین حاجی وُہ ہے جس کی نیت سب سے زیادہ خالص ہو۔ اس کا سفر خرچ سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اور اس کا یقین سب سے بہتر ہو۔"

حضرت ابن منکدرؒ نے حضرت جابرؓ سے، انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"حجِ مبرور کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔" (یعنی جنت ضرور ملے گی)

فرمایا :

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا گیا :

"حج کی نیکی (برالحج) کیا ہے؟"

فرمایا : "پاکیزہ کلام اور کھانا کھلانا۔"

مشائخ بتاتے ہیں کہ اس کو سفرِ (حج) اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی اخلاق کو پاک صاف اور روشن کرتا ہے۔ بعض کا فرمان ہے،

"نفسانی صفات و جوہر کو روشن و صاف کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ضروری نہیں کہ حضر میں جس کی صحبت اچھی ہو تو سفر میں بھی اس کی رفاقت اچھی ہو۔"

ایک آدمی نے بتایا کہ میں فلاں کو جانتا ہوں۔

پوچھا : "کیا تو نے اس کے ہمراہ سفر کیا ہے کہ اس کے اعلیٰ اخلاق کو معلوم کیا ہو؟"

کہا : "نہیں"۔

فرمایا : "پھر میں نہیں سمجھتا کہ تم اسے جانتے ہوگے۔"

حج کے سفر میں نہ جھگڑا کرے، نہ عداوت کا مظاہرہ کرے، نہ ریاکاری کرے، نہ فخر کرے اور نہ زبان سے فحش کلامی کرے۔

حضرت بشر بن حارث سے منقول ہے۔ فرمایا کہ حضرت سفیانؓ نے فرمایا :

"جس نے رفث (بیہودہ کام و کلام) کیا۔ اس کا حج فاسد ہو گیا۔"

مناسکِ حج کے احکام اور حج کے طریقے سے خوب واقفیت حاصل کرے اور گھر سے نکلنے سے پہلے

ہی ان مقامات کے آداب کو سیکھ لے۔ تمام اسبابِ سفر پر ان چیزوں کو مقدم اور اہم رکھے۔ اس لیے کہ اصل مقصود یہی ہیں اور بہتر یہ ہے کہ کسی عالم کی رفاقت میں حج کرے جو نیک ہو۔ عبادت گزار ہو اور اس کی مدد کرتا رہے۔ اگر بھول جائے تو اس کو یاد کرائے۔ اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد کرے۔ اگر یہ بزدلی دکھائے تو اسے دلاسا دے۔ اگر یہ عاجز آجائے تو اسے ہمت دلائے۔ اگر اسے بدظنی اور انقباض ہو تو اسے حسنِ صبر اور صبر و وسعتِ سینہ کی تلقین کرے۔ اپنے رفیقِ سفر سے خواہ مخواہ اختلاف نہ کرے، زیادہ اعتراضات بھی نہ کرے۔ سب لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق اور نرمی سے پیش آئے۔ مخلوق کو تکلیف نہ دے۔ ان کی ایذا پر صبر کرے۔ ان طریقوں پر چل کر حج کی فضیلت مل سکتی ہے۔ کجاوے پر یا پیچھے سوار ہو کر حج کرے۔ اس لیے سلف صالحین اور اصحابِ تقویٰ کا یہی طریقِ حج ہے۔ فرمایا کرتے ہیں،

"ابرار کا حج رحال پر ہوتا ہے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں۔ فرمایا:

میں حج کے ارادہ سے کوفہ سے نکل کر قادسیہ کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے کئی شہروں کے احباب کو دیکھا تو تمام حجاج کو باربرداری کے جانوروں اور بوریاں لدے جانوروں اور کجاووں پہ دیکھا، اور سب محملوں میں تھے۔

حجاج کے قافلے مکہ میں آچکے تھے تو حضرت مجاہدؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے کہا:

کس قدر کثرت سے حجاج آئے ہیں؟

فرمایا، کس قدر قلیل ترین حجاج ہیں بلکہ یوں کہو کہ کس قدر کثرت کے ساتھ سوار آئے ہیں۔

بتایا کہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حجاج کی ان نوایجاد باتوں محمل اور خیموں کو دیکھتے تو فرماتے:

"حاجی کم ہیں اور سواریاں زیادہ ہیں۔ پھر ایک مسکین سے مفلوک الحال آدمی پر نظر پڑی۔

"یہ بہترین حاجی ہے۔" انسان کو چاہیے کہ مفلوک الحال کم سامان رہے۔ صرف اسی قدر زادِ راہ لے کہ جس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ زیادتی اور کمی میں مبالغہ نہ کرے۔ نہ اس قدر تنگی کرے کہ اپنے آپ پر اور رفیقِ سفر پر تنگی اور شدت ہو جائے بلکہ ہر چیز میں مختصر اور بقدرِ کفایت حصہ لے۔ سرخ لباس سے پرہیز کرے اس لیے کہ یہ مکروہ ہے۔"

تواضع کی اہمیت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"آپؐ ایک سفر میں تھے۔ ایک مقام پر صحابہؓ نے پڑاؤ کیا اور اونٹ چھوڑ دیے گئے تو آپؐ نے کجاووں پر سرخ کپڑے دیکھے۔ فرمایا:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سُرخی تم پر غالب آگئی"

راوی بتاتے ہیں کہ ہم جلدی سے اُٹھے اور دوڑ کر اونٹوں کی پشتوں سے سُرخ کپڑے اتار دیے اور اس تیزی سے یہ کام کیا کہ بعض اُونٹ بدکنے لگے۔

اس کے علاوہ لباسِ شہرت اور سامانِ شہرت سے پرہیز کرے۔ ایسا لباس و سامان نہ ہو کہ لوگوں کی نظریں اس پر اٹھیں اور نہ ہی عیاش لوگوں کی مشابہت کرے۔ نہ ہی کثرت و تکبر کر کے اہل دنیا کی مشابہت کرے اور نہ ہی سامان کی فراوانی کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسا کرنا پسندیدہ نہیں۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں جس قدر مشقت اور بھوک پیاس ہوگی۔ اس قدر افضل و اعلیٰ درجہ حاصل ہوگا۔

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر حج کیا۔ آپ کے نیچے ایک پرانی رحجی اور خستہ قسم کی جس کی قیمت چار درہم تھی۔ آپ نے سواری پر طواف کیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور آپ کی شمائلِ مبارکہ کا اتباع کریں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"مجھ سے اپنے مناسک حاصل کرو۔"

کہا کرتے،

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ حَجًّا لَا رِيَاءَ فِيهِ وَلَا سُمْعَةَ۔ (حاضر ہوں اے اللہ حاضر ہوں۔ ایسا حج کہ جس میں نہ ریا ہے نہ سنانا ہے)

یوں کہا،

لَبَّيْكَ إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْآخِرَةِ۔ (حاضر ہوں۔ زندگی تو آخرت کی زندگی ہے)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع و اخفار کا حکم دیا اور تنعم و رفاہیت کے اظہار سے منع کیا۔ یہ فضالہ بن عبید کی حدیث میں ہے۔

روایت میں ہے،

"حاجی تو پراگندہ بال اور (تیل وغیرہ نہ لگانے کے باعث) لباند والا ہوتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو فرماتا ہے،

"دیکھو میرے گھر کی زیارت والوں کو، میرے پاس ہر گہری وادی سے پراگندہ بال اور غبار آلود ہو کر آرہے ہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ۔

التفث کا معنی ہے پریشان حال اور غبار آلود ہونا اور قضاء کا مطلب سر منڈانا اور ناخون کٹوانا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے افواج کے حکام کی طرف لکھا،

اِخْلَوْا نَقُوْا وَ اخْشَنُوْا شَنُوْا۔ (پرانا کرو اور درشت وکھردرا رکھو)

یعنی پرانا لباس پہنو اور سادہ وکھردری اشیاء استعمال کرو۔ یعنی محدثین اس طرح لکھتے ہیں،

اِحْلَوْا نَقُوْا۔ یعنی حلق سے۔ اور یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی سنت کو ساقط کرنے کا حکم دیتے دیکھیے

جب صبیغ میں مذہب خوارج کا اثر ہوا تو اسے حکم دیا"سر کھولو" اس نے سر کھولا تو اس کی دو چوٹیاں تھیں۔

فرمایا: "اگر تیرا سر سارا منڈا ہوا ہوتا (جو خوارج کی خاص علامت تھی) تو میں تیری گردن مارتا۔ لباس و سامان میں اہل یمن کا طریقہ اختیار کرے۔ اس لیے کہ یہ لوگ سلف صالحین کے طریقہ پر آج (یعنی زمانۂ مصنف تک) چل رہے ہیں جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ تھے۔ اور ان سے جدا اور متضاد اسالیب زندگی نوایجاد اور بدعت ہیں۔

اسی مفہوم میں یہ قول ہے کہ،

اہل یمن ہی حجاج کی زینت ہیں۔ اس لیے کہ کم سامانی میں یہ لوگ صحابہؓ کے انداز پر ہیں۔ نہ نرخ مہنگا کرتے ہیں اور نہ ہی راہ تنگ کرتے ہیں۔

قدیم زمانہ میں جب عیاش اور مترف قسم کے لوگ مکہ کی طرف جاتے تو اس زمانہ کے علماء فرمایا کرتے:

"یہ نہ کہو کہ فلاں آدمی حج پر روانہ ہوا بلکہ یوں کہو کہ وہ سفر پر روانہ ہوا۔"

بتاتے ہیں کہ حجاج نے یہ قبے اور محمل ایجاد کیے اور اب لوگ اس کی سنت پر عمل پیرا ہیں۔ اس کے عہد میں علماء اس پر انکار کرتے رہے۔ قبوں اور محملوں میں بیٹھ کر سفر کو ناپسند کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ اونٹوں کی اکثر اموات محمل وغیرہ کے بوجھ کی زیادتی کے باعث ہے۔ اس لیے کہ تنہا محمل ہی چار پانچ افراد کا وزن رکھتا ہے اور پھر سفر طویل اور کھانا قلیل ہوتا ہے۔

چوپایہ پر نیند بھی نہ کرے۔ اس لیے کہ سونے والا اونٹ پر بوجھ بن جاتا ہے اور اصحاب تقویٰ کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ چوپائے پر سوتے نہ تھے البتہ بیٹھے رہتے اور زیادہ وقت تک سواری بھی نہ کرتے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا جانور کے لیے باعث مشقت وتکلیف ہے۔

حدیث میں ہے:

"چوپاؤں کی پشتوں کو کرسیاں نہ بناؤ" اور کرایہ پر لیے ہوئے چوپائے پر اس قدر وزن لادو جس کا

فیصلہ کر لیا ہو یا اس کی اطلاع دی ہو۔

ایک آدمی نے حضرت ابن مبارکؒ سے عرض کیا :

"میری یہ کتاب بھی اپنے ساتھ (اونٹ) پر رکھ لیں۔"

فرمایا : " میں اونٹ والے سے اجازت لے لوں۔ اس لیے کہ میں نے اسے کرایہ پر لیا ہے۔" اور صبح و شام چوپائے سے اتر جائے اور اسے آرام دے۔ یہ سنت ہے اور سلف کا یہی طریقہ ہے۔

بعض سلفؒ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک بار برداری کا جانور کرایہ پر لیتے اور یہ شرط لگا لیتے کہ وہ اتریں گے نہیں۔ پھر اسے آرام دینے کے لیے اتر جاتے تاکہ چوپائے کو آرام دینا میزان میں ان کی نیکیاں بن جائے۔

بعض علمائے ظاہر کا فرمان ہے :

"سوار کا حج افضل ہے اس لیے کہ اس میں خرچ اور مشقت دونوں ہیں۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے تنگی نفس اور مشقت میں کمی ہو جاتی ہے اور یہ بات کمالِ حج و سلامتی کے قریب تر ہے۔ میرے نزدیک یہ بمنزلہ افطار افضل ہے جبکہ تنگی اور مشقت ہو اور (پیدل میں) بدخلقی آ جائے اس لیے کہ خوش اخلاقی اور شرح صدر سے حج کرنا افضل حج ہے۔ اور اگر چل نہ سکے یا اس کا مزاج ہی ... برہم ہو تو اس کے لیے سواری پر حج کرنا بہتر ہے۔ بہر حال حالات کے اعتبار سے معاملہ بدل جاتا ہے۔

مکہ میں ایک متقی فقیہ تھے۔ ان سے پوچھا کہ مکہ سے تنعیم یعنی مسجد عائشہ کی طرف جاتے ہیں اور عمرہ کرتے ہیں۔ یہ مقام سارا سال عمرہ کے لیے ہمارا میقات ہے۔ میں نے پوچھا کہ پیدل چل کر عمرہ کرنا افضل ہے۔ یا گدھا کرایہ پر لے کر اس پر سوار ہو کر عمرہ کرے؟

فرمایا ، لوگوں پر مشقت کے فرق کے مطابق اس کا حکم بھی مختلف ہے۔ اگر چلنے کے مقابلہ میں انسان پر روپیہ خرچ کرنا زیادہ شاق گزرتا ہو (بخیل ہو) تو نفس پر جبر کر کے اور مشقت ڈال کر گدھا کرایہ پر لینا افضل ہے اور جس پر پیدل چلنا زیادہ باعثِ مشقت ہو اس کے لیے یہی افضل ہے۔

پھر فرمایا ، " اہل ثروت لوگوں پر پیدل چلنا زیادہ مشقت کا باعث ہے۔ اس لیے ان کے لیے پیدل چل کر عمرہ کرنا افضل ہے۔ ویسے حالات کے مطابق احکام مختلف ہو جاتے ہیں۔"

میرے نزدیک پیدل چل کر عمرہ کرنا افضل ہے۔ اس طرح جو آدمی پیدل چل کر حج کر سکے اس کے لیے پیدل چل کر حج کرنا افضل ہے۔ بشرطیکہ اس کو فکری و قلبی انتشار لاحق نہ ہو جائے اور یکسوئی میں فرق نہ آنے پائے۔

بطریقِ اہلِ بیت ایک روایت ہے ،

"آخری زمانہ میں چار قسم کے لوگ حج کے لیے نکلا کریں گے۔ ان کے بادشاہ سیر کے لیے، ان کے اغنیاء تجارت کے لیے، ان کے فقراء مانگنے کے لیے اور قراء سنانے کے لیے۔"

حج پر اُجرت لینا مکروہ ہے۔ ایسا نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کا مال لے کر حج کا اجر و مشقت دے دے بعض علماء کے نزدیک یہ بات اس لیے بھی مکروہ ہے کہ حج کرنا دراصل اخروی عمل ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور یہ نماز، اذان اور جہاد کے قائم مقام ہے۔ اس لیے اس کا اجر صرف آخرت میں لے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو فرمایا،

"ایسا موذن حاصل کرو جو اذان پر اجرت نہ لیتا ہو۔"

آپؐ سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا،

"جو جہاد کے لیے نکلا اور اس نے تین دینار لیے تھے"۔ فرمایا

"اس کے لیے دنیا و آخرت کا اس قدر حصہ ہے جو اس نے لے لیا۔ اگر بندے کی نیت آخرت کی ہو اور اسی طرف اس کا سارا دھیان و فکر ہو تو اللہ تعالیٰ آخرت کی نیت پر دنیا عطا فرماتا ہے مگر دنیا کی نیت پر آخرت عطا نہیں کرتا۔ البتہ اس کے لیے وسعتِ دنیا کی امید ہو سکتی ہے۔"

حدیث میں ہے:

"ایک حج پر تین آدمیوں کو اجر ملتا ہے اور وہ جنت میں جاتے ہیں۔ وصیت کرنے والا، وصیت نافذ کرنے والا اور جو حاجی اس وصیت کو قائم کرے"۔ (یعنی اس کی طرف سے حج کرے) اس لیے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کا فریضہ ادا کر کے اس کو بچا رہا ہے۔

منقول ہے:

"جہاد پر اجرت لینے والے مجاہد کی مثال ایسے ہے جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اس کی اُجرت بھی حلال ہے"۔ یہ تب ہے کہ جہاد کی نیت ہو اور اس سلسلہ میں وہ تعاون کا ضرورت مند ہو۔ اس طرح حج میں اگر آخرت اور قربِ الٰہی کی نیت ہو طواف و عمرہ کر کے قربِ الٰہی حاصل کرے گا اور اپنے پر واجب ادا کر چکا ہو۔ اب اگر حج پر اجرت لی تو ان شاءاللہ اس کے لیے یہ بات کچھ مضر نہیں ہو گی۔"

مسجد حرام سے روکنے والے اللہ کے دشمنوں کو مال دے کر ان کی مدد نہ کرے۔ اس لیے کہ مال سے مدد دینا بھی جان کے ساتھ مدد دینے کی طرح ہے اور صد عن المسجد الحرام (مسجد حرام سے روکنا) ایسے ہے کہ آنے سے منع کرے یا محاصرہ کرے اور داخل ہونے میں رکاوٹ ڈال دے اور مال لے کر ہی

اندر جانے دے اس سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ علماء کا فرمان ہے کہ مال دے کر ظالموں کی مدد کرنے کی بجائے نفلی حج سے واپس آجانا بہتر ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا دین میں مداخلت اور اہلِ ایمان کی راہ میں رکاوٹ ہے اور لینے والا اور دینے والا دونوں ایک بدعت کے مددگار ہیں اور واقعہ بھی ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ اس روکنے والے اور مال لے کر اندر جانے کی اجازت دینے والے نے ایک بدعت کو سنت بنا دیا۔ یہ ناجائز ٹیکس جزیہ سے مشابہ ہے۔ اس لیے اس میں اہلِ اسلام اور اسلام کی توہین ہے اور حرم میں یہ کام زیادہ جرم ہے اور جس نے فرض ادا کر دیا اب نفلی حج کے باعث یہ کام نہ کرے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"ہر مسلمان اسلام کی ایک سرحدِ اسلام پر ہے۔ اگر تمام مسلمان چھوڑ دیں تو تو پختہ رہ تاکہ اسلام تیری طرف سے ناپید نہ ہو جائے۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"تمام مسلمان ایک آدمی کی طرح ہیں اور مسلمانوں کے اندر ایک مسلمان کی مثال ایسے ہے جیسے کہ بدن میں سر ہو۔ سر درد ہونے سے تمام بدن درد محسوس کرتا ہے اور بدن میں درد ہونے سے سر کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔"

قائلین نے اس کی رخصت یوں نکال لی کہ اس میں اضطرار ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے کیونکہ اگر وہ واپس آجائے گا تو اس سے کوئی کچھ نہ لے گا اور اگر وہ اہلِ ثروت و مترفین کی طرح خوب آراستہ ہو کر اور محمل لگا کر نکلے گا تو اس سے لیں گے۔ اس لیے اضطرار نہ رہا اور یہ بات اختیار سے ہوئی اور شاید یہ اس بات کی سزا ہے کہ لوگوں نے سواریوں پر کمرے اور محمل لاد لیے اب بے چارہ اونٹ محمل اور آدمی دونوں کو لیے جا رہا ہے اور چار پانچ آدمیوں سے زیادہ کا بوجھ اسے موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ ان پر اونٹ کے قتل کا مطالبہ ہے کیونکہ جو آدمی بھی اونٹ پر اس کی سکت سے زاید بوجھ لادے گا اس پر محاسبہ مطالبہ ہو گا یا اس بات کی سزا ہے کہ یہ لوگ سامانِ تجارت اور فضول مال و متاع لے کر اور مشتبہ مال لے کر آتے ہیں یا ان کی نیت ہی بد اور مقصود ہی خراب ہوتا ہے۔

بتاتے ہیں کہ جب حضرت ابو الدرداءؓ کا اونٹ مرنے لگا تو انھوں نے اس کو مخاطب کر کے کہا:

"اے اونٹ! اپنے رب کے پاس مجھ سے نہ جھگڑنا۔ میں نے تیری طاقت سے بڑھ کر تجھ پر بوجھ نہیں لادا۔" اور کہا ہے اللہ تعالیٰ کسی ایک گناہ کی وجہ سے ویسی ہی سزا دیتا ہے کہ ایک مزید گناہ سرزد ہو جاتا ہے یا اس سے بڑھ کر جرم کر بیٹھتا ہے۔

مناسک و مشاعر میں انسان کو غبار آلود اور پریشان حال ہونا چاہیے۔ یہ سنّت ہے۔ راستہ میں اور تمام مناسک کی ادائیگی میں کثرت سے ذکر اللہ کرتا رہے۔ غافلین کو بھی ذکر اللہ کی نصیحت کرے۔ لوگوں کا ذکر بند کر دے۔ بے کار باتوں میں زبان نہ چلائے اور بقدرِ کفایت ہی اہتمام کرے۔ تکلفات کے قریب بھی نہ پھٹکے۔ اگر نیکی کی بات دیکھے تو اس کا حکم کرے اور برائی دیکھے تو اس سے منع کرے۔ ان اوصاف سے حج کی فضیلت بڑھ جاتی ہے اور حجاج کو بلند درجات حاصل ہوتے ہیں۔

حج و عمرہ و تلبیہ

مستحب یہ ہے کہ میقات پر حج و عمرہ دونوں کی نیت کر لے۔ اس لیے کہ اس میں باعثِ قرب ہدی لازم ہوتی ہے اور میقات سے ہی دو قربانیاں جمع ہو جاتی ہیں عمرہ بھی کرے گا۔ اس لیے کہ کتاب اللہ میں حج کے ساتھ عمرہ کا ذکر بھی ہے اور اکثر علمائے سلف کا مذہب یہ ہے کہ عمرہ کرنا بھی حج کی طرح فرض ہے۔

سلف کی ایک جماعت کے نزدیک حج سے پہلے عمرہ کرنا مستحسن ہے۔ حضرت حسنؒ، عطاءؒ، ابن سیرینؒ اور نخعیؒ کا یہی مذہب ہے۔

مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع فرمایا اور ایک ساتھ دونوں کا احرام باندھا یہ حضرت انس کی حدیث میں ہے۔ حضرت شفیق بن سلمہ نے ضبی بن معبدؓ سے روایت کیا، فرمایا، میں نے جہاد کا ارادہ کیا۔ ایک عالم نے بتایا کہ "پہلے حج کرو"۔ میں نے ایک فقیہ سے مشورہ کیا۔ انھوں نے فرمایا،

"حج اور عمرہ دونوں کرو۔"

میں نے ایسے ہی کیا۔ میں نے دونوں کا تلبیہ ایک ساتھ کہا۔ آخر ہم نے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور یہ سارا واقعہ سنایا اور جو میں نے کیا یہ بھی بتایا تو فرمایا:

"تمہیں اپنے نبی کی سنت کی رہنمائی مل گئی" (سنتِ نبوی پر چلے) اور اگر پہلے عمرہ کرے اور پھر اس سال علیحدہ حج کرے یعنی حج تمتع کرے تو یہ افضل ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے اسے پسند کیا اور اگر حجِ مفرد کرے جیسے کہ حضرت عائشہؓ اور جابرؓ کی روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ آپؐ نے حج مفرد کیا اور جب فارغ ہوئے تو اپنے شہر کے میقات کی طرف واپس آئے اور ان دونوں کو مکمل کرتے ہوئے عمرہ کیا۔ یہ اتمام (حج و عمرہ) میں حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

قران کا طواف کرے یا اس کے لیے دو طواف اور دو سعی کرے۔ اس کی گنجائش ہے تاکہ علماء کے اختلاف سے بچ جائے۔ حالتِ احرام میں کثرت سے تلبیہ پڑھتا رہے۔ یہ افضل ترین ذکر ہے اور تلبیہ میں

آواز بلند کرے۔

تلبیہ میں یہ الفاظ بھی صحابہؓ سے مروی ہیں،

لَبَّيْكَ يَا ذَا الْمَعَارِجِ ، لَبَّيْكَ حَجًّا حَقًّا تَعَبُّدًا وَرِقًّا ، وَالرَّغْبَاءَ إِلَيْكَ وَالْعَمَلَ۔ (حاضر ہوں۔ اے بلندیوں والے حاضر ہوں حج حقیقی، عبادت کرنے کا اور غلامی کا اور تیری طرف رغبت کرنیکا اور عمل)

اور اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلبیہ ہی کہتا رہے تو بھی بہتر ہے اور یہ کافی ہے اور بہتر یہ ہے کہ چاہے واجب نہ ہو پھر بھی قربانی دے۔

قربانی کا حکم جو دم لازم ہو اس سے گوشت کھا جانے سے اجتناب کرے۔ مثلاً دمِ قرآن یا دمِ تمتع یا دمِ کفارہ ہیں سے نہ کھائے اور جو واجب نہ ہو اس سے کھانا مستحب ہے۔

روایات ہیں آمدہ ان عیوب سے ذبیحہ کو پاک رکھے۔ اس طرح قربانیوں کا مسئلہ ہے کہ قربانی کا جانور نہ تو ناک کان کٹا ہو۔ نہ اس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہو اور نہ چار پاؤں میں سے ایک ٹوٹا ہو (یعنی لنگڑا نہ ہو) خارش زدہ جانور نہ ہو۔ اوپر سے کان شق نہ ہو۔ پیچھے سے بھی کان میں پھٹن نہ ہو۔ سامنے سے کان ہیں پھٹن نہ ہو۔ پیچھے سے بھی چرا ہوا کان نہ ہو اور ایسا جانور ہو کہ جو اس قدر کمزور نہ ہو کہ اس میں گودا ہی نہ رہا ہو۔

فرمانِ الٰہی ہے،

ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ[1] (یہ سن چکے اور جو کوئی ادب رکھے، اللہ کے نام لگی چیزوں کا، سو وہ دل کی پرہیزگاری سے ہے)

اس کی تفسیر میں بتایا گیا کہ قربانی کا جانور موٹا اور توانا ہو اور خوب صورت ہو۔

افضل ترین ہدی (قربانی کا جانور) بدنہ (اونٹ) ہے۔ پھر گائے، پھر سفید سینگوں والا مینڈھا، پھر دو سالہ بکری ہے۔ اور اگر میقات سے ہدی چلائے تو یہ افضل ہے بشرطیکہ زیادہ مشقت نہ ہو۔

سلفؒ کا طریقہ تھا کہ تین میں خوب مہنگا مال لیتے تھے اور سستا لینے کو ناپسند جانتے:

۱۔ ہدی

۲۔ قربانیاں (اضاحی)

۳۔ گردن آزاد کرنا۔

---

[1] الحج ۳۲

اس لیے کہ افضل ترین وہی ہے جو زیادہ قیمتی اور زیادہ اعلیٰ درجہ کا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے، "حضرت عمرؓ نے ایک عمدہ اونٹنی کا ہدی لیا۔ اس کے تین صد دینار دام اٹھے۔ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا اس کو بیچ کر اور اس کی قیمت کا ایک بدنہ (اونٹ) خرید کر (قربانی دے دوں؟) آپؐ نے منع فرمایا اور کہا،

"بلکہ اسی کو ہدی (بنا کر) لے جاؤ۔"

ہدی کی عمدگی اور عبادت میں حسنِ معاملہ کے سلسلہ میں یہی سنت ہے اور طلبِ کثرت کے سلسلہ میں ترکِ استبدال میں بھی مسنون ہے۔ اس لیے کہ عمدہ اور قلیل چیز، ناقص درجہ کی کثیر چیز سے بہتر ہے اور تین صد دینار میں تیس (جانور) آ سکتے تھے۔ چنانچہ عمدہ اور خالص جانور زیادہ سے بہتر اور کافی ہے

حضرت ابن منکدرؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا،

"برِ حج کیا ہے؟" (حج کی نیکی جس سے وہ مبرور ہو جائے)

فرمایا، العج والثج۔ العج کا معنی ہے تلبیہ کے وقت آواز بلند کرنا اور الثج کا معنی ہے اونٹوں کا نحر کرنا۔

قربانی کی فضیلت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے؛

"نحر (قربانی) کے روز خون بہانے (قربانی کرنے) سے زیادہ اللہ کو محبوب عمل نہیں (جو) آدمی نے کیا اور قیامت کے روز یہ (مذبوحہ جانور) اپنے سینگوں اور کھروں سمیت آئیں گے۔ اس لیے کہ خون کے زمین پر گرنے سے پہلے یہ اللہ کے ہاں جائے (قبولیت) میں گرتا ہے اس لئے انہیں بطیبِ خاطر دو۔"

حدیث میں ہے،

"تمہارے لیے ساری اون کے ہر بال اور خون کے ہر قطرہ کے عوض ایک نیکی ہے اور انہیں ترازو میں رکھا جائے گا۔ اس لیے خوش ہو جاؤ۔" اور بھیڑ کے بچے کی قربانی دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ سال کے اختتام کے قریب ہو اور بکری، گائے اور اونٹ میں مُثنیٰ ہونا شرط ہے۔ مثنیٰ بکری کا مطلب یہ ہے کہ وہ تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو اور مثنیٰ گائے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو اور مثنیٰ اونٹ کا مطلب یہ ہے کہ جو پانچویں سال میں داخل ہو چکا ہو۔ اگر اس نے اپنے شہر سے احرام باندھا تو یہ بات اکمالِ حج وعمرہ کی ہے اور یہ ایک عزیمت کا قابلِ ستائش عمل ہے۔

مشاعر میں پیدل چلنے حضرت عمر، علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے منقول ہے،

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ [1] (اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لیے)

اس کے بارے میں فرمایا:

ان کا اتمام یہ ہے کہ اپنے شہر سے ہی دونوں کا احرام باندھے، حاضر قلبی رکھے، قبولیتِ دعا کے مقامات میں خوب زاری دکھائے اور بیدار رہے جیسے کہ فرمانِ الٰہی ہے:

لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ [2] (کہ پہنچیں اپنے بھلے کی جگہ پر اور پڑھیں اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں ذبح پر، جو دیئے اس نے)

مستحب یہ ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد عرفات میں پہنچنے تک تمام مشاعر میں پیدل چلے اور اس طرح طوافِ زیارت کر کے پیدل چلتا ہوا منیٰ کے مقام پر پہنچے۔

جس کے نزدیک حاجی کے لیے سوار ہونا مستحب ہے۔ اس کے نزدیک بھی حج مکمل ہونے تک مکہ کی طرف تمام مناسک میں پیدل چل کر جانا مستحب ہے۔ اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹوں کو وفات کے موقع پر وصیت کی۔ فرمایا:

"اے بیٹو! پیدل حج کرو۔ اس لیے کہ پیدل حج کرنے والے کو ہر قدم پر حرم کی سات سات صد نیکیاں ملتی ہیں۔"

ان سے پوچھا گیا:

"حرم کی نیکیاں کیا ہیں؟"

فرمایا، "ایک نیکی، ایک لاکھ نیکی کے برابر، خصوصاً ان مناسک میں پیدل چلنا زیادہ ضروری ہے۔ مسجد ابراہیم علیہ السلام سے لے کر موقف تک اور موقف سے لے کر مزدلفہ تک (بوقتِ افاضہ) اور نحر کی صبح کو مشعر حرام سے لے کر منیٰ تک۔"

کنکر مارنے کے دنوں میں اور عرفہ کے دن روزہ رکھنا افضل ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ ساتھ دعا اور تکبیر پر بھی خوب قوت رہے اور روزہ کی وجہ سے یہ کام نہ رہ جائے اور اگر ایسا کرنے سے کمزوری ہو جاتی ہو تو افطار افضل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کے روز روزہ نہیں رکھا اور نہ ہی ابوبکرؓ نے اور نہ ہی عمرؓ نے روزہ رکھا ہے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا۔

اس راہ میں آیات سے عبرت حاصل کرے اور ہر وقت میں اللہ کی جانب سے پیدا ہونے والے

---

[1] البقرہ ۱۹۶

[2] الحج ۲۸

مختلف تغیراتِ خلق سے جو حکمت و قدرت کی بات دیکھے اس سے عبرت حاصل کرے۔ ہر چیز میں اس کے لیے عبرت ہے اور ہر چیز سے اسے نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ طریق آخرت کی مثال یہ ہے۔

اسے چاہیے کہ ہر چیز میں نصیحت حاصل کرے۔ ہر چیز میں فطانت و بصارت سے کام لے۔ ان میں اللہ ہی کی جانب رجوع رکھے۔ اسی کی یاد کرے، اس کا مشاہدہ رکھے اور اس کی حکمت و قدرت کا مشاہدہ کرے۔

حج مبرور کی علامات

حضرت حسنؓ سے پوچھا گیا،

"حج مبرور کی کیا علامت ہے؟"

فرمایا: "وُہ یہ ہے کہ (حج کے بعد) بندہ واپس آکر دنیا میں زاہد اور آخرت میں راغب ہو جائے۔"

حج مبرور کے وصف میں ایک قول یہ ہے:

"اس سے مراد وُہ حج ہے کہ ایذا سے دُور رہے، ایذا سہے، صحبت اچھی ہو، زادِ راہ خرچ کرے۔"

بتاتے ہیں کہ حج قبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ بندہ جن گناہوں کا عادی تھا انہیں چھوڑ دے۔ بُرے رفقاء کی بجائے نیک رفقاء اختیار کرے۔ لہو و غفلت کی مجالس ترک کر کے ذکر و بیداری کی مجالس اختیار کرے۔ جس کو اس عمل کی توفیق حاصل ہو جائے۔ یہ بات اس کے حج قبول ہونے کی علامت ہے اور اللہ کے نظرِ کرم کی دلیل ہے جس کے جان و مال پر کوئی آفت آئی تو یہ بھی حج قبول ہونے کی علامت ہے۔ اس لیے کہ حج میں تکلیف اٹھانا دراصل اللہ کی راہ میں خرچ و تکلیف کے برابر ہے۔ ایک درہم کے سات سو ملیں گے اور یہ گویا جہاد کی راہ میں مصائب سہنے کے برابر ہے۔

طواف کے فضائل

کثرت سے بیت اللہ کا طواف کرے۔ اس لیے کہ ہر ہفتہ کے طواف پر ایک سو بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ہر رحمت میں جو اللہ چاہے وُہ ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص فرماتا ہے اور کم از کم ہر رحمت پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں کیونکہ حضرت عطاءؒ کی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے اور انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"اس بیت (اللہ) پر اللہ تعالیٰ روزانہ ایک سو بیس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ جن میں سے ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والوں کے لیے ہیں اور چالیس، نمازیوں کے لیے ہیں اور بیس، (کعبہ) کو دیکھنے والوں کے لیے ہیں۔"

حدیث میں ہے،

"بیت اللہ کا کثرت سے طواف کرو۔ اس لیے کہ قیامت کے روز یہی چیز تمہیں اپنے اعمال نامے میں کم سے کم ملے گی اور جو تم پاؤ گے ان میں یہی زیادہ قابلِ رشک ہوگی۔"

طواف کرتے وقت باتیں نہ کرو اور کثرت سے ذکر اللہ کرو۔ تسبیح وتہلیل، حمد وثنا اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہو۔ پورے سکون اور خشوع و انکسار کے ساتھ چلو۔ تصادم سے بچتے رہو اور جس قدر ہو سکے بیت اللہ کے قریب رہو۔ اگر ہو سکے تو ہر طواف کے ہر پھیرے پر حجرِ اسود کو بوسہ دو اور دونوں رکن یمانی کو دونوں ہاتھوں سے چھوؤ یعنی استلام کرو۔

روایت میں ہے:

"جو آدمی ننگے پاؤں افسوس کناں طواف کرے اس کے لیے ایک غلام آزاد کرنے کا اجر ہے اور جو آدمی بارش میں ایک ہفتہ طواف کرے۔ اس کے تمام سابقہ گناہ معاف کر دیے گئے۔" یہ بات حضرت حسن بن علی سے مروی ہے۔ انھوں نے اپنے رفقاء کو یہ بات بتائی۔ اور اسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک رفع کیا۔ (یعنی یہ مرفوع روایت ہے)

حرم کا احترام

غلط افکار اور بُرے خیالات سے پرہیز کرے۔ چنانچہ کہا کرتے ہیں:

"اس شہر میں ارادہ پر بھی مواخذہ کرتا ہے"

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے:

"مکہ کے علاوہ کسی شہر میں عمل کرنے سے پہلے صرف ارادہ پر مواخذہ نہیں ہوتا۔"

اور فرمایا،

"اگر کسی آدمی نے مکہ میں بُرائی کا ارادہ بھی کیا تو اس پر اسے سزا ملے گی۔ پھر یہ آیت تلاوت کی:

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ [1]

(اور جو اس میں چاہیں ٹیڑھی راہ شرارت سے، اسے ہم چکھائیں گے دُکھ کی مار)

اللہ تعالیٰ نے اس میں فعل کی بجائے صرف ارادہ سے تعلیق فرمائی اور بتاتے ہیں کہ جس طرح مکہ میں نیکیاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ اس طرح بُرائیاں بھی کئی گنا ملتی ہیں اور وہاں پر کی گئی برائیوں کا کفارہ صرف وہیں ہوسکتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے،

"مکہ میں ذخیرہ اندوزی کرنا الحاد ہے۔" اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں پر جھوٹ بولنا الحاد ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے،

"میں اگر رکیہ میں ستر گناہ کروں تو یہ مجھے مکہ میں ایک گناہ کرنے سے زیادہ پسند ہیں (کہ حرم میں ایک گناہ

---

[1] الحج ۲۵۔

حل کے ستر گناہوں سے زیادہ خطرناک ہے)۔اور رکیہ دراصل مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔

اسلاف اہل تقویٰ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر اور عمر بن عبدالعزیز وغیرہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا کہ وہ ایک حرم میں خیمہ لگاتے اور ایک حل (حرم کے باہر) خیمہ لگاتے۔ جب نماز پڑھنے یا کسی نیکی کے کام کے کرنے کا ارادہ کرتے تو حرم کے خیمہ میں آجاتے تاکہ مسجدِ حرام کی نماز کا اجر حاصل کریں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک تمام مذکورہ میں سارا حرم ہے اور جب کھانے پینے یا گھر والوں کے باتیں کرنے کا یا پاخانہ کا ارادہ کرتے تو حل کے خیمہ میں چلے جاتے۔

بتاتے ہیں کہ پرانے دور میں جب حجاج کی اولاد مکہ میں آتی تو وہ لوگ حرم کی تعظیم کی خاطر جوتے اتار دیتے۔

ہم نے ایسے حضرات کو سنا ہے کہ جو مکہ میں اقامت پذیر تھے مگر یہاں حرم کے اندر پیشاب پاخانہ نہیں کرتے تھے اور بعض کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ حل میں جاکر ہی پیشاب پاخانہ کرتے ہیں یعنی شعائر الٰہی کی تعظیم اور حرم اور اس کے امن کے تقدس کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔

اور مکہ میں تمام اعمالِ خیر کا کئی گنا اجر ملتا ہے۔ جس طرح مسجد الحرام میں ایک نماز کا اجر ایک لاکھ نماز کے اجر کے برابر ہے۔ اس طرح عام نیکیوں کا اجر بھی لاکھ گنا بڑھ جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ سے اسی مفہوم کا کلام مروی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے:

"یہاں پر ایک روزہ ایک لاکھ روزے کے برابر اور ایک درہم کا صدقہ ایک لاکھ درہم کے صدقہ کے برابر ہے۔"

بتاتے ہیں کہ سات مقبول کا طواف ایک عمرہ کے برابر ہے اور تین عمرے ایک حج کے برابر ہوتے ہیں اور عمرہ دراصل چھوٹا حج ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہوتی ہے:

يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ۔ (حج اکبر کے دن)

تو معلوم ہوا کہ عمرہ حجِ اصغر ہے اور عرب لوگ عمرہ کو حج بھی کہا کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے:

"رمضان المبارک میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔"

چنانچہ جس میں مندرجہ بالا علامات حسنہ پائی گئیں تو یہ اس کے قبولیت حج کی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نظرِ کرم فرمائی۔

حج وعمرہ کے فضائل

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا:

"جس نے اس بیت (اللہ) کا حج کیا اور بے ہودہ کلامی (رفث) نہ کی اور نہ ہی فسق کا کام کیا تو وہ [illegible] اسی طرح نکلا جس طرح وہ اس روز (تھا جس روز) اس کی ماں نے اسے جنا۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"جو حج یا عمرہ کرنے کے لیے گھر سے نکلے۔ پھر وفات پا جائے تو اسے قیامت تک حج وعمرہ کرنے کا اجر [illegible] ان میں سے کسی ایک میں وفات پا گیا اس کا نہ محاسبہ ہوگا اور نہ اس سے کچھ تعرض کیا جائے گا [illegible] سے کہا جائے گا:

"جنت [illegible] ہو جاؤ۔"

ایک حدیث میں ہے:

"ایک حج مبرور [illegible] دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب سے بہتر ہے اور حجِ مبرور کی جزا جنت ہی ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ

"حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے وفد اور زائرین ہیں۔ اگر وہ مانگیں تو انہیں عطا کرتا ہے اور اگر وہ بخشش مانگیں تو انہیں بخشتا ہے اور اگر وہ دعا کریں تو ان کی دعا قبول کرتا ہے۔ اگر وہ سفارش کریں تو سفارش قبول کرتا ہے۔"

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ عرفہ کے روز ایک آدمی کی صورت میں شیطان ان کے سامنے آیا۔ بڑا کمزور جسم [illegible] زرد رنگ تھا اور [illegible] رہا تھا۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔

انہوں نے پوچھا:

"تو [illegible] رو رہا کیوں ہے؟"

شیطان نے کہا:

"حجاج کسی (دنیاوی) تجارت کے بغیر اس کی طرف نکل آئے۔ مجھے یہ غم ہے کہ وہ خائب نہ جائیں گے۔

پوچھا: "تیرے جسم کو کس نے کمزور کر دیا؟"

کہا: "[illegible] گھوڑے کی ہنہناہٹ نے اور اگر میری راہ میں ہوتی تو مجھے زیادہ پسند تھا۔"

پوچھا: "تیرا رنگ کیوں متغیر ہے؟"

کہا: "جماعت نے طاعت ونیکی پر تعاون کیا اس لیے رنگ متغیر ہے۔ اگر یہ لوگ نافرمانی پر تعاون کرنے

تو میری پسند یہ تھی ؛

پوچھا، "تیری کمر کیوں جھک گئی ؟"

کہا، "بندے کے اس قول نے میری کمر جھکا دی ؛ کہ

"اے اللہ میں تجھ سے حسنِ انجام مانگتا ہوں" میں کہتا ہوں۔ ہائے افسوس! یہ آدمی اپنے عمل پر کیا تعجب کرے گا ؛ مجھے خطرہ ہے کہ اس کی یہ دعا قبول ہو گئی۔

مغفرت کی بارش

ایک آدمی حضرت ابن مبارک سے بلاوہ عرفات سے مزدلفہ کی طرف آچکے تھے۔ اس نے کہا،

اسے ابو عبدالرحمٰن ! اس وقت سب سے بڑا مجرم کون ہے ؟"

فرمایا، "جو یہ کہتا ہے کہ اللہ عز وجل ان (حجاج) کو بالکل نہیں بخشے گا۔"

اہل بیت کے طریق سے ایک حدیث مروی ہے ؛

"سب سے بڑا گناہ گار وہ ہے جو عرفات میں وقوف کرے اور پھر یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نہیں بخشا۔"

منقول ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں کہ جن کا کفارہ صرف عرفات کے میدان میں ہی ہو سکتا ہے۔ حضرت جعفر بن محمدؒ نے اسے رفع کیا اور اس طرح یہ سند ہے۔

منقول ہے کہ "اللہ تعالیٰ موقف (عرفات) میں جب کسی ایک بندے کو بخشتا ہے تو اس موقف میں جس جس کو بھی پہنچے سب کو بخش دیتا ہے۔"

بعض سلف کا گمان یہ ہے کہ اگر عرفات کے روز جمعہ کا دن آجائے تو تمام اہلِ موقف کی مغفرت ہو جاتی ہے اور دنیا میں وہ افضل ترین دن ہوتا ہے۔ اسی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کیا اور حج فرض ہونے کے بعد حج نہیں کیا۔ اس میں عرفات کے میدان میں حالتِ وقوف کے اندر یہ آیت نازل ہوئی :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا [1]

(آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے کو پسند کیا)

اہلِ کتاب کے علماء کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم پر یہ آیت نازل ہوتی تو ہم اسے یومِ عید بنا لیتے۔ چنانچہ

---

[1] المائدہ ۳

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ آیت دو عیدوں والے دن یعنی یوم عرفہ اور یوم جمعہ کے دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور آپ عرفات میں حالتِ وقوف میں تھے۔"

فرمانِ الٰہی ہے:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ [1] (کہ پہنچیں بھلے کی جگہوں پر)

اس کی تفسیر میں سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے:

"ربِ کعبہ کی قسم، انہیں بخش دیا گیا۔"

فرمایا:

لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ [2] (میں بیٹھوں گا ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر)

اس کی تفسیر میں بتایا کہ مکہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالوں گا اور وہاں بیٹھوں گا۔

حضرت مجاہدؒ وغیرہ نے علماءؒ سے نقل کیا کہ ایک حدیث دوسری حدیث میں داخل ہے۔ وہ حجاج کو دنیاوی امور میں ملوث ہونے سے پہلے ملتے اور ان سے کہتے: اللہ تم سے اور ہم سے یہ عمل قبول فرمائے۔

اور جب حاجی مکہ میں آتا ہے تو ملائکہ اس سے ملاقات کرتے ہیں اور اونٹوں پر سواروں کو سلام کہتے ہیں اور گدھا سواروں سے مصافحہ ملاتے ہیں اور پیدل چلنے والوں سے معانقہ کرتے ہیں۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا:

"جو آدمی رمضان کے مہینے کے (فوراً) بعد یا جہاد کے (فوراً) بعد یا حج کے (فوراً) بعد مر جائے تو وہ شہید مرا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"حاجی بخشا ہوا ہے اور جس کے لیے بخشش کی دعا کرے وہ بھی بخشا ہوا ہے۔ ذی الحجہ، محرم، صفر اور ربیع الاوّل کے بیس دن۔"

اسلاف کی سنت ہے کہ مجاہدین کو الوداع کریں اور حجاج کا استقبال کریں اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیں اور ان سے دعا کی درخواست کریں۔

---

[1] الحج ۲۸

[2] الاعراف ۱۶

ایک روایت میں ہے،

"اے اللہ! حاجی کو بخش دے اور جس کے لیے حاجی بخشش کی دعا کرے۔"

حضرت علی بن موفق سے مروی ہے۔ بتایا،

"میں نے ایک سال حج کیا۔ جب عرفہ کی رات آئی تو میں نے منیٰ میں مسجد خیف میں رات گزاری۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے دو فرشتے اترے۔ ان کے سبز لباس تھے۔ ایک نے دُوسرے کو آواز دی:

"اے اللہ کے بندے"۔

دُوسرے نے کہا،

"حاضر ہوں اے اللہ کے بندے"۔

پہلے نے کہا،

"جانتے ہو کہ ہمارے پروردگار کے گھر (کعبہ) کا اس سال کتنوں نے حج کیا؟"

کہا: "میں نہیں جانتا"۔

کہا: "ہمارے رب کے گھر کا چھ لاکھ نے حج کیا۔ اب جانتے ہو کہ ان میں سے کتنوں کا قبول ہُوا؟"

کہا: "نہیں"۔

کہا: "ان میں چھ آدمیوں کا (حج) قبول ہُوا"۔

راوی بتاتے ہیں کہ پھر وہ دونوں فضا میں بلند ہُوئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں گھبرا کر بیدار ہو گیا اور مجھے سخت غم لاحق ہُوا۔ مجھے اپنے معاملہ میں ہی فکر پڑ گیا۔ میں نے سوچا،

"جب چھ ہی کا حج قبول ہُوا تو میں ایسا بڑا کہاں ہُوا جو ان چھ میں ہوتا؟ آخر جب ہم عرفات سے نکلے اور میں نے مشعر الحرام کے پاس رات گزاری تو کثرتِ آدم اور کمی قبولیت پر غور کرنے لگا اور اسی حالت میں مجھے نیند آگئی تو دو آدمی آسمان اسی حالت میں اترے۔ ایک نے آواز دی،

"اے اللہ کے بندے"۔

دوسرے نے کہا،

"حاضر ہوں اے اللہ کے بندے"۔

پہلے نے کہا،

"جانتے ہو، ہمارے رب کے گھر کا کتنوں نے حج کیا؟"

کہا: "چھ لاکھ نے"۔

کہا: "تو جانتے ہو، کتنوں کا قبول ہُوا؟"

کہا: "ان چھ کا حج قبول ہوا"۔

کہا: "جانتے ہو۔ اس رات تیرے رب نے کیا فیصلہ فرمایا؟"

کہا: "نہیں"۔

کہا: "اس نے ہر ایک کے عوض ایک لاکھ آدمی کو بخش دیا"۔

راوی بتاتے ہیں کہ جب میں بیدار ہُوا تو اس قدر فرحت تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔

اس واقعہ میں چھ کا ذکر کیا اور ساتویں کا ذکر نہیں کیا اور یہ سات ابدال ہیں۔ اور زمین کے اوتاد ہیں ان پر براہِ راست نظرِ کرم رہتی ہے۔ پھر وہ ان کے قلوب کے پردہ سے قلوبِ اولیاء پر نظر فرماتا ہے۔ ان کے انوار، انوارِ جلال تعالیٰ سے ہیں اور اولیاء کے انوار ان (سات ابدال) کے انوارات سے ہیں۔ ان کے علوم و حصص انہی (سات) کے علوم و حصص سے ہیں۔ چنانچہ ساتواں جو قطبِ ارض ہے۔ اس کا ذکر نہیں کیا اور یہ تمام ابدال اسی کے میزان میں ہیں۔

اور بتاتے ہیں کہ اس امت میں یہی ایک ہے جو حضرت خضرؑ سے حال میں مشابہ ہے اور علم میں اس کے مقام کا آدمی ہے اور یہی دونوں ایک دُوسرے سے علمی فیض اور مزید انعام حاصل کرتے ہیں۔ اصل بات اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا کہ جو مر جائے اور حج نہ کر سکے اس امت میں سے، اسے ہبہ کرتا ہے کیونکہ یہ تمام سے جاہ و درجہ میں زیادہ وسعت والا ہے۔ سب سے زیادہ اسی کی سفارش قبول ہوتی ہے۔

ابن موفق سے مروی ہے،

"ایک سال میں نے حج کیا۔ جب میں نے مناسکِ حج مکمل کر لیے تو جس کا حج قبول نہیں ہُوا اس کے بارے میں مجھے فکر ہُوا"۔ بتاتے ہیں کہ میں نے اپنا یہ حج اسے ہبہ کر دیا اور اس کا ثواب اسے دے دیا کہ جس کا حج قبول نہیں ہُوا۔ بتاتے ہیں کہ میں نے خواب میں رب تعالیٰ کا دیدار کیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

"اے علی، تو میرے سامنے سخاوت جتاتا ہے اور میں نے سخاوت اور سخیوں کو پیدا کیا اور میں سب سے زیادہ سخی ہوں اور سب سے زیادہ کریم ہوں۔ سب جہانوں سے زیادہ سخاوت و کرم کا مالک ہوں۔ میں نے جس کا حج قبول کیا اس کی خاطر ہر اُس کا حج ہبہ کیا (قبول کیا) جس کا حج مقبول نہ تھا"۔

حضرت ابن موفقؒ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کئی حج کیے تھے۔ بتاتے ہیں کہ

میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (خواب میں) دیکھا تو انھوں نے فرمایا:

"اے ابن موفق! تو نے میری طرف سے حج کیا؟"

عرض کیا، "جی ہاں! اے اللہ کے رسولؐ۔"

فرمایا: "تو نے میری طرف سے تلبیہ کہا؟"

عرض کیا، "جی ہاں۔"

فرمایا، "یہ میرا تیرے لیے ہاتھ ہے۔ میں قیامت کے روز تجھے اس کی جزا دوں گا۔ میں موقف میں تیرا ہاتھ پکڑے ہوں گا اور تجھے جنت میں داخل کر دوں گا جبکہ ابھی مخلوقات حساب کی تکلیف میں ہوگی۔"

بیت الحرام کے فضائل

حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس بیت (اللہ) کا ہر سال میں چھ لاکھ آدمی حج کریں گے۔ اگر کم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ یہ تعداد پوری کر دے گا اور کعبہ کو شب زفاف والی دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے اور جو بھی حج کرتا ہے اور اس کے پردوں کے ساتھ چپکا ہوتا ہے۔ اس کے گرد طواف کر رہے ہوتے ہیں۔ آخر وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے ہمراہ یہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔"

اولیاء کرام میں سے ایک بزرگؒ کو مکاشفہ ہوا۔ فرماتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ تمام سرحدات، عبادان کو سجدہ کر رہی ہیں اور میں نے عبادان کو دیکھا کہ وہ جدہ کو سجدہ کناں ہے۔ اس لیے کہ جدہ، حرم کا خزانہ ہے اور مسجد حرام والوں کا دہانہ ہے۔"

میں ایک سال مکہ میں تھا کہ مجھے مہنگائی کا فکر ہوا اور بہت ہی تشویش ہوئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے سامنے دو آدمی ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کو کہہ رہا ہے:

"اس شہر کی ہر چیز عزیز ہے۔" گویا مہنگائی بھی عزیز ہے۔

دوسرے نے کہا:

"جگہ عزیز ہے۔ اس لیے اس میں ہر چیز عزیز ہے۔ اب اگر تو اپنے آپ پر ایثار کو سستا کرنا چاہے تو انہیں شرفِ مقام کی طرف ملا دے۔ حتّٰی کہ وہ سستی ہو جائیں۔"

مکہ میں اقامت کا مسئلہ

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے:

"اللہ کی قسم! میں نہیں سمجھ رہا کہ کس شہر میں رہائش رکھوں!"

ان سے عرض کیا گیا: "خراسان میں"۔

فرمایا: "وہاں مختلف مذاہب اور غلط آراء کا تصادم برپا ہے"۔

کہا گیا: "شام میں"۔

فرمایا: "وہاں تیری طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے گا"۔

کہا گیا: "عراق میں"۔

فرمایا: "جابرہ کا شہر"۔

کہا گیا: "مکہ میں"۔

فرمایا: "عقل اور بدن کو (مارے ڈر کے) پگھلا دیتا ہے"۔

ایک آدمی نے حضرت ثوریؒ سے کہا:

"میں نے مکہ میں رہائش کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے نصیحت فرمائیے"۔

فرمایا: "تجھے تین باتوں کی وصیت کرتا ہوں:

۱۔ پہلی صف میں نماز نہ پڑھنا۔

۲۔ کسی قریشی کی مصاحبت نہ کرنا۔

۳۔ صدقہ ظاہر نہ کرنا"۔

پہلی صف میں نماز اس لیے مکروہ ہے کہ اگر کسی روز گم ہُوا تو اس کے بارے میں لوگ پُوچھیں گے۔ اگر غائب ہُوا تو شہرت ہوگی اور دوام صفِ اول کیا تو پہچانا جائے گا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایک مقام سے چھٹکارہ کر اپنے حال کی حفاظت کرے ورنہ اخلاص ختم ہو جائے گا اور تصنع و تزئین اختیار کرلے گا۔

ایک آدمی مکہ میں حضرت سفیانؒ کے پاس آیا۔ ان سے پوچھا کہ "ایک آدمی نے مجھے مال دے کر بھیجا ہے کہ اسے کعبہ کی خدمت میں لگا دے۔ آپؒ کا کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "جس نے یہ حکم دیا وہ جاہل ہے۔ کعبہ اس سے بے نیاز ہے"۔

پُوچھا: "پھر آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "اسے فقراء اور بیوہ عورتوں پر خرچ کر دو۔ اور فلاں کی اولاد سے بچنا وہ حاجیوں کے چور ہیں"۔

بعض سلفؒ کے نزدیک مکہ میں اقامت پذیری مکروہ تھی۔ وہ اس بات کو پسند کرتے کہ باہر سے حج کے لیے بیت اللہ کا قصد کریں اور وہاں سے باہر جائیں یا تو اشتیاق کے باعث یا یہاں پر گناہ ہو جانے کے ڈر سے یا دوبارہ واپس آنے کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا[1] (اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ، اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ)

یعنی بار بار اس گھر کی طرف آئیں اور اس بات سے نہ تھکیں اور نہ اکتائیں۔

بعض کا فرمان ہے :

"تو ایک دوسرے شہر میں ہو اور تیرا دل خانہ کعبہ کے ساتھ لگا ہو۔ یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تو مکہ میں ہو اور اس جگہ سے بیزار ہو یا تیرا دل کسی دوسرے شہر سے وابستہ ہو۔"

حضرت ابن عیینہ نے حضرت شعبیؒ سے نقل کیا،

"مجھے حرام امین میں ٹھہرنا مکہ میں قیام سے زیادہ پسند ہے۔"

حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں،

"یہ دراصل مکہ کی عظمت اور گناہوں سے بچنے کی خاطر فرمایا۔"

حضرت عمر بن خطابؓ حج کے بعد حجاج کو (نکالنے کے لیے) مارنے کا حکم دیتے اور فرماتے،

"اے اہل یمن، تم یمن میں رہو اور شام والو شام جاؤ اور عراق والو عراق جاؤ۔"

حضرت ابن عباس فرمایا کرتے تھے،

"مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دینا حرام ہے اور اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ دو کاموں کو لوگ حلال نہ سمجھ لیں،

۱۔ عورتوں کو ان کی دبر میں آنا۔

۲۔ مکہ کے مکانات کرایہ پر دینا۔

حضرت ثوریؒ، حضرت بشرؒ اور دوسرے اہل تقویٰ فقہاء اس بات کو ناپسند کرتے کہ کوئی آدمی مکہ کا مکان کرایہ پر اٹھائے۔ حتیٰ کہ حضرت ثوریؒ کا فرمان ہے،

"جب تجھ سے (کرایہ) مانگیں اور دیے بغیر چارہ کار نہ ہو تو جو انہوں نے لیا اس کے عوض (یا ساتھ مزید رقم دے کر) ان سے مکان ہی خرید لو۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

---

[1] البقرۃ ۱۲۵

"خراسان والوں میں سے کئی آدمی ایسے ہیں کہ جو اس گھر کا طواف کرنے والوں سے بھی زیادہ اللہ کے قریب تر ہوتے ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ بعض ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں کہ انہیں اللہ کا اس قدر قرب حاصل ہوتا ہے کہ کعبہ ان کا طواف کرتا ہے۔"

ہمارے ایک شیخ نے مکہ کے ایک بزرگ ابو علی کرمانی سے روایت کیا: یہ ابدال میں سے تھے۔ البتہ میں نے یہ واقعہ ان سے سنا۔ فرمایا:

"میں نے ان کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں نے اہل ایمان میں سے ایک آدمی کو دیکھا کہ کعبہ اس کا طواف کر رہا تھا۔" اور اس شیخ نے مجھے بتایا کہ بسا اوقات میں نے دیکھا کہ آسمان کعبہ کی چھت سے آن ملا ہے اور کعبہ سے اس کا اتصال ہو گیا ہے اور ہند و زنج کی سرزمین میں اور کفار کے علاقوں میں زیادہ تر ابدال ملتے ہیں۔"

کہا کرتے ہیں،

"کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ آفتاب غروب ہو جائے اور ابدال میں سے کوئی آدمی اس کا طواف نہ کرے اور نہ ایسا ہوتا ہے کہ رات گزر کر فجر ہو جائے اور اوتاد میں سے کوئی ایک آدمی اس کا طواف نہ کرے۔"

جب یہ چیز منقطع ہو گئی تو یہی بات زمین سے کعبہ اٹھائے جانے کا باعث ہوگا۔ صبح ہو گی اور لوگ دیکھیں گے کہ کعبہ اٹھا دیا گیا اور اس کا نشان بھی باقی نہیں۔ یہ تب ہوگا کہ جب سات برس ایسے گزر جائیں گے کہ کوئی بھی کعبہ کا حج نہ کرے۔ پھر مصاحف میں سے قرآن اٹھا لیا جائے گا، صبح ہو گی اور لوگ دیکھیں گے کہ صفحات خالی پڑے ہیں اور ان میں ایک حرف بھی نہیں۔ پھر دلوں سے بھی قرآن مٹا دیا جائے گا اور ایک کلمہ بھی کسی کو یاد نہ رہے گا پھر لوگ اشعار، گانوں اور جاہلیت کے واقعات میں انہماک کریں گے پھر دجال ظاہر ہو گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کریں گے اور اس زمانہ میں قیامت اس قدر قریب ہو گی جیسے کہ حاملہ کو ولادت کا انتظار ہوتا ہے۔

حضرت وہیب بن ورد مکی ؒ سے مروی ہے۔ فرمایا،

"میں ایک روز حجر میں نماز پڑھ رہا تھا کہ میں کعبہ اور استار (پردوں) کے درمیان سے ایک آواز سنی جو کہہ رہا تھا،

"میں اللہ کے سامنے ہی فریاد کرتا ہوں۔ پھر اے جبریل تیری طرف، کہ جو میرے گرد دو گروہ ڈالے گئے۔ انہیں بس باتیں کرنے اور لہو و لعب میں دلچسپی ہے۔ اگر یہ لوگ اس کام سے نہ رکے تو میں ایسی جنبش

کھاؤں گا کہ ہر پتھر اسی پہاڑ کی طرف لوٹ جائے گا کہ جس سے جدا ہوا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے،

"جب تک رکن اور مقام اٹھائے نہ جائیں۔ اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی۔"

ایک روایت ہے،

"حبشی لوگ کعبہ پر چڑھائی کریں گے۔ ان میں سے پہلا آدمی حجرِ اسود کے پاس ہوگا اور دوسرا آخری آدمی جدہ میں ساحل کے پاس ہوگا۔ وہ ایک ایک پتھر کر کے اکھاڑیں گے اور ایک دوسرے کو دیتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ اسے سمندر میں پھینک دیں گے۔"

بعض صحابہؓ سے اور سابقہ کتب سے اس طرح مروی ہے،

"گویا میں (سر کے سامنے حصہ میں) گنجے ناک کٹے حبشی کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ اس (کعبہ) پر کھڑا ہے اور ایک ایک کر کے پتھر گرا رہا ہے۔"

روایت میں ہے،

"اس گھر کا اس کے اٹھائے جانے سے پہلے پہلے کثرت سے طواف کرو۔ یہ دو بار منہدم ہوا، اور تیسری بار اٹھایا جائے گا۔" اور یہ رفع اس کے منہدم ہونے کے بعد ہوگا۔ اس لیے کہ پہلوں سے اس کی تعبیر ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے حال پر لوٹ آتا ہے اور بار بار حج کیا جائے گا۔ پھر اس کا رفع ہوگا۔"

حضرت ابو رافع کی حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے،

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں دنیا کو برباد کرنے کا ارادہ کروں گا تو سب سے پہلے اپنے گھر سے ابتداء کروں گا۔ چنانچہ اس کو منہدم کروں گا۔ پھر اس کے بعد ساری دنیا کو برباد کروں گا۔" اور مکہ کے بعد مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ افضل کوئی جگہ نہیں اور یہاں اعمال کا اجر کئی کئی گنا زیادہ ملتا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"میری اس مسجد میں نماز پڑھنا، مسجدِ حرام کے سوا باقی (مساجد) کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔" اور اس طرح بتایا گیا کہ نماز کی فضیلت کی طرح مدینہ میں تمام اعمال کو فضیلت حاصل ہے کہ ہر عمل ہزار گنا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سرزمین بیت المقدس (واقع فلسطین) کا درجہ ہے۔ اس لیے کہ وہاں پر ایک نماز کا اجر پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور وہاں ہر عمل کا اجر پانچ صد گنا ہو جاتا ہے۔"

حضرت عطاء سے مروی ہے۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اور انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"مدینہ کی مسجد (مسجد نبویؐ) میں ایک نماز کا اجر دس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز کا اجر ایک لاکھ نماز کے برابر ہے اور مسجدِ اقصیٰ میں ایک نماز کا اجر ایک ہزار نماز کے برابر ہے۔ پھر اس کے بعد ساری زمین کی مساجد برابر درجہ رکھتی ہیں۔ اب کسی دوسری خاص مسجد کی کوئی شرع سے ثابت شدہ افضلیت دوسری پر نہیں ہے۔ جیسے کہ حدیث میں ہے؛

تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری (مسجد) کی طرف شدِّ رحال نہ کرو۔ (سفرِ زیارت نہ کرو)۔ مسجدِ حرام، یہ میری مسجد (مسجد نبوی)، اور مسجدِ اقصیٰ۔" اس کے بعد جس جگہ بھی تیرا قلب درست رہے تیرا دین سلامت رہے۔ اور تیرا حال ٹھیک رہے وہی جگہ تیرے لیے افضل تر ہے۔

ایک روایت میں ہے؛

"تمام شہر اللہ تعالیٰ کے شہر ہیں اور ساری مخلوق اسی کے بندے ہیں۔ جہاں بھی تو سہولت دیکھے، وہاں رہائش کرلے اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کر۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"جس کو کسی چیز میں کچھ ملے وُہ اسے لازم پکڑے اور جس کا گزران کسی چیز میں کر دیا جائے وُہ اس سے منتقل نہ ہو۔ جب تک کہ اس کی حالت ہی متغیر نہ ہونے لگے۔" (یعنی تکلیف پہنچے یا دین کو خطرہ لاحق ہو جائے تو بے شک بدل دے)

حضرت نعیمؒ فرماتے ہیں؛

"میں نے حضرت ثوری کو دیکھا کہ تھیلا کاندھے پر ڈال رکھا ہے اور کوزہ ہاتھ میں ہے۔ میں نے پوچھا؛ "اے ابو عبداللہ کہاں کا ارادہ ہے؟"

فرمایا؛ "اس شہر کی طرف جہاں میں اپنا تھیلا ایک درہم سے بھر لوں۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ فلاں بستی میں ارزانی اور آسانی ہے۔ اس لیے اس طرف جا رہا ہوں۔

میں نے کہا؛

"اے ابو عبداللہ! تم بھی ایسا کرتے ہو؟"

فرمایا؛ "ہاں، جب تو کسی شہر میں ارزانی کا سُنے تو وہاں کا قصد کرلے۔ اس لیے کہ وہاں تیرے دین کے لیے زیادہ سلامتی ہے اور تجھے فکرِ معاش کم ہوگا۔"

فرمایا کرتے؛ "یہ بُرا وقت آگیا۔ گمنام لوگ بھی اس میں پُرامن نہیں رہے تو مشہور لوگ کیسے پُرامن

رہ سکتے ہیں! یہ زمانہ ایسا ہے کہ آدمی منتقل ہوتا رہے ایک بستی سے دوسری بستی میں اپنا دین فتنوں سے بچا کر بھاگتا پھرے۔

فقراء اور سالکین کا طریقہ تھا کہ مختلف شہروں میں جاتے تاکہ علماء اور صالحین کی ملاقات حاصل ہو۔ ان کی زیارت کرکے برکت اور ادب حاصل کریں۔

علماء حضرات مختلف شہروں میں جاتے تاکہ علم حاصل کرکے لوگوں تک علم پہنچائیں اور انہیں راہِ حق بتائیں۔

اور جب اہلِ عمل اور سالکین ناپید ہو جائیں تو پھر جہاں دین کی سلامتی، اصلاحِ قلب اور سکونِ نفس دیکھے۔ وہیں اقامت کرے۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ سفر کرکے کسی بدتر حالت و مقام میں جا پڑے اور پہلی جگہ واپس نہ آسکے۔

وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِهٖ۔

اور اللہ بزرگ و برتر کے بغیر نہ کوئی قوت ہے اور نہ ہی مدد ہے۔

فصل ۳۵

اسلام و ایمان کا بیان

معاملہ قلبی کے عقود

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ [1]

(اے ایمان والو! پورا کرو اقرار)

اور فرمایا :

وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ [2] (اور لیکن پکڑتا ہے جو قسم تم نے گرہ باندھی)

فرمایا :

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا اَخْطَاْتُمْ بِہٖ
وَلٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ [3]

(اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ ، پھر وہ جو ۔۔۔ سے ارادہ کیا)

اور فرمایا :

وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ [4] (اور لیکن پکڑتا ہے اس کام پر جو کرتے ہیں دل تمہارے)

چنانچہ قلبی عہد و کسب دراصل قلبی عقود و اعمال ہیں ۔

قلبی عقود ہی ایسی سنت ہے جس پر اجماع ہے جس کو متاخرین نے اسلاف سے نقل کیا اور دو مسلمانوں کا بھی ان میں اختلاف نہیں ۔ ان میں سولہ خصال ہیں ۔ ان میں آٹھ آخرت میں ہیں ۔ ان میں سے جو دنیا میں ہیں وہ یہ ہیں :

آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے نیکی سے بڑھتا اور نافرمانی سے ناقص ہو جاتا ہے ۔ علم کے باعث قوت ایمانی حاصل ہوتی ہے اور جہالت سے ضعف ایمانی پیدا ہوتی ہے اور قرآن مجید دراصل اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے ۔ اس کا علم قدیم ہے اور اس کی ایک صفت ہے وہ بذاتہ اس کے ساتھ متکلم ہے ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے :

---

[1] المائدہ آیت ۱
[2] المائدہ آیت ۸۹
[3] الاحزاب آیت ۵
[4] البقرہ آیت ۲۲۵

"جو چیز (اللہ سے) برآمد ہوئی یعنی اس کا کلام مبارک افضل ترین چیز ہے جس کے ذریعہ بندے نے اللہ کا قرب حاصل کیا۔"

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جنگِ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی:

"اے کھیعص، میں ایسے گناہوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جو سزا کا باعث ہوں اور میں ایسے گناہوں سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو حرم ہتک کا باعث ہوں اور میں ایسے گناہوں سے پناہ مانگتا ہوں، جو دشمنوں کو جمع کرتی ہیں جس نے ہم پر ظلم کیا ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔"

حضرت ضحاک بن مزاحمؒ نے فرمایا:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو ہر سختی پر مقدم سمجھتے تھے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مروی ہے:

اعوذ بکلمات اللہ و اسمائہ کلها۔ (میں اللہ کے تمام کلمات و اسماء کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں)

جیسے کہ دعا کی:

اعوذ بعزۃ اللہ و قدرتہ۔ (میں اللہ کی عزت اور اس کی قدرت کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کلام و اسماء صفات ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب دو حکم لگائے تو خوارج نے اس پر اعتراض کیا اور ساتھ بد چلنے لگے اور خوارج کہنے لگے:

"اللہ کے دین میں مخلوق کا حکم نہیں ہو سکتا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"اللہ کی قسم! میں نے کسی مخلوق پر حکم نہیں کیا۔ میں نے صرف قرآن کا حکم نافذ کیا ہے۔"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب مسیلمہ کذاب کا مصنوعی قرآن سنا جو اس نے گھڑ رکھا تھا اور کلام اللہ سے مشابہت دکھا رہا تھا تو فرمایا:

"اللہ کی قسم یہ الّ (اللہ) سے ہے اور نہ کسی پرہیزگار سے ہے۔"

حضرت ابو عبیدہؒ نے فرمایا:

"یعنی یہ اللہ تعالیٰ سے نہیں۔"

فرمایا: یہی بات قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی دلیل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے خارج ہوا۔ اس نے یہ

کلام فرمایا۔"

فرمایا، یہ فرمان اسی سے ہے:

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً۔[1] (نہ لحاظ کریں کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا)

مطلب یہ ہے کہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی مفہوم کا کلام مروی ہے:

"تمام کلاموں پر کلام اللہ کی فضیلت ایسے ہے جیسے کہ تمام مخلوق پر اللہ کو فضیلت ہے۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام خدا سے ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کے مصحف میں میں نے پڑھا: فرمایا:

"اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنی رسالت اور اپنے کلام کے ساتھ سب لوگوں پر فضیلت بخشی"۔ اور تکلّم بالذات ہو سکتا ہے اور فرمایا:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔[2] (اور باتیں کیں اللہ نے موسیٰ سے بول کر)

اہل لغت کا فرمان ہے:

جب مصدر فعل میں داخل کیا جائے تو وہ مواجہت و وصف کے لیے ہوتا ہے۔ فعل کے امر کے لیے نہیں ہوتا اور نہ ہی مجاز پر ہوتا ہے۔ پھر جو صفات، روایات اور صحت نقل سے ثابت ہیں ان میں "تاویل" نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ قیاس و عقل سے مشابہ ہیں انہیں تسلیم کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایسا کرے کہ وہ اسماء و صفات کو ان بیع معانی و حقائق کے ہیں جو اللہ کے مناسب ہیں ان میں تشبیہ و کیف کی نفی کرے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی برابری کرنے والا نہیں کہ مشابہت دی جا سکے۔ وہ بے مثال ہے۔ ہم اس کی مشابہت و صفت نہیں کر سکتے وہ مثال و کیف سے بالا ہے۔ اگر روایاتِ صفات کو رد کیا جائے تو اسلامی شرائع کا رد ہو جاتا ہے۔ اس طرح جن روایات نے شرائع دینی اور احکامِ ایمان کو نقل کیا ہے انہوں نے ہی اسے بھی نقل کیا ہے۔ اگر شریعت نقل کرنے ہیں وہ عدول ہیں تو جس جس بات کو انہوں نے روایت و نقل کیا وہ اس میں بھی عدول و مقبول ہیں اور اگر روائتِ صفات میں (نعوذ باللہ) وہ جھوٹے ہوں تو کذاب آدمی

---

[1] التوبۃ ۱۰۔

[2] النساء ۱۶۴۔

جو قول بھی نقل کرتا ہے وہ مردود ہوتا ہے اور اللہ پر کذب باندھنا کفر ہے۔ اب کافر کی شہادت کیسے قبول ہوگی؛
اور اگر اللہ پر ان کو جرأت کرنا جائز ہو یعنی اس کی صفات میں ایسا اضافہ کریں جو انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا تو وہ احکام میں بدرجہ اولیٰ رسول اللہ پر جھوٹ باندھ لیں گے۔ اس میں شریعت کا ابطال اور صحابہ و تابعین جیسے اصحاب ناقلین کی تکفیر لازم آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے روایاتِ صفات کے انکار کرنے والوں کی تکفیر کی ہے۔

مشاجراتِ صحابہ پر خاموش رہو

ہمیں چاہیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ و اہل بیت کو افضل ترین گروہ سمجھیں اور ان کے باہمی نزاعات کے بارے میں خاموش رہیں۔ ان کے محاسن و فضائل بیان کریں تاکہ قلب میں ان کی محبت پیدا ہو۔ انہوں نے جو کچھ کیا اسے قبول کرلیں۔ اس لیے کہ ان کی عقل ہم سے زیادہ و اعلیٰ تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے علم پر اور منتہائے عقل پر عمل کیا۔ جیسے بھی انہیں اجتہاد سے معلوم ہُوا۔ اگرچہ ان میں باہمی فضیلت میں مختلف درجات تھے ان میں سے بعض افضل ہیں۔ البتہ ہمارے علوم اور ہماری عقلیں ان میں سے کم ترین درجہ کے صحابی کے علم و عقل سے بھی ناقص ہیں۔ انہیں ہم پر افضلیت ملی اور جس کو اللہ اور اس کا رسولؐ مقدم کر دے، وہ مقدم ہی ہے۔

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ تمام صحابہؓ ہدایت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو ہدایت عطا فرمائی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ان کی فضیلت و شرف کی ضمانت دی کہ گمراہی پر ان کا کبھی بھی اجتماع نہ ہوگا۔

جب علیؓ سے عرض کیا گیا،
"کیا آپؓ ہم پر کسی کو خلیفہ نہیں بنا دیں گے؟"
فرمایا: "میں تم پر کسی کو خلیفہ نہیں بناتا بلکہ تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہُوں۔ اگر وہ تمہارے لیے بھلائی کا ارادہ کرے گا تو تمہارے نبی کے بعد تمہیں تم میں سے بہتر پر متفق کر دے گا۔"

خلفائے راشدین

حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا،
"جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کا معاملہ حضرت معاویہؓ کے سپرد کیا تو اسے سنت الجماعۃ کا نام دیا گیا۔"
ایک شیعہ نے کہا:
"اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے۔"

فرمایا: "بلکہ میں مومنوں کو معزز کرنے والا ہوں۔ میں نے اپنے والد رضی اللہ عنہ کو فرماتے سُنا:
"حضرت معاویہؓ کی امارت (خلافت) کو ناپسند نہ کرو۔ اس لیے کہ وُہ اس معاملہ کا سیلاب ہیں۔ اگر تم نے انہیں کھودیا تو تم دیکھو گے کہ پوری قوت کے ساتھ تلواریں نکل رہی ہیں جیسے کہ ایلوا ہو۔ اب جس کی امامت سے صحابہ کرام راضی ہُوئے اس کے بارے میں قلبی عقیدت ہونا ضروری ہے۔ صحابہؓ کا ان کی خلافت پر اجماع ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی بناء پر تمام اہل شوریٰ ائمہ ہدایت کا اتفاق ہے کہ فرمایا:

"ہم جناب رسول اللہ کے عہد میں اس طرح ترتیب رکھتے تھے۔ ابوبکرؓ پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے انکار نہیں فرمایا"

حضرت سفینہؓ کی حدیث میں ہے:

"یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"میرے بعد خلافت تیس سال ہے پھر بادشاہ ہوں گے۔"

چنانچہ یہی چاروں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں۔ ائمہ عشرہ مبشرہ اور مہاجرین و انصار کے امام ہیں اور تمام بلندپایہ صحابہؓ کے پیش رو ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہؓ کو تمام جہانوں پر پسند فرمایا اور میرے صحابہؓ سے چار کو پسند فرمایا۔ انہیں صحابہ میں بہترین کیا اور میرے ہر صحابی میں بھلائی ہے اور میری امت کو تمام امتوں پر پسند کیا اور میری امت سے چار قرون پسند کیے اور ہر قرن میں ستر سال ہیں۔" چنانچہ ہم ایسی قوم ہیں جس کا اتباع کیا جاتا ہے حدیث پر عامل ہیں۔ رائے و عقل کے ذریعہ بدعات جاری نہیں کرتے۔ عقل کے ذریعہ روایت کو رد نہیں کرتے۔ اس لیے کہ فضیلت میں قیاس و رائے کا کچھ دخل نہیں۔ جیسے کہ صفات و اصولِ عبادات میں رائے کو دخل حاصل نہیں بلکہ بدعت و انفراد سے دُور رہ کر بطریق اجماع و اتباع فضیلت تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنت پر پختہ رہو۔ دانتوں سے اس کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جو جدا رہا وہ آگ میں ہے۔"

اس کی تصدیق کرتے ہُوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا (اور چلے سب مسلمانوں کی راہ سے (الگ) سو ہم اس کو

تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۱ حوالے کریں وہی طرف جو اس نے پکڑی اور ڈالیں اسکو دوزخ میں)

قیاس وعقل کے خلاف فضیلت وخلافت میں ترتیب آئی۔ دراصل یہ نبوت ورسالت کی تائید وتاکید کے لیے تاکہ نبوت کا بادشاہت سے التباس نہ ہوجائے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطنت کے انتظام میں قیصروکسریٰ کے انداز نہیں رکھتے تھے جیسے کہ نبوت، بادشاہت سے جُدا رنگ رکھتی ہے اور جیسے بادشاہ لوگ بیٹوں اور گھر والوں کو اپنے بعد نائب بناتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ایسے نہیں کرتے۔ اور اگر قیاس ورائے کا فضیلت بتانے میں کچھ بھی دخل ہوتا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کا بیٹا حضرت حسنؓ سب سے افضل ہوتے۔ اس لیے کہ ان میں نبوت کی (برکات) ہیں اور آپؐ چچا حضرت عباسؓ افضل ترین ہوتے جن میں ابوت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے برعکس حال پر اجماع ہے۔ اسی مفہوم میں مخلوق کو عام عادت سے الگ ہونا پڑا اور یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حضرت ابو قحافہ اور ابو سفیان رضی اللہ عنہما حالتِ ایمان میں فوت ہوئے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد اور آپؐ کے چچا کی موت کفر پر ہوئی (مگر ائمہ کا فرمان ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کے بارے میں سکوت میں احتیاط ہے اور مورخین نے ثابت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء موحدین میں سے تھے اور زمانۂ فترت کے موحدین کو کافر کہنا درست نہیں۔ مترجم) اہل نقل واہل تاریخ کا اس پر اجماع ہے (اس میں بھی سہو ہے) جب فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

"اے اللہ کے رسول، اللہ کی قسم، مجھے اپنے والد کے اسلام کے مقابلہ میں ابو طالب کا اسلام قبول کرنا زیادہ پسند تھا تاکہ اس کی وجہ سے آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔" اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

علمِ الٰہی میں یہ تھا کہ یہ چاروں صحابہؓ نبوت کے خلفاء ہوں گے۔ چنانچہ ان کی ترتیبِ خلافت اور عمر کا فیصلہ ازل میں ہو چکا تھا جو آخر میں خلیفہ ہوتا تھا وہی آخر میں بنا۔ اس کی وفات آخر میں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے حال کے مطابق تدبیرِ خلافت کی اور ان سے زمین خلافت دینے کا وعدہ کیا جیسے کہ ان سے پہلے دور کے انبیاء کے خلفاء سے خلافت فی الارض کا وعدہ فرمایا تھا۔ ان کے دین کو شوکت عطا فرمائی۔

---

۱ النساء ۱۱۵

ان کا خوف دُور کر کے انہیں مامون کر دیا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا:

وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ [1] (اور کون ہے قول کا پُورا اللہ سے زیادہ)

ایک جگہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ [2] (وعدہ دیا اللہ نے جو لوگ تم میں ایمان لائے اور کیے ہیں نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کرے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو)

اور یہ عقیدہ رکھے کہ قیامت تک تمام عربوں کے مقابلہ میں صرف قریش میں ہی امامت رہے گی (بشرطِ اہلیت) حکام کے مقابلہ میں تلوار لے کر خروج نہ کرے گا۔ ان کے ظلم پر صبر کرے گا اور نیکی و عدل پر شکر ادا کریگا۔ اگر وہ تقویٰ و نیکی کا حکم دے گا تو اس کی اطاعت کرے گا اور اگر کوئی غلط کام کیا یا سخت جرم کیا تو الگ بات ہے سنت یہی ہے۔

ہمارے عالم امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

"یہ اُمت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں بہتّر ہلاک ہوجائیں گے۔ اور سب بادشاہ کے بغض کے باعث (ہلاک ہوں گے) اور ان میں ایک فرقہ نجات پانے والا ہے جو سلطان (اسلام) کے ساتھ ہوگا۔"

اطاعت سلطان اور کب تک؟

پُوچھا گیا، "کون سب لوگوں سے بہتر ہے؟"

فرمایا، "سلطان (اسلام) اور اس سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ سلطان سب سے بُرا ہوتا ہے۔"

فرمایا، "یاد رکھو، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے جان و مال کی سلامتی کی طرف ہر روز دو بار نظر فرماتا ہے، اور ان کے افکار کی سلامتی پر ایک بار نظر فرماتا ہے۔ اس کے نامۂ اعمال پر نظر کر کے اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔"

ابو محمد خلیفہؒ نے فرمایا:

"جب وہ صالح نہ ہو تو وہ ابدال میں سے ہے اور اگر صالح ہو تو وہ قطب ہے جس پر دنیا کا مدار ہے۔" اور ابدال سے مراد ابدال بادشاہ ہے۔

---

[1] التوبہ ۱۱۱

[2] النور ۵۵

حضرت جعفر بن محمد صادقؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"دنیا میں سات ابدال ہوتے ہیں۔ ان کی مقدار پر ہی ہر زمانہ میں عبادت گزار، علماء، تجار، خلیفہ، وزیر، امیرِ لشکر، امیرِ پولیس، قاضی اور گواہ پائے جاتے ہیں۔"

حدیث میں ہے:

"ایک عادل امام کی عدل کی ایک گھڑی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

کہا کرتے ہیں:

"عادل امام کے میزان میں اس کی تمام رعایا کے اعمال رکھے جائیں گے۔"

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں:

"ایک دھوکہ باز امام، دائمی فتنہ سے بہتر ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم پر فساد کرنے والے حکام ہوں گے اور اللہ ان کے ذریعہ جو اصلاح کرائے گا وہ زیادہ ہو گی۔ اگر وہ احسان کریں تو ان کے لیے اجر ہے اور تم پر شکر لازم ہے اور اگر وہ برائی کریں تو ان پر اس کا بوجھ ہے اور تم پر صبر لازم ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"تم میں ایسے حکام بھی ہوں گے جو وہ کہیں گے، جو نہ جانتے ہوں گے اور جس پر انکار کریں گے وہ (منکر کام) کریں گے۔"

ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا وہ کام کریں گے۔"

ہم نے عرض کیا:

"کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟"

فرمایا: "نہیں، جب تک وہ نماز پڑھیں۔"

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

"جب تک وہ نماز قائم رکھیں۔"

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"جس نے سلطان (اسلام) کی امامت کا انکار کیا وہ زندیق ہے اور جس کو سلطان بلائے اور وہ نہ آئے

تو وہ بدعتی ہے اور جو بغیر بلائے آیا وہ جاہل ہے۔"

فرمایا کرتے،

" ان کے دروازوں پر لٹکی ہوئی سیاہ لکڑیاں (ڈنڈے) شر قاضیوں سے مسلمانوں کے لیے بہتر ہیں جو مسجد میں فیصلے کرتے ہوں۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

" جب سلطان صالح آدمی ہو تو وہ صالحین امت سے بھی بہتر ہے اور جب سلطان فاسق ہو تو صالحین امت اس سے بہتر ہیں۔ امتِ اسلام کا کوئی فرد اگر مشیتِ الٰہی ہی میں تو یہ کیسے بغیر گناہوں پر اصرار کی حالت میں مر جائے۔ پھر بھی اہل قبلہ کی گناہ کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ چاہے کیسا بڑا گناہ ہو اور نہ ہی اسے یقینی جنتی یا یقینی دوزخی کہا جا سکتا ہے بلکہ اس کے لیے جنت کی امید ہوگی اور دوزخ کا ڈر ہوگا۔ اگر اس پر وعید و عذاب نافذ ہوا تو یہ عدل ہے اور اگر معاف کر دیا اور درگزر فرمایا تو یہ اس کا فضل ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگاتے اور نہ ہی قطعی بات کرتے ہیں اور اپنے لیے ہم اس پر کچھ لازم نہیں کرتے۔ ہم اس کے عدل و فضل اور اس کی مشیت و اختیار کے درمیان ہیں۔ اگر ہم پر عذاب آیا تو ہم اس کے اہل ہیں اور اگر اس نے بخش دیا تو وہ بخشنے والا ہے۔ وہ ایسی ذات ہے کہ جس سے ڈرنا اور معافی مانگنا اس کے شایانِ شان ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

" اللہ تعالیٰ جس عمل پر ثواب کا وعدہ کرے وہ اسے پورا کرتا ہے اور جس عمل پر سزا کا وعدہ کیا تو اس میں وہ مختار ہے۔" (چاہے بخش دے اور چاہے سزا دے)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے،

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فرمان کا مطلب پوچھا گیا،

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا[1] (جو کوئی مارے مسلمانوں کو قصداً، تو اس کی سزا دوزخ ہے ہمیشہ رہے اس میں)

تو فرمایا،

" اس کی جزا جہنم ہے بشرطیکہ سزا دی (ورنہ بخش دے تو وہ مختار ہے۔) اللہ کے ہر فیصلہ میں کامل

---

[1] سورۃ النساء آیت ۹۳۔

حکمت، عدل اور حکمِ صادق وحق ہے اور اس بات کی تصدیق کرے کہ خیر وشر کی تمام تقدیریں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اس کے علمِ ازلی میں ہیں۔ اس کے حکم سے مخلوق میں جاری ہیں اور صرف اسی کی طرف سے عصمت ملنے پر وہ نافرمانی سے بچ سکتا ہے اور اسی کی رحمت سے اطاعت کی توفیق ملتی ہے اور اسی کی مدد سے وہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور وہ اس کی مشیت کے بغیر اپنی مدد و نقصان کے مالک بھی نہیں۔ ہم اللہ کے ملک اور اس کے غیبِ ملکوت میں قدرت و آیاتِ الٰہی پر ایمان لاتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء و محبوبین اور صدیقین وصالحین کی کرامات واجابتِ دعا اور اظہارِ قدرت کے واقعات ملتے ہیں تاکہ ان کا ایمان زیادہ ہو، ان کا یقین پختہ ہو اور یہ ان کے لیے عزت و شرف کی خاطر ہوتا ہے اور اس میں انبیاء کی نبوت کا ابطال نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ان کے استدلال کی نفی ہے۔ اس لیے کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے نہ دشمن ہیں اور جو کچھ ظاہر ہوا اس کے دعویدار بن کر (فخر نہیں کرتے) اس سے ان کا مقصد دنیا طلبی اور اقتدار پسندی بھی نہیں بلکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے جیسے چاہا رازِ ملکوت سے کشف فرمایا۔ اور جہاں چاہا اپنی غیبی قدرت سے ان پر ظاہر فرمایا۔ یہ ان کی تخصیص و تعریف ہے، انبیاء علیہم السلام کے تابعدار ہیں۔ انہی کی سنن پر چلنے والے ہیں اور انہی کی سنت کے پیروکار ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی برکت سے اور ان کی تابعداری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ انعام فرمایا۔ یہ ان کے ابدال بھائی ہیں اور ان کی اشکال نہیں۔ انہی سے یہ امثال ہیں۔ صحابہ و تابعین سے مذکورہ اخبار بکثرت مروی ہیں اور یہ تواتر تک جا پہنچی ہیں۔

احوالِ برزخ

اخروی واقعات کے بارے میں آٹھ عقاید ہونے لازم ہیں۔ بندے پر لازم ہے کہ منکر و نکیر کے سوال کا عقیدہ رکھے۔ وہ بندے کو قبر میں بدن بمع روح کے سیدھا بٹھاتے ہیں اور اس سے توحید و رسالت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ یہ مومن پر آخری آزمائش ہے اور یہ دونوں قبر میں ابتلا ڈالنے والے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے اور قرآن مجید میں بھی ایسے ہی آتا ہے،

فرمایا،

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ[1] یعنی منکر و نکیر کے سوال کے موقع پر۔

(مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں)

---

[1] ابراہیم ۲۷

وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ وَ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ۔ (اور بھلا دیتا ہے اللہ ظالموں کو اور جو چاہے کرتا ہے)

عذابِ قبر حق اور حکمت و عدل ہے اور جسم، روح اور جان پر ہوتا ہے۔ جس طرح یہ سب نافرمانی میں شریک تھے اسی طرح یہ عذاب سہنے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ اخروی احکام ہیں۔ یہ عقلی عرف کے مطابق نہیں ہیں اور نہ ہی عقلی ترتیب پر معاملہ ہے بلکہ یہ قدرت کے طریق پر ہے اور عذاب و انعام، ارواح و اجسام دونوں پر ہوتے ہیں چاہے یہ متفرق ہوں۔ ان دونوں سے اس کا اتصال ہوتا ہے گویا دونوں متفق ہیں اور قدرت میں مسافت و ترتیب نہیں ہے اور نہ ہی بُعد و نوعیت کا معاملہ ہے۔

میزان و صراط دو پلڑوں اور ایک کانٹے والے میزان (ترازو) پر ایمان رکھے کہ یہ عدل و حق ہے اور حکمت و فضل ہے جیسے اس کی عظمت کے بارے میں آتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے طبقات بھر اعمال بھی قدرتِ الٰہی سے اس ترازو میں تُل جائیں گے اور رائی بھر عمل بھی تولا جائے گا۔ یہ صنعتِ الٰہی ہے اور حقیقی عدل ہے۔

وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا۔ (اور خراب ہُوا جس نے بوجھ اٹھایا ظلم کا)

نیکیاں خوب صورت شکل میں نور کے پلڑے میں رکھی جائیں گی اور اللہ کی رحمت سے ترازو جھک جائے گا اور برائیاں بُری صورت میں اندھیرے پلڑے میں رکھی جائیں گی اور عدلِ الٰہی کی وجہ سے وزن ہلکا ہو جائے گا۔

اور یہ عقیدہ رکھے کہ پل صراط حق ہے اور جیسے آثار و روایات میں آتا ہے ویسے ہی ہے کہ بال کی طرح باریک اور تلوار کی طرح تیز ہے اور یہ جنت یا نار میں جانے والے دونوں فریقوں کی گزرگاہ ہے۔ یہ جائے لغزش ہے۔ مومنوں کے قدم اس پر قدرتِ الٰہی سے مضبوط رہیں گے اور انہیں اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اس سے پار کر کے جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور منافقین کے قدم پھسل جائیں گے۔ آخر وہ اللہ عز و جل کے حکم سے آگ میں گر پڑیں گے۔ یہ جہنم کے ٹھیک اُوپر ہے اور اذنِ الٰہی سے ہے جس نے اسے پار کیا وُہ اللہ کی رحمت سے نجات پا گیا اور جو اس سے پھسل گیا وُہ اللہ کی حکمت سے آگ میں گر پڑا۔

حساب کتاب پر ایمان لائے اور یہ سمجھے کہ مخلوق کے ساتھ اس میں مختلف معاملہ ہوگا۔ بعضوں کا حساب آسان تر ہوگا اور بعض ایسے بھی ہوں گے جو بغیر حساب کے دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے اور بغیر حساب دوزخ میں جانے والے کافر ہوں گے۔

ہمارے امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"انبیاء سے تبلیغ و رسالت کا سوال ہوگا۔ کافروں سے تکذیبِ مرسلین کا سوال ہوگا۔ بدعتیوں سے سنت کے بارے میں سوال ہوگا اور مسلمانوں سے اعمال کے بارے میں پرسش ہوگی۔" چنانچہ ہمارا کلام

ان کے اتباع میں ہے۔

اس بات پر ایمان لائے کہ اللہ جل جلالہٗ کا کھلم کھلا آنکھوں کے ساتھ سامنے دیدار ہوگا۔ حجابات اور پردے ہٹا دیے جائیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت اور اس کے نور و رحمت کے ساتھ ہوگا جیسے چاہے گا اس فرمان کا یہی مطلب ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ[1] (جنھوں نے کی بھلائی ان کو ہے بھلائی اور بڑھتی)

چنانچہ حُسنیٰ سے مراد جنت ہے اور الزیادۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح تفسیر فرمائی ہے۔

مسئلہ شفاعت اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اہلِ ایمان کو انتقام و سزا کے بعد آگ سے نکال دیا جائیگا حتیٰ کہ اللہ کے فضل سے، پھر انبیاء و صدیقین کی شفاعت سے اہلِ توحید میں سے کوئی ایک بھی دوزخ میں باقی نہیں رہے گا اور ہر مومن کے لیے اللہ کے اذن سے شفاعت ہوگی۔ انبیاء و صدیقین شفاعت کریں گے۔ علماء و شہداء اور عام اہلِ ایمان بھی سفارش کریں گے۔ ہر ایک اپنے اپنے درجہ و منزلت کے مطابق شفاعت کرے گا۔ شفاعت کے اثبات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کا اجماع ہے۔ اسی طرح اہلِ توحید کے آگ سے آخر کار نکل آنے پر بھی اجماع ہے۔ یہ دوزخ کے اُوپر کے درجہ کے لوگ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے:

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ[2] (کسی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کہ کسی طرح ہوتے مسلمان)

مفسرین کا فرمان ہے کہ کفار یہ خواہش اس وقت کریں گے کہ جب اہلِ توحید کو آگ سے نکالا جائے گا اور پھر ارحم الراحمین کی رحمت کے لیے کچھ باقی بھی رہ جائیں گے۔ جن کی کوئی سفارش کرنے والا سفارش نہ کرے گا اور مرسلین علیہم السلام بھی ان کی سفارش کے معاملہ میں آگے نہ بڑھیں گے۔ انہیں اللہ تعالےٰ اپنی مشیت اور اپنی وسیع رحمت و فضل کے باعث آگ سے نکال دے گا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مفہوم مروی ہے۔ یہ سنتِ ہدایت کے عقود اور امتِ راضیہ کا طریق ہے۔ اس پر اسلاف کا اجماع ہے اور کسی کا اختلاف بھی منقول نہیں ہے اور نہ ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے برعکس

---

[1] یونس ۲۶

[2] الحجر ۲

کوئی فرمان مروی ہے بلکہ تمام مرویات میں یہی مذکور مفہوم ثابت ہوتا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کارسازی فرما کر تمام ادیان پر دینِ اسلام کو غالب کیا۔ اس طرح سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سب کا اجماع کر دیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے میرے لیے ضمانت دی۔"

دوسرے الفاظ یہ مروی ہیں:

"مجھے یہ عطا کیا کہ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی اور جب تم اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم کے ساتھ ہو جاؤ۔" سوادِ اعظم سے مراد کثرتِ (اہلِ اسلام) ہے۔

سوادِ اعظم کیا ہے؟

سب کا اتفاق ہے کہ سوادِ اعظم وہ ہے جس پر عام اہلِ اسلام اور تمام عوام مسلمان ہیں اور بدعتی لوگ اور دوسرے مخالفین چھوٹے چھوٹے گروہ اور متفرق احزاب ہیں۔ اس لیے کہ بدعتی سوادِ اعظم سے نہیں ہیں بلکہ ایک فرقہ اور الگ گروہ ہے اور صرف اہل سنت والجماعت ہی سوادِ اعظم اور عوام اہل اسلام کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور دوسرے صالحینؒ وغیرہ سے مروی ہے:

"ہمارا دین بڑی بوڑھیوں، مدارس کے بچوں اور اعراب کا دین ہے۔" یعنی یہ قوی سلیم طبع عوام ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت فرمائی،

"جو اس پر ہو، جس پر تم آج ہو۔" امت کا اجماع ہے کہ بعد کے پیدا ہونے والے فرقے اس دین و نظریہ پر نہیں ہیں جس پر صحابہ تھے۔ صحابہ نے ان موجودہ افکار میں کلام کیا۔ نہ یہ افکارِ جدیدہ ان سے مروی ہیں بلکہ ہم نے شروع میں جو بیان کیا صحابہ اس پر تھے۔ اس کے برعکس کسی سے مروی نہیں بلکہ قرنِ اوّل اور قرنِ ثانی میں اس سے اتفاق منقول ہے۔ پھر تیسری اور چوتھی صدی میں اختلافات رونما ہوئے اور کئی فرقے پیدا ہو گئے۔

حضرت عمرو بن دینارؒ، ایوبؒ اور حماد بن سلمۃؓ کے سامنے جب مرجیہ اور جہمیہ کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے،

"اللہ تعالیٰ ایسے دین پر لعنت کرے کہ میں اس سے بڑا ہوں۔ یعنی میں مبتدعین کے ان نو ایجاد مذاہب سے پہلے ہوں۔"

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[1] (سو اللہ کے لیے ہی حمد ہے جو آسمانوں کا رب ہے اور زمین کا رب ہے، رب سارے جہانوں کا ہے)

---

[1] جاثیہ آیت ۳۶۔

اس کے حسنِ توفیق اور ہدایتِ جمیل پر اسی کی حمد ہے۔

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ[1] (اور ہم نہ تھے راہ پانے والے، اگر نہ راہ دیتا ہم کو اللہ)

جس طرح اللہ نے ہم پر اسلام کا احسان فرمایا اسی طرح ایک احسان یہ فرمایا کہ سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق بخشی۔ اس لیے کہ جیسے اس نے ہمیں اپنی معرفت عطا کر کے ہم پر انعام فرمایا۔ اسی طرح اپنا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیج کر ہم پر انعام فرمایا۔ اس لیے کہ نبی کی اطاعت کے ساتھ ہی اطاعتِ الٰہی ہے اور کتاب اللہ کی سنتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تفسیر کی ضرورت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"ایک کے ساتھ شیطان رہتا ہے اور دو سے وہ دُور رہتا ہے۔ تم میں سے ایک کا بھیڑیا ایسے ہے جیسے کہ جُدا رہنے والی اور تنہا بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے۔ جو (آدمی) جنت کے وسط میں جانا چاہے اسے چاہیئے کہ وہ جماعت سے وابستہ رہے اور جو الگ ہوا وہ آگ میں پڑا۔"

حضرت ابو غالبؓ نے ابو امامہؓ کے بارے میں نقل کیا کہ جب انہوں نے حروریہ فرقہ کے لوگوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے جو بصرہ سے لائے گئے تھے اور دمشق میں انہیں لکڑیوں پر لگا کر نصب کیا گیا تو فرمایا:

"آسمان کے سایہ تلے یہ بدترین مقتول ہیں اور جن کو انہوں نے قتل کیا وہ بہترین مقتول ہیں۔"

پھر فرمایا:

"یہ دوزخ کے کتے ہیں۔"

پھر یہ آیت تلاوت کی:

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ[2] (جو جن کے دل پھرے ہوئے ہیں وہ لگتے ہیں ان کے ڈھب والیوں سے، تلاش کرتے ہیں گمراہی)

اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی:

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ (جس دن سفید ہوں گے بعضے منہ اور سیاہ ہوں گے بعضے منہ، سو وہ جو سیاہ ہوئے منہ ان کے، کیا تم کافر

---

[1] الاعراف آیت ۴۳

[2] آل عمران آیت ۷

اِیْمَانِکُمْ ؎ (ہو گئے ایمان میں آ کر)

اور انگلی سے ان کی جانب اشارہ کرتے جاتے، پھر رونے لگتے۔

راوی بتلاتے ہیں کہ میں نے کہا : آپ ان کے بارے میں ایسے ایسے کلمات بھی کہتے ہیں اور پھر روتے بھی ہیں۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ، ابلیس کو ہلاک کرے۔ اس نے ان لوگوں کے ساتھ کیا کیا ! اے ابو غالب، یہ لوگ ہمارے دین پر تھے۔ اب میں روتا ہوں کہ یہ کس قدر (شدید عذاب) سے ملنے والے ہیں۔ تمہارے علاقے میں بہ کثرت سے ہیں۔ میں تین بار اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے ان سے اپنی پناہ میں رکھے۔ میں نے کہا : آمین۔ اے ابو امامۃؓ، کیا آپ نے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھا ہے یا اپنی رائے سے فرما رہے ہیں۔

فرمایا : (اگر میری رائے ہوتی تو) تین بار میں ایسی جرأت کرنے والا ہوتا بلکہ میں نے ایک دو تین نہیں اور چار مرتبہ نہیں (بلکہ کئی بار) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا،

" نصرانی لوگ بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت ان سے ایک فرقہ زاید ہو گی (یعنی تہتر فرقے ہوں گے) اور سواد الاعظم کے سوا باقی سب آگ میں جائیں گے۔"

ایک آدمی نے عرض کیا،

اے ابو امامۃؓ ہمارے ساتھ سواد الاعظم میں فلاں کی اولاد بھی ہے۔

فرمایا، اگر وہ ایسا کریں تو ان پر ان کا کیا اور تم پر تمہارا کیا ہے اور فرقہ سے جماعت بہتر ہے اور نافرمانی سے اطاعت بہتر ہے۔"

پھر حروریہ کے سروں کی طرف دیکھا اور فرمایا،

کیا ہم پر غضبناک ہونے تھے اور ہمیں قتل کرتے تھے ؟

یہ خوارج کے سر تھے اور یہی وجہ حروریہ فرقہ ہے جس نے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے خلاف نہروان میں بغاوت کی۔

مختلف فرقوں کا ظہور پہلی صدی میں یہ نیا فرقہ پیدا ہوا اور زمانۂ اسلام میں یہ پہلی بدعت تھی۔ یہ لوگ قرآن پڑھنے والے تھے۔ قرآن ان کی گردنوں میں حائل تھا۔ سجدوں کی وجہ سے

؎ آل عمران ۱۰۶

ان کی پیشانیوں پر نشان پڑ چکے تھے اور حکمین کے حکم ہونے کا انکار کیا۔ ان لوگوں نے احکامِ امراء کا انکار کیا اور یہ کہا کہ حکم کا لفظ واپس لو اور یہ دعویٰ کیا کہ لاحکم الا اللہ (اللہ کے بغیر کسی کا حکم نہیں) اور سلطانِ اسلام کے اوامر کی مخالفت کی اور امام کے خلاف بغاوت و خروج کو ضروری قرار دیا۔ ان لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی تکفیر کی۔ مصری شرارت پسندوں کے فتنہ کو درست قرار دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی اس نظریہ میں ان کی تائید کریں۔ ان کی خواہشات کا ساتھ دیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے مسلمانوں سے مقاتلہ کیا تاکہ وہ حکمین کو حکم بنانے سے رجوع کر لیں۔ کبیرہ گناہ پر کافر ہونے کا فتویٰ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رض کو شرح صدر فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس فرقہ کی نشان دہی فرما دی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ان کو قتل کیا۔ یہ لوگ دوزخی ہیں۔

دنیا کے بہترین گروہ حضرت علیؓ اور ان کے اصحابؓ نے ان سے جنگ کی۔ اس گمراہ فرقہ کا سردار اور سب سے بڑا فسادی ایک کانا آدمی عبداللہ بن کوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ان سے مناظرہ کرنے کے لیے بھیجا تاکہ حجت پوری ہو جائے مگر ان لوگوں نے انہیں گالیاں دیں اور انہیں گرفتار کیا۔ یہی ابن کوا کھڑا ہو کر کہنے لگا:

کیا تم مجھ سے اس کا تعارف کراتے ہو؟ میں اس کا تعارف تم سے کراتا ہوں۔ یہ اس قوم میں سے ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ[1] (یہ نام جو دھرتے ہیں تجھ پر، سب جھگڑے کو، بلکہ یہ لوگ ہیں جھگڑالو)

اس کے بعد بعض لوگ حضرت ابن عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے سوالات کرنے لگے۔ انہوں نے حق کو واضح کر دیا۔ اور ان میں سے دو ہزار آدمی نے توبہ کر لی اور باقی چار ہزار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی۔ یہ پہلا فرقہ ہے جو دین سے باغی ہوا اور ملت اسلامیہ سے ہٹ کر گمراہی کی راہ پر چلا۔

پھر مدائن میں دوسرا فرقہ پیدا ہوا۔ ان لوگوں نے ارجاء کو دین قرار دیا (ان کو مرجیہ کہا جاتا ہے) اور یہ کہا کہ ایمان دراصل قول و عمل دونوں کا نام ہے اور ایمان میں کمی و زیادتی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں نے شام کے حاکم کو یہ عقیدہ لکھ کر بھیجا۔ اس نے ان سے جنگ کا ارادہ کیا مگر رومیوں کے ساتھ جنگی مصروفیتوں کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہ دے سکے۔

---

[1] الزخرف ۵۸۔

پھر بصرہ میں تیسرا فرقہ قدریہ نام کا ظاہر ہُوا۔ ان کا سردار معبد الجہنی تھا، عمرو بن عبید، واصل بن عطاء، غزال اوران کے ساتھیوں نے اس کا اتباع کیا۔

اس کے بعد کوفہ میں چوتھا فرقہ نمودار ہُوا۔ یہ رافضی فرقہ ہے۔ اس کو رافضی اس لیے کہا جاتا ہے جب زید بن علی بن حسین جنگ کے لیے ہشام کے مقابلہ میں نکلے تو انہوں نے کہا:

"ہم ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے (نعوذ باللہ) بیزاری کا اعلان کرتے ہیں"۔

حضرت زید بن علی بن حسینؓ نے فرمایا:

"یہ دونوں ہمارے بزرگ اور امام عادل ہیں۔ ہم ان سے بیزاری کا اعلان نہیں کرتے"۔

ان لوگوں نے حضرت حسین کے پوتے کے فرمان کو مسترد کر دیا۔ (رفض کا معنی ہے مسترد کرنا) چنانچہ یہ رافضی کہلائے۔

اس کے بعد ہر فرقہ میں اٹھارہ اٹھارہ فرقے پیدا ہُوئے اور بہتر فرقے مکمل ہُوئے۔ یہ تمام فرقے سرزمین عراق میں نمودار ہُوئے اور یہیں قرن الشیطان ظاہر ہُوا۔ فتنے و فساد برپا ہُوئے۔ ہم ان تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"اللہ تعالیٰ کے تین فرشتے ہیں۔ ایک فرشتہ بیت اللہ شریف کی چھت پر ہے۔ ایک فرشتہ مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور ایک فرشتہ بیت المقدس کی چھت پر ہے۔ وہ ہر روز آواز دیتے ہیں۔ بیت اللہ شریف کی چھت والا فرشتہ کہتا ہے:

"جس نے اللہ تعالیٰ کے فرائض کو ضائع کیا وُہ اللہ کی امان سے نکل گیا"۔

مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چھت والا فرشتہ کہتا ہے:

"جس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت کی اسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہیں ہوگی"۔

بیت المقدس کی چھت والا فرشتہ کہتا ہے:

"جس نے حرام کھایا اللہ تعالیٰ نے اس سے کچھ صرف و عدل (معاوضہ) قبول نہ ہوگا"۔

علمِ ظاہر سے معاملہ قلبی کی شرح
اسلام و ایمان کے ارکان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ،

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا [1]

(اور جس وقت نکالے تیرے رب نے آدم کے بیٹوں ان کی پیٹھ میں سے ان کی اولاد ، اور اقرار کروایا ان سے ان کی جانوں پر ، کیا میں نہیں ہوں رب تمہارا ، بولے البتہ ہم قائل ہیں)

فرمایا ،

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا [2]

(اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر ، اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور مانا)

اور فرمایا ،

وَ مَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَ قَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ [3]

(اور تم کو کیا ہوا کہ یقین نہ لاؤ گے اللہ پر ، اور رسول بلاتا ہے تم کو کہ یقین لاؤ اپنے رب پر ، اور لے چکا ہے تم سے تمہارا اقرار ، اگر تم مانتے)

اسلام کے پانچ ارکان

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان ہیں :

۱۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں ، وُہ تنہا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں ۔ یہ دونوں اقرار ایک ہی عہد کی طرح ہیں ۔ اس لیے کہ وجوب و حکم میں دونوں کی گواہی ضروری ہے ۔

۲۔ پانچ نمازیں قائم کرنا اور یہ سب ایک طرح کی لازمی اور فرض ہیں ۔ اس لیے کہ ہر ایک کا دوسری سے

---

[1] الاعراف ۱۷۲

[2] المائدہ ۷

[3] الحدید ۸

تعلق ہے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا اور یہ بھی نماز کی طرح فرض اور ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کا اس کے ساتھ اتصال واشتراط ہے۔

۴۔ ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔

۵۔ بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔ اور یہ دونوں یکساں طور پر فرض ہیں۔ یہ پانچوں برابر کے فرض اور لازمی ہیں۔ ان کے فرض ہونے پر یکساں عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں بعض کی فرضیت کا حکم ساقط ہوجاتا ہے (مثلاً حائضہ پر ایامِ حیض میں نماز ساقط ہوجاتی ہے وغیر ذلک)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا:

"اسلام کو پانچ پر مبنی کیا گیا۔ (ارکانِ اسلام پانچ ہیں):

اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، پانچ نمازیں قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، ماہِ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔"

ایمان کے سات ارکان

اسلام کے سات ارکان ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات پر ایمان لانا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا۔

۴۔ ملائکہ اور شیاطین (کے وجود) پر ایمان لانا۔

۵۔ جنت و دوزخ کے وجود پر ایمان لانا اور یہ تسلیم کرنا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل پیدا کیے گئے۔

۶۔ موت کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لانا۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کی تمام اقدار، خیر و شر، شیریں و تلخ جیسی بھی ہو اس پر ایمان لانا اور یہ تسلیم کرنا کہ یہ اقدار اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر یا حکمت و مشیت سے ہیں۔ اور یہ اس کا عدل اس کی حکمتِ بالغہ ہے۔ ان کے غیبی علم اور حقیقی مفاہیم سے وہی آگاہ ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ [1] (اس سے پوچھا نہ جائے جو وہ کرے)

---

[1] الانبیاء ۲۳

ہم عقلی تمثیلات کے ساتھ اس کی مثال نہیں دے سکتے۔ وہ (امثال و اشباہ) سے بالاتر ہے۔
جو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے امثال دے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اُس کے گمراہ ہونے کی خبر دی اور فرمایا:

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا[1] (دیکھ کیسی مثالیں دیتے ہیں تیرے لیے، سو گمراہ ہوئے)

اب جو مولائے کبیر و اعلیٰ کی مثال دے اس سے بڑا گمراہ کون ہو سکتا ہے۔ جبکہ ایسا کرنے کی ممانعت بھی ہے۔ فرمایا:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[2] (سومت دو اللہ کے لیے مثالیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کی اطاعت فرض ہے اور بندوں پر اس کا حکم لازم ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو شرطِ ایمان قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[3] (اور حکم میں چلو اللہ کے اور اس کے رسول کے، اگر ایمان رکھتے ہو)

چنانچہ رحمت کے لیے اطاعتِ رسول کو شرط قرار دیا جیسے کہ اس کے لیے تقویٰ کو شرط بتایا۔ فرمایا:

وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ[4] (اور حکم میں چلو رسول کے شاید تم پر رحم ہو)

استجابت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کی مخالفت سے ڈرایا گیا اور وصف و مدح میں مبالغہ میں اس سے بدل کیا۔ فرمایا:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ[5] (سو ڈرتے رہیں جو لوگ خلاف کرتے ہیں اس کے حکم کا کہ پڑے ان پر کچھ خرابی یا پہنچے ان کو دکھ کی مار)

جیسے کہ فرمایا:

وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ[6] (اور اللہ تم کو ڈراتا ہے آپ سے)

---

[1] بنی اسرائیل ۴۸
[2] النحل ۷۴
[3] الانفال ۱
[4] النور ۵۶
[5] النور ۶۳
[6] آل عمران ۲۸

فرمایا،

اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ [۱] (حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جب وہ تمہیں بلائیں ایک کام پر جس میں تمہاری زندگی ہے)

اس لیے کہ فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ۔ (بے شک جو لوگ ہاتھ ملاتے ہیں تجھ سے، وہ ہاتھ ملاتے ہیں اللہ سے)

کتاب اللہ میں یہ آیت سب سے زیادہ مدح کی ہے اور اس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ بلیغ فضیلت پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اسے لفظ سے بدل بنایا اور حکم میں اس کا مقام رکھا گیا اس کے اور اس کے درمیان کاف تشبیہ نہیں لائے۔ مثلاً کانما۔ اور نہ لام ملک لائے یعنی یبایعون لِلّٰہِ نہیں کہا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مخلوق میں کسی کو بھی رب تعالیٰ کی جانب سے یہ مقام عطا نہیں ہوا۔

معنی و حکم کے اعتبار سے ایمان و اسلام کا اتصال ہے

کیا اسلام و ایمان ایک ہیں؛ بعض نے یہ کہا کہ ایمان ہی اسلام ہے۔ ان لوگوں نے ایمان و اسلام کا فرق اور مقامات ختم کر دیے۔ یہ قول مذہبِ مرجیہ کے قریب تر ہے۔

دوسروں کا قول یہ ہے کہ اسلام، ایمان کے علاوہ چیز کا نام ہے۔ ان لوگوں نے تضامن و تفاسیر کو داخل کر دیا۔ یہ اباضیہ کے قول کے قریب بات ہے۔

یہ مسئلہ مشکل اور توضیح طلب ہے۔ ایمان سے اسلام کی مثال ایسے ہے جیسے کہ (توحید و رسالت) کی شہادتوں کا معنی و حکم میں ایک دوسرے سے فرق ہے۔ چنانچہ شہادتِ رسالت جدا چیز ہے اور شہادتِ توحید جدا چیز ہے۔ یہ ایمان میں دو چیزیں ہیں مگر ایک دوسرے کا باہمی ربط ایسا شدید ہے کہ یہ ایک چیز کی طرح ہیں۔

"جس کا اسلام نہیں اس کا ایمان نہیں، اور جس کا ایمان نہیں اس کا اسلام نہیں۔" کیونکہ ایک مسلمان، ایمان سے

---

[۱] انفال ۲۴

خالی نہیں ہوتا۔ اسی کے ذریعہ اس کا اسلام صحیح ہوتا ہے اور مسلمان کے لیے ایمان ہونا ضروری ہے۔ اسی کے ذریعہ اس کا ایمان حقیقی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ صالحہ کے لیے ایمان کو شرط قرار دیا۔ چنانچہ اس کی تاکید میں فرمایا:

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ [1]

(اور جو کوئی کرے نیک کام اور وہ یقین رکھتا ہو سو اکارت نہ کریں گے اس کی دوڑ)

اور ایمان بالعمل کی تاکید کے سلسلہ میں فرمایا:

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى [2]

(اور جو آیا اس پاس، ایمان سے، اکر کر نیکیاں، سو ان لوگوں کے ہیں درجے بلند)

جو آدمی ظاہری طور پر اسلامی اعمال کر رہے ہوں اور ایمان بالغیب کے عقود نہ ہوں۔ (یعنی غیبی امور جن پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ مثلاً اللہ، رسالت، قیامت وغیرہ کو دل سے تسلیم نہ کرے) وہ منافق ہے اور اس کا نفاق ملتِ اسلامیہ سے خارج کرنے والا ہے۔ اور جس کی نیت ایمان بالغیب کی ہو مگر احکامِ ایمان اور شرائع اسلام پر عامل نہ ہو تو وہ ایسا کافر ہے کہ اس کے ساتھ توحید ثابت نہیں ہوتی۔

جن باتوں کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اور جن کا حکم دیا ان غیبی امور پر جو آدمی ایمان رکھے اور اوامر پر عمل کرتا تو وہ مومن و مسلم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ جائز ہوتا کہ ایک مومن کو مسلم کا نام نہ دیا جاتا اور یہ بھی جائز ہوتا کہ ہر مسلم کو اللہ، اس کے رسل علیہم السلام اور اس کی کتابوں کا مومن نہ کہا جائے۔

اعمال کے بعد ایمان کی مثل ایسے ہے جیسے کہ جسم سے قلب کو تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ایسا زندہ جسم نہیں مل سکتا کہ جس کا کوئی دل ہی نہ ہو اور نہ ہی ایسا دل والا کوئی ملتا ہے کہ جس کا کوئی جسم نہ ہو۔ یہ دونوں جدا جدا سبب ہیں اور معنی و حکم میں متصل ہیں۔

ان دونوں کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ایک دانہ ہو۔ جس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے اور یہ ایک ہے اس کو دونوں اوصاف کے قرب کے باعث دو دانے نہیں کہا جاتا۔ اس طرح ایمان سے اعمالِ اسلام کا معاملہ ہے۔ اسلام دراصل ظاہر ایمان ہے۔ یعنی اعضائے ظاہر کے اعمال اور ایمان دراصل باطنِ اسلام ہے۔ یعنی قلبی اعمال۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:

---

[1] طٰہٰ ۷۵۔

"اسلام علانیہ چیز ہے اور ایمان پوشیدگی وستر ہے"
ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:
"ایمان، دل میں ہے"

چنانچہ اسلام دراصل ایمان کا اعلام و اظہار ہے۔ ایمان، عقودِ اسلام کا نام ہے۔ اب عمل کے بغیر کوئی ایمان نہیں اور عقیدہ کے بغیر کوئی عمل نہیں۔

اس کی مثال ظاہر و باطن کے علم کی مثال ہے کہ ایک دوسرے سے ربط ہے۔ اسی طرح قلبی اعمال اور اعضائے ظاہر کے اعمال کا باہمی ربط ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس طرح ملتا ہے:

"اعمال کا دارومدار نیت پر ہے" یعنی جس کا عقیدہ وقصد نہ ہو اس کا کچھ عمل نہیں۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان انما ایک چیز کی تحقیق اور غیر کی نفی کے لیے ہے (انما الاعمال بالنیات) چنانچہ اس کے ساتھ عبادات کے اعضائے ظاہر کے اعمال ثابت کیے اور نیتوں کے اعتبار سے قلبی اعمال ثابت کیے۔

ایمان سے عمل کی مثال ایسے ہے جیسے کہ زبان کے دو ہونٹ ہیں۔ ان دونوں کا وجود ہو تو کلام صحیح طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ حروف نکالتے وقت دونوں ہونٹ مل کر کام کرتے ہیں اور زبان کلام کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک ہونٹ نہ رہے تو کلام نہیں ہو سکتا اسی طرح عمل ساقط ہونے پر ایمان چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کلام کو اپنی نعمت بتایا اور زبان کے ساتھ ساتھ دو ہونٹوں کا ذکر کیا۔ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ
(بھلا ہم نے نہیں دیں اس کو دو آنکھیں، اور زبان اور دو ہونٹ)

مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اسے دیکھنے والا اور کلام کرنے والا نہیں بنا دیا؟ کلام کو زبان و دو ہونٹوں سے تعبیر کیا۔ اس لیے کہ یہ دونوں کلام کی جگہ ہیں اور دو ہونٹوں کا اس لیے ذکر کیا کہ کلام کے ذریعہ اللہ کی نعمت آئی اور یہ ان دونوں کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

ایمان و اسلام کی مثال ایک یہ بھی ہے جیسے کہ زمین میں ایک خیمہ لگا ہو۔ اس کا ایک ظاہر ہے کہ خول اور طنابیں ہیں اور باطن میں ڈنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ خیمہ اسلام کی طرح ہے۔ اس کے بعض ظاہری اعمال ہیں۔ یہ دراصل طنابیں ہیں کہ جو خیمے کو تھامے رکھتی ہیں اور ڈنڈے دراصل خیمے کا باطن ہے۔ یہ ایمان کے باطن کی طرح ہے۔ خیمہ ان ڈنڈوں کے ذریعہ کھڑا رہ سکتا ہے۔ خیمہ ان دونوں چیزوں کا محتاج ہے۔ ان دونوں کے

ذریعہ ایک خیمہ پختہ اور قایم رہ سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے ظاہری اعمال ہیں۔ اور ایمان کے بغیر یہ بھی قایم نہیں رہ سکتا۔ ایمان باطنی اعمال سے عبارت ہے اور اس کا فائدہ بھی اسلام کے بغیر نہیں ہوتا۔ یعنی اعمال صالحہ ہوں تو ایمان کا فائدہ (درست طور پر) ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ ایمان کی تعبیر کی۔ اگر یہ دونوں ایک چیز کی طرح نہ ہوتے تو ایک کی دوسرے سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ چنانچہ فرمایا:

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ [1] (پھر بچا نکالا ہم نے جو تھا وہاں ایمان والا، پھر نہ پایا ہم نے سوائے ایک گھر کے مسلمانوں کا)

اور دو گھر نہ تھے بلکہ ایک ہی گھر تھا اور وہ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے اہل بیت کا گھر تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ [2] (اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم ہو مسلمان)

چنانچہ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ کو اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ پر عطف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں نام ایک ہی معنی میں ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے راتوں (لیالی) کو دنوں (ایام) سے تعبیر کیا۔ اس لیے کہ دن کا رات کے ساتھ ربط ہوتا ہے اور آپ یہ سمجھتے ہی ہیں کہ یہ دونوں ایک چیز ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ میں فرمایا:

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا [3] (کہا نشانی تیری یہ کہ نہ بات کرے تو لوگوں سے تین دن مگر اشارے سے)

ایک جگہ یہ بھی فرمایا:

اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا۔ (نشانی تیری یہ کہ نہ بات کرے تو لوگوں سے تین رات تک چنگا بھلا)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اسلام و ایمان کی ضد ایک بتائی۔ اب یہ دونوں حکم و معنی میں ایک چیز کی طرح نہ ہوتے تو ان کی ضد ایک نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ (کیونکر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ منکر ہو گئے

---

[1] الذریٰت ۳۵

[2] یونس ۸۴

[3] آل عمران ۴۱

إِيْمَانِهِمْ [1] (مان کر)

اور فرمایا:

أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ [2] (کیا تم کو کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکو)

چنانچہ ان دونوں کی ضد کفر بتائی۔

اسی طرح اسلام وایمان کے بارے میں ایک وصف کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے:

"اسلام کی بنیاد پانچ پر رکھی گئی۔

اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور یہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور نماز قایم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔"

حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں وفد عبدالقیس کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایمان کے بارے میں پوچھا تو یہ اوصاف ذکر فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان باطن صرف اسلام ظاہر کے ساتھ ہی ہے۔ اسلام و عمل دونوں ساتھی ہیں۔ ایک کا دوسرے کے بغیر کچھ نفع نہیں ہوتا۔ ایک کی صحت دوسرے کے بغیر نہیں ہوتی جیسے کہ دونوں کی صحت و وجود اس صورت میں ہے کہ ان دونوں کی ضد یعنی کفر کی نفی ہو جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"کسی کی تکفیر تب تک نہیں کی جائے گی جب تک وہ اس کا انکار نہ کر دے جس کا اس نے اقرار کیا ہے۔"

شروع کی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے زیادہ واضح ہے جس میں اسلام کے لفظ کے بدلہ میں ایمان کا ذکر ہے۔

حضرت جریر نے سالم بن ابی جعد سے، انہوں نے حضرت عطیہ سے روایت کیا جو بنی عامر کے آزاد کردہ غلام تھے۔ (حضرت عطیہؒ) نے یزید بن بشرؓ سے روایت کیا کہ میں حضرت ابن عمرؓ کے پاس حاضر تھا۔ ایک آدمی آیا، اس نے کہا:

"اے ابو عبداللہ بن عمرؓ، کیا بات ہے آپ حج و عمرہ کرتے ہیں اور جہاد چھوڑ رکھا ہے؟"

---

[1] آل عمران ۸۶

[2] آل عمران ۸۰

فرمایا: "تیرا ناس ہو ایمان کی بنیاد پانچ پر ہے: تو اللہ کی عبادت کرے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور بیت اللہ کا حج کرے اور ماہِ رمضان کے روزے رکھے"۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان کے لیے عملِ صالح کو شرط قرار دیا اور بتایا کہ عمل پائے جانے سے ہی ایمان کا کامل نفع حاصل ہوگا جیسے کہ ایمان کے لیے اسلام کو شرط قرار دیا۔ فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ [1]

(مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کیا کچھ کام نیک، سو ان کو بدل دے گا اللہ برائیوں کی جگہ بھلائیاں)

مفسرین کا اجماع ہے کہ الا من تاب (مگر جو توبہ کرے) یعنی شرک سے توبہ کرے۔ جیسے کہ فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ [2]

(سو اگر توبہ کریں اور قائم کریں نماز اور زکوٰۃ دیں تو چھوڑ دو ان کی راہ)

اس سے پہلے فرمایا:

وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ [3]

(اور پکڑو اور گھیرو ان کو)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا [4]

(اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد وہ نہیں کہ نزدیک کر دے ہمارے پاس تمہارا درجہ، پر جو کوئی یقین لایا اور بھلا کام کیا)

اور فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔

(جو ایمان لائے اور تھے پرہیزگار)

جیسے کہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۔

(جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور وہ حکم بردار تھے)

چنانچہ ایمان کے لیے اعمال و تقویٰ کو شرط قرار دیا جیسے کہ اعمالِ صالحہ کے لیے ایمان کو شرط فرمایا۔ اب جس طرح ایک بندہ تمام اعمالِ صالحہ بھی کرے تب بھی وہ ایمان کے بغیر کچھ نفع نہیں دیتے۔ اس طرح اگر سارا ایمان لے آئے تو بھی یہ اعمال کے بغیر نفع بخش نہیں بنتا۔

---

[1] الفرقان ۷۰
[2] التوبۃ ۵
[3] توبہ ۵
[4] سبا ۳۷

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی:

" اے بیٹے، جس طرح کھیتی، پانی اور مٹی کے بغیر درست نہیں ہو سکتی اسی طرح ایمان بھی عمل و علم کے بغیر درست نہیں ہوتا۔"

حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرق بتایا جب آپ سے پوچھا گیا:

" ایمان کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا کہ

" تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر، حساب ہونے پر اور بھلی بری قدر پر ایمان لائے۔"

پھر پوچھا گیا:

" اسلام کیا ہے؟"

تو آپؐ نے پانچ خصال کا ذکر کیا۔" یہ قلبی اعمال و عقود کی توضیح ہے اور یہ قلبی عقود ہی جیسے کہ ہم نے وضاحت کر دی ہے جو کہ اعمالِ ظاہر کی نیات و عقود بنتے ہیں جن پر افعال ظاہر واجب ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے کہا ہے کہ یہ ملا ہوں۔

البتہ اسلام اور ایمان کے معنی میں اختلاف و تضاد ہے اور یہ بات اس کی دلیل نہیں بنتی کہ حکم میں بھی دونوں مختلف ہوں۔ اس لیے کہ گاہے یہ دونوں ایک مسلم مومن بندے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مذکور عقودِ قلبی اس کا وصفِ قلب ہے اور جو علانیہ اعمال بناتے وہ ظاہر جسم کا وصف ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں دونوں اسماء کے وصف کو ایک معنی میں رکھا گیا اور وفدِ عبدالقیس کی مذکورہ حدیث میں جو ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ اس میں بھی دونوں کو ایک معنی میں رکھا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مفصل طور پر یہ آتا ہے:

" ایمان دراصل زبان کے ساتھ قول ہے اور دل کے۔ اعتقاد ایمان ہے اور ارکان پر عمل ہے۔ چنانچہ خود ایمان میں اعتقاد کے ظاہر کے اعمال داخل کیے۔

امت کا بھی اس پر اجماع ہے کہ حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں وصفِ ایمان بتایا اور اس میں قلبی عقود کا ذکر کیا جو ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ اگر کوئی آدمی ان تمام قلبی عقود پر ایمان لائے اور جو اعمال ظاہر بتائے جو اسلام کا وصف ہے۔ ان اعمالِ ظاہر پر قطعاً عمل نہ کرے تو اس کا نام مومن نہ ہوگا اور اگر اسلام کے یہ تمام اعمال پر کرے اور وصفِ ایمان پر عقیدہ نہ رکھے تو اسے مسلم نہیں کہا جائے گا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہ امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی ہے کہ اسلام، ایمان کا غیر ہے یا مسلمان مومن کا غیر ہے یا ایمان، اسلام کی ضد ہے۔

حدیث (او مسلم) کی تاویل میں دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ او مستسلم؟ اب جب قلبی عقود اور اعمالِ ظاہر دونوں کا جامع ہوگا۔ اس وقت وہ مسلم مومن ہوگا۔

اور جو اس کا قائل نہ ہو جو ہم نے ذکر کیا ہے تو اس نے پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تکفیر کر ڈالی اور مرتدین کے ساتھ ان کے قتال کو جہالت قرار دے دیا اور ان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کر دیا کہ انہوں نے مومنوں کو قتل کیا۔ اس لیے کہ مرتدین تو ایمانی عقود مانتے تھے اور توحید کا بھی انہوں نے انکار نہیں کیا اور نہ ہی دوسرے اکثر اعمال کا انکار کیا بلکہ انہوں نے زکوٰۃ کا انکار کیا۔ اس لیے ان کا قتل حلال بتایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ان کی موافقت فرمائی۔ آخر بعض منکرینِ زکوٰۃ کو قتل کیا اور بعض نے توبہ کر لی۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ،

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن و مسلم میں فرق کیا۔ اس طرح کہ ایک آدمی کو عطا کیا اور دوسرے کو عطا نہیں کیا۔"

حضرت سعدؓ نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے فلاں کو چھوڑ دیا اسے کچھ عطا نہیں فرمایا حالانکہ وہ مومن ہے۔"

آپ نے فرمایا،

"کیا وہ مسلم ہے؟"

انہوں نے دوبارہ یہی سوال کیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا،

"او مسلم؟ (کیا وہ مسلمان ہے؟)"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مقامات و باہمی فضیلت میں ایمان اور اسلام کے درمیان فرق ہے۔ یعنی ایسا آدمی خواص مومنین اور اصحابِ فضیلت اہلِ ایمان میں سے نہیں۔ چنانچہ حضرت سعدؓ پر جو مقام مخفی رہا ان پر اسے کھول دیا۔ جیسے کہ حقیقی ایمان کے سلسلہ میں مقامِ حضرت حارثہؓ کو واضح فرمایا۔ وہ گمنامی کی حالت میں رہتے تھے۔ آپ نے فرمایا،

"تو نے صبح کیسے کی؟"

انہوں نے مشاہدہ بتایا تو آپ نے فرمایا،

"تم نے معرفت حاصل کر لی اس پر پختہ رہو۔"

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقامِ ایمان کو مقامِ اسلام پر فضیلت حاصل ہے اور مومنوں کو ایمان میں باہمی فضیلت حاصل ہے۔ اگرچہ اسلام کے ظاہری اعمال میں وُہ برابر ہوں اور ایمان کی کوئی حد نہیں۔ اگرچہ اس کی صحت، محدودِ اسلام کے ساتھ ہو۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخوشی ایمان لانے والے کو مجبور ہو کر ایمان لانے والے پر ترجیح دی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نومسلم امراء کی تالیفِ قلب کے لیے عطا فرماتے تھے اور موجودہ مشرکین کو اسلام پر آمادہ کرنے کے لیے ایسا کرتے جیسے کہ ایک آدمی کے بارے میں کلام فرمایا۔ پھر بھی اسے عطا کیا تو آپؐ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی۔ آپؐ نے فرمایا:

"یہ احمق متبوع ہے۔"

یا جس کا خاندان بڑا ہوتا اور اس کے اتباع زیادہ ہوتے تو اس کو عطا فرماتے تاکہ وُہ اہلِ ایمان کے لیے مددگار بن جاتے یا جس میں مسلمانوں کے لیے نفع یا عزت ہوتی تو اسے عطا کرتے۔

البتہ اتباع اور معمولی درجہ کی تالیف کے لیے زیادہ عطا نہ فرماتے بلکہ معمولی درجہ کے مولفۃ القلوب والوں کی بجائے اہلِ ایمان کو مقدم رکھتے جیسے کہ آپؐ نے ایک بار اہلِ ایمان میں مال تقسیم کیا تو مجاہدین میں سے ایک آدمی کو نہیں دیا جو سرمنڈا تھا اور اس کے پاس جائے نماز تھا۔ اس آدمی نے کہا:

"یہ ایسی تقسیم نہیں ہے کہ اس سے اللہ (کی رضا) مراد ہو (یعنی یہ لوجہ اللہ نہیں نعوذ باللہ من ذٰلک) اللہ کی قسم، انصاف نہیں کیا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر میں انصاف نہ کروں گا تو پھر کون انصاف کرے گا۔"

یہ پہلا شیطانی اور خوارج کا سینگ تھا۔ دیکھیے آپؐ نے اسے عطا نہیں کیا اور نہ ہی آپؐ کو اس کا ملال ہوا۔ اس لیے کہ یہ آدمی خواص مسلمانوں میں سے نہ تھا، نہ ہی یہ آدمی ایسا تھا کہ اس کی قوت سے خطرہ ہوتا اور نہ ہی اسلام میں اس کا زیادہ احتیاج تھا کہ تالیفِ قلب کی خاطر اسے کچھ دیا جاتا۔ اس کی مثال وہی ہے کہ جب فرعون ڈوبنے کے قریب پہنچا اور یہ الفاظ کہہ کر اسلام لانے پر مجبور ہوا تو اس کے منہ کو بند کر دیا گیا فرعون کہنے لگا:

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ [1]

(کہا یقین جانا میں نے کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر یقین لائے بنو اسرائیل اور میں ہوں حکمبرداروں میں)

---

[1] یونس ۹۰

مفسرین کا اجماع ہے کہ اس کا معنی ہے:

اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (میں تابعداروں میں سے ہوں)

اگر یہ کہا جائے کہ دوسری بعض روایات میں اس کے برعکس مفہوم منقول ہے اور یہ آدمی صرف متسلم نہ تھا بلکہ صاحبِ فضیلت آدمی تھا۔ اور وہ یہ روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں ایک قوم کو عطا کروں گا اور دوسروں کو نہیں دوں گا انہیں اس کے سپرد کردوں گا جو ایمان اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈال رکھا ہے۔ ان میں سے فلاں ہے"

اس کے بارے میں بتایا کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستانفہ جملہ ہے قائل کو اس کا فائدہ دیا اس لیے کہ آپ کو جامع کلمات کا وصف عطا فرمایا گیا۔ وہ آپ سے ایک چیز کے بارے میں دریافت کرتا ہے آپ اسے بتاتے ہیں اور جس کو عطا کیا اس کی مزید توضیح فرمائی۔ گویا آپ نے عطا اور لینے والوں کی اقسام بیان فرمائیں کہ یہ آدمی ضرورت مند ہے۔ اس لیے دیا۔ یہ صاحبِ فضیلت ہے اس لیے دیا۔ اس کو تالیفِ قلب کی خاطر دیا۔ اس لیے کہ جس کو عطا نہیں کیا وہ اس آدمی سے افضل ہے کہ جس کو عطا کیا اور اگر ویسے معاملہ ہو جیسے کہ قائل کا خیال ہے تو ایمان سے اسلام افضل ہوگا اور مومنوں سے مسلمان افضل ہوں گے۔ حالانکہ کسی عالم نے بھی ایسا نہیں کہا۔ البتہ ایمان خاص ہے اور اس میں مختلف مقامات اور فرق ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اسلام پر مشتمل ہے اور اسلام اس میں داخل ہے اور مومن لوگ ہی خواص مسلمان ہیں۔ ان میں مقربین، صدیقین اور شہداء داخل ہیں۔ اسلام عام محدود ہے اور عوام اہل ایمان اس سے متصف ہیں۔ اس میں کبائر کے مرتکب بھی داخل ہیں۔ جو کفر سے جدا ہوا اور اس پر ایمان کا نام واقع ہوا۔ وہ اس سے خارج نہ ہوگا، جیسے کہ فرمایا:

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ [1] (سو جو کوئی باندھے اللہ پر جھوٹ)

اس کے فسق کی خبر دی اور فرمایا:

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُوَ یُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ [2]

(اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور اس کو بلایا جاتا ہے اسلام کی طرف اور اللہ ظالموں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا)

اور یہ اجماع ہے کہ ایمان نے اس شبہ کو دور کر دیا کہ یہ آدمی افضل ہے۔ اور یہ ہو بھی کیسے، جبکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کی تخصیص نص سے مروی ہے۔ آپ سے پوچھا گیا:

"کون سا عمل افضل ہے؟"

---

[1] آل عمران ۹۴ [2] الصف ۷

فرمایا: "اسلام"

پوچھا گیا: "کون سا اسلام افضل ہے؟"

فرمایا: "ایمان"

چنانچہ ایمان کو اسلام میں ایک مقام قرار دیا۔

اس حدیث میں اسلام پر ایمان کو تخصیص ہے اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ آدمی کا وصف بیان کیا کہ "کیا مسلم ہے؟" اس کے مفہوم میں دیکھا جائے تو دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ "کیا مسلم ہے؟" مذکورہ تاویل کو باطل قرار دیتا ہے اس لیے کہ الف استفہامی کے ساتھ یہ کلام "اَوْ مُسْلِمٌ؟" کا لفظ عرف میں صرف ناقص حال و وصف میں ہی مستعمل ہے۔ خوب سمجھ لو۔

اس فرمان الٰہی میں مذکور بھی اسی نوع میں سے ہیں۔ فرمایا:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا [1]

(کہتے ہیں گنوار، ہم ایمان لائے، تو کہہ تم ایمان نہیں لائے اور لیکن کہو ہم مسلمان ہوئے)

مطلب یہ ہے کہ یوں کہو:

"ہم نے قتل کے ڈر سے تابعداری کی اور یہ کمزور اور معمولی درجہ کے لوگ تھے۔ یہ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قسمیں کھاتے اور کہتے کہ:

'ہمیں آپ کیوں نہیں عطا کرتے جیسے کہ دوسرے اہل ایمان کو عطا فرماتے ہیں جبکہ ہم سب مومن ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دعووں کا پول کھول دیا اور ان کا جھوٹ ظاہر کر دیا۔"

فرمایا:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ [2]

(اور بعضے ان میں ہیں جو تجھ کو طعن دیتے ہیں زکوٰۃ بانٹنے میں، سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تب وہ ناخوش ہو جائیں)

اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مولفین کی اس قسم کو عطا نہ فرماتے اور آیت میں ایمان اور اسلام کے درمیان فرق نہیں کیا۔ اس کے بعد کی آیت میں اس پر دلیل ہے۔

---

[1] الحجرات ۱۴۔

[2] التوبہ ۵۸۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ۔ (تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے۔ تو کہہ کہ مجھ پر احسان نہ رکھو، اپنی مسلمانی کا، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو راہ دی ایمان کی)

چنانچہ ان کے اسلام کو ایمان کا نام دیا۔ اس لیے کہ کلام کے بعض کا دُوسرے حصّہ کلام پر عطف ہے اور اوّل کو آخر کی طرف رد کیا۔ اس طرح رسول پر ان کا احسان ساقط کر دیا اور ان پر اپنا احسان بتایا اور دوسرے اسم کو پہلے والے پر معطوف کیا اور دو لفظوں میں مغایرت بتائی یعنی ایک سے دُوسرا مراد نہیں لیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ۔ (کہ ہدایت دی تمہیں ایمان کی)

اس لیے کہ عربی زبان میں وسعت ہے اور یہیں خوب تر وضاحت بھی بتا دی اور یہ کہ اسلام و ایمان ایک ہی مفہوم کے دو نام ہیں جیسے کہ فرمایا:

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ [1] (کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو تمہیں روزی دیتا ہے)

اور يَخْلُقُكُمْ (تمہیں پیدا کرتا ہے) نہیں فرمایا تاکہ واضح ہو جائے کہ رزاق ہی خالق ہے اور ایک دوسرا وصف بھی واضح فرمایا۔ اس کی مثال یہ ہے:

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ [2] (پھر بچا نکالا ہم نے جو تھا وہاں ایمان والا، پھر نہ پایا ہم نے اس جگہ سوائے ایک گھر کے مسلمانوں کا)

مصحف ابن مسعود میں اس کی قرأت ایسے ہے۔ فرمایا:

قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ [3] (کہا، تو پاک ہے میں نے تیرے پاس توبہ کی اور میں سب سے پہلے یقین لایا)

اب اگر یہ دونوں ایک معنی میں نہ ہوتے تو خلافِ معنی پڑھنا جائز نہ ہوتا (یعنی دوسرے لفظ میں پڑھنا جائز نہ ہوتا) اور جو ابو جعفر محمد بن علیؓ سے مروی ہے:

"ایمان، اسلام میں بند ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا باطن ایسا ہے۔ فرمایا اور اسے بڑے دائرہ میں پھیلایا۔ چنانچہ فرمایا: "یہ اسلام"۔ پھر اس کے وسط میں چھوٹا دائرہ لگایا۔ چنانچہ فرمایا: "یہ اسلام میں

---

[1] الحجرات ۱۷

[2] الذاریات ۳۵، ۳۶

[3] الاعراف ۱۴۳

ایمان ہے۔ چنانچہ جب یہ کیا تو ایمان سے نکل گیا اور اسلام میں ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ وہ حقیقی اور کمالِ ایمان سے نکل گیا اور ان لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ جن مومنین کی خوف و تقویٰ کے ساتھ مدح و تعریف کی گئی ہے اس لیے کہ وہ اسم و معنی سے نکل گیا۔ حتیٰ کہ وہ اللہ پر ایمان لانے والا اور اس کے رسولوں اور کتابوں کی تصدیق کرنے والا نہیں ہے۔

دیکھیے چھوٹا گھر اگر کسی بڑے گھر کے اندر ہو اور بڑا مکان اسے احاطہ کیے ہوئے ہو تو چھوٹا مکان بڑے سے باہر نہیں ہوتا۔ اس کی مثال دی۔ البتہ وہ اس میں مخصوص ہوگا اور اگر یہ مراد ہوتا کہ وہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے تو اسے دو جدا جدا دائرے میں رکھ دیتے اور ایک کو دوسرے کے بطن و جوف میں نہ بتاتے۔

اسی طرح روایت آتی ہے ؛

"زانی زنا نہیں کرتا، جب وہ زنا کرتا ہے کہ مومن ہو، اور نہیں شراب پیتا، جب شراب پیتا ہے کہ وہ مومن ہو"

(جب زانی زنا میں مشغول ہو اور شرابی شراب پی رہا ہو تو وہ اس وقت مومن نہیں ہوتا)

مطلب یہ ہے کہ اس کا ایمان کامل نہیں ہوتا یا وہ حقیقی مومن نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حقیقی اور کامل ایمان تو خوف و تقویٰ کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ "کبائر کا ارتکاب کرنے والے کافر نہیں ہیں اور جب وہ زنا کرے اور شراب پی کر فسق میں مبتلا ہوگا تو وہ حقیقی ایمان یعنی خوف و ورع سے نکل گیا اور اسمِ ایمان اور معنیٰ ایمان سے نہیں نکلا یعنی تصدیق و التزامِ شریعت سے نہیں نکلا۔

اس میں ایک لطیف مفہوم ہے گویا اس سے حیاء کا ایمان اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

"حیاء کرنا ایمان سے ہے۔"

اور حیاء کرنے والا آدمی حرام پر اپنا ستر نہیں کھولتا البتہ اسلام و توحید اور احکام لازم کرنے کا ایمان باقی رہتا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اس کی وضاحت مروی ہے۔ فرمایا ؛

"ایمان، اسلام کی حقیقت ہے۔"

حضرت حذیفہؓ سے پوچھا گیا ،

"منافق کون ہے؟"

فرمایا ؛ "جو اسلام میں کلام کرے اور عمل نہ کرے۔"

چنانچہ انہوں نے علمِ ایمان کو ایک اسلام قرار دیا اور قول کو عمل کے ساتھ ملایا۔

حضرت ثوریؒ نے فرمایا : "ہمارے نزدیک لوگ، اپنے حدود و فرائض میں، نکاح میں، وراثت کے

معاملات ہیں، ان کے پیچھے نمازیں اور ان پر نمازِ جنازہ میں مومن مسلمان ہیں۔ زندوں کا محاسبہ نہیں کیا جاتا۔ اور مرنے والوں پر فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور ان کے باطنی معاملات کو ہم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ دھمکی سنتے ہیں تو اہل قبلہ کے لیے ڈرتے ہیں اور نرمی سنتے ہیں تو اہل قبلہ کے لیے امید باندھتے ہیں۔ ہم اپنے اسلاف کی رائے کا اتباع کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ ایمان و اسلام دونوں ساتھی ہیں۔ جدا نہیں ہوتے۔ یہ تمام محدثین اور ائمہ سلف رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے۔

ایمان و اسلام کا فرق
محدثین کی نظر میں

بعض محدثین سے مروی ہے کہ انہوں نے ایمان و اسلام میں فرق کیا۔ چنانچہ امام زہریؒ نے فرمایا:

"اسلام، کلمہ ہے اور ایمان، عمل ہے۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ سے ایمان و اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"یہ دو چیزیں ہیں۔"

حضرت حماد بن زیدؒ نے فرمایا:

"اسلام عام ہے اور ایمان خاص ہے۔" اور ان کے تمام اقوال ہماری مذکورہ کی تائید کرتے ہیں۔ ان حضرات نے ایمان و اسلام کے درمیان اختلافی اور تضاد کا فرق نہیں فرمایا کہ دوسرے کے معدوم ہونے پر بھی ایک پایا جائے ورنہ مرجیہ کی موافقت ہو جاتی اور محدثین کرام مرجیہ کے خیالات سے بہت دور ہیں۔ اس لیے کہ یہ حضرات اصحابِ اثر و توقیف ہیں۔

البتہ انہوں نے تفاوت و تخصیص کا فرق بتایا یعنی ایمان اخص و اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ اس میں کمی و بیشی ہوتی ہے اور فضائل و مقامات اسی سے ہیں اور اس میں استثناء لازم ہے اور اسلام عام ہے۔ اس سے صرف کافر ہی خارج ہیں۔ اس لیے کہ اس سے پرے کچھ چیز نہیں۔

علمائے اسلام کے ایک گروہ کے نزدیک اسلام میں استثناء واجب نہیں۔ اس لیے کہ یہ محدود و معلوم ہے چنانچہ جس نے اسلام و ایمان میں فرق کیا اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض سلف اور بعض متقدمین کا یہ طریقہ ہے اور یہ بھی ہماری مذکورہ تفصیل و توضیح کے مطابق ہے۔ البتہ ہم نے مرتب انداز میں اور زیادہ وضاحت سے یہ مسئلہ پیش کیا ہے۔ یہ اس حدیث کی طرح ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

"کون سا ایمان افضل ہے؟"

فرمایا: "اسلام"

پوچھا گیا: "تو کون سا اسلام بہتر ہے؟"

فرمایا: "ایمان"۔

چنانچہ دونوں میں امتیاز نہیں رکھا۔ البتہ اس کی تخصیص کی اور ایمان کو حقیقی و خالص اسلام قرار دیا۔ اس لیے کہ اس نے اس سے خبر دی۔ آپ کا فرمان ہے:

"آدمی کے حسنِ اسلام سے یہ بات بھی ہے کہ وہ لایعنی کو چھوڑ دے۔" یعنی حقیقی اسلام یہ ہے اور اس وصف کا اسلام اعلیٰ ہے۔ صاحبِ یقین و زہد مومن کی یہی صفت ہے اور یہ قول ابوجعفر محمد بن علی کی مثال کے مشابہ ہے کہ "اس نے ایک بڑا دائرہ لگایا اور اس میں تخصیص کرتے ہوئے ایک چھوٹا دائرہ لگایا۔" اور ہماری تمام مذکورہ بحث اور اقوالِ سلف سے مرجیہ، کرامیہ اور اباضیہ کا قول باطل اور غلط ثابت ہو جاتا ہے تو ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ ایمان عمل کے بغیر صرف قول کا نام ہے یا معرفت کا نام ہے، یا صرف نیت کا نام ہے اور یہ معتزلہ کا بھی رد ہے جو دو درجوں کے درمیان ایک درجہ کے قائل ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مومن اور کافر۔ چنانچہ وہ فاسق کو مومن نہیں سمجھتے اور یہ حشریہ، جرمیہ، قطعیہ اور حروریہ جیسے خوارج کے فرقوں کا بھی رد ہوا جو اس بات کے قائل ہیں کہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے خارج ہے اور کبائر کا ارتکاب کرنے والے کفار ہیں۔ ان کو قتل کرنا جائز ہے اور باغی ائمہ کافر ہیں .... اور رعایا پر لازم ہے کہ ان سے جنگ کرے۔

بعض کا یہ قول ہے کہ جس نے امام سے بغاوت کی وہ کافر ہے۔ حالانکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ[1]

(اور اگر دو فرقے مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ملاپ کرا دیں۔ پھر اگر چڑھائی کریں ان میں سے ایک دوسرے پر تو سب لڑو چڑھائی والے سے جب تک کہ پھر آوے اللہ کے حکم پر)

چنانچہ باغیوں کو مومن کہہ کر ان سے قتال کا حکم دیا اور ان کے لیے کوئی تیسرا الگ درجہ نہیں بتایا۔

اور دو بدعتی فرقوں کے دو مختلف اور متضاد اقوال ہیں یعنی مرجیہ اور معتزلہ کے اقوال الگ الگ ہیں۔

مرجیہ کا قول یہ ہے:

"موحدین آگ میں داخل نہ ہوں گے چاہے تمام کبائر اور فسق کا ارتکاب کر ڈالیں۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے

---

[1] الحجرات ۹

ان کے ایمان میں نقص نہیں آتا۔"

اور معتزلہ کا قول یہ ہے:

"فاسق آدمی مومن نہیں۔ اگر توبہ کے بغیر وہ کسی صغیرہ گناہ میں ملوث بھی مرگیا تو وہ ضرور دوزخ میں جائیگا۔ اور وہاں سے نہیں نکلے گا اور کافروں کے ہمراہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔"

اور صحیح مسلک یہ ہے کہ فاسق آدمی مومن ضرور ہے۔ اس کا فسق اسے ایمان کے نام و حکم سے خارج نہیں کرتا البتہ وہ صدیقین و شہداء جیسے حقیقی اہل ایمان میں داخل نہیں اور کبائر گناہوں کے مرتکب سزا کے اور آگ میں جانے کے مستحق ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم و جود سے معاف کر دیں اور درگزر فرما دیں جیسے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے:

"تم پر متوسط راہ لازم ہے۔ غلو کرنے والے کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ناراض کو اس کے بارے میں غصہ مٹا دینا چاہیے۔"

علمائے سنت کا وصف بیان کرتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر خلف سے اس علم کا عدول ہی حامل ہوگا جو غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کے نئے مذاہب اور جاہلوں کی تاویلات کا رد کریں گے۔ چنانچہ غالین وہ ہیں جو سنن و آثار سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ مبطلین وہ ہیں جو رائے و قیاس سے دعوے باندھتے پھرتے ہیں (یعنی جو قیاس خلافِ کتاب و سنت ہو) جاہلین سے مراد شطحیات میں مبتلا گمراہ صوفی ہیں اور عدول سے مراد وہ آدمی ہے جو سلف کے طریقِ صالح کا اتباع کرے اور دین میں بدعات جاری کرے۔ اہل ایمان کے طریقہ میں مداخلت نہ کرے اور یہ دراصل اخبار و آثار کے حامل محدثین اور فقہائے امت ہیں۔ ہمارے اس قول کی توضیح و تصحیح یہ فرمانِ الٰہی کرتا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ (آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا)

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے اور یہ آیت فرائض نازل ہونے اور شریعت کی تکمیل ہو جانے کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ حج کی فرضیت نازل ہونے کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری حج ہے۔ اس پر قرار کا اجماع ہے اور فقہاء کا اتفاق ہے۔ قرآن مجید میں یہ آخری نازل ہونے والی آیت ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین ماہ اور تین دن زندہ رہے۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت عرفہ کے دن ۹ ذی الحجۃ کو نازل ہوئی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۱۲۔ ربیع الاول کو ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام احکام اور حلال و حرام کے اوامر نازل فرمائے اور پھر فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ (آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا)

اکمال کا معنی ہے ایک چیز کا مکمل کرنا جس کے بعض کا بعض حصہ سے تعلق ہوتا ہے اور اکمل نہیں کہا کہ بعض، بعض سے پہلے ہو اور جب تمام کا تمام پایا گیا تو اب وُہ کامل و مکمل ہُوا۔ اس کلمہ کی یہ حقیقت ہے۔ جب ایمان کا معاملہ مکہ میں گزر چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کر کے فرائض اتار دیے اور دین کا اکمال ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کا بعض، اس کے اکمل کی طرف بعض سے متعلق ہے۔ چنانچہ اعمال دراصل ایمان سے متعلق ہُوئے اور یہ دونوں' دینِ مکمل ہیں۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

بعض مرجیہ کا جو یہ قول ہے کہ ابلیس مومن ہے۔ اس لیے کہ اس نے ایمان کا اقرار کیا۔ یہ کہہ کر دراصل اس کا اپنا مذہب ہی باطل ہو گیا اور قسم ہے کہ ابلیس ملعون تو اللہ کو ایک سمجھتا ہے اور جانتا ہے۔ البتہ اس نے توحید پر عمل نہیں کیا اور جس کو جانا اور جس کو مانا اس کی اطاعت نہیں کی۔ اس لیے کہ وُہ کافر ہے۔ رہا ان کا اس قولِ الٰہی سے تعلق :

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ[1] (پھر ان کو بدلہ دیا ان کے رب نے، اس کہنے پر، باغ، نیچے ان کے بہتی نہریں)

تو اس نے جنّت کے لیے قول کو شرط قرار دیا یا باغات (جنّات) کو قول سے معلق کیا۔ یہ دراصل تخصیص قول کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اثبات ہے اور یہ فیصلہ ایمان و یقین کا ہے اور وہ اس قول کو پناہ اور منافقین کی طرح اسے ڈھال نہیں بناتے۔ اس لیے کہ گا ہے منافقین نے بھی ان کے قول کی طرح کہا۔ البتہ اللہ تعالےٰ نے ان کے باطن کی خبر دی کہ وہ اس کے برعکس ہے۔ فرمایا:

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ[2] (اس دن کفر کی طرف نزدیک ہیں ایمان سے، کہتے ہیں اپنے منہ سے جو نہیں ان کے دل ہیں)

چنانچہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے یہ بتایا کہ ان کا قول، مومنوں کا قول ہے اور ان کا قول ان کے اعمال سے ایمان ہے اس لیے کہ وہ عمل کی بجائے صرف قول کے ساتھ ہی منفرد تھے۔

اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حق کا قول' ایمان سے ہے۔ اور اس پر وُہ ثواب کا مستحق ہے۔ اس لیے

---

[1] المائدہ ۸۵۔

[2] آل عمران ۱۶۷۔

کہ نیکی کے اعمال بمنزلہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ہیں۔ اور اگر اس کے اندر یہ دلیل تلاش کی جائے کہ صرف قول ہی کافی ہے اور یہی سارا ایمان ہے اور ایمان قول کا ہی نام ہے۔ عمل کی ضرورت نہیں تو یہ باطل قول ہے جس کو ہم مذکورہ صفحات پر بیان کر چکے ہیں اور ان آیات کا استدلال دے کر ثابت کر چکے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اعمال کو شرط قرار دیا اور کفار کے بارے میں فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔ (سو اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو)

مزید برآں اس آیت سے مرجبہ کا دعویٰ بھی باطل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا:

فلم یثبہم اللہ الا بما قالوا جنت۔

بلکہ یہ فرمایا:

فاثابہم اللہ بما قالوا جنت۔

چنانچہ یہ بتایا کہ ان کے حق کہنے اور اقرار و قول پر انہیں اجر دیا جیسے کہ فرمایا:

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا[۲] (سو ان کے لیے ہے بدلہ دوگنا ان کے کیے پر)

پھر اس فرمان کے ساتھ اسے مقید و محکم فرمایا۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ[۳] (اور انہیں یہی حکم ہوا کہ وہ عبادت کریں اللہ، اسی کے لیے خالص کر کے اس کے لیے بندگی ابراہیم کی راہ پر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں)

مگر ان کی حالت ایسی ہے جیسے کہ فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ[۴] (سو جن کے دل پھرے ہوئے ہیں وہ لگتے ہیں ان کی ڈھب والیوں سے، تلاش کرتے ہیں گمراہی اور تلاش کرتے ہیں ان کی کل بٹھانی (تاویل))

اور جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم ان لوگوں کو دیکھو کہ جو قرآن میں متشابہ (آیات) پر عمل کرتے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ نے مراد لیے

---

[۱] التوبہ ۵ — [۲] سبا ۳۷

[۳] البینۃ ۵ — [۴] آل عمران ۷

ان سے بچ کر رہو۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مقامات میں اعمال کو ایمان کے ساتھ ملا دیا۔ مرجیہ گروہ اس وضاحت و احکام کو کچھ بھی نہ سمجھ سکے اور جب ایک جگہ مجمل فرمان آیا تو اس سے چپک کر رہ گئے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو قسمیں ایسی ہیں کہ انہیں اسلام میں کچھ حصہ حاصل نہیں"۔

اور دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"انہیں میری شفاعت حاصل نہ ہوگی۔

۱۔ قدریہ

۲۔ مرجیہ۔"

ایک غریب حدیث میں ہے:

"دو گروہ جنت میں نہ جائیں گے۔ جس نے یہ کہا کہ ایمان، کلام ہے۔"

حضرت حذیفہؓ نے اسے روایت کیا اور فرمایا:

"میں دوزخ میں جانے دو (مختلف) مذاہب والوں کو جانتا ہوں۔ ایک قوم شریر اور بے علم ہے اور ایک قوم آخری زمانہ میں ہوگی"۔ وہ کہیں گے:

"وہ ہزاروں تھے اور گمراہ تھے۔"

ہم اللہ تعالیٰ سے فہمِ آیات سے محرومی سے عافیت مانگتے ہیں۔ اللہ ہمیں تکبر میں مبتلا نہ کرے۔ ہمیں سیدھی راہ پر چلائے۔ اور اس کی راہ پر رہنے کی توفیق بخشے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سرکشی اور غلط راہ سے بچائے رکھے، جیسے کہ مبتلائے آفات لوگوں کے بارے میں فرمایا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا[۵۷]

(پھیر دوں گا اپنی آیات سے ان کو، جو بڑائی ڈھونڈتے ہیں ملک میں ناحق، اور اگر دیکھے ساری نشانیاں یقین نہ کرے ان کو، اور اگر دیکھے راہ سنوار کی، وہ ٹھہرائیں راہ، اور اگر دیکھے راہ الٹی تو اس کو ٹھہرائیں راہ)

ایمان میں استثنا، اور نفاق کا خوف

ایمان میں استثنار ایک سنتِ ماضیہ ہے۔ خوف و تقصیر کے مفہوم پر اور نفس کے لیے پاکیزگی جتانے کو مکروہ جاننے کے طور پر ائمہ سلف کا طریقہ ہے۔ یہ بات نہیں کہ انہیں ایمان میں (نعوذ باللہ) شک تھا اور نہ ہی

---

۵۷ الاعراف ۱۴۶۔

تصدیق میں شبہ کے طور پر ایسا کرنے ، اس لیے کہ ایمان کے مختلف مقامات ہیں اور اہلِ ایمان کے مختلف درجات ہیں ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا وصف بیان فرمایا :

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۔ (وہی ہیں مومن سچے)

اس میں ان کا وصفِ کمال اور اعمالِ صالحہ کی عاداتِ طیبہ بیان کیں اور اس اندازِ خطاب سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بعض غیر حقیقی مومن ہیں (جن کا درجہ بلند نہیں) فرمایا :

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِھُوْنَ یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ [1] (اور ایک جماعت ایمان والی نہ راضی تھی ۔ تجھ سے جھگڑتے تھے درست بات میں ، واضح ہو چکی کے بعد)

اور دوسروں کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا :

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ (اے ایمان والو تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں)

اور سچے مومنین کے بارے میں فرمایا :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ [2] (ایمان والے وہ ہیں جو یقین لائے اللہ اور اس کے رسول پر ، پھر شبہ نہ کیا اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں لڑائی کی ۔ وہی جو ہیں وہی ہیں سچے)

اسی طرح انہی کا ایک جگہ یوں وصف بیان کیا :

وَ لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ یہاں سے لے کر اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ تک بیس اوصاف بیان کیے ۔ چنانچہ اس کی محبت پر مال خرچ کرنا ، ایفائے عہد کرنا ، امراض و عبرک پر صبر کرنا اور آفات پر صبر کرنا انہی میں سے ہیں ۔ ان اوصاف کے بعد ہی ان کے لیے صدق و تقویٰ کی گواہی دی ۔

اہلِ یقین محبوبین کا وصف کرتے ہوئے فرمایا :

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ [3] (بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال خرید لیے)

---

[1] الانفال ۵ ، ۶ [2] الحجرات ۱۵
[3] التوبہ ۱۱۱

اورعوام اہلِ ایمان کا وصف بیان کرتے ہُوئے فرمایا،

وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ وَلَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْهَا فَیُحْفِکُمْ تَبْخَلُوْا وَ یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ [۱]

(اور اگر تم یقین لاؤ گے اور بچ چلو گے، تو دے گا تم کو تمہارے اجر، اور نہ مانگے گا تم سے مال تمہارے، اگر مانگے تم سے وُہ مال، پھر تنگ کرے تو بخیل ہو جاؤ، اور کھول تمہارے دل کی خفگیاں)

اب جس کی تعریف یوں ہُوئی کہ یہ مجاہد اور سچا ہے۔ اس کے درمیان اور اس کے درمیان کہ جس کی تعریف میں یہ کہا کہ یہ پیچھے رہنے والا اور ناراضگی کا سامنا کرنے والا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس طرح جس کو حقیقی مومن کہا اس کے اور جس کو حق کے بارے میں جدال کرنے والا کہا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

جس کا جان و مال قبول ہوا اس کے اور جس کا جان و مال رد کر دیا گیا ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ اس لیے کہ موءخر الذکر کا بخل واضح ہے حالانکہ ایمان کا نام دونوں کو شامل و حاوی ہے البتہ بعض کا ایمان زیادہ بلند درجہ کا ہے اور بعض کا کم درجہ کا ہے۔ ان میں باہمی فرق ہے جیسے کہ فرمایا:

یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ [۲]

(اللہ اونچے کرے ان کو جو ایمان رکھتے ہیں تم میں، اور جن کو علم دیا گیا ان کے بڑے درجے)

اور جیسے کہ فرمایا:

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی [۳]

(ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو خرچ کرے اس سے پیچھے اور لڑے، اور سب کو وعدہ دیا اللہ نے خوبی کا)

یعنی درجات کے مطابق ان کے لیے جنت ہے۔ چنانچہ جس طرح ان کو اسمِ ایمان میں جمع کیا اسی طرح دارِ جنت میں ان کو جمع کیا البتہ مقامات میں انہیں بلند درجات عطا فرمائے جیسے کہ فرمانِ الٰہی ہے:

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا

(لوگ کئی درجے ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتے ہیں

---

[۱] محمد ۳۶، ۳۷

[۲] المجادلۃ ۱۱

[۳] الحدید ۱۰

يَعْمَلُوْنَ ۔[1]

ایک روایت میں ہے :

"ایمان برہنہ ہے اور اس کا لباس تقویٰ ہے ۔ اس کا زیور ورع ہے اور اس کا پھل علم ہے" اس میں یہ دلیل پائی گئی کہ جس کا تقویٰ نہیں اس کے ایمان کا لباس نہیں ۔ جس کا ورع نہیں اس کے ایمان کی زینت نہیں ۔ جس کو علم نہیں اس کے ایمان کا پھل نہیں اور اگر ایسا اتفاق ہو کہ وہ فاسق ظالم اور جاہل ہو تو وہ آدمی مومنوں کی بجائے منافقین سے زیادہ مشابہ ہے اور اس کا ایمان نفاق کے قریب تر ہے ۔ اس کے یقین میں شک کی جانب میلان زیادہ پایا جا رہا ہے مگر ایسا ہونا اسے اسمِ ایمان سے خارج نہیں کرتا ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے ایمان کا لباس نہیں اور اس کے لیے کچھ پھل نہیں جیسے کہ فرمایا :

اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۔[2] (یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی کی تھی)

علاماتِ نفاق

نفاق کے کئی مقامات ہیں ۔ ایک قول کے مطابق ستر مقاماتِ نفاق ہیں اور اسی طرح شرک میں بھی کئی طبقات ہیں ۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"چار باتیں، جس میں یہ ہوں گی وہ خالص منافق ہے، چاہے روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور یہ سمجھے کہ وہ مومن ہے جو بات کرے تو جھوٹ بولے ۔

جب وعدہ کرے تو توڑ دے ، جب اسے امین بنایا جائے (اس کے پاس امانت رکھی جائے) تو خیانت کرے ، اور جب جھگڑے تو فحش گوئی کرے ۔"

اور بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں :

"اور جب عہد کرے تو غدر کرے ۔" (دھوکہ دے اور توڑ دے) چنانچہ اب یہ پانچ علامات بن گئیں جس کے اندر ان میں سے ایک خصلت ہے ۔ اس میں ان کا ایک شعبہ ہے جب تک کہ اسے چھوڑ نہ دے ۔

قلوب چار ہیں

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے :

"قلوب چار ہوتے ہیں ؛ صاف ترین قلب ، جس میں چراغ روشن ہے ۔ یہ مومن کا قلب ہے ، ایک مصفح قلب ہے اس میں ایمان و نفاق ہے ۔ اس میں ایمان کی مثال ایک سبزی کی طرح ہے ، جس کو

---

[1] آل عمران ۱۶۳

[2] الانعام ۱۵۹

شیریں پانی دراز کرتا ہے ۔ اور اس میں نفاق کی مثال ایک پھوڑے کی طرح ہے جس کو پیپ اور کچلہو کھینچتا ہے (بڑھاتا ہے) جس کھنچاؤ کی زیادتی ہوئی ۔ اس کا حکم لگ جائے گا ۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں :

"ان دونوں میں سے جو غالب آئی وہ اسے بہالے جائے گی۔"

ایک حدیث میں ہے :

"ایمان کی ستر اور کچھ شاخیں ہیں ۔ سب سے بلند ترین یہ ہے گواہی دینا کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور ادنیٰ ترین یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹا دے۔" ایمانی اخلاق کی بعضیت کرنے میں اور دقائق شریک اور شعبہ ہائے نفاق پائے جانے میں ایسی بات ہے جو کمالِ ایمان میں موجبِ استثناء ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ یہ جائز ہے کہ قلب میں ایمان و نفاق دونوں کا اجتماع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ قلب میں نفاق کا کوئی شعبہ پایا جائے اور ایمان کے بعض شعبے نہ پائے جائیں ۔

دیکھیے حدیث میں آتا ہے :

"میری امت کے اکثر منافق اس کے قراء ہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے :

"میری اُمت میں شرک ، صاف (جگہ) پر چیونٹی رینگنے سے بھی مخفی تر ہے۔"

حضرت حذیفہؓ نے فرمایا :

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی ایک کلمہ بولتا تو وہ موت تک منافق شمار ہوتا اور میں اب ویسے کلمات تم سے ایک دن میں دس بار سنتا ہوں۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حدیث میں ہے :

"ایمان ، ایک سفید چمک بن کر ظاہر ہوتا ہے جب بندہ نیک اعمال کرتا ہے تو وہ بڑھ جاتی ہے ۔ آخر سارا قلب سفید ہو جاتا ہے اور نفاق ، ایک سیاہ نقطہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے ۔ جب محرمات کو توڑتا ہے (حرام اور ممنوعات کا ارتکاب کرتا ہے) تو وہ مکمل ہو جاتا اور بڑھ جاتا ہے ۔ آخر سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور اس پر مہر لگ جاتی ہے یہی ختم (مہر بر قلب) ہے ۔ پھر فرمایا :

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [1] (کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے)

---

[1] المطففین ۱۴۔

یہ تمام چیزیں دراصل مخفی شرک اور دقیق قسم کے نفاق پائے جانے کے خطرات کے باعث استثنار در ایمان کی موجب ہیں اور یہ خطرہ ہوتا ہے کہ حقیقت و کمال کا دعویٰ ہو رہا ہو اور معاملہ برعکس ہو۔ اس لیے کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ "میں حقیقی مومن ہوں" اس نے اپنے آپ کا تزکیہ بیان کیا اور رب تعالیٰ کی نافرمانی کی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کا تزکیہ بیان کرنے کی ممانعت فرمائی اور تزکیہ کرنے والے نے اپنے نفس کو اس فرمان میں جھوٹ کے سامنے لاکھڑا کیا۔ فرمایا:

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔

اور فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (تو نے نہ دیکھے وہ جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں بلکہ اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے جس کو چاہے)

پھر فرمایا:

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ (دیکھو کیسا باندھتے ہیں جھوٹ اللہ پر)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایک طرح میں سے فرمایا:

وَلَا اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْئًا۔ (اور میں ڈرتا نہیں ان سے جن کو شریک ٹھہراتے ہو اس کا مگر کہ میرا رب کچھ چاہے)

اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا:

وَمَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا (اور ہمارا کام نہیں کہ پھر آویں اس میں)

یعنی ملتِ کفر کی طرف۔

اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا۔ (مگر یہ کہ اللہ چاہے رب ہمارا)

ان سب کی وسعتِ علم اور مشیتِ سابقہ کی علت بتائی۔ اب اللہ تعالیٰ کے وسعتِ علم اور اس کی مخفی مشیت میں کوئی بھی بے خوف نہیں ہو سکتا اور یہ خوفِ مکر ہے۔

حقیقتِ مکر کے دو مفہوم ہیں:

۱۔ ایک چیز کو ظاہر کرے اور اس کے برعکس معاملہ کو چھپا دے۔

۲۔ اطمینان و عزت کے بعد پوشیدہ اور مخفی کو ظاہر اور واشگاف کر دے اور انبیاء علیہم السلام اپنے

شرف وفضل اور بلند مقام کے باوجود، خوفِ مکر کے باعث استثنا فی الکفر کرتے ہیں اور ایک جاہل کمزور ایمان کا آدمی ایمان میں استثنا نہیں کرتا ہے اور ظاہری حالت سے دھوکہ و فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اسلام اور تمام اعمالِ خیر میں بھی استثنا ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ کیا خبر، کون سا قبول ہوگا۔ نہ کیا قبول ہو جائے، اور ظاہری معاملہ دُوسرا ہو اور ازل میں کچھ اور ہو۔ اس لیے کسی حال میں بھی استثنا کو نہ چھوڑنا چاہیے۔ (یعنی ہر حال میں ڈرے اور سوچے کہ خدا معلوم کیا ہوگا اور اللہ ہی چاہے گا تو کام بنے گا۔)

بعض علما نے اس فرمان کی توضیح میں بتایا:

"جَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ [1] (اور آئے بے ہوشی موت کی تحقیق)

فرمایا، حکم سابق ہے۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"آخری اعمال کا وزن ہوگا اور حضرت ابوالدرداء اللہ کا حلف اٹھا کر فرمایا کرتے،

"جو آدمی بھی سلبِ ایمان سے بے خوف ہوا، اس کا ایمان سلب ہوگیا۔"

کہا کرتے ہیں: کہ

"بعض ایسے گناہ بھی ہیں جن کی سزا سوءِ خاتمہ تک مؤخر کر دی جاتی ہے اور یہ سب سے بڑا خطرہ ہے، جس سے عمل کرنے والے ڈرتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّن دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا عَامِلُونَ [2] (اور ان کے اعمال ہیں اس کے سوا، کہ وہ ان کو کر رہے ہیں)

بتاتے ہیں کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی سزا یہی ہے کہ آخری وقت میں توحید (ایمان) سلب کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سزا سے اپنی پناہ میں رکھے۔

بتاتے ہیں:

"یہ سزا اس صورت میں ملتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر افترا باندھتے ہوئے ولایت اور کرامات کے دعوے کرتا پھرے۔"

---

[1] قٓ ۱۹

[2] المومنون ۶۳

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ،

" اولیاء کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں استثناء کرتے ہیں "

فرمایا " جس نے یہ کہا کہ میں یہ کام کروں گا اور ان شاء اللہ (اگر اللہ نے چاہا) نہ کہا تو قیامت کے روز اس قول پر پرسش ہوگی۔ چاہے تو اسے سزا دے اور چاہے تو بخش دے "

اللہ تعالیٰ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز میں استثناء کرنے کا حکم دیا اور بتایا کہ اگر بھول جاؤ تو استثناء کرو (ان شاء اللہ کہو) - اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ [1] (اور تو کسی چیز کے لیے ہرگز نہ کہنا کہ میں کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے)

پھر فرمایا :

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ ۔

یعنی استثناء کرو (ان شاء اللہ کہو) جب بھی یاد آجائے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ ترین ادب سکھایا اور آپ ہر چیز میں ان شاء اللہ فرمایا کرتے۔ جب بھی کچھ کام کرنے یا ہونے کا بتاتے۔

مروی ہے :

" آپ قبرستان میں تشریف لے گئے تو کہا ،

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ۔ (تم پر سلامتی ہو، مومن قوم کا گھر ہے اور ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو استثناء کرنا اور ہر کام میں اللہ کی مشیت کی طرف اسے سپرد کرنا سکھایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ [2] (داخل ہو رہو گے ادب والی مسجد میں اگر اللہ نے چاہا چین سے)

او راستثناء اصل ہے جو اسے سمجھ لے۔ وہ ہر کام خدا کی مشیت کے سپرد کرتا ہے اور اس کا انکار نہیں کرتا اور اصل میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ بیشی یوں ہوتی ہے کہ قرآن پاک کی نص میں ہے۔

---

[1] الکہف ۲۳ ، ۲۴

[2] الفتح ۲۷

وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى[1] (اور زیادہ کرے اللہ ان کو جو ہدایت پر ہیں، ہدایت)

اور فرمایا،

فَزَادَهُمْ اِيمَانًا۔ (پھر زیادہ آیا ان کو ایمان)

اسی طرح دوسری نظائر بھی ملتی ہیں اور جو چیز زیادہ ہو سکتی ہے اس میں کمی بھی آ سکتی ہے اور خطابِ الٰہی پر غور کریں تو اس کا مفہوم قرآن مجید میں مل جاتا ہے۔ فرمایا:

وَ لَا يَزِيدُ الظّٰلِمِينَ اِلَّا خَسَارًا۔ (اور گناہگاروں کو یہی بڑا ہے نقصان)

اور فرمایا،

وَ لَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا[2] (اور اس حکم سے جو تجھ کو اترا تیرے رب کی طرف سے، ان کو بڑھے گی شرارت اور انکار)

اور فرمایا:

وَ فِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔

ایک جگہ یوں فرمایا:

وَ اَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ[3] (اور جن کے دلوں میں آزار ہے سو ان کو بڑھائی گندگی پر گندگی)

چنانچہ ظالموں کے لیے خسارہ میں اضافہ ہوا، کفر میں اضافہ ہوا اور ایمان کی کمی ہو گئی اور ان کا اندھاپن ان کی بصیرت میں کمی کرتا رہا اور ناپاکی کے باعث ان کی طہارت میں کمی آ گئی۔ اس طرح کہ شر بڑھے گا تو خیر میں کمی آ جائے گی جیسے کہ خیر بڑھنے سے شر میں کمی آ جاتی ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اعمالِ صالحہ سے ایمان بڑھتا (قوی ہوتا) ہے اور برائیوں سے کم ہوتا (کمزور پڑتا) ہے تو اس میں بھی استثناء لازم ہوا۔ اس لیے کہ صالحات دراصل درجات ہیں جن کے ذریعہ ایک مومن حسنِ ولایت اور حسنِ مجاہدہ کی وجہ سے ان میں رفعت حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مجمل خطاب میں فرمایا،

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (اور ہر ایک کے لیے درجات ہیں اس سے جو انہوں نے کیا)

---

[1] مریم ۷۶

[2] المائدہ ۶۴

[3] التوبہ ۱۲۵

اسی طرح فرمایا:

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[1] (اور وہ ان کا کارساز ہے بوجہ اس کے کہ وہ تھے عمل کرتے)

فرمایا:

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے لے کر وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا تک[2]۔ (برابر نہیں بیٹھنے والے مسلمان، جن کو بدن کا نقصان نہیں اور لڑنے والے اللہ کی راہ میں ..... الخ)

حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی حدیث میں ہے:

"ایمان بڑھتا اور گھٹتا ہے۔" صحابہؓ کی ایک جماعت اور بے شمار تابعینؒ سے یہی مروی ہے۔

چند اہم اقوال

حضرت احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا:

"استثناء فی الایمان کا کیا مطلب ہے؟"

فرمایا: "کیا ایمان، قول و عمل نہیں ہے؟"

کہا گیا: "ہاں"

فرمایا: "قول کی تصدیق کرنا اور عمل کے ساتھ استثناء کرنا (ان شاء اللہ کہنا)"۔

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"جو آدمی یہ سمجھے کہ میں بری ہوں وہ نفاق کے قریب ترین ہے۔"

ایک بار فرمایا:

"جو زیادہ بے خوف ہو۔"

عفرۃؓ کے آزاد کردہ غلام عمرؒ نے فرمایا:

"سب لوگوں سے زیادہ نفاق کے قریب وہ ہے جو اس سے نفس کو پاک بتائے۔ جس میں اس کے قلب کو راحت نہیں اور نفاق سے دور تر وہ ہے جو اس سے ڈرتا ہو کہ وہ اس کی حقیقت سے نجات نہیں پائے گا۔" (یعنی خطرۂ نفاق ہو)

---

[1] الانعام ۱۲۸

[2] النساء ۹۵

حضرت بشر بن حارثؒ فرماتے ہیں :

" مدح کی طرف قلبی سکون ہونا گناہوں سے زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے "۔

حضرت سہلؒ فرماتے ہیں :

" عالم کی غفلت یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی طرف پرسکون ہو اور جاہل کی غفلت یہ ہے کہ وہ کسی چیز پر فخر کرے اور مشائخؒ کے نزدیک سکون ہونا دراصل ایک دعویٰ ہے اور دعویٰ کرنا معصیت میں داخل ہے "۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں :

" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے آج منافقین زیادہ ہیں۔ اس زمانہ میں وہ نفاق کو چھپاتے تھے اور آج نفاق کو ظاہر کرتے ہیں "۔

حضرت حسنؒ سے پوچھا گیا :

" ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ آج نفاق نہیں پایا جاتا "۔

فرمایا : " اے برادر زادے ! اگر منافق ہلاک ہو جائیں تو تم راہوں میں وحشت زدہ ہو کر رہ جاؤ "۔

ان سے اور کسی دوسرے بزرگؒ سے منقول ہے :

" اگر منافقین کو دُم لگ جائیں تو ہم (کثرت کے باعث) زمین پر نہ چل سکیں "۔

حضرت ابن عمرؓ نے ایک آدمی کو حجاج پر طعن کرتے سنا ، فرمایا :

" اگر وہ یہاں ہوتا تو کیا تم اس کے بارے میں ایسا ہی کلام کرتے جیسے کہ ابھی کیا ہے ؟ "

کہا : " نہیں "۔

فرمایا : " جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم اسے نفاق شمار کرتے تھے "۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" جو آدمی دنیا میں دو زبانوں والا ہو (دو رُخا ہو)، آخرت میں آگ کے اندر ان کی دو زبانیں کر دی جائیں گی "۔

ایک دوسری روایت میں ہے :

" دو رُخا (آدمی) سب لوگوں سے بدتریں ہے۔ ان سے اس رُخ سے ملے اور اُن سے اُس رُخ سے ملے "۔ (یہاں کچھ باتیں کرے اور وہاں اس کے برعکس باتیں کرے)

حضرت حسنؒ سے پوچھا گیا ،

" ایک جماعت کا قول ہے کہ ہم نفاق سے نہیں ڈرتے "۔

فرمایا: "اللہ کی قسم مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میں نفاق سے بری (اور پاک) ہوں۔ یہ بات مجھے زمین بھر کر سونے سے زیادہ محبوب ہے۔"

نفاق کی اقسام

حضرت حسنؒ کا فرمان ہے:

• زبان و قلب کا مختلف ہونا، ظاہر و باطن اور اندر و باہر کا اختلاف، نفاق سے ہے۔"

حضرت حذیفہؓ کو ایک آدمی نے کہا:

"مجھے یہ ڈر ہے کہ میں منافق نہ ہو جاؤں۔" (اپنے منافق ہونے سے ڈرتا ہوں)

فرمایا: "اگر تو منافق ہوتا تو منافق ہو جانے سے نہ ڈرتا۔" اس لیے کہ منافق آدمی نفاق سے بے خوف ہوتا ہے کیونکہ نفاق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ نفاق جو انسان کو ملتِ اسلام سے خارج کر دے۔ یہ وہ نفاق ہے کہ جب کوئی آدمی اللہ کے دین میں ہی شک کرنے لگ جائے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو رد کر دے۔

۲۔ ایک نفاق وہ ہے جو اسلام سے خارج نہیں کرتا مگر ایمان میں نقص پیدا کر دیتا ہے۔ حقیقی ایمان چلا جاتا ہے ایمانی انوارات کو بجھا دیتا ہے۔ مزید ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔ اعمال کو برباد کر دیتا ہے۔ اللہ کی ناراضگی اور اعراض کا باعث ہوتا ہے۔ یہ نفاق دراصل ریاکاری، مداہنت، مخلوق کی خاطر تصنع کرنے، حق کا دکھاوا کرنے، زبان کی شیریں اور الفت دکھانے اور قلوب کے تنفر، قول و عمل کے تفاوت، مامورات سے ہٹ کر ممنوعات کے ارتکاب کرنے، ظاہر و باطن کے اختلاف اور بواطن پر ظواہر کا اضافہ کرنے کا نام ہے۔ سلف کا نفاق سے ڈرنا اسی مفہوم سے تھا اور اسی قسم کے نفاق سے وہ حضرت لرزاں و ترساں رہا کرتے۔

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے تھے:

"حقیقی ریاکار وہ ہے کہ جس کا ظاہری حال اچھا ہو۔ عوام و علماء میں سے کوئی کسی بات میں اس پر انکار نہ کریں مگر اس کا باطن خراب ہو۔"

حضرت حسنؒ اور ان کے اصحاب بدعتی لوگوں کو منافقین کہا کرتے۔ حضرت ابن سیرینؒ اور ان کے اصحاب ان کو خوارج کا نام دیتے۔

حضرت ابن ابی ملیکہؒ فرماتے ہیں:

"میں نے ایک سو تیس اور ایک روایت میں پانچ سو اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا وہ اپنے آپ پر نفاق سے ڈرتے رہتے ہیں۔"

ایک بار فرمایا: "ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو کہتا ہو کہ میں جبرئیل و میکائیل علیہما السلام کے

ایمان (کے درجہ) پر ہوں"۔

بدعت کا مفہوم

حضرت علیؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

" ارجاء بدعت ہے"۔

حضرت ابوایوبؒ نے فرمایا:

" میں ارجاء سے بڑا ہوں"۔ (دُور ہوں) اور سب سے پہلے مدینہ کے ایک آدمی نے ارجاء کا نظریہ پیدا کیا اور اس آدمی کا ذکر کیا۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں،

" اللہ تعالیٰ اس دین پر لعنت کرے اور میں اس سے بڑا ہوں اور ارجاء (مرجیہ) کا مذہب حجاج کی گورنری کے زمانہ میں ابنِ اشعث کی شکست کے بعد ظاہر ہُوا"۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا:

" جس نے کہا کہ میں اللہ کے نزدیک مومن ہوں وُہ جھوٹوں میں سے ہے اور جس نے کہا کہ میں مومن ہوں حقیقی طور پر، تو بدعت ہے"۔

پُوچھا گیا:

" تو پھر کیا کہے؟"

فرمایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ [1] (تو کہو، ہم نے یقین کیا اللہ کو، اور جو اترا ہم پر، اور جو اترا ابراہیم پر)

حضرت حسنؒ سے کسی نے پوچھا،

" کیا آپ مومن ہیں؟"

فرمایا: " اِن شاء اللہ"۔

پوچھا گیا" اے ابوسعید، ایمان میں آپ استثناء کرتے ہیں؟"

فرمایا" مجھے ڈر ہے کہ میں" ہاں" کہوں اور اللہ کہے:

" اے حسنؒ! تُو نے جھوٹ کہا اور مجھ پر کلمۂ الٰہی لازم ہو جائے"۔

---

[1] البقرہ آیت ۱۳۶۔

فرمایا کرتے :

"مجھے اس بات نے خائف کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہیں میرے اندر کچھ ناپسندیدہ بات دیکھی ہو اور مجھ پر ناراض ہو اور یہ کہہ دے: "جاؤ میں کبھی بھی تیرا عمل قبول نہیں کروں گا اور میں بے نتیجہ طور پر عمل کرتا رہوں"۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ:

"یہ پوچھنا بدعت ہے کہ تو مومن ہے؟"

اور بعض علماء فرمایا کرتے:

"جب تجھے پوچھا جائے کہ کیا تو مومن ہے؟ تو یوں کہو:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ۔ (میں اللہ پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا)"

ہم مومن ہیں

حضرت ابراہیمؒ فرماتے ہیں:

"جب تجھ سے کوئی پوچھے کہ کیا تو مومن ہے؟ تو یوں کہو" مجھے ایمان میں شک نہیں اور تیرا سوال بدعت ہے"۔

حضرت ثوریؒ نے حسن بن عبیداللہ سے، انہوں نے ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا:

"جب تجھ سے پوچھا جائے کہ تو مومن ہے؟ تو یوں کہہ دو:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں)"

حضرت منصورؒ نے ابراہیمؒ سے نقل کیا کہ حضرت علقمہؓ سے پوچھا گیا:

"کیا آپ مومن ہیں؟"

فرمایا: "مجھے اس کی ان شاء اللہ امید ہے؟"

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے:

"ہم اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ہم نہیں جانتے کہ ہم اللہ کے نزدیک کیا ہیں؟"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"میں ایمان کے ساتھ مومن ہوں مجھے (ایمان میں) کچھ شک نہیں اور میں یہ نہیں جانتا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں یا نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ (وہی ہیں مومن پکے)"۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں: "اگر میرے سامنے یہ پیش کیا جائے کہ گھر کے باہر دروازہ پر ہی شہادت ہو

اور کمرے کے دروازہ پر توحید کی حالت میں موت ہے تو میں شہادت پہ موت کو ترجیح دوں گا۔"

پوچھا گیا: "کیوں؟"

فرمایا: "اس لیے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ کمرے کے دروازے سے چل کر گھر کے دروازہ تک پہنچتے پہنچتے میرے قلب میں توحید کے بارے میں کیا کیا تغیرات آجائیں۔"

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"میں نے بعض حکام کو منبر پر ایسا کلام کرتے دیکھا کہ ارادہ کیا اُٹھوں اور ان پر انکار کروں۔ اس میں یہ خطرہ تھا کہ وُہ مجھے قتل کرنے کا حکم کر دے گا۔ مجھے مرنے کی کچھ پروا نہ تھی۔ البتہ یہ ڈر تھا کہ میرے قلب میں یہ بات آئے گی کہ میں نے حاکم کو نیکی کا حکم دیا اور رُوح نکلتے وقت یہ خیال آئے گا کہ میں اللہ کی راہ میں مارا جا رہا ہوں اور لوگوں کے سامنے مجھے اپنے آپ پر یہ فخر و زینت نظر آئے گی (اسی طرح ریاکاری کا ڈر تھا) اس لیے اس کام سے رُک گیا۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"اگر میں کسی آدمی کو پچاس برس سے توحید پر پاؤں اور پھر میرے اور اس کے درمیان ایک ستون آجائے اور وہ اس (عدمِ ملاقات کی) حالت میں مرجائے تو میں قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وُہ توحید پر مرا۔ اس لیے کہ قلوب میں سُرعتِ تقلیب سے میں آگاہ ہُوں۔"

منصور بن زاذان فرماتے ہیں، کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے کسی سے بھی سوال کیا جاتا تو وُہ فرماتے،

"میں مومن ہوں ان شاءَ اللہ۔"

ابو وائل فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابن مسعودؓ سے عرض کیا کہ میں چند سواروں سے مِلا ہُوں، وُہ کہہ رہے ہیں:

"ہم مومن ہیں۔"

تو فرمایا:

"ارے، انھوں نے یہ نہ کہا کہ ہم اہلِ جنّت میں سے ہیں۔"

حضرت عبداللہ کے اصحاب میں سے ایک نے ایک آدمی سے پوچھا،

"تم مومن ہو۔"

اس نے کہا: "ہاں"۔ اس کے بعد انہوں نے اس کا ذکر حضرت ابنِ مسعودؓ سے کیا۔ فرمایا: "اس سے پُوچھو کہ کیا تُو اہلِ جنّت سے ہے؟"

اس نے کہا: "مجھے امید ہے۔"

فرمایا: "فرمایا: جیسے تو نے دوسری بار (پوچھنے پر) امید کی۔ پہلی بار کیوں نہ امید کی؟"

تابعین میں سے ایک کے لڑکے نے ان کی انگوٹھی پر یہ عبارت لکھ دی:

"فلاں آدمی اللہ کے ساتھ کچھ بھی شرک نہیں کرتا۔"

اس کے والد محترمؒ نے فرمایا:

"یہ عبارت (دعویٰ) شرک سے بھی زیادہ بُری ہے۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"جو آدمی اپنے نفس میں یہ سمجھتا ہے کہ میں نفاق سے بعید ترین ہوں وہ نفاق کے قریب ترین ہے۔"

ایک روایت میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے۔ صحابہؓ نے ایک آدمی کا ذکر کیا اور اس کی خوب تعریف وثنا کی، وہ اس حالت میں تھے کہ وہ آدمی سامنے آیا اور وضو کی وجہ سے اس کے چہرے سے پانی کے قطرات ٹپک رہے تھے اس نے جوتے ہاتھوں میں لٹکا رکھے تھے اور اس کی آنکھوں کے درمیان (پیشانی پر) سجدوں کا نشان تھا۔"

صحابہؓ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ وہ آدمی ہے جس کا وصف ہم نے آغاز میں آپؐ سے عرض کیا تھا۔"

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نظر فرمائی تو فرمایا:

"میں اس کے چہرہ پر شیطان سے سفعہ (اندھیرا) دیکھ رہا ہوں (یعنی شیطانی ظلمت اس کے چہرہ پر نظر آرہی ہے)۔ وہ آدمی آیا۔ اس نے سلام کہا اور لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا:

"میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ جب تو ان لوگوں کے سامنے آیا تو تیرے جی نے یہ کہا تھا کہ ان میں تجھ سے بہتر کوئی نہیں۔"

اس نے عرض کیا:

"ہاں اللہ گواہ ہے۔"

ایک حدیث میں ہے:

"جو یہ کہے کہ میں مومن ہوں تو وہ کافر ہے اور جو یہ کہے کہ میں عالم ہوں تو وہ جاہل ہے اور جو یہ کہے کہ میں جنتی ہوں

تو وہ دوزخی ہے"۔ (یعنی ایسے دعوے باندھنا تکبر اور خطرہ کی دلیل ہے)

شرکِ خفی سے پناہ مانگو

ایک حدیث میں ہے:
"میری امت میں صاف زمین پر چیونٹی کے چلنے سے بھی شرک مخفی تر ہے"۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے:

اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ لِمَا عَلِمْتُ وَ مَا لَمْ اَعْلَمْ۔ (میں بخشش مانگتا ہوں اس کی جو میں جانتا ہوں اور جو نہیں جانتا)

عرض کیا گیا:
"اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپؐ کو خوف ہے؟"
فرمایا: "میں کیسے بے خوف ہو جاؤں جبکہ قلوب، رحمٰن تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ جیسے چاہتا ہے انہیں بدلتا ہے"۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ[1] (اور نظر آیا ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال نہ رکھتے تھے)

یعنی انہوں نے ایسے اعمال کیے جن کو وہ نیکیاں سمجھ رہے تھے اور جب انہیں تولا گیا اور حساب ہوا تو وہ برائیاں نکلیں۔
مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بڑے بڑے عبادت گزاروں کا پتہ پانی کر دیتی ہے اور اس مفہوم میں ایک فرمانِ الٰہی ہے:

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا[2] (اور تیرے رب کی بات پوری سچ ہے اور انصاف کی)

یعنی جس کا ایمان پر خاتمہ ہوا اس کے لیے صدقاً ہے۔ اور جو شرک پر مرا اس کے عدل ہے جیسے کہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ[3] (بے شک جن پر ٹھیک آئی بات تیرے رب کی وہ نہ مانیں گے اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں)

اور فرمایا:

يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ[4] (وہ لوگ پائیں گے جو ان کا حصہ لکھا کتاب میں سے)

---

[1] الزمر آیت ۴۷ [2] سورۂ انعام آیت ۱۱۶
[3] یونس ۹۶، ۹۷
[4] الاعراف ۳۷

وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ[1] (اور ہم دینے والے ہیں ان کو ان کا حصہ بن گھٹایا)

اور فرمایا :

وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (اور اللہ کے اختیار میں ہے تمام امور کا انجام)

فرمایا :

لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ[2] (آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا)

چنانچہ استثناء فی الایمان بھی ایمان ہے اور ہر چیز میں استثناء کرنا اولیاء کی علامت ہے۔ شرک ونفاق سے ڈرتے رہنا مزید ایمان کا باعث ہے تاکہ بندہ کسی چیز کی طرف پرسکون نہ ہو کر رہ جائے اور نہ ہی کسی چیز کے معاملہ میں اپنے نفس کی پاکیزگی بیان کرنے لگے۔

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا :

"اگر ایک آدمی کسی ایسے باغ میں جائے جہاں سب قسم کے درخت ہوں اور ان پر سب طرح کے پرندے ہوں اور ہر پرندہ جُدا زبان میں اس سے کلام کرے اور ہر پرندہ یہ کہے :

" اے اللہ کے ولی، السلام علیک (تجھ پر خدا کی سلامتی ہو) پھر اس کا نفس اس کی طرف سکون حاصل کرے تو وہ آدمی دراصل ان کے پنجوں میں گرفتار ہے۔"

---

[1] ہود ۱۰۹

[2] النمل ۶۵

فصل ۳۶

اہل سنّت کے فضائل

ائمہ سلف کا طریق

سنت کی تعریف و فضیلت

سنت دراصل راہ کو کہا جاتا ہے اور یہ ایک پختہ راہ کا نام ہے۔ کہا کرتے ہیں۔ طریق، طریقہ، سنن، سنتہ، حجۃ اور محجۃ۔

سنت اور اہل سنت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز میں کمی رکھتے ہیں۔ تھوڑی سی چیز عطا ہونے پہ قناعت کرتے ہیں اور اللہ کے لیے ہر چیز میں تواضع اختیار کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے:

"عبادت کی فضیلت، تواضع ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"چار حرف عجب کے ساتھ ہی پائی جاتی ہیں۔ تواضع، جو ابتدائے عبادت ہے، خاموشی، اللہ تعالیٰ کا ذکر اور ہر چیز کی کمی۔"

یاد رہے کہ تواضع، پانچ مفاہیم کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ قول کے ساتھ، فعل کے ساتھ، لباس کے ساتھ، اثاثہ کے ساتھ اور مکان کے ساتھ۔ ایک مومن میں ان میں سے بعض ہوتی ہیں۔ جس میں یہ سب پائی گئیں وہ متواضع ہے اور تکبر، تواضع کی ضد ہے اور وہ بھی ان پانچ کی اضداد کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مومن ان میں سے بعض کے ذریعہ ابتلاء میں پڑتا ہے اور بعض سے وہ عافیت میں رہتا ہے۔ جس میں یہ پانچوں اضداد پائے گئے وہ متکبر ہے۔

قلب میں اس کی حقیقت پائی جاتی ہے اور افعال و اقوال کے ذریعہ ظاہر میں ہوتا ہے۔ پھر متشابہات اور اشکالات علمی و عملی سے پرہیز کرنا۔ ان میں کلام نہ کرے اور نہ عمل کرے اور نہ ہی ان کی نفی یا اثبات کا نظریہ رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ باطل کا عقیدہ رکھنے والا یا حق کی نفی کرنے والا بن جائے۔ بلکہ اس کا عقیدہ یوں ہو کہ اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے میں اسے تسلیم کرتا ہوں اور اللہ کے نزدیک جو حقائق ہیں میں ان پر ایمان لاتا ہوں اہل ایمان کا یہی طریقہ ہے کہ وہ تسلیم و سکوت اختیار کرتے ہیں اور راسخین فی العلم کی یہی تعریف فرمائی۔

جو تسلیم نہیں کرتا اس کے ایمان کی نفی کی۔

اور تسلیم کو مزید ایمان قرار دیا۔ فرمایا:

وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا۔ [1] (اور ان کو اور بڑھا یقین اور اطاعت کرنا)

ایک روایت میں ہے:

"تین امور ہوتے ہیں وہ معاملہ کہ جس کا رشد و ہدایت ہونا واضح ہو جائے۔ اس کا اتباع کرو۔ وہ معاملہ کہ جس کی گمراہی ظاہر ہو جائے اس سے پرہیز کرو، وہ معاملہ کہ جس کے بارے میں اشکال پیدا ہو جائے، اسے اس کے جاننے والے کے سپرد کردو"

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے:

"اس قرآن کا ایک منار (جائے نور اور واضح مقام) ہے جیسے کہ راستہ کا منار (روشنی کا مینار) ہوتا ہے۔ تمہیں اس کی جو آگاہی ہو جائے اس پر عمل کرو اور جو نہ جانو اسے اس کے جاننے والے کے سپرد کردو"

نیز فرمایا کرتے:

"آج تم ایسے دور میں ہو کہ تم میں بہترین وہ ہے جو تیز رو ہو اور عنقریب تم پر ایسا زمانہ آئے گا کہ تم میں بہترین وہ ہوگا جو زیادہ محتاط ہوگا۔ یعنی قرنِ اول میں حق واضح تھا اور بعد کے زمانہ میں شبہات کا دخل ہوگیا اور حق پوشیدہ ہوگیا۔ آج بہترین آدمی وہ ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری سے خوب وابستہ رہے۔ جیسے کہ بتایا کہ اس دور میں خوب خوب اعمال کرنے والا اور اعمالِ صالحہ میں تیزی کرنے والا بہترین تھا۔

تسلیم کا نام ہی ایمان ہے جیسے کہ تصدیق کا نام ایمان ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ بعض تابعین مثلاً جعفر بن محمد کی قرأت میں ہے اور ابو جعفر بن محمد بن علی سے بھی مروی ہے کہ ان دونوں نے اس طرح پڑھا:

وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ۔ (اور ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا)

اور یوں بھی پڑھا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۔ [2] (جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور رہے وہ مسلمان)

اب اگر دونوں ایک ہی مفہوم میں نہ ہوتے تو مقروء (تلاوت شدہ) میں یہ جائز نہ ہوتا کہ وہ مقروء بہ معنی کے خلاف کریں۔

---

[1] الاحزاب ۲۲

[2] الزخرف ۶۹

مشتبہ معاملہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرمان ہے:

"یعنی ایسا معاملہ ہو کہ جس میں ایک لحاظ سے حق سے مشابہت ہو اور ایک اعتبار سے باطل سے مشابہت ہو تو فرمایا:

"اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو، بلکہ یوں کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف نازل ہوا، اس پر اور جو تم پر (پہلے انبیاء پر) نازل ہوا اُن پر ایمان لاتے ہیں"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ' وتعالیٰ نے ہی تورات کو نازل کیا اور وہ حق ہے پھر بتایا کہ لوگوں نے اس میں تحریف کر دی۔ اب ممکن ہے کہ جو وہ خبریں دے رہے ہوں وہ اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہوں۔ اس لیے ان کی تکذیب درست نہ ہوئی اور نہ ان کی نفی کا عقیدہ رکھنا جائز ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو وہ اہلِ ایمان کو بتا رہے ہیں وہ تحریف شدہ ہو۔ اب اس کا قبول کرنا جائز نہیں اور اس کے حقیقت ہونے کا عقیدہ رکھنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف کرنے کا حکم دیا اور بتا دیا کہ جو بھی اللہ نے نازل کیا، سب پر بالاجمال ایمان لاؤ۔ اگر وہ صحیح بتا رہے ہیں تو وہ ایمان میں داخل ہے اور اگر غلط بتا رہے ہیں تو کچھ مضر نہیں۔

مسلم وہ ہے جو عقل میں دلیل آئے بغیر صرف قدرت، سنت اور نقل کے باعث ہی تسلیم کر لے۔ جیسے کہ جو چیز مشاہدہ میں نہیں آتی اس پر غیبی ایمان لانے والا مومن ہے۔ اس لیے کہ جس طرح بدن کی بینائی آنکھ ہے اسی طرح قلب کی بینائی عقل ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دیوانے سے قلم اٹھا دیا گیا تا آنکہ وہ سمجھے" جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ[1]

(نہیں اندھے پر کچھ تکلیف)

پھر بقدرِ کفایت لے اور لایعنی کو چھوڑ دے۔ فضول کلام و فعل کو ترک کر دے۔ اس لیے کہ لایعنی میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ ممنوع کا تکلف کرتا پھرے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ:

"میری امت کے پرہیزگار اس (لایعنی میں حصہ لینے) سے بری ہیں اور جو مطلوب ہو صرف اسی میں مصروف رہے۔ اہلِ خرد کا کام بھی یہی ہے کہ لایعنی سے دور رہ کر مطلوب میں انہماک رکھیں۔ حکمت کی یہی جڑ ہے۔ حضرت لقمانؑ سے پوچھا گیا:

"حکمت کب ملتی ہے؟"

فرمایا: "دو چیزوں کے ساتھ، بقدر کفایت رکھوں اور تکلیف نہ کروں۔ اور جس کا مکلف ہوں اس کو

---

[1] النور ۶۱

ضائع نہ کروں"۔ اس لیے کہ لایعنی چیز ایسی ہے جس سے جاہل رہنا مضر نہیں اور اس کا کرنا نفع بخش نہیں اور یہ ایسی چیز لازم کر رہا ہے جس میں کچھ فضیلت نہیں۔ اگر اس کو سن لے یا اس کو نمایاں کرے تو بھی اس میں کچھ فائدہ نہیں اور نہ دوسرے کا فائدہ ہے۔ پھر ایذا دہی سے رکنا۔ یہ تقویٰ کی بات ہے۔

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے تھے:

"ایذا دہی سے رکنا، عقل کی کمائی ہے اور ایذا، سہنا علم کی کمائی ہے۔ مخلوق کو نصیحت کرنا اور ان پر رحم کرنا ایمان کی کمائی ہے کہ نفس جن عاجل لذتوں کا عادی بن چکا ہے انہیں کاٹ رہا ہے اور نفسانی لذات و عادات اخروی اعمال سے دور کر دیتے ہیں اور ایسا ہو جائے کہ اس کی نفسانی خواہش و شہوت کی کوئی ایسی عادت نہ رہے کہ وہ اس سے منازعت دکھائے۔ اس لیے کہ عادت بھی ایک غالب آنے والا لشکر ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے توبہ میں مشکل پڑ جاتی ہے اور اگر عادت غالب آجائے تو انسان استقامت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ (عادت) بھی ہوائے نفسانی میں سے ہے۔ البتہ مامور یا مندوب کام کی عادت درست ہے۔

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"اگر تو ایسا کر سکے کہ مقررہ وقت میں تجھے کھانے کی عادت نہ ہو کہ نفس منازعت کرے اور کہے کہ ابھی کھانا لاؤ۔ تو ایسا ضرور کرو (یعنی مقررہ وقت میں کھانے تک کی عادت بھی نہ ڈالو)

فرمایا: "مجھے شب بھر قیام سے یہ زیادہ پسند ہے کہ رات کے کھانے میں سے ایک لقمہ کم کر دوں"۔ یعنی نفس کو اس کی عادت سے ہٹا دوں اور کھانے میں کمی کر دوں۔"

فرمایا: "سال بھر کے روزے رکھنے اور راتوں کو قیام کرنے سے زیادہ قلب کے لیے نفع بخش چیز ہے کہ نفسانی شہوات میں سے ایک شہوت چھوڑ دے"۔ یہ اس لیے ہے کہ "تاکہ عادات سے الفت نہ ہونے پائے ورنہ نفس، مالوف عادت کی طرف آنے کی جدوجہد کرے گا اور غلبۂ وصف کے باعث اس کا ضبط ممکن نہ ہو سکے گا۔

پھر مامور پر صبر کرنا اور ممنوعات سے پرہیز پہ حسنِ صبر سے کام لینا، یہ افضل ترین عمل ہے اور اس کے بہت ہی فضائل ہیں۔ ان سے ہی مزید انعام و ایمان اور کمال ملتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"محارم سے بچو، تم سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہو گے"۔

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"تم سب لوگوں سے زیادہ پرہیزگار ہو گے"۔

اسرائیلیات میں ایک واقعہ گناہ سے صبر کرنے کا آتا ہے جو بہت ہی عجیب ہے کہ ایک آدمی نے کسی دوسرے

شہر میں ایک عورت سے نکاح کیا جہاں خاوند رہائش پذیر تھا۔ اس شہر اور بیوی کے شہر میں ایک ماہ کی مسافت تھی۔ اس آدمی نے اپنا غلام بھیجا کہ وہ عورت کو لے آئے۔ وہ اس عورت کو لے کر چلا۔ جب رات ہوئی تو شیطان نے غلام کو بہکایا کہ تیرے اور اس عورت کے خاوند کے درمیان ایک ماہ کی مسافت کا فاصلہ ہے اگر تو اس ماہ کی راتیں اس عورت کے ساتھ مزے اڑائے تو کیا حرج ہے۔ عورت بھی اس کو بُرا نہیں سمجھے گی، بلکہ تیرے آقا کے پاس تیری تعریف کرے گی اور تجھے اس کے ہاں بلند مقام حاصل رہے گا۔ غلام فوراً اٹھا اور نماز پڑھنے اور دُعا کرنے لگا:

"اے پروردگار، تیرا دشمن میرے پاس آیا، اس نے تیری نافرمانی کے لیے مجھے بہکایا اور ایک ماہ کی مدت تک مجھے اس کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ اے پروردگار، میں اس کے مقابلہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ مجھے پناہ عطا فرما دے اور اس آفت میں میری یاوری فرما۔ رات بھر شیطان بہکاتا رہا اور یہ دعا کرتا رہا اور شیطان سے بچنے کی تدبیریں کرتا رہا۔ آخر سحر ہوئی تو اس نے عورت کو سوار کرایا اور اس کو لے کر چل پڑا۔ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا اور ایک ماہ کی مسافت اس کے لیے لپیٹ کر مختصر کر دی۔ طلوعِ فجر ہوتے ہی وہ اپنے آقا کے شہر تک پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کی قدر فرمائی۔ وُہ نافرمانی سے دُور بھاگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر انعام فرمایا اور اسے نبوت سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ یہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی تھے۔ علیہ السلام۔

پھر مستقبل کے لیے ذخیرہ اور توشہ تیار کرے۔ اگر یہ آخرت کے لیے محنت کرنے والا سالک ہے۔ لوگوں سے الگ ہو کر اپنے آپ میں مشغول اور اس پر متوجہ ہے تو یہ اس پر لازم ہے اور فضول شہوات سے بے رغبتی رکھے اور شبہات سے خوب پرہیز رکھے یہ فرض ہے۔ دنیا کا اور لوگوں کا ذکر بند کر دے۔ یہ بہتر طریقہ ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کا ذکر کرنے سے غفلت اور فسادتِ قلبی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرے اور آلاء و انعاماتِ الٰہی کا ذکر کیا کرے۔ اللہ کی خوب خوب مدح و ثناء کرتا رہے۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جو ہمارے ساتھ نشست رکھے وُہ تین عادتوں سے دُور رہے اور جس میں چاہے فیصلہ کرے۔ لوگوں کے ذکر سے دُور رہے۔ اس لیے کہ یہ مرض ہے، دنیا کا ذکر نہ کرے۔ اس لیے کہ یہ فساد ہے۔ زیادہ کھانے سے پرہیز رکھے۔ اس لیے کہ یہ حرص ہے۔"

ایک دُوسرے عالم کا فرمان ہے:

"جو ہمارے ساتھ نشست رکھے، وُہ صرف تنہا اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر کرے۔ اگر غیر کا ذکر ضروری ہو تو

ہمن آخرت کا اور نیک بندوں کا ذکر کرے۔"

حضرت ۔۔۔ل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے،

" سنت وہ ہے جس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم تھے اور پہلی سنت ، دنیا میں زہد کرنا ہے۔ اس لیے کہ وہ سب زاہد تھے۔" فرقہ ناجیہ کا وصف بیان کرتے ہوئے روایت میں بھی اسی طرح آتا ہے،

" جو اس پر ہو جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔" چنانچہ صحابہؓ انہی مذکورہ اوصاف پر تھے۔ اب جو اس اسلوب و طریق پر ہوگا۔ وہ سنت پر ہے۔ یہ سنت کے فضائل تھے۔ مزید ایمان اور حسنِ یقین کا اصل باعث بھی ہیں۔

برہنہ ایمان اور خلاصہ شریعت

اللہ جلّ ثناءہٗ نے فرمایا:

اس کی خبر بھی سچی ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا[1] (پھر ہم نے تجھے رکھا ایک راستے اس کام کے، تو اس پر چل)

چنانچہ شریعت دراصل اسمائے طریق میں سے ایک اسم ہے اور اس سے مراد وہ طریقہ و راستہ ہے جو واضح سیدھا اور وسیع ہو۔ تمام ضروریات کے جامع طریق کا یہی وصف ہے گویا ایسا طریق ہے جو تمام طُرق کا جامع اور سب پر حاوی ہے۔

طریق کے کئی نام ہیں۔ مثلاً صِرَاطُ الْمُسْتَقِيْمَ (سیدھی راہ)، سَبِيْل، مِنْهَاج، الْمَحَجَّة، مَنْسَك۔

اس سے چار اسماء مشتق ہوئے:

۱۔ شَارِع۔

۲۔ مشرعۃ۔

۳۔ شِرعۃ۔

۴۔ شَرِيْعَت۔

اور یہ آخری لفظ تمام طریقوں پر حاوی اور سب کا جامع ہے۔

---

[1] الجاثیہ ۱۸۔

شریعت میں بارہ خصائل پائی جاتی ہیں اور یہی خصائل اوصافِ ایمان کو جامع ہیں :

۱۔ توحید و رسالت کی شہادت دینا اور یہی فطرت ہے۔

۲۔ پانچ نمازیں ادا کرنا اور یہ ملت ہے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا اور یہ طہارت ہے۔

۴۔ روزے رکھنا اور یہ جنت ہے۔

۵۔ حج کرنا اور یہ کمال ہے۔

۶۔ جہاد کرنا اور یہ مدد و نصرت ہے۔

۷۔ امر بالمعروف کرنا، یہ حجت ہے۔

۸۔ نہی عن المنکر کرنا۔ یہ حفاظت و دفاع ہے۔

۹۔ جماعت سے وابستہ رہنا۔ یہ الفت ہے۔

۱۰۔ استقامت اختیار کرنا، یہ عصمت ہے۔

۱۱۔ حلال کمانا، یہ تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔

۱۲۔ اللہ کی خاطر محبت کرنا اور بغض رکھنا۔ یہ عہد و پیمان ہے۔ ان میں سے بعض خصائل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور حضرت ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہیں۔

مسلمان ہونے کی شرط

صحیح مسلمان تب ہے کہ جب

۱۔ کسی بدعت پر عقیدہ نہ رکھے۔

۲۔ کسی کبیرہ گناہ پر قایم نہ ہو۔

۳۔ حرام نہ کھاتا ہو۔

۴۔ سلف صالحین پر زبان درازی نہ کرے۔

۵۔ مسلمانوں کے جان و مال سے زبان و ہاتھ کو روک رکھے۔

۶۔ تمام مسلمانوں کو ان پر شفقت کرتے ہوئے نصیحت کرے۔

۷۔ ان کی خوشی سے خوش ہو اور ان کی غمی پر غمگین ہو۔ اہلِ اسلام کے ائمہ عظام کے ساتھ بہ خصوصی معاملہ رکھے۔ سب کو نیکی کی دعوت دے اور تمام اعمال خلوص کے ساتھ اللہ کی خاطر ہی کرے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "اس ذات کی قسم کہ میری جان اس کے قبضہ میں ہے

ایک بندہ اسی وقت ہی مسلمان ہو سکتا ہے کہ اس کا قلب و زبان بھی مسلمان ہو جائے اور اسی وقت ہی وُہ مومن ہوتا ہے کہ جب اس کے پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے مامون ہو جائیں۔

ایک روایت ہے:

"تین ایسی ہیں کہ ایک مسلم کا دل ان پر کھوٹ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر خلوصِ عمل، حکامِ وقت کو نصیحت کرنا، جماعت (سوادِ الاعظم) سے وابستگی، اس لیے کہ ان کی دعوت انہیں پیچھے سے احاطہ کرتی ہے اور اس زمانہ میں جس کے اندر یہ خصائل جمع ہو جائیں وُہ اولیاء اللہ میں سے ہے۔ اور یہ ابتدائے ولایت ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب عصمت و رحمت کی پہلی نظر ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے سالم بن عبد اللہؓ کو لکھا:

"مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت لکھ بھیجیں تاکہ اس پر چلوں۔"

انہوں نے لکھا: اما بعد۔ تو عمرؓ کے زمانہ میں نہیں اور نہ ہی تیرے ساتھی عمرؓ کے ساتھیوں جیسے (بلند پایہ) ہیں۔ اگر تو اس زمانہ میں حضرت عمرؓ کی سیرت پر چلا اور تیرے یہ ساتھی ہوں تو تُو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہتر ہو گا۔

حُسنِ اسلام اور محبتِ الٰہی کی علامات

انسان کو چاہیے کہ خیر اور اہلِ خیر سے محبت رکھے۔ شر اور اہلِ شر سے دُور رہے۔ مندوب و مامور کی طرف تیزی کرے۔ جب بھی استطاعت حاصل ہو اور اگر عاجز آ جائے تو فوت شدہ اعمالِ صالحہ پر غمگین ہو۔ بے کار قول و فعل سے پرہیز کرے۔ تکلف سے کنارہ کش رہے۔ یعنی جس کا حکم نہیں اور جس کا کرنا یا نہ کرنا مندوب نہیں۔ اس سے دُور رہے اگر فتنہ و فساد نہ ہو اور دین کی سلامتی ہو تو با جماعت پانچوں نمازیں ادا کرے۔ غیبت کرنے اور لوگوں کو یاد کرنے سے بچے۔ سب کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے چاہے اور جو اپنے لیے نہ چاہے وُہ کسی کے لیے بھی نہ چاہے۔ بھلائی کے کاموں اور اعمالِ صالحہ میں تیزی دکھائے۔ زیادہ تر خاموش رہے۔ مومنوں کے سامنے نرم اور متواضع ہو۔ متکبرین پر سخت ہو، باطل میں نہ گھسے۔ دین میں مداہنت نہ کرے حق کی کسی بات سے بغض نہ رکھے چاہے اپنے پر ہو یا کسی دُور کے آدمی سے ہو۔ باطل کو پسند نہ کرے چاہے اسے اس میں اپنا فائدہ ہو یا قریب ترین کا فائدہ ہو۔ اپنے مداحوں سے مدح نہ چاہے بلکہ مدح کو ناپسند کرے جس سے بغض ہو۔ اس کو بھی نصیحت کرتا رہے۔ اس کے نزدیک مدح و مذمت دونوں برابر ہوں۔ تکلیف ہو تو بھی سچ ہے۔ عاجل نفع کی خاطر تصنع نہ کرے۔ اس کا باطن، اس کے ظاہر سے بہتر ہو۔ مخلوق کی ایذاء سے۔ ان کے باعث ابتلاء پر صبر کرے۔ ان سے اپنے حال کے ساتھ منفرد رہے۔ تغیر قلب

اور شبہات میں پڑ جانے کے ڈر سے عوام سے اختلاط نہ رکھے اور زیادہ تر ان کی مجلس سے کنارہ کش رہے۔

آج کے دور میں جس کے اندر یہ خصائل حمیدہ پائی جائیں وہ آخرت کا سالک ہے۔ یہ دولتِ ثانیہ اور نظرِ ثانیہ ہے۔

بتاتے ہیں کہ ہر قرن میں ان کے زمانہ کی مقدار پر ابدال ہوئے اور ہر قرن میں سابقین و مقربین پائے جاتے ہیں۔

ایک فرمانِ الٰہی ہے:

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ [1] (تم کو چڑھنا ہے کھنڈ پر کھنڈ (درجہ بدرجہ))

بعض مفسرین نے فرمایا:

تم ہر قرن میں لوگوں کے ایک طبقہ کے اندر ایسے حال پر ہوں گے کہ اس حال پر نہیں ہونگے۔ اور زیادہ سے زیادہ قرن سے مراد ایک سو سال کا قول ہے اور کم از کم چالیس برس کا قول ہے اور متوسط قول جو روایات و احادیث کے مشابہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک قرن ستر برس کا ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے اس لیے کہ دو صد سال کے اختتام پر بعثت سے تین قرن ختم ہوئے اور آج ہم (زمانۂ مصنف تک) چھٹے قرن میں ہیں یعنی ۳۴۰ھ سے لے کر ۴۱۰ھ تک کا زمانہ چھٹے قرن کا ہے۔

بتاتے ہیں، ساتویں قرن کے بعد سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔ یہ وقت چار صد اور اسی برس کے اختتام پر آتا ہے اور جس نے قرن کو ایک سو سال کا کہا اس کے نزدیک سات صد برس کے بعد کا زمانہ مراد ہے۔

ایک روایت میں ہے:

موت کا فرشتہ جب ایک مومن آدمی کی روح قبض کرنے آتا ہے تو اس کے ساتھ لگے دونوں فرشتے (کراماً کاتبین) یوں کہتے ہیں "ہمیں رکھو تاکہ ہم اس کے کانوں کو حسنِ تعریف سے بھر دیں"۔ وہ کہتے ہیں:

"ہماری طرف سے اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے۔ ہمارے علم کے مطابق تو اطاعتِ الٰہی میں تیزی کرنیوالا، اس کی نافرمانی سے دُور رہنے والا، خیر اور اہلِ خیر سے محبت کرنے والا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق تو عمل کرتا تھا تو نے بسا اوقات ہمیں اچھا کلام سنایا اور اچھی مجالس میں ہمیں بٹھایا۔ سچے وعدے کے باعث خوش ہو جاؤ۔ جو ہمارے اور تیرے درمیان ہے کہ کل آئندہ تجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا تو (ہم) اس کے پاس تیرے حق میں گواہی دیں گے۔"

---

[1] الانشقاق ۱۹

مسلمانوں کا مسلمان پر کیا حق ہے؟

مسلمانوں پر حرمتِ اسلام لازم ہے اور مسلمان کے مسلمان پر دس حقوق ہیں جو چھ احادیث میں مذکور ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"مسلمانوں کے مسلمان پر چھ خصال (حقوق) لازم ہیں۔"

حضرت ابوایوبؓ انصاری کی حدیث میں ہے:

"مسلم کے مسلم پر حقوق کی چھ باتیں لازم ہیں۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی چھوڑ دیا تو اس نے اپنے اوپر ایک واجب حق چھوڑ دیا۔"

حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں ہے:

"ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باتوں کا حکم فرمایا اور سات سے منع فرمایا۔"

حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے:

"مسلم کے مسلم پر چار خلال (حقوق) واجب ہیں۔"

حضرت سعدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث بھی اسی مفہوم کی ہے:

حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے:

"چار (چیزیں ہیں جو) تجھ پر مسلمان کے حق میں ہیں۔" البتہ اس میں مذکورہ کے علاوہ کا ذکر کیا۔ ہم نے مختلف احادیث کے مضامین کو جمع کر کے دس خصال کا ذکر کیا ہے۔ البتہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ان سے زاید الفاظ ہیں اور یہ حدیث غریب ہے۔ ہم اس کا ذکر کریں گے۔

جن دس خصال کا ذکر روایات میں بکثرت آتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ جب ملاقات ہو تو سلام کرے۔

۲۔ جب وہ دعوت دے تو قبول کرے۔

۳۔ جب اسے چھینک آئے تو اس کا جواب دے۔

۴۔ جب بیمار ہو تو اس کی تیمارداری کرے۔

۵۔ جب وہ فوت ہو تو اس کے جنازہ میں شریک ہو یعنی جنازہ پڑھے۔

۶۔ جب وہ اس پر قسم کھا بیٹھے تو اس کی قسم پوری کر دے۔

۷۔ جب وہ اس سے نصیحت چاہے تو اسے نصیحت کرے۔

۸۔ جب وہ غائب ہو تو پیٹھ پیچھے اس کی حفاظت کرے۔

۹۔ جو اپنے لیے پسند کرے وہی اس کے لیے پسند کرے۔

۱۰۔ جو اپنے لیے ناپسند کرے وہی اس کے لیے ناپسند کرے۔

اسماعیل بن ابی زیاد نے ابان بن عیاش سے اور انہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان کے چار حق ہیں کہ نیکوکار کی امداد کرے، گناہ گار کے لیے دعائے بخشش کرے، بدقسمت کے لیے دعا کرے، اور توبہ کرنے والے سے محبت رکھے۔" یہ خصائل اُن مذکورہ خصائل میں داخل ہیں اور نصیحت کے مفہوم میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح کہ تو ان کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے چاہے۔

حضرت ابن عباسؓ مسلمان پر مسلمان کا حق بتاتے ہوئے خصوصیت سے یہ کہتے اور اسے حلال و حرام کی طرح فرض بتاتے اور وہ رحماء بینھم کی تفسیر اس سے کرتے۔ چنانچہ رحماء بینھم کے فرمان میں حضرت جبیرؒ حضرت ضحاکؒ سے روایت ہے کہ رحماء بینھم "یعنی باہم محبت کرتے ہیں۔" ان کا صالح آدمی بُرے کے لیے دُعا کرے۔ جب ایک بُرا آدمی امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صالح آدمی کو دیکھے تو یہ دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَہٗ فِیْمَا قَسَمْتَ لَہٗ مِنَ الْخَیْرِ وَ ثَبِّتْہُ عَلَیْہِ وَ انْفَعْنَا بِہٖ۔ (اے اللہ تو نے اس کو بھلائی دی اس میں اسے برکت عطا کر۔ اسے اس پر پختہ کر اور ہمیں اس سے فائدہ عطا فرما)

اور جب ایک صالح آدمی امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی بُرے کو دیکھے تو یہ دُعا کرے:

اَللّٰھُمَّ اھْدِہٗ وَتُبْ عَلَیْہِ وَ اغْفِرْ لَہٗ۔ (اے اللہ اسے ہدایت دے، اس پر رحمت کے ساتھ لوٹ آ اور اسے بخش دے)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں،

"یہ آیت تمہارے حلال و حرام سے ہے۔ یہ خصائل حُرمتِ اسلام میں جامع اور مختصر ہیں اور ایک دوسرے کے وجوبِ حق کو حاوی ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی چھوڑ دینا کسی کے لیے درست نہیں۔ ہاں البتہ اگر سنت ہی اسے معذور سمجھے اور علم اس کی گواہی دے تو الگ بات ہے اور بعض زیادہ موکد ہیں اور بعض کم موکد ہیں۔ کامل ترین مومن وُہ ہے جو ان کی طرف تیزی دکھائے اور پختہ ہو۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات آتی ہیں۔

سلفؒ میں سے بعض نے ان میں سے تین کو ترک کر دیا:

۱۔ دعوت قبول کرنا۔

۲۔ بیماروں کی تیمارداری کرنا۔

۳۔ جنازوں میں شرکت کرنا۔ البتہ یہ لوگ قطعی طور پر لوگوں سے جُدا اور الگ ہو چکے تھے۔ وُہ گھروں میں

تھے، رہتے اور صرف نماز باجماعت میں شرکت کے لیے باہر آتے اور بعض نے جماعت بھی ترک کر دی اور ان میں سے بعض نے صحراؤں میں رہائش کر لی اور بھائیوں اور شہروں کو ترک کر دیا۔

حضرت سہلؒ فرماتے ہیں:

"حقوق العباد سے زیادہ سخت چیز میں نہیں پاتا۔"

فرمایا کرتے،

"جو مخلوق سے ایذا روک لے۔ (انہیں ایذا نہ دے) وہ پانی پر چلتا ہے۔"

حضرت ابویزیدؒ اور دوسرے بزرگ فرماتے ہیں:

"اہل عقل کا مقصود و مطلوب سلامتی ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے سلامتی چاہے وہ لوگوں کو سلامتی دیئے رکھے اور جو یہ چاہے کہ لوگ اس سے سلامت رہیں۔ وہ ان سے دور رہے۔" اسی مفہوم میں ایک شعر ہے:

اَلنَّاسُ بَحْرٌ عَمِيْقٌ ۔۔۔ وَالْبُعْدُ مِنْهُمْ سَلَامَةٌ

وَقَدْ نَصَحْتُكَ فَانْظُرْ ۔۔۔ لَا تُدْرِكَنَّكَ نَدَامَةٌ

(لوگ ایک گہرا سمندر ہیں، اور ان سے دور رہنا سلامتی ہے)

(میں نے تجھے نصیحت کر دی اب دیکھ، تجھے کہیں ندامت نہ آن لے)

حضرت ابن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"اللہ سے بچو (ڈرو) اور لوگوں سے بچو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ:

"اگر مجھے وسوسہ کا خطرہ نہ ہو تو میں لوگوں کے ساتھ مجالست نہ رکھوں۔"

ایک بار فرمایا:

"تو ایسے شہروں میں چلا جاؤں جہاں کوئی انیس نہ ہو اور لوگ تو لوگوں کے ذریعہ ہی خراب ہوتے ہیں۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"جس قدر واقف زیادہ ہوں گے۔ اسی قدر قرض خواہ زیادہ ہوں گے اور جس قدر مصاحبت طویل ہوگی اسی قدر حقوق لازم ہوں گے۔"

ایک عالم کا فرمان ہے:

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا وہ آرام پاگیا اور جس نے لوگوں کو پہچانا وہ مشقت میں پڑگیا۔"

حضرت بشر بن حارثؒ نے اس کے برعکس الفاظ میں فرمایا، جس نے لوگوں کو پہچانا، اس نے آرام پایا۔

مدارات الناس صدقۃ (لوگوں کی مدارات صدقہ ہے) کے فرمان نبویؐ کی توضیح میں فرمایا گیا کہ علوم ہیں مدارات اور عقلوں میں مفارقت کرنا مراد ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ اَحْسَنُ ۔ (احسن طریقہ سے جواب دو)

کے فرمان کی توضیح کی کہ اس سے مراد مدارات ہے۔

ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس کو نرمی سے حصہ ملا اسے دنیا و آخرت کی بہترین چیز ملی اور جس سے نرمی کا حصہ روک دیا گیا اس سے دنیا و آخرت کا حصہ روک دیا گیا۔"

بدن کی سنتیں

بدن میں بارہ سنتیں ہیں اور یہ سنتیں مختلف احادیث سے ماخوذ ہیں۔ ان احادیث میں ایک حدیث حضرت جبرئیلؑ کی وہ حدیث ہے کہ جب انھوں نے وحی میں ویر کردی ان میں سے پانچ سنتیں سر میں ہیں:

۱۔ کلی کرنا۔

۲۔ ناک میں پانی ڈالنا۔

۳۔ مسواک کرنا۔

۴۔ مونچھیں کٹوانا۔

۵۔ سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔

اور سات سنتیں بدن میں ہیں:

۱۔ ختنہ کرانا۔

۲۔ موئے عانہ صاف کرنا۔

۳۔ پانی چھڑکنا یعنی استنجا کرنا۔

۴۔ بغل کے بال اکھاڑنا۔

۵۔ ناخون کاٹنا۔

۶۔ براجم (پوروں) کو دھونا۔

۷۔ انگلی کے جوڑوں کو پاک صاف کرنا۔

براجم (رواجب) پوروں کے صاف کرنے کا نام ہے۔ عربوں کی عادت تھی کہ وہ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ نہ دھوتے۔ چنانچہ ہاتھوں اور ناخنوں میں میل جمع ہو جاتا۔ اس لیے آپؐ نے ان کو صاف کرنے کا حکم دیا۔

حضرت ابوہریرہ وغیرہ اہل صفہ میں سے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

"ہم بھنا ہوا گوشت کھاتے۔ پھر نماز کھڑی ہوتی تو ہم اپنی انگلیاں کنکروں میں رگڑ لیتے اور مٹی سے مل کر پھر تکبیر کہہ لیتے"

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا:

"ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اشنان نہیں جانتے تھے۔ ہمارا ... ہمارے پاؤں کے نیچے کا حصہ تھا (یعنی زمین تھا)۔ جب ہم چکنائی کھا لیتے تو ان کے ساتھ رگڑ لیتے۔ بتاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے چار بدعات جاری ہوئیں:

۱۔ چھلنیاں

۲۔ اشنان

۳۔ دسترخوان

۴۔ سیر ہو کر کھانا کھانا۔

یہ تمام بدعات پیٹ کے معاملہ میں ہیں اور یہ پیٹ بھی ایک شریر برتن ہے۔

رواجب دراصل راجبہ کی جمع ہے اور راجبہ کا مطلب ایک پورا ہے۔ عربوں کو سر ... میسر نہ آتی کہ وہ اپنے ناخون وقت پر کاٹ سکیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناخون کاٹنے کے لیے ایک مدت مقرر فرما دی۔ اسی طرح بغل کے بال اکھاڑنے، شرم گاہ کے بال اتارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چالیس دن مقرر کر دیے کہ اس سے بڑھنے نہ چاہیے البتہ آپؐ نے ناخون کے نیچے کے حصہ کو بار بار صاف کرنے کا حکم دیا، اس لیے کہ ان کے نیچے میل جمع ہو جاتا ہے۔ یہی رواجب ہیں تاکہ ناخون کاٹ دیے جائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے میں دیر ہو گئی۔ جب حضرت جبریلؑ حاضر ہوئے تو آپؐ نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا:

"ہم آپؐ پر کیسے نازل ہوں جبکہ آپ لوگ (یعنی عرب لوگ) اپنے پورو ے دھوتے نہیں اور اپنے پوروے صاف نہیں کرتے"

اپنی امت کو اس بات کا حکم دیجیے۔ ناخنوں کے نیچے کے میل کو اف کہا جاتا ہے اور اف تف سے یہی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ ناخنوں کا میل اف کہلاتا ہے اور کان کا میل تف کہلاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق ایذا میں مبالغہ پیدا کرنے کے لیے اف کے اتباع میں تف بھی ساتھ ملا لیا جاتا ہے اور اف تف کہا جاتا ہے اسی طرح جائع نائع (خوب خوب بھوکا)۔ عطشان نطشان (خوب خوب پیاسا) کے الفاظ مروج ہیں مگر اس کے

بارے میں روایت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ۔

یعنی انہیں ناخون کے نیچے کی میل کے برابر ایذاء نہ دو۔

ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں کو اس مقدار جتنی یا تیرے ناخن کے نیچے جو میل ہے اس جتنی بھی ایذاء نہ دو۔

ڈاڑھی کے معاملہ میں
بدعات و محرمات

بعض روایات میں ہے:

اللہ تعالیٰ کے بعض فرشتے ایسے ہیں جو قسم کھاتے ہیں کہ "اس ذات کی قسم، جس نے آدم کو ڈاڑھی کے ذریعہ زینت بخشی۔" اور کہا کرتے ہیں کہ" ڈاڑھی آدمی کے اخلاق کا کمال ہے۔ اسی کے ذریعہ ظاہری طور پر مرد اور عورت میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصف میں ہے، کہ

"آپؐ کی ڈاڑھی خوب تھی۔"

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کی ڈاڑھی بھی گھنی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی ڈاڑھی طویل اور پتلی تھی۔ حضرت علیؓ کی ڈاڑھی اس قدر چوڑی تھی کہ دونوں کاندھے بھر گئے تھے۔ بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے علاوہ سب اہل جنت بے ڈاڑھی ہوں گے۔ ان کی ڈاڑھی سینہ تک ہوگی۔ یہ ان کی خصوصیت وفضیلت ہے۔

بنی تمیم میں سے کسی نے احنف بن قیس کے بارے میں کہا:

"ہم نے چاہا کہ احنف کے لیے بیس ہزار میں بھی ایک ڈاڑھی خریدلیں"۔ چنانچہ اس نے احنف کی ٹانگ میں کسی خرابی یا آنکھ کے کانے پن کا ذکر نہیں کیا بلکہ ڈاڑھی کا نہ ہونا ناپسند خیال کیا اور یہ ایک صاحب عقل و بردبار آدمی تھا۔

فرمان الٰہی ہے:

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ۔

اس کی تاویل میں ایک غریب حدیث نقل ہے کہ اس سے مراد ڈاڑھی کا اضافہ ہے اس میں کئی اور وجوہ بھی ہیں۔ قاضی شریح کے بارے میں مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"میں چاہتا ہوں کاش کہ دس ہزار میں مجھے ڈاڑھی مل جائے۔"

ایک ادیب کا قول ہے:

"ڈاڑھی میں کئی خصائلِ نافعہ ہیں مثلاً آدمی کی عزت بڑھتی ہے۔ علم و وقار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مجالس میں اسے اچھی جگہ ملتی ہے۔ اس کی جانب توجہ رکھتے ہیں۔ جماعت میں اسے مقدم کیا جاتا ہے۔ عزت کا تحفظ بھی اسی سے ہے یعنی جب کوئی اس کو گالی دینا چاہے تو اس کی وجہ سے وہ خاموش ہو جائے گویا تحفظ مل گیا۔"

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں،

"جس کی ڈاڑھی بڑی ہوئی اس کی معرفت بڑھی؛ چنانچہ ڈاڑھی کے جہاں فوائد ہیں وہاں مخفی اور دقیق قسم کے آفات نفسانی بھی ہیں۔

خضاب کا حکم ڈاڑھی کے بارے میں بارہ بدعات شروع ہوئیں جن میں بعض زیادہ بری اور بعض کم درجہ کی بری ہیں۔ اور یہ تمام بدعات مکروہ ہیں۔ ہم نے انہیں یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مثلاً خواہشِ نفس اور بڑھاپا چھپانے کے لیے سیاہ خضاب استعمال کرنا۔ صالحین اور قراء کے ساتھ مشابہت کی نیت نہ ہو کر بہ سنت پر عمل ہو نا بلکہ ویسے ہی ڈاڑھی کو سرخ رنگ دینا، بڑی عمر بتاتے اور ریاست وعظمت حاصل کرنے کے لیے کسی دوا کے ذریعہ مثلاً گندھک کے ذریعہ ڈاڑھی کو سفید کرنا تاکہ حکام کے ہاں قرب حاصل ہو یا اس وجہ سے ایسا کرے کہ عوام اس کی بات کو سنیں اور جو نہ جانتا ہو اس کے سامنے حدیث بیان کریں۔ تو وہ سنے۔ بعض محدثین نے ایسا کیا ہے۔

ڈاڑھی کی مقدار اسی طرح ڈاڑھی کو اکھاڑنا یا فخر کو بت چھپانے کے لیے سفید بالوں کو نوچنا برا ہے۔ اسی طرح ڈاڑھی کو اس ترتیب سے کٹوانا کہ ایک فیشن بن جائے یہ بھی بری بات ہے اسی طرح ڈاڑھی کو چھوٹا کرنا بھی گناہ ہے اور اس قدر زیادہ کرنا بھی مکروہ ہے کہ کنپٹیوں کے بال بھی بڑھتے رہیں حتیٰ کہ تمام رخسارے اور کنپٹیوں تک بال ہی بال ہو جائیں اور وہ جبڑے کی ہڈی سے بھی بڑھ جائیں۔ ڈاڑھی کی حد یہ ہے یا دونوں ہڈیوں سے نصف رخسارے تک کم کر دے۔ ایسا کرنے میں مثلہ ہو جائے اور ایسا کرنا ڈاڑھی میں کمی کرنا بن جائے گا۔

اسی طرح لوگوں کو دکھانے کی خاطر ڈاڑھی میں کنگھی کرتے رہنا یا زہد دکھانے کی خاطر ڈاڑھی کو بے ترتیب و پریشان غبار آلود چھوڑ دینا مکروہ ہے۔ اسی طرح کاہلی کی وجہ سے ڈاڑھی کو پریشان رکھے رہنا بھی درست نہیں۔

اس لیے کہ ایسا کرنے سے وہ مشہور ہو جائے گا کہ صوفی آدمی ہے۔

فخر و غرور کے باعث ڈاڑھی کی سیاہی پر نظر کرنا اور شباب و غرور دکھانے کو ڈاڑھی کی سیاہی کو دکھانا بھی مکروہ ہے۔

اسی طرح نوجوانوں پر بڑائی جتانے کی خاطر ڈاڑھی کی سفیدی پر نظر کرنا بھی درست نہیں۔ ایسے کرنے سے وہ علم حاصل کرنے اور قرآن سیکھنے سے محروم ہو جائے گا۔ اس لیے کہ نوجوان عالم کو حقیر جانے گا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا اس لیے ایسا کرنے میں جہالت کا ہی اضافہ ہوگا اور بس! اور جہالت کی وجہ سے یہ سمجھے گا کہ جس کے بال زیادہ سفید ہیں اس کو فضیلت و شرف حاصل ہے یا وہی بڑے علم والا آدمی ہے حالانکہ یہ نہیں سمجھتا کہ عقل تو قلوب میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

اب جس کے باطن میں حماقت اور طبیعت میں جہالت ہو وہ جوں جوں بڑی عمر پائے گا اس کی حماقت بڑھتی جائے گی اور جس قدر عمر زیادہ ہوگی اس کی جہالت زیادہ ہوگی۔

ہم نے یہ باتیں کئی لوگوں میں دیکھی ہیں اور یہ سب نو ایجاد اور بیہودہ ہیں اور تعداد میں یہ بدن کی بارہ سنن سے مشابہ ہیں۔

ان کے مکروہ ہونے کے بارے میں مختصر یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حفوا الشوارب واعفوا اللحی۔
(مونچھیں کترواؤ اور ڈاڑھی کا احفاء کرو)

چنانچہ حفوا کا مطلب یہ ہے کہ

اجعلوها حفافی الشفۃ۔

یعنی اس کے گرد کر دو، کیونکہ حفاف الشئ کا مطلب اس کا اردگرد ہے۔ اس لیے فرمانِ الٰہی ہے:

وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ[1] (اور تو دیکھے فرشتے گھر رہے ہیں عرش کے گرد)

بعض علماء کے نزدیک مونچھوں کو اس قدر مونڈنا مکروہ ہے کہ جلد ظاہر ہو جائے اور وہ اسے بدعت بتاتے ہیں۔

حضرت مالک بن انس اور بعض علمائے مدینہ فرمایا کرتے تھے،

"مونچھ کا مونڈنا، مثلہ بنانا ہے بلکہ اس قدر لے کہ اطار ظاہر ہو جائے اور اطار کا مطلب ہے کہ اوپر سے ہونٹ کے کنارے ظاہر ہو جائیں۔

---

[1] الزمر ۷۵

ایک حدیث میں الفاظ ہیں:

احفوا الشوارب۔ (مونچھوں کو احفاء کرو)

اور احفاء مطلب یہ ہے کہ انہیں خوب طرح مونڈ دو، اور یہ حفو اسے زیادہ بلیغ لفظ ہے۔ یہ فرمانِ الٰہی اسی سے ہے:

اِنْ یَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَیُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا۔[1] (اگر مانگے تم سے وہ مال، اگر تنگ کرے تمہیں تو تم بخیل ہو جاؤ)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر صحابہ کرام مونچھوں کو خوب طرح کٹوا دیتے۔

ایک تابعیؒ نے ایک آدمی کو کہا کہ اس کی مونچھیں خوب طرح کٹی ہوئی تھیں۔ فرمایا:

"تو نے مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی یاد تازہ کرا دی"

راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"کیا وہ اپنی مونچھوں کو خوب صاف کرا لیتے تھے؟ (احفاء کرتے تھے)"

فرمایا "ہاں، اور اس سے بھی خوب تر جیسے مونڈ رکھی ہوں۔ اور احفاء، حلق کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس سے مشابہ ہوتا ہے"

اس حدیث میں تین الفاظ دوسرے بھی ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

"مونچھوں سے لو، اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مونچھوں سے لیتے تھے۔ یعنی...... کان یاخذ من شاربہ!"

ایک روایت ہے:

قصوا الشوارب (مونچھیں کٹواؤ) اور جزّوا الشوارب (مونچھیں کٹواؤ) یہ تینوں ایک ہی معنی میں ہیں۔

اور ان کا مطلب یہ ہے کہ کچھ حصہ لے لو اور کچھ حصہ چھوڑ دو اور بالکل ہی مونڈ نہ دو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری جانب دیکھا اور میری مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: آؤ، چنانچہ ایک مسواک پر (رکھ کر) اسے کاٹ دیا" مونچھوں کے بال لینے میں فعلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نص ہے۔

---

[1] محمد ۳۷

ایک غریب روایت ہے:

طروا الشوارب طرًا۔ (مونچھوں کو خوب کاٹو)

طرّ کا مطلب یہ ہے کہ مونچھوں کے اوپر اور نیچے سے اس قدر کاٹے کہ وہ باریک ہوجائے اور طرّ کا مطلب یہ ہے کہ باریک طویل اور اپنے سے زیادہ چیز سے نکلی ہوئی۔ حتیٰ کہ اس کا اطلاق اس سے کم تر یا چھوٹی تر پر ہوتا ہے۔ اس سے طرۃ کا لفظ ہے گویا یہ بوصفِ لطیف، کثیر چیز سے نکالی ہوئی ہے۔

بعض سلفؒ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مونچھوں کا درمیانی حصہ خوب کتروا دیتے اور مونچھوں کے آخری دونوں سرے چھوڑ دیتے۔ حضرت عمرؓ بعض دوسرے صحابہؓ کے بارے میں یہی منقول ہے۔ اسی طرح میں نے حضرت ابوالحسن بن سالم رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے ایسے کرتے دیکھا اور فرمانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی اعفوا اللحی کا مطلب یہ ہے کہ ڈاڑھی زیادہ کرو اور اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

حَتّٰى عَفَوْا۔

یعنی کثرت ان کی ہوگئی۔

ایک روایت میں ہے:

"یہودی اپنی مونچھیں بڑھاتے (اعفاء کرتے) ہیں اور اپنی ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں، ان کی مخالفت کرو۔"

حضرت عمر بن خطاب اور مدینہ کے قاضی ابن ابی لیلیٰؒ نے ایک ایسے آدمی کی گواہی مسترد کردی جو ڈاڑھی اکھیڑتا تھا اور جبڑوں کے ملنے کی جگہ کے بال اکھاڑنا بدعت ہے۔

ایک آدمی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے گواہی دی اور وہ جبڑوں کے ملنے کی جگہ کے بال اکھاڑتا چنانچہ انہوں نے اس کی گواہی مسترد کردی۔

اور سفید بال اکھاڑنے کی ممانعت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت مروی ہے اور فرمایا:

"یہ مومن کا نور ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ خضاب استعمال کرنے کی ممانعت کی اور فرمایا:

"یہ دوزخیوں کا خضاب ہے۔"

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"سیاہ خضاب، کفار کا خضاب ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ اپنے والد محترم کو بڑھاپا متغیر کرنے کا کہیے۔ فرمایا:

"سیاہی سے بچو۔"

اور فرمایا،

"یہ دوزخیوں کا خضاب ہے۔"

ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نکاح کیا اور وہ سیاہ خضاب استعمال کرتا تھا۔ جب اس کا خضاب اُترا اور بڑھاپا (سفید بال) ظاہر ہوا تو عورت والوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے معاملہ پیش کیا۔ آپؓ نے اس کا نکاح لوٹا دیا۔ (یعنی نکاح توڑ دیا) اور اسے خوب مارا اور فرمایا،

"تو نے قوم کو جوانی دکھا کر فریب دیا اور بڑھاپے کو چھپایا؟"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"زردی، مسلمانوں کا خضاب ہے اور سُرخی، مومنوں کا خضاب ہے۔" اور سلف صالحین مہندی کے ساتھ سُرخ خضاب کرتے تھے اور خلوق (ایک خوشبو جس میں زعفران زیادہ ہوتا ہے) اور وسمہ سے زرد خضاب کرتے۔ اور کہتے ہیں،

"سب سے پہلے فرعون لعنہ اللہ نے سیاہ خضاب استعمال کیا۔"

حضرت سری بن مغلس سقطیؒ نے فرمایا،

"داڑھی میں دو شرک ہیں،

۱۔ لوگوں کی خاطر اسے کنگھی کرنا۔

۲۔ زہد دکھانے کی خاطر اسے پریشان اور بے ترتیب چھوڑ دینا۔"

ایک بار فرمایا،

"اگر میرے پاس کوئی آدمی آئے اور میں اس کی وجہ سے داڑھی پر ہاتھ پھیروں (یعنی اسے درست کروں) تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ میں نے شرک کیا۔"

حضرت کعبؓ اور ابو جلدؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے بتایا کہ آخری زمانہ میں ایک قوم ہوگی جس کا وصف یہ بیان کیا کہ" وہ داڑھیاں اس طرح کتروائے گی کہ کبوتری کی دُم کی طرح ان کی شکل ہو جائے اور ان کے جُوتے درانتی کی طرح (نوکدار) ہوں گے۔"

اور ایک جماعت سے یہ منقول ہے کہ یہ قیامت کی علامات سے ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے اور انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا،

"آخری زمانہ میں ایک قوم ہوگی جو کبوتر کی پوٹوں کی طرح سیاہ خضاب کرے گی۔ وہ جنت کی ہوا بھی نہ پائے گی۔"

حضرت ابوالمہزمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا:

"دجال کے ساتھیوں پر چادریں ہوں گی اور ان کی مونچھیں طویل نوکدار ہوں گی (جیسے کہ مرغوں کے خار ہوں) اور ان کے جوتے نوکدار (درانتی کی طرح) ہوں گے"۔

حضرت ابن عمرؓ حجام کو فرمایا کرتے،

"دونوں ہڈیوں تک خوب صاف کرو۔ اس لیے کہ یہ دونوں ڈاڑھی کا انتہا ہیں"۔ یعنی ڈاڑھی کی حد ہیں اسی لیے اسے لحیتہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حد جبڑا ہے۔ چنانچہ اس حد سے کمی اور بیشی دونوں بدعت اور غلط ہیں"۔

ڈاڑھی میں سُنن و مستحبات

بعض علماء ناسک وغیرہ میں ڈاڑھی سے زائد بال کٹوا لیتے تھے اور اگر انسان ڈاڑھی کو مٹھی میں لے کر زائد بال کٹوا دے تو کچھ حرج نہیں۔ حضرت ابن عمرؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت نے ایسا کیا ہے۔ امام شعبیؒ اور ابن سیرینؒ نے اسے مستحسن قرار دیا اور حضرت حسنؒ اور حضرت قتادہؒ نے اسے ناپسند فرمایا اور اسے اپنی خلقت پر چھوڑ دینا میرے نزدیک زیادہ پسند ہے"۔

ایک روایت ہے:

"آدمی کی سعادت سے یہ ہے کہ اس کی ڈاڑھی ہلکی ہو"۔ البتہ بعض روایات نے اس کو دوسرے مفہوم پر نقل کیا اور اگر یہ لکھنے میں غلطی نہیں تو یہ غریب ہے۔ اس میں فرماتے تھے،

"مراد ہے: خفة لحيته یعنی تلاوتِ قرآن کے ذریعہ۔ اور میں نے اسے محفوظ روایت نہیں سمجھتا"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد صالحین کا یہ طریق رہا ہے کہ وہ دین وسنّت کی وجہ سے ڈاڑھی کو کنگھی کرتے اور صفائی حاصل اور جوئیں وغیرہ سے طہارت کی خاطر اور کوئی مُردہ بال ہو تو اسے گرانے کی خاطر کنگھی کیا کرتے"۔

بعض زاہد ایسے بھی گزرے ہیں کہ وہ اپنے آپ سے غفلت کے باعث ڈاڑھی کو پریشان ہی چھوڑ دیتے یہ ان کی صدقِ نظر تھی اور ہر چیز میں صدق ہونا مستحسن بات ہے۔

بعض روایات کا بیان ہے کہ میں نے حضرت داؤد طائی کو دیکھا کہ ان کی ڈاڑھی پریشان و بے ترتیب تھی۔ میں نے عرض کیا:

"اے ابوسفیان، کاش کہ آپ اپنی ڈاڑھی کو کنگھی کر لیا کریں"۔

فرمایا: "تو کیا میں فارغ بیٹھا ہوں"۔

البتہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گاہے گاہے بالوں کو تیل لگاتے اور کنگھی کیا کرتے اور اس کا حکم بھی فرماتے۔ چنانچہ فرمایا:

"گاہے گاہے تیل لگایا کرو۔"

اور فرمایا:

"جس کا ایک بال ہو وہ بھی اس کا اکرام کرے۔"

ایک آدمی پریشان بال لیے بکھری ہوئی داڑھی کی حالت میں حاضر ہوا، فرمایا:

"کیا اس کے پاس تیل نہیں کہ اس کے بال درست ہو جائیں۔"

پھر فرمایا:

"تم میں ایک آدمی اسی طرح آتا ہے گویا وہ شیطان ہے۔"

ایک غریب حدیث میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی کو روزانہ دو بار کنگھی کرتے۔"

اس سے بھی ایک غریب تر روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"کچھ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر جمع ہوئے۔ آپ ان کے پاس تشریف لائے تو میں نے دیکھا (کہ باہر آنے سے پہلے) آپ مٹکے کے اندر جھانک رہے تھے تاکہ اپنا سر اور داڑھی درست کر لیں۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"آپ روزانہ کنگھی کرتے اور سفر و حضر میں آپ کنگھی اور ڈھیلے کو جدا نہ کرتے۔"

یہ عربوں کا معروف طریقہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر دوام فرماتے اور یہ آپ کے اخلاقِ حمیدہ میں سے ہے۔

گاہے نوجوان لوگ بوڑھوں کے ساتھ اس لیے مشابہت کرتے ہیں کہ بڑھاپے کی فضیلت سمجھتے ہیں۔ انہیں جوانی اور کم عمری پر فخر نہیں۔

ایک روایت میں ہے:

"تم میں سے بہترین نوجوان وہ ہے جو تمہارے بوڑھوں سے مشابہت کرے اور بدترین بوڑھا وہ ہے جو تمہارے جوانوں کی مشابہت کرے۔"

ایک حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کا اکرام فرماتا ہے۔" اور گاہے بوڑھے لوگ، نوجوانوں کو آگے بڑھاتے۔ دین و علم

کی وجہ سے ان کے شرف و فضل کا اعتراف کرتے۔ ان کے سامنے تواضع اختیار کرتے۔ اور تکبر و غلو سے کام نہ لیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو آگے قریب بٹھاتے حالانکہ وہ اکابر صحابہؓ میں کم عمر تھے اور دوسروں کی بجائے ان سے مسائل معلوم فرماتے۔

حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہؓ سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ علم نوجوان کو عطا فرمایا اور ساری بھلائی شباب میں ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ [1] (وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان، ان کو کچھ کہتا، اس کو پکارتے ہیں ابراہیم)

اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ [2] (وہ کئی جوان ہیں کہ یقین لائے اپنے رب پر)

ایک فرمان یہ ہے:

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا [3] (اور دیا ہم نے ان کو حکم کرنا، لڑکپن میں)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کرتے تو فرماتے:

"آپ کی وفات ہوئی اور آپ کے سر اور داڑھی میں بیس بال بھی سفید نہ تھے۔"

ان سے عرض کیا گیا:

"اے ابو حمزہ، اس کی کیا وجہ تھی جبکہ آپ کی عمر بھی بڑی تھی؟"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑھاپے سے عیب نہیں لگایا۔"

کہا گیا: "کیا یہ عیب ہے؟"

فرمایا: "تم سب اسے ناپسند کرتے ہو (اس طرح کراہت کی بات کو عیب فرمایا ورنہ یہ کوئی شرعی عیب اور گناہ نہیں)۔"

بتاتے ہیں کہ جب یحییٰ بن اکثم عہدۂ قضا پر فائز ہوئے تو ان کی عمر اکیس برس کی تھی۔ ایک آدمی نے ایک روز ان کی مجلس میں کہا اور اس فقرے سے اس کا مقصد انہیں شرمندہ کرنا تھا۔

---

[1] الانبیاء ۶۰

[2] الکہف ۱۳

[3] مریم

"اللہ تعالیٰ مدد فرمائے ۔ قاضی صاحب کی عمر کیا ہے ؟"

فرمایا: "جو عمر حضرت عتابؓ بن اسید کی تھی۔ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مکہ کا امیر اور قاضی مقرر فرمایا۔" اس طرح اسے خاموش اور لاجواب کر دیا۔

حضرت مالک بن مسعول سے مروی ہے۔ فرمایا:

میں نے بعض آسمانی کتب میں یہ پڑھا:

"تمھیں داڑھیاں فریب میں نہ ڈالیں، اس لیے کہ بکرے کی بھی داڑھی ہوتی ہے۔"

ایک عربی کا قول ہے:

"جس قدر داڑھی لمبی ہو اسی قدر عقل سکڑ جاتی ہے" (مراد از حد طوالت ہے)

ابو عمرو بن علاء سے مروی ہے:

"جب میں کسی کو لمبے قد والا، چھوٹے سر والا اور چوڑی داڑھی والا دیکھتا ہوں تو اس کے بارے میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ احمق ہے چاہے امیہ بن عبد شمس ہو۔"

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"لمبے قد سے، بڑی داڑھی سے، اس کی کنیت میں اور اس کی انگوٹھی کے نقش میں انسان کی حماقت معلوم ہو جاتی ہے۔"

ابراہیم نخعیؒ اور ان کی طرح کے دوسرے اسلافؒ فرماتے ہیں:

"مجھے ایسے عقلمند آدمی پر تعجب ہے کہ جس کی داڑھی زیادہ لمبی ہو، وہ داڑھی میں سے (بقدرِ سنت) کیوں نہیں لے لیتا۔ اور اسے متوسط کیوں نہیں بنا لیتا۔ ہر چیز میں اعتدال ہی بہتر ہوتا ہے اور پھر کسی ظریف کے یہ اشعار پڑھے: ؎

لَا تَعْجَبَنَّ بِلِحْيَةٍ كَبُرَتْ مَنَابِتُهَا طَوِيلَةً
يَهْوِي بِهَا عَصْفُ الرِّيَا حِ كَأَنَّهَا ذَنَبُ الْحَسِيلَةِ
قَدْ يُدْرِكُ الشَّرَفَ الْفَتَى يَوْمًا وَ لِحْيَتُهُ قَلِيلَةٌ

(لمبی داڑھی پر تعجب نہ کر کہ جس کے بال طویل ہو گئے۔)

(ہوائیں اسے اڑاتی ہیں جیسے کہ بچھڑے کی دم اڑتی ہو)

(کہ گاہے ایک نوجوان کو بھی شرف حاصل ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی داڑھی چھوٹی ہوتی ہے)

کسی عرب کا شعر پڑھا:

لَعَمْرُكَ مَا الْفِتْيَانُ اَنْ تَنْبُتَ اللُّحیٰ
وَلٰكِنَّمَا الْفِتْيَانُ كُلُّ فَتًی نَّدٰی

(تیری عمر کی قسم، نوجوان وُہ نہیں کہ جن کی ڈاڑھیاں اگ آئیں بلکہ ہر بہادر و سخی نوجوان ہی نوجوان ہے)

اس زمانہ میں بُوڑھے لوگ نوجوان سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرتے اور نہ ہی انہیں ہلکا جانتے۔
اس لیے کہ ہر فضل اللہ کے قبضہ میں ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ جس بچے یا کسی دوسرے کو عطا کرے، کوئی روکنے والا نہیں۔ اور جس بڑے یا کسی دوسرے سے روک لے کوئی اسے عطا کرنے والا نہیں۔

حضرت ابو ایوب سختیانیؒ فرماتے ہیں:

"میں نے ایک اسی برس کے بوڑھے کو دیکھا جو ایک بچے سے علم سیکھ رہا تھا اور اس کا اتباع کر رہا تھا"
کسی نے کہا،

"تم اس بچے سے علم سیکھ رہے ہو؟"

کہا: "جب تک میں اس سے علم حاصل کر رہا ہوں میں اس کا غلام ہوں۔"

حضرت علی بن حسنؒ فرماتے ہیں:

"جو علم میں تجھ سے بڑھ گیا وہ اس میں تیرا امام ہے، چاہے وُہ عمر میں تجھ سے چھوٹا ہو۔"

حضرت ابو عمرو بن علاءؒ سے پُوچھا گیا:

"کیا کسی بوڑھے آدمی کے لیے مناسب ہے کہ وُہ ایک چھوٹے بچے سے علم حاصل کرے؟"

فرمایا: "اگر زندہ رہنا اس کے لیے مناسب اور بہتر ہے تو علم سیکھنا بھی اس کے لیے مناسب اور بہتر ہے اس لیے کہ جب تک وُہ زندہ ہے وُہ علم کا محتاج ہے۔"

حضرت یحییٰ بن معینؒ نے حضرت امام احمد بن حنبل کو دیکھا کہ وہ امام شافعیؒ کی خچر کے پیچھے پیچھے چلتے جا رہے ہیں، حضرت یحییٰ بن معینؒ نے امام احمدؒ کو کہا:

"اے ابو عبداللہ! آپ سفیانؒ کی بلندیٔ درجہ کے باوجود ان کی حدیث چھوڑ کر اس نوجوان کی خچر کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں اور انؒ سے سُن رہے ہیں؟"

امام احمدؒ نے فرمایا:

"جو میں جانتا ہوں۔ اگر تم بھی جانتے تو تم دُوسری جانب چلتے۔ سفیانؒ کا علم اگر مجھ سے اعلیٰ درجہ کا رہ گیا تو کم درجہ تک تو حاصل کر لوں گا لیکن اس نوجوان کی عقل و دانش اگر مجھ سے رہ گئی تو یہ مجھ سے کم زیادہ کہیں بھی حاصل نہ ہو گی۔"

میں نے ابوبکر بن جلاء کو فرماتے سُنا:
"اگر میں کسی بچے کو ایسا کام کرتے دیکھوں جس کو اچھا سمجھوں تو اس کی اقتدا کر لیتا ہوں اور وہ اس میں میرا امام ہوتا ہے۔"
ان کے علم و زہد کے باوجود میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو زیادہ تواضع کرنے والا نہیں دیکھا۔

ایک روایت میں ہے:
"لوگ اس وقت تک بھلائی میں رہیں گے جب تک انہیں اکابر سے علم ملتا رہے گا اور جب انہیں اصاغر سے علم ملنا شروع ہُوا تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔"
حضرت ابن مبارکؒ سے پوچھا گیا، تو فرمایا کہ اصاغر سے مراد بدعتی لوگ ہیں۔ اس لیے کہ اہل سنت میں سے جس کے پاس بھی علم ہو وہ اصاغر میں سے نہیں ہے۔"

پھر فرمایا:
"کئی کم عمر ایسے ہیں جن سے ہم نے بڑا علم حاصل کیا۔"
ایک قول یہ ہے کہ "اکابر سے مراد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں"۔ یہ مفہوم ایک دوسری روایت کے مطابق ہے:
"میری اُمت اس وقت تک بھلائی میں رہے گی جب تک ان میں وُہ لوگ ہیں جنھوں نے مجھے دیکھا، عنقریب وُہ زمانہ آئے گا کہ اطرافِ زمین میں تلاش کیا جائے گا اور وُہ نہ ملے گا جس نے مجھے دیکھا۔"

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:
"لوگ اس وقت تک بھلائی میں رہیں گے جب تک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے اور ان کے اکابر سے ان کے پاس علم آئے گا اور جب انہیں اپنے اصاغر سے علم ملے گا تو بڑا چھوٹے پر نافرمانی کرے گا اب وُہ ہلاک ہو جائیں گے۔" یہ دراصل اس خطرہ کے باعث فرمایا کہ بڑی عمر والے تکبر، تقریباً جبار کی وجہ سے چھوٹے سے علم نہیں سیکھیں گے اور یہ ان کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔
ایک دوسری توجیہ بھی ہے؛ اور یہ میرے نزدیک خبر و کون پر ہے، مذمت پر نہیں۔ اس لیے کہ اس اُمت کے ابتدائی زمانہ کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کے چھوٹے بڑوں سے علم سیکھیں گے اور اس طرح آخری زمانہ میں بڑے چھوٹوں سے علم سیکھیں گے۔ اگر یہ توجیہ درست ہو تو اس میں چھوٹوں کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور سابقہ اُمتوں پر اس اُمت کا شرف و فضل ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ سابقہ امتیں صرف راہبوں، صوفیوں اور بُوڑھے عابد و زاہد لوگوں کے علاوہ کسی سے علم نہ حاصل کرتی تھیں۔

بنایا: "آخری زمانہ میں یہ اُمت، ابتدائی زمانوں میں کی سابقہ امتوں پر فضیلت حاصل کرے گی، یعنی ان میں بڑا چھوٹے سے علم حاصل کرے گا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس (علم) کے ذریعہ فضیلت بخشی"
یہ روایت ایک دُوسری روایت کے بہت زیادہ مطابق ہے۔ فرمایا:

"میری اُمت بارش کی طرح ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اس کی ابتداء بہتر ہے یا اس کا آخری حصہ بہتر ہے"

اسی طرح ایک روایت ہے:

"وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے کہ جس کی ابتداء میں مَیں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں اور اس کے آخر میں عیسیٰ بن مریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں!"

ایک روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ جس بندے کو علم عطا کرے اسے حقیر نہ جانو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حقیر نہیں بنایا (بلکہ اسے علم عطا کیا" (اور عزت بخشی)

حضرت شعبہؒ فرماتے ہیں:

"میں جس سے ایک حدیث لکھوں یا اس سے کچھ علم حاصل کر لوں تو میں اس کا غلام ہوں"

ایک بار فرمایا:

"جب میں کسی آدمی سے سات احادیث لکھ لوُں تو اس نے مجھے اپنا غلام بنا لیا"

البتہ بعض علماءؒ کے بارے میں مروی ہے، جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے کہ انہوں نے سیاہ خضاب استعمال کیا اور وہ نفسانی خواہش یا بڑھاپا چھپانے کی وجہ سے ایسا نہ کرتے تھے بلکہ اللہ کے دشمنوں کو حسبِ استطاعت اپنی قوت اور طاقت بتانا مقصود تھا اور گویا اس معنی میں ہُوا کہ

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ[1] (اور تیار رکھو ان کے واسطے جو کر سکو قوت)

اور جوانی ظاہر کرنا بھی قوت دکھانے میں داخل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمل کیا اور آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے رمل (تیز دوڑنا) کیا تاکہ کفار دیکھ لیں کہ ان میں بھی قوت اور شدت ہے۔
اب اگر کوئی آدمی عالم ہو، اس کی نیت بھی خالص لوجہ اللہ کام کرنے کی ہو تو اس کا یہ فعل (علم) باعثِ شرف و فضیلت ہے اور اگر اعمال خراب ہوں اور ان میں خلوص وغیرہ نہ ہو تو ایسے اعمال کا اتباع درست نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

---

[1] سورۃ انفال ۶۰

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین درجہ کا وہ آدمی ہے جو مومن کی برائی کا اتباع کرتا ہے اور اس کی نیکی چھوڑ دیتا ہے۔" چنانچہ مومن کی برائی بھی پائی جاسکتی ہے۔ اور بدترین آدمی وہ ہے جو خواہش نفس کے لیے ایک عذر بنا کر کسی مومن کی برائی پر چل پڑے۔

نوافل میں مستحبات و مکروہات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اس سے مراد فجر کی دو رکعتیں ہیں۔"

اسی طرح اس فرمان الٰہی کی تفسیر کی:

وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ السُّجُوْدِ[1] (اور کچھ رات میں بول اس کی پاکیزگی اور سجدوں کے بعد)

اس سے مراد ان کے بعد اور ان کے آخر میں دو رکعت مغرب مراد ہیں اور تسبیح دراصل نفلی نماز کا نام ہے اس لیے کہ اس میں تسبیح ہوتی ہے اور نفلی نماز کو سبحۃ بھی کہا کرتے ہیں۔

نمازوں کے بعد اور ان سے پہلے کچھ ایسی سنتیں ہیں جن میں کچھ بھی نہ چھوڑنا چاہیے۔ ان میں سے بعض سنت موکدہ ہیں اور بعض غیر موکدہ ہیں۔ پانچ احادیث سے سترہ رکعتیں ثابت ہوتی ہیں (جو سنت ہیں)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ان سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دن کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"سولہ رکعتیں (دن میں پڑھتے)۔"

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے:

"میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعتیں یاد رکھی ہیں۔"

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی حدیث میں نماز ظہر سے پہلے کی سنتوں کے بارے میں اور حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت عائشہؓ عشاء آخر کے بعد کی نمازیں اور وتر میں روایت کرتے ہیں۔

حضرت ام حبیبہؓ کی روایت میں تعداد رکعات کی فضیلت آتی ہے:

"جس نے دن میں فرض کے علاوہ بارہ رکعات (سنن) پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر

---

[1] سورۃ ق ۴۰

بنائے گا۔"

ایک غریب روایت اہل بیت سے ہے جو مذکورہ کے مطابق ہے:

"اللہ تعالیٰ نے دن رات میں تم پر سترہ رکعتیں فرض فرمائیں اور اس کے برابر سنن ادا کرنا (مسنون) فرمایا۔"

چنانچہ نمازِ فجر سے پہلے دو رکعت ادا کرنا سنتِ موکدہ ہے۔ نمازِ ظہر سے پہلے چار رکعت سنت ہیں مگر یہ استحباب کے درجہ میں اور مستحب ہیں۔ نمازِ ظہر کے بعد دو رکعت ادا کرنا سنت ہے۔ نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت سنت ہیں اور امید ہے کہ ایسا کرنے والا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے رحمت سے حصہ پائے گا۔ نمازِ مغرب کے بعد دو رکعت سنت موکدہ ہیں اور رات کو تین وتر موکدہ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مروی ہے اس میں انہوں نے ان باتوں کا ذکر کیا جو دوسروں نے نہیں کیا، کہ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ضحیٰ (چاشت کی نماز) چھ رکعت دو وقتوں میں پڑھتے۔ جب سورج روشن ہو کر اوپر اٹھتا تو آپ کھڑے ہوتے اور دو رکعت نماز پڑھتے۔ اس سے مراد اشراق کی نماز ہے اور یہ دن کا دوسرا ورد ہے۔ اور جب سورج ذرا تیز ہو جاتا اور مشرق کے چوتھائی حصہ آسمان تک اٹھ آتا تو اس وقت چار رکعت ادا کرتے جیسے کہ تین چوتھائی آسمان طے کرنے پر نمازِ عصر پڑھتے ہیں۔ یہ ضحیٰ اعلیٰ کا وقت ہے۔

دن کے تیسرے ورد پر دوام اختیار کرنا اور اس نمازِ چاشت مسلسل ادا کرنا ایک عزیمت اور فضیلت کی بات ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت ام ہانی ؓ نے بتایا:

"آپ نے نمازِ ضحیٰ آٹھ رکعت پڑھی، انہیں خوب طویل کر کے اور عمدہ کر کے ادا کیا۔" یہ تعداد کسی دوسرے راوی نے نقل نہیں کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"آپ نمازِ ضحیٰ چار رکعت ادا کرتے اور جس قدر اللہ چاہتا، زیادہ پڑھتے۔" چنانچہ انہوں نے تعدادِ رکعات کی تحدید نہیں فرمائی۔

ایک منفرد حدیث میں ہے:

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ضحیٰ، چھ رکعتیں ادا کرتے۔"

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منفرد طور پر روایت کیا:

"آپ زوال کے بعد اور نمازِ ظہر سے پہلے ہمیشہ چار رکعت ادا کرتے۔ ان میں سورۃ بقرۃ کی مقدار کے

مطابق پڑھتے۔ بتاتے ہیں کہ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا:

"اس گھڑی میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دعا قبول کی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس (گھڑی) میں میرا کوئی نیک عمل اٹھایا جائے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت حبیبہؓ نے وضاحت کی اور فرمایا:

"جو دن میں فرائض کے علاوہ بارہ رکعتیں ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔ (یعنی فجر سے پہلے دو رکعت، ظہر سے پہلے چار رکعت اور اس کے بعد دو رکعت، عصر سے پہلے دو رکعت اور مغرب کے بعد دو رکعت۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء اخیرہ کے بعد چار رکعت ادا کرتے اور پھر سو جاتے۔"

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد تین رکعتوں سے وتر پڑھتے۔ پہلی رکعت میں (سورۃ فاتحہ کے بعد) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی پڑھتے۔ دوسری رکعت قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھتے اور تیسری رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے۔"

اب اگر انسان ان سترہ رکعتوں کو دوگنا کر لے یعنی چونتیس رکعتیں ہمیشہ پڑھا کرے اور انہیں نماز کا ورد بنا لے تو یہ افضل ہے۔ یہ اہل سنت کا مذہب ہے اور انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس فرمان سے استدلال کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے میری امت پر دن رات میں سترہ رکعتیں فرض کیں اور اسی قدر ان کے لیے مسنون ٹھہرائیں۔"

اگرچہ اہل نقل محدثین اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نماز بہترین وضع کردہ چیز ہے۔ جو چاہے زیادہ کرے اور جو چاہے کم رکھے۔"

اور فرمایا:

"ہر اذان اور اقامت کے درمیان ایک نماز ہے اس کے لیے جو چاہے۔" اگر پانچوں نمازوں سے پہلے اور ان کے بعد ان سنن و مستحبات کا لحاظ رکھے تو یہ باعثِ قربِ الٰہی عمل ہے جیسے کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں۔ چنانچہ نمازِ فجر سے پہلے دو رکعت۔ نمازِ ضحیٰ کی چار رکعت، نمازِ ظہر سے پہلے چار رکعت اور اس کے بعد بھی چار رکعت، نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت، نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعت، نمازِ عشاء سے پہلے چار رکعت اور اس کے بعد چھ رکعت پڑھا کرے۔ پھر ایک رکعت ملا کر وتر کرے۔ ایسا کرنے سے مذکورہ روایات

کے فضائل کو حاصل کرے گا۔ مروی روایات اور اہلِ بیت کے فعل کی طرف ایسا کرنے سے نسبت حاصل ہوجائیگی۔

مغرب اور عشاء کے درمیان زیادہ سے زیادہ آپؐ کی نماز چھ رکعتیں مروی ہیں اور نمازِ ضحیٰ میں زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں پڑھنا مروی ہے۔ اور ایک مقطوع حدیث کے علاوہ باقی روایات سے رات کی نماز (نمازِ تہجد) میں آپؐ سے زیادہ سے زیادہ تیرہ رکعتیں پڑھنا منقول ہے۔ مقطوع حدیث حضرت طاؤس پر موقوف ہے۔ ابن مبارکؒ نے اسے روایت کیا کہ "حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سترہ رکعتیں ادا کرتے"۔ مگر یہ شاذ حدیث ہے اور تمام دوسری روایات جو حضرت ابن عباس، عائشہ، میمونہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہم و عنہن سے مروی ہیں۔ ان میں گیارہ اور تیرہ رکعتیں منقول ہیں۔

مستحب یہ ہے کہ انسان ہر نماز سے پہلے اور بعد میں چار چار رکعت نماز ادا کرے۔ البتہ جن نمازوں سے پہلے اور بعد نماز نفل کی اجازت نہیں وہاں نہ پڑھے۔ پھر ان نمازوں کے علاوہ جس قدر اللہ تعالیٰ توفیق بخشے زیادہ سے زیادہ نوافل پڑھتا رہے۔ نمازِ ضحیٰ میں آٹھ رکعت ادا کرے اور اس نماز پر دوام رکھے۔ اگر انبساط حاصل ہو تو طویل طویل رکعتیں پڑھے ورنہ اختصار رکھے مگر ہمیشہ پڑھے۔ اس لیے کسی عمل پر دوام کرنا ایک دوسرا عمل ہے اور یہ اللہ کے نزدیک افضل ترین اور محبوب ترین کام ہے۔ اگر زیادہ وقت نہ ہو تو چار رکعت پڑھ لے، مگر ناغہ نہ کرے۔

غروبِ آفتاب کے بعد اور نمازِ مغرب سے پہلے اگر دو رکعت پڑھے تو یہ مکروہ نہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ دانش صحابہؓ نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت ادا کرتے تھے۔ حضرت ابی بن کعب، عبادۃؓ ابن صامت، ابو ذر، زید بن ثابت اور دوسرے اکابر صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ عنہم یہ دو رکعت پڑھا کرتے۔

حضرت عبادۃؓ یا کسی دوسرے راویؒ کا بیان ہے:

"جب موذن، نمازِ مغرب کی اذان دیتا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تیزی سے ستونوں کی طرف آتے اور دو رکعت ادا کرتے"۔

بعض کا فرمان ہے:

"ہم نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعت ادا کرتے"۔ اور یہ فعل دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عام حکم میں داخل ہے۔ فرمایا:

"ہر دو اذانوں (اذان و اقامت) کے درمیان ایک نماز ہے اس کے لیے جو چاہے"۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ یہ دو رکعت پڑھتے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور ایک بار فرمایا:

"میں نے لوگوں کو یہ دو رکعت پڑھتے نہیں دیکھا"۔چنانچہ میں نے انہیں چھوڑ دیا اور فرمایا: "اگر کوئی آدمی اپنے گھر میں دو رکعت (قبل از مغرب) پڑھ لے یا جہاں اسے لوگ نہ دیکھتے ہوں وہاں پڑھے تو بہتر ہے اور یہ مستحب ہے (تاکہ عوام سے اُلجھنے سے بچ جائے)۔

فصل ۳۷

اعمالِ صالحہ کو برباد کرنیوالے

بڑے بڑے گناہ اور ان کے درجات

کبائر کی تعداد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ [1]

(اگر تم بچے رہوگے بری چیزوں سے جو تمہیں منع ہوئیں تو ہم تمہارے گناہوں کا کفارہ کر دیں گے)

چنانچہ چھوٹے گناہوں کے دُور کرنے کی یہ شرط رکھی کہ بڑے گناہوں سے بچے رہو جو ہلاک کر دیتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"پانچ نمازیں، اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک جو آدمی کبائر سے بچے گا۔ ان کے درمیان اس کے (صغائر گناہوں) کا یہ کفارہ ہیں"۔ دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

"ان کے درمیان کے لیے کفارات ہیں سوائے کبائر کے"۔ چنانچہ کبائر گناہوں کو کفارات سے مستثنیٰ کیا"۔

صحابہ و تابعین میں علماء کا کبائر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ چار ہیں۔ بعض کے نزدیک سات۔ بعض کے نزدیک نو اور بعض کے نزدیک گیارہ اور بعض کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے،

"یہ چار ہیں"۔

حضرت ابن عمرؓ فرمایا کرتے،

"کبائر سات ہیں"۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا،

"یہ نو ہیں"۔

جب حضرت ابن عباسؓ کو حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول پہنچا کہ کبائر سات ہیں تو فرمایا :

"یہ سات سے زیادہ اور ستر کے قریب ہیں"۔

ایک بار فرمایا : "جس جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا وہ کبیرہ گناہ ہے"۔

---

[1] سورۃ النساء ۳۱

انہوں نے اور ایک دُوسرے صحابیؓ نے فرمایا:
"جس پر اللہ تعالیٰ نے آگ (دوزخ) کی دھمکی دی وُہ کبائر میں سے ہے۔"
بعض سلفؒ کا فرمان ہے:
"دنیا میں جس پر حد لازم ہوتی ہو وُہ کبیرہ گناہ ہے۔"
ان کے نزدیک لمم بیں سے تھے یعنی جن پر حد لازم نہیں ہوتی اور جن پر دوزخ کی دھمکی نہیں دی گئی۔
حضرت ابُوہریرۃؓ اور دُوسرے صحابہ سے یوں منقول ہے۔
عبدالرزاق فرمایا کرتے،
"کبائر گیارہ ہیں۔"
جن اقوال بیں تعداد مروی ہے ان میں یہ موخرالذکر زیادہ سے زیادہ تعداد والا قول ہے۔
ایک قول یہ ہے کہ مبہم ہیں۔ ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں جیسے کہ لیلۃ القدر، جمعہ کے دن کی قبولیتِ دعا کی گھڑی اور صلاۃ وسطیٰ مبہمات میں سے ہیں تاکہ لوگ خوف و امید کی حالت میں رہیں۔ کسی چیز میں قطعیت کا حکم نہ لگادیں اور نہ ہی کسی چیز کی طرف پر سکون ہوکر رہ جائیں۔
بطریقِ استنباط حضرت ابنِ مسعودؓ کا قول خوب ہے ان سے کبائر کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا،
سورۃ نساء شروع سے پڑھو اور تیس آیات تک یعنی اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ تک پڑھ جاؤ۔ ابتدائے سورت سے لے کر یہاں تک اللہ تعالیٰ نے جس جس چیز سے منع فرمایا وہ کبائر میں سے ہے۔ یہ قول دراصل حضرت ابن عباسؓ کے لیلۃ القدر کے استنباطی فرمان کے مشابہ ہے کہ یہ ستائیس شب ہے۔ انہوں نے ھِیَ تک سورت کے کلمات شمار کیے تو وہ ستائیس کلمات تھے۔ یہ دونوں اقوال ہیں۔ واللهُ أعلم بحقيقتهما۔

کبائر کون سے ہیں؟ میرے نزدیک متفرق اقوال کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد سترہ بنتی ہے۔ چار کبائر کا تعلق قلب سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر قلبی اصرار کرنا۔
۳۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہوجانا۔
۴۔ اللہ تعالیٰ کے مکر (تدبیر و ابتلاء) سے بے خوف ہوجانا۔
چار کبائر زبان میں ہیں،

۱۔ جھوٹی گواہی دینا۔

۲۔ مرد یا عورت پر تہمتِ زنا رکھنا۔ جو کہ بالغ مسلمان اور آزاد ہو۔

۳۔ جھوٹی قسم کھانا یعنی جس کے ذریعہ ایک حق کو باطل کیا جائے یا باطل کو اس کے ذریعہ حق بنایا جائے۔ ایک قول کے مطابق جھوٹی قسم (یمینِ غموس) سے مراد وُہ ہے جس کے ذریعہ ظلم کرتے ہُوئے مسلمان کا مال حاصل کیا جائے۔ چاہے پیلُو کی ایک مسواک ہی ہو۔ اسے غموس اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ فعل انسان کو اللہ تعالیٰ کے غضب میں ڈبو دیتا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل انسان کو آگ میں ڈبوتا ہے۔

۴۔ جادو۔ یعنی ایسا کام یا کلام جو اعیان کو بدل دے یا انسان کو متغیر کر دے اور معانی کو ان کے موضوعات خلق سے بدل دے اور جادوگر وہ ہیں جو گانٹھوں میں پھونکیں لگاتے ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔

تین کبائر پیٹ میں ہیں :

۱۔ شراب پینا اور دُوسری مسکرات میں سے کھانا پینا۔

۲۔ یتیم کا مال ظلم کر کے لینا۔

۳۔ جانتے ہُوئے سُود کھانا۔ یعنی جانتا ہے کہ یہ سود ہے پھر بھی اسے لے۔

دُو کبائر شرمگاہ میں ہیں :

۱۔ زنا کرنا

۲۔ اور دبر میں قومِ لُوط کا سا فعل کرنا۔

اور دُو کبائر ہاتھوں میں ہیں :

۱۔ قتل کرنا

۲۔ چوری کرنا۔

ایک کبیرہ گناہ ٹانگوں میں ہے یعنی جہاد میں میدانِ جنگ سے بھاگ آنا اور بھاگنے کا مقصد امام کے حکم پر واپس آنا یا کسی مسلمان گروہ کے پاس آکر دوبارہ جنگ کرنا اور پیچھے ہٹ کر دوبارہ حملہ کرنا نہ ہو بلکہ فرار مقصد ہو تو یہ کبیرہ گناہ ہے۔

ایک کبیرہ گناہ سارے بدن میں ہے یعنی والدین کی نافرمانی کرنا اور والدین کی نافرمانی کا مطلب یہ ہے کہ وُہ کسی حق میں اس پر قسم کھائیں اور وہ ان کی قسم پوری نہ کرے۔ وُہ اس سے اپنی جائز ضرورت کا مطالبہ کریں اور وُہ انہیں نہ دے۔ وہ اس سے امن چاہیں اور وہ ان کے ساتھ خیانت کرے۔ وُہ بھوکے ہوں

اور یہ سیر ہو اور انہیں کھانا نہ دے وہ اس کو گالی دیں تو یہ انہیں مارے۔

حضرت وہب بن منبہ یمانیؒ نے فرمایا:

"تورات میں والدین کی اطاعت یہ بیان ہوئی کہ تو اپنے مال کے ذریعہ ان کا مال بچائے۔ ان کا مال موخر کرکے بچائے اور اپنے مال سے انہیں کھلائے اور نافرمانی کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مال خرچ کرکے اپنا مال بچائے، اپنا مال بڑھائے اور بچائے رکھے اور ان کا مال کھاتا رہے۔"

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے:

"ایک نماز، دوسری نماز تک کفارہ ہے۔ ایک رمضان دوسرے رمضان تک کفارہ ہے سوائے تین (گناہوں) کے۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، سنت ترک کر دینا اور بیعت توڑنا۔ یعنی ایک آدمی بیعت کرے، پھر تلوار لے کر اس کے مقابلہ میں نکل آئے اور اس سے مقابلہ کرے۔"

حضرت علاء بن عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا۔ بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی کا ناحق طور پر اپنے مسلمان بھائی کی عزت میں ہاتھ ڈالنا اور ایک گالی کے عوض دو گالی دینا بھی کبائر سے ہے۔"

حضرت عبادۃ بن صامت، ابوسعید خدری اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے:

"تم بعض کام ایسے کرتے ہو کہ تمہاری نظروں میں وہ بال سے باریک تر ہیں۔ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انہیں کبائر میں شمار کرتے۔"

اور بعض الفاظ یہ مروی ہیں:

"انہیں مہلکات میں سے شمار کرتے۔"

ایک جماعت کا فرمان یہ ہے:

"ہر عمد سے (کیا گیا گناہ) کبیرہ ہے۔"

چار باتیں مخفی ہیں

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"چار چیزیں مبہم ہیں ان کے حقائق کوئی نہیں جانتا۔

۱۔ نمازِ وسطیٰ۔

۲۔ لیلۃ القدر۔

۳۔ جمعہ کے روز قبولیتِ دعا کی گھڑی۔

۴۔ اور کبائر، تاکہ لوگ وعید اور دھمکی کی وجہ سے ڈرتے رہیں اور تقویٰ اختیار کریں اور امید بھی رکھیں اور مانگتے رہیں اور کسی چیز کے بارے قطعیت سے حکم نہ لگا دیں اور نہ کسی چیز کی طرف پرسکون ہو کر رہ جائیں۔

وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ [1] (اور اللہ کے اختیار ہے آخر ہر کام کا)

مذکورہ خصائل متوسط اور معتدل ترین طور پر اقوال سے لی گئی ہیں۔ ان پر سب کا اتفاق ہے اور ان کے بارے میں بکثرت روایات موجود ہیں۔ یہی وہ مہلکات ہیں کہ اگر ان سے بچا رہا تو دوسرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس کی برائیاں نیکیوں میں بدل جائیں گی۔ اور فرائض خمسہ جو ارکان اسلام ہیں ان کے علاوہ پھر نوافل بھی ثابت رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارکان اسلام اور یہ کبائر دونوں قرین ہیں۔ معنوی طور پر دونوں بالمقابل اور اپنے اپنے مفہوم میں عظیم اجر یا سزا کا باعث ہیں۔

اگر کبائر سے بچا رہے تو صغائر سے کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر ارکان خمسہ کامل طور پر ادا کرے تو وہ دوسری برائیوں کے لیے کفارہ بن جاتے ہیں۔ بندے کے لیے نوافل ثابت رہتے ہیں اور ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتے ہیں اور اس طرح انسان کو عظیم شرف حاصل ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے لیے جنت اور عبادت گزاروں کے اعلیٰ مقامات کی امید کی جا سکتی ہے اور یہی آدمی سابق بالخیرات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ [2]

(اگر تم بچتے رہو گے بڑی چیزوں سے جو تمہیں منع ہوئیں تو ہم تمہارے گناہوں کا کفارہ کر دیں گے)

اور کبائر کے بعد فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ [3]

(مگر جس نے توبہ کی اور یقین لایا اور کیا کچھ کام نیک، سو ان کو بدل دے اللہ، برائیوں کی جگہ بھلائیاں)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پانچ نمازیں ان کے لیے کفارہ ہیں جو ان کے درمیان (صغائر گناہ) ہیں، جب تک کبائر سے بچتا رہے۔"

اور فرائض اربعہ جن کا پانچ نمازوں سے تعلق اور گہرا تعلق ہے۔ یہ ان کے بغیر صحیح نہیں ہوتے جیسے کہ ایک چیز ہی بمنزلہ چار کے ہو۔

---

[1] الحج ۴۱

[2] النساء ۳۱

[3] الفرقان ۷۰

چنانچہ نماز کا توحید و رسالت کی شہادت کے ساتھ ربط ہے۔ اگر ان میں سے ایک ترک کر دی تو پانچوں ترک کر دینے کی طرح معاملہ ہوا۔ اس لیے کہ یہ (نماز) اسلام اور ایمان کی بنیاد ہے۔

کبائر کے وجود اور عدم وجود کا اثر

کبائر سے پرہیز رکھنے کا توحید و رسالت کی شہادت کے ساتھ ربط ہے۔ اسی شہادتِ توحید و رسالت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اب جب کبائر کا ارتکاب ہوگا تو فرائض خمسہ تو تمام صغائر کا کفارہ بن جائیں گے مگر کبائر رہ جائیں گے اور ان کا کفارہ نہ ہوگا اب قیامت کے روز بندے کے لیے فرائضِ خمسہ کے علاوہ ارتکابِ کبائر کی حالت میں دوسرا کوئی عمل باقی نہ رہے گا اور کبائر کے ارتکاب نے اس کے تمام باقی ماندہ نوافل ضائع کر دیے ہوں گے۔ اس لیے اس پر دوزخ کا اور مقامِ مسرفین میں جا گرنے کا سخت اندیشہ ہے اور یہی آدمی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے اور اللہ تعالےٰ نے مومنوں کو اس سے ڈرایا۔ فرمایا :

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ [1] (اے ایمان والو، حکم پر چلو اللہ کے، اور حکم پر چلو رسول کے اور ضائع مت کرو اپنے اعمال)

اسی طرح فرمایا :

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ [2] (کیوں نہیں، جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اپنے گناہ نے)

ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ کبائر اس کی تمام نیکیوں کا احاطہ کر کے انہیں مٹا دیں گے۔ اس وجہ سے ہم نے اس قرأت کو مختار بتایا۔

دوسری توجیہ یہ ہے :

وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ یعنی شرک پر اس کا خاتمہ ہوا اور اس سے پہلے کے اعمال اس کے کچھ کام نہ آئے اور اگر ارکانِ اسلام یعنی ارکانِ خمسہ میں کچھ خامی رہی مگر کبائر سے بچتا رہا تو اس کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اور اس کے فرائض اس کے نوافل کے ذریعہ مکمل کر دیے جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ موجود ہیں۔ کیونکہ اسے صحتِ توحید حاصل ہے اور ایسے کبائر بدعات سے بچا ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتی ہیں۔ اس کی نیکیاں اور برائیاں موجود ہیں۔ اس کا حساب طویل ہوگا۔ یہ آدمی خوف و زلزلوں کو دیکھے گا تاکہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے۔ اسے اعراف والوں میں سے کر دیا جائے گا جو کہ جنت اور دوزخ کے درمیان جگہ ہے اور دونوں کی جھلک پڑتی ہے۔

---

[1] سورۃ محمد آیت ۳۳

[2] سورۃ البقرۃ آیت ۸۱

یہ اہلِ جنت اور اہلِ نار کے درمیان ایک رکاوٹ ہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل فرمائے۔

اب اگر مولائے کریم نے اس سے درگزر کر کے یہ سب معاف کر دیا اور اُسے اصحابِ یمین میں شامل کر کے جنت میں داخل کر دیا تو یہ آدمی مقتصد ہے یعنی ظالم لنفسہ اور سابق الی ربہ کے درمیان ہے۔ اگر اس کے پاس نوافل نہ ہوئے اور فرائض میں بھی کمی ہوئی اور اس کے پاس اعمال صرف یہی ہیں کہ وہ کبائر سے بچتا رہا تو اس کا باقی عمل وزن کیا جائے گا۔ یعنی کبائر سے بچنا اور ناقص فرائض کو تولا جائے گا۔ اگر کبائر سے بچنا ذرہ بھر بھی بھاری ہو گیا یا اس کی ایک نیکی بھی بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ مزید احسان سے اس کو دوگنا کر دے اور اس کی برائیوں سے درگزر فرما کر اسے جنت میں داخل کر دے گا مگر اسے مقاماتِ مقربین اور درجہ سابقین سے کچھ حصہ نہ ملے گا۔ یہ ان میں سے ہو گا جن کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا[1]

(اللہ ظلم نہیں کرتا کسی پر ذرہ بھر، اور اگر نیکی ہو تو اسے دُگنا کرتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا ثواب دیتا ہے)

یعنی جنت عطا کرے گا۔

اگر اس نے فرائض ضائع کر کے یہ پلڑا ہلکا کر لیا تو یقیناً اسے طویل حساب کے لیے کھڑا ہونا پڑے گا اور شفاعت کرنے والے کی شفاعت کا محتاج ہو گا۔

اگر فرائض خمسہ میں کمی ہوئی اور کبائر کا ارتکاب بھی کرتا رہا تو یہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔ یہ ان میں سے ہے کہ جن مومنوں کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو گا یہ مسرفین اور دوزخیوں میں سے ہے۔ اسلام میں اس کے ناقص ہونے اور برائیوں کی زیادتی کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا۔ اس لیے کہ اس کی نیکیاں اس کی برائیوں کو مٹا نہ سکیں گی اور کبائر کے ارتکاب کے باعث اس کے نوافل بھی ختم ہو چکے ہوں گے۔

البتہ یہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا اس لیے کہ اس کی توحید درست ہے اور جس کے دل میں ایمان ایک دینار بھر ہو گا وہ سب سے پہلے دوزخ سے باہر آئے گا۔ اس کے مقابلہ میں کہ جس کے دل میں جَو بھر ایمان ہو گا اور جَو بھر ایمان والا ذرہ بھر ایمان والے سے پہلے دوزخ سے نکلے گا اور ذرہ بھر ایمان والا آخر میں باہر آئے گا۔ آخر کار بعض پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی رحمت ہو گی جو وہم و گمان سے باہر ہے، بعض کو معاف فرما دے اور ان میں سے نہیں کرے گا کہ جن پر سزا لازم ہوئی۔ اس لیے کہ ان کے لیے کلمہ حسنیٰ ازل سے ہے۔

---

[1] النساء : ۴۰

وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّـئَاتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ[1] (اور ہم ان کی برائیاں معاف کرتے ہیں جنت کے لوگوں میں)

ایک روایت میں ہے:

"اس امت کا ایک آدمی لایا جائے گا اور اس سے جہنم کے حصوں میں سے ایک حصہ روک دے گا۔" (بھر دے گا)

ایک روایت میں ہے:

"ایک آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اس کی نیکیاں پہاڑوں کے برابر ہوں گی۔ اگر اس کے پیسے محفوظ رہتیں تو وہ جنتی ہوتا۔ پھر مظلوم لوگ اٹھیں گے اور معلوم ہوگا کہ اس نے اس کو گالی دی ہے، اس کا مال کھایا ہے، اس کو مارا ہے، چنانچہ اس کی نیکیاں کم ہوتی جائیں گی۔ آخر اس کی کوئی نیکی باقی نہ رہے گی تو فرشتے کہیں گے "اے پروردگار! اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور ابھی مطالبات والے بہت سے باقی ہیں"۔ تو کہا جائے گا: "ان کی برائیاں اس کی برائیوں میں ڈال دو اور اسے آگ میں دے مارو۔"

ہر مومن دوزخ سے نکل جائے گا

بتاتے ہیں کہ موحدین میں سے سب سے زیادہ مدت تک دوزخ میں رہنے والا آدمی سات ہزار برس تک دوزخ میں رہے گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس میں شدت ہے۔ فرمایا:

"اللہ کی قسم، دوزخ میں داخل ہونے کے بعد کوئی آدمی بھی اس وقت تک باہر نہ آئے گا جب تک سات ہزار برس اس میں نہ رہ لے"۔ اور واللہ اعلم، یہ دوزخ سے اخیر میں نکلنے والے کی مدت ہے۔ اس لیے کہ وہ مختلف اوقات میں گروہ در گروہ ہو کر نکلیں۔ کچھ لوگ ایک دن کے بعد، کچھ ایک جمعہ کے بعد، کچھ ایک ماہ اور ایک سال سے لے کر سات ہزار سال کے بعد نکلیں گے اور جس کا ایمان زیادہ ہوگا اس کا دوزخ میں قیام کم ہوگا اور سب سے پہلے نکلے گا۔

سب سے پہلے وہ گروہ دوزخ سے نکلے گا جس کے دل میں ایک مثقال ایمان ہوگا یہ سب سے کم مقدار دوزخ میں ٹھہرے گا اور سب سے جلدی باہر آئے گا۔ اسی طرح جو بھر ایمان والا ذرہ بھر ایمان والے سے پہلے باہر آئے گا۔ ذرہ بھر ایمان والے لوگ قلیل ترین ایمان، ناقص ترین توحید رکھتے ہوں گے۔ سب سے بڑے مجرم اور اللہ کے سب سے زیادہ باغی ہوں گے۔ انہیں سب سے زیادہ مدت تک دوزخ میں رہنا پڑے گا۔

ایک خبر مشہور ہے کہ ایک آدمی ہزار برس کے بعد دوزخ سے باہر آئے گا اور وہ کہہ رہا ہوگا:

یا حنّان یا منّان۔ (اے مہربان، اے احسان کرنے والے)

---

[1] الاحقاف ۱۶

بتاتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے جب یہ حدیث روایت کی تو کہا،

"کاش! میں وہی آدمی ہوتا" یہ شدتِ خوف کے کہا۔ پہلے تو دوزخ میں جانے کا ڈر ہوا۔ پھر خوف زیادہ ہوا تو ڈرے کہ کہیں وہاں سے نہ نکلوں تو یہ جملہ کہہ دیا اور یہ تمنا کر دی۔ کاش، ہزار برس کے بعد ہی نکل جاؤں۔ ایک روایت میں ہے:

"سب سے آخر میں دوزخ سے نکلنے والا ہی سب سے آخر میں جنت میں جانے والا ہے۔ واللہ اعلم وہ سات ہزار برس کے بعد ہو' اسے جنت میں ساری دنیا کے برابر دس گنا عطا ہوگا۔" اسے ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

بترتیبِ کون آدمی کو آگ میں داخل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان پانی سے پیدا ہوا۔ پھر اس میں خواہشات کا امتزاج ہو گیا۔ اب یہ مختلط خواہشات آگ کے ذریعہ ہی باہر نکل سکتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ پانی کو مختلط ہونے والی اشیاء سے الگ کرے گی اور وہ خالص ہو جائے گا۔ مزید برآں انسان مٹی سے پیدا ہوا اور یہ مثل ٹیڑھی لکڑی کے ہے جو آگ سے سیدھی ہوتی ہے۔ پھر آگ اس سے الگ کر دی جائے گی اور وہ سیدھا ہو چکا ہوگا۔ اس وقت وہ غیر نار (یعنی جنت) کے قابل ہوگا۔

کافروں اور شیاطین کے دائمی دوزخ میں رہنے کی حکمت یہ ہے کہ ارواح تو آگ سے پیدا ہوئیں۔ آخر یہ اپنے معدن اور کان میں لوٹ آئیں اور یہ بھی سیاہ اندھیری اور ناری ہے اور وہ بھی آگ کے لیے پیدا ہوئے نہ کہ کسی دوسری چیز کے لیے بمنزلہ لکڑیوں، کانٹوں اور جلنے والی چیزوں کے ہیں جو کہ آگ کے ہی قابل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ برکت والا ہے۔ تمام اشیاء میں اس کی حکمت معتدل ہے۔ اس کی حکمتیں ان میں موجود ہیں۔ اعتدال کی نظر سے ہی نظر آتی ہیں اور کمی و فضیلت کے مفاہیم کے ساتھ تعادیر ان کے باعث تقسیم ہوتی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بندے کا ہر نیک وصف اس کی برائی کا کفارہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے نوافل ساقط ہیں اور بندے کا ہر برا وصف اس کے نوافل کو مٹاتا نہیں اس لیے کہ اس کے نوافل بکثرت اور پختہ قائم ہیں۔

جو نیکیاں کرنے والا ہو اور بعض کبائر کا بھی ارتکاب کر جاتا ہو تو اس کے اعمالِ خیر اور اجر و ثواب اس کی توبہ پر موقوف رہتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی اور پختہ رہا تو اس کی توبہ تمام سابقہ کبائر کا کفارہ بن جائے گی۔

طاعات پر اس کی استقامت اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گی اور کبائر میں سے زیادہ تر مہلک گناہ مظالم کے ہیں۔

اور زیادہ تر دوسروں کے گناہ دوزخ میں داخلہ کا باعث ہوتے ہیں جبکہ وہ اس پر ڈال دیے جائیں اور کثرت سے لوگ دوسروں کی نیکیوں سے جنت میں جائیں گے جبکہ وہ انہیں مل جائیں گی۔ اس لیے کہ یہ پختہ

ضعیف ہے۔

اور گاہے آفات آنے سے نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مجھے ابو عبیداللہ بن جلاء سے پہنچا کہ ان کے کسی بھائی نے ان کی غیبت کی پھر انہوں نے معافی کی درخواست بھیجی تو کہا:

"میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرے نامۂ اعمال میں ان کی نیکیوں سے افضل نیکی کوئی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا نامۂ اعمال ان کی نیکیوں سے مزیّن کروں"۔

توبہ کا وقت و اہمیت

حدیث میں ہے:

"ایک گناہ کی مغفرت ہو جاتی ہے اور ایک گناہ نہیں چھوڑا جاتا۔ جس گناہ کی مغفرت ہو جاتی ہے وہ تیرا اپنے نفس پر ظلم کرنا ہے اور جس گناہ کو نہیں چھوڑا جاتا وہ بندوں پر مظالم ہیں" اور سب کا راہ ہے اور رحمت انہیں گھیر لیتی ہے۔ مغرب سے طلوعِ آفتاب ہونے تک توبہ کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہے اور ہر بندے کی توبہ اس وقت تک قبول ہو جاتی ہے جب تک کہ اس کی رُوح گلے تک نہ جا پہنچے اور وہ (موت کے وقت) فرشتوں کو نہ دیکھ لے۔ اب جب اس کی رُوح گلے تک آن پہنچی اور اس نے فرشتوں کو دیکھ لیا تو اس پر توبہ کا دروازہ بند ہو گیا اور وہ اصرارِ (گناہ) پر مرا۔

وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ [1] (اور لوگ کہیں کون ہے جھاڑنے والا)

یعنی اس کی رُوح کون اُوپر لے جائے گا؟ رحمت کے فرشتے یا عذاب کے فرشتے؟

وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ [1] (اور اس نے سمجھا کہ اب آیا فراق)

اس نے یقین کر لیا کہ وہ دنیا سے جدا ہو رہا ہے اور آخرت کو سامنے دیکھ رہا ہے، لوگوں اور گھر والوں سے جدا ہو رہا ہے اور فرشتے نظر آ رہے ہیں۔ اب اگر وہ بغیر توبہ کے مر گیا تو ان میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ [2] (اور اٹکاؤ پڑ گیا ان میں اور جو ان کا جی چاہے ان میں)

یعنی توبہ میں رکاوٹ ہو جائے گی۔

كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِنْ قَبْلُ [2] (جیسا کیا گیا ہے ان کے راہ والوں سے پہلے)

---

[1] القیمۃ ۲۷ - ۲۸

[2] الفاطر ۵۴

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ۔ (اور ان کی توبہ نہیں، جو کرتے جاتے ہیں بُرے کام، جب تک سامنے آئی ایسے کسی کو موت، کہنے لگا میں نے توبہ کی اب)

اور موت اس وقت آتی ہے کہ جب فرشتہ موت سامنے ہوتا ہے اور جب سارے بدن سے روح نکل کر خارج ہو جاتی ہے اور صرف دل اور آنکھوں کے درمیان رہ جاتی ہے۔ یہ وُہ وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ[1] (جس دن دیکھیں گے فرشتے، کچھ خوشخبری نہیں اس دن گناہگاروں کو)

اور اس سے یُوں کہہ کر ڈرایا:

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ[2] (کاہے کی راہ دیکھتے ہیں مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے)

یعنی موت کے وقت۔

اور یہ دیکھنے والوں کے لیے ہے۔

أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ۔ (یا آئے تیرا رب)

یعنی قیامت کے روز۔ اور یہ اہلِ برزخ کے لیے ہے۔

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ۔ (جس دن آئے گا تیرے رب کا ایک نشان)

یہ ناامیدی ہے جو اسے دنیا سے ہو جاتی ہے جیسے کہ مغرب سے طلوعِ آفتاب کے بعد ناامیدی ہو جائے گی اور یہ توبہ کا آخر ہے اور اس کو دیکھ کر تو ہر کافر بھی ایمان لے آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ۔ (جس دن آئے گا تیرے رب کا ایک نشان، کام نہ آئیگا ایمان لانا کسی کو جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا)

یعنی دیکھ کر ایمان لائے تو نافع نہیں۔

أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا۔ (یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی تھی)

یعنی توبہ کرلے اور یہی وُہ وقت ہے جس کے بارے میں فرمایا:

---

[1] الفرقان ۲۲

[2] انعام ۱۵۹ - ۱۵۴

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا۔ (پھر جب دیکھی انہوں نے ہماری آفت)

پردہ ہٹ جائے گا۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِیْنَ فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ[1]

(بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر، اور چھوڑیں جو چیز شریک بناتے تھے۔ پھر نہ ہوا کہ کام آئے ان کا یقین لانا، ان کا جس وقت دیکھ چکے ہمارا عذاب، رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آئی ہے اس کے بندوں میں)

یعنی بندوں کے بارے میں اس کا طریق چل چکا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا[1] (اور تو نہ دیکھے گا اللہ کی چال بدلتی)

آخرت میں بندوں کے ان کے اعمال پر مواخذہ کرے یا معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے۔ اگر چاہے تو انہیں بخش دے وہ غفور رحیم ہے۔ ادائیگی فرائض، ارتکابِ معصیت، ابنائے دنیا کی طرح نفسانیت پرستی اور دنیا دارانہ طرزِ زندگی رکھنے میں لوگ مختلف طور پر برتتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال غافلین کا اور مقام جاہلین کا ہے۔ ان کا انجام قابلِ تعریف نہیں اور نہ ہی ان کا خاتمہ قابلِ رشک ہے۔ اگر ان لوگوں میں ہو تو آفات آنے کے ڈر سے نیک کام نہ چھوڑے۔ اور اگر شیطانی وساوس و مداخلت بھی ہو۔ پھر بھی اعمالِ صالحہ سے الگ نہ ہو بلکہ بطریقِ قصد نیک اعمال کرتا رہے اور وہ اسی نیت پر ہوگا۔

اب اگر کوئی آفت آ جائے تو اس کا علاج کرے، اس کو زائل کرنے کا عمل کرے، حسنِ نیت اور عملِ صالحہ پر پختہ رہے۔ مخلوق سے شرم کھاتے ہوئے یا اس وجہ سے کوئی نیک عمل نہ چھوڑ بیٹھے کہ لوگ اس کے افضل ہونے کا عقیدہ رکھ لیں گے اور ایسا ہونے کو وہ ناپسند کر کے عمل ہی چھوڑ بیٹھے ایسا نہ کرے۔ اس لیے کہ لوگوں کی خاطر عمل کرنا شرک ہے اور ان کی خاطر عمل چھوڑ دینا ریا و دکھاوا ہے اور آفت آ جانے کے ڈر سے عمل ترک کر دینا جہالت ہے اور آفت آ جانے پر عمل چھوڑ کر بیٹھ جانا کمزوری اور سستی کی علامت ہے۔

جو آدمی اللہ کی خاطر عمل شروع کرے اور ختم ہونے اللہ کی خاطر اس سے فارغ ہو اور باہر آئے تو درمیان میں جو گڑبڑ ہو اس کے لیے کچھ نقصان دہ نہیں بشرطیکہ وہ اس کی نفی کرتا رہے اور اس شیطانی مداخلت سے پرسکون و مانوس نہ ہونے پائے۔

گاہے عمل کرنے کے بعد کچھ نقصان دہ بات ہو جاتی ہے مثلاً اس نے ایک کام مخفی طور پر کیا۔ پھر کچھ

---

[1] المومنون ۸۴، ۸۵

مدت کے بعد اسے ظاہر کر دیا۔ اب وہ علانیہ عمل بن گیا۔ چنانچہ دیوانِ سِر سے دیوانِ علانیہ میں منتقل ہو گیا۔ اور مثلاً اگر اس نے کام کیا، پھر اس پر فخر و غرور اور تکبر کیا تو اس کا عمل ہی برباد ہو گیا۔ اس لیے کہ اس نے خود اسے ضائع کیا اور فساد کیا اور اللہ تعالیٰ مفسدوں کے عمل کو درست نہیں فرماتا۔

جو آدمی اللہ کی خاطر کوئی عمل صالح شروع کرے۔ پھر اس میں کچھ خرابی آجائے اور اس کی وجہ سے وہ عمل سے نکل آئے تو اس کا عمل باطل ہو گیا۔

جس کے عمل میں کوئی آفت آئی اور وہ صحت کے ساتھ اس عمل سے مکمل کر کے نکلا تو اس کا عمل سلامت رہا اور آخری حصہ کے ذریعہ پہلے حصہ کی تلافی کر دی گئی۔

افضل ترین عمل وہ ہے کہ اللہ کی خاطر شروع کرے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر مکمل کر کے اس سے نکلے، اور درمیان میں کچھ آفت نہ آئے۔ اب اس کے اول میں اللہ ہے اور آخر میں وہی اس کے ساتھ ہے۔ پھر اس کے بعد اس عمل کے ذریعہ فخر و غرور بھی نہ دکھائے تو یہ افضل ترین عمل ہے۔

اخلاص نیت

افضل ترین نیت یہ ہے کہ تو ہر کام صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر کرے۔ پروردگار کریم کے حق کے باعث اس کی تعظیم مطلوب ہو اور اپنے آپ پر وصفِ عبودیت لازم کرتا ہوا عمل کرے۔ اگر مشاہدہ ذی الجلال والاکرام کا مقام حاصل نہ ہو تو کم از کم مقامِ رجاء تو ہو کہ اخروی مرغوبات و انعامات کا اشتیاق ہو جائے۔

بندے کو چاہیے کہ جو کام کرے اس کا علم حاصل کرلے۔ اگر علم حاصل کر کے کام کرے گا تو وہ علم میں داخل ہونے والا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر چیز میں احکام ہیں۔ ان میں سے جس جس کا علم حاصل ہو اس پر اللہ کی حمد کرے اور عمل کرے۔ اور جس سے جاہل ہو اس کے بارے میں اپنے سے بڑے عالم سے دریافت کرے اور جہاں اشکال پیدا ہو جائے وہاں رک جائے۔ بات واضح ہو جائے تو کام کرے ورنہ چھوڑ دے مگر اس بات کا خاص خیال رکھے کہ اس کی ہر حرکت و سکون یا کام سے توقف سب باتیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے لیے سب کام کرے۔ یہ اعلیٰ ترین نیت ہے اور یہی اخلاص کا مقصود و غایت ہے۔

اگر کوئی آدمی اس لیے عمل کرے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے نفسانی مزے لے گا اور جنت کی نعمتیں اور لذتیں پائے گا۔ حوریں ملیں گی جن کے اوصاف اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں تو ایسی بات اس کے اخلاص کے لیے معیوب نہیں اور نہ ایسا کرنے سے اس کی صحتِ نیت میں خرابی آجاتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کی توصیف کی اور ترغیب دی۔ البتہ یہ بات مقامِ محبین میں نقص شمار ہوتی ہے۔ ان کے

نزدیک یہ ایک ایسا ہی عیب ہے جیسے کہ ایک جاہل ریاوی لذات کی خاطر کوئی عمل کرے۔ ان کے ہاں اہل توحید کے اخلاص میں ایسا کرنا شرک ہے۔ اس لیے کہ وہ بندہ ہونے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ چنانچہ کامل طور پر ہر خواہش سے آزاد ہیں اور صرف وحدانیت کے غلام ہیں۔ اس لیے کہ انہیں خالص ربانی مشاہدہ حاصل ہے۔

رب تعالیٰ کی خاطر اخلاصِ عبودیت، ضرورت کے باعث عبادت و عمل سے زیادہ شدید ہے۔ ہاں جسے اس کا مقام ملا۔ وہ ضرورت کے طور پر بھی عمل کرتے ہوئے حقیقی اخلاص دکھا سکتا ہے۔ اسے ایک عمل یا مجاہدہ ماف نہیں کرتا بلکہ وہ تو پہلے سے ہی مخلص ہے اور یہ محبین کا مقام ہے۔

سالکین کو سب سے زیادہ مشقت، عبادت کو صاف اور پُرخلوص بنانے میں اٹھانی پڑتی ہے اس لیے کہ ان پر شرکِ خفی اور شہوتِ مخفیہ کا خطرہ باقی ہوتا ہے جیسے کہ دنیا داروں کو مال جمع کرنے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ اہلِ دنیا دراصل خواہش کے غلام بن چکے ہیں۔

احرار کا کام یہ ہے کہ وُہ خدمتِ مخلوق سے بری ہیں اور خدمتِ مخلوق (دنیا) اخلاص کو ختم کرتی اور نیت بگاڑ دیتی ہے اور نقص پیدا کرتی ہے اور اس کی کچھ چیز ضائع ہو جائے یا اس کے حق میں کوئی ظلم کرے تو اسے چاہیے کہ اس میں وہ یہ نیت کرے کہ صبر کروں تاکہ اللہ کے ہاں ذخیرہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ پر حسنِ ظن اور صدقِ یقین رکھتے ہوئے اسے اللہ کی راہ میں کر دے۔ چنانچہ اسے نیت کے مطابق اجر ملے گا۔

بتاتے ہیں کہ ایک آدمی کو وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو پُوچھا:

"تم نے اپنے اعمال کیسے دیکھے؟"

کہا: "میں نے جو بھی اللہ کی خاطر کیا تھا سب اس کے ہاں پا لیا۔ حتیٰ کہ راہ سے ایک انار کا دانہ اٹھایا تھا بلکہ ہماری ایک بلی مر گئی تھی میں نے ان سب کو نیکیوں کے پلڑے میں پایا۔" اور بتایا: "کہ میری ٹوپی میں ریشم کا ایک دھاگہ تھا اس کو برائیوں کے پلڑے میں پایا۔"

اور یہ بھی بتایا کہ "ہمارا ایک سو دینار کا گدھا مر گیا تھا۔ اس کا ثواب میں نے نہیں پایا۔"

میں نے پوچھا:

"بلی کی موت نیکیوں میں ہو اور یہ گدھا جس کی قیمت ایک سو دینار تھی اس کا ثواب نہیں پا رہا۔ یہ کیا بات ہے؟"

اسے فرمایا گیا:

"اس کی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تُو نے اس گدھے کو بھیجا اور پھر تجھے بتایا گیا کہ وُہ مر گیا تو تُو نے کہا: "فی لعنۃ اللہ تعالیٰ (اور فی سبیل اللہ تعالیٰ نہیں کہا)۔ اب کیا تیرا اجر باطل نہ ہوتا؟ اور اگر تو فی سبیل اللہ

کہہ دیتا تو اس کو اپنی نیکیوں میں پاتا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے بتایا:

ایک روز میں نے لوگوں پر صدقہ کیا۔ مجھے ان کی مجھ پر نظروں پر تعجب ہوا۔ اس کا نہ مجھے ثواب ملا اور نہ عذاب۔ (بلکہ یہ صدقہ بے کار گیا)"۔

حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں: کہ

"اس کا کیسا بہترین حال ہے؟ کہ نہ اس پر عذاب ہوا اور نہ اجر ملا۔ یعنی سزا سے تو بچ گیا۔ اللہ تعالےٰ نے اس پر احسان فرمایا"۔

ایذاء پر صبر

جس کی غیبت کی جائے یا اسے کوئی آدمی ایذاء دے تو اسے چاہیے کہ صبر کر کے اسے اللہ کے ہاں سمجھے۔ شاید ایسا کرنا اس کی نجات کا باعث بن جائے۔ مروی ہے،

"بندے پر تمام اعمال کے سلسلہ میں محاسبہ ہوگا اور ان میں آفات کے باعث وہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آگ کا مستحق قرار پائے گا۔ پھر اس کے لیے ایسی نیکیاں کھولی جائیں گی جو کہ اس نے نہیں کی ہوں گی اور وہ جنت کا مستحق ہو جائے گا۔ اس پر وہ تعجب کرے گا اور کہے گا:

"اے پروردگار، میں نے یہ اعمال نہیں کیے"۔

اس سے کہا جائے گا،

"یہ ان کے اعمال ہیں۔ جنہوں نے تیری غیبت کی۔ تجھے ایذاء دی اور تجھ پر ظلم کیا۔ ان کی نیکیاں تیرے لیے کر دی گئیں"۔

اس لیے کسی عمل کو معمولی نہ سمجھو۔ چاہے کس قدر چھوٹا سا عمل ہو۔ اسے نیت سے خالی نہ کرو اور نہ چھوٹا خیال کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اسی میں اس کی ہلاکت و بربادی ہوتی ہے اور وہ نہیں جانتا۔

ابن مبارکؒ نے حضرت حسنؒ سے روایت کیا:

"قیامت کے روز ایک آدمی دوسرے آدمی سے لپٹ جائے گا اور کہے گا:

تیرے اور میرے درمیان اللہ تعالیٰ ہے"۔

وہ کہے گا،

"اللہ کی قسم: میں تجھے نہیں پہچانتا"۔

وہ کہے گا:

"ہاں ہاں، تو نے میری دیوار سے ایک تنکا لیا تھا۔ قیامت کے روز ایک آدمی دوسرے آدمی سے

لپیٹ کر کہے گا: اس نے میرے کپڑے سے ایک دھجی لی۔"

ہر کام میں نیت کی اہمیت

حضرت حماد بن ابی سلمان کوفہ کے علماء میں سے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو حضرت ثوریؒ سے پوچھا گیا:

"آپ ان کے جنازہ میں شرکت نہیں کریں گے؟"

فرمایا: "اگر میری نیت ہوتی تو کرتا (یعنی پہلے سے اللہ کی خاطر نیت ہوتی تو جاتا۔ اب اگر جاؤں گا تو تمہارے کہنے سے جاؤں گا اور میرا یہ کام غیر اللہ کی خاطر ہوگا جو علمائے ربانیین کے ہاں شرک کی طرح ہے۔ مترجم)

حضرت حسن بصریؒ کا انتقال ہوا تو ابن سیرینؒ جنازہ میں تشریف نہیں لائے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

"میری نیت نہ تھی۔"

بعض علمائے سلفؒ سے اگر پوچھا جاتا کہ کیا آپ یہ کام کریں گے؟ تو فرماتے:

"اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں نیت عطا فرمائی تو کریں گے۔"

حضرت یحییٰ بن کثیر نے فرمایا:

"عمل میں حسنِ نیت، عمل سے بھی زیادہ باعثِ رسائی ہے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"سلف صالحین چاہتے تھے کہ ہر چیز میں ان کی نیت ہو۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں:

"نیت کے بغیر بات بھی نہ کرو۔"

بعض کا فرمان ہے:

"فسادِ نیت اور نیت بدلنے کا ڈر ترکِ اعمال سے زیادہ سخت ہے۔"

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں:

"جس نے کسی آدمی کو کھانے پر بلایا اور اس کی نیت یہ نہ تھی کہ وہ کھائے۔ اب اگر (مہمان) نے دعوت قبول کر لی اور کھایا تو اس (میزبان) پر دو گناہ ہیں اور اگر دعوت قبول نہ کی تو اس پر ایک گناہ ہے۔ چنانچہ بلا نیت اس کے کھانے پر دو گناہ بتائے۔ اس لیے کہ وہ ناراضگیِ الٰہی کا سامنا کر رہا ہے اور جس کو وہ ناپسند کرتا ہے اس کے لیے اس نے اپنے بھائی کو آمادہ کیا۔ اب اگر وہ جانتا تو دعوت قبول نہ کرتا۔"

جس آدمی کو اللہ تعالیٰ اخلاصِ نیت کی سمجھ عطا فرمائے اور معرفتِ اخلاص زیادہ عطا کرے وہ عبادت کو پُرخلوص بنانے کی خاطر لوگوں سے دُور بھاگے گا۔ اس لیے کہ اسے نظرِ یقین حاصل ہے۔ اور جانتا ہے کہ اس کے لیے صرف

وہی عمل فائدہ مند ہے جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہو اور اس میں اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ بنائے۔ اسی وجہ سے بعض ابدال مجبور ہو گئے کہ وہ خلوصِ اعمال کی خاطر دنیاداروں سے علیحدہ ہو جائیں۔ اور پہاڑوں کی غاروں میں جا چھپے۔ اگرچہ یہ لوگ کئی فضائل اعمال مثلاً باجماعت نماز وغیرہ سے محروم ہو گئے مگر ان کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ ستر نیکیوں سے زیادہ ایک برائی سے بچنا بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات ایک مصیبت آجانے کے ڈر سے فضائل سے الگ ہو گئے۔

جاہل آدمی فضائل کی تلاش کرتا رہتا ہے۔ چھوٹے گناہوں کی پروا نہیں کرتا۔ حالانکہ ان کی نحوست سے اللہ سے بُعد حاصل ہوتا ہے اور یہ مقربین کی راہ نہیں۔ گاہے مقاصد مختلف ہونے کی وجہ سے نیت میں اختلاف آجاتا ہے چنانچہ حُسنِ نیت کے ذریعہ وُہ بعد کو قرب سمجھنے لگتا ہے اور بُری نیت کے باعث وُہ برائی کو نیکی سمجھنے لگتا ہے۔

داؤد محبرؒ نے جب کتاب العقل لکھی تو امام احمد بن حنبلؒ ان کے پاس آئے اور وہ کتاب مانگی۔ چند صفحے دیکھے اور واپس کر دی۔

انہوں نے پُوچھا:

"کیا بات ہے؟"

فرمایا: "اس میں ضعیف اسانید ہیں۔"

حضرت داؤدؒ نے فرمایا:

"میں نے اسے اسانید کی بنیاد نہیں لکھا اسے بنظرِ خبر دیکھیے۔ اگر آپ نے اسے بنظرِ عمل دیکھا تو فائدہ حاصل ہوگا۔"

حضرت احمدؒ نے کہا:

"دوبارہ دیں۔ میں اسے اس نظر سے دیکھوں جس نظر سے آپ نے دیکھا ہے۔"

انہوں نے دوبارہ کتاب دی تو ان کے پاس ایک عرصہ تک کتاب رہی۔ آخر ابن محبرؒ نے خود کتاب مانگی تو انہوں نے واپس کی اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے مجھے اس سے خوب واضح نفع ہُوا۔"

حضرت حسن فرماتے ہیں:

"نیت، عمل سے نیت زیادہ باعثِ رسائی ہے۔"

اور فرمایا:

"ابن آدم جب بھی کسی بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں دو نور پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آغاز

اللہ عزوجل کی خاطر ہو تو اس کا آخر و انجام اس کے لیے کچھ ضرر رساں نہیں۔ یعنی اگر بھلائی میں ارادہ اول کے اندر اخلاص ہو تو اس کے بعد وساوس سے کچھ ضرر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وساوس کمزور چیزیں ہیں۔ یہ عزم کی قوت کو ختم نہیں کر سکتے اور نہ ہی حکم مبرم کو ختم کر سکتے ہیں۔

حضرت یوسف بن اسباطؒ نے فرمایا:

"نیت کو بگاڑ سے صاف و خالص کرنا عبادت گزاروں پر طویل ریاضت سے زیادہ مشقت کی بات ہے۔"

بعض سے مروی ہے۔ فرمایا:

"میں ابو عبید تستریؒ کے پاس کھڑا تھا اور وہ عرفہ کے دن عصر کے بعد اپنی زمین میں ہل چلا رہے تھے ابدال میں سے ایک بزرگ بھائی ان کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے ان کے ساتھ کچھ سرگوشی کی۔ ابو عبیدؒ نے فرمایا: "نہیں" اور وہ بادل کی طرح زمین پر اڑتے چلے گئے۔ آخر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے حضرت ابو عبیدؒ سے پوچھا:

"انہوں نے آپ سے کیا کہا؟"

فرمایا: "مجھے کہا کہ چلو میرے ساتھ مل کر حج کرو۔"

میں نے کہا: "نہیں"۔

ان صوفی صاحب نے پوچھا:

"آپ نے کیوں (حج) نہ کیا؟"

فرمایا: "میری حج کی نیت نہ تھی اور میں نے نیت کر لی تھی کہ رات تک اس زمین کا کام مکمل کروں گا اب مجھے ڈر ہوا کہ اگر میں نے ان کی خاطر ان کے ہمراہ حج کیا تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سامنا کروں گا۔ اس لیے کہ میں نے عمل میں اس کے غیر کو شریک کر لیا۔ میرے نزدیک یہ (غیر اللہ کو کسی عمل میں شریک نہ کرنا) ستر حجوں سے بہتر ہے۔" اور جس نے کسی مباح کام کی نیت کر رکھی ہو اور فضیلت والے کام کی نیت نہ کی ہو تو اس کے لیے اس وقت مباح کام ہی افضل ہے یعنی منتقل ہو گئی اور مباح ہی فضیلت بن گیا۔ اور فضیلت عدم نیت کی وجہ سے اس سے کم درجہ کی بن گئی۔ اس باریک فرق کو صرف علمائے باطن ہی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی پر ظلم ہوا۔ اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بدلہ لے۔ لیکن اگر معاف کر دے تو یہ افضل ہے۔ البتہ اگر بدلہ لینے میں کوئی اچھی نیت ہو اور معاف کرنے میں کچھ نیت نہ ہو تو بدلہ لینا افضل ہے۔

اسی طرح کھانے پینے اور سونے میں اگر یہ نیت ہو کہ عبادات میں قوت حاصل کروں اور دوسرے وقت کے لیے نفع لوں۔ اس کے برعکس روزے اور قیام میں کچھ نیت نہ ہو تو اس صورت میں اس کا کھانا پینا اور

اور سونا ہی افضل ہوگا۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں:

"میں بعض اوقات اپنے آپ کو کسی کھیل میں لگاتا ہوں تاکہ یہ فرحت میرے لیے حق پر مددگار ہو جائے اور جو عمل بھی مباح ہو اور اس میں کوئی اچھی نیت ہو تو اس پر اجر ملے گا اور ہر اچھا عمل جو بے نیت ہو اس پر کچھ اجر نہیں بہتر یہ ہے کہ اس سے دُور رہے۔ یہ اس کے لیے نہ فائدہ مند ہے اور نہ نقصان دہ ہے۔ بسا اوقات اس میں گناہ ہو جاتا ہے جبکہ اس میں دنیا کی نیت آجائے اور جو مباح یا فضیلت کا عمل بغیر نیت کے ہو، اس میں بندے کے لیے کچھ اجر و ثواب نہیں۔ البتہ فارغ اوقات کے بارے میں پرسش ہوگی۔ اور جس فضیلت والے عمل میں (از خود) نیت ہے تو اس کا عمل باطل ہے اور اس کی نیت دراصل خواہش ہے اور نیت دراصل مخفی شہوت اور ناقص ہونے کی وجہ سے پائی گئی۔

اور اگر اس نے عمل شروع کر کے اللہ کی خاطر نیت کر لی تو بُرے انجام سے بچ گیا مگر اس کے ذریعہ اسے فضیلت نہ ملے گی اور اگر اس پر خواہش نفس پوشیدہ رہی یا جہالت کے باعث دقیق قسم کی دنیاوی محبت پائی گئی تو چونکہ اس نے اخلاص کی معرفت حاصل کرنے کے لیے حصولِ علم میں کوتاہی کی اور جہالت پر پرسکون رہا۔ اس لیے گناہ گار ہوگا اور اس میں نقص آجائے گا اور اس کے لیے کچھ عذر بھی نہ ہوگا۔

جہالت ایک جرم ہے

ایک روایت میں ہے:

" اللہ تعالیٰ جہالت کو عذر نہیں قرار دیتا" اور جاہل کے لیے جہالت پر چپ بیٹھ جانا جائز نہیں اور نہ عالم کے لیے جائز ہے کہ وہ علم پر خاموش رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[1] (سو پوچھو اہل ذکر سے، اگر تم کو معلوم نہیں)

حضرت سہلؒ سے پوچھا گیا:

"جہالت سے بڑی بھی کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے؟"

فرمایا: "ہاں"

پوچھا گیا: "وہ کیا؟"

فرمایا: "جہالت سے جاہل ہونا" یعنی آدمی جاہل ہو اور یہ جانتا ہو کہ وہ جاہل ہے یا جاہل آدمی اپنے آپ کو عالم سمجھتا رہے اور جہالت پر خاموش اور راضی ہو کر بیٹھ جائے اور علم حاصل نہ کرے۔ اس طرح فرائض کے فرض د

---

[1] النحل ۴۳

اصل سب کو ضائع کرتا رہے یعنی طلبِ علم کو ضائع کرے اور شاید ایسا بھی کرنے لگے کہ جہالت کے مطابق فتوے دینا شروع کر دے یا شبہات میں کلام کرے۔ اور سمجھے کہ یہ علم ہے۔ یہ بات اس کی خاموشی سے زیادہ جُرم ہے۔ علم کے مشابہ بات سے بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

علم کا علم ہونا کہ وُہ کیا چیز ہے۔ یہ بھی علم ہے اور علم کے واجب ہونے کے لحاظ سے یہ بھی واجب ہے تاکہ علم سیکھتے وقت بصیرت سے علم حاصل کرے کیونکہ علمی شبہات میں آجکل غلط صوفیوں کے اقوال اور متکلمین کے مذہب کی آمیزش ہو چکی ہے۔ قصہ گو لوگوں کی باتیں علمی متشابہات میں مل چکی ہیں۔ اب پُر فریب قول و فعل، علم سے مشابہ بن گیا حالانکہ وہ علم نہیں ہے۔ اس لیے کہ دونوں میں معنوی التباس موجود ہے۔ دقیق اور غریب باتوں میں مشابہت سی ہے اور علمائے سلف کا مسنون طریقہ مخفی ہو چکا ہے۔ اب ان قصہ گو لوگوں اور متکلمین نے علماء سے اختلاط کر لیا۔ اس وجہ سے یہ جاننا کہ علم کیا چیز ہے؛ اور علم کا علم حاصل کرنا ایک دُوسرا علم بن چکا ہے اور پُر فریب اقوال کی بجائے صحیح علم کا جاننے والا ہی عالم ہے۔ گویا اس طرح علم کا جاننا بمنزلہ فضیلتِ علمی کے ہُوا اور اس کا وجوب لازم ہُوا جیسے کہ جہالت سے جاہل رہنا جہالت سے بڑھ کر جرم ہے۔

حضرت سہل رح فرمایا کرتے تھے:

"جہالت کے باعث اس کی قساوتِ قلبی، گناہوں کے باعث پیدا ہونے والی قساوتِ قلبی سے ہے"؛ اس لیے کہ جہالت ایک اندھیرا ہے اور اندھیرے میں بینائی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی اور علم ایک نور و روشنی ہے اگر ایک قصد کرنے والا چاہے نہ چلے پھر بھی اس سے مستفید ہوگا۔

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۔[1] (اور نظر آیا ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال نہ رکھتے تھے)

اس کی تفسیر میں بتایا گیا کہ انہوں نے ایسے اعمال کیے کہ جنہیں اپنی جہالت کے بدلے نیکیاں سمجھتے رہے مگر آخر میں انہوں نے انہیں بُرائیاں پایا۔

ایک قول یہ ہے کہ دوسروں کے گناہ ان کے ذمہ ڈال دیے گئے اور ان کے ذریعہ انہیں عذاب دیا گیا۔ اور دنیا میں وُہ ان کا محاسبہ نہ کرتے تھے۔

ایک روایت میں اس طرح آتا ہے:

"بندہ اپنے اعمال میں نیکیاں دیکھے گا جن کی وجہ سے وُہ جنت میں اپنے درجات کی امید رکھے گا، مگر اس پر

---

[1] الزمر ۴۷

وہ برائیاں ڈال دی جائیں گی جو اس نے نہیں کیں۔ چنانچہ نیکیوں کے مقابلہ میں ان (برائیوں) کا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور وہ دوزخ کا مستحق قرار پائے گا۔ پھر کہے گا:

"اے پروردگار! میں نے یہ برائیاں نہیں کیں جن کی وجہ سے میں ہلاک ہُوا"

(اللہ تعالیٰ) فرمائے گا:

"یہ اس قوم کے گناہ ہیں جن کی تُو نے غیبت کی اور تُو نے اُنہیں ایذا دی اور تُو نے ان پر ظلم کیا۔ یہ تجھ پر ڈال دی گئیں اور وہ ان سے چھوٹ گئے۔"

اسی مفہوم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مسند حدیث آتی ہے:

"قیامت کو ایک بندے کے پاس پہاڑوں کی مقدار نیکیاں ہوں گی اگر وہ اسی کی ہوں تو جنت میں جائے، مگر یہ آئے گا اس پر اس نے ظلم کیا ہے، اس کو گالی دی ہے، اس کو مارا، چنانچہ اس کی نیکیوں سے اس کو بھی معاوضہ دیا جائے گا۔ آخر کار اس کی کوئی نیکی باقی نہ رہے گی۔ پھر فرشتے کہیں گے: "اے ہمارے پروردگار! اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور مطالبہ کرنے والے ابھی بہت سے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"ان کی بُرائیاں اس کے اُوپر ڈال دو۔ پھر اسے آگ میں دے مارو۔"

نیت کے فوائد

بندے کو چاہیے کہ جب کسی عمل کا ارادہ کرے اور یہ چاہیے کہ یہ اس کے لیے ثابت رہے تو اس کے لیے نئے سرے سے اچھی نیت کرے۔ پھر اس پر توقف کرے۔ پھر سوچے کہ اس میں کیا ایک ہی آفت آسکتی ہے یا بہت سی آفات آسکتی ہیں؟ چنانچہ مشاہدۂ یقین کے ذریعہ آفات کو دُور کر کے سب سے نکل آئے۔ پھر صرف تنہا اللہ ہی کی خاطر عمل کرے۔ قصد و وجد اور طلب و ثواب میں صرف اسی کی جانب دھیان رکھے اور کسی غیر کو اس کا شریک نہ بنائے۔ پھر اس عمل پر استقامت رکھے۔ اب اگر درمیان میں کوئی وسوسہ و آفت آئی تو اس کی نفی کر دی۔ حتیٰ کہ مشاہدہ یقین پر قائم رہا تو یہی اخلاص ہے۔ اس لیے کہ مخلص آدمی اخلاص میں دو چیزوں کا محتاج ہوتا ہے اور ان میں سے ایک دوسری سے اولیٰ نہیں ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر صحتِ نیت۔

۲۔ آخرت میں اس کے ہاں سے اجر مانگنا۔ پھر فارغ ہونے تک آفات نکالے رکھے اور احتیاط رکھے کہ کوئی آفت نہ آنے پائے۔ ایسا کرنے سے اس کا اخلاص مکمل ہو گا اور کثرتِ ہوی سے وہ پاک ہو جائے گا۔ اور مخفی شہوت سے بھی صفائی حاصل کرلے گا۔ اب اسے ریاء و شہوت اور آفت سے پاک وصاف خالص اخلاص نصیب ہو گا۔

حدیث میں ہے :

" مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ ڈر ریا، اور مخفی شہوت کا ڈر ہے "۔

ایک قول کے مطابق مخفی شہوت، سے مراد دنیاوی محبت ہے ۔

ایک قول یہ ہے کہ ایسا عمل مراد ہے جس میں بندے کو اجر ملے اور اس کی تعریف کی جائے ۔

پھر بندے کو چاہیے کہ جب کوئی عمل کرنے لگے تو اس سے پہلے ذرا سا توقف کر کے سوچے کہ نیت کیا ہے ؟ اور کتنی نیتیں ہیں ؟ بسا اوقات انسان ایک عمل میں دس یا پانچ یا ان کے درمیان نیتیں کر سکتا ہے ۔ یعنی جس قدر وجوہِ نیکی اور معانی قرب ملیں گے ۔ سب کی نیت کرے ۔ چنانچہ ہر نیت ایک عمل ہو گا اور ہر عمل پر دس اجر ملیں گے اس لیے کہ یہ دس یا پانچ اعمال ہیں اور ہر نیت کا ایک عمل ہے اور ہر عمل کا اجر ہے ۔ ایسا کرنے سے اعمال اور نیکیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان باتوں کو علمائے ربانیین ہی جانتے ہیں جو اس کے احکام سے آگاہ ہوں، اور اصحابِ حال صالح ابدال کا یہ طریق ہے اسی وجہ سے ان کے اعمال پاکیزہ ہُوئے ۔ ان کے مقامات بلند ہوئے ان کے اجر و ثواب میں اضافہ ہُوا ۔ ان کے حالات [illegible] ہو گئے ۔ محض کثرتِ اعمال سے یہ کام نہیں ہوا بلکہ حُسنِ عمل سے ان کا کام بنا اور ایک ایک عمل میں لی گئی نیتیں اس قدر ثمر آور ہُوئیں ۔

روایت میں آتا ہے :

" جو آدمی ایسا عمل کرے جس میں وہ اللہ کی خاطر کرنے کی نیت نہیں کرتا وہ فارغ ہونے تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں رہتا ہے "۔

ایک ادیب کا قول ہے :

" جس نے حُسنِ نیت کرتے ہُوئے تیرا شکر نہ کیا وہ حسنِ صنعت کے ساتھ بھی تیرا شکر نہیں کرے گا " (یعنی قلبی شکر نہ کیا تو ظاہری شکر بھی نہیں کرے گا ۔)

اور اسی مفہوم میں یہ اشعار آتے ہیں : ؎

لَاَشْکُرَنَّکَ مَعْرُوْفًا هَمَمْتَ بِهٖ ‏ ‏ اِنَّ اِهْتِمَامَكَ بِالْمَعْرُوْفِ مَعْرُوْفٌ

وَلَا اَلُوْمَكَ اِذْ لَمْ يَمْضِهِ قَدَرٌ ‏ ‏ فَالشَّيْءُ بِالْقَدَرِ الْمَكْتُوْبِ مَصْرُوْفٌ

(جس نیکی کا تو نے ارادہ کیا میں اس پر ضرور تیری قدر کروں گا اس لیے کہ تیرا نیکی کا ارادہ بھی نیکی ہے)

(اگر تقدیر نے اسے نہ ہونے دیا تو تجھ پر ملامت نہیں اس لیے کہ لکھی ہُوئی تقدیر کے ذریعہ چیز بدل جاتی ہے)

اور اگر نیکی کرنے کی نیت اور کچھ نہ ہو تو یہ ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے وہ قلب و نیت میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا اور عبادت گزار شمار ہو گا ۔ چاہے تقدیر میں اس کے اعضائے ظاہر میں یہ کام نہ لکھا ہو اور تقدیر کی

وجہ سے وہ نہ بھی کر سکے، پھر بھی اسے ہمیشہ اجر ملے گا اور بدی کی نیت میں اور کچھ سزا نہ ہو تو یہ سزا تو ضرور ہے کہ ایسا آدمی اگر تقدیر کی رکاوٹ کے اعضائے ظاہر سے کوئی برائی نہ کرے۔ پھر بھی وہ ہمیشہ خسارے اور باطل میں ہے اور اس پر اس کا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بری نیت اور بُرے کام سے اپنی پناہ میں رکھے۔

ہر کام سے پہلے نیت کرو

بعض مشائخ کا فرمان ہے:

اللہ تعالیٰ سے بعید ترین آدمی وُہ ہے جو صرف اعضاے ظاہر سے عمل کر رہا ہے اور صحت ارادہ کے ذریعہ دل سے اس کی موافقت نہ کرتا ہو۔ یعنی اس کی وجہ سے اللہ کی خاطر اخلاص میں نقص آجاتا ہے۔

نکاح کرنا دین کا ایک عظیم الشان اور اہم مسئلہ ہے۔ اس میں یہ نیت رکھے کہ اس کے حسن و جمال اور مال کی وجہ سے نکاح نہیں کر رہا بلکہ اس کی دینداری اور عقل کی وجہ سے اور نکاح سنت ہونے کی وجہ سے کر رہا ہوں کہ ہم دونوں عفت اور پاکیزگی کی زندگی گزاریں اور (مال و حسن میں) کم درجہ کی عورت پر قناعت کرے۔

حدیث میں ہے:

"جس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر نکاح کیا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر نکاح کر دیا۔ وُہ اللہ تعالیٰ کی ولایت کا حقدار ہے۔"

افضل ترین عمل وُہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی خاطر داخل ہو اور اللہ تعالیٰ کی خاطر باہر آئے اور اس کے بعد کوئی آفت اس پر نہ آئے اور اس سے بڑھ کر اس کا درجہ ہے کہ جو اللہ عزّ وجلّ کے باعث اعمال میں داخل ہو۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی معیت میں ثابت رہے اور اللہ تعالیٰ کے باعث ان سے باہر آئے۔ یہ اصحاب یقین اور عارفین میں سے اہل توحید کا مقام ہے۔ چنانچہ صحیح ترین اور خالص ترین عمل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کی خاطر ہو۔ اس کے آغاز میں وہی ہو۔ اس کے درمیان عامل کو اسی کی معیت حاصل ہو اور اس میں بندے کو اس کے ہاں درجہ حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ ہی اس کے آخر میں ہو۔ پھر اس کے بعد اس پر فخر نہ دکھائے اور نہ ہی کبیرا کبر تعالیٰ سے اس کے عوض کا خیال بھی لائے بلکہ اسے بھول جائے اور اس سے بالکل غافل ہو کر مولائے کریم کی یاد میں لگ جائے۔

مسجد میں بیٹھنے کی نیابت و فوائد

مساجد میں بیٹھنا افضل ترین دینی شان اور اہل تقویٰ کے اعمالِ فاضلہ میں سے ہے۔ اس میں دس نیتیں ہونی چاہئیں۔

مولائے کریم کی زیارت اس کے گھر میں کروں گا جیسے کہ مروی ہے:

"جو مسجد میں بیٹھا اس نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی۔ جس کی زیارت کی جائے اس پر حق ہے کہ زیارت کرنیوالے کا

اکرام کرے۔"

ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کی نیت کرلے جیسے کہ اس فرمانِ الٰہی وَرَابِطُوا کے معنی میں روایت ہے اور یہی مرابطت ہے۔

اور اسی طرح اللہ کی خاطر کان اور نظر کو روکنا اور ڈرتے رہنا۔ جیسے کہ مروی ہے:

"میری امت کی رہبانیت مساجد میں بیٹھنا ہے۔"

اسی طرح عکوف کرنا۔ عکوف کا مطلب ہے کہ دل پر غم و فکر سوار کر لینا اور باطنی عکوف یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی بندگی میں پڑ کر رہ جائے۔ ذکر اللہ کرنا اور ذکر الٰہی سننا اور اس سے نصیحت پکڑنا جیسے کہ روایت میں آتا ہے،

"جو آدمی مسجد کی طرف صبح جائے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہو اور اس کی یاد دلاتا ہو وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنیوالے کی طرح ہے۔" اسی طرح مسجد میں بیٹھ کر علم سکھائے یا علم سیکھے تو وہ بھی مجاہد کی طرح ہے یا اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک مسلمان بھائی کو فائدہ دینے کی خاطر بیٹھے یا اس لیے بیٹھے کہ اللہ کی رحمتوں کا یہاں نزول ہوتا ہے یا ڈر یا حیاء کی وجہ سے گناہوں سے بچنے کے لیے بیٹھے جیسے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے،

"جو بار بار مساجد کی طرف آنے کا التزام رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس کو سات خصائل عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر فائدہ مند بھائی یا نازل ہونے والی رحمت یا برائی سے روکنے والا کلمہ۔ یا ڈر یا حیاء کی وجہ سے گناہوں کو چھوڑ دینا۔"

اخلاص نیت یہ ہے کہ قلب اور ارادہ سے ہر اس کی ضد نکل جائے چاہے اس کی تعداد زیادہ ہو۔ اس لیے کہ نیت قصد کے باعث منفرد ہے۔ واحد تعالیٰ کی خاطر نیت کو سب الائشوں سے جدا اور منفرد کر دینے سے ہی عمل میں خلوص آتا ہے۔

بعض صالحین سے منقول ہے فرمایا:

"میں نے بحری جہاد میں حصہ لیا۔ ہم میں سے ایک ساتھی نے مجھے توبرا پیش کیا کہ خرید لو۔ میں نے سوچا اسے خریدوں اور جہاد میں اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ جب میں فلاں شہر میں جاؤں گا تو میں اسے فروخت کر دوں گا اور خوب نفع ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسے خرید لیا اور اسی رات کو خواب میں دیکھا کہ دو شخص آسمان سے اترے۔ ایک نے دوسرے سے کہا:

"مجاہدین کے نام لکھو۔" چنانچہ اس نے لکھنا شروع کیا اور کہا:

"فلاں آدمی سیر کی خاطر نکلا۔ فلاں دکھاوے کے لیے نکلا۔ فلاں تاجر بن کر نکلا اور فلاں آدمی اللہ کی راہ میں نکلا۔" پھر اس نے میری طرف نگاہ کی اور کہا:

"لکھو۔ فلاں آدمی تاجر ہو کر نکلا۔"

میں نے کہا:

"اللہ میرا گواہ ہے، اللہ کی قسم، میں تجارت کرنے کے لیے نہیں نکلا اور نہ ہی میرے ساتھ سامانِ تجارت ہے۔ میں تو صرف جہاد کی خاطر نکلا ہوں۔"

اس نے کہا:

"اے شیخ، کل گزشتہ تو نے توبرا خریدا اور تیرا ارادہ تھا کہ اس سے نفع حاصل کروں گا۔" میں رونے لگا اور کہا:

"مجھے تاجر بن کر نکلنے والا نہ لکھو۔"

اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور کہا:

"تیرا کیا خیال ہے؟"

اس نے کہا:

"لکھو۔ فلاں جہاد کرنے کی خاطر نکلا مگر اس نے راستہ میں ایک توبرا خریدا تاکہ اس کے ذریعہ نفع کمائے۔ حتیٰ کہ اللہ عزوجل جو مناسب سمجھے وہ فیصلہ فرما دے۔"

دُنیا سے علیحدگی کا حکم

بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو نقائص ہیں مگر افضال فضیلت کے ساتھ ان کا التباس واشتباہ ہوتا ہے۔ ان میں بھی غم و صبر کا انداز پایا جاتا ہے۔ ان باتوں کو علمائے ربانیین ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کے بعد دو آدمیوں نے بھائی چارہ قائم کر لیا۔ ان میں سے ایک راہب بن گیا اس کا نام سرجس تھا اور دوسرا مساجد میں جا کر جماعت میں شریک ہوتا۔ عوام سے اختلاط رکھتا۔ یہ عوام سے اختلاط رکھنے والا آدمی زیادہ عالم تھا۔ یہ اپنے بھائی سرجس کو ملتا اور کہا کرتا:

"بھائی، جس کام میں تم داخل ہوئے ہو یہ بدعت ہے اور اس کا ایسا لحاظ رکھنا لازم ہوتا ہے جو تجھ سے نہ بن سکے گا اور اس میں اللہ کی رضا بھی نہیں۔ اگر میرے ہمراہ جماعت میں آئے اور عوام سے الفت و اختلاط رکھے تو یہ بات رضائے الٰہی کا باعث ہوگی اور تنہا ہی تو سنت پر ہوگا۔"

وہ راہب اس سے اعراض کر لیتا اور اس کی کچھ پروا نہ کرتا اور کہا کرتا:

"تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا ہے اور مخلوق کے ساتھ مانوس ہونے لگا ہے۔" آخر جب اس نے اسے بار بار کہا اور یہ انکار کرتا رہا تو ایک روز عالم نے کہا:

"آج شام میرے ہاں افطار کرو تاکہ یہ بات کھل جائے۔ اس نے ایسے ہی کیا۔ اس نے ڈھونڈتے ہوئے

چوزے سامنے رکھے اور اسے کہا:

"آؤ ہم ان دو چوزوں کو فیصل بنا لیتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک دعا کرے۔ جس کا طریقہ اللہ اور اس کے رسول کے مطابق ہے۔ اس کی دعا پر یہ دونوں چوزے زندہ ہو کر اڑ جائیں۔

اس نے کہا:

"ٹھیک ہے تو دعا کر۔"

راہب دعا کرنے لگا:

"اے اللہ! جس راہ پر میں چل کر تیری رضا حاصل کرنا چاہتا ہوں، اگر یہ راہ میرے اس بھائی کی موعودہ اور بتائی راہ سے حق کے زیادہ قریب ہے تو ان دونوں چوزوں کو زندہ کر کے میری طرف بھیج دے۔"

بتاتے ہیں کہ دعا قبول نہ ہوئی۔ پھر دوسرا آدمی یعنی عالم دعا کرنے لگا:

اے اللہ! اگر یہ راہ جس سے میں وابستہ ہوں اور اس (مرجس) کی اور اس کے اصحاب کی مخالفت کر رہا ہوں۔ اگر یہ حق کے قریب تر ہے اور تیرے نزدیک میرے اس بھائی کی راہ یعنی جماعت سے الگ ہونے اور تنہائی سے حق کے زیادہ قریب ہے تو ان دو چوزوں کو زندہ فرما دے۔ بتایا کہ وہ فوراً اذن الٰہی سے زندہ ہو گئے۔ اب اس کے راہب بھائی نے سمجھ لیا کہ اس رہبانیت کی راہ میں اللہ کی رضا نہیں ہے۔ چنانچہ وہ جماعت اور مساجد کی طرف لوٹ آیا۔

بعض اوقات بلند فضائل میں التباس ہو جاتا ہے۔ ایک انہیں حاصل کرنے کے لیے اپنے مقام میں اپنا حال چھوڑ بیٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے ارادہ سے فضیلت کے پیچھے پڑتا ہے مگر اس پہ لوٹ کر اس کے لیے باعث ہلاکت ہوتی ہے۔ برصیص عابد کو اسم اعظم سیکھنے کے سلسلہ میں شیطان نے یہی دھوکہ دیا اور اس کا واقعہ مشہور ہے

علماء کے نزدیک علم یہ ہے کہ دو بھلائیوں میں سے زیادہ بھلائی سے آگاہ ہو تاکہ اس کے رہ جانے سے پہلے اس کی جانب سبقت کرے۔ اس طرح دو بھلائیوں میں سے بری کو جانتا ہو تاکہ اس سے اعراض کر لے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے دوسری بہتر سے غافل کر دے۔ دو برائیوں میں سے اچھی کو جانتا ہو تاکہ اگر ابتلا اور اضطرار آن پڑے تو اسے کرے۔ اس طرح دو برائیوں میں سے زیادہ بری بات کو جان لے تاکہ اس سے دور بھاگے اور اس کے سامنے دوسری دیوار رکھے۔ یہ علوم کی دقیق باتیں ہیں۔

التباس کی چند صورتیں

گاہے نیت اور تمنا میں التباس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا اخفار ہو جاتا ہے اور فقد اور وسوسہ میں

مشابہت پائی جاتی ہے حالانکہ نیت وُہ ہے کہ جس سے اللہ کی خاطر کام کرنا مقصود ہو اور اللہ کے ہاں ہی اس کا عوض چاہتا ہو۔

اور تمنا وُہ ہے جس کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہو اور فانی دنیا کا فوری مزہ چاہتا ہو۔ گاہے ارادہ اور محبت میں اور گاہے حاجت اور شہوت میں التباس ہوجاتا ہے۔

ارادہ یہ ہے کہ ایک کام کرنے کا ارادہ کرے اور اس کے ہونے کو پسند نہیں کرتا یا اس کی ضد ہونے کو بھی چاہتا ہے۔

اور محبت وُہ ہے جو عقل کو مغلوب کر دے۔ وجد غالب آجائے۔ قلبی گہرائیوں میں اُتر جائے اور اس کے سوا دوسری بات کا وجود ناپسند کرے اور اس کا فقدان نہ چاہے اور حاجت یہ ہے کہ جس کی طرف مجبور ہوجائے اور اس کے بغیر چارۂ کار نہ ہو اور اس کے علاوہ دوسری چیز کے باعث اس سے استغنا نہ ہو۔

اور شہوت دراصل لذت کو زیادہ کرنے والی، فاقہ کی فضیلت کی داعی اور عادت پیدا کرنے والی چیز کا نام ہے۔

گاہے قلبی ذکر اور معانی قرب میں فکر کرنے کے درمیان اختلاط ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ذکر وُہ ہے جو فراموشی ظاہر کر دے، سرکشی کھول دے اور شکر یاد کرا دے اور فکر یہ ہے کہ جو معاملہ کو صورت دے اور خبر ظاہر کرے۔

گاہے رجاء اور محبت میں التباس ہوجاتا ہے۔ گاہے ہویٰ (خواہش) اور نیت میں التباس ہوجاتا ہے چنانچہ رجا یہ ہے کہ کسی وجہ سے بھی اس کی خواہش رکھے اور محبت یہ ہے کہ جس کا مزہ چکھے اور اسے پیدا کرنیوالے کسی سبب کے بغیر اسے پائے۔

گاہے قلبی تواضع اور قلبی ضعف و قلبی موت کے درمیان کے التباس ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ خالق تعالیٰ کے مشاہدہ کے باعث وہ تواضع نفس کے ذریعہ مخلوق میں طمع رکھتا ہے۔

گاہے دنائت و کمینگی نفس کی وجہ سے طمع کی تواضع اور اعترافِ حق خضوع برائے علم میں التباس ہوجاتا ہے۔

گاہے غلبۂ خواہش اور عقل سے مغلوب ہونے کی وجہ سے نفس کے تواضع اور قلب کے تواضع میں التباس ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ وُہ عالم محقق کا تیزی سے اتباع کرتا ہے۔

گاہے قلبی عزت و عظمت کا مرجع سے اختلاط ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی طرف دوام نظر رہتی ہے کہ (دیکھیے انجام کیسا ہو) اور عقلی عظمت کا سلم میں اختلاط ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک علم کا درجہ زیادہ ہوتا ہے۔ گاہے عزتِ نفس کا عزتِ ایمان سے اختلاف ہوجاتا ہے۔ عزتِ ایمان غلبی کے باعث معزز ہے۔ عارفین کے لیے یہ ظاہری فرق ہیں اور غافلین کو متنبہ کرنے کے لیے یہ وُسعت کی باتیں ہیں۔

گاہے عادت اور عبادت میں التباس ہو جاتا ہے مثلاً کسی علم یا عمل میں بندے کی ایک نیت ہے یا صدقہ یا مہینہ یا سال کے خرچ میں بندے کی ایک نیت ہے۔ پھر اس کی نیت الگ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی عادت پر باقی رہا۔ اب اس معروف طریق پر اس کا حال اسے چلائے جا رہا ہے اور اب وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ عرفِ عام سے نکل آئے اور استقامتِ حال پر کلفت اٹھا کر عمل کرے اور بطریقِ تکلف ایسا کرے۔ چنانچہ اس کی نیت ختم ہو جاتی ہے اور عادت باقی رہ جاتی ہے۔

اس غلط طریقہ کی وجہ سے وُہ آخرت کے ارادہ اور آخرت کے لیے محنت سے باہر نکل جائے گا، اور بطریقِ عادت شہوات کے باعث دنیاوی ارادہ میں جا گرے گا۔

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ وہ علوم و اعمال کے مفہوم میں اخروی راہوں کے ذریعہ خواہش کے وجود کے باعث دنیا یعنی حبِ ریاست کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اب اس نے جو سلف کے اعمال چاہے یا نفس کی تادیب مطلوب تھی اور اس کے ذریعہ دنیا میں زہد سیکھا تو یہ اخروی راہیں ہیں اور جو اس کے برعکس ہو گا وُہ دنیاوی راہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ آخرت کی ضد ہیں۔

سلفؒ بتاتے ہیں کہ لوگ جب جان لیں تو عمل کریں۔ جب عمل کریں تو غافل ہو جائیں۔ اور جب غافل ہو جائیں تو فرار اختیار کر لیں۔ اور فرمایا، "سمجھ لو، پھر الگ ہو جاؤ۔"

گاہے اعمال کے ظاہر کرنے اور پوشیدہ احوال کے کھولنے تاکہ اس کے ذریعہ ادب سکھائے اور اتباع کرے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت و آیات کے اظہار کرنے تاکہ سامع کو مزید معرفت حاصل ہو جائے۔ ان باتوں میں اور فخر و تزین کرنے یا اس کے ذریعہ مدح و ستائش چاہنے اور شہرت حاصل کرنے میں التباس ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوسلیمانؒ سے پوچھا گیا:

"ایک آدمی اپنے بارے میں کچھ بتاتا ہے۔ اب اگر وُہ امام ہو تو اس کی اقتداء کی جائے؟" تو ایک بار فرمایا:

"وُہ یا دوسرا؟" اس کے ارادہ کے مطابق یہ مختلف ہوگا۔ اگر اس سے مراد تادیبِ نفس ہو اور یہ بات معلوم نہیں کی جا سکتی کہ اس میں نفس کا دخل ہے یا فنائے نفس کے اثرات ہیں اور فنائے نفس مشاہدہ یقین خداوندی کی قبولیت سے حاصل ہوتا ہے۔

ترکِ عمل میں اچھی نیت کرے

ترکِ عمل ایک کثیر عمل ہے۔ تارکِ عمل اس بات کا محتاج ہے کہ کام کی ممانعت ہو یا اس کی کراہت

ضروری ہو یا تقویٰ مراد ہو اور حسن نیت ہو کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کا جائے امن چاہئے یا اس کے انعام حاصل کرنے کے لیے اس عمل کو ترک کرے اور مخلوق کی وجہ سے یا حال کے رفقاء کی خاطر یا بندوں کے پاس درجہ و مقام حاصل کرنے کی خاطر ایسا نہ کرے۔ اس لیے کہ گناہ ترک کرنا افضل ترین عمل ہے اور وہ بہترین نیت کا ضرورت مند ہے کیونکہ اس کام پر اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت بہت اجر ملنے والا ہے۔ اس لیے کہ اس نے نفس کو آزمائش کی بھٹی میں ڈال کر وصف بدلا اور برائی سے دُور ہُوا۔

بعض مشائخ کا فرمان ہے:

"جو آدمی یہ چاہے کہ اللہ کے سوا دُوسرا کوئی اس کے تقویٰ کو سمجھے تو اللہ کے ہاں اس کے لیے کچھ بھی اجر نہیں۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کسی قوم کی دیوار بنا رہے تھے۔ یہ دست کار تھے اور اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتے تھے۔ کچھ لوگ ان کے پاس آئے۔ ان کے سامنے ان کو کھانا دیا گیا جو دو روٹی تھا۔ یہ کھانے لگے اور فارغ ہونے تک انہیں کچھ نہ پوچھا۔ انہوں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس لیے کہ وہ آپ کا زہد و کرم خُوب جانتے تھے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا:

"میں مزدوری پر کام کرتا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے دو روٹیاں دیں تاکہ ان کے کام میں یہ کھا کر قوت حاصل کروں۔ اگر تم بھی میرے ہمراہ کھاتے تو نہ تمہیں یہ کھانا کافی ہوتا اور نہ مجھے کافی ہوتا۔ اور میں ان کے کام میں کمزور رہتا۔" یہ مثال ان کی ہے کہ جس نے فرض کی وجہ سے فضیلت کا کام چھوڑ دیا اور جس کی ترکِ فعل میں بھی ایسی نیت ہو جیسی کہ فعل و عمل میں تھی۔

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"میں حضرت سفیان بن ابی عاصمؒ کے پاس گیا وُہ کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے انگلیاں چاٹ لینے تک مجھ سے کلام بھی نہیں کیا جب فارغ ہُوئے تو فرمایا:

اگر میں نے اسے قرض نہ لیا ہوتا تو پسند کرتا کہ تُو بھی میرے ہمراہ کھائے۔"

منقول ہے کہ ایک عجمی آدمی چند آدمیوں کے پاس سے گزرا جو بیٹھے مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ اس نے سمجھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کر رہے ہیں۔ اس نے حُسن نیت کے مطابق ان کی طرح کہنا شروع کر دیا۔ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حُسن نیت کی وجہ سے بخش دیا۔

خالص عمل ہی قبول ہوگا

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں:

"مسلمان کی علامت یہ ہے کہ اس کی زبان اس سے آگے نہیں بڑھتی، اس کی نظر سبقت نہیں کرتی اور اس کی نیت پیچھے نہیں رہ جاتی۔" یعنی اگرچہ اس کے اعمال کم ہوں اور اس کے اعضاء کمزور ہوں مگر کمزوری نہیں دکھاتا اور نیکی کے کاموں میں تیزی سے لپک کر جاتا ہے اور پوری قوت کے ساتھ انہماک کرتا ہے۔

فرمایا: "مومن وُہ ہے جس کی نیت بہت خوب، تیز اور قوی ہو اور اس کی بدنی قوت کمزور ہو اور منافق وُہ ہے جس کی نیت کمزور ہو۔ اور اس کی بدنی قوت خوب ہو۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر چیز کی ایک حقیقت ہے اور بندہ حقیقی اخلاص سے تب ہی رسائی پا سکتا ہے جبکہ وُہ اللہ تعالےٰ کی خاطر کیے گئے اعمال میں سے کسی عمل پر یہ پسند نہ کرے کہ اس کی تعریف کی جائے۔"

حضرت عیسٰی بن مریم علیہ السلام کو آپ کے حواریوں نے کہا:

"اے رُوح اللہ، اللہ عزوجل کی خاطر اخلاص کیا ہے؟"

فرمایا: "جو اللہ تعالیٰ کی خاطر عمل کرتا ہے اور یہ پسند نہیں فرماتا کہ لوگوں میں سے کوئی اس پر اس کی تعریف کرے۔"

اُنہوں نے کہا:

"اللہ عزوجل کی خاطر ناصح کون ہے؟"

فرمایا: "جو لوگوں کے حقوق سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حقوق سے آغاز کرے اور جب اس کے سامنے دو معاملے آئیں۔ ایک دُنیا کا معاملہ اور دُوسرا آخرت کا معاملہ تو دنیا کے معاملہ سے پہلے اخروی معاملہ کا آغاز کر دے۔"

چنانچہ لوگوں سے تعریف سننے کی پسندیدگی دراصل اصل ہے اور یہ اس کی شاخ ہے اور وہ یہ چاہے کہ اس کا مقام معلوم ہو جائے۔ شہرت کا طلبگار ہو اور لوگوں کی طرف سے عزت وعظمت کا خواہشمند ہو تو اس نیت کے ساتھ اس کا جنگلات میں چھپ رہنا کچھ نفع بخش نہ ہوگا اور اس کا عمل بھی مقبول نہ ہوگا۔

جیسے کہ منقول ہے بنی اسرائیل کے ایک عابد نے ایک غار میں چالیس برس تک اللہ کی عبادت کی۔ فرشتے اس کے اعمال لے کر آسمانوں پر جاتے اور وُہ قبول نہ کیے جاتے۔ فرشتوں نے عرض کیا:

"اے ہمارے پروردگار، تیری عزت کی قسم، ہم نے تیری طرف صحیح (اعمال) اٹھائے ہیں۔"

اللہ عزوجل نے فرمایا:

"اے میرے فرشتو! تم نے سچ کہا۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ اس کا مقام معلوم ہو جائے (شہرت کا طلبگار ہے)"
یہی وجہ ہے کہ بعض سلفؒ نے فرمایا:

"جو آدمی تکبر اور ریا اور حبِ شہرت سے بچ گیا وہ سلامت رہا۔"

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں:

"نیت سے زیادہ مجھے کسی کام میں مشقت نہیں اٹھانی پڑی۔ اس لیے کہ کمزور اور مدھم پڑ جاتی ہے اور تجھے مدارات سے کام لینا پڑتا ہے"۔ جیسے کہ منصورؒ نے فرمایا:

"عمل پر مداومت رکھنا، حتیٰ کہ خلوص ہو جائے۔ یہ عمل سے بھی شدید تر کام ہے۔"

حضرت ثوریؒ نے فرمایا:

"میں اپنے ظاہر ہونے والے عمل کی طرف التفات نہیں کرتا۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا:

"عمل سے زیادہ عمل قبول ہونے کا خوب اہتمام دکھاؤ۔ اس لیے کہ تقویٰ کے ساتھ ساتھ عمل کم نہیں ہوا کرتا اور جو عمل قبول کر لیا جائے وہ کم کیسے ہو سکتا ہے؟"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

"جو تنہائی سے وحشت پائے اور جماعت کے ساتھ مانوس ہو وہ ریا سے نہیں بچتا۔"

عبدالعزیز بن ابی رواد کا فرمان ہے،

"میں نے اسلاف (صحابہ) کو دیکھا کہ وہ عملِ صالح میں خوب محنت کرتے۔ اور جب نیک عمل کر لیتے تو ان پر غم سوار ہو جاتا کہ کیا یہ قبول ہوا ہے یا نہیں۔"

مالک بن دینارؒ نے فرمایا:

"عمل پر یہ ڈر کہ قبول نہ ہو، یہ عمل سے بھی شدید تر ہے۔"

حضرت عجلان کا فرمان ہے،

"ایک عمل صرف تین کے ذریعہ ہی صحیح ہوتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر تقویٰ اختیار کرے۔

۲۔ نیت اچھی ہو۔

۳۔ کام درست طریق پر کرے۔ (اسلامی ہدایات و قواعد کے مطابق کام کرے)

فرمانِ الٰہی ہے :

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ اَعْمَالاً ـ

اس کی تفسیر میں فرمایا :

"خالص ترین اور صائب ترین عمل ہو"

پُوچھا گیا ، "وہ کیا ہیں ؟"

فرمایا ، "جب عمل خالص ہو اور صائب نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا"

تباحیؒ فرماتے ہیں ،

"عمل دراصل چار خصال کا نام ہے ۔ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ؛

۱ ۔ اللہ عزوجل کی معرفت ۔

۲ ۔ حق کی معرفت ۔

۳ ۔ اخلاصِ عمل ۔

۴ ۔ سنت طریقہ پر عمل کرنا "

چنانچہ ان چار سے پہلے جو عمل ہوگا وُہ قبول نہ ہوگا ۔

بعض لوگ ادائیگی فرض کے وقت ندامت اور گناہوں کے ڈر کی بہت شدت محسوس کرتے ہیں ۔ یہ احسن تر حال کے لوگ ہیں ۔

بعض لوگ ادائیگی فرض کے وقت گناہوں پر بہت کم نادم ہوتے ہیں ۔ ان پر غم کی بہت کمی ہوتی ہے ۔ یہ بدترین حال کے لوگ ہیں ۔

اور ایک ہی قیاس ان کا وجدان نہیں ہوتا ۔ اللہ جس کو چاہے اس کا بڑا گناہ بھی بخش دے اور چاہے تو چھوٹے گناہ پر سزا دے ۔ اس لیے کہ اس کے علم میں یہ دونوں ازل سے ہیں اور ان دونوں پر اس کی مشیت و حکم نافذ ہے۔ گاہے دو آدمی ایک گناہ میں شریک ہوتے ہیں مگر حکم مشیت کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہوتا ہے ۔ جس پر چاہے رحمت کے ساتھ لوٹ آئے ، جس کا چاہے عمل قبول کرے اور قبول کرنا ، عمل کے علاوہ ہے ۔ بندے پر عمل لازم ہے اور قبول کرنا مولائے کریم کی مرضی ہے ۔ جس کو چاہے قبول کرے اور جس کا عمل چاہے رد کر دے اور سابقت (ازلیت) معصیت کا غیر ہے ۔ مشیت میں سابقت ہے جس کے لیے کلمۂ حسنیٰ ازل میں ہُوا اس کی تمام نافرمانیاں بخش دے اور جس پر کلمۂ عذاب نازل ہُوا اسے سزا دے اور اس کی تمام نیکیوں کے اعمال مٹا دے ۔ اور مخلوق ، قولِ سابق کی طرف جانے والی ہے اور ان کے بارے میں علمِ الٰہی کے مطابق حکم لگ چکا ہے ۔

ایک روایت میں ہے :

"اصرار کرنے والے برباد ہوئے۔ وہ آگ کی طرف لے جائے گئے" اور اصرار کا مطلب یہ ہے کہ قلبی طور پر یہ عزم ہو کہ جب بھی قوت ملی، گناہ کروں گا یا نادم ہونے اور اس سے توبہ کرنے کا عزم دوبارہ نہ کرے، اور سب سے بڑا اصرار یہ ہے کہ "گناہوں کی تلاش میں تیزی دکھائے"

ایک روایت میں ہے :

"اللہ کے ذکر میں لگ کر تنہا ہوئے اور اس پر فریفتہ ہیں۔ ذکر نے ان کے گناہ اتار دیئے۔ اب قیامت کو وہ ہلکے پھلکے ہو کر آئیں گے۔ یہی لوگ مقربین سے ہیں جن کے بارے میں ہم سے کلمہ حسنیٰ کہا گیا گویا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ ان پر گناہوں کے بوجھ تھے جو کہ ذکر اللہ نے اتار دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ [1]

(اور سبقت کرنے والے، سابقین وہی ہیں مقربین)

یہ دلائل علوم اور تاویل کتاب سے ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کا عفو اور ارادہ اس سب کے پرے اور علاوہ ہے اور اس کا علم قدیم ہے۔

وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

(اور اللہ کے اختیار میں ہر کام کا انجام)

محاسبۂ کفار کا مسئلہ

کافروں سے کیا سوال ہوگا؟

کفار کے محاسبہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کا فرمان ہے کہ ان کا محاسبہ ہوگا اور بعض نے محاسبہ سے انکار کیا ہے۔

اس مسئلہ میں روایات مختلف ہیں۔ بعض میں ان کے محاسبہ پر دلالت ہوتی ہے اور جو اس کا قائل ہے اس نے یہیں سے یہ کہا اور بہت ہی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر محاسبہ نہ ہوگا اور جس نے اس کا انکار کیا ہے اس نے ان روایات سے استدلال کیا ہے۔ اختلاف کے موقع پر کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس میں شفاء اور اس کے ساتھ غنا ہے۔ ہم قائلین کی وضاحت کریں گے اور تاویل کرنے والوں جو سختی کی اس میں اعتدال کے ساتھ بحث کریں گے۔

ہم اس پر بحث کرتے ہیں، واللہ اعلم۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دو آیات نازل فرمائیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کافروں سے پرسش ہوگی کہ انہوں نے توحید میں شرک کیوں کیا ؟ اور انبیاء و رسل علیہم السلام

---

[1] الواقعہ ۱۰ - ۱۱

کی دعوت قبول کرنے کی بجائے تکذیب کیوں کی؟ فرمایا:

وَ یَوْمَ یُنَادِیْہِمْ فَیَقُوْلُ اَیْنَ شُرَکَآءِیَ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ [۱] (اور جس دن ان کو پکارے گا تو کہے گا: کہاں ہیں میرے شریک جن کا تم دعویٰ کرتے تھے)

اور دُوسری آیت میں فرمایا:

وَ یَوْمَ یُنَادِیْہِمْ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِیْنَ [۲] (اور جس دن ان کو پکارے گا تو کہے گا: کیا جواب دیا تم نے رسولوں کو)

ہمارے نزدیک کہ ان سے ان آیات کی روشنی میں صرف توحید اور مرسلین علیہم السلام کی تکذیب کے بارے میں پرسش ہوگی اور دو دوسری آیات میں فرمایا:

وَ لَا یُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِہِمُ الْمُجْرِمُوْنَ [۳] (اور پوچھے نہ جائیں گناہوں سے ان کے کام)

ایک جگہ فرمایا:

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِہٖٓ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۔ (پھر اس دن پوچھ نہیں اس کے گناہ کی کسی آدمی سے نہ جن سے)

پھر فرمایا:

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰہُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ۔ (پہچانے جائیں گے گناہگار اپنے چہرے سے، پکڑا جائے گا ماتھے کے بال سے اور پاؤں سے)

یہ آیات کافروں کو گناہوں اور اعمال پر پرسش نہ ہونے پر نص ہیں۔

ہمارے نزدیک ان دو آیات کے ذریعہ ان سے اعمال کے بارے میں پرسش نہ ہوگی البتہ جو اس کے اور اللہ کے درمیان معاملۂ عمل ہے اس پر محاسبہ ہوگا اور جس کی نیکیاں قائم رہیں اس کا وزن بڑھ جائے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس فرمان

وَقِفُوْہُمْ اِنَّہُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۔ (اور کھڑا رکھو ان کو ان سے پوچھنا ہے)

میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی پرسش مراد ہے۔ یہ مفہوم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع طور بھی مروی ہے۔

---

[۱] القصص ۶۲
[۲] القصص ۶۵
[۳] القصص ۷۸
[۴] الرحمٰن ۳۹
[۵] الرحمٰن ۴۱

اب مطلب یہی ہُوا جیسے کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ان سے توحید کے بارے میں پرسش ہوگی

لوگوں کے چھ طبقات

قیامت کے روز جنتی اور دوزخی لوگ چھ طبقات میں منقسم ہوں گے۔
ایک گروہ وہ ہے کہ جو بغیر حساب کے جنت میں جائے گا۔ یہ سابقین مقربین کا گروہ ہے۔

ایک گروہ معمولی سے حساب کے بعد جنت میں جائے گا۔ یہ خواص اہل ایمان وصالحین ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو طویل اور پُر مشقت حساب کے بعد جنت میں جائے گا۔ یہ اصحاب یمین اور عام اہل ایمان ہیں۔ اسی طرح دوزخیوں کے تین طبقات ہیں؛

ایک گروہ بغیر حساب کے اور بغیر پرسش کے دوزخ میں جائے گا۔ یہ یافث بن نوح کی اولاد میں سے وہ بت پرست عالم ہیں۔ یعنی یاجوج اور ماجوج۔ یہ آگ کے لیے پیدا ہوئے۔

ایک گروہ طویل اور پُرمشقت حساب کے بعد دوزخ میں جائے گا۔ یہ کبائر کا ارتکاب کرنے والے اور منافقین ہیں۔

ایک گروہ اعمال پر محاسبہ ہوئے بغیر، پرسش اور توقف کے بعد دوزخ میں جائے گا۔

یہ انبیاء کی اُمتیں ہیں جن کی طرف انہیں مبعوث کیا گیا۔ فرمایا:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ[1] (سو ہم کو پُوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول بھیجے تھے)

ایک خبرِ مشہور میں ہے؛

"جس پر حساب کی مناقشت ہوئی اسے عذاب ملا۔"

عرض کیا گیا: کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا[2] (تو اس سے حساب لینا ہے آسان حساب)

فرمایا: "یہ پیش کرنا ہے اور جس سے حساب کی مناقشت ہُوئی اسے عذاب ملا۔"

امام سہل بن عبداللہ فرمایا کرتے تھے؛

"کافروں سے توحید کے متعلق پرسش ہوگی اور سنت کے بارے میں پرسش نہ ہوگی اور بدعتیوں سے سنت کے بارے میں پرسش ہوگی اور مسلمانوں سے اعمال کے بارے میں پرسش ہوگی۔"

---

[1] اعراف ۶

[2] انشقاق ۸، ۹

محاسبہ کفار کی وضاحت

فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ [1]

(بیشک ہم پاس ہے ان کو آنا اور پھر بے شک ہمارے ذمہ ہے ان کا حساب لینا)

اس میں دو توجیہیں ہیں:

۱۔ یہ پہلے سے منفصل کلام ہے اور اس سے مراد مسلمان ہیں۔ اس لیے کہ یہ کفار کی خبر کا ذکر ہے جسے عذاب پر ختم کیا۔ چنانچہ آغازِ کلام میں فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ۔ (مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہوا تو اللہ کو اس کو عذاب کرے گا بڑا عذاب)

یہ ان کی خبر کا آخری حصہ ہے۔ پھر دوسروں کے بارے میں کلام شروع کیا۔ فرمایا:

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ۔ (بے شک ہم پاس ہے ان کو آنا اور پھر بے شک ہمارے ذمہ ہے ان کا حساب لینا)

دوسری توجیہ یہ ہے کہ فرمانِ الٰہی ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ یعنی ان کی جزاء۔ چنانچہ کافروں کے بارے میں جہاں جہاں بھی حساب کا ذکر آیا۔ مراد یہ ہے کہ ان کی بداعمالی پر انہیں بدلہ اور سزا ملے گی۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ۔ (اور اللہ کو پایا اپنے پاس، پھر اس کو پورا پہنچا دیا اس کا لکھا)

یعنی ان کی جزا پوری کر دی۔ البتہ قتادہ اور اہلِ زبان اس معاملہ میں ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ انہوں نے بعد والے الفاظ کا اعتبار کیا اور اسے محاسبہ پر دلیل قرار دیا۔ ان کا یہ کہنا ہے:

فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ سے یہ بھی مراد ہے کہ جزاء مراد ہو جیسے کہ ہم نے کہا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد محاسبہ ہو۔ جب فرمایا:

وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ (اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے)

تو اس طرح قرآن مجید نے وضاحت کر دی کہ حِسَابَهٗ سے مراد اس کا محاسبہ ہے۔ وَ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ کی ابتداء میں ذکر کردہ آیت کی تاویل میں زجاج کا یہی قول ہے۔ کہا:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے پرسش نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس سے فارغ ہو چکا اور اسے پختہ کر دیا اور علمِ سابق میں ان کا معاملہ طے کر دیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس سے فارغ ہو چکا۔ اور سابق علم کی وجہ سے اس کا

---

[1] الغاشیہ ۲۵، ۲۶

فیصلہ فرما چکا۔ مقاتل بن سلیمان بھی اختلاف معنی بالمعنی کے ذریعہ اس تاویل میں موافقت کرتے ہیں۔ تفسیر کرتے ہیں اس لیے کہ لغت میں انہیں کچھ تمکنت حاصل نہ تھی۔ کہا:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مجرمین سے پہلے مجرموں کے بارے میں کچھ پرسش نہ تھی"۔ چنانچہ ھم سے قارون اور اس کے ساتھی اور سابقہ زمانوں کے مجرمین مراد لیے۔ اس لیے کہ ان کا ذکر اس خطاب کا سیاق ہے۔ فرمایا:

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا۔ (کیا نہ جانا کہ اللہ ہلاک کر چکا ہے اس سے پہلے کتنی صدیاں (یعنی لوگ) جو اس سے زیادہ قوت اور زیادہ مال جمع رکھتے تھے)

پھر فرمایا:

وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمْ۔ (اور پوچھے نہ جائیں گنا ہگاروں سے ان کے گناہ)

یعنی یہ مُجْرِمُوْنَ (مجرم لوگ) مراد ہے اس امت کے مشرکین۔

ایک قول ان اور دوسروں کا یہ بھی ہے کہ کافروں نے پوچھا اور کہا:

"پہلے زمانہ کے جن کافروں کے واقعات سنائے جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ راوی بتاتے ہیں کہ اس پر یہ آیت نازل ہوئی گویا یہ بمنزلہ قولِ فرعون کے ہُوا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى۔ (کہا پھر کیا حقیقت ہے پہلی صدیوں کی)

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ۔ (اس کا علم میرے رب کے پاس ہے) اللہ تعالیٰ نے حساب کو جزاء کے معنی میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

عَطَآءً حِسَابًا۔ (تیرے رب کا) (دیا حساب سے) یعنی جزاء کے طور پر۔

ایک قول ہے:

کفاهم و احسبهم ذلك۔ یعنی انہیں یہ کافی ہے۔

جیسے کہ فرمایا:

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ۔ یعنی انہیں دوزخ کافی ہے۔

تھا اور مجھے خطرہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں داخل سمجھا جائے جن کے بارے میں فرمایا:

اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔[1] (جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیچھے لگا ہے اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہے حد سے بڑھنا ہے)

یعنی اس کا سارا کام غفلت و سہو ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا سارا کام تفریط و تضییع ہے، اور ایک قول میں اس کا معاملہ ہلاکت کی طرف ہے۔ چنانچہ نیت ہی عملِ صالح کا آغاز اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلی عطا ہے اور یہی جائے جزا ہے۔

اور جیسی اللہ تعالیٰ کسی کو نیت عطا فرماتا ہے اسی کے مطابق اسے جزا و اجر ملتا ہے اور یہی جائے جزا۔ بسا اوقات ایک عمل میں اس کی کئی نیتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ نیت سے بڑھ کر بندے کو جزا مل جاتی ہے جو اسے وہم تک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر نیت پر اسے نیکی ملتی ہے۔ پھر ہر نیکی دس گنا بڑھتی ہے۔ اس لیے کہ یہ اعمال ایک عمل میں جمع ہیں۔

نیت کا طریقہ

نیت کے دو معنی ہیں؛

۱۔ بھرپور بیداری کے ساتھ عمل کی طرف قلبی قصد کا درست اور صحیح ہونا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے ہی اجر لیتے ہوئے اس کی خاطر اخلاص رکھنا۔ اب جو عمل بھی اسی نیت کے طریق پر ہوگا وہ عمل صالح ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے قبول ہوگا۔ اس لیے کہ ایسا عمل کرنے والا شرک، جہالت اور خواہش سے بچ رہا ہے۔ اس کا عمل خزائن الٰہی میں بلند ہو کر محفوظ رہے گا اور اس کا اجر جمع رہے گا۔

حقیقتِ اخلاص

حقیقتِ اخلاص یہ ہے کہ دو باتوں سے بچا رہے؛

۱۔ ریاکاری سے۔

۲۔ خواہش سے۔ تاکہ وہ ایسا خالص ہو جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے دودھ کے خالص ہونے کا ذکر کیا۔ اب اس پر یہ کامل نعمت ہوگی۔ فرمایا؛

مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا۔

اور اگر گوبر اور خون میں سے ایک چیز بھی پائی گئی تو وہ خالص نہ ہوگا اور نعمت کامل نہ ہوگی اور نہ ہی ہماری طبائع ایسے دودھ کو قبول کرتی ہیں۔ اسی طرح رب تعالیٰ کے ساتھ ہمارا معاملہ ہوگا۔ اگر عبادت میں ریاء ہوئی یا کوئی نفسانی شہوت پائی گئی تو وہ عبادت خالص نہ رہے گی اور عبادت میں صدق و ادب مکمل نہ ہوگا، اور نہ ہی

---

[1] الکہف ۲۸

فصل ۳۸

نیّت کی تشریح اور حُسنِ نیّت کا بیان

نیّت پر آنے والی آفات

اخلاص

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ[1]

(اور ان کو حکم یہی ہُوا کہ عبادت کریں اللہ کی، خالص کر کے)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین کے اندر ایک مسلمان آدمی کا قلب کھوٹ نہیں کرتا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اخلاص عمل ہیں" الحدیث۔ اور فرمایا:

"اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے وُہ ہے جو اس نے نیت کی۔"

بطریق اہل بیت رضی اللہ عنہم ایک حدیث میں مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ عمل کے بغیر کسی قول کو قبول نہیں کرتا اور نہ ہی نیت کے بغیر کسی قول اور عمل کو قبول کرتا ہے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرض کی ادائیگی اور جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اس سے پرہیز کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے صدقِ نیت افضل ترین اعمال ہیں۔"

اس لیے انسان کو چاہیے کہ ہر چیز میں ایک نیت (حسنہ) رکھے۔ حتیٰ کہ کھانے پینے، لباس اور نکاح میں بھی اس کی نیت ہو۔ اس لیے کہ یہ تمام اس کے اعمال ہیں اور ان پر پرسش ہوگی۔ اب اگر یہ اعمال اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہُوئے تو اس کی نیکیوں کے پلڑے میں ہوں گے اور اگر یہ اعمال راہِ خواہش میں ہُوئے یا غیر اللہ کی راہ میں تھے تو اس کی برائیوں کے پلڑے میں ہوں گے۔ اس لیے کہ ہر بندے کو اس کی نیت کا اجر ملے گا اور اگر کسی بھی نیت کے بغیر اور کسی عزم و جزم کے بغیر غفلت کے طور پر ہو رہے ہیں تو اس کیلئے ان میں کچھ اجر و سزا نہیں اور آخرت میں یہ اعمال ناپید ہوں گے۔ نہ سزا اور نہ جزا۔ دنیا میں وُہ ایسا شمار ہوگا کہ ایک چوپایہ تھا جو عقل اور تکلیف کے بغیر زندہ رہا۔ بس حیوانوں پر جیسے کہ آگاہی وانفار سا ہوتا ہے اس طرح

---

[1] البینہ ۵

اللہ تعالیٰ ایسی عبادت کو قبول فرمائے گا۔ خوب سمجھ لو۔

حضرت سعید بن ابی بردہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کی طرف ارسال کردہ مکتوب سے روایت کیا:

"جس کی نیت خالص ہوئی، اس کے اور لوگوں کے درمیان جو بھی ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہوا اور جس نے لوگوں کی خاطر تصنع کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو معیوب (ذلیل) کرے گا۔ اب تیرا کیا خیال ہے"

حضرت سالم بن عبداللہ نے عمر بن عبدالعزیز کی طرف لکھا:

"اے عمر! یاد رکھو، اللہ تعالیٰ بندے کی نیت کی مقدار پر اس کا مددگار ہے جس کی نیت کامل ہے اس کے لیے خاص کر کے اللہ تعالیٰ کی مدد بھی کامل ہوئی اور جس کی نیت ناقص ہے اللہ تعالیٰ کی مدد اسی قدر اس سے کم ہو گئی۔" اس کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا [1] (اگر یہ دونوں صلح چاہیں گے تو اللہ ان میں ملاپ دے گا)

چنانچہ ارادۂ اصلاح کو باعثِ توفیق قرار دیا۔ ایک صالح عامل کو موافق تعالیٰ کی جانب سے یہ پہلی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

بعض سلف کا فرمان ہے:

میں نے بھلائی کو دیکھا کہ حسنِ نیت اس کی جامع ہے اور اگرچہ یہ ظاہر نہ ہو پھر بھی تجھے کافی ہے۔ کئی چھوٹے عمل ایسے ہیں جن کو نیت بڑا بنا دیتی ہے اور کئی بڑے عمل ایسے ہیں کہ جن کو نیت ہی چھوٹا بنا دیتی ہے۔

ایک ادیب نے اپنے بھائی کو فرمایا:

"اعمال میں خالص تر یں نیت رکھو۔ اس لیے کہ خالص نیت کے ساتھ چھوٹا سا عمل بھی تجھے کافی ہے۔"

داؤد طائی نے فرمایا:

"اگر کسی کا سارا قصد و فکر پرہیزگاری ہو اور اس کے سارے اعضاء دنیا سے ملوث ہوں تو ایک روز اسے اس کی نیت اچھائی کی طرف لے آئے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور ایام اللہ سے جاہل آدمی جس کا سارا فکر دنیا اور خواہش ہو اس کے سارے اعضاء اگر اعمالِ صالحہ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ پھر وہ خواہش کی موافقت اور دنیا طلبی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا باطن دراصل نفسانیت پرستی کا ہے اور وہ عاجل دنیا کی

---

[1] النساء ۳۵

طرف دھیان دیے ہوئے ہے۔

محمد بن حسینؒ نے فرمایا،

"انسان کو چاہیے کہ اس کے عمل کے سامنے اس کی نیت رہے۔"

ایوب سختیانی وغیرہؒ نے فرمایا،

"عاملین پر تمام اعمال سے زیادہ مشقت کی بات خلوصِ نیت ہے۔"

حضرت ثوریؒ نے فرمایا،

"جیسے سلف علم سیکھتے تھے اسی طرح عمل کے لیے نیت سیکھتے تھے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے،

"عمل سے پہلے، عمل کی نیت چاہو اور جب تک تو بھلائی کی نیت رکھے ہے تو بھلائی پر ہے۔"

حضرت زید بن اسلم نے فرمایا،

"دو خصلتیں تیرے کمال کی باتیں ہیں،

۱۔ تو اس حالت میں صبح کرے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کا قصد نہ رکھتا ہو اور شام اس طرح کرے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔"

بعض سلفؒ نے اسی معنی میں فرمایا،

"اللہ تعالیٰ کے انعامات شمار سے باہر ہیں اور تمہارے گناہ تمہارے علم سے مخفی نہ رہیں۔ اب صبح بھی توبہ کرو اور شام کو بھی توبہ کرو۔ اس کے درمیان کی بخشش ہو جائے گی۔"

ایک سالک کے بارے میں منقول ہے۔ وہ علماء کے پاس جایا کرتے اور کہا کرتے،

کوئی عالم مجھے ایسا عمل بتا دے کہ میں ہر وقت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ہو جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر رات یا دن میں کوئی ایسی گھڑی نہ آئے کہ اس میں اللہ کی عبادت نہ کرتا ہوں (یعنی ہر وقت ہی عبادت میں داخل بن جاؤں)۔

ان سے کہا گیا،

"آپ نے مطلوب پا لیا۔ امکان بھر حد تک اعمالِ خیر کرتے رہیے۔ جب تھکاوٹ ہو جائے یا انقطاع آجائے تو عمل کی نیت کر لیجیے۔ اس لیے کہ اچھے کام کی نیت کرنا بھی عمل والے کی طرح ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے:

"خوشخبری ہو اس آنکھ کے لیے، جو نافرمانی کا ارادہ کیے ہوئے نہیں ہے اور گناہ کے بغیر حال پر

اس کا انجام ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور ابھی عمل نہیں کیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی گئی اور جس نے کسی برائی کا ارادہ کیا پھر اس پر عمل نہیں کیا (بلکہ برائی سے الگ ہو گیا) تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی گئی۔"

نیّت عمل سے بہتر ہے

اس میں دس وجوہ ہیں۔ ایک قول میں نیت باطن کی بات ہے اور ستری اعمال دو گنا ہو جاتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ غیب ہے۔ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس پر آگاہ نہیں اور ظواہر میں شرکت ہوتی ہے۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ بندے کو خالص کر کے یہ عطا فرماتا ہے اور جب عطا فرماتا ہے تو اس میں کچھ بھی ملاوٹ نہیں کرتا اور نہ اس پر آفات کا گزر ہوتا ہے۔ یہ عطا توفیق بخش ہوتی ہے اور تمام اعمال اس کے لیے ذخیرہ رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ شرطِ عمل ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل صحیح نہیں ہوتا۔ البتہ یہ خود مجرد بھی صحیح ہوتی ہے۔ عبدالرحیم بن یحییٰ الاسود نیۃ المرء خیر من عملہ (انسان کی نیت، اس کے عمل سے بہتر ہے) کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ:

"عمل میں انسان کا اخلاص، عمل سے بہتر ہے۔"

فرمایا، "چنانچہ عمل کے بغیر اخلاص، غیر مخلص عمل سے بہتر ہے۔" اور ان کے نزدیک نیت ہی اخلاص ہے اور دوسروں کے نزدیک اخلاص کا مطلب ہے:

"ظاہر و باطن میں برابری دکھا کر حال کے اندر صداقت ہونا۔"

حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور صدق میں ایک لطیف فرق بتایا مگر اس کی وضاحت نہیں کی حالانکہ وہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

ایک شیخ نے ان سے نقل کیا۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں:

"ایک جماعت نے ایک آدمی کے خلاف گواہی دی وہ مخلصین سے تھے مگر پھر بھی اسے کچھ ضرر نہ پہنچا اور اگر وہ صادقین سے ہوتے تو اس آدمی کو ضرور سزا ملتی۔" مطلب یہ ہے کہ ان کا صدق کہ وہ جس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں اس جیسا عمل یا عمل نہیں کریں گے۔ یہ صدقِ حال ہے اور محققین کے نزدیک یہی بات نیت کی حقیقت و اخلاص ہے۔

منیۃ المومن خیر من عملہ کی توضیح میں ایک قول یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کی نیت دائمی اور متصل ہوتی ہے اور اعمال میں انقطاع آتا رہتا ہے اور نیت کی وجہ سے موحدین ابدی طور پر جنت میں رہیں گے اور نیت کی وجہ سے مشرکین ابدی طور پر دوزخ میں رہیں گے۔ اس لیے کہ موحدین کی نیت دائمی طور پر توحید پر قائم رہنے کی تھی اور مشرکوں نے زمانہ بھر شرک پر قائم رہنے کی نیت تھی۔ اب جزاء اور سزا بھی ویسے ہوئی۔

یہ تمام مفاہیم اس صورت پر ہیں کہ اس کا مطلب یہ کیا جائے کہ "نیت، عمل سے بہتر ہے۔" اور اس میں ایک دوسری توجیہ ہے اور اس تقدیم و تاخیر پر کلام ہوگا۔ یعنی منیۃ المومن ھی من عملہ خیر (مومن کی نیت ہی اس کے عمل سے بھلائی ہے)

گویا فرمایا،

ھی بعض اعمال الخیر۔ (یہ اس کے اعمالِ خیر کا بعض حصہ ہے)

یہ اس طرح ہوا جیسے فرمایا،

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ[1] (جو موقوف کرتے ہیں ہم کوئی آیت پہنچاتے ہیں اس سے بہتر)

مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے خیر و بھلائی لاتے ہیں۔ (نات منھا بخیر)

اور اسی طرح فرمایا،

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ كَاَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَا[2] (تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں گویا کہ تو اس کا متلاشی ہے)

مطلب یہ ہے کہ یسألونک عنھا کانّک حفی بھم۔ یعنی عنھا کا قول موخر کر دیا اور اس کا معنی مقدم ہے۔ یہ اس صورت و توضیح پر ہے کہ نیت کو ایک قلبی عمل قرار دیا جائے اور یہ انسان کے اعمال میں یہ ایک خیر کثیر کا عمل ہے۔ یہ تمام اقوال صحیح اور نیت میں موجود ہیں۔ چنانچہ نیت نے عمل کو افضل بنا دیا۔ اس لیے کہ یہ تمام مفاہیم اسی نیت کے صفات ہیں۔

ایک تابعیؒ فرماتے ہیں:

نیکوں کے قلوب نیکی کے ذریعہ جوش زن ہوتے ہیں اور بدکاروں کے قلوب بدی کے ذریعہ جوش مارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی نیتوں پر نظر کناں ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق انہیں ثبات عطا کرتا ہے۔ اب دیکھو،

---

[1] البقرہ ۱۰۶

[2] اعراف ۱۸۷

تمہاری نیت و ارادہ کیا ہے؟"

بعض کتب میں اللہ تعالیٰ کا فرمان آتا ہے۔ فرمایا،

"میں ہر دانا کا کلام قبول نہیں کرتا مگر میں اس کی نیت و خواہش کی طرف دیکھتا ہوں۔ جس کی نیت اور خواہش میرے لیے ہو۔ میں اس کی خاموشی کو بھی ذکر بنا دیتا ہوں۔ اس کی نظر کو عبرت بنا دیتا ہوں۔" اور یہ بات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی عموم خبر میں داخل ہے،

"اللہ تعالیٰ تمہارے اجسام کی طرف نہیں دیکھتا اور نہ ہی تمہارے مالوں کی طرف (دیکھتا ہے) بلکہ وہ تمہارے قلوب اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔"

نیت کے اثرات

حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا،

"کیا انسان پر نیت کی وجہ سے مواخذہ ہوتا ہے؟"

فرمایا: "ہاں، جب عزم ہو تو مواخذہ ہوتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے:

"ایک آدمی اچھے اعمال کرتا ہے اور فرشتے مہر زدہ صحیفوں میں اس کے اعمال لے کر اوپر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یہ صحیفہ پھینک دو، اس نے میری خاطر (عمل کی) نیت کی۔" پھر فرشتوں کو فرماتا ہے:

"اس کے لیے ایسے ایسے اعمال لکھو، اس کے لیے ایسے ایسے اعمال لکھو۔"

وہ عرض کرتے ہیں،

"اے ہمارے پروردگار! اس نے ان میں سے کچھ نہیں کیا۔"

وہ فرماتا ہے،

"اس نے اس کی نیت کی ہے۔"

حضرت ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے،

"لوگ چار ہیں۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم اور مال دیا اور وہ اپنے علم کے مطابق اپنے مال میں کام کر رہا ہے۔ چنانچہ ایک آدمی کہتا ہے، کاش! اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی ویسے ہی دے جیسے اس کو عطا کیا تو جیسے وہ عمل کر رہا ہے یہ بھی ضرور عمل کروں تو نیکی میں یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ مال عطا کرے اور علم عطا نہ کرے تو وہ جہالت کی وجہ سے اپنے مال میں بھٹک رہا ہے (یعنی غلط کاموں پر مال خرچ کر رہا ہے) تو ایک آدمی یہ کہے کہ کاش! اللہ تعالیٰ مجھے مال دے جیسے اس کو دیا تو میں بھی ویسے (برے) کام کروں جیسے وہ کام کر رہا ہے

تو یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔"

دیکھئے، کس طرح حسنِ نیت کے باعث اسے اس کے اچھے عمل میں شریک کر دیا اور دُوسرے کو بُری نیت کی وجہ سے دُوسرے کے بُرے اعمال میں حصّہ دار اور برابر بنا دیا۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک کی حدیث میں آتا ہے،

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں تشریف لے گئے تو فرمایا؛

"مدینہ میں کچھ اقوام ہیں۔ ہم نے جو وادی بھی طے کی، جو مقام بھی ہم نے طے کیا، جو کافروں کو غصہ دلاتا ہے جو بھی ہم نے خرچ اٹھایا، ہم نے جو مشقت بھی اٹھائی، جس فاقہ کا بھی سامنا کرنا پڑا وُہ ان سب میں شریک رہے۔ حالانکہ وُہ مدینہ میں ہیں۔"

(صحابہؓ نے) عرض کیا؛

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ کیسے ہے؛ اور وہ ہمارے ہمراہ بھی نہیں ہیں۔"

فرمایا؛ "انہیں عذر نے روک لیا، چنانچہ وُہ حسنِ نیت کی وجہ سے ہمارے حصّہ دار ہیں۔"

بعض سلف" کا فرمان ہے؛

"اعمال کی درستی اور خرابی، نیتوں کی درستی اور خرابی کے باعث ہے۔"

حضرت مطرفؒ فرمایا کرتے تھے؛

"قلبی درستگی کے ساتھ ہی عمل کی درستگی ہے اور نیت کی درستگی کے ساتھ قلب کی درستگی ہے اور جو صاف رہا اس کے لیے صفائی ہوئی اور جس نے اختلاط کیا اس پر اختلاط ہو گیا۔"

ایک حدیث میں ہے؛

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان اصُولِ دین میں سے ایک اصل ہے۔ فرمایا؛

"اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔ جس کی ہجرت، اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہے وہ ملے یا ایک عورت کی طرف، کہ اس سے نکاح کرے گا تو اس کی ہجرت، اسی کی طرف ہے جس کی طرف ہجرت کی۔" چنانچہ اس میں یہ بتایا کہ نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں۔ پھر ہر بندے کے لیے ایک نیت فرمائی۔ پھر دنیا اور بیویوں کے طلب گاروں کو ان کی نیتوں کی طرف بتایا۔ ان پر یہی حکم لگایا اور راہی کو اللہ کی جانب ان کا حصّہ قرار دیا جائے۔ چاہے انہیں اس کی توفیق دی یا نہیں دی۔ ان کی نیتوں کی خرابی کے باعث ان کی ہجرت باطل ہوئی۔ ان کی دنیا طلبی اور دنیا کی خواہش نے انہیں ثواب سے محروم کر دیا جو مخلصین کو ان کی حسنِ نیت اور آخرت طلبی کے باعث عطا ہوا۔ یہ بات طالبانِ دنیا

کے لیے آخرت میں حسرت اور دنیا میں بدنامی کا باعث ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے،

"جس نے کچھ چیز چاہتے ہوئے ہجرت کی (کہ فلاں شہر میں جا کر فلاں چیز حاصل کروں گا) تو اس کے لیے وہی ہے۔ چنانچہ ایک آدمی نے ہجرت کی اور ایک عورت سے آ کر نکاح کیا۔ اسے ام قیس (قیس کی ماں) کا مہاجر کہا جاتا تھا۔"

حضرت داؤدؒ فرماتے ہیں،

"یہ حدیث علم کا چوتھائی حصہ ہے۔"

اس کی وجہ یہ فرمائی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں صحیح سنن جمع ہیں اور یہ چار ہزار احادیث ہیں۔" پھر فرمایا،

"میں نے انہیں چار احادیث پر پیش کیا تو ہر حدیث ربع علم ہے۔"

فرمایا، "یہ حدیث پہلی ہے" اور یہ اس لیے فرمایا کہ یہ فرض الفروض ہے اس کے بغیر فرض مکمل نہیں ہوتا۔
حدیث میں آتا ہے کہ "ایک آدمی اللہ عزوجل کی راہ میں قتل ہو گیا۔ اسے گدھے کا مقتول کہا جاتا تھا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک آدمی سے اس وجہ سے جنگ کی کہ اس کا سامان اور اس کا گدھا لے گا۔ اس میں قتل ہو گیا اور نیت کی جانب ہی وہ منسوب ہو گیا۔

حضرت ابو عبادہؓ کی حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس نے جہاد کیا اور اس کی نیت صرف اونٹ باندھنے کی رسی تھی تو اس کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔"

فرمایا، "میں نے ایک آدمی سے تعاون چاہا وہ میرے ہمراہ جہاد میں شریک تھا۔ اس نے کہا، میرے لیے کچھ اجرت مقرر کر دو۔"

میں نے مقرر کر دی۔ بعد میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا،

"اس کے لیے دنیا و آخرت وہی کچھ ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا۔"

اسرائیلیات میں منقول ہے کہ ایک آدمی بھوک کی حالت میں ریت کے ایک ٹیلے کے پاس سے گزرا تو اس نے دل میں کہا، کاش، میرے پاس اس ریت کے برابر کھانا ہو تو میں اسے لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔

راوی بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور کے نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اس کو کہہ دو،

"میں نے تیرا صدقہ قبول کر لیا اور تیری حسنِ نیت کی قدر کی اور تجھے اس قدر ثواب عطا کر دیا کہ اگر اس قدر

کھانا ہوتا اور تو اس کا صدقہ کرنا۔"

بہت سی روایات میں ہے :

"جس نے ایک نیکی کا ارادہ کیا، پھر اس پر عمل نہ کر سکا تو بھی اس کے لیے ایک نیکی لکھی گئی۔"

اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے :

"جس کی نیت دنیا ہی کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے اس کا فقر و احتیاج کر دے گا اور اس میں کی مرغوب چیز اس سے جدا کر دے گا اور جس کی نیت آخرت کی ہوگی اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں غناء بھر دے گا اور اس کا کام مجتمع کر دے گا اور جس سے وہ بہت بے رغبت ہے اس کو جدا کر دے گا۔" (یعنی پریشانی اور فقر دور کر دے گا)

حضرت ام سلمہؓ کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کا ذکر کیا جو بیداء کے علاقہ کی زمین میں دھنس جائے گا تو میں نے عرض کیا :

"اے اللہ کے رسولؐ! ان میں مجبور کردہ اور اجرت پر بھی ہوں گے۔"

فرمایا" ان کا حشر ان کی نیتوں پر ہوگا۔"

حضرت عمرؓ کی حدیث میں بھی اسی طرح ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا :

"جہاد کرنے والے اپنی اپنی نیتوں کے مطابق جہاد کرتے ہیں۔"

حضرت فضالہؓ کی حدیث میں ہے :

"جو آدمی جس مرتبہ پر مرا اس پر اٹھے گا۔"

اسی طرح حدیث میں ہے :

"جب دو صفتیں باہم ملتی ہیں تو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ مخلوق کو ان کے درجات پر لکھا جاتا ہے کہ فلاں آدمی دنیا کی خاطر جنگ کرتا ہے۔ فلاں آدمی عصبیت کی وجہ سے لڑتا ہے۔ البتہ فلاں آدمی کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں قتل ہوا تو جس نے اس لیے جنگ کی کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو وہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے۔

حضرت جابرؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا :

"ہر آدمی اس پر اٹھایا جائے گا جس پر مرا۔"

حضرت احنف بن قیس کی حدیث میں حضرت ابی بکرۃؓ سے مروی ہے :

"جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ باہم لڑیں تو قاتل اور مقتول آگ میں ہیں۔"

عرض کیا گیا : "اے اللہ کے رسولؐ! یہ قاتل (تو آگ میں ہوا) اور مقتول کے (دوزخ میں جانے کی)

کیا وجہ ہے؟"

فرمایا "اس لیے کہ اس نے بھی اپنے ساتھی (مسلمان) کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا" ایک گروہ کے نزدیک اخلاص کا نام نیت ہے اور دوسروں کے نزدیک اس سے مراد صدق ہے۔

اور تمام کے نزدیک نیت دراصل صحتِ عقد اور حُسنِ قصد کا نام ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ ایک قلبی عمل ہے اور اعمال میں یہ مقدم ہے۔ ہر عمل کی ابتدا یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔ (اللہ کا ذکر کرو، بہت)

ایک تفسیر میں بتایا کہ اس سے مراد خالصاً ہے۔ چنانچہ خالص کو کثیراً فرمایا۔ یہ وُہ ہے کہ جس میں خالص اللہ تعالیٰ کی خاطر ہی نیت ہو اور منافقین کا ذکر قلت کے ساتھ کیا۔ فرمایا:

يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا۔[1] (دکھاتے ہیں لوگوں کو اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں)

یعنی غیر خالص ذکر کرتے ہیں اور سورۃ قل ھو اللہ احد کو سورۃ اخلاص اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں تنہا اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہے اور اس کے علاوہ کسی دُوسری چیز مثلاً جنّت و دوزخ، وعدہ و وعید اور امر و نہی وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح اسے سورۃ توحید بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں غیر کا ذکر نہیں۔ چنانچہ نیت بگڑنے پر قلب پر شیطانی تسلط کا آغاز ہوتا ہے۔ جب انسان کی نیت بگڑی تو شیطان کو بھی لالچ ہوا۔ اب وہ اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور ضعفِ نیت ہی استقامت سے پھر جانے کی ابتدا ہے اور جب نیت کمزور ہوئی تو نفس توانا ہُوا اور خواہش کو غلبہ حاصل ہُوا اور جب نیت قوی ہُوئی تو عزم صحیح ہُوا اور نفسانی صفات کمزور ہو گئیں۔ اس لیے کہ انسان ایک نافرمانی سے دُوسری کم تر نافرمانیوں کی طرف منتقل ہوتا رہے گا۔ اب وُہ اللہ کی خاطر، ترک کی نیت کے ساتھ اولیٰ کو ترک کر رہا ہے جو اس کے لیے زیادہ نافع ہے اور انجام کے اعتبار سے زیادہ قابلِ مدح اور قلب کے لیے زیادہ مناسب اور توبہ کے زیادہ قریب تھی اور یہ اس کے لیے خواہش و فاسد نیت کے ساتھ اختلاط پذیر اطاعات سے بہتر تھی۔ اس لیے کہ نیت بگڑنے اور بُرائی میں ویسی ہی بُرائی ملانے کے باعث وُہ نافرمانیوں میں گر پڑتا ہے اور برائی کو برائی کے ذریعہ ہٹاتا ہے۔ یہ اس فرمانِ الٰہی کے برعکس کام بن گیا۔

خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا۔[2] (ملایا ایک کام نیک اور دُوسرا بُرا)

---

[1] النساء ۱۴۲

[2] توبہ ۱۰۲

اور فرمایا :

يَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ ۔ [1]

(بھلائی دیتے ہیں برائی کے جواب میں)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بھی برعکس ہے ۔ فرمایا :

"برائی ہو جانے کے بعد نیکی کرو ، وہ اسے مٹا دے گی"

حضرت ابُو ہریرۃؓ کی حدیث میں ہے ،

"جس نے کسی عورت سے صداق (مہر) پر نکاح کیا اور اس کا ادا کرنے کا ارادہ نہیں تو وہ زانی ہے اور جس نے قرض لیا اور ادا کرنے کا ارادہ نہیں وُہ چور ہے ۔"

حضرت ابنِ مسعودؓ کی حدیث میں ہے ، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شہداء کا ذکر ہُوا تو فرمایا :

"میری امت کے بیشتر شہداء اور دو صفوں کے درمیان کئی مقتول ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی نیت جانتا ہے ۔"

حضرت ثابت بنانیؒ نے فرمایا ،

"مومن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ باعثِ رسائی ہے ۔ مومن نیت کرتا ہے کہ وہ دن کو روزہ رکھے گا اور رات کو قیام کرے گا اور مال میں سے خیرات کرے گا مگر اس کا نفس اس معاملہ میں اس کا اتباع نہیں کرتا ۔ اس لیے نیت اس کے عمل سے زیادہ باعثِ رسائی ہے ۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی مثال بادشاہ سے دی اور اعضاء کو اس کے لشکر بنایا ۔ فرمایا :

"جب دل درست ہو تو سارا بدن درست ہو گیا اور جب (دل) بگڑ گیا تو سارا بدن بگڑ گیا ۔" مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کی نیت درست ہُوئی تو بندے کی استقامت کو دوام حاصل ہو اور جب نیت کدورت و خواہش سے پاک صاف ہو گئی تو اس کے اعمال ریا سے صاف ہو گئے اور شہوات و خواہشات سے پاک ہو گئے اور جب دنیاوی محبت سے نیت خراب ہُوئی تو اس کے اعضاء کے اعمال مدح اور ریا سے محبت کے باعث خراب ہو گئے ۔

نیت بدلنے کا انجام

اسرائیلیات میں ہے کہ ایک عابد نے عرصۂ دراز تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ۔ کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا ،

"یہاں پر ایک قوم ، اللہ تعالیٰ کے سوا ایک درخت کی عبادت کرتی ہے ۔"

اسے غصہ آیا اور کلہاڑا کاندھے پر رکھ کر درخت کاٹنے کے ارادہ سے چلا ۔ راستہ میں شیطان ایک بوڑھے

---

[1] القصص ۵۴

کی صُورت بن کر اسے ملا اور پُوچھا :

" اللہ تجھ پر رحم کرے کہاں جا رہے ہو؟"

فرمایا، " میں اس درخت کو کاٹنا چاہتا ہُوں، اللہ تعالیٰ کی بجائے لوگ جس کی عبادت کر رہے ہیں "

اس نے کہا،

" کہاں آپ اور کہاں وُہ درخت ؛ آپ نے عبادت چھوڑ دی اور اپنا کام بند کر کے دوسرے کے کام میں مصروف ہُوئے "

انہوں نے کہا،

" یہ بھی عبادت کا کام ہے "

شیطان نے کہا :

" میں آپ کو کاٹنے نہیں دوں گا "

راوی بتاتے ہیں : دونوں کی لڑائی ہوگئی۔ عابد نے اسے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا اور سینہ پر چڑھ گئے۔

ابلیس نے کہا،

" مجھے چھوڑ دو، میں ایک بات کرتا ہوں "

وُہ اٹھ گئے اور ابلیس کہنے لگا :

" ارے میاں اللہ تعالیٰ نے تیرے ذمہ یہ کام فرض نہیں کیا اور تجھ سے ساقط کر دیا ہے۔ کیا آپ نبی ہیں؟"

انہوں نے فرمایا، " نہیں "۔

اس نے کہا :

" تو آپ پر یہ فرض نہیں جو وہ غیراللہ کی عبادت میں لگے ہیں کہ انہیں روکیں اور آپ اپنی عبادت سے غافل ہو کر اور اسے چھوڑ کر ادھر کیوں آتے ہیں۔ اس زمین میں اللہ کے کئی انبیاء ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو انہیں ان لوگوں کی طرف بھیجتا اور انہیں اس درخت کے کاٹنے کا حکم دیتا "

عابد نے فرمایا،

" میں یہ درخت کاٹ کر رہوں گا "

ابلیس نے مقابلہ کی دعوت دی۔ اس بار پھر عابد نے اس پر غلبہ پایا اسے پچھاڑ کر اس کے سینہ پر چڑھ گئے

جب ابلیس نے دیکھا کہ ان کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں اور ان پر کچھ تسلط حاصل نہیں تو کہنے لگا :

" میاں، مجھ سے ایک بات پر فیصلہ کر لو گے جو آپ کے اور میرے درمیان ہوگی۔ جس میں آپ جا رہے ہیں۔

آپ کے لیے اس کام سے وہ زیادہ بہتر اور فائدہ مند ہے"۔

انہوں نے پوچھا:

"وہ کیا ہے؟"

کہنے لگا:

"ہٹو تو بتاؤں"۔

عابد نے اسے چھوڑ دیا ابلیس کہنے لگا:

"آپ ایک فقیر آدمی ہیں آپ کے پاس کچھ مال نہیں لوگوں پر آپ بوجھ ہیں۔ وہ آپ کی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔ شاید آپ یہ پسند کریں کہ اپنے بھائیوں پر احسان کریں۔ پڑوسیوں پر صدقہ کریں۔ اپنی حالت میں وسعت کریں اور لوگوں سے بے نیاز ہو جائیں"۔

انہوں نے کہا: "ہاں"۔

شیطان نے کہا:

"جس کام میں جا رہے ہو ادھر سے ہٹ کر واپس ہو جاؤ اور میرے ذمہ ہوا کہ آپ کے سرہانے روزانہ رات کو دو دینار رکھ دوں۔ جب صبح ہو گی تو آپ انہیں لے کر جو چاہیں کریں۔ اپنے آپ پر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں، اپنے بھائیوں پر صدقہ کریں۔ یہ بات اس درخت کے کاٹنے سے تیرے لیے اور مسلمانوں کے لیے بہتر ہے اس لیے کہ اس درخت کی جگہ دوسرا بھی بویا جا سکتا ہے اور اسے کاٹ دینا کچھ نقصان دہ نہیں اور نہ ہی اس کے کاٹنے سے تیرے اہل ایمان کو کچھ فائدہ ہو گا"۔

راوی بتاتے ہیں کہ عابد نے غور کیا اور جی میں کہا: اس بوڑھے نے صحیح کہا: میں نبی نہیں کہ اس درخت کا کاٹنا مجھ پر لازم ہو اور نہ ہی مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اسے کاٹوں، کہ ایسا نہ کرکے اس کی نافرمانی ہو جاتی ہو۔ یہ ایک فضیلت کی بات ہے اور اس کا باقی رہنا موحدین کے لیے مضر بھی نہیں اور جس بات (دو دینار) کا اس نے ذکر کیا ہے یہ عام لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ بخش چیز ہے۔ شیطان نے وعدہ کیا اور حلف اٹھایا۔ عابد واپس ہو گیا۔ رات گزری تو صبح کو اس کے سرہانے دو دینار تھے۔ انہیں لے لیا، دوسرے روز بھی ایسے ہی ہوا۔ تیسرے روز صبح ہوئی تو کچھ نہ پایا۔ غصہ آیا، کلہاڑا کاندھے پر رکھا اور درخت کاٹنے کی نیت سے چل پڑا، اور کہا:

"اگر دینار رہ گئے تو آخرت کی بات نہیں چھوڑوں گا"۔

بتاتے ہیں کہ شیطان اسے بوڑھے کی صورت میں ملا اور کہا:

"کہاں کا ارادہ ہے؟"

عابد نے کہا،

"وہ درخت کاٹوں گا۔"

اس نے کہا،

"تم نے جھوٹ کہا، اللہ کی قسم، تو اس پر قدرت نہیں رکھتا اور یہ بات تیرے بس میں نہیں۔"

عابد نے اسے پکڑا تاکہ جیسے پہلی بار اسے پچھاڑا تھا ایسے ہی پچھاڑ دے اور کہا آؤ" راوی بتاتے ہیں کہ ابلیس نے اس طرح دبوچا جیسے ایک چڑیا کو دبوچ لیتے ہیں اور اٹھا کر دے مارا۔ اب ابلیس اس کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:

"اس کام سے باز ہو گئے یا تجھے ذبح کر دوں؟"

عابد نے دیکھا کہ اس کے مقابلہ کی کچھ ہمت نہیں تو کہا:

"تو غالب آ گیا۔ اب مجھ سے ہٹ جا اور یہ بتا کہ پہلی بار میں تجھ پر کیوں غالب آ گیا تھا اور تجھے پچھاڑ دیا تھا اور اب تو غالب آ گیا اور مجھے پچھاڑ دیا۔ یہ کیا بات ہے؟"

ابلیس نے کہا،

"اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی بار تو اللہ تعالیٰ کی خاطر غضبناک ہوا تھا اور تیری نیت آخرت کی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے قابو میں دے دیا اور تو مجھ پر غالب آ گیا اور اس بار تو اپنے نفس کی خاطر غضبناک ہو کر آیا اور تیری نیت دنیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تجھ پر مسلط کر دیا اور میں نے تجھے پچھاڑ دیا۔"

ایک طویل واقعہ میں مروی ہے: کہ بنی اسرائیل کی ایک ملکہ نے ایک عابد کو نفسانیت کی راہ میں ورغلایا تو اس نے کہا:

"مجھے پانی دو، بیت الخلا میں طہارت کر لوں۔"

بتاتے ہیں کہ وہ محل پر اوپر چڑھے اور اپنے آپ کو زمین پر پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کے فرشتہ کو وحی فرمائی،

"میرے بندے کو تھام لو۔"

بتاتے ہیں کہ فرشتہ نے اسے تھام لیا اور آہستہ آہستہ زمین پر پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ ابلیس سے کسی نے کہا:

"تو نے اسے بہکایا نہیں تھا؟"

کہنے لگا، "جو آدمی اپنی خواہش کی مخالفت کرے اور اپنی جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دے۔ مجھے

اس پر کچھ تسلط حاصل نہیں۔

ہر کام پر پرسش ہو گی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے،

" قیامت کے روز انسان سے ہر چیز کے بارے میں سوال ہو گا۔ حتیٰ کہ آنکھوں میں سُرمہ ڈالنے کے بارے میں، انگلیوں کے ساتھ مٹی کے کریدنے کے بارے میں اور اپنے بھائی کا کپڑا چھونے کے بارے میں۔"

ایک منقطوع خبر میں ہے؛

"جس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر خوشبو لگائی۔ قیامت کو وُہ آئے گا اور اس کی خوشبو، مشک سے زیادہ تیز ہو گی اور جس نے غیر اللہ کے لیے خوشبو لگائی وُہ قیامت کو آئے گا اور اس کی بدبو، مردار سے زیادہ متعفن ہو گی" خوشبو لگانا کوئی سخت مامور بہ کام نہیں اور نہ کوئی ممنوع کام ہے۔ اب اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے اتباع اور اللہ کی نعمت کے اظہار کے باعث خوشبو لگائی تو یہ اطاعت ہے اور اسے اس کی نیّت پر ثواب ملے گا اور اگر اس کے علاوہ کسی غلط (غیر اللہ وغیرہ) کی خاطر لگائی تو اتباع ہوائی کی وجہ سے نافرمان شمار ہو گا۔

بعض سلف صالحین سے منقول ہے۔ فرمایا، کہ میں نے ایک مکتوب لکھا اور ارادہ کیا کہ پڑوسی کے مکان کی مٹی سے خشک کر لوں مگر مجھے کھٹکا سا ہُوا۔ آخر میں نے کہا؛

"مٹی ہی ہے، کیا ہے مٹی؟" اور میں نے مٹی لگا کر خشک کر لیا۔ ایک غیبی آواز آئی اور کہا؛

جس نے مٹی کو معمولی جانا، وہ عنقریب جان لے گا کہ اس پر کل آئندہ جو سوءِ حساب ڈالا جائے گا۔

ایک عالم کا فرمان ہے:

"میں چاہتا ہُوں کہ ہر چیز میں میری ایک اچھی نیت ہو۔ حتیٰ کہ کھانے، پینے اور سونے میں بھی نیت ہو۔"

منقول ہے کہ ایک آدمی نے حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ نمازِ عید ادا کی۔ وُہ ان کے ہمراہ صبح مُنہ اندھیرے ہی نکلتے تھے۔ جب سویرا ہُوا تو اس نے دیکھا کہ حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے اُلٹی دھوتی باندھ رکھی ہے۔ عرض کیا:

"اے ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ! آپ نے اُلٹا لباس پہن رکھا ہے اسے درست کر لیں۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ بڑھایا تاکہ دھوتی کو سیدھا کر دیں مگر واپس کھینچ لیا اور اسے درست نہیں کیا۔ اس آدمی نے پُوچھا:

"اسے سیدھا کرنے میں کیا رکاوٹ ہُوئی؟"

فرمایا: "میں نے اسے اللہ عزوجل کی خاطر پہنا تھا۔ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ غیر اللہ کی خاطر اسے

درست کروں"۔

ایک آدمی چھت پر بال بنا رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو آواز دی کہ میری کنگھی لانا"۔

عورت نے پوچھا:

"کیا آئینہ بھی لے آؤں؟" وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر کہا: "ہاں"۔

کسی سننے والے نے پوچھا:

"خاموش کیوں رہا اور آئینہ کے بارے میں توقف کیوں کیا؟"

اُنہوں نے فرمایا:

"میں نے ایک نیت کے ساتھ اپنی بیوی کو کنگھی لانے کے لیے کہا تھا۔ جب اس نے آئینہ لانے کا پوچھا تو اس وقت آئینہ کے سلسلہ میں میری کوئی نیت نہ تھی۔ میں نے توقف کیا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نیت عطا فرمائی اور پھر میں نے کہا:

"ہاں، وہ بھی لے آؤ"۔

حضرت بشرؒ کے اصحاب میں سے ایک صاحب بتاتے ہیں کہ حضرت فتح موصلیؒ ان کے پاس آئے تو حضرت بشرؒ ان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بتاتے ہیں کہ میں نے انہیں کبھی کسی کی خاطر اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اب میں بھی کھڑا ہو گیا۔ حضرت بشرؒ نے مجھے بٹھا دیا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اُن سے پوچھا:

"آپ ان کی خاطر کھڑے ہوئے اور جب میں کھڑا ہوا تو آپ نے مجھے بٹھا دیا؟"

فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کے لیے کھڑا ہوا اور تم میری خاطر اُٹھے۔ اس لیے میں نے تجھے بٹھا دیا"۔

بتاتے ہیں کہ ایک فقیر، حضرت ابو سعید خرازؒ کی مصاحبت میں رہتا تھا۔ وہ ان کی ضروریات میں لگا رہتا۔ فقراء کی خدمت کرتا۔ حضرت ابو سعید اور ان کے اصحاب کے حوائج میں کام آتا۔ ایک بار حضرت ابو سعیدؒ نے اخلاصِ حرکت کے بارے میں کلام کیا تو اس نوجوان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ سمجھا کہ ان کی خدمت سے الگ ہو جانا اور خاموش بیٹھ رہنا اخلاص ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت ابو سعید اور ان کے اصحاب کی خدمت بند کر دی اور انہیں تکلیف ہوئی۔ اُنہوں نے پوچھا:

"اے بیٹے! تو اپنے بھائیوں کی ضروریات کے کام میں آتا تھا۔ پھر الگ ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

عرض کیا:

"اے استاذ! آپ نے اخلاص کے بارے میں کلام فرمایا اور مجھے ڈر ہوا کہ میرے افعال میں ریاء کا دخل ہے

اس لیے انہیں چھوڑ دیا۔"

حضرت ابوسعیدؒ نے فرمایا:

"غفلت مت کرو۔ اخلاص ایسی چیز نہیں جو عبادت کو ختم کر دے اور نہ ہی ایک دانشمند کے لیے یہ مناسب ہے کہ اخلاص کی خاطر عمل کرنا چھوڑ بیٹھے ورنہ اخلاص و عمل دونوں ہی کھو بیٹھے گا اور میں نے یہ نہیں کہا کہ جو کر رہا ہے اسے چھوڑ دے بلکہ میں نے تجھے کہا تھا کہ اس میں اخلاص پیدا کر۔ تیری اخلاص طلبی نے تجھے نیکی کے کام سے ہٹا دیا اور ہمیں تکلیف پہنچی۔ جو کر رہا تھا پھر دوبارہ اس میں لگ جا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی خاطر اخلاص رکھ۔"

انسان کو چاہیے کہ تمام تصرفات، حرکت وسکون اور محنت و ترکِ محنت سب میں نیت خالص رکھے۔ اس لیے حرکت وسکون تو اعمال کے اصل ہیں۔ ان کے بارے میں پرسش ہو گی اور ان دونوں میں اخلاص اور نیت کی ضرورت ہے۔ ان سب کو صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر کر دے جس مرتبہ مقام پر ہے اس پر ایک نیت کے ساتھ کرے یا اس کی محبت کی خاطر اور اس کے اجلال و اکرام کی نیت رکھے یا اس سے خوف یا اس سے امید کی نیت کرے۔ یا اس وجہ سے کہ اس نے ایسا حکم دیا یعنی یہ مامور بہ کام ہے۔ چنانچہ فرائض کی ادائیگی یا مندوب کی ادائیگی کی نیت کرے اور یا بھلائی کے کام میں تیزی دکھانے اور اگر مباح کام میں مصروف ہو تو قلبی اصلاح، نفسانی سکون اور حلال میں داخل ہونے کی نیت کرے اور یہ تمام کام دین کی خاطر اور آخرت کی تیاری کے لیے کرے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے اور انعاماتِ الٰہی کا اعتراف کرتے ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرتے ہوئے کام کرے اور طبیعت کے ساتھ کام نہ دے اور نہ عادت پر چلتا رہے۔

حضرت ابوعبیدہ بن عقبہؒ نے فرمایا:

"جو اپنے عمل کی تکمیل کی مسرت چاہے اسے چاہیے کہ نیت اچھی رکھے۔" اس لیے کہ جب نیت اچھی ہو تو اللہ تعالیٰ اجر عطا کرتا ہے چاہے ایک لقمہ ہی کھائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیت کی خوب تفسیر فرمائی آپؐ سے پوچھا گیا:

"احسان کیا ہے؟"

تو فرمایا: "تو اللہ کی عبادت کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے۔"

یہ عارفین کی شہادت اور اہل یقین کی معرفت کی بات ہے۔ یہی لوگ مخلصوں کے مخلص ہیں۔

حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا:

"کئی چھوٹے عمل ایسے ہیں جن کو نیت ہی بڑا بنا دیتی ہے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"قلوب کے ساتھ اللہ کی طرف قصد کرنا، نماز روزے وغیرہ کے ذریعہ اعضائے ظاہری کی حرکات سے زیادہ رسائی کی بات ہے۔

حضرت انطاکیؒ فرماتے ہیں،

"جب معاملہ دل کی طرف ہُوا تو اعضائے ظاہری کو راحت مل گئی۔"

حضرت علیؓ سے مروی ہے:

"جس کا ظاہر اس کے باطن سے زیادہ وزنی ہو تو قیامت کو اس کا تول ہلکا ہوگا اور جس کا باطن اس کے ظاہر سے وزنی ہو اس کا تول بھاری ہُوا (نیکی کا پلڑا وزنی ہُوا)۔

حضرت داؤد طائیؒ نے فرمایا:

"میں نے دیکھا کہ ساری بھلائی کی جامع چیز حسنِ نیت ہے۔ اگر عمل نہ بھی ہو تو تیرے لیے یہ بھلائی کافی ہے۔"

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا۔ (اور ہم نے اس کا اجر دنیا میں دے دیا)

اس کی تفسیر میں حضرت حسن سے مروی ہے۔ فرمایا،

"صادق نیت کے ذریعہ اس نے آخرت میں اجر حاصل کیا۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن مزیک سے مروی ہے۔ فرمایا:

"جو آدمی بھلائی کی کسی چیز کی طرف کھڑا ہو اور اس کی مراد صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو۔ پھر اس کے سامنے ایسا آجائے کہ جس کو یہ دکھانا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اصل عطا کرے گا اور فرع (زاید) ختم کر دے گا اور جو آدمی کسی نیکی کی چیز کی طرف جائے اور مقصود دکھاوا ہو پھر سوچے اور اس کا آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کی نیت کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے فرع عطا کرے اور اصل میں ساقط کر دے گا۔" گویا یہ توبہ کے طریق پر ہُوا اور توبہ سابقہ گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

نافصاتِ اعمال گاہے نافصات اس قدر دقیق ہوتے ہیں اور ان کا علم بایں قدر مخفی ہوتا ہے کہ فضائل کے ساتھ ان کا التباس پڑ جاتا ہے مثلاً انسان نفلی نماز پڑھے اور اسے زیادہ واجب گمان کرنے لگے۔ ایک بار ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا۔ اس نے جواب نہ دیا۔ اس نے سمجھا کہ نبی طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام کرنا زیادہ افضل ہے۔ جب اس نے سلام پھیرا تو حاضر ہُوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب میں نے بلایا تھا تو تجھے جواب دینے میں کیا رکاوٹ ہُوئی؟"

عرض کیا: "میں نماز پڑھ رہا تھا۔"

فرمایا: تو نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنا:

اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ؕ[1] (مانو حکم اللہ کا اور رسول کا، جس وقت بلائے تمہیں ایک کام پر جس میں تمہاری زندگی ہے)

اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر جواب دینا افضل تر تھا۔ اس لیے کہ اس کی نماز نفلی تھی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا جواب دینا فرض۔

بعض کا فرمان ہے:

"جس کے نزدیک ادائیگیِ فرض سے زیادہ تلاشِ فضائل اہم ہو وہ فریب خوردہ ہے اور جو اپنے نفس سے غافل ہو کر دوسروں میں مشغول ہوا، وہ دھوکے میں ڈوب گیا۔"

حضرت سفیانؒ نے فرمایا:

"اصول ضائع کر کے وصول حاصل کرنے والا محروم ہے۔ بندے کے لیے افضل ترین چیز یہ ہے کہ اپنے نفس کو پہچانے، پھر اسے حد پر ٹھہرائے۔ پھر جس حال میں وہ ٹھہرا اسے پختہ کرے۔ پھر جس عمل کی توفیق ملے اسی کو ادا کرے اپنے علم و امکان کی حد تک ممنوعات سے پرہیز کے بعد سب سے پہلے فرائض ادا کرے۔ یہاں سے عمل کا آغاز کرے۔ جب تک فرض پر پختہ نہ ہو جائے تب تک نوافل کی طرف نہ بھاگے اس لیے کہ نفلی عبادات اصل زر (فرائض) کے موجود ہونے کے بعد ہی درست ہوتی ہیں اور یہ دراصل نفع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل زر ہو تو نفع ملتا ہے اور ہر نفل کو ختم کرنے والی ایک آفت ہوتی ہے جو اس سے بچ گیا اس نے نفل (نفع) لے لیا اور ہر نفیس چیز کی مشقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس نے اسے برداشت کیا اس نے نفیس چیز پالی اور جس پر سلامتی ہی مشکل بن گئی وہ نفل و نفع تک کہاں پہنچ سکے گا؟

جو آدمی مشقت اٹھانے میں صبر نہ دکھائے وہ اعلیٰ مقامات حاصل نہیں کر سکتا۔ گاہے تکلف اور اخلاص کے درمیان التباس ہو جاتا ہے اور گاہے اظہارِ علم اور علم کی مصنوعی زیبائش کے درمیان التباس ہو جاتا ہے حضرت ثوریؒ نے فرمایا:

"اپنے آپ کو علم کی زینت عطا کر اور زینتِ علمی کا تکلف نہ کر۔" یعنی اللہ عزوجل کی خاطر ادب سکھا کر اپنا اللہ میں زینت ہو گی اور لوگوں کے ہاں اس کی زیبائش و دکھاوا نہ کرتا پھر کہ وہ تیری تعریف کریں۔ گاہے اختیار اور

---

[1] انفال ۲۴

اختیار کے درمیان التباس ہوجاتا ہے۔ اعتبار یہ ہے کہ ضرورت کی وجہ سے ہو اور اس سے اللہ عزوجل کی طرف جانا مقصود ہو اور اختیار (پسند و رغبت) وہ ہے کہ جو شہوت سے ہو اور زاہد ہو اور مخلوق کی طرف جانے کا ذریعہ بن جائے جیسے کہ ستر چھپانے کے لیے لباس پہننے اور دنیاوی انعامات ظاہر کرنے اور فخر و غرور جتانے کے لئے لباس پہننا ان دونوں میں التباس ہو جاتا ہے۔

گاہے انسان ایک نفل کام کرتا ہے اور اس میں لگ کر فرض ضائع کر بیٹھتا ہے۔ حالانکہ فضیلت یہ ہے کہ سلامتی حاصل کرنے کے لیے فرائض کو پختہ رکھے۔

روایت ہے کہ "جب تمہیں کوئی کھانے کی دعوت دے اگر افطار کی حالت میں ہو تو قبول کر لو اور اگر روزہ دار ہو تو کہہ دو۔ میں روزے سے ہوں" یعنی اظہارِ عمل کا حکم دیا۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اخفائے عمل افضل چیز ہے۔ مگر اظہارِ عمل اس لیے افضل ہوا کہ اخفاء کرنے میں خطرہ تھا کہ اس کے مسلم بھائی کے دل میں کچھ وسوسہ یا خیال آجائے کہ دیکھو کیسا آدمی ہے قبول نہیں کر رہا اور عمل پر عاملین کو افضلیت حاصل ہے۔ اس لئے ان کا خاص خیال رکھا گیا کیونکہ عاملین پر ہی عمل موقوف ہیں گویا یہ فرمایا گیا کہ اپنا عمل ظاہر کر کے اپنے بھائی کے دل سے اثرات دور کر دے۔ یہ بات اخفائے عمل کرنے اور اپنے بھائی کے دل پر برے اثرات ڈالنے سے بہتر ہے اس لیے کہ ایک بھائی نے تیرے لیے کھانا تیار کیا اور تو نے اس کی دعوت قبول نہیں کی اور نہ ہی ایسا واضح عذر پیش کیا کہ وہ تجھے معذور سمجھ لے۔ اب اگر وہ دعوت میں سچا ہے تو اس پر تیرا انکار کرنا شاق گزرے گا۔

ابن شبرمہؒ فرماتے ہیں کہ کرز بن وبرہ نے اپنے رب تعالیٰ سے دعا کی کہ اسم اعظم عطا فرما دو اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ دنیا کی کوئی چیز نہیں مانگوں گا۔"

اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کی اور اسمِ اعظم عطا کیا۔ انہوں نے دعا کی کہ مجھے رات دن میں تین بار روزانہ قرآن مجید ختم کرنے کی استطاعت بخشیے۔

حضرت کرزؒ سے کسی نے عرض کیا:

"آپؒ نے اپنے آپ کو عبادت میں تھکا دیا۔"

فرمایا، "دنیا کی عمر کتنی ہے؟"

عرض کیا گیا: "سات ہزار سال"۔

فرمایا" کیا بندہ اس پر راضی نہیں ہوتا کہ وہ سات ہزار سال عمل کرے اور ایک دن ہی عذاب سے بچ جائے جس کی مقدار پچاس ہزار برس کے برابر ہے؟"

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا:

"خلوص کے ساتھ دو رکعتیں پڑھنا، تیرے لیے ستر احادیث لکھنے سے بہتر ہے" یا یہ فرمایا کہ "سات سو احادیث لکھنے سے بہتر ہے۔"

طعام میں ترتیب اور کمی بیشی

بھوک کی مقدار

خوراک کے بارے میں بعض سلف کا طریقہ یہ تھا کہ خوراک میں اس قدر کمی کرتے کہ قلیل ترین غذا پر اکتفا کرتے۔ جو آدمی اس راہ پر چلنا چاہے وہ ہر خوراک میں سات روٹیوں میں سے جو تہائی (⅓) کم کرتا جائے۔ حتیٰ کہ کھانے کے سلسلہ میں صرف تہائی پر اکتفا کرے اور تہائی حصّہ ہی کھانا، ایک معتاد کھانا بنالے۔ یہی سالکین کی راہ ہے۔

بعض علماء کا کہ وُہ خوراک کے وقفہ میں زیادتی کرتے ہیں اور اسے موخر کرتے جاتے ہیں۔ الغرض بدن میں بھوک سہنے کی جس قدر استطاعت ہو اس حد تک فاقہ طویل کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ڈر ہوتا ہے کہ بدن، فرائض سے بھی کمزور ہو جائے گا یا عقل جانے کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

جو آدمی اس راہ پر چلنا چاہے وُہ شب کے نصف سبع ½ حصّہ تک کھانا موخر کر دے۔ حتیٰ کہ نصف ماہ میں وُہ ایک شب بیدار رہنے والا بن جائے۔ یہ اس کا طریق ہے جو سات، دس اور پندرہ روز سے کر چالیس روز تک شب بیداری اور بہ ضرورت پیٹ دینے کا معاملہ کرنا چاہے۔ اس لیے کہ ایسا کر کے وُہ بھوک کے وقفہ کو طویل کر سکے گا اور کھانے میں کمی نہیں کرے گا بلکہ مقدارِ طعام (ایک وقت میں وہی ہوگی جس کی عادت ہے) ایسا کرنے سے اس کی عقل کو ضرر نہیں ہوگا اور نہ ادائیگی فرائض میں کمزوری آئے گی۔ بشرطیکہ وُہ صحیح نیت، بہتر عزم اور سچا عزم رکھتا ہو۔ اس لیے کہ ایسا کرنے میں اسے قوت و نصرت حاصل ہوگی۔ اور ہر بار کھانے کے موقع پر اسے کھانے میں بتکلف کمی کرنے کی حاجت نہ ہوگی بلکہ ضرورت میں کمی کے باعث کھانا خود بخود کم ہوتا جائے گا۔ اس لیے کہ مسلسل فاقہ سے اس کی انتڑیاں سکڑ کر مختصر رہ جائیں گی۔ اب جوں جوں فاقہ میں زیادتی ہوگی کھانے میں کمی ہوتی جائے گی۔ آخر بھوک و فاقہ پر ہی انتہا ہوگی اور معمولی مقدار کے کھانے پر اکتفا کر لے گا اور فاقہ کے فضائل جو احادیث میں آتے ہیں اس وقت حاصل ہوتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ قیامِ شب اور ذکر اللہ بھی کرتا رہے اور بہ ضرورت پیٹ کر رکھ دے۔

بعض لوگوں کا قول ہے:

"فاقہ کی حد یہ ہے کہ جہاں فاقہ شروع کیا اس سے لے کر پھر کل آئندہ اس وقت تک یعنی چوبیس گھنٹے تک فاقہ رکھے اور یہ کم از کم مقدارِ فاقہ ہے اور زیادہ سے زیادہ انتہائی مقدارِ فاقہ یہ ہے کہ بہتر گھنٹوں تک فاقہ کرے خوراک کے سلسلہ میں بعض کے نزدیک یہ حد ہے کہ تیرا نفس سالن کا مطالبہ نہ کرے اور اگر تیرا نفس روٹی کے

ساتھ ساتھ سالن کا بھی مطالبہ کرے تو تو بھوکا نہیں۔ یہ فاقہ کی کم از کم مقدار ہے۔

اور ایک قول کے مطابق فاقہ کی مقدار یہ ہے کہ تو روٹی مانگے اور تجھے یہ پتہ نہ چل سکے کہ یہ وہی ہے یا کوئی اور چیز ہے اور اگر تیرا نفس ایک مخصوص روٹی کا اشتیاق رکھے تو یہ بھوکا نہیں۔ اس لیے کہ اس میں ایک خاص روٹی کی خواہش موجود ہے اور جب وہ روٹی اور دوسری کھانے کی چیز کے درمیان تمیز نہ کر سکے تو یہ حد فاقہ ہے اور یہی کھانے کی صحیح حاجت ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اجسام کے لیے غذا بنایا اور تین سے لے کر پانچ اور سات کے بعد اوقات کی آخری حد میں یہ ہوتا ہے اور بندہ اس وقت اگر کھانا چاہے تو در اصل وہ بقدرِ ضرورت خوراک ہے جس سے بھوک مٹ جاتے اور ادائیگی فرائض میں مدد مل سکے اور یہ صدیقین کا حال ہے۔ اسی گروہ کے ایک بزرگؒ کو میں نے یہ فرماتے سُنا:

"بھوک اور فاقہ کی حد یہ ہے کہ جب تو تھوکے تو تیری تھوک پر مکھی نہ گرے۔ اب تیرا معدہ کھانے سے خالی ہو گیا" مراد یہ ہے کہ تھوک اب روغنیت اور چکناہٹ سے خالی ہو گیا اور پانی کی طرح کا صاف تھوک بن گیا۔ اب اس پر مکھی نہ گرے گی حالانکہ مکھی کا احساس و ادراک بہت ہی تیز ہے۔

عادات کے طور پر کھانا، شہوات میں کمی کا تکلف کرنا اور سیر ہو کر کھانا علماء کے نزدیک مکروہ ہے اور ایسے لوگ ان کے ہاں بمنزلہ چوپائے کے ہیں۔

اس قدر کھانا اور پیٹ بھرنا کہ بدہضمی ہو جائے۔ علماء کے نزدیک یہ فسق ہے۔ ایک عارفؒ نے مجھے بھی بتایا۔ مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا گیا،

"گزشتہ رات آپ کے بیٹے نے اس قدر کھایا کہ بدہضمی ہو گئی۔"

فرمایا: اگر وہ مر جاتا تو میں اس کا جنازہ نہ پڑھتا اور علماء کے نزدیک روزہ یہ نہیں کہ بھوک سے رہ رہ کر طبیعت ہی بجھ جائے اور احساسِ فاقہ ہی جاتا رہے۔ اس لیے کہ ایسا کریں تو روزہ ایک عادت بن جائے گی، اور جب روزہ دار روزہ کھولے گا تو اس میں طبعی قوت عود کر آئے گی بلکہ جب وہ ایسا روزہ رکھے گا تو یہ روزہ اس کی طبعی قوت، نفسانی ظہور اور شہوات کی آمد میں اضافہ کا باعث ہو گا۔ ایسا کرنے سے طاعات میں کاہلی پیدا ہو گی۔ تساہل اور برائیوں کی آمد ہو گی۔ بسا اوقات اچانک طبیعت میں قوت آتی ہے اور نفس غلبہ پا لیتا ہے۔ البتہ دن میں وہ اس معمول کی عادت پر رہے گا اس آدمی کا ظاہری حال اگرچہ آخرت کے اسباب کا سا ہے مگر اس نے کم علمی کی وجہ سے خواہش میں کمی کے تکلف اور بابِ دنیا کا حال بنا رکھا ہے کیونکہ اس کا مشاہد دنیا کا ہی ہے۔

چنانچہ افطار کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں بقدرِ کفایت کھانا دل کے لیے زیادہ مناسب ہے، اور

اس سے علمی دوام حاصل ہوتا ہے۔ اسی قسم کا روزہ آخرت میں زیادہ رسائی کا موجب ہے۔ اس لیے کہ پہلا مذکورہ روزہ جو اہلِ دنیا کا روزہ ہے۔ یہ اہلِ آخرت اور زاہد لوگوں کا روزہ نہیں ہے۔ البتہ کمی خوراک، قیامِ شب، شہوات چھوڑنے اور مشتبہات سے پرہیز کرنے کے ذریعہ نفس میں انکساری آتی ہے۔ طبیعت میں تواضع اور گمنامی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ضعفِ عادت کمزور ہوتی ہے۔ آخرت کی نیت میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ سالک آخرت کی خاطر ہی عمل کرتا ہے۔ قلب سے دنیا کی حلاوت نکل جاتی ہے۔ آخرکار بھوک، قیامِ شب اور ترکِ اسراف کے باعث انسان زاہد بن جاتا ہے۔

بھوک و پیاس کا انعام حضرت اسامہ بن زیدؓ اور ابو یزید طویلؒ کی حدیث میں آتا ہے جس کو میں نے اختصار سے لکھا ہے:

"قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سب لوگوں سے زیادہ قریب وُہ ہوگا جس کا فاقہ، پیاس اور غم دنیا میں طویل مدت تک رہا۔ برہنہ پا پرہیزگار جن کو دیکھیں تو پہچانیں نہیں، اگر غائب ہو جائیں تو لوگ تلاش نہ کریں۔ زمین کے قطعے انہیں پہچانتے ہیں۔ آسمان کے فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ لوگوں نے دنیا کی نعمتوں میں حصہ لیا اور وُہ طاعتِ الٰہی کو نعمت سمجھے۔ لوگوں نے بستر بچھا لیے اور انہوں نے پیشانیاں اور گھٹنے بچھا لیے۔ لوگوں نے انبیاء کے افعال و اخلاق کو کھو دیا۔ انہوں نے ان کی حفاظت کی۔ جب زمین انہیں کھوتی ہے تو روتی ہے۔ جس شہر میں ان میں سے کوئی نہ ہو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے جیسے کتے مردار پر پڑتے ہیں وہ اس طرح دنیا پر نہیں پڑے۔ ان کی خوراک قلیل ہے ان کا لباس پھٹا ہے۔ پر غبار آلود پریشان بال ہیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی مرض ہے۔ (لوگ کہتے ہیں کہ انہیں اختلاط ہُوا۔ ان کی عقلیں چلی گئیں لیکن اس قوم نے قلبی نظر کی تو دنیا ان کی نظروں سے گر گئی۔ اہلِ دُنیا کے نزدیک وُہ عقلوں کے بغیر ہی چلتے ہیں۔ لوگوں کی عقلیں جہاں رہ گئیں وہاں ان کی عقلوں کو رسائی ملی۔ انہیں آخرت میں جھلک و نظر حاصل ہے۔ اے اسامہؓ! جب تو ان کو کسی شہر میں دیکھے تو جان لے کہ یہ اس شہر کے امان کی علامت ہیں۔ جس قوم میں یہ ہیں اللہ تعالیٰ اسے عذاب نہیں دیتا۔ انہی کے باعث زمین پر رحم ہوتا ہے۔ جبار تعالیٰ ان سے راضی ہے۔ انہیں گہرا دوست بنا لے۔ شاید تو ان کے باعث نجات پا جائے۔ اگر ہو سکے کہ تجھے اس حالت میں موت آئے کہ تیرا پیٹ بھوکا ہو، تیرا جگر پیاسا ہو، تو کر۔ اس لیے کہ اس کی وجہ سے تو اعلیٰ منازل پالے گا۔ انبیاء علیہم السلام کے ہمراہ اترے گا۔ ملائکہ کے آنے پر تیری رُوح خوش ہوگی اور جبار تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے گا۔"

فاقہ کی مقدار علماء کرام میں بکثرت ایسے گزرے ہیں کہ جن کا بستر لپیٹ کر شب بیدار رہنا ہر ماہ میں پندرہ روز سے لے کر بیس روز تک رہا ہے مثلاً ابن عمر عوفیؒ، عبدالرحمٰن بن ابراہیم وحیمؒ، ابراہیم تیمیؒ، حجاج

ہیں ثقہ افقتہ ، حسن بن عابد مصیصی، مسلم بن سعد، زبیر بنائی، سلیمان خواص، سہل بن عبد اللہ اور ابراہیم خواص رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چھ دن بستر بوریا لپیٹ رکھتے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سات روز تک ایسا فرماتے اور حضرت ابو الجوزاء جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ہیں۔ وہ سات روز تک بستر لپیٹ رکھتے۔

مروی ہے کہ حضرت ثوری اور ابراہیم بن ادھم تین تین روز بستر لپیٹ رکھتے اور ہم نے نو دن اور پانچ دن بستر لپیٹنے والے بھی دیکھے اور تین تین روز ایسا کرنے والے تو کثرت سے دیکھے ہیں۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جو آدمی چالیس روز تک کھانے کا (دسترخوان) لپیٹ رکھے۔ اس کے سامنے قدرتِ ملکوت ظاہر ہوتی ہے۔"

فرمایا کرتے:

"حقیقی زہد جس میں ذرا بھر بھی ملاوٹ نہ ہو۔ یہ انسان کو صرف غیبی قدرتِ ملکوت کے مشاہدہ کے ذریعہ ہی حاصل ہوتا ہے۔"

بعض کا فرمان ہے:

"ایسی نظر سے قدرتِ غیبیہ کا مشاہدہ کہ جس کی وجہ سے اسے دوامِ مشاہدہ و اضطرار رہے۔ اسی کے ذریعہ ہی انسان کو پختہ یقین و استقامت، پختہ حال اور ملکوت میں علم نافذ حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے معرفت حاصل کرتا ہے۔ ان میں سے بعض خدا کی قیومیت کے ساتھ مخصوص ہیں، پھر عبدِ مراد کے لیے اس طریق میں سال میں چالیس اور چار ماہ کی گنجائش ہوگی۔ جیسے کہ ہم وقتاً فوقتاً تاخیر اوقات کی ترتیب دی اور ان اوقات میں ریاضتِ نفس کی ترتیب قائم کی، حتیٰ کہ راتیں، دنوں میں داخل ہو جائیں اور دن، راتوں میں داخل ہو جائیں اور چالیس، بمنزلہ ایک دن اور ایک رات کے ہو جائے۔ یہ بعض مقربین کا طریقہ ہے جس پر صرف انہیں قدرت حاصل ہے جن کو اس کی استطاعت حاصل ہوئی اور جن کو ایسا مکاشفہ حاصل ہے کہ اس کی وجہ سے اپنے نفس سے غافل ہیں۔ اس نے ان کی طبیعت و عادت کو ختم کر دیا ہے، بھوک کو فراموش کر دیا ہے۔ انہیں حقیقت اور رجوع کا مکاشفہ حاصل ہے۔ ہم بعض ایسے بزرگوں سے آگاہ ہیں جنہوں نے یہ کام کیا اور ان کے سامنے ملکوتی آیات کا اظہار شروع ہوا۔ قدرت جبروت کے معانی کھلے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جیسے چاہا ان کے لیے تجلی فرما کر انہیں اعزاز بخشا۔"

اس گروہ میں سے ایک بزرگ ایک راہب کے پاس رکے اور اس کے حال کو دیکھا اور گفتگو فرما کر چاہا کہ

وہ اسلام قبول کرلے۔ اور جس فریب میں مبتلا ہے اس سے نکل آئے۔ انہوں نے اس کے ساتھ خوب افہام و تفہیم سے کام لیا۔ آخر کار راہب نے کہا،

"حضرت مسیح علیہ السلام چالیس چالیس دن کھانے پینے کا دستر خوان لپیٹ رکھتے تھے اور میں اس معجزے کا قائل ہوں اور یہ معجزہ صرف نبی کو حاصل ہو سکتا ہے۔"

صوفی صاحب نے فرمایا:

اگر میں پچاس روز تک فاقہ کروں تو کیا حال ہو، اسے چھوڑ دو گے اور دینِ اسلام میں آجاؤ گے اور یہ سمجھ لوگے کہ جس دین پر ہم ہیں یہ حق ہے اور جس پر تم ہو یہ باطل ہے؟

اس نے کہا: "ہاں"۔ چنانچہ انہوں نے اس کے پاس قیام کیا۔ کہیں اِدھر اُدھر جاتے تو ایسے طریقہ سے کہ راہب انہیں دیکھتا رہے۔ آخر کار پچاس روز تک فاقے گئے، پھر فرمایا،

"زیادہ کرتا ہوں" اس طرح ساٹھ ایام تک فاقہ کیا۔ راہب کو بڑا تعجب ہوا۔ ان کی فضیلت اور دینِ اسلام کی فضیلت کو مان گیا اور کہا،

مجھے گمان نہ تھا کہ کوئی آدمی مسیح علیہ السلام سے بھی درجہ میں بڑھ سکتا ہے (یہ مطلب نہیں کہ غیر نبی بڑھ گیا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے اور یہ فاقہ کی قوت اس امت کو عجیب طریقہ پر حاصل ہے، البتہ یہ امت علم و فضل میں انبیاء علیہم السلام سے مشابہ ہے چنانچہ اسی کو دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

حضرت ابراہیم تیمیؒ، حجاج بن قرافصہؒ بھی چالیس روز دستر خوانِ طعام لپیٹ لیتے تھے اور تیس یا بیس روز تک فاقہ کرنے والے بکثرت ہیں مثلاً حضرت سہل بن عبداللہ اور اہلِ بصرہ کی ایک جماعت ایسا کرتی تھی۔

شام اور الجزائر والوں میں سے بہت سے بزرگ مہینہ میں دو بار، تین بار اور چار بار کھانا کھانے والے گزرے ہیں۔ سالک کے لیے بہتر ہے کہ افطار کے دو حصے کرے۔ شروع رات میں افطار کے وقت ایک روٹی کھائے تاکہ روزے پر قوت حاصل کر سکے۔ یہ بہتر ہے اور اگر افطار میں تاخیر رکھ کر اسے سحری تک لے جائے اور سحری ہی کو کھایا کرے تو اس سے پانچ چیزیں حاصل ہوں گی۔

۱۔ روزہ دار ہونے کی وجہ سے دن کا فاقہ۔

۲۔ قیامِ شب کرنے والے کی طرح رات کا فاقہ۔

۳۔ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے قلبی صفائی و خلاء۔

۴۔ قلبی خلاء کی وجہ سے فکر کی رقت و اجتماعیت اور معلوم کرنے کے لیے نفس کا سکون اب وقت سے پہلے نفس اس سے مطالبہ نہیں کرے گا۔ میرے نزدیک یہ متوسط ترین اور محبوب ترین طریق ہے اور یہی طریقِ سائرین ہے۔

حضرت عاصم بن کلیب کی حدیث میں ان کے والد سے مروی ہے۔ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا۔ فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی تمہارے اس قیام کی طرح قیام نہیں کیا بلکہ آپ اس قدر قیام فرماتے کہ آپ کے پاؤں پھٹ گئے اور تمہارے اس وصال کی طرح آپ وصال کرتے۔ بلکہ آپ سحری تک افطار کو موخر فرما دیتے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔ بتایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سحری تک وصال کرتے" اب اگر سالک ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے اور یہ روزے کا معتدل ترین طریقہ ہے تو جس روز افطار ہو ظہر کے بعد کھائے اور شب روزہ کو فجر کے قریب کھانے۔ اگر ایسا کرے تو افطار کے دن کل گزشتہ نصف کھانا کھائے۔ گویا وہ روزہ دار ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو بدن میں تکلیف و نقاہت پیدا ہو گی اور حال میں کمزوری واقع ہو گی اور جس کے لیے کچھ معلوم و مقرر نہ ہو تو اس کے لیے کچھ حرج نہیں کہ وہ سیر ہو کر کھائے پھر انتظار ہو کر بھوک ختم ہو جائے اور بھوک کی علامت یہ ہے کہ اس کا نفس، دوسری ماکولات کی بجائے روٹی کو مخصوص طور پر پسند کرتا ہو تو اس میں سیری کا مرض باقی ہے اور کھانے کے بعد سیری کی علامت یہ ہے کہ وہ چاہت کے ساتھ خالی روٹی کھا لے۔ جب اس کا نفس سالن کا مشتاق ہونے لگے تو سیری کا آغاز ہو گیا۔ اور اگر اس نے سالن کو پسند و منتخب کر لیا تو وہ سیر آدمی ہے (فاقہ سے محروم ہے) کھانے کے سلسلہ میں معلوم و مقرر چیز کو ترک کرنا (یعنی جو آئے کھا لے) یہ بغداد کے صوفیاء کا طریق ہے اور معلوم پر توقف کرنا، یہ بصرہ کے صوفیاء کا طریق ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت ابو القاسم جنیدؒ کے پاس بصرہ کے صوفیاء آئے تو انہوں نے پوچھا: "تم روزے میں کیسا کرتے ہو؟"

عرض کیا:

"ہم دن کو روزہ رکھتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو ہم معمولی غذا کھاتے ہیں۔"

فرمایا: "آہ، آہ، کاش تم بغیر غذا کھائے روزے رکھتے تو یہ تمہارے حال کے لیے زیادہ باعث کمال تھا۔ یعنی تم ایک معلوم کی طرف پر سکون نہ ہوتے۔"

انھوں نے عرض کیا:

"نہیں اس پر توقف نہیں اور قسم ہے کہ کھانے میں ترکِ معلوم کا عمل اعلیٰ ترین ہے جس پر بغداد کے صوفیاء تھے اور اصحاب توقف متوکلین کا یہی طریق ہے اور معلوم پر توقف کرنا جو اہل بصرہ کا طریقہ ہے کہ نفسانی آفات سے سلامتی

اور دنیا کی طرف انابت، ورتانک جھانک کو ختم کرنے والا طریقہ ہے اور یہ سالکین و عاملین کا طریق ہے۔

کھانے میں سالکین کی ریاضت

فاقہ و کمی میں سلفؒ کا طریق

حضرت ابوذرؓ بعض انکارات کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"تم جَو (کا آٹا) چھان کر بدل چکے، حالانکہ چھلنی (زمانۂ رسالت) میں نہ تھی۔ تم نے نرم روٹیاں بنانا شروع کر دیں اور تم نے دو دو سالن اکٹھے کیے اور تم پر طرح طرح کے کھانے پیش ہوں گے۔ تم میں سے ایک صبح کو ایک لباس پہن کر آتا ہے اور دوسرے لباس میں لوٹتا ہے۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں (صحابہؓ) ایسے نہ تھے۔"

فرمایا کرتے: "ہر ہفتہ میں میری خوراک جَو کی ایک صاع ہے۔ اللہ برتر کی قسم! میں اس سے نہیں بڑھاؤں گا حتیٰ کہ اس سے ملاقات کروں۔ اس لیے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

"قیامت کے روز تم میں مجھے زیادہ محبوب اور مجلس کے اعتبار سے میرے قریب ترین وُہی ہے جو اس حال پر فوت ہو جس پر میں نے اسے چھوڑا۔"

صحابہؓ کی ایک جماعت کی خوراک ہفتہ بھر میں ایک صاع تھی اور جب وُہ پھل بھی کھاتے تو ڈیڑھ صاع (خوراک) ہو جاتی۔

اہل صفہ کی روزانہ خوراک دو آدمیوں میں کھجور کی ایک مُد تھی اور مُد سے مراد ۱⅓ رطل ہے۔

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں،

"مومن ایک ننھی سی بکری کی طرح ہے جس کو ایک ہتھیلی بھر گھاس، ایک مٹھی بھر جَو اور ایک گھونٹ پانی کافی ہے اور منافق ایک درندے کی طرح ٹرپ ٹرپ کھاتا اور نگلتا ہے۔ اس کا پیٹ اپنے پڑوسی کی خاطر نہیں سکڑتا اور وہ اپنے بھائی پر اپنا کسی چیز کا ایثار نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے اس فضول چیز کو تمہارے سامنے کیا۔"

حضرت ابویزید بسطامیؒ فرمایا کرتے،

"مومن ایک انتڑی میں کھاتا ہے اور منافق سات انتڑیوں میں کھاتا ہے۔"

یہ وسعت اور کثرتِ خوراک بطریقِ مثال بیان کی۔ یعنی منافق آدمی ایک مومن سے کئی گنا زیادہ کھاتا ہے۔

اور عرب لوگ کہا کرتے ہیں: ضعف الشئ (چیز کا دُگنا) اور اضعافہٗ الی سبعۃ (اور سات گنا تک اضافہ)۔

ہمارے شیخ امام ابو محمد سہلؒ نے اس کی وضاحت کی۔ فرمایا:

"سات انتڑیوں میں کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حرص، طمع، لالچ، رغبت، غفلت اور عادت کے طور پر کھاتا ہے۔ یعنی منافق ان مفاہیم کے اعتبار سے کھاتا ہے اور مومن صرف فاقہ وزہد کے ایک مفہوم کے لحاظ سے کھاتا ہے"۔ اسی وجہ سے فرمایا کرتے:

"اگر ساری دنیا تازہ خون ہی ہوتی تو مومن کی اس میں سے خوراک صرف حلال حصّہ ہوگی۔ اس لیے کہ مومن تو صرف ضرورتِ زندگی کے باعث کھاتا ہے کہ زندہ رہے اور عبادت کرتا رہے"۔

بعض لوگ اس عبارت کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ یہ کلام ہمارے شیخ امام سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

آپ سے مومن کی خوراک کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

"اس کی خوراک اللہ (ذکر الٰہی) ہے"۔

پُوچھا: "میں نے اس کے قوام (جس سے زندہ رہے) کے بارے میں پُوچھا"۔

فرمایا: "ذکر"۔

کہا: "میں نے اس کی غذا کے بارے میں پُوچھا ہے"۔

فرمایا: "اس کی غذا علم ہے"۔

میں نے کہا: "میں نے اس کے جسمانی طعام کے بارے میں پُوچھا ہے"۔

فرمایا: "تجھے جسم سے کیا تعلق، جسم کو اس پر چھوڑ دے جس نے قدیم زمانہ میں اس کی کارسازی کی اب بھی وہی کارساز ہے"۔ پھر فرمایا:

"جسم ایک صنعت ہے۔ جب اس میں خرابی آجائے تو اسے اس کے صانع کے پاس لوٹا دے"۔

آپ سے حلال کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا:

"جب تک اس کے آغاز میں اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور اس کے آخر میں اسے فراموش نہ کرے۔ کھاتے وقت اسے یاد کرے اور فارغ ہو کر اس کا شکر کرے"۔

فرمایا کرتے:

"مومنین کے لیے خوراک ہے۔ صالحین کے لیے قوام ہے اور صدیقین کے لیے ضرورت ہے اور جو صاحبِ معصوم ہو اسے دن رات میں دو روٹیوں سے زیادہ نہ کھانا چاہیے اور ان دو کے درمیان بقدرِ ضرورت ایک بار ذرا چھوٹا وقفہ رکھے۔ عادت و شہوت کے طور پر اپنے آپ کو غذا نہ دے اور روٹی سے مراد چھتیس نوالے ہیں۔ یعنی ہر گھڑی میں تین نوالے زندگی برقرار رکھنے کے لیے ہوئے۔ جب اس انداز پر روٹی کھانا چاہے

تو ہر تین نوالوں کے بعد ایک گھونٹ پانی پی لے۔ یہ بارہ گھونٹ چھتیس نوالوں کے اندر ہوں گے۔ اس ترتیب پر ہر رات دن میں یہ غذا بدنی صحت و اصلاح کا باعث ہو گی۔

کم خوری پر انعامات

اس سلسلہ میں ایک مجمل روایت آتی ہے کہ حضرت ابوذرؓ فرمایا کرتے تھے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں میری خوراک ہر ہفتہ میں ایک صاع تھی۔ اللہ کی قسم، میں اس میں اضافہ نہیں کروں گا یہاں تک کہ اس سے جا ملوں۔" اور یہ روزانہ ایک صاع یعنی ایک رطل یا اس کے برابر ہوتی۔"

حضرت ابوجحیفہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ثرید اور گوشت کھا کر ڈکار لیا اور بتایا کہ میں نے یہ کھایا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اپنا ڈکار ہم سے روک رکھو، تم میں دنیا کے اندر زیادہ سیر ہونے والا قیامت کے روز تم میں زیادہ بھوکا ہو گا۔"

ابوجحیفہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم، اس دن کے بعد سے لے کر آج تک میرا پیٹ کھانے سے نہیں بھرا۔ (سیر ہو کر کبھی نہیں کھاتا) اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ مجھے اس (سیر ہو کر کھانے) سے بچائے رکھے گا۔

حضرت حسنؓ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"صوف پہنو، (پائنچے) کس کر رکھو اور نصف پیٹوں کی حد تک کھاؤ۔ تم ملکوتِ سماوی میں داخل ہو جاؤ گے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے،

"اپنے جگر بھوکے رکھو، اپنے بدن برہنہ رکھو تاکہ تمہارے قلوب اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن یحییٰ اسود نے طاؤسؒ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رفع کرتے ہوئے روایت کیا کہ آپؐ نے یہ فرمایا ہے (یعنی مرفوع روایت بتائی)

حضرت ابویزید بسطامیؒ صوفیا کے گروہ کے بلند پایہ بزرگ ہیں۔ ان سے پوچھا گیا:

"مشاہدۂ معرفت کسی چیز کے ذریعہ ہو سکتا ہے؟"

فرمایا، "بھوکے پیٹ اور برہنہ بدن کے ذریعہ۔"

تورات میں لکھا ہے،

"اللہ تعالیٰ موٹے فربہ عالم سے بغض رکھتا ہے۔"

اور ایک کتاب میں ہے،

"اور دو گوشتوں والے گھر پر ناراض رہتا ہے۔"

اور ایک طریق سے یہ دونوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باسناد بھی منقول ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے،

"اللہ تعالیٰ فربہ قاری سے بغض رکھتا ہے" (یعنی جس کو آخرت کا فکر نہ ہو اور دنیا دار ہو)

ایک مرسل روایت میں ہے،

"شیطان اس کے خون کے قائم مقام ہو کر (یعنی مل کر) آدم میں چلتا ہے اس لیے اس کی چلنے کی راہوں کو بھوک اور پیاس کے ذریعہ تنگ کر دو"

جب آدمی دو فاقوں کے درمیان ایک سیری رکھے تو اس کا فاقہ سیری سے زیادہ ہے اور حضرت ابو جحیفہؓ کی حدیث کی زد میں آنے سے سلامت رہا اور جو آدمی ہر سیری کے بعد فاقہ کرے اس کا فاقہ وسیری اعتدال پر ہے۔ اور جو آدمی ہر روز دو بار کھائے وہ سیر ہو کر کھانے والا ہے اور حضرت ابو جحیفہؓ کی روایت کا خطرہ واقع ہو گیا اور اس صورت میں اس کی سیری، اس کے فاقہ سے زیادہ ہے اور یہ مسنون بھی نہیں۔ یہ مترف لوگوں کا کام ہے اور سلف صالحین اسے اسراف شمار کرتے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے: انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"کہ آپ جب صبح کا کھانا کھاتے تو شام کا کھانا نہ کھاتے اور جب شام کا کھانا کھاتے تو صبح کا کھانا نہ کھاتے"

سلف صالحین روزانہ ایک بار کھاتے۔ روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا:

"اسراف سے بچو، اس لیے دن میں دو بار کھانا، اسراف سے ہے"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا [1] (اور وہ کہ جب خرچ کرنے لگیں تو نہ اسراف کریں اور نہ تنگی کریں)

چنانچہ ایک دن میں دو بار کھانا فضول خرچی ہے اور دو روز میں ایک بار کھانا کنجوسی اور اقتار ہے اور ایک دن میں ایک بار کھانا اعتدال کی راہ ہے۔

اسی وجہ سے میں کہتا ہوں،

"اگر اس نے چار روٹی کھائیں تو یہ اسراف ہوا اور تین روٹی بہتر اعتدال ہے اور یہ خوراک ہی معتدل راہ ہے۔

---

[1] الفرقان ۶۷

اور ایک ہی جگہ میں چار روٹیاں کھانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ کھانے کا لالچ بڑھے گا۔ اور اللہ کی ناراضگی پیدا ہو گی۔

ایک روایت میں ہے:

"سیر ہونے کی حالت میں کھانا، برص پیدا کرتا ہے۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"بندہ کو جس چیز کی خواہش پیدا ہوا سے کھا لینا، اسراف ہے۔"

صحابہ کا طعام و مشروب دو طرح کا ہوتا ہے:

۱۔ وجبۃ

۲۔ غبوق۔

وجبۃ سے مراد وہ کھانا تھا جو ایک وقت سے لے کر دوسرے وقت پر فاقہ کر کے کھاتے۔ جیسے کہ دقعہ کا قول ہے۔ یہ فرمانِ الٰہی اسی انداز پر ہے:

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا[1] (پھر جب گر پڑے ان کی کروٹ تو کھاؤ ان میں سے)

یعنی جب فاقے کی وجہ سے انسان کے پہلو زمین پر لگنے لگیں اس وقت کھاؤ۔ اور غبوق سے مراد یہ ہے کہ سوتے وقت یا عشاء کے بعد مٹھی بھر کھجور کھا لے یا دودھ کے چند گھونٹ پی لے یا دوپہر کے وقت ایسا کرے اور گاہے سحری کے وقت اس مقدار میں کھا لیا کرتے۔

دو مشروب یہ ہیں:

۱۔ العلل

۲۔ النھل

النھل سے مراد دودھ کے پہلے چند گھونٹ ہیں جو واجب کے درجہ پر ہیں اور العلل سے مراد دوسری بار پینا ہے جو مٹھی بھر کھجوروں یا کشمش کے غبوق کے قائم مقام ہے اور یہ بمنزلہ دو کھانوں کے ہے۔ اب سیرابی کامل ہوئی اور پہلی صورت میں پیاس کی وجہ سے نفس علیل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے العلل کا نام دیا۔

سلف کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اختیاری طور پر بدن کو ہلکا کرنے یا فقراء کی غمگساری یا حالِ فقر میں ان کے ساتھ مساوات حاصل کرنے کی خاطر سیر ہو کر کھانا چھوڑ دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ حالتِ فقر میں ان سے الگ

---

[1] الحج ۳۶

ہوکر اغنیاء میں داخل نہ ہو جائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلی بدعت سیر ہوکر کھانے کی ظاہر ہوئی۔ جب لوگوں کے پیٹ بھر جاتے ہیں تو وہ دنیا کی جانب بھرپور میلان کرنے لگتے ہیں۔"

ایک روایت میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقہ کرنے اور نہ ملنے کی وجہ سے بلکہ خود اختیار سے فاقہ کرتے۔ حالانکہ اوقات کے اندر اندر کھانے پر قدرت ہوتے ہوئے اختیاری طور پر فاقہ کرتے۔"

بسیار خوری کے نقصانات

بعض علماء کا فرمان ہے:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک پُر پیٹ سب سے مبغوض چیز ہے، چاہے وُہ حلال سے (بھرا) ہو۔"

یہ مفہوم ہم نے باسناد بھی نقل کیا ہے۔ ایک اسرائیلی روایت میں ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سامنے ابلیس ظاہر ہُوا اس پر ہر چیز کے رنگ برنگ قسم کے علائق دیکھے۔ پُوچھا:

"یہ علائق کیسے ہیں؟"

اس نے کہا:

"یہ بنی آدم کی شہوات ہیں۔"

فرمایا: "کیا ان میں کچھ میرے لیے بھی ہے؟"

اس نے کہا:

"بسا اوقات جب آپ سیر ہوکر کھاتے ہیں تو میں آپ پر نماز اور ذکر اللہ میں ثقالت ڈال دیتا ہُوں۔"

فرمایا: "کچھ اور بھی میرے لیے ہے؟"

کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "میں نے اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے آپ پر لازم کر لیا کہ اپنا پیٹ کھانے سے کبھی نہیں بھروں گا۔"

شیطان نے کہا:

"میں اللہ کی خاطر وعدہ کرتا ہوں کہ کسی مسلمان کو کبھی نصیحت نہیں کروں گا۔"

تابعین کی عادات طیبہ یہ تھی کہ وہ فاقہ کی پہلی حد یعنی چوبیس گھنٹوں تک کھانے سے رُکے رہتے اور عادت کی خاطر کھانا اس کا طریقہ نہ تھا اور نہ ہی وہ کھانے کا انتخاب کیا کرتے کہ فلاں کھائیں اور دُوسرے

کھانوں کے مقابلہ میں قصد کر کے روٹی کھایا کرتے۔ بس جو ملتا کھا لیتے کہ بھوک ختم ہو جائے اور زندہ رہیں۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جب تجھے اخروی ضرورت پیش آئے تو اسے کھانا کھانے سے پہلے پوری کرے۔ اس لیے کہ جس نے کھانا کھایا اس کی عقل میں کمی ہوئی (ثقالت کے باعث سمجھ میں گرانی آجاتی ہے)"۔ یا فرمایا: "جس درجہ عقل پر تھا اس میں تغیر ہوا۔"

فرمایا کرتے:

"میرے نزدیک رات بھر کے قیام سے زیادہ رات کے کھانے سے ایک لقمہ کم کر دینا زیادہ محبوب ہے"۔

دراصل ان کا یہ قول کثرتِ عبادت پر فاقہ و کمی کو ترجیح دینے کا ہے"۔

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے کہ ایک عابد نے اپنے کسی بھائی کی دعوت کی اور اس کے سامنے روٹیاں رکھیں تو وہ روٹیاں الٹ پلٹ کرنے لگا تاکہ عمدہ قسم کی روٹی لے۔ عابد نے کہا:

"ہاتھ بڑھاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں کہ جس روٹی پر تم قناعت نہیں کر رہے اور بے رغبتی دکھا رہے ہو۔ اس میں صانع نے ایسے ایسے عمل کیا اور اس کے اندر اس طرح کی صنعت ظاہر ہوئی۔ بادل آیا، وہ پانی اٹھا کر لایا۔ پانی نے زمین کو سیراب کیا۔ زمین نے غلہ اگایا۔ ہواؤں، چوپاؤں اور بنی آدم نے اس سلسلہ میں محنت کی۔ آخر کار تیار ہو کر تیرے سامنے پہنچی اور تو اب بھی اس پر راضی نہیں ہو رہا؟"

ایک دوسرے قول میں اس مفہوم میں اضافہ ہے کہ روٹی کے تیار اور گول ہونے سے پہلے پہلے اس میں تین سو ساٹھ عمل ہوتے ہیں۔ یعنی اس قدر صانع اور صنعت کا سلسلہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت میکائیل علیہ السلام خزائنِ رحمت سے پانی کا وزن کرتے ہیں۔ پھر فرشتے، ابر کو ہنکاتے ہیں، سورج، چاند، افلاک، آسمانی فرشتے اور زمین کے جاندار و چوپائے وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں نانبائی روٹی تیار کرتا ہے:

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا [1] (اور اگر اللہ کے احسان شمار کرو تو شمار نہ کر سکو)

ایک خبر مشہور میں ہے:

"ابن آدم نے پیٹ سے زیادہ بُرا برتن نہیں بھرا۔"

معلوم ہوا کہ پیٹ جس قدر کم بھرا جائے گا اسی قدر بہتری ہے"۔

پھر فرمایا: "بنی آدم کو چند لقمے کافی ہیں کہ کمر سیدھی کرے"۔

---

[1] ابراہیم ۳۴

چنانچہ لقیمات میں دو معنی ہیں،

۱۔ کمی کرنا اور چھوٹا لقمہ رکھنا۔ اس لیے کہ جمع قلیل پر "تا" آتی ہے اور اس سے مراد دس سے کم ہوتا ہے۔

۲۔ یہ تصغیر ہے اس لیے کہ لقمۃ کی تصغیر لقیمۃ ہے۔

پھر فرمایا،

"اگر یہ نہ ہو سکے تو ایک تہائی کھانے، ایک تہائی پینے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے ہو۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں،

"اور ایک تہائی ذکر کے لیے ہو۔"

اب معلوم ہوا کہ پیٹ بھرنا ذکر اللہ میں رکاوٹ ہو وہ برائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ اللّٰہُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔ (اور اللہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے)

اور فرمایا،

وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔ (اور آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے)

مقدار و آداب طعام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "ایک تہائی کھانا" کا مطلب یہ ہے کہ مقتاد سیرابی تک کھائے اور تہائی سیر ہونا عادتِ ثانیہ کے ذریعہ اس کی زندگی قایم رکھنے کا ذریعہ ہو، جیسے کہ اس کی پہلی عادت پیٹ بھر کر کھانے کی تھی اور ایک تہائی پیٹ بھرنے سے مراد آٹھ روٹیہ کھانا ہے جیسے کہ روایت میں کے مفہوم سے ظاہر ہے: "ایک کا دو کو کافی ہے اور دو کا چار کو کافی ہے۔" اس میں پانچ وجوہ ہیں۔

ہمارے بعض بصری مشائخ کا فرمان ہے،

"ایک کا پیٹ بھر کر کھانا، دو آدمیوں کی خوراک کے طور پر کافی ہے۔"

بعض کا فرمان ہے،

"ایک مسلم کا کھانا دو مومنوں کے لیے کافی ہے اور دو مسلمانوں کا کھانا چار خواص مومنوں کے لیے کافی ہے۔"

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک منافق کا کھانا دو مسلمانوں کے لیے کافی ہے۔ اس مفہوم پر کہ:

"مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور منافق سات آنتوں میں کھاتا ہے۔"

اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ "ایک صنعت کار اور محنت کش آدمی کا کھانا، دو بیٹھنے والوں اور غیر محنتی افراد کے لیے کافی ہے۔"

ایک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ایک افطار کرنے والے کا کھانا دو خواص روزہ داروں کے لیے کافی ہے۔"

روایت عمر رضی اللہ عنہ میں ہے جب کہ واقعۂ مرتد میں انہوں نے حضرت ابن مسعودؓ اور ابو موسیٰؓ کو فرمایا اس لیے کہ انہوں نے مرتد کو توبہ سے پہلے قتل کر دیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"تمہارا ناس ہو، تم نے اسے ایک کمرے میں بند کیوں نہ کر دیا اور تین روز تک روزانہ اسے ایک روٹی کیوں نہ دی۔ شاید وہ توبہ کر لیتا اور اسلام کی طرف واپس آ جاتا؟ اے اللہ! جب مجھے یہ خبر ملی تو میں نے اس کا حکم نہیں دیا نہ مجھے اس کا علم ہوا اور نہ میں راضی ہوا۔" اس سے معلوم ہوا کہ ایک روٹی میں دن بھر کے لیے کفایت موجود ہے اور ہمارے نزدیک حجاز کی تین روٹیاں ایک رطل کی ہیں اس لیے کہ رطل اس دن سے آج تک چھ افراس کے برابر ہے۔ اب ہر روٹی آٹھ اوقیہ کی ہوئی اور اس سے مذکورہ بات ثابت ہوگئی کہ آٹھ اوقیہ ایک تہائی پیٹ بھرنا ہے۔ (ایک تہائی شبع ہے)

فرمایا: "ایک تہائی کھانا" اور اس سے پہلے فرمایا:

"لقیمات جو کہ جمع کا لفظ ہے اور اس سے مراد دس سے کم ہیں۔ یہ اس روایت کے بھی موافق ہے کہ" حضرت عمر رضی اللہ عنہ سات لقمے کھایا کرتے تھے۔"

خلفاء کے واقعات میں آتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے چار اطباء کو اکٹھا کیا:

۱۔ ہندوستانی

۲۔ رومی

۳۔ عراقی

۴۔ سوادی

ان سے پوچھا:

"ہر حکیم ایسی دوا بتاؤ کہ جس میں کوئی بیماری نہ ہو۔"

ہندوستانی نے جواب دیا:

"میرے نزدیک ہلیلہ سیاہ ایسی چیز ہے جس میں کچھ مرض نہیں۔"

رومی نے کہا:

"میرے نزدیک حبِ رشاد سفید ایسی دوا ہے کہ جس میں کوئی مرض نہیں۔"

عراقی نے کہا:

"میرے نزدیک گرم پانی ایسی دوا ہے کہ جس میں کوئی مرض نہیں۔"

سوادی زیادہ عالم تھا اس نے کہا:

"ہلیلہ سیاہ معدہ میں مروڑ پیدا کرتا ہے اور یہ مرض ہے۔"

دُوسروں نے پُوچھا:

"پھر تیرے نزدیک کیا بہتر ہے؟"

فرمایا: "میرے نزدیک وُہ دوا جس میں مرض نہیں وُہ یہ ہے کہ اس وقت کھانا کھاؤ جب خُوب بھُوک ہو، اور ابھی بھُوک باقی ہو تو ہاتھ اٹھا لو۔"

سب نے کہا:

"یہ ٹھیک ہے۔"

ایک عالمؒ کا فرمان ہے کہ میں نے اہلِ کتاب میں سے ایک فلسفی کے سامنے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان رکھا:

"ایک تہائی کھانا، ایک تہائی پینا اور ایک تہائی سانس لینا۔"

اس کو تعجب ہُوا اور اسے اعلیٰ ترین فرمان قرار دیا اور کہا:

"میں نے کھانے کے سلسلہ میں اس سے پختہ ترین کلام کبھی نہیں سُنا۔ یہ ایک حکیم کا کلام ہے۔"

پھر کہا، اطباء نے بہت زور لگایا تو کم کھانے کے سلسلہ میں صرف یہی کہہ سکے

"کھانے پر اس وقت بیٹھ جب خواہش پیدا ہُوا اور ابھی خواہش باقی ہو تو ہاتھ اٹھا لے۔"

بعض کا قول ہے:

"بھوک کے بعد ہی کھانا کھاؤ اور سیر ہونے سے پہلے ہاتھ اٹھا لو۔"

ایک کا قول یہ ہے:

"سخت بھوک کے بعد ہی کھاؤ اور خُوب سیر نہ ہو۔" اور ان سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تصدیق ہوتی ہے۔

بعض مشائخؒ سے مروی ہے۔ فرمایا کرتے:

"جو آدمی صرف گندم کی روٹی کھائے اور ادب کے ساتھ کھائے وُہ مرضِ موت کے سوا کسی دُوسرے مرض میں مبتلا نہ ہوگا۔"

پوچھا گیا: "ادب کیا ہے؟"

فرمایا: "بھوک کے بعد کھائے اور پیٹ بھرنے سے پہلے ہاتھ اٹھالے۔"

اس میں اصل یہ ہے کہ زمین کی مختلف نباتات کے ذریعہ اجسام میں امراض آتی ہیں کیونکہ معدہ چار

طبائع سے آمیز ہے،

۱۔ حرارت ۔

۲۔ برودت ۔

۳۔ رطوبت ۔

۴۔ یبوست ۔

اسی طرح زمین کی نباتات میں بھی چار مزاج ہیں۔ نباتات کی حرارت و برودت کے باعث معدہ میں حرارت وبرودت آتی ہے اور نباتات کی رطوبت و یبوست کے باعث معدہ میں رطوبت و یبوست آتی ہے۔ پھر باہم تقابل ہوتا ہے۔ ایک وصف میں قوت و اضافہ ہوجاتا ہے توامراض بھی اسی کے مطابق آتی ہیں۔ اس لیے کہ ہر خوراک جسمانی مفہوم کے وصف میں کام واثر کرتی ہے اور گندم ایسی چیز ہے کہ جو تمام زمینی نباتات کے مقابلہ میں معتدل ہے۔ اس میں چاروں مزاج اعتدال سے پائے جاتے ہیں جیسے کہ تمام مشروبات میں پانی ایک معتدل مشروب ہے۔

جس طرح تمام غلوں میں گندم ایک معتدل غلہ ہے اسی طرح تمام گوشتوں میں تیتر کا گوشت معتدل تر ہے۔

بعض اطباء کا فرمان ہے،

"خالص روٹی جو چاہو، کھاؤ۔ یہ مضر نہیں۔"

ایک دُوسرے کا فرمان ہے،

"تنہا روٹی کا کھانا، خراب سالن سے بہتر ہے۔"

بعض کا فرمان ہے،

"انسان نے انار سے زیادہ نفع بخش چیز اپنے معدہ میں داخل نہیں کی اور نہ ہی نمکین سے زیادہ ضرررساں چیز معدہ میں ڈالی۔" اور کثرتِ انار سے بہتر چیز یہ ہے کہ نمکین میں کمی کردے اور چار مزاجوں میں سارے معدہ میں تمام پھلوں سے زیادہ مشابہت سنگترہ سے ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی سنگترے سے مشابہت دی کہ اس کا ذائقہ عمدہ ہے اور اس کی خوشبو عمدہ ہے۔"

یہ لطیف وحکیم تعالیٰ کی طرف سے ایک لطف وحکمت ہے۔ جب وُہ کسی انسان کی صحت کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے معدہ کی جانب وحی فرماتا ہے،

"سبز نباتات و بوٹی سے معدہ کے وصف کے خلاف وصف حاصل کرو۔ چنانچہ حرارت، برودت اخذ کرتی ہے۔ رطوبت، یبوست اخذ کرتی ہے اور اس طرح مزاج میں اعتدال آجاتا ہے اور یہ بات امراض سے

بخار کا باعث بن جاتی ہے اور جب وُہ کسی بندے کو بیمار کرنا چاہتا ہے تو طبیعت کو کھانے میں سے اس انداز اور جنس کی صفت حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے مزاج بگڑ جاتے ہیں۔ پھر یہی فاسد مزاج رگوں کے ذریعہ تمام جسم کے اطراف میں چل کر مختلف اعضا میں پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ ہر عضو میں برعکس مزاج آ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے طبیعت کے خلاف بدن میں گرانی اور ثقالت آجاتی ہے اور بدن مریض ہو کر طرح طرح کی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی بات امراض و عوارض کا باعث ہوتی ہے۔ ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ[1] (یہ اندازہ ہے غالب جاننے والے کا)

پیدائش آدم علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنیتِ انسانی کی ایک اصل مروی ہے۔ حضرت براوٗ فرماتے ہیں، کہ عبدالمنعم بن ادریس نے بتایا انہیں ان کے والد نے حضرت ابن منبہ یمانیؒ سے روایت کیا: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ اس کے بارے میں تورات میں وصف دیکھا:

"میں نے آدمؑ کو پیدا کیا۔ اس کے بدن کو چار اجزاء سے پیدا کیا۔ پھر میں نے اسے اس کی اولاد میں وراثت رکھ دی۔ یہ ان کے اجسام میں بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہیں۔ اس کا بدن رطوبت و یبوست اور گرمی و سردی سے مرکب کر دیا۔ میں نے اسے مٹی سے پیدا کیا۔ اس کی رطوبت پانی سے اور حرارت سانس کی جانب سے ہے۔ اس کی برودت رُوح کی جانب سے ہے۔ پھر اس پیدائشِ اوّل کے بعد روح میں چار انواع رکھ دیں۔

کچھ مخلوق میرے اذن سے بدن کی مالک و قیم ہے۔ بدن صرف انہی کے ذریعہ قائم رہتا ہے اور ان میں سے ایک بھی دُوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

مرۃ سوداء، مرۃ صفراء، خون اور بلغم بھی پیدا کیے۔ پھر ان میں سے بعض کو بعض میں رکھ دیا۔ یبوست کو مرۃ سوداء میں سکونت دی۔ رطوبت کو مرۃ صفراء میں۔ حرارت کو خون میں اور برودت کو بلغم میں رکھ دیا۔ اب جس بدن میں یہ چاروں طبائع اعتدال سے ہوں جن سے اس کا قوام ہے تو اس میں ہر ایک کی نسبت ربع کی ہوتی ہے اور اس میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس کی صحت کامل اور درست ہوتی ہے اور اگر ایک مزاج میں اضافہ ہو جائے تو وہ دُوسروں پر غالب آکر بقدرِ غلبہ، مرض پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ حتٰی کہ وُہ ان کی اطاعت، و مقاربت سے کمزور و عاجز آجاتی ہے۔ پھر طویل حدیث ذکر فرمائی۔

اور گاہے بعض سالکین پر قوتِ مزاجی و تیزیٔ شہمات کی وجہ سے حرارت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اب طبیعت

---

[1] السجدہ ۱۲

سامنے آجاتی ہے اور مجرد آدمی میں منی زیادہ ہو جاتی ہے جیسے کہ حرارت میں قوت پیدا ہو کر خون میں قوت آجاتی ہے کیونکہ منی کی اصل وہی خون ہے جو کہ ریڑھ کی ہڈیوں میں چڑھتا ہے اور یہیں سکون پذیر ہوتا ہے۔ حرارت اسے پکا کر سفید رنگ کی چیز میں بدل دیتی ہے۔ جب ریڑھ کی کوڑیاں اس سے بھرپور ہو جاتی ہیں تو وہ اس کی راہوں سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ اس کی وجہ سے صحت و بدن میں قوت ہو جاتی ہے۔ اسی کو نکاح کی طرف رغبت و ہیجان کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ گرم قسم کے کھانے کھائے بلکہ اسے ٹھنڈے اور قاطع شہوت چیزیں کھانی چاہئیں اور ہر گرم خشک یا سرد تر چیز کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ اشیاء طبیعت میں ہیجان پیدا کرتی اور عضو میں قوت پیدا کرتی ہیں۔

فرمانِ الٰہی ہے،

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ[1] (اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں قوت نہیں)

حضرت قتادہؓ سے اس کی تفسیر میں منقول ہے۔ فرمایا،

"اغلام بازی کی آفت۔"

حضرت فیاض بن نجیحؒ فرماتے ہیں،

"جب آدمی کا ذکر کھڑا ہوا تو اس کی تہائی عقل جاتی رہی۔"

حضرت عباسؓ سے اس آیت وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کی تفسیر میں مروی ہے۔ فرمایا،

"یعنی ذکر کھڑا ہونے کی شرارت سے۔"

بعض روایات نے اسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف باسناد بتایا۔ البتہ یہ کہا،

"ذکر، جب داخل ہو۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے،

اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِيْ وَ بَصَرِيْ وَ لِسَانِيْ وَ قَلْبِيْ وَ مَنِيِّيْ۔ (میں اپنے کان، اپنی بینائی، اپنی زبان، اپنے دل اور منی کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہن اجمعین کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سر کر اور ٹھنڈی اشیاء استعمال کرتیں اور ان کے ذریعہ شہوت ختم کرتیں۔

بعض مشائخ صوفیاء سے مروی ہے۔ فرمایا،

---

[1] البقرہ ۲۸۶

"ابتدائے سلوک میں مجھ پر میرا وصف (شہوت کا) شدید غلبہ ہوا اور تاب نہ رہی۔ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے زاری کیا کرتا۔ آخر میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا۔" اس نے کہا:

"تجھے کیا ہے؟" میں نے اس کے سامنے اپنی حاجت رکھی۔ اس نے کہا:

"آگے بڑھ۔" میں بڑھا تو اس نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھا اور مجھے دل کی گہرائیوں تک اور سارے بدن میں ایک ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ بتاتے ہیں کہ صبح اٹھا تو میرا سارا دکھ ختم ہو چکا تھا۔ سال بھر آرام رہا اور پھر یہ وصفِ (شہوت) لوٹ آیا بلکہ پہلے سے شدت تھی۔ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے اور گڑگڑانے لگا۔ ایک آدمی خواب میں نظر آیا اور اس نے کہا:

"کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تیری یہ چیز جاتی رہے اور تیری گردن کاٹ دوں؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

اس نے کہا:

"گردن بڑھاؤ۔" میں نے گردن بڑھائی اور اس نے نور کی ایک تلوار نکالی اور میری گردن کاٹ دی۔ صبح ہوئی تو یہ تکلیف ختم ہو چکی تھی۔ ایک سال تک میں پھر ٹھیک رہا۔ پھر شہوت کی تکلیف بڑی شدت کے ساتھ اُبھری تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو میرے سینہ اور کپڑے کے درمیان کی طرف مخاطب کر کے کہہ رہا تھا:

"تیرا ناس ہو، کب تک اللہ تعالیٰ سے وہ مانگتے رہو گے جو کہ وہ تجھ سے اُٹھانا پسند نہیں کرتا۔"

بتلاتے ہیں کہ پھر میں نے نکاح کر لیا اور یہ مرض جاتا رہا اور دوبارہ (برائی کرنے کا) خیال تک کبھی پیدا نہ ہوا۔ یہ بات ان کی اولاد کا باعث تھی۔

اور جب انسان اپنی بھوک بھول ہی جائے اور بھوک فراموش کر کے رب تعالیٰ کو یاد کرتا رہے تو وہ فرشتوں سے مشابہ ہے۔ اور اگر سیر ہو کر بھی شہوات کی تلاش میں پریشان ہے تو وہ چوپاؤں سے مشابہ ہے۔

کہتے ہیں کہ بھوک مالک و بادشاہ ہے اور سیری مملوک ہے اور بھوکا آدمی عزت والا ہے اور سیر آدمی ذلیل ہے۔

ایک قول یہ ہے:

"بھوک، سب کی سب عزت ہے اور سیر ہونا سب کا سب ذلت ہے۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"بھوک، آخرت کی کنجی اور زہد کا دروازہ ہے اور سیر ہونا دنیا کی کنجی اور رغبت و خواہش کا دروازہ ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"ہر چیز کا ایک دروازہ ہے اور عبادت کا دروازہ روزہ ہے۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے،

"روزہ رکھو، صحت مند ہو جاؤ۔"

چنانچہ بیماریوں سے اجسام کی صحت کے مقابلہ میں امراض سے قلبی صحت زیادہ اعلیٰ و بہتر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا،

"ہمیشہ جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو، تمہارے لیے کھول دیا جائے گا۔"

میں نے کہا،

"اے اللہ کے رسول، ہم ہمیشہ جنت کا دروازہ کیسے کھٹکھٹائیں؟"

فرمایا: "بھوک اور پیاس کے ذریعہ۔"

حضرت ابو سعیدؒ نے عزائم و وجدان کے اعتبار سے اہل فاقہ کی بیان میں ان کے مقامات کی تقسیم کی ہے۔

حضرت جہضمیؒ نے احمد بن شاکرؒ سے نقل کیا۔ کہا کہ میں نے ابو سعیدؒ کو فرماتے سنا کہ میں نے ثقہ علماء سے روایت سنی ہے جو عبدالواحد بن زیدؒ کے بارے میں نقل کی کہ وُہ قسم کھا کر فرمایا کرتے،

"فاقہ کے سوا کوئی صاف نہ ہُوا اور فاقہ کے بغیر کوئی پانی پر نہ چلا اور فاقہ کے بغیر انہیں طی الارض حاصل نہ ہُوا۔"

فاقہ کی اقسام

وہ تمام عمدہ اخلاق کو شمار کر کے فرمایا کرتے کہ یہ صرف فاقہ کی بدولت ہی حاصل ہُوئے۔

حضرت ابو سعیدؒ نے فرمایا:

"فاقہ کا مفہوم مخلوق پر معلق ہے۔ اس کے اندر آنے میں ان میں فرق ہُوا اور فاقہ کشی کے کئی اسباب ہیں۔

بعضؒ نے صاف و حلال چیز نہ پائی۔ اس لیے تقویٰ کی وجہ سے فاقہ کیا۔

بعضؒ نے صاف و پاک چیز پائی مگر طویل حساب اور پرسش کے ڈر سے چھوڑ دیا۔

بعضؒ نے عبادت میں اس قدر لطف و سرور اور چین و راحت محسوس کی کہ کھانے پینے کے معاملہ کو عبادت میں حائل اور قاطع جان کر چھوڑ دیا۔

بعضؒ کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہُوا ان کو اللہ تعالیٰ سے قلبی حیا آئی۔ اس لیے کہ وُہ جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے۔ ان کا مقام حیا رکھا ہے۔ انہیں ڈر ہُوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے اور یہ اس کے سامنے منہ چلا رہے اور کھا پی رہے ہیں۔ ایسا کرنا انہیں بُرا محسوس ہُوا چنانچہ ٹھیک اسی وجہ سے فاقہ کرنے لگے۔ اس لیے کہ انہیں پردہ کرنا پڑا۔ چنانچہ اس نے دو بہتر باتوں سے تسلی پائی، حتیٰ کہ غیب میں اس کا ذکر ہُوا یا اسے یاد دلایا گیا۔"

حضرت ابو سعیدؒ خراز نے یہ بھی فرمایا کہ حکماء کی ایک جماعت کا قول ہے:

"اللہ تعالیٰ کسی ایسے آدمی سے کلام نہیں فرماتا کہ اس کے پیٹ میں دنیا کی کچھ چیز ہو۔" اس سے پتہ چلتا ہے

کر موسیٰ علیہ السلام کو ایسا حکم کیوں ہوا۔ اس لیے کہ وُہ دنیا سے خالی ہو کر اور کسی چیز کی طرف نفسانی میلان لے کر ملاقات نہ کریں اور ایسی رُوح کے ساتھ آئیں جو روحانی ہو اور حق تعالیٰ سے ہی اسے زندگانی ملی ہو۔ اس وقت ہی انسان اس قابل ہے کہ کسی ترجمان کے بغیر میں اس سے خطاب کروں۔

حسن بن یحییٰ لبنتیؒ نے ابن مسروقؒ سے نقل کیا کہ میں حضرت سہل بن عبداللہؒ سے ملا۔ جب میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے بوسہ دیا اور خوشخبری دی۔ وہ سلوک و تواضع کی حالت میں تھے۔ میں نے پُوچھا:

"آپ اپنے آغازِ سلوک کے بارے میں کچھ بتائیں۔ وُہ کیسا تھا اور آپ کو کیسے قوت حاصل ہوئی؟"

فرمایا: "ہر سال میں تین درہم خرچ کرتا۔ ایک درہم کا گھی لے لیتا اور ایک درہم کا چاول کا آٹا لے لیتا اور اسے ملا کر تین سو ساٹھ گولے سے بنا لیتا۔ ہر روز ایک گولہ کھا کر افطار کرتا۔"

میں نے پوچھا:

"اب کیسا طریقہ ہے؟"

فرمایا: "بغیر حد اور توقف کے کھاتا ہوں (یعنی فاقہ کی کوئی حد مقرر نہیں)"

خلیفہ منصور کا حکیمانہ جواب

بادشاہوں کے واقعات میں آتا ہے کہ شاہِ ہند نے خلیفہ منصور کی طرف کچھ تحائف بھیجے۔ ان تحائف کے اندر ایک فلسفی طبیب بھی تھا۔ بتایا کہ خلیفہ منصور نے طبیب کی بہت قدر و منزلت کی۔ جب حکیم اس کے پاس آیا تو فلسفی نے کہا،

"اے امیرالمومنین! میں آپ کی خدمت میں تین باتیں لے کر آرہا ہوں کہ عام بادشاہ ان کی بہت قدر کرتے اور انہیں چاہتے ہیں اور ہم یہ دوائیں صرف بادشاہوں کے لیے ہی بناتے ہیں۔"

منصور نے پُوچھا: "وُہ کیا ہیں؟"

کہا، میں آپ کی داڑھی پر ایسا سیاہ خضاب لگا دوں گا کہ سیاہی کبھی نہیں اُترے گی اور رنگ نہیں بدلے گا"

خلیفہ نے کہا: "دوسری دوا کیا ہے؟"

کہا" میں آپ کو ایسی دوا دوں گا کہ خوب کھا سکیں گے۔ آپ جو چاہیں گے کھائیں، بدہضمی نہ ہوگی اور نہ ہی کھانا آپ کو ضرر دے گا۔"

پُوچھا: "تیسری دوا کیا ہے؟"

کہا: "میں آپ کی پشت ایسی مضبوط کر دوں گا کہ جماع کی زبردست قوت پیدا ہو جائے گی۔ آپ جس قدر چاہیں جماع کر سکیں اور تھکاوٹ نہ ہو اور نہ بینائی کمزور ہو اور نہ ہی قوت میں کمی واقع ہوگی۔"

بتاتے ہیں کہ خلیفہ منصورؒ نے تھوڑی دیر سر نیچے کیا اور سر اٹھا کر فرمایا: "میں سمجھتا تھا کہ تم عقلمند ہو، مگر

سیاہ بالوں کی مجھے ضرورت نہیں یہ فریب وکذب ہے اور بڑھاپا ایک وقار اور ہیبت ہے اور میں اپنے چہرے میں پیدا کیے ہُوئے اللہ کے نور کو سیاہی کی ظلمت سے نہیں بدلوں گا۔

اور جو تم نے کھانے کا ذکر کیا۔ اللہ کی قسم، میں حریص آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے کثرتِ طعام کی ضرورت ہے اس لئے کہ ایسا کرنے میں بدن بوجھل ہو جاتا ہے اور آفات سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے اور کم خوری میں بیت الخلاء کی طرف آمدورفت بھی کم رہتی ہے اور زیادہ کھانے کی وجہ سے جو ناپسند کرتا ہُوں وُہ زیادہ دیکھوں گا اور جس کو بُرا سمجھتا ہُوں اسے زیادہ سُنوں گا۔

اور رہی عورتوں کی بات، تو نکاح دراصل جنون کی ایک شاخ ہے اور اگر میں کسی لونڈیا کے سامنے (جماع کی خواہش لے کر) بیٹھوں تو میرے جیسا بُرا خلیفہ اور کوئی نہیں۔ اس لیے جہاں سے آیا ہے اسی کے پاس ناکام و نامراد ہو کر چلا جا۔ مجھے ان چیزوں کی کچھ ضرورت نہیں جو تُو لے کر آیا ہے۔"

زہد کی ایک عجیب تعریف

صوفیاء کی جماعت میں سے بعض سے مروی ہے: فرمایا کہ: میں قاسم فاقہ کش کے پاس آیا۔ میں نے پوچھا:

"زہد کیا چیز ہے؟"

انہوں نے کہا:

"اس میں کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا:

"صوفیاء نے بتایا ہے کہ زہد کم امیدی کا نام ہے۔"

فرمایا: "تُو نے اس میں کیا سُنا؟"

میں نے کہا:

"ان کا قول ہے کہ زہد ترکِ ذخیرہ کا نام ہے۔"

فرمایا: "اچھا ہے۔" الغرض میں نے کئی اقوال ان کے سامنے پیش کیے وُہ خاموش رہے۔ میں نے عرض کیا:

"آپ اس میں کیا کہتے ہیں؟"

فرمایا: "یاد رکھو پیٹ ہی بندے کی دُنیا ہے۔ جس قدر وُہ پیٹ پر قابُو رکھے گا اسی قدر وُہ زہد والا ہے اور جس قدر پیٹ کا اس پر قابو ہو گا اسی قدر وُہ دنیا کا مملوک و غلام ہے۔"

حکیم الامت حضرت وہب بن منبہؒ نے اس طرح فرمایا "ہر چیز کا ایک وسط اور دو طرف ہیں۔ جب ایک

طرف پرسکون ہوتی ہے تو دوسری میں میلان ہو جاتا ہے اور جب وسط میں سکون ہوتا ہے تو دونوں اطراف میں اعتدال واقع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پیٹ کو اعضائے ظاہر میں وسط کی حیثیت حاصل ہو۔ اگر یہ پرسکون ہو تو اطراف یعنی سماعت، بصارت، زبان، شرمگاہ اور دونوں پاؤں میں اعتدال آجاتا ہے۔

شیخ ابن سالمؒ فرمایا کرتے تھے:

"جب پیٹ کو اس کا حصہ سیرابی دیا جائے تو وہ ہر عضو اپنا اپنا لہو و لعب کا حصہ مانگے گا اور نفس بے قابو ہو کر تجھے ہلاکت میں ڈال دے گا اور جب پیٹ کے حصہ کو روکے گا تو ہر عضو اپنے حصہ کے مطالبہ میں کمی کرے گا۔ چنانچہ قلب میں استقامت و ہدایت آجائے گی۔"

حضرت بشر بن حارثؒ بیمار ہو گئے۔ انہوں نے عبدالرحمٰن طبیب سے خوراک کے بارے میں پوچھا کہ جو مناسب ہو۔

عبدالرحمٰن نے کہا:

"مجھ سے پوچھ رہے ہو، جب میں بیان کروں گا تو تُو قبول نہیں کرے گا۔"

حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"اچھا بتاؤ، میں سنوں، کیا بتاتے ہو؟"

اس نے کہا:

"تین چیزیں استعمال کرنی چاہئیں۔ انہی میں آپ کے جسم کی اصلاح ہے۔"

پوچھا: "وہ کیا چیزیں ہیں؟"

کہا: "سکنجبین پئیں، بہی چوسیں اور اس کے بعد اسفید باج کھائیے۔"

حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"کیا تم سکنجبین سے کم چیز جانتے ہو جو اس کے قائم مقام ہو؟"

اس نے کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "میں جانتا ہوں۔"

اس نے کہا: "وہ کیا؟"

فرمایا: "سرکے کے ہمراہ ہندبا (کاسنی) کھانا، اس کے قائم مقام ہے۔"

فرمایا: "بہی سے کم چیز جانتے ہو جو اس کے قائم مقام ہے؟"

کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "میں جانتا ہوں۔"

کہا: "کیا چیز ہے؟"

فرمایا: "خرنوبِ شامی۔"

فرمایا: "جانتے ہو اسفیداج سے کم چیز کیا ہے جو اس کے قائم مقام ہو؟"

کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "میں جانتا ہوں۔"

پوچھا: "کیا چیز ہے؟"

فرمایا: "گائے کے گھی میں چنوں کا پانی اس کے قائم مقام ہے۔"

عبدالرحمٰن نے کہا:

"آپ مجھ سے طب زیادہ جانتے ہیں۔ اب مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟"

انسان کو چاہیے کہ اگر بھوکا ہو اور نفس جماع کی خواہش کرے تو کھانا نہ کھائے تاکہ نفس کے لیے دو لذتیں جمع نہ ہو جائیں کہ دونوں کا مطالبہ کرے۔ بسا اوقات عفت حاصل کرنے کی خاطر جماع کیا جاتا ہے اور نفس کھانا مانگتا ہے تاکہ خوب انبساط کے ساتھ جماع کی طرف لپکے اور دو لذتوں کا جمع کرنا نفس کو قوت دینا اور اس کے لیے عادت پیدا کرنا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ کھانا کھا کر سو نہ جائے ورنہ دو غفلتیں جمع ہو جائیں گی۔ سستی کی عادت ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے قساوتِ قلبی پیدا ہو گی بلکہ کھانا کھا کر نماز پڑھے یا بیٹھ کر ذکر اللہ کرے۔ یہی بات، شکر کے قریب تر ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

"نماز و ذکر کے ساتھ اپنے کھانے کی اصلاح کرو اور سو نہ جاؤ ورنہ قساوتِ قلبی پیدا ہو جائے گی۔" ہر کھانے کے بعد کم از کم چار رکعتیں ادا کرے اور ایک صد بار تسبیح پڑھے اور کچھ قرآن مجید کی تلاوت کرے۔

حضرت سفیان ثوریؒ اگر کسی رات کو سیر ہو کر کھاتے تو رات بھر بیدار رہتے اور اگر کسی دن میں سیر ہو کر کھاتے دن بھر نماز پڑھتے اور ذکر اللہ میں مشغول رہتے۔

مثال دے کر فرمایا کرتے:

"زنگی سیر ہوا اور مشقت اٹھائی۔"

ایک بار فرمایا:

"گدھا سیر ہوا اور مشقت اٹھائی اور جب بھوکے ہوتے تو اس میں نرمی کرتے۔"

گوشت، روغنیت اور پھل

ایک منقشف آدمی کو ہر ماہ میں دو بار گوشت اور روغنیت کھانی چاہئے۔ اگر چار بار بھی کھا لے تو کچھ ہرج نہیں۔ سلف صالحینؒ ایسے ہی کرتے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"جس نے چالیس روز گوشت چھوڑ دیا وہ تند اخلاق ہو گیا اور جس نے چالیس روز روزانہ گوشت کھایا اس کے دل میں قساوت پیدا ہو گئی۔" گوشت پر مداومت کرنے کی ممانعت ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ "جیسے شراب میں ضرر ہے اسی طرح گوشت کی مداومت میں ضرر ہے۔"

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ عبادان کے متقی لوگوں کو فرمایا کرتے:

"اپنی عقلوں کی حفاظت کرو، انہیں روغن اور چربی کے ذریعہ بچاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ولی ناقص العقل نہیں ہوتا۔"

اگر ایک سالک آدمی، کچھ پھل وغیرہ کھانا چاہے تو اسے روٹی کے عوض کھائے اور اسی قدر روٹی کم کرے۔ اسی کے ذریعہ بھوک مٹالے۔ کھانے کے وقت تک یہی اس کی خوراک بن جائے گی اور لذت حاصل کرنے کی خاطر پھل نہ کھائے ورنہ عادت اور شہوت کا اجتماع ہو جائے گا اور ایسا کرنے سے اکتاہٹ پیدا ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ ایک بار دو بار روٹی کے بغیر پھل ہی سے سیر ہو گا تو جلدی چھوڑ دے گا اور شہوت ہی کٹ جائے گی۔ (یعنی پیٹ میں ایک یا دو وقت میں صرف پھل ڈالنے سے لذاتِ دنیا سے بے زاری آ جائے گی جو کہ مطلوب ہے)

حضرت ابو سہل رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے شیخ ابن سالم رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں روٹی اور کھجور ہے۔ فرمایا:

"کھجور سے ابتدا کرو۔ اگر یہ کافی رہے تو ٹھیک ورنہ بعد میں ضرورت کے مطابق روٹی بھی کھا لینا۔"

فرمایا: "کھجور مبارک ہے اور روٹی نحوست ہے۔" یعنی اسی کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلنا پڑا۔ اور کھجور اس طرح مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں کلمۂ توحید کے لیے کھجور کے درخت کی مثال دی۔" فرمایا:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ [1]

دیکھا تو نے نہ دیکھا کہ بیان کی اللہ نے ایک مثال، ایک بات ستھری جیسے کہ ایک درخت ستھرا، اس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنی آسمان میں)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

---

[1] ابراہیم ۲۴

"کلمۂ توحید سے شیریں تر کوئی چیز نہیں۔ یہ ایک پاک و عمدہ درخت کی طرح ہے اور یہ کھجور کا درخت ہے۔" اور پھلوں میں تر کھجور سے زیادہ کوئی پھل شیریں تر نہیں ہوتا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیرینی، نرمی، قوت اور پختہ اصل ہونے میں مومن کی کھجور کے درخت کے ساتھ مشابہت دی۔ فرمایا:

"اس کا پتہ نہیں گرتا۔ اس کی مثال مومن کی سی ہے۔"

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"اگر تو روٹی کی بجائے دوسری چیز کو کھا کر کام چلا سکے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے۔"

مطلب یہ تھا کہ نفس کو کسی ایک خاص چیز کا عادی نہ بنا لے ورنہ یہ تجھ سے نزاع کرے گا۔

حضرت ابو بکر بن جلاء کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا گیا تو وہ بہت متعجب ہوئے اور فرمایا:

"یہ حکمار کا کلام ہے اور ایسا کرنے سے اس کا حال درست ہو جائے گا۔" اور اگر سالک کو ڈر ہو کہ وہ کسی کھانے کی چیز کا عادی ہے اور اس کو نفسانی منازعت کا خطرہ ہے اور ابھی سالک ابتدائی حالت میں ہو، نفس کے مخفی مکر و فریب سے آگاہ نہ ہو اور نہ ہی آفاتِ نفس کو سمجھ سکتا ہو تو اب اگر عادت کی چیز کو چھوڑ دے تو افضل ہے اور چھوڑے تو اللہ سے یوں ڈر کر چھوڑے کہ اگر استعمال کیا تو شہوت ہو گی اور حرص پیدا ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے دوسری ایسی اشیاء میں پڑ کر برائی کے راستے کھل جائیں گے۔ دین ہاتھ سے نکل جائے گا یا عادت پختہ ہونے کا ڈر رکھے اور یہ خطرہ محسوس کرے کہ عادت پختہ ہونے کے بعد تو یہ مشکل ہو جائے گی کیونکہ شہوات کی عادت کی وجہ سے وہ شبہات میں جا گھسے گا اور عادت بھی ایسی چیز ہے جو عقل پر غالب آجاتی ہے اور ابتلاء بھی اللہ کی جانب سے علم کو مغلوب کرنے والا ایک معاملہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے استقامت میں دشواری ہوتی ہے اور اگر عادت نہ ہوتی تو لوگ توبہ کرنے والے ہوتے۔ ابتلاء نہ ہوتا تو تائب لوگ نیک ہی رہتے۔ اس لیے اگر عمدہ اشیاء کھانے سے شہوات پیدا ہوتی ہوں اور عادت ہو جانے کا ڈر ہو تو انہیں چھوڑ دے۔ اس لیے کہ عادات آنے سے نفسانی آفات پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا کر کے ہی آدمی اپنے قلب کی اصلاح کر سکتا ہے اور نفس کو قابو رکھ سکتا ہے تاکہ نفس کا غلام بننے سے پہلے پہلے نفس کو اپنا غلام بنا لے۔ عادت کی ہلاکت آفرینی دیکھنے سے پہلے ہی اسے جڑ سے کاٹ دے اور شہوت بننے سے پہلے ہی اسے مغلوب کر دے۔ بعض حکماء کا فرمان ہے:

"میں اپنی عام ضرورت، ترکِ ضرورت کے ذریعہ پوری کرتا ہوں۔ یہ بات میرے نفس کے لیے زیادہ راحت کا باعث ہے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں: "جب میں شہوت کی وجہ سے کسی دوسرے سے قرض لینے کا ارادہ کرتا ہوں تو میں

اپنے نفس سے قرض لے لیتا ہوں۔ یہ میرا بہترین قرض خواہ ہے۔ اس طرح نفس کے لیے ترک و منع اس کی غذا و عادت ہو جاتی ہے جیسے کہ اخذ و طعام اس کی عادت تھی اور اس طریقہ میں قلب کی اصلاح اور اس کے حال کو دوام حاصل ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم اپنے اصحاب سے کسی کھانے کی چیز کے بارے میں معلوم کرتے اور وہ بتاتے کہ یہ بہت مہنگی ہے تو فرماتے ،

"اسے چھوڑ کر سستا کر دو۔"

ایک ادیب نے اسی مفہوم میں یہ شعر کہا ہے : ؎

وَ اِذَا غَلَا شَیْءٌ عَلَیَّ تَرَکْتُہٗ ... فَیَکُوْنُ اَرْخَصَ مَا یَکُوْنُ اِذَا غَلَا

(جب ایک چیز مہنگی ہو جاتی ہے تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ اب یہ مہنگائی کے زمانہ میں سستی ترین بن جاتی ہے)

ایسا کرنے وقت وہ اللہ کی خاطر تارکِ شہوات اور اللہ کے عبادت گزاروں میں سے ایک عبادت گزار بن جائے گا۔

سلف کے ایک گروہ کا یہی طریقہ تھا مگر اب وہ حضرات دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ان کا طریقہ بھی ناپید ہو گیا۔ بعد میں جو لوگ ان کے نائب بنے وہ شہوات میں پڑ گئے اور ان مقامات کو زندہ نہ رکھ سکے اور نہ ہی کوئی آدمی ان ان راہوں پر چلا۔ اسی لیے ترکِ شہوات کے بارے میں کوئی کلام بھی نہیں کرتا۔ سالکین کے فقدان کے باعث یہ راہ بھی مٹ گئی۔ اب جو اس پر عمل کر کے اس پر چلے گا وہ اسے دوبارہ ظاہر کرنے والا ہے اور جس نے اسے دوبارہ ظاہر کیا اس نے اس راہ پر چلنے والوں کو زندہ کیا۔

ایک عالم ایک بصری سالک کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا :

"میرے نفس نے روٹی ، چاول اور مچھلی کا مطالبہ کیا اور اس کا مقابلہ شدت اختیار کر گیا۔ آخر بیس برس تک مجھے اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔"

بتاتے ہیں کہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا :

"اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا ؟"

انہوں نے بتایا :

"اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جو جو انعامات و اکرام فرمائے ہیں ان کی توصیف نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلے مجھے روٹی ، چاول اور مچھلی عطا ہوئی۔" اور فرمایا :

آج بغیر حساب کے اپنی اشتہاء کے مطابق خوب کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ[۵۱] دکھاؤ اور پیو رچ سے، بدلا اس کا جو آگے بھیجا تم نے پہلے دنوں میں،

گویا جب انھوں نے شہوات کو ترک کیا تو انہیں بعد کے لیے جمع کر دیا اور آج کے ایام میں بھوک اور پیاس کو مقدم کر دیا۔ اسی لیے ان کا استقبال ہی کھانے پینے سے ہُوا۔

بتاتے ہیں: "آخرت میں ہر عمل کی جزا اس کی جنس و مفہوم سے ملے گی"

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا،

"تیس برس سے مجھے خواہش ہو رہی ہے کہ اعلیٰ اور کم درجہ کی کھجوریں ملا کر کھاؤں مگر میں اپنے نفس کو روکے ہُوئے ہوں۔"

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ نے فرمایا،

"نفسانی شہوات میں سے ایک شہوت کو چھوڑ دینا، قلب کے لیے سال بھر کے روزوں اور قیام شبی سے بہتر ہے۔"

فرمایا: "میرے نزدیک رات کے کھانے میں سے ایک لقمہ چھوڑ دینا رات بھر کے قیام سے بہتر ہے۔" یہ دراصل کمی کو ترجیح دینا اور معدے کو کھانے سے ہلکا رکھنے کے باعث ہے یا سیر ہو کر کھانے کی عادت لوٹ آنے کا ڈر ہے۔

میں نے ابوبکر بن جلاءؒ کو فرماتے سُنا،

"میں ایک آدمی کو جانتا ہُوں کہ اس کا نفس یہ کہتا ہے کہ میں تیری خاطر دس روز تک فاقہ کر لیتا ہُوں مگر اس کے بعد مجھے میری خواہش کے مطابق کھلا دینا اور وُہ اسے کہتا ہے، میں تجھ سے دس روز کا فاقہ کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ میں چاہتا ہوں جو تو اب خواہش کر رہا ہے اسے چھوڑ دے۔"

ایک آدمی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی۔ آپؐ نے اس کی کلائی کی جلد پکڑی اور فرمایا: "تُو نے یہ سارا ہی فاقہ کر دیا۔" اور یہ نہیں فرمایا کہ فاقہ چھوڑ دو۔ اگر آپؐ فاقہ چھوڑنے کا حکم دیتے تو یہ آدمی فاقہ ترک کر دیتا۔ یہ ایسا نیک بندہ تھا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے کہ تیس برس تک اس نے خواہش کی چیز اور روٹی نہیں کھائی۔

حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے، "تم میں سے بعض لوگ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے

---

[۵۱] الحاقۃ ۲۴

درمیان کھانے کی مشک (بھرا ہوا پیٹ) رکھ لیتے ہیں اور پھر بھی چاہتے ہیں کہ مناجات کی حلاوت ملے یا فہم خطاب حسن سکیں؛" اور پیٹ کی مثال مزھر کی طرح ہے۔ یہ کھوکھلی لکڑی ہوتی ہے جس پر تار لگے ہوتے ہیں۔ یہ اندر سے خالی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی آواز بہت پتلی اور حسین ہوتی ہے اور اگر یہ بھر جائے اور وزنی ہو جائے تو اس کی آواز ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر پیٹ کھانوں وغیرہ سے خالی ہو تو یہ بات قلب کے لیے زیادہ رقت کی باعث ہے تلاوت میں خوب مزہ آجائے گا۔ قیام شب پر دوام حاصل ہوگا اور نیند میں کمی ہو جائے گی۔

ترکِ شہوت و عادت کی اہمیت

انہی سے مروی ہے کہ عتبہ غلام نے عبدالواحد بن زید سے عرض کیا:
" فلاں آدمی قلب کا ایسا درجہ بیان کرتا ہے جس کو میں نہیں سمجھتا۔ کہا کہ فلاں آدمی کھجور نہیں کھاتا اور آپ کھاتے ہیں"۔ اس نے کہا: " اگر میں بھی کھجور کھانا چھوڑ دوں تو کیا؟"
فرمایا: " اگر میں کھجور کھانا چھوڑ دوں تو کیا میں اس کے درجہ کو معلوم کر لوں گا؟ میں نے مقام پہچان لیا"
فرمایا" ہاں اور مزید درجہ ملے گا"۔
وہ رونے لگا۔ ان کے اصحاب میں سے کسی نے اس سے کہا" اللہ تیری آنکھ رلائے، کیا کھجور پر رو رہا ہے؟"
عبدالواحدؒ نے فرمایا:
" اسے چھوڑ دو، اس کا نفس ترکِ کھجور میں اس کے عزم سے آگاہ ہو گیا اور یہ ایسا آدمی ہے کہ جب ایک چیز چھوڑے گا تو دوبارہ کبھی اسے استعمال نہ کرے گا"
ہمارے ایک بزرگؒ نے گرم روٹی کھانا چھوڑ دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسے بہت پسند کرتے اور کئی سال تک اس کی خواہش رہی۔ اس پر عتاب ہوا تو فرمایا:
اگر میرا نفس بیس برس تک بھی روٹی کھانے کی خواہش کرتا رہے تو بھی میں اسے نہیں کھلاؤں گا اور بسا اوقات وہ نفسانی خواہش کی شدت کے باعث رو پڑتے۔ اس لیے کہ ان کا نفس ان کا صدق و عزم اور حسنِ وفا جان چکا تھا اور تا زیست ان کی شہوات و نائی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اسی وجہ سے ان پر گریہ طاری ہو جاتا۔
یاد رکھیے کہ شہوات کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ قوت، علم کی طرح ہے، اس کی حدود ہیں، کئی بار شہوت نے انسان کو بلند درجہ سے روک دیا۔ شہوات ختم ہو جائیں تو خوب خوب درجات حاصل ہوں اور اگر شہوات کو ختم نہ کر سکے تو کم از کم توبہ میں تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ نفسانی شہوات کا کوئی انجام نہیں۔ فرشتے نظر آنے تک شہوات سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ فرشتے نظر آئے تو نفسانی صفات ختم ہو گئیں اور شہوات غائب ہو گئیں۔ اس لیے شہوات اوصافِ نفس میں سے ہیں۔ اگر تو ایک عادت و خواہش کو ختم نہ کر سکے تو اس طرح کی نئی عادات میں اضافہ نہ کرے، بلکہ عادات میں کمی کرنے کی کوشش رکھے۔ یہی طریقہ ایمانی اخلاق کے قریب تر ہے۔

ایک بزرگ اپنے اصحاب کو فرماتے ہیں:

"شہوات مت کھاؤ، اگر کھاؤ تو ان کی طلب مت کرو۔ اگر طلب کر بیٹھو تو انہیں پسند نہ کرو"

اور واقعہ تو یہ ہے کہ روٹی سے زائد چیز پھل ہے جس سے انسان لذات حاصل کرتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"ہمیں روٹی کے مقابلہ میں عراق سے آنے والا پھل زیادہ پسند ہے" اگر روٹی کے ساتھ کچھ پھل کھانا بھی پڑ جائے تو ایسے کھانے جیسے اللہ تعالیٰ نے کفارہ میں فقراء کو کھلایا یعنی سالن میں اعتدال رکھے۔ اس کا فقراء کو حکم دیا مثلاً روٹی اور روغن۔ اس لیے کہ اعلیٰ ترین سالن گوشت اور شیرینی (حلوا) ہے اور معمولی ترین سالن نمک اور سرکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین کا حکم نہیں دیا کیونکہ یہ اغنیا پر گراں ہے اور معمولی کا بھی حکم نہیں دیا کیونکہ یہ فقراء پر گراں ہے البتہ اعتدال کا حکم دیا۔ فرمایا:

مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ۔

اس کے باوجود اگر انسان شہوات کی اشیاء کھانے اور انہیں پسند کرنے میں مبتلا ہو جائے تو اسے ظاہر کرے اور پوشیدہ نہ رکھے انہیں خود خریدے کیونکہ یہ صادق حال اور طریقہ سلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال میں ریاضت سے صداقت حال ختم نہیں ہو جاتی۔ اب اگر صدیق اور سچا ہو تو کذب میں صداقت سے کام لے۔ اس لیے کہ کذب میں صداقت سے کام لینے والا بھی صادقین میں سے ایک ہے۔

مزید برآں کذب اور نقص کا اظہار کرنا اور اس کے برعکس اخلاص دکھانا دو کذب بن جاتے ہیں کیونکہ وہ ناقص تھا اور اس نے کاملین کا سا حال ظاہر کیا۔ بیمار تھا اور معصومین کی علامات دکھائیں۔ اب دو طریق سے کذب ہوا اور دو وجوہ سے خدا کی ناراضگی کا مستحق ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین پر غضبناک ہوا اور ان پر دو ناراضگیاں ڈال دیں اور دو توبہ کے بغیر ان سے راضی نہ ہوا۔ ان پر دو شرطیں لگا دیں۔ فرمایا:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ[1] (منافق ہیں سب سے نیچے درجہ میں آگ کے)

یعنی کافروں سے بھی زیادہ عذاب میں ہیں کیونکہ کافر نے کھل کر کفر کیا۔ اس کا ظاہر و باطن برابر ہے اور منافق نے کفر بھی کیا اور ایمان میں شرک بھی کیا۔ اس کا ظاہر و باطن جدا جدا ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کو معمولی جانا اور مخلوق کو بڑا۔ سبحانہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ذلت میں اضافہ کر دیا اور اس کی توبہ میں شدت کی اور دو شرطیں لگا دیں۔ فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا (مگر جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور مضبوط پکڑا اللہ کو

---

[1] النساء: ۱۴۵

بِاللّٰہِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ ؂ (اور اپنا دین اللہ کے لیے خالص کیا)

نیز یہ ایک ریاء کی قسم ہے۔ ایک عالمِ ربانی اور اہل خرد آدمی ایسا کام نہیں کر سکتا۔ اگرچہ شہوات کی اشیاء کھانے اور بعض نافرمانیوں کا ابتلاء آن پڑے جیسے کہ عارفین عام مخلوق کی سی ریاء کاری کا ارتکاب نہیں کرتے۔ مگر بعض ذنوب ان پر بھی چل جاتے ہیں۔ پھر بھی ایک عالم ربانی ریاء کاری میں مبتلا نہیں ہوا کرتا۔

اس سلسلہ میں سلفؒ کے دو طریق ہیں :

۱۔ نفس سے مجاہدہ کرنا اور شہوات کو چھوڑ دینا۔ بعض سلفؒ تو اسے مخفی رکھتے اس لیے کہ یہ زیادہ سلامتی کا باعث ہے اور بعض ظاہر کر دیتے۔ اس لیے کہ وہ قوی نیت والے حضرات تھے اور ان کا اتباع کیا جاتا تھا۔ متبوع ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا درست ہے۔

۲۔ علماء اور عابدین کا ایک گروہ دوسرے طریق پر ہے۔

یہ حضرات عمدہ اشیاء کھاتے۔ جب مل جاتا تو کھانے میں وسعت فرماتے البتہ یہ ظاہر کر دیتے اور اس کے ذریعہ اپنے نفوس کو چھپا لیتے۔

اگر اعلیٰ طریق رہ جائے تو متوسط اور زیادہ سلامتی والے طریق پر چل اور اگر کوئی آدمی پوشیدہ طور پر شہوات کھائے اور ظاہر میں انہیں مخفی رکھے یا ظاہری طور پر ان کے برعکس کا اظہار کرے تو یہ اہل یقین کی راہ نہیں اور نہ ہی عارف کا یہ مسلک ہے۔ ایسا آدمی صحیح راہ سے بھٹک کر ہلاکت کی راہ میں چل پڑا۔ اس طریقہ سے دُور رہو، ورنہ سخت آفت و پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بتاتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سے ایک عابد آدمی کا ایک قوم کی زمین پر گزر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ کھیت کے درمیان بعض لوگوں کے چلنے سے راستہ سا بن گیا ہے۔ اس نے سوچا۔ اگر عام راستے سے ادھر گیا تو طویل ہو جائیگا اس نے سوچ کر کہا :

یہ گزرگاہ بن چکا ہے۔ لوگ اس پر چل لیتے ہیں۔ اگر میں بھی اس راہ پر چل کر دوسری جانب چلا جاؤں تو کچھ حرج نہیں۔ جب وہ اس سرزمین سے آگے بڑھا تو اس پر عتاب ہوا وہ گناہ بھول گیا۔ اب وہ بار بار کرنے لگا کہ کیا غلطی ہوئی؟

بتایا گیا کہ تو غلط راہ پر چلا۔ تو ایک قوم کے کھیت میں ان کی اجازت کے بغیر چلا۔

اس نے زاری کی اور کہا" اے پروردگار! معافی چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک راستہ بنا ہوا ہے"

؂ النساء ۱۴۶

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"ظالموں نے ایک راہ بنا لیا تھا اور تو نے اسی (طریقِ ظالمین) کو میری طرف راہ قرار دے دیا؟" جو آدمی ظالم کی راہ پر چلا۔ وہ معذور نہیں۔ اسے پریشانی اور ہلاکت میں گرنا ہوگا۔ ظالم خود ہلاک ہُوا۔ اپنی اقتدار کرنے والے کو بھی ہلاک کیا۔ یہ راستہ ریاکار جاہل اور دنیا کے طالب کا راستہ ہے جو ترکِ شہوات میں لوگوں کے ہاں مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کمزور یقین اور توحید میں ظلم و اختلاط کرنے والا آدمی ہے۔

دو طریق مٹ چکے

سلف صالحینؒ کا طریقہ تھا کہ وُہ خود خواہش کی اشیاء خرید کر لاتے اور انہیں گھروں میں لٹکا دیتے۔ لوگوں کے سامنے راغبین کا سا حال ظاہر کرتے مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں وُہ زاہد تھے انہیں کھاتے نہ تھے بلکہ جاہلوں کے دلوں سے اپنا مقام گرانے اور دیکھنے والوں سے اپنا حال پوشیدہ رکھتے۔ غافلین کی توجہ اپنی جانب سے ہٹا دیتے۔ اور اس کے ذریعہ کئی مقامات قطع کرتے اور اجر و ثواب حاصل کرتے۔ اس لیے کہ یہ اس کا مقام ہے جس نے اشیاء میں زہد کیا اور زہد کو پوشیدہ رکھا۔ اخفائے زہد کی انتہاء یہ ہے کہ اس کے برعکس معاملہ ظاہر کرے اور چیز لے کر اس سے نفع حاصل نہ کرے اور نہ اس سے لذت یاب ہو یہ بات نفس پر مجاہدہ سے بھی زیادہ شاق گزرتی ہے اس لیے کہ اس میں دو گرانیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ لذت سے روک دینے کی گرانی۔

۲۔ درجہ گرانے کی گرانی۔

نفس اس کے مزے سے محروم ہُوا اور اس کے ترک سے اسبابِ منزلت بھی ختم ہُوئے۔ اب اس نے دو بار صبر کا جام پیا۔ ایسی شہوات میں صدیقین کا یہی حال ہے اور اصحاب عزم اقویاء کا یہی طریقہ ہے۔ یہ بات عطیات لینے کے معاملہ میں زاہدین کے فعل سے مشابہ ہے کہ بعض زاہدین ظاہر میں عطیہ قبول کر لیتے۔ پھر پوشیدہ طور پر اسے اپنے قبضہ سے نکال دیتے۔ اس طرح عطیہ وصول کرنے میں رغبت ظاہر کر کے جاہ ختم کرتے اور پوشیدہ طور پر خرچ کر کے حقیقی زہد حاصل کرتے۔ چنانچہ عطیہ واپس کر کے نفس کو جاہ و مرتبہ کا مزہ نہ دیتے اور لے کر خود کھانے کے ذریعہ نفس کو اس کا مزہ بھی نہ چکھاتے۔ یہ طریقہ نفس پر بہت ہی گراں گزرتا ہے اور یہ علمائے زاہدین کا طریقہ ہے۔ جو اس پر چلا اُسے مقامِ صدیقین تک رسائی حاصل ہو گئی۔

یہ دو مذکورہ طریقے آج ختم ہو چکے۔ آج ان کا نشان تک باقی نہیں رہا۔ کوئی اِکا دُکا آدمی ہی اس راہ پر ہے جو اسے سمجھتا ہے ورنہ عام لوگ تو تصنع و تزئین کی راہ پر گامزن ہیں۔

حضرت جعفر صادقؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"جب میرے سامنے کوئی خواہش کی چیز پیش کی گئی تو میں نے اپنے نفس کی طرف دیکھا۔ اگر اس نے

اس کی خواہش برملا ظاہر کر دی تو میں نے اسے کھلا دی اور ایسا کرنا روکے رکھنے سے بہتر ہے اور اگر میرے نفس نے اپنی شہوت و خواہش کو مخفی رکھا اور زہد سے رغبتی ظاہر کی تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس میں سے کچھ نہ رہا۔ (یعنی نفس نے زہد دکھایا اور باطن سے کھانا چاہا تو میں نے اسے محروم رکھا تاکہ ظاہر و باطن یکساں ہو جائے)

ریاء و مخفی شہوت

نفس کا اظہارِ شہوت یہ ہے کہ تجھے اس کی پرواہ نہ ہو کہ شہوات کھانے کی شہرت ہو جائے گی بلکہ تو یہ بات پسند کرے کہ اہل دین لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایسی غذائیں کھاتا ہے اور نفس کا اخفائے شہوت یہ ہے کہ تجھے یہ خواہش ہو اور تو یہی پسند کرے کہ لوگوں کو میری شہوات اور عمدہ کھانوں کا علم نہ ہونے پائے اور شہوات کے کھانے والوں میں سے مشہور ہونے کو تو ناپسند کرے۔ یہی بات ترکِ طعامِ شہوت کا انجام ہے۔ اس لیے کہ جب اس نے شہوات کی خاطر ترکِ طعامِ عمدہ کیا پھر یہ چاہا کہ اس کا ترک مشہور نہ ہو تو یہ شہوات کی شہوت و خواہش ہے۔ یہ ناپسندیدہ سے بھی بڑے خطرے میں گزرا اور اس نے ترکِ شہوتِ طعام کے ذریعہ مزہ حاصل کرنے سے بھی زیادہ اپنی مدح و ثنا چاہی اور یہی مخفی شہوت ہے جس کے بارے میں روایت آتی ہے:

"مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ ڈر، ریاء اور مخفی شہوت کا ہے۔" اور ریاء تو معاملات (عباداتِ ظاہری) میں ہوتی ہے۔

اور مخفی شہوت یہ ہے کہ تجھے یہ خواہش ہو کہ ترکِ شہوات پر تیری توصیف و شہرت ہو جائے۔

بعض علماء سے ایک زاہد کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ خاموش رہے۔ پوچھنے والے نے کہا:

"کیا آپ کو ان میں کچھ خرابی نظر آتی ہے؟"

فرمایا: "کوئی خرابی نظر نہیں آتی البتہ ایک ناپسندیدہ بات ہے کہ وہ خلوت میں جو چیزیں کھاتا ہے، جماعت کے اندر وہ اشیاء نہیں کھاتا۔ اس کی وجہ سے اس میں نقص ہے اور فہم ہے کہ یہ مقامِ مرض ہے کیونکہ صالحین کا طریقہ یہ تھا کہ خلوت میں جو اشیاء نہیں کھاتے تھے مگر اس آدمی کا حال ان کے برعکس ہے۔

اگر انسان کے سامنے دو کھانے موجود ہوں تو نرم اور لطیف تر کو پہلے کھائے شاید یہی کافی ہو اور دوسرے سے بچا رہے کیونکہ دنیا دار لوگ لطیف چیز سے غلیظ چیز پہلے کھاتے ہیں تاکہ خوب زیادہ کھا سکیں اور شہوات میں اضافہ ہو جائے۔ اب اس لطیف چیز کا ذکر اعتراض نہ ہوگا۔

بعض نے معدہ کی مثال ایسے دی کہ جیسے پیٹ چکی دو اور نیچے بادام ڈالے جائیں اور جب ان کیلئے مزید جگہ نہ رہے تو پھر نرم مال دیے جائیں تو وہ شگافوں اور دراڑوں میں ٹھہر جائیں گے اور بادام کے درمیان

بیں اپنے لیے جگہ پیدا کرلیں گے یعنی سنگریزے میں تلوں کے لیے بھی جگہ بن گئی۔ اسی طرح معدہ کا معاملہ ہے۔ اسی میں غلیظ اور ثقیل کھانے کے بعد کوئی لطیف کھانا ڈالو تو وہ شہوت اسے نازل کر کے جگہ کرے گی اور سیر ہو جانے کے بعد بھی اس کو کھا لیا جائے گا۔ عرب لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں اور اس طرح سنگریزے کی طرح پیٹ بھرنا برا خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ طریقہ یہ ہے کہ ثرید سے پہلے گوشت کھائے۔ ایک آدمی نے ایک نبطی کو کہا:

"تو ان لوگوں میں سے ہے جو بھنے ہوئے سے پہلے ثرید کھاتے ہیں"

یعنی عراقیوں کی مذمت کرتے ہوئے یہ کہا:

"جب دونوں کھانے یکساں ہو اور سالک کو ان میں سے کسی ایک کے ترک میں کوئی افضلیت نظر نہ آئے۔ اب اگر وہ شہوات ترک کر چکا ہے اور اس کی نیت و عزم پختہ ہے۔ پھر یہ کھانا سامنے آیا تو کم زور درجہ والی چیز کھائے"

ایک صادق نے تنہائی میں مرغوبات کھانا ترک کر رکھا تھا۔ ایک بار لوگوں کے سامنے مرغوب چیز پیش ہوئی تو انہوں نے دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اپنے آپ کو اوجھل کرنے اور مدح کرنے والوں کو اپنے آپ سے غافل کرنے کی خاطر تھوڑی سی مقدار میں وہ چیز کھالی۔

حضرت ابوسلیمانؒ فرماتے ہیں:

"جب تیرے سامنے کوئی مرغوب چیز آئے اور تو اسے چھوڑ چکا ہو تو تھوڑی سی کھالے اور نفس کو انتہا تک جانے کی اجازت نہ دینا۔ تو نے اپنے نفس سے رغبت ختم کر دی اور اسے اس کی انتہا تک بھی نہیں پہنچنے دیا اور اس پر قابو پا لیا۔ اگر ایسا کرے تو بہتر ہے"

اس لیے کہ ابوسلیمانؒ کو یہ خطرہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ترکِ رغبت ظاہر کرتا ہو اور ترکِ شہوات کے ذریعہ اپنی فضیلت کے مزے لے کر تمام شہوات سے بڑھ کر برائی میں جا گرے اور اس طرح اس شہوت پرستی کی وجہ سے نفس پر ظلم کرے اور اخلاص میں خرابی آجائے۔

عوام کہا کرتے ہیں:

"چوپایہ بچوں کی طرح کھانا ہے"

اگر اس کا یقین پختہ ہو اور مخلوق اس کی نظروں سے غائب ہو تو پھر مرغوب چیز چھوڑ دے اور اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو۔ اس لیے کہ وہ کسی کے دیکھنے پر مریضِ (ریاء) نہیں ہوتا کہ کچھ کھا کر اس کا علاج کرے اور اگر تقویٰ سے نکل جانے والا کسی مذموم کی رغبت سے یا مجاہدہ کے عزم کے باعث مرغوب چیز ترک کر دی۔ (یعنی اگر میں نے ترکِ مرغوب نہ کیا تو تقویٰ سے نکل جاؤں گا) تو یہ بات اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر امتحان ہے

کر کیا وُہ نیت و عزم کو پورا کرتا ہے؟ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اب نہ کھائے اور اگر کوئی کھٹکا پیدا ہو تو اسے دُور ہٹانے کی کوشش کرے۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس نے مجاہدہ کی خاطر یہ چیز چھوڑ رکھی ہے۔ اب اس نے دو نیک کام کیے:

۱۔ ترکِ مرغوب کے عزم کو پورا کیا۔

۲۔ لطیف طریقوں سے اپنے حال کو مخفی رکھا۔

سالکین اور اہلِ تقویٰ کا یہی طریقہ اور یہی صفات ہیں اور یہ طریقہ پہلے ذکر کردہ طریقہ سے کم درجہ کا ہے۔

اگر اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا اس کی نظرِ رحمت آئی تو ذوالجلال والاکرام کے قرب و مشاہدہ کی وجہ سے اس کو یہ حیلے اور تدبیریں کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ اعلیٰ تر طریقہ ہے جس کو ہم نے آخر میں بیان کیا ہے اور یہ اصحابِ یقین کی راہ ہے۔

اور اگر غلیظ و ثقیل چیز ہی شبہ سے صاف تر ہو تو یہی کھانا زیادہ پاکیزہ اور افضل تر ہے۔ اب اس ہی سے کھائے۔ بتاتے ہیں کہ بندہ جب حلال میں سے پہلا لقمہ کھاتا ہے تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ ایک لقمہ اگر خوب مزیدار اور مرغوب ہو مگر مشتبہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی خاطر اسے چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ اس کی قدر کرتا ہے اور اس کے سابقہ گناہ معاف فرماتا ہے۔ وُہ بخشنے والا اور قدر کرنے والا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کو بھی بخش دینے والا ہے اور تھوڑے سے عمل کو بھی قبول کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کھانے میں احتیاط کرنے والوں اور پاکیزہ کی تلاش کرنے والوں کی تعریف کی کہ وُہ اصحابِ ہدایت توحید اور رشد و رحمت والے ہیں۔ فرمایا:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى وَ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا۔[۱]

(وُہ کئی جوان ہیں کہ یقین لائے اپنے رب پر، اور زیادہ دی ہم نے ان کو ہدایت، اور گرہ دی ان کے دلوں پر جب وُہ کھڑے ہوئے، پھر بولے)

یعنی توحید کی گواہی دی۔ چنانچہ ان کا قیام بھی کھانے کے معاملہ میں خُوب تحقیق و احتیاط کا نتیجہ تھا اور انہوں نے اپنے میں سے ایک کو کہا:

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔

(اب بھیجو اپنے میں سے ایک، یہ روپیہ لے کر اپنا، اس شہر کو، پھر دیکھے کہ کونسا پاکیزہ تر کھانا ہے۔ سو لا دے تم کو اس

---

[۱] الکہف ۱۴ ۱۹

میں سے کھانا)

یعنی حلال ترین اور افضل ترین کھانا ہو وُہ لاؤ۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کھانے کا حکم دیا تو انہوں نے اپنے قاصد کو حلال کھانا تلاش کرنے کا حکم دیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اکلِ حلال کو اعمالِ صالحہ پر مقدم رکھا ہے۔ فرمایا:

كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ (کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے اور نیک عمل کرو)

تاکہ تقویٰ و پرہیزگاری حاصل ہو اور ایسا کر کے ہی اہل ایمان کا اتباع کیا جا سکتا ہے اور ان کی معیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ظالموں اور مجرموں کا اتباع کیا تو پھر انہی کے ساتھ حشر کیا۔ اس لیے ظالموں کا اتباع نہ کرنا۔

کھانا و فاقہ اللہ کی خاطر ہو

سالکین کی ریاضت اور مجاہدین کی راہ یہی ہے اور عارفین کا کھانا اوقات و تجربہ میں تقسیم نہیں ہوتا بلکہ جب وُہ کھاتے ہیں تو کمی کر کے کھاتے ہیں اور شکر کرتے ہیں اور جب اس کا دوسرا مقام و ظرف دیکھتے ہیں تو ایثار کرتے ہیں اور اگر فاقہ کرتے ہیں تو عمل کرتے اور صبر کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر والوں کے ہاں تشریف لاتے تو فرماتے:

"کیا کھانے کو کچھ چیز ہے؟"

اگر جواب "ہاں" ہوتا تو کھا لیتے اور اگر جواب "نہیں" ملتا تو فرماتے:

"میں روزے سے ہوں۔" اور اگر کھانے کے لیے پیش کیا جاتا تو فرماتے:

"میرا روزے کا ارادہ تھا مگر پھر کھا لیتے۔"

ایک روایت میں ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز باہر تشریف لائے تو فرمایا:

"میں روزے سے ہوں۔" اور پھر اندر آئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

"ہمیں حیس (کھجور، گھی، ستو سے بنا ہوا کھانا) ہدیہ میں آیا ہے۔" تو آپؐ نے فرمایا:

"میرا روزے کا ارادہ تھا مگر اب لاؤ۔" آپؐ اور اللہ کے درمیان روزے اور افطار کی ایک علامت تھی۔ یعنی موجود ہوتا تو افطار کر لیتے اور یہی مراد تھی اور اگر نہ ہوتا تو روزہ رکھ لیتے اور یہ بھی مراد تھی۔ عارفین کے قلبی تغیرات اسی طرح ہوتے ہیں۔ (جیسے اللہ تعالیٰ نے رکھا۔ اس کو اپنا مقصود و فرحت سمجھا) اسی فانوس سے اصحابِ مشاہدہ کو نورِ بصارت ملتا ہے اور وُہ کسی ایک حال پر بھروسہ نہیں کر بیٹھتے اور نہ ہی ایک مقام پر توقف کر کے رہ جاتے ہیں اور یہ تین صفت تین باتوں کے ذریعہ ہی درست ہوتی ہیں۔

۱۔ خواہش و ہوٰی نہ رہے اور نفس کو عادت کر لینے سے بچائے۔
۲۔ جیسے یہ روزے میں نیت ہوتی ہے ویسے ہر کھانے میں نیت ہو اور اس کا کھانا بھی اللہ کی خاطر ہو۔ اب اس کا کھانا اور روزہ برابر ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ دونوں میں ایک ہی عمل ہوگا۔
۳۔ تمام اعضاء کو خوب نگرانی رکھ کر گناہوں سے بچائے۔ یہی آدمی روزے دار ہوگا اور یہی بات اس پر فرض اور اس کے لیے باعثِ فضیلت ہے یعنی آنکھ، کان، زبان، دل، ہاتھ اور پاؤں کی حفاظت کرے۔ اگرچہ پیٹ اور شرمگاہ سے یہ حالت افطار میں ہے اور یہ آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب اور زیادہ رسائی و حفاظت والا ہے اس شخص سے جو پیٹ اور شرم گاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہے مگر ان مندرجہ بالا اعضاء کی حفاظت نہیں کرتا۔ اگر روزہ کی حالت میں صبح نہ کرے پھر ان تین اوصاف میں سے کسی ایک میں ملوث ہو کر روزہ کھولے تو اس پر مخفی شہوت کا خطرہ ہے جس کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے۔

مروی ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"مجھے تم پر سب سے زیادہ ریاء اور مخفی شہوت کا ڈر ہے۔" تو فرمایا:
"تم میں سے ایک آدمی روزہ کی حالت میں صبح کرے۔ پھر اس کے سامنے کھانا پیش کیا جائے تو اسے اشتہاء پیدا ہو اور اس کی وجہ سے افطار کرے۔" اب جو اللہ کی خاطر روزہ کی نیت کرے اسے چاہیے کہ وہ روزہ مکمل کرے اگر غیر اللہ کی خاطر روزہ توڑ دیا تو اسے قلبی سزاؤں میں سے کوئی سزا ملے گی یا طرق آخرت میں کسی عضو کی سزا ملے گی۔ یہ سزا ترکِ فضائل پر ہوگی۔"

ایک روایت میں ہے:
"عالم کی نیند عبادت ہے۔ اس کا سانس لینا تسبیح ہے۔"
حضرت بشر بن حارث کے سامنے کسی نے ذکر کیا: "فلاں دولت مند آدمی ہمیشہ روزہ رکھتا ہے۔" فرمایا: "اس بے چارے نے اپنا حال چھوڑ دیا اور غیر کے حال میں داخل ہو گیا۔ اس کا حال یہ تھا کہ بھوکوں کو کھلاتا، ننگوں کو پہناتا اور محتاجوں کی غمگساری کرتا۔ اس کے لیے یہ کام صیام وغیرہ سے افضل ہے۔" پھر حضرت بشر نے فرمایا:
"دولتمند کی عبادت بھی کوڑے پر ایک باغیچے کی طرح ہے اور فقیر کی عبادت ایک حسین و جمیل گردن میں جواہرات کا ہار ہے۔"
ایک دن حضرت سفیان ثوری، ابو اسحٰق فزاری کے پاس تشریف لائے۔ انہوں نے حلوے کا ایک پیالہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا:

"اگر میرا روزہ نہ ہوتا تو میں آپ کے ہمراہ کھاتا۔"

حضرت فزاری نے فرمایا:

"میرے پاس آپ کے بھائی ابراہیم بن ادھم تشریف لائے۔ جہاں آپ بیٹھے ہیں یہیں بیٹھے۔ میں نے اسی پیالے میں ان کے سامنے حلوا پیش کیا۔ انھوں نے کھایا۔ جب واپس چلے گئے تو فرمایا:

"میرا روزہ تھا، مگر میں نے یہ پسند کیا کہ تیرے ساتھ کھا کر تجھے خوش کروں۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت نوری نے پیالے میں ہاتھ ڈالا اور کھانے لگے اور حضرت ابراہیم کے طریق کو اپنایا۔

بتاتے ہیں کہ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا:

"آپ کی ابتداء کیسے ہوئی؟"

انہوں نے کئی طرح کی ریاضتیں بتائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ایک عرصہ تک بیری کے پتے کھاتے رہے ایک یہ تھی کہ وہ تین برس تک باریک تنکے کھاتے رہے۔ پھر بتایا کہ میں نے تین برس میں تین درہم خرچ کیے۔

پوچھا گیا: "وہ کیسے؟"

فرمایا: "میں ہر سال دو دانق کی کھجوریں اور چار دانق کا لباس خرید لیتا۔ انہیں کوٹ کر ملا کر تین سو ساٹھ حصے بنا لیتا اور ہر حصہ پر رات کو افطار کرتا۔"

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے کہا:

"اب اس وقت آپ کس حال پر ہیں؟"

فرمایا: "اب نہ کھانے کی حد ہے اور نہ وقفہ کی مدت۔"

حضرت معروف کرخی کے پاس عمدہ اشیاء ہدیہ میں آتیں تو آپ کھاتے۔ ایک آدمی نے کہا:

"آپ کے بھائی بشر یہ نہیں کھاتے۔"

فرمایا: "میرے بھائی بشر کو تقویٰ نے روک رکھا ہے اور مجھے معرفت نے انبساط بخشا ہے۔"

پھر فرمایا:

"میں اپنے آقا کے گھر مہمان ہوں، جب کھلاتا ہے، کھا لیتا ہوں اور جب بھوکا رکھتا ہے تو صبر کرتا ہوں مجھے اعتراض و انتخاب کا کوئی حق نہیں۔"

حضرت بشر حافی کے ایک بھائی بتاتے ہیں کہ میں ان کے پاس گیا تو وہ کھا رہے تھے۔

مجھے فرمایا: "کھاؤ۔"

میں نے عرض کیا: "میرا روزہ ہے۔" انہوں نے مجھے ایک ٹکڑا دیا اور فرمایا: "کھاؤ۔"

میں نے کھا لیا۔ فرمایا:

"تو روزے کی آفت (ابتلا) سے بچ گیا" اور مجھ پر خوشی آئی۔

ایک روز حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ کا روزہ تھا۔ حضرت فتح موصلیؒ ان کے پاس تشریف لائے۔ حضرت حسین مغازلیؒ بتاتے ہیں کہ انہوں نے مجھے مٹھی بھر درہم دیے اور فرمایا:

"جو عمدہ کھانا ملے وُہ لے آؤ اور جو عمدہ شیرینی ملے وُہ بھی لے آؤ اور جو عمدہ خوشبو ملے وُہ بھی لے آؤ۔"

راوی بتاتے ہیں کہ انہوں نے مجھے کبھی ایسا حکم نہ دیا تھا۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ ان کے سامنے کھانا چن دیا وہ اُن کے ہمراہ کھانے لگے اور میں نے انہیں ان کے سوا کسی کے ہمراہ کھاتے نہیں دیکھا۔

گروہِ صوفیاء میں سے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جب تیرا مالک کریم تجھے کچھ مال دے تو اس نے تجھے خواہش دی کہ جو چاہو خرید لو اور اگر وُہ تمہیں کچھ کھانے کی مقرر چیز دے تو اسے ہی کھا لو اور اس کے علاوہ دُوسری کو پسند نہ کرو۔"

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے اپنے ایک بھائی کو کچھ دراہم دیے اور فرمایا،

"ان سے ہمارے لیے مکھن، شہد اور حوارانی روٹی خرید لاؤ۔"

میں نے عرض کیا،

"اے ابو اسحٰق، کیا ان سب کی خرید لاؤں؟"

فرمایا: "تیرا ناس ہو، جب ملے گا تو مردوں کی طرح کھائیں گے اور جب نہیں ملے گا تو مردوں کی طرح صبر کریں گے۔"

ایک روز بہت سا کھانا تیار کیا اور کچھ لوگوں کو دعوت پر بلایا جن میں حضرت ثوریؒ اور اوزاعیؒ بھی تھے۔ کسی نے کہا:

"کیا تمہیں اسراف کا ڈر نہیں؟"

فرمایا: "کھانے میں اسراف نہیں ہوتا۔ اسراف تو سامانِ خانہ اور لباس میں ہوتا ہے۔" سلف کی سیرت سے یہی مروی ہے کہ کھانوں میں فراخی کرتے، لباس اور کپڑوں میں کمی کرتے۔

ایک روایت میں ہے:

ایک آدمی نے کھانا تیار کیا اور اپنے ایک بھائی کو بلایا۔ اس نے کہا:

"میرا روزہ ہے۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

"تیرے بھائی نے تیرے لیے کھانا تیار کیا اور تُو نے نہیں کھایا؟ تُو نے افطار کیوں نہ کر لیا اور اس کی

بجائے کسی دُوسرے موقع پر روزہ رکھ لیا ہوتا؛

ایک عالم صنعاء میں قاضی تھے۔ وُہ صنعاء کے حاکم کے پاس گئے تو کھانے کا وقت آگیا انہیں کھانے کی دعوت دی گئی تو کہا:

"میرا روزہ ہے۔"

حاکم کھانے لگا اور ان سے باتیں بھی کررہا تھا۔ اچانک قاضی صاحبؒ نے دیکھا کہ اُونٹ کا بُھنا ہُوا گوشت لائے ہیں تو قاضی صاحبؒ بھی دسترخوان کے قریب ہُوئے اور ہاتھ بڑھا کر کھانے لگے۔

حاکم نے کہا:

"آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ میرا روزہ ہے؟"

فرمایا: "میرے لیے ایک روزہ کی قضاء ادا کرنا اس اُونٹ کے قضاء پُوری کرنے سے زیادہ آسان ہے۔"

حضرت سلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"جو تکلف نہ کرے اس کے لیے شہوات کچھ مضر نہیں۔ البتہ جو ان پر حریص ہو اس کے لیے بہ ضرر رساں ہیں۔"

وہ اپنے اصحاب کو جمع کر کے عمدہ عمدہ چیزیں ان کے سامنے رکھتے۔ وُہ کہتے:

"آپ ہمیں ان سے منع کرتے ہیں اور پھر آپ ہی یہ پیش کرتے ہیں؟"

فرمایا: "میں جانتا ہُوں تم انہیں چاہتے ہو۔ اب تم میرے پاس بہتر چیز (حلال مال) کھاؤ گے اور اگر میرے پاس زاہد آدمی آئے تو میں نمک سے زیادہ اس کے سامنے کچھ اضافہ نہ کروں۔"

فرمایا کرتے:

"حلال و عمدہ چیزیں کھانا، اللہ کی رضا کا باعث ہے۔"

بعض خلفاء کا قول ہے:

"برف سے سرد کیا ہُوا پانی پینا، اللہ تعالیٰ کے شکر میں اخلاص پیدا کرنا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ولی کی طرف وحی فرمائی:

"میری خاطر لطفِ فطانت اور مخفی لطف حاصل کر، میں اسے پسند کرتا ہُوں۔"

انہوں نے عرض کیا: "اے پروردگار! لطفِ فطانت کیا ہے؟"

فرمایا: "جب تیرے اوپر مکھی گرے تو جان لے کہ میں نے اسے گرایا۔ اب مجھ سے ہی اس کے اٹھانے کے لیے دُعا کر۔"

عرض کیا: "اور مخفی لطف کیا ہے؟"

فرمایا: "جب تیرے پاس گھن لگا ہوا لوبیا آئے تو جان لے کہ میں نے اس کے ذریعہ تجھے یاد کیا۔ اب اس پر تو میرا شکر ادا کر۔"

اللہ تعالیٰ نے ایک نبی علیہ السلام کو وحی فرمائی:

"ہدیہ کی کمی کی طرف نہ دیکھ۔ ہدیہ دینے والے کی عظمت پر نظر رکھ اور گناہ کے چھوٹا ہونے کو نہ دیکھ بلکہ کبریا تعالیٰ کی طرف دیکھ، جس کے سامنے تو نے یہ کام کیا۔ جب تجھے فقر و تکلیف آئے تو میری مخلوق کے پاس میری شکایت نہ کر جیسے کہ تیرے گناہ اوپر چڑھتے ہیں تو میں اپنے فرشتوں کے پاس تیری شکایت نہیں کرتا۔"

فصل ۴۰

کھانے کی
سنن و آداب اور کراہت و استحباب

کھانا کھلانے کے فضائل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ۔[1]

(اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں روزی دی اور اللہ کا شکر)

اس میں شکر کرنے پر کھانے کے حکم کو مقدم کر کے ذکر کیا اور فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (اے ایمان والو اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقہ سے نہ کھاؤ)

یہاں پر قتلِ جان سے پہلے حرام کھانے کی ممانعت فرمائی اس لیے کہ حلال کھانا بہت ہی فضیلت کی بات ہے اور حرام اور باطل طریق سے کھانا بہت بڑا جرم ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انسان کو اجر ملتا ہے، حتیٰ کہ جو لقمہ وہ اٹھا کر اپنے منہ میں یا اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے اس میں بھی اجر ملتا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"ایک مسلمان جو اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہے وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

"ایمان کیا ہے؟"

فرمایا، "کھانا کھلانا اور سلام دینا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"کفارات اور درجات میں کھانا کھلانا اور رات کو نماز پڑھنا جبکہ لوگ سوتے ہوں۔"

---

[1] البقرہ ۱۷۲

آپؐ سے حج مبرور کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"کھانا کھلانا اور نرم کلامی"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے ،

"آدمی کا شرف یہ ہے کہ سفر میں اس کا زادِ راہ عمدہ ہو اور اپنے ساتھیوں پر اسے خرچ کرے"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ۔ فرمایا:

"مجھے ایک گردن (غلام) آزاد کرنے کے مقابلہ میں یہ زیادہ محبوب ہے کہ ایک صاع کھانے پر اپنے بھائیوں کو جمع کروں"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب کھانا رکھا جائے اور نماز کھڑی ہو جائے تو نماز پڑھنے سے پہلے کھانا شروع کر دو"

بتاتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ بسا اوقات اقامت اور امام کی قرأت سنتے ہوتے مگر کھانے سے نہ اُٹھتے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ، فرمایا ؛

"افضل ترین کھانا وہ ہے جس پر کثرت سے ہاتھ پڑیں"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے کہ کھانوں پر ثرید کو حاصل ہے"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ،

"کھانے سے پہلے وضو کرنا ، فقر کو ختم کرنا ہے اور اس کے بعد لمم (چھوٹے گناہوں) کو دُور کرنا اور بصارت کو درست کرنا ہے ۔" یعنی اس کی وجہ سے ہاتھ بھی دُھلتے ہیں ۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ؛

"اللہ تعالیٰ نے حلال و عمدہ کھانے کو عمل پر مقدم فرمایا"

چنانچہ فرمان ہے ،

كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ (کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے اور عمل کرو نیک)

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے تھے ،

"جو کھانے کے آداب نہیں بجا لاتا وہ عمل کے آداب بھی بجا نہیں لاتا"

فرمایا : "جو آدمی کھانے میں تصنع کرتا ہے ۔ وہ عمل میں بھی تصنع کرتا ہے ۔"

ایک بار فرمایا ، "جو کھانے میں فریب دیتا ہے وہ نماز میں بھی فریب دیتا ہے ۔"

بعض سلف رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

"میں چاہتا ہوں کہ ہر چیز میں میری ایک نیت (صالحہ) ہو۔ حتیٰ کہ کھانے اور نیند کرنے میں بھی نیت ہو۔"

سلف صالحین کا طریقہ تھا کہ جیسے فاقہ میں ان کی ایک نیت صالحہ ہوتی۔ اسی طرح کھانے میں بھی ایک نیتِ صالحہ ہوتی ہے اور جو آدمی اخروی نیت کے بغیر عادت یا شہوت و مزے کی خاطر کھاتا ہے وہ آدمی آخرت کے بغیر عادت و شہوت یا دنیا کے رکھانے کی خاطر فاقہ کرتا ہے۔ یہ بھی نفسانی دقیق آفات میں سے ہے۔ اچھا وہی ہے جو آخرت کی نیت سے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر کھائے جیسے کہ وہ اچھا ہے جو آخرت کی نیت سے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر فاقہ کرتا ہے ورنہ یہ ابوابِ دنیا میں سے ہوگا۔ الغرض کھانے میں ایک سو ستر خصائل ہیں جو فرض و سنت، ادب و فضیلت، مستحب و مکروہ اور مروت و شجاعت وغیرہ طریقہ ہائے سلف و صنائع عرب سے ہیں۔

حلال غذاء اور اس کے آداب غذاء میں سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ حلال خوراک ہو اور حلال کی تین علامات ہیں:

۱۔ کھانا ایک معروف چیز ہو۔ اس میں کسی ایسی چیز کا اختلاط نہ ہو کہ جو ظلم یا خیانت کی چیز ہو۔

۲۔ اس کا سبب مباح ہو اور کسی شرعی طور پر ممنوع ذریعہ سے کھانا نہ آیا ہو۔ خواہشِ نفس یا دین و دنیا میں کسی مداہنت کے عوض کھانا نہ ملا ہو۔

۳۔ احکام سنت کی مطابقت کا خیال رکھا ہو اور کسی مکروہ طریقہ پر حاصل نہ ہو۔ پھر کھاتے وقت نیکی، تقویٰ اور عبادتِ الٰہی پر قوت حاصل کرنے کی نیت کرے اور یہ یقین رکھے کہ یہ کھانا، صرف منعم تعالیٰ نے ہی عطا کیا ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس پر اللہ کے شکر کرنے کو لازم سمجھے۔ زیادہ پر کمی کو ترجیح دے۔ حرص پر قناعت کو اور لالچ پر ادب کو ترجیح دے۔ مستحب یہ ہے کہ شروع میں ہاتھ دھوئے اور بعد میں بھی ہاتھ دھولے، تاکہ نظافت حاصل ہو۔ شروع کرتے وقت بسم اللہ الخ پڑھے اور آخر میں الحمد الخ پڑھے دائیں ہاتھ سے کھائے۔ نمک سے ابتدا کرے اور اس پر ختم کرے۔ کھانے کی مذمت نہ کرے اور نہ عیب دھرے۔ اگر اچھا لگے تو کھالے ورنہ چھوڑ دے۔ کھانے پر قناعت ایک حصہ ہے۔ موجود پر راضی رہنا روزی ہے اور بہتر یہ ہے کہ کھانے پر بکثرت ہاتھ ہوں۔ (یعنی زیادہ لوگ مل کر کھائیں)

ایک روایت میں ہے:

"اپنے کھانے پر جمع ہو جاؤ۔ اس میں تمہارے لیے برکت ہوگی۔" لقمہ چھوٹا توڑے۔ خوب چبا کر رکھے۔ کھانے والوں کے چہرے کی طرف نہ دیکھے۔ ان کے سامنے سے نہ کھائے بلکہ اپنے سامنے سے کھائے۔ بائیں ٹانگ پر بیٹھے اور دائیں کھڑی کرے۔ سہارا لگا کر اور لیٹے ہوئے نہ کھائے اور کھانے میں پہل نہ کرے بلکہ میزبان

اور بڑا آدمی پھر اس سے چھوٹا کھانا شروع کرے۔ ہاں اگر یہ امام ہو اور اس کی اقتدا کی جاتی ہو یا جب تک یہ نہ کھائے، لوگوں میں انقباض رہتا ہو تو ابتدا کر کے انہیں فرحت بخشے۔ ایک ہی طشتری میں کھجوریں اور ان کی گٹھلیاں نہ ڈالے اور ایک ہی ہتھیلی میں یہ دونوں جمع نہ کرے اور گٹھلی منہ سے نکال کر ہتھیلی کی پشت پر رکھے۔ پھر اسی طرح اسے پھینک دے اور اسی طرح جو اسی قسم کی زاید پھینک دینے کے لیے قابل چیز ہو اسے اسی طرح رکھ کر پھینکے۔ مستحب یہ ہے کہ وتر عدد میں سات یا گیارہ یا اکیس کھجوریں کھائے۔ اگر تر کھجور مل جائے تو اسی پر افطار کرے ورنہ تمر (خشک کھجور) پر افطار کرے۔ اور اگر یہ بھی نہ ملے تو پانی سے افطار کرے۔

حضرت وھب بن منبہؒ فرمایا کرتے تھے:

"روزہ دار کی نگاہ دھندلی سی ہو جاتی ہے۔ جب وہ شیریں چیز سے افطار کرتا ہے تو بینائی واپس آجاتی ہے"۔

اور اگر لوگوں کے ہمراہ کھا رہا ہو تو دو کھجوریں ملا کر نہ کھائے۔ ہاں اگر دوسرے لوگ بھی ایسا کریں یا ان سے اجازت لے تو کھائے۔ بھوک کے بعد کھائے۔ اور تہائی پیٹ یا نصف پیٹ بھرتے ہی ہاتھ اٹھالے۔ سلف صالحینؒ کا یہی طریقہ رہا ہے اور بدن کے لیے یہی باعثِ صحت بھی ہے۔

ایک طبیب کا قول ہے:

"وہ یہ ہے کہ تو اس وقت ہی کھائے جب تجھے اشتہاء پیدا ہو اور ابھی اشتہاء باقی ہو تو ہاتھ اٹھالے"۔

روایت میں ہے:

"ہر مرض کی جڑ بردہ ہے"۔ یعنی بدہضمی ہر مرض کی جڑ ہے۔

حکماء کے واقعات میں آتا ہے کہ ارسطو کے ایک خادم نے ایک حبشی سپاہی آدمی سے ایک ضرورت کے سلسلہ میں مدد چاہی۔ اس نے مدد نہ دی۔

اس نے کہا: "شاید تجھے ارسطو کی ضرورت پڑے"۔

اس نے کہا: "مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔

خادم نے ارسطو کو بتایا تو اس نے کہا:

"اگر وہ بھوک لگنے کے بعد کھاتا ہے اور سیر ہونے سے پہلے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور اس کے دربان کم خوری رکھتا ہے تو اس نے سچ کہا۔ اسے ہماری ضرورت نہیں"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی حکم دیا۔ فرمایا:

"ابن آدم نے پیٹ سے زیادہ برا برتن نہیں بھرا ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں کہ کمر سیدھی کر سکے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو ایک تہائی کھانا، ایک تہائی پینا اور ایک تہائی سانس لینا ہو، کھانا دراصل مرضِ بھوک کا علاج ہے۔

جب مرضِ بھوک آئے تو علاج کرے اور جب نہ ہو تو پھر کھانا ہی مرض ہے۔ اس لیے کہ کھانے کے باعث بھی اسی طرح تکلیف ہوتی ہے جیسے کہ بھوک سے ہوتی ہے بلکہ گاہے کھانے کی تکلیف زیادہ شدید ہوتی ہے۔

سامنے سے کھائے۔ ہاں پھل میں اجازت ہے کہ اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا ہے۔ تین انگلیوں کے ساتھ کھائے البتہ ثرید میں اجازت ہے کہ تمام انگلیاں استعمال کرے۔ کھانے کے درمیان میں سے اور پیالے کی چوٹی پر سے نہ کھائے۔ کھانا کھاتے وقت بالکل خاموشی اختیار نہ کرے۔ یہ عجمی لوگوں کا طریقہ ہے بلکہ اچھی باتیں کیا کرے گوشت کو چھری سے نہ کاٹے۔ اس کی ممانعت ہے۔ فرمایا:

"بلکہ اسے دانتوں سے کاٹ لے۔ روٹی کو بھی چھری سے نہ کاٹے اور روٹی کو گولائی سے کھاتا رہے ہاں اگر روٹی کم ہو اور کھانے والے زیادہ ہوں تو اجازت ہے کہ روٹی کے ٹکڑے کرکے بانٹ لیے جائیں۔ اور اپنے بھائی سے زیادہ سوالات نہ کرے اس سے اس پر گرانی ہوگی۔ بسا اوقات وہ کھانا ہی چھوڑ دے گا اور یہ مناسب ہے کہ اپنے بھائی کو بار بار کہے، کھاؤ، کھاؤ۔ اور نہ ایسا کرے کہ اسے کہا"

ایک ادیب کا قول ہے:

"اور جو اپنے بھائی سے باتوں کی گرانی دکثرتِ کلام دور کردے اور ایسا کھانا نہ چھوڑے کہ جس کو وہ چاہتا ہے تاکہ دوسرا اس پر نظریں جمائے۔ یہ تصنع ہے اگر اس کھانے کا اپنے بھائیوں پر ایثار کیا یا کسی بھائی کے سامنے خود پیش کیا تو بہتر ہے تنہائی میں مقدار کھانے سے نہ بڑھے۔ اور اگر جماعت کی موافقت کرتے ہوئے یا ان کے ساتھ کھانے کی فضیلت کی نیت سے کچھ زیادہ کھالے تو کچھ حرج نہیں۔

کھانے کے دوران پانی پینا، طب کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔ بشرطیکہ پانی سے اندازہ کرے اور زیادہ مقدار میں پانی نہ پئے۔ بتاتے ہیں کہ پانی معدہ کو دھوتا اور درست کرتا ہے۔ سہارا لگا کر پانی پینا طبی طور پر بھی معدہ کے لیے نقصان دہ ہے۔ سہارا لگا کر یا سوتے ہوئے کھانا کھانا مسنون نہیں ہے۔ ہاں البتہ چند دانے کھالے یا ایسی چیز مختصر سی چیز کھالے تو اجازت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ لیٹے ہوئے ڈھال پر خشک روٹی کھا رہے تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ پیٹ کے بل لیٹے ہوئے اور عرب لوگ ایسا کرتے ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"کھانے کو ناپ تو اس میں تمہارے لیے برکت ہوگی اور آٹا خوب گوندھو یہ بہت ہی بابرکت بات ہے۔"

اگر کھانا بچ جائے تو اسے پیالے میں بمعہ تلچھٹ کے واپس نہ ڈالے کر پھر دُوسرا کھائے اور ہاتھ آئے تو اسے کھالے ورنہ تلچھٹ سمیت چھوڑ دے اور ہم بے تحاشا سرکہ نہیں کھاتے کہ گوشت سے پہلے سرکہ سے پیٹ بھر لیں۔

اور بتاتے ہیں کہ :

"جس دسترخوان پر سبزی ہو وہاں فرشتے آتے ہیں"

ایک روایت میں ہے، کہ بنی اسرائیل پر آسمان سے جو دسترخوان اترا تھا اس میں ہر طرح کی سبزیاں تھیں سوائے گندنے کے۔ اور اس میں ایک مچھلی تھی جس کے سرے پر سرکہ اور دُم کی طرف دو زیتون اور ایک دانہ انار تھا" یہ کھانا مل جائے تو خُوب تر ہے ورنہ جیسے ایک ادیب کا قول ہے اس پر عمل کرے :

"جب تونے اپنے بھائیوں کی دعوت دی تو ان کے سامنے حضرمی اور بورانی روٹی پیش کرو۔ اگر انہیں ٹھنڈا پانی پلا دیا تو تُو نے ضیافت مکمل کر دی۔"

کھانے وکھلانے کے آداب

ایک امیر نے بعض احباب کو دعوت دی اور دو سو درہم خرچ کیا۔ ایک حکیم نے اس سے کہا :

"تجھے اس قدر سب کی ضرورت نہ تھی۔ جب روٹی عمدہ ہو۔ سرکہ کھٹا ہو اور پانی ٹھنڈا ہو تو یہ کافی ہے۔"

ایک حکیم کا قول ہے :

"کھانے کے بعد شیرینی کھانا، کھانوں کی کثرتِ تعداد سے بہتر ہے اور دسترخوان پر ٹھہرنا دو طرح کے کھانوں کے اضافہ کرنے سے بہتر ہے۔"

ایک دوسرے حکیم فرماتے ہیں :

"کھانے پر ٹھنڈا پانی پینا، زیادہ کھانوں سے بہتر ہے۔"

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا :

"عمدہ چیزیں کھانا، خدا کی رضا کا باعث ہے۔"

مامون رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

"برف سے ٹھنڈا پانی کر کے پینا اللہ تعالیٰ کے شکر میں خلوص کا باعث ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ اسے چاہیے کہ وُہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔"

اکرامِ مہمان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے لیے جلدی سے کھانا تیار کرے۔ ان کے سامنے جو پیش کیا جاتا ہے اس میں گوشت سب سے بہتر ہے۔ اس فرمانِ الٰہی میں یہ تمام مفاہیم جمع ہیں :

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ [۱] (کیا پہنچی ہے تم کو بات ابراہیم کے مہمان کی جو عزت والے تھے)

مکرمین میں دو قول ہیں؛

۱۔ اپنے بھائی کے سامنے خود کھانا رکھے اور اس کی خدمت خود کرے۔

۲۔ مہمان کے لیے جلدی سے کھانا تیار کرے۔

فرمایا،

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ۔

یعنی دیر نہیں کی اور حنیذ کا معنی ہے "پکا ہوا"

اور فرمایا،

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ۔ (پھر دوڑا اپنے گھر کو تو لایا ایک بچھڑا گھی میں تلا)

ارغان کا معنی ہے جلدی سے جانا۔ اور ایک قول میں "پوشیدہ طور پر جانا" ہے۔

بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام گوشت کی ران لے آئے اسے عجل کہا گیا۔ اس لیے کہ آپؐ نے جلدی کی اور دیر نہیں فرمائی۔

پھر بتایا کہ یہ سمین یعنی پکی ہوئی تھی۔ کہا کرتے ہیں،

حنیذ اور محنوذ۔ یعنی پکا ہوا۔

عمدہ کھانوں کے بارے میں فرمایا،

وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى۔ (اور ہم نے تم پر اتارا من وسلویٰ)

المن کا معنی شہد اور السلویٰ کا معنی گوشت ہے۔ اسے سلویٰ اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ تمام دوسرے سالنوں سے تسکین دیتی ہے۔ یعنی اس کی وجہ سے باقی سب سالنوں سے استغناء ہو جاتا ہے اور دوسرا کوئی سالن اس کا قائم مقام نہیں۔

پھر فرمایا،

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ (کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں روزی دی)

یعنی گوشت اور شیرینی عمدہ کھانوں میں سے ہے۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے میزبان بھائی کے گھر میں بھی بے تکلف ہو کر کھائے جیسے کہ اپنے گھر میں

---

[۱] الذٰریٰت ۲۴

کھاتا ہے اور تصنع نہ کرے۔ اس لیے کہ جس طرح باقی تمام اعمال نماز و روزہ میں ریاء و تصنع پایا جا سکتا ہے۔ کھانے میں بھی یہ ہوتا ہے اور کھانا بھی ایک عمل ہے۔ ہر عمل میں نیت و اخلاص کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس کی نیت یہ ہو کر کھا کر نیکی کی قوت حاصل کرتا ہو۔ اپنے بھائیوں کے ہمراہ کھاتے ہوئے یہ نیت ہو کر اپنے بھائیوں کا اکرام کرتا ہوں۔ ان کے لیے باعثِ فرحت ہوتا ہوں اور جماعت کی برکات حاصل کرتا ہوں۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جماعت، برکت ہے۔"

دعوت قبول کرنے میں سنت کو قائم رکھنے کی نیت کرے تاکہ اجر ملے اور اس سارے عمل میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر کاربند رہے۔ یہ سب ہی حسنِ اخلاق میں داخل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مفہوم میں داخل ہے:

"بندہ، حسنِ اخلاق کے ذریعہ روزہ دار اور قیام کرنے والے کا سا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔"

بعض کا فرمان ہے:

"یہ وہ آدمی ہے کہ جو اپنے بھائیوں سے درخواست کرے کہ دن کو اس کے ہمراہ افطار کر دیا رات کو سحری اس کے ہاں کھاؤ اور اس کی عادت روزہ و قیام کی ہو۔ چنانچہ وہ ان کے اخلاق پر چل کر ان کی مساعدت کرے۔ اور حسنِ اخلاق روزہ دار و شب بیدار کا درجہ حاصل کرلے۔"

بعض اہلِ ادب علماء کا فرمان ہے:

"یہ کوئی سنت یا مروت کی بات نہیں کہ انسان کے بھائی اسی سے ملنے آئیں اور یہ ان سے اعراض کر کے نفلی نماز میں مشغول ہو جائے۔ یا اس کے بھائی اس کو بلائیں اور اس کے سامنے کھانا رکھیں اور یہ نفلی روزوں کی وجہ سے ان کے ہمراہ نہ کھائے اور مطلوب کھانے میں کمی نہ کرے کہ ابھی ضرورت ہو اور کھانا چھوڑ دے۔ یہ غیر محمود بات ہے اور نہ ہی اس پر اجر ہے۔ بشرطیکہ کوئی سبب مانع نہ ہو جائے۔

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مجھے محبوب ترین بھائی وہ ہے جو خوب کھائے اور بڑا نوالہ ڈالے اور گرانی کا باعث وہ ہے کہ جس کو بار بار کھاؤ، کھاؤ، کہنا پڑے۔"

فرماتے ہیں:

"آدمی کی محبت اس کے گھر میں عمدہ طریق پر کھانے سے معلوم ہو جاتی ہے۔" اور اگر فقراء کے ساتھ کھائے اور ان پر ایثار کرتے ہوئے کم کھائے یا کھانا کم ہونے کی وجہ سے ایسا کرے تو بہتر ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کو اور ان کے اصحاب کو کھانے کی دعوت دی۔ انہوں نے کم مقدار میں کھایا۔ جب کھانا اٹھا دیا گیا تو حضرت ثوریؒ نے انہیں فرمایا:

"آپ نے کم کھایا ہے۔"

حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا:

"اس لیے کہ آپ نے کم کھانا رکھا۔ ہم نے کھانے میں کمی کر دی۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے حضرت ثوریؒ اور ان کے اصحابؒ کو کھانے کی دعوت دی اور بڑی مقدار میں کھانا پیش کیا۔

اُنھوں نے کہا:

"اے ابو اسحٰق، ڈرتے نہیں، اس قدر میں اسراف نہیں ہو جائے گا؟"

حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا:

"کھانے میں اسراف نہیں ہوتا۔"

کھانے کے بعد کپڑے سے ہاتھ صاف کرنے سے پہلے اُنگلیاں چاٹ لے۔ کھانے کے بعد جو ٹکڑے گر جائیں انہیں اٹھا کر کھا لے۔

بتاتے ہیں کہ یہ حورعین کے مہر ہیں۔ بتاتے ہیں کہ جس نے پیالہ چاٹا اور اس کا پانی پی لیا اس کے لیے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ہے اور اگر حلال چیز کھائے تو بعد میں یہ دُعا پڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ وَ تُنَزَّلُ الْبَرَکَاتُ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَاَطْعِمْنَا طَیِّبًا وَ اسْتَعْمِلْنَا صَالِحًا۔

(سب حمد اللہ کی ہے جس کی نعمت سے اچھی باتیں مکمل ہوتی ہیں اور برکات نازل ہوتی ہیں۔ اے اللہ اپنے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر رحم فرما اور ہمیں حلال و عمدہ کھلا۔ ہمیں اچھے کام میں لگا)

اور خوب شکر ادا کرے۔

اور اگر مشتبہ چیز کھائے تو یہ دُعا پڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ عَلٰی آلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ لَا تَجْعَلْهُ قُوَّةً لَنَا عَلٰی مَعْصِیَتِكَ۔

(ہر حال میں اللہ کی تعریف ہے۔ اے اللہ ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر رحم فرما اور اس کھانے کو ہمارے لیے تیری نافرمانی

پرطاقت نہ بنا دے)

اور بہت ہی غم محسوس کرے، کثرت سے استغفار کرے۔

ایک روایت میں ہے:

"جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ قبول نہ کرے تو یہ مت کہو کہ خوب کھا، شاید اس نے حلال مال سے نہ لیا ہو بلکہ یوں دعا کرے:

اَطْعَمَكَ اللّٰهُ طَيِّبًا۔ (اللہ تعالیٰ تجھے حلال چیز کھلائے)

اور جب دودھ پیئے تو یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِكْ لَنَا فِيْمَا رَزَقْتَنَا خَيْرًا مِّنْهُ۔ (اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور جو تُو نے ہمیں روزی دی اس میں برکت عطا کر، اور اس سے بہتر روزی عطا فرما)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کہا کرتے، اس لیے کہ یہ دُوسری غذاؤں سے زیادہ نفع بخش ہے اور پہلے لقمہ پر یہ کہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ۔" اور دُوسرے لقمہ پر کہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ" اور تیسرے لقمہ پر یہ کہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔

اور پیالے کا پانی تین سانس لے کر پیئے۔ پہلے گھونٹ پر یہ کہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"۔ دُوسرے پر یہ کہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔ اور تیسرے میں یہ الفاظ بڑھا دے:

"الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"۔ اور اگر ہر لقمہ کے آغاز میں اللہ کا نام لے یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الخ پڑھے تو بہتر بات ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ الخ اور لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ الخ پڑھے اگر پھل بھی کھانا ہو تو کھانے سے پہلے کھائے۔ کتاب اللہ میں اسی ترتیب سے ذکر ہوا۔ فرمایا:

وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ[1] (اور میوہ، جو پسند چن لیں اور گوشت جانوروں کا جو چاہیں)

---

[1] الواقعہ ۲۰ - ۲۱

اپنے بھائیوں سے پہلے ہاتھ نہ اٹھائے۔ اس لیے کہ انہیں انبساط کی ضرورت ہے۔ یا ایسا کرنے کو وہ برا سمجھتے ہیں۔ اور اگر کم کھانے والا آدمی ہو تو تھوڑی دیر انتظار کرے۔ جب وہ کچھ کھانا کھا چکیں پھر شریک ہو اور آخر تک ان کے ساتھ کھاتا رہے اور اگر مہمان علماء ہوں اور پہلے چھوڑ دینے کو ناپسند کریں تو پھر کراہت نہیں۔ کئی ایک صحابہؓ نے یہ کیا ہے۔

بھائیوں کی ضیافت کے سلسلہ میں ایسا تکلف نہ کرے کہ اس کی قیمت اس پر گراں گزرے یا قرض لینا پڑے یا سخت جدوجہد سے کمائے۔ یا مشتبہ کھانا ہو اور موجود چیز کو ان سے الگ کر کے ذخیرہ بھی نہ کرے اور ان پر کسی دوسرے کو ترجیح دے کر کچھ چیز الگ نہ کرے اور اپنے اہل و عیال کو بھی ضرر نہ دے۔

بتاتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تین شرطوں پر دعوت قبول کرتا ہوں:

۱۔ تُو بازار سے کچھ نہیں لائے گا۔

۲۔ جو گھر میں ہے اسے ذخیرہ نہیں کرے گا۔

۳۔ اپنے اہل و عیال کو برباد نہ کرے گا۔"

سلف صالحین کا یہی طریقہ تھا کہ جب کسی بھائی کی دعوت کرتے تو جو حاضر ہوتا پیش کر دیتے یا ہر قسم سے کچھ کچھ پیش کر دیتے۔

ایک سخی امیر آدمی نے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ نانبائی کو بلایا اور کہا:

"تمہارے پاس جس جس قسم کی روٹی ہو لوگوں کو بتا دو۔ پھر انہیں کھانے کی اجازت دے دو۔" آخر کار جب وہ کھا چکے اور فارغ ہونے لگے تو وہ خود امیر آدمی نے گھٹنے ٹیک کر ہاتھ بڑھایا اور کھانے لگا اور کہا:

"اللہ تعالیٰ تم پر برکت فرمائے۔ میری مدد و مساعدت کرو۔" (یعنی مزید کھاؤ اور خوب کھاؤ)

سلفؒ اسے مستحسن قرار دیتے اور یہ بات مسنون نہیں ہے کہ ایک آدمی کھانے کے موقع پر کسی کی ملاقات کو جائے تاکہ کھاتے وقت سامنا ہو۔ یہ اچانک مہمان بننا ہے جس کی ممانعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ[1]

(مت جاؤ نبی کے گھروں میں، مگر جو تم کو اجازت دی جائے کھانے کے واسطے نہ راہ دیکھتے اس کے پکنے کی)

یعنی کھانا پکنے اور کھانے کے وقت کا دھیان رکھ کر نہ آیا کرو۔

---

[1] الاحزاب ۵۳

کھانے کے ارادہ سے جانا

ایک روایت میں ہے:
"جو کھانے کی طرف چلے اور اس کو اس کی دعوت نہ دی گئی ہو تو وُہ فاسق ہو کر چلا اور حرام کھایا۔" البتہ اگر اچانک قصد کے بغیر ملاقات ہُوئی اور وہ کھانا کھا رہے تھے۔ پھر انہوں نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی اور یہ جانتا ہے کہ انہیں اس سے محبت ہے پھر کھا لے اس میں کچھ حرج نہیں۔ اور یہ اچانک مہمان بننے میں داخل نہ ہوگا اور اگر اسے یہ علم نہیں کہ وہ اس کا ان کے ہمراہ کھانا پسند کرتے ہیں بلکہ ویسے ہی عزت افزائی اور حیاء کی وجہ سے کہہ دیا کہ کھائیے تو ان کے ہمراہ کھانا مکروہ ہے اور اگر بھوکا تھا، پھر کسی بھائی کی طرف چلا تاکہ اس سے کھانا کھائے۔ جب ملاقات ہُوئی تو وُہ کھا رہا تھا اور یہ کھانے کے وقت کو تاڑ کر نہیں آیا تو کھانے میں کچھ حرج نہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابوالہیثم بن تیہان اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہما کے گھر تشریف لے گئے تاکہ کھانا کھائیں۔ یہ فاقہ سے تھے اور وُہ کھا رہے تھے۔

سنت یہ ہے کہ میزبان اپنے مہمان کے ہمراہ گھر کے دروازے تک وداع کرنے کے لیے آئے اور یہ سنت نہیں کہ مہمان آدمی، گھر والوں سے اذن لیے بغیر ہی چل پڑے اور نہ ہی تین دن سے زیادہ مہمان بن کر ٹھہرنا سنت ہے کہ گھر والا اسے دھکے دے کر نکالے یا تنگ آ جائے۔

تکلف کی ممانعت

بعض کا فرمان ہے:
"جب تیرا ملاقات کا ارادہ ہو تو جو حاضر ہو پیش کر دے اور جب تو ملاقات کی دعوت دے تو کچھ باقی نہ چھوڑ سب سامنے رکھ دے۔"

ایک روایت میں ہے کہ ہم حضرت جابر بن عبداللہؓ کے پاس آئے۔ انہوں نے ہمارے سامنے روٹی اور سرکہ رکھا اور فرمایا:

"اگر ہمیں تکلف سے نہ روکا جاتا تو میں تمہاری خاطر تکلف کرتا۔"

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے کہ ان کے بھائی ان کے پاس آئے۔ انہوں نے جَو کا ایک ٹکڑا اور روٹی پیش کی اور جو سبزی وُہ بوتے تھے وُہ سامنے رکھی اور فرمایا:

"کھاؤ، اگر اللہ تعالیٰ تکلف کرنے والوں پر لعنت نہ کرتا تو میں تمہاری خاطر ضرور تکلف کرتا۔"

حضرت انس بن مالک اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے:
وُہ اپنے بھائیوں کے سامنے جو موجود ہوتا پیش کر دیتے۔ خشک ٹکڑے، اچھی اور معمولی کھجوریں جو ماحضر ہوتا سامنے رکھ دیتے اور فرماتے:

"ہم نہیں جانتے ان میں سے کس کا بوجھ زیادہ ہے۔ اس پر زیادہ بوجھ ہے جس کے سامنے پیش کیا جائے تو اسے حقیر سمجھتا ہے یا اس پر زیادہ بوجھ ہے کہ جو اس کے پاس ہے اسے پیش کرتے وقت حقیر جانتا ہے۔ اسی مفہوم میں ایک باسند روایت آتی ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور دُوسرے صحابہؓ کے پاس جو ہوتا وُہ اپنے بھائیوں کے سامنے رکھتے اور فرماتے:

"کھانے پر اجتماع کرنا، مکارمِ اخلاق سے ہے۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ پر جمع ہوتے اور چکھ کر افطار نہ کرتے اور جس کو دعوت دی جائے اس کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ دعوت دینے والے کو کسی مخصوص چیز کا پابند کرے۔ یہ بات قناعت سے نہیں۔ ہاں اگر دعوت دہندہ نے دو کھانوں میں ایک کا اختیار دیا تو اقرب و آسان تر کو اختیار کرے۔ یہی سنت ہے (تاکہ دعوت دہندہ پر بوجھ میں تخفیف ہو)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت ہے کہ:

"جس کو دو کاموں میں سے ایک کا اختیار دیا جائے وُہ آسان تر کو اختیار کرلے۔"

حضرت اعمشؒ نے ابو وائلؓ سے روایت کیا۔ فرمایا:

"میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ سلمانؓ کی ملاقات کے لیے گئے۔ انہوں نے ہمارے سامنے جَو کی روٹی اور پِسا ہُوا نمک رکھا۔

میرے ساتھی نے کہا: اگر اس نمک کے ہمراہ پودینہ بھی ہوتا تو خُوب ہوتا۔

حضرت سلمانؓ باہر تشریف لائے اور لوٹا رہن رکھ کر پودینہ خرید لائے۔ جب ہم کھا چکے تو میرے ساتھی نے کہا:

"اللہ کی حمد ہے جس نے ہمیں جو روزی دی اس پر قناعت عطا کی۔"

حضرت سلمانؓ نے فرمایا:

"اگر تو دی ہُوئی روزی پر قناعت کرتا تو لوٹا گروی پڑا نہ ہوتا۔"

مہمان کا اکرام اگر تیرا میزبان بھائی تجھ سے خُوب مانوس ہے اور فرمائش کرنا اسے خوش کرنا ہے تو پھر فرمائش کر دینے میں کچھ حرج نہیں۔ امام شافعیؒ نے زعفرانی رحمہا اللہ کے ساتھ ایسے ہی کیا۔ یہ بغداد میں اس کے پاس ٹھہرے ہُوئے تھے۔ جمعہ کے روز دونوں نماز کی طرف آتے تو زعفرانیؒ اپنی لونڈی کو ایک رقعہ لکھ دیتا کہ ایسے ایسے کھانے تیار کر دو۔

ایک روز امام شافعیؒ نے لونڈی کو بُلایا اور رقعہ دیکھا تو ایک پسندیدہ کھانے کا اضافہ کر دیا۔ جب زعفرانی آیا،

اور لونڈی نے ایک نیا کھانا دیکھا تو زعفرانی کو حیرت ہُوئی اس لیے کہ اس نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ لونڈی نے بتایا کہ شافعیؒ نے اس رقعہ میں یہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے کہا، "رقعہ دکھاؤ۔"

جب اس نے امام شافعیؒ کی تحریر رقعہ میں دیکھی تو بہت خوش و مسرور ہُوا اور کہا:

"تو اللہ تعالیٰ کی خاطر آزاد ہے۔"

امام شافعیؒ کے اس اضافے پر اس نے خوش ہو کر لونڈی کو آزاد کر دیا۔ بغداد کے مغربی حصہ میں باب الشعیر کے پاس درب الزعفرانی اسی کے نام سے مشہور ہے اور اگر میزبان خود ہی اس سے اپنے مرغوب کھانے کے بارے میں معلوم کرے تو پسندیدہ چیز کا ذکر کر دینے میں کچھ ہرج نہیں تاکہ وُہ اسی کو ترجیح دے اور اسے تیار کرے۔ اس کی فضیلت آئی ہے۔ ایک مشہور حدیث میں ہے:

"جس نے اپنے بھائی کی (جائز) خواہش کو پُورا کیا۔ اس کی بخشش ہوگئی اور جس نے اپنے مومن بھائی کو خوش کیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا۔"

حضرت ابن زبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے اپنے بھائی کو اس کی چاہت سے لذت یاب کیا (یعنی کوئی چاہت کی حلال چیز کھلا دی وغیرہ) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس لاکھ نیکیاں لکھے گا اس کے دس لاکھ گناہ معاف کر دے گا اور اس کے ایک ہزار درجات بلند کرے گا اور اللہ تعالیٰ اسے تین بہشتوں سے کھلائے گا۔ جنتِ فردوس، جنتِ عدن اور جنتِ خلد ہے۔"

کھانے کے بعد کی اچھی عادات بیان کرنا بھی ضروری ہیں۔ طشتری میں ہاتھ دھونے میں کچھ ہرج نہیں البتہ اس میں کھانسنا بے ادبی کی بات ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور ثابت بنانیؒ کھانے پر جمع ہُوئے۔ حضرت ثابتؒ کی طرف طشتری بڑھائی گئی تاکہ وُہ ہاتھ دھولیں۔ وُہ رُک گئے۔ حضرت انسؓ نے فرمایا:

"اگر تیرا بھائی تیرا اکرام کرے تو اس کی عزّت افزائی کو قبول کرلے اور ردّ نہ کر دے۔ اس لیے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کا اکرام کر رہا ہے۔"

ہارون الرشید نے ابُو معاویہ نابیناؒ کو کھانے پر بُلایا اور طشتری میں ان کے ہاتھوں پر پانی خود ڈالا۔ جب فارغ ہُوئے تو پُوچھا:

"اے ابو معاویہؒ، آپ جانتے ہیں، آپ کے ہاتھوں پر کس نے پانی ڈالا؟"

فرمایا: "نہیں۔"

کہا "امیرالمومنین نے "

فرمایا " اے امیرالمومنین ، تو نے علم کی عزت و تکریم کی۔ اللہ تعالیٰ تجھے عزت و اکرام بخشے گا۔ جیسے کہ تو نے علم کی عزت و تکریم کی ہے۔"

خادم کا کھڑے رہنا مکروہ سی بات ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر پانی ڈالے اور دو یا تین آدمیوں کا ہاتھ دھونے میں جمع ہونا اور ان کا مستعمل پانی یکبارگی طشتری میں جمع ہونا بہتر ہے اور یہ تواضع کی بات ہے۔

اور جو آدمی تنہا ہی ہاتھ دھوئے۔ اگر وہ طشتری میں کھانسی لے تو کچھ ہرج نہیں اور جس نے اس کے اٹھائے جانے کے بعد اور ہاتھ دھونے کے بعد اس میں تھوک لیا تو کچھ ہرج نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مختلف علاقوں کی طرف حکم لکھا :

"قوم کے سامنے سے طشت بھرا ہوا ہی رکھا جائے اور عجم سے نشانہ نہ کیا جائے۔" اور عجم کے ساتھ مشابہت نہ کرو۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے :

"ایک ہی طشتری میں ہاتھ دھو لیا کرو اور عجمی لوگوں کے طریقہ پر نہ چلو اور خلال کی وجہ سے جو دانتوں سے نکلے اسے مت نگلو۔ یہ مرض اور مکروہ چیز ہے۔ البتہ جو دانتوں سے لگا ہو اسے نگل لینے میں کچھ ہرج نہیں۔ خلال کے بعد کلی کر لے۔ اسی سلسلہ میں بعض اہل بیت کی طرف ایک روایت بھی ہے۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھے :

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ کَفَانَا وَ اٰوَانَا سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا یَا کَافِیْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ وَ لَا یَکْفِیْ مِنْہُ شَیْءٌ اَطْعَمْتَ مِنْ جُوْعٍ وَ اٰمَنْتَ مِنْ خَوْفٍ لَکَ الْحَمْدُ اٰوَیْتَ مِنْ یُتْمٍ وَ ھَدَیْتَ مِنْ ضَلَالَۃٍ وَ اَغْنَیْتَ مِنْ عَیْلَۃٍ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا کَثِیْرًا دَائِمًا طَیِّبًا نَافِعًا مُبَارَکًا فِیْہِ کَمَا اَنْتَ اَھْلُہٗ وَ مُسْتَحِقُّہٗ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَطْعِمْنَا طَیِّبًا وَ اسْتَعْمِلْنَا صَالِحًا اِجْعَلْہُ عَوْنًا لَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ وَ نَعُوْذُبِکَ اَنْ نَسْتَعِیْنَ

(سب حمد اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور ہمیں پلایا اور ہمیں کفایت بخشی اور ہمیں پناہ دی ہمارا سردار اور ہمارا کارساز، اسے ہر چیز سے کفایت کرنے والے، اور کوئی چیز اس سے کفایت نہیں کرتی، تو نے ہی بھوک میں کھلایا اور تو نے خوف میں امن دیا۔ تیری ہی حمد ہے۔ تو نے محتاجی میں پناہ دی اور تو نے گمراہی میں ہدایت بخشی اور تو نے احتیاج میں غنا بخشا۔ تیری ہی حمد ہے۔ بہت بہت ابدی، عمدہ پاک اور نفع بخش مبارک حمد ہے اس میں، جیسے کہ تو اس کا اہل و مستحق ہے۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر رحم فرما اور ہمیں عمدہ حلال کھلا اور نیک کام پر

بِهٖ عَلٰی مَعَاصِیْكَ۔ لگائے رکھ۔ اس (کھانے) کو ہمارے تیری اطاعت پر مددگار بنادے اور ہم پناہ مانگتے ہیں تیری، اس بات سے کہ ہم اس کو تیری نافرمانیوں پر مددگار بنائیں)

اجتماعی کھانے کی برکات

بھائیوں کے ساتھ مل کر کھانے میں تین فضائل ہیں۔ حضرت جعفر بن محمدؓ سے مروی ہے:

"جب تم دسترخوان پر اپنے بھائیوں کے ہمراہ بیٹھو تو یہ نشست طویل کرو۔ اس لیے کہ تمہاری عمروں میں یہ ایسی گھڑی ہے جس پر حساب نہ ہوگا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"فرشتے اس وقت تم میں سے ہر ایک پر رحم کی دعا کرتے ہیں۔ جب تک اس کے سامنے دسترخوان بچھا ہوا ہے حتیٰ کہ اسے اٹھا دیا جائے۔"

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

"ہر وہ خرچ جو آدمی اپنے آپ پر اور اپنے والدین پر خرچ کرتا ہے۔ اس کا حساب ہوگا۔ البتہ اگر آدمی اپنے بھائیوں کو دعوت پر بلائے تو اللہ تعالیٰ اس سے پرسش کرنے سے حیاء فرماتا ہے۔"

بعض علمائے خراسان سے مروی ہے کہ جب وہ اپنے بھائیوں کو دعوت دیتے تو ان کے سامنے ایک قفیز (ایک وسیع پیمانہ ہے) کے قریب طرح طرح کے کھانے، دانے اور پھل رکھتے۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت پہنچی ہے کہ جب بھائی (اہل اسلام) کھانے سے اپنے ہاتھ اٹھالیں (فارغ ہوجائیں) تو باقی بچے ہوئے کھانے پر حساب نہ ہوگا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے کثیر تعداد میں پیش کروں تاکہ اس کا بچا ہوا ہم کھایا کریں۔"

بعض سلفؒ سے ایک روایت ہے:

"بندہ اپنے بھائیوں کے ہمراہ جو کھاتا ہے اس پر محاسبہ نہیں ہوتا۔" چنانچہ بعض سلفؒ کا طریقہ تھا کہ جماعت میں مل کر زیادہ کھاتے اور تنہائی میں کم کھاتے۔

ایک روایت میں ہے:

"تین کا بندے پر محاسبہ نہیں ہوتا، سحری کھانے، جس سے افطار کرے اور بھائیوں کے ہمراہ کھانے پر۔" اور جس کی اس قدر زاید کھانا پیش کرنے میں کوئی نیتِ صالحہ نہ ہو۔ اس کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

وہ اس قدر پیش کرے جس قدر کھا لیا کرے اور چھوڑا نہ جائے۔ خود اور گھر والوں کو باقی ماندہ کھانے میں رجوع کی اجازت نہ دے ورنہ یہ کام ویسے ہوئے میں رجوع بن جائے گا اور نہ ہی تصنع اور فخر دکھانے کی خاطر سارا کھا لیا جائے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کھانا پیش کرنے والا کچھ حصہ ہی کھلانا چاہتا ہے تو تقویٰ یہ ہے کہ نہ کھائے۔ اس لیے کہ جب کھانا یوں پیش کیا جائے کہ اس کا کچھ حصہ کھایا جائے تو یہ تصنع ہے۔ اہل تقویٰ لوگ تصنع کے کام نہیں کیا کرتے اور نہ ہی متقی لوگ ایسا کھانا کھانے میں اس لیے کہ یہ متعین طور پر معلوم نہیں کہ کس قدر کھانا کھا لینا اسے پسند ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"ہمیں ایسے آدمی کی دعوت قبول کرنے سے منع کیا گیا، جو کھانے پر فخر و مباحات کرے"

صحابہؓ کی ایک جماعت نے مباہات کا کھانا ناپسند فرمایا ہے اور اس نیت کے ساتھ کھانا پیش کرنا بھی مکروہ ہے۔ اس لیے کہ اس نے تدلیس کی ہے اور یہ معلوم نہیں کہ کتنی مقدار کھانی ہے اور ایک ناپسندیدہ فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ مزید برآں یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر پیش کی گئی ہیں۔ اب اس کچھ حصہ میں رجوع بھی درست نہیں۔ جیسے ایک آدمی روٹی یا کچھ چیز لے کر نکلے تاکہ سائل کو دے۔ پھر دیکھے کہ سائل جا چکا ہے تو اسے کھانا اور اس میں رجوع کرنا مکروہ ہے بلکہ اسے الگ کر دے۔ جب دوسرا سائل ملے تو اسے دے دے۔

بعض محدثین کا طریقہ تھا کہ جب بھائیوں کے ساتھ مل کر کھاتے تو باقی کھانا الگ کر دیتے۔

حضرت سیار بن حاتمؒ جب دسترخوان پر آتے۔ چند نوالے کھاتے تو فرماتے:

"میرا حصہ الگ کر دو"

ایک بار جماعت میں دسترخوان پر کھانا آیا۔ جب حلوہ آیا تو ٹوپی اتار کر فرمایا:

"میرا حصہ اس میں ڈال دو"

مناسب یہ ہے کہ دعوت میں کھانا پیش کرنے سے پہلے گھر والوں کے لیے کھانا الگ کر لے تاکہ دل میں واپس لینے کا خیال نہ آئے۔ یہ مکروہ بات ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کھانا بچ کر بالکل ہی نہ آئے اور اس میں کھانے والوں کی تنقیص و حرج ہے اور یہ بات ان پر اکرام سے زیادہ شدید دکھ کی ہے کہ گھر والے بھوکے رہیں اور وہ کھائیں۔ نیز اس میں اصل کو ضائع کیا۔

صرف اسی قدر رکھنا مناسب ہے کہ جس کے بارے میں اس کا دل چاہے کہ یہ کھا لیں اور جس قدر کھانے کی ضرورت ہو اسی قدر رکھا جائے۔ اس میں سنت و فضیلت دونوں پائی گئیں۔

کھانے کے دوسرے آداب ایک روایت میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے کبھی بچا ہوا کھانا نہیں اُٹھایا گیا"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں مخلص لوگ تھے۔ اس لیے صرف اسی قدر سامنے رکھتے جو کافی ہوتا اور بھوک لگنے کے بعد ہی کھاتے تھے۔ جب تک چاہت ہوتی کھاتے رہیے اور کم مقدار میں کھانا اس وجہ سے رکھے کہ جو کافی ہو۔ اور زاید کھانا واپس نہ آئے اور سنّت کی موافقت حاصل ہو جائے اور زیادہ مقدار میں کھانا پیش کرنے میں بھی ایک نیت صالحہ ہے کہ "جس نے بھائیوں کا بچا ہوا کھایا اس پر محاسبہ نہ ہوگا"۔

اور جو آدمی جماعت میں ہو وہ کھانا دیر سے لانے کا حکم نہ کرے۔ ممکن ہے جماعت میں ایسا آدمی ہو جو جلدی کھانے کا ضرورت مند ہو ہاں اگر سب کا تاخیر کرنے میں اتفاق ہو تو پھر صرف اپنے لیے تقدیم کا حکم نہ دے۔

جب کھانا اور نماز دونوں موجود ہو جائیں اور دل میں کھانے کی طرف رغبت ہے اور وقت میں گنجائش ہے کہ نماز پڑھ سکے گا تو پہلے کھانا کھائے اور اگر طبیعت مطمئن ہو یا وقت تنگ ہو یا خطرہ ہو کہ کھانے میں کافی وقت چلا جائے گا تو پہلے نماز پڑھ لیں۔

زمین پر کھانا مستحب ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کھانا آتا تو آپ اسے زمین پر رکھتے اور دونوں پاؤں کے بل بیٹھ کر تناول فرماتے اور فرمایا کرتے ؛

"میں سہارا لگا کر کھانے والا نہیں اور پاؤں کی پُشت پر بیٹھتے۔ دائیں ٹانگ کھڑی کر لیتے۔ آج تک عربوں کا کھانے کا یہی طریقہ چلا آتا ہے اور اگر دسترخوان پر کھائے تو یہ سنّت ہے۔ سفر کے لیے زادِ راہ لے اور سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے"۔

اونچے خوانوں پر (مثلاً میزوں پر) کھانا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ سلفؒ کے نزدیک ہاتھوں سے بلند جگہ پر کھانا رکھ کر کھانا مکروہ ہے اور یہ بعد کی ایجاد ہے اور یہ تواضع سے بھی نہیں۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں ؛

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خوان میں نہیں کھانا کھایا اور نہ کبھی چنگیر میں"۔

پوچھا گیا : "تو آپ کس پر کھایا کرتے تھے؟"

فرمایا : "دسترخوانوں پر"۔

بتاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلی چار بدعات جاری ہوئیں ؛

۱۔ دسترخوان (بڑے بڑے)

۲۔ چھلنیاں

۳۔ اشنان

۴۔ سیر ہو کر کھانا

جو آدمی اشنان سے ہاتھ دھوئے۔ وُہ دایاں ہاتھ دھونے کے بعد منہ صاف کرے۔ اور اشنان کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے بطن میں خشک حالت میں رکھے۔ پھر مُنہ دھوئے۔ آخر کار انگلیوں سے اس کو صاف کر دے۔ پھر اشنان کو ترکر کے ہاتھوں کو دھوئے اور ہتھیلیوں کو دوبارہ نہ دھوئے یہ اصحابِ مروّت کا کام ہے۔

جب طرح طرح کے کھانے سامنے آئیں تو لطیف ترین کو پہلے کھائے، پھر اس سے کم لطیف کو کھائے۔ پہلے عمدہ تر کو، پھر عمدہ کھائے۔ یعنی ثرید سے پہلے بُھنا ہُوا کھائے اور سکباج (گوشت و سرکہ سے تیار کردہ سالن) سے پہلے طب ہج (کھانے کی ایک قسم) کھائے۔ یہ عربوں کا طریقہ ہے تاکہ بھوک کی حالت میں پہلے عمدہ و حلال ترین کھانا کھائے اور خوب وافر حصّہ حاصل کرے۔ یہ بات صاحبِ دعوت کے لیے زیادہ اجر کا باعث ہے اور کھانیوالے کے لیے کم تر بوجھ ہے۔ اگر بعد میں غلیظ کھانوں کی ضرورت آئے تو تھوڑا سا ان میں سے بھی کھالے۔ اس لیے کہ دنیا دار لوگ مغلظ کھانا، پہلے کھاتے ہیں تاکہ زیادہ مقدار میں کھائیں اور شہوات میں اضافہ ہو اور لطیف کھانا بعد میں ہو۔ ایسا کرکے انہوں نے عمدہ وپاک تر کھانا کم مقدار میں کھایا اور ابنائے آخرت و صالحین کے نزدیک یہ غیر مستحب بات ہے۔

متقدمین کا طریقہ تھا کہ ایک ہی جگہ وُہ مرغوبات کھانوں کی تمام اقسام پیش کر دیتے اور سب کھانا معلوم ہو جاتا کہ فلاں فلاں چیز ہے۔ اور جب ان کے پاس ایک ہی کھانا ہوتا تو کہہ دیتے یہی ایک کھانا ہے تاکہ دُوسرے کی طرف دھیان نہ جائے اور اس میں سے مناسب مقدار کھالیں۔

ہمارے ایک شیخ نے اپنے شیخ سے نقل کیا۔ فرمایا:

ایک شام ایک صاحب نے میرے سامنے خربوزہ پیش کیا۔ میں نے کہا،

"ہمارے ہاں عراق میں یہ آخر میں پیش کیا جاتا ہے۔"

اس نے کہا: "ہمارے ہاں شام میں بھی ایسے ہی معاملہ ہے۔"

بتاتے ہیں کہ اس جواب سے مجھے بڑی شرمندگی ہُوئی۔ اس لیے کہ اس کے پاس یہی کچھ کھانا تھا۔

ایک دُوسرے آدمی نے بتایا کہ ہم ایک آدمی کے ہاں جماعت میں کھانا کھا رہے تھے۔ وُہ ہمارے سامنے طرح طرح کے کھانے مثلاً پکا ہُوا کھانا اور گوشت کے ٹکڑے لائے۔ ہم تھوڑا تھوڑا کھاتے رہے۔ اس لیے کہ ہمیں انتظار تھا کہ مزید نئی طرح کے کھانے آئیں گے۔ اُونٹ یا بکری بُھنی ہُوئی آئے گی۔ دیکھا تو وُہ طشت اٹھا لایا کہ ہاتھ دھو لو، اور مزید کھانا نہ لایا۔ اہلِ تصوّف میں سے ایک بزرگ پُر مذاق آدمی تھے۔ میری طرف توجہ کر کے فرمایا:

"وُہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ بغیر بدنوں کے سر پیدا کر دے"۔ بتاتے ہیں کہ ہم اس رات کو بھُوکے ہی رہے۔

اور ہم میں سے بعض کو رات کے آخری حصہ میں روٹی یا ٹکڑے کھانے پڑے۔

ادب یہ ہے کہ باقی کھانے بھی سامنے رکھ دیے جائیں اور جب تک وُہ ہاتھ نہ کھینچ لیں تب تک دسترخوان نہ اٹھائے اور پہلے کے رکھے ہُوئے کھانے سامنے رکھے رہنے دے۔ ممکن ہے کسی آدمی کو انہی میں سے ایک سے دل چسپی ہو یا کسی کا ان میں سے ایک کھانے کے بارے میں فضیلت کا معاملہ ہو اور وُہ اس سے رہ جائے۔ اور اپنے جی کی بات پُوری نہ کر سکے۔

ہمارے بعض اصحاب حضرت ستوریؒ کے بارے میں روایت کرتے ہیں۔ یہ صوفی بزرگ تھے کہ "ایک بار وُہ دنیاداروں کے دسترخوان پر گئے اور وُہ آدمی کنجوس سا تھا۔"

بتاتے ہیں کہ اس نے اُونٹ پکا کر سامنے رکھا۔ لوگ کھانے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ سارے اُونٹ کو بوٹی بوٹی کرتے جا رہے ہیں تو تنگی ہُوئی اور کہا:

"اے لڑکے۔ یہ کھانا بچّوں کے پاس لے جاؤ۔" اُونٹ اٹھا کر گھر کے اندر لے گئے۔ حضرت ستوریؒ اٹھ کر اُونٹ کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ گھر والے نے کہا:

"اے ابُو عبداللہ، کہاں جا رہے ہو؟"

فرمایا "میں بچّوں کے ہمراہ کھاؤں گا۔" اسے شرمندگی ہُوئی اور اونٹ واپس کیا گیا۔ آخر سب نے ضرورت کے مطابق کھایا۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے:

"جو کسی آدمی کو کھانے پر بُلائے اور وُہ چاہتا ہو کہ یہ قبول نہ کرے۔ اب اگر اس نے دعوت قبول نہ کی تو دعوت دینے والے پر ایک گناہ ہے اور اگر قبول کر لی تو دو گناہ لازم ہُوئے۔"

ایک گناہ کی وجہ یہ ہے کہ اس نے زبان سے ایسی بات کی تھی جو قلبی حال کے خلاف تھی۔ چنانچہ کلام میں تصنع کیا اور یہ دکھاوے اور ریاء میں داخل ہے اور ایسا کام ہے کہ نہ کیے ہُوئے فعل پر تعریف چاہتا ہے۔

دو گناہوں کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بھائی نے دعوت قبول کر لی۔ اس آدمی نے اپنے بھائی کو ایسی بات پر اُبھارا جس کی حقیقت سے وُہ آگاہ نہ تھا اور جس حال کو وُہ ناپسند کرتا ہے۔ اس کا سامنا کرنے کی راہ پر لگا دیا اور اپنے باطن کے بارے میں اپنے بھائی کو نصیحت نہیں کی کیونکہ اگر اس کے بھائی کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ اس کی دعوت قبول کرنے کو پسند نہیں کرتا تو وُہ اس کا کھانا نہ کھاتا۔ مزید برآں اس نے اسے بھی ریاکاری میں داخل کیا۔ اب اس پر دو گناہ لازم ہُوئے۔

بعض متقدمین کا طریقہ یہ تھا کہ جب کھانا کھاتے وقت کوئی آدمی ان کے پاس آتا تو وُہ اُٹھ کر کھانا پیش

نہ کرتے۔ اس لیے کہ وہ کلام کے ذریعہ تصنع کرنا نہ چاہتے تھے یا یہ خطرہ تھا کہ انہیں ایسی بات سے دوچار کر بیٹھیں جسے وہ ناپسند کرتے تھے۔

حضرت سمیر ابو عاصمؒ ایک زاہد بزرگ تھے۔ یہ کھانا کھا رہے تھے کہ کچھ لوگ ان کے پاس آئے۔ آپؒ نے فرمایا:

"اگر میں نے یہ قرض سے نہ لیا ہوتا تو تمہیں ضرور کھلاتا۔"

تکلف سے دُور رہو

"تکلف کی وضاحت کرتے ہُوئے بعض سلف فرماتے ہیں:

"تکلف یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کو وُہ کھلائے جو خود نہیں کھاتا۔" یعنی جس قدر عمدہ چیز تو خود نہیں کھایا کرتا اور اس کی قیمت تجھ پر شاق گزرتی ہے وُہ چیز بھائی کو کھلانا تکلف ہے۔

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں:

"لوگ تکلف کی وجہ سے جُدا جُدا ہو گئے۔ ایک آدمی اپنے بھائی کو بلاتا ہے اور اس کی خاطر تکلف کرتا ہے چنانچہ وہ دوبارہ اس کے پاس آنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔"

بعض سلف ماحضر سامنے لانے کا حکم دیتے اس لیے کہ یہ طریقہ بار بار ملاقات کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اور صاحبِ مکان پر گراں بھی نہیں گزرتا۔

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں،

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ میرے پاس کوئی بھائی بھی آجائے اس لیے کہ میں اس کی خاطر تکلف ہی نہیں کرتا۔ جو موجود ہوتا ہے وُہ پیش کر دیتا ہوں اور اگر میں تکلف کروں اور جو حاضر نہ ہو تکلیف اٹھا کر اسے لاؤں تو اس کے بار بار آنے سے تنگ آجاؤں اور ان کی آمد کو ناپسند کرنے لگوں۔"

ایک بزرگؒ نے فرمایا،

"میں اپنے ایک بھائی سے مانوس تھا اور کثرت سے اس کی ملاقات کو جایا کرتا۔ وہ میرے لیے تکلف کر کے عمدہ عمدہ چیزیں مہیا کرتا۔ ایک روز میں نے اسے کہا "جب تو اپنے گھر میں ہوتا ہے تو کیا ایسی اشیاء کھایا کرتا ہے جو میرے سامنے پیش کرتا ہے؟"

اس نے کہا، "نہیں۔"

میں نے کہا، "اسی طرح جب میں اپنے گھر میں تنہا ہوتا ہوں تو ایسی اشیاء نہیں کھایا کرتا۔ اب جب ہم تنہائی میں ایسی اشیاء نہیں کھاتے تو ملاقات ہونے اور اجتماع کے موقع پر کیوں ایسا کھاتے ہو: یہ تکلف کی بات ہے یا تو تو اس کام کو چھوڑ دے اور تنہائی میں جو تو کھایا کرتا ہے وہی پیش کر دیا کر ورنہ میں آنا بند کر دوں گا۔" بتاتے ہیں کہ اس نے ایسا کرنا ختم کر دیا۔ جو موجود ہوتا وہی پیش کر دیتا اور ہم کھا لیتے۔ اس طرح

ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہی۔

مہمان کے فرائض

جس کو کھانے پر مدعو کیا جائے اور اس کے پاس دوسرا آدمی بھی ہو یا ایک جماعت ہو کہ انہیں معلوم نہ ہو تو ایک کو یا جماعت مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔ یہ سنت اور ادب کی بات ہے۔ (یعنی اگر باقیوں کی دعوت نہ کرنا چاہیے تو انہیں مستثنیٰ کر دے)

جس کو جماعت میں مدعو کیا جائے اور معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ آنے سے پہلے صاحبِ مکان کو اُن کی تعداد سے آگاہ کر دے تاکہ وُہ ان کا استقبال کرنے کی تیاری کر سکے اور ان کی ضرورت کے مطابق کھانا تیار کر سکے۔

جو کسی کو خاص دعوت میں مدعو کرے اور عام دعوت میں نہ بلایا ہو اور اس کے پاس کچھ لوگ یا کوئی خاص آدمی ہو تو جو اپنے پاس ہو اس کے بارے میں مدعو کو آگاہ کر دے تاکہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق آئے۔ ممکن ہے کہ میزبان کے پاس ایسا آدمی ہو کہ جس کے پاس اکٹھا ہونے کو مہمان ناپسند کرے یا وُہ دعوت کر کے آ جائے اور یہ سمجھتا ہو کہ اس کے پاس کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ کھانا بھی ایک معاشرت ہے اور ہر آدمی، ہر آدمی کے ساتھ معاشرت پسند نہیں کرتا۔ خصوصاً امرا ایسا کرنا پسند نہیں کرتے۔

جو آدمی کسی آدمی کے ہمراہ کھانا کھائے اور ایک سائل سامنے آ جائے تو مالکِ طعام کی اجازت کے بغیر اسے کھانے میں سے کچھ چیز نہ دے یا صاحبِ مکان سے پُوچھ لے بلکہ صاحبِ مکان خود ہی دے تو ٹھیک ہے۔ اگر اس نے اجازت کے بغیر دے دیا تو اس کا ثواب صاحبِ مکان کے لیے ہے اور گناہ اس کے ذمہ ہے

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ایک آدمی ان کے ہمراہ کھا رہا تھا اس نے ان کی اجازت کے بغیر سائل کو دے دیا تو انہوں نے فرمایا: ہم اس بات سے غنی تھا کہ میرے لیے اجر اور تیرے اوپر وزر (گناہ) ہو۔ اور اس طرح مالک کی اجازت کے بغیر کسی دُوسرے کو اس کھانے پر دعوت نہ دے۔

جس نے اپنے مخصوص بھائیوں کو دعوت پر بلایا۔ پھر ایک دُوسرا آدمی شریک ہو گیا تو اسے ان کے ہمراہ نہ بٹھائے بلکہ اسے کھانا دے کر واپس کر دے یا علیحدہ کھانا دے۔

ایک بزرگ بعض صالحین سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کھانے پر صوفیاء کو دعوت دی۔ عام لوگوں میں سے ایک آدمی بھی آن گھسا اور ساتھ بیٹھ کر کھانے لگا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ کر دیا اور فرمایا: ہم نے یہ کھانا مخصوص طور پر ان اصحاب کے لیے تیار کیا ہے۔ ان کے ہمراہ کسی دوسرے عامی کو بیٹھ کر کھانا مناسب نہیں۔ پھر اس کو علیحدہ کر کے کھانا کھلایا۔ اس فعل کا انہیں علیحدہ اجر ملا۔

کھانے وقت اگر کوئی آدمی آجائے تو کھانا اٹھا نہ دے۔ یہ سنت طریقہ نہیں اور نہ ہی مروت والوں کا یہ کام ہے شاید آنے والا اس سے زیادہ ضرورت مند ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کا امتحان لینے کے لیے اسے بھیجا ہو۔

میزبان کی ذمہ داریاں

اگر تو ایک یا دو بار اپنے بھائی کے سامنے کھانے کا اصرار کرے تو زیادہ اصرار نہ کر اس طرح تو نے اس کی دعوت کی مگر اس نے ناپسند کیا تو بھی اصرار نہ کرنا چاہیے۔

صوفیاؒ فرماتے ہیں: اپنے بھائی کا ایسا اکرام نہ کر کہ اس پر گراں گزرے اور تین بار سے زیادہ نہ کہہ۔ اس لیے کہ الحاح اور لجاجت وہ ہے جو تین بار سے زائد ہو اور یہ طریقہ ادب کے خلاف ہے۔ بتاتے ہیں کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک چیز میں تین بار بات چیت ہوتی تو پھر تین کے بعد بات نہ دہراتے۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے:

”کھانا، اس پر حلف اٹھانے سے زیادہ سہل ہے۔“

ایک بار فرمایا:

”اس سے (زیادہ سہل ہے) کہ اس کی طرف دعوت دی جائے۔“ یہ مومن کے عظیم حق کی وجہ سے کہا۔

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے:

”جب تیرا بھائی تیری ملاقات کرے تو اُسے یہ نہ کہو کہ کھائے گا؟ یا پیش کروں، بلکہ جو موجود ہو، اسے پیش کر دو۔ اگر کھا لیا تو ٹھیک ورنہ اٹھا لو۔“

حضرت حسن اور ابن مبارک رضی اللہ عنہما جب صبح یا رات کا کھانا کھاتے تو دروازہ کھول دیتے۔ جو سامنے آتا اس پر کھانا پیش کر دیتے۔ سلف صالحین کا یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ کھانا آنے پر دروازے کھول دیا کرتے اور جو اندر آجاتا وہ ان کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

بعض نیک بندے تو گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر کھاتے اور دروازہ کھول دیتے۔ جو راہ پر گزرتا اسے کھانے کی دعوت دیتے چاہے امیر ہوتا چاہے محتاج ہوتا۔

ایک تابعیؒ کا فرمان ہے:

”یاد رکھو، تم میں بہترین وہ ہیں جو صحن میں کھاتے ہیں اور جن کے برتن فراخ ہیں اور مشروب عمدہ ہیں اور تم میں بدترین وہ ہیں کہ جو چھپ کر کونوں میں کھاتے ہیں اور ان کے مشروب یا کھانے مختصر ہیں۔“

اگر کسی کو کھانے پر دعوت دی جائے اور مدعو جانتا ہے کہ یہ اس کے کھا لینے کو پسند نہیں کرتا تو اسے کھانا مکروہ ہے۔ اگر اس کے دل کی کراہت اور قول کے برعکس سے آگاہ ہو تو اس کے قول کی پروا نہ کرے اور اگر حقیقتِ حال معلوم نہ ہو تو ظاہری قول کے مطابق اسے کھانے کی اجازت ہے اور خواہ مخواہ بدظنی نہ کرنا چاہیے۔

ایک آدمی نے سفر کی حالت میں احنف بن قیس کو کھانے کی دعوت دی۔ احنفؒ نے فرمایا:

"شاید تو عارفین میں سے ہے؟"

اس نے پوچھا: "عارفین کون ہیں؟"

فرمایا: "جو چاہتے ہیں کہ ناکردہ فعل پر ان کی تعریف کی جائے۔" وہ خاموش رہا۔ حضرت احنف نے کھانے کی دعوت قبول نہ کی۔

حضرت ثوریؒ ایک آدمی کے ہمراہ جا رہے تھے۔ ایک آدمی کے دروازے کے پاس سے گزرے اس نے اندر آنے اور اپنے ہمراہ کھانا کھانے کو بلایا۔ حضرت ثوریؒ نے فرمایا:

"سچ سچ بتانا تمہیں کیا پسند ہے؟ آجاؤں یا چلا جاؤں؟" وہ خاموش رہا۔ حضرت ثوریؒ تشریف لے گئے۔

بغیر اذن کھانا

جو آدمی یہ جانتا ہو کہ میرا یہ بھائی پسند کرتا ہے کہ اس کا کھانا کھائے تو اس کے اذن کے بغیر بھی کھانا جائز ہے۔ اس لیے کہ اس کا حقیقتِ حال کا علم ہی اذن کے قائم مقام ہے۔

حضرت محمد بن واسعؒ اور ان کے اصحاب حضرت حسنؒ کے گھر میں آکر جو پاتے، اذن کے بغیر ہی کھا لیا کرتے بسا اوقات حضرت حسنؒ انہیں دیکھ کر مسرور ہوتے اور فرماتے ہم ایسے ہی تھے۔

ان کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایک سبزی فروش کے سامان میں سے کھا لیا کرتے تھے۔ اس ٹوکری میں سے ایک تنکا لیا۔ اس ٹوکری میں سے کچھ لیا۔ حضرت ہاشم اوقصؒ نے عرض کیا:

اے ابوسعیدؒ! آپ ایک آدمی کے مال سے اس کے اذن کے بغیر ہی کھا رہے ہیں؟

فرمایا: اے لڑکے تُو نے کھانے کی آیت نہیں پڑھی؟

پھر یہ آیت تلاوت کی:

وَلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْ بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِکُمْ سے لے کر اَوْ صَدِیْقِکُمْ تک۔

پھر حضرت حسن نے فرمایا:

صدیق سے مراد وہ دوست ہے کہ جس کی طرف قلبی اطمینان و سکون ہو۔ جب ایسا معاملہ ہو تو اس کے مال میں اذن کی ضرورت نہیں۔

کچھ لوگ حضرت سفیان ثوریؒ کے گھر میں آئے۔ وہ گھر میں نہ تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا، دسترخوان بچھایا اور جو کچھ تھا کھانے لگے۔ حضرت ثوریؒ آئے تو فرمایا:

تم نے مجھے سلف کے اخلاق کی یاد تازہ کرا دی۔ وہ اسی طرح بے تکلف بھائی بھائی تھے۔

ایک تابعی کے پاس کچھ لوگ آئے۔ ان کے پاس ان کے سامنے پیش کرنے کے لیے کچھ چیز نہ تھی۔ وہ اپنے

ایک دوست کے گھر میں گئے۔ وہ مکان میں نہ تھا اندر جا کر دیکھا کہ پکی ہوئی ہنڈیا رکھی ہے اور روٹیاں بھی تیار شدہ موجود ہیں اور دوسری کھانے کی اشیاء پڑی ہوئی ہیں۔ وہ سب اٹھا لائے اور اپنے اصحاب کے سامنے رکھ دیں اور فرمایا:

"کھاؤ،" جب گھر والا آیا تو دیکھا کہ کھانا نہیں۔ کسی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ فلاں آئے اور سب چیزیں لے گئے۔ اس نے کہا:

"انہوں نے کہا بہت اچھا کیا۔"

پھر جب ملاقات ہوئی تو گھر والے نے کہا:

"بھائی اگر وہ مہمان آئیں تو آپ پھر آ کر لے جائیے۔"

حضرت بریرہؓ کے پاس صدقہ کا گوشت آیا۔ وہ موجود نہ تھیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اجازت کے بغیر کھا لیا۔ اس لیے کہ آپؐ جانتے تھے کہ وہ اس پر خوش ہوں گی۔ اور فرمایا:

"صدقہ اپنے مقام پر پہنچ گیا۔ اس (بریرہؓ) پر صدقہ تھا اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی کا آدمی کی طرف قاصد اس کا اذن ہے۔" یعنی وہ جان چکا ہے کہ اس کے آنے کی اسے فرحت ہے چنانچہ اذن کی ضرورت نہ رہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل پر تدبر سے معلوم ہوا کہ جو آدمی یہ جانتا ہو کہ اس کا کھانا کھانا اس (میزبان) کے لیے کراہت کا باعث ہے تو وہ کھانا نہ کھائے۔ چاہے زبان سے اجازت بھی دے دے۔ خوب سمجھ لو۔

بعض سلف سے یہ بھی منقول ہے کہ ایک آدمی کو دعوت میں بلایا۔ قاصد اسے نہ ملا۔ پھر جب علم ہوا تو دعوت میں چلا گیا مگر لوگ واپس جا چکے تھے۔ اس نے گھر میں جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ میزبان باہر آیا اور پوچھا: "کوئی کام ہے؟"

کہا: "تم نے مجھے دعوت میں بلایا تھا مگر اس وقت قاصد نہ ملا۔ اب معلوم ہوا تو آیا ہوں۔"

اس نے کہا: "لوگ کھا کر جا چکے۔"

پوچھا: "کچھ باقی ہے؟"

کہا: "نہیں۔"

پوچھا: "ایک ٹکڑا بھی اگر باقی رہ گیا ہو؟"

کہا: "کچھ بھی باقی نہیں رہا۔"

انہوں نے کہا: "اچھا! میں دیگچے چاٹ لوں گا۔"

کہا" وُہ ہم نے دھو دیے۔"

یہ سن کر وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے ہُوئے واپس چلے گئے۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:
اس آدمی نے خوب کیا۔ نیت کے ساتھ ہمیں بلایا۔ ایسا آدمی تواضع ومسکنت میں مقامات الفت وعزت پر ہے اور ابن کدیمی کے نفس سے مشابہ ہے جو کہ ابو القاسم جنیدؒ کے استاد تھے کہ ایک بچے نے انہیں اپنے باپ کی طرف سے دی گئی دعوت میں بلایا۔ اس کے باپ نے چار بار انہیں واپس کر دیا اور وہ ہر بار واپس ہو جاتے لڑکا بلا لاتا اور باپ واپس کر دیتا۔ یہ نفوس دراصل توحید پر مطمئن ہیں۔ اپنے اللہ کی طرف سے ابتلاء کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور اللہ ہی ابتلاء ڈالنے والا اور دوبارہ اٹھانے والا ہے۔ اس کی وجہ سے تواضع اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ افراد کا مفرد طریق ہے اور احاد کا مجرد حال ہے۔ متکبر لوگ دعوتیں قبول نہیں کرتے اور بعض کے نزدیک نفس کی خودداری سے ہے۔ ایک نے کہا:

" میں دعوت قبول نہیں کرتا۔"

پوچھا گیا" کیوں؟"

کہا" شوربے کا انتظار کرنا ذلت کی بات ہے۔"

کس کی دعوت قبول کرے؟

ایک صاحب بتاتے ہیں:
" جب تو نے غیر کے پیالے میں ہاتھ ڈالا تو اس کے سامنے تیری گردن جھک گئی۔"

بعض ایسے بھی ہیں کہ نفسانی تکبر کی وجہ سے غریبوں کی دعوت قبول نہیں کرتے اور اغنیاء کا درجہ ان کے نزدیک بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔

دنیادار لوگ صرف اپنے جیسے مرتبہ اور دنیاوی مال ومتاع رکھنے والے کی دعوت ہی قبول کرتے ہیں اور یہ بات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔ آپؐ غریبوں کی دعوت قبول کر لیتے۔ غلام کی دعوت بھی قبول کر لیتے۔ فرمایا:

" بدترین کھانا اور برا کھانا ایسا ولیمہ ہے جس میں اغنیاء کو بُلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔" پھر فرمایا:

" جو دعوت کو قبول نہیں کرتا اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔"

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا مساکین کی ایک قوم کے پاس سے گزر ہُوا وُہ چوراہوں پر لوگوں سے بھیک مانگتے۔ جب ان کے پاس سے گزرے تو انہوں نے زمین پر ریت پر ٹکڑے بکھیر رکھے تھے اور کھا رہے تھے۔ یہ اپنی خچر پر سوار تھے۔ انہوں نے گزرتے ہُوئے انہیں سلام کہا۔ انہوں نے جواب دیا اور کہنے لگے:

"اے ابن بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیے، کھائیے۔"

فرمایا: "ہاں، اللہ تعالیٰ متکبرین کو پسند نہیں کرتا۔"

پھر سرین کو موڑا اور سواری سے اُتر کر ان کے ہمراہ زمین پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ پھر سلام کہا اور سوار ہو گئے۔

ایک دُوسری روایت میں یہ زیادہ الفاظ ہیں۔ فرمایا:

"میں نے تمہاری دعوت قبول کر لی تم بھی میری دعوت قبول کرو۔"

انہوں نے کہا: "ہاں"۔

چنانچہ دن کے وقت ان کی دعوت کا وقت مقرر کیا۔ جب وُہ آئے تو ان کی خوب خاطر تواضع کی اور اُونچی جگہ بٹھایا۔ پھر فرمایا:

"اے وازات، جو ذخیرہ ہے سب لے آؤ۔" لونڈی نے سب پیش کر دیا اور جو کھانا موجود تھا رکھا اور ان کے ہمراہ کھانے میں شریک ہو گئے۔

حضرت ابن مبارکؒ اپنے احباب کی دعوت کرتے تو تر کھجوریں آگے میں رکھتے اور فرماتے:

"جو زیادہ کھائے گا اسے ہر گٹھلی پر ایک درہم دوں گا۔" چنانچہ گٹھلیاں گنتے اور جس کی گٹھلیاں زیادہ ہوتیں اسے گٹھلیوں کے برابر درہم عطا کرتے۔

بعض اصحاب عبرت کا کہنا ہے:

"میں صرف اس لیے دعوت قبول کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ جنّت کی نعمتوں کو یاد کروں۔ ایسا کھانا جو کسی تکلیف اور مشقت کے بغیر ملا۔"

اسی وجہ سے مشائخ فرماتے ہیں کہ انس و الفت کی حالت میں بقدر کفایت کھانے پر مسلمان بھائیوں کا جمع ہونا دنیا میں سے نہیں ہے۔

بعض صوفیاء فرمایا کرتے:

"صرف اسی کی دعوت قبول کر جو یہ سمجھے کہ تُو نے اپنا ہی رزق کھایا ہے اور اس نے تیری امانت تیرے سپرد کی ہے جو اس کے پاس رکھی تھی اور دعوت قبول کرنے میں تیرا احسان سمجھے۔" یہ ایک عارف میزبان کی شہادت ہے اسی طرح موحد مدعوین کا کام یہ ہے کہ وہ داعی اول، مجیب آخر، معطی باطن اور رزاق ظاہر (یعنی اللہ تعالیٰ) پر نظر رکھیں کہ اسی نے دیا جیسے کہ بعض صوفیاء نے اپنے اصحاب کا امتحان بھی اسی کے مطابق لیا۔

بتلاتے ہیں کہ کسی آدمی نے صوفیاء کے ایک امام اور ان کے اصحاب کی دعوت کی۔ جب لوگ اپنے مقام پر بیٹھ کر بہترین کھانے کا انتظار کرنے لگے تو شیخ تشریف لائے اور فرمایا: "اس آدمی نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ

اس نے تمہاری دعوت کی اور تم اس کا کھانا کھا رہے ہو۔ یہ تو خراب بات ہے"۔ یا فرمایا : یہ اس پر حرام ہے جو کھانے کے فعل میں مولائے کریم کا مشاہدہ نہ کرے (یعنی اس کو رزاق نہ دیکھے۔ اس پر یہ کھانا حرام ہے)

بتاتے ہیں کہ تمام لوگ اُٹھ کر چلے گئے اور کسی نے کچھ چیز کھانا حلال نہ سمجھا۔ اس لیے کہ اس فعل میں وہ تثبیت نہیں دیکھ رہے تھے۔ البتہ ایک نوعمر لڑکا باقی رہا اس کا مشاہدہ پختہ نہ تھا اور نہ ہی اس کی نظر رسا تھی۔

اگر تیرا بھائی تیری دعوت کرے اور تو روزے سے ہو اور تجھے علم ہو کہ تیرے کھانے سے یہ خوش ہوگا تو اس کی خاطر افطار کرنے میں کچھ حرج نہیں اور اگر تجھے یہ معلوم نہ ہو بلکہ میزبان یہ کہے کہ آپ کے کھانے سے مجھے مسرت ہوگی تو اس کی تصدیق کرو۔ اور حسن ظن رکھو اور اگر تجھے علم نہیں اور اس نے بھی ایسا کلام نہیں کیا تو میرے نزدیک ایک چونکہ بہتر نیت سے روزہ شروع کیا تھا۔ اس کو چھوڑ کر کم درجہ کی طرف نہ جائے اور روزہ ترک نہ کرے ایسی حالت میں روزہ ہی افضل ہے اور اگر تو نے اپنے بھائی کا احترام کرتے ہوئے اس کے ہمراہ کھایا تو یہ ایک اچھی نیت ہے۔

بعض سلف کا طریقہ تھا کہ افطار کے روز جب کھاتے تو احباب کے ہمراہ کھاتے اور جس طرح روزہ میں اچھی نیت ہوتی اسی طرح افطار میں نیتِ صالحہ سے کام لیتے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا :

"افضل ترین نیکی یہ ہے کہ ہم نشینوں کی عزت کرے۔" جو آدمی دوسروں کو کھلانا نہیں چاہتا اسے چاہیے کہ وہ کھانا ان کے سامنے نہ کرے اور نہ ان کے سامنے کھانے کی توصیف کرے۔ چاہے کھایا ہو یا نہ کھایا ہو۔

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے :

"جب تیرا ارادہ اپنے گھر والوں کو ایک چیز کھلانے کا نہ ہو تو ان سے اس کا ذکر نہ کر اور نہ ہی انہیں یہ چیز دکھا"

میزبان کی سات نیات

میزبان کو چاہیے کہ وہ دعوت دیتے وقت سات نیات رکھے۔ اس لیے کہ تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے" اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔" اس لیے کہ دعوت ایک عمل ہے جس نے اس سے دنیا کی نیت کی اس کے لیے عاجل دنیا کا حصہ ہے اور جس نے اس میں آخرت کی نیت کی۔ اس کے لیے اس کی نیت کے مطابق آخرت کا حصہ ہے۔

اگر نیت نہ ہو یا نیت میں بگاڑ آجائے تو توقف کرے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی نیتِ صالحہ عطا فرمائے اور اس پر دعوت دے اور اگر نیت نہ ہو سکے تو دعوت ہی نہ دے۔ اس لیے کہ یہ عمدہ اعمال میں سے ہے اور اس میں بہترین نیت کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ان میں علم پایا جاتا ہے اور ان کے ذریعہ نیکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور انہی کی وجہ سے خواہشِ نفس ختم ہوتی ہے اور برائیوں سے بچ جاتا ہے

ورنہ اس کی دعوت ایک مذاق بن کر رہ جائے گی اور یہ دنیا کے ایک دروازہ کی خاطر کام کرنے والا، نفسانی لذات اور پیٹ بھرنے کی خاطر جد و جہد کرنے والا ہو جائے گا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ وہ ملے تو اس کی ہجرت اسی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔"
ایسا کر کے نیت کے فساد کے باعث اس پر گناہ ہوگا یا اسے اس عمل پر کچھ اجر نہ ملے گا۔

پہلی نیت یہ رکھے کہ دعوت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا مقصود ہے۔ اس لیے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"جو دعوت قبول نہ کرے اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی"

دوسری نیت سنت قائم کرنے کی ہو۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"اگر مجھے ایک کراع میں دعوت دی جائے تو بھی قبول کروں۔" کراع، مدینہ منورہ سے کئی میل دور ایک جگہ کا نام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب رمضان کے مہینہ میں یہاں پہنچے تو آپ نے افطار کیا اور سفر کی وجہ سے نماز میں قصر کی۔

ایک دوسری روایت میں فرمایا،

"اگر مجھے ایک دو جانور کے دست پر دعوت دی جائے تو بھی قبول کروں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت میں کھانے کی مقدار قلیل بھی ہو، یا دور جگہ ہو تب بھی دعوت قبول کر لینی چاہئے۔ توراۃ یا بعض کتب میں ہے۔

"ایک میل چل کر کسی مریض کی تیمارداری کر، دو میل چل کر جنازہ کی ہمراہی کر، تین میل چل کر کسی دعوت قبول کر، چار میل چل کر بھی اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے بھائی کی زیارت کر۔ عیادت اور جنازہ کی ہمراہی پر دعوت قبول کرنے کے معاملہ میں دور تک جانے کا حکم اور اس کی فضیلت اس لیے ہے کہ زندہ کا حق ادا کرنے کا معاملہ ہے، اور دعوت دینے والے کی بات قبول کرنا بھی ہے۔

تیسری نیت یہ ہے کہ اپنے بھائی کی عزت افزائی کی خاطر دعوت دے۔ ایک روایت میں ہے:

"جس نے اپنے مومن بھائی کی عزت کی وہ اللہ تعالیٰ کا اکرام کرتا ہے۔"

ایک حسن حدیث میں ہے:

"جس کے پاس بغیر مانگے کچھ چیز آئی اس نے اسے واپس کر دیا تو وہ اللہ تعالیٰ پر واپس کر رہا ہے۔" یعنی دعوت قبول نہ کرنا عطیہ کو رد کرنا ہے۔

اسی مفہوم میں ایک حدیث قدسی آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندے کو فرمائے گا:

"میں بھوکا تھا تو نے مجھے نہیں کھلایا۔"

بندہ کہے گا،

"میں تجھے کیسے کھلاتا۔ تُو تو سارے جہانوں کا پروردگار ہے؟"

فرمائے گا،

"تیرا مسلمان بھائی بھوکا ہُوا تو نے اسے نہیں کھلایا۔ اگر تو اسے کھلاتا تو تُو نے مجھے کھلایا۔" اس کی تعظیم کی ایک بات ہے کہ وُہ مسلمان کی حُرمت وعزت کا خیال رکھے۔ اس لیے کہ اس نے اسے اس کے مقام پر رکھا۔ اس کے مفہوم میں ایک بات یہ نکلتی ہے کہ جب اس نے دعوت کی تو اس نے خود اسے کھلانے پر مدد دی۔ گویا اسے کھلایا اور جب اس نے دعوت قبول نہ کی تو اس نے کھلانے پر تعاون ترک کر دیا اور تفریع کے تحت داخل ہُوا، یعنی اس نے اپنے آپ کو نہیں کھلایا حالانکہ وُہ مسلمان ہے اور اس نے اس کی دعوت قبول نہیں کی۔ خوب سمجھ لو۔

چوتھی نیت مومن بھائی پر مسرت لانے کی نیت ہے۔ ایک دُوسری خبر میں ہے:

"جس نے ایک مومن کو مسرت دی اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا۔"

پانچویں نیت اس کے دل سے غم دُور کرنے کی ہے۔ جب وُہ دعوت نہ کرے گا تو بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور اسے غم لاحق ہوگا اور غیبی طور پر بدگمانیوں کا باعث دعوت قبول نہ کرنا ہی ہے۔ شاید اس کے دعوت قبول کرنے پر بدگمانیاں اُٹھ جاتیں اور بدظنی کا دُکھ دُور ہو جاتا ہے اور سابقہ یقینِ الفت میں شبہات نہ آتے۔

چھٹی نیت اپنے بھائی کی ملاقات کی ہونی چاہیے۔ یہ بات اس کے لیے نفلی اجر ہوگی اور کامل نیکی ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر بھائی کی ملاقات کرنے میں بہت فضیلت ہے۔ اس عمل کے ذریعہ وُہ اللہ تعالیٰ کی ولایت کا حقدار بن سکتا ہے۔ اور یہ بات متحابین فی اللہ کی ولایت کی علامت ہے۔ اس میں دو شرطیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی رضا کی خاطر خرچ کرے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر ہی ملاقات کرے۔ ایک کی جانب سے خرچ ہُوا۔ اور دوسرے کی جانب سے ملاقات ہُوئی جیسے کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت قبول کرنا تواضع سے ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ متکبر لوگ دعوت قبول نہیں کرتے۔ جس کو اس عمل کی توفیق ملے اسے یہ سات نیات کرنی چاہئیں۔ اگر کسی فقیر پر فاقہ شدت اختیار کرے اور وُہ اپنے کسی مسلمان بھائی کے پاس کھانے کے ارادہ سے جائے تو دو شرطوں کے ساتھ یہ جائز ہے۔ اس کے پاس کوئی کھانے کی چیز نہ ہو اور اس کی نیت یہ ہو کہ اس کے بھائی کو اس کا اجر ملے اور وہی اس کے اجر کا باعث بن رہا ہے اور وہی اسے ثواب دلانے کا سبب بن رہا ہے۔

ایسا کرنا تقویٰ و نیکی کے کام میں تعاون کرنا ہے۔ مساکین کو اور اپنے جیسے فقیر کو کھانا کھلانے کی ترغیب دینے میں داخل ہے۔ مزید برآں اس کے بھائی کو صورتِ حال سے آگاہی نہ تھی۔ اگر علم ہوتا تو وُہ خود کھلا کر مسرور ہوتا۔ سلف صالحین کی ایک جماعت نے ایسا کیا ہے۔

اسی مفہوم میں سلف صالحین سے تین طرق مروی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عون بن عبداللہ مسعودیؒ تھے ان کے تین سو ساٹھ دوست تھے۔ ہر روز ایک کے کھانا ہوتا۔ ایک دُوسرے بزرگ کے تین سو دوست تھے ہر ایک کے ہاں ایک دن رات رہتے۔ اس قدر احباب کے ہوتے ہُوئے وُہ ایسے اخلاقِ کریمہ کو بہتر سمجھتے۔ کمانے اور معلوم مال پر اسے ترجیح دیتے۔ ان کے احباب معلوم تھے اور یہ نہ کماتے اور نہ ذخیرہ کرتے۔ ان کے احباب بھی نیک نیت تھے۔ وُہ خود ان سے پُوچھتے اور ان پر مال تقسیم کرتے اور انہیں افضل شمار کرتے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہی لوگ اپنے احباب کو دعوت دے کر اور انہیں پاس رکھ کر ان کا اکرام کرتے تھے۔ حضرت سعید بن ابی عروۃ احباب پر کھانا پیش نہ کرتے بلکہ اسے سامنے رکھ دیا کرتے اور انہیں اجازتِ عامہ دے دیتے۔ چنانچہ ان کے ہاں جو کچھ ہوتا وُہ سامنے لٹکا ہُوا ہوتا اور روٹیاں بھی سامنے پڑی ہوتیں۔ اسی طرح کپڑے سامنے لٹکا دیتے اور سامان بھی سامنے ہی رکھ دیتے۔ جس کا جی چاہتا گھر میں داخل ہو کر گوشت کاٹتا اسے بھُون کر اور پکا کر کھا لیتا۔ جو سالن پاتا اس سے روٹی کھا لیتا۔ جس کا جی چاہتا اپنی مرضی کا کپڑا لے کر پہن لیتا۔ یعنی ان کے مکان میں ہر چیز لینے کی اجازت تھی جو چاہے لے لے۔

بعض حضرات دُنیا سے الگ ہو کر اپنے مسلمان دوست کے مکان میں رہ جاتے، بقدرِ کفایت لے لیتے، اور اس جگہ زندگی گزار دیتے جیسے وُہ اپنے مکان میں تصرف کر لیا کرتے تھے ویسے ہی اپنے دوست کے مکان میں آزادانہ تصرف کیا کرتے۔

بعض علماءؒ کا فرمان ہے،

"دو کھانوں کا بندے پر محاسبہ نہیں؛

۱۔ جو اس نے سحری میں کھایا۔

۲۔ جو اس نے اپنے احباب کے ہاں ان کا اکرام کرتے ہُوئے کھایا۔" جو آدمی کسی قوم کے پاس کھانا کھائے وُہ فارغ ہوتے وقت یہ کلمات کہے:

اَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ وَ اَكَلَ طَعَامَكُمُ الْاَبْرَارُ وَ صَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ۔ (روزہ داروں نے تمہارے پاس افطار کیا، ابرار نے تمہارے کھانا کھایا اور فرشتوں نے تم پر دعائے رحمت کی)

ایک دُعا یہ بھی مروی ہے،

مَلَائِکَۃُ صَلاَۃَ قَوۡمٍ اَبۡرَارٍ لَیۡسُوۡا بِاٰثِمِیۡنَ وَ لاَ فُجَّارٍ یَقُوۡمُوۡنَ اللَّیۡلَ وَ یَصُوۡمُوۡنَ النَّهَارَ۔ (تم پرنیکوں کی قوم کی دعائے رحمت ، وہ نہ گناہ کرتے ہیں اور نہ فجور کرتے ہیں۔ رات کو نماز پڑھتے ہیں اور دن کو روزہ رکھتے ہیں)

ہاتھ دھونے کا طریقہ ہر آدمی ہاتھ دھونے کے آداب سے بھی آگاہ نہیں ہے جیسے کہ ہر آدمی مسنون طریقہ پر کھانے سے آگاہ نہیں۔ جو آدمی اشنان سے ہاتھ دھوئے وہ پہلے تین انگلیاں دھوئے پھر اشنان کو خشک حالت میں بائیں ہتھیلی میں رکھے۔ پھر اسے دونوں ہونٹوں پر چھو کر گزارے، اپنا منہ ، دانت ، تالو اور زبان انگلیوں کے ساتھ دھوئے۔ پھر پانی کے ساتھ انگلیاں دھو دے۔ پھر باقی خشک اشنان کو منہ میں ملوائے تاکہ اس کے ہاتھوں سے چکناہٹ اس طرف دوبارہ نہ آجائے اور دوبارہ اس طرح دھو لینا کافی ہے اور جو آدمی کھانے کے بعد احباب کے ہاتھ دھلوائے اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں پر شیریں پانی ڈالے (یعنی جو کھارا نہ ہو) اس خوبی سے اس کی دعوت میں حسن نیت کا پتہ چلتا ہے اور اکرام مہمان کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض فرمایا کرتے ،

"ایک آدمی اپنے احباب کی دعوت کرتا ہے تو ہر طرح کے عمدہ کھانے پیش کرتا ہے۔ شیرینی بھی ان کے کام و دہن کی تواضع کرتا ہے مگر بعد میں نمکین پانی سے ان کی زبان کھاری کر دیتا ہے۔ یہ بات کم فہمی اور حسن تدبیر و رعایت میں نقص کی علامت ہے۔"

کھانے کے بارے میں کراہت و فضیلت کے اقوال

یہ سنت کے طریقوں اور صنائع عرب سے ہے۔ ہم نے کہیں کہیں ضمنی طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔ ایسے کہ یہ قدماء کی کلام سے منقول ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جس نے دسترخوان کا گرا پڑا (ٹکڑا یا کھانا) کھایا وہ وسعت میں جیا اور اس کی اولاد میں عافیت رہی۔"

حضرت سعید بن لقمان کی روایت میں ہے۔ انہوں نے عبدالرحمٰن انصاری سے ، انہوں نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے سنا۔ بتاتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا :

"بازار میں کھانا کمینگی ہے"

اس کی سند غریب ہے اور یہ صحیح نہیں کہ یہ ابراہیم نخعی تابعی اور ان کے علاوہ کسی دوسرے کا قول ہے۔

حضرت جریر نے حضرت ضحاک سے ، انہوں نے نزال بن سبرۃ سے ، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ فرمایا :

جس نے نمک کے ساتھ کھانے کی ابتداء کی۔ اللہ تعالیٰ اس سے ستر قسم کی آفات دور کر دے گا اور

جس نے ایک دن میں سات عجوہ کھجوریں کھائیں۔ اس کے پیٹ کا ہر کرم مارا گیا اور جس نے ہر روز اکیس کشمش سُرخ کھائے وُہ اپنے جسم میں کوئی ناپسندیدہ مرض نہ دیکھے گا۔ اور گوشت، گوشت پیدا کرتا ہے۔ ترید، عربوں کا کھانا ہے۔ اُونٹنی کا گوشت پیٹ کو بڑھاتا اور جوڑوں کو ڈھیلا کرتا ہے۔ گائے کا گوشت بادی ہے۔ اس کا دُودھ شفا ہے، اس کا گھی دوا ہے اور چربی اپنے جیسی چیز پیدا کرتی ہے اور نفاس والی عورتیں تازہ کھجور سے زیادہ بہتر چیز سے شفا حاصل نہیں کر سکتیں اور مچھلی بدن کو پگھلاتی ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مسواک بلغم کو دُور کرتے ہیں۔ جو باقی رہنا اور باقی رکھنا چاہتا ہے وہ صبح جلدی کھانا کھائے۔ عورتوں سے کم خلوت کرے، اور رداء یعنی قرض میں کمی رکھے۔

اُمراء کے واقعات میں آتا ہے کہ حجاج نے بنادق طبیب سے کہا:

"ایسی بات بتاؤ کہ اس پر عمل کروں اور تعداد نہ کروں۔"

اس نے کہا: "صرف جوان عورت سے نکاح کر، صرف جوان گوشت ہی کھا، پکی ہُوئی چیز تب ہی کھا کر وُہ خوب پک جائے۔ صرف مرض کی حالت میں دوا پی، پھل اس وقت کھا کہ جب وُہ پک جائے، کھانا خُوب چبا کر کھا، جو چاہو کھاؤ مگر اس کے بعد پانی نہ پیو، اگر پانی پی لو تو پھر کھاؤ نہیں، پیشاب و پاخانہ نہ روکو، جب دن کا کھانا کھا لو تو سو جاؤ اور جب رات کا کھانا کھاؤ تو سونے سے پہلے چلو، چاہے سو قدم چلو۔"

اس طبیب نے حکمت کی باتیں بتائی ہیں اور ان میں سے بعض کے بارے میں آثار بھی مروی ہیں۔ بعض کا قول ہے:

"دوا پینا ایسے ہے جیسے کپڑے پر صابن استعمال کیا جائے، وُہ صاف کر دیتا ہے مگر اُسے پُرانا کر دیتا ہے۔"

ایک منقطوع خبر میں ہے جس کو ابوالخطاب بن عبداللہ بن بکرؒ نے رفع کیا۔ فرمایا:

"جس کو معمولی مرض ہو وُہ دوا نہ کرے۔ اس لیے کئی دوائیں مرض پیدا کر دیتی ہیں۔"

حکماء کا فرمان ہے:

"جس قدر تیری غذا مرض کو اٹھا سکے اسی قدر دوا کے ذریعہ دفاع کر۔"

بعض کا فرمان ہے:

"دوا کی مثال صابون کی طرح ہے جو کپڑے کو صاف کر دیتا ہے مگر اسے پُرانا کر دیتا ہے۔"

بقراط کا قول ہے:

"دوا اوپر سے ہے اور مرض نیچے سے ہے۔ جس کا مرض ناف سے اُوپر پیٹ میں ہو اسے دوا پلائی جائے اور جس کا مرض ناف سے نیچے ہو اسے حقنہ کیا جائے۔ اور جس میں نہ اوپر سے مرض ہو اور نہ نیچے سے مرض ہو، اسے

نہ پلائی جائے۔ اگر دوا پلا دی تو جب وہ مرض نہ پائے گی جہاں اپنا اثر کرے تو صحت میں مرض پیدا کر دے گی۔"

ایک روایت میں ہے:

"رنگین کا "نا مبغوض بات ہے اور رات کا کھانا ترک کھانا بڑھاپا لانا ہے۔"

عرب کہا کرتے ہیں،

"غذا چھوڑ دینا۔ چوتڑوں کی چربی دُور کرتا ہے۔"

بعض سلف کا فرمان ہے،

"اطبا نے مجھے کھانے کے دوران پانی پینے سے منع کیا۔"

اور عرب کہا کرتے ہیں:

تعش و تمش و تغد و تمد یعنی رات کا کھانا کھا کر چلو پھرو اور صبح کا کھانا کھا کر لیٹ جاؤ۔ تمد سے مراد تمدد ہے یعنی الف کو دوسرا دال بنا دیا تا کہ تکرار لازم نہ آئے اور کلام بھدی نہ ہو کر رہ جائے۔ اس سے فرمانِ الٰہی ہے۔

ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ [۱] (پھر گیا اپنے گھر کو اکڑتا)

یتمطی سے مراد ہے یتمطط۔ دُوسرے طاء کو الف بنا دیا۔ مطلب ہوا یمد مطاہُ۔ یعنی وہ پشت باندھتا اور اکڑتا جا رہا تھا۔

پاخانہ روکنے کے بارے میں فلاسفر کا قول ہے،

"اگر کھانا چھ گھنٹے سے پہلے نکل جائے تو معدہ میں تکلیف سمجھو اور اگر چوبیس گھنٹوں سے زیادہ عرصہ تک پڑا رہے اور پاخانہ نہ آئے تو بھی معدہ پر تکلیف ہوگی۔"

بتاتے ہیں:

"پیشاب روکنے سے جسم کو نقصان ہوتا ہے جیسے کہ اگر نہر کا چلتا پانی روک دیا جائے تو نہر کے کناروں کو نقصان ہوتا ہے اور اس کے کنارے ٹوٹ کر پانی بہنے لگتا ہے۔"

بتاتے ہیں کہ جوڑوں کی تکلیف، ہوا روکنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

شیخ ابو طالبؒ فرماتے ہیں،

"میں نے حکمت میں پڑھا ہے: چار باتوں میں تمام امور کی اصلاح پائی جاتی ہے،

---

[۱] القیمۃ ۳۳۔

۱۔ اشتہا پیدا ہونے کے بعد ہی کھانا کھائے۔

۲۔ عورت صرف اپنے خاوند کی طرف نظر کرے۔

۳۔ سلطنت صرف اطاعت سے درست رہتی ہے

۴۔ رعایا کا معاملہ عدل کے ذریعہ درست رہتا ہے

رُوم کے بعض حکما سے پوچھا گیا؛

"کس وقت میں کھانا بہتر ہے؟"

کہا؛ "امیر آدمی کو جب بھوک لگے تب کھائے اور غریب آدمی کو جب ملے تب کھالے۔"

بتاتے ہیں: "جب مقدرت زیادہ ہوجاتی ہے تو اشتہا کم ہوجاتی ہے۔"

کسریٰ نے اپنے ہم نشینوں سے کہا؛

"انسان کے اندر کون سی خصلت زیادہ مضر ہے؟"

سب نے کہا: "فقر۔"

اس نے کہا: "بخل تو فقر سے بھی سخت تر ہے۔ اس لیے کہ فقیر کو مال حاصل نہیں اور بخیل کے پاس مال موجود ہے اور پھر بھی نہیں کھاتا۔"

ایک فربہ آدمی سے پُوچھا گیا؛

"تُو کیسے فربہ ہو گیا؟"

اس نے کہا؛

"گرم کھانے، ٹھنڈا پینے، بائیں سمت پر سہارا لینے اور دُوسرے کے مال سے کھانے سے موٹا ہُوا۔"

ایک دُوسرے آدمی کا بدن خُوب سڈول اور خُوبصورت تھا۔ اس سے پُوچھا گیا؛

"تیرے جسم کو کس نے خوب صورت کس دیا؟"

کہا: "کم فکری، فاقہ کی کثرت۔"

ایک حکیم نے ایک فربہ آدمی کو دیکھا تو کہا؛

"میں تیرے اوپر گوشت دیکھتا ہُوں جس نے تیرے دانتوں کو آراستہ کر دیا۔ یہ کیا ہے؟"

کہا: "میں بڑھیا اور چھوٹی بکریاں کھاتا ہوں۔ بنفشہ کا تیل لگاتا ہُوں اور سُوت پہنتا ہُوں۔"

عرب کہا کرتے ہیں:

(کھانا کھانے والا انکار کرنے والوں کو اشتہا لاتا ہے) المعاشیة تهيج الآبية۔

یعنی کسی آدمی کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کر انکار کرنے والے کو بھی بھوک لگ جاتی ہے۔
اصمعی نے ذکر کیا کہ ایک حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی اور کہا:
"اے بیٹے، گھر سے کھانا کھائے بغیر نہ نکلنا"
اس طرح بازار جاتے اور لوگوں کی ملاقات کرنے کے لیے جانے سے پیشتر کھانا کھا لیا جائے تو بازار میں
، ملاقات کے موقع پر کھانے کی اشتہاء زیادہ واقع نہیں ہوتی۔
ہلال بن مُعتم نے ایک شعر کہا ہے ؎

وَإِنَّ قِرَابَ الْبَطْنِ يَكْفِيكَ مِلْؤُهُ وَيَكْفِيكَ سَوْآتِ الْأُمُورِ اجْتِنَابُهَا

(پیٹ کا تھوڑا بھرنا تیرے لیے کافی ہے اور بُرے کاموں سے پرہیز کرنا تیرے لیے کافی ہے)
ایک بلند پایہ صوفی صاحب بازار میں چلتے چلتے کھا رہے تھے۔ ایک صاحب بتاتے ہیں کہ میں نے کہا:
"آپ بازار میں کھاتے ہیں؟"
فرمایا: "اللہ تجھے خیر عطا کرے، جب مجھے بازار میں بھوک لگے گی تو کیا گھر میں جا کر کھاؤں گے؟"
میں نے عرض کیا:
"آپ کسی مسجد میں جا کر کھا لیتے؟"
فرمایا: "مجھے اس بات سے حیا آتی ہے کہ اللہ کے گھر میں کھانے کے لیے جاؤں۔"
اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کھانا کھانا ایک دنیائی بات سمجھی۔ اس لیے اسے یہیں رکھا۔ جیسے کہا کرتے:
"بازار چوکوڑوں کے دسترخوان ہیں۔ وہ عبادت سے بھاگے اور بازاروں میں آکر بیٹھ گئے"
حضرت ابن عمرؓ سے ایک روایت ہے:
"ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چلتے چلتے بھی کھا لیتے اور کھڑے کھڑے بھی پی لیتے۔
بعض اہل طب کا فرمان ہے:
پرہیز بھی دو مرضوں میں سے ایک ہے!
کہا کرتے ہیں کہ تندرست کے لیے پرہیز بھی نقصان دہ ہو جاتی ہے جیسے کہ مریض کے لیے نفع بخش ہے۔
اور جب دوا کو مقام عمل (مرض) کا نہ ملے تو وہ صحت کے مقام کو ہی تختۂ مشق بنا لیتی ہے۔
ایک عرب کا شعر ہے ؎

وَرُبَّ حَزْمٍ كَانَ لِلْعَبْدِ عِلَّةً وَعِلَّةُ جَرِّ الدَّاءِ حِفْظُ التَّقَلُّلِ

(بندے کے لیے بدپرہیزی مرض ہے اور بیماری پیدا کا سبب پرہیز کی ہی ہے)

حضرت لقمان نے فرمایا:

"جس نے پرہیز کیا وُہ یقیناً کسی ناپسندیدہ اذیت تکلیف کی حالت میں ہے اور کھانے میں جو عافیت ہے اس سے شبہ میں ہے۔"

کہا کرتے ہیں:

"طبیب وہ نہیں جو بادشاہوں کو پرہیز کرائے اور اشتہاؤں سے روکے بلکہ طبیب وہ ہے جو انہیں ان کی مرغوبات استعمال کرنے دے۔ پھر ایسی حسن تدبیر سے کام لے کہ ان کے اجسام صحیح رہیں۔"

ایک مدنی آدمی نے ایک اعرابی سے پُوچھا:

"بتاؤ کیا کھاتے ہو اور کیا چھوڑتے ہو؟"

اس نے کہا:

"ہم ام حنین کے سوا جو چلتا ہو اور زمین میں داخل ہوتا ہو اسے کھاتے ہیں۔"

مدنی نے جواب دیا:

"ایک روایت میں ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صہیبؓ کو کھجور کھاتے دیکھا۔ ان کی آنکھیں متورم تھیں۔ فرمایا:

"تمہاری آنکھوں میں سوزش ہے اور کھجوریں کھاتے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول، میں اس طرف دوسری سمت سے کھا رہا ہُوں یعنی جو آنکھ درست ہے اس طرف سے کر کے کھا رہا ہوں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔

پیٹ بھرنے کی مذمت اور پرہیز کرنے کے اقوال

کھانے کی مقدار

حضرت اسمٰعیل بن عیاش نے شرجیل بن مسلمؓ سے روایت کیا کہ حضرت ابو الدرداء نے فرمایا۔ دین کے خلاف سب سے بڑے معادن یہ ہیں:

۱۔ کمزور دل

۲۔ لالچی پیٹ

۴۔ اشتہائے شدید"

بعض حکماء سے پوچھا گیا:

"کون سا کھانا عمدہ ہے؟"

کہا: "بھوک خوب جانتی ہے۔ یعنی بھوک کی وجہ سے کھانا عمدہ ہو جاتا ہے"۔ جیسے کہ ایک قول ہے:

"بہترین سالن، بھوک ہے"۔ جو کھانے سے پہلے اس پر طاری ہوئی۔

حضرت عتبی بتاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ نے اہل مدینہ میں سے ایک آدمی کو کہا:

"بھائی، مجھے بڑی حیرت ہے کہ تمہارے فقہاء، ہمارے فقہاء سے زیادہ ظریف ہیں۔ تمہارے عوام، ہمارے عوام سے زیادہ ظریف ہیں، تمہارے دیوانے بھی ہمارے دیوانوں سے زیادہ ظریف ہیں"۔

کہا: "جانتے ہو یہ کیوں ہے؟"

میں نے کہا: "نہیں"

کہا: "اس کی وجہ بھوک ہے۔ دیکھو جب عود کا بطن خالی ہو تو اس کی آواز خوب صاف ہوتی ہے"۔

حضرت عبداللہ زبیرؓ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم کی دعوت کی۔ حضرت حسنؓ اور ان کے اصحاب تشریف لائے۔ سب نے کھایا مگر انہوں نے کھایا۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"میرا روزہ ہے البتہ روزہ دار کا تحفہ؟"

کہا: "وہ کیا ہے؟"

کہا: "تیل اور خوشبو"۔

اسی طرح کہا کرتے ہیں:

"سرمہ اور تیل دو قریب میں سے ایک ہے اور دودھ دو گوشتوں میں سے ایک گوشت ہے اور مہمان کے ساتھ مزاح کرنا اور باتیں بھی ایک ضیافت ہے۔ اس لیے جو روزے سے ہو اور کھانے پر آئے۔ اگر وہ نہ کھائے تو خوشبو لگائے اور خوش گپی کرے۔ یہی اس کا زاد ہے"۔

بتاتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرةؓ، حضرت معاویہؓ کے دسترخوان پر تھے۔ حضرت معاویہؓ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بڑے بڑے لقمے اٹھا رہا ہے۔ جب رات کا کھانا آیا تو تنہا ابوبکرة ہی ان کے پاس گئے۔ پوچھا:

"تیرے بڑے نوالے کھانے والے بیٹے کا کیا حال ہے؟"

انہوں نے بتایا کہ وہ بیمار ہو گیا۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا: "ایسا آدمی مرض سے محفوظ نہیں رہتا"۔

حضرت ابوبکرہؓ سے کہا گیا:

"آپ کے لڑکے نے اس قدر کھایا کہ انہیں بدہضمی ہو گئی۔"

فرمایا: "اگر وہ مر جاتا تو میں اس کا جنازہ نہ پڑھتا۔"

اور کہا کرتے ہیں:

للبشم سکر کسکر الخ (بدہضمی کی شراب کے نشہ کی طرح ایک نشہ ہے)

حارث بن کلاہ ایک عرب طبیب سے پوچھا گیا:

"وہ کون سی دوا ہے جس میں مرض نہیں؟"

"ایسی دوا لازم یعنی پرہیز ہے۔"

جالینوس سے پوچھا گیا:

"تم کھانا بہت کم کھاتے ہو؟"

فرمایا: "میری کھانے کی غرض یہ ہے کہ زندہ رہوں دوسرے لوگ اس لیے زندہ ہیں کہ کھایا کریں۔"

کہا کرتے ہیں:

"انار سے زیادہ نفع بخش چیز انسان نے اپنے پیٹ میں نہیں ڈالی اور نہ نمک سے زیادہ مضر چیز ڈالی۔ اب انار بڑھانے سے نمک کی کمی زیادہ نفع بخش ہے۔" اس میں کثرتِ طعام کی مذمت ہے چاہے وہ نفع بخش ہو اور کمی طعام کی تعریف کی چاہے یہ ضرر میں سے ہے۔

حضرت عبدالمنعم بن ادریسؒ نے اپنے والد سے، انہوں نے حضرت وہب بن منبہؒ سے روایت کیا: کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو فرمایا:

"اے بیٹے! بیت الخلاء میں زیادہ دیر بیٹھنے سے سر کی طرف حرارت چڑھتی ہے۔ ناسور پیدا ہوتا ہے اور جگر کو کاٹتا ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اُٹھ جاؤ۔" فرمایا: "اسے بیت الخلاء پر لکھ دو۔"

بتاتے ہیں کہ حجاج نے اپنے ہم نشینوں سے پوچھا:

"عجز دور کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر چیز کیا ہے؟"

انہوں نے کہا: "کھجور کھانا۔"

بعض کا قول ہے: "حمام کرنا۔" بعض نے جماع کرنا بتایا اور کچھ لوگوں نے سماخ (کان کا میل) یا بکری کے تھنوں کی رکاوٹ نکلنا بتایا۔ تیاذوق نے کہا:

"قضائے حاجت ایسی چیز ہے جو عجز (و تساہل) کو دور کرتی ہے۔"

بعض اطباء کا قول مروی ہے کہ ایک آدمی نے معجون خبث الحدید کھالی تو وہ اس کے پیٹ میں ٹھہر گئی۔ اور سخت درد پیدا کر دیا۔ بتاتے ہیں کہ میں نے مقناطیس کا ایک ٹکڑا پیش کر دیا اس کے پیتے ہی خبث الحدید اسے چپک گیا اور پاخانہ کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

اصمعیؒ نے جعفر بن سلیمان سے نقل کیا کہ تیا ذوق نے بتایا:

"گوشت پر گوشت کھانا، درندے کو جنگل میں مار ڈالتا ہے۔"

پھر ابو جعفر نے بتایا کہ ہماری ایک لونڈی نے کہا کہ ہمارے پاس ایک ہرن تھا۔ اس نے گوندھا ہوا آٹا دیکھا تو اُسے کھا گیا۔ اب اس کا پیٹ پھول گیا۔ اسے ذبح کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا خون نکل آیا تھا۔

یونس طبیب کا کہنا ہے کہ اسی طرح جب انسان کو بدہضمی ہوتی ہے تو اس کا معدہ خون پھینکنے لگتا ہے۔

اصمعی نے بصرہ کے حاکم جعفر سے روایت کیا کہ اس نے ایک بہت زیادہ کھانے والے آدمی سے کہا:

" ایسا نہ کیا کر، اس لیے کہ جیسے چوپایہ زیادہ چارے کا عادی ہوجاتا ہے ایسے ہی معدہ زیادہ کھانے کا عادی ہوجاتا ہے۔ مگر غذا کو پکاتا نہیں (اس لیے غذا کا اکثر حصّہ ضائع ہو کر خارج ہوجاتا ہے)"۔

بعض کا فرمان ہے کہ تیاذوق سے گندہ ذہنی کا علاج پوچھا گیا، اس نے کہا:

" اس کا علاج یہ ہے کہ کشمش کو جَو میں گوندھ لیں۔ پھر دو یا تین ہفتہ یہ دوا کھلائی جائے۔"

اطباء کا قول ہے کہ پانی کا ہلکا پن معلوم کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جلدی کھولنے لگے، جلدی ٹھنڈا ہوجائے سورج کے سامنے ہو۔ شمال پر اس کا بہنے کا مقام ہو۔ سُرخ مٹی اور ریت پر گزرے۔

ابو طالبؒ فرماتے ہیں کہ اقوال میں سے آخری ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" روٹی کا احترام کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان سے نازل کیا۔"

چنانچہ روٹی کی برکات سے یہ ہے کہ سالن کا انتظار نہ کرے جو موجود ہو نمک، سرکہ اور سبزی وغیرہ اس کے ساتھ کھالے اور دسترخوان کے نیچے کوئی دُوسرا برتن وغیرہ اور پیالے کے نیچے بھی ایسی چیز نہ رکھے کہ جس سے چیز کو سہارا دیا جاتا ہو۔ کسی چیز کے لیے بڑی پلیٹ نہ لے اور اگر اس پر کھانا رکھ لیا تو کچھ حرج نہیں۔ سنّت وادب یہ ہے کہ جب جماعت موجود ہو تو غائب کا انتظار نہ کرے بلکہ حاضرین کے ہمراہ کھالے۔ اس لیے کہ حاضرین اور موجودہ کھانے کا احترام غائب آدمی سے زیادہ ضروری ہے۔ ہاں اگر غائب آدمی فقیر و محتاج ہو تو اس کی عزت افزائی کی خاطر انتظار کر لینے سے کچھ حرج نہیں تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔

اور اگر غائب آدمی دولت مند ہے تو فقراء کے موجود ہوجانے کے بعد اس کا انتظار نہ کرے۔ اس لیے کہ دولت مند کا انتظار کرنا ایک معصیت ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مروی ہے:

"بدترین کھانا ایسے ولیمہ کا کھانا ہے جس میں اغنیاء کو بلایا جائے۔ اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے"۔ چنانچہ آپ نے اغنیاء کی وجہ کھانے کو بدترین قرار دیا۔ کھانے کا قصور نہیں بلکہ اس پر اغنیاء کو بلانا اور فقراء کو نہ بلانا بری بات ہے اور اس کا اثر اس پر پڑا۔

اہل میت کے لیے کھانا

ماتم کا طعام دو قسم کا ہے:

۱۔ میت کے گھر والے نوحہ کرنے والوں اور رونے والوں کے لیے تیار کریں اور ماتم کرنے والوں کے لیے پکائیں۔ اس کا کھانا مکروہ ہے اور اس کی ممانعت ہے۔

۲۔ ایک وہ کھانا ہے کہ دوسرے لوگ اہل میت کے لیے کھانا لے جائیں اس لیے کہ وہ غم میں مبتلا ہیں اور اس میں کچھ حرج نہیں۔ اس سے کھانا جائز ہے۔ اس لیے کہ اگر ماتم کرنا اور بین کرنا مراد نہ ہو اور نہ ہی قبر پر بیٹھ کر جزع و فزع اور سوگ منانا مراد ہو تو یہ ایک نیکی اور احسان کی بات ہے۔

جب حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی وفات کی خبر آئی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جعفر کے گھر والے، میت کی وجہ سے کھانا تیار کرنے سے غافل ہیں اس لیے انہیں کچھ بھیجو، جو وہ کھائیں"۔

چنانچہ اہل میت کو کھانا بھیجنا سنّت ہے۔

ان کی دعوت نہ کھائے

اگر دعوت کرنے والے کے گھر میں پانچ باتیں ہوں تو ان کی دعوت قبول نہ کرے اور ایسی دعوت سے انکار کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

۱۔ اس کے دسترخوان پر شراب بھی کھانے کے بعد پی جاتی ہو چاہے اس وقت شراب نظر نہ آتی ہو۔

۲۔ گھر میں ریشم یا دیباج (ریشم کی قسم) کا فرش بچھا رکھا ہو۔

۳۔ بعض برتن سونے یا چاندی کے استعمال ہوتے ہوں۔

۴۔ مکان میں دیواروں پر اس طرح پردے لٹک رہے ہوں جیسے کہ کعبہ پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔

۵۔ کسی ذی روح کی تصویر نصب کر رکھی ہو یا دیوار پر بنا رکھی ہو۔

اگر کوئی آدمی دعوت قبول کرلے مگر وہاں جانے پر ان پانچ میں سے کچھ چیز نظر نہ آئے تو اس پر لازم ہے یا خود نکل آئے۔ یا ان چیزوں کو باہر کر دے۔ اگر وہاں بیٹھا تو ان کی برائی میں حصہ دار ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کھانے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے اپنے احباب کی ایک جماعت کے ہمراہ جانا قبول فرمایا۔ جب گھر میں پہنچے تو چاندی کے برتن استعمال ہوتے دیکھے۔ چنانچہ وہ باہر نکل آئے۔ ان کے اصحاب بھی باہر آگئے اور کھانا نہیں کھایا۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے اشنان کا برتن دیکھا جس پر چاندی کا ڈھکنا تھا۔ یہ دیکھ کر بیقرار ہوئے اور باہر نکل آئے۔

احمد بن عبدالخالق بتاتے ہیں کہ ابوبکر مروزیؒ نے بتایا کہ میں نے ابوعبداللہ سے پوچھا۔ ایک آدمی کو ولیمہ کی دعوت دی جائے تو وہ کس چیز کو دیکھ کر باہر نکل آئے؟

فرمایا، حضرت ابوایوب کو دعوت دی گئی جب انہوں نے مکان میں پردے لٹکے دیکھے تو باہر آ گئے۔
حضرت حذیفہ کو دعوت دی گئی انہوں نے عجمی لباس میں سے کچھ دیکھا تو باہر نکل آئے اور فرمایا:

"جو جس قوم جیسا لباس پہنے وُہ ان میں سے ہے۔"

میں نے حضرت عبداللہؒ سے عرض کیا:

"اگر کچھ چاندی کا (برتن وغیرہ) دیکھا تو کیا نکل آئے؟"

فرمایا: "ہاں، میرا خیال یہ ہے کہ نکل آئے۔"

بتایا کہ میں نے انہیں یہ فرماتے سنا:

"محنت سے پہلے ہمارے اصحاب میں سے ایک آدمی نے ہماری دعوت دی اور ہم اکثر عفانؒ کی طرف جایا کرتے تھے۔ جب وہاں پہنچے تو چاندی کے برتن دیکھے۔ میں نکل آیا اور سب لوگ میرے ساتھ ہی نکل آئے۔"

صاحبِ خانہ پر یہ بات بہت شاق گزری، میں نے ابُوعبداللہؒ سے کہا:

"ایک آدمی کو دعوت دی جاتی ہے اور وہاں جا کر وُہ سُرمہ دانی دیکھتا ہے جس کا سرا چاندی کا ہے۔"

فرمایا: "یہ تو عام استعمال کی چیز ہے۔ البتہ جو استعمال نہیں کی جاتی وہ دیکھے تو نکل آئے مگر وستہ میں رخصت دی۔" اس لیے کہ یہ آسان تر ہے اور میں نے باریک پردے کا پُوچھا تو اسے ناپسند کیا۔ میں نے کہا:

"میں اس کو پھینک دوں یا چھوڑ دوں؟" تو اس میں انہوں نے کچھ ہرج نہیں سمجھا۔

میں نے ابوعبداللہ سے عرض کیا:

"ایک آدمی نے ایک جماعت کو دعوت دی۔ چنانچہ چاندی کی طشتری یا لوٹا لایا، مہمان نے اسے توڑ دیا۔ کیا اس کا توڑنا جائز ہے؟"

فرمایا: "ہاں۔"

ابوبکر مروزیؒ نے بتایا:

"میں نے پوچھا: ایک آدمی کو دعوت دی گئی اس نے ریشم کا فرش دیکھا تو کیا اس پر بیٹھ جائے یا کسی دوسرے مکان میں بیٹھے؟"

فرمایا: "وہاں سے نکل جائے۔" حضرت ابوایوبؓ اور حضرت حذیفہؓ نکل گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں بھی نکل جانا مروی ہے۔

میں نے عرض کیا ؛
"کیا انہیں نکل جانے کا حکم دیا جائے ؟"
فرمایا؛" ہاں - انہیں بتایا جائے کہ یہ ناجائز ہے۔"
میں نے ابو عبداللہ سے عرض کیا ؛
" گھر میں ریشم کا فرش ہو اور کسی چیز کے سلسلہ میں انسان کو دعوت دی جائے تو کیا خیال ہے ؟"
فرمایا؛" نہ وہاں جائے اور نہ ہی ان کے پاس بیٹھے "۔
میں نے کہا ،
" ایک آدمی کو دعوت دی جائے اور وہاں باریک پردہ ہے۔"
انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا ،
" یہ ریا ہے۔ یہ نہ سردی روک سکتا ہے اور نہ گرمی روک سکتا ہے۔"
میں نے عرض کیا ،
"ایک آدمی کو دعوت دی جاتی ہے وہ دیکھتا ہے کہ دیواروں پر تصاویر ہیں "۔
فرمایا ؛" انہیں نہ دیکھے "۔
میں نے کہا ؛" گاہے نظر پڑ جاتی ہے ۔"
فرمایا :" اگر ہو سکے تو انہیں مٹا دے ۔"
بتاتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا :
"پردے میں قرآن کی آیات لکھی ہوں تو اس کا کیا حکم ہے ؟"
اس کو بھی ناپسند فرمایا - فرمایا ،
" قرآن مجید کی آیات کسی نصب شدہ چیز پر نہ لکھی جائیں اور نہ ہی پردوں وغیرہ پر ۔"
میں نے عرض کیا :
"ایک آدمی مکان کرایہ پر لے اور اس میں تصاویر ہوں تو کیا انہیں کھرچ کر صاف کر دے ؟"
فرمایا ؛" ہاں "
میں نے ابو عبداللہ سے عرض کیا :
" میں حمام میں جاؤں اور وہاں کوئی تصویر دیکھوں تو کیا اس کا سر کھرچ کر ختم کر دوں ؟"
فرمایا ؛" ہاں "

میں نے اخروٹ کے بکھیرنے کے بارے میں پوچھا۔ اس کا اسناد جید ہے۔ ابوحصین نے خالد بن مسعودؒ سے نقل کیا کہ ابوبکر مروزیؒ نے بتایا :

" میں ابو عبداللہ کے پاس حاضر ہُوا۔ ان کا لڑکا سمجھدار ہو چکا تھا۔ اس نے اخروٹ خریدے تاکہ بچوں پر بکھیر کر تقسیم کرے۔" ابوعبداللہؒ نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا :

" یہ لوٹ ہے۔"

ہاشم بن قاسمؒ نے بتایا کہ محمدؒ نے فرمایا :

" طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما ، شادی اور کھانے کے موقع پر اخروٹ اور شکر بکھیرنے کو ناپسند کرتے تے۔"

فرمایا : " میں نے ابوعبداللہؒ سے پوچھا : روٹی اور خمیر کو بانٹنا کیسا ہے ؟"

فرمایا : " اس میں کچھ حرج نہیں۔ جدید میں آخری زیادتی "

پانچ کی دعوت قبول نہ کرے

پانچ آدمیوں کی دعوت قبول نہ کرے۔ اگر آدمی کو دعوت دی جائے اور اسے ان باتوں کا علم نہ ہو وہاں پہنچنے پر یہ برائی معلوم ہو تو باہر نکل آنے میں کچھ حرج نہیں۔

۱۔ بدعتی آدمی کی دعوت قبول نہ کرے۔

۲۔ ظالموں کے مددگاروں کی دعوت قبول نہ کرے۔

۳۔ سُود کھانے والے کی دعوت قبول نہ کرے۔

۴۔ ایسا فاسق جو برملا فسق میں مبتلا ہو اس کی دعوت قبول نہ کرے۔

۵۔ جس کا مال زیادہ تر حرام ہو اور عوام کے ساتھ دھوکہ کرتا ہو اور جرائم سے پرہیز نہ کرتا ہو۔ اس لئے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" صرف پرہیزگار کا کھانا ہی کھا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ پرہیزگار آدمی کھانے پینے کے سلسلہ میں خوب پرہیز سے کام لیتا ہے۔ اس نے تمہیں کھلا کر سوال سے مستغنی کر دیا۔ متقی آدمی نے تجھے کھلا کر نیکی اور تقویٰ پر مدد دی اور وُہ تقویٰ پر معاون ہُوا ، جیسے کہ فرمانِ الٰہی ہے۔ اب وُہ نیکی میں حصّہ دار ہے اور اگر تُو نے ظالم اور بدمعاش آدمی کا کھانا کھایا تو اس کے اشتراک کے باعث ظالموں کا مددگار بن گیا۔

خیاط بن مبارکؒ نے پُوچھا کہ "میں بعض ظالموں کے وکلا کے لیے سیتا ہوں تو کیا یہ خطرہ ہے کہ میں ظالموں کا مددگار ہوں ؟"

فرمایا : " تو ظالموں کا مددگار نہیں بلکہ تُو خود ظالموں میں سے ہے۔ ظالموں کے مددگار تو وُہ ہیں جو تجھ سے

دھاگہ اور سوئی خریدتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے تقویٰ کے سلسلہ میں اس سے دقیق تر کلام کیا۔ بادشاہ نے انہیں قید کر دیا۔ اس لیے کہ ایک غامض علم کے کلام پر عوام نے ان پر انکار کیا تھا۔ سلطان کی طرف ان کے پاس کھانا آتا تھا۔ وہ اس سے کچھ نہ کھاتے اور ایک زمانہ تک قید خانہ میں رہے مگر کبھی کچھ نہیں کھایا۔ ان کی ایک اسلامی بہن تھی جو اللہ کی خاطر ان کی بہن بن چکی تھی۔ وہ گھر سے کھانا بھیجتی۔ وہ کھانا ان کے سامنے پیش کر کے انہیں بتایا جاتا کہ یہ کھانا فلاں نیک عورت کی طرف سے ہے۔ وہ پھر بھی کھانا نہ کھاتے۔ جب وہ قید خانہ سے رہا ہوئے تو بڑھیا سے ملاقات ہوئی اس نے کھانا واپس کرنے کی وجہ پوچھی اور کہا:

"آپ جانتے تھے کہ یہ کھانا میرے گھر سے تھا؟"

فرمایا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے مگر یہ ایک ظالم کی طشتری میں آیا۔ ظرف کی وجہ سے میں نے اسے واپس کر دیا۔ یعنی اس قید خانے کے ناظم کے ہاتھ سے آیا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عید کے روز کوفہ کے ایک دہقان نے ان کے پاس سونے کے پیالے میں حلوا بھیجا۔ دراصل وہ ان کا احترام کر رہا تھا۔ انہوں نے واپس کر دیا اور نہیں کھایا۔ فرمایا:

میں نے اسے اس برتن کی وجہ سے واپس کیا ہے جس میں یہ حلوا تھا۔

حلال کی اہمیت

ایک قول ہے،

"جس نے حرام کا ایک نوالہ کھایا چالیس روز تک اس کے قلب میں قساوت رہی۔"

ایک قول ہے کہ (چالیس روز) تک اس کے قلب میں اندھیرا رہا اور جس نے چالیس روز تک حلال کھایا اس نے دنیا میں زہد اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایمان داخل کر دیا۔ اس کی زبان پر حکمت کا کلام جاری فرما دیا۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"جب ایک آدمی نے حلال کھایا تو حلال کھانے ہی اللہ تعالیٰ نے اس کے سابقہ گناہ بخش دیے۔"

ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں،

"جس نے طلبِ حلال میں اپنے آپ کو تواضع میں ڈالا اس کے گناہ اس طرح جھڑ گئے جیسے کہ سرما کے موسم میں درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔"

قریہ قریہ پھرنے والوں اور اسفار میں رہنے والوں کے بارے میں حضرت سہلؒ نے فرمایا:

"اگر ایک آدمی کسی بستی میں جائے اور مشتبہ چیز ہی مل سکے۔ اس لیے بھوکا رہے اور فاقہ سے رات گزارے

تو اس ساری بستی والوں کے سارے اعمال کے برابر اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی۔

اگر بادشاہ نے کسی کو کھانے پر مجبور کیا یا اس کے سامنے مشتبہ چیز رکھی تو اس کا کھانا مکروہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ مریض بن جائے اور رنگ بدل کر بہانہ کرے اور خوشی سے نہ کھائے اور لقمہ بڑا نہ کھائے اور نہ ہی زیادہ کھائے۔ صرف اسی قدر کھائے کہ جان بچ جائے اور بھوک کی شدت کم ہو جائے اور جان تلف ہونے کا خطرہ نہ رہے۔

ایک گواہ کا کہنا ہے کہ خراسان کے اہلِ علم میں سے ایک مزکی (جو گواہی کے صحیح ہونے کی گواہی دے) نے اس آدمی کی گواہی رد کر دی جس نے بادشاہ سے کھانا کھایا تھا اور بادشاہ نے اسے مجبور کر کے کھلایا تھا۔ اس گواہ نے کہا:

"بادشاہ نے مجھے کھانے پر مجبور کیا۔"

مزکی نے کہا:

"مجھے یہ معلوم ہے مگر میں تیری شہادت اس لیے رد نہیں کرتا کہ تُو نے یہ کھانا کھایا بلکہ اس لیے رد کرتا ہوں کہ تُو چاہت سے کھا رہا تھا اور بڑے نوالے ڈال رہا تھا۔ کیا بادشاہ نے تجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا؟ بس یہی وجہ ہے کہ میں نے تجھے حاکم کے پاس مجروح گواہ قرار دیا۔"

ایک شیخ کا فرمان ہے کہ بادشاہ نے اس مزکی کو اپنے ہاں سے کھانے پر مجبور کیا۔ مزکی نے کہا:

"دو باتوں میں سے ایک پسند کر لو یا تو جیسے تم حکم کرتے ہو میں کھا لیتا ہوں اور اس کے بعد کسی کا تزکیہ نہیں کروں گا اور کسی گواہ کو مجروح یا عادل نہیں بناؤں گا اور یا پھر مجھے تزکیہ کرتے ہوئے جرح و تعدیل کے کام پر رہنے دو اور تمہارا کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

سلطان اور اس کے مصاحبین نے سوچا کہ ہم اس کے محتاج ہیں اور ایسا آدمی بہت ہی نایاب ہے۔ اس کے کام کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور اس نے ان کے کھانے سے کچھ چیز نہ کھائی اور رجو ان کے ہمراہ تھا اس کو مجبور کیا۔ یہ نیشاپور سے بخاری کی طرف لائے تھے۔ یہ ایک طویل واقعہ ہے جس کا سبب حذف کر دیا گیا اور اختلافِ الفاظ کے باوجود مفہوم ایک ہی ہے۔ مگر میں نے جو سنا اس کا مفہوم بیان کر دیا۔

حضرت بشر بن حارثؒ فرماتے ہیں:

"مشتبہ کھانے میں چھوٹے سے چھوٹا ہاتھ اور چھوٹے سے چھوٹا لقمہ ہونا چاہیے۔" اور جب وہ پہلے جاتے تو حلال میں کلام کرتے۔ ان سے کہا گیا:

" اے ابوالنصر، آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟" اور وہ ہنس دیتے۔

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں:

" ہم مشتبہ اشیاء چھوڑنے پر صبر نہیں کرتے جیسے کہ زہریؒ صبر کر لیتے تھے۔ جب انہیں بنی مروان کی مصاحبت پر کہا گیا تو فرماتے ہیں:

" تمہیں حق نے سچا کر دیا۔ ہم شہوات میں وسعت اختیار کرنے لگے۔ اس لیے جو ہمارے قبضہ میں ہے وہ ہم پر تنگ ہو گیا۔ اور ان کی طرف ہمیں انبساط ملنے لگا۔ یہ اصحاب خرد کے لیے قول فیصل ہے۔ واللہ اعلم

فصل ۱۸۱

فقر و فقرا کی تعریف اور فضائل و فرائض

قبول ورد کی تفصیل اور ملت کا طریقہ

فقیر کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ [1]

(واسطے مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے، جو نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے)

ایک جگہ فرمایا:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ [2]

(ان مفلسوں کو، جو رُکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں، چل پھر نہیں سکتے۔)

چنانچہ اپنے اولیاء کے ہجرت و حصر کی مدح پر فقر کی مدح کو مقدم کیا اور اللہ تعالیٰ جس پسندیدہ کا وصف بیان کرتا ہے صرف پسندیدہ (الفاظ با طریقہ) کے ساتھ ہی وصف بیان کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو فقر کا وصف محبوب ترین نہ ہوتا تو اپنے محبوبین کی اس کے باعث مدح نہ کرتا اور نہ ہی اس کی وجہ سے انہیں شرف و اکرام عطا کرتا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کا حکم دیا اور کئی احادیث میں اس کی فضیلت بیان فرمائی۔

اسماعیل بن عیاش نے عبداللہ بن دینار سے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے پوچھا:

"کون سا آدمی بہتر ہے؟"

انہوں نے عرض کیا:

"جس کو مالی خوشحالی ہو۔ اپنی جان و مال میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتا ہو۔"

آپؐ نے فرمایا:

"یہ اچھا آدمی ہے اور اس کے ساتھ نہیں۔"

صحابہؓ نے عرض کیا، "اے اللہ کے رسولؐ! کون بہترین آدمی ہے؟"

---

[1] الحشر آیت ۸

[2] البقرہ آیت ۲۷۳

فرمایا: "فقیر جس کو مشقت دی جاتی ہے۔"

حضرت بلالؓ کی ایک حدیث ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی فقیر حالت میں ملاقات کر اور حالتِ غنا میں اس سے ملاقات نہ کر۔"

ابن اعرابیؒ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا:

"جب فقیر راضی ہو تو اس سے افضل تر کوئی نہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ عیال دار صاحب عفت فقیر کو پسند کرتا ہے۔"

دو مشہور خبروں میں ہے:

"میری امت کے فقراء ان کے اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے۔"

ایک دوسری حدیث ہے:

"اے اللہ مجھے مسکین حالت میں زندہ رکھ، مسکین حالت میں وفات دے اور مساکین کے گروہ میں دوبارہ اٹھا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات فقراء کے لیے باعث شرف و اکرام ہے اور فضیلتِ فقر حاصل کرنے کی ترغیب بھی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اس اُمت میں بہترین فقراء ہیں اور جنت میں سب سے جلدی جانے والے کو ضعفاء ہیں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے عرض کیا:

"اے پروردگار، میں تجھے کہاں تلاش کروں؟"

اللہ عزوجل نے فرمایا:

"جن کے دل میری وجہ سے شکستہ ہیں ان کے پاس۔"

عرض کیا: "وہ کون ہیں؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سچے فقراء"۔

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"دو چیزوں کے سوا تمام اعمال خزائن میں ہیں۔ اس لیے کہ یہ خزانہ شدہ ہے اور اس پر مُہر لگی ہوتی ہے یہ مہر شہداء کے ذریعہ ہی مہر زدہ ہوتی ہے یعنی فقر مع معرفت۔"

فرمایا کرتے: "اشتہاء کے بغیر فقیر کا سانس لینا ایسا دشوار کام ہے کہ جس پر ایک غنی کی ساری عمر کی

عبادت سے افضل بھی نادر نہیں ہوتا۔"

حضرت بشرؒ فرماتے ہیں:

"دولت مند عبادت گزار کی مثال ایسے ہے جیسے کہ کوڑے پر باغیچہ ہو اور فقیر پر عبادت ایسے لگتی ہے جیسے کہ ایک خوب صورت گردن میں جواہرات کا ہار ہو۔"

فرمایا: "عبادت، اغنیاء کو نہیں سجتی۔"

فرماتے: "تقویٰ تو صرف فقر میں سجتا ہے۔"

ایک فقیر آدمی نے انہیں کہا:

"اے ابونصر، اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دعا کرو۔ مجھے فقر اور عیالداری سے بہت پریشانی ہے۔"

حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"جب تیرے اہل و عیال یہ کہیں کہ ہمارے پاس نہ آٹا ہے اور نہ روٹی تو اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کر، وہ قبولیت کا وقت ہے اور تیری دعا میری دعا سے افضل ہے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"علمائے ربانیین نے یہ علم صرف اغنیاء سے سننا ناپسند کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اغنیاء لوگ اس علم کے اہل نہیں ہیں۔"

بعض فقراء کا فرمان ہے:

"اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بدلے میں فقراء کو علم معرفت عطا فرمایا ہے وہی اسے ظاہر کرتے ہیں اور انہی کے پاس یہ علم ملتا ہے۔ دنیا میں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں راحت بخشی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خاطر جو آج چھوڑ دیا اسے اس کا عوض بنایا۔ جب کل آئے گا (یعنی قیامت آئے گی)، تو یہی وہ لوگ ہیں کہ جن پر ایسے ایسے انعامات ہوں گے کہ کوئی نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیا کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے اور یہی مزید انعام ہے۔"

فرمان الٰہی ہے:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ [1]

(اور ان پر ہر دروازے سے فرشتے آتے ہیں۔ کہتے ہیں سلامتی تم پر، اس کے عوض کہ تم نے صبر کیا)

---

[1] الرعد آیت ۲۳ - ۲۴

اس کی آیت کی تفسیر میں بتایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں فقر ملا اس پر صبر کیا۔

فرائضِ فقر

فقراء کے نزدیک فقر کے فرائض حسب ذیل ہیں:

فاقہ آنے سے پہلے سوال نہ کرے اور صبر دکھائے۔ مخلوق کے مال و دولت پر نظریں نہ اٹھائے ضرورت آن پڑے تو وہ چیز نہ کھائے جس کو علم منع کرے۔ حدودِ احکام سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ اگر ضرورت پڑنے پر سوال کرے تو ضرورت سے زیادہ نہ مانگے اور نہ ہی ذخیرہ اندوزی کرے۔

اگر اسے کفایت سے زیادہ مل جائے اور اس لیے وصول کرلے کہ آئندہ سوال سے بچے گا تو اس میں کچھ ہرج نہیں۔ متقی لوگوں سے مانگے اور ایسے آدمی سے مانگے کہ جس کے بارے میں اسے علم ہے کہ وہ حلال کمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوال کرنا بھی ایک عمل ہے۔ جس طرح خود کمانے میں تقویٰ ضروری ہے اسی طرح سوال کرنے میں بھی تقویٰ کی ضرورت ہے۔

جس کے بارے میں جانتا ہے کہ اسے اس کی پروا نہیں کہ وہ کہاں سے کھاتا ہے اور کمانے میں حرام سے نہیں بچتا، ایسے آدمی سے نہ مانگے۔

اگر کسی آدمی کو بنیادی ضرورت ہو اور وہ بھوکا ہو تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس قدر کھلائیں کہ وہ کمر سیدھی کر سکے اور اسے سکون مل جائے اور اگر وہ ننگا ہو تو اس کو اس قدر کپڑا مہیا کرنا لازم ہے کہ جس سے وہ ستر چھپا لے یہ بات عام مسلمانوں پر واجب ہے اور اگر بعض نے یہ حق ادا کر دیا تو دوسروں سے ساقط ہو گیا اور اگر اس نے خود یہ مانگا تو اس پر کچھ ہرج نہیں۔

سوال کی اجازت کب ہے؟

کہتے ہیں کہ سوال کا کفارہ یہ ہے کہ سائل اپنے سوال میں سچا ہو۔ سچائی کا مطلب یہ ہے کہ فاقہ آنے اور فرائض سے بھی رہ جانے کے ڈر کے وقت ہی سوال کرے۔ جب اسے خطرہ ہو کہ عقل زائل ہو جائے گی قلبی تشتت واقع ہو جائے گا اور جب بقدر کفایت ملے تو سوال سے فوراً رک جائے اور سیر ہونے کے بعد ذخیرہ اندوزی شروع نہ کر دے۔ اگر بطورِ عادت اسے مل جائے تو سوال نہ کرے اور نہ ہی حرفت و پیشہ کرے اور جس قدر سوال کرنے سے بچے، بہتر ہے اور یہی افضل تربات ہے۔

فاقہ آنے پر تین انبیاء علیہم السلام نے سوال کیا ہے:

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت چالیس روز کے لیے چھن گئی تو انہوں نے سوال کیا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

۳۔ اور حضرت خضر علیہ السلام نے جب بستی والوں سے مانگا (تو انہوں نے انکار کر دیا)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سائل کا حق ہے چاہے گھوڑے پر آئے۔"

حدیث میں ہے:

"سائل کو دو، چاہے ایک جلا ہوا کھر دو۔"

اگر سوال کرنا ظلم و گناہ ہوتا تو دینے پر ترغیب نہ پائی جاتی۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے وہ گناہ و ظلم پر مددگار بن جاتا بلکہ عطا کرنا نیکی اور تقویٰ کی بات ہے کیونکہ عطا ہی نیکی کا باعث ہے گویا اس نے حرمتِ اسلام کی خاطر اس سے تعاون کیا اور کسی کی غمگساری کرنا نیکی و احسان کی بات ہے۔

مغرب کے بعد ایک آدمی مانگ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اسے مانگتے دیکھا تو فرمایا:

"اے یرفا! اس آدمی کو کھانا کھلا دو۔"

اسے کھانا کھلا دیا گیا پھر اسے دوبارہ مانگتے دیکھا تو فرمایا:

"میں نے کہا نہیں تھا کہ اس آدمی کو کھانا کھلا دو؟"

عرض کیا:

"میں نے اسے کھلا دیا۔"

حضرت عمرؓ نے اس سائل کو دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں روٹیوں کا بھرا ہوا ایک تھیلا تھا، فرمایا:

"تو سائل نہیں بلکہ تو تاجر ہے۔"

پھر اس کے ہاتھ سے روٹیاں لے کر اسے دُرّے سے مارا اور بیت المال کے اونٹوں کے سامنے روٹیاں ڈال دیں اور فرمایا:

"تو سائل نہیں بلکہ تاجر ہے۔"

فقر کا ثواب و عذاب

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"مخلوق کو فقر پر ثواب بھی ملتا ہے اور گاہے فقر کے ذریعہ سزا ملتی ہے۔ اگر فقر باعثِ اجر و ثواب ہو تو اس کی علامت یہ ہے کہ فقر آنے کے بعد بھی حُسنِ اخلاق سے رہے اور اپنے ربِ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہے اور اپنی حالتِ فقر کی شکایات نہ کرتا پھرے اور فقر پہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا رہے اور اگر فقر بطورِ سزا کے ہو تو اس کی علامت یہ ہے کہ فقر آنے پر وہ آدمی بد اخلاق ہو جاتا ہے۔ ربِ تعالیٰ کی نافرمانی پر تل آتا ہے۔ شکایات کا انبار لگا دیتا ہے اور فیصلہ الٰہی پہ برہم ہوتا ہے اور بات بھی ایسے ہی ہے جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سزائے فقر کی یہی نوع ہے جس سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ چاہی ہے یہ فقرِ نفس ہے کیونکہ مال کا احتیاج و فقر ہی صدقِ حال نہ ہونے کے ساتھ ساتھ مخلوق کی طرف اور اشیاء کی طرف

احتیاج ہے۔

مانگنے کی ممانعت

روایت میں ہے :
" لوگوں سے مانگنا فحش کی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے سوا کوئی بات حلال نہیں کی۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم سے اسلام پر بیعت لی اور ان پر سمع و اطاعت کی شرط لگا دی۔ پھر ایک آسان کلام فرمایا :

" اور لوگوں سے کچھ نہ مانگو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مانگنے سے بچنے اور عفت اختیار کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا :

" جو ہم سے مانگے گا ہم اسے دیں گے اور جو مستغنی ہوا اللہ تعالیٰ اسے مستغنی کر دے گا۔"

فرمایا : " اور جو ہم سے نہ مانگے وہ ہمیں زیادہ محبوب ہے۔" (یعنی جو سوال نہ کرے)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

" لوگوں سے مستغنی ہو جاؤ اور سوال جس قدر کم ہو، بہتر ہے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا :

" اے اللہ کے رسولؐ ! کیا آپؐ سے بھی ؟"

فرمایا : " اور مجھ سے بھی۔" اور کچھ نہ ہو تو مانگنے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ وعید کی خبر تو صاف ملتی ہے کہ جو غنی ہوتے ہوئے مانگے، وہ دوزخ کے انگارے بڑھا رہا ہے اور جس نے اس حال میں مانگا کہ اس کے پاس بقدرِ غنا کے ہے وہ قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر خالی ہڈیاں بجتی ہوں گی اور ان پر گوشت نہ ہوگا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے :

" اس کا مانگنا اس کے چہرہ میں نقص اور نوچنے کا (اثر) ہوگا۔"

ایک حدیث میں ہے :

" اللہ عزوجل کے غنا کے ذریعہ ہی استغناء حاصل کرو۔"

صحابہؓ نے عرض کیا :

" اور وہ کیا ہے ؟"

فرمایا : " صبح کا کھانا یا رات کا کھانا۔" (موجود ہو تو سوال نہ کرے)

روایت میں ہے:

"جس کے پاس پچاس درہم ہوں یا اس کے برابر سونا ہو، پھر وُہ مانگے تو وُہ الحاف کرنے والا ہے"۔ اور جس کے اس قدر دنیا ہو وُہ عام فقرا سے خارج نہیں۔ البتہ اگر یہ ہوتے ہُوئے مانگا تو عام فقرا سے خارج ہوگیا۔ جس نے فاقہ سے پہلے یا سیر ہونے کے بعد مانگا یا ذخیرہ کرنے کی خاطر مانگا یا اس کے پاس صبح کا کھانا ہے تو مانگا یا اس کے پاس رات کا کھانا ہے پھر بھی مانگا۔ تو ایسا کرنا اسے خواص فقرا سے خارج کر دے گا۔

حضرت سفیان ثوریؒ سے پُوچھا گیا:

"افضل ترین عمل کون سا ہے؟"

فرمایا: "محنت کے وقت خوبصورتی سے کام کرنا"۔

فقیر پر لازم ہے کہ عطا کرنے کی وجہ سے کسی دولت مند کی پاکیزگی بیان نہ کرے اور نہ دینے کی وجہ سے کسی کی مذمت نہ کرے اور نہ ہی اس پر ناراض ہو اور دنیا داروں کو بُرا نہ سمجھے اور دنیا کی وجہ سے ان کی عزت و اکرام نہ کرے۔

حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا:

"فقیر کی تواضع یہ ہے کہ وُہ اغنیاء کے سامنے تکبر کرے"۔

حضرت علیؓ نے ایک خواب کے واقعہ میں بتایا:

"اگر غنی آدمی اللہ تعالیٰ کے ثواب کی خواہش کے باعث فقیر کے سامنے تواضع کرے تو یہ کام کیسا بھلا ہے اور اگر فقیر کی غنی پر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہُوئے نیت ہو تو کیسی خُوب بات ہے"۔

فضائلِ فقر

فقر کے فضائل حسبِ ذیل ہیں۔

چالیس روز سے زیادہ کا ذخیرہ نہ کرے۔

چالیس درہم سے زیادہ ذخیرہ نہ رکھے۔

اس میں اصل اللہ تعالیٰ کا کلام مقدس ہے۔ فرمایا:

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً [1] (اور جب ہم نے موسیٰ کے ساتھ چالیس راتوں کا وعدہ کیا)

اگر اس نے چالیس روز کی امید میں ایسا کیا تو ذخیرہ اندوزی امید کی بات ہے۔ اس لیے کہ چالیس دن تک کی امید کے لیے چالیس روز کا ذخیرہ کرنا جائز ہے اور جس کی امید کم ہو جائے۔ ایک دن رات کی امید رہ جائے۔

---

[1] البقرہ آیت ۵۱۔

اسے اس قدر ذخیرہ کرنا جائز ہے ۔چنانچہ ترکِ ذخیرہ دراصل کمی امید کا تقاضا ہے۔ ایک فقیر آدمی کا غنا چالیس درہم میں رکھا گیا۔ یہ عوام فقراء کے لیے قاعدہ ہے اور خواص فقراء کا حال یہ ہے کہ کم امیدی کی وجہ سے ان کے ہاں صبح یا شام کا کھانا موجود ہونا بھی غناء کی علامت ہے جیسے کہ شروع میں ذکر کردہ حدیث میں ہے ؛

" اللہ تعالیٰ کے غناء کے ذریعہ غناء حاصل کرو۔"

پُوچھا گیا ؛

" اللہ تعالیٰ کا غناء کیا ہے ؟"

فرمایا ؛ " صبح کا کھانا یا رات کا کھانا ۔"

فقر کی ایک فضیلت یہ ہے کہ وہ کل آئندہ کی روزی کا اہتمام نہیں کرتا ۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کل آنے سے پہلے اُس سے کل کے عمل کا مطالبہ نہیں کرتا ۔ اس لیے کہ روزی مقرر شدہ اور تقسیم شدہ ہے اور وکیل تعالیٰ حفاظت کرنیوالا اور قیوم ہے ۔

فقیر اپنے فقر پر راضی رہتا ہے اور فقر کی نعمت کو غنیمت اور قابلِ رشک سمجھتا ہے اور غنی آدمی کو جس قدر غناء چھن جانے کا ڈر ہوتا ہے ۔اس سے کہیں زیادہ ایک فقیر کو فقر چھن جانے کا ڈر ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ اسے اس حال پر فخر و رشک ہوتا ہے ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے ؛

" اے فقراء کے گروہ ! اپنے دلوں سے اللہ تعالیٰ کو رضا دو ۔ (راضی ہوجاؤ) تم ثوابِ فقر پا لوگے ورنہ نہیں ۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن سابط نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا :

" اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ وہ فقیر ہے جو اپنے رزق پر قناعت کرے اور اللہ عزوجل سے راضی رہے ۔"

بہتر یہ ہے کہ وسعت پر مغموم ہو اور تنگی و مصیبت پر فرحت پائے ۔ مساکین سے محبت رکھے اور انہیں دنیا داروں پر ترجیح دے ۔ اغنیاء پر رحم کھائے اور غناء کی وجہ سے ان کی مذمت نہ کرے البتہ فقراء کو ان پر ترجیح دے اور قریب کرے ۔ فقیر پر احسان کرے اور اس کے ساتھ صبر برداشت کرے ۔ فقر کو سوال نہ کرکے چھپائے ۔ غناء کو ظاہر کردے مگر فقر کو شکایت و کراہت کے ذریعہ ظاہر نہ کرے ۔

فقراء سے محبت رکھو

اللہ تعالیٰ سے ایک روایت میں ہے ؛
جب تو فقیر کو آتا دیکھے تو یہ کہہ ؛

مَرْحَبًا بِشِعَارِ الصَّالِحِيْنَ ۔ (خوش آمدید ، نیکوں کے شعار پر ، ہو)

اور جب دولت کو آتا دیکھے تو یہ کہے،

ذَنْبٌ عُجِّلَتْ عُقُوْبَتُهٗ۔ (کوئی گناہ ہوا جس کی سزا ابھی مل گئی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا،

" اے پروردگار! تیری مخلوق میں سے تیرے محبوب کون ہیں تاکہ تیری وجہ سے میں ان سے محبت کروں "

فرمایا، " ہر فقیر فقیر۔" (کُلُّ فَقِیْرٍ فَقِیْرٍ)

اس میں دو معنوں کی وجہ سے تکرار کیا،

۱۔ جس پر فقر آ جائے۔

۲۔ اور اس پر سخت تنگی اور تکلیف ہو۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا،

" مجھے مسکنت محبوب ہے اور میں غنا سے نفرت رکھتا ہوں " بتاتے ہیں کہ انہیں محبوب تر نام یہ تھا کہ انہیں " اے مسکین " کہہ کر پکارا جائے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں یہ آتا ہے،

اَسْأَلُكَ الطَّيِّبَاتِ وَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنَ۔ (میں تجھ سے حلال غذا، نیک کام اور مساکین سے محبت مانگتا ہوں)

غنا پر فقر کو اس وجہ سے بھی فضیلت ہے کہ مخلوق میں سے افضل ترین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس نے ان کے وصف میں شرکت کی، ان کے وصف کے مفہوم سے قرب حاصل کیا وہی افضل ہے۔ اس لئے کہ وہ افضل فالافضل ہے اور یہ فقراء کا مقام ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف اس طرح بیان کیا۔ فرمایا،

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ[1] (اور نہ ان پر جب تیرے پاس آئے تاکہ ان کو سواری دے تو نے کہا، مجھ کو پیدا نہیں کہ جو تم کو سواری دوں)

جب عدم سرمایہ میں آپ سے مشارکت ہوئی تو وہ افضل ہوئے۔ اس لئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال ہی افضل ترین اور کامل ترین ہے۔ اس سے ان کا دوسروں پر افضل حال ہونا معلوم ہوا۔

فرمان خداوندی ہے،

إِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ (راہ الزام کی ان پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے،

---

[1] التوبۃ آیت ۹۲ - ۹۳

وَھُمْ اَغْنِیَاۗءُ ۔ (اور مالدار ہیں)

اور فرمایا:

کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔[1] (کوئی نہیں، آدمی سرکش کرتا ہے اس سے کہ دیکھے اپنے آپ کو محفوظ)

اس میں اغنیاء کا وصف یطغٰی بتایا اور ان پر حجت لگادی اور فقراء کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَاۗءَ ۔ (جاہل انہیں غنی گمان کرتا ہے)

اب اگر غنی کا درجہ کم نہ ہوتا تو کم تر وصف کی طرف وہ کیوں موصوف ہوتا۔

فقر و غناء کا تقابل

غناء دراصل دنیا کا دروازہ، فخر جتانے کی جڑ اور مذموم جذبۂ کثرتِ مال کا باعث ہے، اور فقر حقیقت میں آخرت کا دروازہ، زہد کی جڑ اور قابلِ ستائش تواضع کا نام ہے۔

عارفین کے نزدیک غناء نا قابلِ منازعت صفات میں سے ہے اور ایک ناپسندیدہ وصف ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے عزت، تکبر، مدح و ذکر کی محبت۔ اب جو کسی چیز کو پسند کرے گا اس نے یہ لینے کے لیے گویا اللہ تعالیٰ سے منازعت کی اور صوفیاء نے اسے اللہ عزوجل کی خاطر چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ یہ صفاتِ رب تعالیٰ سے ہے اور اس سے خوف یا اس کی محبت کے باعث تسلیم و رضا کا معاملہ کیا۔

فقر دراصل صفاتِ عبودیت میں سے ہے۔ مثلاً امید، خوف، تواضع اور مسکنت، جس نے انہیں پسند کیا اور انہیں طلب کیا۔ اس میں وصفِ عبودیت آگئی اور اللہ تعالیٰ یہی پسند فرماتا ہے کہ بندے میں بندوں والی صفات پائی جائیں۔ اس لیے کہ یہ خدا کا بندہ ذلیل ہے اور رب تعالیٰ کی صفات میں منازعت ناپسندیدہ کام ہے۔ اس لیے کہ وہ ملک جلیل ہے۔

غناء سے محبت رکھنا، دنیا میں ہمیشہ زندہ رہنے سے محبت کی دلیل ہے۔

حضرت سہل فرمایا کرتے:

"غناء سے محبت رکھنا رب تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے اس لیے کہ بقاء تو رب باقی تعالیٰ کی صفات سے ہے"

اگر غناء کو فقر سے بہتر جانے تو معلوم ہوا کہ اسے غناء سے محبت ہے۔ اس سے اس کی اغنیاء سے محبت ظاہر ہوگئی۔ اس لیے کہ وصف سے محبت اس وصف کے موصوف سے محبت کا نشان ہے اور ایک چیز سے محبت رکھنا اس کے برعکس سے بغض کی علامت ہے۔ اب جب فقر سے بغض رکھا تو گویا فقراء سے بغض رکھا اور جس نے غناء کی محبت کی وجہ سے فقر سے بغض رکھا۔ اس نے زہد پر رغبت و خواہش کو ترجیح دی۔

---

[1] العلق آیت ۶

قلت پر کثرت کو اور دنیا میں تواضع پر عزت و تکبر کو ترجیح دی۔ ایسا کرنے میں آخرت پر دنیا کو ترجیح دینا پایا گیا، اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و تابعین کے ان آثار و روایات کو منہدم کرنا پایا گیا، جن میں فقر کی افضلیت اور اغنیاء پر فقراء کے شرف و فضل کے فرامین آتے ہیں۔

بتاتے ہیں:

"فقر، مومن کا شرف ہے اور سلفؒ میں مومن فقراء ایسے بلند درجہ سمجھے جاتے تھے جیسے کہ آجکل تم میں اشراف ہیں۔" علمائے ربانیین کے نزدیک اس قول کا فاسد ہونا واضح ہے۔

فقراء کی تین اقسام

فقراء کے تین درجات ہیں:

۱۔ فقراء اغنیاء۔ یہ صرف فاقے آنے پر ہی سوال کرتے ہیں بقدر کفایت پر مطمئن ہو جاتے اور قناعت کرتے ہیں۔ یہ پاکیزہ اغنیاء ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا مزید انعام ہے۔ اغنیاء کے مال میں ان کا حصہ رکھا گیا اس لیے کہ ان میں سے بعض سائل اور محروم ہیں اور بعض قناعت پسند اور بعض راضی بعطاءٗ ہوتے ہیں۔

۲۔ فقراء الفقراء۔ ان پر فقر آیا اور انہوں نے فقر کو پسند کیا۔ غناء پر فقر کو ترجیح دی۔ اس لیے کہ یہ سوال نہ کرنے اور عفت اختیار کرنے کی فضیلت سے خوب آگاہ ہیں۔ یہ سوال جیسا فضول کام نہیں کرتے۔ یہ اپنے آقا کی طرف سے فراخی پر راضی ہیں تو انہیں دیکھے گا، انہیں خاص نشان سے پہچان لے گا اور جاہل آدمی انہیں سوال اور شکوہ شکایت نہ کرنے کی وجہ سے اغنیاء سمجھتا ہے۔ ان میں سے بعض محروم ہیں کہ دنیا کے لیے محنت سے محروم ہوئے۔ بعض عارف ہیں یعنی اسباب ان سے منحرف ہو چکے اور بعض قانع ہیں جو مشقت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے، اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ بعض مقر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو حالت طاری کر دی اسی پر راضی ہو گئے۔

۳۔ اغنیاء الفقراء۔ یہ ہی اسخیاء کا گروہ ہے جو کہ عطا کرنے والے اور خرچ کرنے والے ہیں۔ یلتے ہیں اور نکال دیتے ہیں۔ کثرت اور ذخیرہ اندوزی کے قریب بھی نہیں جاتے۔ اگر نہ ملے تو مانع کا شکر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہی معطی تعالیٰ ہے۔ اس کا روک دینا بھی ایک طرح کی عطا ہے اور اگر تنگی آئے تو واسع کریم کی حمد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہی محمود ہے۔ اس کی جانب سے تنگی بھی فراخی ہے۔ اگر انہیں ملے تو وہ خرچ کرتے اور دنیا میں زہد اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ زاہد اور اصحاب یقین لوگ یہی ہیں انہیں یقین کا غنا ہی کافی ہو گیا۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے شقیق بن ابراہیمؒ کو فرمایا جبکہ وہ خراسان سے ان کے پاس آئے۔

"تم نے اپنے ساتھی فقراء کو کس حال میں چھوڑا؟"

فرمایا: "میں نے انہیں اس حال میں چھوڑا کہ اگر ملے تو شکر کرتے ہیں اور اگر ملے تو خرچ کر کے (زہد کو) ترجیح

حضرت ابراہیمؒ نے ان کے سر پر بوسہ دیا اور کہا :

"اے استاذ تُو نے سچ کہا۔"

حضرت بشرؒ کہا کرتے تھے :

فقرا تین ہیں :

۱۔ وہ فقیر جو نہیں مانگتا اگر دیا جائے تو لیتا نہیں۔ یہ علیین میں روحانیین کے ساتھ ہے۔

۲۔ وُہ فقیر جو نہیں مانگتا اور اگر دیا جائے تو لے لیتا ہے۔ یہ خطیرۃ القدس میں مقربین کے ہمراہ ہے۔

۳۔ وُہ فقیر جو فاقہ آنے پر مانگتا ہے یہ صادقین کے ہمراہ ہے اور اس کا صدقِ حال اس کے سوال کا کفارہ بن جائے گا۔

فقرا کی مصاحبت اور اغنیا سے اجتناب

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو ساٹھ ہزار دیے گئے۔ ان پر قرض تھا اور کچھ دوسری ضروریات بھی تھیں۔ انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ان سے اس کی وجہ پُوچھی گئی تو فرمایا :

"میں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ ساٹھ ہزار کی خاطر اپنا نام فقرا کے رجسٹر سے مٹوا دوں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حالت یہ تھی کہ ایک لاکھ خیرات کر دیا مگر ان کی قمیص میں پیوند لگے ہُوئے تھے خادمہ نے عرض کیا :

"کاش! میں آپ کے لیے ایک درہم کا گوشت خرید لیتیں اور اس سے آپ افطار کرتیں۔"

فرمایا : "اگر تو یاد کرا دیتی تو ایسا ہی کر لیتیں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وصیت کی۔ فرمایا :

"اگر تو مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو فقرا کی سی زندگی اختیار کر لے اور اغنیا کے ساتھ مجالست سے دور رہنا اور کپڑے کو مرمت کیے بغیر نہ اتارنا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فقرا کو جو فرمایا کہ

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۔ (یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے)

شاید آغازِ کلام پر تدبر کیے بغیر یہ گمان کر لیا جائے کہ اس میں فقرا پر اغنیا کو فضیلت حاصل ہے بلکہ یہ آپؐ کے پہلے فرمان کی مزید تاکید کے لیے ہے کہ یہ ورد کر لیا کرو تم سے پہلے کا کوئی بھی تم سے نہیں بڑھے گا اور بعد والا بھی تمہارا درجہ نہ پا سکے گا۔

فقرا صحابہ نے یہ ورد کرنا شروع کر دیا، جب اغنیا نے یہ سُنا تو انہوں نے بھی یہی ورد کرنا شروع کر دیا۔

فقرا کے دلوں میں کھٹکا ہُوا۔ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر پُوچھا تاکہ آپ کا پہلا فرمان پختہ ہوجائے۔ آپؐ نے فرمایا:

"معاملہ ایسے ہی ہے جیسے میں نے تمہیں بتایا۔ تم سے پہلے کا کوئی تم سے نہ بڑھ سکے گا۔" پہلے میں آپؐ کا فرمان صحیح ہے اور آپ اس میں معصوم ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو آپ کا آخری قول پہلے کا نقیض ہوتا اور یہ جائز نہیں۔

اور اگر اسے ظاہر پر محمول کیا جائے جیسے کہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسے افضلیت دی مگر آخرت میں فقرا کے مقامات پر اغنیا کو فضیلت نہ ہوگی البتہ اس کی وجہ سے انہیں فضیلت حاصل ہُوئی کہ انہوں نے بھی وہی ورد کیا جو اسے فقرا تم نے کیا تھا۔ اب انہیں مزید فضل و شرف ملا مگر یہ بات نہیں کہ اس کی وجہ سے ان کا درجہ تم سے بڑھ گیا ہو بلکہ تمہارا درجہ ہی بڑھا ہُوا ہے۔ اس لیے کہ اس ذکر کے ساتھ ساتھ فقر اور صبر کے اوصاف بھی تم میں ہی پائے جاتے ہیں اور اس تسبیح سے تمہیں کامل فضیلت مل چکی تھی اور جب اغنیاء نے یہ ورد کیا تو ان پر بھی اللہ کا فضل ہُوا اور ہم یہ بھی کہتے کہ اغنیاء کے لیے غناء کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی جانب جانے والا طریق نہیں ہے البتہ طریقِ فقراء کو افضلیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام سے افضل فالامثل یہی فقراء ہیں۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ[1] (اور برابر نہیں زندہ اور نہ مُردے)

اس میں حضرت حسنؓ سے مروی ہے:

"مراد یہ ہے کہ فقرا اور اغنیاء برابر نہیں۔ چنانچہ انہوں نے فقراء کو اپنے مولائے کریم کے باعث زندہ کہا اور دُنیا کی وجہ سے اغنیاء کو مُردہ کہا۔"

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں:

"جب تو کسی فقیر کو اغنیاء سے اختلاط رکھتے ہُوئے دیکھے تو سمجھ لے کہ یہ ریاکار ہے اور جب وُہ بادشاہ سے اختلاط رکھے تو وُہ چور ہے۔"

ایک عارفؒ کا قول ہے:

"جب فقیر آدمی اغنیاء کی طرف میلان کرے تو اس کا کاج کھل گیا اور جب اس نے ان میں لالچ کیا تو اس کی عصمت ختم ہوگئی۔ جب ان میں سکون پایا تو وُہ گمراہ ہوگیا۔ روایات میں فقر و فقرا کی غناء اور اغنیاء پر جو فضیلت مروی ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی آدمی غناء کو فقر پر فضیلت دے تو وُہ سنن سے جاہل ہے۔ اس لیے کہ وُہ اثر و

---

[1] الفاطر - ۲۲

سنت پر رائے وخواہش کو ترجیح دے رہا ہے۔ جب روایت میں ایک چیز آجائے تو وہاں رائے کا کچھ دخل نہیں رہتا اور جانتے ہوئے اس سے اختلاف کرنا عناد اور ضد ہے۔ ہم جہالت وخواہش سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں اور علم وتقویٰ کی توفیق مانگتے ہیں۔

ظاہری ذریعہ نہ رکھنے والے فقیر کا حکم

جو روزی آئے قبول کرے

اگر فقیر کے لیے دنیا کا معلوم رزق نہ ہو اور اس کا رزق دنیاوی دستکاری کے عوض کے بغیر لوگوں کے ذریعہ بطور امداد و تعاون کے آتا ہو تو یہ رزق متضاد ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"یہ مال، اللہ کا مال ہے جس نے اس کے حق کا (احترام کرکے) اسے لے لیا۔ اس میں برکت ہوگی۔ اور جس نے اسے نفسانی میلان کے ساتھ لیا۔ اس میں برکت نہ ہوگی۔ وہ ایسا ہوگا کہ کھائے مگر سیر نہ ہو۔"

ایک روایت ہے،

"جس کو یہ مال بغیر مانگے ملے اور نہ ہی (نفسانی) میلان ہو تو یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف بھیجا۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"اسے واپس نہ کرے، اگر ضرورت مند ہو تو ٹھیک ورنہ اپنے سے زیادہ ضرورت مند کو دے دے۔"

حضرت حسنؓ اور حضرت عطاءؒ سے ایک مرسل روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کو بغیر مانگے رزق ملا اس نے واپس کردیا تو اس نے اللہ تعالیٰ پر واپس کیا۔" (یعنی ایسا ہرگز نہ کرے)

عابد بن شریح نے حضرت انس بن مالکؓ سے، انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"جب لینے والا محتاج ہو تو وسعت ہوتے ہوئے دینے والے کا اجر (لینے والے سے) زیادہ نہیں۔"

ایک عالم کا فرمان ہے:

"اگر بندہ روزی سے بھاگ کھڑا ہو، پھر بھی روزی اسے تلاش کرکے اس تک پہنچ جائے گی جیسے کہ موت سے بھاگے تو موت اسے پکڑ لیتی ہے۔"

ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

" اگر بندہ اپنے اللہ سے یہ دُعا کرے کہ مجھے روزی نہ دے تو اس کی دُعا قبول نہ ہوگی اور وہ نافرمان شمار ہوگا اور اسے کہا جائے گا ، اے جاہل ، جیسے میں نے تجھے پیدا کیا یہ ضروری بات ہے کہ تجھے روزی بھی دوں ۔"

ایک عارفؒ بتاتے ہیں :

" میں نے دنیا میں زہد اختیار کیا ۔ آخر زہد کے اس مقام پر پہنچے کہ لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی ۔ آبادی سے باہر نکل گئے اور کہا : " میں کسی سے کچھ چیز نہیں مانگوں گا ۔ میری جو روزی مقرر ہے وہ خود میرے پاس آئے گی ۔"

بتاتے ہیں کہ وہ سیر کرنے لگے ۔ آخر ایک پہاڑ کی گھاٹی میں سات دن تک ٹھہرے رہے اور فاقوں کی وجہ سے مرنے کے قریب جا پہنچے ۔ عرض کیا :

" اے پروردگار ! مجھے عطا کر ورنہ مجھے وفات دے کر اپنے پاس بُلا لے "

اللہ تعالیٰ نے وحی کی :

" میری عزت کی قسم ، میں تجھے اس وقت تک رزق نہیں دُوں گا جب تک تو آبادی میں جا کر لوگوں کے درمیان نہ رہے ۔" اس حکم پر وہ آبادی میں آ گئے اور لوگوں میں رہنے لگے ۔ یہ آدمی کھانا لایا ، دوسرا سالن لایا ۔ یہ پینے کی چیز لایا ۔ انہوں نے کھایا اور پیا ۔ پھر دل میں کھٹکا ہوا ۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی :

" تو نے چاہا کہ دنیا میں اپنے زہد کی وجہ سے میری حکمت ہی ختم کر دے ؟ تو جانتا نہیں کہ میں اپنے بندوں کے ہاتھوں کے ذریعہ روزی دینا اس بات سے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ انہیں بلاواسطہ دستِ قدرت سے روزی دوں ؟"

علائق دنیا سے ایک منقطع عارفؒ کا فرمان ہے کہ بڑا کاریگر تھا ۔ میں نے چاہا کہ اس صنعت کو چھوڑ دوں تو میرے دل میں خیال آیا کہ روزی کہاں سے ملے گی ؟

ایک غیبی آواز آئی جس کو میں دیکھ نہیں رہا تھا :

" تو سب سے جُدا ہو کر میری طرف آتا ہے اور روزی کا فکر کرتا ہے ۔ میں اپنے اولیاء میں سے کسی ولی کو تیری خدمت پر لگا دوں گا ۔ یا اپنے دشمنوں میں سے کسی منافق کو تیرا مسخر کر دوں گا ۔"

بعض سلفؒ سے منقول ہے : اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی کی :

" جو میری خدمت (عبادت) کرے تو اس کی خدمت کر ، اور تیری خدمت کرے تو اسے تھکا دے ۔"

مکہ کے ایک خادم کا کہنا ہے کہ میرے پاس دراہم تھے میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے جمع کر رکھے تھے ۔ ایک رات کو میں نے دیکھا کہ اندھیری رات میں ایک نیک و صالح قسم کا فقیر کعبہ کا طواف کر رہا ہے

خادم کعبہ نے بتایا کہ میں نے اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا اور اس طرح اس کا پیچھا کیا کہ اسے خبر نہ ہُوئی۔ جب اس نے سات چکر پُورے کر لیے تو باب و حجر کے درمیان ملتزم میں کھڑا ہُوا اور آہستہ آہستہ دُعا کرنے لگا۔ میں نے غور سے سنا تو وُہ کہہ رہا تھا:

"بھُوکا ہوں جیسے تو دیکھ رہا ہے، برہنہ ہوں جیسے تُو دیکھ رہا ہے۔ اب جو تُو دیکھ رہا ہے اس میں تیری کیا مرضی ہے۔ اے جو دیکھتا ہے مگر کوئی اسے دیکھ نہیں پاتا؛"

راوی بتاتا ہے کہ میں نے دیکھا۔ اس کے بدن پر دو پرانے بوسیدہ کپڑے تھے جو پھٹے ہُوئے ہونے کی وجہ سے اس کی پردہ پوشی کے لیے ناکافی تھے۔ میں نے دل میں کہا: اُن دراہم کی اس سے بہتر جگہ نہیں، میں نے اس کا پیچھا کیا تو وہ زمزم کے قبہ کی طرف جا کر دو رکعت طواف کی پڑھنے لگا۔ میں جلدی سے گھر گیا اور وُہ دراہم لا کر اس کے حوالے کر دیے۔ اور عرض کیا:

"اللہ آپ پر رحم کرے، آپ اس مقام میں اور اس حالت میں ہیں؛ یہ لے کر خرچ کیجئے" اور میں نے تمام دراہم دامن سے نکال کر زمین پر اس کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ اس نے انہیں دیکھا اور پانچ دراہم لے لیے اور کہا: "چار دراہم سے دو چادریں آئیں گی اور ایک درہم سے تین روز کھانا کھاؤں گا۔" پھر کہا: "سارے دراہم کی مجھے ضرورت نہیں۔"

یہ بتاتے ہیں کہ دُوسری رات کو میں نے انہیں دیکھا۔ دو نئی چادریں اوڑھ رکھی ہیں۔ میرے دل میں کھٹکا سا ہُوا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے سات چکر دلائے یعنی طواف کرایا۔ ہر چکر میں زمین کے خزانوں کے جواہرات ہمارے پاؤں میں ایڑیوں تک لڑھکنے لگے۔ چاندی، سونا، یاقوت، موتی اور جواہرات بکھرے پڑے تھے جو لوگوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

"ہمیں یہ تمام اشیاء دی گئیں مگر ہم نے ان میں زہد و بے رغبتی کی اور لوگوں کے ہاتھوں سے لینا ہمیں زیادہ پسند ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی زیادہ محبوب ہے اور ہم پر مطالبہ میں بھی اسی طرح کمی رہے گی اور یہ سرمایہ بوجھ اور فتنہ ہے اور یہ ایسا طریقہ ہے کہ اس میں بندوں پر رحمت و نعمت ہے۔

روایت میں ہے،

"تمام شہر اللہ کے شہر ہیں اور مخلوق اسی کے بندے ہیں تو جہاں رزق پائے وہیں اقامت اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے۔"

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

"روزی اور موت کے سوا لوگوں نے ہر چیز میں اختلاف کیا اور اس پر اجماع کیا کہ اللہ کے سوا کوئی

روزی دینے والا نہیں اور اللہ کے سوا کوئی موت دینے والا نہیں۔"

روزی کہاں کہاں ہے؟

فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے روزیاں پیدا کیں تو ہوا کو حکم دیا کہ انہیں زمین کے (اطراف و) اقطار میں پھیلا دو۔ ہوا نے انہیں پھیلا دیا۔ بعض کی روزی دس ہزار مقامات پر پڑی، بعض کی روزی ایک لاکھ مقامات پہ پڑی، بعض کی ایک ہزار مقامات پر، بعض کی ایک سو مقامات پر اور بعض کی ایک مقام پر روزی پڑی۔ غرض بعض کی کم مقامات پر اور بعض کی زیادہ مقامات پر روزی پڑی۔ بعض کی روزی گھر کے دروازہ پر پڑی کہ نکلے اور لے آئے۔ اب ہر آدمی لکھی ہوئی روزی کی تلاش میں ہے۔ حتیٰ کہ اپنا حصّہ پورا کر لے۔ جب وہ مقامات ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی روزی پوری ہو جاتی ہے تو فرشتۂ موت آکر اس کی رُوح قبض کر لیتا ہے۔

روزی مل کر رہے گی

یاد رکھیے پیدائش سے لے کر بندے کا رزق کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ماں کے پیٹ میں لے رحم کے اندر خون کے ذریعہ غذا دی گئی۔ اس سے اس کا بدن زندہ رہا۔ اس کی ناف کی طویل انتڑی اس کی ماں کی انتڑی سے ملی ہوئی تھی اور ماں کے پیٹ سے اس کے پیٹ میں کھانا جا رہا تھا اور اس طرح وہ زندہ رہا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے باہر آنے کا حکم دیا تو ایک فرشتہ کو بھیجا۔ اس نے مقام اتصال سے یہ انتڑی کاٹ دی۔ دنیا میں آیا تو اس کا رزق، دنیا سے کر دیا۔ جب یہاں سے نکلا تو دنیا کے آخری رزق کے ساتھ ہی آخرت کا پہلا رزق ملا۔ آخرت میں پہنچا تو اس کا رزق برزخ سے ہے جیسے کہ دنیا میں روزی کھا رہا تھا۔ البتہ کچھ اسالیب رزق مختلف ہو گئے۔ جب برزخ سے نکلا اور قیامت میں آیا تو اس کا رزق جائے وقوف پر اس کے حال کے مطابق ہو گا۔ جب موقف (روزِ قیامت) سے نکل کر جنت و دوزخ میں سے ایک جگہ جائے گا تو اس کا رزق وہیں چلا جائے گا اور وہاں ابدالاباد تک اسے رزق ملتا رہے گا۔ جب بندے کو اس کا یقین ہے مشاہدہ ہو تو اس کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک رزق اور موت دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور یقین کر لیتا ہے کہ جیسے موت کے بغیر چارہ نہیں۔ اسی طرح رزق بھی مل کر رہے گا۔ اس کے بغیر بھی چارہ نہیں۔ اس پر اطاعت احکامِ الٰہی بھی لازم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مخلوق مل کر بھی اس کی عمر میں ایک گھڑی کا اضافہ یا کمی نہیں کر سکتی۔ جب یہ یقین ہو گیا تو اب وہ پورے خلوص و اطمینان کے ساتھ مولائے کریم کی عبادت میں مشغول ہو جائے گا اور اسی کو اپنا کارساز سمجھے گا۔

روزی کی ۲ دو اقسام

روزی کی دو قسمیں ہیں اور یہ تقسیم بے شمار مفاہیم و اسباب کی وجہ سے ہے۔ بعض اوقات سکون سے اور بیٹھے بٹھائے روزی مل جاتی ہے۔ یہ وہ رزق ہے جو خود چل کر بندے کی طرف گیا۔

بعض اوقات بندہ چل کر رزق کی طرف آتا ہے۔ چنانچہ روزی حاصل کرنے کے لیے وہ اسباب اختیار کرتا اور محنت کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں رزق ایک ہی ہے اور ان دونوں کا رازق بھی ایک ہی ہے۔ ساکن و قاعد میں اور متحرک و قائم میں حکمت و قدرت بھی ایک ہے۔ البتہ ان دونوں میں احکام جدا جدا ہیں۔

اس کے علاوہ تمام اشیاء کی دو اقسام ہیں:

۱۔ جو تیرے سامنے مسخر ہیں۔

۲۔ جن کا تجھ پر قبضہ ہے۔

اب جو تیرے لیے مسخر ہیں تو ان پر مسلط ہے یہ تجھ پر نعمت ہے اور اس کا شکر لازم ہے۔ رزق کے معنی ہیں یہ مقام شکر ہے اور جو تجھ پر مسلط ہے اس میں تو ان کے قبضہ میں ہے اور یہ تجھ پر ابتلاء و آفت ہے۔ اس پر صبر کرنا لازم ہے۔ یہ ابتلاء کے مفہوم سے مقام صبر ہے۔ جس نے ان مذکورہ باتوں کا مشاہدہ کر لیا اس نے اپنے مقام سے اپنا حال سمجھ لیا اور جو سمجھ اس کے مطابق حکم برداری کی اور جس نے مشاہدہ نہ کیا وہ اپنے حال سے جاہل رہا اپنا مقام نہ سمجھ سکا۔ اس لیے اسے اضطراب و حیرانی لاحق ہوئی اور اس نے اپنے اوپر لازم شدہ اللہ کا حکم ضائع کر دیا۔

زائد مال ابتلاء ہے

جس کے لیے معلوم روزی نہ ہو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اسے مال بھیجے تو بقدر حاجت ہی لے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق و امداد ہے۔ اس کا لینا افضل بات ہے اور جو ضرورت سے زاید آئے یا ایسی خریدے کہ جس کی حاجت نہ ہو تو یہ اس کے لیے امتحان و ابتلاء ہے تاکہ دیکھے کہ وہ زاید از حاجت میں زہد کرتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ کثرت میں رغبت تو نہیں کرتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ ایک چیز کا مالک بن جائے گا تو وہ گویا اس کی ہو گئی۔ اب وہ معرفت کے باعث جان لے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء ہے اور اس میں دو حکم ہیں:

۱۔ علانیہ اور پوشیدہ طور پر کسی محتاج تر آدمی کو دے دے۔ یہ اقویاء کا طریق ہے اور نفس پر یہ زیادہ ہی شاق گزرتا ہے۔ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا اور یہ علمائے زاہدین کا حال ہے۔

۲۔ اسے اپنے سے محتاج تر کو دینے کے لیے نہ لے بلکہ اپنی ضرورت کے لے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر کچھ احکام لازم ہیں۔ یہ متوسط طریقہ زہاد ہے۔ اب جو آدمی بلا ضرورت صرف کثرت مال اور ذخیرہ کی وجہ سے لے تو میں نہیں جانتا کہ یہ بھی طریق الی اللہ کی کوئی قسم ہو سکتی ہو اور جب وہ طریق الی اللہ کا کام نہ ہو تو وہ شیطان کی طرف جانے والے طریق خواہشات میں سے ہے۔ پھر لینے والا یہ دیکھے کہ جو اللہ تعالیٰ

نے عطا کیا۔ اس میں اس کے کیا کیا احکام لازم ہیں۔ اب اگر زکوٰۃ کا مال آئے جو فرض ہے تو جن میں زکوٰۃ لینے کی شرائط پائی جاتی ہوں اور کتاب اللہ میں مصارفِ زکوٰۃ منصوص ہیں۔ انہی پر خرچ کرے۔ افضل بات یہ ہے کہ یہ مالِ زکوٰۃ، صرف لباس، طعام، رہائش اور قرض ادا کرنے میں خرچ کرے۔ صدقاتِ واجبہ خرچ کرنے کا یہ افضل مقام ہے۔

زائد مال پر پرسش

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

"جس نے وہ چیز خریدی جس کی اسے حاجت نہیں۔ اس نے وہ چیز فروخت کر دی جس کی اُسے حاجت ہے۔"

فضول دنیا وہ ہے جو بقدر کفایت سے زیادہ ہو اور اس کی ضرورت نہ ہو اور دین ایک ضرورت کی چیز ہے اہلِ خرد کے لیے یہ مناسب نہیں کہ غیر ضروری دنیا کے عوض ضروری دین فروخت کر دیں ورنہ یہ ایک واضح خسارہ، گھاٹے کی تجارت اور غیر محدود شہوات میں گر پڑنے کا معاملہ ہے اور شہوات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوتی۔ البتہ خوراک کی ایک حد و انتہا ہے جہاں جا کر وہ ختم ہو جاتی ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت ہے،

"ابنِ آدم کو صرف تین میں حق ہے:

۱۔ اس قدر کھانا کہ پیٹھ سیدھی کر لے۔

۲۔ اس قدر کپڑا کہ ستر چھپا لے۔

۳۔ مکان، جس میں بارش اور سردی گرمی سے محفوظ رہے۔ جو اس سے زاید ہو اس پر حساب ہے۔" یہ تین چیزیں ابن آدم کے ہمراہ ماں کے پیٹ میں بھی تھیں۔ قبر میں اور اس کے درمیانی عرصہ یعنی دنیا میں بھی ہیں اور اس کے بعد آخرت میں بھی ہوں گی۔ اس لیے ان تین کی ضروریات کے لیے لینا بندے کے لیے باعثِ اجر ہے اور اس سے زاید کو واپس کرنا، لینے سے افضل بات ہے۔

عطا کی چار اقسام

جس کے لیے کوئی معلوم روزی نہ ہو اُسے احکامِ عطیہ سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بندے پر عطائے ربانی چار اقسام کی ہے جس میں سے دو قابلِ مدح اقسام ہیں اور دو اقسام ناپسندیدہ ہیں۔ قابلِ مدح اقسام وہ ہیں جو نرمی اور مشقت سے ملیں اور ناپسندیدہ وہ ہیں کہ جو بطور امتحان اور ابتلا کے آئیں اور نرمی و مشقت کے درمیان ہوں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ضرورت پڑنے سے پہلے جو مال اسباب کے ذریعہ سے آئے یا مال آئے اور وہ اس سے مستغنی ہو یا اس کے پاس ویسی چیز موجود ہو اور ایک چیز مزید آئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء ہے

تاکہ اس کے بارے میں اس کا عمل دیکھے۔ اس میں افضل یہ ہے کہ اسے اپنی ملکیت سے نکال دے۔ ایسا کرکے وہ پوشیدگی میں اللہ تعالیٰ کی خاطر معاملہ کرنے والا اور علانیہ میں لوگوں کے سامنے اپنے نفس کے درجہ کو گرانے والا ہوگا۔ اگر اس کی قوت نہ ہو اور نفس پر یہ مشقت نہ ڈال سکتا ہو تو اس کے بعد اس کے لیے یہی افضل ہے کہ وہ یہ لے ہی نہیں تاکہ اللہ تعالیٰ جو چاہے اس میں اپنا حکم فرمائے اور وہ مال کے معاملہ میں اپنے بھائی کو نصیحت کرے خصوصاً واجب مال ہو تو بالکل نہ لے۔

اور امتحان یوں ہوتا ہے کہ گاہے ایک فقیر نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر ایک کھانے کو چھوڑنے کا ارادہ کیا یا ایک چیز میں کمی کا ارادہ تھا تاکہ خواہش نفس کی مخالفت کرے اور اصلاحِ قلب ہو جائے اور جو چیز انسان کو کثرت میں ڈالتی ہے اس سے دور رہے یا عزم توڑنے والی چیز سے دور رہے۔ اب اگر وہی چیز سامنے آئے اور کثرت میں ڈالے یا عزم توڑے تو اس کو رد کرنا افضل ہے۔ اور یہی زہد اور رعایتِ عہد ہے اب اگر لے لیا۔ پھر اسے دوسرے محتاج کو دے دیا تو یہ زہد ہے اور اس کام میں اس کے لیے کئی معاملات ہیں مثلاً بندے کے لیے ایثار و قربانی مندوب ہے۔ جب وہ فقیر ہے اور کسی چیز کا مالک بنا۔ پھر اسے نکال دیا تو یہ اسی کے نامۂ اعمال میں ہے۔ اس میں موافقتِ سنت بھی ہے کہ اسے لینے کا حکم ملا تھا، یا اس نے اپنے سے محتاج تر کو دے دیا۔

مزید برآں لوگوں کے سامنے برملا طور پر لینا اور پوشیدہ طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا نفس پر بہت ہی گراں گزرتا ہے۔ ہاں البتہ خاشعین کی حالت یہ ہے کہ ان کے نزدیک نفس گر چکا ہے اور وہ نفسانی وسعت کے ساتھ چیز نہیں لیتے اور یہ کام اہل یقین کا ہے اور یہ مقام زاہدین فی النفس کا ہے۔ یہ اغنیاء الفقراء، علمائے زہاد کا حال ہے جو کہ بلند ترین طبقہ کے لوگ ہیں اور جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

عطاء کی دوسری دو قسموں میں سے ایک قسم رفق و نرمی کی ہے یعنی اس کے پاس ضرورت پڑنے پر رزق آئے یا اسے ایک چیز کی اشتہاء ہو اور اس پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہی ہے۔ وہ مخلوق میں طمع کے بغیر اس کی طرف یہ چیز بھیج دے یا مال آئے کہ وہ اسے خرید لے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کی یہ قسم رفق و نرمی کی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اسے لے لے اور اس کو واپس کرنے سے بسا اوقات عقل زائل ہونے کا ڈر ہوتا ہے یا طبیعت کے غلبہ یا مخلوق میں طمع ہو جانے کے ابتلاء یا کسی خسیس طرز کے کسب میں گر پڑنے کا ڈر ہوتا ہے۔

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"جس کو دیا جائے اور وہ نہ لے۔ وہ مانگے گا اور اس کو نہیں ملے گا۔" اس قسم کے بارے میں جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جب لینے والا محتاج ہو تو وسعت ہوتے ہُوئے دینے والے کے لیے (لینے والے سے) زیادہ اجر نہ ہوگا۔"

اس میں آپؐ نے لینے والے کو دینے والے کے اجر میں شریک اور برابری کرنے والا قرار دیا۔ اس لیے کہ دونوں ہی تقویٰ و نیکی کی بات میں برابر کا تعاون کر رہے ہیں اور نیکی و تقویٰ کا حکم بھی ہے۔ ایسا عطیہ لینے میں کچھ حرج نہیں۔

حضرت سری سقطیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کی طرف کچھ چیز بھیجی اور وہ واپس کر دیتے۔ تو حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا :

"اے احمد، واپس کرنے کی آفت سے بچو، یہ لینے کی آفت سے زیادہ سخت ہے۔"

امام احمدؒ نے فرمایا :

"یہ بات دوبارہ کہو۔"

انہوں نے دوبارہ کہی۔ امام احمدؒ نے فرمایا :

"میں نے صرف اس وجہ سے واپس کر دیا کہ میرے پاس ایک ماہ کی خوراک تھی۔ اگر ایک ماہ کے بعد یہ رہے تو میرے کام میں لگا دینا۔"

عطاء کی چوتھی قسم مشقت کی ہے۔ یہ اس کے اہلِ فقراء کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فقیر محنت و مشقت اٹھا کر کماتا ہے مگر اس کی طبیعت میں سخاوت کرنے اور لوگوں کو کھلانے کا جذبہ بھی کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا ہے۔ فقراء پر خوب احسان و قربانی کرتا ہے۔ اس کے حال میں وسعت نہیں آتی اور یہ تنگ دست ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اخلاقِ سخاوت کی مدد کے لیے عطیہ بھیجتا ہے تاکہ وہ مقصد براری کرے، اور نیکی کے کاموں میں اسے خرچ کرے۔ مروّت اور سخاوت کا شوق پُورا کرے۔ عطیے کی یہ قسم عارفین کے نزدیک امتحان ہوتی ہے۔ افضل یہ ہے کہ اسے لے کر مروت و اخلاق کے کاموں میں خرچ کر دے۔ سلف صالحین میں بہت سوں کا یہ طریق تھا۔

البتہ آجکل ایک قوم نے اس طریق میں مغالطہ آمیزی کر رکھی ہے۔ انہیں زہد سے کچھ حصہ حاصل نہیں۔ ان میں رغبت ہے اور یہ کمینے لوگ ہیں۔ انہوں نے نفسانیت کی خاطر عطیات کو قبول کیا اور عطیات کے مالک بن کر اپنی خواہشات میں خرچ کرنے لگے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اختیار ہے۔ ان لوگوں نے ابتلاً اور اختیار کا فرق سمجھنے میں سلف کی مخالفت کی۔ امتحان تو تب ہوتا ہے کہ خود خرچ نہ کرے اور اس میں ایثار سے کام لے۔

مگر ان لوگوں نے خواہشات کی پیروی کی اور کثرت کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ ان اشیاء کے مالک بن بیٹھے۔ چنانچہ معنی بدلنے کی وجہ سے مغالطہ میں جا گرے اور خواہش کی وجہ سے طریقِ حال میں غلطی کھائی۔

بعض سچے قاعدین کا حال یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر حسنِ ظن رکھتے ہوئے قرض لیتے۔ جناب رزق آتا تو ادا کر دیتے اور اگر اسی نیت پر فوت ہو جائیں تو بھی ان سے مواخذہ نہ ہوگا بلکہ ان کا قرض ان کے مولائے کریم پر ہے وہ ادا کر دے گا اور قرض خواہوں کو ان سے راضی کر دے گا۔

سلف صالحین میں سے بعض ایسے بزرگوں کا قرض بیت المال سے ادا کیا جاتا تھا اور بعض بزرگ ایسے بھی تھے کہ جب تک دو کپڑوں میں سے ایک کپڑا فروخت نہ کر دیتے یا زائد از ضرورت اشیاء فروخت نہ کر دیتے تب تک قرض نہ لیتے۔ اس فرمانِ الٰہی کی دو توجیہات میں سے ایک یہ ہے۔

وَ مَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ [1] (اور جس پر کشائش کی اس کی روزی، اسے چاہیے کہ وہ خرچ کرے جیسا دیا اس کو اللہ نے)

فرمایا کہ جس کو معاشی تنگی لاحق ہو جائے تو وہ اپنے دونوں کپڑوں میں سے ایک فروخت کر دے اور ایک قول یہ ہے کہ اپنے تعلقات کی وجہ سے قرض لے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہی عطا فرمایا۔

بعض سلف رح کا فرمان ہے:

"اللہ کے بعض بندے اپنے سامان کے مطابق خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر حسنِ ظن کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔"

سلف رح میں سے ایک بزرگ رح کی وفات ہوئی تو انہوں نے اپنے مال کو تین گروہوں پر تقسیم کرنے کی وصیت کی:

۱۔ اقویاء

۲۔ اسخیاء

۳۔ اغنیاء

ان سے پوچھا گیا "یہ کون لوگ ہیں؟"

فرمایا "اقویاء وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھتے ہیں۔ اسخیاء سے مراد اللہ پر حسنِ ظن رکھنے والے اور اغنیاء سے مراد وہ ہیں جو سب سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ گئے۔

---

[1] الطلاق آیت ۷

جس کا کوئی ظاہری معلوم سبب نہ ہو۔ اسے چاہیے کہ وہ لیتے وقت پرہیزگاری اختیار کرے اور دینے والوں کی پڑتال کرے۔ جیسے کہ کمانے والے کمائی کے سلسلہ میں پڑتال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر چیز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ایک حکم ہوتا ہے اور کمانے سے الگ ہونے پر اس کے احکام ساقط نہیں ہوتے اور طلب سے جُدا ہونے والے پر سے احکام طلب ختم نہیں ہو جاتے کیونکہ ترکِ عمل میں بھی عمل کی ضرورت ہوتی ہے اور فقراء صالحین کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ایک سے لیں اور ہر وقت لیں اور نہ ہی وہ بقدرِ کفایت سے زائد لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ دوسروں کو دینے کے لیے لے لیتے ہیں اور اس سے لیتے ہیں کہ جس سے قبول کر کے ان کے قلوب ہلکے رہیں اور ان کا عطیہ قبول کر کے ان کے اور ان کے درمیان سے توحش دُور کر دیں۔ اس لیے کہ ان کے قبول کرنے سے دینے والوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور ان کا لینا وہ اپنے اُوپر اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ جس کے لینے پر قلبی ثقالت ہو، وہ اگر اپنے قبضہ سے کوئی چیز نکالے گا۔ اس پر گرانی سی ہو گی اور وہ چیز کے واپس کرنے پر مغموم نہ ہو گا۔ اس لیے اس کا مال بے شک نہ لے۔

کس سے قبول کرے؟

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"جب بھی اللہ تعالیٰ کی خاطر دو آدمی باہم اخوت قائم کریں اور بعد میں ایک آدمی دُوسرے سے انقباض محسوس کرے یا متوحش ہو جائے تو یہ بات دراصل ان میں سے کسی ایک میں خرابی کی دلیل ہے۔ ایک فقیر آدمی کو چاہیے کہ صرف سچے دوست سے ہی لے اور جس سے محبت صادق ہو اسی سے عطیہ قبول کرے۔ اس لیے کہ علمائے ربانیین اور عارفین کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کو قبول یا رد کرنے میں جو مناسب سمجھے، عمل کرے۔ اور اگر کوئی ایسی غلطی دیکھے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں مثلاً شروع میں ہم نے روایت نقل کی تھی کہ "جس کے پاس بغیر مانگے کچھ آئے اور وہ اسے واپس کر دے تو اس نے اللہ تعالیٰ پہ رد کیا" مزید بر آں عارفین تمام عطیات کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتا دیکھتے ہیں اس لیے اس پر واپس کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ جو آدمی عطیات کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتا دیکھے وہ آدمی رد کرنے کا حکم بھی اسی سے دیکھتا ہے۔ اب جس آدمی کو امتحان و ابتلا کی عیوب آگاہی حاصل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب قبول و رد کرنے کے احکام سمجھتا ہو، یعنی اسے یقین ہو کہ اس کے قبول کرنے کا اور اس کے رد کرنے کا حکم ہے تو علمِ احکام کی وجہ سے اس کے لیے دونوں حال برابر ہیں۔ بشرطیکہ احکام سے آگاہ ہو اور خواہش کا اتباع نہ کرتا ہو۔ ایسے آدمی پر کچھ سزا نہیں البتہ کثرت کی خواہش کرنے والے عالم یا بصارت سے محروم جاہل عابد پہ حجت ہو گی۔ اس لیے کہ قبول کرنے میں لوگوں کے مختلف درجات ہیں اور تحائف کا کچھ حصہ رد کر دے تو بھی سنت ہے۔

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھی، پنیر اور بھیڑ پیش کی گئی، آپ نے گھی، پنیر قبول کیا اور بھیڑ واپس کر دی۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض سے قبول کر لیتے اور بعض کا ہدیہ واپس کر دیتے اور فرماتے: "میں نے بار ہا ارادہ کیا کہ صرف قرشی یا ثقفی یا دوسی سے قبول کروں۔" تابعین کی ایک جماعت نے اس پر عمل کیا ہے۔

حضرت فتح موصلیؒ کے پاس پچاس دراہم کی ایک تھیلی آئی۔ فرمایا: ہمیں حضرت عطاءؓ نے بتایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کے پاس بغیر مانگے رزق آئے اور وہ واپس کر دے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر واپس کیا۔" پھر حضرت فتح موصلی نے یہ تھیلی کھولی اور اس میں سے ایک درہم لیا اور باقی واپس کر دیے۔ حضرت حسن بصریؒ بھی اس حدیث کو روایت کرتے تھے۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک آدمی نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی جس میں مال تھا اور خراسانی کپڑے کی ایک پوٹلی تھی۔ انہوں نے واپس کر دی۔ بعض اصحاب نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

"جو آدمی ہماری اس قسم کی مجلس میں بیٹھے اور اس قسم کے لوگوں سے قبول کرے۔ قیامت کے روز وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا۔"

حضرت حسنؒ اپنے اصحاب سے قبول کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم تیمیؒ اپنے اصحاب سے ایک درہم اور اس کے برابر مانگ لیا کرتے اور دوسروں سے دو صد لینے سے بھی رخ موڑ لیتے اور کچھ نہ لیتے۔

حضرت بشر بن حارث لوگوں سے کچھ چیز قبول نہ کرتے تھے۔ بعض کہا کرتے:

"میں چاہتا ہوں کہ یہ معلوم کر دوں یہ کھاتے کہاں سے ہیں؟"

ایک آدمی نے بتایا کہ مجھے معلوم ہے کہ کہاں سے کھاتے ہیں؟ ان کا ایک عقلمند دوست ہے۔ یعنی عقل و دین میں ان کی نظیر ہے۔ اس لیے کہ بعض سلفؒ کا طریقہ تھا کہ اتباع سے قبول نہ کرتے بلکہ اپنے نظیر و مثیل سے ہی قبول کرتے تھے۔ یہ دوست ہی ان کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے اور وہ اللہ کو ظاہر نہیں کرتا۔ ان کا نام سری بن مغلس سقطیؒ ہے۔ اس لیے کہ حضرت بشرؒ نے ہمیں بتایا:

"میں نے دنیا میں حضرت سری سقطیؒ کے سوا کسی سے نہیں مانگا۔ اس لیے کہ میرے نزدیک اس کا دنیا میں زہد صحیح ہے۔ وہ چیز کے قبضہ سے نکلنے پر خوش ہوتا اور آنے سے بیزار ہوتا اور میں اس کی پسند پر اس سے تعاون کرتا ہوں۔"

حضرت سریؒ، امام احمد بن حنبلؒ کو ان کی ضروریات کی اشیاء بھیجتے اور وہ قبول کر لیتے اور جب امام احمدؒ کے سامنے ان کا ذکر ہوتا تو وہ فرماتے :

" یہ غنی ہے اور عمدہ غذا کے ساتھ مشہور ہے۔ مجھے اس کے معاملہ پر حیرت ہوتی ہے۔" (کہ ایسا بہتر غنی آدمی !)

ایک عابدؒ کا طریقہ تھا۔ جب دنیاداروں میں سے کوئی آدمی انہیں کوئی چیز دیتا تو وہ پوچھتے : " لینے کے بعد میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؛ موجودہ سے افضل یا کمتر ؟ اور صحیح صحیح بتانا۔ اگر وہ کہتا کہ آپ لینے کے بعد میرے نزدیک اب سے افضل ہوں گے تو قبول کر لیتے۔ اور اگر وہ قلبی طور پر کمی ہو جانے کی بات بتاتا تو واپس کر دیتے۔ ایک بزرگؒ زیادہ تر تحائف کو واپس کر دیتے۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا : ان پر نصیحت اور ڈر کے باعث ایسا کرتا ہوں۔ وہ اسے یاد کرتے رہیں گے اور چاہیں گے کہ اس کا علم ہو۔ ان کا مال بھی خرچ ہو جائے گا اور اجر بھی جاتا رہے گا۔ حضرت ثوریؒ کا یہی طریقہ تھا جس سے لیتے۔ اس پر شرط عاید کر دیتے کہ اس کا ذکر نہیں کرو گے تاکہ اس کا اجر ضائع نہ ہو جائے اور حکم خداوندی بھی ہے :

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى[1] (مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر اور ستا کر)

فرمایا : المن کا مطلب اسے یاد کرنا اور الاذیٰ کا مطلب اسے ظاہر کرنا ہے۔

حضرت جنیدؒ کے پاس ایک خراسانی آدمی مال لے کر حاضر ہوا۔ اور اس نے درخواست کی کہ اسے کھایئے۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا :

" میں اسے فقراء میں تقسیم کر دیتا ہوں۔"

اس نے کہا :

" میں فقراء کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔"

حضرت جنیدؒ نے فرمایا :

" کیا مجھے امید ہے کہ میں اس کے کھانے تک زندہ رہوں گا ؟"

اس نے کہا :

" میں یہ نہیں کہتا کہ اسے سرکہ، چٹنی اور سبزیوں پر خرچ کرو بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے عمدہ عمدہ اشیاء کھایئے اور طرح طرح کے حلوے کھایئے۔ اس لیے کہ جو مال جس قدر جلدی ختم ہو گا مجھے وہی عزیز تر ہے۔"

---

[1] البقرہ - آیت ۲۶۴

حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

"تیرے جیسے آدمی کا ہدیہ واپس نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہدیہ قبول کر لیا۔

اس آدمی نے کہا:

"بغداد میں آپ سے زیادہ مجھ پر احسان کرنے والا کوئی نہیں۔"

حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

"ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ صرف تیرے جیسے آدمی سے ہی قبول کرے۔" یہ اہل حقائق کی راہیں ہیں۔
جو آدمی کاروبار سے الگ ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہی کاروبار ترک کرے۔
اس لیے کہ کاروبار ترک کرنے کے بھی احکام ہیں۔ اپنے حال کے علم پر قائم رہے۔ اسباب سے علیحدگی خوبی کے ساتھ نبھائے۔ مسبب وہاب تعالیٰ پر ہی اعتماد رکھے اور اس یقین کی برکت سے اسے معلوم کو چھوڑ دینا جائز ہے۔

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"صرف اسی کے پاس کھا جو یہ سمجھتا ہو کہ تو نے اپنا رزق کھایا اور اس پر صرف اپنے رب کا شکر کر۔"
کسی آدمی نے حضرت شقیق بلخیؒ کی دعوت کی ان کے پچاس کے قریب اصحاب تھے۔ اس آدمی نے خوب وسعت سے کھانا رکھا اور بہت مال خرچ کیا۔ جب کھانے بیٹھے تو حضرت شقیقؒ نے فرمایا:

"یہ آدمی کہہ رہا ہے کہ جو مجھے کھانا تیار کرنے والا اور ان کے سامنے پیش کرنے والا نہیں سمجھتا اس پر میرا کھانا حرام ہے۔"

بتاتے ہیں کہ سب لوگ اُٹھ گئے اور باہر نکل گئے۔ البتہ ایک ناقص المشاہدہ لڑکا بیٹھا رہا۔ گھر والے نے حضرت شقیقؒ سے کہا:

"اللہ آپ پر رحم کرے، آپ کی اس سے کیا مراد تھی؟"

فرمایا: "میں نے اپنے اصحاب کی توحید کا امتحان لینا چاہا۔ یعنی اس نوجوان کے سوا کوئی بھی جو بنایا گیا اس میں اس پر نظر نہیں رکھتے اور جو پیش کیا گیا اس میں ان کی نظریں اس پر نہیں ہیں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے۔ کہا:

"اے پروردگار، تو نے اس اس طرح بنی اسرائیل کے ہاتھ پر میرا رزق رکھ دیا۔ یہ آدمی صبح کا کھانا دیتا ہے اور یہ رات کا کھانا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی:

"میں اپنے اولیاء کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہوں۔ ظالم بندوں کے ہاتھوں پر ان کے رزق جاری کر دیتا ہوں

تاکہ انہیں اس کام پر اجر دوں۔

مشائخ کے نزدیک جاہل مصروف سے وہ عالم بہتر ہے جو کاروبار سے الگ ہے اور کمانے والا عالم، جاہل بے کار سے بہتر ہے اور قوی تارکِ کاروبار ان کے نزدیک کمزور کمانے والے سے بہتر ہے اور قوی کمانے والا آدمی کمزور تارک کاروبار سے بہتر ہے۔

کھلانے کی اہمیت اللہ تعالیٰ نے چھ قسم کے لوگوں کو عطیات کا مستحق قرار دیا۔ تین آیات میں ان کا ذکر فرمایا:

۱۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ[۱] (زکوٰۃ جو ہے سو حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا)

۲۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ[۲] (اور ان کے مالوں میں حصہ تھا مانگتے کا اور محروم کا)

۳۔ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ[۳] (تو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ صبر سے بیٹھے کو اور بے قرار کو)

اب جس کا کاروبار یا ذریعہ معاش معلوم نہ ہو تو وہ ان آیات میں داخل ہے اور عطیہ کا محتاج ہے اور جس کا ذریعہ معاش معلوم نہ ہو وہ زیادہ خاندان ہونے یا کثرتِ اخراجات کی وجہ سے مستحق ہو جاتا ہے اور وہ ان کے اوصاف کے مفہوم کی وجہ سے داخل ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ اس آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ کی شرح میں فرماتے:
یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں اور جو ان کے مفہوم میں قیامت تک آنے والے ہیں، ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی تعداد چار سو پچاس تھی۔ ان کے مدینہ میں خاندان نہ تھے اور نہ ہی ان کے پاس مال و دولت تھی جیسے کہ دوسرے مہاجر و انصار کا معاملہ تھا۔ دوسرے قبائل انہیں طعن دیتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد کے صفہ (چبوترے) پر ٹھہرایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مالوں سے حصہ مقرر کر دیا۔

ان چھ طبقات کے بعد اللہ تعالیٰ نے ساتویں طبقہ کا علیحدہ ذکر کیا۔ ان کی خوب تعریف کی اور اللہ تعالیٰ کی

---

[۱] التوبہ آیت ۶۰
[۲] الذریٰت آیت ۱۹
[۳] الحج آیت ۳۶

خاطران پر حلال مال خرچ کرنے پر بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا۔ فرمایا:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ ؎۱ (اے ایمان والو! خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی سے)

اور فرمایا:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ ؎۲ (اور جو خرچ کرو گے خیرات پوری ملے گی تم کو)

اور اس سب کا تعلق و اتصال اس کے ساتھ ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ؎۳ (ان مفلسوں کو جو رک گئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے ملک میں)

سے لے کر آخر تک۔

چنانچہ ان میں بتایا کہ وہ اللہ کی راہ میں محصور ہو گئے۔ دنیا اور دنیا داروں سے عفت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ زہد کی وجہ سے ان سے چپک چپک نہیں جاتے۔ جاہل آدمی انہیں دیکھ اغنیاء سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہ طبقہ زکوٰۃ کے مستحقین سے بالاتر ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا وصف بیان کر کے ان پر عمدہ اور حلال مال خرچ کرنے کا حکم دیا اور اللہ تعالیٰ جس سے محبت رکھے اس کا وصف بیان کرتا ہے اور جب اس کی تعریف فرماتا ہے تو اس کی محبت اس کے لیے ثابت ہو گئی۔ اس لیے کہ تعریف کرنا، محبت کی دلیل ہے اور محبت ان کے فضل و شرف کی علامت ہے جیسے کہ آخر میں فرمایا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔ (یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے، دیتا ہے)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"عطا کرنے والے کا ہاتھ ہی بلند ہے اور عطاء کرنے والے کا ہاتھ ہی نیچے ہے۔"

اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بزرگؒ نے فرمایا:

"عطاء کرنے والا فقیر ہی ہے اور عطا کرنے والا ہی غنی ہے۔" اس کی دلیل یہ ہے کہ حقیقی عطاء آخرت کی عطاء ہے اور وہی عطا کرنے والا ہوا اور غنی ہی عطاء کرنے والا ہوا۔ دوسری دو روایات اس کی دلیل ہیں۔ فرمایا:

"صدقہ، سائل کے ہاتھ میں پڑنے سے پہلے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے ہاتھ میں پڑتا ہے۔ اور وہ سائل کے

؎۱ سورۃ البقرہ آیت ۲۶۷ ؎۲ البقرۃ آیت ۲۷۲ ؎۳ البقرہ آیت ۲۷۳

ہاتھ میں رکھتا ہے۔ ؛ اب فقیر کا ہاتھ ہی اوپر والا ہاتھ ہے۔

دوسری روایت یہ ہے ؛

" اللہ کا ہاتھ اوپر والا ہے اور عطا کرنے والے کا ہاتھ وسطی ہے "۔ اس سے معلوم ہُوا کہ فقیر ہی عطاء کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور وہی اس کے ہاتھ میں عطاء کرتا ہے۔ اب اس کا ہاتھ وسطی ہُوا۔

اگر کہا جائے کہ فرمانِ الٰہی میں ہاتھوں کی ترتیب ہے کہ اللہ کا ہاتھ اُوپر والا ہے اور عطاء کنندہ کا ہاتھ ہی نیچے کا ہے۔ اب عطاء کنندہ ہی غنی ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک عطاء کا ترتیب پر اظہار ہو رہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ایک ساتھ دونوں کے اُوپر ہے اور وہ ترتیب کے ماتحت نہیں آتا۔ اب اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان دونوں پر ہُوا۔ فرمایا :

یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔ (اللہ کا ہاتھ ہے اُوپر ان کے ہاتھوں کے)

اور ہم جانتے ہی ہیں کہ بندوں کے ہاتھ باہمی اُوپر نیچے ہوتے ہیں۔ پھر بتایا کہ یہ سب سے اوپر ہے۔ اس لئے کہ وہی معطی اوّل دونوں کا ہے۔ اب جس طرح عطاء میں اس سے پہلے کوئی نہیں اسی طرح اعطاء میں اس کے ہاتھ کے اوپر کوئی ہاتھ نہیں اور ترتیب تو دراصل اللہ کے ہاتھ کے بعد غنی اور فقیر کے درمیان ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حقیقی عطاء کرنے والا وہی ہے کہ جب ابدی اور باقی رہنے والی عطاء کرے اور عطاء فانی اور زائل ہونے والی نہ ہو اور ایسی صفات کی عطاء تو اخروی عطاء ہے۔ اب فقیر ہی غنی کو عطاء کرنے والا ہُوا کہ اس نے دُنیا میں اسے اخروی عطاء کی۔ آخرت میں اس کے درجات بڑھا دیئے اور غنی آدمی نے دنیا میں فقیر کو ذرا آسانی کر دی جو چند روز کے بعد فنا ہونے والی ہے اور دُنیا تو لاشئی ہے۔ اب وہ دے گا کیا! اور اللہ کا ہاتھ ان دونوں پر ہے۔ جس نے ان دونوں کو عطاء کیا اس لیے کہ اس کا فوق سے بالاتر ہے۔ تحت سے بالاتر ہے۔ اس کا تحت و فوق سے وصف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بلند اوصاف، اسفل مخلوق کی صفات سے بالاتر ہیں اور وہ قیاس و تشبیہ سے باہر ہے۔

احباب میں سے ایک نے اپنے ایک شیخ سے روایت کیا، فرمایا :

' میں نے ابوالحسن نوریؒ کو دیکھا۔ وہ ایک جگہ ہاتھ بڑھا کر لوگوں سے مانگ رہے تھے ' بتاتے ہیں کہ مجھے یہ بات بڑی بُری لگی اور میں حضرت جنیدؒ کے پاس آیا اور انہیں یہ بات بتائی۔ انہوں نے فرمایا :

اس کو بڑی بات نہ بنا لینا، حضرت نوریؒ لوگوں سے صرف انہیں عطا کرنے کے لیے مانگ رہے ہیں۔ جب وہ ان سے انہیں آخرت کی باقی چیز دینے کے لیے سوال کریں گے تو لوگوں کو اجر ملے گا اور انہیں کچھ ضرر

نہیں۔ پھر فرمایا :

"ترازو لاؤ۔" بتاتے ہیں کہ انہوں نے ایک سو درہم تول کر اس کے اُوپر ایک مٹھی درہم ڈال دیے اور فرمایا :

"انہیں ان کے پاس لے جاؤ۔"

یہ بتاتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا :

چیز اس لیے تولی جاتی ہے کہ اس کا وزن معلوم ہو جائے مگر یہاں مزید دراہم ڈال کر پھر اختلاط کر دیا گیا، مگر یہ آدمی بڑے حکیم ہیں۔ چنانچہ شرم کی وجہ سے میں نے اس کی وجہ نہیں پوچھی اور تھیلی لے کر حضرت نوریؒ کے پاس گیا۔ انہوں نے فرمایا :

"ترازو لاؤ۔" اور پھر ایک سو دراہم تول لے اور کہا :

"انہیں واپس کر دو اور کہہ دو" میں تم سے کچھ چیز قبول نہیں کرتا۔" اور جو ایک سو سے زاید تھے وہ لے لیے۔

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے کہا :

"آپ نے یہ کیوں کیا؟"

فرمایا۔" جنیدؒ ایک دانا آدمی ہے اس نے چاہا کہ دونوں جانب سے رسی پکڑے۔ اس سو کو اپنے لیے آخرت کے ثواب کی خاطر تولا اور اس پر ایک مٹھی ڈال کر بغیر وزن کیے اللہ کی راہ میں دیا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیا قبول کر لیا اور جو اس نے اپنے لیے کیا تھا اسے واپس کر دیا۔" بتاتے ہیں کہ جب میں نے حضرت جنیدؒ کو واپس دیے تو وہ رو پڑے۔ اور فرمایا :

اس نے اپنا مال لے لیا اور ہمارا مال واپس کر دیا۔ واللہ اعلم

صدقہ کے اظہار و اخفاء کے احکام

اخفائے صدقہ بہتر ہے

اہل اخلاص کا عمل اس سلسلہ میں مختلف ہے۔ بعض نے عطیہ لے کر اسے مخفی رکھنے کو بہتر سمجھا ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے وہ متعفف (سوال سے بچنے والا) ہو گیا اور یہ دُوسرے کے دل کے لیے یہ بات زیادہ سلامتی کا باعث ہے اور اس میں عام نفوس کی زیادہ اصلاح ہوتی ہے۔ مزید برآں ایسا کرنے سے اپنے بھائیوں کو غیبت یا تہمت سے بچنے سے مدد ملی اور اس میں اپنے بھائی کے لیے احتیاط کا معاملہ بھی ہے۔ نیکی اور تقویٰ کے کام میں اس سے تعاون بھی ہے۔ فرمایا :

وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ (اور اگر چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو تمہارے لیے

خَيْرٌ لَّكُمْ [1] بہتر ہے)

ایک روایت میں بھی آیا :

"افضل ترین صدقہ تنگ دستی کی کمائی ہے جو کسی فقیر کو پوشیدہ طور پر دیا جائے۔" نیز پوشیدہ عمل، ظاہری عمل سے ستر گنا زیادہ ثواب رکھتا ہے۔ اب اگر یہ اس کے عطیہ کو مخفی نہ رکھتا اور نیکی پوشیدہ رکھنے میں اس سے تعاون نہ کرتا تو یہ بات کیونکر مکمل ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ دونوں کے درمیان ایک راز ہے۔ اگر ایک نے کھول دیا، یا دونوں ہی چھپانے پر متفق نہ ہوں تو کہیں سے بھی ظاہر ہو جائے۔ یہ خبر ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"اپنے امور پر اخفاء کر کے مدد حاصل کرو۔ اس لیے کہ ہر صاحبِ نعمت محسود ہے۔" یہ عابد قراء کا مذہب ہے۔

حضرت ایوب سختیانیؒ نے فرمایا :

"میں اس لیے نیا کپڑا پہننا چھوڑ دیتا ہوں کہ کہیں میرے پڑوسیوں کے دل میں حسد پیدا نہ ہو جائے۔"

ایک زاہد کا قول ہے :

"بسا اوقات میں اپنے بھائیوں کی خاطر ایک چیز کا استعمال چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ کہتے ہیں :

"اسے یہ کہاں سے ملا ؟"

حضرت ابراہیم تیمیؒ کو ایک آدمی ظاہر میں ایک چیز دی۔ انہوں نے واپس کر دی۔ ایک دوسرے آدمی نے پردے میں ایک چیز دی تو قبول کر لی۔ اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا :

"اس آدمی نے اپنی نیکی کو چھپایا اور معاملہ کرنے میں ادب سے کام لیا۔ ہم نے اس کا عمل قبول کر لیا۔ اور اس نے اپنی نیکی کو ظاہر کیا۔ معاملہ میں بے ادبی سے کام لیا۔ ہم نے اس کا عمل اس پر رد کر دیا۔"

ایک آدمی نے ایک بزرگؒ کو لوگوں کے سامنے کچھ چیز دی۔ انہوں نے واپس کر دی۔ ان سے کہا گیا :

"آپ اللہ تعالیٰ پر واپس کیوں کرتے ہیں جو اس نے آپ کو عطا کیا ؟"

فرمایا : "جو چیز اللہ تعالیٰ کے لیے تھی اس میں تو نے غیر اللہ کو شریک بنایا اور تُو نے اللہ تعالیٰ کی نظر پر قناعت نہ کی۔ اس لیے ہم نے تیرا شرک تجھ پر واپس کر دیا۔"

بعض علماء کا طریقہ تھا کہ وہ علانیہ چیز نہ لیتے اور پوشیدہ طور پر لے لیتے۔ ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا : "اظہارِ صدقہ میں علم کو ذلیل کرنا اور علمائے دین کی اہانت کرنا ہے۔ علم اور علماء کو ذلیل کر کے تُو دنیا کی

---

[1] البقرۃ آیت ۲۷۱

کسی چیز سے سربلندی حاصل نہیں کر سکتا۔

ایک آدمی نے ایک عارفؒ کو علانیہ کچھ چیز دی۔ انہوں نے واپس کر دی۔ پھر انہیں پوشیدہ طور پر دی گئی تو قبول کر لی۔ ان سے کہا گیا:

"آپ نے ظاہر میں واپس کر دی اور پوشیدگی میں لے لی۔"

فرمایا: "اس لیے کہ پوشیدگی میں تو نے اللہ کی اطاعت کی۔ میں نے قبول کر کے تیری نیکی میں تجھ سے تعاون کیا اور ظاہر میں تو نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ میں تیری نافرمانی پر تیرا مددگار نہیں بن سکتا۔"

حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے:

"اگر مجھے معلوم ہو کہ ان میں ایک آدمی اپنے احسان کو یاد کرتا نہیں پھرے گا اور اس کا ذکر نہیں کرے تو میں اس کا احسان قبول کر لوں۔" قسم ہے کہ اخفائے صدقہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مندوب کے مطابق ہے اور سری اعمال کی فضیلت بھی زیادہ ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت میں لینے والے میں داخل نہیں کہ،

"جس کو ہدیہ دیا جائے اور اس کے پاس ایک جماعت ہو تو وہ اس (ہدیہ) میں حصّہ دار ہیں۔"

ایک حدیث میں ہے،

"آدمی کا اپنے بھائی کو افضل ترین ہدیہ چاندی (سکہ) ہے یا اسے روٹی کھلائے۔" چنانچہ چاندی کو دوسرے ہدیوں کی طرح ایک ہدیہ قرار دیا اور یہ افضل تر ہے۔ اس لیے کہ یہ اشیاء کی قیمت بن جاتا ہے اور اگر حاضرین بھی پاس ہوں تو یہ تحفہ سب کا مشترک ہے۔ اور اگر وہ اسے ہبہ کر دیں تو تنہا مالک ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو بھی کوئی تعجب کی بات ہے۔

عارفین کا ایک گروہ یہ خیال رکھتا ہے کہ لینے والے کا ظاہر کرنا افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کے لیے خوب باعثِ سلامتی ہے اور زیادہ خلوص وصدق کا باعث ہے اور رد کرنے اور زہد کرنے کی وجہ سے وہ ظاہری جاہ وحشمت اور بڑے پن سے باہر یا ہر نکل آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ۔ (تجھ پر اپنی جان کے سوا ذمہ نہیں)

اخفاء میں سلامتی کو دیکھتے ہوئے ظاہر میں لینے کی پابندی نہیں اور توحید میں یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں وہی عطا کرنے والا ہے۔ اب ظاہر میں واپس کرنے کا کوئی مطلب نہیں۔

بعض کا فرمان ہے:

"عارف کا باطن و ظاہر ایک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دونوں حالتوں میں اس کا معبود ایک ہے۔ چنانچہ ان میں

سے ایک حالت کا دُوسری سے مختلف ہونا، توحید میں شرک کہلاتا ہے۔"

ایک عارف" کا فرمان ہے:

"ہمیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ جو پوشیدگی ہیں لے۔ پھر ظاہری طور پر ہاتھ اٹھا دے۔"

پھر فرمایا:

"یہ دنیا کی بات ہے اور امورِ دنیا سے علانیہ ہی افضل ہے اور امورِ آخرت میں اخفا، افضل ہے۔"

اظہار کی اجازت

ایک سالک کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے ایک عارف استاذ سے پُوچھا کہ سبب ظاہر کر دے یا مخفی رکھے؟

فرمایا: اگر تو لینے والا ہے تو ہر حال میں اظہار کر دے۔ اس لیے کہ تو دو آدمیوں میں سے ایک ہی ہوگا:

ا۔ ایک وُہ آدمی ہے کہ جس کے قلب میں تو گر جاتا ہے۔ جب تُو نے یہ کیا تُو یہی تو چاہتا ہے۔ یہی تیرے دین کے لیے زیادہ سلامتی اور آفات سے بچنے کا بہتر طریقہ ہے۔ یہی کر۔ اس لیے کہ یہ بغیر تکلّف کے تیرے پاس آیا۔

۲۔ ایک آدمی ایسا ہے کہ اس کے قلب میں تیرا فضل و شرف بڑھتا رہتا ہے۔ تیرا بھائی یہی چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کو تجھ سے جس قدر محبت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کا ثواب بڑھے گا اور اسے مزید انعام ملنے پر اجر ملے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس پر عمل کرو۔"

ایک عارف" کا قول ہے:

"جب تُو نے اسے لیا تو اسے ظاہر کر دے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اس کا اظہار ہی افضل ہے اور جب تُو نے اسے واپس کیا تو اسے چھپا دو۔ اس لیے کہ یہ تیرا عمل ہے اور اس کا پوشیدہ رکھنا افضل ہے اور قسم ہے کہ یہی قولِ فیصل ہے اور یہی عارفین کی راہ ہے۔"

ایک عالم" فرماتے ہیں:

"لینے والے سے اظہار دراصل آخرت کی بات ہے اور اس کا پوشیدہ کرنا، دنیا ہے اور اعمال کا ظاہر کرنا دنیا ہے۔ انہیں چھپانا آخرت ہے۔" اور یہ اظہار کو مکروہ نہیں سمجھتے تھے اور یہ طریقہ اس فرمانِ خداوندی کے مطابق ہے:

وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ [1] (جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر)

---

[1] الضحیٰ آیت ۱۱۔

اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کی مذمت کی کہ جس کے پاس اللہ کا فضل آئے اور اسے مخفی رکھے۔ اسے بخل سے ملایا اور بخل، دنیا کا ایک بڑا دروازہ ہے۔ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔[1] (وہ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل سکھاتے ہیں اور جو ان کو اللہ نے اپنا فضل دیا اسے چھپاتے ہیں)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر کسی نعمت کا انعام فرمائے تو وہ پسند کرتا ہے کہ تو اس پر یہ دیکھے۔" اہل توحید عارفین کے قلوب کو یہی اقرب بات ہے۔ اس لیے کہ یہ ان کے حال کا تقاضا ہے اور ان کے مشاہدہ کا باعث ہے کیونکہ بندوں کے ہاتھ یعنی ظروف ان کے نزدیک برابر ہیں اور ان کی نظریں ہمیشہ معطی اوّل پر رہتی ہیں۔ اس کے ہاتھ سے لیتے ہیں ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔

میرے نزدیک یہ بات وضاحت طلب ہے۔ واللہ اعلم۔ بات یہ ہے کہ مخلوق پر ایک دوسرے کے ذریعہ ابتلا ہوتا ہے۔ ہر بندے کو اپنے حال کے حکم پر قائم رہنا فرض ہے تاکہ وہ قیامِ حکم کے باعث فضیلت حاصل کرے اور اس حال میں سلامتی پائے۔ اب معطی پر لازم ہے کہ محنت کو مخفی رکھے۔ اگر اس نے اپنے حال سے آگاہ ہونا چھوڑ دیا تو اس کی وجہ سے نقص و کمی ہو جائے گی۔ یہ ایک نفسانی آفت ہے اور ابوابِ دنیا میں سے ہے۔

معطی پر لازم ہے کہ وہ ذکر کرے اور پھیلائے۔ اب اگر اس نے اسے مخفی رکھا تو اس نے اپنے عمل میں اخلاص چھوڑ دیا اور اس کی وجہ سے ناقص ہو جائے گا اور یہ بھی ایک نفسانی آفت ہے اور یہ بھی دنیا کا ایک دروازہ ہے

شکر و ثناء کا حکم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

"فلاں آدمی کو آپ نے ایک دینار دیا تو اس نے اس پر شکر و ثناء کہی۔"

آپ نے فرمایا:

"مگر فلاں کو میں نے تین سے دس تک دیا مگر اس نے شکر و ثناء نہیں کی۔" چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے شکر و ثناء چاہی اور آپ ابن حمامہ شاعر کو فرماتے ہیں:

"جو تو نے اس پر میری مدح کی اسے اپنے سے ڈال دو۔ اور جو تو نے اس پر اپنے رب تعالیٰ کی مدح کی تو اسے لاؤ، اس لیے کہ وہ مدح کو پسند فرماتا ہے۔" مگر اس آدمی کو آپ نے اپنے حال کے حکم پر قائم رہنے کا امر فرمایا۔ اس لیے کہ آپ جانتے تھے کہ شکر و ثناء دراصل عطاء و نیکی کی بات پر آمادگی کرنے کی بات ہے اور

---

[1] النساء ۳۷۔

یہ بات اخلاقِ ربانی میں سے ایک خُلق ہے، جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے. چنانچہ اس نے منفق لوگوں کی قدر کی اور وہی رزق دینے والا ہے اور اپنے اولیاء سے یہ پسند کیا کہ وہ واسطوں کا شکریہ بھی ادا کریں اور ان کی بھی تعریف کریں. البتہ اس میں اوّل تعالیٰ کا ہی مشاہدہ کریں۔

اسی طرح حبیب مہاجرینؓ نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! ہم نے اس قوم سے بہتر قوم نہیں دیکھی کہ ہم ان میں اترے۔ انہوں نے ہم میں اپنے مال تقسیم کیے۔ حتیٰ کہ ہمیں خطرہ ہُوا کہ سارا ثواب یہی لے جائیں گے۔"

آپؐ نے فرمایا،

"ہرگز نہیں، تم نے ان کا جو شکر کیا اور اس کے باعث ان پر ثنا بیت کیا۔" (تمہیں بھی اجر ملا)

اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُوسری حدیث میں حکم دیا،

"جس پر احسان کیا جائے، اسے چاہیے کہ اس کا معاوضہ دے اگر اس کی ہمت نہ ہو تو اس کی تعریف ہی کر دے۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں،

"جو تم پر کوئی احسان کرے تو اس کو معاوضہ دو۔ اگر اس کی قوت نہ ہو تو اس کی اچھی تعریف کر دو، اور اس کے لیے دعا کرو۔ حتیٰ کہ وہ جان لے کہ تم نے اس کا بدلہ چکا دیا۔" اور اس مفہوم میں ایک خبرِ عام ہے: "جس نے لوگوں کا شکر نہ کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کیا۔"

معنی حدیث میں ایک غریب لفظ مروی ہے،

"جو دو طریق سے آیا اور وہ یہ ہے کہ "جس نے لوگوں کا ذکر نہیں کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا۔"

مطلب یہ ہے کہ عطاء میں ان کا ذکر نہیں کیا اور ان کی تعریف نہیں کی۔

فضیلت کی دوسری نوع یہ ہے کہ معطی پر لازم ہے کہ وہ اس نیکی کا ذکر کرنا اور اس پر تعریف کیا جانا پسند نہ کرے۔ اگر یہ چاہنے والا آدمی ہو تو یہ بات اس کی کم علمی پر دلالت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اس پر نفسانی آفات کی شدت ہے۔ اس قسم کے آدمی پر تعریف نہ کرنا اور پوشیدہ رکھنا افضل بات ہے۔ اگر فقیر نے اس کے صدقہ کو ظاہر کر دیا تو اس نے اس پر ظلم کیا۔ اس لیے کہ اس کا نفس ظالم ہے اور اس پر نفسانی آفات کا غلبہ ہے اس قسم کا کام کرنا دراصل بُرائی اور ظلم میں تعاون کرنے کے برابر ہے۔ اب معطی کو چاہیے کہ اگر وہ ظالم ہو اور اس بات سے آگاہ نہ ہو تو اس کی اس طرح مدد کرے کہ اس کا صدقہ اور عمل مخفی رکھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عطیہ پر تعریف کرے یا نہ کرے؛

بعض کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عطیہ کا اظہار و اخفاء برابر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں حسنِ یقین حاصل ہے اور ان کی نیت خالص ہے۔ ان کی نظر ہمیشہ منعم اول تعالیٰ پر رہتی ہے۔ ان کی قوتِ معرفت اور کمالِ عقل کے باعث اگر برملا ان سے قبول کیا جائے تو درست ہے اور ان کی تعریف و ثنا کرنا بھی جائز ہے۔ اس لیے کہ ان کی نظریں مولائے کریم پر ہوتی ہیں کہ اس نے توفیق بخشی وہی کارساز ہے اور اس پر وہ خدا کا شکر کرتے ہیں اور یہ اس کی طرف نعمت سمجھتے ہیں۔ یہ ایک خبرِ مشہور کی طرح ہے۔ فرمایا:

"جب مومن کی تعریف کی جاتی ہے تو اس کے قلب میں ایمان بڑھتا ہے۔"

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"آدمی کی تعریف اس کی عقل کی مقدار پر کی جاتی ہے۔"

حضرت ثوریؒ نے فرمایا:

"جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس کے لیے لوگوں کی تعریف کچھ ضرر رساں نہیں۔"

فضیلت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی نیکی کو ظاہر کیا جائے تو ان کی نیت میں خرابی آجاتی ہے۔ ان میں تصنع اور ریاء کی آفات کا خطرہ ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اگر علانیہ کچھ پیش کریں تو قبول نہ کرے ورنہ ان کی معصیت پر مددگار ہوگا۔ مزید برآں ان کی اس کام پر تعریف کرنا بھی درست نہیں۔ اگر ان کی تعریف کر دی یا ان کی نیکی کو ظاہر کر دیا تو ایسا کرنے سے ان میں خرابی آجائے گی۔ اور وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ان کا نفس ابھی طاقت ور ہے۔ ان کی معرفتِ ربانی بھی ناقص ہے۔ اب جس نے ان کی تعریف کی اور اس کی نیکی کا ذکر کیا تو اس نے ان کے شرک پر ان کی مدد کی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا:

"تو نے اس کی گردن کاٹ دی۔ اگر وہ سن لے تو فلاح نہ پائے۔" حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک قوم کی یقین کی پختگی سے آگاہ ہوتے اور یہ جان لیتے کہ ان کی مدح کرنا ان کے لیے مزید ایمان کا باعث ہے تو آپؐ ان کی تعریف فرماتے۔

ایک آدمی حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا:

"یہ اہل دیہات کا سردار ہے۔"

ایک دوسرے آدمی کے بارے میں فرمایا اور وہ سن رہا تھا:

"جب تمہارے پاس ایک قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کی عزت کرو۔" ایک آدمی بڑا موزوں و مفضل

بیان کیا تو آپ کو خوب لگا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
" بے شک بعض بیان جادو ہوتے ہیں " اور جب آپ سمجھتے کہ کسی کے لیے تعریف نقصان دہ ہے
تو آپ ان کے بارے میں تعریف کو پوشیدہ رکھتے ۔
حضرت ثوری ؒ نے حضرت یوسف بن اسباط ؒ کو فرمایا ،
"جب میں تیرے ساتھ بھلائی کروں اور تجھ سے زیادہ میں اس پر مسرت محسوس کروں اور میں اس کو
اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھوں اور تجھ سے زیادہ اس سلسلہ میں حیا کروں تو میں شکر کروں گا ورنہ نہیں ۔"
الغرض عطا کرنے والے کا حال اخفاء کا ہے اور لینے والے کا حال اظہار کا ہے ۔ جس نے اس کے برعکس کیا ۔
اس نے اپنا حال چھوڑ دیا ۔ عطا کرنے والے کا فرض یہ ہے کہ وہ مدح کو ناپسند کرے اور ذکر و ثناء کو نہ چاہے
جس کی یہ حالت معلوم ہو ، اس کی تعریف کرنا اور اس کا شکر و ذکر کرنا تجھ پر لازم ہے اور جس کے بارے میں
یہ معلوم ہو کہ یہ اظہار کو پسند کرتا ہے اور شہرت کا طلبگار ہے ۔ اس کا ذکر کرنا اس کے ظلم میں مدد کرنا ہے اس لیے
اس جیسے آدمی کی تعریف نہ کرنا افضل اور زیادہ سلامتی کا باعث ہے ۔ اہل صدق کے فرامین کا مسلم ہے ۔

واجب یا نفلی میں سے کون سا صدقہ قبول کرے ؟

اس بات میں اختلاف ہے کہ واجب صدقہ قبول کرے یا نفلی صدقہ کرے ؟

بعض کی رائے یہ ہے کہ واجب صدقات قبول کرے اور نفلی صدقات قبول نہ کرے ۔ واجب صدقہ اللہ تعالیٰ
کے اذن سے اور اس کے مقرر کردہ حصہ کے مطابق لیا جاتا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ واجب کی
اسی طرح اس کا لینا بھی واجب فرمایا ۔ اس لیے کہ اگر فقراء و مساکین زکاتیں نہ لینے پر اتفاق کریں تو سب
گنہ گار ہوں گے اور ایسا کرنے کے سبب نافرمان شمار ہوں گے ۔ اس لیے کہ انہوں نے اموال میں فرض بات
یعنی زکوٰۃ کو ساقط کر دیا ۔ اس گروہ کا فرمان ہے :
اس سلسلہ میں ہم پر کسی کا احسان نہیں اور اس کی وجہ سے ہم پر کوئی حق لازم نہیں آتا ۔ اس لیے کہ ہم
اس کے حق دار ہیں اور فرمایا کہ یہ ہمارے دین کے لیے زیادہ سلامتی کا موجب ہے تاکہ ہم پر دین کے
عوض کھانا لازم نہ آئے اور ہم صرف حرمتِ اسلام کی خاطر اور ضرورت کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں اور اگر
ہم نفلی صدقہ کھائیں گے تو خطرہ ہے کہ ہم نے دنیا کے عوض کھایا ، یا ہماری فضیلت کے عقیدہ کے باعث ہمیں
دیا گیا ۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ فقراء (مستحقین زکوٰۃ وغیرہ) کے علاوہ ہمیں کسی چیز سے مخصوص کر دیا جائے ۔ یہ
عبادت گزار فقراء کا مذہب ہے اور اس کا مذہب ہے کہ جو اپنے حال کے تقاضا اور اپنے مشاہدہ
کی وجہ سے اپنے دین کے سلسلہ میں اصلاح اور نفس کو درست رکھنے پر نظر رکھتا ہے ۔

ایک گروہ نے فرائض کی بجائے نوافل صدقات قبول کرنا پسند کیا۔ انہوں نے اسے تحفہ کے قائم مقام قرار دیا اور فرمایا :

نوافل کا قبول کرنا مامور بھی ہے اور ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجنے میں محبت و الفت بھی بڑھتی ہے اور ہم مساکین کے حقوق میں مزاحمت کرنا بھی نہیں چاہتے۔ شاید ہم ان کے اوصاف پورے نہ کر سکیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لازم ہونے کی جو شرائط عائد کر رکھی ہیں، ہم میں نہ پائی جائیں اور ہم واجب صدقات کو ان کے صحیح مصرف میں نہ رکھ سکیں تاکہ اس سلسلہ میں ہم سے کوئی بے احتیاطی ہو جائے۔ چنانچہ ہمارے لیے نفلی صدقہ ہی زیادہ آسانی کا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ نعمت سمجھتے ہیں اور دین اللہ ہی کا ہے جیسے کہ فرمایا :

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[1] (یاد رکھو، اللہ کے لیے ہی ہے خالص بندگی)

اور یہ حضرات پابند عمل ہیں اور ان پر انعام کرنے والے ہیں۔ اپنے آپ پر انعام کرنے والے نہیں ہیں۔ بعض اہل معرفت کا یہی طریقہ ہے۔

حضرت ابراہیم خواصؒ، ابو القاسم جنیدؒ اور ان کے موافقین کا یہ طریقہ ہے۔ میرے نزدیک معاملہ یہ ہے کہ جو آدمی ہر انسان سے نہ لے اور ہر وقت نہ لیتا ہو اور صرف ضرورت کے وقت ہی قبول کرے اور جس کے بغیر چارہ نہیں صرف وہی لیتا ہو۔ پھر واجب اور نفل میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے تو اس کے دونوں حال قریب قریب ہیں اور درست ہیں۔ اس لیے کہ واجب میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک حکم فرمایا اور نفلی صدقہ میں اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے۔

بندے پر یہی لازم ہے کہ وہ دین کا خیال رکھے، بھائی کے لیے احتیاط کرے اور جو نسا صدقہ بھی ہو وقت کے مطابق اس کے احکام پر عمل کرے تو یہ دونوں برابر ہیں اور خواہش و لذت میں آ کر نفسانی ظلمت کے ساتھ نہ دیکھے اس میں اس کی سلامتی ہے۔

---

[1] الزمر آیت ۳

فصل ۴۲

سفر اور مسافر کے احکام

سفر کی اہمیت

اگر سالک کو کوئی سفر پیش آئے تو حدیث میں ہے:

"تمام شہر اللہ عزوجل کے شہر ہیں اور مخلوق اس کے بندے ہیں۔ جہاں روزی ملے، قیام کرے اور اللہ عزوجل کی حمد کرے۔"

ایک خبر مشہور میں ہے:

"سفر کرو، غنیمت پاؤ۔ اس لیے کہ ابنائے آخرت کی غنیمت دراصل آخرت کی تجارت کا نفع ہے۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا[1]

(کہہ دو، چلو زمین میں، سو دیکھو)

فرمایا:

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ[2]

(اور زمین میں نشانیاں ہیں، واسطے یقین لانے والوں کے)

ایک جگہ فرمایا:

وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

(اور تمہاری اپنی جانوں میں کیا پس نہیں دیکھتے)

اب جس کے اندر نشانات ہوں اور وہ بصارت رکھے، وہ صاحبِ فطانت ہے اور جس کے لیے آفاق میں نشانیاں ہیں۔ وہ چلے اور سیر کرے۔ اس طرح فرمایا:

وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۙ وَ بِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ[3]

(اور تم گزرتے ہو ان پر صبح کے وقت اور رات کو، پھر کیا نہیں سمجھتے)

ایک جگہ فرمایا:

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ[4]

(اور بہترین نشانیاں ہیں آسمان اور زمین میں، جن پر گزرتے ہیں اور ان سے اعراض کیے ہوئے ہیں)

جس کے پاس بصیرت ہو وہ اگر سفر کرے تو سمجھے گا اور عبرت حاصل کرے گا اور جو آدمی نشانات سے گزرے گا اور انہیں دیکھے گا وہ ان سے نصیحت حاصل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو یہ بنا کر کہ بچھونا ہے تو فرمایا کہ اس میں چلو اور اس میں پیدا ہونے والی روزی کھاؤ۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] انعام ۱۱ [2] الذریت ۲۰ [3] الصفت ۱۳۷، ۱۳۸ [4] یوسف ۱۰۵

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ[1]

وہ ہی ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کو پست کر دیا اب اس کے کندھوں پر پھرو اور کھاؤ کچھ روزی دی ہوئی اس کی۔

یعنی اس کے بازاروں میں چلو۔ ایک قول میں۔ ہے کہ اس کی بستیوں میں چلو۔
ایک قول یہ ہے کہ اس کے پہاڑوں میں چلو اور میرے نزدیک یہ قول زیادہ پسندیدہ ہے اور احداب الارض سے مراد بستیاں ہیں اور مناکبہا سے مراد پہاڑ ہیں۔ اس لیے کہ یہ بلند مقامات ہیں۔

حضرت بشر حافی رح فرمایا کرتے:

"اے گروہ قراء! سیر کرو، خوب رہو گے اس لیے کہ جب پانی ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرا رہے تو وہ خراب ہو جاتا ہے۔"

سفر میں کیا نیت کرے؟

سفر کو اس لیے سفر کہا گیا کہ یہ نفسانی اخلاق کو درست کر دیتا ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی قدرت و حکمت کو روشن کرتا ہے۔ سفر کا معنی ہے روشن کرنا۔ جب انسان سفر کا ارادہ کرے تو دو استخارہ کے نفل پڑھے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے۔ سواری میں اللہ تعالیٰ پر نظر رکھے۔ نشست و برخاست میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرے اور اس سے راضی رہے اور سفر میں یہ نیت کرے کہ آثار کو دیکھ کر عبرت حاصل کروں گا۔ بصارت کے ساتھ آیاتِ الٰہی پر نظر کروں گا اور مندوب اسباب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا فضل مانگوں گا۔

بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسافروں پر کچھ فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے مقاصد پر نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق دیتا ہے۔ جس کی نیت دنیا طلبی کی ہو، اسے اس میں سے حصہ دیتا ہے اور اس سے کئی گنا آخرت کا حصہ کم کر دیتا ہے۔ اس پر پریشان فکری طاری کر دیتا ہے۔ لالچ اور طمع کی وجہ سے اس کی مشغولیت بڑھ جاتی ہے اور جس کی نیت آخرت کی ہو اسے بصیرت و فطانت عطا فرماتا ہے۔ اس کے لیے نصیحت و عبرت کے دروازے اس کی نیت کے مطابق کھول دیتا ہے۔ اس کو فکری اجتماعیت عطا کرتا ہے اور قناعت کے ساتھ اسے دنیا کے حصہ کا مالک بناتا ہے اور وہ زُہد اختیار کرتا ہے۔ اس کے لیے فرشتے دعا کرتے ہیں۔ اس کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔ چنانچہ مسافر کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ قلب کی اصلاح کرے گا۔ نفس پر ریاضت ڈالوں گا، اس کا حال کھولوں گا اور اس کے اوصاف کا امتحان لوں گا۔ اس لیے کہ

---

[1] الملک ۱۵۔

جب اقامت کے زمانہ میں نفس یقین و اتباع کا اظہار کرتا ہے مگر جب اس پر سفر کی مشکلات طاری ہوتی ہیں اور اس کا شدت کے ساتھ حقیقی تجربہ کیا جاتا ہے تو وہ عام عادت سے نکل جاتا ہے اور اس کی اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے اور نفسانی دواعی کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ علم و بصارت کے ساتھ سفر کرنے والا آدمی اپنے نفس کے مخفیات اور اس کے مقام سے آگاہ ہو جاتا ہے اور یہی خبء الارض ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے محب کے لیے حجاب بنانا سے باہر نکال دیتا ہے۔ فرمایا:

يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[1] (نکالتا ہے چھپی چیز آسمانوں میں اور زمین میں)

اب اگر وہ علم کی تلاش میں سفر کرتا ہوا نکلا تو اس فرمانِ الٰہی السَّائِحُوْنَ کی تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد علم طلب کرنے میں نکلنے والا ہے اور ایک قول میں اس سے مراد طالبانِ علم ہیں۔

حضرت سعید بن مسیبؒ صرف ایک حدیث کی طلب میں کئی کئی دن کا سفر کرتے

حضرت شعبی نے فرمایا:

"اگر شام کا ایک آدمی سفر کر کے انتہائے یمن میں پہنچے تاکہ ہدایت کا ایک کلمہ سیکھے تو میں اس کا سفر ضائع نہیں سمجھتا۔"

حضرت جابر بن عبداللہؓ اور دوسرے صحابہؓ نے مدینہ سے مصر کا سفر کیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن انیس انصاریؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کرتے تھے۔

اسے سننے کے لیے ایک ماہ کا سفر کیا۔ آخر وہ حدیث ان سے سُنی۔ عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک بے شمار لوگوں نے علم حاصل کرنے کی خاطر سفر کیا ہے۔

ایک روایت میں ہے:

"جو علم کی تلاش میں گھر سے نکلا، وہ اللہ عزوجل کی راہ میں ہے، حتیٰ کہ وُہ واپس آیا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"جو اس پر چلا کہ اس میں علم طلب کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنّت کی طرف راہ آسان کر دی۔"

مشائخ کا فرمان ہے کہ علم میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی طرح ہے۔ ایک درہم کے عوض سات سو ملیں گے اور اگر نیک لوگوں کی ملاقات کے لیے سفر کرے تو اس سلسلہ میں روایت بھی ہے کہ

---

[1] النمل ۲۵

سلف صالحین ملاقات کرنے کے لیے حج پر جایا کرتے تھے اور حج افضل ترین سفر ہے۔ اسے صالحین و اخیار کی ملاقات کا سبب بنا لیا اور اگر حضر میں نفسانی تعلق اور دُنیا سے جُدا ہونے کے لیے دوسری جگہوں میں جائے تاکہ دین سلامت رہے تو بھی بہتر ہے۔ بسا اوقات شہرت کے فتنہ سے بچنے کے لیے اور گمنامی و تواضع کی تلاش میں بزرگانِ دین نے سفر کیا اور یہ چاہا کہ قلبی اصلاح ہو جائے اور لوگوں سے دُور رہ کر حال میں استقامت رہے؛ تنہائی میں جا کر ریاضتیں کیں۔ حتّٰی کہ ان کا یقین قوی ہو گیا اور قلبی اطمینان حاصل ہو گیا اور پھر سفر و حضر اور مخلوق کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو گیا اس لیے کہ ان کے دلوں میں ان کی اہمیت ہی جاتی رہی۔

حضرت ثوریؒ نے فرمایا،

"یہ ایک خطرناک وقت ہے، گمنام آدمی بھی مامون نہیں رہا۔ اس لیے مشہور کیسے بے خوف ہو سکتا ہے؟ یہ ایسا زمانہ ہے کہ آدمی کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہنا چاہیے۔ جب ایک جگہ ذرا شہرت ہو جائے تو دُوسرے مقام پر چلا جائے۔"

حضرت ابونعیمؒ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ثوریؒ کو دیکھا انہوں نے ہاتھ میں اپنا لوٹا اٹھا رکھا تھا اور تھیلا پیٹھ پر لاد رکھا تھا۔ میں نے پُوچھا،

"اے ابوعبداللہ، کہاں کا ارادہ ہے؟"

فرمایا: "مجھے معلوم ہُوا ہے کہ فلاں بستی میں اشیاء سستی ہیں۔ وہاں رہائش کرنے کا ارادہ ہے۔"

میں نے عرض کیا،

"اے ابوعبداللہ! آپ اور یہ کام کرتے ہیں؟"

فرمایا، "ہاں، جب تجھے یہ اطلاع ملے کہ فلاں بستی میں اشیاء سستی ہیں تو وہاں رہائش کر، یہ تیرے لیے زیادہ سلامتی کا باعث ہے اور اس میں کم فکری بھی ہوتی ہے۔"

افضل ترین سفر

حضرت سری سقطیؒ صوفیاء کو فرمایا کرتے:

"جب سردی نکل جائے آذار (مارچ) کا مہینہ آ جائے، درختوں کے پتّے نکل آئیں تو زمین میں پھیلنا بڑی فرحت کی بات ہوتی ہے۔"

افضل سفر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے یا حج کے سفر پر جائے یا اسلامی سرحد پر پہرہ دینے نکلے یا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے یا اپنے مسلمان احباب کی ملاقات کے لیے جائے اور ان میں اللہ تعالیٰ سے اجر چاہے۔ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے جس سے بھائی چارہ قائم کر رکھا ہے اس کی ملاقات کے لیے سفر کرنا مستحب و مندوب ہے۔

اہل بیت سے ایک خبر مروی ہے اور تورات میں بھی ایک قول کے مطابق یہ تحریر ہے :

" ایک میل سفر کرکے بیمار کی مزاج پُرسی کر ، دو میل سفر کرکے جنازہ میں شرکت کر، تین میل سفر کرکے دعوت قبول کر اور چار میل سفر کرکے اللہ تعالیٰ کی خاطر بھائی بنے ہُوئے کی ملاقات کر"

ایک روایت میں ہے :

ایک آدمی کا کسی دوسری بستی میں بھائی تھا وہ اسے ملنے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتہ مقرر کر دیا۔ اس نے پُوچھا :

" کہاں کا ارادہ ہے ؟"

اس نے کہا :

" اس بستی میں میرا ایک بھائی ہے اس کی ملاقات کو جا رہا ہُوں۔"

فرشتہ نے کہا :

" کیا تیرے اور اس کے درمیان کوئی رحم کا تعلق ہے کہ تُو صلہ رحمی کر رہا ہے ؟"

کہا : " نہیں۔"

فرشتہ نے کہا :

" تو کیا اس کا تیرے اوپر کوئی احسان ہے کہ اسے چکا رہا ہے ؟"

کہا : " نہیں ، میں نے صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر اس سے مواخات قائم کر رکھی ہے۔"

فرشتہ نے کہا :

" تو میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے قاصد ہُوں اور تجھے جنّت کی خوشخبری دیتا ہُوں اور بتاتا ہُوں کہ تیری اپنے بھائی کی زیارت کی وجہ سے اللہ نے تجھے بخش دیا۔" اور اگر کسی اسلامی سرحد پر چالیس روز تک یا تین روز تک پہرہ دینے کے لیے سفر پر جائے تو بہتر ہے اور اگر عبادان جانے کا ارادہ کرے اور وہاں تین روز پہرہ دے تو اس نے تین سو علماء اور عبادت گزاروں کے برابر ثواب ملے۔ جو وہاں پہرے دیں اور اس قدر اجر ملے کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے بصرہ میں ایک آدمی کو عبادان میں تین رباط (پہرہ دینے) کا حکم فرمایا اور ان کی مصاحبت کرنے کا فرمایا۔

سفرِ حرمین شریفین

ایک عارفؒ کا فرمان ہے :

" مجھے شہروں کا مکاشفہ ہُوا، میں نے تمام سرحدات کو دیکھا کہ وہ عبادان کی طرف سجدہ کر رہے ہیں اور جس نے تین مساجد میں سے ایک مسجد کی طرف سفر کرنے کا ارادہ کیا تو یہ شدِ رحال کی وجہ سے

مندوب سفر ہے اور یہ افضل ہے۔ سب سے پہلے مسجدِ حرام کی زیارت کا سفر ہے، پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے اور مسجد بیت المقدس ہے۔ بتاتے ہیں کہ جس نے ان تمام مساجد میں نمازیں ادا کیں اس کے تمام گناہ بخش دیے گئے اور جس نے مسجد اقصیٰ سے مسجدِ حرام جانے کے لیے حج یا عمرہ کا احرام باندھا وہ اس طرح گناہوں سے نکلا جیسے کہ آج ہی پیدا ہُوا۔

حضرت ابن عمرؓ مدینہ منورہ سے بیت المقدس جانے کی نیت سے نکلے اور وہاں پانچ نمازیں ادا کیں، پھر دُوسرے روز ہی مدینہ آ گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے دُعا کی کہ " جو بھی اس مسجد کی طرف آنے کا ارادہ کرے، وہ یہاں آ کر صرف نماز ہی پڑھے کہ جب تک وہ یہاں ٹھہرے اس پر تیری نظرِ کرم رہے تا آنکہ وہ نکلے اور گناہوں سے اسے اس طرح پاک کر دینا کہ جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا " اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی یہ دعا قبول فرمائی۔

حرمین کی مساجد یعنی مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ کے فضائل بے شمار مذکور ہیں۔

اگر حلال کی تلاش میں سفر کرے اور حرام سے بچنا چاہے تو اس میں دو نیکیاں ہیں۔ ہر زمانہ میں صالحین نے یہ سفر کیا ہے۔

انسان کو سفر میں اپنے مسلک کا خیال رکھنا چاہیے۔ قلبی شکستگی اور مخلوق میں طمع اور سوال کرنے کے قریب بھی نہ جائے۔ اگر اس کے پاس معلوم نہ مال، نہ ہو تو اس کا معلوم علام الودود تعالیٰ ہے۔ اس کا اس کی طرف صدقِ توکل کا طریق ہے۔ اس راہ میں اس کا زادِ راہ لوگوں سے ٹھیک طور پر مایوس ہو کر حسنِ تقویٰ کا زاد ہے۔ اس وقت اس پر ابتلا کی وجہ سے صبر لازم ہے۔ اس کی فضیلت حاصل ہونے پر راضی رہے۔ اس کے مخفی انعامات پر شکر کرے، چاہے روک دینے کا انعام ہو اور چاہے انعام عطا ہو، تنگی کا ہو یا فراخی کا ہو، کیونکہ وہ وکیل تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ جیسے چاہتا ہے الٹ پلٹ کرتا ہے اور متوکلین کے نزدیک توکل ہی صبر ہے جو صبر کرنے والے کرتے ہیں اور حاکم کا حکم تسلیم کرنا بھی یہی بات ہے۔ اس سے فرمانِ الٰہی ہے۔

اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ (جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں)

اسی طرح فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ۔ (حکم صرف اللہ کا ہے۔ اسی پر میں نے توکل کیا)

ایک آدمی نے حضرت بشر بن حارثؒ کو فرمایا:

" میں سفر کرنا چاہتا ہوں مگر رکاوٹ یہ ہے کہ میرے پاس کچھ چیز نہیں۔"

فرمایا: " کچھ نہ ہونا تجھے سفر سے نہیں روک سکتا اور اپنے مقصود میں نکل جا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے وُہ نہیں دیا

جو دوسرے کو دیا تو جو تیرا ہے وہ اس نے نہیں روکا۔

حضرت ابراہیم بن خواص ؒ فرمایا کرتے:

"خالی ہاتھ ہو، دل پاک ہو تو جہاں چاہو، جاؤ۔" اور اگر فاقہ آجائے یا کوئی سخت ضرورت آن پڑے اور وُہ کچھ مانگ لے تو ایسا کرنے سے وہ توکل سے نہیں نکلتا اس لیے کہ قوت وصبر نہ رہنے کی وجہ سے وُہ اپنے نفس کے لیے بلکہ رب تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کے لیے مانگ رہا ہے۔ خواہش نے اسے مانگنے پر نہیں اکسایا بلکہ علم نے ایسا کرنے کو کہا ہے تاکہ فرض ادا کرے اور عقل کی حفاظت کرے جو مقامِ تکلیف ہے۔

روایت میں ہے:

"جو بھوکا ہو اور نہ مانگے، پھر مر جائے تو وہ دوزخ میں جائے گا۔" اس لیے کہ مرنے کے خطرہ پر بھی نہ مانگنا، جان ضائع ہونے کا باعث ہے جبکہ بھوک کی وجہ سے مرنے کے قریب جا پہنچے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"سب سے حلال تر وُہ ہے جو بندہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے۔"

بعض متاخرین صوفیا نے اس فرمان کی تاویل کی کہ اس سے مراد فاقہ پڑنے پر مانگنا ہے مگر میں اس تاویل کی ذمہ داری سے بیزار ہوں۔

حضرت جعفر خلدی ؒ یہ واقعہ ایک صوفی بزرگ ؒ سے نقل کرتے تھے اور اسے مستحسن سمجھتے تھے مگر حضرت ابوسعید خراز فاقہ پر اپنا ہاتھ بڑھاتے اور کہتے:

"یہاں کچھ اللہ کے لیے بھی ہے۔"

حضرت ابوجعفر حداد ؒ، حضرت جنید ؒ کے استاد تھے، ان سے مروی ہے:

"ان کا توکل میں علم ہے اور زہد سے ایک حال ہے۔ وہ مغرب و عشاء کے درمیان نکل کر روٹی کا اہتمام کرتے۔ ایک یا دو دروازوں پر جاتے اور مانگتے۔ ایک یا دو دن ان کی ضرورت میں یہ معلوم (سبب) تھا اور خواص میں سے کسی نے اس پر انکار نہ کیا اور نہ بُرا سمجھا۔

متوکل کا طریقہ

ایک آدمی نے ایک صوفی کو صبح کے وقت ایک تھیلی دی جس میں ایک سو دراہم تھے۔ انہوں نے یہ تمام دراہم تقسیم کر دیے اور رات کا کھانا مانگ کر کھایا۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

"آپ کو اس قدر مال دیا گیا اور آپ نے سارا تقسیم کر دیا۔ اگر آپ رات کے کھانے کے لیے کچھ رکھ لیتے۔"

فرمایا، "مجھے گمان نہ تھا کہ میں شام تک زندہ رہوں گا۔ اگر مجھے زندہ رہنے کا علم ہوتا تو ایسے ہی کر لیتا۔ یہ فقیر ایک زاہد اور کم امید آدمی تھا البتہ خواص کے نزدیک متوکل کا سوال کرنا اسے توکل سے نکال دیتا ہے۔"

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے تھے:

"متوکل آدمی نہ مانگتا ہے، نہ واپس کرتا ہے اور نہ ذخیرہ کرتا ہے" اور میرے نزدیک فاقہ اسے پرامن متوکل کو توکل سے خارج نہیں کرتا بلکہ صبر و قوت ختم ہونا در اصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال کرنے کی اجازت کا نام ہے۔ جبکہ وہ اس کی نظر ہر حال میں وکیل تعالےٰ پر ہو اور تمام احوال میں ولی حمید تعالےٰ اپنے دل کو ادتا بدلتا رہتا ہے۔

دیکھیے اہل ظاہر و باطن کے امام نے کھانا مانگا۔

اِسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا[1] (کھانا چاہا وہاں کے لوگوں سے)

اس لیے کہ بھائیوں پر ایک مسلمان کا حق ہے کہ حرمتِ اسلام کی خاطر فاقہ آنے پر اسے کھلائیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"شبِ مہمان واجب ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"ضیافت حق ہے۔"

ایک روایت میں ہے:

"تجھے حق ہے کہ اس کے مال سے رات (کے کھانے) کی مقدار کے برابر لے لے۔"

ایک حدیث میں ہے:

"جس گھر کے صحن میں یا بستی والوں میں کوئی مسلمان بھوکا رات گزارے ان سے ذمہ ہٹ گیا۔"

حضرت ثوریؒ حجاز سے لے کر صنعاء یمن تک میدانوں میں مانگتے۔ فرمایا، "میں انہیں ضیافت کے بارے میں حضرت عبداللہؓ کی حدیث یاد کراتا تھا۔" فرمایا کہ مجھے وہ لوگ کھانا دیتے اور میں سیر ہو کر کھا لیتا، اور باقی کھانا چھوڑ دیتا۔

مہمانی کی مدت مسافر ہی ابن السبیل ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مالوں میں حق مقرر کر دیا۔ اس لیے کہ سبیل کا معنی طریق و راستہ ہے اور اس پر چلنے والا اس کا ابن ہے کیونکہ وہ صاحبِ طریق

---

[1] الکہف ۷۷

سالکِ راہ ہے۔ اس پر اپنے مسلمان بھائی کے پاس تین روز کا قیام لازم نہیں اس لیے وُہ مباح پر رہائش رکھے ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"مہمانی تین دن ہے جو اس سے زیادہ ہو وہ صدقہ ہے۔"

چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا اور فرمایا،

"تین روز سے زیادہ نہ ٹھہرے ورنہ اسے تنگی میں مبتلا کر دے گا" اور میرے نزدیک

"اور جو تین روز سے زیادہ ہو، وہ صدقہ ہے" کی تاویل یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے اور مندوب یا مامور بہ ہو نامراد نہیں۔ اگر وُہ خود صدقہ کو پسند کرے اور اس سے نفس کو پاک نہ بتاتا پھرے تو وُہ خوب جانتا ہے یعنی تین روز کی مہمان نوازی مہمان کا حق ہے اور میزبان پر لازم ہے لیکن اگر تین روز کے بعد میزبان درخواست کرے، یا مہمان یہ جانتا ہو کہ میزبان اس کی اقامت کو پسند کرتا ہے تو پھر کچھ حرج نہیں۔

بعض صوفیاء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "جو تین روز سے زاید ہے وُہ صدقہ ہے" کی تاویل کی کہ یہ مہمان نوازی کی وجہ سے گھر والوں کا مہمان کی اقامت کے باعث صدقہ ہے اس لیے کہ انہیں اجر مل رہا ہے مگر مجھے یہ تاویل کچھ اچھی نہیں لگی۔

سفر کی حالت میں کامل وضو کے ساتھ وقت پر نمازیں ادا کرنے کا خوب اہتمام رکھے اور قلبی پریشانی کو قریب نہ آنے دے اس لیے کہ اکثر سفر کی وجہ سے سالک پریشان فکری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور عارفین کو جمعیتِ خاطر حاصل رہتی ہے۔ کمزوروں کو قلبی مشغولیت اور اقویاء کو قلبی راحت ملتی ہے اور سفر دراصل بندے کے اخلاق ظاہر کرنے اور محنت کا نام ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک آدمی نے ایک آدمی کا تزکیہ بیان کیا۔ اس نے آپ سے اس کی گواہی قبول کرنے کی درخواست کی، آپ نے پُوچھا،

"کیا تُو نے کبھی اس کے ہمراہ سفر کیا کہ جس سے اس کے حُسنِ اخلاق کا پتہ چلتا ہو؟"

اس نے کہا، "نہیں۔"

فرمایا، "میں نہیں سمجھتا کہ تُو اسے پہچانتا ہو۔"

سفر کے دُوسرے آداب

بعض سلف سے مروی ہے:

"جب حضر میں کسی آدمی سے معاملہ کرنے والے اور سفر میں اس کے شریک سفر اس کی تعریف کریں تو اس وقت ہمیں اس کے بارے میں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اس لیے کہ

سفر، اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے اور درشتی پیدا کرتا ہے۔ بخل اور لالچ جیسی نفسانی پوشیدہ صفات کو سامنے لاتا ہے۔
اور جس کی مصاحبت سفر میں اچھی ہو، حضر میں بھی اس کی مصاحبت اچھی ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ حضر میں جس کی مصاحبت اچھی ہو، سفر میں بھی اس کی مصاحبت اچھی ہی ہو۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"تین کو درشتی پر ملامت نہیں کی جا سکتی:

۱۔ روزہ دار

۲۔ بیمار اور

۳۔ مسافر۔"

اور مسافر کو چار اشیاء ہمیشہ پاس رکھنی چاہئیں:

۱۔ چھاگل یا ڈونگا

۲۔ رسّی

۳۔ سوئی اور دھاگہ

۴۔ قینچی۔"

حضرت خواصؒ متوکلین میں سے تھے اور یہ چار اشیاء ہمیشہ پاس رکھتے اور فرماتے:

"یہ دُنیا سے نہیں۔"

بعض صوفیاء کا قول ہے:

"جب فقیر کے پاس ڈونگا اور رسّی نہ ہو تو یہ اس کے دینی نقص کا نشان ہے۔"

اربابِ قلوب اور اہل معاینہ کی ایک جماعت کا طریقہ تھا کہ جب ان کے نفوس ایک جگہ مطمئن ہو جاتے تو وہ سفر میں چلے جاتے تاکہ عادت ختم ہو جائے اور قلب و تواضع کا ساماں پیدا ہو جائے اور فرماتے:

"مومن پر ہمیشہ قلت یا تواضع یا مرض رہنی چاہئے اور جب انہیں مخلوق کی طرف میلان و اشراف کا ڈر ہوتا تو بھی سفر میں نکل جاتے تاکہ اشراف الی الخلق کو اوکار اور سفر کے ذریعہ ختم کر دیں۔"

حضرت خواصؒ ایک شہر میں چالیس روز سے زیادہ قیام نہ کرتے اور جب زیادہ قیام کرنے پر توکل میں کوئی خرابی خیال کرتے تو نفس کے امتحان اور اس کا حال سامنے لانے کا کام کرتے۔

ایک شیخؒ سے منقول ہے، فرمایا:

"میں گیارہ روز تک ایک ویرانے میں رہا اور کوئی چیز نہ کھائی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس جنگل کی

گھانس پر چل کر دیکھوں۔ دیکھا تو حضرت خضرؑ میری طرف آ رہے ہیں۔ میں ان سے بھاگ کھڑا ہُوا۔ جب میں نے بھاگتے ہُوئے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو وُہ بھی واپس جا رہے تھے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کا ولی کیسا ہے کہ مجھ پر گمان کر کے اپنا توکل خراب نہیں کیا؟ ان سے پُوچھا گیا:

"آپ ان سے کیوں بھاگے؟"

فرمایا: "میرے نفس نے سوچا کہ یہ مجھے کھانا دے گا۔"

اہل قلوب مسافروں کو چاہیے کہ وہ "وطن و سفر میں قلبی سکون" اور وطن و سفر میں نفسانی سکون" کے درمیان امتیاز کریں اس لیے کہ ان میں التباس ہو جاتا ہے جس کو بصیرت نہیں اور جو اپنے احوال میں نہیں وُہ نفسانی سکون کو ہی قلبی سکون سمجھ لیتا ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ سے اس میں نقص آجاتا ہے اور اس نقص کو وہ سمجھتا نہیں اور اگر اس کو وطن و سفر میں سے کسی کی طرف قلبی سکون حاصل ہو اس میں اس کی دینی اصلاح، اخروی فائدہ اور رب تعالیٰ سے محبت کا سامان بنتا ہو تو یہ قلبی سکون ہے اس لیے کہ اسے ایمانی اخلاق وعلم پر سکون ہُوا اور اگر وطن و سفر میں سے کسی ایک کی طرف اسے نفسانی سکون ہُوا، یعنی کسی عاجل لذت، دنیاوی فائدے اور خواہش کی موافقت ملی تو یہ نفسانی سکون ہے۔ اس لیے کہ وہ خواہش کی طرف پر سکون ہُوا۔ اسے وطن سے سفر کی طرف اور سفر سے وطن کی طرف جانا چاہیے اور اگر اس کا سفر اس کے علاوہ کسی دوسرے حال پر ہو، یعنی حال ہی کھو بیٹھے۔ احکامِ علم کی پابندی نہ کرے تو یہ خواہش و فتنہ ہے اور اس کا سفر اس پر ایک مصیبت و مشقت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سفر میں جس کو مصروف کرنے والا حال، جمعیتِ خاطر، وقتِ اصلاح، مقامِ سایہ، جائے انس، زادِ باطن اور علمِ امراضِ باطن حاصل نہ ہو تو اس کے حال کے لیے حضر ہی بہتر ہے۔ حضر میں ہی اس کی قلبی اصلاح ہے اور سفر کے مقابلہ میں اسے وطن میں زیادہ سکون ملے گا۔ اس لیے کہ سفر میں انسان پر پریشان فکری اور باطنی افراتفری آجاتی ہے۔ گاہے اس لیے کہ اس کے پاس رقم ہوتی ہے اور وہ اس کے گم ہو جانے سے ڈرتا ہے۔ گاہے مال ختم ہو جاتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ گاہے مخلوق کے مال پر طمع آتا ہے اور گاہے مال نہ ہونے پر قلبی ضعف طاری ہو جاتا ہے اور گاہے ایک آدمی کا تعاون نظر آنے پر بندے کی جانب میلان شدید ہو جاتا ہے اور گاہے موجود چیز گُم ہونے پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کے لیے سفر نقصان دہ ہے۔ اتقیاء کی فکر کو جمعیت حاصل ہوتی ہے اور مبتدی لوگوں کے احوال سفر میں ناپید ہو جاتے ہیں۔

جو آدمی قلبی اصلاح نہ کرے وطن میں اس کا حال درست نہ ہو تو سفر میں اس کو اصلاحِ حال و استقامتِ قلب

نصیب نہیں ہوتی۔ ایک سیاح نے سفر کے بارے میں یہ اشعار کہے ہیں : ؎

اَلِفْتُ التَّفَرُّدَ وَ الْغُرْبَۃَ فَفِیْ کُلِّ یَوْمٍ اَطْوِیْ تُرْبَۃَ

(میں تنہائی و سفر سے مانوس ہُوا۔ ہر روز میں ایک سر زمین طے کرتا ہوں)

فَیَوْمٌ مُقِیْمٌ عَلٰی نِعْمَۃٍ وَ یَوْمٌ مُطِلٌّ عَلٰی نَکْبَۃٍ

(ایک روز میں اس کی نعمتوں پر مقیم ہوں اور ایک روز میں اس کے ابتلأ پر ہوں)

وَ مِمَّا یُطِیْبُ نَفْسُ الْغَرِیْبِ حَبِیْبٌ تَطِیْبُ بِہٖ الصُّحْبَۃَ

(جس بات سے مسافر کے نفس کو فرحت ہے وہ دوست ہے کہ اس کی مصاحبت خوش لگتی ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تنہا سفر کرنے کی ممانعت کی۔ فرمایا :

"تین ایک نفر (قلیل جماعت) ہیں۔"

اور فرمایا :

"جب تم سفر میں تین ہو تو ایک کو اپنا امیر بنا دو۔"

بتاتے ہیں کہ صحابہؓ یُوں کہا کرتے کہ :

"یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق امیر ہے اور اس طرح مستحب ہے۔"

روایت میں ہے :

"بہترین اصحاب چار ہیں اور جماعت میں سفر اور سیر عمدہ ہوتا ہے۔"

قلیل ترین جماعت دو آدمیوں کی ہے۔ تین اور چار افضل ہیں اور تنہائی میں سیاحت اچھی نہیں لگتی۔ اگر سیاحت کے دوران تین آدمی ایک ہی قلب، ایک ہی فکر اور ایک ہی حال والے مل جائیں تو یہ ایک ہی بندے کی طرح ہُوئے۔ یہ خُوب ہے اور اس کے اندر نیکی و تقویٰ پر تعاون رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا۔ جنہیں مدد روک دی گئی اور صحبت سے بھی محروم رہے۔ فرمایا :

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِہِمْ وَ لَا ھُمْ مِّنَّا یُصْحَبُوْنَ [1] (وہ اپنی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ان کو ہماری طرف سے رفاقت ہے)

جس کی اللہ تعالیٰ نے اس کے نفس کے مقابلہ میں مدد کی اسے اس کی صحبت ملی اور جس کو صحبت نہ ملی اس پر نفس مسلّط ہو گیا اور وہ اس کا غلام ہُوا۔

---

[1] الانبیاء ۴۳

الغرض سفر بھی ایک عمل ہے جس میں نیت اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ بعض سفر فرض ہوتے ہیں یعنی گناہ سے بھاگ کر سفر کرنا، بعض میں اجر و ثواب ہیں ہے جیسے کہ نیکی کرنے کا سفر، بعض مباح سفر ہیں جیسے تجارت کے لیے سفر کرنا اور بعض گناہ کے سفر ہیں جیسے کہ فساد کرنے اور بُرائی کے لیے سفر کرنا۔

فصل ۳۴

امام، امامت اور مقتدی کے احکام

امام کے فرائض اگر سالک کسی قبیلہ میں امامِ نماز ہو تو اسے چاہیے کہ امامت کے تمام احکام کا خاص خیال رکھے اور کوئی خامی نہ رہنے دے۔ اسے بھی اقتداء کرنے والوں کے برابر اجر و ثواب ملے گا، بشرطیکہ وُہ اللہ عزوجل کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق بنانے والا ہو۔ اس لیے وہی اس کی طرف ان کا طریق و راہ ہے۔

روایت میں ہے،

"امام امیر ہے۔ جب وُہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو۔ جب وُہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو۔"

ایک حدیث میں ہے،

"اگر اس نے مکمل کیا تو اس کے لیے اور ان کے لیے اجر ہے اور اگر اس نے کمی رکھی تو اس پر (بوجھ) ہے اور ان (مقتدیوں) پر (بوجھ) نہیں۔"

روایت میں ہے،

"تمہارے امام، اللہ عزوجل کی طرف تمہارے وفود ہیں۔ اگر تم اپنی نمازوں کو پاکیزہ کرنا چاہو تو اپنے میں سے بہترین کو آگے بڑھاؤ۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے،

"امام، ضامن ہے اور موذن امانت دار ہے۔ اے اللہ، آئمہ کو ہدایت عطا کر اور موذنوں کو بخش دے۔"

ایک حدیث میں ہے،

"تین کی نماز قبول نہیں ہوتی۔"

دُوسرے الفاظ یہ ہیں،

"ان کی نماز ان کے سروں سے اُوپر نہیں چڑھتی، بھاگا ہوا غلام، ایسی عورت جس کا خاوند اس پر ناراض ہے اور قوم کا ایسا امام جس کو وُہ ناپسند کرتے ہیں۔"

امام کیسا ہو؟ امام کے بارے میں حسب ذیل شرائط ضروری ہیں،

فسق اور کبائر گناہوں سے پرہیز کرتا ہو۔

صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والا نہ ہو۔

کتاب اللہ کا بہتر پڑھنے والا ہو۔ لحن کیے بغیر اور معنوی تغیر کیے بغیر اچھی طرح قرأت کر سکتا ہو۔ نماز کے فرائض و سنن سے خوب آگاہ ہو۔

نماز توڑنے والی باتوں اور ان باتوں سے واقف ہو جن کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم آتا ہو اور جن پر سجدۂ سہو لازم نہ آتا ہو۔

اگر نماز میں کوئی حدث واقع ہو جائے یا اس کو یاد آجائے کہ وہ باوضو نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو اور نماز سے باہر آجائے اور قریب ترین آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی جگہ کھڑا کر دے۔

حالتِ نماز میں امام الائمہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ آپؐ نماز سے باہر آگئے اس لیے کہ انہیں حالتِ جنابت یاد آگئی چنانچہ آپؐ نے غسل فرمایا پھر واپس آکر نماز میں شامل ہوئے۔ اب اگر نماز میں ایک حادثہ پیش آجائے تو یہ کرے۔

اگر امام کو نماز شروع کرنے کے بعد یاد آجائے کہ وہ طہارت کی حالت میں نہیں ہے تو نماز سے نکل آئے اور ندامت کی وجہ سے نماز میں لگا ہی نہ رہے بلکہ دوبارہ نماز پڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام کو نماز سے پہلے اپنی طہارت کے بارے میں کامل یقین و اطمینان ہونا چاہیے۔ اقامتِ نماز میں پُرسکون ہو۔ امامت میں خلوص رکھتا ہو اور اس میں اللہ تعالیٰ سے ہی اجر چاہتا ہو۔

اسی طرح نماز پر اُجرت لینا جائز نہیں اور نہ ہی اذان پر اجرت لینا جائز ہے۔ اس لیے کہ اذان دراصل نماز کی طرف جانے والا راہ ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن ابی العاص کو حکم دیا،

"ایسا موذن حاصل کرو جو اذان پر اجرت نہ لیتا ہو"۔ یہ نماز کی طرف دعوت دینے والا ہے۔ اس دعوت پر اُجرت لینا درست نہیں۔ اب جو آدمی (امام بن کر) نمازی اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کھڑا ہے اس لیے اُجرت لینا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

بعض سلفؒ فرماتے:

"انبیأ کے بعد علماء سے افضل تر کوئی نہیں اور علماء کے بعد نمازیوں کے اماموں سے افضل تر کوئی نہیں، اس لیے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان کھڑے ہوئے۔ یہ نبوت کے باعث اور یہ علم کے باعث اور یہ عماد الدین یعنی نماز کے باعث"۔

ابوبکرؓ خلافت کے پہلے حقدار ہیں

اس سے اس بات پر استدلال کیا گیا کہ خلافت کے معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تقدم اور اولیت حاصل تھی اور پہلے حقدار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارے دین کا امام بنا دیا۔ فرمایا:

"ہم نے دیکھا کہ نماز، دین کا ستون ہے۔ چنانچہ جس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کے بارے میں بھی راضی ہو گئے۔"

امام کا درجہ

ایک آدمی نے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ، مجھے ایسا عمل بتائیے کہ جو مجھے جنت میں لے جائے۔"

فرمایا: "موذّن ہو جا۔"

اس نے کہا:

"اس کی مجھے استطاعت نہیں۔"

فرمایا: "امام ہو جا۔"

اس نے کہا:

"اس کی بھی استطاعت نہیں۔"

فرمایا: "تو امام کے قریب ترین ہو کر نماز پڑھ۔"

بعض متقی لوگ امامت سے بچتے تھے۔ اس لیے کہ اس میں امام پر بہت بڑی ذمہ داری اور بوجھ ہے اور وہ امامت پر اذان کو منتخب کرتے اور اسے افضل سمجھتے۔ ان میں بہت سے صحابہؓ بھی گزرے ہیں۔

امام پر اوقاتِ نماز کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ اول وقت میں نماز ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے۔ نماز کے آخری وقت پر اول وقت میں نماز پڑھنے کی فضیلت ایسے ہے جیسے کہ آخرت کو دنیا پر فضیلت حاصل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح مروی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"بندہ آخری وقت میں نماز پڑھتا رہتا ہے اور وہ ضائع نہیں ہوتی۔"

اور اول وقت کا جو (درجہ) اس سے رہ گیا، وہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے ان سے بہتر ہے۔ رکوع اور سجدہ مکمل کرے۔ اور ان کے درمیان خوب اعتدال کے ساتھ بیٹھے اور ایسے اطمینان کے ساتھ بیٹھے کہ کمزور اور مریض مقتدی بھی نماز پا سکیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یہی تھی۔

امام کو ہر رکعت میں تین سکتے کرنے چاہئیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ اور عمران بن حصینؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی روایت کیا۔

پہلا سکتہ یہ ہے کہ جب تکبیر کہے تو اس قدر طویل سکتہ کرے کہ اس میں سورۃ فاتحہ پڑھی جا سکے تاکہ قرأت شروع ہونے پر پیچھے والے نہ پڑھنے لگیں ورنہ ان کی نماز کا نقص امام پر رہے گا اور اگر اب بھی وہ قرأت کے دوران سورۃ فاتحہ پڑھنے لگ جائیں تو اب امام پر کچھ بوجھ نہ ہوگا۔

دوسرا سکتہ سورۃ فاتحہ کی قرأت کے بعد ہے تاکہ جن کی سورۃ فاتحہ کا کچھ حصہ باقی ہے وہ اس سکتہ میں اسے پورا کرلیں۔ یہ سکتہ پہلے سکتہ سے نصف ہوگا۔

تیسرا سکتہ رکوع کرنے سے پہلے اور ساری قرأت ختم کرنے کے بعد ہوگا۔ یہ سکتہ دوسرے سکتہ سے نصف ہوگا تاکہ قرأت کے متصل ہی رکوع نہ ہو، یعنی قرأت کے ساتھ ہی تکبیر نہ کہہ دے۔ رکوع سے قرأت کا اتصال کرنا ممنوع ہے۔

مقتدی پر لازم ہے کہ وہ امام کی تکبیر احرام کے ساتھ اور امام کے سلام کے ساتھ اپنی تکبیر وسلام کو ملانہ لے بلکہ اس کے بعد تکبیر وسلام کہے۔ امام و مقتدی دونوں پر لازم ہے کہ دونوں سلاموں کو بھی ملا کر نہ کہے بلکہ وقفہ کر کے سلام کہے۔

مقتدی کے فرائض

مقتدی پر لازم ہے کہ امام کے بعد ہی تکبیر کہے اور بعد میں ہی رکوع و سجدہ میں جائے اور بعد میں ہی سجدہ و رکوع سے سر اٹھائے اور جب تک امام کی پیشانی سجدہ پر جا نہ لگے تب تک وہ سجدہ میں نہ جائیں بلکہ کھڑے رہیں اور پھر امام کے سجدہ میں سر رکھتے ہی سجدہ میں جائیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نماز ایسے ہی تھی اور جب نمازی پیچھے صف بنالیں تب تکبیر تحریمہ کہے اور دائیں بائیں دیکھ کر صف سیدھا ہونے کا اطمینان کرے۔ اگر صف کہیں سے ٹیڑھی ہو تو ہاتھ سے اشارہ کرے اور اگر دو آدمیوں کے درمیان فاصلہ دیکھے تو اسے پُر کرنے کے لیے کہے۔ اس لیے کہ صفوں کا سیدھا اور برابر کرنا، اکمالِ نماز سے ہے۔ صحابہؓ کا طریقہ تھا کہ وہ کاندھے برابر کرتے اور ٹخنے دیکھ کر صف سیدھی کرتے۔

اجرِ نماز کے درجات

نماز سے لوگ تین طرح کا اجر لے کر جاتے ہیں۔ ایک گروہ نماز کا اجر پچیس گنا لے کر جاتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو امام کے رکوع وسجود کے بعد رکوع و سجود کرتا ہے اور ایک گروہ صرف ایک ہی نماز لے کر واپس جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو امام کے ساتھ ہی متصل تکبیر کہتے اور رکوع وسجود بھی اس کے برابر ساتھ ساتھ ہی کرتے ہیں۔ ذرا بھی تاخیر نہیں کرتے اور تیسرا گروہ

وہ ہے جو بغیر نماز کے واپس جاتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو کہ امام سے پہلے سر اٹھانا اور امام سے پہلے رکوع و سجود میں جاتا ہے۔ یہ امام سے آگے بڑھنے والا گروہ ہے۔

صبح کی نماز میں مثانی کی دو سورتیں پڑھے۔ یہ سورت ایک سو آیات سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ فجر کی نماز میں طویل قرأت اور تغلیس (اندھیرے میں نماز پڑھنا) سنت ہے اور اگر اندھیرے میں نماز شروع کر کے اسفار (روشنی) میں ختم کی تو کچھ حرج نہیں اور اگر دوسری رکعت میں سورتوں کے آخری حصے میں سے تیس یا بیس آیات پڑھے تو بھی ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ اس میں مزید ذکر و نصیحت ہے۔ اس لیے کہ اگر امام چھوٹی سورتیں عام طور پر پڑھنے کا عادی ہو تو سامعین سُنی ان سنی کر دیتے ہیں اور اگر بڑی سورتوں کا آخری حصہ پڑھا جائے تو یہ کبھی کبھار سُنی جانے والی آیات ہوں گی۔ اس لیے لوگوں کی توجہ دانا بن خوب رہے گی، اور غور و تدبر بھی کریں گے۔ یہ بات کچھ مکروہ سی ہے کہ سورت کے شروع سے پڑھے اور انقطاع کر ڈالے یا سورت کے کہیں درمیان سے پڑھنا شروع کر دے بلکہ آخری حصہ پڑھے اور سورت کو ختم کر کے رکوع میں جائے۔ بعض علماء کے نزدیک درمیان سے یا شروع سے پڑھ کر سورت ختم کیے بغیر انقطاع کر کے رکوع میں جانا مکروہ ہے۔

قرأت کی مقدار مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو رکعتوں میں سورۃ بقرۃ کی ایک سو آیات تلاوت فرمائیں۔

پہلی میں قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ اور دوسری میں رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ۔ اور ایک روایت میں آپؐ نے دونوں میں یہ پڑھا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ کو دیکھا کہ وہ ادھر اُدھر سے آیات پڑھ رہے ہیں۔ آپؐ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔

حضرت بلالؓ نے عرض کیا:

"میں پاک کو پاک کے ساتھ ملا رہا ہوں"۔

فرمایا: "تو نے خوب کیا (یا فرمایا) تو نے درست کیا"۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ایک خبر مشہور ہے:

"صنابحیؒ فرماتے ہیں: میں نے ان (ابوبکر صدیقؓ) کے پیچھے نمازِ مغرب پڑھی۔ میں نے تیسری رکعت میں ان کی قرأت پر کان دھرا تو وہ پڑھ رہے تھے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا الآیہ۔

چنانچہ نمازِ مغرب میں تیسری رکعت میں خاص طور پر یہ دُعا پڑھنا مستحب ہے۔
حضرت ابن مسعودؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے عشاء کی نماز میں امامت کی اور دوسری رکعت میں سورۃ آل عمران کی دس آخری آیات پڑھیں۔ مزید برآں اس نماز میں انہوں نے سورۃ الفرقان کی بھی آخری آیات پڑھیں۔ اور یہاں سے شروع کیا:
تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا۔
فقہاء کا فرمان ہے کہ سورۃ الحمد کے بعد کسی سورت کی تین آیات پڑھنا مستحب ہے۔ بعض نے دو آیات بتائیں اور اگر صرف سورۃ الحمد ہی پڑھی تو بھی جائز ہے۔
اہل بصرہ کے فقیہ حضرت جابر بن زیدؓ کے بارے میں مروی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ انہیں فتوے دینے میں نائب رکھتے اور ان سے فتویٰ لینے کا حکم دیتے کہ انہوں نے نماز شروع کی اور سورۃ الحمد پڑھ کر مُدْهَآمَّتٰنِ پڑھا اور رکوع کر دیا۔ یہ کتاب اللہ کی چھوٹی ترین آیت ہے اور اس کے بعد ثُمَّ نَظَرَ ہے
میں نے ایک بہت بڑی جامع مسجد میں دیکھا کہ ایک امام نے عشاء کی نماز میں دوسری رکعت کے اندر سورۃ یونس کی آخری آیات پڑھیں اور اس کے پیچھے علماء کرام بھی تھے۔ کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔
نمازِ ظہر میں طوالِ مفصل میں سے تیس آیات تک پڑھے اور نمازِ عصر میں نمازِ ظہر سے نصف آیات کی تلاوت کرے اور نمازِ مغرب میں اواخر مفصل یعنی چھوٹی سورتوں کی تلاوت کرے۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نماز مغرب کی ادا کی۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ والمرسلات کی تلاوت کی۔ اس کے بعد آپؐ (مسجد میں) نماز نہیں پڑھ سکے بلکہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔
حضرت انسؓ بتاتے ہیں کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ ہلکی نماز اور کامل ترین نماز پڑھنے والے تھے۔"
پھر فرمایا:
"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تخفیف کا حکم دیتے اور سورۃ الصّٰفّٰت پڑھ کر امامت فرماتے۔"
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:
"تم میں سے جب کوئی آدمی لوگوں کو نماز پڑھاتے تو ہلکی رکھتے۔ اس لیے کہ ان میں بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔ اور جب اکیلے پڑھے تو جس قدر چاہے طویل کرلے۔"
حضرت معاذ بن جبلؓ اپنی قوم کو عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے۔ انہوں نے سورۃ بقرۃ شروع کر دی۔ ایک آدمی نماز سے الگ ہوا اور اپنی نماز مکمل کر کے چلا گیا۔ لوگوں نے کہا:

"یہ آدمی منافق ہو گیا" پھر دونوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت پیش کی۔ اس آدمی نے کہا:

"حضرت معاذؓ نے بوجھ لاد دیا" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کیا تو فتنہ میں ڈالے گا؟ سورۃ سبح، سورۃ والسماء والطارق اور سورۃ والشمس وضحٰہا پڑھ۔ رکوع و سجود میں سات یا پانچ بار تسبیح پڑھے تاکہ مقتدی تین تین بار تو پڑھ لیں۔ کیونکہ مقتدی، امام کے بعد رکوع و سجود میں جاتے ہیں۔

حضرت انس بن مالکؓ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پیچھے نماز پڑھی۔ یہ مدینہ کے حاکم تھے۔ فرمایا:

" میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسی عمدہ نماز آج اس نوجوان کے پیچھے ہی پڑھی"۔ فرمایا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے رکوع اور سجود میں دس دس بار تسبیح پڑھ لیا کرتے تھے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مجمل روایت ہے: کہ

"ہم (صحابہؓ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے رکوع و سجود میں دس دس بار تسبیح پڑھ لیا کرتے تھے۔"

اگر ظہر، عصر اور عشاء کی نماز میں آخری دو رکعتوں کے اندر سورۃ الحمد کے بعد کوئی چھوٹی سورت یا دو آیات پڑھے تو بہتر ہے کہ پیچھے والا اطمینان سے سورۃ الحمد پڑھ لے۔

لاحق کا انتظار اگر امام رکوع میں ہو اور کسی کے پاؤں کی آہٹ سنے تو کیا وہ رکوع میں انتظار کرے کہ وہ رکعت میں مل جائے یا اس کی پروا نہ کرے؟ اس کے بارے میں اختلاف ہے۔

بعض نے فرمایا کہ اس کے مل جانے کا انتظار کرے۔ حضرت شعبیؒ نے اسے مختار بتایا۔

دوسروں نے فرمایا کہ "ان کا انتظار نہ کرے۔ اس لیے کہ پیچھے رہ جانے والے کے مقابلہ میں نماز کا احترام زیادہ ہے"۔ ابراہیم نخعیؒ کا بھی قول ہے۔ فقہائے حجاز کا بھی یہی فرمان ہے کہ ان کا انتظار نہ کرے۔ اس لیے کہ یہ نماز میں زیادتی ہے اور اخلاص کی بات یہی ہے کہ ان کی خاطر انتظار نہ کرے۔

کوفہ کے بعض فقہاء کا فرمان ہے کہ اگر ان کا انتظار کرے تو بہتر ہے تاکہ وہ بھی جماعت میں شریک ہو جائیں اور انہیں بھی جماعت میں مل جانے کی فضیلت حاصل ہو جائے۔

فجر کی نماز میں حضرت عثمانؓ نے رکوع سے پہلے دعائے قنوت مقدم کر کے پڑھی تاکہ لوگ رکوع میں مل سکیں۔ میرے نزدیک اس میں متوسط انداز رکھے کہ اگر رکوع کے آغاز میں ہی ان کے پاؤں کی آہٹ سن لے تو ان کے مل جانے تک رکوع طویل کرنے میں کچھ ہرج نہیں (بشرطیکہ رکوع زیادہ طویل نہ کرنا پڑے) اور اگر رکوع کے آخری حصہ میں سر اٹھانے کے وقت آہٹ سنے تو ان کی خاطر نماز میں طوالت نہ کرے بلکہ ان کی

پرواکیے بغیر سر اٹھالے۔

تشہد و سلام

اور میرے نزدیک افضل ترین تشہد وُہ ہے جو حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت جابرؓ نے روایت کیا، تشہد کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ زیادہ مختار وُہ ہے جو کہ حضرت عبداللہؓ سے اثبات و اوات کے ساتھ منقول ہے اور اس میں اللہ عز وجل کا نام مقدم ہے اور زیادتی مبارکات کے ساتھ مروی ہے ایسا کرنے سے تمام روایات کا جامع تشہد بن جائے گا۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ کی حدیث میں مبارکات کا ذکر ہے اور اللہ عز وجل کا قول موخر ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں تسمیہ کا ذکر ہے۔

حضرت ثوریؒ کی حدیث میں حضرت ایمن بن وائل سے، انہوں نے حضرت ابن زبیر سے اور انہوں نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے:

بِاسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَ الصَّلَوٰتُ وَ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ۔ (اللہ کے نام سے، اور اللہ کے ساتھ، تمام بدنی عبادات اللہ کے لیے ہیں اور تمام زبانی اور تمام مالی عبادات اللہ عز وجل کے لیے ہیں)

میرے نزدیک یہی افضل و احوط ہے اور اس میں تمام روایات جمع ہو جاتی ہیں۔ اب سلام میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مواجہت رکھے یا ترک کر دے۔ میرے نزدیک افضل یہ سلام ہے:

اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت و برکات ہوں۔ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو)

اس لیے کہ اس مذکورہ سلام کی وضاحت بھی منقول ہے۔ فرمایا،

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے تھے تو ہم یوں دُعا کرتے:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ۔ (اے نبی تجھ پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہوں)

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہُوا تو ہم اس طرح دُعا کرنے لگے،

اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ الخ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو الخ)

اور یہ الفاظ تمام روایات میں آتے ہیں:

وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ (اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں)

اور یہی مختار ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ کی روایت رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔

بعض صالحین سے نقل کرتے ہُوئے ایک عالم نے مجھے بتایا۔ وُہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! تشہد میں علماء کا اختلاف ہے ہم کس پر چلیں؟"

فرمایا، وہ تشہد جس کو ابن ام عبدؓ نے روایت کیا ہے۔ تشہد میں یہ پانچ کلمات ضرور کہے اور ان کا ناغہ نہ کرے۔

اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَ الْمَمَاتِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَ اِذَا اَرَدْتَ بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ۔

(میں دوزخ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں زندہ و مردہ کے فتنہ سے اور دجّالِ مسیح کے فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور جب تو کسی قوم پر فتنہ ڈالنے کا ارادہ کرے تو مجھے فتنہ میں مبتلا کیے بغیر اپنی طرف بُلا لے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی کیا اور اس کا حکم بھی دیا اور المسیح میں میم پر نصب ہے۔ یہ ماسحؐ سے معدول ہُوا۔ یعنی یمسح الارض مسحا۔ اس لیے کہ اس کی خاطر زمین لپیٹ دی جائے گی اور بعض اہل لغت کا فرمان ہے کہ اس کی آنکھ کانی اور خراب ہو گی یعنی مسوح العین ہو گا۔ اس لیے یہ کہا گیا اور تکبیرِ سلام ضروری ہے اور اذان بھی ضروری ہے۔

نماز کے دُوسرے مسائل عامہ

بہتر یہ ہے کہ موذن اور امام جدا جدا آدمی ہوں۔ ایک روایت میں ہے، "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کا موذن ہونا ناپسند کیا"۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اذان کی فضیلت سنتے تو فرماتے:

"اگر امامت نہ ہوتی تو میں اذان دیا کرتا"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"اذان موذن کی طرف ہے اور امامت، امام کی طرف ہے"۔ یعنی یہی اس کے زیادہ حقدار ہیں۔

موذن کو چاہیے کہ وہ امام کا انتظار کرے اور جب وقت آجائے تو امام اور مقتدی پر موذن کا انتظار کرنا لازم نہیں اور جب امام نے انتظار کر لی اور وقت آگیا تو موذن پر انتظار کرنا لازم نہیں۔

ہر نماز اوّل وقت میں پڑھنا، تاخیر کے ساتھ جماعت کے انتظار سے افضل ہے اور طویل سورتیں نماز کے اندر پڑھنے سے بھی اوّل وقت میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

سلفؒ کے بارے میں مروی ہے کہ جب نماز میں دو آدمی حاضر ہو جاتے تو تیسرے کا انتظار کرتے اور جب جنازہ میں چار آدمی آجاتے تو پانچویں کا انتظار نہ کرتے اور کہتے ہیں کہ امام کے آجانے کے بعد مقتدیوں کا (زیادہ) انتظار کرنا مکروہ ہے۔ میت کے بارے میں دفن وغیرہ کے اعلانات کرنا بدعت ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر کی حالت میں تھے اور آپؐ نے نمازِ فجر تاخیر کر کے ادا کی اور آپؐ کو وضو کرنے میں دیر ہوگئی تو صحابہؓ نے انتظار نہ کیا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو آگے بڑھایا اور انہوں نے نماز پڑھائی۔ حتیٰ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک رکعت رہ گئی اور آپؐ نے بعد میں اٹھ کر پورا کیا۔ راوی بتاتے ہیں کہ ہم اس پر ڈر گئے مگر آپؐ نے فرمایا:

"تم نے اچھا کیا۔ اسی طرح کیا کرو۔"

ایک بار آپؐ کو نمازِ ظہر میں دیر ہوگئی تو صحابہؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھایا۔ آخرکار آپؐ پہنچے اور آپؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔

جب موذن یہ کلمات کہے:

قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ۔ (نماز کھڑی ہوگئی)

تو تکبیر کہہ کر نماز شروع کرے اور جب موذن

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ۔ (آؤ نماز کی طرف)

کہے تو لوگ اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ سنت ہے۔ سلفؒ کا یہی طریقہ تھا اور ہم نے اس بارے میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے

سلفؒ کا طریقہ تھا کہ جب موذن حی علی الصلوٰۃ کہتا تو لوگ کھڑے ہو جاتے اور جب موذن قد قامت الصلوٰۃ کہتا تو امام تکبیر کہہ دیتا اور موذن تنہا باقی اقامت پوری کر دیتا۔ پھر وہ نماز شروع کرتا اور امام سورۃ الحمد پڑھتا۔ اس لیے کہ قد قامت الصلوٰۃ کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے ہیں یعنی نمازی کھڑے ہو گئے اور نماز خود کھڑی نہیں ہوا کرتی۔ جب وہ قد قامت الصلوٰۃ کے موقع پر کھڑے ہوں تو موذن اپنے اس قول میں سچا شمار ہوگا۔ اگرچہ قربِ وقت اور سببِ قیام سامنے آنے کے باعث بطور مجاز کے یہ جملہ صحیح ہے مگر لوگوں کے ٹھیک اس جملہ پر اٹھنے سے موذن کی آواز بالکل حقیقی صداقت کی حامل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ امام کا موذن ہونا مکروہ بات ہے کیونکہ اس وقت وہ تکبیر کہے گا اور قد قامت الصلوٰۃ کے موقع پر لوگ نماز میں شریک ہوں گے۔ اب اگر امام ہی موذن ہو تو یہ باقی اقامت کیسے پوری کر سکے گا۔ سلفؒ سے ایسے ہی مروی ہے۔ سنت یہ ہے کہ اذان منارہ پر ہو اور اقامت مسجد میں ہو تاکہ موذن کے لیے نماز

میں جلدی شرکت کرنا آسان ہو۔ اس طرح حضرت بلالؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض کیا:

"آمین میں جلدی نہ بڑھیے" یعنی ذرا دیر کیجیے تاکہ میں بھی آمین کی فضیلت حاصل کر سکوں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ سورۃ الحمد ان سے پہلے شروع کر چکے تھے۔ ہم نے آغازِ کلام میں جو بتایا کہ اگر رکوع کی ابتدا میں ہو تو پاؤں کی آہٹ سن کر رکوع میں انتظار کرے اس پر حضرت بلالؓ کا "لا تسبقني بآمين" (آمین میں مجھ سے آگے نہ بڑھیے) کا قول دلیل ہے اور یہ نہیں کہا کہ "الحمد میں مجھ سے آگے نہ بڑھیے"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اگرچہ سورۃ الحمد کا جزو ہے اور اس سورت کی ایک آیت ہے مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ بیشتر روایات میں آتا ہے کہ آپؐ نے بسم اللہ کو جہر سے نہیں پڑھا اور آپؐ کا آخری فعل یہی (عدمِ جہر) کا ہے اور صحابہؓ بھی آخری سے آخری فعل کی پابندی کرتے تھے اور اکثر علماء کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس لیے بسم اللہ کو جہر سے پڑھنا مستحب نہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ فرمایا:

"سنت یہ ہے کہ امام چار کا اخفاء نہ کرے:

۱۔ سبحانک اللھم۔

۲۔ استعاذہ۔

۳۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔

۴۔ آمین کہنا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کا جہر کرنا منقول ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

"اس کا جہر کرنا سنت نہیں ہے۔" اور میرے نزدیک صبح کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا مکروہ نہیں جو کہ حضرت حسنؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"یہ دعا اخفاء کے ساتھ پڑھ لیا کرے اور ہاتھ نہ اٹھائے۔ اس لیے کہ یہ دعا کے قائم مقام ہے اور اگر اسے چھوڑ دیا تو بھی اچھا ہے۔ اکثر فقہاء نے اسے ترک کیا ہے۔"

مستحب یہ ہے کہ جمعہ کی شب اور جمعہ کی صبح کو وہی سورتیں پڑھے جو دو حدیثوں میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ ایک حدیث مشہور ہے کہ:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز صبح کی نماز میں سورۃ السجدۃ اور ھل اتی پڑھتے۔"

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی شب کو نمازِ مغرب میں قل یا ایھا الکافرون

اور قل ھو اللہ احد پڑھتے اور عشاء کی نماز میں سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقین پڑھتے۔"

دُعا کا طریقہ مستحب یہ ہے کہ تشہد میں وہی دُعا پڑھے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو سکھائی اور یہ جامع و کامل دعاؤں میں سے ہے۔ دُعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ مِنَ الْخَیْرِ کُلِّہٖ عَاجِلِہٖ وَ اٰجِلِہٖ مَا عَلِمْتُ مِنْہُ وَ مَا لَمْ اَعْلَمْ اَسْاَلُکَ مِمَّا سَاَلَکَ مِنْہُ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ اَعُوْذُبِکَ مِمَّا اسْتَعَاذَکَ مِنْہُ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اَسْاَلُکَ الْجَنَّۃَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ وَ عَمَلٍ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ وَ مَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ وَّعَمَلٍ اَللّٰھُمَّ مَا قَضَیْتَ لِیْ مِنْ اَمْرٍ فَاجْعَلْ عَاقِبَتَہٗ رُشْدًا۔

(اے اللہ میں تجھ سے تمام ابھی کی اور بعد کی بھلائی مانگتا ہوں جو میں جانتا ہوں اور جو نہیں جانتا۔ میں تجھ سے وہ مانگتا ہوں جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا اور اس تیری پناہ مانگتا ہوں جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری پناہ مانگی۔ میں تجھ سے جنت اور جو قول و عمل اس کے قریب کر دے وہ مانگتا ہوں اور میں آگ سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس قول و عمل سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو اس کے قریب کر دے۔ اے اللہ! تو نے میرے لیے جو فیصلہ بھی کیا اس کا انجام بھلائی و رشد کو دینا)

اس کے بعد تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے دعائے بخشش کرے اور یہ دعا کرے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا۔

(اے ہمارے پروردگار! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کرنا اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی)

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

(اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں اچھی زندگی عطا کرنا اور آخرت میں اچھی، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لینا)

اس سے بڑھ کر کوئی دعا زیادہ افضل نہیں اور نہ ہی کوئی منقول کلام ہے۔ سوائے اس استعاذہ کے کہ جو ہم پانچ کلمات کے ساتھ آغازِ کلام میں ذکر کر چکے ہیں اور اگر انہی پر اکتفا کیا تو بھی جائز ہے۔

امام کا صرف اپنے لیے دعا کرنا مکروہ ہے۔ چنانچہ نماز میں دعا کرتے وقت جمع کے صیغے استعمال کرے اور یوں کہے:

نسألك (ہم مانگتے ہیں) نَسْتَعِیْذُکَ (ہم تیری پناہ مانگتے ہیں) اور اس میں اپنے لیے اور مقتدیوں کے لیے نیت کرے۔

روایت میں ہے: "جو کسی قوم کی امامت کرے وہ ان کو چھوڑ کر اپنے ہی کو دُعا میں مخصوص نہ کرلے۔"

اور اگر سالک امامت کی بجائے موذن بننا پسند کرے تو بعض علماء کا فرمان ہے:

"اذان امامت سے افضل ہے اور موذن کے لیے امام سے زیادہ اجر ہے۔" اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"امام امیر ہے۔"

اور آپؐ نے فرمایا:

"امام ضامن ہے۔"

چنانچہ امامت کو امارت اور ضمان سے تشبیہ دی۔ پھر فرمایا:

"اب اگر (نمازیں) کمی رہ گئی تو اس (امام) پر ہے ان (مقتدیوں) پر نہیں۔" چنانچہ اذان میں زیادہ سلامتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ امامت کے حقوق ادا نہ کرسکے اور امام کے اوصاف کا حامل نہ ہو سکے۔ اس طرح نمازیوں کا بوجھ اٹھانا پڑے جیسے کہ اکمالِ نماز میں اس کے لیے اجر ہے۔ مزید برآں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے لیے جو دعا فرمائی: "اے اللہ، ائمہ کو ہدایت دے اور موذنوں کو بخش دے۔" اس میں موذنوں کے لیے زیادہ قابلِ مدح دعا ہے اور فرمایا:

"موذنوں کی آواز تک اس کے لیے بخش دیا جاتا ہے اور ہر تر و خشک اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔" اور ایک بلیغ ترین وصف بتایا کہ "موذن، امانت دار ہے۔" دوسرے الفاظ اس طرح مروی ہیں کہ "تمہارے موذنین، تمہارے امین ہیں اور تمہارے ائمہ، تمہارے ضامن ہیں۔" اب امین کا حال، ضامن کے حال سے زیادہ ارفع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ضامن آدمی گویا مقروض ہے اور گا ہے امین نہیں ہوتا مگر امین صاحب تمکن ہے اور اس پر کوئی ضمان نہیں۔

اس وجہ سے حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ نے امامت کو ناپسند کیا۔ ابوحازمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سہل بن سعدؓ قوم کے نوجوانوں کو آگے بڑھا دیتے اور وہ نمازیں پڑھاتے۔ میں نے ان سے کہا: "آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور آپ کو یقیناً فضیلت حاصل ہے۔ کاش، آپؓ آگے بڑھ کر قوم کو نماز پڑھایا کریں۔"

فرمایا: "اے برادر زادے! میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: "امام ضامن ہے۔" اور میں ضامن بننے کو ناپسند کرتا ہوں۔"

اذان کی فضیلت

روایت میں ہے:

"جس نے ایک مسجد میں سات برس تک اذان دی اس کے لیے جنت واجب

ہو گیا اور جس نے چالیس برس تک اذان دی وہ جنت میں بغیر حساب کے جائے گا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت یہ ہے:

"قیامت کے روز تین مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے۔ لوگ گھبراتے ہوں گے اور انہیں گھبراہٹ نہ ہوگی۔ حتیٰ کہ مخلوقات کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ایک وہ آدمی جس نے قرآن مجید پڑھا اور اس میں جو احکام ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کیا۔ ایک وہ آدمی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مسجد میں اذان دی اور ایک وہ آدمی جو دنیا میں غلامی (کی مصیبت) میں مبتلا ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اپنے آقاؤں کی اطاعت کی۔"

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ [1] (اور اس سے بہتر بات کس کی جو اللہ کی طرف بلائے)

اس کی تفسیر میں مروی ہے۔ فرمایا:

"یہ آیت مؤذن کے حق میں نازل ہوئی اور عَمِلَ صَالِحًا (نیک اعمال کیے)" فرمایا کہ "یہ نماز اور اقامت کے درمیان ہے۔"

جب مؤذن اذان سے فارغ ہو تو یہ دعا کرے:

وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ ساری حمد اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)

اور یہ آیت پڑھی:

وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ اور

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (خالص کر کے، اس کی بندگی، سب حمد اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)

مستحب یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان مؤذن چار رکعت نماز ادا کرے اور خوب زاری کے ساتھ دعا کرے۔

فرمایا "سلف صالحین چار کو ناپسند کرتے اور ان سے دور رہتے:

۱۔ امامت

---

[1] حم السجدہ آیت ۳۳۔

۲۔ فتویٰ

۳۔ وصیت

۴۔ کسی کی امانت رکھنا۔"

بعض کا فرمان ہے،

"مجھے باجماعت نماز سے زیادہ محبوب چیز کچھ نہیں اور یہ کہ میں مقتدی ہوں کہ میری غلطی کا ضامن وہ ہو، اور اس کا بوجھ میرے سوا کوئی اور اٹھائے۔" البتہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو جس کو حکم کیا جائے وہ آگے بڑھ جائے اور ایک دوسرے کو دھکے نہ دیں۔" یہ آتا ہے،

" نماز کھڑی ہونے کے بعد ایک قوم نے امامت کے لیے ایک دوسرے کو دھکا دیا تو انہیں زمین میں دھنسا دیا گیا۔" البتہ امام کے حاضر ہونے سے پہلے مؤذن اقامت نہ کہے اور کھڑے ہو کر امام کی آمد کا انتظار بھی نہ کیا جائے۔ یہ مکروہ بات ہے۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب تک مجھے نہ دیکھ لو، نہ اٹھو۔"

حضرت بشر بن حارث فرمایا کرتے،

" جو آدمی دنیا کی سلامتی اور آخرت کی عزت چاہے۔ وہ چار سے بچتا رہے،

۱۔ حدیث کی روایت نہ کرے۔

۲۔ گواہی نہ دے۔

۳۔ امامت نہ کرے۔

۴۔ اور فتویٰ نہ دے۔" اور یہ بھی منقول ہے کہ "دعوت قبول نہ کرے۔"

ایک بار فرمایا،

"اور ہدیہ قبول نہ کرے۔" اور یہ ان کی شدت ہے۔

اذان کے الفاظ مختار یہ ہے کہ اہلِ حجاز کے مذہب پر اذان دے۔ ہر کلمہ دو دو بار ترجیع کے ساتھ اور اقامت ایک بار۔ اور فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ (نیند سے نماز بہتر ہے) دو بار زاید کہے اور نماز کا وقت آنے سے قدرے پہلے اذان دے (یعنی اقامتِ نماز سے پہلے اذان دے) تاکہ لوگ نماز کی تیاری کر سکیں اور یہ صلوٰۃِ وسطیٰ ہے۔ البتہ اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے،" انہوں نے ہمیں صلاۃِ وسطیٰ یعنی نمازِ عصر سے غافل کر دیا۔" اب آثار کی خاطر اختیار ترک کر دے اور مؤذن اپنی پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کر کے اذان دے اور ترتیل سے اذان دے۔ کہتے ہیں اذان اور تلبیہ در جگہوں کے علاوہ ہر جگہ

آواز پست ہونی چاہیے۔

ایک روایت میں ہے؛

" اذان اور اقامت کے درمیان موذن اس قدر توقف کرے کہ کھانے والا کھانے سے فارغ ہو جائے اور نچوڑنے والا نچوڑنے سے فارغ ہو جائے۔ یہ اذان و اقامت کے درمیان وقفہ کا اندازہ ہے۔ البتہ جس آدمی کو کھانے وغیرہ کی شدید ضرورت ہو وہ نماز پڑھنے سے پہلے اس سے فارغ ہو جائے تاکہ وہ نماز پڑھتے وقت اُسی کام میں نہ لگا رہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی حالت میں ان دنیاوی علائق میں مبتلا رہنے اور شیطانی وساوس میں پھنسنے سے منع کیا۔ فرمایا؛

"جب رات کا کھانا رکھا جائے اور نماز کھڑی ہو جائے تو کھانا شروع کر دو" تاکہ اس کا دل رب تعالیٰ کی عبادت کے لیے فارغ ہو اور یہ کام بھی اقامت و اکمالِ نماز میں سے ہے۔

امام کون ہو؟

حسبِ ذیل لوگوں کی امامت مکروہ ہے؛

۱۔ جس کو نماز میں کثرت سے سہو ہو جاتا ہو (یعنی اکثر بھول جاتا ہو)

۲۔ اس کا دل مناجات و دعا سے ہمیشہ غافل رہتا ہو۔

۳۔ جو یہ جانتا ہو کہ مقتدیوں میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اس سے زیادہ دین و علم کی سمجھ رکھتے ہیں یا اس سے زیادہ قرآن مجید پڑھے ہوئے ہیں۔ چاہے یہ آدمی عابد و صالح ہو۔

۴۔ عالم و فقیہ ہو اور اس کے پیچھے زیادہ پرہیزگار آدمی ہو اور امامت کے لیے زیادہ موزوں ہو جبکہ وہ فرض تلاوت ادا کر سکے۔

ان پڑھ آدمی، پڑھے ہوؤں کی امامت نہ کرے۔ عجمی آدمی فصیح لوگوں کی امامت نہ کرے۔ تیمم کے ساتھ نماز پڑھنے والا وضو کیے ہوؤں کی امامت نہ کرے۔ اور اگر ان پڑھ جمع ہو جائیں تو زیادہ پڑھے ہوئے کو آگے کر دیں۔ اور اگر تمام ہی اونچے درجہ کے پڑھے ہوئے ہوں تو اپنے میں زیادہ عالم کو آگے کر دیں۔ اگر دو آدمی ایسے ہوں کہ دونوں ہی مکمل قرآن کے حافظ ہوں تو جو آدمی زیادہ بہتر طریقہ سے تجوید کے ساتھ تلاوت کر سکتا ہو اسے امام بنایا جائے اور اگر سارے مکمل قرآن کے حافظ نہ ہوں تو جس کی قرأت زیادہ بہتر ہو وہ آگے بڑھے۔ بشرطیکہ وہ نماز کے مسائل سے آگاہ ہو۔

روایت میں ہے؛

"کتاب اللہ کا زیادہ پڑھنے (یاد رکھنے والا) قوم کی امامت کرے۔ اگر قرأت میں برابر ہوں تو دین میں

زیادہ آگاہی والا امامت کرے۔ اگر (دین) آگاہی میں سب برابر ہوں تو زیادہ عمر والا امامت کرے"۔ اس وجہ سے حکم ہے کہ اگر آدمی اپنے گھر میں ہو تو وُہ امامت کا زیادہ مستحق ہے۔ البتہ دُوسرے کو اجازت دے تو الگ بات ہے۔

امام کو چاہیے کہ سلام پھیرتے ہی جلدی کے ساتھ لوگوں کی طرف چہرہ گھمالے اور امام کے چہرہ گھمانے سے پہلے مقتدیوں کے لیے اٹھ جانا مکروہ ہے۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں ایک خوب سنت مروی ہے کہ: "ان دونوں نے بصرہ میں امام کے پیچھے نماز پڑھی"۔ جب دونوں نے سلام پھیرا تو امام کو فرمایا:

"تیری نماز کس قدر اچھی اور کامل ہے جیسے کہ ہم پڑھتے تھے مگر ایک چیز ہے کہ تُو نے جب سلام پھیرا تو تُو نے رُخ نہیں موڑا"۔ پھر لوگوں کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"کس قدر اچھی نماز تم نے ادا کی مگر تم اپنے امام کے رُخ موڑنے سے پہلے ہی چلے گئے (اٹھ گئے)

اگر پڑوسی یا مقتدی اس کی امامت ناپسند کریں تو اس کے لیے آگے بڑھنا جائز نہیں۔ البتہ اگر مقتدیوں کا باہم اختلاف ہو، کچھ لوگ اس کی امامت پسند کریں اور کچھ ناپسند کریں تو یہ دیکھے کہ اہل دین و علم کا کیا رویہ ہے ان کے کہنے کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر دین و علم کے لحاظ سے بہتر لوگ اقلیت میں ہوں تو کم درجہ والوں کی اکثریت کا کچھ اعتبار نہ کیا جائے اور کسی بدعتی کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ جس نے بدعتی کے پیچھے نماز پڑھی اور اس کا علم نہ تھا تو معلوم ہونے کے بعد نماز کا اعادہ کرے۔

مسجد میں جانے کی تاکید

ایک آدمی راستہ میں جا رہا ہو اور مسجد سے اذان کی آواز سنے تو اسے چاہیے کہ فوراً مسجد میں چلا جائے اور نماز ادا کرے اور کسی دوسری مسجد تک پہنچنے کے لیے تاخیر نہ کرے۔ البتہ دو صورتوں میں ایسی اجازت ہے۔

۱۔ اسے یقین ہو کہ دوسری مسجد میں جماعت مل جائے گی اور وہاں کا امام اس امام سے افضل ہو۔

۲۔ اس امام کی بدعت یا فسق سے آگاہ ہو۔ اور اگر ایسا سبب موجود نہ ہو تو پہلی مسجد میں مسلمانوں کے ہمراہ نماز پڑھنا افضل ہے۔

حدیث میں ہے:

"مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد کے سوا نہیں ہے اور مسجد کے پڑوسی کے بارے میں دو قول ہیں:

۱۔ جس نے اذان سُنی وُہ پڑوسی ہُوا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

۲۔ جس کے مکان اور مسجد کے درمیان تین مکان ہوں اور اس کا مکان چوتھا ہو تو وُہ مسجد کا پڑوسی ہے

اور اذان سننے والے پر ترکِ جماعت میں سختی آئی ہے۔

جس کے پڑوس میں دو مسجدیں ہوں اس کے لیے قریب تر مسجد میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ یہ حضرت حسنؓ کا مذہب ہے۔ ہاں البتہ اگر زیادہ قدم اٹھانے میں ایک نیت ہو یا دُور والی مسجد کا امام افضل تر ہو تو دُور والی مسجد میں نماز پڑھ لے۔ اور ایک قول کے مطابق قدیم تر مسجد میں نماز افضل ہے۔

حضرت انس بن مالک اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں مروی ہے کہ وُہ نئی مسجدوں سے آگے بڑھ کر پُرانی مساجد میں جایا کرتے۔

مقتدی کو چاہیے کہ وُہ جہری نمازوں میں سورۃ الحمد کے بغیر امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھے اور سورۃ الحمد بھی صرف امام کے سکتوں میں پڑھے اور اگر امام سکتے نہ کرے اور سورۃ الحمد پڑھنے کا موقع نہ دے تو ساتھ ساتھ ہی پڑھ لے۔ اب اس کا بوجھ امام پر ہوگا کہ وہ اس کی نماز میں کمی کا باعث بنا۔ اللہ تعالیٰ اس سے حساب لے گا اور جب امام سری تلاوت کرے (یعنی ظہر اور عصر کی نمازیں ہوں) تو سورۃ الحمد بھی پڑھے اور موقع ملے تو کوئی سورت بھی ملا لے۔ البتہ سورۃ الحمد کا پڑھنا ضروری ہے۔

جب امام فرض نماز ادا کرے تو جگہ بدل لے اور اسی جگہ پر نفل نماز ادا نہ کرے۔ یہ مستحب ہے۔

حدیث میں آتا ہے؛

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو اچھل پڑتے (یعنی فوراً دُوسری جگہ ہو جاتے) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب سلام پھیرتے تو اچھل کر (دُوسری جگہ ہو جاتے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب سلام پھیرتے تو اچھل کر (دُوسری جگہ ہو جاتے)۔"

ایک خبرِ مشہور ہے،

"آپؐ (سلام پھیرنے کے بعد) صرف یہ دُعا پڑھنے کی مقدار بھر بیٹھتے،

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ وَ تَعَالَيْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ۔

(اے اللہ تو ہی سلام ہے اور تجھ سے ہی سلام ہے تو برکت والا، تو بلندی والا ہے۔ اے صاحب جلال و اکرام)

پھر اُٹھ جاتے۔

اگر امام فرض پڑھ کر جگہ بدل لے۔ چاہے ایک قدم ہی ہٹ جائے تو بہتر ہے۔ اس کے بارے میں روایت بھی ہے اور اگر ذرا سی دیر بیٹھا تاکہ تسبیحات پڑھ لے اور دُعا کر لے تو بھی کچھ حرج نہیں۔

کتاب الامامت کا اختتام ہُوا۔

فصل ۴۴

اللہ تعالیٰ کی خاطر مواخات قائم کرنا

اس کے احکام اور مواخات کرنے والوں کے اوصاف

اخوتِ اسلامی ایک انعام ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر دینِ اسلام کو نعمت بتایا کہ ان کے قلوب جُدا جُدا تھے مگر اب دینِ اسلام قبول کر کے باہم بھائی بھائی بن گئے۔ نیکی اور تقویٰ پر ساتھ دینے والے ہیں۔ پھر ان پر کی جانے والی نعمت کا ذکر کیا اور اس راہ سے وابستہ رہنے کا حکم دیا اور دین نے ان میں اجتماعیت پیدا کی۔ اب انہیں متفرق ہوتے اور آپس میں پھوٹ ڈالنے سے منع کیا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ ایمان لانے کی توفیق دینا اور یہ چیز ان پر اللہ کا احسان ہے کہ انہیں آگ کے گڑھے سے نکالا۔ ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ کی جانب راہنمائی حاصل ہوتی ہے اور ان کو تسلیم کرنے اور ان پر چلنے سے اللہ تعالیٰ تک رسائی ملتی ہے۔ یہ تمام باتیں ان آیات میں آتی ہیں،

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ سے لے کر لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تک۔

سالکین کا یہ کام ہے کہ وہ مواخات اور مصاحبت کرتے ہیں۔ سفر و حضر میں محبت بھی اللہ کی خاطر کرتے ہیں۔ یہ سالکین کے طرق ہیں اور ہر طریق میں ایک گروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک فضیلت کی بات ہے۔ یہ مندوب و مامور بھی ہے۔ کیونکہ حب فی اللہ ایک برہنہ اور پختہ ترین ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر الفت و مصاحبت اور اس کی خاطر محبت و زیارت کرنا اہل تقویٰ کے عمدہ اسباب میں سے ہیں۔ روایات میں اس کی بہت فضیلت و ترغیب ملتی ہے اور یہاں سب روایات کا ذکر ہمارا مقصود نہیں۔ البتہ ہم نے اختصار کے ساتھ ہر پہلو پر خوب بحث کر دی ہے۔ البتہ ہم ان کے ضروری متعلقات و افعالِ حسنہ کے بارے میں کلام کریں گے۔ اور تابعینؒ کا تعارف ہونے کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔

اخوت کی اہمیت بعض تابعینؒ کا فرمان ہے:

"واقفوں میں کمی رکھو، تیرے دین کی سلامتی اسی میں ہے۔ کل کو تیری رسوائی بھی کم ہوگی، تجھ پر لازم حقوق ضائع ہونے کا معاملہ بھی کم ہوگا۔ اس لیے کہ کہا کرتے ہیں:

"جس قدر دوست زیادہ اسی قدر حقوق زیادہ اور جس قدر مصاحبت طویل اسی قدر رعایت سخت۔"

بعض کا فرمان ہے:

"کیا تُو نے واقف سے بھی زیادہ بُرائی دیکھی؟" اس لیے جس قدر اس میں کمی رہے اسی قدر بہتری ہے۔

بعضؒ کا فرمان ہے :

"واقف سے اجنبی ہو جا اور ناواقف سے واقفیت پیدا نہ کر۔"

حضرت سفیان ثوریؒ، ابراہیم بن ادھمؒ، داؤد طائیؒ، فضیل بن عیاضؒ، سلیمان خواصؒ، یوسف بن اسباطؒ، حذیفہ مرعشیؒ اور بشر حافی رحمہم اللہ تعالیٰ کی یہی رائے ہے۔ اکثر تابعینؒ کا یہی فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر کثرتِ اخوان مستحب ہے جبکہ اہل ایمان سے محبت رکھنے اور ان کی تالیف کی خاطر ایسا کیا جائے اس لیے کہ فراخی میں یہ زینت ہے اور تنگی میں مدد ہے، نیکی و تقویٰ پر تعاون ہے اور دین میں الفت ہے۔

بعضؒ کا فرمان ہے :

"کثرت سے بھائی بناؤ، اس لیے کہ ہر مومن کی ایک سفارش ہے۔ شاید تو کسی بھائی کی سفارش میں آجائے۔" سلف صالحین اخوت والفت کا حکم دیتے اور اس کی ترغیب دیتے۔ کہا کرتے ہیں :

"جب کسی بندے کی بخشش ہوئی تو وہ اپنے بھائیوں کے بارے میں سفارشی ہوا۔"

فرمانِ الٰہی ہے :

وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيْدُهُمْ[1] (اور دُعا سنتا ہے ایمان والوں کی جو بھلے کام کرتے ہیں اور زیادہ دیتا ہے انہیں اپنا فضل)

اس آیت کی تفسیر میں ایک غریب مروی ہے :

"ان کے بھائیوں کے بارے میں ان کی سفارش قبول کرے گا اور انہیں ان کے ساتھ جنت میں داخل کرے گا۔ ابن مسیب، شعبی، ابن ابی لیلی، ہشام بن عروۃ، ابن شبرمہ، شریح، شریک بن عبداللہ، ابن عیینہ، ابن مبارک، شافعی، احمد بن حنبل اور ان کے موافقین رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"تم میں نشست کے لحاظ سے میرے قریب تر وہی ہیں جو تم میں اخلاق کے لحاظ سے بہترین ہیں۔ اور تنہائی اختیار کیے رہتے ہیں جو الفت کرتے ہیں اور جن سے الفت کی جاتی ہے۔" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"مومن الفت رکھنے والا، الفت کیا جانے والا ہے اور جو نہ الفت کرے اور نہ اس سے الفت کی جائے اس میں کچھ بھلائی نہیں۔"

---

[1] سورۃ الشوریٰ ۲۶۔

کہتے ہیں،

"اس امت سے سب سے پہلے خشوع اٹھا لیا جائے گا، پھر تقویٰ، پھر امانت، پھر الفت۔"

اخوت کے فضائل

روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہے اس کو نیک دوست عطا کرنا چاہتا ہے۔ کہ اگر بھول جائے تو یاد کرا دے۔ اور اگر یاد ہو تو اس کی مدد کرے۔"

ایک روایت میں ہے،

"دو بھائیوں کی مثال ایسے ہے کہ جیسے دو ہاتھ ہوں، ملیں تو ایک دوسرے کو دھوتا ہے اور جب بھی دو مومن ملے، اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے بھائی سے بھلائی عطا کی۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی کو بھائی بنایا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے اس قدر درجہ بلند کرے گا کہ ویسا درجہ وہ اپنے کسی عمل کے ذریعہ نہیں لے سکتا۔"

کہتے ہیں کہ اخوت فی اللہ رکھنے والے دو آدمی اگر جنت میں ہوں اور ایک کا درجہ دوسرے کے درجہ سے بڑا ہو تو کم درجہ والے کو بھی بڑا درجہ عطا کر کے اس تک رسائی مل جائے گی اور جیسے بال بچے ایک دوسرے سے جا ملتے ہیں۔ ایسے یہ بھی مل جائیں گے۔ اس لیے کہ اخوت دراصل ولادت کی طرح ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ[1] (پہنچا دیا ہم نے ان تک ان کی اولاد کو اور ہم نے ان کے عمل سے کچھ نہ گھٹایا)

یعنی ہم نے ان کے اعمال میں ذرہ بھی کمی نہیں کی اور جس کا کوئی دوست نہ ہوگا کہ اس کو سفارش کا فائدہ دے اس کے بارے میں فرمایا:

وہ کہیں گے:

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ[2] (پھر کوئی نہیں ہماری سفارش کرنے والا اور نہ کوئی دوست محبت کرنے والا)

---

[1] الطور آیت ۲۱

[2] الشعراء آیت ۱۰۰، ۱۰۱

حمیم کا معنی ہے ھمیم۔ ھاء کو قرب کے باعث حاء سے بدل دیا۔ یہ اہتمام سے ماخوذ ہے یعنی مُھْتَمٌّ بِاَمْرِہٖ (اس کے معاملہ کا اہتمام کرنے والا) اس سے معلوم ہوا کہ صدیق (دوست) وہی ہے جو تیرے امور کا اہتمام کرے اور اہتمام ہی حقیقی صداقت ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"مومن اپنے بھائی کی وجہ سے کثیر ہے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"اسلام کے بعد کسی بندے کو نیک بھائی سے بڑھ کر بھلائی نہیں ملی۔"

نیز فرمایا:

"تم میں سے ایک آدمی اگر اپنے بھائی سے محبت دیکھے تو اس کو تھام رکھے۔ اس لیے کہ یہ کم ہی ملا کرتی ہے۔"

اسی مفہوم میں ایک حکیم کے چند اشعار ہیں:

مَا نَالَتِ النَّفْسُ عَلٰی بُغْیَتِہٖ   اَلَذُّ مِنْ وُدِّ صَدِیْقٍ اَمِیْنٍ

مَنْ فَاتَہٗ وُدُّ اَخٍ صَالِحٍ   فَذٰلِکَ الْمَقْطُوْعُ مِنْہُ الْوَتِیْنُ

(نفس نے ایک امانت دار دوست کی محبت سے بڑھ کر لذیذ مقصود حاصل نہیں کیا)

(جو نیک بھائی کی محبت سے محروم رہا۔ یہ ایسا ہے کہ اس کی مضبوط رسی ٹوٹ گئی)

بعض جگہ دوسرا مصرعہ یہ مروی ہے:

فَذٰلِکَ الْمَغْبُوْنُ حَقَّ یَقِیْنٍ۔   (یہی مغبون ہے یقینی طور پر)

قدیم واقعات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی:

"اے عمران کے بیٹے! بیدار ہوجا، اپنے لیے بھائی چاہ، اور جو دوست اور ساتھی میری مسرت پر تیری امداد نہ کرے تو وہ تیرا دشمن ہے۔"

ایک دوسری روایت میں حضرت داؤد علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

"اے داؤد! کیا بات ہے، تم الگ ہو کر اکیلے نظر آتے ہو؟"

عرض کیا:

"اے میرے معبود! تیری خاطر میں نے مخلوق سے نفرت کر لی۔"

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"اے داؤد بیدار ہوجا، اپنے لیے بھائی تلاش کر، ہر وہ دوست جو میری مسرت کے کام پر تیری

موافقت نہ کرے۔ اس سے مصاحبت نہ کر، وُہ تیرا دشمن ہے۔ تیرے دل میں قساوت پیدا کر دے گا اور تجھے مجھ سے دُور کر دے گا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"تالیف (و الفت) کرنے والے بنو اور نفرت دلانے والے بنو۔"

حدیث میں ہے:

"تم میں سے اللہ تعالیٰ کو محبوب تر وُہ ہیں جو اُلفت رکھتے ہیں اور ان سے الفت کی جاتی ہے۔ اور تم میں سے اللہ تعالیٰ کو مبغوض تر وُہ ہیں جو چُغل خور ہیں۔ اور بھائیوں کے درمیان تفریق ڈالتے ہیں۔"

حضرت داؤد علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا:

"اے پروردگار، میرے لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمام لوگ مجھ سے محبت کریں اور میرے تیرے درمیان جو (تعلق) ہے، اس کے لیے بھی خوب سلامتی رہے۔"

فرمایا: "لوگوں سے ان کے اخلاق کے ساتھ پیش آ اور میرے اور تیرے درمیان جو ہے اسے حُسن و خُوبی سے ادا کر۔"

بعض روایات میں ہے:

"اہل دنیا کے ساتھ اخلاقِ دُنیا سے پیش آ۔"

حضرت شعبی نے حضرت صعصعہؓ بن صوحان سے نقل کیا کہ انہوں نے اپنے بھائی کے بیٹے کو حضرت زیدؓ کو فرمایا:

"تیرے باپ کو میں تجھ سے زیادہ محبوب تھا اور تُو مجھے میرے اپنے بیٹے سے زیادہ محبوب ہے۔ دو باتوں کی وصیت کرتا ہوں، انہیں یاد رکھو:

۱۔ مومن کے ساتھ بھرپُور خلوص رکھ۔

۲۔ فاجر (بُرے آدمی) کے ساتھ بھرپُور مخالفت رکھ، اس لیے کہ فاجر آدمی اچھے اخلاق کے ذریعہ تجھ سے راضی ہو جائے گا۔ مگر تجھ پر حق لازم ہے کہ تُو مومن کے لیے خلوص رکھے۔"

ان سے پہلے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"ہم بعض قوموں کے منہ پر شکر کرتے ہیں مگر ہمارے دل ان پر لعنت بھیج رہے ہوتے ہیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی شرارت و اذیت کو ہٹایا جائے جیسے کہ فرمانِ الٰہی ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ (ایسے طریقہ سے موافقت کر، جو خُوب تر ہو)

ایک قول میں اس سے مراد سلام ہے۔ فرمایا،

بِ ذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔

ایک جگہ فرمانِ الٰہی ہے،

یدْرَؤُنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ۔ (اور کرتے ہیں بُرائی کے مقابل بھلائی)

اس فرمان کا مطلب بیان کرتے ہُوئے حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے،

"فحش و اذی ہی سیئة ہے اس کو سلام کہہ کر دُور کرتے ہیں" اور مدارات کا نام حسنة۔

افضل ترین نیکی ہم نشینوں کا احترام ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ (اور اگر دفع نہ کرا دے اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے)

یعنی ترغیب و ترہیب اور حیاء و مدارات کے ساتھ مدافعت کی۔ اسی طرح اس قول کا مطلب ہے کہ "مومن سے خلوص رکھو اور فاجر کی مخالفت کرو۔" خلوص کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر قلبی محبت رکھے۔ مواخات کا عقیدہ رکھے اور مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ میں اور ملاقات کے وقت مخالفت کا انداز اختیار کرے۔ اس کی توضیح اس طرح آئی ہے،

"لوگوں سے ان کے اعمال کے مطابق اختلاط کرو اور دلوں میں انہیں اٹھاؤ۔"

محمد بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے،

"وُہ دانا نہیں کہ اسے جس کے معاشرت کے بغیر چارۂ کار نہ ہو وہ اس کے ساتھ حسنِ معاشرت رکھے۔ حتٰی اللہ تعالیٰ اس کے لیے راہِ نجات نکال دے۔ چنانچہ غیر متقی آدمی کے ساتھ معاملہ دراصل اضطراری حال ہے اور متقی آدمی کے ساتھ معاملہ کرنا اور مواخات رکھنا ایک بہترین اختیاری بات ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ہے کہ انہیں وحی میں فرمایا گیا،

"اگر تُو نے میری اطاعت کی تو تیرے کس قدر زیادہ بھائی ہوں گے۔"

مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں سے مانوس رہے، ان پر شفقت رکھی اور ان کے لیے قلبِ سلیم رکھا اور ان سے حسد نہ کیا تو تیرے بھائی بہت زیادہ ہوں گے۔

بتاتے ہیں کہ اخوت فی اللہ والوں میں سے ایک آدمی فوت ہوگیا تو اس سے کہا جائے گا۔ جنت میں جاؤ۔ اس نے اپنے بھائی کے درجہ کے بارے میں پُوچھا۔ اب اگر وہ کم درجہ کا ہُوا، تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ جب تک کہ اس کے بھائی کو بھی ویسا درجہ نہ دے دیا جائے۔ بتایا کہ وُہ برابر اسی طرح مانگتا رہے گا اور اسے بتایا جائے گا کہ اس نے تیرے برابر عمل نہیں کیا۔ وُہ جواب دے گا کہ میں اپنے لیے

اور اس کے لیے عمل کرتا رہا ہوں۔ بتایا کہ پھر اسے بھی وُہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے مانگا اور اس کے بھائی کے درجات بلند کر کے اسے بھی اس کے ساتھ پہنچا دیا جائے گا۔ چنانچہ سلف صالحین دنیاوی مقاصد کی خاطر مواخات قائم نہ کرتے بلکہ اخروی فوائد کی خاطر مواخات قائم کیا کرتے تھے۔

ایک عالم نے افضل ترین اخوت کی توضیح کرتے ہُوئے فرمایا کہ اخوت و محبت ایک عمل ہے، اس لیے افضل ترین اخوت، دائمی اخوت ہے اور افضل ترین محبت بھی دائمی محبت ہے اور ہر عمل میں حسنِ خاتمہ کی ضرورت ہے تاکہ عمل مکمل ہو اور اس کا اجر ملے اور اگر حسنِ خاتمہ اور انجام میں یہ کام مکمل نہ ہو تو محبت و دوستی میں بُرے انجام کا نقص آ گیا اور پہلے کا کیا ہوا عمل باطل ہُوا اس لیے کہا ہے دو آدمی بیس برس تک دوست اور بھائی رہتے ہیں مگر آخر میں اخوت ٹوٹ جاتی ہے اور سابقہ مصاحبت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس لیے عالم نے وفات تک محبت و اخوت کے لازمی ہونے کی شرط لگا دی تاکہ انجام بھی اچھا ہو۔

کہا کرتے ہیں کہ شیطان جس قدر دو اللہ تعالیٰ کی خاطر مواخات قائم کرنے والوں سے جلتا اور حسد کرتا ہے اسی قدر وُہ دو نیکی میں تعاون کرنے والوں سے بھی حسد نہیں کرتا۔ وہ مواخات قائم کرنے والوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور دوستی توڑنے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ [1]

(اور کہہ دے میرے بندوں کو بات وہی کہیں جو بہتر ہو، شیطان جھگڑواتا ہے آپس میں)

یعنی شیطانی وساوس کے بعد وُہ اچھی بات کرتے ہیں اور (اس طرح شیطانی وساوس کو شکست دے دیتے ہیں) حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بتاتے ہُوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ [2]

(بعد اس کے کہ جھگڑا اٹھایا شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان)

کہتے ہیں کہ دو آدمی جب اللہ تعالیٰ کی خاطر مواخات قائم کریں۔ پھر اگر ان میں تفریق پیدا ہو جائے تو صرف ان میں سے ایک کے گناہ کے باعث ہو گی۔ حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"جب بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کمی کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو انس دینے والی چیز اس سے

---

[1] بنی اسرائیل ۵۳

[2] یوسف ۱۰۰

چھین لیتا ہے۔"

اور کہا کرتے ہیں ،

"ابلیس کا ایک چیلا ایسا بھی ہے جو مواخات قائم کرنے والوں کے درمیان تفریق پیدا کرتا ہے۔ اس کا صرف یہی کام ہے اور دوسرے کاموں سے وہ فارغ ہے۔"

متقی آدمی کی علامت یہ ہے کہ تفریق ہوتے وقت بھی اچھی بات کرے اور انقطاع ہوجانے پر بھی خوشروئی سے پیش آئے۔ اسی مفہوم میں ایک دانش ور عالم کا شعر ہے سے ،

اِنَّ الْكَرِيْمَ اِذَا تَقَضّٰى وُدَّهٗ ✣ يُخْفِي الْقَبِيْحَ وَ يُظْهِرُ الْاِحْسَانَا

وَ تَرَى اللَّئِيْمَ اِذَا تصرم حَبْلُهٗ ✣ يُخْفِي الْجَمِيْلَ وَ يُظْهِرُ الْبُهْتَانَا

(شریف آدمی جب محبت ختم کرتا ہے تو برائی چھپاتا اور نیکی ظاہر کرتا ہے)

(اور کمینے آدمی کی جب رسّی ٹوٹتی ہے تو اچھائی چھپاتا اور بہتان ظاہر کرتا ہے)

چنانچہ یہاں شریف آدمی کو الٰہی اخلاق کا آئینہ دار بتایا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مروی ہے، جس کے آغاز میں یہ الفاظ آتے ہیں ؛

يَا مَنْ اَظْهَرَ الْجَمِيْلَ وَ سَتَرَ الْقَبِيْحَ وَ لَمْ يُؤَاخِذْ بِالْجَرِيْرَةِ وَ لَمْ يَهْتِكِ السِّتْرَ۔

(اے جس نے اچھائی ظاہر کی اور برائی پر پردہ ڈال دیا اور گناہ پر مواخذہ نہیں کیا اور پردہ دری نہیں کی)

اب اہل ایمان کے اوصاف بھی اسی طرح اعلیٰ ہیں۔

حضرت ابوالدرداؓ فرمایا کرتے ،

"صدیق کا عتاب اس کے گم ہوجانے سے بہتر ہے۔" اور اپنے بھائی پر احسان کرو اور اس کے لیے نرم ہوجا اور اس کا مشتاق بن جا۔ اس کے معاملہ میں شیطان کی تابعداری نہ کر۔ کل اسے موت آئے گی تو اس کی جدائی کافی ہوجائے گی۔ موت کے بعد کیوں روتے ہو جبکہ زندگی میں اس کی ملاقات چھوڑ رکھی ہے ؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ؛

"ذرا توقف کرکے اپنے دوست سے محبت رکھ ، ممکن ہے کہ کسی روز اس سے بغض کرنے لگے اور ذرا توقف کرکے اپنے مبغوض سے بغض کر ، ممکن ہے کسی روز اس سے محبت کرنے لگے۔"

حضرت عمر بن خطاب سے اسی مفہوم کا قول مروی ہے ،

"تیری محبت تکلیف اور تیرا بغض تباہ کن نہ بن جائے۔" فرمایا : "سلامتی رکھ۔"

میں نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

فرمایا: "جب تو محبت کرے تو تکلف نہ کر، جیسے کہ بچہ کسی چیز سے محبت کرے تو تکلف کرتا ہے اور جب تو ناراض ہو تو ایسا بغض نہ رکھ کہ تو اپنے دوست کو ہلاک کر دینا چاہے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وصیت حضرت یحییٰ بن سعید انصاریؒ نے حضرت سعید بن مسیبؓ سے روایت کی۔ بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تجھ پر سچے دوست بنانے لازم ہیں۔ ان کے پہلو میں زندگی گزار۔ اس لیے کہ فراخی میں یہ زینت ہیں۔ اور مصیبت میں یہ کام آنے والا سامان ہے اور اپنے بھائی کے معاملہ کو بہتر انداز پر سمجھ حتیٰ کہ اس سے جو تجھ پر غلبہ ہو وہ تجھ سے محبت کرے۔ اور دشمن سے الگ رہ۔ قوم میں سے صرف امانت دار آدمی کو ہی دوست بنا اور امانت دار وہی ہے جو اللہ عزوجل سے ڈرتا ہو۔ فاجر سے دوستی نہ رکھ تو اس سے فجور (بدمعاشی) ہی سیکھے گا اور اسے اپنے راز پر آگاہ نہ کر اور اپنے معاملہ میں ان لوگوں سے مشورہ کر جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں۔"

حبیب کیسا ہو؟

حضرت ابراہیم بن سعیدؒ سے مروی ہے کہ ہمیں یحییٰ بن اکثمؒ نے بتایا۔ وہ کہتے ہیں: "امیرالمومنین مامون سے میری گفتگو ہوئی۔"

میں نے کہا:

"مجھے سفیان عیینہؒ نے عبدالملکؒ بن ابجر سے روایت کیا کہ جب حضرت علقمہ عطاردی کی وفات قریب ہوئی تو انہوں نے اپنے بیٹے کو بلایا اور فرمایا: "جب تجھے مردوں کی مصاحبت کی ضرورت پیش آئے تو اس کی مصاحبت کر جس کی تو خدمت کرے تو وہ تیری حفاظت کرے اور اگر تجھ پر مشقت آئے تو وہ تیری حفاظت کرے اور اگر تو اس پر مشقت کرے تو وہ تیری مشقت برداشت کرے۔ اس کی مصاحبت کر کہ جب تو کسی بھلائی کے ساتھ بڑھا تو وہ اسے پکڑ کر تعاون کرے۔ اگر تجھ سے نیکی دیکھے تو اسے شمار کرے اور اگر تجھ سے برائی دیکھے تو اسے روک دے اس کی مصاحبت کر، جب تو اس سے مانگے تو وہ تجھے عطا کرے اور جب تو خاموش رہے تو وہ پہل کر کے عطا کرے۔ اگر تجھ پر کوئی آفت آئے تو تیرا غمگسار ہو، اس کی مصاحبت کر، کہ جب تو بات کرے تو وہ تیرے قول کی تصدیق کرے اور جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو وہ تجھے صحیح مشورہ دے اور اگر تم دونوں کا نزاع ہو جائے تو تجھے ترجیح دے۔"

ابن اکثمؒ بتاتے ہیں کہ مامون نے کہا:

"اور یہ کہاں ہے؟"

احنف بن قیس سے کسی نے پوچھا:

"آپ کو کون سا بھائی زیادہ محبوب ہے؟"

کہا: "جو میرے دکھ کی دوا ہو، میری لغزشوں پر پردہ ڈالے اور میرے عذر قبول کرے۔"

اصمعیؒ سے مروی ہے کہ علاء بن جریر نے اپنے والدؒ سے نقل کیا کہ احنفؒ نے کہا:

"دوست کا حق یہ ہے کہ اس کی تین باتیں برداشت کی جائیں۔ غصہ کا ظلم، لغزش کا ستم اور ناز کرنے والے کا ستم۔"

اور فرمایا:

"اخوت ایک رفیق جوہر ہے۔ اگر اس کی خوب حفاظت نہ کی جائے تو اس کو آفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ اخوت کو تواضع کے ساتھ راضی کر۔ حتیٰ کہ تو اس کے اوپر تک جا پہنچے اور غصہ پینے سے راضی کر، حتیٰ کہ جو تجھ پر ظلم کرے تو اس کو معذور سمجھے (اور اسے برا نہ سمجھے) اور رضا کے ساتھ راضی کر حتیٰ کہ تو اپنے آپ کے لیے کوئی فضیلت جان کر بڑا نہ بنے اور دوست میں کوئی خرابی نہ سمجھے۔"

کہا کرتے ہیں:

"جو آدمی لوگوں کی خاطر اپنے نفس پر سختی نہیں کرتا اور ان کے لیے ظلم کرتا ہے، ان سے غافل رہتا ہے وہ ان سے سلامت نہیں رہتا۔"

اسماء بن خارجہ فزاری فرماتے ہیں:

"میں کسی سے بھی نہیں اکتایا۔ اس لیے کہ مجھے دو آدمیوں میں سے ایک ہی ملول کر سکتا ہے:

۱۔ شریف آدمی جس سے لغزش ہو جائے مگر میں اس کو معاف کرنے کا زیادہ مستحق ہوں اور ایسے موقع پر اس پر نوازش کرنے والا ہوں۔

۲۔ یا کمینہ آدمی، تو میں اس کے سامنے اپنی کوئی غرض رکھتا ہی نہیں۔"

پھر مثال دی ہے:

وَ اَغْفِرُ عَوْرَاءَ الْکَرِیْمِ اِصْطِنَاعَهٗ ۔۔۔ وَ اَعْرِضُ عَنْ ذَاتِ اللَّئِیْمِ تَکَرُّمًا

(اور میں شریف آدمی کی بری بات کرنے کو معاف کرتا ہوں اور کمینے کی ذات سے بچتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہوں)

محمد بن عامر نے احباب کے بارے میں اشعار کہے ہیں:

فَلَا تَعْجَلْ عَلٰی اَحَدٍ بِظُلْمٍ ۔۔۔ فَاِنَّ الظُّلْمَ مَرْتَعُهٗ وَخِیْمٌ

وَ لَا تَفْحَشْ وَ اِنْ مُلِئْتَ غَیْظًا ۔۔۔ عَلٰی اَحَدٍ فَاِنَّ الْفُحْشَ لُوْمٌ

وَ لَا تَقْطَعْ اَخًا لَکَ عِنْدَ ذَنْبٍ ۔۔۔ فَاِنَّ الذَّنْبَ یَغْفِرُهٗ الْکَرِیْمُ

وَ لٰكِنْ دَاوِ عَوْرَتَهٗ بِرَقْعٍ كَمَا قَدْ يُرْقَعُ الْخَلَقُ الْقَدِيْمُ
وَ لَا تَجْزَعْ لِرَيْبِ الدَّهْرِ وَ اصْبِرْ فَاِنَّ الصَّبْرَ فِي الْعُقْبٰى سَلِيْمٌ

(کسی پر ظلم میں جلدی نہ کر۔ اس لیے کہ ظلم کی چراگاہ نقصان دہ ہوتی ہے)
(اگر غصہ سے بھر جائے پھر بھی فحش گوئی نہ کرنا کسی پر، اس لیے کہ فحش گوئی کمینگی ہے)
(غلطی پر اپنے بھائی سے قطع تعلق نہ کر۔ اس لیے کہ کریم غلطی کو معاف کر دیتا ہے)
(بلکہ اس کی پردہ پوشی کر اور پیوند لگا جیسے کہ پُرانی چیز کو گاہے پیوند لگایا جاتا ہے)
(رب تعالیٰ کے ابتلاء پر واویلا نہ مچا اور صبر کر۔ اس لیے کہ آخرت میں صبر ہی سلامتی کی بات ہے)

اسی مفہوم میں احمد بن یحییٰ بن ثعلب سے بھی اشعار مروی ہیں۔ وُہ بتاتے ہیں کہ عبد اللہ بن شبیب نے یہ اشعار سنائے ؎

اِخَاءُ النَّاسِ مُمْتَزِجٌ ✧ وَ اَكْثَرُ فِعْلِهِمْ سَمِجٌ
فَاِنْ يَدْهَتْكَ مُقْطِعَةٌ فَلَيْسَ وَرَاءَهُمْ فَرَجٌ
فَقَوِّمْهُمْ بِوَصْلِهِمْ ✧ فَاِنْ لَمْ يُوْصَلُوْا اِعْوَجُّوْا
صُرُوْفُ الدَّهْرِ دَائِبَةٌ، تَقْطَعُ دُوْنَهَا اللَّهَجُ

(لوگوں کی اخوت اختلاط والی ہے، اور ان کے اکثر کام بُرے ہیں۔)
(اگر تجھ پر انقطاع آ گیا تو ان کے بعد کوئی آسائش نہیں)
(اس لیے انہیں جوڑ کر سیدھا کر۔ اگر نہ جوڑا تو وہ ٹیڑھے ہو جائیں گے)
(زمانہ کے تغیرات رواں ہیں۔ یہ تو اس سے ورے زبان ہی کو کاٹ دیتے ہیں)

حضرت عکرمہؓ سے منقول ہے۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنے بھائی سے نہ جھگڑ اور نہ اس سے مزاح کر، اور نہ اس سے ایسا وعدہ کر کہ تو اس کے خلاف کرے۔"

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم اپنے مالوں کے ذریعہ لوگوں کے لیے وُسعت اختیار نہیں کر سکتے۔ البتہ تم خوش روئی اور حُسنِ اخلاق سے وسعت کر سکتے ہو۔"

فرمانِ الٰہی ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ [1] (خوب کر معاف کرنا اور نیک کام کا حکم کر)

[1] الاعراف آیت ۱۹۹

اس کی تفسیر میں حضرت ابونجیح سے مروی ہے کہ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا:
"لوگوں کے اخلاق و اعمال سے لو جو جاسوسی کے بغیر ظاہر ہو اور اسی موضوع پر ایک دانش ور کے اشعار مروی ہیں ؎

خُذْ مِنْ خَلِیْلِكَ مَا صَفَا وَ ذَرِالَّذِیْ فِیْهِ الْكَدِرِ
فَالْعُمْرُ اَقْصَرُ مِنْ مَعَا تِبَةِ الْخَلِیْلِ عَلَی الْغَیْرِ

(اپنے دوست سے صاف چیز لے لو اور جس میں خرابی ہو وہ چھوڑ دو)
(چنانچہ غیر پر عتاب سے عمر چھوٹی ہے)

جو آدمی اخوت فی اللہ اور محبت فی اللہ کا درجہ اور فضیلت سمجھ لے۔ وہ اپنے بھائی کی خاطر صبر کرے گا، اور اس کا شکر ادا کرے گا، اس سے درگزر کرے گا اور اس کا ستم سہے گا تاکہ کچھ عطیات ربانی کی امید رکھ سکے، اپنے مقصود تک رسائی پا سکے۔ جو عمدہ چیز چاہے وہ عمدہ کا ہی سوچتا ہے۔ جو مرغوب چیز چاہے وہ اس کی خاطر مرغوب کو خرچ کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے اللہ تعالیٰ یقیناً اس سے محبت کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کے انعامات

حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنے والے (قیامت کے روز) سُرخ یاقوت کے ستونوں پر ہوں گے۔ ستون کے سرے پر ایک ہزار بالا خانے ہوں گے جو اہل جنت پر جھانکتے ہوں گے۔ اہل جنت کو ان کا حسن اس طرح روشنی دے گا جیسے کہ دنیا والوں کو سورج روشنی دیتا ہے۔ ان پر سبز ریشم کا لباس ہوگا، ان کی پیشانیوں پر یہ تحریر ہوگا:

"هٰؤُلَاءِ الْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ" (یہ اللہ عزوجل کی خاطر باہم محبت کرنے والے ہیں)

حضرت معاذؓ کی حدیث میں ہے۔ انہیں ابوادریس خولانیؒ نے کہا:
"میں اللہ تعالیٰ کی خاطر آپ سے محبت کرتا ہوں"
آپؓ نے انہیں فرمایا:
"خوش ہو جا، پھر خوش ہو جا" اس لیے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:
"قیامت کے روز ایک گروہ کے لیے عرش کے گرد کرسیاں بچھائی جائیں گی اور ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے۔ لوگ گھبراہٹ میں ہوں گے اور یہ گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ لوگ

ڈرتے ہوں گے اور ان کو کچھ خوف نہ ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہیں جن پر کچھ خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

پوچھا گیا، "اے اللہ کے رسولؐ، یہ کون ہیں؟"

فرمایا: "یہ اللہ تعالیٰ کی خاطر باہم محبت کرنے والے ہیں"۔

حضرت ابو حریرہؓ نے اسے روایت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا،

"عرش کے گرد نور کے منبر ہوں گے ان پر ایک قوم ہوگی جس کا لباس نور کا ہوگا۔ ان کے چہرے نور کے ہوں گے۔ وہ نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء ہیں۔ انبیاء اور شہداء ان پر رشک کرتے ہوں گے"۔

(صحابہؓ) نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں ان کی صفات بتا دیجئے"۔

فرمایا: "یہ اللہ تعالیٰ کی خاطر باہم محبت کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خاطر باہم مل کر بیٹھنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرنے والے ہیں"۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

"میری خاطر محبت رکھنے والوں، میری خاطر ملاقات کرنے والوں اور میری خاطر تواضع اور صداقت اختیار کرنے والوں کے لیے محبت حق (اور لازم) ہوگی"۔

فرمان الٰہی ہے،

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ [1]

(اگر تو خرچ کرتا جو سارے ملک میں ہے تمام، نہ الفت دے سکتا ان کے دلوں میں، اور لیکن اللہ نے الفت ڈالی ان میں)

اس کی تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی خاطر باہم محبت کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

ابو بشرؒ نے حضرت مجاہدؒ سے روایت کیا۔ فرمایا،

"جب اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت رکھنے والے باہم ملتے ہیں۔ اب ایک بھائی دوسرے کے سامنے نرم پڑتا ہے تو اس سے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے کہ سرما کے موسم میں خشک درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

---

[1] الانفال آیت ۶۳

"سات کو اللہ تعالیٰ اس روز اپنے عرش کے سایہ تلے جگہ دے گا جس روز کہ اس کے سایہ کے بغیر کوئی سایہ نہ ہو گا (ان میں سے یہ بھی ہیں) اور وہ دو آدمی جنہوں نے اللہ کی خاطر مواخات کی اور اسی پر جمع ہوئے، اسی پر جدا ہوئے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ اور دوسرے فرماتے ہیں،

"محبت و رحمت کے ساتھ ایک بھائی کی دوسرے بھائی پر نظر کرنا عبادت ہے۔ چنانچہ محبت فی اللہ اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے کہ اجتماع میں رحمت و اختلاط ظاہر ہو اور تفریق پر نصیحت ہو، غیب سے پرہیز کرے، وفا رکھے، انس پایا جائے، جفا نہ ہو۔ وحشت ختم ہو جائے، انبساط پایا جائے اور تنفر ختم ہو جائے۔"

اخوّت کے آداب

حضرت فضیلؒ فرمایا کرتے تھے،

"جب غیبت شروع ہوئی تو اخوت جاتی رہی۔"

حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

"جب بھی دو آدمی اللہ تعالیٰ کی خاطر مواخات قائم کریں۔ پھر ان میں سے ایک کو دوسرے سے وحشت ہو جائے اور ایک کو تنفر ہو جائے تو یہ ان میں سے ایک کی خرابی کی وجہ سے ہو گا۔"

یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جب بھی دو آدمیوں نے اللہ کی خاطر محبت کی تو ان میں سے اللہ تعالیٰ کو محبوب تر وہ ہے جو اپنے بھائی سے زیادہ محبت کرے۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں، کہ

"ان دونوں میں سے افضل یہ ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ کی خاطر اخوت قائم کرنے والوں میں سے اللہ تعالیٰ کو محبوب تر وہ ہے جو اپنے بھائی کے لیے زیادہ نرم ہو۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"ایک بندہ اس وقت ہی ایمان کا مزہ چکھتا ہے جب کہ وہ انسان سے محبت کرے تو حضرت اللہ ہی کی خاطر محبت کرے۔"

حضرت ابن عباسؓ نے حضرت مجاہدؒ کو وصیت کی تو اس میں فرمایا:

"جب تیرا بھائی تجھ سے غائب ہو تو اس کا ذکر اسی طرح کر جیسے کہ اگر تو اس سے غائب ہو تو اپنا ذکر چاہتا

پسند کرتا ہے اور جیسے تو چاہتا ہے کہ تجھے معاف کر دیا جائے۔ اس پر اسے بھی معاف کر۔"

بعض کا فرمان ہے:

"میں نے غیر حاضری میں جب بھی کسی بھائی کا ذکر کیا تو یہ فرض کر لیا کہ وہ یہاں بیٹھا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے بارے میں وہی کہا جو وہ اپنی موجودگی میں سننا پسند کرتا ہے۔"

ایک بزرگ کا فرمان ہے:

"جب بھی غیر حاضری میں میرے کسی بھائی کا ذکر ہوا تو میں نے اس کی صورت میں اپنے آپ کو تصور کیا اور اس کے بارے میں وہی کچھ کہا جو اپنے بارے میں پسند کرتا ہوں۔"

یہ صدقِ اسلام کی حقیقت ہے۔ مسلمان اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ بھائی کیلئے بھی وُہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور بھائی کے لیے بھی وہی کچھ ناپسند نہ کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے۔"

ایک ادیبؒ کا قول ہے:

"جس نے بھائیوں سے وُہ تقاضا کیا جو وہ اس سے تقاضا نہیں کرتے تو اس نے ان پر ظلم کیا اور جس نے بھائیوں سے اس کا تقاضا کیا جس کا وہ تقاضا کرتے ہیں تو اس نے انہیں تھکا دیا اور جس نے ان سے کچھ تقاضا نہ کیا اس نے ان پر نوازش کی۔"

اس مفہوم میں ایک حکیم سے مروی ہے:

"جس نے بھائیوں کے سامنے اپنے آپ کو اپنے درجہ سے بلند کیا وہ بھی گنہ گار ہوا اور اس کے بھائی بھی گنہ گار ہوئے۔ اور جس نے ان کے سامنے اپنے آپ کو اپنے درجہ پر رکھا وہ خود بھی تھکا، انہیں بھی تھکایا، اور جس نے اپنے آپ کو درجہ سے کم رکھا وہ بھی سلامت رہا اور انہیں بھی سلامتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ سے محبت فی اللہ لوگوں میں بہت ہی کمیاب ہے اس لیے حقیقی محبت یہی ہے!"

پُرانے واقعات میں ہے:

"دو کمیاب ہیں اور ان سے عزت میں ہی اضافہ ہوتا ہے:

۱۔ حلال درہم

۲۔ ایسا بھائی کہ جس کی طرف سکون ملے۔"

اور ایک قول یہ ہے کہ تُو اس کے ساتھ انس پائے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا فرمان ہے:

"تین چیزیں ہمارے اس زمانہ میں کمیاب ہیں اور ان میں سے ایک وفاء کے ساتھ حسنِ اخوت کا ذکر کیا۔ یعنی غیر حاضری میں وفاء ہو اور یہ کہ اسے علم بھی نہ ہو اور اس طرح وفاء ہو جیسے کہ اس کی زندگی میں اور اس کے سامنے ہوتی ہے اور اس کی موت کے بعد بھی اس کے لیے اور اس کے اہل کے لیے وفاء ہو۔ جیسے کہ اس کی زندگی میں تھی۔ یہی وہ وفاء ہے جس کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات میں شرط لگائی۔ فرمایا:

"اس پر ان کا اجتماع ہو یا تفریق ہو" اور اس کی جزاء، روزِ قیامت کو عرش کا سایہ عطا ہونا فرمایا۔

ایک ادیب کا قول ہے:

"وفات کے بعد کم وفاء والا بھی زندگی میں کثیر الوفاء سے بہتر ہے۔"

سلف صالحینؒ کا یہی طریقہ تھا جیسے کہ حضرت حسنؓ وغیرہ سے مروی ہے۔

مشائخؒ کا فرمان ہے کہ سلف کا طریقہ تھا کہ جب ان کا ایک بھائی فوت ہوتا تو اس کے اہل و عیال کی چالیس چالیس برس تک بھی خدمت کرتے اور انہیں صرف چہرہ غائب ہونے کی ہی تکلیف ہوتی۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت مسروقؓ نے کافی قرض لے رکھا تھا اور ان کے دوست حضرت خیثمہؒ پر بھی قرض تھا۔ چنانچہ حضرت مسروقؒ نے حضرت خیثمہؒ کا قرض ادا کر دیا اور انہیں معلوم نہ تھا اور حضرت خیثمہؒ نے حضرت مسروقؒ کا قرض ادا کر دیا اور انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ کون ادا کر گیا۔

محبت فی اللہ حقیقی طور پر یہی ہے کہ سامنے اور غیر حاضری میں خلوص کے ساتھ محبت ہو۔ قلب و زبان میں مطابقت ہو۔ خلوت و جماعت میں ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جب ایسا اختلاف نہ ہو تو یہ اخلاصِ اخوت ہے اور اگر اس میں اختلاف ہو تو اخوت میں مداہنت و اختلاط پایا جاتا ہے۔ دین اور اہل ایمان کے طریقہ میں مداخلت ہے اور ایسا ہونے کے ساتھ حقیقتِ ایمان حاصل نہیں۔

حضرت ابو رزین عقیلیؓ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے ان کے لیے کچھ باتوں کی شرط لگائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ غیر نسب سے محبت رکھے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت ہو۔

محبت فی اللہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ صلۂ رحمی کی خاطر یا اس کا احسان چکانے کی خاطر محبت نہ کرتا ہو جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:

"ایک آدمی نے کسی دوسری بستی میں جا کر اپنے ایک بھائی سے ملاقات کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا۔ اس نے پوچھا:

"کہاں کا ارادہ ہے؟"

کہا: "اس بستی میں میرا ایک بھائی ہے اس کی ملاقات کا ارادہ ہے۔"

پوچھا، "کیا تیرے اور اس کے درمیان کوئی ایسا (تعلق رحم) ہے کہ تو صلہ رحمی کر رہا ہے یا تجھ پر اس کا کوئی انعام ہے کہ تو احسان چکار رہا ہے؟"

کہا: "نہیں، بلکہ مجھے اس سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت ہے۔"

اس فرشتہ نے کہا:

"میں تیری طرف اللہ کا قاصد ہوں۔ اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت رکھتا ہے جیسے کہ تو نے اس کی خاطر اس آدمی سے محبت رکھی۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"اگر آدمی دن کو روزے رکھے اور افطار نہ کرے اور رات کو قیام کرے اور جہاد کرے مگر اللہ تعالےٰ کی خاطر محبت نہ رکھے اور نہ ہی اس کی خاطر عداوت رکھے۔ اس کے لیے یہ کچھ بھی نفع نہ دے گی۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کو فرمایا:

"کون سا برہنہ ایمان پختہ ترین ہے؟"

صحابہؓ نے عرض کیا: "نماز"۔

فرمایا: "ایک نیکی ہے اور اس درجہ کی نہیں۔"

صحابہؓ نے عرض کیا: "حج اور جہاد۔"

فرمایا: "ایک نیکی ہے اور اس درجہ کی نہیں۔"

عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ، آپؐ ہی ہمیں بتائیے۔"

فرمایا: "پختہ ترین برہنہ ایمان، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔"

غلطی پر بھائی سے کیا سلوک کرے؟

مواخات فی اللہ کر کے اگر ایک بھائی سے غلطی ہو جائے پھر دوسرے کا حال بدل جائے اور اس میں کچھ تغیر ہو جائے تو کیا اس سے بغض رکھے یا نہ رکھے؟ صحابہؓ کا اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوذرؓ فرمایا کرتے تھے:

"جب اس کا حال بدل جائے اور متغیر ہو جائے تو جس اعتبار سے اس سے محبت کی اسی اعتبار سے اس سے بغض رکھو۔"

حضرت ابوالدرداءؓ کے بارے میں مروی ہے کہ ایک نوجوان ان کی مجلس پر چھا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت ابوالدرداءؓ اس سے محبت کرنے لگے۔ وہ اسے بڑوں سے مقدم و قریب رکھتے۔ لوگوں کا اس نوجوان سے حسد پیدا ہوا اور اچانک یہ نوجوان کوئی کبیرہ گناہ کر بیٹھا تو اسے حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس لے کر آئے اور تمام ماجرا سنا کر عرض کیا:

"کاش آپ اسے دُور کر دیں۔"

فرمایا: "سبحان اللہ، ہم ایک چیز کی وجہ سے اپنے دوست کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

بعض تابعین و صحابہ سے بھی اسی قسم کے واقعات مروی ہیں۔ جب ان سے ایسا کرنے کو کہا گیا تو فرمایا:

"میں اس کے عمل سے بغض رکھتا ہوں مگر وہ میرا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اہل کے بارے میں یہی حکم دیا۔

فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ [1] (پھر اگر تیری نافرمانی کرے تو کہہ دے میں الگ ہوں تمہارے کام سے)"

اور یہ نہیں فرمایا کہ "میں تم سے نسبی طور پر ہی بے زار ہوں۔"

اور کہا کرتے ہیں، "صداقت کا تعلق بھی نسب کے تعلق کی طرح ہوتا ہے۔"

حکیم بن مرۃ سے پوچھا گیا،

"آپ کو کون زیادہ محبوب ہے: آپ کا بھائی یا دوست؟"

فرمایا، "میں اپنے بھائی سے زیادہ محبت رکھتا ہوں جبکہ وہ دوست ہو۔"

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے،

"تیرے کتنے ہی ایسے بھائی ہیں جن کو تیری ماں نے نہیں جنا" اسی لیے یہ کہا گیا،

"قرابت، محبت کی محتاج ہے اور محبت قرابت کی محتاج نہیں۔"

جب ایک قوم نے ایک بُرائی میں مبتلا آدمی کو گالی دی تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ٹھہرو" اور انہیں منع کیا کہ "اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔"

بھائیوں کی لغزشوں کے بارے میں بعض علماء کا قول مروی ہے،

"شیطان نے چاہا کہ تمہارے بھائی پر یہ برائی ڈال دے تاکہ تم اس سے قطع تعلق کر لو اور اسے چھوڑ دو۔ اب تم نے اپنے دشمن کی (شیطان کی) کس قدر خواہش پوری کی؟"

حضرت ابو الدرداءؓ فرمایا کرتے،

"جب تیرے بھائی کا حال بگڑ جائے اور اس میں تغیر آ جائے تو اس کی وجہ سے اسے نہ چھوڑ دے۔ اس لئے کہ تیرا بھائی ایک بار بگڑتا ہے تو دوسری بار سنور بھی جاتا ہے۔"

---

[1] الشعراء آیت ۲۱۶

فرمایا کرتے :

"اپنے بھائی کا علاج کر اور حسد کرتے ہوئے اس سے تعلق نہ توڑ دے کہ تو بھی ایسا ہو جائے گا۔"

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے :

"مہذب آدمی کون سے ہیں ؟"

ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا :

"گناہ پر اپنے بھائی سے قطع تعلق نہ کر اور نہ اسے چھوڑ دے۔ اس لیے کہ آج وہ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے تو کل چھوڑ دے گا۔"

ایک بار فرمایا :

"عالم کی لغزش کا لوگوں میں ذکر نہ کرو، اس لیے کہ ایک عالم ایک لغزش کھاتا ہے پھر اسے چھوڑ دیتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے :

"عالم کی لغزش سے بچو اور اس سے قطع تعلق نہ کرو اور اس کے رجوع (و توبہ) کا انتظار کرو۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"سب سے بدترین بندے چغل خور ہیں جو کہ احباب کے درمیان تفریق ڈالتے ہیں۔ بے گناہ لوگوں کے عیب تلاش کرتے ہیں۔"

حضرت سعید بن مسیبؓ نے فرمایا :

"میں باہم الفت رکھنے والوں کے درمیان تفریق ڈالنے کو ناپسند کرتا ہوں۔"

ایک بار فرمایا :

"باہم محبت رکھنے والوں کے درمیان۔"

حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے : انہوں نے اپنے ایک بھائی کے بارے میں پوچھا تھا جس سے ان کی مواخات تھی اور وہ شام گئے ہوئے تھے۔ ایک وہاں سے آنے والے آدمی سے ان کے حالات معلوم کیے تو اس نے بتایا کہ وہ شیطان کا بھائی ہے۔"

فرمایا : "ٹھہرو۔"

اس نے کہا :

"وہ کبائر کا مرتکب ہوا اور شراب تک کا ارتکاب کرنے لگا ہے۔"

فرمایا : "جب تو وہاں جائے تو مجھے مل کر جانا۔" چنانچہ اس کی طرف رقعہ لکھا :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ[1]

(شروع ساتھ نام اللہ کے جو بخشنے والا اور نہایت رحم والا اور مہربان ہے۔ حٰم۔ اتارنا کتاب کا اللہ کی طرف سے ہے جو غالب جاننے والا گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے)

پھر اسے عتاب کیا اور اس بُرے فعل پر ندامت دلائی جب اس نے ان کا مکتوب پڑھا تو کہا:

"اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا اور حضرت عمرؓ نے مجھے نصیحت کی۔"

بتاتے ہیں کہ پھر توبہ کرکے نیک ہو گیا۔

اخوت کے مزید فضائل

حب فی اللہ کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اسے ایمان پائے جانے کی علامت قرار دی اور اس فرمان میں حبِ الٰہی اور حبِ رسولؐ کو جمع کر دیا۔

حدیث میں ہے:

"میرا بندہ اس وقت ہی مومن ہو سکتا ہے کہ اسے اللہ اور اس کا رسول ان کے علاوہ سے زیادہ محبوب ہو۔"

پھر اسی طرح یوں آیا:

"بندہ اسی وقت ہی ایمان کی حلاوت پائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر انسان سے محبّت رکھے۔" حب فی اللہ کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے کی ملاقات کی جائے ایک دوسرے پر خرچ کیا جائے اور صاف دلی رکھے۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث میں ہے اور موسیٰ بن عقبہؓ نے فرمایا:

"میں اپنے ایک بھائی کو ایک بار ملتا تو کئی روز تک اس کی ملاقات کے باعث خوشی کی مجلس قائم کرتا ہوں۔"

حضرت جعفر بن سلیمانؒ نے فرمایا:

"جب میں اپنے جی میں سستی دیکھتا ہوں تو محمد بن واسع کے چہرہ کی طرف دیکھتا ہوں تو اس پر ایک جملہ تک عمل پیرا رہتا ہوں۔"

محمد بن واسع فرمایا کرتے تھے:

---

[1] حٰم المومن آیت ۱، ۲، ۳۔

" دنیا میں تین لذیذ ترین چیزیں ہی باقی رہ گئیں ؛

۱۔ با جماعت نماز ۔

۲۔ رات کو تہجد پڑھنا ۔

۳۔ بھائیوں سے ملاقات کرنا ۔"

بعض" کا فرمان ہے ؛

" احباب کی ملاقات ، تسلّی کا باعث ہے اور غم دُور کرتی ہے ۔"

حضرت حسنؒ اور ابُو قلابہؒ فرمایا کرتے ؛

" ہمیں اپنے احباب اپنی اولاد و اہل سے بھی محبوب تر ہیں ۔" اس لیے کہ ہمارے اہل ہمیں دنیا یاد دلاتے ہیں اور ہمارے احباب ہمیں آخرت یاد دلاتے ہیں ۔"

ایک بزرگؒ کا فرمان ہے :

" اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد اور اہل دنیا میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاطر بھائی دراصل آخرت کا ذریعہ ہیں ۔"

حضرت سفیان بن عینیہؒ سے پُوچھا گیا ؛

" کون سی چیز لذیذ تر ہے ؟"

فرمایا ؛ " بھائیوں کے ساتھ نشست کرنا اور کفایت کی طرف لوٹ آنا ۔"

ایک روایت میں ہے ؛

" ایک آدمی جب بھی اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے ایک بھائی کو شوق و رغبت کے ساتھ ملتا ہے تو اس کے پیچھے سے فرشتہ آواز دیتا ہے ، تو خوش ہوا اور تیرے ساتھ جنّت بھی خوش ہُوئی ۔"

حضرت حسنؒ کا فرمان ہے ؛

" جس نے اپنے ایک بھائی کو اللہ تعالیٰ کی خاطر رخصت دی منزل تک ، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے نیچے سے فرشتے بھیجے گا جو اسے جنّت کی طرف رخصت کرے گا یعنی جنّت تک پہنچائے گا ۔"

حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں ۔ کہا کرتے تھے کہ تین کے بعد بھائیوں کو مفقود جانو ؛

۱۔ اگر بیمار ہوں تو ان کی تیمار داری کرو ۔

۲۔ اگر وہ مصروف ہوں تو ان کی مدد کرو ۔

۳۔ اگر بھول جائیں تو ان کو یاد کراؤ ۔"

حضرت شعبیؒ ایک آدمی کے بارے میں فرماتے ہیں جو ان کا ہم نشین تھا ۔ فرمایا ؛

"میں اس کا چہرہ پہچانتا ہوں اور اس کا نام نہیں جانتا۔" یہ معرفتِ توکل کی بات ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو دائیں بائیں التفات کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی وجہ معلوم کی۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک آدمی سے محبت رکھتا ہوں اسے تلاش کر رہا ہوں مگر وہ نظر نہیں آ رہا۔"

آپؐ نے فرمایا:

"اے ابو عبداللہ! جب تو کسی سے محبت کرتا ہو تو اس کا نام، اس کے باپ کا نام اور اس کے گھر کا پتہ معلوم کرو۔ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کرو اور اگر وہ مصروف ہو تو اس کی مدد کرو۔"

حضرت ضحاکؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ ان سے کسی نے پوچھا:

"آپ کو سب لوگوں سے زیادہ کون محبوب ہے؟"

فرمایا: "میرا ہم نشین۔"

اور فرمایا کرتے:

"جو آدمی بھی دنیا کی کسی حاجت کے بغیر میری مجلس میں تین بار آئے تو میں دنیا سے اس کی جزا دینا جان لیتا ہوں۔"

حضرت سعید بن العاصؓ فرمایا کرتے:

"میرے ہم نشین کے مجھ پر تین حق ہیں:

۱۔ جب قریب ہو تو اس کو مرحبا کہوں۔

۲۔ جب بات کرے تو توجہ رکھوں۔

۳۔ جب بیٹھے تو اس کے لیے وسعت کروں۔"

احنفؒ بن قیس کا قول ہے:

"انصاف حکمرانی کو مضبوط کرتا ہے اور اچھی معاشرت کے ساتھ مصاحبت طویل ہوتی ہے۔"

فرمایا کرتے:

"تین عادات کے ذریعہ محبت حاصل ہوتی ہے:

۱۔ معاشرت میں انصاف کرنا۔

۲۔ تنگی میں غمخواری کرنا۔

۴۔ دوستی و محبت سے وابستگی:۔

حضرت اکثم بن صیفیؒ نے اپنے بیٹوں کو فرمایا،

"اے بیٹو، محبت میں قرب حاصل کرو اور قرابت پر بھروسہ نہ رکھو۔"

ابو حازمؒ سے کسی نے پوچھا،

"قرابت کیا ہے؟"

فرمایا: "محبت"۔ چنانچہ حب فی اللہ میں پہلی بات یہ ضروری ہے کہ کسی نافرمانی پر محبت نہ ہو اور نہ ہی دنیاوی فائدہ کی خاطر محبت کرے اور نہ ہی خواہش کی موافقت کی وجہ سے محبت ہو اور نہ ہی آج کے معالج و احوال میں فائدہ یا کسی سابقہ احسان چکانے کے طور پر محبت ہو۔ یہ امور اللہ تعالیٰ کی طرف اور آخرت کی طرف کی راہ نہیں ہے ۔ یہ دنیاوی اور خواہش کی راہ ہے۔ جب ان سب معاملات سے بچا رہا تو یہ حب فی اللہ کی ابتدا ہے اور حب فی اللہ میں کوئی خرابی پیدا نہ کرے۔ یہ دوسرا شعبہ ہے مثلاً خوش اخلاقی ، ادب، بردباری، کمالِ عقل اور اس کے برداشت وصبر کی وجہ سے اس سے محبت کرے۔ یا اس سے مانوس ہونے اور وحشت اُٹھ جانے یا اللہ تعالیٰ کے دونوں کے درمیان الفت قائم کر دی۔ اس وجہ سے ایسا کرے اور اگر دین اور اہل ایمان کے طریقوں میں داخل والی بات کی وجہ سے محبت کرے تو یہ حقیقی محبت فی اللہ نہیں۔ اسی طرح اگر انعام و فضل جیسی چیزوں سے نہ جُدا رہے اور نہ ان سے اتصال ہو تو بھی یہ حقیقی محبت نہیں۔ چونکہ طبعی جبلت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ انعام ہو تو محبت زیادہ ہو تو قلب کو اس احساس سے روکا نہیں جا سکتا۔ اور جو اس سے برائی کرے اس سے بغض رکھنا بھی حقیقی محبت نہیں۔ البتہ معروف اسباب پائے جانے پر محبت کرنے والا گناہ اور معصیت کا مرتکب شمار ہو گا جیسے کہ کسی کی برائی دیکھ کر اگر نفرت رکھے تو گناہ گار نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ یہ نفرت کسی جرم تک نہ جا پہنچے کہ جس پر گناہ ہو۔ البتہ یہ طبعی محبت ہے۔ البتہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی خاطر قلبی محبت اور قلبی بغض سے اجر ملتا ہے چاہے مباح ہو اس لیے کہ یہ زائل ہو جاتی ہے اور جو محبت بھی کسی عوض میں آئے تو وہ عوض ختم ہوتے ہی زائل ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت و بغض ایسی چیز نہیں کہ جو طبع میں دنیاوی نفع یا دنیاوی نقصان ہوتا دیکھ کر بدل جائے حقیقی طور پر حب فی اللہ یہ ہے کہ دین یا دنیا کے معاملہ میں اس پر حسد نہ کرے جیسے کہ ان دونوں معاملات میں اپنے آپ پر حسد نہیں کرتا اور اگر بھائی کو دین یا دنیا کی ضرورت ہو تو اسے ان میں ترجیح دے۔ حب فی اللہ کی یہ دو شرطیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں ذکر کیا:

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ۔ (محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے آئے ان کے پاس)

پھر ان کی محبت کا وصف بیان کیا۔ فرمایا:

وَ لَا يَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا[۱] (اور نہیں پاتے اپنے دل میں غرض اس چیز سے جو ان کو ملا)

یعنی دین یا دُنیا کی کوئی ضرورت ہو، پھر دوسری شرط کے بارے میں فرمایا،

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (اور انہیں اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ اپنے آپ پر بھوک ہو)

یہ واضح کلام ہے اور احباب کا مکمل وصف بتایا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے جان و مال پر اپنے بھائی کو ترجیح دے اگر اسے اس کی ضرورت ہو اور اگر اس درجہ پر نہ ہو تو یہ صدیقین کا مقام ہے۔ وہ اس کے حال میں اس کے مساوی ہے اور یہ مقامِ صدیقین ہے اور یہ کم تریں درجۂ اخوت ہے اور یہی اہل ایمان کا اخلاق ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنی اور فقیر کے درمیان اخوت قائم کی تاکہ غنی فقیر کو برابر کر دے اور دونوں میں اعتدال ہو جائے اور مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کو اپنی اولاد اور اہل پر مقدم رکھے اور اسے ان سے زیادہ محبوب رکھے۔ اس لیے کہ اولاد و اہل کی محبت دنیا کی وجہ سے اور نفس و خواہش کے باعث ہے اور بھائیوں کی محبت آخرت کی وجہ اور اللہ تعالیٰ کی خاطر ہے اور دین و امور دین و آخرت کے معاملہ میں محبت کرنا اہل تقویٰ کے نزدیک مقدم چیز ہے۔

حضرت عبداللہ بن حسن بصریؒ کا طریقہ تھا کہ وہ حضرت حسن کے بھائیوں کا جب طویل وقوف اور حضرت حسنؒ کا ان کے معاملہ میں شدید مصروفیت دیکھتے تو انہیں واپس کرتے۔ اور کہتے،

" اپنے شیخ کو تنگ نہ کرو۔"

جب حضرت حسنؒ کو اس کا علم ہوتا تو فرماتے،

" اے لڑکے انہیں چھوڑو۔ مجھے یہ لوگ تم سے زیادہ محبوب ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاطر مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور تم مجھے دنیا کی خاطر چاہتے ہو۔"

حضرت ابو معاویہ اسودؒ نے فرمایا،

" میرے تمام بھائی مجھ سے بہتر ہیں۔"

کسی نے پوچھا،

" یہ کیسے ؟"

---

[۱] الحشر ۹ ۔

فرمایا: "ان میں سے ہر ایک اپنے سے مجھے ہی افضل سمجھتا ہے۔ اب جس نے اپنے آپ پر مجھے فضیلت دی وہ مجھ سے بہتر ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"انسان اپنے خلیل کے دین پر ہے۔ اس آدمی کی مصاحبت میں کچھ بھلائی نہیں جو تیرے لیے وہی کچھ نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

حضرت اعمشؒ فرمایا کرتے تھے:

"جس نے اپنی بدعت ہم سے چھپائی اس کی الفت ہم سے مخفی نہ رہی۔" یعنی جن بھائیوں سے انہیں الفت تھی ان کی طرف دیکھا جاتا تو ان کی وجہ سے ان کی جانب رہنمائی حاصل ہوتی۔"

اصمعیؒ نے مجاہدؒ سے اور انہوں نے حضرت شعبیؒ سے نقل کیا کہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے ایک آدمی کو نصیحت فرمائی اور اس کے لیے ایک بدعقل جاہل آدمی کی مصاحبت ناپسند کی۔ چنانچہ فرمایا: ؎

لَا تَصْحَبْ اَخَا الْجَہْلِ وَ اِیَّاکَ وَ اِیَّاہُ
فَکَمْ مِنْ جَاہِلٍ اَرْدٰی حَلِیْمًا حِیْنَ اٰخَاہُ
یُقَاسُ الْمَرْءُ بِالْمَرْءِ اِذَا مَا ہُوَ مَاشَاہُ
وَ لِلشَّیْءِ مِنَ الشَّیْءِ مَقَایِیْسُ وَ اَشْبَاہُ
وَ لِلْقَلْبِ عَلَی الْقَلْبِ دَلِیْلٌ حِیْنَ یَلْقَاہُ

(جاہل کی صحبت نہ کر اور اس سے بالکل دور رہ)
(کئی جاہل آدمی ایسے ہیں کہ جب ایک حلیم آدمی نے ان سے اخوت کی تو اس نے اسے بھی عیب لگایا۔)
(آدمی کا آدمی پر قیاس ہوتا ہے۔ ایک پیمانے اور ان کے امثال)
(دل کا دل پر۔ راہ ہے جب وہ اس سے ملتا ہے)

محمد بن جامع فقیہؒ کے اشعار مشہور ہیں: ؎

تَذَلَّلْ لِمَنْ اِنْ تَذَلَّلْتَ لَہٗ یَرٰی ذَاکَ لِلْفَضْلِ لَا لِلْبَلَہٖ
وَ جَانِبْ صَدَاقَۃَ مَنْ لَا یَزَالُ عَلَی الْاَصْدِقَاءِ یَرَی الْفَضْلَ لَہٗ

(اس کے سامنے تواضع کر کہ اگر تو تواضع کرے تو اسے تیری فضیلت سمجھے اور بے وقوفی نہ کہے)
(اس کی دوستی سے بچ کر جو ہمیشہ دوستوں پر اپنا فضل و کرم جتاتا رہے)

ایک ادیب کے اشعار ہیں :

كَمْ مِنْ صَدِيْقٍ عَرَفْتُهُ بِصَدِيْقٍ صَارَ حَظِّيْ مِنَ الصَّدِيْقِ الْعَتِيْقِ

وَ رَفِيْقٍ رَأَيْتُهُ فِيْ طَرِيْقٍ صَارَ عِنْدِيْ مَحْضَ الصِّدْقِ الْحَقِيْقِيْ

(کئی دوست میں نے ایک دوست کے ذریعہ جانے۔ میرا حصہ پرانے دوست سے ہوا)

(میں نے راستہ میں جس دوست کو دیکھا میرے نزدیک وہ حقیقی صدق ہی بن گیا)

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے بھائی کے اوصاف میں ایک جامع مختصر رجزیہ کلام پڑھا :

اِنَّ اَخَاكَ الْحَقُّ مَنْ كَانَ مَعَكَ وَ مَنْ يَضُرُّ نَفْسَهُ لِيَنْفَعَكَ

(تیرا حقیقی دوست وہ ہے جو تیرے ساتھ ہو اور تجھے فائدہ دینے کی وجہ سے اپنا نقصان بھی کر ڈالے)

وَ مَنْ اِذَا رَيْبَ الزَّمَانُ صَدَعَكَ شَتَّتَ شَمْلَ نَفْسِهِ لِيَجْمَعَكَ

(اور جب زمانہ تجھ پر شبہ کرے تو وہ تیرے لیے اظہارِ حق کرے تیری جمعیت کی خاطر اپنے آپ کو پریشان کر لے)

اخوت کس سے ہو؟

حسب ذیل لوگوں سے دوستی نہیں رکھنی چاہیے:-

۱۔ کسی بدعتی آدمی سے حب فی اللہ نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ کسی فسق پر اصرار کرنے والے فاسق سے دوستی نہ رکھے۔

۳۔ کسی ایسے فقیر سے دوستی نہ رکھے جو کسی غنی کو دنیا کی وجہ سے دوست رکھے اور نہ ایسے فقیر سے دوستی رکھے کہ جس کو دنیا کی عاجل چیز ملے تو خوش ہو۔

گاہے ایک غنی اور فقیر کے درمیان بھی اخوت و محبت پائی جاتی ہے حالانکہ غنی آدمی اپنے بھائی کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس کا فقیر بھائی اس سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اسے ترجیح دینا پسند کرتا ہے۔

گاہے عالم اور جاہل کے درمیان اور صالح اور بُرے آدمی کے درمیان اس وجہ سے دوستی ہوتی ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے دین سیکھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کرے اور اعلیٰ ترکی اس میں کئی نیتیں ہوں اور یہ اس کے حسنِ اخلاق، بہتر معاملہ یا قابلِ مدح نورانیت کی وجہ سے ہو۔ اس لیے کہ مومن سب ہی ہلاک نہیں ہوتا اور نہ ہی سب ختم ہو جاتا ہے اور مومن آدمی کامل طور پر ہلاک نہیں ہوتا اور نہ ہی ایک دم سب ختم ہو جاتا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اس آدمی پر شفقت ہے یا عالم اور صالح آدمی اپنے دل میں تواضع اختیار کرتا ہے اور ہر حال میں اسے ہی بہتر جانتا ہے یا اس کی پردہ داری کرتا ہے تاکہ دوسرے سے اسے کوئی عیب یا نقص نہ آ جائے۔ یہ اخوت کرنے والوں کی راہیں ہیں اور اس میں ان کی کئی نیتیں ہوتی ہیں۔

چنانچہ جس بات سے وُہ آگاہ نہیں اِس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے علم و جہالت سے واقف ہو تاکہ جس طرح اس کے مال سے مدد کرتا ہے۔ اسی طرح علم سکھا کر اس کی مدد کرے۔ اس لیے کہ جہالت کا فقر و احتیاج مال کے فقر سے زیادہ سخت ہے اور علم کی ضرورت، مال کی ضرورت سے کم کسی طرح نہیں۔

حضرت فضیلؒ فرمایا کرتے؛

"صدیق کو تصدق کی وجہ سے اور رفیق کو ترفق (نرمی کرنے) کی وجہ سے صدیق اور رفیق کہا جاتا ہے۔ اگر تو اس سے زیادہ مالدار ہے تو مال کے ذریعہ اس پر رفق و نوازش کر، اور اگر تو اس سے زیادہ عالم ہے تو علم سکھا کر اس پر رفق و نوازش کر۔"

دوست کو نصیحت کا طریقہ

مناسب یہ ہے کہ اسے تنہائی میں نصیحت کیا کرے اور لوگوں کے سامنے زجر و توبیخ نہ کرے اور نہ ہی کسی کو اس کے مخفی حال پر آگاہ کرے۔ اس لیے کہ کہا کرتے ہیں؛

"مومنوں کی نصائح، ان کے کانوں میں ہوتی ہیں۔"

حضرت جعفر بن برقانؒ بتاتے ہیں کہ میمون بن مہرانؒ نے مجھے فرمایا؛

"جو میں ناپسند کرتا ہوں، میرے منہ پر وُہ کہو۔ اس لیے کہ آدمی اپنے بھائی کو تب ہی نصیحت کرتا ہے کہ جو وہ ناپسند کرتا ہو اس کے منہ پر کہے۔ اگر اس کا حال صادق حال ہے تو اس کی نصیحت پر اس سے محبت کرے گا اور اگر اس نے اسے پسند نہ کیا اور ناپسندیدگی ظاہر کی تو یہ بات اس کے کذبِ حال کی علامت ہوگی اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے کاذبین کا وصف بتایا اور فرمایا؛

وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۔ (اور لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے)

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں،

"مجھے سب لوگوں سے محبوب ترین وُہ ہے کہ جو میرے عیوب میرے پاس بھیجے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے بھائیوں کو یہی حکم دیا کرتے اور فرماتے:

"اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو اپنے بھائی کو اس کے نفس کے عیوب بتائے۔" مگر مسعود بن کدام سے پُوچھا گیا؛

"جو آپ کو آپ کے عیوب سے آگاہ کرے کیا آپ اس سے محبت رکھیں گے؟"

فرمایا، "اگر اس نے مجھے تنہائی میں نصیحت کی کہ میں اور وُہ ہو تو ہاں! اور اگر اس نے لوگوں کے سامنے مجھے سرزنش کی تو نہیں۔"

سلف صالحین کا طریقہ تھا کہ جب وہ اپنے کسی بھائی کی کوئی ناپسندیدہ حرکت دیکھے تو تنہائی میں اسے نصیحت کرتے یا اسے ایک مکتوب کی صورت میں لکھتے اور حقیقت ہے کہ نصیحت اور فضیحت میں بھی فرق ہے اور اللہ کی خاطر صحت نیت بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ اسی طرح عتاب اور توبیخ میں بھی فرق ہے۔

عتاب وُہ ہے جو خلوت میں کیا جائے اور توبیخ ہمیشہ جماعت میں کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک ایمان دار پر اپنی رحمت میں الگ کر کے اور اس پر پردہ ڈال دے گا اور پوشیدہ طور پر عتاب کرے گا اور اس پر پردہ ڈال دے گا اور پھر اسے گناہوں پر آگاہ کرے گا۔ بعض کے سربمہر اعمال نامے فرشتوں کو دیے جائیں گے اور وُہ انہیں گھیرے ہوں گے اور جنت میں لے جاتے ہوں گے۔ جب جنت میں داخل ہونے کے قریب پہنچیں گے تو انہیں سربمہر اعمال نامے دیے جائیں گے اور وُہ انہیں پڑھیں گے۔

اور جن پر توبیخ ہوگی انہیں سب لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا۔ چنانچہ ان کی رسوائی تمام اہل محشر کے سامنے ہوگی اور ان کے عذاب میں اضافہ ہوگا۔ اسی طرح مدارات اور مداہنت میں فرق ہے۔

مدارات یہ ہے کہ تو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت چاہیے کہ فرض ادا کر دے اور مقصود یہ ہو کہ تیرا بھائی گناہوں سے بچ جائے اور اس کی قلبی اصلاح ہو جائے۔ یہ سب اللہ کے لیے چاہتے ہو اور مداہنت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تو دنیا چاہے اور نفسانی مزہ کی خاطر ایک کام کرے۔ اسی طرح غبطہ اور حسد کے درمیان فرق ہے۔ غبطہ (رشک) یہ ہے کہ جو انعام تو اپنے بھائی پر دیکھے وُہ اپنے لیے بھی چاہے اور یہ نہ چاہے کہ اس سے یہ انعام ختم کر دیا جائے بلکہ تیری چاہت یہ ہو کہ یہ انعام اس پر بھی باقی رہے اور کامل رہے مگر مجھے بھی عطا ہو اور حسد کا مطلب یہ ہے کہ جو انعام تیرے بھائی کے پاس ہے وہ تو اس سے لینا چاہے اور تو یہ بھی چاہے کہ اس کے پاس انعام نہ رہے بلکہ وُہ محروم ہو جائے اور سب مجھے ہی مل جائے۔ یہ مکروہ چاہت ہے اور اگر تو نے فعل یا قول کے ذریعہ ایسی حرکت کی تو حسد سے بڑھ کر زیادتی اور ستم بن جائے گی اور یہ ایک کبیرہ گناہ ہے۔ اسی طرح فراست اور بدظنی کے درمیان فرق ہے۔ فراست یہ ہے کہ تو نے کسی دلیل یا ظاہر ہونیوالی علامت سے اپنے بھائی کے اندر کسی غلطی یا بُرائی کا اندازہ کر لیا۔ مگر اس کو ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی اس کے بُرا ہونے کا حکم لگایا اور نہ قطعیت کے ساتھ اسے بُرا قرار دیا اور اگر ایسا کیا تو گناہ ہوگا۔ اور بدظنی یہ ہے کہ تو نے غلط رائے سے یا بغض و کینہ کی وجہ سے یا کسی بدنیتی کی وجہ سے یا اپنے خبث باطن کی وجہ سے جس سے تو آگاہ بھی ہے اپنے بھائی پر بدظنی کی اور اپنے بھائی کو ایسا ایسا قرار دیا۔ یہ بدظنی اور گناہ ہے۔ یہ ایک قلبی غیبت ہے جو حرام ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے مومن کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت کو حرام کر دیا۔" (واجب الاحترام کر دیا) اور اس پر

بدظنی رکھنا بھی حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"بدظنی سے بچو، اس لیے کہ یہ سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔" یہ پانچ مفاہیم اور ان کے اضداد ہیں۔ اور علماء کے نزدیک ان کے درمیان فرق ہے۔ خوب سمجھ لو۔

پردہ داری کا حکم

انسان کو چاہیے کہ جان، مال، زبان، قلب اور افعال کے ذریعہ سے اپنے بھائی کی مدد کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ان چار مفاہیم پر ہی مدد دی جاتی ہے:

۱۔ اگر افعال میں مدد کی ضرورت ہو تو نفس (جسم) کے ذریعہ مدد کرے۔

۲۔ اگر کلام میں اس پر ظلم کیا جائے تو زبان سے اس کی مدد کرے۔

۳۔ اگر مال کی ضرورت ہو تو مال دے کر اس کی غمخواری کرے۔

۴۔ اور کم از کم قلبی طور پر اس کی مدد کرے کہ حسنِ نیت اور سلامتیٔ عقیدہ میں غم و کرب میں اس کی مدد کرے۔ اور اس پر یہ بھی لازم ہے کہ غیر حاضری میں اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ اس کی تعریف کرے۔ اس کی فضیلت بیان کرے۔ اس کی لغزشوں پر پردہ ڈالے اور اس کے عذر قبول کرے۔

کہا کرتے ہیں کہ ہر آدمی کی کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں ہوتی ہیں جس کی خوبیاں ظاہر ہوں اور برائیوں پر غالب آجائیں وہ مومن مقتصد ہے۔ ایک شفیق اور کریم آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے بھائی کی اچھائیاں ذکر کرے، اور کمینے منافق کا کام یہ ہے کہ وہ برائیاں اچھالتا رہے۔

حدیث میں ہے:

"ایسے بُرے پڑوسی سے اللہ کی پناہ مانگو کہ اگر وہ نیکی دیکھے تو اسے چھپا دے اور اگر وہ بُرائی دیکھے تو اسے ظاہر کر دے۔"

اسی مفہوم کی وجہ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بعض بیان سحر ہوتے ہیں۔" اس لیے کہ جس حدیث کے آخر میں کسی سبب کا ذکر ہوگا۔ اس حدیث کی تخریج اس پر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی مذمت کی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کل گزشتہ تو ہی اس کی تعریف کر رہا تھا اور آج اس کی مذمت کر رہے ہو؟"

اس نے کہا:

"اللہ کی قسم! میں نے کل گزشتہ اس کے بارے میں سچ کہا اور آج بھی اس کے بارے میں جھوٹ نہیں کہا۔

کل گزشتہ اس نے مجھے راضی کیا تو اپنے علم کے مطابق میں نے بہتر بات کہی اور آج اس نے مجھے غضبناک کیا تو اپنے علم کے مطابق میں نے اس کی برائی بیان کی"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا:

"بعض کلام جادو ہوتے ہیں"۔ گویا آپؐ نے اسے جادو سے تشبیہ دے کر اسے ناپسند کیا۔ اس لیے کہ جادو حرام ہے"۔

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بے ہودہ کلامی اور بیان، نفاق کی دو شاخیں ہیں"۔

ایک حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بیان، سارے بیان کو ناپسند کیا"۔ (یعنی بنا بنا کر باتیں کرنے اور تو ضیحات کے شوق میں تکبر و تعالیٰ اور مبالغہ آرائی کو ناپسند کیا)

وصفِ عدالت میں امام شافعیؒ کا قول علماء نے بہت ہی پسند کیا ہے۔ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم نے بتایا کہ میں نے امام شافعیؒ کو یہ فرماتے سنا:

"ہر آدمی ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کرتا رہے اور نافرمانی نہ کرے اور ہر آدمی ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہی کرتا رہے اور اطاعت نہ کرے۔ اب جس کی نیکیاں، اس کی برائیوں سے بڑھ گئیں تو یہ عدل ہے"۔

ابن عبدالحکمؒ نے فرمایا:

"یہ حذاق کا کلام ہے۔ بسط و انقباض میں بھی ان کا قولِ فیصل ہے"۔

فرمایا: "لوگوں سے ان کی عداوت کے باعث انقباض آتا ہے اور برے ساتھیوں کی وجہ سے ان سے انبساط چھن چکا ہے۔ اب انقباض اور انبساط کے درمیان رہو"۔

اہل ایمان کا وصف اللہ تعالیٰ نے رحمت و صبر کے ساتھ بیان کیا۔ فرمایا:

وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ (اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو رحم کھانے کی وصیت کرتے رہے)

اور تواضع کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ۔ (نرم دل ہیں مسلمانوں پر، زبردست ہیں کافروں پر)

فرمایا:

رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ۔ (آپس میں بہت رحم دل ہیں)

اور یہ بات اس کے اہتمام میں داخل ہے اور صداقت میں حقیقی صدق یہی ہے جیسے کہ فرمایا:

وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ یعنی ھمیم۔

یہ اہتمام سے ہے یعنی اس کا اہتمام کرنے والا دوست نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اصحابؓ کو فرمایا:

"جب تمہارا بھائی سو رہا ہو اور اس کا کپڑا اس سے کھل جائے اور تم اسے دیکھ لو تو کیا کرتے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا:

"ہم اسے ڈھانپ دیتے ہیں اور پردہ کر دیتے ہیں۔"

فرمایا: "بلکہ تم اس کا پردہ کھولتے ہو۔"

انہوں نے عرض کیا:

"سبحان اللہ! یہ کون کرے گا؟"

فرمایا: "تم میں سے ایک آدمی اپنے بھائی کے بارے میں ایک بات سنتا ہے تو اس میں اضافہ کر کے اسے پھیلاتا ہے۔"

یہ بات قلب و نفس میں مخفی حسد و کینہ کی وجہ سے ہے کہ آدمی ایک چیز سن کر اس میں اضافہ کر لے یا ویسی بات گھڑ لے تو یہ کینہ ظاہر ہوتا ہے اور اہل ایمان نے اسی بات سے پناہ چاہی جیسے کہ کتابِ الٰہی میں ہے:

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا۔ (اور نہ رکھ ہمارے دل میں دشمنی ایمان والوں کی)

مزید برآں کسی معاملہ میں بھائی سے اختلافات کا دروازہ نہ کھولے اور نہ کسی مقصود میں اس پر معترض ہو۔

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"جب ایک بھائی، اپنے بھائی سے کہے: "اٹھو ہمارے ساتھ" تو وہ کہے: "کہاں چلیں؟" تو اس کی مصاحبت مت کرو۔"

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جب وہ تمہیں کہے: "مجھے اپنا مال دو" تو وہ کہے: کتنا چاہتے ہیں؟ یا اس سے کیا کرو گے؟" تو اس نے اخوت کا حق قائم نہیں رکھا۔"

بھائی کی امداد

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"میرا ایک بھائی عراق میں رہتا تھا۔ میں گاہے گاہے اس سے ملنے جایا کرتا اور کہا کرتا:

"اپنے مال میں سے مجھے کچھ دو۔" وہ میرے سامنے تھیلی کر دیتا اور میں اپنی مرضی سے جس قدر چاہتا لے لیتا۔
ایک روز میں اس کے پاس آیا تو میں نے کہا،

"مجھے کچھ ضرورت ہے۔"

اس نے کہا،

"کس قدر ضرورت ہے؟"

اس جملہ پر میرے دل سے اخوت کی حلاوت ختم ہو گئی۔

حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو حریرہؓ اپنے مال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے بھائی سے زیادہ ان کے درہم و دینار کا کوئی زیادہ مستحق نہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دُوسرے سے دشمنی و اختلاف نہ رکھو اور باہم حسد نہ کرو اور نہ ہی باہم قطع تعلق کرو اور اللہ کے بندے، بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے محروم کرتا ہے اور نہ ہی اسے ذلیل کرتا ہے۔ آدمی کی یہی برائی کافی ہے کہ وُہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے لوگوں سے معاملہ کیا تو ان پر ظلم نہ کیا۔ ان سے بات کی تو ان سے جھوٹ نہیں بولا۔ ان سے وعدہ کیا تو وعدہ نہیں توڑا۔ وہ ان لوگوں سے ہے جن کی مروت کامل ہے اور جن کی عدالت ظاہر ہے اور اس کی اخوت لازم ہے اور اس کی غیبت حرام ہے۔"

ابو اسامہ باہلیؓ کی حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم جھگڑ رہے تھے۔ آپؐ غضبناک ہوئے اور فرمایا:

"نزاع کرنا چھوڑ دو، اس کے لیے اس میں بھلائی کم ہے۔ نزاع چھوڑ دو اس لیے کہ اس کا فائدہ کم ہے اور یہ بھائیوں کے درمیان عداوت بھڑکاتا ہے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

"جس نے بھائیوں پر ملامت کی اور ان سے جھگڑا کیا اس کی کرامت و عزت کم بلکہ ناپید ہو گئی۔"

حضرت عبداللہ بن حسنؒ فرماتے ہیں کہ

"لوگوں کی دشمنی سے دُور رہو، اس لیے کہ ایک بُردبار کے فریب یا کمینے آدمی کے اچانک (حملے) کو

تو معدوم نہیں جان سکتا۔"

ایک حکیم" کا قول ہے:

"مخفی کینے کے مقابلہ میں ظاہری عتاب بہتر ہے اور کینے کا مزہ یہی ہے کہ وحشت و نفرت میں اضافہ ہو گا۔"

بھائیوں سے کینہ رکھنے کے بارے میں ایک سخت کلام مروی ہے کہ عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر نے اپنے والد سے نقل کیا کہ میں یمن میں تھا اور میرا ایک یہودی پڑوسی تھا۔ وہ مجھے تورات کی باتیں بتایا کرتا۔ ایک دن ایک مسافر یہودی آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر ایک نبی مبعوث فرمایا ہے اور اس نے ہمیں اسلام کی دعوت دی۔ ہم نے اسلام قبول کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے ہم پر تورات کی تصدیق کرنے والی کتاب نازل فرمائی۔

یہودی نے کہا:

"تم نے سچ کہا مگر تم پر جو نازل ہوا۔ اس کی تم لوگ تاب نہیں رکھتے، ہم اس نبی کی اور اس کی امت کی صفت (تورات میں) پاتے ہیں کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ علم رکھتا ہو اور گھر کی چوکھٹ سے نکلے تو اس کے دل میں اپنے مسلمان بھائی کے خلاف، ناراضگی ہو۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"سب لوگوں سے عاجز تر وہ ہے جو بھائیوں کی تلاش میں کوتاہی کرے اور اس سے بھی عاجز تر وہ ہے جو کسی بھائی کو حاصل کر کے کھو بیٹھے۔"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں:

"ایک ہزار آدمی کی الفت، لے کر بھی ایک آدمی کی عداوت نہ خریدو۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان ہے:

"اپنی ضرورت کی بناء پر دوستی و محبت سے بچو کہ جب ضرورت پوری ہو جائے تو محبت بھی ختم ہو جائے۔"

سلف کے اخلاق یہ تھے۔ فرمایا:

ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ کہتا کہ میرے کپڑے میں جو کچھ ہے وہ میرا ہے بلکہ جس کو بھی ضرورت ہوتی وہی بے کھٹکے استعمال کر لیا کرتا، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا یہی وصف بتایا:

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (اور ان کا معاملہ باہم مشورہ سے ہے)

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (اور جو ہم نے انہیں روزی دی اس سے خرچ کرتے ہیں)

امرھم کا معنی ہے امورھم۔ اور ایک چیز کی طرح ان سب کو واحد کے لفظ میں ذکر کیا۔

بینھم شوریٰ کا مطلب یہ ہے کہ باہم تقسیم نہیں اور ایک ہی ملکیت نہیں بلکہ سب اس میں حصّہ دار اور برابر کے شریک ہیں۔ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ یعنی اموال میں سب کا اختلاط و شرکت ہے اور شرکت کے باعث ایک دُوسرے کے کجاوہ کا امتیاز نہ ہو سکتا۔

عتبہؒ ایک آدمی کے گھر گیا جس سے انہوں نے اخوت قائم کر رکھی تھی۔ کہا:

"مجھے تیرے مال سے چار ہزار کی ضرورت ہے۔"

اس نے کہا،

"دو ہزار لے لیں"۔ انہوں نے چہرہ پھیر لیا اور فرمایا،

"تم نے اللہ تعالیٰ پر دنیا کو ترجیح دی، تمہیں حیاء نہیں کہ حب فی اللہ کا دعویٰ کرتا ہے اور ایسی بات کرتا ہے؟"

حضرت فتح موصلیؒ اپنے ایک بھائی کے گھر تشریف لے گئے وُہ موجود نہ تھے۔ انہوں نے اس کی بیوی سے کہا اس نے ان کا صندوق کھول نکالا۔ حضرت فتح موصلیؒ نے اسے کھول کر ان کی تھیلی سے اپنی حاجت کے مطابق لیا۔ لونڈی اپنے آقا کے پاس گئی اور یہ واقعہ بتایا تو اس نے کہا،

"اگر تو سچی ہے تو تُو اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزاد ہے۔ یعنی اس کام پر مسرور ہو کر اسے آزاد کر دیا۔"

حضرت ابن ابی شبرمہؒ نے اپنے ایک بھائی کی بہت بڑی ضرورت پوُری کی۔ وُہ آدمی ایک بہت بڑا ہدیہ لے کر حاضر ہُوا تو انہوں نے فرمایا:

"یہ کیا چیز ہے؟"

اس نے کہا:

"جو آپ نے مجھ پر احسان کیا۔"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ تجھے عافیت دے۔ اپنا مال اٹھاؤ۔ جب تو اپنے کسی بھائی سے کوئی ضرورت پوری کرنے کو کہے اور وہ اس سلسلہ میں پوُری جد و جہد نہ کرے تو نماز والا وضو کر اور اس پر چار تکبیراتِ (جنازہ) کہہ دے اور اسے مُردوں میں شمار کر۔ اس پر بعض کا فرمان ہے، جب تو نے اپنے بھائی سے ایک ضرورت پوُری کرنے کے لیے کہا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر اسے پورا نہ کیا۔ اسے دوبارہ یاد کراؤ شاید وُہ بھُول چکا ہو۔ اگر پوُری نہ کرے تو تیسری بار کہو، ہو سکتا ہے کسی عذر کی وجہ سے اسے غفلت ہو گئی ہو۔ اگر اب بھی پوُری نہ کرے تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھ کر یہ آیت پڑھو:

وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ۔

بھائی سے کیسا سلوک کرے؟

حضرت میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں:
"جو اپنے بھائی پر ترکِ نوازشات میں راضی ہُوا۔ اسے چاہیے کہ قبروں والوں سے مواخات کرے۔"

ایک آدمی حضرت ابوہریرہؓ کے پاس حاضر ہُوا اور کہا:
"میں اللہ عزوجل کی خاطر آپ سے مواخات قائم کرنا چاہتا ہُوں۔"
آپؓ نے فرمایا:
"جانتے ہو، اخوت کا حق کیا ہے؟"
اس نے کہا: "آپ بتا دیں؟"
فرمایا: "تیرے درہم و دینار کا مجھ سے زیادہ کوئی حق دار نہیں ہو گا۔"
اس نے کہا: "ابھی میں اس درجہ کو نہیں پہنچا۔"
فرمایا: "پھر جاؤ۔"

حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی سے پُوچھا:
"کیا تم میں سے کوئی آدمی ایسا ہے کہ دُوسرے بھائی کی آستین یا تھیلی میں ہاتھ ڈالے اور بغیر اجازت کے جو چاہے لے لے؟"
اس نے کہا: "نہیں۔"
فرمایا: "پھر تم بھائی بھائی نہیں ہو۔"

حضرت حسنؒ کے پاس کچھ لوگ آئے اور انھوں نے حضرت حسنؒ سے پُوچھا:
"اے ابوسعید، آپ نے نماز پڑھ لی؟"
فرمایا: "ہاں۔"
انھوں نے کہا: "بازار والوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی۔"
فرمایا: "بازار والوں سے دین کون لیتا ہے؟ مجھے تو یہ معلوم ہُوا ہے کہ وہ اپنے بھائی سے ایک درہم بھی روک لیا کرتے ہیں۔"

محمد بن نصرؒ فرماتے ہیں:
"ایک آدمی حضرتِ ابراہیمؒ بن ادھم کے پاس آیا۔ اس کا بیت المقدس جانے کا ارادہ تھا۔ اس نے ان سے کہا: میں آپ کا رفیق بننا چاہتا ہُوں۔"

حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا:

"اس شرط پر کہ تیری چیز کا میں زیادہ مالک ہوں گا۔"

اس نے کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "مجھے تیرے صدقِ (رفاقت) پر تعجب ہے۔"

موسیٰ بن طریف بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے جب کوئی آدمی رفاقت کرتا تو اس کی مخالفت نہ کرتے۔ اور جو ناموافق آدمی ہوتا اس سے رفاقت نہ کرتے۔

بتاتے ہیں کہ سفر میں ایک گھسیارا ان کا ہم سفر بنا اس نے ابراہیمؒ کو کسی مقام پر جاکر ثرید کا ایک پیالہ ہدیہ میں پیش کیا جب انہوں نے پیالہ واپس کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنے ساتھی کی بوری کھولی اور گھانس کی ایک مٹھی نکال کر اس پیالے میں رکھ دی پھر اور ہدیہ دینے والے کو دے دیا۔ جب ان کا ساتھی آیا تو اس نے پوچھا: کہا

"ثرید کا جو پیالہ آپ نے کھایا تھا وُہ کیا چیز ہے؟"

فرمایا: "تو اسے تین بار دو شراک دے رہا ہے۔"

دونوں نے کہا:

"درگزر کرو، درگزر ہو گا۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے ایک آدمی کو پیدل دیکھا تو اپنے اس ساتھی کا گدھا بغیر اجازت کے اس پیدل کو دے دیا۔ جب ان کا رفیق آیا تو خاموش رہا اور بُرا نہیں مانا۔

عون بن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

کسی آدمی سے اپنی محبت کے بارے میں نہ پوچھ بلکہ اپنے دل کو دیکھ کہ تیرے دل میں اس کے لیے جیسے محبت ہے ویسی اس کے دل میں تیرے لیے ہے۔

حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰنؒ نے فرمایا:

حضر کی مروت یہ ہے کہ مساجد کی طرف جایا کرے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر کثرت سے بھائی ہوں اور سفر کی مروت یہ ہے کہ زاد راہ خرچ کرے اور بھائیوں سے اختلاف کم کر دے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل بیت کی سند کے ساتھ مروی ہے:

"حضر کی مروت تین باتیں ہیں:

کتاب اللہ کی تلاوت، مساجد کو آباد کرنا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر مواخات قائم کرنا۔" اور جس نے اللہ کی خاطر مواخات کو افضلیت دی اس نے اس کے ساتھ تلاوتِ کتاب اور آبادیٔ مساجد کو ملا دیا اور مساجد کی طرف

کثرت سے جاما بھائی حاصل کرنے کا باعث قرار دیا۔

حضرت ابن عباس اور حسن بن علی رضی اللہ عنہم کی حدیث میں ہے:

"جس نے مسجد کی طرف دوام رکھا اسے پانچ میں سے ایک بات یہ حاصل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر فائدہ مند بھائی ملا" حضرت ابو عنیبہ نے فرمایا اور یہ شعر پڑھا:

وَجَدْتُ مُصِيبَاتِ الزَّمَانِ جَمِيعَهَا
سِوَى فُرْقَةِ الْإِخْوَانِ هَيِّنَةَ الْخَطْبِ

(میں نے بھائیوں کے فراق کے سوا تمام مصائب کو آسان و سہل پایا)

فرمایا: "میں نے ایسی اقوام کا زمانہ پایا کہ ان سے جدا ہوئے تیس برس گزر گئے مگر قلب ان کے افسوس نکل جانے کا خیال تک نہیں لا سکا۔"

بعض کا فرمان ہے:

"معاصرین کی موت نے جس قدر مجھے کمزور اور بوڑھا کیا اسی قدر کسی چیز نے مجھے کمزور نہیں کیا۔" کہا کرتے ہیں: "جب ایک آدمی کا دوست فوت ہو تو اس کا ایک عضو جاتا رہا اور عتبی سے یہ اشعار مروی ہیں:

وَلَقَدْ بَلَوْتُ النَّاسَ ثُمَّ خَبَرْتُهُمْ ۔ وَصَلْتُ مَا قَطَعُوا مِنَ الْأَسْبَابِ
فَإِذَا الْقَرَابَةُ لَا تُقَرِّبُ قَاطِعاً ۔ وَإِذَا الْمَوَدَّةُ أَقْرَبُ الْأَنْسَابِ

(میں نے لوگوں کا امتحان لیا اور ان کی خبر معلوم کی اور جو اسباب انہوں نے کاٹے میں نے جوڑ دیئے)
(دیکھا تو قطع کرنے والے کو قرابت قریب نہیں کرتی اور دوستی ہی قریب ترین نسب ہے)

بتاتے ہیں کہ دو بھائی بنے ہوئے تھے ان میں سے ایک کسی کی خواہش میں مبتلا ہو گیا اور اس نے دوسرے بھائی کو اپنا حال کہہ سنایا اور کہا:

"مجھے خواہش نفس کا مرض لگ گیا۔ اگر چاہو تو اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت نہ رکھو تو کر لو۔"

اس نے کہا:

"میں تیرے گناہ کی وجہ سے کبھی بھی تیری محبت فی اللہ ختم نہیں کروں گا۔" پھر اس کے بھائی نے اپنے اور اللہ کے درمیان عہد کر لیا کہ وہ تب تک نہ کھائے گا اور نہ پیئے گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس خواہش سے عافیت نہ عطا کر دے۔" بتاتے ہیں کہ چالیس روز گزر گئے اور اس نے کھانا پینا ترک کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے بھائی کی عافیت کی دعا کرتا رہا اور پوچھا: "کیسے ہو؟"

اس نے کہا،

"دل اس حال پر ہے۔"

بتاتے ہیں کہ اس کا بھائی کمزور اور نحیف ہوتا گیا۔ غم سے نقاہت شدت کو پہنچی اور موت نظر آنے لگی آخر چالیس روز کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو عافیت عطا کی۔ اس نے بھائی کو بتایا کہ اب عافیت ہے پھر جا کر اس نے کھایا اور پیا۔

اسی مفہوم میں سلف کے بارے میں منقول ہے کہ دو آدمیوں کی اخوت تھی۔ ان میں ایک کی حالتِ استقامت بدل گئی لوگوں نے پرہیزگار کو کہا کہ اس بھائی کو چھوڑ دو۔

اس نے جواب دیا،

"اس وقت یہ میری امداد کا زیادہ مستحق ہے۔ یہ لغزش کھا چکا۔ مجھے چاہیے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ اس پر نرمی سے عتاب کروں اور اس کے لیے دوبارہ پہلی حالت پر آنے کی دعا کروں۔"

اسرائیلیات میں منقول ہے:

"دو عبادت گزار آدمیوں اخوت تھی اور ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے تھے۔ ان میں ایک باہر آیا تاکہ شہر سے ایک درہم کا گوشت خریدے۔ اس نے گوشت والے کے پاس ایک معصیت کی مجلس دیکھی تو اس میں داخل ہو کر وہیں رہ گیا۔ اور تین روز اس گناہ کی مجلس میں رہا۔ اب اسے گناہ کی وجہ سے اپنے بھائی کے پاس جانے سے شرم آئی۔ دوسرے بھائی نے جب اسے گم پایا تو اسے اس کی فکر ہوئی۔ وہ شہر میں آیا اور اس کے بارے میں پوچھتا پوچھتا پھرتا رہا۔ آخر اسے اس گناہ کی مجلس میں بیٹھے پکڑ لیا۔ اس سے لپٹ کر چومنے لگا۔ دوسرے نے انکار کیا اور کہا کہ میں تجھے نہیں پہچانتا۔ تو کون آدمی ہے۔ دراصل شرم کی وجہ سے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: "میرے بھائی اٹھو، مجھے تیری حالت کا علم ہو گیا اور آج کے دن اور اس گھڑی میں تو مجھے سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ چھوڑنے والا نہیں تو اٹھا اور اس کے ہمراہ چلا گیا۔ یہ دراصل اس کی حسنِ نیت کا پھل تھا اور آداب و مروت والے بھائیوں کا یہی کام ہے اور اگر دوسرے بھائی کی عطا کو یہ اسی پر ایثار کرنا چاہے اور ہدیہ کی واپسی اور ادائیگی مراد نہ ہو تو بہتر ہے۔

حضرت سعد بن ربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو مال و جان عطا کیا تو انہوں نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ یہ دونوں تجھے مبارک کرے۔" چنانچہ انہوں نے جو ان پر ایثار کیا انہوں نے ان پر ایثار کر دیا۔ گویا اس کو نئے سرے سے ہبہ دیا۔ اس لیے کہ انہوں نے سخاوتِ نفس، حقیقی زہد، صدقِ محبت کی وجہ سے انہیں اس مال کا مالک بنا دیا تھا۔ اب حضرت سعدؓ کو مساوات حاصل ہو گئی اور ایثار عبدالرحمٰنؓ کو حاصل ہوا چنانچہ

اس پر اضافہ کر دیا اور انصار پر مہاجرین کی یہ فضیلت ہے۔ اس لیے کہ مساوات کا درجہ ایثار سے کم ہے۔

معتمر بن عیسیٰؒ اور سلیمانؒ فرماتے ہیں:

"جس نے ایک آدمی سے محبت کی، پھر اس کے حق میں کوتاہی کی وہ اپنی محبت میں جھوٹا ہے۔"

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں:

"وہ محبت میں سچا ہے مگر حق میں تفریط کرنے والا ہے"۔ پھر فرمایا:

"اگر میں ساری دنیا کا مالک بن جاؤں اور ساری دنیا کو اپنے بھائی کے منہ میں دے دوں پھر بھی اسے کم سمجھوں گا کہ میں نے کم مدد کی۔" اور فرمایا:

"میں اپنے ایک بھائی کو نوالہ کھلاتا ہوں تو اس کا ذائقہ اپنے حلق میں محسوس کرتا ہوں۔"

یاد رکھو بھائیوں کو کھلانا اور ان پر مال خرچ کرنا دوسرے لوگوں پر صدقہ کرنے اور اجنبی لوگوں کو عطا کرنے سے کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یہ ایسے ہے کہ جیسے کہ اہل و عیال اور اقربا پر خرچ کرنا کئی گنا اجر کا باعث ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"میرے نزدیک اپنے برادر فی اللہ کو بیس درہم دینا دوسرے مساکین پر دو سو درہم خرچ کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

نیز فرمایا:

"میں اپنے بھائیوں کو جمع کر کے انہیں کھانا کھلاؤں۔ یہ بات مجھے ایک غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔"

ایک حکیمؒ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی:

"اے بیٹے! دشمنوں کے درمیان دخل کر لینا اور دوستوں کے درمیان ہرگز دخل نہ دینا۔"

اس نے کہا: "وہ کیسے؟"

کہا: "دشمنوں کے درمیان دخل سے صداقت و دوستی ملتی ہے اور احباب کے درمیان دخل سے عداوت ملتی ہے۔"

ایک بھائی کو اپنے بھائی کی غیر حاضری میں اس سے خیانت نہ کرنی چاہیے۔ جب کہ یہ مباح چیز کے بارے میں کراہت کا کام ہو۔ اور اگر اس کے علم کے مطابق وہ کوئی غیر مناسب کام کرے تو اس پر انکار نہ کرے۔ بشرطیکہ اس کا بھائی زیادہ عالم ہو یا کوئی توجیہ موجود ہو۔

اخفائے راز کسی معاملہ میں بھائی کے سامنے جھوٹ نہ بولے اور اس کا راز ہرگز نہ کھولے۔ اس کی غیبت اور چغلی نہ کرے اور اسے مدارات پر مجبور نہ کرے۔ اسے عذر پیش کرنے پر بھی مجبور نہ کرے۔ اسے ایسی بات کا حکم نہ کرے کہ اس پر کلفت اور مشقت بن جائے یا وہ اسے ناپسند کرتا ہو۔

حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے کو کہا:

"میں اس آدمی یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھتا ہوں کہ وہ بڑوں پر آپ کو مقدم رکھتا ہے اور ان سے زیادہ آپ کو قرب بخشتے ہیں۔ اس لیے مجھ سے تین باتیں یاد رکھو، ان کا کوئی راز ہرگز نہ کھولنا، ان کے سامنے کسی کی غیبت ہرگز نہ کرنا اور انہیں تیرے جھوٹ کا کبھی تجربہ نہ ہونے پائے۔"

ایک روایت میں ہے کہ:

"اور کسی معاملہ میں ان کی نافرمانی نہ کرنا اور انہیں تیری کسی خیانت پر اطلاع نہ ہو۔"

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے شعبیؒ کو بتایا، انہوں نے یہ روایت کیا:

"ہر کلمہ ایک ہزار سے بہتر ہے"

انہوں نے فرمایا:

"ہر کلمہ دس ہزار روپیہ سے بہتر ہے۔"

ایک بھائی نے اپنے بھائی کو ایک راز بتایا، پھر پوچھا:

"یاد ہوا؟"

کہا: "بلکہ بھول گیا۔"

ایک نبی علیہ السلام سے کسی نے پوچھا:

"آپ راز کی حفاظت کیسے کرتے ہیں؟"

فرمایا: "میں مخبر کا انکار کرتا ہوں اور خبر چاہنے والے کے سامنے حلف اٹھاتا ہوں (یعنی خبر اور مخبر کے بارے میں کچھ بتانے سے بھی صاف انکار کر دیتا ہوں۔"

اخفائے راز کے بارے میں ایک قول بہت ہی عمدہ ہے۔ ہمارے ایک شیخ نے اپنے ایک بھائی سے نقل کیا کہ وہ عبداللہ بن معتز سے حفاظتِ راز کے بارے شعر سنانے کے لیے کہا تو انھوں نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے:

وَمُسْتَوْدِعِیْ سِرًّا تَبَوَّأْتُ کَتْمَهٗ ۔۔۔ فَاَوْدَعْتُهٗ صَدْرِیْ فَصَارَ لَهٗ قَبْرًا

(اور میری جائے حفاظت راز ہے۔ اس کا اخفا ہی اقامت کر لیا۔ چنانچہ میں نے سینہ کو یہ امانت دی اور وہ اسکی قبر بن گیا)

فرمایا: "ہم ان کے پاس سے نکلے اور محمد بن داؤد اصفہانی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا:
"کہاں سے آ رہے ہیں؟"
ہم نے انہیں راز کے بارے میں ابن معتز کے اشعار سنائے۔ اس نے ہمیں ٹھہرایا اور تھوڑی دیر سر جھکایا اور فرمایا:

میرا کلام سنو:

وَ مَا السِّرُّ فِیْ صَدْرِیْ کَثَاوٍ بِقَبْرِہٖ ۔۔۔ لِاَنِّیْ اَرٰی الْمَقْبُوْرَ یَنْتَظِرُ النَّشْرَا
وَ لٰکِنَّنِیْ اَنْسَاہُ حَتّٰی کَاَنَّنِیْ ۔۔۔ بِمَا کَانَ مِنْہُ لَمْ اُحِطْ سَاعَۃً خُبْرًا
وَ لَوْ جَازَ کَتْمُ السِّرِّ بَیْنِیْ وَ بَیْنَہٗ ۔۔۔ عَنِ السِّرِّ وَالْاَحْشَاءِ لَمْ یَعْلَمِ السِّرَّا

(اور میرے سینہ میں راز، قبر میں مردہ کی طرح ہے۔ اس لیے کہ میں مُردے کو دوبارہ اُٹھنے کا منتظر دیکھتا ہوں)
(اور مگر میں اسے ایسے بھلاتا ہوں گویا مجھے اس کی ایک گھڑی بھی خبر نہ تھی)
(اور اگر مجھے اپنے باطن و انتڑیوں سے بھی راز چھپانے کی قدرت ہوتی تو وہ بھی رازداں نہ ہوتے۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
"بدترین دوست وہ ہے جو تجھے مدارات کا محتاج کر دے اور تجھے اعتذار کرنے پر مجبور کر دے۔"

نیز فرمایا:
"بدترین دوست وہ ہے جس کی خاطر تکلف کرنا پڑے۔"

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں:
"تکلف کی وجہ سے لوگوں میں انقطاع ہو گیا۔ ایک آدمی اپنے بھائی کی ملاقات کے لیے جاتا ہے تو وہ اس کے لیے ایسا تکلف و اہتمام کرتا ہے جو وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں اپنے لیے نہیں کرتے، وہ دوبارہ اس کے پاس آنے سے شرماتا ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:
"ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے، نہ اسے غمزدہ کرتا ہے اور نہ ہی شرمندہ (و غضبناک) کرتا ہے۔"
بھائیوں کے سامنے انبساط کے معاملہ میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ اگر وہ امام کی جانب سے منقول نہ ہوتے تو میں ان کا ذکر نہ کرتا۔

حارث بن محمد نے ابراہیم بن سعید جوہریؒ سے نقل کیا کہ ہشامؒ کو ایک قیمتی پوستین ہدیہ میں پیش کی گئی، فرمایا: "یہ سعید جوہریؒ کے پاس لے جاؤ اور اسے کہو، یہ پوستین ہے۔ ہشیم لایا، اسے اس کے لیے خرید لو۔"

بتاتے ہیں کہ وہ یہ لے کر اس کی طرف گیا اور اسے خریدا۔ پھر اسے ہشیم کے پاس بھیج دیا۔ اب یہ اور اس کے دراہم اسی کے ہو گئے۔

علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبل کا فرمان ہے:

"میرا دل چاہتا ہے کہ میں مکہ تک تیری رفاقت کروں مگر مجھے ڈر ہے کہ میں تیرے لیے باعثِ ملال نہ بن جاؤں یا تو میرے لیے باعثِ ملال نہ بن جائے۔" اس لیے کہ کہا کرتے ہیں:

"بھائیوں کا پُرملال ہونا اخلاقِ کریمانہ میں سے نہیں۔"

حضرت مکحولؒ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت حسنؓ سے کہا:

"میں مکہ جانا چاہتا ہوں۔" تو انہوں نے فرمایا:

"ایسے آدمی کی مصاحبت نہ کرنا کہ جو تجھ پر احسان کرتا ہو ورنہ تیرے اور اس کے درمیان تعلق ٹوٹ جائے گا۔"

حضرت ابو عمرو بن علاؒ فرماتے ہیں،

"دوست کے سوا ہر چیز سے صبر کرنا اچھی بات ہے۔"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی خاطر مواخات رکھنے والوں کو دن میں دو بار ملاقات مستحب ہے۔"

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں،

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ چلتے اور اگر کوئی چٹان یا ٹیلہ سامنے آجاتا اور اس کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے جُدا ہوئے۔ پھر اس کے بعد ملتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے۔"

حضرت حسنؒ اور ابو قلابہؒ کا فرمان ہے:

"یہ بات مروت کی نہیں کہ اپنے دوست پر نفع حاصل کرے۔"

ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:

"اپنے بھائی پر ایسا کرم و احسان نہ کر کہ اس پر بار بن جائے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا:

"دو بیٹھنے والے امانت کے ساتھ نشست کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں سے ایک کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی پر وہ ظاہر کرے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔"

حضرت ابن مبارکؒ سفر میں نکلے۔ ان کے ہمراہ کچھ لوگ ہو گئے۔ انہوں نے ان لوگوں سے فرمایا:

"اگر تم میں سے کوئی میری بُری بات دیکھے تو مجھے بتا دے۔ جب جُدا ہونے لگے تو انہوں نے پوچھا:

"کیا تم نے میری کوئی بُری بات دیکھی؟"

ایک نوجوان بولا: "میں نے"

پُوچھا: "تو نے کیا بُری بات دیکھی؟"

اس نے کہا،

"میں نے آپ کو مسواک کرتے نہیں دیکھا"

فرمایا، تیرا ناس ہو، کیا آدمی اپنے دوست کے سامنے مسواک کیا کرتا ہے۔"

دوست کی تعریف

حضرت بشر بن حارثؒ کا فرمان ہے،

"صرف خوش خلق آدمی سے ہی اختلاط رکھو۔ اس لیے کہ یہ بھلی بات ہی کرے گا، اور بدخلق سے اختلاط مت کرو۔ اس لیے کہ یہ بُری بات ہی کرے گا۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا،

"جس کو غصہ دلایا جائے اور اسے غصہ نہ آئے۔ وہ گدھا ہے اور جس کو راضی کیا جائے اور وہ راضی نہ ہو تو وہ شیطان ہے۔"

عمرو بن دینارؒ فرماتے ہیں،

"تجھے رغبت رکھنے والی میں تیرا زُہد، تیرے حصہ میں کمی ہے اور تجھ میں زاہد کے اندر تیری رغبت، ذلتِ نفس ہے۔"

حضرت ابن سیرینؒ فرماتے ہیں،

"آدمی اپنے بھائی کی ستر لغزشیں سہتا اور ان کا عذر تلاش کرتا ہے۔ اگر یہ کافی ہو تو ٹھیک ورنہ یُوں کہتا ہے۔ شاید میرے بھائی کا کوئی مجھ سے پوشیدہ عذر ہو۔"

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں،

"تو جس سے مواخات قائم کرنا چاہتا ہے اسے غصہ دلا دے۔ پھر کوئی آدمی اس سے تیرے بارے میں پُوچھے تو اس کی ٹوہ لگا۔ اگر وہ اچھی بات کرے تو اس کی مصاحبت اختیار کر لے۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں؛

"امتحان لیے بغیر کسی سے مواخات قائم نہ کرو۔ اس کے سامنے ایک راز کھول دو۔ پھر اس پر ستم کر کے اسے غصہ دلاؤ (ہلکا سا ستم دکھا کر غصہ دلاؤ) اب دیکھو۔ اگر وہ راز فاش کر دے تو اس سے بچ کر رہو۔"

ابُو یزیدؒ سے کسی نے پُوچھا؛

"میں کس آدمی سے مصاحبت کروں؟"

فرمایا: "جو تجھ سے ایسے آگاہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔ اور تیری ایسی پردہ پوشی کرے جیسے کہ اللہ تعالیٰ پردہ پوشی کرتا ہے۔ (یعنی ہر راز جاننے کے باوجود پردہ پوشی کرے)"

حضرت ذوالنون فرمایا کرتے،

"تیرے لیے اس کی مصاحبت میں کچھ بھلائی نہیں جو تجھے صرف معصوم ہی دیکھنا چاہتا ہے۔"

ایک عالم سے پوچھا گیا،

"کس آدمی سے مصاحبت رکھی جائے؟"

فرمایا: "جو تجھ سے تکلف کا بوجھ اٹھا دے اور تیرے اور اس کے درمیان تحفظ کی مشقت ختم کر دے۔"

حضرت جعفر بن محمد صادق فرمایا کرتے،

"مجھ پر وہ دوست بہت ہی بار ہے جو میرے لیے تکلف کرتا ہے اور میں اس سے تحفظ کرتا ہوں اور مجھ پر وہ دوست ہلکا پھلکا ہے کہ جو میرے ساتھ ایسے ہے جیسے کہ میں تنہائی میں ہوا کرتا ہوں۔" مطلب یہ ہے کہ جو بے تکلف نہ ہو۔ اس میں ریاء اور تصنع آجاتا ہے۔ اس طرح مصاحبت کی برکت اور اخوت کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے۔"

صوفیاء میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں،

"صرف اس کے ساتھ مصاحبت کر کہ نیکی کی وجہ سے اس کے نزدیک تیرا درجہ نہ بڑھے اور گناہ کے باعث تجھے کم درجہ نہ سمجھے۔ جب تو گناہ کرے تو تیری جانب سے وہ توبہ کرے اور جب تو برائی کے ساتھ پیش آئے تو تیرے سامنے معذرت کرے۔ اپنے آپ کی مشقت تجھ سے اٹھا رکھے اور تیرے لیے تیری اپنی مشقت ہی کافی جانے۔" اس دور میں ایسا دوست خال خال ہی ملتا ہے بلکہ ناپید ہی ہو گیا ہے جیسے کہ حضرت جنید کو ایک آدمی نے کہا:

"اس زمانہ میں اخوت فی اللہ ناپید ہو گئی۔"

وہ خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ یہی کہا۔ حضرت جنید نے فرمایا:

اگر تو اللہ تعالیٰ کی خاطر بھائی چاہتا ہے جو تیری مشقت اٹھائے اور تیری اذیت سہے تو یہ بہت کمیاب ہے اور اگر تو اللہ تعالیٰ کی خاطر ایسا بھائی چاہتا ہے کہ جس کی مشقت تو اٹھائے اور اس کی اذیت پہ صبر کرے تو میری ایک جماعت ہے اگر تو پسند کرے تو بتا دوں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ اپنے بھائی سے نفع حاصل کرنے کی خاطر اخوت قائم کرتا ہے تو یہ اپنے نفس کا

محب ہے۔ اخوت فی اللہ چاہنے والا نہیں اور اخوت صرف اذیت نہ دینے کا نام نہیں۔ اس لیے کہ اذیت نہ دینا واجب ہے بلکہ اخوت تو اذیت پر صبر کرنے کا نام ہے۔

صوفیاء حضرات چار مفاہیم میں استواری پر ہی مصاحبت روا رکھتے ہیں کہ ان میں کسی کو ایک دوسرے پر ترجیح نہ ہو اور کسی کو دوسرے پر اعتراض نہ ہو۔ اگر ان میں ایک آدمی سارا دن کھائے تو اس کا ساتھی یہ نہیں کہے گا کہ روزہ رکھ اور اگر ایک آدمی رات بھر عبادت کرتا رہے تو دوسرا اسے سونے کا مشورہ نہیں دے گا۔ اس کے نزدیک اس کے دونوں حال برابر ہیں۔ روزے اور قیامِ شب کی وجہ سے اس کا درجہ نہیں بڑھتا، افطار کرنے اور سوتے رہنے کی وجہ سے اس کا درجہ کم نہیں ہوتا۔ جب اس کے دل میں عمل کے باعث اس کا درجہ بڑھے اور ترکِ عمل پر درجہ کم ہو جائے تو ان کی دینی سلامتی اور ریاء کاری سے بچاؤ جدا رہنے میں ہے۔ نفسانی جبلت یہ ہے کہ تعریف کو پسند کرتا اور مذمت کو ناپسند کرتا ہے اور جس سے شہرت ملے اسے بڑھا کر پیش کرتا ہے اور جس سے شہرت ملے اسے بڑھا کر پیش کرتا ہے اور جو وصف لوگوں میں اچھا ہو اسے ہی ظاہر کرتا ہے۔ ایسے آدمی کے ساتھ مصاحبت کرنا صادقین اور مخلصین کی راہ و مقصود نہیں۔

ایسے لوگوں سے اجتناب برتنا ہی قلبی اصلاح اور عملی خلوص کے لیے فائدہ مند ہے۔ ان کی مصاحبت میں قلبی بگاڑ اور نقصِ حال کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ یہ ریاء کے اسباب ہیں اور ریاء، اعمال کو برباد کرتی ہے اس سے اصل زر ہی ختم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظروں میں انسان ذلیل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے،

"جس نے لوگوں سے مصاحبت کی اس نے ان کی مدارات کی اور جس نے ان کی مدارات کی اس نے ان کے سامنے ریاء دکھائی اور جس نے ریاء دکھائی وہ اس میں گرا جس میں وہ گرے اور جیسے وُہ ہلاک ہُوئے یہ بھی ہلاک ہُوا۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں،

"صرف اس آدمی سے مواخات قائم کر جو چار حالات میں تجھ پر متغیر نہ ہو،

۱۔ غصہ کے وقت

۲۔ رضا کے وقت

۳۔ لالچ کے وقت

۴۔ اور خواہشِ نفس کے وقت۔ اس لیے کہ ان مفاہیم کی خاطر طبائع میں تغیر آ جاتا ہے کیونکہ اس سے۔

نفس پر ضرر آتا ہے اور نفع ختم ہو جاتا ہے۔"

ایک ادیبؒ کا قول ہے:

"صرف اس آدمی سے مصاحبت رکھ جس میں یہ اوصاف ہوں:

۱۔ تیرا راز چھپائے اور تیری نیکی پھیلائے اور تیرا عیب لپیٹ دے اور مصائب میں تیرا ساتھی ہو، اور مرغوبات میں تجھ پر ایثار کرے۔ اگر ایسا دوست نہ ملے تو صرف اپنے آپ سے ہی مصاحبت رکھو اور اسی مفہوم میں ایک عالمؒ کے یہ اشعار مروی ہیں: ؎

وَ نَدْمَانُ آخِیْ ثِقَـةٌ	کَانَ حَدِیْثُهٗ خَـبْرُهٗ
یَسِرُّكَ حُسْنُ ظَاهِرِهٖ	وَ تَحْمَدُ مِنْهُ مُخْتَبِرُهٗ
فَسَاعِدْ خُلَّهٗ كَرَمًا	وَ فِیْ اَخْلَاقِهٖ اثِـرَهٗ
وَ یَطْوِیْ سُوْءَهٗ اَبَدًا	وَ حُسْنًا اِنْ طَوٰی نَشَـرَهٗ
وَ یَسْتُرُ عَیْبَ صَاحِبِهٖ	وَ یَسْتُرُ اٰتِهٖ سَتَرَهٗ
(اور میرے قابلِ اعتماد ساتھی۔	اس کی بات ایک واقعی خبر ہے)
(اس کا ظاہری حسن تجھے بھائے گا۔	اور اس کی دانش کی تو تعریف کرے گا)
(اس کی کریمانہ عادت کی موافقت کر۔	اور اس کے اخلاق میں اقتدار کر)
(اس کی برائی کو لپیٹ دے۔	اگر وہ لپیٹے تو اس کے حسن کو پھیلا)
(اور اپنے ساتھی کے عیوب پر پردہ ڈال۔	اور پردہ ڈالنے پر بھی پردہ ڈال دے)

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"دو میں سے ایک آدمی کی ہی مصاحبت کرو:

۱۔ وہ آدمی کہ جس سے تو کوئی دین کی بات سیکھے کہ تیرے لیے نفع بخش ہو۔

۲۔ وہ آدمی جس کو تو دین کی بات سکھائے اور وہ اسے قبول کرے اور تیسرے سے بھاگ جا۔"

ابن ابی حواریؒ بتاتے ہیں کہ مجھے میرے استاد ابو سلیمانؒ نے فرمایا:

"اے احمد! دو میں سے ایک آدمی ہی کی مصاحبت کرو:

۱۔ وہ آدمی کہ تو دنیا میں اس کی وجہ سے فراخی پائے۔

۲۔ وہ آدمی کہ تو اس کی وجہ سے آخرت میں فائدہ اور مزید انعام پائے۔" اور ان دو کے علاوہ کسی آدمی کی مصاحبت بہت بڑی حماقت ہے۔

ماموںؒ فرماتے ہیں کہ:

بھائی تین ہیں۔ ایک کی مثال غذا کی طرح ہے کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ دوسرے کی مثال دوا کی طرح ہے کہ ایک مقررہ وقت میں اس کی ضرورت ہوتی ہے اور تیسرے کی مثال بیماری کی طرح ہے کہ اس کی ضرورت نہیں اور بندے پر اس تیسرے کے ذریعہ ابتلاء آیا کرتا ہے اور یہی وہ بھائی ہے کہ جس میں کوئی انس و فائدہ نہیں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک نعمت ہے۔ اس میں الفت و انس ہے اور اس کے ساتھ فائدہ اور انعام ہے۔

حضرت ابوذرؓ فرمایا کرتے:

"بُرے ساتھی سے تنہائی بہتر ہے اور نیک ساتھی تنہائی سے بہتر ہے۔"

حضرت بشر بن حارثؒ فرماتے ہیں:

"آدمی کے تین بھائی ہوتے ہیں:

۱۔ آخرت کے لیے بھائی

۲۔ دنیا کے لیے بھائی

۳۔ انس حاصل کرنے کے لیے بھائی۔"

چنانچہ بتایا کہ گا ہے انس والا بھائی قرب والا اور عابد نہیں ہوتا اور انس مخصوص چیز ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ یہ صرف کریم آدمی میں ہی پایا جاتا ہے۔

یوسف بن اسباطؒ ایسے آدمی کو کمیاب قرار دیتے کہ جس میں انس پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کرتے:

"مصیصہ میں تین بھی ایسے نہیں ملتے کہ جن کے ساتھ انس حاصل کیا جا سکتا ہو۔"

یاد رکھیں ہر عالم میں انس نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ہر عاقل اور نہ ہی ہر زاہد عابد میں انس پایا جاتا ہے۔ ولی میں انس پائے جانے کے لیے چند صفات ہونا ضروری ہے۔ جب یہ تمام صفات پائی جائیں تو کامل انس ہوگا اور نفرت و وحشت دور ہو جائے گی اور اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو انس بھی نہ ہوگا اور جس میں یہ تمام صفات نہ ہوں اس میں کچھ انس پایا جائے گا اور جب انس ملا تو اس میں کرب سے راحت اور غم سے سکون و طمانیت پائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اوصاف کمیاب ہونے کی وجہ سے ایسے افراد بھی کمیاب ہیں جن میں انس پایا جاتا ہو وہ اوصاف سات ہیں:

۱۔ علم

۲۔ عقل

۳۔ ادب

۴۔ حسنِ اخلاق

۵۔ سخاوتِ نفس

۶۔ سلامتیِ قلب

۷۔ تواضع

اب اگر ان میں سے کچھ پائے گئے تو کامل انس کی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ ان کے اضداد میں وحشت کاملہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جاہل میں کوئی انس کی بات نہیں ہوتی۔ احمق بھی انس سے خالی ہے۔ بخیل اور بدخلق آدمی میں بھی انس نہیں ہوتا۔ خبیث اور متکبر آدمی میں بھی انس نہیں پایا جاتا۔

حضرت اصمعیؒ سے مروی ہے۔ انہوں نے کسی حکیم کا قول نقل کیا:

شریف و کریم آدمی سے محض محبت کے ساتھ معاملہ کرو۔ عوام کے ساتھ ترغیب و ترہیب کے ذریعہ معاملہ کرو۔ احمقوں اور کمینوں کے ساتھ صرف دھمکی اور تخویف کے ذریعہ معاملہ کرو۔

تمام لوگ، سارے درختوں کی طرح ہیں۔ ان میں سے بعض کا سایہ ہے مگر پھل نہیں۔ یہ وہ ہے کہ جس کا دنیا میں نفع ہے اور آخرت میں اس کا کچھ فائدہ نہیں اور کسی وقت اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض درخت ایسے ہیں کہ جن میں پھل ہوتا ہے مگر اس کا سایہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہے جو آخرت کے لیے مناسب ہے اور دنیا کے لیے مناسب نہیں۔ یہ کمیاب اور قلیل تر ہے اور بعض درخت ایسے بھی ہیں کہ جن کا نہ پھل ہے اور نہ اس کا سایہ ہے یہ بے ضرورت ہے۔ درختوں میں اس کی مثال جھاؤ کے درخت جیسی ہے۔ یہ جنگلات کا کانٹے دار درخت ہے عوام اسے ام غیلان یعنی کیکر کہا کرتے ہیں۔ یہ کپڑے پھاڑتا ہے۔ یہ نہ کھانے کے کام آتا ہے اور نہ پینے کے کام آتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو نہ فائدہ بخش ہیں اور نہ نقصان دہ ہیں۔ ان کی تعداد زیادہ ہے۔

اس کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ لَبِئْسَ الْمَوْلَى وَلَبِئْسَ الْعَشِيرُ [1]

(پکارے جاتا ہے البتہ جس کا ضرر پہلے پہنچے نفع سے، بے شک برا دوست ہے اور برا رفیق)

چوپاؤں میں ایسے بے کار کی مثال چوہے اور سانپ کی ہے۔ ان کا وصف بیان کرتے ہوئے کسی نے کہا:

---

[1] الحج آیت ۱۳۔

اَلنَّاسُ شَتّٰی اِذَا مَا اَنْتَ ذُقْتَهُمْ — لَا يَسْتَوُوْنَ كَمَا لَا يَسْتَوِی الشَّجَرُ
ذَا رَبُّ ظِلٍّ وَ هٰذَا عِنْدَ ثَمَرٍ — وَ ذَاكَ لَيْسَ لَهُ ظِلٌّ وَ لَا ثَمَرُ

(جب تو لوگوں کو آزمائے گا تو دیکھے گا کہ لوگ مختلف قسم کے ہیں جیسے درخت یکساں نہیں ہوتا اسی طرح لوگ بھی یکساں نہیں ہوتے)

(یہ سایہ دار ہے اور اس کے پاس پھل ہے اور وہ ایسا ہے کہ نہ سایہ اور نہ پھل)

ایک ادیب نے اس وصف کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے

اِذَا كُنْتَ لَا تُرْجٰى لِدَفْعِ مُهِمَّةٍ — وَ لَمْ تَكُ يَوْمَ الْحَشْرِ مِمَّنْ يَشْفَعُ
وَ لَا اَنْتَ ذَا مَالٍ يَجُوْدُ بِمَالِهٖ — فَعُوْدُ خِلَالٍ مِنْ اِخَائِكَ اَنْفَعُ

(اور جب تجھ سے کسی مشکل دُور کرنے کی امید نہ رکھی جائے اور حشر کے روز تو سفارشیوں میں سے بھی نہ ہو) اور تو مالدار بھی نہ ہو کہ سخاوت کرے تو اپنے بھائی کی عادت لینا خوب نفع مند ہے)

بعض سلف کا قول ہے کہ،

"جب تیرا بھائی کوئی دوستی کرے تو نصف محبت پر قائم رہے تو یہ بہت ہے"۔

محمد بن قاسم قرشیؒ نے ربیع بن سلیمانؒ سے، انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں نقل کیا کہ انہوں نے بغداد میں ایک آدمی سے مواخات قائم کی۔ پھر ان کا بھائی وہ اسباب کا مالک ہوا تو شافعیؒ کے ساتھ اس کا سلوک بدل گیا۔ اب وہ پرانے وقت کے انداز پر نہ رہا۔ شافعی رضی اللہ عنہ نے اسے یہ اشعار لکھے ؎

اِذْهَبْ فَوُدُّكَ مِنْ فُؤَادِيْ طَالِقٌ — مِنِّيْ وَ لَيْسَ طَلَاقُ ذَاتِ الْبَيْنِ
فَاِنِ ارْعَوَيْتَ فَاِنَّهَا تَطْلِيْقَةٌ — وَ يَدُوْمُ وُدُّكَ لِيْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ
وَ اِذَا امْتَنَعْتَ شَفَعْتُهَا بِمِثَالِهَا — فَتَكُوْنُ تَطْلِيْقَتَيْنِ فِيْ حَيْضَتَيْنِ
فَاِذَا الثَّلَاثُ اَتَتْكَ مِنِّيْ بَتَّةً — لَمْ تُغْنِ عَنْكَ وَلَايَةُ السَّبَبَيْنِ

(جاؤ تمہاری محبت کو میری طرف سے طلاق ہے اور یہ طلاق بائنہ نہیں۔)
(اگر تو نے احترام مروت کیا تو ایک طلاق ہے اور تیری محبت دو باقی پر ہمیشہ رہے گی۔)
(اور اگر تو نے انکار کیا تو اس کے ساتھ دو اور ملا دوں گا اور دو حیضوں میں دو طلاقیں ہوں گی)
(اب تجھے میری طرف سے تین طلاق ہوں گی جو بائنہ نہیں اور دو اسباب کا مالک بننا تیرے کچھ کام نہ آئے گا)

یہ کلام ایک فقیہ کے سامنے کسی نے پڑھا تو انہوں نے اسے بہت خوب کلام کہا اور فرمایا:

"یہ فقہی طلاق ہے البتہ انہوں نے نکاح سے پہلے طلاق دے دی۔

امام شافعیؒ نے محمد بن عبدالحکم مصری سے مواخات قائم کر رکھی تھی۔ وُہ ان سے محبت رکھتے تھے، اور فرمایا کرتے،

"مصر میں میرے اقامت پذیر رہنے کا اس کے سوا کوئی باعث نہیں"

محمدؒ بیمار ہو گئے۔ امام شافعیؒ ان کی بیمار پرسی کے لئے گئے تو قرشی نے ربیع سے نقل کرتے ہُوئے مجھے بتایا کہ محمدؒ کی بیمار پرسی کر کے امام شافعیؒ نے یہ اشعار پڑھے:۔

مَرِضَ الْحَبِيْبُ فَعُدْتُهٗ   فَمَرِضْتُ مِنْ حَذَرِيْ اِلَيْهِ

وَاَتَى الْحَبِيْبُ يَعُوْدُنِيْ   فَبَرَأْتُ مِنْ نَظَرِيْ اِلَيْهِ

(دوست بیمار ہُوا تو میں نے اسکی بیمار پرسی کی۔ میں اس کے ڈر کی وجہ سے بیمار ہو گیا

دوست بیمار پرسی کرتا آیا اور اس پر نظر کرتے ہی میں تندرست ہو گیا)

اور اہل مصر نے بلاشبہ یہ اعتراف کیا کہ شافعیؒ نے حلقۂ ذکر و تدریس انہیں سونپ رکھا تھا اور وُہ انہیں ہی امام شافعیؒ کی وفات کے بعد جانشین سمجھتے تھے اور امام شافعیؒ لوگوں کو ان کے پاس حاضر ہونے کا حکم دیتے آخر مرض وفات میں اس بارہ میں ان سے پُوچھا گیا کہ اے ابُو عبداللہ، آپ کے بعد ہم کس کی مجلس کریں؟ اور صاحبِ حلقہ کون ہوگا؟ انہیں گمان تھا کہ امام شافعیؒ، محمدؒ کی طرف اشارہ کریں گے۔ محمدؒ نے بھی اس طرف توجہ دی اور دیر تک کان لگائے رکھے۔ وہ اس کے سرہانے ہی بیٹھے ہُوئے تھے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا:

سبحان اللہ، کیا ابو یعقوب بویطیؒ کے بارے میں شبہ ہے؟ اس سے محمدؒ کا شکستہ قلب ہو گئے اور دل میں کھٹکا ہُوا۔ ان کے اصحاب ابو یعقوب بویطیؒ کی طرف مائل ہو گئے۔ محمدؒ، علمِ شافعیؒ کے حامل تھے اور ان کے مذہب کے پیروکار تھے اور مالکؒ سے انقطاع کر لیا تھا مگر بویطیؒ زیادہ زاہد اور متقی تھے اور شافعیؒ نے دین کے معاملہ میں نصیحت کرتے ہُوئے کسی قسم کی مداہنت نہیں کی بلکہ صاف طور پر ابو یعقوبؒ کا نام لیا اور انہیں ترجیح دی۔ اس لیے کہ یہی افضل تھے۔ جب امام شافعیؒ کا انتقال ہُوا تو محمد بن عبدالحکم نے شافعیؒ کا مذہب چھوڑ دیا اور ان کے اصحاب سے الگ ہو کر دوبارہ مذہب مالک کی طرف رجوع کر لیا اور اپنے والد کی کتب مالکؒ سے روایت کیں اور ان کی فقہ کی پابندی کی۔ آج محمد بن عبدالحکم، مالکؒ کے بلند پایہ اصحاب میں سے ہیں، اور دوسری طرف بویطیؒ نے گمنامی کی زندگی اختیار کر لی اور شہر کے علاقے سے نکل کر سب لوگوں سے علیحدگی اختیار کر کے بویطہ میں رہائش پذیر ہو گئے اور کتاب الام تصنیف کی جو کہ آجکل ربیع بن سلیمان کی طرف منسوب و مشہور ہے حالانکہ یہ کتاب بویطیؒ نے جمع کی۔ مگر اپنا تذکرہ نہیں کیا اور ربیع کو بھیجی۔ اس نے اس میں اضافہ کیا۔

اور اسے مروّج کیا اور اس کا سماع کیا۔ بویطیؒ کو مصر سے بادشاہ نے بُلایا اور قرآن کے معاملہ میں ایک مسئلہ پر قید کر دیا۔ ربیعؒ سے مروی ہے کہ:

"بویطیؒ نے قید خانے سے مجھے خط لکھا اور مجھے علمی مجالس کی ترغیب دی اور ہمیشہ علوم حاصل کرتے رہنے اور علوم دین حاصل کرنے والوں پر نرمی کرنے کی مواظبت کا حکم دیا اور فرمایا کہ "ان کا خاص خیال رکھو اور ان کے سامنے تواضع کرو"۔

فرمایا! "میں شافعیؒ سے اکثر یہ شعر سُنا کرتا تھا:

اُهِينُ لَهُمْ نَفْسِي لِكَيْ يُكْرِمُونَهَا وَلَنْ تُكْرَمَ النَّفْسُ الَّتِي لَا تُهِينُهَا

(میں ان کی خاطر اپنے نفس کو سوار کرتا ہوں تاکہ وہ اس کی عزت کریں اور جس نفس کو ذلیل نہ کروگے اس کی عزت نہیں کی جائے گی)

سلفؒ میں سے ایک بزرگؒ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی:

"اے بیٹے، لوگوں میں سے اس کی مصاحبت کرنا کہ اگر تو محتاج ہو جائے تو وہ تیرے قریب ہو اور اگر تو امیر ہو جائے تو تیرے مال میں طمع نہ کرے۔ اگر اس کا درجہ بڑھ جائے تو تجھ پر بڑائی نہ دکھائے اور اگر تو اس کی خاطر تواضع کرے تو وہ تیری حفاظت کرے (یعنی تجھے ذلیل نہ کرے) اور اگر تو اس کی زیارت کرے تو وہ برداشت کرے اور اگر تو اس کے پاس ہو تو وہ تیری زینت کا باعث بنے اور اگر ایسا دوست نہ ملے تو کسی کی مصاحبت ہرگز نہ کرنا۔"

سیرت سلفؒ سے اخوت فی اللہ کے حقوق کے بارے میں واقعہ منقول ہے کہ: ایک آدمی اپنے بھائی کے گھر میں آتا ہے اور اس بھائی کو معلوم بھی نہیں۔ وہ اس کے گھر والوں سے پوچھتا ہے کہ:

"تمہارے پاس آٹا ہے؟ گھی ہے؟ تمہیں فلاں چیز کی ضرورت ہے؟" اگر وہ جواب دیں کہ ہمارے پاس فلاں فلاں چیز نہیں تو وہ یہ تمام اشیا، خرید کر انہیں لا دیتا۔ یعنی وہ بھائی اپنے اہل وعیال اور اپنے بھائی کے اہل وعیال میں فرق نہ رکھتا۔ اپنے بھائی کا بوجھ بھی خوشی خوشی اٹھاتا اور بتاتے ہیں کہ جب بھائی سے ملاقات ہوتی تو اس مدد کا ذکر تک نہ کرتا۔

حضرت سعید بن ابی عروبہؒ کا طریقہ تھا کہ ہر قسم کے کپڑے رسی پر لٹکا دیتے۔ ہر قسم کا کھانا سامنے کر دیتے اور کہا ہے کچا گوشت خریدتے اور اسے کھونٹے پر لٹکا دیتے اور دروازہ کھول دیتے اور ان کے بھائی (اخوان فی اللہ) آتے جو کھانا چاہتے لے جاتے۔ جس قدر گوشت چاہتے کاٹ کر لے جاتے اور اسے پکا کر یا بھون کر کھا لیتے اور جو چاہتا کپڑا لے جاتا اور اسے پہن لیتا۔ اور یہ سب کام بغیر اجازت کر لیتے، گویا اذن عام دے رکھا تھا

سلف صالحین کا یہ اخلاق وسیرت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو باہمی الفت عطا کی اور اسے اپنی ایک نشانی بتایا اور اسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں سونپا۔ فرمایا :

وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ [1]

(اور ان کے دلوں میں الفت ڈالی، اگر تو خرچ کرتا جو سارے ملک میں ہے تمام، نہ الفت دے سکتا ان کے دلوں میں، لیکن اللہ نے الفت ڈالی، بے شک وہ زور آور ہے حکمت والا)

یعنی وہ غالب ہے۔ اس نے جن میں تفریق کر دی کوئی دوسرا ان میں الفت پیدا نہیں کر سکتا اور جن میں اس نے الفت ڈال دی۔ ان میں دوسرا کوئی بھی تفریق نہیں کر سکتا۔ وہ حکیم ہے جس طرح وہ توحید کے ساتھ واحد ہے، اسی طرح تالیف میں حکم کے ساتھ بھی منفرد ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ عزیز ہے۔ یعنی الفت کو عزت والی چیز بنایا اور اہل ایمان کے نزدیک اسے عظمت بخشی۔ حکیم ہے یعنی صالح حکماً کے ساتھ اسے حکمت میں بنایا۔

بھائی کے لیے غائبانہ دعا

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ہل میں جُتے ہُوئے دو بیلوں کو دیکھا کہ ایک بیل رُک کر بدن کھجلانے لگا تو دوسرا بیل بھی رُک گیا۔ حضرت ابوالدرداءُ رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا :

"اللہ تعالیٰ کی خاطر باہم مواخات رکھنے والے بھی اسی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر عمل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر باہم تعاون کرتے ہیں۔ جب ان میں سے رک جاتا ہے تو دوسرا بیل اس کے رکنے کی وجہ سے رک جاتا ہے۔" اور حضرت ابوالدرداءُ رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر عبادت "فکر" تھی اور وُہ فرمایا کرتے :

"میں سجدہ میں اپنے چالیس بھائیوں کے لیے دعا کیا کرتا ہُوں اور ان کے نام لیا کرتا ہوں۔"

حدیث میں آتا ہے :

"بھائی کی اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دعا رد نہیں ہوتی" اور فرشتہ کہتا ہے :

ولك مثل هٰذا (اور تجھے بھی اسی قدر ملے)

دوسرے الفاظ یہ ہیں :

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : میں تجھ سے ابتداء کرتا ہوں۔" اور ایک مشہور حدیث ہے :

---

[1] الانفال ۶۳

"آدمی کی اپنے بھائی کے معاملہ میں وہ (دعا) قبول ہوتی ہے جو اپنے بارے میں قبول نہیں ہوتی۔"
اخوت کا یہ حق لازم ہے کہ غائبانہ طور پر اپنے بھائی کے لیے کثرت سے دُعا و استغفار کرتا رہے۔ اگر اخوت کی اس کے علاوہ اور کوئی بات نہ ہو تو یہی برکت و فائدہ بہت بڑی برکت ہے۔

محمد بن یوسف اصفہانیؒ فرمایا کرتے:

"صالح بھائی جیسا کہاں ہے؟ تیرے گھر والے تیری وراثت تقسیم کریں گے اور وُہ تنہا تیرا افسوس دل میں لیے تیرے غم میں ڈوبا ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہ تیرے لیے دُعا کر رہا ہے اور تو مٹی کی کئی تہوں کے نیچے ہے۔" چنانچہ انہوں نے ایک نیک بھائی کو فرشتوں سے تشبیہ دی۔ اس لیے کہ حدیث میں آتا ہے:

"جب انسان مرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں: "پیچھے کیا چھوڑ گیا؟"

اور فرشتے کہتے ہیں:

"آگے کیا بھیجا؟" چنانچہ جس نے بھلائی آگے بھیجی اس پر خوش ہوتے ہیں اور اس پہ مہربان ہوتے ہیں۔

موت کے بعد دُعا

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"مواخات قائم کرنے میں اور کچھ فائدہ نہ ہو تو یہ کیا کم ہے؟ کہ جب انسان مرتا ہے تو بھائی اس کے لیے دعا کرتا ہے اور اس پر رحم کھاتا ہے۔ کیا خبر اس کی دعا قبول ہو جائے اور اس کے حسنِ نیت کی وجہ سے مُردے کی بخشش ہو جائے۔" اور کہا کرتے ہیں:

"جس کو اس کے بھائی کی موت کی خبر ملے۔ وہ اس پر رحم کھائے اور بخشش کی دُعا کرے۔ گویا وُہ جنازہ میں شریک ہوا اور اس نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"قبر میں مُردے کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ڈوبنے والا ہر چیز سے لپٹ لپٹ جائے۔ وُہ اپنے بیٹے یا والد یا بھائی کی دُعا کا منتظر رہتا ہے اور زندوں کی دُعاؤں سے مُردوں کی قبروں پر پہاڑوں کے برابر انوارات آتے ہیں۔"

کہا کرتے ہیں: کہ

"جیسے کہ دنیا میں زندوں کے لیے تحائف ہوتے ہیں، مُردوں کے لیے دُعائیں بمنزلہ ان تحائف کے ہیں۔" فرمایا:

"فرشتہ مُردے کے پاس نور کی ایک طشتری لے کر آتا ہے جس پہ نور کا رومال ہوتا ہے اور کہتا ہے، یہ تیرے فلاں بھائی کی جانب سے تحفہ ہے، تیرے فلاں دوست کی طرف سے ہے۔ بتایا کہ وہ اس پر ایسے

خوش ہوتا ہے جیسے کہ زندہ، تحفہ پر خوش ہوتا ہے"۔ چنانچہ سلف صالحین اپنے بھائیوں کو اپنے جانے کے بعد دُعائیں کرنے کی وصیت کرتے اور حسنِ یقین اور صدقِ نیت کی وجہ سے اس کی بہت رغبت رکھتے اور دلاتے۔

اس آدمی کے لیے سب سے زیادہ حسرت کا مقام ہے کہ جو دُنیا سے نکلا مگر اس کا کوئی دوست نہیں کہ جس سے مانوس ہو۔ اس کا کوئی سچا دوست نہیں جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"غریب وہ ہے جس کا کوئی حبیب نہیں" اور بدظنی میں پڑ کر کسی دوست سے نفرت ہرگز نہ کرنا۔ ایک شیخؒ نے اپنے ایک بھائی کے لیے یہ شعر پڑھا: ؎

وَلَيْسَ غَرِيْبًا مَنْ تَنَاءَتْ دِيَارُهٗ　　وَلٰكِنْ مَنْ يَّتَجَفّٰى فَذَاكَ غَرِيْبُ

(اور جس کی غائبانہ تعریف ہو وُہ غریب نہیں، بلکہ وُہ غریب ہے جس پر ستم کیا جاتا ہو)

وَمَنْ كَانَ ذَا عَهْدٍ قَدِيْمٍ وَّذَا وَفَا　　فَلَوْ جَاوَزَ السَّدَّيْنِ فَهُوَ قَرِيْبُ

(اور جو قدیم عہد اور وفا والا ہو۔ وُہ اگر اطرافِ ارض بھی پار کر جائے وُہ قریب ہے)

حضرت سفیان ثوریؒ سے پوچھا گیا:

"آپ کس سے مانوس ہوتے ہیں؟"

فرمایا: "قیس بن ربیع سے اور میں نے اسے دو سال سے نہیں دیکھا"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"میری بعض غائب بھائیوں سے محبت، ان بھائیوں سے زیادہ پختہ ہے جو دن میں دو بار مجھ سے ملتے ہیں"۔

محمد بن داؤدؒ فرماتے ہیں:

"جائے ملاقات دُور ہونے کے باوجود قلبی قرب ایسے قربِ وطن سے بہتر ہے جو نِرا قربِ وطن ہی ہو"۔

بھائی کے ساتھ مکروہ سلوک

بھائی کے ساتھ پانچ قسم کا سلوک کرنا بہت ہی ناپسندیدہ بات اور ادب و مروّت کے خلاف ہے اس سے بچتا رہے:

۱۔ اس پر ایسی ذمہ داری نہ ڈالے جس کو وُہ ناپسند کرتا ہو اور اس پر یہ مشقت بن جائے۔

۲۔ اس کی چغلی نہ سنے اور نہ ہی اس کے خلاف کسی تہمت کی تصدیق کرے۔

۳۔ کثرت سے یہ نہ پوچھا کرے کہ کہاں سے آئے ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟

۴۔ اس کی جاسوسی نہ کرے یعنی اس کے حالات معلوم کرنے کی ٹوہ میں نہ لگا رہے۔

۵ - اور نہ ہی اس کی خبریں معلوم کرتا رہے کہ اب کیا کر رہا ہے؟ اور صبح کیا کر رہا تھا؟
سیرتِ سلفؒ میں ان کاموں کو ناپسند سمجھا جاتا تھا۔
محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں؛
"اپنے بھائی پر ایسی ذمہ داری نہ ڈالو جو اس پر مشقت بن جائے۔"
حضرت مجاہدؒ نے فرمایا:
"جب تو اپنے بھائی کو راستہ میں دیکھے تو یہ نہ پوچھ کہ کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے؟ ہو سکتا ہے وہ صحیح بتائے اور ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹ بول دے اور تو نے گویا اسے جھوٹ پر آمادہ کیا۔"
کہتے ہیں کہ ایک حکیم آدمی دوسرے حکیم کے پاس گیا تو کہا:
"میں تیرے پاس مواخات قائم کرنے کے لیے آیا ہوں۔"
اس نے جواب دیا؛
"اس کا حق تین چیزیں ہیں۔ اگر انہیں پورا کیا تو یہ ہو جائے گا۔"
پوچھا: "وہ کیا ہیں؟"
کہا: "کسی معاملہ میں میری مخالفت نہ کرنا اور میری چغلی کو صحیح نہ ماننا اور میرے بارے میں رشوت نہ دینا۔"
کہا: "میں نے مان لیا۔"
اس نے کہا:
"میں نے مواخات قائم کر لی۔"
تجسس اور تحسس دونوں سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ترکِ تدابر و تقاطع کے ساتھ انہیں بھی شرطِ اخوت قرار دیا۔ فرمایا؛
"جاسوسی مت کرو، خبریں مت لو، انقطاع نہ کرو اور باہم تفریق نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔"
شہادت میں مقاطعہ کا مطلب یہ ہے کہ قطع مواصلت کر دے اور عام عادت سے ہٹ جائے اور تدابر کا مطلب ہے کہ پیٹھ پیچھے بھی وہی بات کرے جیسے کہ سامنے کہتا ہے۔ یعنی غیبت اور ناپسندیدہ بات نہ کرے اور بھائیوں کا طریقہ ہے کہ وہ علوم و اعمال اور تلاوت و اذکار پر ساری ساری رات گزار دیتے ہیں اور انہی مفہومات پر ہی حسنِ صحبت اور حقیقی محبت حاصل ہوتی ہے۔

سلف صالحین اس سے مزید انعام حاصل کرتے اور دنیا و آخرت میں ایسے ایسے بلند درجات حاصل کرتے کہ انہیں تنہائی میں ویسے درجات نہ مل سکیں۔ تنہائی میں حُسنِ اخلاق و عمل اور علمی مذاکرات کی دولت نصیب نہ ہوتی۔

اور یہ دولت صرف اہل افراد کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ سلف صالحین کے سینے صاف اور رحمت سے بھرپور تھے وہ لوگ حسد، مقابلہ اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش سے پاک تھے۔ ان میں تکلف نہ تھا ہمیشہ الفت رکھتے اور اگر یہ صفات نہ پائی جاتی ہوں تو ان کے اضداد پائے جائیں گے۔

چنانچہ کہا کرتے ہیں:

"جس کا تکلف ختم ہُوا اس کی مصاحبت والفت ہمیشہ رہی جس کا بوجھ کم ہُوا اس کی محبت دائمی ہُوئی۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"بدترین دوست وہ ہے جس کی خاطر تکلف کیا جائے۔"

حضرت یونس علیہ السلام نے جب اپنے بھائیوں (احباب) کو دیکھا تو جَو کی روٹی ان کے سامنے رکھی اور جو سبزی خود بو رکھی تھی اس کو کتر کر اس کے سامنے پیش کیا اور فرمایا:

"اگر اللہ تعالیٰ نے تکلف کرنے والوں پر لعنت نہ کی ہوتی تو میں تمہارے لیے تکلف کرتا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"میں اور میری امت کے متقی لوگ تکلف سے بری (اور پاک) ہیں۔"

تکلف کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایسا کام کرے جس میں (اللہ کی رضا اور آخرت کی) نیت نہ ہو۔ بس جب جی چاہا کر ڈالا۔ کوئی اچھی نیت نہ ہو اور لایعنی کام کرنا بھی تکلف ہے۔ بقدرِ کفایت کام ہو گیا مگر پھر بھی کرتے رہنا تکلف کی بات ہے۔ حسد اور کینہ ہونا بھی یہی ہے۔ اگر غلبہ دکھایا اور فخر و مباہات کیا تو اجنبیت پیدا ہو جائے گی اور اگر خبث و مکر سے کام لیا تو نفرت پیدا ہوگی اور ان تمام باتوں کی وجہ سے الفت ختم ہو جاتی ہے محبت کم ہو کر اخوت کی فضیلت برباد ہو جاتی ہے۔

بعض اہل بیت کا قول ہے:

"مجھ پر سب سے زیادہ گراں گزرنے والا بھائی وُہ ہے جو مجھے متنفر کرے اور جس کو میں متنفر کروں۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"حضرت حسنؒ سے پُوچھا گیا کہ ایک دوست ہے جس نے اس کا مال بغیر اذن کھا لیا۔"

فرمایا: "جس کی طرف نفس استراحت پا جائے اور قلب اس کی طرف پُرسکون ہو۔ جب ایسا ہو تو اس کیلئے

اس کے مال میں اذن کی ضرورت نہیں۔"

حضرت ذوالنونؒ سے انس کے بارے میں پوچھا گیا، فرمایا کہ،

"تو ہر اچھے چہرہ اور ہر اچھی آواز سے انس پائے اور اللہ تعالیٰ تیرے اور اس کے درمیان ہو۔"

بغیر اذن کھانا

جب تجھے معلوم ہو کہ تیرا بھائی اس بات پر مسرت پاتا ہے کہ تو اس کا مال اور ملو کہ چیز لے یا تجھے معلوم ہو کہ اگر تو ایسا کرے تو وہ اس کو ناپسند نہیں کرتا تو تیرے لیے جائز ہے کہ چاہے وہ اذن نہ دے پھر بھی لے لے۔ اس لیے کہ اس کا علم ہی اذن کے قائم مقام ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ تیرا قلب شرح صدر کے ساتھ یہ کر رہا ہے اور تیرے دوست پر یہ بات ناگوار ہونے کی بجائے مسرت کی، اور ہلکی ہے اور اگر تیرے مال لینے پر اس کو ناپسندیدگی ہو یا تو سمجھ لے کہ وہ بخل دکھا رہا ہے تو اس کے مال سے کھانا مکروہ و ناپسندیدہ بات ہے اور اگر وہ اجازت دے دے مگر مجھے یہ معلوم ہو کہ اس کے نزدیک تمہارا نہ لینا زیادہ محبوب ہے تو تقویٰ اسی میں ہے کہ نہ لے اور اگر وہ عطیہ دے تو قبول نہ کرو۔ اس کی علامت یہ ہے کہ ایسا ہدیہ قبول کرنے اور ایسا مال لینے سے تجھے انقباض سا ہو گا اور طبیعت میں وحشت و پریشانی آئے گی۔

حدیث میں ہے،

"گناہ قلب پر پورا پورا قابو پا لیتا ہے۔"

گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور حسن خلق کا نام نیکی ہے اور نیکی وہ ہے کہ جس پر تیرا نفس پرسکون ہو اور قلب مطمئن ہو۔ یہ الفاظ مختلف روایات میں آتے ہیں۔

جیسے کہ ہم بتا چکے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ پر صدقہ کیا ہوا گوشت کھایا اور وہ موجود نہ تھیں۔ اس لیے کہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کا ایسا کرنا حضرت بریرہؓ کے لیے مسرت کا باعث ہو گا۔ اب اس کے برعکس اسی طرح قیاس کر لیا جائے۔

ہاشم اوقصؒ نے حضرت حسنؒ کو دیکھا کہ وہ ایک سبزی فروش کی دکان پر اس ٹوکری سے یہ چیز اور اُس ٹوکری سے وہ چیز کھا رہے ہیں تو پوچھا،

"اے ابو سعید، آپ ایک آدمی کا مال اس کی اجازت کے بغیر ہی کھا رہے ہیں؟"

فرمایا، "اے لڑکے کھانے کی آیت پڑھنا۔"

پھر حضرت حسنؒ نے یہ آیت پڑھی،

وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ ... سے لے کر اَوْ صَدِيْقِكُمْ۔

(اور نہیں تکلیف تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے ... یا اپنے دوست کے گھر سے)

محمد بن واسعؒ اور فرقد سنجیؒ کے اصحاب ان کے گھر میں آتے اور صاحبِ خانہ سے اجازت لیے بغیر ہی کھا لیا کرتے۔ وُہ فرمایا کرتے:

"تم نے مجھے سلف صالحین کا اخلاق یاد دلایا۔ ہم اسی طرح تھے۔" بتایا کہ ہم ابو سلیمان دارانیؒ کے پاس جاتے وُہ ہمارے سامنے عمدہ عمدہ چیزیں رکھتے اور ہمارے ہمراہ نہ کھاتے اور فرمایا کرتے:

"میں نے یہ چیزیں تمہارے لیے چھپا کر رکھی تھیں۔"

ہم کہتے: "آپ ہمیں شہوات (خواہش کی چیزیں) کھلاتے ہیں اور آپ خود نہیں کھاتے؟"

فرماتے: "میں انہیں نہیں کھاؤں گا۔ میں انہیں چھوڑ چکا۔ اور تمہارے سامنے اس لیے رکھتا ہُوں کہ میں جانتا ہوں تم یہ چیزیں چاہتے ہو۔"

بتایا: ہم مصیصہ اور ساحلی بستیوں میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے پاس رات کو ٹھہرتے تو وُہ صنوبر، بادام اور بندق کا پھل توڑ کر لاتے اور فرماتے: "کھاؤ۔"

ہم عرض کرتے:

"کاش! آپ اپنی نماز پڑھتے رہتے اور یہ کام چھوڑ دیتے۔"

وہ فرماتے: "یہ افضل ہے۔"

بعض سلف کا یہ حال تھا کہ اچانک مہمان آئے۔ گھر میں کچھ کھانے کو نہ تھا۔ اپنے بھائی کے گھر گئے، وہاں روٹیاں اور ہنڈیا پکی ہُوئی موجود تھی، وہ بغیر اذن اٹھا لائے اور مہمانوں کے سامنے رکھ دی۔ جب وُہ بھائی ملتا تو وُہ اس کام کو مستحسن سمجھتا اور کہا کرتا کہ اگر دوبارہ مہمان آئیں تو پھر ایسا ہی کیجیے۔

ایک عالمؒ کا فرمان ہے:

"اگر ایک آدمی اپنے بھائی کے گھر میں چار کام کرے تو انس کامل ہُوا:

۱۔ جب اس کے پاس کھائے۔

۲۔ خلوت میں داخل ہو۔

۳۔ سوئے۔

۴۔ اور نماز پڑھے۔"

ایک شیخ کے سامنے یہ بات نقل کی گئی تو فرمایا:

"سچ کہا مگر ایک بات باقی ہے۔"

میں نے پُوچھا: "وُہ کیا ہے؟"

فرمایا: "ان کے ساتھ جماع کرے (یعنی اس کے گھر میں کسی کمرے میں پردہ میں یہ کرے)" جب یہ کیا تو انس کامل ہوا۔ اس لیے کہ انہی پانچ کے لیے مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں اور استراحت ملتی ہے۔ اور اگر یہ کام نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کے گھر یعنی مساجد ہی زیادہ آرام دہ اور عمدہ جگہیں ہیں۔ ان پانچ میں وحشت جاتی رہے تو انس کامل ہے۔ تنہائی میں حالِ انس کی مثال یہ ہے کہ نفس میں کوئی عیب نہ ہو اور نہ برعکس معاملہ ہو بلکہ اتفاق جنس ہو اور یہ انتہائی انس کی بات ہے اور انس کی پانچویں بات یعنی وَ جَامِعَ - فرمایا: اس سے عربوں کے تسلیم و ترحیب کے اقوال سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ عرب کہا کرتے ہیں:

مرحبا واھلا و سھلا - یعنی ہمارے پاس تیرے لیے قلب و مقام کی مرحب یعنی وسعت ہے اور ہمارے ہاں تیرے لیے سہولت یعنی اخلاقی وسعت و مسرت ہے۔

دوستی کے سات لوازم

تعارف کے سلسلہ میں لوگوں کو سات لوازم و ذرائع حاصل ہیں:

۱۔ صرف دیکھنے سے یا سننے سے ہی معرفت حاصل ہو۔ اسی وجہ سے حرمتِ اسلام ہے اور یہ عوام اہلِ اسلام کا حق ہے۔

۲۔ مجاورت - یعنی پڑوسی ہو۔ اس پر پڑوسی کا حق ہے اور یہ آیت کی ایک توجیہ کے مطابق صاحب بالجنب ہے۔ اس کے تین حقوق ہیں اس لیے کہ اس میں حرمتِ اسلام، حُرمتِ پڑوس شامل ہے اور مسافر ہونے کا اضافہ ہے۔

۳۔ مصاحبت - یعنی ساتھ رہے اور اتباع کرے۔ یہ اس سے بڑھ کر ہے۔

۴۔ صداقت و دوستی - یہ حقیقی اخوّت ہے اور معاشرت اسی کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے مخالطت اور انس پایا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے باہمی ملاقات، ان کے ہاں رات رہنے اور کھانے کھلانے کا حکم دیا جاتا ہے اور یہ کامل معاشرت ہے۔

معاشرت دراصل عشیر سے ماخوذ ہے یعنی قریب رہ کر اختلاط کرنے والا۔ اسی لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان " لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْرُ" میں عشیر سے مراد خاوند لیا گیا یعنی چچا کا بیٹا جو اس سے اختلاط رکھتا ہے۔ اسی سے مفاعلہ کے وزن پر معاشرت کا لفظ آتا ہے۔ اس لیے کہ یہ لازمی طور پر دو کے درمیان ہی ہوا کرتی ہے۔ یعنی جیسے یہ کرتا ہے ویسے دوسرا بھائی بھی کرتا ہے۔ مثلاً مضاربت، مقاتلت، مشاتمت (ایک دوسرے کو مارنا، ایک دوسرے کو قتل کرنا، ایک دوسرے کو گالی دینا) کہ ہر ایک نے ایک دوسرے کے ساتھ یکساں ہی معاملہ کیا۔

۵۔ اخوت - یہ صداقت سے بلند درجہ تعلق ہے اور یہ تعلق صرف ان لوگوں کے درمیان قائم ہوتا ہے کہ

جو حال اور حسن و معنی میں برابر کے اور قریب قریب ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ قلب، عزم، علم اور خلق میں ایک دوسرے کے قریب اور مشابہ ہوں۔ اور اگر باہم اختلاف ہو جیسے کہ فرمایا:

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ [1] (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں)

اور یہ ان کی جنس سے نہ ہوں اور نہ ہی وصفِ خلقت میں مشابہت و قرب ہو۔ البتہ قلوب و احوال میں مشابہت پائی جائے اور باہم مواخات قائم کریں تو یہ اخوتِ حال ہے اور یہ حقیقی صداقت ہے۔

۶۔ محبت۔ یہ اخوت کی خاصیت ہے اور اللہ تعالیٰ قلوب میں اسے انس والفت کی شکل میں پیدا کرتا ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی کارسازی و صنعت کا کرشمہ ہے۔ کوئی دوسرا اس پر قادر نہیں۔ اس سے قلبی راحت، شرح صدر اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وحشت ختم ہو جاتی ہے اور تنفر دور ہو جاتا ہے۔

۷۔ خلیل۔ یہ حبیب سے بلند درجہ ہے اور یہ تعلق صرف ان دو کے درمیان ہوتا ہے جو ایک معیار اور ایک طریق کے عاقل، عالم اور عارف ہوں۔ یہ درجہ بہت ہی کمیاب اور عزیز تر ہے۔ خلت دراصل تخلل الاسرار سے ماخوذ ہے۔ حقیقی محبت و ایثار اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر خلیل، حبیب ہے مگر ہر حبیب خلیل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خلت میں افضل ترین عقل، بلند ترین علم اور قوتِ تمکین کی ضرورت ہے اور ہر محبوب میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے۔ اس لیے بہت ہی نادر اور گراں وصف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محبت میں رفعت و بلندی عطا فرمائی اور آپ کو مقامِ ابراہیمؑ تک رسائی عطا کرنے کے لیے خلت عطا فرمائی اب خلت دراصل مزید محبت ہے۔

خلیلِ محمدؐ اور خلیل اللہ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

" اگر میں مخلوق میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا لیکن تمہارا آقا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم، خلیل اللہ ہے عزوجل۔"

اب جب انہیں خلیل بنایا گیا تو ان کے لیے خلتِ خالق کے اندر خلتِ مخلوق کو حصہ دار و شریک بنانا درست نہ تھا۔ پھر فرمایا،

" البتہ اخوتِ اسلام ہے۔" چنانچہ آپؐ کو اخوت کے مطابق فرمایا۔ اس لیے کہ اس میں انہیں مشارکتِ حال ہے جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اخوت کی شرکت بتائی مگر نبوت سے الگ رکھا جیسے کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلت سے الگ کیا۔

---

[1] بنی اسرائیل ۲۷

ایک دُوسری حدیث میں ہے :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرحاں وشاداں حالت میں منبر پر چڑھے اور فرمایا :

"یاد رکھو، اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا خلیل بنایا جیسے کہ ابراہیمؑ کو خلیل بنایا۔ چنانچہ میں حبیب اللہ ہوں اور میں خلیل اللہ ہوں۔"

معرفت سے پہلے کوئی اسم نہیں کہ جس کا حکم لازم ہو سوائے اسلام کے۔ اور خلیل کے بعد کوئی وصف معروف نہیں۔ سوائے نعتِ محب کے۔ پھر معرفت اور خلت کے درمیان بھائی چارہ کی حرمات بڑھتی رہتی ہیں اور طویل صحبت اور حسنِ معاشرت کی وجہ سے حقوق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کہا کرتے ہیں : ایک سال کی مصاحبت اخوت ہے اور دس سال کی معرفت قرابت ہے۔

مواخات کے دُوسرے مسائل

اللہ تعالیٰ نے صدیق کو اہل کے ساتھ ملا کر ذکر کیا۔ پھر اخوت کا درجہ صداقت سے بڑھا کر بتایا۔ فرمایا :

اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهٗ۔ (یا جس کی کنجیوں کے تم مالک ہو)

ایک بھائی اپنا مال دُوسرے بھائی کو دے کر حضر میں جاتا تو کہتا :

میری مملوکہ میں تمہارا حکم میرے حکم کی طرح ہے اور میری ملکیت تیری ملکیت کی طرح ہے۔ اب یہ بھائی اپنے بھائی کے غیب ہونے کی وجہ سے تقویٰ کے باعث اپنے آپ پر تنگی کرتا اور کہا کرتا کہ :

"اگر وہ موجود ہوتا تو میں بافراغت کھاتا۔" یہ تقویٰ کی وجہ سے کرتے اور اپنے بھائی پر ایثار کی خاطر ایسا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے تقویٰ کی قدر کی، ان کی تنگی دُور فرمائی اور انہیں اذنِ عام دے دیا اور کھانے میں وسعت کر دی۔ فرمایا :

وَ لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ (اور تمہاری جانوں پر کچھ حرج نہیں)

یعنی تمہیں کوئی گناہ اور تنگی نہیں کہ

اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ۔ (کہ تم اپنے گھر سے یا اپنے آباد (والدین) کے گھروں سے کھاؤ)

پھر ترتیبِ احکام کے مطابق اقارب کا ذکر کیا اور بھائی کو بھی ساتھ ملا دیا۔ اس لیے کہ اخوت نے تملیکِ کنجی کا کام کیا۔ اسے ملکیتِ اخوت پر رکھ کر فرمایا :

اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهٗ۔ (یا جن کی کنجیوں کے تم مالک ہوئے)

پھر اس کے بعد صدیق کا ذکر کیا۔ اس لیے کہ اس کا وصف اخوت والا نہ تھا۔ پھر فرمایا :

لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا جَمِیۡعًا۔ (تم پر کچھ حرج نہیں کہ تم سب مل کر کھاؤ)

جبکہ بھائی موجود ہوں اور یا اَوۡ اَشۡتَاتًا (یا متفرق ہو کر) جبکہ بھائی جدا جدا جگہوں میں ہوں۔ چنانچہ ان کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر بتائی۔ اس لیے کہ ان کے بھائیوں کو بھی ان اشیاء کی ملکیت میں مساوات حاصل ہے اور کھانے پینے کی اشیاء کے بارے میں زبان وقلب بھی یکساں ہیں۔ اس فرمانِ الٰہی میں ذکر کیے ہُوئے وصف کی یہی تحقیق ہے:

وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ۔ (اور ان کا معاملہ باہم مشورہ سے ہوتا ہے)

ایک ادیبؒ کا قول ہے،

"جب کچھ بھائی باہم مانوس ہو جائیں اور ان میں صحیح الفت ہو اور وُہ کسی کھانے وغیرہ کی مجلس میں جمع ہوں اور ایک بھائی غیر حاضر ہو تو ان کی لذت میں اسی قدر کمی آ جاتی ہے۔" یہ بات انس اور باہمی تعلق کی وجہ سے ہوتی ہے

مالک بن دینارؒ اور محمد بن واسعؒ دونوں حضرت حسنؒ کے گھر میں تشریف لائے۔ حضرت حسنؒ موجود نہ تھے محمد بن واسعؒ نے چارپائی کے نیچے سے کھانے کی ٹوکری نکالی اور کھانا کھانے لگے۔ حضرت حسنؒ تشریف لائے تو فرمایا،

(دورِ صحابہ میں) ہم ایسے ہی تھے۔ ہم ایک دُوسرے سے تنفر نہیں کرتے تھے۔ یہ یاد رکھیں۔ دو بھائیوں اور دو رفیقوں کے درمیان اعمال میں ریاء نہیں پائی جاتی۔ اگر اس کا دُوسرا ساتھی آنکھوں سے دیکھ بھی لے تو ان کے لیے سرِ خلوت کا ثواب ہے۔ اس لیے کہ وُہ دونوں حضر میں اہل کی طرح اور سفر میں ساتھی کی طرح ہیں اب آدمی اور اس کے اہل و عیال کے درمیان اس طرح مسافر اور رفقائے سفر کے درمیان کوئی ریاء و سمعۃ نہیں ہوتا کہ دکھانے یا سنانے کو عمل کرتا ہو اور نہ ہی اس پر ان سے بھی چھپنا اور خلوت لازم ہے۔ اگر اس بھائی نے سفر میں اس کی مصاحبت کی تو اس کا حق لازم تر و واجب تر ہے۔ چنانچہ نہ اس سے اختلاف کرے اور نہ اس پر اعتراض کرے۔ اگر وہ کسی جگہ ٹھہرنا چاہے تو اس کا بھائی اسے ناپسند کرے اور اگر وہ وہاں سے کوچ کرنا چاہے تو یہ وہاں قیام نہ چاہے۔ اگر ایک چل پڑے تو دُوسرا نہ ٹھہرے اور اگر دوسرا آرام کرنا چاہے تو یہ وہاں نہ ٹھہرے۔ اگر یہ کچھ خریدے تو اسے منع نہ کرو اور کسی کھانے یا پینے کی چیز کو اس پر ترجیح نہ دو۔ بلکہ اس معاملہ میں ایثار کرو۔

حدیث میں ہے،

"دو آدمیوں نے جب بھی مصاحبت کی تو ان دونوں میں سے اپنے ساتھی کے ساتھ نرم تر ہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ :

" آپؐ اپنے صحابہؓ کے ہمراہ ایک جنگل میں داخل ہُوئے۔ آپؐ نے اراک کی دو مسواکیں لیں۔ ان میں سے ایک ٹیڑھی تھی اور ایک سیدھی تھی۔ آپؐ نے ٹیڑھی اپنے لیے رکھی اور سیدھی اپنے ساتھی کو دے دی۔ اس نے عرض کیا،

" اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ سیدھی کے زیادہ مستحق ہیں۔"

فرمایا :۔ " جو بھی کسی کا ساتھی بنتا ہے چاہے دن کی ایک گھڑی ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے اس کی مصاحبت کے بارے میں پرسش کرے گا کہ کیا اس میں اللہ تعالیٰ کا حق قائم کیا یا ضائع کیا ؛ " جو آدمی اپنے بھائی کی اخوت پر نظر رکھے یا اس کے نیک اعمال کی وجہ سے مصاحبت کرے یا اس کے اکمل حال پر آگاہ ہو، اور اس کی وجہ سے رفاقت اختیار کرے تو اس سے معلوم ہُوا کہ وہ اس طریق سے جاہل ہے اور اس میں تغیر ہو جانے کا سخت اندیشہ ہے۔ اخوت تو قلبی حقائق اور عقلی سلامتی پر موقوف ہے۔ اس لیے کہ معاملہ انہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اب اس کی جہالت کے ساتھ ساتھ اگر دُوسرے کی معرفت ناقص ہُوئی تو تصنع و ریاء کاری آئے گی۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک اس کا درجہ بلند ہے اور اسے اس پر حُسنِ ظن ہے۔ اب اس میں شرک بھی آ گیا اور شرک کی وجہ سے وُہ حقیقی توحید سے محروم ہو گیا۔ استقامت کے بعد ایسے ہی لغزش ہو جاتی ہے اور آدمی اللہ کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ پھر وہ اس کی کارسازی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ نفس پر مدح و ثناء کی محبت کا ابتلاء ہوا کرتا ہے اور نفس کی آزمائش اس طرح ہوتی ہے کہ اظہارِ وصف کر کے وُہ اپنا درجہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت یہ ساتھی سب سے زیادہ منحوس اور ضرر رساں ہو گا اور یہ دونوں ساتھی ایک دُوسرے کے لیے ابتلاء و آفت ہیں اس لیے ایسے ساتھی سے فوراً علیحدگی اختیار کرلے۔ یہ جاہل ساتھی ہے اور اس کی مصاحبت میں سراسر نقصان ہے اور آفات آنے کا اندیشہ ہے۔ ایسے ساتھی کی بجائے تنہائی اختیار کرے اور جیسا بھی اچھا یا بُرا حال ہو اپنے اندر رہے کسی کو حصہ دار و شریک نہ بنائے۔ یہی بات اس کے لیے زیادہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے یہ ایک لطیف نکتہ ہے اور اس معاملہ میں دو گروہ ہلاک ہُوئے :

۱۔ ایک آدمی نے انہی امراض پر مواخات قائم کی اور رفاقت اختیار کی۔ اس لیے کہ اس کا یقین کمزور اور خواہشِ نفس طاقتور ہے۔ اس کی نظر میں لوگوں کا درجہ بلند ہے۔ حاصل ہونے والی دنیا کا درجہ اس کے قلب میں بڑا ہے۔ یہ آدمی کی تصنع کی وجہ سے ہلاک ہُوا اور اس طرح اس کا بھائی بھی ہلاکت میں جا گرا۔

۲۔ مشہور عبادت گزار لوگ جن پر نیکی کا پردہ پڑا ہُوا ہے وہ اپنا اصل حال ظاہر کرنے سے ڈرتے ہیں اس لئے کہ وہ اسکو ناپسند کرتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ کسی ضد و مبائن چیز سے ان کا امتحان لیا جائے اور مصاحبت میں

کھلتے بھی نہیں۔ اس لیے طویل مصاحبت کے باوجود ان کے اصل احوال پر آگاہی نہیں ہوتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ دُور سے ان کی طرف متقی ہونے کے اشارات کریں اور ان کی ملاقات عام ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ شبہ کیا جائے کہ ہر وقت حضرت حق کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان لوگوں نے تنہائی اور عزلت نشینی کا بھروپ بھر رکھا ہے۔ مصاحبت سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یہ لوگ عبادت گزاری کا دعویٰ لے کر ساری دنیا سے جُدا نظر آتے ہیں۔ اب چونکہ عوام کو اہلِ صدق کے احوال سے آگاہی نہیں۔ اس لیے ان کے تفرد و عزلت نشینی کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ہر وقت عباداتِ الٰہی میں مصروف نہیں ہوتے۔ یہ لوگ ترکِ سنت کی وجہ سے اور تکبر کے باعث امت سے اختلاط ترک کے باعث برباد ہوئے۔ جو لوگ سیرتِ اسلاف سے جاہل ہیں ان پر رعب دکھاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم سب سے الگ ہو کر عبادات میں مشغول ہیں۔ ان لوگوں کو معرفت سے نابلد سمجھا جاتا ہے۔ یہ دراصل قلبی وساوس کا شکار ہیں۔ اہلِ صدق اور عارفین کے سامنے یہ برہنہ اور عیاں ہیں۔ کثرت سے ایسے واقعات مروی ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ سلف صالحین اپنے مسلمان بھائیوں سے اختلاط رکھتے۔ مل کر کھاتے کھلاتے۔ عوام اہلِ اسلام سے ملتے۔ بازاروں میں چلتے۔ ضروریات خود خرید لاتے اور سامان خود اٹھا لیتے۔ صحابہ و تابعین کی یہی سیرت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھروالوں کے لیے اپنی پیٹھ پر (خوراک وغیرہ) کی بوری اٹھا لیتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے اور ہاتھ میں کھجور اور نمک اٹھا لاتے اور فرمایا کرتے،

لَا يَنْقُصُ الْكَامِلُ مِنْ كَمَالِهِ　　مَا جَرَّ مِنْ نَفْعٍ إِلَى عِيَالِهِ

(کامل اس وجہ سے ناقص نہیں ہوتا، کہ اس نے اہل وعیال کے نفع کے لیے مشقت اٹھائی)

حضرت ابی، ابن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا یہی طریقہ تھا۔ یہ لکڑیاں خود لاتے۔ اپنے کاندھوں پر آٹے کی بوریاں اٹھا لاتے اور سید المرسلین امام المتقین رسول رب العلمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک چیز خریدتے تو خود اٹھا لیتے۔ آپ کا صحابی عرض کرتا،

"یہ مجھے دیجئے، میں اٹھا لیتا ہوں" تو فرماتے،

"چیز کا مالک، اسے اٹھانے کا زیادہ حقدار ہے"

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں مانگنے والے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے زمین پر روٹی کے ٹکڑے رکھے تھے اور وہ کھا رہے تھے۔ انہوں نے ان کو سلام کہا تو وہ بولے،

"اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے فرزند، آئیے کھانا کھائیے"۔ انہوں نے خچر سے ٹانگ کھسکائی اور اُتر کر ان کے ہمراہ زمین پر کھانے لگے اور پھر سوار ہو گئے اور فرمایا،

اللہ تعالیٰ متکبرین کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد انہیں اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ وہ آئے تو خادم کو فرمایا: "جو چیز بھی ذخیرہ کر رکھی ہے لے آؤ۔" چنانچہ ان کے ہمراہ کھا لیتے۔

اسرائیلیات میں منقول ہے کہ:

ایک حکیم نے حکمت کے فن میں تین سو ساٹھ کتابیں لکھیں اور سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا ایک مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی فرمائی:

فلاں سے کہہ دو، تو نے زمین کو نفاق سے بھر دیا اور میں تیرے نفاق سے کچھ چیز بھی قبول نہیں کرتا۔

بتاتے ہیں کہ غم کے مارے اس نے تنہائی اختیار کر لی اور زیرِ زمین ایک سرنگ میں چلا گیا اور کہنے لگا:

"مجھے اپنے رب کی محبت تک رسائی حاصل ہو گئی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی فرمائی:

اُسے کہہ دو، "تجھے میری رضا تک رسائی نہیں ہوئی۔"

بتاتے ہیں کہ پھر وہ بازاروں میں داخل ہوا۔ عوام سے اختلاط و مجلس کی۔ ان کے ساتھ مل کر کھایا، اور ان کے ہمراہ بازاروں میں چلا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ کی طرف وحی کی:

اسے کہہ دو: "اب تجھے میری رضا تک رسائی مل گئی۔"

اب اگر مخلوق کی خاطر تصنع کرنے والا اور ان کے ہاتھوں میں گرفتار یہ آدمی بھی یقین کر لے کہ مخلوق ساری مل کر بھی اس کی روزی میں کمی نہیں کر سکتی۔ نہ اس کی عمر میں اضافہ کر سکتی ہے، نہ مخلوق اسے اللہ کے ہاں بلند درجہ دے سکتی ہے اور نہ ہی اللہ کے ہاں اسے ذلیل کر سکتی ہے بلکہ یہ تمام امور تنہا اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کے سوا کوئی ان کا مالک نہیں۔ اور اگر یہ مولائے کریم کا خطاب سنتا تو اس مشقت سے بچ جاتا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ[1]

(تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوا، یہی بتوں کے تھان، اور بناتے ہو جھوٹی باتیں، بے شک جن کو پوجتے ہو اللہ کے سوا، مالک نہیں روزی کے، سو تم ڈھونڈو اللہ کے ہاں روزی اور اس کی بندگی کرو)

اور فرمایا:

---

[1] العنکبوت ۱۷۔

إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ [1] (جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، بندے ہیں تم جیسے)

اب اگر اس بندے کو عقل ہوتی تو آخرت میں مصروف ہو کر ساری مخلوق کو دل سے نکال باہر کرتا اور سب سے اعراض کر کے آخرت کی فکر میں لگ جاتا۔ اپنا حال و معاملہ اپنے رب کے سامنے کھولتا کر وہاں سے رحم و قوت عطا ہوتی۔ اگر ایسا کرے تو اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ لوگ اسے کس حال پر دیکھ رہے ہیں۔ اس کی نظر مولائے کریم کی طرف ہوتی وہ صرف اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ وہ ایسا عمل کرتا ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی قدر ہو۔ چاہے لوگ اسے ذلیل کہیں لیکن جس کا یقین کمزور ہوگا اس کی نظر مخلوق پر ہوگی وہ چاہے گا کہ لوگ اس کے اصل حال سے آگاہ نہ ہوں تاکہ ان کے نزدیک اس کا درجہ قائم رہے اور گرنے کا نہ پائے۔ یہ آدمی عجب و غرور میں مبتلا ہو گا جس کا کچھ حال نہیں۔ اس کے سامنے اپنا حال بتا کر اکڑے گا اور جس کا کچھ مقام نہیں اس کے سامنے اپنا مقام ظاہر کر کے بڑا بنے گا۔ وہ لوگ جہالت کی وجہ سے اس کو بزرگ سمجھیں گے اور اسے عالم قرار دیں گے۔ اور اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔

یونس بن عبد الاعلیٰ بتاتے ہیں کہ مجھے شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛

"اللہ کی قسم، میں تجھے نصیحت کی بات ہی کہوں گا کہ لوگوں کے طعن سے بچنے کا کوئی راہ نہیں۔ اس لیے جس کو اپنے لیے بہتر دیکھو وہ کر گزرو۔"

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں؛

"لوگوں کی رضا ایسا مقصود ہے جو حاصل نہیں ہوتا۔ اب سب سے بڑا احمق وہی ہے جو ناقابلِ حصول چیز کی طلب کرے۔"

اسی مفہوم میں ایک حکیم کا شعر مروی ہے؛

مَنْ رَاقَبَ النَّاسَ مَاتَ غَمًّا وَ فَازَ بِاللَّذَّةِ الْجَسُوْرُ

(جس نے لوگوں پر نظر رکھی وہ غم سے مر گیا۔ اور بہادر آدمی لذات حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔)

ابو محمد سہلؒ نے ایک فقیر آدمی کو دیکھا تو فرمایا؛ "ایسا ایسا عمل کرو۔" فرمایا؛ "اے استاد، میں لوگوں کی وجہ سے یہ نہیں کر سکتا۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ نے اپنے اصحاب کی توجہ کرتے ہوئے فرمایا؛

---

[1] الاعراف ۱۹۴۔

اسی (تصوف) کی حقیقت صرف وہی آدمی حاصل کر سکتا ہے جس میں دو میں سے ایک وصف پایا جاتا ہو۔

۱۔ ایسا آدمی کہ تمام لوگ اس کی نظر سے گر جائیں اور وہ گھر میں صرف اپنے آپ اور خالق تعالیٰ کو ہی دیکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نفع و نقصان کا مالک نہیں۔

۲۔ وہ آدمی جو لوگوں کو دل سے گرا دے اور اسے اس کی پرواہ نہ ہو کہ وہ کسی حال پر اسے دیکھ رہے ہیں۔

امام الائمہ حضرت حسن بن یسار بصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے ان سے کہا:

اے ابوسعید، بعض لوگ آپ کی مجلس میں آپ سے استفادے کے لیے نہیں آتے اور نہ آپ سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ کے کلام میں کوئی نقص اور عیب تلاش کریں تاکہ آپ کو بدنام کریں۔ حضرت حسنؓ مسکرا دیے اور فرمایا:

"اے برادرزادے، اس میں نہ پڑو۔ اس لیے کہ میرے جی میں جنت کی رہائش کا خیال آیا تو میں نے اس کی خواہش کی۔ میرے جی میں خوب صورت حوروں سے معانقہ کا خیال آیا تو میں نے اس کی خواہش کی میرے جی میں رحمٰن تعالیٰ کے جوار و پڑوس کا خیال آیا۔ میں نے اس کی خواہش کی، مگر میرے جی میں کبھی لوگوں کے طعنوں سے بچنے کی بات نہیں آئی۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ لوگوں نے اپنے خالق و رازق، زندہ کرنے اور مارنے والے کو بھی اپنی زبان درازیوں سے نہیں بچایا۔ اب میں ان سے بچنے کا خیال کیسے کر سکتا ہوں"۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں مروی ہے کہ دعا کی:

"اے پروردگار، لوگوں کی زبانیں مجھ سے روک لے"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یہ تو میں نے اپنے لیے بھی نہیں کیا۔ اب میں تیری خاطر کیسے کروں گا؟"

دوسرے الفاظ یہ ہیں: کہ

"اگر میں کسی کو ایسی تخصیص دیتا تو اپنے آپ کو اس سے مخصوص کرتا۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"میں نے جس دن بھی صبح یا شام حالتِ محبت میں کی اور لوگوں نے مجھے اذیت نہ دی تو میں نے اسے اللہ کی ایک نعمت قرار دیا اور یہ شعر پڑھا: ؎

وَ اِنَّ امْرَأً یُمْسِیْ وَ یُصْبِحُ سَالِمًا مِنَ النَّاسِ اِلَّا مَا جَنٰی لَسَعِیْدٌ

(اور بے شک ایک لوگوں سے سلامت رہ کر صبح یا شام کرے تو وہ نیک بخت کے لیے ہی فائدہ حاصل کرے۔)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیرؑ سے وحی فرمائی:

"اگر تو اس پر راضی ہو کہ میں تجھے چبانے والوں کے منہ میں لوتھڑا بناؤں تو اس وقت ہی تجھے اپنے نزدیک تواضع کرنے والوں میں سے کروں گا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے:

"اے حواریوں کے گروہ، اگر تم بھائی بن جانا چاہو تو لوگوں سے عداوت و بغض کے موقع پر اپنے نفوس کو متواضع بناؤ۔ اہل ایمان کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے جو برکت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کے بارے میں روایت نہ بھی ہو تب بھی یہ برکت ہی کافی ہے۔"

مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیت اللہ کا طواف کیا تو زمزم کی طرف رُخ کیا، تاکہ (پانی) پییں۔ دیکھا تو چمڑے کے برتنوں میں کھجوریں بھگو رکھی تھیں لوگوں نے انہیں ہاتھوں میں مل رکھا تھا اور وہ اس سے لے کر کھا اور پی رہے تھے۔ آپؐ نے پانی مانگا اور فرمایا:

"مجھے پانی پلاؤ۔"

حضرت عباسؓ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول، یہ نبیذ کا مشروب ہے جس کو کئی ہاتھوں نے مل رکھا ہے۔ کیا میں گھر میں ڈھکے ہوئے گھڑے کا پاکیزہ اور صاف تر (نبیذ) نہ لے آؤں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"نہیں، مجھے اسی سے پلاؤ جس سے لوگ پیتے ہیں۔ میں مسلمانوں کے ہاتھوں کی برکت چاہتا ہوں۔"

چنانچہ آپؐ نے یہی پیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

عرض کیا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ! ڈھکے ہوئے گھڑے سے آپؐ کو وضو کرنا زیادہ پسند ہے، یا ان مطاہر (پانیوں) سے کہ جہاں سے عام لوگ وضو کرتے ہیں؟"

فرمایا: "بلکہ ان مطاہر سے زیادہ پسند ہے مسلمانوں کے ہاتھوں کی برکت چاہتے ہوئے۔"

روایت میں ہے:

"جب دو مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی کی خاطر تبسم کرتا ہے تو دونوں کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے کہ درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"ان کے درمیان ایک سو رحمتیں تقسیم کی جاتی ہیں اور ننانوے اسے ملتی ہیں جو اپنے ساتھی کے لیے

زیادہ باعثِ انس ہو اور زیادہ خوش خلقی سے پیش آئے۔

روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے اصحاب کے ساتھ زیادہ نرم روی رکھے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے ساتھ زیادہ نرمی سے پیش آئے۔ اور جاہل کی مصاحبت سے دُور رہو ورنہ اس کی صحبت تجھے بھی جاہل کر دے گی۔ یا اپنے مولا کریم سے غافل کر دے گی اور اس کی خواہش کے تابع بنا دے گی۔ آخر وُہ تجھے اس کی راہ سے ہٹا کر برباد کر دے گا جیسے کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

فَاسْتَقِيمَا وَ لَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ[1] (سو تم دونوں ثابت رہو، مت چلو راہ ان کی جو نہیں جانتے)

چنانچہ استقامت کی ابتدا علماء کی مصاحبت سے حاصل ہوتی ہے اور فرمایا:

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوَاهُ[2] (اور نہ اطاعت کر اس کی جس کا ہم نے دل غافل کر دیا اپنی یاد سے اور اس نے اپنی خواہش کی تابعداری کی)

اور فرمایا:

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدٰى[3] (سو کہیں تجھ کو اس سے نہ روک دیں، وہ جو یقین نہیں رکھتا اس کا اور اپنے مزوں کے پیچھے پڑا ہے۔ پھر تو پٹکا جائے)

یعنی ورنہ تو برباد ہو جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

ایک جگہ فرمایا:

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا[4] (سو جس نے ہمارے ذکر سے منہ پھیرا۔ اس سے اعراض کر لے)

اس میں یہ استدلال ملا کہ جو ذکر اللہ کرتا ہو۔ اس کے پاس آؤ اور اس کی مصاحبت اختیار کرو اور جو ذکر اللہ سے غافل ہو اس سے دُور رہو اور اس کی مصاحبت ختم کر دو۔ ہاں اگر وُہ توبہ کر لے اور ذکر اللہ کی طرف رجوع کرے تو مصاحبت کرو۔ فرمایا:

---

[1] یونس ۸۹
[2] الکہف ۲۸
[3] طٰہٰ ۱۶
[4] النجم ۲۹

وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ۔ (اور اس کی راہ کا اتباع کر، جس نے میری طرف رجوع کیا)

پانچ قسم کے آدمیوں کی مصاحبت سے دور رہو:

۱۔ بدعتی
۲۔ فاسق
۳۔ جاہل
۴۔ دُنیا کا لالچی
۵۔ لوگوں کی بہت غیبت کرنے والا۔

یہ پانچوں قسم کے لوگ، دلوں کے بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ احوال برباد کرنے اور دنیا و آخرت میں نقصان دہ ہیں۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے:

"احمق کے چہرے کی طرف دیکھنا ایک لکھی ہوئی خطا ہے۔"

حضرت سعید بن مسیب نے فرمایا:

"ظالموں کی طرف مت دیکھو ورنہ تمہارے نیک اعمال برباد ہو جائیں گے۔" مگر حضرت صعصعہ بن صوحان فرماتے ہیں:

"جب تو کسی مومن سے ملے تو خوب اختلاط رکھ اور جب تو کسی منافق سے ملے تو خوب مخالفت کر۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی اولیاء کا وصف بیان کیا:

وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔[1] (اور جب بات کرنے لگیں جاہل لوگ، کہیں صاحب سلامت) یعنی سلامتی۔ ھاء کے بدلے میں الف ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے گناہ سے بچ گئے اور تم ہمارے شر سے بچ گئے۔

حضرت ابو الدرداءؓ اپنے زمانہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

"لوگ پتے تھے جن میں کانٹا نہ تھا۔ آج لوگ کانٹے بن گئے جن میں پتا نہیں۔ اگر تو ان کی تنقید کرے تو وہ تیری تنقید کریں گے اور اگر تو انہیں چھوڑ دے تو وہ تجھے نہیں چھوڑیں گے۔ ان میں سے زیادہ کاٹ کھانے والا وہ ہے جو تجھے افلاس و فقر کے دن ملے۔"

---

[1] الفرقان ۶۳

اور فرمایا کرتے :

"جس روز لوگ مجھے اذیت نہ پہنچاتے (یعنی کوئی زبان درازی کا تیر نہیں چلاتے) اسے میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت شمار کرتا ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جو آدمی لوگوں سے اختلاط رکھے اور ان کی ایذا دہی پر صبر کرے وہ اس سے افضل ہے جو اختلاط نہ کرے اور نہ ہی ان کی ایذاء پر صبر کرے۔"

اللہ جل جلالہٗ کا ارشاد ہے :

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ [1] (وہ لوگ پائیں گے اپنا حق دہرا، اس پر کہ ٹھہرے رہے اور بھلائی دیتے ہیں بھلائی کے جواب ہیں)

یعنی بری کلام کا جواب اچھی کلام کے ساتھ دیتے ہیں اور کلام مفسر میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔

یعنی اچھی کلام کے ساتھ جواب دے اور فرمایا :

فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ [2] (پھر جو تو دیکھے تو جس میں تجھ میں دشمنی تھی، جیسے دوستدار ہے ناتے والا)

پھر فرمایا :

وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۔ (اور یہ بات ملتی ہے انہی کو، جو صبر کرتے ہیں اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے)

یعنی یہ کلمہ صرف امر الٰہی پر اور غیظ و غضب پر صبر کرنے والوں کو اور بڑے علم و حلم والوں کو ہی عطا ہوتا ہے

ایک قول یہ ہے کہ

"اللہ عزوجل کے ہاں حصہ وجزا ملے گی اس لیے بڑے نصیب والے ہیں۔"

حضرت لقمان حکیم کا ایک متوسط قول مروی ہے :

"اے بیٹے، ایسا شیریں نہ ہو جا کہ تجھے نگل جائیں اور ایسا تلخ نہ ہو کہ تجھے تھوک دیں۔" مطلب یہ ہے کہ

---

[1] القصص ۵۴

[2] حم السجدہ ۳۴، ۳۵۔

لوگوں کی ہر بات میں تابعداری نہ کرو ورنہ اس قدر بے تکلف ہو جائیں گے کہ تیرے پاس کچھ باقی نہ رہے گا، اور ہر چیز میں ان کی مخالفت اور ان سے نفرت نہ کرو ورنہ تجھ سے الگ ہو جائیں گے اور تجھے مسترد کر دیں گے اور تیری غیبت میں پڑیں گے۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"صرف سالک کی مصاحبت کرو اور ہر وہ دوست جو وہ نہیں چاہتا جو تو چاہتا ہے اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔"

ایک عرب عالم کا فرمان ہے:

"دوست کی مثال کپڑے میں پیوند کی طرح ہے۔ اگر اسی کپڑے کی جنس کا پیوند نہ ہو تو اس کے لیے معیوب بن جاتا ہے۔"

رفاقت میں مشابہت کی اہمیت

ایک حکیم کا قول ہے:

"ہر انسان اپنی شکل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے کہ پرندہ اپنی جنس کے ساتھ ہوتا ہے۔" حضرت مالک بن دینار بھی اسی طرح فرمایا کرتے۔ اور کہا ہے معاشرت و مصاحبت میں دو آدمیوں کا اتفاق یوں ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا ایک وصف دوسرے میں بھی پایا جاتا ہے اور پرندوں کی اجناس کی طرح لوگوں کی اشکال کا معاملہ ہے۔

بتاتے ہیں کہ ایک روز انہوں نے ایک کوے اور ایک کبوتر کو ایک ساتھ دیکھا۔ اس پر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ فرمایا:

"ان دونوں کی شکل ایک نہیں، پھر اتفاق کیسے ہوا؟" مگر جب وہ اڑے تو دونوں ہی لنگڑے تھے۔ فرمایا: "دونوں کی مطابقت یہی تھی۔"

کہا کرتے ہیں:

"جب دو آدمی تھوڑی دیر کی مصاحبت کریں اور حال میں ہم شکل نہ ہوں تو ان میں تفریق ہو جانا لازمی بات ہے۔" ایک عرب شاعر نے کسی حکیم کے قول کو اشعار میں ادا کیا:

وَ قَائِلٍ لِمَا تَفَرَّقْتُمَا ✦✦✦ فَقُلْتُ قَوْلًا فِيهِ اِنْصَافُ

لَمْ يَكُ مِنْ شَكْلِيْ فَفَارَقْتُهُ وَ النَّاسُ اَشْكَالٌ وَّ اُلَّافُ

(کہنے والے نے پوچھا تم میں جدائی کیوں ہوئی۔ میں نے انصاف کی بات بتائی)

(کہ وہ میری شکل کا نہ تھا اس لیے میں نے اس کو چھوڑ دیا اور لوگ اشکال و الفت کے ساتھ رہتے ہیں)

حدیث میں ہے :

" ارواح جمع شدہ لشکر ہیں جن کا (باہم) تعارف ہوا - ان میں الفت ہوگئی اور جن میں باہم اجنبیت ہوئی ، ان میں اختلاف ہوا - وہ ملاقات کر کے ہوا میں بکھر جاتے ہیں ." معنی یہ ہے کہ مذہب و خلق ہیں - اور ایک روایت میں زاید الفاظ ہیں کہ ،

" اگر ایک مومن کسی ایسی مجلس میں جائے جہاں ایک سو منافق ہوں اور ایک مومن ہو تو وہ اسی (مومن) کی طرف آ کر بیٹھے گا اور اگر منافق کسی مجلس میں جائے اور اس میں ایک سو مومن ہوں اور ایک منافق ہو تو وہ اس (منافق) کی طرف جا کر بیٹھے گا ."

اس حدیث کا یہ سبب ذکر کیا گیا ہے کہ مدینہ میں احد کی ایک عطارہ عورت تھی - مکہ کی ایک عطارہ عورت مدینہ آئی اور یہ مزاح کرنے والی عورت تھی - جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا :

" کہاں ٹھہری ہو ؟ "

عرض کیا : " فلاں (عطارہ) کے پاس ."

آپ نے فرمایا :

" ارواح جمع شدہ لشکر ہوتے ہیں ."

بعض علماء کا فرمان ہے ، کہ

" اللہ تعالیٰ نے ارواح کو پیدا فرمایا تو انہیں پیدا کیا اور مختلف انداز بنائے - پھر انہیں اپنے عرش گرد طواف کرایا - اب جو دو رُوحیں وہاں ہی باہم متعارف ہوگئیں - یہاں دنیا میں ان کی جب بھی ملاقات ہوئی ان میں تعلق و رفاقت قائم ہوگئی اور جونسی دو روحوں کا وہاں باہم اختلاف ہوا اور وہاں ہی اجنبیت رہی اور طواف کرتے ہوئے مختلف رہیں - وُہ آج یہاں باہم نفرت رکھتی ہیں - جن کا وہاں طواف میں تعارف ہوا اور سامنے آ کر باہم متعارف ہوئے اور رفاقت کی - وہ یہاں متعارف ہیں اور جنہوں نے طواف کرتے اجنبیت دکھائی اور پشت پھیر لی - آج پیدا ہو کر ان میں اختلاف ہے اور باہمی الفت صرف اجتماع اور اتفاق سے ہی نہیں ہُوا کرتی بلکہ یہ چیز حال و اخلاق میں مشابہت ہی سے حاصل ہوتی - اس لیے کہ لوگوں کی اجناس بھی پرندوں کی اجناس کی طرح ہیں .

گاہے دو مختلف جنس کے پرندے اتفاق کرتے ہیں اور یک جا ہو جاتے ہیں - ان کی اشکال میں تباین کی وجہ سے اسے حقیقی الفت و اتفاق نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی صرف اجتماع ہو جانے سے ہی یہ چیز کھل کر سامنے آ سکتی ہے - اگر ایک ساتھ اڑیں تو یہ ظاہر ہو جاتی ہے - اب اگر ایک بلند ہو اور دوسرا نیچے رہ جائے تو ہم شکل نہ ہونے کی وجہ سے فراق ہو جانا ایک لازمی بات ہے - حال و وصف ہم شکل نہ ہونے کی وجہ سے اتفاق کے بعد

افتراق پائے جانے کی یہ ایک مثال ہے۔

مزید برآں دو آدمیوں کے درمیان الفت و اختلاف چار مفاہیم میں ہوتا ہے:

۱۔ جب وہ عزم میں یکساں ہوں۔

۲۔ حال میں اشتراک ہو۔

۳۔ علم میں قریب قریب ہوں۔

۴۔ اخلاق میں اتفاق ہو۔

جب ان چار باتوں میں اتفاق ہوا تو یہ دونوں ہم شکل اور ہم جنس ہیں اور انہی کے ہوتے ہی الفت و اتفاق ہو سکتا ہے اور اگر سب میں اختلاف ہو تو یہ تضاد و تباعد کی علامت ہے۔ اب افتراق ہوگا۔ اور اگر بعض میں اتفاق اور بعض میں اختلاف ہو تو کچھ اتفاق اور کچھ اختلاف ہوگا۔ جس قدر تعارف ہوگا اسی قدر اتفاق ہوگا۔ ارواح کی اجنبیت کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ اگر نشأت میں، طبعی نشوونما میں اختلاف ہونے کے باعث ان کے ارواح میں اجنبیت ہے اور جن کے اوصاف میں مزاجی قرب ہے وہ باہم متعارف ہیں۔

یعقوب بن معروف رحمہا اللہ تعالیٰ سے مروی ہے۔ بتاتے ہیں کہ حضرت معروف[رح] کی اسود بن سالم[رح] سے مواخات تھی۔ وہ ان کے پاس آئے اور کہا:

'بشر بن حارث آپ سے مواخات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود سامنے آنے سے حیا کرتے ہیں اور مجھے بھیجا ہے کہ آپ کے اور ان کے درمیان مواخات قائم کر دوں اور اسے پختہ کر دوں۔ البتہ وہ کچھ شرائط لگانا چاہتے ہیں۔

۱۔ وہ اس کی شہرت ہونا پسند نہیں کرتے۔

۲۔ اور وہ آپ سے زیادہ ملاقات اور آمد و رفت بھی پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہیں کثرت ملاقات پسند نہیں۔

حضرت معروف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

' اگر میں کسی کو دوست بناؤں تو میں رات اور دن کسی وقت بھی اس سے جدا رہنا پسند نہیں کرتا۔ ہر وقت اس کی ملاقات کروں گا اور ہر حال میں اپنے آپ پر اس کو ترجیح دوں گا۔' پھر اخوت فی اللہ اور حب فی اللہ کے بارے میں مروی کئی احادیث بیان فرمائیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مواخات قائم کی تھی۔ وہ علم میں ان کے حصہ دار تھے۔ بدن میں حصہ دیا۔ اپنی افضل ترین بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا اور میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کے اور اپنے درمیان اخوت قائم کر لی۔ ان کے پیغام پر انہیں اللہ تعالیٰ کی خاطر بھائی بنا لیا اور اگر انہیں ملاقات ناپسند ہے تو یہ بھی تسلیم کیا مگر میں جب چاہوں گا، ملاقات کے لیے جاؤں گا

اور انہیں کہوں گا کہ مجھے فلاں جگہ ملیں اور یہ بھی کہوں گا کہ اپنے تمام احوال سے مجھے آگاہ کر دیں اور اپنا کچھ مال بھی مجھ سے مخفی نہ رکھیں۔"

حضرت اسود بن سالم یہ پیغام لے کر حضرت بشرؒ کے پاس گئے وہ اسی پر راضی و مسرور ہوئے۔

حضرت اسود بن سالم اپنے زمانہ کے بلند پایہ بزرگ اور عالم تھے۔ یہ اپنے احباب کے معاملہ میں فراخ دل اور صابر آدمی تھے۔ یہی وہ بزرگ ہیں کہ جب معروفؒ نے ابو محفوظؒ سے پوچھا:

"اے ابو محفوظ! اس شہر میں دو بلند پایہ بزرگ ہیں۔ میں کس کی مصاحبت کروں تاکہ اس سے علم و ادب سیکھوں۔ امام احمد بن حنبل یا بشر بن حارث۔ تو انہوں نے فرمایا:

"ان میں سے ایک کی بھی مصاحبت نہ رکھ۔ اس لیے کہ احمدؒ محدث ہیں اور حدیث میں لوگوں کے ساتھ مشغولیت ہوتی ہے۔ ان کی مصاحبت تیرے دل کی حلاوتِ ذکر اور محبتِ خلوت کو گنوا دے گی اور بشرؒ اپنے حال میں غرق ہیں۔ وہ آپ کی طرف توجہ نہیں کر سکیں گے۔ البتہ اسود بن سالمؒ کی مصاحبت کرو۔ یہ آپ کے لیے بہتر ہیں اور توجہ بھی کریں گے۔ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ چنانچہ ان سے خوب نفع حاصل کیا اور حضرت معروفؒ کو احمد بن حنبلؒ اور بشرؒ سے کم درجہ کے بزرگ کا اس لیے مصاحب بنایا کہ وہ ان کے حال کے زیادہ مناسب اور ان کے وصف سے زیادہ مشابہ تھے۔

حدیثِ مواخات جس میں بتایا گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مواخات قائم کی اس میں ہے کہ آپؐ نے علم و حال میں ہم شکل صحابہؓ سے مواخات قائم کی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان قائم کی۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ کے درمیان مواخات قائم کی۔ یہ دونوں مماثل تھے۔ حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کے درمیان مواخات قائم کی۔ یہ علم و زہد میں ہم شکل تھے۔ حضرت عمارؓ اور حضرت سعدؓ کے درمیان مواخات قائم کی۔ یہ بھی مماثل تھے۔ حضرت علیؓ اور اپنے درمیان مواخات قائم کی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین وصلی اللہ علیٰ سیّدنا محمد و آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

یہ ان کی اعلیٰ ترفضیلت ہے اس لیے کہ ان کا علم و حال ان کے علم و وصف سے ہے۔ پھر آپؐ نے امیر اور غریب کے درمیان مواخات قائم کی تاکہ دونوں کی حالت معتدل ہو جائے اور امیر آدمی اپنے فقیر بھائی پر مال کا ایثار کرے۔

ابوسلیمان دارانیؒ نے احمد بن ابی حواریؒ کو کہا:

"اس زمانہ میں اگر تو کسی سے مواخات کرے تو کسی ناپسندیدہ بات پر عتاب نہ کر، اس لیے کہ یہ خطرہ ہے کہ پہلے سے زیادہ بُرا آدمی ملے۔" احمدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا تجربہ کیا اور اسے ہی صحیح پایا۔

بعض علماء کا قول ہے،

بھائی کی ایذا دہی پر صبر کرنا، اس پر عتاب کرنے سے بہتر ہے اور قطع تعلق کرنے سے عتاب کرنا بہتر ہے۔ اور کسی جرم میں پڑنے سے قطع تعلق بہتر ہے۔"

بعض کا فرمان ہے؛

"صفائی پر افتراق سے اجتماع کی کدورت بہتر ہے اور اخوت ایسے ہے جیسے کہ پتلا شیشہ ہو۔ اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے تو آفات آنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور وفات تک اخوت قائم رکھنا، زندگی میں اخوت کی ابتدا کرنے سے زیادہ سخت مسئلہ ہے۔

لوگوں کی چار اقسام

ایک ادیب کا قول ہے کہ لوگوں کی چار اقسام ہیں،

۱۔ سارا ہی شیریں، اس سے سیری نہیں ہوتی۔

۲۔ سارا ہی تلخ، اس سے کوئی غذا حاصل نہیں کرتا۔

۳۔ کھٹاس والا، اس کے تجھ سے لینے سے پہلے اس سے لے۔

۴۔ کھارا، جب ضرورت ہو تو اس سے لے۔

ایک امامؒ کا فرمان ہے؛

لوگوں کی چار اقسام ہیں، تین کی مصاحبت کر اور ایک کی مصاحبت نہ کر۔

۱۔ سمجھدار آدمی، جو اپنی سمجھ سے آگاہ ہے۔ یہ عالم ہے اس کا اتباع کرو۔

۲۔ سمجھدار آدمی، جو اپنی سمجھ سے آگاہ نہیں۔ یہ سونے والا ہے، اسے جگا دو۔

۳۔ بے سمجھ آدمی، جو اپنے آپ کو بے سمجھ ہی سمجھتا ہے۔ یہ جاہل ہے، اسے سکھاؤ اور تعلیم دو۔

۴۔ بے سمجھ آدمی، جو اپنے آپ کو بے سمجھ گمان نہیں کرتا۔ یہ منافق ہے اس سے بچو۔ اس چوتھے کے بارے میں حضرت سہلؒ کا قول ہے؛

"جہالت سے بدتر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کوئی نہیں اور سب سے بڑی جہالت یہ ہے کہ جہالت سے جاہل ہو۔"

ایک ادیب کا قول ہے؛

"لوگوں کی تین اقسام ہیں۔ دو سے مصاحبت کر اور تیسرے سے بھاگ جا۔

۱۔ جو آدمی تجھ سے زیادہ عالم ہے اس کی مصاحبت کر۔

۲۔ وہ آدمی جس سے زیادہ تو خود عالم ہے اور وہ تیری طرف توجہ رکھتا ہے۔ اس کی مصاحبت کر اور اسے علم سکھا۔

۴۔ اپنے بارے میں خوش فہم اور مغرور آدمی، اس کے پاس کچھ علم نہیں اور نہ ہی وہ علم سیکھتا ہے۔ اس سے دور بھاگ۔"

محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

جس آدمی کو کسی سے لازمی طور پر معاشرت کرنی پڑے تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے نجات دے۔ اس کیلئے بھلائی کے ساتھ معاشرت نہ کرنا دانش مندی نہیں۔ اس کی ساری محنت تھکاوٹ اور بھائیوں سے اختلاط اضطراری چیز ہے۔ متقی کی معاشرت ہی بہترین نیکی ہے۔ حضرت ابو مہران فرمایا کرتے:

میں گھر سے نکلتا ہوں تو تین کے درمیان ہوتا ہوں:

۱۔ اگر اپنے سے زیادہ عالم سے ملاقات ہو تو اس سے سیکھتا ہوں۔

۲۔ اگر اپنے جیسے سے ملاقات ہو تو یہ میرے مذاکرات کا دن ہے۔

۳۔ اور اگر اپنے سے کم درجہ والے سے ملاقات ہو تو وہ دن میرے لیے ثواب کا ہے اسے سکھاتا ہوں اور اجر کی امید رکھتا ہوں۔

ابو جعفر محمد بن علی نے اپنے بیٹے جعفر بن محمد رضی اللہ عنہم کو فرمایا:

"پانچ آدمیوں کی مصاحبت ہرگز نہ کرنا اور ان کے سوا جس کی مصاحبت چاہو کرو۔

۱۔ جھوٹے کی مصاحبت نہ کرنا، تجھے اس سے دھوکا ہوگا۔ یہ سراب کی طرح ہے۔ جوں جوں قریب جاؤ دور ہوتا جائے گا۔ قریب کو تجھ سے دور کر دے گا۔

۲۔ احمق کی مصاحبت نہ کرنا۔ تجھے اس سے کچھ فائدہ نہ ملے گا۔ وہ تجھے نفع دینا چاہے گا مگر نقصان کر دے گا۔

۳۔ بخیل کی مصاحبت نہ کرنا۔ یہ تیری سب سے زیادہ ضرورت کی چیز تجھ سے الگ کر دے گا۔

۴۔ بزدل سے بچو۔ یہ مصیبت کے وقت تجھے چھوڑ کر اپنی جان و مال لے کر بھاگ جائے گا۔

۵۔ بدکار آدمی کی مصاحبت نہ کرنا۔ یہ تجھے ایک لقمہ یا اس سے بھی کم پر فروخت کر دے گا۔"

میں نے پوچھا:

"لقمہ سے کم تر کیا چیز ہے؟"

فرمایا: "طمع۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے راستہ میں آپ کی مصاحبت کی جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنگل میں پہنچے تو آپ نے پیلو کی دو مسواکیں توڑیں۔ ان میں سے ایک ٹیڑھی تھی اور دوسری سیدھی۔ آپ نے ٹیڑھی خود لے لی اور سیدھی اپنے ساتھی کو دے دی۔ اس آدمی نے

عرض کیا:

"آپ مجھ سے زیادہ سیدھی (مسواک) کے حقدار ہیں۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو آدمی بھی کسی کی مصاحبت کرتا ہے چاہے دن کی ایک گھڑی (مصاحبت) کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے مصاحبت کے بارے میں پوچھے گا کہ کیا اس میں اللہ عزوجل کا حق ادا کیا یا نہیں؟ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ مجھ سے تیرا ایسا حق ہو جو میں نے ادا نہ کیا ہو۔"

اخوت فی اللہ، محبت فی اللہ اور حسنِ مصاحبت دراصل سلف صالحین کے طُرق تھے۔ آج یہ ناپید ہو گئے ان کے آثار تک جاتے رہے۔ جو ان پر عمل کرے اس نے انہیں زندہ کیا اور جس نے انہیں زندہ کیا اسے بعد میں عمل کرنیوالوں جیسا اجر ملے گا۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ کوئی ایسا نیک بھائی عطا کرے جس پر اس کو قلبی اطمینان ہو اور اس کے ذریعہ اس کی قلبی اصلاح ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دوسری بھی کئی نعمتیں ہیں۔ سب حمد اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد و آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

فصل ۴۵

نکاح کے احکام

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

وَانْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ[1] (اور نکاح کر دو رانڈوں کو اپنے اندر)

چنانچہ جن کو نکاح کی ضرورت ہے انہیں نکاح کا حکم دیا اور گناہ سے بچنے والوں کے لیے مندوب قرار دیا۔ ضرورت ہو تو نکاح کرنا فرض ہے اور کفایت کی صورت میں سنّت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فقر پر غنا کا وعدہ کیا۔ وہ ثواب سے محروم تھا اسے ثواب کا غنا ملے گا۔ وہ عدمِ حکم سے محروم تھا۔ اس پر حکم لازم کرنے کا غنا آئے گا۔ مکان، اثاثہ اور مال وغیرہ سے محروم اور فقیر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا :

وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ یعنی وہ ان کے فقر کے مفاہیم سے ان کی غنا کے لیے وسیع ہے۔ ان کے حال سے آگاہ ہے اور ان کے لیے جو بہتر ہے اسے جانتا ہے کہ کسی کو کس درجہ میں رہنا چاہیے۔

حضرت حسنؒ نے ابو سعیدؓ سے نقل کیا۔ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا :

"جو افلاس کے ڈر سے نکاح کرنا چھوڑ دے وہ ہم میں سے نہیں"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"جب تمہارے پاس وُہ آئے جس کے دین و امانت پر راضی ہو تو اس سے نکاح کر دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بہت ہی فتنہ و فساد برپا ہو گا"

روایت میں ہے :

"جو اللہ تعالیٰ کے (حکم کے) باعث نکاح کرے اور اللہ تعالیٰ کے (حکم کے) باعث نکاح کر دے وہ اللہ تعالیٰ کی ولایت کا مستحق ہے"۔ یہ ادنیٰ سی صورت ہے کہ جس سے تجھے ولایت حاصل ہو گی اس لیے کہ ولایت کے مقامات ہیں اور ہر مقام میں ایک عملِ صالحہ ہوتا ہے۔

ترکِ نکاح کی اجازت کب ہے ؟

حضرت بشر بن حارثؒ سے پُوچھا گیا :
"لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں"

پوچھا : "وہ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

---

[1] النور ۳۲۔

کہا، "وہ کہتے ہیں کہ آپ تارکِ سنت ہیں۔ یعنی نکاح نہیں کرتے۔"

فرمایا: "ان سے کہہ دو، میں سنت کی بجائے فرض میں مصروف ہوں۔"

ایک بار فرمایا:

"مجھے اس بات سے کتاب اللہ کی ایک آیت ہی روک رہی ہے کہ،

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ۔ (اور ان (عورتوں) کا حق ہے جیسے کہ ان پر حق ہے)،

شاید میں یہ حق ادا نہ کر سکوں۔ فرمایا کرتے،

"اگر میں ایک مرغی کی پرورش کروں تو بھی ڈر ہے کہ پل صراط پر مجھے کھینچا جاتا۔" یہ بات ۲۱۱ھ میں کہہ رہے ہیں۔ اب ہمارے زمانہ میں حلال اور عورتوں کا معاملہ کیا صورت رکھتا ہوگا؟

ہمارے زمانہ میں سالک کے لیے بہتر یہ ہے کہ اگر فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور عصمت کی حفاظت کر سکے اور گناہ کا خیال پیدا نہ ہو، اس کے قلب پر عورتوں کا خیال اس شدت سے نہ آئے کہ قلبی پراگندگی پیدا ہو جائے یا عورتوں کے امور پر توجہ دینے اور ان سے بات چیت میں مصروفیت کے باعث عبادت الٰہی میں مناسب انہماک نہ کر سکے۔ اس کی نظریں برائی میں نہ پڑیں اور اس کے تقضیب پر شہوت کا غلبہ نہ ہو۔ اس لیے کہ شرمگاہ کی برائیوں میں پہلی برائی یہ ہے کہ دل میں افکارِ فاسدہ کی وجہ سے شہوت پیدا ہو۔

دوسری برائی یہ ہے کہ قلبی شہوت کے بعد فرج میں شہوت آ جائے۔ یہ ایک عمل واقع ہو گیا۔ اور تیسری برائی یہ ہے کہ انسان اپنی شرمگاہ کو لغوظ کی حالت میں پکڑے۔ اب اگر شرمگاہ میں شہوت نمودار ہو گئی تو یہ چوتھی برائی ہے۔ اور دائیں ہاتھ سے شرمگاہ کو چھونا مکروہ ہے۔ یہ حالت طاری ہوتے ہی قلب سے خشوع ختم ہو جاتا ہے اور اس میں خرابی آ جاتی ہے۔ اب اگر اسی قسم کے مفاسد کا ڈر نہ ہو تو ایسے آدمی کے لیے خلوت بہتر ہے۔ اسی میں اسے حلاوتِ وجود اور حلاوتِ عبادت حاصل ہوگی۔ وہ اپنے آپ کا احتساب کرتا رہے گا۔ اپنے حال میں مصروف رہے گا اور غیر کے حال کی فکر نہیں کرے گا اور نہ دوسرے کا حال اپنے آپ پر لاد لے گا۔ پھر خرابی پیدا ہو گی یا کوئی دوسرا حکم لگ جائے گا۔ اب اس کا اپنے شیطان کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے شیطان سے بھی مقابلہ ہوگا۔ دوسرے کا نفس اپنے نفس کے ساتھ ملا لے گا اور پھر اسے نفسانی مجاہدہ اور اس کی خواہش پر صبر کرنے کے لیے ازحد مشقت اٹھانا پڑے گی۔

جب کاروبار میں خرابی آ جائے تو یہ صرف نافرمانی سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس سے پرسش ہو گی کہ کہاں سے کمایا اور کہاں پر خرچ کیا؟ اگر حلال کمائی نہ ہو تو اس پر محاسبہ ہوگا اور اگر اسے خواہش پر خرچ کیا تو اس کا کچھ اجر نہ ہوگا۔

عورت کا فتنہ عورتیں عام طور پر ناقص العقل والدین ہوتی ہیں جہالت و خواہش کا ان پر غلبہ ہوتا ہے اس لیے ان کی وجہ سے اخروی خسارہ اٹھانے کا اور خواہش نفس میں پڑجانے کا سخت اندیشہ رہتا ہے یا ان کی خواہشات ٹھکرا کر دنیاوی زندگی دو بھر کرلے گا کہ وہ ہر وقت منہ چڑھائے بیٹھی رہیں گی۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؛

" اللہ کی قسم ! ایک آدمی جب بھی عورت کی خواہشات پر چلا اللہ تعالیٰ نے اسے اوندھے منہ آگ میں ڈال دیا "

اغنیاء کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ فقراء کا حق ادا کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ حقوق اللہ ادا کرنے میں کوتاہی کرجاتے ہیں اس لیے اکثر اغنیاء بھی ظالموں کے درجہ پر ہوتے ہیں اور اگر یہ فقیر اور عیالدار ہوا تو سخت مشقت ومحنت میں پڑے گا اور اہل وعیال کی خاطر یہ شدید خطرہ ہے کہ کسی طرح کے مفاسد میں جاگرے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مشقت ابتلاء کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا ؛

" کثرتِ عیال اور کمی مال "

بعض سلف کا فرمان ہے ؛

" کمی عیال ، دو میں سے ایک آسانی ہے اور کثرتِ عیال دو فقروں میں سے ایک فقر ہے "

کہا کرتے ہیں ؛

" شہوتِ حلال کی سزا اہل وعیال ہے اور بقدرِ کفایت سے زیادہ چاہنے کی سزا حرص ہے " یہ موحدین کی عقوبت ہے۔

حدیث میں ہے ؛

" برُے ساتھی سے تنہائی بہتر ہے " اب نیک ساتھی کا ملنا غیر یقینی بات ہے اور شک سے یقین زائل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اکثر عورتوں میں بہتری کم ہی ہوتی ہے کیونکہ ان پر دنیاوی محبت وخواہش کا غلبہ رہتا ہے۔

روایت میں ہے ؛

" عورتوں میں ایک نیک عورت کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ایک سو کووں کے اندر ایک سفید پاؤں والا کوا ہو۔ یعنی جس کا پیٹ سفید ہو "

حضرت لقمان ؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی ؛

" اے بیٹے ! بری عورت سے بچو۔ اس لیے کہ یہ تجھے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کر دے گی اور شریر عورتوں سے بچو، اس لیے کہ یہ نیکی کی طرف نہیں بلاتیں اور ان میں سے بہتر عورت احتیاط کے ساتھ حاصل کرو "

بہترین عورتوں (ازواجِ مطہرات) کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم یوسف کی ساتھی عورتیں ہو"۔ یعنی تمہارا ابوبکرؓ کو امامت کرنے سے ہٹانا دراصل خواہش کی طرف میلان و تزئین ہے۔ جیسے کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی۔ یہ اس سے غوایت کا معاملہ تھا۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اعتذار ہے اور زلیخا پر ملامت کی اور ان کی مشابہت اس سے کی اور جب انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راز فاش کیا:
اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا[1] (اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے)
یعنی اس کا خواہش کی طرف میلان ہوا اور دونوں کو اس میلانِ خواہش سے توبہ کرنے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا:
وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ۔ (اور اگر تم دونوں چڑھائی کرو گی اس پر)
یعنی اگر وہ اس کے خلاف تعاون کریں اور یہ بہترین عورتیں ہیں اور جو عورت جہالت و ضلالت کے زیادہ قریب ہو اس کا تو معاملہ ہی خطرناک ہے۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:
"اس قوم نے فلاح نہ پائی جس کی بادشاہ عورت ہو"۔
اللہ تعالیٰ نے بعض بیویوں اور اولاد کی عداوت کی خبر دی۔ فرمایا:
اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ[2] (بعض تمہاری بیویاں اور اولاد دشمن ہے تمہاری، سو ان سے بچتے رہو)
یعنی آخرت میں تمہاری دشمن ہوں گی کہ تمہیں خواہشات میں ڈالیں گی اور تم لوگ ان کی ناقص آراء کی طرف میلان رکھو گے۔ اب کل وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے اور گاہے تو عورت اور لڑکے کی خواہشات کے خلاف چلے اور علم پر عمل کرے تو وہ آج ہی دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب کل قیامت کو خدا جانے کیا قیامت ڈھائیں گے۔
حضرت ابراہیم بن ادہمؒ فرمایا کرتے:
"جو عورتوں کی رانوں کا عادی ہوا اس نے فلاح نہ پائی"۔
حضرت بشرؒ فرمایا کرتے:
"اگر میرے عیال ہوں تو مجھے خطرہ ہے کہ مجھے پُل صراط پر کھینچا جاتا"۔ اس لیے تنہائی میں زیادہ قلبی راحت

---

[1] التحریم ۴
[2] التغابن ۱۴

اور کم فکری ہوتی ہے۔ بوجھ ہلکا رہتا ہے۔ نزاع سے امن رہتا ہے اور احکامِ شرعی ساقط ہونے کا اندیشہ بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ سلف صالحینؒ احکام شرعی ساقط ہونے کے ڈر سے ایسا کر لیا کرتے۔ اس لیے کہ وُہ اس بار کو اٹھانے سے اپنے آپ کو عاجز سمجھتے تھے۔

تنہائی میں اور فائدے بھی ہیں۔ جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کا اہتمام نہیں کرنا پڑتا۔ مکان کی حفاظت، پرسش کے خطرے سے بچا رہتا ہے۔ بری عورت کی وجہ سے کئی خدشات کا ڈر ہے اور جن باتوں سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے ان کی تلاش کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے کہ یہ معاملہ ہی نہیں پڑتا اور دنیا میں زہد کرنے والوں نے قلبی راحت، کم فکری اور پرسش ساقط کرنے کی غرض سے زہد اختیار کیا ہے۔ اس امت کے لیے آخری زمانہ میں عزلت اور تنہائی کو پسند کیا گیا۔

روایت میں ہے:

"دو صدیوں کے بعد میری امت کے لیے تنہائی (و عزلت) مباح کی گئی اور یہ کہ تم ایک بچے کو پالو، اس سے تمہارے لیے بہتر ہے کہ کُتّے کے پلّے کو پالو"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"دو صدیوں کے بعد سب سے بہترین لوگ وُہ ہیں جو کم بوجھ والے ہوں گے۔ جن کا نہ اہل ہو اور نہ بچہ ہو"
(یعنی ذمہ داریاں کم ہوں گی)

ایک دوسری روایت میں ہے:

"لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ایک آدمی کی ہلاکت، اس کی بیوی، اس کے والدین اور اس کے بچے کے ہاتھوں پر ہو گی۔ وہ اسے فقر کی عار دلائیں گے اور اسے اس پر آمادہ کریں گے جس کی اس میں طاقت نہیں۔ پھر ان جگہوں پر جائے گا کہ جہاں اپنا دین گنوا بیٹھے گا۔ چنانچہ ہلاک ہو گا" اور بسا اوقات ایک عورت کسی انسان کیلئے سزا ہوتی ہے۔

کس پر نکاح لازم ہے؟

انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں ہے کہ:

"حضرت یونس علیہ السلام کے پاس کچھ لوگ آئے۔ آپؑ نے ان کی مہمان نوازی کی۔ وہ جب بھی گھر میں داخل ہوتے یا باہر آتے تو ان کی بیوی انہیں ستاتی اور زبان درازی کرتی اور وہ خاموش رہتے۔" لوگوں کو حیرت ہوئی مگر ہیبت کے مارے پُوچھ نہ سکے۔

انھوں نے فرمایا:

"اس پر تعجب نہ کرو، میں نے اللہ عزوجل سے دعا کی تھی، اے پروردگار! تو آخرت میں مجھے جو سزا دے گا

وہ دنیا میں ہی دے دے ۔"

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

"تیری سنا فلاں کی بیٹی ہے تو اس سے نکاح کرلے ۔" میں نے نکاح کر لیا اور جو تم دیکھ رہے ہو اس پر صبر کر رہا ہوں۔ یہ سب اس کے لیے جس کو زنا کا خطرہ نہ ہو اور اگر عنت (زنا) کا خطرہ ہو تو اس صورت میں زنا سے بہتر ہے کہ لونڈی ہی سے نکاح کر لے اور عنت کا معنی ہے ملانے کے بعد توڑنا۔ یعنی وہ عصمت و توبہ کے ساتھ ملا ہوا تھا ۔ پھر لغزش یا بُری عادت کی وجہ سے توبہ اور عصمت ٹوٹ گئی اور لونڈی کے نکاح سے صبر کرنا، اس کے نکاح سے بہتر ہے۔ لونڈی کے نکاح کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے کہ،

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۔

اسی طرح اگر نکاح کے ذکر کرنے کے باعث دل میں طرح طرح کے فاسد اور گندے خیالات ہجوم کر آئیں اور اسے فرض سے غافل کر دیں یا اس کو فکری پراگندگی میں مبتلا کر دیں تو اس صورت میں بھی لونڈی سے ہی نکاح کر لینا بہتر ہے اور اگر آزاد عورت سے نکاح کی سہولت ہو تو پھر لونڈی سے نکاح کرنا حرام ہے ۔

ایک روز حضرت ابن عباسؓ کی مجلس سے تمام لوگ چلے گئے اور ایک نوجوان وہیں بیٹھا رہا اور دیر تک وہیں رہا۔ حضرت ابن عباسؓ نے پوچھا :

"کیا تجھے کوئی ضرورت ہے ؟"

اس نے کہا :

"ہاں، مجھے ایک ضرورت ہے مگر میں آپ سے لوگوں کی موجودگی میں پوچھنے سے شرماتا ہوں۔"

فرمایا : "جو چاہو، پوچھو۔"

اس نے کہا :

"آپ کا رعب و جلال مجھ پر چھایا جا رہا ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا :

"عالم بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے۔ سائل پر اس سے پوچھنے میں وحشت نہیں ہونی چاہیے ۔ تو اپنے باپ کو جو کہہ سکتا ہے وہ مجھے بھی بتا دے ۔ میرے نزدیک تجھ پر کوئی عیب نہ ہوگا۔"

اس نے کہا :

"اللہ آپ پر رحم کرے ، میں نوجوان ہوں میری بیوی نہیں ۔ گاہے مجھے زنا کا ڈر ہوتا ہے تو میں ذکر سے منی نکال لیتا ہوں ۔ کیا اس میں مجھ پر گناہ ہوتا ہے ؟"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے منہ پھیر لیا، پھر فرمایا:

"اف، لونڈی سے نکاح کرنا بھی اس سے بہتر ہے اور یہ زنا سے بہتر ہے۔"

جس آدمی کے پاس دس دراہم ہوں تو علمائے عراق کے نزدیک اس کے لیے لونڈی سے نکاح کرنا حرام ہے۔" اور بعض علمائے حجاز کا قول ہے کہ "جس کے پاس تین درہم ہوں اس کے لیے بھی لونڈی سے نکاح کرنا حرام ہے۔"

ابن مسیبؒ کے بعض اصحاب سے مروی ہے:

"جس کے پاس دو درہم ہوں اس پر لونڈی سے نکاح کرنا حرام ہے۔"

بعض کا قول ہے:

"سب سے بڑا احمق وہ ہے جو آزاد ہو اور لونڈی سے نکاح کرے اور سب سے عقلمند وہ غلام ہے جو آزاد عورت سے نکاح کرے۔ اس لیے کہ یہ اپنے حصّہ کو آزاد کراتا اور وہ غلام بناتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے بچے کو غلام بناتا ہے۔"

مشت زنی کرنے کے بارے میں روایات میں سخت وعید اور سنداً منقول ہے: مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو ہلاک کر دیا۔ اس لیے کہ وہ اپنے ذکروں کے ساتھ فضول حرکت کرتے۔" اسے اسماعیل بن ابان نے انس بن مالک سے باسند بیان کیا۔

حضرت ابو محمدؒ سے عورتوں کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا:

"ان سے صبر کرنا بہتر ہے اور ان پر صبر کرنا (بہتر) نہیں۔ اور آگ پر صبر کرنے سے ان پر صبر کرنا بہتر ہے۔"

ان سے پہلے بھی بعض علماء سے اس طرح منقول ہے:

"عورتوں کی دوا سے تنہائی کی دوا زیادہ بہتر ہے۔"

ایک صاحبِ تقویٰ و یقین بصری عالمؒ سے ہمارے زمانہ جیسے دَور میں عورتوں سے نکاح کرنے کے بارے میں پوچھا گیا، اور بتایا کہ:

"آجکل کاروبار میں رکاوٹیں آگئیں۔ حلال کم ہو گیا۔ عورتوں کا بگاڑ زیادہ ہو گیا ہے تو انھوں نے تقویٰ کی خاطر اسے ناپسند کیا اور مدافعت کرنے کا حکم دیا۔ مگر جب دوبارہ سوال کیا گیا تو فرمایا:

"یہ گناہوں میں داخل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ حرام کاروبار اور آفات میں گھسنے کے بعد انسان کیا کرتا ہے اور جس نے دین کے عوض کھایا اور مخلوق کے لیے تصنّع کیا اسے اس وقت میں نکاح کرنا مناسب نہیں۔ البتہ اگر وہ ایک گدھے کی خصلت لیے ہوئے ہے جہاں ایک گدھی پر نظر پڑی تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ فوراً کود کر چڑھ گیا۔ اور جب تک سر پر ڈنڈا نہ لگے، پیچھے نہ ہٹے۔ اگر انسان کی یہ حالت ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا افضل

بات ہے۔

حضرت قتادہؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تشریح کی :

وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا۔ (اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا کہ جس کی ہم میں طاقت نہیں)

اور فرمایا :

مراد ہے اغلام کی آفت میں نہ ڈالنا۔

حضرت عکرمہؓ اور مجاہدؒ سے مروی ہے :

وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔

فرمایا : مطلب یہ ہے کہ انسان "عورتوں سے صبر نہیں کرتا۔"

حضرت نیامن بن نجیحؒ سے مروی ہے :

"جب ایک آدمی کا قضیب کھڑا ہو جائے تو اس کی تہائی عقل جاتی رہی۔"

بعض کا فرمان ہے :

"اس کا تہائی دین جاتا رہا۔"

وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ (اور اندھیرے کی برائی سے جب وہ چھا جائے)

اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قضیب کھڑا ہو جائے اور بعض روایات نے اسے باسند بتایا۔ البتہ اس میں یہ بھی کہا :

"جب قضیب داخل ہو جائے اور قضیب کھڑا ہونے کا ذکر نہیں کیا۔"

ایک روایت میں ہے :

"جب آدمی نے نکاح کر لیا تو اس نے اپنا نصف دین بچا لیا۔ اب اسے دوسرے نصف کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔"

حضرت براء ابن عازب کی دعا میں ہے :

اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَ بَصَرِیْ وَ قَلْبِیْ وَ مَنِیِّیْ۔ (میں اپنے کان، اپنی آنکھ، اپنے دل اور منی کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

اس لیے کہ جب ریڑھ میں منی بھر جائے تو وہ باہر آنا چاہتی ہے۔ اس سے قلبی بگاڑ کا خطرہ ہوتا ہے اور اس کی بیماری بھی خون کی طرح ہوتی ہے کہ جب وہ رگوں میں زیادہ ہو جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور خون میں طبخ آتا ہے اور یہ سفید ہو کر اللہ تعالیٰ کے اذن سے منی بن جاتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کی مجلس میں عورتوں کا ذکر ہوا۔ ایک قوم نے عورتوں کی مذمت کی تو فرمایا:

"ایسا مت کرو، پھر مریض کی تیمارداری نہ ہوتی اور مُردے پر کوئی نہ روتا۔ اور نہ ہی ان کی طرح گھروں کو کوئی آباد کرتا اور نہ ہی ان جیسی چیزوں کا انسان محتاج ہوا۔"

بعض تفسیر میں اس فرمان

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا[1] (ہم نے بنایا ہے جو کچھ زمین پر، اس کی رونق)

میں بتایا:

"عورتیں اس دنیا کی زینت بنائی گئیں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ فرمایا:

"نوجوان کی عبادت اس وقت مکمل ہوتی ہے کہ جب وہ نکاح کرلے" اور وہ اپنے غلاموں کو بالغ ہونے کے قریب دیکھتے تو جمع کرتے۔ عکرمہ اور کریب وغیرہ کو جمع کر کے فرماتے:

"اگر تم نکاح کرنا چاہو تو میں تمہارا نکاح کر دوں۔ اس لیے کہ بندہ جب زنا کرتا ہے تو اس کے قلب سے نورِ ایمان نکل جاتا ہے۔"

حضرت ابو الزوائدؒ کو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"نکاح سے تمہیں صرف عاجز آنا یا فجور روکتا ہے۔"

بعض علمائے خراسان سے منقول ہے کہ ان کے ایک صالح شیخ کا طریقہ تھا کہ وہ حضرت ابن مبارکؒ کے اصحاب میں سے حضرت عبدان کی مصاحبت میں رہتے۔ ان کے علم و تقویٰ کی بہت تعریف کرتے اور حالات بتاتے۔ فرمایا: کہ وہ کثرت سے نکاح کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی دو یا تین بیویاں ہوتیں ان پر کسی نے عتاب کیا تو فرمایا:

"کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بیٹھا ہو یا اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو اور عبادت کر رہا ہو۔ پھر اس کے دل میں شہوت کا خیال آیا ہو یا اس نے ایسی بات پر دھیان دھرا ہو؟"

لوگوں نے کہا:

"گاہے ہمیں کثرت سے ایسے وساوس آتے ہیں۔"

فرمایا: "تمہاری عمر جس حال کی ہے اگر ہمیں زندگی کا ایک لمحہ بھی اس طرح کا پسند کرتا تو نکاح ہی نہ کرتا۔"

پھر فرمایا:

---

[1] الکہف ۷

"میرے دل میں جب بھی ایسا خیال آیا میں نے اس سے آرام پانے کے لیے اور اپنے کام میں دلجمعی کے ساتھ مصروف ہونے کے لیے اس کو نافذ کر لیا (یعنی بیوی سے ہم بستری کر کے یہ شہوانی خیال باہر نکال دیا)"

پھر فرمایا:

"چالیس برس سے میرے دل میں برائی کا خیال تک نہیں آیا۔"

ایک عالم نے ایک جاہل کو دیکھا کہ وہ صوفیا پر طعن کر رہا ہے۔ فرمایا:

"ابے، تیرے نزدیک ان میں کیا نقص ہے؟"

اس نے کہا،

"وہ کھاتے زیادہ ہیں۔"

فرمایا، "اگر تجھے بھی اس قدر بھوک لگے جس قدر انہیں لگتی ہے تو تو بھی اسی قدر کھاتا۔"

پھر فرمایا:

"اور کیا سبب ہے؟"

اس نے کہا: "وہ نکاح کثرت سے کرتے ہیں۔"

فرمایا: "اگر تو بھی اپنی شرم گاہ کی ایسی حفاظت کرتا جیسی وہ کرتے ہیں تو تو بھی اسی قدر نکاح کرتا اور وجہ بتاؤ۔"

اس نے کہا،

"وہ کلام بہت سنتے ہیں۔"

فرمایا: "اگر تیری نظر بھی ویسی ہوتی جیسی ان کی ہے تو تو بھی ویسے ہی سنتا جیسے وہ سنتے ہیں۔"

ایک عالم سے پوچھا کہ

"فقراء زیادہ نہیں کھاتے مگر جماع زیادہ کرتے ہیں اور شیرینی انہیں بہت پسند ہے۔"

فرمایا، "اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا فاقہ طویل ہے اور کھانا پایا جانا ان پر مشکل ہو رہا ہے جب پاتے ہیں خوب کھاتے ہیں اور شیرینی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے شراب پینا چھوڑ دیا اور نفسانی لذات سے الگ ہو گئے چنانچہ شیرینی میں ہی ان کی تمام لذات جمع ہو گئیں اور وہ اسے کھاتے ہیں۔

اور چونکہ ظاہر میں وہ نظروں پر پردہ ڈالتے ہیں، حرام کی طرف نہیں دیکھتے اور قلوب کو خیالات آنے سے تنگ کر دیا۔ اب نکاح میں انہوں نے وسعت کر لی اور جب اعضائے ظاہر کو بدنظری کی جگہوں سے بچایا تو نکاح کی کثرت کر لی۔"

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں :

"جس طرح میں خوراک کا ضرورت مند ہوں اس طرح میں جماع کا بھی ضرورت مند ہوں"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زاہد و عالم صحابہؓ میں سے تھے۔ یہ کثرت سے روزے رکھا کرتے اور وہ کھانے سے پہلے جماع کر لیتے اور گاہے مغرب کی نماز سے پہلے ہی جماع کر لیتے۔ پھر غسل کر کے نماز ادا کرتے۔ ان کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے رمضان میں نمازِ عشاء سے پہلے چار لونڈیوں سے جماع کیا۔

نکاح کی اہمیت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے :

"اس امت میں بہترین وہ ہیں جو کثرت سے نکاح کرتے ہیں"۔

حضرت سفیان بن عینیہ فرمایا کرتے :

"بیویوں کی کثرت دنیا نہیں ہے اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ زاہد ہیں۔ ان کی چار بیویاں اور سترہ لونڈیاں تھیں۔ اس طرح نکاح کرنا ایک سنتِ اسلاف ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے اخلاق میں سے ہے"۔

انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں آتا ہے کہ ایک عابد نے تنہائی اختیار کی اور اس قدر عبادت کی کہ اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے بڑھ گیا۔ اس زمانہ کے نبی کے سامنے اس عابد کا ذکر کیا گیا اور لوگوں نے اس کی خوب تعریف کی۔ اس زمانہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"یہ آدمی خوب ہے اگر یہ تارکِ سنت نہ ہوتا۔ بتاتے ہیں کہ اس عابد کو کسی نے یہ بات پہنچا دی۔ اسے بڑا فکر ہوا اور کہنے لگا کہ اگر میں تارکِ سنت ہوں تو میری دن رات کی عبادت بے فائدہ ہے۔" چنانچہ وہ نبی علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا اور خود پوچھا تو نبی علیہ السلام نے فرمایا :

"ہاں، تم نکاح کی سنت کے تارک ہو"۔

اس نے عرض کیا :

"میں نے اسے حرام سمجھ کر نہیں چھوڑا بلکہ میں محتاج ہوں۔ میرے پاس کچھ چیز نہیں اور میں لوگوں پر بوجھ ہوں ایک بار یہ کھلاتا ہے اور دوسرے وقت میں یہ کھلا رہا ہے۔ اس لیے میں نے اسے پسند نہ کیا کہ نکاح کر کے ایک عورت کو باندھ کر اس پر ظلم کروں اور ان پر مشقت ڈالوں"۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا :

"تجھے صرف یہی رکاوٹ ہے؟"

عرض کیا: "ہاں"

فرمایا: "میں اپنی بیٹی کا تجھ سے نکاح کرتا ہوں" واقعہ طویل ہے قصہ کوتاہ اس نبی علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا۔

حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام نے ایک عورت سے نکاح کیا اور وہ اس سے مقاربت نہ کرتے تھے۔ بتاتے ہیں کہ نظر بچانے کے لیے اور ایک قول کے مطابق فضیلت کی خاطر نکاح کیا گویا انہوں نے تمام فضائل جمع کرنے کے ارادہ سے اور ایک قول کے مطابق سنّت پر چلنے کے لیے ارادہ سے نکاح کیا۔

حضرت بشر بن حارث رحمہ اللہ، حضرت امام احمد بن حنبل کی فضیلت کے بہت قائل تھے۔ فرماتے، انہیں مجھ پر تین فضیلتیں حاصل ہیں:

۱۔ وہ اپنے لیے اور دوسرے کے لیے حلال تلاش کرتے ہیں۔ اور میں صرف اپنے لیے حلال تلاش کرتا ہوں۔

۲۔ انہوں نے نکاح میں وسعت کی ہے اور میں نے اس سے انقباض و تنگی دکھائی۔

۳۔ وہ عوام اہلِ اسلام کے امام ہوئے اور میں اپنے آپ کی خاطر تنہائی کا متلاشی ہوں۔

بتاتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کی بیوی ام عبداللہ کی وفات ہوئی تو آپ نے ان کی وفات کے بعد دوسرے روز ہی نکاح کر لیا۔

بتاتے ہیں کہ انہوں نے ساری عمر میں بیوی فوت ہونے کے بعد صرف ایک روز ہی تجرد کی زندگی گزاری۔

بتہ حضرت بشر اپنے بارے میں ایک استدلال کیا کرتے تھے ان سے پوچھا گیا:

"لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں"

فرمایا: "کیا اعتراض؟"

کہا: "وہ کہتے ہیں کہ آپ ترکِ نکاح کے باعث تارکِ سنّت ہیں"

فرمایا: "انہیں کہہ دو، میں سنت کی بجائے فرض میں مشغول ہوں"

دوسری بار پھر کسی نے اعتراض کیا تو فرمایا:

"مجھے اس کام سے کتاب اللہ کی ایک آیت نے ہی روک رکھا ہے۔ یعنی

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ۔ (اور ان کے لیے ہے اسی طرح جیسے کہ ان پر ہے)

بتاتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو فرمایا:

"بشر جیسا کون ہے؟ وہ نیزے کی نوک پر گویا بیٹھے ہیں"

بتاتے ہیں کہ جب ان کا انتقال ہوا تو وفات کے بعد کسی نے انہیں خواب میں دیکھا اور ان کی حالت کے

بارے میں پُوچھا: تو فرمایا:

"علیین میں میرے ستر درجات بلند کیے گئے۔ مجھے انبیا کے مقامات پر جبکہ عطا ہُوئی اور اہل و عیال والوں کے درجہ پر نہیں پہنچ سکا۔"

ایک روایت میں یہ ہے کہ فرمایا:

"میرے رب تعالیٰ نے مجھ پر عتاب کیا اور فرمایا: "اے بشرؒ! میں یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ تُو مجھے تجرد کی حالت میں ملے۔"

میں نے پُوچھا:

"ابو نصر تمارؒ کے ساتھ کیسا سلوک ہُوا؟"

فرمایا: "انہیں مجھ سے ستر درجات بلند تر ملے۔"

ہم نے پُوچھا:

"کیوں؟ ہم تو آپ کو ان سے بڑھ کر سمجھتے تھے؟"

فرمایا: "وہ اپنی بیٹیوں اور اہل و عیال پر صبر کرتے تھے۔"

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے:

"اگر میری عمر میں سے صرف دس دن باقی رہ گئے ہوں اور ان کے بعد میری موت ہو تو میں چاہوں گا کہ میں نکاح کروں اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات ایسے نہ کروں کہ میں تجرد کی حالت میں ہُوں۔"

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی بیوی طاعون کی مرض میں وفات پا گئیں ان کو طاعون کا اثر تھا۔ فرمایا:

"میرا نکاح کر دو۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ سے حالتِ تجرد میں ملاقات کروں۔"

بعض صحابہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اقامت اختیار کر لی۔ رات آپؐ کے پاس رہتے اور ضرورت پڑتی تو خدمت کرتے۔ آپؐ نے اس کو فرمایا:

"تو نکاح نہیں کر لیتا؟"

انھوں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ، میں فقیر ہوں۔ میرے پاس کچھ چیز نہیں اور دُوسرے میں آپ کی خدمت سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔" آپؐ خاموش رہے۔ پھر دوبارہ ایک روز آپؐ نے اسے یہی فرمایا:

"تم نکاح نہیں کر لیتے؟"

انھوں نے پہلے کی طرح جواب دیا۔ پھر صحابیؓ نے اپنے جی میں سوچا اور عرض کیا:

"اللہ اور اس کا رسول دنیا و آخرت میں میری بہتری کی بات کو خوب جانتے ہیں جو مجھے اللہ کا قرب عطا کرے۔ اگر آپؐ نے تیسری بار مجھے فرمایا تو میں ضرور کروں گا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا:

"تم نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟"

بتاتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ، آپؐ میرا نکاح کر دیجئے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"فلاں قبیلے کے پاس جاؤ اور ان سے کہو، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیٹیوں (میں سے کسی بیٹی) سے میرا نکاح کر دو۔"

بتاتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے پاس کچھ چیز نہیں۔"

آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو فرمایا:

"اپنے بھائی کے لیے گٹھلی کے وزن کے برابر سونا جمع کر دو۔"

صحابہؓ نے جمع کر دیا اور وہ قوم کی طرف گئے۔ انہوں نے ان کا نکاح کر دیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ولیمہ کرو۔"

عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ، میرے پاس کچھ چیز نہیں۔"

آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

"اپنے بھائی کے ایک بکری کی قیمت جمع کر دو۔" صحابہؓ نے جمع کی۔ اس نے کھانا تیار کر کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کو دعوت دی۔

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"جس کو فراخی حاصل ہو اسے نکاح کرنا چاہیے۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"تم میں سے جس میں قوتِ باہ ہو یعنی جماع کی قوت ہو اسے نکاح کرنا چاہیے۔" اس لیے کہ یہ نظر بچانے اور شرم گاہ کی حفاظت کی بہتر صورت ہے اور جو (بیوی) نہ پا سکے تو اسے چاہیے کہ وہ روزے رکھے۔ اس لیے

کہ اس کے لیے روزے ہی وجاء ہے اور وجاء کا مطلب یہ ہے کہ بکرے کے خصیے کچل دینا، جس کی وجہ سے اس میں نر ہونے والی صفت ختم ہو جائے۔ عرب لوگ ایسا کرتے ہیں کہ دو پتھروں کے درمیان خصیہ رکھ کر مارتے اور اس کی نر ہونے کی قوت ختم کر دیتے۔ اس کی شہوت ختم ہو جاتی اور وہ موٹا ہو جاتا۔"

اسی سے روایت ہے؛

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو املح موجؤۃ دنبے قربان کیے۔" یعنی سفید تھے اور ان کے خصیے کچل دیے گئے تھے۔

کثرتِ اولاد کی ضرورت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے؛

"نکاح کرو، نسل بڑھاؤ، اس لیے کہ میں قیامت کے روز دوسری امتوں پر تمہاری کثرت دکھاؤں گا۔" حتیٰ کہ ساقط ہونے والا اور شیر خوار بچہ بھی۔

ایک دوسری خبر میں ہے:

"جس نے مجھ سے محبت کی اسے میری سنت کا اتباع کرنا چاہیے۔" یعنی نکاح کرنا چاہیے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

"جس نے افلاس کے ڈر سے نکاح کرنا چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کثرت سے نکاح کیے۔ فرمایا کرتے،

"میں صرف بچے کی خاطر نکاح کرتا ہوں۔"

سلف صالحین کی ایک بڑی جماعت کی نکاح کرتے وقت یہ نیت ہوتی کہ ان کے ہاں اولاد ہو۔ وہ زندہ رہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لائے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے یا اگر وفات پا جائے تو ایک نیکی بن کر ان کے نامۂ اعمال میں تلے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"بچہ اپنے والدین کو اپنے نال کے ساتھ جنت کی طرف گھسیٹے گا۔ بچے سے کہا جائے گا جنت میں جاؤ، تنبایا کہ وہ جنت کے دروازے پر کھڑا ہو جائے گا اور محبنط (یعنی غیظ و غضب سے) بھر جائے گا۔ وہ کہے گا، میں اپنے والدین کو ہمراہ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ کہا جائے گا کہ اس کے والدین کو اس کے ہمراہ جنت میں داخل کر دو۔"

ایک غریب خبر ہے:

"قیامت کو جب مخلوق کو حساب پر لایا جائے گا اس میدان میں بچوں کو جمع کیا جائے گا اور فرشتوں کو کہا جائے گا۔

"ان کو لے کر جنت میں لے جاؤ۔"

بتایا کہ وہ جنت کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں گے انہیں فرشتے کہیں گے:

مرحبا، مسلمانوں کی اولاد۔ داخل ہو جاؤ تم پر کوئی حساب نہیں۔"

وہ کہیں گے:

"ہمارے باپ اور مائیں کہاں ہیں؟"

دربان کہے گا:

"تمہارے باپ اور مائیں تمہاری طرح نہیں۔ ان کے گناہ اور برائیاں ہیں۔ ان کا حساب ہو رہا ہے اور ان پر مطالبات ہو رہے ہیں۔"

فرمایا: "وہ جنت کے دروازے پر ایک زبردست چیخ و پکار مچا دیں گے اور رونا دھونا شروع کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے مگر فرشتوں کو فرمائے گا:

"یہ کیسی چیخ و پکار ہے؟"

وہ عرض کریں گے:

"اے ہمارے پروردگار، مسلمانوں کے بچے کہہ رہے ہیں کہ ہم جنت میں اپنے والدین کے ہمراہ ہی جائیں گے۔"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"اس مجمع میں گھس جاؤ، اپنے والدین کے ہاتھ پکڑ لو اور انہیں اپنے ہمراہ جنت میں داخل کر دو۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس کے دو لڑکے فوت ہو جائیں اسے دوزخ سے بچنے کے لیے ایک آڑ مل گئی۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"جس کے تین بچے فوت ہو جائیں، جو بلوغت تک نہ پہنچے ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے انہیں خاص طور پر جنت میں داخل کرے گا۔"

عرض کیا گیا:

"اے اللہ کے رسول، اگر دو ہوں۔"

فرمایا: "اور دو ہوں (تو بھی جنت میں داخل کرے گا)"

ایک بزرگ کو نکاح کا کہا جاتا تو وہ ایک مدت تک انکار کرتے رہے۔ ایک روز سو کر اٹھے تو فرمایا:

"میرا نکاح کر دو۔"

پوچھا گیا، "کیا وجہ ہے؟"

فرمایا، "شاید اللہ تعالیٰ مجھے ایک بچہ عطا کرے یا اسے وفات دے تو میرے لیے آخرت میں آگے بھیجی ہوئی (نعمت و امداد) ہو۔" پھر اس کی وجہ بیان کی۔ فرمایا،

"میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا قیامت ہو چکی اور میں بھی موقفِ (قیامت) میں تمام مخلوقات کے اندر ہوں۔ مجھے اس قدر پیاس لگ رہی ہے کہ میری گردن ٹوٹنے کے قریب ہے۔ تمام مخلوقات گرمی، آفتاب اور کرب و بے چینی میں ہے۔ بتایا کہ ہم اس حالت میں تھے۔ اچانک بچے اس مجمع میں گھس آئے، ان پر نور کے رومال ہیں اور ان کے ہاتھوں میں چاندی کے لوٹے ہیں اور سونے کے گلاس ہیں اور وہ ایک ایک کو پلاتے جاتے ہیں۔ مجمع میں گھسے جاتے اور زیادہ تر لوگوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کہا کہ میں نے ایک بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا: "مجھے پانی پلا دو، پیاس نے مجھے نڈھال کر دیا ہے"۔ اس نے کہا:

"ہم میں تیرا بچہ کوئی نہیں۔ ہم تو اپنے اپنے والدین کو پلا رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

اس نے کہا،

"ہم مسلمانوں کے فوت شدہ بچے ہیں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"تمہاری بہترین عورتیں، محبت کرنے والی اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہیں۔"

مروی ہے،

"بچہ نہ جننے والی عورت سے مکان میں ایک چٹائی بہتر ہے۔"

ایک روایت یہ بھی ہے،

"نہ جننے والی خوب صورت سے خوب جننے والی سیاہ عورت بہتر ہے۔" یہ سب اسی وجہ سے ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں اور میری سنت نکاح کرنا ہے۔ جس نے مجھ سے محبت کی اسے میری سنت ضرور اپنانی چاہیے۔"

بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں صرف عیالدار انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہی کیا ہے اور یہ پینتیس ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نکاح کیا اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہو کر نکاح کریں گے اور ان کے ہاں اولاد بھی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ عیالدار کو مجرد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسی کہ مجاہد کو

جہاد سے الگ ہو کر بیٹھ رہنے والے پر فضیلت حاصل ہے اور عیالدار کی دو رکعتیں مجرد کی ستر رکعات سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں علیہم الصلاۃ والسلام کا وصف بتایا اور فرمایا :

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ[1] (اور بھیجے ہیں ہم نے کتنے رسول تجھ سے پہلے، اور دی تھیں ان کو بیویاں اور اولاد)

چنانچہ ازواج اور ذریت کو ان کی مدح فرمایا۔ اس طرح اولیائے کرام کو اس دعا کی وجہ سے ان سے لاحق کیا کہ

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ[2] (اور جو کہتے ہیں اے رب ہیں اپنی بیویوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف آنکھوں کی ٹھنڈک دے)

چنانچہ انہوں نے اس کا فضل مانگا اور جس طرح مردوں کے لیے نکاح کرنا افضل بات ہے۔ اس طرح عورتوں کے لیے نکاح کرنا زیادہ افضل اور باعث ثواب ہے تاکہ ان کے ذمہ سے کمانے کی مصروفیت دور ہو جائے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی عورتوں کو نکاح کرنے کا حکم دیا اور منکوحہ عورت کا مجردہ عورت پر افضل ہونا کئی احادیث میں آتا ہے۔

۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" اللہ تعالیٰ ان مجرد رہنے والوں مردوں پر لعنت کرے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نکاح نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت کرے جو مجرد ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم نکاح نہیں کرتیں " حالانکہ آپ نے مرد کا عورت پر بہت بڑا حق بتایا اور اس کی ثقالت واضح کر دی۔ آخر ایک عورت یہ کہہ اٹھی :

" پھر میں کبھی نکاح نہیں کروں گی "

آپ نے فرمایا :

" بلکہ نکاح کرلے، یہی بہتر ہے " میاں بیوی کے لیے مشترک اجر و ثواب کی روایات بھی بکثرت ہیں اور ہمارا مقصد یہاں پر جمع کرنا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ[3] (سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو)

---

[1] الرعد ۳۸

[2] الشعراء ۷۴

[3] البقرہ ۲۲۳

اَنّٰی میں تین معانی ہیں۔ ان میں سے دو معنی اس طرح ہُوئے :

جیسے تم چاہو۔ چاہے رات کو، چاہے دن کو۔ اور چاہے سامنے سے آؤ اور چاہے پیچھے سے مگر دبر میں یہ کام مت کرو۔ اور تیسرا معنی ہے اَیْنَ کا۔ یعنی کہاں فعل کرے۔ یعنی آگے پیچھے جیسے چاہے۔ یہ معنی غلط ہے اور اس کی اجازت نہیں بلکہ صرف سامنے کے مقررہ راستہ سے ہی جماع کرنے کی اجازت ہے۔

پھر فرمایا :

وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ۔ (اور اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو)

یعنی نکاح سے پہلے ایسا کرو۔ اس کا فاؔ تو پر عطف ہے اور یہ تین وجوہ میں سے ایک ہے۔ اس لیے کہ اس میں جناب کے غسل کی فضیلت ہے، عورت سے ملاقات کی فضیلت ہے اور جب عورت سے اس نے ملاعبت و تقبیل کی تو اسے کئی نیکیاں ملیں گی۔ اگر وہ غسل کریں گے تو ہر قطرہ سے ایک فرشتہ پیدا ہوگا جو قیامت تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا رہے گا اور اس کا ثواب ان دونوں کو ملے گا۔ اور نکاح کرنے میں دونوں کی عفت بھی ہے اور نطفہ کو مقامِ نطفہ میں رکھنے کا معاملہ بھی بن جائے گا۔ الغرض نکاح میں کئی ایک فضائل ہیں۔ جناب رسول اللہ صلعم نے اس کا حکم دیا۔ فرمایا :

"تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ شکرگزار دل، ذکر کرنے والی زبان اور ایسی مومن عورت لے کہ جو آخرت پر اس کی مددگار ہو" اور وَ قَدِّمُوْ لِاَنْفُسِكُمْ میں دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑکا آگے بھیجو۔ یعنی آخرت کے لیے اسے ذخیرہ کرو۔ یہ ایک عمل ہے جیسے کہ فرمایا :

اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَآ اَلَتْنٰهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ[1] (پہنچا دیا ہم نے ان تک ان کی اولاد کو، اور گھٹایا نہیں ہم نے ان کا یہ ان کا عمل کچھ)

یعنی ہم نے ان کی اولاد کو ان کا نقص نہیں بنایا، بلکہ انہیں اولاد کی وجہ سے جزا دی اور ان کی نیکیوں میں اضافہ کر دیا۔ اس لیے کہ اولاد بھی ان کے اعمالِ حسنہ اور کسب حسنہ ہیں۔ جیسے کہ فرمایا :

مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ۔ (نہیں کام آیا مال اس کا اور جو اس نے کمایا)

یعنی اس کا بچہ۔

تدبر سے معلوم ہُوا کہ جیسے ایک مومن اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرے تو آخرت میں کام آئے گا۔ اسی طرح ایک نیک بچہ بھی آخرت میں کام آئے گا۔

---

[1] الطور ۲۱

ایک روایت میں ہے:

"آدمی کا لڑکا، اس کے کسب میں ہے۔ چنانچہ حلال تو وہ ہے جو اس کے لڑکے کی کمائی سے ہے۔"

وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ میں تیسری توجیہ یہ ہے کہ جماع کے وقت بسم اللہ پڑھ لے۔ یعنی آخرت کے ذخیرہ کی خاطر اس وقت اللہ کا نام لے لے۔ چنانچہ جماع کرنے والے کو چاہیے کہ وہ جماع کے وقت یہ دعا پڑھے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور پھر قل ھو اللہ احد پڑھے اور بعض محدثین کا طریقہ تھا کہ جب جماع کرتے تو کلمہ طیبہ پڑھتے اور اللہ اکبر کہتے۔ حتیٰ کہ گھر والے بھی سن لیتے۔

اگر ایک عورت نیک کاموں میں مرد کی مددگار ہو اور کم پر قناعت کرنے والی ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اس پر شکر کا مطالبہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ [1] (اور اچھی کر دی اس کے لیے اس کی عورت)

اب یہ اس پر اللہ تعالیٰ کا احسان و کرم ہوا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ بدخلق تھی اسے خوش خلق کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ زبان دراز تھی اسے شیریں زبان کر دیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"مجھے حضرت آدم علیہ السلام پر دو فضیلتیں عطا کی گئیں۔ ان کی بیوی معصیت پر ان کی مددگار بنی اور میری بیویاں طاعت پر مددگار رہیں۔ ان کے ساتھ لگا ہوا شیطان کافر تھا اور میرے ساتھ لگا ہوا شیطان مسلمان ہے۔ وہ مجھے بھلائی ہی کا مشورہ دیتا ہے۔" اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں سے شمار کیا گیا۔

اگر ایک عورت خوب صورت، خوش اخلاق، سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والی، فراخ چشم اور سفید رنگ کی ہو۔ خاوند سے محبت رکھے۔ نظریں جھکائے رکھے۔ تو یہ حور عین کے اخلاق کی عورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ۔ (ان میں خوش اخلاق خوش شکل ہیں)

فرمایا:

وَ حُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ [2] (اور گوریاں بڑی آنکھوں والیاں کی، برابر پلٹے موتی کے)

حور کا مطلب گوری، عین کا مطلب فراخ چشم ہے۔ یہ عیناء کی جمع ہے اور حوراء کا مطلب گورے بدن والی،

---

[1] الانبیاء ۹۰

[2] الواقعہ ۲۲، ۲۳۔

آنکھوں کی سفیدی تیز، سیاہی بھی تیز اور سیاہ بال۔

فرمایا: عُرُبًا - عربۃ کے دو معنی ہیں:

خاوند کی عاشق ہو اور جماع کرانے کی خواہشمند ہو۔ ایسا ہونے سے لذت میں کمال آتا ہے۔ اس لیے کہ اگر عورت خاوند سے محبت نہ کرے اور جماع کی خواہشمند نہ ہو تو لذت میں کمی آجاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اہل جنت کی بیویوں کا وصف بتایا کہ لذتِ کاملہ حاصل ہوگی۔

کہا کرتے ہیں:

رجل شبق (شہوتی مرد)

امراۃ عربۃ (شہوتی عورت)

ایک روایت میں ہے:

"تمہاری عورتوں میں بہترین وہ ہیں جو اپنے خاوند پر شہوت کریں۔"

ایک دانا کا قول ہے:

تین لذتیں بے مثال ہیں:

گرمیوں میں سلوار (بند کپڑے) کے بغیر چلنا۔ ساحل پر پاخانہ کرنا اور جماع کی خواہشمند عورت سے جماع کرنا

اللہ تعالیٰ نے کمالِ وصف یہ بتایا:

قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ۔ یعنی ان کی نظریں صرف اپنے خاوندوں پر محدود ہو کر رہ گئیں۔ وہ نہ اس سے زیادہ کسی دوسرے کو خوب صورت سمجھتی ہیں اور نہ ہی اس کے بدلہ میں دوسرا خاوند چاہتی ہیں۔

نیک عورت ایک نعمت ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہاری عورتوں میں سے بہترین وہ ہے کہ جب مرد اس کی طرف دیکھے تو اسے مسرور کرے اور جب اسے حکم کرے تو اس کی اطاعت کرے اور جب مرد اس سے غائب ہو تو وہ اس کی جان و مال کی حفاظت کرے۔"

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً۔ (اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں اچھی زندگی عطا کر)

اس کے مفہوم میں محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، "اس سے مراد نیک عورت ہے اور فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً۔[1] (سو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی دیں گے)

---

[1] النحل ، ۹۷

یعنی نیک عورت دیں گے ۔ یہ بھی ایک تفسیر ہے ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے ،

" نیک عورت ، دنیا میں سے نہیں اس لیے کہ یہ تجھے آخرت کے لیے فارغ کرتی ہے"۔ البتہ فرمایا کرتے ،

" مفرد آدمی عبادت میں وہ لذت حاصل کرتا ہے جو شادی شدہ کو حاصل نہیں"۔

حضرت عمر بن خطاب فرمایا کرتے تھے ،

" اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے بعد نیک عورت سے زیادہ بہتر انسان کو نہیں دی گئی"۔ عورتوں کا وصف بتایا کہ ان میں سے بعض بکریاں ہیں جن کے عوض کوئی عطیہ نہیں لیا جاتا ۔ بعض عورتیں نرا کھوٹ ہیں ۔ ان کی کچھ قیمت ہی نہیں کہ ان کے عوض کچھ مل سکے ۔ اب یہی ہے کہ اس سے کچھ راحت نہ ملے ۔ ایسی کھوٹی عورت کا شوہر اسیر ہے اور عورت کی موت کے بغیر اسے چھٹکارا نہیں ملتا ۔

عرب لوگ اگر کسی قیدی کو سخت ایذا دیتے تو بکری کی جلد اسے پہنا دیتے اور وہ اس کے جسم پر چپک جاتی ۔ آخر اسی حالت میں وہ دم گھٹ کر مر جاتا ۔ پھر اس کو ٹھڈ لگا کرتے بلکہ وہ پڑا رہتا ، اس میں کیڑے پڑ جاتے ۔ یہی مثل ہے جو ایذا دہ عورت کی طرح ہے ۔ یاد رکھیے عورتیں نفسانی اوصاف پر ہوتی ہیں جس نے نفسانی اوصاف کو سمجھ لیا ۔ اس نے عورتوں کو بھی سمجھ لیا ۔ تجربہ و نقل سے انہی پر انہیں قیاس کیا جا لے گا ۔ بعض عورتیں ڈھیلے پیٹ کی ہوتی ہیں ۔ یہ ادنیٰ ترین عورت ہے ۔ بعض عورتیں برائی کا حکم کرنے والی ہیں اور بدترین عورتیں ہیں ان سے بداخلاقی اور بیہودہ گوئی کے سوا کچھ حاصل نہیں ۔ بعض عورتیں نفس لوامہ کے قائم مقام ہیں ۔ یہ نیک عورتیں ہیں ۔ بعض نفس مطمئنہ کی طرح ہیں ۔ یہ عورتیں بہت ہی نیک ، راضی رہنے والی اور پرسکون زندگی گزارنے والی ہیں ۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اگر عزلت نشینی اور تجرد میں انسان کے قلب و حال کا معاملہ درست رہتا ہو تو تجرد اختیار کرے ۔ اس لیے کہ اس میں سلامتی تو ہے اور ہمارے اس زمانہ میں سلامتی بھی فضیلت و غنیمت کی بات ہے اور اگر نکاح کو جی چاہے اور خواہشات نفس سے خطرہ محسوس کرتا ہو تو دین کی سلامتی کی خاطر نکاح کر لے اور ایک بیوی کافی نہ ہو تو دوسری بیوی بھی کر لے اور اگر دو بیویاں بھی ناکافی ہوں تو تین اور چار تک بیویاں کر سکتا ہے ۔ اس لیے کہ اگر قوت و شہوت زیادہ ہو اور نکاح کر کے انسان برائی سے بچنا چاہے تو چار عورتیں بمنزلہ ایک کے ہیں اور اگر ایک عورت ہی کفایت کر جائے اور اس سے عفت حاصل ہو جائے تو ایک ہی عورت چار کے قائم مقام ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے جبلی طور پر صورت و نفس کو اس طرح برتری عطا کی ، اور طبائع میں تفاوت رکھ دیا ۔

چار عورتوں کی اجازت ہے

چونکہ طبائع چار قسم ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے چار بیویوں کی اجازت دی۔ ہر طبیعت کے لیے اس کی مقدارِ حرکت پر ایک ہے کہ نفس کی حفاظت ہوتی رہے اور انسان عورتوں کے حقوق ادا کرے یا انہیں خرچ و مکان مہیا کرے تو ایسا کرنا باعثِ نقص نہیں بلکہ یہ مزید انعام و اجر کی بات ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے حال میں پختہ ہے۔ انبیاء و ائمہ طریق کا یہی عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سواری کے لیے چار اقسام کے چوپائے عطا کیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور اختلافِ طبائع کے باعث چار عورتیں تک جائز کر دیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً [1] (اور گھوڑے بنائے اور خچریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہوں اور رونق)

فرمایا:

مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ۔ [2] (اور بنا دیے، چوپائے اور کشتی جن پر سوار ہوتے ہیں)

یعنی اونٹ۔

اب چار عورتوں کے وطی کرنے کے تفاوت کو چار اقسام کے چوپاؤں کے چلنے کے تفاوت کے قائم مقام کر دیا۔ اونٹنی کی رفتار گھوڑے سے جدا ہے۔ خچر کی رفتار، گدھے سے جدا ہے۔ اس طرح جو چار سے وطی کر سکتا ہے اسے اس کی طرح نہیں بنایا کہ جو صرف ایک یا دو یا تین پر سواری کرے۔ اور اگر کسی کے پاس چاروں ہوں گھوڑا، خچر، گدھا اور اونٹ، اور اسے ان کی وسعت ہو، سب کا بوجھ برداشت کر سکے تو اسے اجازت ہے کہ کبھی ایک پر سواری کرے اور کبھی دوسرے پر، کبھی تیسرے اور چوتھے پر سواری کرے۔ اس طرح اس کے لیے نکاح میں چار عورتیں جمع کرنا جائز قرار دیا۔

اور کہا ہے ایک آدمی کو ایک ہی چوپایہ کافی ہوتا ہے۔ یہ عزیز العلیم کی تقدیر اور منعم حکیم کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیوی کے ساتھ تین شرطیں لگا دیں۔ اگر وہ تینوں شرطیں پائی گئیں تو کفایت حاصل ہوئی اسے سکون ہوا اور اگر ایک بیوی میں تین شرطیں نہ پائی گئیں تو اسے چار تک بیویوں سے نکاح کی اجازت ہے اور وہ سب ایک ہی مفہوم میں ہوں گی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی شرائط نہ پائی گئیں اور چار بیویوں میں تو لازمی طور پر وہ شرائط مومنوں کے قلوب میں پائی جاتی ہیں جیسے کہ باری تعالیٰ نے بتا دیا اور یہ اس کی حکمت و آیات میں سے

---

[1] النحل ۸

[2] الزخرف ۱۲

بھی ہے۔ فرمایا:

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً۔[1]

(اور اس کی نشانیوں سے یہ کہ بنادیا تم کو تمہارے قسم کے جوڑے، کہ چین پکڑو ان کے پاس اور رکھا تمہارے اندر پیار اور رحمت)

اب اگر ایک انسان، ایک ہی عورت میں سکونِ نفس، رحمت اور مودت پالے تو یہ کافی ہے۔ اور اگر چار عورتوں میں جاکر سکون و رحمت و مودت ملے تو یہ چار ہی کفایت اور باعثِ استغنا ہوئیں۔ اللہ تعالےٰ بعض کو ایک کے ساتھ ہی بے نیاز کر دیتا ہے اور بعض کو چار کی دولت عطا کرتا ہے یعنی ایک میں استغنا کر دیتا ہے اور چار میں رضا و ذخیرہ کرتا ہے۔ جو اس کی قوت رکھتا ہو اور اس پر پختہ ہو اس میں اس کا امتحان ہے اور یہ آیات الٰہی میں سے بھی ہے۔

بعض لوگوں نے بیویوں کو قمیص سے تشبیہ دی۔ کہا

" اگر ایک آدمی چار قمیصیں بنالے تو یہ اسراف نہیں۔ البتہ اس سے زیادہ اسراف ہوگا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے چار عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا جائز قرار دیا۔ اور

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ (وہ تمہاری پوشاک ہیں)

سے استدلال بھی کیا جا سکتا ہے انہیں ملبوس کے مفہوم میں رکھا اور چار تک بڑھا دیا۔ فرمایا:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (سو نکاح کرو جو تمہیں خوش لگیں عورتیں)

پھر مَثْنٰی سے کلام کا ابتدا کیا اور اس کو نص فرمایا اور ایک کا ذکر نہیں کیا تاکہ دو میں جمع ہو جائے اور عدل دو میں جمع کرلے پر ہوتا ہے اور اگر ظلم کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔[1] (پھر اگر ڈرو کہ عدل نہ کروگے تو ایک ہی)

یعنی یہی بات ظلم نہ کرنے اور عدل کے قریب تر ہے۔ حجازی فقہا میں سے ایک کا فرمان ہے:

" لَا تَعُوْلُوْا کا مطلب یہ ہے کہ کثرت سے تمہارے عیال نہ ہوں مگر پہلا مفہوم ہی بہتر ہے اور قرآن کے اسلوب کے منشا یہ بھی ہے، گویا نص پر عطف ہے۔ جب کہا: لَا تَعُوْلُوْا تو فرمایا:

" یہ کم تر ہے تاکہ ظلم نہ کرو۔ اور پہلا مطلب میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔" لغت کے اعتبار سے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہا کرتے ہیں: عال یعول یعنی اعال یعیل۔ یہ عیلۃ سے ہے۔ یعنی جب

---

[1] النساء ۳

عیال کو زیادہ ہو اور اسے ایک معنی کی دولت بتانا شاذ ہے۔ عورتوں کے اندر عدل کا مطلب یہ ہے کہ اخراجات، لباس اور رہائش میں برابری رکھے اور کسی ایک پر کمی نہ رکھے ورنہ اس سلسلہ میں لازم آنے والے حقوق میں کوتاہی کا مجرم ہوگا۔

بیویوں میں عدل کا معنی

حدیث میں ہے:

"جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک سے (میلان کرکے) دوسری کی طرف مائل ہوگیا۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"اس نے ان دونوں کے درمیان عدل نہ کیا تو قیامت کے روز اس حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک حصہ جھکا ہوگا۔" اور اس پر یہ لازم نہیں کہ محبت اور جماع میں بھی برابری رکھے۔ اس لیے کہ اسے ان باتوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ البتہ شب باشی میں برابری رکھے (رات رہنے میں برابری کرے) اور جس کے ہاں رات گزارے اس کے ساتھ جماع کرنا بھی ضروری نہیں۔ البتہ ہر ایک کے ہاں ایک ایک رات گزارنا اس پر لازم ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ[1] (اور تم ہر عدل نہ کرسکو عورتوں میں اور اگرچہ تم شوق کرو)

یعنی تم محبت و جماع میں برابری رکھنا چاہو تو بھی برابری نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے کہ یہ قلب میں ڈالنے کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور نفس میں یہ خیال بھی وہیں سے آتا ہے (یعنی خدا کی دی ہوئی قوت وخلق سے یہ ہوسکتا ہے)۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ

"آپ تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان عطیات اور شب باشی (رات گزارنے) میں برابری کرتے اور فرماتے:

"اے اللہ جس پر مجھے اختیار ہے اس میں یہ میری محنت ہے اور جس کا میں مالک نہیں اور تو ہی مالک ہے اس کی مجھے طاقت نہیں۔" یعنی محبت و جماع میں برابری نہیں۔ آپ بعض ازواج سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔

---

[1] النساء ۱۲۹

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ حالتِ مرض میں آپ کو ہر روز ایک ایک بیوی کے گھرے جایا جاتا تو پوچھتے،

"میں کل کہاں ہوں گا؟"

ایک بیوی سمجھ گئیں اور انھوں نے کہا:

"آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کا پوچھ رہے ہیں؟" چنانچہ تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے عرض کیا،

" اے اللہ کے رسول، آپ کو (روزانہ باری باری) اٹھ کر جانا مشکل ہے۔ ہم آپ کو اجازت دیتی ہیں کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف رکھیں"

آپ نے فرمایا،

"تم سب اس پر راضی ہو؟"

سب نے عرض کیا،" ہاں"

فرمایا،" مجھے عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے حجرہ میں چلو"

یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتیں:

"آپ نے میرے حجرہ میں اور میرے سینہ سے ٹیک لگائے وفات پائی" آپ اس پر فخر کیا کرتیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ۔ (سو پورا میلان نہ کرو)

یعنی دوسری بیویوں کے اخراجات میں کوتاہی کر کے ایک ہی طرف سارا میلان نہ کر لو کہ

فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (کر ڈال رکھو اسے ادھر میں لٹکتی)

کہ اسے ایسی گری پڑی بنا دو جیسے کہ اس کا نہ خاوند ہو اور نہ طلاق ملی ہو۔ بس بیچاری بندھ کر رہ جائے۔ یعنی نہ رانڈ ہو کر خود مشقت کر کے گزارا کر سکے اور نہ خاوند والی ہو کہ وہ اس پر خرچ کرے اور اسے خاوند کے باعث استغناء حاصل ہو۔

عرب کہا کرتے ہیں:

علقت الامر۔ میں نے کام کو موقوف رکھا اور قول معلق۔ یعنی موقوف قول۔ جس پر کوئی حکم نہیں لگا۔

اسے چاہیے کہ دن رات تقسیم کر دے۔ ہر بیوی کے پاس ایک دن رات رہے۔ ہاں اگر ایک بیوی رات یا دن دوسری کو بخش دے تو پھر اجازت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح بیویوں کے درمیان

دن رات تقسیم کرتے تھے۔ سودہؓ بنت زمعہ کی عمر زیادہ تھی۔ آپ نے انہیں طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو بخش دی اور درخواست کی کہ آپ مجھے اپنی زوجیت میں رکھئے تاکہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھے آپ کی ازواج مطہرات کے اندر ہی اٹھائے۔ چنانچہ آپ نے قبول کر لیا اور پھر ان کی باری نہ لگاتے۔ البتہ ان کی زوجیت قائم رہی اور آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس دو راتیں ٹھہرتے اور دوسری ازواج کے ہاں ایک ایک رات کا قیام ہوتا۔ البتہ اگر کسی ایک سے جماع کا ارادہ ہوتا اور اس کی باری نہ ہوتی اور آپ اس سے مباشرت کرتے تو پھر خوب عدل کے باعث اس رات میں تمام کے ہاں جاتے اور اگر دن کو یہ سلسلہ ہوتا تو بھی ایسے ہی طریقہ تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض دوسری ازواج مطہراتؓ سے اس کی تائید منقول ہے کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی رات میں تمام بیویوں کے پاس تشریف لے گئے"۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوپہر میں نو بیویوں کے پاس تشریف لے گئے اور جس کی صرف ایک ہی بیوی ہو کہ وہ ہر تین راتوں کے بعد ایک بار (یا حسبِ استطاعت) مباشرت کرے جیسے کسی کی چار بیویاں ہوں تو وہ ایک سے چوتھی رات میں مباشرت کرتا ہے۔ حضرت عمر اور کعب بن اسود رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کے لیے یہی فیصلہ کیا کہ وہ ہر چار راتوں میں ایک رات مباشرت کرے۔ اگر اس میں زیادہ قوت و جوش ہو تو عفت حاصل کرنے اور ضرورت کے مطابق زیادہ بھی کر سکتا ہے اور اگر وہ جانتا ہو کہ بیوی کو مباشرت سے نفرت سی ہے تو اس پر بار بار مباشرت ضروری نہیں البتہ مہینہ میں ایک بار یا سال میں ایک بار (بقدر ضرورت) کرنی چاہیے اور اگر مرد کو ضرورت ہو تو عورت کو انکار کرنے کی اجازت نہیں۔ چاہے دن کو کہے اور چاہے رات کو کہے اور اسی طرح خاوند کی اجازت کے بغیر عورت کو نفلی روزہ بھی جائز نہیں۔"

حضرت علیؓ نے نو عورتوں سے نکاح کیا (البتہ ایک وقت میں چار سے زیادہ نہ تھیں) اور وفات کے وقت آپؓ کی چار بیویاں اور سترہ لونڈیاں تھیں۔

شام کے کسی حاکم کو جب ان کی کثرتِ ازواج کی اطلاع ہوتی تو وہ کہتا کہ یہ نکاح و طلاق نہیں (ایک کھیل ہے) یعنی اعتراض کرتا۔

بتاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے فوراً بعد نکاح کر لیا اور حضرت امامہؓ بنت زینبؓ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ وصیت کی تھی۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے دو سو پچاس عورتوں سے نکاح کیا۔ ایک قول کے مطابق تین سو

عورتوں سے نکاح کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بات سے بہت تنگی محسوس کرتے اور طلاق دینے کے بعد ان کے گھر والوں سے بہت شرم محسوس کرتے اور فرمایا کرتے،

"حسن بہت طلاق دینے والا ہے اس سے نکاح نہ کرو۔"

ہمدان کے ایک آدمی نے کہا،

"اے امیرالمومنین! اللہ کی قسم جس قدر وہ چاہیں ہم ان سے نکاح کرتے رہیں گے۔ جس کو پسند کریں، روک رکھیں اور جس کو ناپسند کریں جدا کر دیں۔"

حضرت علیؓ یہ سن کر خوش ہوئے اور یہ شعر کہا، ؎

وَ لَوْ كُنْتُ بَوَّابًا عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ
لَقُلْتُ لِهَمْدَانَ اُدْخُلِىْ بِسَلَامٍ

(اگر میں جنت کے دروازہ پر دربان ہوا تو میں ہمدان سے کہوں گا۔ جنت میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ ــــــ)

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت حسنؓ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت پائی جاتی تھی۔ خُلق و خَلق میں وہ آپؐ سے مشابہ تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا،

"تمہیں میرے خَلق اور میرے خُلق کی مشابہت عطا ہوئی ہے"

اور فرمایا،

"حسنؓ مجھ سے اور حسینؓ، علیؓ سے ہے۔"

حضرت حسنؓ بسا اوقات چار عورتوں سے نکاح کر لیتے اور چار عورتوں کو طلاق دے دیتے۔ آپؐ نے اپنے غلام کے ہاتھ دو بیویوں کو طلاق نامہ بھیجا اور فرمایا،

"ان سے کہہ دو کہ دونوں عدت بیٹھو۔" اور ہر ایک کو دس ہزار دراہم دینے کا حکم کیا۔ جب غلام واپس آیا تو پوچھا،

"دونوں نے کیا کہا؟"

قاصد نے بتایا،

"ایک خاموش ہو گئی اور سر نیچے ڈال کر سکوت اختیار کر لیا اور دوسری رو پڑی اور روتے ہوئے یہ کہہ رہی تھی،

مَتَاعٌ قَلِيلٌ مِنْ حَبِيبٍ مُفَارِقٍ۔ (نفع کم اور دوست کی جدائی سخت تر ہے)

انہوں نے سر نیچے کر لیا اور اس پر ترس کھا کر فرمایا،

"اگر میں رجوع کرنے والا ہوتا تو اس عورت پر رجوع کر لیتا۔"

حضرت عبدالرحمن بن حارثؓ بن ہشام نے اپنی بیٹی کی منگنی کرنے کی پیشکش کی اور کہنے لگا،

"آپؓ مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں مگر آپ طلاق بہت دیتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ میرا قلب آپؓ کے بارے میں بگڑ نہ جائے۔ اگر آپؓ ضمانت دیں کہ آپؓ اس کو نہیں چھوڑیں گے تو میں نکاح کر دوں۔"

وہ خاموش ہو گئے اور ایک ساتھی کی طرف توجہ کر کے فرمایا،

"عبدالرحمن کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی بیٹی کو میرے گلے کا ہار بنا دے۔"

طلاق ایک مبغوض اباحت ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"اللہ تعالیٰ نکاح کو پسند کرتا ہے اور طلاق سے بغض رکھتا ہے۔ اس لیے نکاح کرو اور طلاق نہ دو۔" اور جو آدمی صرف چار سے زیادہ بیویاں کرنے کی خاطر طلاق دے اس کیلئے یہ بات نامناسب ہے۔

حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ نے اسی عورتوں سے نکاح کیا اور کثرت سے صحابہؓ کی تین تین چار چار بیویاں ہوتیں اور جن کی دو بیویاں تھیں ان کا شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔

کثرتِ نکاح کا فائدہ یہ ہے کہ انسان بدنظری اور غلط روی سے بچا رہتا ہے اور حرام سے پرہیز رکھتا ہے۔ اب جب بدنظری اور غلط روی پر پابندی لگ گئی تو اللہ تعالیٰ نے حلال میں وسعت فرما دی۔

نفسانی استراحات اسی جنس سے مل سکتی ہیں۔ چنانچہ پرہیزگاروں کے نفسانی استراحات مباح ہیں ہیں۔ فرمانِ الٰہی لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (تاکہ اس کی طرف سکون پائے) اسی سے ہے اور یہی سکون نفس ہے جو جنس کی طرف ہے اس لیے کہ صفاتِ مجالست اسے نرم کرتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کا ایک مفہوم یہی ہے۔

"دلوں کو آرام دو۔" ذکر میں آرام دو۔ یعنی نفس کو مباح کی طرف لگا کر آرام دو اور پھر آخرت کا ذکر کرو۔ اس لیے کہ ذکر اشغال ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے،

"ہر عالم کی ایک شرہ اور ایک فترت ہے۔ جس کی فترت، میری سنت کی طرف ہوئی وہ ہدایت پا گیا۔" شرہ کا معنی مشقت ہے اور فترت کا معنی رکاوٹ و استراحت ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے،

میں اپنے نفس کو بعض اوقات کسی کھیل سے بہلاتا ہوں تاکہ بعد میں یہ حق پر توانا ہو جائے۔"

ماضی کی عورت کا کردار

قدیم زمانہ کی عورتوں کے اوصاف آج کے دور سے جدا تھے۔ ایک آدمی گھر سے نکلتا تو اس کی بیوی کہتی ہے۔" اے میاں" اور بیٹی آواز دیتی ؛ " اے ابا جان ! آج ہمارے لیے صرف حلال ہی کما کر لانا ورنہ تُو دوزخ میں جائے گا اور ہم اس کا باعث بنیں گے۔ ہم بھوک اور تنگی پر صبر کر لیں گے اور تیرے لیے باعث سزا نہیں بنیں گے۔"

سلف صالحینؒ میں سے کوئی آدمی گھر سے غائب ہوتا اور کسی غزوہ میں شریک ہوتا اور دوسرے بھائی اس کا باہر جانا پسند نہ کرتے کہ گھر کی خبر کون لے گا تو وہ اس کی بیوی کو آکر سمجھاتے کہ اس کو باہر نہ جانے دو۔ خرچ دیے بغیر جا رہا ہے اور خبر نہیں کہ کب واپس آئے گا ؛

تو اس کی بیوی جواب دیتی ، جب سے میں نے اسے دیکھا یہ کھانے والا ہے اور میں نے اسے روزی دینے والا کبھی نہیں سمجھا۔ کھانے والا جا رہا ہے اور روزی دینے والا باقی ہے اور اس کے علاوہ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ ایسی منحوس عورت بن جاؤں کہ اسے نیکی کی راہ سے روک دوں۔

احمد بن عیسیٰ خراز نے ایک عورت سے نکاح کیا تو عورت سے پوچھا ،

" تُو نے میرے ساتھ کس بات پر نکاح کیا اور تجھے میرے اندر کیا چیز مرغوب ہوئی ؟"

اس نے کہا ،

" اس بات پر نکاح کیا ہے کہ مجھ پر تیرا جو حق لازم ہے اسے ادا کرتی رہوں گی اور تجھ پر میرا جو حق ہے اسے ساقط کرتی ہوں۔"

رابعہؒ بنت اسماعیل بن ابی حواری نے پیغام نکاح بھیجا۔ مگر اس نے اس کی کثرت عبادت کے باعث ناپسند کیا۔ اس نے اصرار کیا تو کہنے لگے ؛

" مجھے اپنے حال میں مصروفیت کے باعث ، عورتوں میں کوئی لگن نہیں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا ،

" اے بندۂ خدا ، میں تیری مصروفیتِ حال کے باعث اپنے حال میں مصروف رہوں گی اور مجھے مردوں میں شہوت نہیں بلکہ مجھے اپنے خاوند سے تین لاکھ دینار وراثت میں ملے ہیں اور وہ حلال مال ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے آپ پر اور آپ کے بھائیوں پر خرچ کروں اور آپ کے ذریعہ نیک لوگوں سے نیکی کروں اور یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو۔"

انہوں نے کہا ، " میں اپنے استاد سے اجازت لے لوں۔" بتاتے ہیں کہ میں ابو سلیمانؒ کے پاس آیا ،

وہ مجھے نکاح سے منع کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے ، کہ ہمارے اصحاب میں سے جس نے بھی نکاح کیا اس کا حال بگڑ گیا۔ جب میں نے اس عورت کا قول ان کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے سر جھکا لیا اور ایک گھڑی خاموش رہے پھر سر اٹھا کر فرمایا ،

" اے احمد ، اس سے نکاح کر لو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ولی ہے۔ اور یہ صدیقین کا سا کلام ہے " بتاتے ہیں کہ میں نے اس عورت سے نکاح کر لیا۔

احمد بتاتے ہیں کہ اس کے گھر میں چونے کی ایک کوٹھڑی تھی مگر پھر ان میں سے کچھ باقی نہ رہا۔ البتہ کھانا کھا کر تیزی سے نکلنے والوں کے ہاتھ دھونے کے لیے کچھ اشنان باقی تھا۔

بتاتے ہیں کہ میں نے اس عورت پر تین مزید نکاح کیے وہ مجھے عمدہ عمدہ چیزیں کھلاتی اور کہتی ،

" پوری قوت و نشاط کے ساتھ اپنی بیویوں کی طرف جاؤ۔ یہ ارباب قلوب میں تھیں اور صوفیاء ان سے احوالِ باطن کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ احمدؒ بھی ان سے بعض مسائل معلوم کرتے۔ یہ شام میں ایک بلند پایہ عورت تھیں جیسے کہ بصرہ میں رابعہ عدویہؒ تھیں "۔

نکاح کے بارے میں ابوسلیمانؒ ایک معتدل کلام فرماتے ؛

" جو شدت پر صبر کرے اس کے لیے نکاح کرنا افضل ہے۔ تنہا آدمی اور فارغ قلب عمل کی ایسی حلاوت پاتا ہے جو عیالدار نہیں پاتا "۔

ایک بار فرمایا :

" میں نے ایسا کوئی نہیں دیکھا کہ ہمارے اصحاب میں سے کسی نے نکاح کیا ہو اور پھر بھی وُہ اپنے پہلے درجہ پر قائم رہا ہو "

انہوں نے فرمایا ،

" تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس نے انہیں چاہا اس نے دنیا میں رغبت کی ،

۱۔ جس نے کاروبار تلاش کیا ۔

۲۔ نکاح کیا ۔

۳۔ حدیث لکھی ۔ "

اور حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت کے لیے مدارت کی ضرورت ہے۔ لطیف حکمت ، مواسات ، ملاطفت ، خرچ کے لیے وسعت ظرفی ، حسنِ اخلاق اور نرم الفاظ کے بغیر کام نہیں چلتا اور ایک بُرد بار عالم اور ایک دانش ور عارف آدمی ہی اس مسئلہ کو نبھاہ سکتا ہے اور جو آدمی یہ بوجھ نہ اٹھا سکے ، اخراجات برداشت نہ

کر سکتا ہو اور اجتماعی زندگی سے مانوس نہ ہو بلکہ تنہائی پسند ہو۔ اکیلا کھانے کا عادی ہو۔ کنجوس، بداخلاق، سنگدل اور درشت زبان ہو۔ اس کے لیے مجرد رہنا ہی بہتر ہے۔ اس کے لیے عورتوں سے دُور رہنا ہی باعثِ سکون بات ہے۔ ایسے آدمی نے اگر نکاح کر لیا تو خود عذاب میں پڑے گا۔ دوسروں پر آفت ڈھائے گا، خود گنہ گار ہوگا اور دوسروں کو بھی گنہ گار کرے گا۔ اس لیے کہ عورتوں کی سفاہت کا مقابلہ حلم سے، ان کی جہالت کا علاج علم سے اور ان اخلاق و لغزش کا علاج لطف و حکمت سے کیا جاتا ہے۔ اب اگر مرد بھی جاہل، بداخلاق اور درشت زبان ہوا تو جہالت کا اجتماع ہو جائے گا اور عقل دُور ہو جائے گی۔ ظلم، سنگدلی، ایذادہی کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اب اصلاح کم ہوگی اور بگاڑ و نفرت زیادہ ہوگی اور ان کے درمیان کبھی بھی صلح نہ ہوگی اہل خرد کا یہ طریقہ بھی نہیں۔

جب نکاح کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ عورت کو اپنا تمام حال بتا دے اور اپنے اخلاق واضح کر دے۔ تاکہ وہ اس کے حال و اخلاق سے آگاہ ہو کر نکاح کرے اور اپنی مرضی سے نکاح کرے۔ یہی تقویٰ کی بات ہے سلف کا یہی طریقہ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک آدمی نے نکاح کیا وہ سیاہ خضاب استعمال کیا کرتا تھا۔ جب وہ عورت کے پاس گیا تو اس کے خضاب کا رنگ اتر گیا اور اس کا بڑھاپا ظاہر ہو گیا۔ عورت کے وارثوں نے دعویٰ کیا اور کہا،

"ہم نے اسے نوجوان سمجھا تھا۔"

حضرت عمرؓ نے اسے خوب مارا اور فرمایا،

"تُو نے اس قوم کو دھوکہ دیا۔" اور دونوں کو جُدا کر دیا۔

حضرت شعیبؒ بن حرب نے جب نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو عورت کو کہا،

"میں بداخلاق آدمی ہوں۔"

اس نے کہا،

"اے بندۂ خدا، تجھ سے بھی بداخلاق وہ ہے جو تجھے بداخلاقی پر مجبور کرے۔"

اس کے برعکس منقول ہے کہ ایک آدمی نے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ اس عورت کو کہا،

"میرے بعض اخلاق ہیں۔ میں تجھے ان پر آگاہ کرتا ہوں۔ پھر جی چاہے تو نکاح کر لو۔"

اس نے کہا:

"ہاں بتاؤ۔"

اس آدمی نے کہا؛

" میں بیزار اور کینہ ور آدمی ہوں۔ بدظن، غیور، تنگ دل اور بہت مارنے والا ہوں۔ اگر میرے پاس زیادہ رہے تو بیزار ہو جاتا ہوں اور مجھ سے اگر دور ہو جائے تو بے قرار ہو جاتا ہوں۔ اگر تو کلام کرے تو میرا سینہ غضب سے پھٹنے لگتا ہے۔ اگر تو خاموش رہے تو میرے دل میں شبہات آجاتے ہیں۔"

عورت نے جواب دیا؛

" اما بعد، تو نے ایسے اخلاق کا ذکر کیا ہے کہ ایسے اخلاق والے کو تو ہم ابلیس کی بیٹیوں کے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ انسان کی بیٹیوں کے لیے کیسے پسند کریں گے؟ جاؤ، اللہ بھلا کرے، ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!"

اہل وعیال پر خرچ کا اجر

جس کو نفسانی آفات کا خطرہ ہو اور اسے ایسی عورت مل جائے جس میں کچھ اچھی خصائل ہوں تو اس کے لیے نکاح کرنا ہی افضل بات ہے۔ اب نکاح میں کئی نیتیں ہونی چاہئیں۔ اس لیے کہ یہ ایک بہت بڑا عمل ہے اور محض عیاشی کی خاطر نکاح نہ ہونا چاہئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا؛

" جب حق خواہش کے موافق ہو تو یہ کھجور کی جھاگ ہے۔ اس میں ایک نیت یہ رکھے کہ سنت قائم کر رہا ہوں قلبی اصلاح کرتا ہوں۔ دین کی سلامتی، بدنظری سے بچنا اور شرمگاہ کی حفاظت مقصود ہے۔ اس کا حکم بھی ہے اور عیال پر کمانے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے توبہ سمجھتا ہے (توبہ کرتا رہے) اور جیسے اپنے آپ کو اخروی معاملات میں نصیحت پسند کرتا ہے۔ اسی طرح اہل وعیال کو بھی نصیحت کرے تاکہ اس پر انہیں ملے اور یہ بھی ثواب میں حصہ دار ہو جائے اور اس سارے کام کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کرے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

" آدمی اپنے اہل پر جو خرچ کرے وہ اس کے لیے صدقہ ہے اور انسان کو اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنے پر بھی اجر ملے گا۔"

اور ایک یہ ہے کہ؛ " وہ اللہ کی راہ میں مجاہد کی طرح ہے۔"

ایک آدمی ایک عالم کے سامنے اپنے آپ پر ہونے والے انعاماتِ خداوندی بتا رہا تھا۔ کہنے لگا،

" مجھے اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے اعمالِ صالحہ سے حصہ عطا کیا۔" آخر کار حج، جہاد اور دوسری کئی طرح کی عبادات کا ذکر کیا۔

عالم نے فرمایا: " ابدال کا عمل کہاں ہے؟"

اس نے پوچھا: " وہ کیا عمل ہے؟"

فرمایا: "حلال کمانا اور عیال پر خرچ کرنا."

ابن مبارکؒ جہاد میں تھے اپنے بھائیوں کو فرمایا:

"تم ایسا عمل بھی جانتے ہو جو اس سے افضل ہے جس میں ہم مصروف ہیں؟"

لوگوں نے کہا:

"ہم نہیں جانتے یہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ اعدائے الٰہی سے قتال ہو رہا ہے۔ اس سے کیا افضل ہوسکتا ہے؟"

فرمایا: "لیکن میں جانتا ہوں۔"

پوچھا: "وُہ کیا ہے؟"

فرمایا: "سوال نہ کرنے والا عیال دار آدمی رات کو اٹھے۔ سوتے بچوں کو دیکھے کہ ان پر سے کپڑا ہٹ گیا ان پر کپڑا اڈال دے۔ یہ عمل اللہ کی راہ میں جہاد سے بھی افضل ہے۔"

ایک آدمی نے حضرت بشرؒ سے عرض کیا:

"مجھے فقر و عیال داری نے تنگ کر دیا ہے۔ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے۔"

فرمایا: "جب تیرے گھر والے کہیں، ہمارے پاس نہ روٹی ہے اور نہ آٹا ہے۔ ہم بھوکے ہیں۔ اس وقت تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر، تیری دعا، میری دعا سے افضل ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس کی نماز اچھی ہوئی۔ بال بچے زیادہ ہوئے، مال کم ہُوا اور اس نے مسلمانوں کی غیبت نہ کی وُہ جنت میں میرے ساتھ ان دو (انگلیوں) کی طرح ہوگا۔"

دوسری حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ محتاج، سوال سے بچنے والے (متعفف) عیال دار کو محبوب رکھتا ہے۔"

اس سلسلہ میں نیت کا فائدہ یہ ہے کہ اہل و عیال کی مصلحتوں اور تکالیف پر اگر غم سہنا پڑا تو اس کے لیے یہ غم نیکیاں بن جائے گا۔ اس لیے کہ یہ بھی اس کا ایک عمل ہے۔

روایت میں ہے:

"جب بندے کے گناہ بڑھ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے کسی غم میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ ان کا کفارہ ہو جائے۔"

بعض سلف کا قول ہے: "بعض ایسے گناہ ہیں کہ جن کا کفارہ عیالداری کے غم کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے ؛

" بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ طلب معاش کے غم سے ہی ہوتا ہے ۔" اور ان پر صبر کرنے اور ان کی تکلیف سہنے کا اسے اجر ملتا ہے ۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور نیک اعمال کا اجر و ثواب ملتا ہے اور بسا اوقات بیوی بچوں کا مرنا انسان پر سزا اور باعثِ نقص بات ہوتی ہے ۔ اگر ان پر خرچ کرنے اور ان پر صبر کرنے کا اسے مقام حاصل ہو تو اسکی جان سے جُدائی اس کے لیے باعثِ نقص و خسارہ ہے ۔"

ایک عالم ؒ بتاتے ہیں کہ ایک عابد کی بیوی تھی ۔ یہ عابد اپنی بیوی کے حقوق بڑی خوبی کے ساتھ ادا کرتا ۔ آخر وُہ فوت ہو گئی ۔

عابد کہتے ہیں کہ بیوی کی وفات کے ایک جمعہ بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے لوگ اُتر چڑھ رہے ہیں اور ہوا میں چل رہے ہیں ۔ جو کوئی اترتا ہے وہ مجھے دیکھتا ہے اور اپنے سے پیچھے والے کو کہتا ہے ؛

" یہی وہ منحوس ہے ۔"

وہ کہتا ہے ، " ہاں ۔"

تیسرا آیا وُہ بھی اپنے پیچھے والے سے کہہ رہا ہے ؛

" یہی وہ منحوس ہے ۔"

چوتھے نے کہا ، " ہاں "۔

کہتے ہیں : مجھ پر یہ بات بہت ہی گراں گزری میں نے ارادہ کیا کہ ان سے پوچھوں گا ۔

جب آخری آدمی گزرا ، جو ایک لڑکا تھا ۔ میں نے اس کو کہا ؛

" بھائی ، یہ کون منحوس ہے ، جس کی طرف تم اشارے کر رہے ہو ؟

اس نے کہا ، " تُو "۔

میں نے پُوچھا ، " کیوں ؟"

اس نے کہا ،

" ہم تیرے اعمال ، مجاہدین فی سبیل اللہ میں اٹھاتے تھے مگر ایک جمعہ سے ہمیں حکم ہُوا کہ ہم انہیں مخالفین کے اعمال میں رکھ دیں ۔ اب مجھے خبر نہیں کہ تُو نے کیا کر ڈالا ؟"

بیدار ہونے کے بعد اس نے اپنے بھائیوں سے کہا ؛

" میرا نکاح کر دو ، میرا نکاح کر دو ۔" اس کے بعد ہمیشہ اس کی ایک یا دو یا تین بیویاں رہیں ۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے ،

"ہم نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ اس حدیث کے بارے میں مناظرہ کیا، تبادلۂ خیال کیا، اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی نہ بیوی ہو اور نہ بچہ ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ بیوی بچے ہوں مگر وہ اسے مشغول نہ کریں۔ اور اگر نفس مطمئنہ ہو۔ رب کی خاطر نظروں میں خشوع ہو، ڈرنے والا قلب ہو تو اس کے لیے غم میں مشغول ہونے کی بجائے نکاح کرنا بہتر اور اچھا کام ہے۔"

جیسے کہ حضرت داؤد طائیؒ فرماتے ہیں کہ "پچاس سال گزر گئے۔ میرے قضیب میں ہوا کی خیزش نہیں ہوئی۔"

ایک بزرگؒ سے کسی نے پوچھا :

" کیا شہوت کی وجہ سے آپ کو کبھی خیزش ہوئی ؟"

فرمایا: "جب سے قرآن مجید پڑھا ہے نہیں ہوئی۔"

ایک عالمؒ کا فرمان ہے :

"بیس برس سے میری نظر اپنی شرمگاہ پر نہیں پڑی۔"

جو آدمی غلط روی، بدنظری کی راہ پر ہو، شہوت زیادہ ہو تو اس کا احسن ترحال اور بہتر عمل نکاح کا ہے۔ اس لیے کہ مباح اس کا مقام ہے جس کا کچھ مقام نہ ہو۔ اگر نکاح کا ارادہ ہو تو دین دار، نیک، عقل مند اور قناعت پسند عورت کو تلاش کرو۔ انہی طریقوں کے مطابق خلوصِ نیت حاصل ہوتی ہے۔

اچھی عورت کے اوصاف

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"عورت سے اس کے مال وجمال اور حسب و دین کے باعث نکاح کیا جاتا ہے۔ تجھ پر دین دار (عورت سے نکاح) کرنا لازم ہے۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں :

"جو آدمی، عورت کے مال وجمال کی خاطر نکاح کرے وہ اس کے مال و جمال سے محروم رہے گا اور جو اس کے دین کی خاطر نکاح کرے اللہ تعالیٰ اسے اس کا مال وجمال نصیب کرے گا۔"

ایک روایت ہے :

"عورت کے جمال کی خاطر نکاح نہ کرو۔ شاید اس کا جمال اسے معیوب کر دے اور نہ مال کی خاطر نکاح کرو شاید اس کا مال اسے سرکش کر دے بلکہ عورت کے ساتھ اس کے دین کی خاطر نکاح کرو۔"

چنانچہ دین کی خاطر عورت سے نکاح کرنا، آخرت کی راہ ہے کم درجہ کی، معمولی صورت کی اور بڑی عمر کی عورت سے نکاح کرنا زہد کی بات ہے۔

بسا اوقات نفس امارۃ انسان پر چار بیویوں سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ جس نے اہل و عیال کو ناپسند سمجھا اس نے صرف اس لیے ایسا کیا کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کا قرب دینے والے اعمالِ خیر سے غفلت ہو جاتی ہے اور اگر بے اہل و عیال آدمی باطل کاموں میں مصروف ہو، شہوات کی راہ پر گامزن ہو تو یہ اہل و عیال والے سے بھی بدتر ہے اور گا ہے اہل و مال نہ طلب کرنے والے کو ناپسندیدہ مقام میں رکھا کہ وہ ان کے ذریعہ فضیلت و نجات طلب نہیں کرتا۔

ایک روایت میں ہے،

"بعض دوزخی کمزور لوگ ہیں جن کا کچھ دین نہیں۔ وہ تم میں صرف پیروی کرنے والے ہیں۔ وہ نہ اہل چاہتے ہیں اور نہ مال۔" یہ لالچی اور حریص ہیں جس کا مقصد پیٹ ہے۔ اسے پروا نہیں کیسے حاصل کیا؟ اور نہ اس کی پروا ہے کہ وہ کسی حال پر الٹ پلٹ ہو رہا ہے؟ اور جس کو اس کا اہل و مال اللہ تعالیٰ سے غافل نہ کرے وہ آدمی بے اہل و عیال سے افضل ہے۔ یہ بے اہل و عیال آدمی پیٹ اور شرم گاہ کا بندہ ہے۔ خواہش و شہوت کا قیدی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ مومنوں کے پاس مال ہوگا، اولاد ہوگی مگر انہیں فرمایا کہ یہ چیزیں تمہیں اللہ سے غافل نہ کریں ایک گروہ کی تعریف کی کہ تجارت اور خرید و فروخت انہیں عبادت سے غافل نہیں کرتی اور جس دن آنکھیں اور دل تڑپتے ہوں گے اس روز یہ مامون و بے خوف ہوں گے۔

ایک گروہ نے بیویوں اور اولاد کی دعا کی تو ان کی تعریف فرمائی، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ[1] (اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک)

اور جو چیز آنکھوں کی ٹھنڈک ہو وہ قرۃ اعین (آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی نماز) سے غافل نہیں کرتی بلکہ اس کے قریب لے جاتی ہے جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"مجھے تمہاری دنیا سے تین محبوب ہوئیں۔ خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

حضرت ابو سلیمانؒ فرمایا کرتے:

"(بعض صوفیاء نے) اس لیے نکاح چھوڑ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے فارغ قلبی حاصل ہو جائے۔"

ابن ابی حواریؒ سے حدیث مروی ہے جو انہوں نے حبیش سے انہوں نے حسنؒ سے روایت کی،

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اسے اہل اور مال میں مشغول نہیں کرتا۔"

---

[1] الشعراء ۷۴

ابو سلیمانؒ فرماتے ہیں،

" ہر چیز میں زہد ہوتا ہے حتیٰ کہ آدمی ایک بڑھیا سے نکاح کرے یا کم درجہ کی عورت سے نکاح کرے۔ یہ بھی دنیا کے اندر زہد کی بات ہے۔"

مالک بن دینارؒ فرمایا کرتے،

" بعض لوگ ایک یتیم لڑکی سے نکاح کرتے ہیں۔ اسے کھلانے پلانے اور پہنانے کا اجر ملتا ہے اور اس کا بار بھی کم ہوتا ہے۔ یہ عورت تھوڑے پر راضی ہو جاتی ہے مگر بعض لوگ فلاں بنت فلاں یعنی مالدار آدمی کی لڑکی سے نکاح کرتے ہیں۔ وہ شہوات کا مطالبہ کرتی ہے اور کہتی ہے، یہ کپڑا لا دو، ایسا ریشمی لباس بنا دو۔ اس طرح اس کے دین کو تباہ کرتی ہے۔

احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آنکھ والی عورت کو پسند کیا حالانکہ اس کی بہن خوب صورت اور تندرست تھی۔ انہوں نے دریافت کیا،

" ان دونوں میں زیادہ عقلمند کون ہے؟"

کہا گیا، " ایک آنکھ والی"

فرمایا" اس سے میرا نکاح کر دو۔"

گاہے ایک کم درجہ کی عورت سے نکاح کر کے قلبی رخصت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس جیسی عورت میں کوئی راغب نہیں ہوتا۔ بہتر یہ ہے کہ نکاح سے پہلے عورت کا چہرہ دیکھ لے اور اگر چہرہ کے ساتھ بازو بھی دیکھ لے تو علمائے حجاز کے نزدیک کچھ ہرج نہیں۔

چہرہ دیکھنے کے بارے میں کئی روایات آتی ہیں:

محمد بن مسلمہؓ بتاتے ہیں کہ میں نے انہیں ایک نوجوان لڑکی کا پیچھا کرتے دیکھا۔ آخر وہ کھجوروں کے جھنڈ میں چھپ گئی۔

میں نے کہا" آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور آپ بھی ایسا کر رہے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ،

" جب اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں کسی عورت سے نکاح کی کچھ بات ڈالے تو اس کو دیکھ لیا کرو تاکہ جس کی طرف دعوت دی جا رہی ہو اس کو سمجھ لو۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے،

" (بعض) انصار کی آنکھوں میں ایک خرابی ہے۔ اس لیے جب ان میں سے کسی سے نکاح کرو تو انہیں

دیکھ لیا کرو۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"جب کسی عورت کے متعلق تمہارے دل میں کچھ چیز (نکاح کرنے کی) ڈالی جائے تو اسے دیکھ لیا کرو۔ یہ بات خوب تعلقِ دائمی کا سبب ہے۔" یعنی ان یودم بینھما۔ یعنی یودم الادمة علی الادمة۔ اور یہ بشرہ سے زیادہ بلاغت کا کلام ہے۔ اس لیے کہ بشرہ ظاہری جلد کو اور ادمۃ اندرون جلد کو کہا جاتا ہے۔ یہ ضرب المثل کے طور پر مبالغہ میں آتا ہے۔

مہر اور ولیمہ

حضرت اعمش" فرمایا کرتے:

"جو نکاح دیکھے بغیر واقع ہو اس کا انجام غم اور پریشانی ہے اور مہر میں ناواجب زیادتی نہ ہو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے دس درہم اور گھر کے سامان پر نکاح کیا اور یہ سامان ہاتھ کی ایک چکی، گھڑا، چمڑے کا ایک تکیہ تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

اور ایک بیوی پر دو مُد جو کے ساتھ ولیمہ کیا اور ایک دوسری پر دو مُد کھجوروں کے ساتھ ولیمہ کیا۔" ولیمہ کرنا سنت ہے اور ولیمہ کی دعوت قبول نہ کرنا معصیت کی بات ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ زیادہ رقم کے مہر رکھنے سے منع کرتے اور فرماتے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت سے چار صد دراہم سے زیادہ مہر پر نکاح نہیں کیا اور نہ کسی دوسرے کا نکاح (اس سے زیادہ مہر پر) کیا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مہر ساڑھے بارہ اوقیہ تھے۔"

آپ اپنے صحابہؓ کے نکاح گٹھلی بھر سونے پر کرتے اور گٹھلی سے مراد صیحانی کھجور کی چھوٹی سی گٹھلی ہے۔ اس کی قیمت پانچ دراہم بنتی ہے۔

روایت میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہؓ کا گٹھلی بھر سونے پر نکاح کیا جس کی قیمت تین درہم اور ایک تہائی درہم (۳ ۱/۳ درہم) تھی۔"

حضرت سعید بن مسیبؓ بلند پایہ تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح دو درہم پر کیا، پھر رات کو اسے خاوند کے گھر پہنچا دیا۔

اور دس دراہم مہر پر نکاح میرے نزدیک مکروہ نہیں۔ یہ جمع قلت میں کثیر تعداد ہے اور مستحب ہے

۔تاکہ علماء کے اختلاف سے نکل سکے اور دس درہم سے کم مہر رکھنا مستحب نہیں۔ یہ فقہاء کے مذاہب کا متوسط درجہ ہے اسی مقدار پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور یہ بعض اہل حجاز کا مذہب ہے۔

روایت میں ہے:

"سب سے زیادہ برکت والی (عورت)، سب سے کم تر مہر والی ہے۔"

ایک روایت میں ہے:

"جلد نکاح ہوجانا اور جلد ولادت ہونا، عورت کی برکت سے ہے۔"

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں اور میں کہتا ہوں:

عورت کی نحوست یہ ہے کہ اس کا مہر زیادہ ہو اور نکاح کرنے والے کے لیے یہ بات درست نہیں کہ وہ پوچھے، "عورت کو کیا ملے گا؟" (یعنی کیا جہیز لائے گی)، اور نہ ہی اس کے لیے یہ درست ہے کہ اس کو کچھ چیز دے تاکہ اس سے زیادہ لے اور نہ ہی یہ درست ہے کہ مرد کو کچھ ہدیہ دے کر مجبور کریں کہ وہ اس سے زیادہ دے کر بدلہ چکائے۔ اور اگر وہ بدلہ چکانا چاہے تو اس پر اس کی مقدار سے زیادہ دینا لازم نہیں اور اگر مرد کو ہدیہ میں ایسی نیت معلوم ہوجائے تو اسے لینے سے انکار کا حق حاصل ہے۔ نکاح میں یہ تمام باتیں بدعت ہیں۔ یہ تو نکاح میں تجارت سی بن گئی اور یہ سُود میں داخل ہے اور جوئے سے بھی اس کی مشابہت ہے۔

خاوند کی صفات

جس نے اس نیت سے نکاح کیا یا نکاح کر دیا تو یہ فاسد نیت ہے اور اس کا نکاح دین و آخرت کے لیے نہیں۔

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے:

"جب ایک آدمی نکاح کرکے یہ کہے کہ عورت کے لیے کیا (جہیز) ہے؟ تو سمجھ لو کہ وُہ چور ہے، اس سے نکاح نہ کرو۔"

مزید برآں کسی بدعتی، فاسق، ظالم، شراب نوش اور سود خور کے ساتھ لڑکی کا نکاح نہ کرو۔ جس نے ایسا کیا اس نے اپنا دین برباد کیا۔ قطع رحمی کی اور اپنی بیٹی کی ولایت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس نے احسان چھوڑ دیا اور یہ لوگ ایک مسلمان عفیفہ اور آزاد عورت کا کفو نہیں ہیں۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"صرف متقی لوگوں سے نکاح کرو۔ اگر اس نے اس سے محبت کی تو اس کی عزت کرے گا اور اس سے نفرت کی تو انصاف کرے گا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنے نطفوں کے لیے بہتر جگہ تلاش کرو۔ اور کفو والوں سے نکاح کرو اور انہی کو نکاح کر کے دو۔" ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا چاہے عورت ثیبہ ہو اور اگر ولی نہ ہو تو مسلمان بادشاہ اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں یا جس کو وہ حَکَم بنائے وہی ولی شمار ہوگا۔ سنت یہی ہے۔

میاں بیوی کے واجبات

نکاح کرنے والے کو چاہیے کہ وہ حیض کے مسائل سیکھے۔ اس کے مختلف اوقات اور کمی بیشی کی باتوں سے آگاہ ہو اور استحاضہ کے احکام جانے۔ طہر کا وقت معلوم ہو اور عورت کو یہ مسائل سکھا کر اسے دوسروں کے پاس جانے سے مستغنی کر دے۔ پھر اپنی بیوی اور گھر والوں کو نماز کے فرائض و احکام اور اسلام کے دوسرے مسائل، اعتقادات سکھائے اور اہلسنت والجماعت کے تمام عقائد و مسائل سے آگاہ کر دے۔ اگر مرد ایسا کر دے تو عورت پر لازم نہیں کہ وہ علماء کے پاس جا کر مسائل معلوم کرے۔

اور اگر علمِ توحید، اسلام کے بنیادی مسائل و نظریات، ایمانیات اور اہل سنت کے مذہب کی ضروری تفصیلات سے مرد، عورت کو آگاہ نہ کر سکے تو عورت کو اجازت ہے کہ وہ نکل کر معلومات حاصل کر سکے جن سے مرد کی جہالت کے باعث وُہ محروم ہے۔ البتہ نفلی اور فضیلتِ علم کی خاطر مرد کی اجازت کے بغیر باہر آنا جائز نہیں۔

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ مرد کو حرام کمانے پر اکسائے اور نہ ہی مرد کو گناہوں پر مجبور کرنا جائز ہے۔ مرد کو بھی بُرے کاموں میں داخل ہونے اور دنیا کے عوض آخرت فروخت کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر عورت نیکی و تقویٰ پر مرد کا ساتھ دے سکے تو اس کو بسائے اور اگر عورت مرد کو برائی اور ظلم پر مجبور کرے تو اسے الگ کر دے۔

وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ[1] (اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو غنی کرے گا اپنی کشائش سے)

کہتے ہیں کہ قیامت کے روز سب سے پہلے مرد کو اس کی بیوی اور بچے چپکیں گے۔ اسے اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا کر کے کہیں گے،

اے ہمارے پروردگار، ہمارا حق اس سے لے لے۔ ہم جاہل تھے اس نے ہمیں تعلیم نہیں دی۔ یہ ہمیں حرام کھلاتا تھا اور ہمیں خبر نہ تھی۔ فرمایا: چنانچہ اس سے بدلہ لیا جائے گا۔

ایک روایت میں ہے: "ایک آدمی کو میزان کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ اس کی نیکیاں پہاڑوں کے برابر

---

[1] النساء ۱۳

ہوں گی۔ اس پر اپنے بال بچوں کی حفاظت اور ان کے حقوق ادا کرنے کی پرسش ہوگی اور یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ آخر کار یہ مطالبات اس کے تمام اعمال کو ختم کر دیں گے اور اس کے پاس ایک نیکی بھی باقی نہ رہے گی۔ فرشتے آواز دیں گے، یہ وہ آدمی ہے کہ اس کے عیال نے دنیا میں اس کی نیکیاں کھائیں اور آج اپنے اعمال کی وجہ سے پھنس چکا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر شر (سزا) کا ارادہ کرتا ہے تو دنیا میں اس پر ایسی ڈاڑھیں (یعنی اہل وعیال) مسلط کر دیتا ہے جو اسے نوچ نوچ کھاتی ہیں۔"

ایک روایت میں ہے،

"بندہ گھر والوں کی جہالت سے زیادہ بڑا گناہ لے کر اللہ کو نہیں ملے گا۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے،

"آدمی کا یہ گناہ کافی ہے کہ اپنے عیال کو ضائع کر دے۔"

روایت میں ہے،

"(اہل و) عیال سے بھاگنے والا، اپنے آقا سے بھاگے ہوئے غلام کی طرح ہے۔ جب تک وہ ان کی طرف واپس نہ آئے گا، اس کی نہ نماز قبول ہوگی اور نہ روزہ۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا [1] (اے ایمان والو، اپنی جانوں کو اور اپنے اہل کو اس آگ سے)

چنانچہ اہل کو اس کے اپنے نفس کے ساتھ ملا دیا کہ دونوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ آگ سے بچاؤ، جیسے کہ ہم اپنی اپنی جانوں کو بچاتے ہیں۔

عَلِّمُوْهُنَّ وَ اَدِّبُوْهُنَّ۔ (انہیں تعلیم دو اور ادب سکھاؤ)

کی وضاحت میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"تم میں کا ہر آدمی راعی ہے اور تم سب کو اپنی رعیت کے بارے میں پرسش ہوگی۔" عورت راعیہ (نگران) ہے خاوند کے مال پر، اس سے بھی پرسش ہوگی اور مرد اپنے اہل کا راعی ہے۔ اس سے ان کے بارے میں پرسش ہوگی۔

---

[1] التحریم ۶

بتاتے ہیں کہ اگر عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے کچھ خرچ کر دے تو جب تک خاوند اسے اجازت نہ دے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں رہتی ہے اور عورت کو کھجور (رطب) کے سوا دوسری چیز صدقہ کرنے کی اجازت نہیں۔ اس لیے کہ اس کے خراب ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔ اب اگر عورت نے مرد کی اجازت سے خرچ کیا اور کھلایا تو مرد کی طرح اسے بھی اجر ملے گا اور اگر عورت نے مرد کی اجازت کے بغیر کھلایا تو مرد کو اجر ملے گا اور عورت پر گناہ ہے (البتہ خود جائز اور ضروری ضروریات مثلاً لباس، کھانا، استعمال کرنا بغیر اجازت کے جائز ہے، اس لیے کہ یہ عورت کے حقوق ہیں)

مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کو اپنا حق بتا دے اور اسے یہ سمجھا دے کہ تم پر مرد کی اطاعت لازم ہے۔ اس لیے کہ یہی تیرا جنت و دوزخ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو عورت فوت ہو جائے اور اس کا مرد اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گی۔"

ایک آدمی نے سفر کیا اور عورت کو کہا:

"مکان کے اونچے حصہ سے اتر کر مکان کے نیچے حصہ تک نہ آنا۔" اس عورت کا والد نیچے تھا۔ وہ بیمار پڑ گیا، عورت نے اجازت مانگی کہ میں باپ کے پاس اتر کر جاؤں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنے خاوند کی اطاعت کرو۔" آخر باپ فوت ہو گیا۔ عورت نے اب وہاں جانے کی اجازت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاہی آپ نے فرمایا:

"خاوند کی اطاعت کر۔" اس کا باپ دفن کر دیا گیا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو پیغام بھیجا:

"اللہ تعالیٰ نے اس عورت کے باپ کو اس کے اپنے خاوند کی اطاعت کرنے کی وجہ سے بخش دیا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب عورت پانچ نمازیں پڑھے، ماہ (رمضان) کے روزے رکھے، شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے وہ اپنے پروردگار کے پاس جنت میں داخل ہو گی۔" چنانچہ آپ نے اطاعتِ شوہر کو بھی اسلام کی ایسی بنیادوں میں داخل کر دیا کہ جن کی وجہ سے جنت میں داخلہ ملتا ہے اور مرد کی اطاعت کو جنت میں داخل ہونے کی شرط فرمایا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا ذکر کیا تو فرمایا:

"حاملہ عورتیں، جننے والیاں، دودھ پلانے والیاں اور اپنی اولاد پر رحم کرنے والیاں، اگر اپنے خاوندوں

کے ساتھ بدسلوکی نہ کریں تو ان میں سے نماز پڑھنے والیاں جنت میں داخل ہوجاتیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"میں نے دوزخ میں جھانکا تو وہاں زیادہ تر عورتوں کو دیکھا اور میں نے جنت میں جھانکا تو وہاں کم تر عورتوں کو دیکھا۔ میں نے عرض کیا:

"عورتیں کہاں ہیں؟"

فرمایا: "انہیں سونے چاندی نے غافل کر دیا۔"

یعنی زیورات اور رنگین وحسین لباس نے انہیں غافل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنے زیورات سے صدقہ کیا کرو۔ اس لیے کہ میں نے تمہیں زیادہ تر اہلِ دوزخ دیکھا ہے۔"

انہوں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ کیوں؟"

فرمایا: "تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور عشیر (یعنی خاوند) کی ناشکری کرتی ہو۔"

اس پر ایک نوجوان عورت نے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ، پھر میں نکاح نہیں کروں گی۔"

ام عبد مغلبیہؓ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا:

ایک نوجوان عورت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک نوجوان عورت ہوں، مجھے دعوتِ نکاح دی جاتی ہے مگر میں نکاح کرنے کو پسند نہیں کرتی۔ خاوند کا بیوی پر کیا حق ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"اگر مرد سر کی مانگ سے لے کر قدموں تک پیپ بن جائے اور عورت اسے چاٹ لے تو بھی مرد کا شکر ادا نہیں کر سکتی۔"

اس نے کہا:

"پھر میں نکاح نہیں کرتی۔"

آپؐ نے فرمایا:

"ہاں، نکاح کر لو، یہی بہتر ہے۔"

یہ روایت خثعمیہ کی مجمل ہے۔ اور اس حدیث میں اسی کی توضیح آتی ہے۔

حضرت عکرمہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا،

قبیلہ خثعم کی ایک عورت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کیا،

"میں ایک بیوہ عورت ہوں اور نکاح کرنا چاہتی ہوں تو خاوند کا کیا حق ہے؟"

فرمایا: "خاوند کا بیوی پر یہ حق ہے کہ جب وہ اس سے (مباشرت) کرنا چاہے اور وہ (عورت) اونٹ کی پشت پر سوار ہو تو اسے نہ روکے۔"

خاوند کی افضلیت کے بارے میں ایک جامع خبر آئی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر میں کسی کو حکم کرتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اس کا اس قدر عظیم حق ہے۔"

مرد کا یہ حق ہے کہ عورت، مرد کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے کچھ چیز کسی کو نہ دے۔ اگر اس نے بغیر اجازت کسی کو دیا تو مرد کے لیے اجر ہے اور عورت پر گناہ ہے۔ مرد کا ایک حق یہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر عورت نفلی روزہ نہ رکھے۔ اگر اس نے بغیر اجازت نفلی روزہ رکھا تو یہ فاقہ ہے جو قبول نہ ہوگا۔ مرد کا ایک حق یہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہ آئے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو جب تک وہ واپس نہیں آتی یا توبہ نہیں، فرشتے اس پر لعنت برساتے رہیں گے۔

پردے کی اہمیت

عورت کو چاہیے کہ ہر رات اپنے آپ کو مرد پر پیش کیا کرے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:

"عورت رب تعالیٰ کے چہرہ کے قریب ترتب ہے کہ جب وہ اپنے گھر کے اندر ہو اور اس کا اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اس کا کمرے کے اندر نماز پڑھنا، گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اس کا مخدع (کمرے کے اندر کمرے) میں نماز پڑھنا، کمرے میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پردہ کی چیز ہے اور جو زیادہ پردے میں ہوگی وہی زیادہ سلامتی میں ہے۔ اور زیادہ سلامتی والی ہی زیادہ افضل ہے۔

ایک روایت میں ہے:

"عورت کے دس پردے ہیں، جب عورت نے نکاح کیا تو خاوند کا پردہ ایک پٹہ ہے۔ اور جب اس کی وفات ہوئی تو قبر نے دس پردے کر دیے۔"

اب اگر خاوند عورت کی اصلاح کی بات کرے مگر عورت مرد کی مخالفت کرے تو وہ اسے نصیحت کرے اور

ڈانٹ پلائے۔ اور اگر دوبارہ نافرمانی کرے تو اس کے بستر سے علیحدگی اختیار کرے۔

بعض علماءؒ کا فرمان ہے؛

"اس کی طرف پشت کرے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے؛

"تین راتوں سے لے کر سات راتیں اس سے علیحدگی رکھے۔ اگر اب بھی درست نہ ہو تو اس کو مارے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے؛

"ایسی مار نہ دے کہ اس کی ہڈی ٹوٹ جائے یا بدن سے خون بہنے لگے۔ مرد کو حق حاصل ہے کہ دینی معاملہ بیس دس روز سے لے کر ایک ماہ تک عورت پر ناراض رہے۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک کلام پر ازواج مطہرات سے ناراض ہوئے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت زینبؓ کے پاس ایک تحفہ بھیجا، انہوں نے واپس کر دیا اور جو اس کے گھر میں تھی اس نے کہا،

"میں نے آپؐ کا ہدیہ واپس کر کے آپؐ کو خفیف کیا" (یعنی اقمتک) اس پر آپؐ تمام ازواجؓ سے ایک ماہ تک ناراض رہے۔ یہ کلمہ اتباع سے ہے۔ عرب کہا کرتے ہیں، اقمتہ' اور اس طرح صاغوا قمیا کا لفظ مستعمل ہے اور مازال کذٰلک حتّٰی ذل وقمی۔ (وہ ہمیشہ ایسا رہا آخر ذلیل و رسوا ہوا) اور یہ لفظ تحقیر کے لیے آتا ہے۔

عورتوں کے حقوق

گھر والوں پر اخراجات میں تساہل نہ کرے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"تم میں سے بہتر وہ ہیں جو اپنے اہل کے ساتھ بہتر ہو۔"

حضرت علیؓ کی چار بیویاں تھیں اور وہ ہر ایک کے لیے ہر چار روز میں ایک بار گوشت خریدتے۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا،

"وہ اپنے گھروں میں خوشحال تھے اور سامان اور کپڑوں میں قرب ہے۔"

ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:

"مستحب یہ ہے کہ انسان ہر ماہ میں ایک بار گھر والوں کے لیے فالودہ تیار کرے اور اگر اہلیہ سے کوئی لغزش یا فضول حرکت سرزد ہو جائے تو اسے برداشت کرے اور اس پر سختی نہ کرے بلکہ نرمی کے ساتھ پیش آئے۔"

حدیث میں ہے،

"عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اگر تو نے اسے سیدھا کیا تو توڑ دے گا۔ اور اگر اسے چھوڑا تو ٹیڑھی

ہونے کے باوجود اس سے فائدہ اٹھائے گا"

اور ایک لفظ یہ ہیں ؛

" اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے ۔" حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی بات کا جواب دیتیں. گاہے ایک عورت آپ سے رات کو علیحدہ رہتی۔ ایک نے آپ کو سینہ میں دھکا دیا تو اس کی والدہ نے ڈانٹ پلائی۔ آپ نے فرمایا ؛

" اسے چھوڑ دو۔ یہ اس سے بھی زیادہ کرتی ہیں۔ آپ کے اور حضرت عائشہؓ کے درمیان تکرار ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ درمیان میں فیصلہ کرنے والے قرار پائے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

" تم بات کرو گی یا میں بات کروں ؟"

انہوں نے کہا ؛

" آپ بات کیجئے مگر حق کہیے "

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں زور سے تھپڑ مارا اور ان کے منہ سے خون نکل آیا اور فرمایا ؛

" اپنی جان کی دشمن ، کیا آپ حق کے علاوہ بھی کہتے ہیں ؟ بلکہ تو اور تیرا باپ باطل کہتا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتے "

انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی خاطر یہ ناراضگی دکھائی۔ آخر حضرت عائشہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چھپ کر پناہ حاصل کی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا ؛

" ہم تجھے یہ نہیں کرنے دیں گے اور نہ ہمارا یہ ارادہ ہے۔ ایک بار غصہ میں آکر یہ کہہ دیا ، آپ ہیں جو گمان کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حلم و کرم کی وجہ سے مسکرا دیے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا کرتے ؛

" میں تیرا غصہ اور رضامندی سمجھتا ہوں "

عرض کیا ؛ " وہ کیسے سمجھ لیتے ہیں ؟"

فرمایا : " جب تم راضی ہوتی ہو تو کہتی ہو " نہیں ، اور محمدؐ کے خدا کی قسم " ، اور جب تم ناراض ہوتی ہو " نہیں اور ابراہیم کے خدا کی قسم "

انہوں نے کہا ؛ " آپ نے درست فرمایا۔ میں آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں (ایسے موقع پر)"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں سے ایسا مذاق کر لیا کرتے جو ان کے عقل و اخلاق کے معیار کے مطابق ہوتا۔ ایک روایت میں ہے؛

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے ساتھ لوگوں سے زیادہ فکاہت سے پیش آتے۔"

لقمان حکیمؑ کا قول ہے؛

"عقلمند آدمی اپنے گھر میں اور اپنی اہلیہ کے ساتھ بچے کی طرح ہوتا ہے اور جب قوم میں آتا ہے تو وہ ایک مرد ہوتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے؛

"اللہ تعالیٰ جعظری جواظ سے بغض رکھتا ہے۔" یعنی جو گھر والوں پر تشدد کرے اور تکبر کرنے والا ہو۔ فرمانِ الٰہی ہے؛

عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝[1] (اجڈ، اس سب کے پیچھے بدنام)

اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ گھر والوں پر درشت زبان اور سنگدل ہو اور اس طرح غلام اور ماتحت پر سنگدل ہو۔ روایت ہے؛

"ایک غیرت سے اللہ تعالیٰ بغض رکھتا ہے کہ مرد اپنی بیوی پر تنگ کر کر کے ہی غیرت دکھاتا رہے۔"

گویا اسے اپنے گھر والوں پر بدظنی کی وجہ سے یہ غصہ و غیرت ہوئی۔ حالانکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے بدظنی سے منع کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛

"اپنے اہل پر زیادہ غیرت (غصہ) نہ دکھا۔ اس وجہ سے تو برائی دیکھے گا۔" اور غیرت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب انسان اس سے تجاوز کرے تو وہ واجب میں کوتاہی کرے گا اور حق پر اضافہ کر دے گا۔

حضرت حسنؓ فرماتے؛

"کیا تم اپنی عورتوں کو بازاروں میں کافروں سے مزاحمت کی اجازت دیتے ہو۔ جو غیرت نہ کھائے اللہ اسے ذلیل کرے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے بتایا؛

"اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ نکالو۔"

ان کے ایک لڑکے نے فرمایا؛

---

[1] القلم ۱۳۔

"ہاں، اللہ کی قسم! ہم انہیں منع کریں گے۔"

حضرت ابن عمرؓ نے انہیں مارا اور سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: تو مجھ سے سن رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:

"انہیں نہ روکو" اور تم کہہ رہے ہو کہ ہم روکیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔[۱] (اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ کر دیا)

ایک حکیم کا قول ہے:

"جس نے تجاوز کیا وہ مذموم ہے جیسے کہ کوئی آدمی کوتاہی کرے تو مذموم ہوتا ہے۔"

اور اگر ایک آزاد مسلمان عورت کسی ضروری کام سے باہر نکلے تو اسے اس کی اجازت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہیں اس کی اجازت ہے کہ اپنی ضروریات میں نکل سکو۔ اس طرح عید دن (نمازِ عید کے لیے) خصوصیت سے جایا کرو۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق طور پر اس کی اجازت دی۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ خاوند کی اجازت و رضامندی سے نکلیں اور صرف اس کام سے نکلیں جس کی سخت ضرورت ہو اور جب ضرورت نہ رہے تو پھر نہ جائیں اور اگر کوئی اجنبی مرد انہیں نہ دیکھے تو یہ بات ان کے قلوب کے زیادہ مناسب ہے اور افضل بات ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

"اے بیٹی! عورت کے لیے کیا چیز بہتر ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:

"یہ کہ نہ وہ کسی (غیر) مرد کو دیکھے اور نہ کوئی (غیر) مرد اسے دیکھے۔" آپ نے اسے سینہ سے لگا لیا۔ اور فرمایا:

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ (کہ اولاد تھے ایک دوسرے کی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ دیواروں کے سوراخ اور دراڑیں بند کر دیا کرتے، جن میں عورتیں جھانکتی ہیں۔

---

[۱] الطلاق ۳۔

حضرت معاذؓ نے ایک عورت کو دیوار کے روشندان سے جھانکتے دیکھا تو اسے مارا۔ ان کی ایک عورت نے ایک غلام کو سیب دیا جس میں سے کچھ خود کھایا تھا۔ آپؓ نے اسے مارا۔

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے،

"عورتوں کو گھر سے میں رہنا چاہیے۔ عورتوں کو گھر سے چپکا دو کہ گھروں میں ہی رہا کریں۔"

اور فرمایا کرتے کہ "عورتوں کو "نہیں" کا عادی بنا دو۔"

ایک بار کسی حکم کے معاملہ میں انھوں نے بات کی تو ان کی بیوی تکرار کرنے لگی تو اس سے منع کیا اور فرمایا،

"تو اس کے لیے نہیں ہے بلکہ تو گھر کے ایک کونے کا کھلونا ہے۔ جب ہمیں تیری ضرورت ہوا کرے تو ٹھیک ورنہ جیسی ہو بیٹھی رہا کرو۔" اور مرد کو بیوی کی فضول بیانات اور ایذاء دہی پر صبر کرنے کا اجر ملے گا اور ان سے حسن سلوک کا ثواب حاصل ہوگا۔

محمد بن حنفیہؒ فرمایا کرتے،

"دانشور وہ نہیں ہے کہ جو اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے جس کی معاشرت کے بغیر اسے چارۂ کار نہیں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس سے نجات اور رہائی کی راہ نکال دے۔" اور اگر عورت بدزبان، کم اطاعت اور سخت جاہل اور اجڈ ہو۔ ایذاء کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا ہو تو دونوں کے دین کی حفاظت اور دنیا و آخرت میں دونوں کو قلبی راحت اسی میں ہے کہ اسے طلاق دے دی جائے۔

ایک آدمی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کی بدکلامی کی شکایت کی۔ فرمایا،

"اسے طلاق دے دو۔"

اس نے عرض کیا،

"مجھے اس سے بڑی محبت ہے۔"

فرمایا، "پھر روکے رکھو۔" یعنی محبت کی وجہ سے فراق ہونے پر پریشان قلبی کا خطرہ تھا اور پریشان قلبی بدنی ایذا سے بھی بدتر چیز ہے۔ اسی لیے روک دیا۔

فرمان الٰہی ہے،

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ[۵]

(مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے، اور وہ بھی نہ نکلیں مگر جو کریں صریح بے حیائی)

---

[۵] الطلاق - ۱

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے :

"اگر یہ اپنے اہل پر بیہودہ کلامی کرے اور اپنے خاوند کو ایذا دے تو یہ فاحشہ ہے۔ یہ عدت میں مراد ہے"۔ اس لیے کہ فرمان ہے:

اَسْکِنُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِنْ وَجْدِکُمْ[1] (ٹھہراؤ ان کو جہاں تم خود ٹھہرو اپنے مقدور کے مطابق)

اور یہ اس فرمان کے متصل ہے:

وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ۔

وَ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ۔ (اور انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو یعنی عدت میں انہیں گھروں سے نہ نکالو)

طلاق و خلع

بعض لوگ طلاق کو ممنوع سمجھتے ہیں اور اس آیت کی غلط تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ یاد رکھیں کہ طلاق ایک مباح کام ہے۔ البتہ بغیر کسی سببِ تفرقہ کے طلاق دینا ایک مکروہ فعل ہے۔

روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ نے طلاق سے زیادہ مبغوض چیز کو مباح نہیں کیا"۔ اور اگر عورت یہ دیکھے کہ مرد اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہیں کرتا اور حدودِ الٰہی کا پاس نہیں کرتا تو عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ فدیہ دے کر طلاق لے لے اور مرد نے جس قدر عورت کو دے رکھا ہے اس سے زاید فدیہ کا مطالبہ کرنا مکروہ ہے۔ فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ[2] (سو اگر تم لوگ ڈرو کہ وہ نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے، تو نہیں گناہ دونوں پر، جو بدلہ دے کر چھوٹے عورت)

اور یہی خلع ہے جو اکثر علماء کے نزدیک جائز ہے۔

کسی عورت کے لیے مرد سے طلاق مانگنا جائز نہیں اور نہ ہی مرد کی رضامندی کے بغیر اس سے خلع کر لینا جائز ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس عورت نے اپنے خاوند سے بغیر کسی ہرج کی بات کے طلاق مانگی وہ جنت کی ہوا نہیں پائے گی"۔

فرمایا: "خلع کرنے والیاں ہی منافق عورتیں ہیں"۔

---

[1] الطلاق ۶

[2] البقرہ ۲۲۹

اور نشوز (نافرمانی) مرد عورت دونوں سے ہوسکتی ہے۔ البتہ مرد کو عورت کی نافرمانی (نشوز) میں مارنے کی اجازت ہے اور عورت کو مرد کی نافرمانی (نشوز) میں صلح کرنے کی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ۔ (اور صلح کرنا بہتر ہے)

اور نشوز کا مطلب یہ ہے کہ دونوں میں ایک، دوسرے پر زیادتی اور ظلم کرے، بدکلامی کے ذریعہ ایسا کرے یا ایذا دے یا علیحدگی اختیار کرے۔ اس موقع پر مرد اور عورت کی جانب سے ایک ایک حکم (فیصلہ کرنے والے) آئیں گے اور وہ غور کر کے عدل کے ساتھ فیصلہ کریں گے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے نکاح پر غنا کا وعدہ کیا۔ اسی طرح تفرقہ پر بھی غنا کا وعدہ فرمایا:

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ[1] (اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے محفوظ کرے گا)

فرمایا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ[2] (اور نکاح کرو، رانڈیوں کو اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں، اگر وہ ہوں گے مفلس تو غنی کرے گا اپنے فضل سے)

اب کا ہے مال کے ذریعہ غنا حاصل ہوتا ہے اور کا ہے دونوں میں سے ہر ایک، دوسرے سے مستغنی ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک اپنا مخفی کرم فرماتا ہے۔

روایت میں ہے:

"تین کی دعا قبول نہیں کی جاتی۔ وہ مرد جس کی عورت بری ہو۔ وہ یہ کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے تم سے نجات دے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں طلاق کا معاملہ دے رکھا ہے، جب چاہے طلاق دے دے اور دوسرا برے غلام اور برے پڑوسی کے بارے میں۔" فرمایا کہ ان کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔

انسان کو اپنے اہل کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا[3] (پھر اگر تمہاری اطاعت کریں تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی)

---

[1] النساء ۱۳۰

[2] النور ۳۲

[3] النساء ۳۴

یعنی تفریق اور جھگڑے کی راہ تلاش نہ کرو اور یہ اس صورت میں نفس مطمئنہ کے طور پر ہوگی کہ جب ایمان کے لیے دعوت دی جائے تو وُہ اہل ایمان کے اخلاق بخوشی قبول کر لیتی ہو۔ اب اس سے نرمی کا برتاؤ کیا اور مباح بات حاصل کرنے میں نرمی اختیار کرو۔

اللہ تعالیٰ نے بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے مشابہ قرار دیا۔ فرمایا:

وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا۔ (اور دنیا میں ان دونوں کا ساتھ دے دستور سے)

اور عورتوں کے بارے میں فرمایا:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (اور ان سے دستور کے ساتھ معاشرت کر)

اور خاوند کے حق سے جو جدا رکھا اسے مجمل طور پر بیان کیا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (اور ان کے لیے ہے جیسے کہ ان پر ہے دستور کے مطابق)

اور بڑا حق بتایا:

وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا۔ (اور لے چکیں تم سے عہد پختہ)

فرمایا:

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ۔ (اور برابر کے رفیق سے)

ایک قول میں اس سے مراد عورت ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری تین وصیتیں فرمائیں۔ آپؐ تین کے بارے میں بتا رہے تھے کہ آپؐ کی زبان تھتھلا گئی اور آواز پست ہو گئی۔ آپؐ فرما رہے تھے:

"نماز نماز اور جن پر تمہارے دائیں ہاتھوں کا قبضہ ہے (یعنی غلام) انہیں ایسی مشقت میں نہ ڈالو کہ جس کی انہیں ہمت نہ ہو اور عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا۔ وہ تمہارے ہاتھوں قیدی ہیں۔ تم نے انہیں اللہ کے عہد کے ساتھ لیا۔ اور کلمۃ اللہ کے ذریعہ ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا۔" (یعنی نکاح کے ذریعہ حلال کیا۔)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:

"مرد پر عورت کا کیا حق ہے؟"

فرمایا: "جب وُہ کھائے اسے بھی کھلائے۔ اور جب خود پہنے اُسے بھی پہنائے اور اس کے چہرے پر نہ مارے اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کرے مگر گھر میں۔"

جب نکاح کرے تو اُسے چاہیے کہ عورت کے ساتھ حُسنِ معاشرت، اس کے حقوق کی ادائیگی، مدارات اور

لطف و کرم کا طریقہ سیکھے اور عورت کو بھی اپنے حقوقِ واجبہ سے آگاہ کردے۔ عورت تیری کسی چیز کی مالک نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اس پر اختیار دیا۔ اس لیے اپنی خواہش کی وجہ سے حکمتِ الٰہی کو نہ بدلنا ورنہ معاملہ تمہارے خلاف ہوگا۔ یوں ہوگا کہ گویا تم نے دشمن کی اطاعت کی اور اس قول میں اس کی موافقت کی۔

وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ[1] (اور ان کو سکھاؤں گا کہ اللہ کی بنائی صورت بدلیں)

فرمایا:

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا[2] (اور مت پکڑوا دو بے عقلوں کو اپنے مال جو بنائے اللہ نے تمہاری گزران)

یعنی عورتوں کو اور بچوں کو مال نہ دو۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بیوی کا بندہ ہلاک ہوا۔" اس لیے کہ اس نے بیوی کی خواہشات کی اطاعت کر کے ہلاکت خریدی۔ گویا اس نے اللہ کی نعمت کو ناشکری میں بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو اپنے کلام میں سردار بنایا۔ فرمایا:

وَ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ[3] (اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس)

یعنی اپنے خاوند کو۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا:

"انسان نے جب بھی ایسی صبح کی کہ وہ عورت کی خواہشات میں اس کی تابعداری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے آگ میں اوندھا ڈال دے گا۔" اور اسے کوئی عادت بھی نہ ڈالو ورنہ تجھ پر بڑھے گی اور عادت پوری کرنے کا مطالبہ کرے گی۔ یہ ٹھیک نفسانی اخلاق کی طرح ہے۔ اگر تو نے اس کی باگ کھلی چھوڑ دی تو یہ تجھ پر چڑھ آئے گی اور اگر تو نے اس کی باگ ذرا ڈھیلی کر دی تو یہ تیرا ہاتھ بھی گھسیٹ لے گی اور اگر تو نے اس پر سخت گرفت رکھی اور لگام کھینچ کر رکھی تو شاید یہ تیری تابعداری کرے۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"تین وہ ہیں کہ اگر تو نے ان کی عزت کی تو وہ تیری توہین کریں گے اور اگر تو نے ان کی توہین کی تو وہ تیری

---

[1] النساء ۱۱۹

[2] النساء ۵

[3] یوسف ۲۵

عزّت کریں گے۔ عورت، خادم اور نبطی۔"

خاوند کی اطاعت

عرب عورتیں اپنی لڑکیوں کو ایسی باتیں سکھاتیں کہ جن سے وُہ اپنے شوہروں کا امتحان لے سکیں۔

ایک عورت نے اپنی بیٹی کا نکاح کر کے کہا:

"اے بیٹی، اپنے خاوند کے پاس جانے سے پہلے اس کا امتحان لو۔ اس کے نیزے کے پچھلے حصہ کا لوہا اتارو۔ اگر وہ خاموش رہے تو اس کی ڈھال پر اس کا گوشت کاٹو اور اگر تسلیم کرلے تو اسی کی تلوار سے اس کی ہڈیاں توڑو۔ اور اگر صبر کرے تو اس کی پیٹھ پر پالان ڈالو اور اس پر سواری کرو۔ یہ گدھا ہے۔"

اسماء بن خارجہ خزاری عرب کے حکماء سے تھے۔ انہوں نے شبِ زفاف میں اپنی بیٹی کو کہا:

"اے بیٹی، اگر تیری والدہ زندہ ہوتی تو وُہ تجھے نصیحت کرنے کی مجھ سے زیادہ حقدار تھی اور اب دوسروں سے زیادہ مجھے ادب سکھانے کا حق ہے۔ جو کہوں اسے خوب طرح سمجھ لو۔

تُو جس گھونسلے میں داخل تھی آج اس سے نکل کر ایک ایسے بستر پر جا رہی ہے جس سے تو واقف نہیں، ایسے دوست کے پاس جا رہی ہے جس سے تُو مانوس نہیں۔ تُو اس کے لیے زمین بن جا۔ وہ تیرے لیے آسمان ہو جائیگا۔ تُو اس کے لیے بستر بن جا وہ تیرے لیے ستون بن جائے گا۔ تُو اس کی لونڈی بن جا وُہ تیرا غلام ہو جائے گا۔ اس سے چپک کر نہ رہ جانا ورنہ تجھے دُور کر دے گا۔ اس سے دُور نہ ہو جانا ورنہ وُہ تجھے فراموش کر دے گا۔ جب وُہ قریب ہو تو اس کے قریب ہو جا۔ جب وُہ دُور ہو تو بھی اس سے دُور ہٹ جا۔ اس کی ناک، کان اور آنکھ کی حفاظت کر، وُہ تجھ سے خوشبو ہی سُونگھے، وہ صرف اچھی بات ہی سُنے اور وہ صرف خُوب صُورت ہی دیکھے۔ اور میں نے ہی تیری ماں کو شبِ زفاف میں کہا تھا:

خُذِی الْعَفْوَ مِنِّیْ تَسْتَدِیْمِیْ مَوَدَّتِیْ ۔۔۔ وَلَا تَنْطِقِیْ فِیْ سُوْرَتِیْ حِیْنَ اَغْضَبُ
وَلَا تَنْقُرِیْنِیْ نَقْرَكِ الدُّفَّ مَرَّةً ۔۔۔ فَاِنَّكِ لَا تَدْرِیْنَ مَاذَا الْمُغَیَّبُ
فَاِنِّیْ رَاَیْتُ الْحُبَّ فِی الْقَلْبِ وَالْاَذٰی ۔۔۔ اِذَا اجْتَمَعَا لَمْ یَلْبَثِ الْحُبُّ یَذْهَبُ

(مجھ سے معافی لے، میری محبت دائمی ہو گی، اور جب میں غصہ میں ہوں گا تو میرے رعب کے سامنے کلام نہ کرنا)
(اور مجھے ایک بار دف کی طرح نہ بجا - اس لیے کہ تجھے خبر نہیں کہ غیب میں کیا ہے۔)
(میں نے دل میں محبت اور ایذاء کو دیکھا - جب دونوں جمع ہوں تو محبّت ختم ہو جاتی ہے۔)

چھ عورتوں سے نکاح نہ کرو

ایک عرب نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ چھ عورتوں سے نکاح نہ کرنا:

۱۔ انانہ (رونے دھونے والی)

۲۔ منانہ (احسان جتانے والی)

۳۔ حنانہ (سابق خاوند کی یاد میں رہنے والی)

۴۔ حداقہ (طرح طرح کی اشیاء چاہنے والی)

۵۔ براقہ (ہر وقت سنگار کرنے والی)

۶۔ شداقہ (تیز زبان)

اس کی تفسیر یہ ہے کہ

۱۔ وہ عورت جو کہ ہر وقت سر پر پٹی باندھے رہے۔ درد اور شکوہ شکایت ہی اس کا معمول ہو۔

۲۔ جو مرد پر احسان جتایا کرے کہ میں نے تیرے ساتھ یہ یہ احسان کیا اور تُو ایسا نگوڑا ہے۔

۳۔ حنانہ سے مراد دو ہیں: ایک وہ جو اپنے خاوند کو یاد کیا کرے اور اس کا دل اس کی طرف مائل ہو۔ دُوسری وُہ عورت کہ جس کا پہلے خاوند سے ایک بچہ ہو اور وُہ اس کی یاد میں رہے۔

۴۔ حداقہ سے مراد وہ عورت ہے کہ جو چیز دیکھے اشارہ کر دے کہ اسے خرید دو۔ خاوند سے ہر طرح کی چیزیں لانے کی فرمائشیں کرتی رہے اور اسے زیرِ بار رکھے اور جیسے بعض مرد عورتوں کو تاڑتے ہیں۔ اسی طرح یہ مردوں پر نظریں رکھے۔

۵۔ براقہ سے مراد وہ عورت ہے جو ہر وقت اپنی چمک دمک بنانے میں لگی رہے۔ جب دیکھو سنگار کرنے میں مصروف رہے۔ اور ایک مطلب یہ ہے کہ کھانے پر غصّہ منانے والی ہو۔ کھانا کم ہو تو غصّہ سے بھر جائے۔ یا بداخلاقی کی وجہ سے ایسا کرے۔ اور لالچی ہونے کی وجہ سے تنہا کھانا چاہے اور اپنا حصّہ کم سمجھا کرے۔ یہ یمنی لغت ہے اور ان کے ہاں اسے فاشی کہا جاتا ہے۔ کہا کرتے ہیں:

برقت المرأۃ۔ برق الصبی الطعام۔ یعنی عورت یا بچّہ کھانے پر غضبناک ہوگیا۔

۶۔ شداقہ سے مراد وُہ عورت ہے کہ جو بہت باتیں کرے، مُنہ بنا بنا کر اور باچھیں چلا چلا کر کلام کرے۔ اسی سے یہ حدیث ہے:

"اللہ تعالیٰ بکواس کرنے والوں اور باچھیں چلا چلا کر باتیں کرنے والے سے بغض رکھتا ہے"۔

ایک ازدی سیاح کا واقعہ آتا ہے کہ وہ سفر کے دوران حضرت الیاس علیہ السّلام سے ملا۔ انہوں نے اسے نکاح کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

"یہ تیرے لیے بہتر ہے" اور تجرد سے منع کیا۔ فرمایا:

"چار عورتوں سے نکاح نہ کرنا اور ان کے سوا جس سے چاہو نکاح کرلو:

۱۔ مختلعہ

۲۔ مباریہ

۳۔ عاہر

۴۔ ناشر

ہر ایک کی وضاحت یہ ہے :

۱۔ مختلعہ سے مراد وہ عورت ہے جس سے خاوند محبت کرتا ہو مگر یہ معمولی معمولی باتوں پر خلع کرنے کا مطالبہ کرے۔

۲۔ مباریہ سے مراد وہ ہے کہ دوسری عورتوں پر دنیاوی اسباب کے ذریعہ فخر و مباہات جتانے کی عادی ہو، خاوند سے ایسی اشیاء لانے کی فرمائش کرے کہ جن کے ذریعہ وہ دوسری عورتوں پر فخر کر سکے۔

۳۔ عاہرہ سے مراد وہ ہے کہ جو فاجرہ عورت ہو اور کسی خاوند یا دوست سے وابستگی رکھتی ہو۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ[1] (اور نہ یار کرتی ہیں چھپ کر)

۴۔ اور ناشر سے مراد وہ عورت ہے جو کلام یا کام میں مرد پر چڑھ چڑھ آئے اور برتری دکھائے اور اسے زیر رکھنے کی کوشش کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مرد کی بدترین خصلتیں ہیں، بخل، تکبر اور بزدلی۔ مرد میں یہ بدترین خصلتیں ہیں مگر عورت میں اگر تکبر ہو گا ...... تو وہ مرد سے کلام کرنے سے نفرت و شرم کرے گی، اور اگر عورت بزدل ہو گی تو وہ ہر چیز سے ڈرے گی اور گھر سے نہیں نکلے گی۔

عزل' انسانی قتل ہے

عزل کرنا سخت مکروہ اور ناپسندیدہ حرکت ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک قسم کا مخفی شرک ہے اور اس کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت موجود ہے۔ سلف صالحین کی بڑی جماعت نے اس کو ناپسند کیا اور بلند پایہ متقی حضرات عزل نہیں کرتے تھے اور عزل میں کم تر درجہ کی خرابی یہ ہے کہ انسان، اللہ پر توکل سے نکل آتا ہے اور اللہ کے حکم پر رضا میں کمی آجاتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے،

'عزل ہی چھوٹا، زندہ درگور کرنا ہے۔ یہ سنت سے بہترین استنباط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرم

---

[1] النساء ۲۵

صلی اللہ علیہ وسلم سے جماع کے کئی فضائل مروی ہیں۔

ایک آدمی اپنی اہلیہ سے جماع کرتا ہے تو اس کے لیے ایک لڑکے کا اجر لکھا جاتا ہے۔ جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

پوچھا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ، یہ کیسے؟"

فرمایا: "تُو نے اسے پیدا کیا، تُو نے اسے روزی دی، تُو نے اسے ہدیہ (راہِ جہاد) میں پیش کیا۔ تیری طرف اس کا جینا ہے اور تیری طرف اس کی موت ہے؟"

صحابہؓ نے عرض کیا: "بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا، اس کو روزی دی، اس کو ہدیہ (راہِ جہاد) میں دیا۔ اسے زندہ کیا اور اسے مارا۔"

فرمایا: "تو اس معنی میں دیکھ رہا ہے اور وُہ فرماتا ہے کہ جب تُو نے جماع کیا تو تُو نے شرمگاہ میں منی ڈالی۔"

فرمایا:

اَفَرَاَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ[۱] (بھلا دیکھو جو تم منی ڈالتے ہو، اب تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں)

جب اللہ تعالیٰ تیری منی سے کچھ پیدا نہیں کرے گا تو بھی تیرے لیے کافی ہے کہ تُو نے گویا اس سے مذکر پیدا کر کے اس کے احوال و اوصاف مکمل کیے کہ وُہ اللہ کی راہ میں لڑتا ہُوا شہید ہو جائے۔ اس لیے کہ تجھ پر جو لازم تھا وہ سبب تُو نے کر دیا۔ اب اس کا پیدا کرنا اور اسے ہدایت دینا تیرے اُوپر نہیں ہے۔ یہ تقدیرِ الٰہی اور خالص خدا کا فعل ہے۔ اب تیرے لیے ایسے اجر ہُوا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسا کر دیا۔ اس لیے کہ تُو نے بقدرِ قوت کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے:

عزل ہی چھوٹا زندہ درگور کرنا ہے کیونکہ وُہ عزل خود کر رہا ہے اور اس نے ایسا فعل نہ کیا کہ جس کے سبب سے بچہ پیدا ہوتا۔ اب اس کا اجر و ثواب ضائع ہو گیا اور اس پر ایک قتل لازم آیا۔

ہم نے کہا ہے کہ عزل ایک مخفی شرک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں لوگ کئی وجوہ سے عزل کرتے:

۱۔ انہیں بیٹیوں پر عار محسوس ہوتی۔

۲۔ عورتوں پر خرچ کرنا انہیں پسند نہ تھا۔

---

[۱] الواقعہ ۵۸، ۵۹۔

۴۔ کنجوس تھے اور زیادہ بچے ہو جانے پر انہیں فقر و احتیاج کا ڈر رہتا تھا۔

جس آدمی کے لڑکے فوت ہو جاتے اور لڑکیاں زندہ رہتیں، عرب اسے "ابتر" کہا کرتے۔ یعنی یہ کہہ کر اس کی مذمت کرتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہوں نے یہی کہا۔ آپؐ کے لڑکے حضرت ابراہیمؑ کا انتقال ہو گیا اور لڑکیاں زندہ رہیں۔ عاص بن وائل نے آپؐ کے خلاف یہ بکواس کیا کہ آپؐ ابتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد نازل فرمایا:

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ (بے شک تیرا دشمن ہی بے نام ونشان ہونے والا ہے)

اس نے کہا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کا کوئی یاد کرنے والا نہ ہو گا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپؐ کا دشمن ہی ایسا ہے کہ اس کو یاد کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ یعنی آپؐ کے دشمن کی کوئی خوبی اور تعریف نہ کی جائے گی، مگر ہم آپؐ کا ذکرِ خیر ہر زمانہ میں بلند کریں گے۔ اور میرے ساتھ ساتھ آپؐ کا ذکر ہُوا کرے گا۔

عرب کہا کرتے تھے،

جس کے لیے تین آفات میں سے ایک بھی ہو، اس کی قوم نہ عزت مند ہوتی ہے اور نہ وُہ قوم کا دفاع کر سکتا ہے اور ان تین سے مراد ماں، بہن اور بیٹی تھیں۔ انہیں حوبات کہا کرتے تھے۔ حوبۃ کا معنی ہے کبیرہ گناہ۔ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال کھانے کو ظلم قرار دیا۔

فرمایا،

كَانَ حُوبًا كَبِيرًا۔ (یہ بہت بڑا گناہ ہے) مگر حقیقت میں یہ تین گناہ نہیں۔ بعض بلند پایہ تابعین ماں بہن اور بیٹی کی پرورش کرنا بہت بڑی فضیلت بتاتے تاکہ جاہلیت کے طریقہ کی مخالفت ہو جائے۔ چونکہ ان مفاہیم میں عزل پایا گیا اور آج بھی انہی مفاہیم پر عزل پایا جاتا ہے (جیسے کہ خاندانی منصوبہ بندی کرنیوالے کہا کرتے ہیں کہ آدمی بڑھیں گے تو فقر و افلاس بڑھے گا۔ یہ بھی قطعی جاہل اور مشرک لوگ ہیں۔) اور آئندہ بھی اگر ہوا تو اسی مفہوم پر عزل ہو گا۔ اسی لیے ہم نے اسے شرک بتایا اور اسے ایک ناپسندیدہ فعل بتایا۔

اصل میں عزل کرنا خارجی عورتوں کا مذہب ہے جو کہ طہارت میں تعمق کی خاطر زیادہ پانی استعمال کرتی ہیں حیض کے ایام میں بھی روزے رکھتی ہیں اور حیض کے دوران استعمال شدہ کپڑوں کو دھوئے بغیر ان میں نماز نہیں پڑھتیں اور بیت الخلاء میں برہنہ ہو کر جاتی ہیں اور پاکیزگی و نظافت کی ولادت کو ناپسند کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں خلافِ سنّت ہیں۔ عرب کی عورتوں نے یہ بدعات جاری کیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی سنّت سے اعراض کر لیا۔ عراقی اور اہل نہر کے لوگوں کے طریقہ پر چل پڑیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بصرہ میں تشریف لائیں تو ان (خارجی قسم کی) عورتوں میں سے بعض نے

ان کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے اجازت نہ دی۔ مزید برآں اللہ اور اس کے رسولؐ نے اولاد حاصل کرنے کو مندوب و بہتر فرمایا۔

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ۔ (سو آؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو اور اپنی جانوں کیلئے آگے بھیجو)

آگے بڑھاؤ سے مراد لڑکا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نکاح کرو، نسل بڑھاؤ۔ اس لیے کہ میں قیامت کے روز تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"سیاہ زیادہ بچے جننے والی عورت، خوب صورت بچہ نہ جننے والی سے بہتر ہے" اور "بچہ نہ جننے والی عورت سے گھر میں چٹائی بہتر ہے۔"

عورت کی برکت یہ ہے کہ جب اس کا رحم حیض سے پاک ہو تو وہ جماع کی ضرورت مند ہو اور عام طور پر اس وقت عورتوں کو حمل ہُوا کرتا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے طہر کے بعد جماع کا حکم دیا۔ فرمایا:

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ[1] (پھر جب ستھرائی کریں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا)

اور ان کے اضداد کے باعث کراہت و مذمت میں فرمایا کہ حیض کے ایام میں عورتوں سے الگ رہو۔ کہتے ہیں: ہر مبتذل، دیوانہ، مجذوب قسم کا آدمی، جس کو کوئی خرابیِ دماغ ہو یا اس قسم کے عارضہ میں مبتلا ہو اس کا کاشت کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ دلدل یا کھار زمین میں کاشت ہو گی تو فصل ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور جس نے عمدہ زمین میں کاشت کی تو اس کی فصل عمدہ ہو گی۔ غشیان فی الطہر کا یہی مطلب ہے۔ اس لیے فرمایا:

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ۔ (جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا)

ایک مختصر جماعت نے عزل کی رخصت بتائی اور یہ رخصت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور یہ کہ حضرت سعدؓ عزل کیا کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ عزل کو وادِ صغری کہنے پر انکار کیا اور فرمایا کہ یہ سات کے بعد واد (زندہ درگور) کرنا ہوتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

---

[1] البقرۃ آیت ۲۲۲

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ [1] (اور جب زندہ درگور کردہ بیٹی کو پوچھے)

اور اس کا سات کے بعد ذکر کیا۔ پھر یہ آیت تلاوت کی،

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ (اور ہم نے آدمی کو پیدا کیا چن لی مٹی سے پھر رکھا
ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً سے لے کر ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ اس کو بُوند کر کر) الخ
خَلْقًا [2] آخر تک۔

یعنی نفخِ روح تک۔ چنانچہ ان سات خصائل کے بعد ہی زندہ درگور مقتول ہوگا۔ مزید بر آں اللہ تعالےٰ نے سات مفاہیم کے بعد ہی کو رت میں اس کا ذکر کیا۔ پھر دونوں کو فہم میں جمع کیا اور یہ دقیق علمی بات ہے اور ایک لطیف استدلال ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد ہیں۔ ان کا علم بہت نافذ و ثاقب ہے۔ الغرض طہر ہو جانے تک عورتوں سے جماع نہ کرے۔ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ۔ یعنی پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرلیں۔

جماع کے آداب

قبلہ کے احترام کے باعث قبلہ رخ ہو کر جماع کرنا مکروہ ہے۔ حدیث میں ہے،

"جب آدمی اپنی اہلیہ سے جماع کرے تو وہ دونوں دو گدھوں کی طرح برہنہ نہ ہو جائیں"۔

ایک روایت ہے،

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جماع کرتے تو سر ڈھانپ لیتے۔ آواز پست کر لیتے اور عورت کو فرماتے سکون رکھو"۔

جو آدمی ایک بار جماع کرے اور پھر دوبارہ جماع کرنا چاہے تو اس کام سے پہلے ہاتھ دھولے اور اگر احتلام ہو جائے تو شرمگاہ کو دھوئے بغیر یا پیشاب کیے بغیر جماع نہ کرے اور اگر احتلام کے بعد دھوئے بغیر جماع کر لے تو اگر اس جماع کرنے پر نطفہ ٹھہر گیا تو اس بچے کو شیطانی مس کا خطرہ ہے۔

مہینے کی ان تین راتوں میں جماع کرنا مکروہ ہے۔ پہلی رات میں، آخری رات میں اور مہینے کی نصف (پندرھویں) شب میں جماع کرنا مکروہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ان راتوں میں شیطان بھی جماع میں موجود ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ شیاطین بھی ان راتوں میں ساتھ ہی جماع کرتے ہیں۔

حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم سے اس کی کراہت مروی ہے۔ بعض علماء جو جمعہ کے روز جماع کو اس وجہ سے مستحب سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] التکویر آیت
[2] المومنون ۱۲، ۱۴۔

"جو نہائے اور نہلائے" یعنی اہلیہ کو غسل کرائے۔ ان علماء سے بھی اس کی کراہت منقول ہے۔

شروع رات میں جماع کرنا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے پر وہ طہارت نہ ہونے کی حالت میں سوئے گا۔ اس لیے کہ ارواح عرش کی طرف جاتی ہیں ان میں جو پاک ہو، اسے سجدہ کا اذن ملتا ہے اور جو جنابت کی حالت میں ہو اسے اذن نہیں دیا جاتا۔ اور سچا خواب بھی جنابت کی حالت نہ ہونے پر ہوتا ہے اور وضو کی حالت میں زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ یا کم از کم غسل کر کے سو جائے اور اگر غسل نہیں کیا اور جماع کیا تو وضو کیے بغیر نہ سوئے اور نہ کھانا کھائے۔ جماع کے بعد پانی کو چھوئے بغیر سونے کی رخصت بھی مروی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا۔ یہ روایت ہے اور انسان کو حالتِ جنابت میں اپنا سر منڈانا، ناخون کٹوانا، استرہ کرنا یا نورہ لگانا یا خون نکالنا سخت مکروہ ہے۔ اس لیے کہ قیامت کے روز انسان کے بال، ناخون اور خون دوبارہ اس کے پاس واپس آئے گا۔ اب جو حالتِ جنابت سے الگ وہ حالتِ جنابت میں ہی واپس آئے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کا ہر بال جنابت کے بارے میں مطالبہ کرے گا۔

ایک مقطوع روایت میں ہے جو اوزاعیؒ پر اور یحییٰ بن کثیرؒ پر موقوف ہے۔ امام اوزاعیؒ نے فرمایا:

"ہم جنبی کی وطی میں کچھ حرج نہ سمجھتے۔ آخر ہم نے یہ حدیث سُنی اور اس میں حالتِ جنابت میں وطی کرنے کی ممانعت پر نص ہے اور اس پر نص ہے کہ انسان پر اس کی بیوی کی شرمگاہ (فرج) ہی حلال ہے اور دوسرا راستہ (دبر) حلال نہیں۔ اور جو آدمی جماع کرے اسے چاہیے کہ جس طرح اس نے اس سے خواہش پوری کی ہے۔ اسی طرح عورت پر توقف کرے تاکہ عورت بھی اپنی خواہش پوری کر لے۔ بسا اوقات عورت کو مرد کے بعد انزال ہوتا ہے اور اگر توقف نہ کیا تو عورت میں تنفر سا پیدا ہو جائے گا اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ عورت کو شہوت کے باعث پہلے انزال ہو گیا تو پھر توقف کی ضرورت نہیں اور ایک سمجھدار آدمی عورت کے پہلے منزل ہونے سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔

مناسب و موافق تربات یہ ہے کہ جماع اس وقت ہو جب کہ دونوں میں شہوت پیدا ہو جائے اور انزال کے اختلاف سے ہی زوجین کے درمیان نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی مرد کا انزال پہلے ہو جائے تو باہم تنفر ہو جاتا ہے۔ بعض ادیب علماء کا طریقہ تھا۔ جب تک عورت سے اجازت نہ لیتے وہ عورت پر سے نہ ہٹتے۔

عورت کو وجوبِ غسل کا مسئلہ سمجھا دینا چاہیے۔ اس لیے کہ جیسے مرد پر بالغ ہونے کے بعد احتلام ہوتے ہی غسل کرنا واجب ہے۔ اسی طرح عورت جب بالغ ہوگی اور اسے احتلام ہُوا تو اس پر غسل کرنا واجب ہے۔ حضرت ام سلیمؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو آپؐ نے انہیں غسل کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا:

"انصار کی عورتیں بہترین عورتیں ہیں کہ شرم کی وجہ سے دین سیکھنے سے نہیں رکتیں۔"

جب عورت کو حیض آتا ہو تو وہ کو کھ سے لے کر نصف ران تک تہ بند باندھ لے اور پھر مرد کو اجازت ہے کہ تہ بند کے نیچے کے حصے کے علاوہ باقی بدن سے استمتاع کرے۔ یہ فقہائے حجاز کا مذہب ہے۔ اور میرے نزدیک یہ دو وجوہ میں سے پسندیدہ ہے اور بعض علمائے عراق کا فرمان ہے کہ فرجین کے علاوہ باقی تمام بدن سے استمتاع جائز ہے اور یہ بھی درست ہے اور باقی تمام بدن سے استمتاع میں کچھ حرج نہیں۔

انسان کو چاہیے کہ جب وہ عورت کے لحاف میں داخل ہو تو شرمگاہ پر تہ بند سا باندھ رکھا ہو اور بالکل برہنہ نہ ہو۔ یہ ادب کی بات ہے اور مرد کو اجازت ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ جیسے چاہے لیٹ جائے اور اس سے جو کھانا چاہے، کھائے یا کھلائے۔ اور شرمگاہ میں جماع کے علاوہ جو چاہے کرتا رہے۔ اس پر اتفاق ہے اور اس کے علاوہ میں اختلاف ہے جیسے کہ اہل حجاز کا ذکر ہم نے کیا ہے اور یہ مستحب ہے۔

طلاق کا مشروع طریقہ

ناف سے لے کر نصف ران تک تہ بند میں اتفاق ہے۔ اس لیے شادی شدہ کو چاہیے کہ وہ طلاق کے احکام سے آگاہی حاصل کرے۔ اگر اسے طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو ہر طہر میں ایک ایک طلاق دے جس میں جماع نہ ہو۔ اس لیے کہ جب ایک عورت ایک طلاق کی عدت حیضوں یا مہینوں کے حساب سے پوری کرے گی تو اس پر تین طلاقوں کی طرح عملِ تحریم حاصل ہوگا۔ البتہ ایک طلاق میں چار فائدے حاصل ہوں گے،

۱۔ یہ کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

فرمایا،

فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ (سو ان کو ان کی عدت پر طلاق دو)

اور حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأت میں اس کا بیان و وضاحت ہے۔ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِقُبُلِ عِدَّتِهِنَّ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرء کا مطلب طُہر ہے اور میرے نزدیک بھی یہی مسئلہ ہے۔ اگرچہ لغت و معنی میں برابر ہوں کہ حیض بھی مراد ہو۔

۲۔ عدت آسان ہوگی اور عورت تیزی کے ساتھ عدت گزارے گی۔ چنانچہ جس طرح طہر میں جماع نہیں اور اس میں اسے طلاق دی گئی۔ وہ قرء ہے اور اس کا شمار ہوگا۔ اب عدت سے جلد نکل گئی۔ اس لیے کہ یہ حدود اللہ ہیں۔

۳۔ اگر اسے طلاق دینے پر ندامت ہوئی تو عدت کے اندر اندر نیا نکاح کیے بغیر اور نئے مہر کے بغیر ہی رجوع کر سکے گا۔

۴۔ اور اگر اس نے عدت گزارنے کے بعد رجوع کرنا چاہا تو دوسرے خاوند سے نکاح کیے بغیر نکاح کر کے رجوع کر سکے گا لیکن اگر تین طلاقیں ایک دم دے دی جائیں تو پھر یہ تمام فائدے ختم ہو جاتے ہیں اور پھر عورت حرام ہو جاتی ہے اور اگر پھر شرمندگی ہوئی بھی تو نکلنے کا راستہ اللہ نے بند کر دیا۔ اس لیے کہ یہ اب دوسرے

خاوند سے نکاح کے بغیر حلال نہیں اور انسان کو عورت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اب اگر پھر اس عورت کی خواہش پیدا ہو تو اسے دوسرے خاوند کے مرنے یا طلاق دینے کا انتظار کرنا پڑے گا یا پھر دُوسرے آدمی سے نکاح کر کے حلالہ کروائے گا۔ اس میں تین گناہ ہیں۔ مزید بر آں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر لعنت کی ہے۔

ایک عالم کا فرمان ہے:

"حلالے کی شرط پر نکاح اول بھی درست نہ رہا۔ یہ جہالت کا پھل ہے اور سنت کے خلاف ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ۔[1] (سو انہیں طلاق دو ان کی عدت پر)

پھر فرمایا:

لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۔[2] (اس کو خبر نہیں، شاید اللہ نیا نکالے ان کے پیچھے کچھ کام)

یعنی دونوں کو ندامت ہو اور عورت کو دوبارہ آبادی پسند ہو اور جب ایک یا دو طلاقیں ہوں گی تو اس کے لیے عدت کے اندر اندر بغیر نئے نکاح کے رجوع کرنا جائز ہے اور عدت کے بغیر دُوسرے خاوند سے نکاح کے بغیر نکاح کر کے رجوع کرنا جائز ہے۔

پھر فرمایا:

وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۔[3] (اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وُہ کر دے گا اس کا گزارا)

یعنی اللہ سے ڈرے اور عدت کے اندر طلاق دے گا تو رجوع کرنا جائز ہونے کی وجہ سے اس کے لیے نجات کا راستہ ہے۔

جس آدمی نے ایک دم تین طلاقیں دے دیں یا حیض میں طلاق دی تو طلاق واقع ہو گئی اور عورت حرام ہو گئی۔ اب یہ دوسرے خاوند سے نکاح کیے بغیر پہلے خاوند کی طرف نہیں آ سکتی۔ مزید برآں اس نے سنت کے خلاف کیا۔ مکروہ کام کیا۔ اس سلسلہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، ابی بن کعب، زید بن ثابت

---

[1] الطلاق آیت ۱

[2] الطلاق آیت ۱

[3] الطلاق آیت ۲

اور دوسرے جلیل القدر صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے بکثرت آثار منقول ہیں۔

نکاح و ترکِ نکاح کے دوسرے احکام

نکاح کرنے اور نکاح نہ کرنے میں اصل فرمانِ الٰہی ہے کہ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ۔ (اور نکاح کرو رانڈوں کا اپنے اندر)۔ چنانچہ اللہ علیم و حکیم نے خود نکاح کرنے کا حکم دیا اور ایامی کا واحد ایم آتا ہے۔ یعنی وہ عورت کہ جس کا شوہر نہ ہو۔ گا ہے بے بیوی مرد کو بھی یہ کہہ دیا جاتا ہے جیسے ثیب اور بکر (شادی شدہ اور کنوارا) کا لفظ ہے۔

پھر فرمایا:

وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ۔ (اور تمہارے غلاموں میں سے نیک)

اب اگر یہ فضیلت کی بات نہ ہوتی تو صالحین کے ساتھ تخصیص نہ ہوتی اور اسے ان کی فضیلت کے ساتھ ملایا، اور وہی اولیا اللہ ہیں۔ فرمایا:

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ۔ (اور وہی کارساز ہے نیکوں کا)

پھر فرمایا:

اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (اگر ہوں گے محتاج، تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا)

اور اللہ اغنیاء کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیسے ہیں۔ گا ہے اشیاء کے ساتھ غنی کرتا ہے۔ فرمایا:

اَغْنٰى وَ اَقْنٰى۔ (اس نے دولت دی اور پونجی دی)

اور گا ہے اشیاء سے غنی کرنا یعنی زہد و قناعت عطا کرتا ہے اور گا ہے ان کے نفوس کو سامان و مال سے غنی کرتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کثرتِ سامان کا نام غناء نہیں، بلکہ دل کا غنی ہونا ہی غنا ہے۔" گا ہے یقین کے ساتھ غنی کرتا ہے جیسے کہ فرمایا:

"یقین کا غنا کافی ہے۔" گا ہے نظر کی حفاظت اور شرمگاہ کے بچاؤ کے ذریعہ غنا عطا کرتا ہے جیسے کہ فرمایا:

"جو باہ کی قوت رکھے، اسے چاہیے کہ نکاح کرلے۔ اس لیے کہ یہ نظر کو خوب بچاؤ اور شرمگاہ کی خوب پاکیزگی (حفاظت) کا طریقہ ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری خبر میں تفریق ہونے پر بھی غناء کا وعدہ کیا۔ فرمایا:

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ۔ (اور اگر دونوں جدا ہوئے تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشایش سے غنی کر دے گا)

تمام وجوہِ اغناء کو اس دوسرے معنی میں بھی مجمل طور پر بتا دیا۔ مزید برآں عصمت کے ساتھ غنا بھی ملتا ہے کاروبار سے استغناء بھی ملتا ہے مانگنے سے محاسبۂ اکتساب سے اور عورتوں کے حال و احکام سے بھی استغناء ملا کرتا ہے۔

دُوسرے امر کے بارے دوسری وضاحت کی۔ فرمایا:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔ (سو نکاح کرو جو تم کو خوش لگیں عورتیں، دو دو، تین تین، چار چار)

یہ پہلے سے کم تر ہے۔ اس لیے کہ اس میں ہمارا اختیار بتا دیا کہ اگر ہم چاہیں تو چار تک بیویاں کر سکتے ہیں۔ اس کی وسعت ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ طبائعِ نفوس، علاجِ قلوب اور نفسانی تفاوت و حرکات کو خُوب جانتا ہے اور نفسانی کفایت و مصالح سے بھی خوب آگاہ ہے۔ پھر اس نے ہم پر رحم کیا اور فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (سو اگر ڈرو کہ عدل نہ کرو گے تو ایک ہی ہے یا جس کے مالک ہیں تمہارے ہاتھ، اس میں لگتا ہے کہ ایک طرف نہ جُھک پڑو)

یعنی ایک کی اجازت دے دی اور یہ تجرد اور چار کے درمیان متوسط حال ہے۔ مزید برآں ظلم کی ضد عدل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (یہ اس میں لگتا ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑو)

یعنی تم عدل سے ہٹ کر ظلم نہ کرو۔ عرب کہا کرتے ہیں:

عال یعول عولا۔ یعنی ظلم نہ کرنا۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ اَلَّا تَعُوْلُوْا یعنی تم محتاج نہ ہو جاؤ۔ یہ عَيْلَة سے ہے۔ کہا کرتے ہیں: عال یعیل عیلة۔ یعنی محتاج ہونا۔ اس سے یہ فرمان ہے:

اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ۔ (اگر تمہیں فقر کا ڈر ہو تو آگے اللہ تمہیں غنی کرے گا)

اور اہل و عیال کے ساتھ احتیاج ضرور ہوتا ہے۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ تَعُوْلُوْا یعنی تمہارے عیال کثرت سے ہوں گے۔ یہ اس مفہوم کے قریب ہُوا کہ تمہارے عیال بکثرت نہ ہوں اور ھاء کو حذف کر دیا جو کہ عیال کا اسم ہے۔ یہ بعض اہل حجاز کا مذہب ہے اور یہ اس طرف راجع ہے کہ

عال الرجل عیالہٗ یعولھم اور

مارھم یمیرھم

صانهم یصونهم ۔

اب یہ عیال کے لفظ سے مشتق ہوا مگر پہلے دو معنی ہی بہتر اور مشہور تر ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے نہ نکاح فرض کیا اور نہ تجرد فرض کیا جیسے کہ چار عورتیں کرنا فرض نہیں ہیں۔ البتہ قلبی اصلاح ، دینی سلامتی ، نفسانی سکون اور ضرورت کے وقت ان کے امور میں داخل ہونا فرض قرار دیا تاکہ مذکورہ باتیں حاصل ہوسکیں۔ جس کی اصلاح نکاح کرنے میں ہو اس کے لیے یہی افضل ہے اور جس کو استقامت و سکون چار بیویوں میں ملتا ہو اس کے لیے احکامِ ازواج کا احترام کرتے ہوئے سکون حاصل کرنا جائز ہے، جس کے لیے ایک بیوی کافی ہو اس کے لیے ایک ہی افضل و بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ سلامتی کے قریب تر بات ہے اور جس کی قلبی سلامتی و سکونِ نفس تجرد میں ہو، اس کے لیے یہی بات باعث سلامتی ہے اور ہمارے اس زمانہ میں زیادہ سلامتی کی بات ہی افضل تر ہے۔ اس لیے کہ سلامتی کی خاطر نکاح کیا جاتا ہے اور جب سلامتی پائی گئی تو اس کا نہ ہونا مضر نہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اس بات کے قائل ہیں کہ دین میں دو طریق ہیں؛

۱۔ عزیمت کا طریق ۔

۲۔ رخصت کا طریق ۔

تو اسی طرح نکاح میں بھی دو طریق ہیں۔ یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے اور دین کی خاطر ترکِ نکاح میں بھی دو طریق ہیں۔ ایک اقویاء کا طریق ہے یعنی نکاح کرنا ، احکامِ نکاح پر اور عورتوں کے ساتھ مباشرت کی تلخیوں پر صبر کرنا ، اقویاء کا دوسرا طریق یہ ہے کہ عورتوں سے صبر کریں اور عصمت کی حفاظت کرتے رہیں اور آخرت کے لیے فارغ ہو کر آخرت کے کاموں میں مشغول ہوجائیں اور ایک طریق اور بھی ہے کہ اگر زنا کا ڈر ہو اور بدن میں قوت زیادہ ہو اختلاط کی وجہ سے حال کمزور ہو تو استقامت و اصلاح کی خاطر نکاح کرے ۔

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے تھے:

يَا حَبَّذَا الْعُزْبَةَ وَ الْمِفْتَاحُ وَ مَسْكَنٌ تُخْرِقُهُ الرِّيَاحُ
لَا صَخَبَ فِيْهِ وَ لَا صِيَاحُ

(واہ، تجرد کیسا اچھا ہے۔ کنجی ہاتھ میں اور ایسا گھر جس کو ہوائیں بھی خراب کرتی رہیں)
(جس میں کوئی شور و شغب نہ ہو)

فصل ۴۶

حمام میں جانے کے احکام

ہمارے اس وقت میں حمام میں نہ جانا افضل ہے اس لیے کہ وہاں برہنگی اور احکامِ حمام سے عجز بہت ہے البتہ اگر (محرمات شرعیہ کا ارتکاب نہ ہو) تو حمام میں جانا مباح ہے۔

صحابہؓ کی حمام میں جانے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اور ہر صحابی ستارہ ہے جس کا اتباع کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

بعض صحابہؓ کا فرمان ہے:

"حمام بدترین مکان ہے۔ ستر کو ظاہر کرتا اور حیاء دُور کرتا ہے۔" یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی مفہوم کا کلام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

بعض کا فرمان ہے:

"حمام بہترین مکان ہے۔ میل صاف کرتا اور دوزخ یاد دلاتا ہے۔" یہ حضرت ابوالدرداء اور ابو ایوب رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ شام میں گئے تو حماموں میں داخل ہو گئے۔ جو آدمی حمام میں جائے تو وہ دنیاوی مزے، شہوت اور خواہش کی خاطر حمام میں نہ جائے۔ اس لیے کہ یہ اس کا ایک عمل ہے اور انسان سے اس کے ہر عمل پر پرسش ہوگی اور اعمال سے جہالت پر بھی پوچھا جائے گا۔ چنانچہ کہا جائے گا:

"تو حمام میں کیوں گیا، کیسے گیا اور کس لیے گیا؛ جیسے کہ ہر عمل کو اس کا فعل کہا جاتا ہے۔"

حمام میں جانے کے آٹھ احکام ہیں۔ ان میں سے چار فرائض ہیں اور چار نوافل ہیں۔ فرائض یہ ہیں:

۱۔ ستر چھپانا۔

۲۔ نظریں جھکانا اور بچا کر رکھنا۔

۳۔ اس کے بدن پر کسی دُوسرے کا ہاتھ نہ لگے بلکہ اپنے ہاتھ سے ہی بدن مَلے۔

۴۔ نیکی کا حکم کرے۔ یعنی کسی کو برہنہ دیکھے تو اسے کہے کہ پردہ کر لو یا برہنگی حرام ہے اور یہ تیرے لیے حلال نہیں یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یا حمام میں تہ بند کے بغیر داخلہ حرام ہے۔ ان میں سے کچھ کلمات بھی کہہ دے تو اس پر بُرائی سے منع کرنے کا فریضہ ساقط ہو گیا اور اس پر نیکی کرانے پر جبر کرنا لازم نہیں (البتہ ہمت ہو تو مستحب ہے) اس لیے کہ جبر کے ساتھ نیکی کرانے کا کام امامِ وقت پر لازم ہے جو سلطنت اور قوت و شوکت کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلام پر چلانے کا ذمہ دار ہے اور

باقی رعایا سے یہ کام ساقط ہے۔

چار نوافل یہ ہیں۔ دین کی خاطر اور عبادت کے لیے طہارت وصفائی کی خاطر غسل و طہارت کرے۔ اس لیے کہ اخروی امور میں سے طہارت افضل کام ہے اور حمام طہارت کی جگہ ہے۔

حمام میں جانے سے پہلے ہی حمام والے کو اجرت دے دے اور اس طرح جس چیز کی مقدار معلوم نہ ہو۔ یعنی پانی پینا، حمام کی اجرت اور جس پر حمام والا تقاضا نہیں کرتا۔ گویا وہ غیر معلوم ہے اور جب حمام والا دیکھے تو معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کی وضاحت کر لینا مستحب ہے۔

تیسرا نفل یہ ہے کہ بغیر ضرورت زیادہ پانی استعمال نہ کرے اور خاص کر گرم پانی اس قدر استعمال نہ کرے کہ وہ دو یا تین آدمیوں کے لیے کافی ہوتا۔ اس لیے کہ گرم پانی پر حمام والے کو مشقت اٹھانی پڑی ہے اور اس قدر پانی استعمال کرے کہ اگر حمام والا اسے دیکھے تو برا محسوس نہ کرے اور اگر اس قدر پانی استعمال کیا کہ حمام والا دیکھ کر برا محسوس کرتا ہو تو یہ اس کی عدم موجودگی میں مکروہ ہے۔

چوتھا نفل یہ ہے کہ حمام کی گرمی، اندھیرے اور گرم پانی کو دیکھ کر دوزخ کو یاد کرے۔ اس لیے کہ اندھیرے میں حمام دوزخ سے مشابہ تر ہوتا ہے کہ نیچے گرمی اور اوپر اندھیرا۔ یہی دوزخ کا وصف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دوزخ سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اب دوزخ میں کم صبری اور کرب واضطراب کو سوچے۔ الغرض میں جانے اور آنے میں بھی اس کے لیے نصیحت وعبرت ہے۔ اس لیے کہ اصحاب خرد اور متقی لوگوں کے لیے ہر مقام و کام میں عبرت ونصیحت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عمدہ ترین زندگی عطا کی۔

یہ صاحبِ قلب اور صاحبِ مقامِ مزید کی علامت ہے۔ حمام میں اللہ کا نام لیتے اور استغفار کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ البتہ قرآن مجید کی تلاوت کرنا مکروہ ہے۔ ہاں اپنے دل میں پڑھ سکتا اور لفظ اسلام کے ساتھ کسی پر سلام بھی نہ کہے۔ (بلکہ اشارہ کر دے)

ایک آدمی نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما پر حمام میں سلام کہا۔ فرمایا، حمام میں سلام نہیں ہوتا۔ اگر اس کی ضرورت ہو بھی تو صرف ہاتھ سے اشارہ کر دینا کافی ہے، یا یہ کہے، اللہ خیر رکھے، سلامت رہو اور حمام میں زیادہ باتیں کرنا مکروہ ہے اور لایعنی باتیں کرنا تو زیادہ برا ہے۔ البتہ سلف کا طریقہ تھا۔ جب حمام میں داخل ہوتے تو بسم اللہ پڑھتے اور شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتے۔

اگر حمام والے کو کچھ رقم دے کر صرف اپنے لیے حمام خالی کرا لے تو اس پر اجر ملے گا۔ حضرت بشرؒ فرماتے ہیں،

"جس کے پاس صرف ایک درہم ہو اور وہ حمام والے کو حمام خالی کرانے کے لیے دے دے تو

اس نے ظلم نہیں کیا" تاکہ اکیلا غسل کرے۔ حضرت بشر حمام والے کو نقدی دے کر اپنے لیے حمام خالی کرا لیتے۔ چنانچہ وہ باہر سے اور اندر سے تالا لگا لیتے۔ اگر حمام صرف ایک کے لیے خالی ہو اور وہ اپنی لونڈی سے نورہ لگوائے تو کچھ حرج نہیں۔ بعض کا فرمان ہے:

میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو حمام میں دیوار کی طرف رُخ کیے دیکھا۔ انھوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور دیوار پر اپنا ہاتھ بڑھایا۔

ابراہیم حربی سے پُوچھا گیا:

"کیا آپ نبیذ پینے والے کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں؟"

فرمایا: "ہاں۔"

پوچھا گیا:

"کیا آپ بغیر تہ بند کے حمام میں داخل ہونے والے کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں؟"

فرمایا: "نہیں۔"

غروبِ آفتاب کے بعد اور مغرب و عشاء کے درمیان حمام میں داخل ہونا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ ان اوقات میں شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ اسے چاہیے کہ اس میں داخلہ کو اللہ تعالیٰ کی نعمت شمار کرے اور اللہ نے یہ مخلوق اس کے لیے مسخر کر دی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک لطیف فضل و احسان ہے۔ جو حمام میں جائے اور احکامِ حمام کی پابندی کرے تو یہ افضل بات ہے۔ اس لیے کہ اس میں کئی اعمال پائے جاتے ہیں۔

اعمش حمام میں گئے تو کسی کو برہنہ دیکھا۔ آپؒ نے آنکھیں بند کر لیں اور دیواروں کو ٹٹولنے لگے۔ برہنہ آدمی نے کہا:

"اے آدمی! تیری آنکھیں کب سے بند ہوئیں؟"

حضرت اعمشؒ نے فرمایا:

"جب سے تیرا پردہ پھٹا۔"

شافعیؒ نے مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا:

"تین اشیاء میں ذلت ہے:

۱۔ مجلس میں قلم دوات اور کاغذ کے بغیر حاضر ہونا۔

۲۔ کشتی میں زادِ راہ کے بغیر سوار ہونا۔

۳۔ اور کپڑے کے بغیر حمام میں داخل ہونا۔"

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا،
"آپ نے تہ بند کا ذکر نہیں کیا؟"
فرمایا، "خوب، تہ بند اتار دینا فسق ہے۔"
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
"عورت پر حمام میں جانا حرام ہے اور مردوں پر تہ بند کے بغیر جانا (بھی حرام ہے)۔"
حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے،
"حمام ایک عیاشی ہے جس کو اب ایجاد کر لیا گیا ہے۔
فرمان الٰہی ہے،
ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ[1] (پھر تم ضرور اس روز پوچھے جاؤ گے نعمتوں کی حقیقت)
اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہے۔ فرمایا،
"سرما میں گرم پانی نعمت ہے۔ اور اگر ستر کی جگہ چھوڑ کر باقی حصّہ کو کوئی مرد ملے تو کچھ ہرج نہیں۔"
ایک بھائی نے ایک عالم کے بارے میں بتایا کہ میں ان کے ہمراہ حمام میں گیا۔ میں نے ان کو ملنا چاہا تو انہوں نے روک دیا۔
بتاتے ہیں کہ میں اس کے بعد پھر ان کے ہمراہ حمام میں گیا تو میں نے انہیں ملا اور انہوں نے مجھے نہیں روکا۔ میں نے عرض کیا،
"پہلی بار آپ نے مجھے روک دیا تھا۔"
فرمایا، "اس وقت مجھے اس سلسلہ میں اثر کا علم نہ تھا۔ اب میں نے اثر (روایت) پالی۔ پھر اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اصبغ راشتی کو ایک آدمی نے انہیں حمام میں ملا۔ اس نے ان کے جسم کی ایک رگ کے ذریعہ اللہ کا لفظ لکھا دیکھا تو فرمایا "دیکھتے ہو، یہ کسی انسان نے نہیں لکھا۔"
یوسف بن اسباط سے بھی اسی سلسلہ میں روایت ہے کہ جب ان کی وفات قریب ہوئی تو بیٹے کو وصیت کی کہ مجھے فلاں آدمی نہلائے۔ وہ آدمی نہ تو ان کے اصحاب میں سے تھا اور نہ ہی اس کی فضیلت مشہور تھی۔
ان سے اس کی پوچھی گئی تو فرمایا،
"اس نے ایک بار مجھے حمام میں ملا تھا اور میں نے اس کا معاوضہ نہیں دیا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آدمی مجھے

---

[1] التکاثر۔ آیت ۸۔

غسل دینا پسند کرتا ہے۔ اس لیے اس کی وصیت دی اور اس کا معاوضہ بھی ادا ہو جائے گا۔"

اس سے بدن اور پشت پر دبانا جائز ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ

"آپ سفر میں ایک درخت کے نیچے اُترے۔ ایک صحابیؓ بتاتے ہیں کہ میں کھجوروں یا درختوں کے درمیان جارہا تھا کہ دیکھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیٹ کے بل لیٹے ہیں اور ایک سیاہ فام غلام آپؐ کی پشت دبا رہا تھا۔

میں نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا بات ہے؟"

فرمایا: "اُونٹنی نے مجھے تھکا دیا۔"

بعض کا فرمان ہے،

"حمام میں دو تہ بند کے بغیر داخل ہونا جائز نہیں۔ ایک منہ پر ڈال لے اور ایک سے ستر چھپائے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک برہنہ آدمی دیکھا تو نکلے اور یہ کہہ رہے تھے:

(اعوذ باللّٰہِ من الشیطٰن)، میں نے ایک شیطان دیکھا۔

امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جو حمام میں جائے اور برہنہ نکلے۔ اس کی گواہی قبول نہیں۔" اور حوض کے کنارے بیٹھا تاکہ غسل کرے، تو کچھ حرج نہیں۔

حمام سے باہر آتے وقت سرد پانی سے پاؤں دھونا نقرس سے حفاظت ہے۔ اس کے بعد اور چہرہ دھونے سے پہلے نورہ لگانے سے ڈاڑھی سفید ہو جاتی ہے اور اس کے بعد مہندی لگانا جذام سے حفاظت ہے۔ اطباء کے نزدیک نورہ لگانے کے بعد اور نورہ دھونے سے پہلے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا بہتر ہے۔

ایک عرب طبیب نے ہر ماہ نورہ لگانے کا حکم دیا اور بتایا کہ اس سے حرارتِ مرارۃ بجھ جاتی ہے رنگ صاف ہو جاتا ہے اور ایسا کرنے سے جماع کی قوت بڑھ جاتی ہے۔

سنّت یہ ہے کہ ہر چالیس روز کے اندر ایک بار موئے زہار صاف کرے، اس مدت سے بڑھنے نہ پائے۔

بعض اطباء کا قول ہے،

"سردی میں حمام میں پیشاب کرنا، دوا پینے سے بہتر ہے اور سنت کو دیکھا جائے تو حمام کی جگہ میں پیشاب کرنا مکروہ ہے۔"

ایک قول یہ ہے کہ،

"حمام میں پیشاب کرنے سے وساوس زیادہ ہو جاتے ہیں"۔

ایک طبیب کا قول ہے:

"حمام میں داخل ہونے کے بعد گرمی میں سونا دوا پینے سے بہتر ہے" اور سلفؒ گرمی میں سونے کے بعد سرد پانی سے نہانا پسند کرتے اور یہ بدن کے لیے نفع بخش بھی ہے۔

کہتے ہیں کہ:

"جب انسان کی عمر چالیس برس ہو جاتی ہے تو جس روز حمام میں جاتا ہے اس روز کو چھوڑ کر ہر روز اس میں کمی آتی ہے۔ البتہ ان کے نزدیک گرما کے موسم میں حمام میں جانا سرما سے زیادہ فائدہ بخش ہے۔ حمام سے نکلتے ہی سرد پانی پینا مکروہ ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں پر حمام میں جانا حرام کر دیا۔ اس طرح مردوں پر تہ بند کے بغیر حمام میں جانا بھی حرام ہے۔ اگر کوئی عورت کسی مرض کی وجہ سے یا حیض یا نفاس کی وجہ سے یا سردی کے موسم میں حمام میں جائے تو کچھ ہرج نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایک تکلیف کے باعث حمام میں جانا پڑا۔ ہاں البتہ عورت کو خاوند اور سرپرستوں سے اجازت لینا ضروری ہے اور اگر وہ اجازت نہ لیں تو مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ حمام کی اُجرت دے اور اب ساری سزا عورتوں پر ہے۔

کسی مسلمان عورت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ حمام میں جا کر کسی ذمیہ عورت سے خدمت لے (یعنی بدن ملوائے وغیرہ)۔ حضرت عمر اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما نے اس سے منع فرمایا۔ اگر مرد نے عورت کو حمام کی اجرت دی تو بہت بُرا کیا۔ اور وہ گناہ پر مددگار بن گیا اور اگر مرد نے منع کیا مگر وہ نہ رُکی تو اب عورت پر گناہ رہا۔

فصل ۴۷

تجارت و تاجر کے احکام

تاجر پر علمِ تجارت حاصل کرنا لازم ہے

حلال تجارت کے فضائل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا۔[1]

(اور ہم نے دن کو بنایا روزگار کو)

اور بے شمار آیات میں اس کا ذکر کیا۔ فرمایا:

وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ۔[2] (اور ہم نے تمہارے لیے اس میں روزیاں بنا دیں، تم تھوڑا شکر کرتے ہو)

چنانچہ معاش کو نعمت فرمایا اور اس پر شکر کا مطالبہ کیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا:

"بعض ایسے گناہ ہوتے ہیں کہ جن کا کفارہ، طلبِ روزگار کی فکر ہی ہوتی ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے حلال تر وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے اور ہر خیانت سے پاک عمل سے (کھائے)"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"حلال ترین وہ ہے جو انسان صانع کے ہاتھ سے کھائے جب نصیحت کرے۔"

ایک روایت میں ہے:

"سچا تاجر، قیامت کے روز صدیقین اور شہداء کے ہمراہ اٹھایا جائے گا۔"

حدیث میں ہے:

"جس نے حلال دنیا تلاش کی، سوال سے بچا، اپنے عیال پر محنت کی اور اپنے پڑوسی پر مہربانی کی، وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوگا۔"

---

[1] النبأ ۱۱

[2] الاعراف ۱۰

مروی ہے کہ :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز صبح کے وقت اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ دیکھا کہ ایک طاقت ور نوجوان صبح سویرے ہی دوڑا جا رہا ہے۔

صحابہؓ نے کہا:

"اس کا ناس ہو، کاش اس کی قوت و جوانی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہوتی۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ مت کہو، اگر وہ اپنے آپ کے لیے محنت کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو سوال سے بچانے اور لوگوں سے مستغنی کر دے تو یہ اللہ کی راہ میں ہے اور اگر بوڑھے والدین یا کمزور اولاد کی خاطر محنت کر رہا ہے تاکہ انہیں مستغنی کر دے اور ان کی ضرورت کے مطابق، کفالت کرے تو بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے اور اگر فخر جتانے اور کثرتِ مال کی خاطر محنت کر رہا ہے تو یہ شیطان کی راہ میں ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"میں سب سے زیادہ اس آدمی سے ناراضگی رکھتا ہوں جو بالکل فارغ ہے نہ دنیا کے کام میں اور نہ آخرت کے کام میں ہے۔"

حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا:

"ہاتھ سے دست کاری کرنے والا انہیں تاجر سے زیادہ محبوب تھا۔ اور تاجر آدمی انہیں بے کار سے زیادہ محبوب تھا۔"

حضرت ابراہیمؒ سے ایک سچے تاجر کے بارے میں پوچھا گیا کہ "کیا آپ کو وہ زیادہ محبوب ہے یا عبادت کیلیے فارغ ہو جانے والا؟"

فرمایا: "مجھے سچا تاجر زیادہ محبوب ہے۔ اس لیے کہ جہاد میں ہے۔ شیطان اس کے پاس پیمانے اور ترازو سے اور لینے دینے کی جانب سے آتا ہے اور وہ اس سے جہاد کرتا ہے۔" البتہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس معاملہ میں ان سے اختلاف کیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

"مجھے وہ جگہ جہاں میری موت آئے، وہی محبوب تر ہے کہ میں اپنے اہل کے لیے تجارت کرتا ہوں۔ اپنے کجاوے میں خرید و فروخت کر رہا ہوں۔"

حضرت ابو ایوبؒ بتاتے ہیں کہ ابو قلابہؒ نے مجھے فرمایا:

"بازار کو لازم کرو۔ اس لیے کہ غناء، عافیت کا نام ہے۔" یعنی لوگوں سے غناء ہی عافیت ہے۔ واللہ اعلم اور ایسی غنا کہ جس میں اللہ کی عبادت اطمینان سے کی جائے۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"تجارت کر، خرید اور فروخت کر۔" چاہے اصل مال تک ہی ہو (یعنی چاہے نفع کے بغیر ہی ہو) تیرے لیے وُہ برکت ہو گی جو کاشت کار کے لیے نہیں۔"

ابن محیریزؒ شام کے ایک زاہد عابد بزرگؒ تھے۔ مشرکوں سے ہاتھ آنے والے اللہ تعالیٰ کی راہ میں حاصل شدہ مالِ غنیمت کے بعد مجھے پیٹ بھرنے کے لیے محبوب تر کھانا وُہ ہے جو سچے تاجر سے ملے۔

فرمایا: "اہل و عیال کی خاطر کاروبار کرنے والے کو سلفؒ اللہ کی راہ میں مجاہد شمار کرتے اور دوسروں پر اس کی افضلیت سمجھتے۔"

اس بارے میں ایک روایت بھی ہے:

"اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جو محنت کرتا ہے اور اس کے ذریعہ لوگوں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔"

ایک بھائی نے ابو جعفر فرغانیؒ سے نقل کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک روز ہم حضرت جنیدؒ کے پاس تھے۔ ان لوگوں کا ذکر چھڑ گیا جو مساجد میں بیٹھتے ہیں اور صوفیاء سے تشابہ جتاتے ہیں مگر مسجد میں بیٹھنے کا لازم شدہ حق ادا نہیں کرتے اور بازار میں جانے والوں پر عیب لگاتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

"بازار والوں میں سے کئی ایسے بھی ہیں کہ وہ اس میں بیٹھے ہُوئے کے اذن سے اسے باہر کر کے اس کی جگہ خود بیٹھتا ہے۔ میں ایسے آدمی کو جانتا ہوں کہ وہ بازار میں بھی جاتا ہے مگر اس کا روزانہ کا ورد یہ ہے کہ تین سو رکعتیں روزانہ پڑھتا ہے اور تیس ہزار تسبیحات روزانہ کا معمول ہے۔"

راوی بتاتے ہیں کہ مجھے یہ خیال ہُوا کہ وہ اپنے آپ کے بارے میں بتا رہے ہیں۔

علم تجارت سیکھ کر تجارت کرو

اگر انسان تاجر ہو تو اسے چاہیے کہ خرید و فروخت، لین دین، لوگوں سے کاروباری معاملات اور سود بن جانے کے امور سے واقفیت حاصل کرے۔ تاکہ ممنوعات میں پڑنے سے پہلے ان کا علم ہو اور کسی ممنوع کام کا ارتکاب کرنے سے بچ جائے۔ ایسا واقعہ پیش آئے تو مفتی کے پاس جا کر ہر طرح کے معاملات کے بارے میں مسائل دریافت کرے جبکہ ان امور کا اسے پہلے سے علم نہ ہو اور معاملہ پڑنے وقت علم نہ ہو تو بازار جانے سے پہلے مفتی سے مسئلہ دریافت کرے۔ اس لیے کہ ہر عمل کا جدا علم ہوتا ہے اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے۔ اس وجہ سے ایک بڑا عالم بھی دوسرے کے علم سے مستغنی

نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ایسا نہ کیا تو تجارت میں فاسد بیع اور سود واقع ہو جائے گا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بازار میں جاتے اور بعض تاجروں کو دُرّہ سے بھی مارتے اور فرماتے :

" سُود کھانے والے کو اور تجارت کے احکام سے ناواقف کو ہمارے اس بازار میں کاروبار نہیں کرنا چاہیے اس کا دل چاہے یا نہ چاہے۔"

چنانچہ علمِ تجارت حاصل کر کے ہی مباح کاروبار یا صنعت شروع کرے اور اس میں اقامتِ سنّت کی نیت کرے۔ صداقت و امانت اور درست کاروبار کا لحاظ رکھے، نیکی کا حکم کرے، بُرائی سے روکے اور اللہ کی راہ میں جہاد کی طرح محنت کرے۔ اس لیے کہ جس نے حق دیا لیا، صداقت و نصیحت کے ساتھ معاملہ کیا وہ نیکی و تقویٰ پہ مددگار ہے اس دور میں جبکہ باطل کی کثرت ہوگئی۔ ایسا آدمی شیطان و خواہش سے جہاد کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ دنیاوی اصلاح سے دینی اصلاح ہوتی ہے اور دنیاوی بگاڑ سے دینی بگاڑ پیدا ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا باہمی گہرا تعلق ہے اور ہر ایک کو دوسرے کا احتیاج ہے۔

روایت میں ہے :

" بندہ اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا دل درست نہ ہو جائے اور اس کا دل اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی زبان درست نہ ہو جائے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ اس قول باری تعالیٰ کے بارہ میں :

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ[1]

(جو لوگ یقین لائے اور ملائے نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر، انہی کو ہے خاطر جمع اور وہی ہیں راہ پائے)

پوچھا گیا :

" یہ کون لوگ ہیں ؟"

فرمایا : " جس کی قسم سچی ہوئی اور اس کی زبان صادق ہوئی اس کا دل دُرست ہوا۔ اس کی شرمگاہ اور پیٹ پاک (و عفیف) ہوا۔"

پھر کاروبار میں یہ نیت رکھے کہ سوال کرنے سے بچوں گا، لوگوں سے مستغنی رہوں گا۔ ان کے مالوں میں لالچ نہیں رکھوں گا ان پہ دھیان نہیں رکھوں گا۔ تو یہ کاروبار بھی عبادت ہے۔ پھر اپنے کام اور گھر والوں کے طعام کا احتساب کرے۔ یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔ اس پہ صدق کلامی، بھائیوں کو کاروبار میں درست مشورہ دینا لازم ہے۔

---

[1] الانعام ۸۳ ۔

لوگوں کو درست مشورہ دے کر ان کی سلامتی اوران پر رحم کرنے کی نیت رکھے اور ہر چیز میں دین و تقوے کو مقدم سمجھے۔اس کے بعد اگر دنیاوی کاروبار بھی قائم رہے تو اللہ کی حمد بیان کرے۔ یہ نفع اور حقیقی فائدہ ہے اور اگر اس کے بعد دنیاوی امور میں گڑبڑ ہو جائے اور دین و تقویٰ کی وجہ سے دنیاوی امور میں مشکل آن پڑے تو بھائی دین و نفع تو بچا لیا۔ تقویٰ کی وجہ سے اصل زر کی حفاظت تو کر لی۔ یہی بڑی بات ہے اور اگر اس نے دین کا دسواں حصہ بھی ضائع کیا اور دنیا کا مال دوگنا کما لیا تو بھی تجارت میں فائدہ نہ ہوا اور نہ سیدھی راہ ملی بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ آدمی خسارہ پانے والوں میں سے ہے۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"ایک عقلمند آدمی کے نزدیک بہترین چیز وہ ہے جس کی دنیا میں زیادہ ضرورت ہو اور دنیا میں زیادہ ضرورت اس چیز کی ہے جو آخرت میں قابل تعریف ہو۔" حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اپنی وصیت میں اس طرح فرمایا:

"تجھے دنیا کا حصہ تو مل کر رہے گا۔ البتہ تجھے آخرت کے حصہ کی زیادہ ضرورت ہے اس لیے آخرت کا کام شروع کر دے اس سے وابستہ رہ۔اور دنیا کا حصہ تو تجھے مل کر رہے گا۔اس میں تیرا انتظام وُہ خود کرے گا، اور جہاں تو جائے گا وہ بھی وہاں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول)

یعنی دنیا کے اندر دنیا کا وُہ حصہ نہ بھلا جو آخرت کے لیے ہے۔اس لیے کہ آخرت کی نیکیاں یہیں کمائے گا اور پھر وہاں نیکوکاروں کے مقام پر ہوگا۔

اس فرمانِ الٰہی کی دلالت بھی اسی پر ہے۔فرمایا:

وَ اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ [1] (اور بھلائی کر جیسے کہ اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور نہ چاہ خرابی ڈالنی ملک میں)

ایک عالم کا فرمان ہے:

"جو آدمی خرید و فروخت کے لیے بازار میں داخل ہوا اور اس کے نزدیک اپنے بھائی کے درہم سے اپنا درہم زیادہ پسندیدہ ہو۔ اس نے معاملہ کرتے وقت مسلمانوں کو نصیحت نہیں کی۔"

ایک دوسرے عالمؒ کا فرمان ہے:

"جس نے اپنے بھائی کے سامنے ایک درہم میں ایک چیز فروخت کی اور اس کی مناسب قیمت دانق تھی تو

---

[1] القصص - ۷۷۔

اس نے اپنے بھائی کے لیے پسند نہ کیا جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تاآنکہ وہ ایک درہم کی فروخت کرے، تو اس کی مناسب قیمت بھی ہو۔

اس لیے کاروبار کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اپنے مال اور بھائی کے مال کو اپنے نزدیک برابر سمجھے تاکہ کاروبار کے وقت عدل کر سکے یا برابر برابر خریداری کرے اور کاروبار کے بارے میں شرعی احکام کی پابندی کی جا سکے اور اس طرح ہی اس کا مال علم میں نیکی اور حکم میں مباح ہو سکتا ہے۔ اب وہ مال کے سلسلہ میں بھی متقی ہوگا اور یہ خیانت، چوری، فساد، لوٹ اور دھوکہ فریب نہیں بنے گا۔ دراصل مباح کاروبار میں بھی اسی قسم کی حرام صورتیں پائی جا سکتی ہیں اور اگر ان اشیاء کی زیادہ پرواہ نہ کی تو اس کی کمائی مشتبہ ہوگئی۔ اس لیے کہ اس کے اندر حرام کی ملاوٹ کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے اور اسے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ بالکل حلال اور درست کاروبار ہوا۔ کیونکہ اس زمانہ میں تقوی اور پرہیزگاری کم ہوگئی اور آمیزش بڑھ گئی۔ البتہ اس میں حلال کا شبہ بھی ہے۔

حلال کی اہمیت

روایت میں ہے:

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دودھ پیش کیا گیا۔

فرمایا: "تمہیں یہ کہاں سے حاصل ہوتا ہے؟"

عرض کیا: "فلاں بکری سے۔"

فرمایا: "تمہیں یہ بکری کہاں سے ملی؟"

عرض کیا: "فلاں جگہ سے۔" پھر آپ نے دودھ پی لیا۔

پھر فرمایا: "ہم انبیاء کی جماعتوں کو یہ حکم ہے کہ صرف حلال وطیب ہی کھائیں اور نیک کام ہی کریں۔"

اللہ تعالیٰ نے جس کا انبیاء علیہم السلام کو حکم دیا وہی حکم اہل ایمان کو بھی فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں روزی دی)

چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل چیز اور اصل کی اصل کے بارے میں دریافت کیا اور اس سے مزید کرید نہیں کی۔ اس لیے کہ کہا ہے یہ کام دشوار ہوتا ہے اور انسان دور کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ مزید برآں "تاجروں اور صنعت کے اموال میں لشکریوں کے اموال کا اختلاط پایا جاتا ہے اور لشکری لوگ زیادہ تر ناحق وصول کرتے ہیں۔ گویا اس نے باطل طریق سے مال کھایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے خواہش اور نفسانی راہ میں مشقت اٹھائی اور گھوڑے دوڑائے اور راتوں کو بیدار رہے۔ اب وہ بغیر حق کے تنخواہ وعطیہ لیتے ہیں۔

حالانکہ وہ اس کے مالک نہیں ہیں۔ پھر یہی اموال تاجروں اور صنعت کاروں کے اموال میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں اس کا امتیاز نہیں رہتا۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کی کمی کے باعث وہ اس امتیاز کا اہتمام بھی نہیں کرتے۔ اس لیے حرام غالب آگیا کیونکہ حلال دراصل تقویٰ و پرہیزگاری کی شاخ ہے۔ جب متقی اور پرہیزگاروں کی کثرت ہو گی حلال زیادہ ہوگا اور جب متقی اور پرہیزگار لوگ کم ہو جائیں گے حلال بھی کم بلکہ حرام میں ملا ہوا اور غیر واضح رہ جائے گا۔

قرن اوّل میں سلف صالحین کی برکت سے حلال بکثرت تھا۔ لوگ بھی عام طور پر پرہیزگار تھے۔ وہ ناحق مال نہ لیتے اور اگر کہیں شبہ آتا تو اپنا حق بھی چھوڑ دیتے مگر مشتبہ مال نہ لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دور میں حلال کی بہت ہی کثرت تھی۔

ایک عراقی فقیہ سے مروی ہے، فرمایا:

"میں کنجوس کی گواہی قبول نہیں کروں گا۔"

پُوچھا گیا: "کیوں؟"

فرمایا: "اس کی کنجوسی اپنا حق اس طرح پُورا کرنے پر اُبھارے گی کہ وُہ دوسرے کا مال بھی ہتھیانے کی کوشش کرے گا جو اس کا حق نہیں ہے۔"

پھر فرمایا، "مجھے حضرت عطاءؒ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہُوئے بتایا۔ وُہ فرماتے ہیں،

"ایک کریم آدمی کبھی بھی انتہا کو نہیں پہنچتا۔"

پھر یہ آیت تلاوت کی:

عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ۔

روایت میں ہے: کہ

"ہم حرام کے ایک دروازہ کے ڈر سے حلال کے ستر دروازے چھوڑ دیتے تھے۔"

حضرت حسنؓ نے فرمایا،

"میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ جن پر حلال مال پیش کیا جاتا تو بھی وُہ کہہ دیتے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے دل کے بگڑ جانے کا ڈر ہے۔" حالانکہ وہ عادل ائمہ تھے۔ تقویٰ پر باہم تعاون کرتے اور حق کے ساتھ ہی لیتے تھے۔

گھوڑے کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ فرمایا،

"ایک آدمی کے لیے گھوڑے بوجھ ہیں۔ یہ وہ آدمی ہے کہ جو فخر و دکھاوے اور سنانے کی خاطر گھوڑے باندھے اور پھر اسلام پر اس کی نیت کرے۔ اب گھوڑوں نے جو پیٹوں میں کھایا پیا، حتیٰ کہ ان کے بَول و گوبر دا آثار قیامت کے

روز اس کے تراز و میں بوجھ ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ [1] (جمع کرو گناہگاروں کو اور ان کی بیویوں کو)

یعنی ان کے اشباہ و اعوان کو جمع کرو۔

حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"قیامت کے روز کہا جائے گا کہ بُرے حکمران اور ان کے مددگار کھڑے ہو جائیں۔ جس نے ان کے لیے دوات درست کی یا ان کے لیے قلم تراشا یا ان کا نمدہ یا عرق گیر اٹھایا یا کسی معاملہ میں ان کی مدد کی۔ وہ ان کے ہمراہ ہوگا۔"

ایک آدمی حضرت ابن مبارکؒ کے پاس آیا اور کہا:

"میں درزی ہوں بسا اوقات بادشاہ کے کارندوں کے لیے سلائی کرتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا میں بھی ظالموں کا مددگار ہوں؟"

فرمایا: "تُو ظالموں کا مددگار نہیں بلکہ تُو ظالموں میں سے ہے۔ ظالموں کے مددگار وہ ہیں جو تجھ سے سُوئی اور دھاگے خریدتے ہیں۔"

ایک عالم ایک حاکم کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ حاکم نے ایک تحریر لکھی اور کہنے لگا:

"مجھے مٹی دیں۔ ذرا تحریر خشک کر لوں۔" انہوں نے انکار کر دیا اور فرمایا،

مجھے وہ تحریر دکھاؤ جو لکھی ہے تاکہ دیکھوں (کوئی ظلم کی بات تو نہیں لکھی) حضرت ثوریؒ نے مہدی کے ساتھ بھی ایسا کیا۔ مہدی کے ہاتھ میں سفید کاغذ تھا۔ حضرت ثوریؒ اس کے پاس آئے تو اس نے کہا:

"اے ابو عبداللہ! وہ دوات دے دیں تاکہ میں لکھوں۔"

فرمایا: "بتاؤ کیا لکھو گے؟ اگر حق بات ہوئی تو دوات دُوں گا ورنہ میں ظالموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔"

مکہ کے ایک حاکم نے ایک آدمی کو سرحدی عمارات میں کوئی تعمیری کام سپرد کیا۔ وہ بتاتا ہے کہ مجھے دل میں کھٹکا پیدا ہوا اور میں نے حضرت سفیانؒ سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا،

"ہرگز یہ کام نہ کرنا۔ ان کا کم زیادہ کسی درجہ میں مددگار نہ بننا۔"

میں نے عرض کیا: "اے ابو عبداللہ، یہ اہل اسلام کی خاطر اللہ کی راہ میں ایک دفاعی عمارت ہے۔"

فرمایا: "ہاں، اس میں کمتر بُرائی یہ ہے کہ تُو یہ چاہے گا کہ یہ لوگ زندہ رہیں تاکہ تیری اُجرت ادا کر دیں اور ایسا کرنا

---

[1] الصّفٰت ۲۲

اللہ کی مبغوض چیز کو پسند کرنا بن جائے گا۔

حدیث میں ہے:

"جو آدمی ظالم کے زندہ رہنے کی دُعا کرے اس نے اس بات کو پسند کیا کہ اللہ کی نافرمانی ہوتی رہے۔"

حدیث میں ہے:

"جب فاسق کی تعریف کی جائے تو اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوجاتا ہے۔"

ایک دُوسری حدیث میں ہے:

"جس نے فاسق کی عزت کی اس نے گویا اسلام کو مٹانے میں مدد دی۔"

غلط تجارت سے دُور رہو

تاجر کو چاہیے کہ فاسد تجارت سے پرہیز کرے مثلاً دھوکہ، ملاوٹ یا بڑے بیانہ غیر معلوم اور مجہول کی بیع کرنا، فاسد بیع ہے۔ ایک بیع میں دو بیع کرنا فاسد ہے کہ مصارفت کی بیع ہو یا شرط لگانے کی ہو۔ اور جو چیز اس کے پاس نہیں اس کو فروخت نہ کرے۔ اور جس کو خریدا ہے مگر ابھی قبضہ نہیں کیا تو اسے بھی فروخت نہ کرے۔ قرض کے عوض قرض کی بیع نہ کرے۔ پھلوں کی فروخت اس وقت کرے کہ جب وُہ پک جائیں اور ان کی (خام حالت میں) تباہی کا خطرہ نہ رہے۔ کھجور اس وقت فروخت کرے کہ جب سُرخ ہوجائے یا زرد پڑ جائے اور انگور اس وقت فروخت کرے کہ جب وُہ نرم ہوجائے یا سیاہ پڑ جائے (یعنی کوئی پھل خام حالت میں پکنے سے پہلے فروخت نہ کرے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تجارت) نجش سے منع فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز دکھا کر دھوکہ سے دُوسری چیز کی خریداری کی رغبت دلائے اور سونا اور منکے ہار کی صورت میں نہ خریدے بلکہ علیحدہ علیحدہ کرکے خریدے۔ یہی سنت ہے اور جب تک جانور اور پھل صاف واضح نہ ہو، اسے نہ خریدے اور ہر اس تجارت سے بچے کہ جو شرعاً غلط ہو اور اس میں سُود بن جاتا ہو یا کسی حکم شرع کی مخالفت لازم آتی ہو۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے دین اور کاروبار دونوں میں خسارہ واقع ہوتا ہے۔ اگر کوئی باریک معاملہ پیش آئے اور حکم واضح نہ ہو سکے تو علماء سے رجوع کرے اہل تقویٰ کی رائے و مذہب اختیار کرے، اپنے دین کی حفاظت کرے۔ اپنے آپ پر نظر رکھے اور آخرت کے کاموں میں ذرا بھی تساہل نہ کرے۔ یہی اس کے لیے بہترین راہ ہے۔

صنعت کار کو چاہیے کہ اس دور کی اکثر غلط اور نو پیدا صنعتوں سے دُور رہے۔ اس لیے کہ یہ صنعتیں بدعت ہیں۔ سلف کے دَور میں نہ تھیں (اور ان میں کئی خلافِ شرع امور کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

اور جو کام بھی معصیت کا سبب بنے۔ وُہ معصیت ہے۔ نہ اس کی تجارت کرے اور نہ وُہ صنعت اختیار کرے کیونکہ ایسا کرنا ظلم و عدوان پر مدد کرنا ہے اور غلط تجارت و صنعت کے ذریعہ جو مال حاصل کرے گا وُہ مال بھی غلط

اور بدعت ہے اور جس نے بدعتی یا نافرمان کی مدد کی وہ اس کی بدعت و نافرمانی میں حصہ دار ہے اور ایسے طریقوں سے مال حاصل کرنا، باطل طریق سے مال حاصل کرنا ہے۔

جس نے حرام کھایا اس نے اپنے آپ کو اور اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اس لیے کہ اس نے اسے بھی کھلایا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔

فرمایا:

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ (اور اپنی جانوں کو نہ مارو)

اور قتل و غارت گری اہل اسلام کی راہ نہیں۔ فرمایا:

وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ [1] (اور چلے سب مسلمانوں کی راہ سے الگ، سو ہم اس کو حوالے کریں وہی طرف جو اس نے پکڑی اور ڈالیں اس کو دوزخ میں)

تاجر کے لیے جائز نہیں کہ اس کی تجارت اسے آخرت سے غافل کر دے اور نہ ہی ایسا ہونے دے کہ دنیاوی تجارت، اخروی تجارت سے ہٹا دے اور دنیا کا بازار، آخرت کے بازار سے غافل کر دے۔ اس لیے کہ آخرت کے بازار یقینی ہیں اور زمین پر اللہ تعالیٰ کے گھر (مساجد) ہی آخرت کے بازار ہیں۔

فرمایا:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ [2] (وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے، اور نماز کھڑی رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے)

فرمایا:

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ۔ [3] (ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا ان کو بلند کرنے کا اور وہاں اسی کا نام پڑھنے کا، یاد کرتے ہیں اس کی وہاں صبح اور شام)

---

[1] النساء ۱۱۵

[2] النور ۳۷

[3] النور ۳۶

اس لیے انسان کو لازم ہے کہ صبح و شام اللہ کا ذکر کرے اور حسنِ معاملہ کے ساتھ اس کی تسبیح کرتا رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تاجروں کو حکم دیا کرتے :

"دن کا ابتدائی حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے کرو اور آخری حصہ اپنے آپ کے لیے (یعنی کاروبار کے لیے)"۔

سلفؒ کے واقعات میں ہے کہ "وہ دن کا ابتدائی حصہ آخرت کے لیے اور آخری حصہ دنیا کے لیے کرتے"۔

اور کہتے ہیں کہ سردی کے موسم میں ہریسہ اور سریاں صرف بچے اور ذمی لوگ ہی فروخت کیا کرتے۔ اس لیے کہ ہریسے اور سریوں کے تاجر طلوعِ آفتاب تک مساجد میں رہا کرتے۔ بتاتے ہیں کہ عصر کے بعد سلف صالحینؒ مساجد میں جمع ہو کر ذکر و تسبیح میں مصروف ہو جائے۔ گاہے کوئی آدمی آکر پوچھتا کہ کیا آپ عصر کی نماز پڑھ چکے ؟ وہ سمجھتا کہ لوگ نماز کے انتظار میں بیٹھے ہیں (یعنی اس قدر کثرت سے لوگ مسجد میں بیٹھا کرتے) چنانچہ غروبِ آفتاب تک تسبیح میں مشغول رہتے۔ یہ ایک طریق تھا۔ افسوس آج مٹ چکا جو اس پر عمل کرے گا اس نے اسے دوبارہ زندہ کیا۔

ایک عارفؒ کا قول ہے :

"لوگوں کی تین اقسام ہیں :

۱۔ جس کو آخرت کی فکر، دنیا سے غافل کر دے۔ یہ فائزین کا درجہ ہے۔

۲۔ جس کو اس کی دنیاوی فکر نے آخرت کے معاملہ میں مصروف کر دیا۔ یہ نجات پانے والوں کا درجہ ہے۔

۳۔ جس کو دنیاوی فکر نے آخرت سے غافل کر دیا۔ یہ ہلاک ہونے والوں کا حال ہے۔

بازار میں جانے کی دعا

ان سے بلند تر ایک عالمؒ کا فرمان ہے :

"جس نے اللہ سے محبت کی، وہ زندہ رہا۔ جس نے دنیا سے محبت کی، وہ اوچھا آدمی ہے اور احمق آدمی "کچھ نہ" میں صبح و شام کرتا ہے"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب بازار میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے :

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَ الْفُسُوْقِ وَمِنْ شَرِّ مَا اَحَاطَتْ بِهِ السُّوْقُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ يَمِيْنٍ فَاجِرَةٍ وَصَفْقَةٍ خَاسِرَةٍ۔

(اے اللہ میں کفر و فسوق سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور بازار جس (برائی) کو لیے ہوئے ہے اس سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ میں جھوٹی قسم اور خسارے کے سودے سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

اور بازار میں اللہ کی یاد ایسے آتی ہے کہ دوسری جگہ نہیں آتی۔ غفلت کی گھڑیوں میں اللہ کا خوب ذکر کرے۔

اور جس وقت لوگ خرید و فروخت میں مزاحمت کر رہے ہو اس وقت ذکر اللہ کرے۔

حضرت حسنؒ فرمایا کرتے :

"بازار میں اللہ کا ذکر کرنے والا قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کی روشنی مہتاب کی روشنی کی طرح ہوگی۔ اور اس کی برہان، آفتابی برہان کی طرح ہوگی اور جس نے بازار میں استغفار کیا اس کے گھر والوں کی مقدار پر اس کی مغفرت ہو جائے گی۔

ایک خبرِ عام میں ہے:

"غافلین کے اندر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا، بھاگنے والوں سے الگ ہو کر جنگ کرنے والے کی طرح ہے اور مردوں کے اندر زندہ کی طرح ہے۔"

ایک خبرِ خاص میں ہے:

جو بازار میں داخل ہُوا اور یہ کہا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

(اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ وُہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی حمد ہے۔ زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے نہیں مرے گا، اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔)

اللہ تعالیٰ اس کے لیے بیس لاکھ نیکیاں لکھے گا۔

اذان پر تجارت بند کرو

حضرت ابن عمر اور محمد بن واسع رضی اللہ عنہما بازار میں آکر ذکر اللہ کرتے۔ یعنی اس ذکر کی فضیلت حاصل کرنے کی خاطر ایسا کرتے۔ اگر تم بازار میں جاؤ یا پہلے سے بازار میں ہو تو کلمہ طیبہ اور دُوسرے اذکار کو نہ بھُولو۔ یہ تیرے وقت کا عمل ہے اور بازار میں کاروبار یا ذکر اللہ کے علاوہ کے لیے مت بیٹھو۔ یہ مکرُوہ ہے۔ نماز کی اذان سنتے ہی نماز کی تیاری میں مصروف ہو جاؤ اور جماعت سے تاخیر کر کے نماز نہ پڑھو ورنہ بعض علماء کے نزدیک تم فاسق آدمی ہو۔ ہاں اگر وقت کافی ہو یا کسی دوسری مسجد میں با جماعت نماز کی نیت کر رکھی ہو تو الگ بات ہے۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی جماعت میں شریک نماز ادا کرنا زندگی بھر کے تمام دنیاوی نفعوں سے بہتر ہے اور تکبیرِ تحریمہ کا رہ جانا دُنیا بھر کے تمام خساروں سے بڑھ کر خسارہ ہے۔ اہلِ خرد و بصارت کے لیے یہی مسئلہ ہے۔

سلف صالحین میں سے تاجر لوگ اذان سُنتے مساجد میں بھاگ کر جاتے اور نماز کھڑی ہونے سے پہلے نوافل ادا کرتے اور تمام بازار تاجروں سے خالی ہو جاتے۔ اوقاتِ نماز میں صرف بچے اور ذمی لوگ ہی کاروبار کرتے نظر آتے اور سلف کا طریقہ تھا کہ وُہ انہیں کچھ اجرت پر مساجد سے واپس آنے تک دکانوں کی حفاظت کے لیے ملازم رکھ لیتے۔ افسوس آج یہ طریقہ بھی مٹ گیا۔ جس نے اس پر عمل کیا اس نے اس کو زندہ کیا۔

فرمانِ الٰہی ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ۔[1]

(وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں، اللہ کی یاد سے، اور نماز کھڑی رکھنے سے، اور زکوٰۃ دینے سے)

اس کی تفسیر میں بتایا کہ وہ لوہار اور موچی تھے۔ ان میں سے اگر کسی نے ہتھوڑا اٹھایا یا سوئی چبھوئی، پھر اذان کی آواز سن لیتے تو نہ ہی ہتھوڑا اٹھایا بلکہ اُسے پھینک کر مساجد کی طرف چلے گئے اور نماز ادا کی۔

مکروہ تجارتیں

حضرت وہبؒ سے مروی ہے کہ ایک مالکؒ نے ایک آدمی کے بارے میں فرمایا تھا جس نے جمعہ کے روز اذان کے بعد مال فروخت کیا۔ فرمایا:

"اس کی بیع فسخ کی جاتی ہے۔"

بتایا گیا کہ "وہ عامل ہے اور اس کو ترک کر دیا اور وہ آزاد ہے"۔

فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے سامنے استغفار کرے۔"

حضرت ربیعہ فرماتے ہیں:

"اس نے گناہ کیا اور ظلم کیا۔"

مالکؒ نے فرمایا:

"بیع حرام ہو جاتی ہے حتّٰی کہ جمعہ کے دن امام نکل آئے۔"

ایک صنعت کار کو چاہیے کہ صنعتوں میں نقوش، تصویریں اور دوسری آرائش و لہو کی صورتیں نہ بنائے، ساگوان پر باریک کام کرنا، چونا لگانا اور رنگ برنگ کا تصنع کرنا مکروہ ہے اور اس پر اجرت بھی مشتبہ مال ہے۔

بعض سلفؒ فرمایا کرتے:

"اپنی اولاد کے لیے بہتر صنعت تلاش کرو۔"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے صانع اور اس کی صنعت کو پیدا کیا۔"

آٹے اور کھانے کے کاروبار کو وہ ناپسند کرتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کی کراہت ایک حدیث میں مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے:

---

[1] سورۃ آیت

"اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو پسند کرتا ہے جو اپنی صنعت میں خوب ماہر ہو۔"
ایک دوسری روایت میں ہے:
"جب کوئی بندہ کوئی کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ وہ اسے پختہ کرے۔"
دوسرے الفاظ یہ ہیں، کہ
"اتقان (پختگی) کرے۔"
ایک عارفؒ نے ایک آدمی کو وصیت کی۔ فرمایا:
"اپنے بیٹے کو دو کاروبار نہ کرنے دینا اور نہ دو صنعتوں میں پڑنے دینا۔
۱۔ کھانے کا کاروبار
۲۔ کفنوں کا کاروبار
اس لیے کہ وہ مہنگایت کی خواہش کرے گا اور لوگوں کے مرنے کی خواہش کرے گا۔ اور دو صنعتیں یہ ہیں:
۱۔ قصاب کا کام کرنا۔ یہ پیشہ انسان کو سنگدل بنا دیتا ہے۔
۲۔ سنار کا کام۔ یہ سونے چاندی کے ذریعہ دنیا کو آراستہ کرتا ہے۔"
عثمان شحامؒ نے ابن سیرینؒ سے نقل کیا کہ "ان کے نزدیک دلالی بھی مکروہ ہے"۔
حضرت سعیدؒ نے حضرت قتادہؓ سے نقل کیا کہ "ان کے نزدیک دلالی کی اُجرت مکروہ ہے۔"
عرب کہا کرتے ہیں:
"جانور بیچ اور دو مردے خریدلے۔ گویا وہ جانور میں قیمت واپس کرنے کو معیوب خیال کرتے۔ اس لیے کہ انہیں اس کے تلف ہونے کا ڈر ہوتا اور مردہ (چیز) خریدنا پسند کرتے یعنی جس چیز میں رُوح نہ ہو۔"
سلف صالحینؒ کپڑے کا کاروبار پسند کرتے۔ حضرت ابن مسیبؒ فرماتے ہیں:
"میرے نزدیک کپڑے کا کاروبار سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ بشرطیکہ اس میں قسمیں نہ ہوں۔"
ایک دوسری روایت میں ہے:
"اگر اہل جنت تجارت کرتے تو کپڑے کی تجارت کرتے اور اگر دوزخی تجارت کرتے تو صرافی کا کاروبار کرتے۔"
حضرت حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہما کے نزدیک صرافی کا کام مکروہ ہے۔ حضرت حسنؓ سے صراف کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا:
"یہ فاسق ہے۔ اس کے سایہ میں نہ کھڑے ہونا اور نہ ہی اس کے پیچھے نماز پڑھنا اور مالی، مزدور (بوجھ

اٹھانے والا) ، ملاح ، حمام والا ، بڑے آدمی اور آرائش بنانے والا اور حسبِ ذیل کام ابرار و صالحین کے ہیں :
موچی کا پیشہ ، تجارت ، مزدوری ، درزی ، جُوتے والا ، دھوبی کا کام ، موزے بنانا ، لوہے کا کام ، اُون بننے کا کام ، بری اور بحری شکار کرنا اور کتابت کا کام ۔
عبدالوہاب وراق سے مروی ہے کہ مجھے احمد بن حنبلؒ نے فرمایا :
"تیری صنعت کیا ہے ؟"
میں نے کہا :
"کتابت کرنا"
فرمایا : "تیری کمائی پاک و حلال ہے ۔ تیرا پیشہ پاک ہے ۔ اگر میں کوئی پیشہ اختیار کرتا تو تیرا پیشہ ہی اختیار کرتا ۔"
اور مجھے فرمایا :
"اچھی باتیں لکھو اور حواشی اور صفحہ کی پُشت خالی رکھو ۔"

اخروی اعمال پر اُجرت

مالکؒ بن دینار بھی کاتب تھے اور سلف صالحین ان کے کاروبار کو پاکیزہ سمجھتے اور افضل قرار دیتے ۔

ہر وہ عمل جس کے ذریعہ قربِ الٰہی حاصل کیا جائے اور وہ اخروی اعمال میں سے ہو ۔ ایک نیکی کا کام ہو ۔ اس پر اجرت لینا مکروہ ہے مثلاً قرآن پاک کی تعلیم دینا ، علمِ دین پڑھانا ، رمضان میں ذکر کی مجالس قائم کرنا اور نماز پڑھنا ۔ اب جس نے ان پر دنیا کی اُجرت لی وُہ صاف خسارے میں ہوگا جبکہ دنیا میں ان پر صبر کرنے والوں کو اجر و ثواب ملے گا تو اسے عظیم خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا ۔
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ بن ابی عاص کو فرمایا :
"ایسا مؤذن حاصل کرو جو اذان پر اُجرت نہ لے ۔"
حضرت ابو عبادہؓ کو کسی نے ایک کمان تحفہ میں دیا ۔ انہوں نے اس آدمی کو قرآن پاک کی ایک سُورت پڑھائی تھی ۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
"کیا تُو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے آگ کی ایک کمان پہنائیں ؟" اُنہوں نے فوراً واپس کر دی ۔

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

تاجر آدمی کو چاہیے کہ وُہ خوراک کی ذخیرہ اندوزی نہ کرے اور گندم کی ذخیرہ اندوزی کرنا سخت ترین جرم ہے اس لیے کہ گندم تمام لوگوں کی خوراک ہے ذخیرہ اندوزی کے جُرم ہونے کے بارے میں بکثرت احادیث آتی ہیں ۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا :

"جس نے مسلمانوں کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی کی وہ ہم میں سے نہیں۔"

ایک دُوسری روایت میں ہے:

"جس نے خوراک کی چالیس روز تک ذخیرہ اندوزی کی پھر اسس کو خیرات کر دیا تو وُہ صدقہ نہیں بلکہ ذخیرہ اندوزی کا کفارہ ہے۔"

ایک قول یہ ہے:

"جس نے چالیس روز تک ذخیرہ اندوزی کی اس نے گویا ایک جان کو قتل کیا۔"

ایک روایت ہے:

"اللہ تعالیٰ ایسے کو بڑے دوزخ میں ڈالے گا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"جس نے چالیس روز تک ذخیرہ اندوزی کی اس میں قساوتِ قلبی پیدا ہو گئی۔"

ایک روایت ان کے بارے میں یہ ہے کہ انھوں نے ذخیرہ کردہ خوراک آگ سے جلا دی اور احتکار (ذخیرہ اندوزی) کی ایک لحاظ سے فضیلت بھی انہی سے مروی ہے:

"جس نے خوراک حاصل کی، پھر اسے اس دن کے نرخ پر فروخت کیا (جب سستے ایام میں لی تھی) تو گویا اس نے اس کا صدقہ کیا۔"

دُوسرے الفاظ یہ ہیں:

"گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا۔"

بعض علماء کے نزدیک ہر کھانے کی چیز مثلاً دانے، سالن یعنی دال، لوبیا، گھی شہد، شیرہ، کھجور اور زیتون ہر چیز میں ذخیرہ اندوزی کرنا مکروہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس فرمانِ باری تعالیٰ کی تفسیر میں مروی ہے:

وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ [1] (اور جو اس میں چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے، اسے ہم چکھائیں گے دُکھ کی مار)

فرمایا کہ:

"احتکار (ذخیرہ اندوزی) بھی ظلم میں سے ہے۔"

---

[1] الحج آیت ۲۵۔

نصیحت کا مفہوم

بعض سلفؒ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ واسط میں تھے۔ انہوں نے بصرہ کی طرف گندم کا ایک جہاز بھیجا اور اپنے وکیل کو لکھا کہ جس روز یہ گندم بصرہ میں پہنچے اسی روز فروخت کر دینا اور کل تک بھی تاخیر نہ ہو۔ جب گندم پہنچی تو اس وقت نرخ کم تھے۔ تاجروں نے وکیل کو کہا:

"اگر ایک ہفتہ تاخیر کر کے بیچو تو کئی گنا نفع ہوگا۔" اس نے ایک ہفتہ موخر کر دی اور اس میں کئی گنا نفع حاصل کیا۔ پھر مالکِ غلہ کو یہ تمام واقعہ لکھ بھیجا۔ انہوں نے جواب دیا:

"ارے میاں، ہم دینی سلامتی کے ساتھ تہائی نفع پر بھی رضامند تھے مگر تم نے ہمارے حکم کے خلاف کام کیا اور ہم پر جرم لگوا دیا۔ جب میرا خط پہنچے تو سارا مال لے کر اہل بصرہ کے فقراء پر صدقہ کر دو۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ ذخیرہ اندوزی کا کفارہ ہو جائے تو بھی بڑی بات ہے۔ نہ گناہ اور نہ ثواب۔

ہمارے شیخ عابد النشط مظفر بن سہلؒ فرماتے ہیں: کہ میں نے غیلان درزی کو فرماتے سنا کہ حضرت سری سقطیؒ نے ساٹھ دینار میں باداموں کا ایک ٹوکرا خریدا (جس کا وزن مقرر ہوتا ہے) اور اپنے روزنامچہ میں لکھ دیا کہ اس پر تین دینار نفع ہے۔ اس کے بعد باداموں کی قیمت نوّے دینار تک پہنچ گئی۔ دلال آیا تو اس نے بادام لینے چاہے انہوں نے کہا: "لے لو۔"

اس نے پوچھا:

"کیا قیمت ہے؟"

کہا: "تریسٹھ دینار۔"

دلال نے کہا:

"باداموں کے پیلے کی قیمت ستر دینار ہو چکی ہے۔"

حضرت سریؒ نے فرمایا:

"میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان ایک عہد کر رکھا ہے کہ اسے تریسٹھ دینار میں فروخت کروں گا۔ اب میں اس عہد کو نہیں توڑوں گا۔"

دلال نے کہا:

"میں نے بھی اپنے اور اللہ کے درمیان ایک عہد کر رکھا ہے کہ کسی مسلمان سے دھوکہ نہیں کروں گا۔ میں بھی اس عہد کو نہیں توڑوں گا اور آپ سے ستر دینار میں ہی لوں گا ورنہ نہیں۔"

بتاتے ہیں کہ نہ اس دلال نے خریدا اور نہ حضرت سریؒ نے فروخت کیا۔

ایک آدمی نے بصرہ میں رہنے والے ایک تابعیؒ کے بارے میں بتایا کہ ان کا سوس (شہر کا نام) میں

ایک غلام تھا اسے شکر بھیجی۔ غلام نے لکھا کہ اس سال گنّے کو بہت گزند پہنچا ہے اس لیے شکر خرید لیں۔ انہوں نے شکر خرید لی۔ جب وقت آیا تو اس میں تیس ہزار کا نفع ہُوا۔ بتاتے ہیں کہ وہ یہ مال لے کر گھر گئے اور رات بھر نفع کے بارے میں سوچتے رہے کہ میں نے تیس ہزار کا نفع کمایا مگر مسلمانوں میں سے ایک آدمی کو نصیحت نہ کر کے خسارہ اٹھایا۔ جب صبح ہُوئی تو جس سے شکر خریدی تھی اس کے پاس تشریف لے گئے اور اسے تیس ہزار دیے اور فرمایا:

"تیرے مال میں اللہ برکت کرے۔"

اس نے پُوچھا:

"یہ کہاں سے ہے؟"

انہوں نے بتایا:

"جب میں نے تجھ سے شکر خریدی تھی تو اصل بات نہیں بتائی تھی۔ میرے غلام نے مجھے لکھا تھا کہ اس سال گنّے کو بہت گزند پہنچا ہے اور میں نے تمہیں اس کی اطلاع نہیں دی۔ اگر تمہیں معلوم ہو جاتا تو شاید فروخت نہ کرتے۔"

اس نے جواب دیا:

"اللہ آپ پر رحم کرے۔ آپ نے اب تو بتا دیا اور میں نے بخوشی آپ کو یہ رقم دے دی۔"

بتاتے ہیں کہ وہ رقم لے کر گھر آئے اور یہ رات بھی جاگتے گزار دی اور سوچتے رہے:

"تُو نے اصل بات نہیں بتائی تھی۔ کاروبار کرتے وقت ایک مسلمان کو نصیحت نہیں کی تھی۔ شاید اس نے شرم کے مارے یہ رقم چھوڑ دی ہو۔ صبح سویرے ہی اُٹھے اور جا کر کہا:

"اللہ تجھے عافیت میں رکھے، اپنا مال لو، میرے قلب کے لیے یہی بہتر ہے۔ آخر انہوں نے اسے تیس ہزار کی رقم دے دی۔"

حضرت سلیمان تیمیؒ بتاتے ہیں کہ محمد بن سیرینؒ نے ایک دفعہ چالیس ہزار درہم اس وجہ سے چھوڑ دیے تھے کہ انہیں اس مال کے بارے میں قلبی خلش سی ہُوئی، حالانکہ علماء نے بالاتفاق بتایا تھا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر فکرِ دین کا غلبہ تھا۔

مزید برآں فروخت کرنے والا لفاظی کر کر کے چیز کی زیادہ تعریف نہ کرے اور خریدار بھی دھوکہ دینے کی خاطر اس چیز کی ایسی مذمت نہ کرے اور نہ عیب لگائے کہ جو اس میں نہ ہو، اور کاروبار پر قسمیں کھانا تو سراسر معصیت اور کاروبار کو تباہ کرنا ہے۔

سلف صالحین اس معاملہ میں بہت شدت کرتے۔ حضرت ابو ذرؓ نے فرمایا:

"ہم یوں باتیں کیا کرتے کہ کچھ لوگوں پر اللہ تعالیٰ نظرِ رحمت ہی نہیں کریں گے مثلاً فاجر تاجر، اور فاجر تاجر سے

ہم یہ مراد لیتے تھے کہ وہ چیز کی ایسی تعریف جتائے جو اس میں نہ ہو۔

حضرت یونس بن عبیدؒ ریشم کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک آدمی نے آکر ریشم کا کپڑا مانگا۔ انہوں نے غلام کو کہا:

"ریشم کی گٹھڑی نکال لاؤ۔"

جب اسے کھولا تو غلام نے کہا:

"میں اللہ سے جنت مانگتا ہوں۔"

فرمایا: "گٹھڑی باندھ دو اور اس میں سے کچھ فروخت نہ کرو۔ شاید اس کی مدح ہو چکی ہو۔" بتاتے ہیں ان کے پاس دو قسم کے (لباس کے) جوڑے تھے۔ ایک قسم کی قیمت چار سو تھی اور دُوسرے کی قسم دو سو تھی۔ وُہ نماز پڑھنے گئے اور ان کا بھتیجا بیٹھا تھا۔ ایک اعرابی آیا اور اس نے چار سو والا لباس خریدنا چاہا۔ اس نے دو سو والا سامنے رکھا۔ اس نے اسے ہی خوب جان کر لے لیا۔ اور رضامندی کے ساتھ خرید کر ہاتھ میں لیے چل دیا۔ یہ مسجد سے نکلے تو اپنی دکان کا کپڑا اعرابی کے ہاتھ میں دیکھا اور پہچان لیا۔ پُوچھا:

"یہ لباس کتنے میں لیا ہے؟"

اس نے کہا: "چار سو میں۔"

فرمایا: "نہیں، اس کی قیمت دو سو ہے۔"

اعرابی نے کہا:

"میاں، ہمارے ہاں تو اس کی قیمت پانچسو درہم ہے۔"

حضرت یونسؒ نے فرمایا:

"دین میں نصیحت ساری دنیا سے بہتر ہے۔" پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور بھتیجے کے پاس لائے، بھتیجے کو ڈانٹ دی اور فرمایا:

"تو اللہ سے نہیں ڈرتا۔ تجھے حیا نہ آئی کہ ایک مسلمان کو نصیحت نہیں کی اور قیمت کے برابر نفع لیا۔"

اس نے کہا:

"اللہ کی قسم، اس نے رضامندی سے یہ لیا۔"

فرمایا: "چاہے یہ راضی ہو گیا مگر جس پر تو اپنے لیے راضی ہوتا ہے اس کے لیے اس پر کیوں راضی نہ ہُوا؟"

پھر اعرابی کو دو سو درہم واپس کیے۔

محمد بن منکدرؒ کا بھی اسی طرح کا واقعہ آتا ہے۔ ان کے پاس جنابی اور بصری ٹکڑے تھے۔ بعض کی قیمت پانچ پانچ اور بعض کی دس دس تھی۔ یہ باہر گئے۔ دکان میں غلام تھا۔ اس نے ایک اعرابی کے پاس ایک ٹکڑا

غلطی سے پانچ والی دس میں فروخت کر دی۔ حضرت ابن منکدرؒ تشریف لائے تو اس مغالطے سے آگاہ ہُوئے۔ فرمایا:
"تیرا ناس ہو، تُو نے ہمیں ہلاک کیا۔ جا اور جا کر بازاروں میں اعرابی کو تلاش کر"، وُہ سارا دن تلاش کرتا رہا آخر اسے پا لیا۔ جب آیا تو ابن منکدرؒ نے اسے بتایا:
"بھائی اس غلام کو مغالطہ ہو گیا اس نے پانچ کا دس میں فروخت کر دیا"۔
اس نے کہا: "بھائی میں تو راضی ہُوں"۔
فرمایا: "تو اپنے لیے بے شک راضی ہے مگر ہم تیرے لیے اس پر راضی ہیں جس کے لیے اپنے آپ کے بارے میں راضی ہوتے ہیں۔ تین باتوں میں ایک منظور کر لے چاہے تو دس دراہم والا ٹکڑا لے لو۔ اور چاہے ہمارا ٹکڑا واپس کر دو اور اپنے دراہم واپس لے لو"۔
اس نے کہا:
"مجھے پانچ واپس کر دیں"۔
چنانچہ انہوں نے پانچ دراہم واپس کر دیے۔ یہ دراہم لے کر اعرابی باہر نکلا اور لوگوں سے دریافت کرنے لگا کہ "یہ کون بزرگ ہیں؟"
لوگوں نے بتایا کہ "یہ محمد بن منکدرؒ ہیں"۔
اس اعرابی نے کہا:
"لا الٰہ الا اللہ، جب ہمارے علاقوں میں قحط پڑتا ہے تو ہم انہی کے واسطہ سے دُعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش فرماتا ہے"۔
کاروبار میں پرہیزگاری کے بارے میں ایک عالمؒ کا فرمان ہے:
"کاروبار میں تقویٰ تب ہی صحیح ہوتا ہے جبکہ صحیح نصیحت ہو"۔
پُوچھا گیا: "وُہ کیسے؟"
فرمایا: "جب تُو نے ایک چیز ایک درہم میں فروخت کی تو دیکھ، یہ اس قابل ہے کہ تو خود بھی اسے ایک درہم میں خرید ے۔ اگر ایسا ہے تو تُو نے نصیحت کی اور اگر یہ پانچ دانق کے قابل ہے (یعنی درہم سے ذرا کم قیمت، کی بھی) تو تُو اپنے لیے اس پر راضی نہ ہُوا۔ اب تیری نصیحت ختم ہُوئی اور جب نصیحت ختم ہو گئی تو تقویٰ جاتا رہا"۔
بتاتے ہیں کہ "قیامت کے روز فروخت کرنے والے آدمی کو ہر اس آدمی کے سامنے کھڑا کیا جائے گا جس جس سے اس نے کاروبار کیا ہو گا اور ہر ایک کے بارے میں اس پر محاسبہ ہے حتیٰ کہ اس کے عملداروں کا اور جس نے ان سے خریدا ان کا محاسبہ بھی اس پر ہو گا"۔

ایک بزرگ بتاتے ہیں کہ میں نے ایک تاجر کو خواب میں دیکھا تو پُوچھا:

"اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟"

کہا: "مجھ پر پچاس ہزار دفتر کھولے گئے۔"

میں نے پُوچھا: "کیا یہ سب گناہ ہیں؟"

کہا گیا: "یہ وہ معاملات ہیں جو تُو نے دنیا کے اندر لوگوں کے ساتھ کیے۔ ہر آدمی کا علیحدہ دفتر ہے جو تیرے اور اللہ کے درمیان ہے اور شروع سے آخر تک اس میں تحریر ہے۔"

کم تولنے کی ممانعت

اگر دکاندار ترازو والا ہو (یعنی ایسا کاروبار ہو کہ جس میں ترازو استعمال کرنا پڑے) تو فروخت کرتے وقت وزن جھکا کر دے اور جب خود لے تو ذرا سا کم لے اور اگر دو ترازو رکھتا ہے تو پھر معاملہ بہت سخت ہے۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"میں ایک دانے کے عوض اللہ کا عذاب نہیں خریدتا۔ چنانچہ جب وُہ خود لیتے تو ایک دانہ کم کر دیتے۔ اور جب دُوسرے کو دیتے تو ایک دانہ زیادہ کر دیتے۔" اس لیے کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ [1] (خرابی ہے کم تولنے والوں کے لیے)

یعنی جب وُہ ایک دو دانے کم کرنے پر راضی ہوجائیں تو احکامِ الٰہی سے جہالت اور آخرت پر یقین میں کمی کی وجہ سے انہوں نے خوشی کے عوض ذلت خریدی اور ایسا جنّت فروخت کر دیا جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمیشہ ان مظالم کا تدارک نہیں ہُوا کرتا اور نہ ہمیشہ ان سے توبہ صحیح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تمام مظلوموں تک پہنچ کر ان کا حق ادا کرنا یا معاف کرنا ایک دشوار بات ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایت ہے:

"آپؐ نے ایک چیز خریدی۔ جب اس کی قیمت ادا کی تو قیمت تولنے والے کو فرمایا: تول اور جھکا کر رکھو۔"

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ وُہ دینار پر سے سُرمہ ہٹا کر دینار کو صاف کر رہا ہے فرمایا: "اے بیٹا، تیرا یہ کام بیس حجوں سے افضل ہے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

---

[1] المطففین آیت ۱۔

"تعجب ہے اس تاجر اور فروخت کرنے والے پر، کیسے وہ نجات پائے گا؟ دن کو وزن کرتا اور قسمیں کھاتا ہے اور رات بھر سوتا رہتا ہے۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام کا فرمان ہے،

"جیسے دو پتھروں کے درمیان سانپ گھس جاتا ہے اسی طرح خریدار و فروخت کنندہ کے درمیان گناہ آن گھستا ہے۔"

بعض سلفؒ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک ہجڑے کا جنازہ پڑھا۔ وہ مردوں اور عورتوں کے سامنے آیا کرتا اور تماشا کیا کرتا۔

لوگوں نے کہا: "یہ فاسق تھا اور ایسا ایسا آدمی تھا۔"

وہ خاموش رہے۔ کسی نے دوبارہ یہی بات کی۔ وہ ذرا سی دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

"ٹھہرو، تو نے مجھے گویا ایسے بتایا کہ یہ دو ترازوؤں والا تھا۔ ایک سے لیتا اور دوسرے سے دیتا۔ دراصل ایسا فرما کر نصیحت دی کہ "کم تولنا سخت گناہ ہے۔" اور بتایا کہ "مخلوق کے اندر باہم ظلم کرنا زیادہ برا ہے اور فسق تو اپنی جان پر ظلم کی بات ہے۔" چنانچہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں بڑا فرق ہے۔ مخلوق تو جاہل سونے والی اور محتاج ہے یہ لوگ ضروریات کی بنا پر اپنے حقوق پورے کر لیتے ہیں اور پورے کریں گے مگر اللہ تعالیٰ کریم غنی ہے وہ اپنے حق سے درگزر بھی کر جاتا ہے۔

خریدار کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ فروخت کنندہ سے زیادہ طلب کرے کہ زیادہ جھکا کر دو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ۔ (اور سیدھی ترازو تولو انصاف سے)

یعنی عدل کے ساتھ وزن کرو اور عدل سے مراد برابر وزن ہے یعنی کانٹا بالکل سیدھا رہے، کسی ایک پلڑے کی جانب جھکا ہوا نہ ہو۔

حضرت عبداللہؓ کی قرأت میں ہے،

وَلَا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ بِاللِّسَانِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ۔

کھوٹا سکہ دینے کی ممانعت

یہ دراصل توضیح ہے۔ کھوٹے سکے کے ساتھ خرید کرنا غلط ہے اور اگر درہم میں چاندی خراب یا غیر معلوم ہو۔ یعنی جس کی قیمت معلوم نہ ہو اور

اس میں چاندی کے علاوہ چیز اسی طرح کر کے اختلاط پذیر ہو چکی ہو کہ اس سے علیحدہ نہ ہو سکے تو اس سے بیع کرنا مکروہ ہے۔ بعض سلفؒ اس میں شدت کرتے اور اسے حرام قرار دیتے۔ حضرت ثوریؒ، فضیل بن عیاضؒ، وہب بن وردؒ، ابن مبارکؒ، بشر بن حارثؒ اور معافی بن عمران رحمہم اللہ کا یہی مسلک تھا۔

کہتے ہیں جو آدمی ایک کھوٹا سکہ چلائے گا وہ اسے اپنے اعمال نامہ میں لکھا دیکھے گا کہ اس کی تصویر بنی ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے "ایک ہزار برائی۔ پانچ ہزار برائی" یعنی سکے میں جس قدر ذرات ہوں گے اس کے برابر برائیاں ہوں گی اور ذرہ سے مراد دھوپ میں اڑنے والا باریک سا ذرہ ہے۔

ایک عالمؒ نے ایک مجاہد فی سبیل اللہ سے نقل کرتے ہوئے بتایا کہ میں نے اپنے گھوڑے پر لادنے کا ارادہ کیا مگر اس نے اس سے انکار کیا۔ میں واپس آ گیا۔ پھر چارہ قریب کیا تو دوبارہ گھوڑے نے انکار کیا۔ تیسری بار پھر کوشش کی مگر گھوڑا بدک کر دور ہو گیا۔ اور بدک جانا گھوڑے کی عادت نہ تھی۔ میں غمگین ہو کر واپس آ گیا اور خیمے کے ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگا کہ جب گھوڑے کی عادت بدلتی نظر آئی تو اس حالت میں میں خیمے کے ایک ڈنڈے سے ٹیک لگائے سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ گھوڑا میرے سامنے کھڑا ہے اور مجھے کہہ رہا ہے۔ تجھ پر قسم کھاتا ہوں کہ تو نے مجھ پر تین بار چارہ لادنا چاہا مگر کل گزشتہ تو نے جو میرے لیے چارہ خریدا تھا تو نے اس کی قیمت ادا کرتے وقت ایک کھوٹا درہم بھی دے دیا تھا۔ یہ کبھی نہ ہو گا۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں گھبرا کر اٹھا اور میں چارے والے کے پاس گیا اور کہا: "کل میں نے تجھ سے جو چارہ خریدا تھا اور تجھے دراہم دیے تھے وہ دراہم دکھاؤ۔" اس نے دراہم نکال کر سامنے رکھے۔ میں نے کھوٹا درہم لیا اور بدل کر صحیح درہم دے دیا اور یہ کہا: "کل میں تجھے ایک کھوٹا درہم دے گیا تھا۔" اور پھر چلا آیا۔

عبدالوہابؒ کا قول ہے:

"میں نے حضرت بشرؒ سے کھوٹا درہم چلانے کے بارے میں پوچھا۔"

فرمایا: "تو نے اس کی معافی کا پوچھا ہے؟"

پھر فرمایا: "میں نے حضرت ثوریؒ سے پوچھا تھا انہوں نے فرمایا: حرام ہے۔"

ابو داؤدؒ سے مروی ہے کہ میں نے امام احمد کو فرماتے سنا،

وہ کھوٹے سکے اور سر مگے سکے کے ساتھ تجارت و معاملہ پر انکار کرتے تھے۔ ہمارے بعض علماء کا فرمان ہے: "ایک کھوٹا درہم چلانا، ایک سو درہم چوری کرنے سے بدتر ہے۔"

فرمایا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سو درہم چرانے کا گناہ منقطع اور ایک دفعہ کا گناہ ہے اور کھوٹا پیسہ چلانا دین میں ایک بدعت و احداث ہے۔ ایک برے طریقہ کا اجرا ہے جس پر بعد والے عمل کریں گے اور مسلمانوں کا

مال خراب ہوگا اور ایک صدی یا اس سے بھی زیادہ مدت تک جب تک وہ کھوٹا درہم رہے گا اس پر گناہ رہے گا۔ یہ درہم ختم ہونے تک۔ جس قدر مسلمانوں کے اموال میں فساد آئے گا اور جتنی مدت تک یہ چلتا رہے گا اس کا بوجھ اسی کے سر پر ہے۔ اس آدمی پر خرابی ہے کہ جو مر جائے مگر اس کے گناہ ایک یا دو صدیاں جاری رہیں اور ان کی وجہ سے قبر میں سزا ملے تاآنکہ وہ ختم ہو تو جان کنی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ[۱] (اور لکھتے ہیں جو آگے بھیجا انہوں نے اور ان کے پیچھے نشان رہے)

مَاقَدَّمُوْا سے مراد جو انہوں نے عمل کیا اور اٰثَارَهُمْ سے مراد جو انہوں نے باتیں و رسُوم چلائیں، اور ان پر عمل کیا گیا۔ ایک جگہ فرمایا:

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ[۲] (انسان کو جتا دیں گے اس دن، جو آگے بھیجا اور جو پیچھے پڑا)

یعنی جو عمل آگے بھیجا اور جو طریقہ رائج کیا جس پر لوگوں نے عمل کیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے بُرا طریقہ ایجاد کیا اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو اس پر اس کا بوجھ ہے اور جس نے اس پر عمل کیا اس کے برابر بھی اس پر بوجھ ہے اور ان کے (بعد میں عمل کرنے والوں کے) گناہوں میں سے کچھ کمی نہ ہوگی۔"

جو آدمی سکہ سے واقف ہے اس کے لیے کھوٹا سکہ چلانا زیادہ سخت جرم ہے اور جو سکے سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا اس لیے کہ کچھ عذر بن سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ عمداً دھوکہ نہیں کر رہا اور پہلا آدمی عمداً دھوکہ نہیں کر رہا ہے اہل اسلام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اپنے بھائیوں کو دھوکہ سے بچانے کی خاطر وہ سکے کی خوب پہچان کرتے تاکہ کھوٹا سکہ دے کر دھوکہ نہ کریں ورنہ تو سکے کا علم سیکھنا ایک ابتلاء اور گناہ ہی ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس کا علم سیکھا، اب اس سے اس علم کے بارے میں پرسش ہوگی اور جس پر کوئی ٹکڑا واپس کر دیا جائے اسے چاہیے کہ اسے خرچ کر دے اور دوسری فروخت پر پیش نہ کرے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر و ثواب کی امید رکھے، اسے ہر ذرّہ پر ایک نیکی عطا ہوگی اور اگر اسے پھینک دے تو روزے اور نماز سے بھی زیادہ اعمال ملیں گے اور اگر سکہ میں ایسا حصہ بھی ہو کہ ایسا سکہ

---

[۱] یٰس ۱۲

[۲] قیمۃ ۱۳

بازار میں چلایا جاتا ہو اور اسی کے ساتھ یہ کچھ چیز خریدنا چاہے تو دوسرے فروخت کرنے والے کو بتا دے کہ یہ سکہ ایک آدمی نے واپس کیا تھا۔ اب اگر وہ آگاہ ہو کر لے لے تو کچھ ہرج نہیں اور اگر اُسے نہ بتایا تو اس نے اسے نصیحت نہیں کی اور دکاندار گاہے سکہ پہ زیادہ دھیان نہیں دیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

جس کے پاس کھوٹے دراہم آئیں وہ انہیں ہاتھ پہ رکھ کر بازار میں جس کے سامنے بیچے تو آواز دے:

"کھوٹے درہم پرکھ کر تلف کر لو" یہ اس صورت میں ہے کہ جب اس کا ظاہر کھوٹا ہو یعنی اور سکہ ہو جن کی کچھ قیمت ہوتی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ نے حضرت نافعؒ کو فرمایا:

"جیسے عکرمہؒ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یاد رکھتے ہیں۔ اگر تم مجھ سے یاد رکھو تو مجھے یہ اس بات سے زیادہ محبوب ہے کہ میرے پاس ایک کھوٹا درہم ہو۔"

کہا گیا: "آپ اسے صحیح سکہ نہیں بنا دیتے؟"

فرمایا: "ہاں، میرے دل میں یہی ہے۔"

حضرت نخعیؒ سے مروی ہے:

"جب درہم میں چاندی کا کچھ حصہ ہو، چاہے تھوڑا سا حصہ ہو تو کچھ ہرج نہیں۔"

ابو داؤدؒ سے مروی ہے، کہ میں نے اسحاق بن راہویہؒ سے کھوٹا سکہ چلانے کے بارے میں دریافت کیا، تو فرمایا:

"کچھ ہرج نہیں۔ اب اگر کھوٹا سکہ دکاندار کو معلوم ہو کہ یہ کھوٹا ہے تو اسے دینے میں رخصت ہے اور جو آدمی اجر حاصل کرنے کی خاطر کھوٹا سکہ لے اسے اس کا ثواب ملے گا۔"

اب اگر کھوٹا سکہ لے کر مسلمانوں میں چلایا تو یہ گناہ ہوا اور اس سے بہتر یہ ہے کہ درست سکہ لے۔ یہ ایسے اعمال ہیں کہ جو بظاہر بھلے معلوم ہوتے ہیں، مگر اندرونی طور پر ان میں بہت خرابیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہاں اگر کھوٹے سکے لے کر ضائع کر دے اور کسی دوسرے آدمی کو نہ دے۔ پھر یہ واقعی بڑی فضیلت اور نیکی کی بات ہے۔ اس پر بہت ہی اجر و ثواب کی امید ہے۔

ایک تاجر کو چاہیے کہ وہ کثرت سے صدقات کرتا رہے تاکہ اس کی قسموں، گناہوں اور جھوٹ کا کفارہ ہوتا رہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجروں کو صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

مقروض پر آسانی کرو تاجر اور دستکار کو چاہیے کہ ان تمام باتوں پر عمل کرے۔ یہ سب اعمالِ خیر کا

جامع طرزِ عمل ہے۔ اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کے طریق پر چلے۔ خریدے تو سخاوت سے کام لے، فروخت کرے تو بھی سخاوت سے کام لے۔ مطالبہ کرے تو حسنِ اخلاق رکھے اور جب ادا کرے تو بھی اچھے انداز پر دے۔ مقروض آدمی کو چاہیے کہ وہ خود جلد ادا کرنے کی کوشش کرے اور قرض خواہ کو بار بار مطالبہ کرنے پر مجبور نہ کرے۔ ایسا کرنا اس کیلئے باعثِ مشقت ہے۔ قرض خواہ بھی اپنے بھائی پر صبر کرے، تقاضا کرتے وقت حسنِ اخلاق سے پیش آئے اور فراخی تک اسے مہلت دے۔ ایسا کر کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو غنیمت جانے اور جو ایسا کرے اس کی تعریف کر کے اسے مزید ترغیب دے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا،
"درگزر کر، تجھ سے درگزر کیا جائے گا۔"

فرمایا، "لوگوں میں سے بہترین وہ ہے کہ جو بہترین طریق پر ادا کرے۔"

فرمایا: "اپنا حق احتیاط کے ساتھ لو۔ چاہے پورا کر رہا ہو یا پورا نہ کر رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ تیرا حساب آسان کر دے گا۔"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس بندے پر درگزر کرے جس نے فروخت میں درگزر کیا، خریداری میں درگزر کیا، ادائیگی اور مطالبہ پر حسنِ (اخلاق) سے کام لیا۔"

فرمایا: "جو اپنے قرض خواہ کا حق لے کر اس کی طرف چلا۔ فرشتوں نے اس پر سایہ کیا۔"

فرمایا، "جس نے تنگ دست کو مہلت دی یا معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اس پر حساب آسان کر دے گا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ اسے اس روز اپنے عرش کے سایہ تلے جگہ دے گا جس روز اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا ذکر کیا کہ ایک آدمی اپنی جان پر اسراف کرنے والا تھا اس کا محاسبہ ہوا تو ایک نیکی بھی نہ پائی گئی۔ اسے پوچھا گیا:

"کیا تو نے کوئی نیک کام کیا؟"

اس نے جواب دیا:

"نہیں، البتہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ خوشحال سے تسامح کرو، اور تنگ حال کو مہلت دو۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"تنگ حال سے درگزر کرو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تجھ سے اس بات کے زیادہ حقدار ہیں۔ چنانچہ اس کو

بخش دیا۔"

ایک روایت میں ہے :

"جس نے کسی کو ایک مدت تک قرض دیا تو اس کے لیے روزانہ اس مدت تک صدقہ کا اجر ہے اور جب مدت ختم ہوئی اور اس کے بعد اسے مہلت دی تو اس کے لیے روزانہ اس قرض کے برابر صدقہ کا ثواب ہے۔"

ایک حدیث میں ہے :

"جو قرض لے اور اس کی نیت ادا کرنے کی ہو، تو اللہ تعالیٰ اس پر ایسے فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے لیے دعا کرتے ہیں تا آنکہ وہ قرض ادا کر دیتا ہے۔"

سلف صالحینؒ میں سے بعض اس وجہ سے قرض لیتے کہ اس حدیث کی فضیلت حاصل کر سکیں اور ان کے پاس مال بھی ہوتا اور ایک جماعت سلف ایسی تھی کہ وہ یہ نہ چاہتے کہ ان کے مقروض قرض ادا کریں تاکہ وعدہ کی تاخیر کی باعث انہیں قرض کے برابر بموجب اس حدیث کے ثواب ملتا رہے۔

ایک حدیث میں ہے :

"میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر دس گنا ہے اور قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے۔"

ایک قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ محتاج اور غیر محتاج دونوں کے ہاتھوں میں آتا ہے اور قرض صرف محتاج ہی لے گا۔ جبکہ اسے ضرورت ہو گی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی ایک دوسرے آدمی کے ساتھ ہر وقت چپکا رہتا ہے۔ اس لیے کہ اس پر اس کا قرض تھا۔ آپؐ نے قرض خواہ کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کچھ حصہ معاف کر دو۔ اس نے معاف کر دیا۔ آپؐ نے مقروض کو فرمایا :

"اُٹھ اور ادا کر دے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے ایک مدتِ مقررہ تک کے لیے قرض لیا۔ وقت وعدہ آنے پر وہ قرض خواہ آیا اس وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مہیا نہ ہو سکا۔ وہ آدمی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کرنے لگا۔ اور تیز کلامی دکھائی۔ صحابہؓ نے اسے پکڑنا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا :

"اسے چھوڑ دو اس لیے کہ حقدار کو بات کا حق ہے۔"

معاینہ کا حکم

خرید و فروخت کرنے والوں میں خریدار زیادہ امداد کا مستحق ہے اور قرض خواہ و مقروض میں سے مقروض امداد کا زیادہ مستحق ہے۔ البتہ اگر قرض خواہ پر ظلم ہوتا ہو یا خریدار زیادتی سے کام لے رہا ہو تو پھر قرض خواہ اور فروخت کنندہ زیادہ قابلِ امداد ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

"دو بری گالی دینے والے سُود ہیں اور گالی دینے والوں نے جو کہا۔ وہ دونوں میں سے زیادتی کرنے والے پر ہے جب تک کہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔"

تجارتوں میں معمولی مغابنہ جائز ہے۔ اس لیے کہ تجارت کا مطلب ہی یہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ مغابنت (یعنی نفع) حاصل کیا جائے اور جب قیمتوں میں فرق ہو اور دھوکہ صاف معلوم ہو تو یہ مکروہ ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

"غافل کا غبن (چالاکی سے زیادہ نفع) حرام ہے۔"

ایک حدیث میں ہے جس میں بحث ہے کہ "مغبون آدمی نہ قابلِ تعریف ہے اور نہ قابلِ اجر ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تغابن ہو (کاروبار میں غفلت کرے) تو اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دے اور دوسرے کو ظلم کرنے پر آمادہ کرے۔ ایسا آدمی کسی اجر کا حقدار نہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ایاس بن معاویہؒ بصرہ کے قاضی اور ابنائے عصر میں بہت بڑے عالم و عاقل تابعی تھے۔ ان کے والد کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔

فرماتے ہیں:

"میں خب نہیں اور خب کا معنی ہے مغابنت نہ کرنے والا، یعنی محمد بن سیرینؒ۔" مگر حضرت حسن اور معاویہ بن قرہ مغابنت (یعنی کاروبار میں خسارے کی پرواہ نہ کرنا) کرتے تھے۔ حضرت زبیر بن عدیؒ فرماتے ہیں:

میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھارہ صحابہؓ کو دیکھا۔ ان میں سے ایک بھی ایک درہم کا گوشت اچھی طرح نہیں خرید سکتا تھا (یعنی دنیاداری سے غافل اور اللہ و آخرت کے شاغل اس شدت سے تھے)

حضرت حسنؓ نے چار سو درہم کا ایک خچر خریدا۔ جب سودا ٹھک گیا تو خریدار نے کہا:

"اے ابوسعید درگزر کیجئے۔"

فرمایا: "میں نے ایک سو ساقط کر دیے۔"

خریدار نے کہا: "اے ابوسعید احسان کیجئے۔"

فرمایا: "ایک سو مزید بخش دیے۔"

چنانچہ وہ درہم اپنے حق سے کم کر دیے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا:

"احسان کیجیے۔"

فرمایا: "میں نے تجھے دو سو درہم چھوڑ دیے۔"

کسی نے کہا: "اے ابوسعید، یہ تو نصف قیمت ہے۔"

فرمایا، "احسان ایسے ہی ہوتا ہے ورنہ نہ ہو۔"

حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما بلند ترین اسلاف میں سے ہیں۔ یہ قصداً مہنگی چیز خریدتے۔ پھر اس کے علاوہ کافی مال ہبہ کرتے۔ ان سے کہا گیا،

"آپ ذرا سی چیز پر کافی مال دیتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ مزید بہت سا مال ہبہ کرتے ہیں اور آپ کو پرواہ نہیں ہوتی؟"

فرمایا، "ہبہ کرنے والا، اپنا افضل عطا کرتا ہے اور مغبون آدمی اپنی عقل پر پردہ ڈالتا ہے۔"

ایک بزرگؒ کا فرمان ہے:

"میں اپنی عقل و بصیرت سے فریب کرتا ہوں" یا فرمایا، "اپنی واقفیت سے۔ اور غابن کو اس کی قدرت نہیں دیتا اور جب میں ہبہ کرتا ہوں تو اللہ کے لیے دیتا ہوں اور پھر بڑی سے بڑی چیز کو کثیر نہیں سمجھتا۔"

اس مفہوم میں بکثرت روایات آتی ہیں۔ اس کے فضائل بھی بہت زیادہ ہیں اور ان سب کا احاطہ کرنا ہمارا مقصود نہیں خلاصہ ذکر کر دیا اور یہ بھی نیکی و تقویٰ عدل و احسان میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر اس کا حکم دیا ہے۔

چیز کی خرابی ظاہر کر دے

انسان کو چاہیے کہ تجارت و صنعت اور ہر طرح کی خرید و فروخت میں برابر برابر نصیحت کرے۔ خریدار و فروخت کنندہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے صحیح صورت حال و مال رکھ دیں۔ سامان کے عیوب صاف بتا دیں اور خریدار کے سامنے ساری حقیقتِ حال واضح کر دینی چاہیے تاکہ دونوں کا علم برابر ہو اور ہر ایک دوسرے پر احسان کرنے والا ہو۔ حدیث میں ہے،

"بیع کرنے والے دونوں اگر سچ بولیں اور نصیحت کریں تو ان کی بیع (کاروبار) میں برکت ہوگی اور اگر دونوں نے جھوٹ بولا اور چھپا دیا تو برکت دونوں سے اٹھ جائے گی۔"

ایک حدیث میں ہے،

"دونوں شریکوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ جب تک وہ باہم خیانت نہ کریں۔ چنانچہ جب انہوں نے باہم خیانت کی تو ان دونوں سے ہاتھ اٹھا دیا۔"

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جریرؓ سے اسلام پر بیعت لی اور وہ واپس جانے لگے تو آپؐ نے ان کا کپڑا کھینچا اور ہر مسلمان کو نصیحت کرنے کی شرط لگا دی۔

بتاتے ہیں حضرت جریرؓ جب فروخت کے لیے سامان رکھتے تو اس کے عیوب دیکھ کر بتاتے اور پھر فرماتے:

"چاہو تو لے لو اور چاہو تو نہ لو۔"

ہم نے کہا: "اللہ آپ پر رحم کرے، اگر آپ ایسا کہیں گے تو مال فروخت نہ ہوگا۔"

فرمایا: "ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہلِ اسلام کو نصیحت کرنے پر بیعت کی ہے۔"

حضرت واثلہؓ بن اسقع کوفہ میں لوگوں کے پاس کھڑے تھے۔ ایک آدمی نے تین سو درہم میں ایک اُونٹنی فروخت کی۔ حضرت واثلہؓ کو اس کا علم نہ ہُوا اور وہ آدمی اُونٹنی لے کر چلا گیا۔ یہ اس کے پیچھے دوڑے اور اس کو آوازیں دے کر واپس کیا اور فرمایا:

"میاں، یہ اونٹنی گوشت کے لیے لی ہے یا سواری کے لیے؟"

اس نے کہا: "سواری کے لیے۔"

فرمایا: "اس کے پَیر میں ایک سوراخ (یا زخم) ہے جو میں نے دیکھا ہے۔ یہ مسلسل سفر نہیں کر سکتی۔"

بتاتے ہیں کہ اس نے اونٹنی واپس کی تو فروخت کرنے والے نے ایک سو درہم کم کر دیا اور پھر حضرت واثلہؓ سے کہنے لگا: "اللہ آپ پر رحم کرے آپؓ نے میرا سودا خراب کر دیا۔"

فرمایا: "ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے کہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ سودے کی خرابی ظاہر کیے بغیر اسے فروخت کر دے اور جو جانتا ہو اس کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ اس کو ظاہر نہ کرے۔

اس لیے مسلمانوں کو نصیحت کرنے کا دھیان رکھو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے۔ یہ چیز اگرچہ عام لوگوں پر دشوار بن رہی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے صحتِ اسلام کی شرط قرار دیا اور آپؐ اس پر بیعت لیا کرتے تھے۔ البتہ اسے فضائلِ دین میں فرمایا اور اہلِ تقویٰ کے قرب کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ فرمایا:

"دین نصیحت ہے۔ دین نصیحت ہے۔" تین بار فرمایا۔ پھر لوگوں کے مختلف طبقات پر برابری کی! اللہ کیلئے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور ائمہ اہلِ اسلام اور عوامِ مسلمانوں کے لیے۔"

ایک خبرِ مشہور میں ہے:

"لا اِلٰہ الا اللہ، مخلوق پر سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دُور کرتا رہے گا۔ جب تک کہ دنیا کے خسارے کو آخرت پر ترجیح نہ دیں گے۔"

ایک دوسری خبر میں ہے:

"جب تک اس کی پرواہ نہ کریں گے کہ دینی سلامتی کے ساتھ ان کی دنیا کم ہوئی اور جب ایسا کریں گے (یعنی دنیا کو ترجیح دیں گے یا دین کے مقابلہ میں دنیا کا زیادہ خیال رکھیں گے) اور پھر لا الٰہ الا اللہ کہیں گے تو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ فرمائے گا: تم نے جھوٹ بولا، تم سچے نہیں ہو!"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ان پر لوٹا دیا جائے گا۔"

ایک روایت میں اس اجمال کی تفسیر ہے:

"جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اخلاص کے ساتھ وُہ جنت میں داخل ہو گیا۔"

عرض کیا گیا: "اس کا اخلاص کیا ہے؟"

فرمایا: "تو اس کی اس سے حفاظت کرے جسے اللہ حرام فرماتا ہے۔"

ایک خبر مشہور میں ہے:

"وہ قرآن پر ایمان نہیں لایا جس نے اس کی محرمات کو حلال جانا۔"

ایک تابعیؒ سے روایت ہے فرمایا:

"اگر میں اس جامع مسجد میں جاؤں اور وہ نمازیوں سے بھرپور ہو تو مجھ سے پُوچھا جائے۔ ان میں سے کون بہتر ہے؟ تو میں کہوں گا: ان میں سے ان کے لیے سب سے زیادہ نصیحت کرنے والا ہی بہتر ہے۔" اور جب کہیں کہ "یہ؟" تو میں کہوں گا: "یہ بدتر ہے۔"

مسلمانوں پر کاروبار اور صنعت میں دھوکہ کرنا حرام ہے اور جو آدمی کثرت سے یہ کام کرے وہ فاسق یعنی بدمعاش ہے اور دھوکہ کی صورت یہ ہے کہ چیز کا عمدہ تر حصّہ خریدار کے سامنے کر دے یا عمدہ تر کپڑا دکھائے یا صنعت کا وُہ حصّہ ظاہر کرے جو بہتر ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے (گندم وغیرہ کے) ڈھیر کے پاس سے گزرے جو فروخت کی جا رہی تھی اس کا ظاہر خُوب تھا۔ آپؐ نے ہاتھ اندر داخل کیا تو تراوت دیکھی۔ فرمایا:

"یہ کیا ہے؟"

اس نے کہا: "بارش پڑ گئی تھی۔"

فرمایا: "تو نے اسے غلے کے اُوپر کیوں نہیں کیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیتے؟ جو دھوکہ دے وہ مجھ سے نہیں۔"

حضرت عبداللہ بن ربیعہؓ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے، آپؐ کو شُبہ ہُوا تو آپؐ نے ہاتھ اندر ڈالا تو وُہ بارش زدہ تھا۔

فرمایا: "یہ کیا ہے؟"

"اللہ کی قسم، اے اللہ کے رسولؐ! یہ ایک ہی کھانا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"تُو نے اسے کیوں نہ ایک ہی کر دیا تاکہ لوگ تیرے پاس آتے تو ایسی چیز خریدتے جس کو پہچانتے ہوتے۔ جس نے ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔"

میرے ایک بھائی بتاتے ہیں کہ ایک موچی آیا اور پوچھا کہ میں جوتوں کے کاروبار میں کیسے سلامت رہوں؟" فرمایا:" پہلا نیا بنا۔ دونوں کو یکساں بنا۔ دونوں طرف ایک جیسا مال لگا۔ دائیں طرف والا ٹیڑھا نہ ہو۔ اندرونی اشیاء اور سلائی وغیرہ سب میں یکسانیت رکھ اور ایک جوتے کو دوسرے پر نہ رکھ۔"

فروخت کنندہ اور صنعت کار پر لازم ہے کہ فروخت کی جانے والی چیز اور بنی ہوئی چیز کی سب سے بدتر حالت کو اور کم تر صورت کو بھی گاہک کے سامنے کر دے تاکہ خریدار اور بنوانے والا اس پر آگاہ ہو جائیں اور دونوں دیکھ سمجھ کر چیز لیں۔

ابن سیرینؒ نے ایک بکری فروخت کی تو خریدار کو فرمایا:

"میں اس میں ایک عیب سے بری ہوں۔"

اس نے پوچھا: "وہ کیا ہے؟"

فرمایا: "یہ پاؤں کے ساتھ چارہ الٹتی پلٹتی ہے۔"

حضرت حسن بن صالحؒ نے ایک لونڈی فروخت کی۔ خریدار کو فرمایا:

"ہمارے پاس ایک بار اسے کھانسی میں خون آیا تھا۔" اس طرح باریک باریک نقائص بھی واضح کر دیا کرتے جن کو خریدار یا استعمال کرنے والا نہ سمجھتا۔ یہ نصیحت و صدق کی بات ہے۔ خرید و فروخت، صنعت اور اجارات میں اس قسم کی احتیاط سے مال خوب حلال و عمدہ تر ہو جاتا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ ان سب مکروہات و محرمات سے بچے۔ سلف صالحین کی یہی سیرت و طریقہ ہے۔

حرام مال والے کے پاس چیز فروخت نہ کرے

مستحب یہ ہے کہ خرید و فروخت میں دیندار اور متقی لوگوں کے ساتھ ہی کاروبار کرے اور جو آدمی اس سے خریداری اور کاروبار کرنا چاہے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ جو آدمی حرام سے پرہیز نہ کرتا ہو یا جس کے پاس زیادہ تر مشتبہ مال ہو اس کے پاس چیز فروخت کرنا سخت مکروہ ہے۔

ابن مبارکؒ کے بھانجے محمد بن شبیبہؒ نے مجھے بتایا کہ ابن مبارکؒ کے غلام نے انہیں خط لکھا کہ ہم ایسے لوگوں سے کاروبار کرتے ہیں جو بادشاہ سے بھی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ تو ابن مبارکؒ نے لکھا:

جب ایک آدمی بادشاہ اور دوسرے لوگوں سے کاروبار کرتا ہو اس سے کاروبار کرو۔ اگر وہ کچھ رقم ادا کرے تو لے لو۔ ہاں البتہ اگر تجھے ٹھیک معلوم ہو کہ جو رقم ادا کر رہا ہے یہ حرام کا مال ہے تو مت لو۔ اور اگر وہ آدمی صرف بادشاہ سے کاروبار کرتا ہے تو اس کے ساتھ کاروبار مت کرو۔

خلف صالحینؒ میں سے ایک بزرگؒ کا فرمان ہے: "لوگوں پر ایسا زمانہ گزرا ہے کہ ایک آدمی بازار میں آتا اور

وُہ پُوچھتا کہ میں کس آدمی کے ساتھ معاملہ کروں جو اہلِ صدق اور اہلِ وفا میں سے ہو؟"

جواب ملتا: "جس کے ساتھ چاہو معاملہ کرو۔"

پھر ان پر وہ وقت آیا کہ آدمی پُوچھتا ہے "میں کس آدمی کے ساتھ معاملہ کروں؟" تو اسے بتایا جاتا ہے "کہ فلاں فلاں کے سوا جس کے ساتھ چاہو معاملہ کرو۔"

پھر فرمایا: "آج ہم اس دور میں ہیں کہ جب پُوچھا جائے۔ میں کس سے معاملہ کروں؟ تو کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں سے معاملہ کرو اور بس۔ مجھے خطرہ ہے کہ لوگوں پر ایسا وقت آئے گا کہ یہ فلاں فلاں بھی ختم ہو جائے گا۔"

چنانچہ کاروبار میں نہ قسم اٹھائے، نہ جھوٹ بولے، نہ وعدہ خلافی کرے اس لیے کہ جھوٹی قسم کاروبار کو تباہ کر دیتی ہے۔

فرمایا گیا: "اس تاجر کے لیے ہلاکت ہے جو کہے: نہیں، اللہ کی قسم، ہاں اللہ کی قسم اور اس دستکاری کیلئے بربادی ہے کہ جو کہے، آج نہیں کل پرسوں۔"

ابو عمر شیبانیؒ نے حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تین ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر نہیں کرے گا، متکبر آدمی، دے کر احسان جتلانے والا اور قسم کھا کر اپنا مال فروخت کرنے والا۔"

جب مال فروخت کرے یا چیز بنا کر دے تو اس کی تعریف نہ کرے اور جب خریدے یا بنوائے تو اس کی مذمت نہ کرے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے رزق میں اضافہ نہیں ہوتا اور ایسا نہ کرنے سے رزق میں کمی نہیں ہو جاتی۔ رزق تو یقینی ہے۔ البتہ ایسا کرنے سے گناہوں میں اضافہ اور دین میں کمی آ جاتی ہے۔

تاجر کے لیے بعض ہدایات

صنعت کار پر لازم ہے کہ وہ اپنی معلومات کے مطابق بہترین کام کرے۔ اعلیٰ معیار کی پختہ اور دیر تک چلنے والی چیز تیار کرے۔ وُہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ چیز کتنا عرصہ رہ سکتی ہے اور کب تک خراب ہو جائے گی۔ عام صارفین ان معلومات سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اس لیے دستکار کو دیانت داری، پختہ اور بہتر کام کرنا چاہیے تاکہ وہ محاسبہ سے بچ جائے ورنہ ان پر پُرسش ہوگی کہ تم (تاجر و صانع) نے اپنے علم پر کس قدر عمل کیا جبکہ انہیں تجارت و صنعت کا علم ہو اور ان اشیاء کے ساتھ دنیا دی سلطنت آراستہ و آباد ہوتی ہے۔ اب جس طرح دین و ایمان کے علم ہونے پر سوال ہوگا کہ کیا عمل کیا۔ ان پر بھی سوال ہوگا، اس لیے کہ دنیاوی امور کے سلسلہ میں انہیں عقل و امتیاز ملی ہے۔ اب ان پر ایسی پابندیاں و عبادات بھی لازم ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر مقیم پڑوسی کسی کی تعریف کریں اور سفر کے ساتھی بھی تعریف کریں اور بازاروں میں اس سے معاملہ کرنے والے بھی تعریف ہی کریں تو پھر اس کی نیکی کے بارے میں

کوئی شکایت نہ کرو۔

ایک آدمی نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے گواہی دی۔ انہوںؓ نے فرمایا: "ایسا آدمی لاؤ، جو تمہیں پہچانتا ہو۔"

وہ ایک آدمی لے کر آیا اس نے اس کی خوب تعریف کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا:
"تو اس کا قریب ترین پڑوسی ہے جو اس کے باہر اندر آنے جانے سے بھی آگاہ ہو؟"
اس نے کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "کیا تو نے اس کے ساتھ سفر کیا ہے کہ سفر کی مصاحبت میں انسان کے مکارمِ اخلاق کا پتہ چلتا ہے؟"
اس نے کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "کیا تو نے اس کے ساتھ درہم و دینار کا معاملہ کیا ہے کہ جس سے انسان کے تقوی کا پتہ چل سکے؟"
اس نے کہا: "نہیں۔"

فرمایا: "میرا گمان یہ ہے کہ تو نے اسے مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ کہ وہ سر جھکاتا ہے اور کبھی اوپر کو اٹھاتا ہے۔ وہ خوب لَے کے ساتھ قرآن پڑھ رہا ہوگا؟"
اس نے کہا: "ہاں۔"

فرمایا: "جاؤ تو اسے نہیں جانتا۔"

ایک بار فرمایا: "تو وہ بات کہہ رہا ہے جو نہیں جانتا۔" پھر اس آدمی کو حکم دیا:
"جاؤ، وہ آدمی لاؤ جو تجھے جانتا ہو۔"

سلف صالحین میں تاجروں کی یہ حالت تھی کہ تاجر کے پاس دو دفتر ہوتے۔ ایک میں کسی نامعلوم زبان میں ان فقراء اور کمزور لوگوں کے نام درج ہوتے جنہیں وہ نہیں جانتا۔ یہ مسکین آدمی کوئی کھانا دیکھتا اور اب وہ کھانا چاہتا یا اسے اس کی ضرورت ہوتی مگر اسے خریدنے کی استطاعت نہ ہوتی تو دکاندار سے کہتا: "مجھے اس میں سے پانچ یا دس رطل درکار ہیں مگر میرے پاس اس کی قیمت نہیں۔" تو دکاندار کہتا:

"فراخی تک لے لو اور جب مل جائے تو ادا کر دینا۔" اور اس کا نام غیر معلوم لوگوں کے دفتر میں لکھ دیتا اور جو بلند پایہ مسلمان تھے وہ یہ بھی ذکر نہ کرتے بلکہ نیک دل تجار تو اس کا نام بھی نہ لکھتے اور نہ ہی اس پر طے شدہ قرض قرار دیتے بلکہ کہا کرتے:

"جس قدر ضرورت ہو لے جاؤ، مل جائے تو ادا کر دیں اور اگر نہ ملے تو معاف کر دیا۔ اس کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرنا۔" یہ طریق ختم ہو چکا جو اس پر چلا۔ اس نے اسے زندہ کیا۔ متقدمین میں ایسے لوگوں کی تعداد شمار د

تحریر سے باہر ہے اور ایسے لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی، درگزر سے کام لیا اور سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ان سے بھی زیادہ ہیں۔ ہم نے غافلین کو بیدار کرنے کے لیے اور ان کا نشا شدہ طریق بتانے کے لیے مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اس زمانہ میں بلند پایہ نہ تھے بلکہ عوام کا یہ حال تھا اور بلند پایہ زاہدین و عابدین کا یہ حال تھا کہ بازار میں آتے۔ جب دن بھر کے خرچ کے لیے آمدنی ہو جاتی تو دکان بند کر دیتے۔ اور عبادت میں مصروف ہو جاتے۔ بعض سلفؒ کا یہ حال تھا کہ ظہر کے بعد دکان کھولتے۔ نصف دن رب تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے، اور بعض عصر کے بعد دکان بند کرتے اور باقی وقت آخرت کے لیے لگاتے۔ بعض کا یہ حال تھا کہ دکان کھولی، دن بھر کے اخراجات کے مطابق آمدنی ہوئی تو دکان بند کر کے اپنے گھر میں یا مسجد میں چلے گئے اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ بعض ایسے نیک بندے بھی تھے ایک دانق یا ایک قیراط کما کر ہی دکان بند کر دیتے۔ بعض زہد و قناعت اور دنیا پر کمی حرص کی وجہ سے قلیل تر آمدنی کو کافی سمجھتے۔ اور پھر عبادت میں مصروف ہو جاتے۔

اس سے عجیب تر واقعہ حماد بن سلمہؒ کے بارے میں ہے کہ وہ ٹوکری میں گوشت رکھ کر فروخت کرتے۔ جب دو حبہ نفع ہوتا تو ٹوکری اٹھاتے اور چلے جاتے۔

حضرت ابراہیم بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابراہیم بن ادھمؒ سے کہا:

آج میں گارے مٹی کا کام کروں گا۔"

فرمایا:" اے ابن یسار، تو طالب و مطلوب ہے تو اسے طلب کر رہا ہے جو تجھ سے رہے گی نہیں۔ اور وہ تجھے طلب کر رہی ہے جو تجھ سے چھوٹے گی نہیں (یعنی مل کر رہے گی) کیا تو نے لالچی کو محروم اور کمزور کو رزق دیا ہوا نہیں دیکھا؟

میں نے عرض کیا،

"سبزی فروش کے پاس میرا ایک دانق (پیسہ) رکھا ہے۔"

فرمایا،" تجھ پر بڑی مشکل ہے۔ خدا کے بندے ایک دانق کا مالک ہو کر مزدوری کرتے ہو (یعنی یہ دنیا کافی ہے اب عبادت کرو)۔"

کئی صنعت کار ایسے تھے کہ وہ نصف دن یا دن کا دو تہائی حصہ کام کرتے۔ پھر مسجد میں چلے جاتے۔ بعض ایسے بھی گزرے ہیں کہ وہ ہفتہ میں ایک یا دو دن کام کرتے اور باقی سارا ہفتہ مولائے کریم کی عبادت میں مصروف رہتے۔ سلفؒ کا طریقہ تھا کہ دن کے آغاز و اختتام پر اللہ کی عبادت کرتے اور آخرت کا ذخیرہ جمع کرتے اور دن کے وسط میں دنیا کی تجارت کرتے۔ حدیث میں ہے:

"جب فرشتے انسان کا اعمال نامہ لے کر چڑھتے ہیں اور ان میں دن کے آغاز و انجام میں بھلائی اور ذکر اللہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں (حصوں) کے درمیان کے گناہوں کا اسے کفارہ بنا دیتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے:

"طلوعِ فجر کے وقت رات اور دن کے فرشتے باہم ملاقات کرتے ہیں۔ رات کے فرشتے جا رہے ہوتے ہیں اور دن کے فرشتے اُتر رہے ہوتے ہیں اور (اسی طرح) عصر کے وقت (ملاقات کرتے ہیں) کہ رات کے فرشتے اُترتے ہیں اور دن کے فرشتے واپس جاتے ہیں تو اللہ عزوجل فرماتا ہے: تم نے میرے بندوں کو کس (حال) میں چھوڑا؟"

وہ عرض کرتے ہیں:

"ہم نے انہیں نماز پڑھتے چھوڑا اور ہم ان کے پاس گئے تو بھی نماز پڑھ رہے تھے۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے بازار میں سے گزر رہے تھے ان کے ہاتھ میں دُرّہ تھا اور فرما رہے تھے:

"اے تاجروں کے گروہ، حق لو اور حق دو، تم سلامت رہو گے اور تھوڑا نفع رد نہ کرو ورنہ تم حق رد کر کے اس (تھوڑے نفع سے) زیادہ سے محروم ہو جاؤ گے اور کئی گنا (مال) باطل طور پر (بے کار) ضائع ہو جائے گا۔

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے پوچھا گیا:

"آپ کی فراخی و امارت کی کیا وجہ ہے؟"

فرمایا: "تین اسباب ہیں:

۱۔ میں نے نفع کبھی رد نہیں کیا (جو نفع ملا لے لیا)

۲۔ مجھ سے جس جانور کو فروخت کرنے کا مطالبہ ہوا میں نے تاخیر نہیں کی۔

۳۔ اور میں نے ادھار فروخت نہیں کیا۔"

بتاتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہزار اونٹنیاں فروخت کیں تو صرف ان کی رسیاں نفع میں بچیں۔ چنانچہ انہوں نے ہر رسی ایک درہم میں فروخت کر دی اور دو ہزار درہم نفع حاصل کیا۔ ایک ہزار سے لیا اور ایک ہزار ان پر ان کا خرچہ تھا۔

اہلِ ورع لوگ تجارت کی غرض سے بحری سفر ناپسند کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جس نے تجارت کی غرض سے بحری سفر کیا اس نے تلاشِ رزق میں انتہا کر دی۔

ایک روایت میں ہے:

"سمندر کا سفر صرف حاجی یا غازی یا عمرہ کرنے والا ہی کرے۔"

حضرت زید بن وہبؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ وہ فرمایا کرتے:

"یتیموں کے اموال سے کاروبار کرو، انہیں زکوٰۃ ختم نہ کر دے اور ان کے لیے نفع کا پھل نکالو۔ جانور سے بچو

ڈگمگا کر آئے تو بیچ (و) اس لیے کہ بسا اوقات یہ ہلاک ہو جاتا ہے اور سمندری لہروں سے بچو۔ ان میں ان کا مال آخر کار اسی میں ہی ڈوب گیا۔

حضرت عمرو بن عاصؓ فرمایا کرتے:

"بازار میں پہلا داخل ہونے والا نہ بن اور نہ سب سے آخر میں نکلنے والا بن۔ اس لیے کہ یہیں شیطان نے انڈے اور چوزے دیے۔"

حضرت معاذ اور عبداللہ عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے:

"ابلیس نے اپنے بیٹے زلنبور سے کہا: اے زلنبور! اپنی دونوں کتابیں لو اور تو بازار والا شیطان ہے قسم کھانے، جھوٹ بولنے، دھوکہ اور مکر کرنے، خیانت کرنے اور وعدہ خلافی کرنے کو آراستہ و مزین کر، اور جو بازار میں پہلے آئے اس کے ساتھ ہو جا اور جو سب سے آخر میں جائے اس کے ساتھ ہو جا۔"

حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا:

"آپ ابتدائے دن میں بازار میں داخل ہونے کو منع فرماتے اور اہل (سوق) میں سب سے آخر میں نکلنے کو منع فرماتے۔"

اب اگر بازار کے تاجر لوگ ان اعلیٰ اور قابلِ ستائش صفات کے حامل ہوں، تجارت میں احکامِ شرع کی پابندی کریں تو ایسا تاجر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے۔ اس کے افعال و آثار نیکیاں ہیں۔ اور جو چیز بھی آخرت میں مددگار اور آخرت کا ذخیرہ ہونے کا سبب ہو وہ آخرت کی چیز ہے۔

اور اگر مندرجہ بالا شرائط کا اہتمام نہ کرے۔ علمِ دین پر عمل پیرا نہ ہو۔ کاروبار میں تقویٰ سے علیحدگی اختیار کرلے۔ یا دنیا کی کثرت و لالچ کی فکر میں رہے، جو دنیا رہ جائے اس پر واویلا کرنے والا ہو۔ جو مال پاس ہے اسے مستقل سمجھے۔ دنیا کی سلامتی پر خوش رہے اور دین کے ضائع ہونے کی پرواہ نہ کرے۔ اس کا خیال نہ ہو کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کر دیا تو ایسا آدمی گناہوں اور نافرمانیوں میں قلابازیاں کھا رہا ہے۔ اللہ کی ناراضگی کا شکار ہے خدا سے بُعد و فرار کی راہ پر ہے۔ موت کی تیاری نہیں کر رہا اور نہ ایسے آدمی کو محاسبہ کا یقین کرنے والے کی طرح ہے۔ اس کے افعال و آثار گناہ ہیں۔ ان حالات میں اس کے لیے تجارت سے علیحدگی اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔

تجارت و صنعت کے متعلق

روایات و طرقِ صالحین

حضرت علقمہؓ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو اہل اسلام کے شہروں میں کسی ایک شہر میں مالِ تجارت لے کر آئے۔ پھر اس روز کے نرخ پر فروخت کرے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے لیے ایک شہید کا ثواب ہے" پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی:

وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1] (اور کتنے اور پھرتے ملک میں ڈھونڈتے اللہ کا فضل اور کتنے اور لڑتے اللہ کی راہ میں)

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

"چونگی وصول کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔"

حضرت ابوصالحؒ نے حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کنجوس آدمی جنت میں نہیں جائے گا۔"

ہشام بن عروہؒ سے مروی ہے:

بنو جرہم قبیلہ کے ایک معمر آدمی کا حضرت معاویہؓ کے سامنے ذکر ہوا۔ انہوں نے اسے بلایا اور پوچھا:

"تو کس قبیلہ کا آدمی ہے؟"

کہا: "جرہم سے ہوں۔"

فرمایا: "تم کتنے سال شمار کرتے ہو؟"

کہا: "تین سو پچاس برس۔"

فرمایا: "بتاؤ کون سا مال افضل ہے؟"

کہا: "نرم زمین میں سست رفتار چشمہ ہو۔ کفایت کرے اور احتیاج پیدا نہ کرے۔"

فرمایا: "پھر کیا؟"

کہا: "گھوڑی کے پیٹ میں گھوڑا، اس کے پیچھے گھوڑا ہو۔"

فرمایا: "تم اونٹوں اور بکریوں کا ذکر نہیں کرتے۔"

---

[1] سورۃ المزمل آیت ۲۰

کہا: "یہ آپ جیسے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے موزوں ہیں جو خود ان کی نگہداشت کرے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

" مسلمان کا بہترین مال سکۃ مابورہ (کھجوروں کا پیوند شدہ باغ) ہے یا مہر مامورہ (زیادہ بچے دینے والی گھوڑی) ہے۔"

سکۃ مابورہ سے مراد وہ کھجور ہے جس کے شگوفے نکل آئے ہوں یعنی پختہ باغات اور مہر مابورۃ سے مراد زیادہ بچے دینے والے چوپائے ہیں۔

فرمان الٰہی ہے،

اَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا۔

یعنی ہم نے انہیں زیادہ کردیا۔ کہا کرتے ہیں:

امر القوم یعنی قوم کی کثرت ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن احمد سے مروی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے ہاں سے میرے پاس تین لاکھ دینار آئے اور ان میں سے میرے پاس صرف آٹا، بکریاں اور سامانِ خانہ ہے۔ مجھے اس پر حیرانی ہوئی۔ میں حضرت کعب احبارؓ سے ملا تو یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا،

میاں کھجوروں کی بات کہاں رکھ دی؟ ہم اسے کتاب اللہ میں پاتے ہیں۔ محل و مقام میں کھلانے والی اور کیچڑ میں پختہ رہنے والی، بہترین مال کھجور ہے۔ اس کو فروخت کرنے والا برباد ہونے والا ہے۔ اس کو خریدنے والا روزی حاصل کرنے والا ہے۔ جو اسے فروخت کرے پھر اس کی قیمت اسی جیسے مال میں نہ ڈالے۔ اس کی مثال راکھ کی ایسی چٹان کی طرح ہے کہ تیز آندھی کے دن ہوا تیز ہوئی تو وہ گھبرا کر بڑھا اور کھجوریں فروخت کر کے خالی ہاتھ بیٹھ گیا۔ فرمایا،

مروان بن حکم نے وہب بن اسود سے پوچھا،

" مروت کیا ہے؟"

فرمایا: " والدین سے نیکی کرنا اور مال کی اصلاح کرنا۔"

عبدالقدوس بن عبدالسلام سے مروی ہے: فرمایا کہ ابراہیم بن ادھمؒ نے عباد بن کثیر کی طرف لکھا:

" اپنے طواف، سعی اور اپنے حج کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی نیند جیسا سمجھو۔"

حضرت عبادؒ نے ابراہیمؒ کی طرف لکھا،

" اپنا سرحد پر پڑاؤ ڈالنا اور غزوہ اس کی نیند کی طرح سمجھ کر جو اپنے عیال پر حلال روزی کی خاطر مشقت اٹھا رہا ہے۔"

حضرت عباسؒ سے مروی ہے کہ میں نے احمد بن ثور کو فرماتے سنا:

ایک آدمی نے ابراہیم بن ادھمؒ کے ساتھ صنوبر تک رفاقت کی اور عرض کیا:

"اے ابو اسحٰق! مجھے وصیت کیجئے۔"

فرمایا: "زیادہ کر اور اختصار رکھ۔"

کہا: "عمرہ کرنے والا حاجی، پہرہ دینے والا غازی، روزہ دار اور قیامِ شب کرنے والا ہمارے نزدیک اس سے افضل نہیں جو اپنے آپ کو لوگوں سے مستغنی کر دے۔"

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو فرمایا:

"اے بیٹے! دنیا سے ضرورت کے مطابق لو اور اسے بالکل مسترد نہ کر دے ورنہ تو لوگوں پر بوجھ بن جائے گا۔"

خود کمانے کی اہمیت

حضرت شاذانؒ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت حسن بن حیؒ سے کاروبار کے بارے میں کچھ پوچھا تو فرمایا:

"اگر تو نے اس اس طرح کا خیال کیا تو فرات کا پانی بھی تجھ پر حرام ہو جائے گا۔"

پھر فرمایا:

"حلال کی تلاش کرنا جنگ کی ملاقات سے بھی شدید تر ہے۔"

حضرت ہیثم بن جمیلؒ سے مروی ہے کہ ابن مبارکؒ نے فرمایا:

"خشکی اور تری پر سفر کر کے بھی لوگوں سے مستغنی ہو جا۔"

حضرت ہیثمؒ نے فرمایا:

"بسا اوقات میرے بارے میں ایک آدمی کا قول مجھ تک پہنچتا ہے اور میں اپنے آپ کا استغنا یاد کرتا ہوں تو پھر مجھ پر خفیف ہو جاتا ہے۔"

حضرت حماد بن زیدؒ سے مروی ہے کہ ایوبؒ نے فرمایا:

"جس کمائی میں کچھ خرابی سی ہو، میرے نزدیک یہ لوگوں کے احتیاج سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

ابن ابی الدنیا سے روایت کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے اور فرمایا کہ عمر بن عبد اللہؒ نے یہ کہے ہیں ؎

تَنَقُّلُ الصَّخْرِ مِنْ قُلَلِ الْجِبَالِ   اَخَفُّ عَلَیَّ مِنْ مِنَنِ الرِّجَالِ

یَقُوْلُ النَّاسُ کَسْبٌ فِیْہِ عَارٌ   فَقُلْتُ الْعَارُ فِیْ ذُلِّ السُّؤَالِ

(لوگوں کے احسانات کے مقابلہ میں مجھے پہاڑوں کی چوٹیوں سے چٹانیں منتقل کرنا آسان ہے)

(لوگ کہتے ہیں اس کام میں ذلت ہے۔ میں کہتا ہوں مانگنے میں ذلت و شرم ہے۔)

موسیٰ بن طریف بتاتے ہیں کہ ابراہیم بن ادھم بحری جہاز میں سوار ہوئے۔ سمندر میں طوفان آگیا اور موت سامنے نظر آنے لگی۔ لوگوں نے کہا:

"اے ابو اسحٰق، دیکھ رہے ہو۔ ہم کس مصیبت میں ہیں؟"

فرمایا: "یہ بھی کوئی مصیبت ہے؟"

لوگوں نے کہا: "تو پھر مصیبت کیا ہوتی ہے؟"

فرمایا: "لوگوں کا احتیاج مصیبت ہے۔"

ایک عالم نے ایک ادیب کے اشعار ذکر کیے ؎

لَمَوْتُ الْفَتیٰ خَیْرٌ مِنَ الْبُخْلِ لِلْفَتیٰ ، وَ لِلْبُخْلُ خَیْرٌ مِنْ سَوَالِ الْبَخِیْلِ

فَلَا تَجْعَلَنَّ شَیْئاً لِوَجْھِكَ قِیْمَۃً وَ لَا تَلْقَ مَخْلُوْقاً بِوَجْہِہٖ ذَلِیْلٍ

وَ لَا تَسْئَلَنَّ مَنْ کَانَ یَسْأَلُ مَرَّۃً فَلِلْفَقْرِ خَیْرٌ مِنْ سَوَالِ سُئُوْلِ

(نوجوان کا بخیل ہونے سے مرنا بہتر ہے ، اور بخیل کے سوال سے بخل)

(اپنے چہرہ (عزت) کی کچھ قیمت نہ کرو ، اور ذلیل چہرہ لے کر مخلوق کو نہ ملو۔)

(ہرگز نہ مانگ، جو ایک بار سوال کرتا ہے ذلیل ہوتا ہے اب مانگنے سے فقر بہتر ہے)

ایک شیخ کے اشعار مروی ہیں ؎

اِذَا عَدَّتَ الْاٰفَاتِ فَالْبُخْلُ شَرُّھَا وَ شَرٌّ مِنَ الْبُخْلِ الْمَوَاعِیْدُ وَ الْمَطَلِ

وَ لَا خَیْرَ فِیْ وَعْدٍ اِذَا کَانَ کَاذِبًا وَ لَا خَیْرَ فِیْ قَوْلٍ اِذَا لَمْ یَکُنْ فِعْلٌ

(جب تو آفات شمار کرے تو بخل بدترین ہے اور بخل سے بدتر وعدے اور)

(جب وعدہ جھوٹا ہو تو اس میں کچھ بھلائی نہیں اور ایسے قول میں کچھ بھلائی نہیں کہ جس پر عمل نہ ہو)

بعض سے یہ اشعار مروی ہیں ؎

اِذَا کُنْتَ لَا بُدَّ مُسْتَطْعِمًا فَمِنْ غَیْرِ مَنْ کَانَ یَسْتَطْعِمٗ

فَاِنَّ الَّذِیْ کَانَ مُسْتَطْعِمًا اِذَا ذَکَرَ الْجُوْعَ لَا یُطْعِمٗ

(اگر تجھے کھانا مانگنا ہی پڑے تو اس سے علاوہ سے مانگ جو خود مانگتا ہے۔)

(اس لیے کہ جو خود بھکاری ہے۔ جب وہ بھوک کو یاد کرے گا تو کھلائے گا نہیں)

بعض کے اشعار ہیں ؎

مَا خُلِقَتْ حَوَاءُ اَحْمَقُ لِحْیَۃً ﷺ مِنْ سَائِلٍ یَرْجُوْا الْغِنیٰ مِنْ سَائِلٍ

حضرت زید بن اسلمؒ سے مروی ہے کہ محمد بن مسلمہؓ ایک زمین میں بیٹھے کھجوریں بو رہے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور فرمایا:

"اے محمد، کیا کر رہے ہو؟"

انہوں نے کہا، "آپ کا کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔ لوگوں سے مستغنی رہو۔ یہ آپ کے دین کے لیے زیادہ بچاؤ کی بات ہے اور لوگوں کے نزدیک قابلِ احترام ہے۔ دیکھیے: احیحۃ بن جلاح کا شعر ہے ؎

فَلَنْ اَزَالُ عَلَی الزَّوْرَاءِ اَعْمُرُھَا — اِنَّ الْحَبِیْبَ اِلَی الْاِخْوَانِ ذُو الْمَالِ

(میں ہمیشہ زوراء کو آباد کرتا رہوں گا۔ احباب کا دوست مالدار ہی ہوتا ہے)

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"چونکہ وصول کرنے والا تیرے درہم کے پیچھے پڑا ہے۔ اس لیے کہ مغبون (لاپرواہ دراہم سے) نہ قابلِ مدح ہے اور نہ ہی قابلِ اجر ہے۔"

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جب تُو نے اپنے ساتھی کو کہا، 'نیکی و احسان کر' اس نے احسان کیا تو یہ بھی صدقہ ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰن بتاتے ہیں کہ ابراہیم بن ادھمؒ اور ان کے اصحاب ماہِ رمضان میں مسجد میں تھے جب امام نے سلام پھیرا تو ایک آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوال کیا تو اُسے کچھ نہ ملا۔ جب رات کا کھانا سامنے آیا، تو حضرت ابراہیمؒ کے اصحاب نے کہا،

"ہم اسے بھی بُلا لیں؟"

فرمایا: "اسے دعوت نہ دو۔ وہ رات کو بھوکا رہا۔ جب صبح ہوئی تو ابراہیمؒ کے رفقاء میں سے ایک آئے اور کہا: اے ابو اسحٰق! رات جس سائل کو آپ نے دیکھا تھا آج اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا تھا۔"

فرمایا: "تم جانتے ہو، میں نے اسے دعوت میں بلانے سے کیوں منع کیا تھا؟ میرے دل میں خیال آیا کہ اس نے اب سے پہلے کبھی نہیں مانگا تھا۔ اب اس کو رات کے کھانے پر دعوت دینا اس لیے مکروہ خیال کیا کہ کہیں یہ تمہارے کھانے پر توکل نہ کر لے۔"

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ اس آدمی نے ابراہیمؒ سے کہا:

"صبح کیسے کی؟"

فرمایا: "بخیریت ہوں جب تک میرا بوجھ دوسروں کے ذمہ نہ ہو۔"

حضرت موسیٰ بن طریف فرماتے ہیں کہ "ابراھیم بن ادھمؒ جب کسی کے ساتھ کام کرتے تو قیمت کم کرانے کیلئے جھگڑتے نہیں تھے۔"

یوسف بن یوسف بن سعید نے فرمایا:

"میں نے ایک آدمی کو علی بن بکار سے مانگتے سُنا ان دونوں میں سے کون افضل ہے۔ ناپ تول کر یا ناپ کر پکانا کافی نیکی ہے، اندازہ سے پکانا۔"

فرمایا: "حضرت سلیمان خواصؒ ہمارے یہاں گری پڑی چیزیں اٹھایا کرتے، حضرت ابراہیم بن ادھمؒ مزدوری کرتے، حضرت حذیفہؓ کچی اینٹیں بنایا کرتے تھے۔"

ابوعمرو بن علاء بتاتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے فرمایا:

"بازار اللہ تعالیٰ کے دسترخوان ہیں۔ جو یہاں آیا اسے ان میں سے حصہ ملا۔"

حسن بن دینارؒ نے حضرت قتادہؓ سے نقل کیا کہ تورات میں لکھا ہے:

"بیچ، تو بچایا جائے گا۔ مانگ، ملے گا۔ طلب کر، پائے گا۔"

اور انجیل میں لکھا ہے:

"اے ابنِ آدمؑ! صبر کر، صبر ہوگا۔"

حضرت ابوخلدۃ نے ابوالعالیہؒ سے نقل کیا:

"جب تو کوئی چیز خریدے تو عمدہ خرید۔"

ابوالطفیلؒ فرماتے ہیں کہ میں انس بن مالکؓ کے پاس تھا۔ اُن سے کہا گیا:

"دجال نکل آیا۔"

فرمایا: "صباغ نے جھوٹ کہا۔"

یحییٰ بن یمام نے بسام صراف سے، انہوں نے حضرت عکرمہؓ سے روایت کیا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ صراف دوزخیوں میں سے ہیں۔"

دھوکہ کی سزا

عبدالحمید بن محمود سے مروی ہے۔ فرمایا کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا، ایک آدمی آیا، اس نے بتایا: ہم حج کے لیے آئے تھے۔ جب ہم صفاح کے مقام پر تھے تو ہمارا ایک ساتھی فوت ہوگیا۔ ہم نے اس کے لیے قبر کھودی تو دیکھا کہ ایک سیاہ سانپ نے قبر بھر رکھی ہے۔ ہم نے اس کے لیے ایک دُوسری قبر کھودی۔ اس سیاہ سانپ نے یہ قبر بھی بھر رکھی تھی۔ ہم نے ایک اور قبر اس کے لیے

کھودی اس کو بھی سیاہ سانپ نے بھر رکھا تھا۔ ہم نے اسے چھوڑا اور آپ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ ہم آپ سے مشورہ حاصل کریں۔

فرمایا: "یہ اس کا عمل ہے جو وہ کرتا تھا۔"

دوسری روایت میں ہے:

"یہ اس کی خیانت ہے جو خیانت کیا کرتا تھا۔ جاؤ، اُسے انہی (قبروں) میں سے ایک میں دفن کر دو۔ اللہ کی قسم، اگر تم ساری زمین بھی اس کے لیے کھودو، تو بھی اسے وہاں پاؤ گے۔"

بتلاتے ہیں کہ ہم نے اسے انہی میں سے ایک قبر میں ڈال دیا، جب ہم نے یہ سفر ختم کیا تو اس کی بیوی کے پاس آئے اور اس کے عمل کے بارے میں پُوچھا۔ اُس نے کہا:

"یہ ایسا آدمی تھا کہ کھانا بیچا کرتا۔ ہر روز اپنے گھر والوں کی خوراک کے برابر اس میں سے لے لیتا پھر اسی مقدار پر جو کے تنکے لیتا اور انہیں کتر کر کھانے میں اس قدر ملا دیتا جس قدر نکالتا تھا، پھر اسے فروخت کرتا۔"

حجاج نے ابو جعفر محمد بن علی سے روایت کیا:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ دھوبی، رنگریز اور درزی سے ضمانت لیتے کہ وہ لوگوں کا سامان (کپڑے) محفوظ رکھیں گے۔"

ھشام بن عمارؒ سے مروی ہے کہ مالک بن انس سے ایک آدمی کے بارے میں پُوچھا گیا کہ "ایک آدمی جولاہے کو ڈیڑھ درہم اور اڑھائی درہم کپڑا دیتا ہے۔"

فرمایا: "یہ فاسد شرط ہے اور اس کے لیے اس کے مثل کی اُجرت ہے۔ ہاں اگر شرط کے خلاف کرے تو اس پر جرمانہ لازم ہوگا۔"

احمد بن حسن مقری فرماتے ہیں کہ ابوبکر مروزی سے پُوچھا گیا اور میں سُن رہا تھا:

"جولاہا، پچاس پر اور دو درہم اور پچاس پر کپڑا بُنتا ہے۔"

فرمایا: "اگر ہم رضا مند ہوں تو کچھ حرج نہیں۔"

میں نے کہا: "اب ڈیڑھ درہم اور اڑھائی درہم کا کیا معاملہ ہے؟"

فرمایا: "کچھ حرج نہیں۔"

احمد بن حنبلؒ سے یہی مسئلہ دریافت کیا گیا انہوں نے بھی فرمایا:

"کچھ حرج نہیں۔"

ابو داؤدؒ بتاتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبلؒ کو پُوچھا:

"ایک جولاہا تہائی یا چوتھائی پر کپڑا بُنتا ہے۔"

فرمایا: "کچھ حرج نہیں۔"

پھر فرمایا: "کیا یہ مضاربت کی طرح نہیں اور واقعہ خیبر کی طرح نہیں؛ شاید مضاربت کرنے والا کچھ نفع حاصل کرکے اور زمین کچھ چیز نہ نکالے۔ یہ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔"

حضرت ابن وھبؒ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے جمعہ کے روز اذان کے بعد فروخت کیا تو امام مالکؒ نے اس کے بارے میں فرمایا:

"اس بیع کو توڑ دیا جائے گا۔"

بتایا گیا: "وہ کر رہا تھا، پھر چھوڑ دی۔"

فرمایا: "بُرا کیا۔ اسے اپنے پروردگار سے مغفرت مانگنی چاہیے (یعنی اذان کے بعد فروخت کرنا اور یہ شروع کرنا دونوں ہی گناہ ہیں)۔"

حضرت ربیعہؒ فرماتے ہیں:

"اس نے ظلم کیا اور بُرا کیا۔"

بتایا کہ مالکؒ نے فرمایا: "جمعہ کے روز امام کے نکلتے ہی بیع حرام ہو جاتی ہے۔"

ابوداؤدؒ سے مروی ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ کو بارہا کھوٹے سکے اور سرمہ زدہ کے ذریعہ تجارت اور معاملہ کو مکروہ بتاتے سُنا۔

ابوداؤدؒ بتاتے ہیں کہ میں نے اسحاق بن راہویہؒ سے کھوٹا سکہ چلانے کے بارے میں پُوچھا تو انہوں نے فرمایا: "کچھ حرج نہیں۔"

عبدالوہاب وراقؒ فرماتے ہیں: میں نے حضرت بشرؒ سے کھوٹے سکے کے ذریعہ معاملہ کرنے کا دریافت کیا تو فرمایا:

"تُو نے اس سے معانی کا پُوچھا ہے؟"

فرمایا کہ میں نے حضرت سفیان ثوریؒ سے اس کے بارے میں پُوچھا تھا تو فرمایا، "حرام ہے۔"

حسن خیاطؒ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت بشر بن حارثؒ سے سُنا، انہیں ان کے ایک پڑوسی نے کہا:

"میں نے جولاہے کو گڈی دی ہے اب آٹا کس پر لازم ہے؟"

فرمایا: "جولاہے پر اور دھاگے تیرے ہیں۔"

حضرت بشرؒ نے فضیل بن عیاضؒ سے، انہوں نے لیثؒ سے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے روایت کیا:

حضرت مریم علیہ السلام حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تلاش میں راستہ پر جا رہی تھیں۔ ایک جگہ جولاہوں کو بیٹھے دیکھا، تو پوچھا،

"فلاں فلاں جگہ کو کون سا راستہ جاتا ہے؟"

جولاہوں نے غلط راستہ بتادیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ان کے خلاف دعا کی۔ "اے اللہ! ان کے کاروبار سے برکت اڑا دے اور انہیں حالتِ فقر میں مار اور لوگوں کی نظروں میں انہیں ذلیل کر۔"

حضرت بشرؒ فرماتے ہیں کہ "میرا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی بددعا قبول کر لی۔"

ابو عبدالرحمٰن جیلی نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا فرمایا۔

"جس نے فروخت کرتے وقت والد اور بیٹے کے درمیان جدائی ڈالی، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے اور اس کے احباب کے درمیان جدائی ڈالے گا۔"

حرام سے پرہیز کرو

حضرت سفیانؒ نے منصورؒ سے، انہوں نے موسیٰ بن عبداللہ کے بارے میں نقل کیا کہ ان کے والد نے اپنے غلام کو چار ہزار دے کر اصفہان بھیجا۔ یہ مال بڑھتے بڑھتے سولہ ہزار یا اس کے قریب ہو گیا۔ پھر اطلاع ملی کہ وہ غلام مر گیا۔ یہ اس کی وراثت لینے کے لیے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ سود لیا کرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے چار ہزار لیا اور باقی مال چھوڑ دیا۔

ابوبکر مروزیؒ سے روایت ہے کہ میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا؛

"جو سود کا کاروبار کرتا ہو کیا اس کے ہاں کھانا کھا لیا جائے؟"

فرمایا "نہیں۔"

بتایا کہ میں نے ابو عبداللہ کو فرماتے سنا،

"جو آدمی سود کا کاروبار کرتا ہے اس کا اصل زر لیا جائے اور اگر مال والوں کا علم ہو جائے تو انہیں واپس کر دیا جائے ورنہ زائد مال کا صدقہ کر دیا جائے۔"

حضرت ربیعہؒ بن یزیدؒ نے عطیہ سعدیؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"بندہ اس وقت ہی متقین کے درجہ تک پہنچتا ہے کہ جب کچھ حرج نہیں کی چیز بھی اس ڈر سے چھوڑ دے کہ شاید اس میں کچھ حرج ہو۔"

عباس بن جلیدؒ کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابو الدرداءؓ نے فرمایا؛

"کمالِ تقویٰ یہ ہے کہ انسان ذرہ کے ایک مثقال میں بھی پرہیز کرے۔ حتیٰ کہ بعض وہ چیز بھی کہ جس کو حلال

سمجھتا ہے۔ اس ڈر سے چھوڑ دے کہ شاید یہ اس کے اور حرام کے درمیان حجاب ہو۔"

ابو بکر مروزیؒ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ" میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا،

" ایک آدمی کے پاس تین درہم ہیں۔ ان میں ایک درہم حرام ہے اور وہ اسے ٹھیک طور پر نہیں پہچانتا۔ اب کیا کرے؟"

فرمایا،" اس سے اس وقت کچھ نہ کھائے جب تک کہ اسے پہچان نہ لے۔"

تجارت کے عام مسائل

حضرت ابو عبداللہ نے حضرت عدیؓ بن حاتم کی حدیث سے استدلال کیا کہ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا،

" میں اپنا کتا (شکار پر) روانہ کرتا ہوں تو (واپسی پر)، اس کے ہمراہ ایک اور کتا پاتا ہوں۔"

فرمایا،" مت کھاؤ، حتیٰ کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارے کُتے نے (شکار) مارا ہے۔"

میں نے حضرت عبداللہؓ سے پوچھا،

" ایک آدمی اسے دراہم دیتا ہے تاکہ وہ اسے پگھلا دے، کیا رائے ہے؟"

فرمایا،" اس کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے ممانعت ہے اور میں دراہم اور ٹکڑا (یا سکہ) توڑنا پسند نہیں کرتا۔"

میں نے پوچھا،" اگر مجھے ایک دینار دیا کہ پگھلا دو تو کیا کروں؟"

فرمایا،" اس کے دراہم خرید و۔ پھر ان دراہم کا سونا خرید لو۔"

میں نے کہا،" اگر دراہم مالِ غنیمت سے ہوں اور ان کا مالک ٹھیک وہی مال چاہتا ہو تو؟"

فرمایا،" پھر ان کے بالمقابل (سونا) لے لو۔ وہ انہی کی طرح ہوگا۔"

حضرت ابو عبداللہ نے حضرت علقمہ بن عبداللہ کی حدیث روایت کی۔ انھوں نے اپنے والد ماجدؓ سے روایت کیا کہ" حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان جاری سکہ کسی خاص نقص کے بغیر توڑنے کی ممانعت کی۔"

حضرت ابو عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ نقص یہ ہے کہ درہم میں اختلاف ہو جائے۔ بعض اسے کھرا بتائیں اور بعض خراب بتائیں۔ تو اس مطلب کے لیے توڑ کر دیکھا جا سکتا ہے۔

بتایا کہ میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا،

" ایک آدمی اُجرت پر کام کرتا ہے اور مسجد میں بیٹھتا ہے۔"

فرمایا،" درزی اور اس جیسے لوگ تو مجھے مسجد میں بیٹھے اچھے نہیں لگتے۔ مساجد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔

اوران میں خرید و فروخت مکروہ ہے۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"ایک آدمی اُون کاتتا ہے اور قبرستان میں آتا ہے۔ اچانک بارش شروع ہوئی تو وہ قبرستان میں بنے ہوئے کسی قبّے یا کمرے میں بیٹھ جاتا ہے اور وہیں بیٹھا اُون کاتتا ہے۔"

فرمایا: "قبرستان تو آخرت سے ہے اس میں ایسا کام مکروہ ہے۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"ایک آدمی نے آٹا خریدا، پھر ایک قفیز میں ایک پیالہ زیادہ کرے تو؟"

فرمایا: "یہ غلط ہے۔ لوگ ایسا تغابن نہیں کرتے۔"

میں نے کہا: "ایک کیلجہ یا اس سے کم ہو تو؟"

فرمایا: "اس کی مثل میں تغابن کیا جاتا ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"تاجر لوگ تکئے اور کپڑے رفو کراتے ہیں اور جب فروخت کرتے ہیں تو گاہک کو اس کی اطلاع نہیں دیتے۔"

فرمایا: "وہ ایسا کام کرے کہ ظاہر ہو جائے اور باریک و مخفی طرح اسی کا کام کرے جس پر یقین ہو کہ بتا دے گا۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"میں جو کپڑا پہنے ہوئے ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے اسے نفع لے کر فروخت کر دوں؟"

فرمایا: "نہیں، اور اگر تو اسے برابر برابر فروخت کرے تو بھی بتا دے کہ تُو نے اسے پہنا ہے ورنہ پرانے مال کے بازار میں فروخت کر۔"

میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا:

"ایک چاندی کا لوٹا فروخت کیا جا رہا ہے۔ کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "نہیں، توڑ کر فروخت کرو۔" اور فرمایا کرتے: "ریشم نہیں بیچا جاتا۔"

امیہ بن خالد بتاتے ہیں کہ حضرت یونس بن عبیدؒ جب سامان طلب کرتے تو سوس میں اپنے وکیل کو کہلا بھیجتے کہ جس سے سامان خریدو اس کو بتا دو کہ اس سامان کی لوگ تلاش میں ہیں۔

مروزیؒ سے منقول ہے کہ میں نے ابو عبداللہؒ سے اخروٹ بکھیرنے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا:

"ویسے ہی دے کر بچوں پر تقسیم کیے جائیں۔"

بتایا کہ میں ابو عبداللہؒ کے پاس آیا۔ ان کا لڑکا سیانا ہو چکا تھا۔ اس نے اخروٹ خریدے تا کہ بچوں پر تقسیم کرے۔ آپ نے بکھیرنا ناپسند کیا اور فرمایا:

"یہ لوٹ ہے۔"

حضرت عبداللہؒ نے فرمایا اور ابن مبارکؒ نے کچھ مسائل بیان کیے اور فرمایا:

"یہ دقیق مسئلہ ہے۔"

حضرت ابن مبارکؒ سے پوچھا گیا:

"ایک آدمی نے ایک پرندے کا شکار کیا، وہ قوم کی زمین پر گرا۔ اب شکار کس کا ہے؟"

فرمایا: "میں نہیں جانتا۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا، فرمایا: "یہ دقیق بات ہے۔ میں نہیں جانتا۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے عرض کیا کہ عیسیٰ بن عبدالفتاحؒ نے فرمایا کہ میں نے بشرؒ بن حارث سے پوچھا تھا:

"کیا شبہ میں والدین کی اطاعت لازم ہے؟"

ابو عبداللہؒ نے فرمایا:

"یہ محمد بن مقاتل ہیں۔ جو انہوں نے کہا تو نے دیکھا اور یہ بشر بن حارث ہیں۔ انہوں نے جو کہا، کہا۔"

پھر ابو عبداللہؒ نے فرمایا:

"کیسا اچھا، کہ ان کی مدارات کرے۔"

پھر ابو عبداللہ نے فرمایا:

"گناہ دلوں پر چھا جاتا ہے۔"

مروزیؒ فرماتے ہیں کہ میں ابو عبداللہؒ کے پاس ایک آدمی کو لے کر گیا۔ اس نے بتایا کہ میرے کئی بھائی ہیں اور ان کی کمائی مشتبہ ہے۔ بسا اوقات کھانا تیار ہوا اور آپ ہیں یہاں جمع ہونے اور کھانے کی دعوت دیتے۔ فرمایا: یہ بشر کا مقام ہے۔ اگر تیری جگہ ہوتی تو میں وہاں پر یوں دعا کرتا: "اے اللہ ہم پر ناراضگی نہ کرنا!" البتہ ابوالحسن عبدالوہاب کے پاس جا کر پوچھنا۔ اس آدمی نے کہا: "اچھا جو علم میں ہے وہ بتائیے۔" فرمایا:

حضرت حسنؒ سے مروی ہے:

"جب وہ جہاد میں جانے کے لیے اپنی والدہ سے اجازت چاہے اور وہ اسے اجازت دے دے، مگر وہ جانتا ہو کہ ماں کی خواہش یہ ہے کہ اس کے پاس رہے تو اسے وہیں رہنا چاہیے۔"

بتاتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہؒ سے سنا۔ دراصل ان سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی طلبِ علم کی خاطر سفر کرنا

چاہتا ہے اور والدہ سے اجازت مانگ رہا ہے؟"

فرمایا" اگر ایسا جاہل ہے۔ طہارت کے مسائل اور نماز کا طریقہ تک نہیں جانتا تو اس پر طلب علم واجب ہے اور اگر ان فرائض و واجبات کو جان چکا ہے تو والدہ کے پاس رہنا زیادہ پسندیدہ بات ہے۔"

میں نے عرض کیا:

" اگر وہ کوئی برائی دیکھے اور اسے ختم کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر؟"

فرمایا" والدین سے سفر کی اجازت چاہے۔ اگر وہ اجازت دیں تو اس علاقہ سے نکل جائے۔"

ابو ربیع صوفی سے مروی ہے کہ میں بصرہ میں حضرت سفیانؒ کے پاس گیا۔ میں نے عرض کیا:

" اے ابو عبداللہ میں اس حفاظتی دستہ کے ہمراہ ہوتا ہوں۔ بسا اوقات ہم ہجڑوں پر اچانک چھاپہ مارتے ہیں اور دیواریں پھاند کر ان پر جا پڑتے ہیں۔"

فرمایا" ان کے دروازے نہیں ہیں؟"

عرض کیا" ہاں، دروازے ہیں مگر ہم اس وجہ سے اس طرح اندر داخل ہوتے ہیں کہ وہ بھاگ نہ جائیں۔" انہوں نے اس پر سخت انکار کیا اور اسے بہت ہی معیوب خیال کیا۔

ایک آدمی نے کہا:

" اس کو اس مجلس میں کس نے داخل کیا؟"

میں نے کہا:

" میں طبیب کے پاس آیا ہوں اور اپنا مرض بتا رہا ہوں۔"

حضرت سفیانؒ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا:

" ہم ہلاک ہوئے، میاں ہم تو بیمار ہیں اور ہمیں طبیب کہہ رہے ہو؟" پھر فرمایا:

" نیکی کا حکم اور برائی کی ممانعت کرے جس میں تین باتیں ہوں:

۱۔ جس کا حکم کر رہا ہے اور جس سے منع کر رہا ہے، اس کا رفیق ہو (یعنی رفاقت سمجھ کر ایسا کرے)

۲۔ جس کا حکم کرتا ہے اور جس سے منع کر رہا ہے اس میں عدل سے کام لے۔

۳۔ جس سے منع کر رہا ہے اور جس کے کرنے کا حکم کر رہا ہے۔ ان امور کا عالم و جاننے والا ہو۔"

احمد بن محمد بن حجاجؒ بتاتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

" میں بازار میں چلتا ہوں تو ڈھول دیکھتا ہوں جو فروخت ہو رہے ہوتے ہیں۔ کیا انہیں توڑ دوں؟"

فرمایا" اے ابوبکر، اگر قوت ہو تو ایسا کرو۔"

میں نے عرض کیا،

"مجھے مُردہ نہلانے کو کہا جاتا ہے تو میں ڈھول کی آواز سُنتا ہوں۔"

فرمایا: "اگر قدرت ہو تو اسے توڑ دو ورنہ وہاں سے نکل آؤ۔"

میں نے ان سے ڈھول باجے توڑنے کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا:

"انہیں توڑ دیا جائے۔"

میں نے کہا:

"اگر ڈھکے ہوئے ہوں؟"

فرمایا: "اگر تجھ سے چھپا دیے جائیں تو نہیں۔"

میں نے کہا: "اگر لڑکے کے پاس چھوٹا طنبورہ ہو تو؟"

فرمایا: "اگر کھلا ہو یعنی دکھائی دے رہا ہو تو توڑ دو۔"

میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا،

"ایک آدمی کے نرگس کے باغات ہیں کیا انہیں فروخت کرے؟"

فرمایا: "کہتے ہیں کہ اس سے پارہ بنتا ہے۔"

میں نے عرض کیا:

"اگر صرف نشہ آور اشیاء بنانے والے ہی خریدیں تو؟"

فرمایا: "اس کی تحقیقات کر لی جائے اور اگر ایسا ہی ہو تو فروخت نہ کرو۔"

ایک آدمی نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"میرا والد سب لوگوں سے کاروبار کرتا تھا" اور بعض نامناسب لوگوں سے بھی معاملہ بتایا۔

فرمایا: "اس میں سے نفع کے برابر چھوڑ دو اور اسے مت لو۔"

اس نے بتایا: "اس کا بعض لوگوں پر قرض ہے اور لوگوں کا اس پر قرض ہے۔"

فرمایا: "اس سے لیا اور ادا کیا جائے۔"

میں نے عرض کیا: "آپ اس کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔"

فرمایا: "تو تم اسے دین کے ساتھ حساب چکایا کرو گے؟"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا،

"میرا ایک قریبی ہے جس کا کاروبار ناپسندیدہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے لیے ایک کپڑا خریدوں یا

کوئی کاتنے والا دوں؟"

فرمایا: "اس کی امداد نہ کر اور نہ ہی اس کے لیے کچھ خرید جب تک کہ والدہ سے مشورہ نہ کر لو، اگر تمہاری والدہ ایسا کرنے کا حکم دے تو پھر یہ سہل تر کام ہے۔ شاید وہ ناراض نہ ہو جائے۔"

حضرت ابو عبداللہ سے پوچھا گیا،

"ایک آدمی سُود بیتا ہے، وہ اپنے بیٹے کو مقروضوں کے پاس اس کے تقاضا کے لیے بھیجتا ہے۔ کیا وہ اس کی تعمیل کرے؟"

فرمایا: "نہیں، بلکہ یہ کہہ دے کہ جب تک تو توبہ نہ کرے گا میں نہیں جاؤں گا۔"

حضرت ابو عبداللہؒ کے ہاں ایک محدث کا ذکر ہوا تو فرمایا،

"اللہ اس پر رحم کرے خوب آدمی بشرطیکہ ایک عادت اس میں نہ ہو۔"

پھر فرمایا: "کوئی آدمی تمام اعلیٰ خصائل کا حامل نہیں ہوا کرتا۔"

میں نے عرض کیا: "کیا وہ صاحبِ سنت نہیں؟"

فرمایا: "ہاں، یقیناً، میں نے ان سے (حدیث) لکھی ہے۔ مگر ایک عادت ہے۔"

میں نے کہا: "وہ کیا؟"

فرمایا: "وہ اس کی پرواہ نہ کرتے کہ کہاں سے لیا؟"

میں نے ابو عبداللہؒ سے سُنا، حضرت بشر بن حارثؒ کا ذکر ہوا تو فرمایا:

"اللہ اس پر رحم کرے، اس میں انس تھا۔"

ان کے سامنے تقویٰ کا ذکر ہوا، فرمایا،

"ایسی بات بشرؒ سے پوچھی جائے۔ یہ جائے بشر ہے اور میرے لیے مناسب نہیں کہ اس میں کلام کر دوں۔"

حضرت ابو عبداللہؒ کے سامنے ذکر کیا گیا،

"ایک آدمی پرانی دھجیوں میں پھر رہا ہے"، اور میں نے کہا کہ "وہ علم کا کس قدر ضرورت مند ہے"۔ تو فرمایا:

"خاموش رہو، اس کا فقر و عریانی پر صبر کرنا علم سے افضل ہے۔ میں بستر پہ ہوتا ہوں تو بھی اسے یاد کرتا ہوں۔"

فرمایا: "یہ لوگ ہم سے بہتر ہیں۔"

حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا گیا کہ ابن مبارکؒ سے پوچھا گیا،

"ایک سچے عالم کی کیا پہچان ہے؟"

فرمایا: "جو دنیا میں زہد کرے اور اخروی کام پر توجہ رکھے۔"

حضرت ابو عبداللہؒ نے فرمایا:

"ہاں، وہ اسی طرح ہونا چاہتا ہے۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا،

"ایک عورت کے بارے میں پوچھا جو دوسروں سے دبالو کا لمس کرتی تھی اور ایک عورت کا ذکر کیا اور فرمایا" مجھے ابو عبداللہ نے کسی کا حکم نہیں دیا کہ یہ چیز لے کر اس کا صدقہ کر اور پھر مانگ۔"

حضرت ابو عبداللہؒ کے سامنے ابن عون کا ذکر ہوا۔ فرمایا،

"وہ مسلمانوں سے مکانوں کا کرایہ نہ لیتے۔"

میں نے پوچھا، "کس وجہ سے؟"

فرمایا، "تاکہ انہیں پریشان نہ کرے۔"

ابن مبارکؒ نے حکیم بن زریقؒ سے، انہوں نے اپنے والدؒ سے، انہوں نے حضرت سعید بن مسیبؓ سے آٹے کے عوض گندم کے بارے میں فرمایا، "یہ سود ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا،

"مجھے بتایا گیا ہے کہ بشر بن حارثؒ نے اپنے بھائی کو ابلہ سے کھجوریں دے کر بھیجا۔ ان کی والدہ نے گھر والوں میں تقسیم کی جانے والی کھجوروں میں سے ایک کھجور رکھ لی۔ جب حضرت بشرؒ گھر آئے تو ان کی والدہ نے ان سے کہا "تجھ پر میرا جو حق ہے اس کی وجہ سے یہ کھجور کھا لو۔" انہوں نے کھجور کھا لی اور چھت پر چڑھ گئے۔ وہ بھی ان کے پیچھے چڑھ گئی۔ دیکھا تو وہ قے کر رہے تھے اور ان کا بھائی کچھ چیز پر تھا۔"

حضرت ابو عبداللہؒ نے وہیب بن ورد کا ذکر کیا اور فرمایا،

"حضرت ابن مبارکؒ نے مصر سے آنے والی اشیاء کے بارے میں ان سے بات کی اور ان کا خیال تھا کہ اس میں رخصت ملے اور شدت نہ ہو۔ البتہ مصر سے آنے والی اشیاء میں سے صرف کشمش کھاتے تھے۔"

حضرت ابو عبداللہؒ نے پوچھا،

"کیا حضرت بشر بن حارثؒ بغداد سے آنے والا غلہ کھایا کرتے تھے؟"

میں نے عرض کیا،

"نہیں، بلکہ وہ یہ غلہ کھانے پر سخت انکار کرتے۔"

فرمایا، "یہ بشر بن حارثؒ کی طاقت ہے۔ وہ تنہا تھے اور ان کے اہل و عیال نہ تھے اور عیالدار آدمی مجرد کی طرح نہیں ہوا کرتا۔ اگر مجھے ملتا تو میں پرواہ نہ کرتا کہ کیا کھایا؟"

حضرت ابوعبداللہؒ کا مسلک یہ ہے کہ "سواد (عراق وغیرہ) سے بقدر خوراک لے لے اور باقی کا صدقہ کر دے۔"

پھر فرمایا:

"اگر اس میں سے کچھ فروخت کرے تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا:

"آپ کا کیا خیال ہے کہ سواد (عراق وغیرہ) کا مشروب پی لیا جائے۔"

فرمایا: "یہ جس میں ہم ہیں یہ وراثت ہے اور غلہ لینے والا اضطرار کی حالت پر ہے۔"

حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا گیا:

"کیا اس علاقہ میں کچھ (زمین یا گھر) خرید لیا جائے؟"

فرمایا: "اگر ضرورت نہ ہو تو نہ خریدے۔ یعنی بقدر کفایت موجود ہو تو نہ خریدے۔"

پھر فرمایا:

"انسان کا اپنا گھر فروخت کرنا مکروہ ہے۔ اور میں سواد کی کسی چیز پر راضی نہیں ہوں اور مقدار خوراک سے زاید نہ خریدے۔ اگر خوراک سے زاید ہو تو اسے خیرات کر دے۔"

فرمایا: "میرا خیال ہے کہ سواد کا علاقہ مسلمانوں پر وقف ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سواد (عراق وغیرہ) کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور مسلمانوں میں اسے تقسیم نہیں کیا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی ایسے ہی رہنے دیا۔ البتہ بعض صحابہؓ مثلاً ابن مسعود، حضرت سعد وغیرہ رضی اللہ عنہم کو انھوں نے یہاں جاگیریں دیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے ویسے ہی رہنے دیا اور تقسیم نہیں کیا۔

حضرت ابوعبداللہؒ کا قول ہے:

"جو ابن مبارکؒ کے قول کی طرف مائل ہوا۔ وہ تو ابتلاء ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سواد اس پر تقسیم کیا جائے گا۔ جو واقعہ فتح پر موجود تھا۔"

ابن ادریسؒ نے بغداد کے مکان کے بارے میں فرمایا:

"اسے فروخت کرنا جائے حتیٰ کہ جس نے تلوار سے اسے فتح کیا اس تک یہ مکان پہنچ جائے۔"

میں نے کہا:

"اسے کیسے تلاش کریں گے؟"

اس پر وہ مسکرا دیے اور فرمایا:

"مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جائے اور وہاں سے پوچھے۔"

حضرت ابوعبداللہؒ نے فرمایا،

"اہلِ مدینہ ابن ادریسؒ کے مذہب پر ہیں۔" وہ کہتے ہیں کہ جو شہر قوت کے بل پر فتح ہوا۔ اسے موقع والوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔"

میں نے ابوعبداللہؒ سے پوچھا:

"ان سے کس نے اختلاف کیا ہے؟"

فرمایا "حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے اسے مسلمانوں پر وقف کیا۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا،

"جس کو خراجی زمین میں وراثت سے مکان ملے؟"

فرمایا کہ "ابن ادریسؒ اسے اس کو دینے کا حکم کرتے جو قادسیہ کے موقع پر حاضر تھا۔"

میں نے کہا،

"آپ کے نزدیک یہ قول ہے؟"

فرمایا "ہاں، اور کیا خوب قول ہے۔" مگر ہمارے قبضہ میں جو ہے یہ ٹکڑے ہیں۔ اس لیے اگر انسان اپنے قبضہ کی چیز، قبضہ سے نکالنا چاہے تو ہم اسے حکم دیں گے کہ وہ اسے وقف کر دے۔ اس لیے کہ یہ فئی (غنیمت) ہے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے کوفہ اور بصرہ کے بارے میں پوچھا،

"کیا یہ فتح نہیں ہوئے؟"

فرمایا "نہیں، وہ تشریف لائے اور یہاں مکانات بنائے۔"

میں ایک آدمی کو لے کر حضرت ابوعبداللہؒ کے پاس حاضر ہوا۔ اس آدمی نے بتایا کہ مجھے سواد کے علاقہ سے وراثت میں زمین ملی ہے۔

فرمایا "اسے اپنے قرابت داروں پر وقف کر دو۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو اپنے پڑوسیوں پر وقف کر دو۔"

ان سے پوچھا گیا،

"ایک آدمی کو خراجی زمین میں وراثت میں مکان ملا تو کیا کرے؟"

فرمایا "اسے وقف کر دے۔"

پھر فرمایا،

"مسلمانوں کے لیے سواد مالِ غنیمت ہے۔ البتہ خرید نے میں رخصت بتائی۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہ سے پوچھا:

"میں سواد میں کیسے خریدوں جبکہ فروخت نہیں کرتا؟"

فرمایا: "میرے نزدیک خریداری، فروخت کے برعکس بات ہے اور یہ استدلال کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصاحف (قرآن مجید) خریدنے میں رخصت بتائی اور قرآن مجید فروخت کرنے کو ناپسند کیا۔ ابن عباس اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے"۔

حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا گیا،

"آپ کو کیا پسند ہے۔ خراجی زمین میں رہائش یا سواد کے علاقہ میں؟"

فرمایا: میں نے حضرت ابوعبداللہ سے کہا،

"بازاروں سے سہل نزجگہ ہے"۔

فرمایا: "اس کا معاملہ معلوم ہے تم جانتے ہو کہ یہ کس کا ہے!"

میں نے کہا: "کیا آپ یہاں کام کرنا ناپسند سمجھتے ہیں۔ میرے دل میں اس کے بارے میں کچھ کراہت سی ہے"۔

فرمایا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا،

"گناہ دلوں پر چھا جاتا ہے"۔

میں نے ابوعبداللہؒ سے کہا،

"ایک آدمی سرحد کی طرف جانا چاہتا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ مکان فروخت کردے؟"

فرمایا: "نہیں"

میں نے کہا: "اگر وہ یہ کہے کہ میں نقضِ (عہد) فروخت کرتا ہوں تو؟"

اس پر مسکرا دیے اور فرمایا:

"اگر خریدار راضی ہو جائے تو گویا اس کے پاس حیلہ ہے"۔

پھر بتایا کہ حضرت ابن سیرینؒ کو ارضِ سواد میں کچھ زمین وراثت سے ملی"۔

میں نے کہا: "یہ رخصت ہے"۔

فرمایا: "یہ ابن سیرینؒ سے نیکی ہے"۔

ابوبکر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوعبداللہؒ کو فرماتے سُنا: "جب میرے پاس کچھ چیز نہ ہو تو میں خوش ہوتا ہوں۔" اور فرمایا:

"فقر کے ساتھ کچھ چیز میں اعتدال نہیں ہوتا۔" اور فرمایا:

"یہ غلہ ہماری خوراک نہیں"۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک آدمی کہہ رہا ہے: "اگر ابوعبداللہؒ یہ غلہ چھوڑ دے تو

مجھے یہ خُوب لگے۔"اور ان کا ایک دوست یہ بتایا کرتا تھا:

حضرت ابو عبداللہؒ نے فرمایا: "یہ بُرا کھانا ہے" یا فرمایا:

"یہ ردّی کھانا ہے۔ جو اس کا عادی ہو جائے وہ اس سے صبر نہیں کر سکتا۔"

پھر فرمایا: "میرے نزدیک یہ دُوسرے سے عجیب تر ہے۔"

حضرت عبداللہ بن نوح سراجؒ سے مروی ہے۔ بتایا:

"مجھے حضرت بشرؒ نے فرمایا: تو خراجی علاقے میں ہے؟"

میں نے عرض کیا: "ہاں۔"

فرمایا: "اللہ تجھے وہاں جانے سے مستغنی کر دے۔" مجھے حضرت بشرؒ کے بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ حضرت بشرؒ نے پُوچھا:

"کوئی دوا بتاؤ کہ استعمال کروں؟"

کہا: "آپ یہ دوا صرف فلاں کے باغیچے میں پائیں گے یعنی خراجی علاقے کے باغیچے میں ہے۔"

فرمایا: "اگر اس میں میری شفا بھی ہو تو بھی نہیں کھاؤں گا۔"

محمد بن حاتم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن ابی بشرؒ کو بتاتے سنا۔ فرمایا کہ میں حضرت بشر کے ہمراہ تھا۔ ہم جنگ کے ایک دروازے سے نکلے تھے۔ مجھے فرمایا:

"اے ابو یعقوب! تُو نے اس بستی میں اور اس میں آنے کی کراہت پر غور کیا۔ یاد رکھو، جب تک رنگریز بھٹی میں رہتا ہے اسے اس کی بدبو کی خبر نہیں ہوتی۔ البتہ جو نیا داخل ہُوا وُہ اس کی بدبُو محسوس کرتا ہے۔"

بعض سلفؒ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت بشرؒ کو یہ فرماتے سنا:

"بغداد میں میرا قیام، میرے گناہوں میں داخل ہے۔"

حضرت شعیب بن حربؒ فرماتے ہیں:

"بغداد میں کون سے ایسے آدمی ہیں جن کے لیے بھلائی ہے۔"

عبدالوہابؒ بتاتے ہیں کہ ایک قوم یہاں (بغداد) سے نکل کر مدائن میں حضرت شعیبؒ بن حرب کے پاس پہنچی، اور بغداد میں اقامت پذیر ہونے کے بارے میں ان سے بات چیت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ "واپس مت جاؤ"۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مکانات چھوڑ دیے اور ان میں سے بعض نے پانی پلانے پر ہی مدائن میں رہائش کر لی۔ ان میں سے بعض کو حضرت شعیبؒ نے پانی پلاتے دیکھا تو فرمایا:

"اگر حضرت سفیانؒ تجھے دیکھتے تو وُہ خوش ہوتے۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے کہا:

" طرطوس سے ہمارے پاس ایک خط آیا ہے کہ ایک قوم نیف الاسل سے آئی۔ ان کے پیسے چکی میں غلہ پیسا گیا، بعد میں پتہ چلا کہ چکی میں غصب کی خرابی تھی۔ اب بعض نے اپنا حصہ خیرات کر دیا اور بعض نے ایسا نہیں کیا اور کہا" میں اس میں کچھ حکم نہیں دیتا۔ نہ کھانے پر راضی ہوں اور نہ صدقہ کرنے پر راضی ہوں۔ اس بارے میں آپ کا کیا فرمان ہے؟"

چنانچہ ابو عبداللہؒ کا مذہب یہ تھا کہ اگر کچھ ناپسندیدہ چیز حاصل ہو تو اسے صدقہ کر دے۔

ایک آدمی نے لکڑیاں خریدیں اور کرایہ پر جانور لیے۔ یہ لکڑیاں ان پر رکھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ جس طرف لکڑیاں جا رہی ہیں وہ کوئی غلط مصرف ہے۔ اب کیا لکڑیاں وہیں واپس لے جائے جہاں سے لایا تھا یا کچھ اور سلوک کرے؟

وہ مسکرا دیے اور فرمایا:

" میں نہیں جانتا۔"

میں نے عرض کیا، ایک آدمی نے ابو عبداللہؒ سے کہا:

" اس آدمی کے تیل کے بارے میں کیا خیال ہے جس کا کاروبار مکروہ ہے۔ کیا اس کے چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھاؤں؟"

فرمایا:" نہیں۔"

ابو عبداللہؒ نے عثمان بن زائدہ کا ذکر کیا کہ ان کے غلام نے ایک ایسی قوم سے آگ لی، جن کو وہ ناپسند کرتے تھے انہوں نے آگ بجھا دی۔ حضرت ابو عبداللہؒ نے فرمایا:

" نفاطہ (چراغ) اس سے سخت تر ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا:

" ایک تنور غلط قسم کے ایندھن سے گرم کیا گیا اور وہاں روٹیاں لگائی گئیں۔ پھر میں آیا اور دوسری ایندھن لے کر اسے گرم کیا۔"

فرمایا:" نہیں، کیا ان (سابقہ) لکڑیوں سے وہ گرم نہیں کیا گیا؟" چنانچہ اسے ناپسند کیا۔

میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

" کیا نامرد آدمی اپنی آقا عورت کے بالوں کو دیکھ لے؟"

فرمایا:" نہیں۔"

میں نے پوچھا:" عورت کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو جوڑنے والے نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، اب؟"

فرمایا:" یہ ضرورت کے باعث ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں۔"

میں نے کہا،

"میرے لیے ضروری ہے کہ عورت اپنا سینہ کھولے اور میں اس پر اپنا ہاتھ رکھوں، تو؟"

حضرت طلحہؓ فرماتے ہیں:

"وہ زیادتی و جبر کر رہا ہے۔"

میں نے پُوچھا:

"سُرمہ لگانے والا، عورت کے ساتھ تنہا رہ جاتا ہے اور اس کے پاس سے باقی تمام عورتیں چلی جاتی ہیں۔ کیا یہ ممنوعہ خلوت ہے؟"

فرمایا: "کیا وُہ بازار میں یا برسرِ راہ نہیں ہے؟"

کہا: "ہاں۔"

فرمایا: "خلوت تو کمروں کے اندر ہوتی ہے۔"

ابوبکر بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوعبداللہ سے پُوچھا:

"ایک آدمی مردار کھانے پر مجبُور ہُوا مگر ایک قوم کے پاس کھانا بھی پاتا ہے۔ اب کیا وُہ مالک کی اجازت کے بغیر کھانا کھالے یا مردار کھائے؟"

فرمایا: "مردار کھائے اس کے لیے حلال کر دیا گیا۔"

میں نے حضرت ابُوعبداللہؒ سے پُوچھا:

"ایک آدمی ایک باغ یا کھجور کے پاس سے گزر رہا ہے تو کیا اس میں سے کھالے؟"

فرمایا: "صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک جماعت نے اس میں آسانی فرمائی ہے۔"

میں نے کہا:

"آپ کی کیا رائے ہے جب ایک آدمی مردار تک مجبور ہو جائے اور ایک قوم کے پاس کھانا دیکھے تو کیا مالک کی اجازت کے بغیر کھانا کھالے یا مردار کھائے؟"

فرمایا: "مردار کھالے مگر ساتھ اٹھا کر نہ لے جائے۔"

میں نے کہا:

"ایک آدمی باغ کے پاس سے گزر رہا ہے تو؟"

فرمایا: "اگر باغ کے گرد دیوار ہے تو داخل نہ ہو۔ اور اگر اس کے گرد باڑ نہیں تو کھالے مگر ساتھ نہ اٹھائے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے مکہ کے مکانات کی اُجرت (کرایہ) کے بارے میں پُوچھا۔ فرمایا:

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے پوچھا:

"ایک آدمی نے مکان کرایہ پر لیا۔ پھر چلا گیا اور کرایہ ادا نہیں کیا۔"

فرمایا: "یہ اچھی بات نہیں کہ کرایہ ادا نہ کرے۔"

فرمایا: "یہ بمنزلۂ حجام کے ہے۔ یہ دینا ہی چاہیے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"مکہ کے مکانات کی خرید و فروخت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "نہیں، البتہ بڑے بڑے مکانات جیسے کہ دارِ فلان اور دارِ فلان ہے۔ ان کے دروازے کھول دیے جائیں تاکہ حجاج آکر اپنے خیمے ان میں لگائیں اور یہاں اُتریں۔ انہیں ان مکانات میں اترنے سے نہ روکا جائے۔"

حضرت ابو عبداللہؒ سے کسی نے کہا:

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جیل خانہ خریدا تھا۔"

فرمایا: "نہیں، یہ حضرت عمرؓ کی خرید کی طرح معاملہ نہیں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی خاطر خریدا تھا کہ چوروں اور دُوسرے مجرموں کو اس میں بند کریں گے۔"

حضرت ابوعبداللہؒ سے پُوچھا گیا:

"یہ پانی کی چھبیلیں جو مکروہ طریق سے بنی ہیں۔ کیا ان سے وضو کر لیا جائے؟"

فرمایا: "نہیں۔ ہاں اگر نماز یعنی جمعہ کی نماز رہ جانے کا ڈر ہو تو کر لو۔"

حضرت ابُوعبداللہؒ سے پُوچھا گیا کہ جو چھبیلیں راستہ کی جانب کھلتی ہیں کیا ان سے پانی پی لیا جائے؟

فرمایا: "حضرت حسنؒ سے پُوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے ام سعیدؓ کی چھبیل سے پانی پیا تھا اس لیے نرم رہو۔"

میں نے حضرت عبداللہؒ سے عرض کیا۔ بتاتے ہیں کہ حضرت فضیلؒ کا غلام دو درہم لے کر آیا اور کہا: "میں نے فلاں گھر کی مزدوری کی۔" اور ایک ناپسندیدہ گھر کا ذکر کیا تو انہوں نے انہیں پتھروں میں پھینک دیا اور فرمایا:

"اللہ عزوجل کا قرب صرف پاک حلال سے ہی ہوتا ہے۔"

حضرت عبداللہؒ کو اس پر تعجب ہُوا۔ فرمایا:

"اللہ اس پر رحم فرمائے۔" مگر حضرت ابو عبداللہ کا مسلک یہ ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے۔ یہ زیادہ احتیاط کی

بات ہے اور فرمایا،

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ اسے صدقہ کر دیا جائے۔ اگر صدقہ کر دیا جائے تو کیا باقی رہا؟"

مجلسِ دعوت سے نکل آنے کا حکم

امام احمد بن حنبلؒ کی نظر میں

احمد بن عبد الخالقؒ بتاتے ہیں کہ ابو بکر مروزیؒ نے فرمایا، کہ میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پوچھا،

"ایک آدمی کو ولیمہ میں دعوت دی جاتی ہے وہ کس چیز کو دیکھ کر وہاں سے نکل آئے؟"

فرمایا، "حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابو ایوبؓ کو دعوت دی۔ انہوں نے پردے لٹکے دیکھے تو وہاں سے نکل آئے۔"

حضرت حذیفہؓ نے مجمیوں کے لباس سے کچھ دیکھا تو وہاں سے نکل آئے۔

میں نے کہا، "اگر مکان پر پردے نہ ہوں بلکہ چاندی کی کوئی چیز دیکھے تو؟"

فرمایا، "جو استعمال کی جاتی ہے (یعنی برتن چاندی کا ہو) تو نکل آنا اچھا ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ کو فرماتے سنا کہ ہمیں ریاضت سے پہلے ہمارے اصحاب میں سے ایک آدمی نے دعوت دی۔ ہم عفانؒ کے ہاں جایا کرتے اچانک دیکھا کہ چاندی کا برتن ہے۔ میں نکل آیا اور میرے اتباع میں لوگ بھی نکل آئے۔ صاحبِ منزل کو بہت صدمہ ہوا۔

میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پوچھا،

"ایک آدمی کو دعوت دی جاتی ہے وہ سرمہ دانی کا سرا چاندی کا دیکھتا ہے۔"

فرمایا، "یہ استعمال کی چیز ہے اس سے نکل آؤ۔ البتہ انہوں نے وسمہ میں رخصت دی کہ یہ سہل تر ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبد اللہ سے پوچھا،

"ایک آدمی نے ایک قوم کو دعوت دی۔ چاندی کی طشتری یا لوٹا لایا گیا۔ اس آدمی نے اسے توڑ دیا" حضرت ابو عبد اللہؒ کو اس کا توڑنا بھلا معلوم ہوا۔

میں نے حضرت ابو عبد اللہ سے پوچھا،

"ایک آدمی کی دعوت کی جاتی ہے وہ دیباج (ریشم) کا بستر دیکھتا ہے کیا اس پر بیٹھے یا دوسرے کمرے میں بیٹھے؟"

فرمایا، "وہاں سے نکل آئے۔ حضرت ابو ایوب و حذیفہ رضی اللہ عنہما نکل آئے تھے۔"

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے،

"میں نے کہا: آپ کی کیا رائے ہے کہ انہیں حکم دے؟" یعنی نصیحت کرے۔

فرمایا: "ہاں، یوں کہے، یہ جائز نہیں۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا،

"ایک آدمی گھر میں ہے جس میں دیباج یعنی ریشم ہے وہ اپنے بیٹے کو کوئی چیز لانے کا حکم دیتا ہے تو؟"

فرمایا: "وہ نہ ہی اس میں داخل ہو اور نہ ہی باپ کے ہمراہ بیٹھے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا:

"ایک آدمی کو دعوت دی جاتی ہے اور وہ باریک پردہ پڑا دیکھتا ہے؟"

انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا،

"یہ دکھاوا ہے۔ یہ نہ گرمی روکے، نہ سردی روکے۔"

میں نے کہا، "ایک آدمی کو دعوت دی گئی وہ تصاویر دیکھ رہا ہے تو؟"

فرمایا: "ان کی طرف نہ دیکھے۔"

میں نے کہا، "گاہے نظر پڑ جاتی ہے۔"

فرمایا: "اگر انہیں مٹا سکو تو مٹا دو۔"

ابوصالح فرائے نے یوسف بن اسباط سے نقل کیا۔ فرمایا کہ میں نے کہا،

"میں کس کی دعوت قبول کروں؟"

فرمایا: "اس کے پاس مت جانا، جس سے یہ ڈر ہو کہ وہ تیرے قلب کو بگاڑ دے گا۔ وہ اغنیاء کے ہاں جانا پسند نہ کرتے۔"

حضرت مروزیؒ بتاتے ہیں کہ "میں نے حضرت ابوعبداللہ سے ان پردوں کے بارے میں دریافت کیا جن پر آیاتِ قرآنی تحریر ہوتی ہیں۔" انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا،

"کسی نصب شدہ چیز پر قرآن نہیں لکھنا چاہیے۔ چاہے یہ پردہ ہو یا دوسری چیز منصوب یا لٹکی ہوئی ہو۔"

میں نے کہا: "ایک آدمی مکان کرایہ پر لیتا ہے اس میں تصاویر دیکھتا ہے کیا انہیں مٹا دے؟"

فرمایا: "ہاں"۔

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے کہا،

"جب میں حمام میں جاؤں اور وہاں تصویر دیکھوں تو کیا اس کا سر مٹا دوں؟"

فرمایا: "ہاں"

تقویٰ کی تشریحات

ابن عبدالخالق بتاتے ہیں: ہمیں احمد بن حجاج نے بتایا کہ میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا:
"ایک آدمی کی لڑکی کھلونا مانگے تو کیا اسے خرید دے؟"
فرمایا: "اگر وُہ تصویر ہو تو جائز نہیں۔" اور اس میں کچھ کلام کیا۔
میں نے کہا:
"جب ہاتھ یا پاؤں ہی ہو تو کیا تصویر نہیں؟"
فرمایا: حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں:
"جس چیز کا سر ہو وُہ تصویر ہے۔"
حضرت ابوعبداللہؒ نے فرمایا:
"لگا ہے اس کا سینہ، آنکھیں اور ناک بھی بنا دیتے ہیں۔"
میں نے کہا:
"کیا آپ کو یہی پسند تر ہے کہ اسے نہ خریدے؟"
فرمایا "ہاں۔"
میں نے حضرت ابوعبداللہ سے پُوچھا:
"ہاتھ پر بوسہ دینے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"
دین کی وجہ سے ہو تو اس میں کچھ ہرج نہیں سمجھا اور فرمایا:
"حضرت ابو عبیدہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بوسہ دیا تھا اور اگر بطریقِ دنیا ہو تو پھر درست نہیں۔ یعنی جس کی تلوار یا کوڑے کا ڈر ہو اس کے باعث ہاتھ پر بوسہ دینا جائز نہیں۔" حضرت ابوعبداللہ نے فرمایا، کہ مجھے حضرت سعید بن حاجبؒ نے فرمایا:
"کیا اہلِ اسلام حاکم کے ہاتھ پر بوسہ نہیں دیا کرتے؟"
میں نے اپنے ہاتھ سے بتایا کہ اس طرح، اور میں نے کہا نہیں۔
حضرت علی بن ثابت سے مروی ہے کہ میں نے حضرت سفیانؒ کو یہ فرماتے سُنا:
"امام عادل کے ہاتھ پر بوسہ میں کچھ ہرج نہیں اور دُنیا کے معاملہ پر ہاتھ پر بوسہ شدید مکروہ ہے۔"
میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پُوچھا:

"ایک آدمی سرحد کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ راستہ خطرناک ہے۔ اگر راستہ میں چور حملہ کریں تو کیا ان سے جنگ کرے؟"

فرمایا: "وہ اس کا مال لوٹیں تو ان سے جنگ کرے۔" اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جو اپنے مال کی حفاظت کرتا ہُوا قتل کر دیا جائے وُہ شہید ہے۔"

میں نے کہا:

"اگر وہ دُوسرے رفقائے سفر کو لوٹیں تو کیا یہ ان سے جنگ کرے؟"

فرمایا: "اگر وُہ اس سے امداد چاہیں تو جنگ کرے" مگر رفقاء کی طرف سے تلوار کے ساتھ جنگ کو درست نہیں سمجھا۔

حضرت ابوعبداللہؒ سے پُوچھا گیا کہ "کیا قیدی فرار ہو جائے؟"

فرمایا: "ہاں اگر اس کی قدرت ہو تو (کافروں کی قید سے) فرار ہو جائے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے کہا:

"ایک آدمی کسی کے پاس مانگنے کے لیے آیا تو کیا یہ آدمی اس کی خاطر کسی قوم سے مانگے؟"

فرمایا: "نہیں بلکہ یہ اسے قوم کے سامنے پیش کر دے جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا جبکہ ان کے پاس ایک پریشان حال قوم آئی تو آپؐ نے حکم دیا تھا کہ انسان ایسے ایسے صدقہ کرے (صدقات پر آمادہ کیا۔)"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ کو یہ فرماتے سُنا:

"عبدالوہاب کی خوراک دوسروں سے زیادہ پاکیزہ ہے۔" ان کا مطلب کاغذ سازی سے تھا۔

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ کو فرماتے سُنا:

"حضرت یحییٰ بن یحییٰؒ نے مجھے اپنا جبہ تحفہ میں بھیجا اور ان کا بیٹا میرے پاس لے کر آیا اور یہ مجھے دیا۔" میں نے کہا: "نیک آدمی ہے۔ اس میں اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے میں اس سے برکت حاصل کروں گا۔"

بعض علماء سے مروی ہے کہ حضرت یحییٰ بن یحییٰؒ کو ان کی بیوی نے دوا پلاتے ہُوئے کہا:

"اٹھ کر گھر میں چہل قدمی کرو تو فائدہ ہوگا۔"

فرمایا: "میں نہیں سمجھتا یہ کیا مسئلہ ہے؟ میں تو چالیس برس سے اپنے نفس کا محاسبہ کر رہا ہُوں۔"

حضرت موسیٰ بن عبدالرحمان بن مہدیؒ نے فرمایا:

"جب میرے چچا کا انتقال ہُوا تو میرے والد پر غشی طاری ہوگئی۔ جب انہیں افاقہ ہُوا تو فرمایا: بچھونا یہ رکھا ہے اسے بھی وارثوں کے ڈھیر میں رکھ دو۔"

ابن ابی خالدؒ نے بتایا کہ میں حضرت ابوالعباس خطابؒ کے ہمراہ تھا۔ وُہ ایک آدمی کے پاس تعزیت کے لیے آئے جس کی بیوی فوت ہوچکی تھی۔ کمرے میں (دری وغیرہ کا) فرش تھا۔

حضرت ابوالعباسؒ نے مکان کے دروازے پر کھڑے ہوکر فرمایا:

"کیا تیرے ساتھ کوئی اور وارث بھی شریک ہے؟"

اس نے کہا: "ہاں۔"

فرمایا: فرمایا: "جس چیز کا تُو تنہا مالک نہیں اس پر تیرے لیے بیٹھنا جائز نہیں۔" چنانچہ وہ آدمی دری سے اٹھ گیا۔

ابن ضحاک، حضرت بشر بن حارثؒ کے اصحاب میں سے ہیں ان کے بارے میں مروی ہے کہ جب ان کی ہمشیرہ کے خاوند کا انتقال ہُوا تو وُہ اپنی ہمشیرہ کے ہاں آتے اور رات بھی وہیں گزارتے اور اپنے ہمراہ ایسا بستر وغیرہ لاتے کہ جس پر بیٹھتے مگر وراثت میں چھوڑے ہُوئے کپڑے پر بیٹھنا درست نہ سمجھتے۔

حضرت ابن عبدالخالقؒ نے حضرت مروزیؒ سے نقل کیا کہ میں نے حضرت ابُو عبداللہ سے پُوچھا:

"اگر مسجد کی اشیاء میں سے کچھ چیز فالتو بچ جائے یا لکڑیاں بے کار پڑی ہوں تو ان کا کیا کرے؟"

فرمایا: "ان کو خیرات کر دے۔"

میں نے مسجد کے زائد چوُنے اور اینٹوں کے بارے میں پُوچھا تو فرمایا:

"ایسے ہی کر دے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا:

"میں ماہِ رمضان کے اندر مسجد میں ہوتا ہُوں اور ایک نا مناسب مقام سے عود (خوشبو) آتی ہے۔ اب اس کا کیا کرے۔"

فرمایا: "عود سے خوشبو ہی مطلوب ہوتی ہے۔ اب اگر نکل آنا تیرے لیے باعثِ سکون ہو، تو نِکل جا۔"

حضرت ابو عوانہؒ نے عبداللہ بن راشدؒ سے نقل کیا۔ وُہ فرماتے ہیں کہ میں بیت المال سے خوشبُو لے کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ اُنھوں نے اپنی ناک بند کر لی اور فرمایا: "اس کی خوشبُو سے

نفع حاصل کیا جاتا ہے"۔

عبدالعزیز بن ابی سلمہؒ نے حضرت اسماعیل بن محمدؒ سے نقل کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بحرین سے مشک آئی۔ فرمایا،

" اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھا وزن کرنے والی عورت مل جائے تو میں یہ خوشبو وزن کر کے مسلمانوں میں تقسیم کر دوں"۔

ان کی بیوی حضرت عاتکہ بنت عمرو بن نفیل نے کہا،

" میں وزن کرنا خوب جانتی ہوں۔ لائیے وزن کر دوں"۔

فرمایا، " نہیں"۔

میں نے کہا، "کیوں؟"

فرمایا، " مجھے خطرہ ہے تو اس طرح اس میں سے لے گی اور کنپٹیوں میں انگلیاں داخل کریں اور گردن پر ملیں اور یہ خطرہ ہے کہ مجھے دوسرے مسلمانوں سے زائد نہ مل جائے"۔

حضرت سلیمان تیمی نے بتایا کہ نعیمؒ نے حضرت عطارہؒ سے نقل کیا۔ فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی خوشبو اپنی بیوی کو دیتے۔ وہ اسے فروخت کرتیں۔ انہوں نے میرے پاس خوشبو فروخت کی اور تولتے وقت کم زیادہ کرتی رہیں گاہے دانتوں سے کاٹتیں اور ان کی انگلیوں میں کچھ چیز لگی رہتی۔ چنانچہ بتایا، "اس طرح انگلی کے ساتھ۔" پھر انہوں نے اوڑھنی کے ساتھ رگڑ لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگئے۔ فرمایا،

" یہ کیسا نفع (زائد) لیا جا رہا ہے؟"

انہوں نے ساری بات بتائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

" تو مسلمانوں کی خوشبو بیچتی ہے۔ پھر اپنے (کپڑے کے) ساتھ لگا لیتی ہے؟"

چنانچہ انہوں نے ان کے سر سے اوڑھنی اتاری اور پانی کا ایک گھڑا لیا اور اوڑھنی پر پانی ڈال کر مٹی میں اسے ملنے لگے۔ اس طرح مل مل کر سونگھتے جاتے۔ پھر پانی ڈالتے۔ پھر مٹی میں رگڑ کر پھر سونگھتے۔ کئی بار ایسے ہی کیا۔

حضرت عطارہؒ فرماتی ہیں:

" میں ایک بار دوبارہ آئی تو جب ان کی انگلی سے خوشبو لگی تو انگلی منہ میں ڈال کر زمین سے رگڑ دی"۔

حضرت ابوبکر مروزیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا،

" جمعہ کے روز اگر سردی ہو تو کیا کسی مکروہ جگہ میں پانی گرم کر لیا جائے؟"

فرمایا، " نہیں۔ اس سے غسل چھوڑ دینا میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے"۔ میں نے حضرت ابوعبداللہؒ کو حضرت ابو ثورؒ

کے قول پر انکار کرتے سنا۔

پُوچھا گیا: "اگر تمام اطباء کا اجماع ہو جائے کہ اس کی صحت شراب میں ہے تو کیا کرے؟"

اس پر انہوں نے سخت انکار کیا۔ فرمایا:

"میں تو دُبر کا علاج بھی شراب سے ناپسند کرتا ہُوں۔ اس کا پینا کیسے گوارا ہوگا۔" اور اس پر سخت اعتراض کیا۔

حضرت شعیب بن حربؒ بتاتے ہیں:

"مجھے اپنے بیٹے کو چوری کرتے یا زنا کرتے دیکھنا اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ اس پر ایسا وقت آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتا ہو۔"

محمد بن ابی داؤد انباری بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو سلمہؒ سے پوچھا:

"میں ایک ایسے ولیمہ کی دعوت قبول کر لوں جس میں نبیذ ہو؟"

فرمایا: "نہیں۔"

میں نے کہا:

"مجھے اس حدیث کا ڈر ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"جس نے (دعوت) قبول نہ کی اس نے نافرمانی کی۔"

چنانچہ فرمایا: "جس نے آج دعوت نہ کی اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔"

ہارون بن معروفؒ نے بتایا کہ میرے پاس ایک نوجوان آیا اور کہا:

"میرے والد نے مجھ پر طلاق کی حلف دی کہ میں نشہ آور چیز کے ساتھ دوا پیوں۔" میں اسے لے کر حضرت ابو عبد اللہؒ کے پاس گیا انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی اور بتایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر نشہ آور حرام ہے اور ہر نشہ آور خمر (شراب) ہے۔"

حضرت مروزیؒ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پُوچھا:

"ابریشم کے تانے والے کپڑے کو سینے والے درزی کا کیا حکم ہے؟"

فرمایا: "جو مردوں کے لیے ہو تو نہیں اور جو عورتوں کے لیے ہو تو اس میں کچھ ہرج نہیں۔"

میں نے پُوچھا: "یہ عورتوں کے لیے چوڑی گوٹ سینا کیسا ہے؟"

فرمایا: "اگر کوئی چوڑی ہو تو میں اسے مکروہ سمجھتا ہُوں اور یہ بدعت ہے اور اگر متوسط چیز ہو تو کچھ ہرج نہیں سمجھا۔ اور مردوں کی جیب کی طرح عورتوں کے لیے جیب بنانا مکروہ جانا۔

حضرت ابو عبد اللہؒ نے اپنی بیٹی کے لیے قمیص کٹوائی۔ میں موجود تھا۔ انہوں نے درزی سے فرمایا: "اس کی

جیب سامنے ہی لگانا۔"

حضرت ابو عبداللہؒ نے اپنی بیٹی کے لیے قمیص کٹوائی تو فرمایا کہ

"اس کی گوٹ باریک رکھنا اور چوڑی گوٹ کو ناپسند کیا۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ کے لیے ایک جبہ بنوایا اور اس کی گوٹ باریک رکھوائی۔ میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا:

"کیا آپ نے کسی شیخ کو دیکھا کہ جس کی گوٹ چوڑی ہو؟"

فرمایا: "نہیں۔"

میں ایک روز حضرت ابُوعبداللہؒ کے پاس تھا کہ ایک لونڈی گزری جس پر قبا تھا۔ آپ نے اعتراض کیا۔ میں نے عرض کیا:

"کیا آپ اسے ناپسند کرتے ہیں؟"

فرمایا: "کیوں نہیں، میں اسے سخت ناپسند کرتا ہوں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں سے تشابہ کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔"

حضرت عبدالصمدؒ سے مروی ہے کہ یزید بن ہارونؒ نے ایک روز ایک صوفی قسم کے درزی کو بُلا کر فرمایا:

"اس لونڈی کے لیے قبا بنا دو۔" درزی نے قینچی ہاتھ سے رکھ دی اور پوچھا:

"اے ابوخالد، کس کی قبا؟"

حضرت یزیدؒ مروزی خاموش رہے۔ بتاتے ہیں کہ ایک محدث نے حضرت ابوعبداللہؒ کے سامنے ذکر کیا اور بتایا کہ آپ نے اس پر اس لیے انکار کیا کہ اس کے لباس کا انداز صوفیوں والا ہو۔

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پُوچھا:

"ایک آدمی کا سبتی جوتا ہے؟"

فرمایا: "میں تو یہ استعمال نہیں کرتا البتہ مٹی کی خاطر یا باہر نکلنے کے لیے ہو تو شاید درست ہو اور صرف زیبائش کی خاطر پہننا درست نہیں۔" انہوں نے پیشاب گاہ کے دروازہ پر ایک سندی جُوتا دیکھا۔ مجھ سے پُوچھا:

"یہ کس کا ہے؟"

میں نے بتا دیا، فرمایا: "یہ جُوتے والا اولادِ لُوط سے تشابہ کر رہا ہے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے کہا:

"گھر والوں نے مجھے کہا ہے کہ بچی کے لیے سندی جُوتا خرید لاؤں۔"

فرمایا: "مت خریدو۔"

میں نے پُوچھا: "کیا آپ بچوں اور درویشوں کے لیے ناپسند کرتے ہیں؟"

فرمایا: "ہاں۔"

زیاد بن ایوب بتاتے ہیں کہ میں سعید بن عباس کے پاس تھا۔ اس کی بیٹی کا پوتا آیا۔ اس کے پاؤں میں سندی جوتا تھا۔ فرمایا:

"تجھے یہ کس نے پہنایا؟"

اس نے کہا: "میری والدہ نے۔"

فرمایا: "جاؤ ماں کے پاس کر یہ اتار دے۔"

حضرت مروزیؒ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پُوچھا:

"ایک عورت سُرخ لباس پہنتی ہے۔ کیا حکم ہے؟"

انہوں نے اسے سخت ناپسند کیا اور فرمایا:

"اگر زینت کی خاطر ایسا کرتی ہے تو جائز نہیں۔"

فرمایا: بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے آلِ قارون نے سُرخ لباس پہنا، پھر وہ یہ زینت بنا کر قوم کے سامنے آئے یعنی سُرخ لباس میں آئے۔

حضرت مجاہدؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا:

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک آدمی کے پاس سے گزر ہوا، اس آدمی پر دو سُرخ کپڑے تھے۔ اس نے سلام کہا آپ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔"

حضرت مروزیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو عبداللہؒ نے میرے دونوں کپڑوں کا استر سرخ دیکھا تو فرمایا:

"تُو نے اس کا سُرخ رنگ کیوں کرایا؟"

اس نے کہا:

"اس میں دھجیاں تھیں اس لیے ایسا کیا۔"

فرمایا: "تجھے اس کی کیا پرواہ ہے کہ اس میں دھجیاں ہیں؟"

میں نے کہا: "وُہ اسے ناپسند ہو گی۔"

فرمایا: "ہاں۔" اور مجھے ایک ازار بند خریدنے کا حکم دیا اور فرمایا:

"اس میں سُرخی نہ ہو۔"

میں نے کہا: "آپ اسے ناپسند کرتے ہیں؟"

فرمایا: "ہاں۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا،

"کیا جنازہ کو سرخ کپڑے سے ڈھانپ دیا جائے؟" آپ نے اسے ناپسند کیا۔

میں نے کہا: "کیا اسے اتار دیا جائے؟"

فرمایا: "ہاں۔"

مجھے حضرت ابوعبداللہؒ کے گھر میں حکم ہوا کہ ایسا کپڑا خرید لاؤ جس میں تحریر ہو۔

انہوں نے فرمایا: "اگر تم چاہو کہ میں کپڑا خرید لاؤں اور تحریر مٹا دوں تو کرتا ہوں۔"

میں نے کہا: "وہ تو تحریر والا کپڑا چاہتے ہیں۔"

فرمایا: "مت خریدو۔"

ایک عورت نے مجھے بتایا کہ مجھے حضرت ابوعبداللہؒ نے (مہندی کے) رنگ میں نقش بنانے سے منع کیا اور فرمایا: "سارا ہاتھ ڈبو لو" اور حضرت ابوعبداللہؒ نے ہاتھ رنگنے والی عورت کا ذکر کیا تو فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کا فرمان ہے:

حضرت سلیمان تیمیؒ نے ابوعثمانؒ سے نقل کیا۔ فرمایا،

"غیلان کی بیٹی ام فضلؒ نے حضرت انسؓ کو پیغام بھیجا۔ عورت کو گردن میں ہار ڈالنا اور ہاتھ رنگنا کیسا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا،

"عورت کے لیے مستحب ہے کہ نماز کی حالت میں گردن میں کچھ چیز لٹکا لے، چاہے تسمہ ہو۔" اور رنگنے کے بارے میں فرمایا کہ

"سارا ہاتھ ڈبو لو۔"

مروزیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا،

"ایک آدمی چونا کرنے کا کام کرتا ہے۔"

فرمایا: "کمروں کی زمین کی مٹی حفاظت کرتی ہے۔" اور دیواروں پر چونا کرنے کو ناپسند کیا۔

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا،

"لوگوں نے ایک مسجد بنائی اور اس پر زر کثیر صرف کیا۔" انہوں نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور اس پر سخت انکار کیا اور فرمایا:

"صحابہؓ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ مسجد میں روغن کر دیں"
آپؐ نے فرمایا:
"نہیں، جھونپڑا رہے، جیسے حضرت موسیٰؑ کا تھا"
حضرت ابو عبداللہؒ نے فرمایا کہ "سُرمہ کی قسم کی کوئی چیز تھی کہ جس کی پیائی کیا کرتے تھے" حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی۔
احمد بن عبدالخالقؒ نے حضرت ابوبکر مروزیؒ سے نقل کیا کہ میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا:
"شہری، بدوی کے سامنے فروخت نہ کرے (لا یبیع حاضر لباد) یہ کیسے ہوگا؟"
فرمایا: "حضرت سفیانؒ نے ابوالزبیرؒ سے نقل کیا کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے سنا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:
"شہری کسی بدوی کے لیے فروخت نہ کرے۔ لوگوں کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے روزی دیتا ہے۔"
فرمایا: "اور باد سے مراد اعرابی ہے اور حاضر (شہری) ہے۔ اعرابی آتا ہے اسے اشیاء کا نرخ معلوم نہیں۔ تو اٹھتا ہے۔ تجھے نرخ معلوم ہے۔ اب تجھے جو معلوم ہے اس کی اعرابی کے لیے فروخت کرتا ہے۔ اس کی ممانعت ہے۔ (یعنی اعرابی کو دھوکہ دے کر نہ لوٹا یا جائے)"
میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:
"اگر وہ آیا تو آپ اس کے لیے خریدیں گے اس لیے کہ اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو غلو کرنے والا اس سے خرید لے گا اور وہ سستا فروخت کر دے گا"
فرمایا: "یہ بات نہیں، اگر اس طرح بات ہوتی تو لوگ نہ خریدتے اور نہ فروخت کرتے۔ اس پر لازم ہے کہ اس کے لیے فروخت نہ کیا جائے" البتہ اس کے لیے خریدنے میں کچھ حرج نہیں سمجھا۔
میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:
"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "ایک بیع میں دو شرطیں نہیں" کا کیا مطلب ہے؟"
فرمایا: "یعنی ایک آدمی اپنی لونڈی فروخت کرتے وقت کہے کہ میں اپنی یہ لونڈی اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ جب تو اسے فروخت کرے تو میں اس کا زیادہ حقدار ہوں۔"
حضرت ابو عبداللہؒ سے اس نفع کے بارے میں پوچھا گیا جس کا ضمان نہیں لیا۔
فرمایا: "انسان قبضہ کرنے سے پہلے ہی فروخت کرتا ہے۔"
حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا گیا: "ایک آدمی غلے کا بڑا ڈھیر خریدتا ہے تو کیا اسے ناپنے سے پہلے فروخت

کر سکتا ہے ؟"

فرمایا: "نہیں"۔

ان سے بیع مباطع (ایک دوسرے کو فریب کی بیع) کے بارے میں پوچھا گیا: فرمایا:

"میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا، مکان کی چھت میں اس کے مالک کی سمت میں سونا ہے"۔

فرمایا: "ہاں، یہ مکروہ ہے"۔

اور فرمایا کہ "اسے دُور کر دیا جائے"۔

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا،

"ایک آدمی کے پاس نشہ آور شکیزہ ہے، کیا اُسے دُور کر دیا جائے ؟"

فرمایا: "جب اسے نشہ ہُوا تو کیا چیز باقی رہ گئی؟ ہاں اسے دُور کر دیا جائے یا خود ہٹ جائے"۔

میں نے پُوچھا، "ایک آدمی کو جبر سے شراب پلائی جا رہی ہے"۔

فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شربِ خمر میں روایت ہے: "البتہ جب تک سزا نہ دیں نہ پیٹے"۔

میں نے کہا، "اگر وہ اسے قتل کرنے کا حکم دیں تو ؟"

فرمایا: "قتل! اللہ تعالیٰ کے ہاں مقتول نہ ہوگا"۔

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پُوچھا،

"ایک آدمی عیسائی کے پاس مکان فروخت کرتا ہے ؟"

فرمایا: "نہیں، فروخت نہ کرے۔ کیا وہ اس میں کفر نہیں کرے گا ؟" اور ان میں جو ناپسندیدہ باتیں ہوتی ہیں، ان کا ذکر کیا۔

حضرت ابو عبداللہؒ نے مجھے بتایا: "عبدالوہاب نے تجھے میرے مکہ کی طرف چلے جانے کے بارے میں کیا کہا ؟"

میں نے بتایا کہ انھوں نے فرمایا ہے، کہ "میں آپ کے لیے وہاں جانا ٹھیک نہیں سمجھتا۔ آپ یہاں قریب ہو کر نہیں بچتے۔ وہاں دُور جا کر کیسے بچیں گے ؟"

فرمایا: "ایک نیک آدمی نے اشارہ کیا کہ میں نہ جاؤں۔ انہیں بتا دو کہ جیسے آپ نے اشارہ کیا۔ میں نے قبول کر لیا حالانکہ ہم نے ان کی بعض ضروریاتِ سفر بھی خرید لی تھیں"۔

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پُوچھا،

"ایک آدمی نے حج کا تلبیہ کہا اور اس کے پاس کچھ چیز نہیں اس پر قرض بھی ہے"۔

فرمایا: "قرض خواہوں سے اجازت لیے بغیر حج کو جانا جائز نہیں"۔

پھر فرمایا: "اس نے اپنے آپ پر حج لازم کر لیا۔"

میں نے حضرت ابُو عبداللہؑ سے پُوچھا،

"ایک آدمی کی نابینا والدہ ہے۔ مرد کے پاس مال ہے کیا ماں کی طرف سے حج کرے؟"

فرمایا: "اگر عورت سواری نہیں کر سکتی تو اس کی طرف سے حج کرے۔"

فرمایا: "مجھے حیرت ہے کہ صرف قرابت کی طرف سے ہی حج کرتا ہے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؑ سے کہا،

"میں اپنے اصحاب میں سے ایک آدمی کو غسل دینے کے لیے اندر آیا تو دیکھا کہ اہلِ خلاف میں سے ایک آدمی داخل ہوا۔ میں نے اس کا نام لیا" تو فرمایا: "جہاں تو ٹھہرا اور اسے نہلایا وہیں تو ٹھہرا رہا۔ اگر تُو نکل آتا تو پھر بھی اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ وہ ہمارا کوئی اور آدمی لا کر کام نہ بنا لیتا۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؑ سے پُوچھا،

"ایک آدمی فوت ہو گیا اور کتابیں چھوڑ گیا۔ اس کے وارث بھی ہیں۔"

فرمایا: "کتابوں کو دفن کر دیا جائے۔" اگر چھوٹے بچے وارث ہوں۔

فرمایا: "جس کو وصیت کی جائے وہ دفن کرے۔"

حضرت ابوعبداللہؑ نے فرمایا کہ "ہیجڑوں کو ملک سے نکال دیا جائے۔"

حضرت ابوعبداللہؑ سے پُوچھا گیا "ایک عورت کو مالی فراخی ہے۔ اس کا خاوند غائب ہے۔ کیا اسے حج کرنے کی اجازت ہے؟"

فرمایا: "خاوند کو لکھے۔ اگر اجازت دے تو ٹھیک، ورنہ کسی محرم کے ہمراہ حج کر سکتی ہے۔"

کہا گیا، "اگر خاوند موجود ہو اور وُہ علم کے باوجود محرم کے ساتھ بھی جانے سے منع کرتا ہو تو پھر؟"

فرمایا، "ہاں وہ جا سکتی ہے اور خاوند کو حج سے منع کرنے کی اجازت نہیں۔"

فرمایا: "البتہ محرم کے سوا دوسرے کسی کے ساتھ نہ جائے اور اگر اس کا رضاعی بھائی ہو تو جا سکتی ہے۔"

حضرت ابوعبداللہؑ سے پُوچھا گیا،

"ایک آدمی نے مکان اور دکان کرایہ پر لیے۔ پھر جس کرایہ پر لیے اس سے زیادہ کرایہ پر اٹھا دیے۔"

فرمایا: "اس میں اختلاف ہے۔" اور جواب نہیں دیا۔

ان سے کہا گیا، "ایک آدمی کی اپنی زمین میں درخت ہے اور اس کی شاخیں دوسرے کی زمین میں ہیں۔ اسکا کیا حکم ہے؟"

فرمایا: "شاخیں کاٹ لے۔"

کہا گیا: "اگر وہ مصالحت کرے کہ غلہ دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا تو؟"

فرمایا: "مجھے خبر نہیں۔"

اگر محرم آدمی شکار کھانے پر مجبور ہو جائے تو اس کے بارے میں امام عبداللہؒ نے فرمایا:

"وہ مردار کھا رہا ہے۔" فرمایا:

"مردار کے بارے میں میرا مسلک ابن حکیمؒ کی حدیث کی طرف ہے کہ "ہمارے پاس حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک ماہ پہلے آپؐ کا مکتوب آیا (فرمایا) مردار سے کچھ چیز کا نفع حاصل نہ کرو۔"

میں نے ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"ایک محرم آدمی شکار ذبح کرے تو کیا اس سے کھا لیا جائے؟"

فرمایا: "نہیں۔ یہ ذبح نہیں ہے۔ یہ نہیں کھایا جائے گا۔"

میں نے کہا: "ایک آدمی نے اپنی ڈاڑھ اکھیڑ دی۔ پھر اس جگہ واپس رکھ دی اور تین روز اس حال میں رہا پھر اکھیڑ دی۔ اب آپ کا کیا حکم ہے؟"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نمازوں کا اعادہ کرے۔ اس نے مردار میں نماز ادا کی۔"

فرمایا: "مجھ پر جلدی نہ کرو۔" ایک گھڑی خاموش رہے پھر فرمایا:

"کسی قدر دُور کی یہ بات ہے۔ ہاں اگر وہ کسی حلال کھائے جانے والے جانور مثلاً بکری کا دانت لے کر رکھ لیتا تو کچھ حرج نہ تھا۔" اور اس صورت میں فرمایا:

"میرے نزدیک نماز میں لوٹا لینا ہی زیادہ پسندیدہ بات ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"چرخے کے دمکھڑے میں اون فروخت کی جاتی ہے اور شاید وہ مری ہو۔"

فرمایا: "اگر علم ہو تو ایسا نہ کرے۔"

میں نے کہا:

فرمایا: "اگر گدھے کا ہو تو بہت مکروہ ہے۔"

میں نے پوچھا: "پھر آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "جو نہیں جانتے اس میں مباحثہ بھی نہ کرو۔"

میں نے کہا: "ایک تنور میں خنزیر جھونا گیا، کیا اس میں روٹی پکائی جائے؟"

فرمایا: "نہیں، جب تک اسے دھو نہ لے اور اس کے اندر جو ہے اسے اکھیڑ نہ دے۔"

میں نے کہا: "کیا اسے توڑ دیا جائے؟"

فرمایا: "نہیں۔"

میں نے کہا: "گدھوں سے گندم روندوائی جاتی ہے وہ اس میں پیشاب کر دیتے ہیں۔ پھر اسے دھوئے بغیر پسوا لیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

فرمایا: "یہ نہ کھائی جائے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا، "ایک آدمی پوچھ رہا ہے کہ جس کے پاس ایک بیوی ہو کر اس میں سکون حاصل کرلے اور روٹی ہو کر کھالے تو وہ نعمت والا آدمی ہے۔"

فرمایا: "اس نے سچ کہا۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے سنا۔ وہ کمائی کا ذکر کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ کی کمائی کو افضل تر کھانا قرار دیا۔

میں نے انہیں بتایا کہ عبدالوہابؒ کہہ رہے ہیں کہ ابو عبداللہؒ سے کہہ دو: مجھے حدیث کے بارے میں خطرہ ہے کہ کوئی چیز اس سے روک نہ دے۔

فرمایا: "حدیث سے انہیں کیا چیز روکے گی؟"

فرمایا: "کمائی اور معاشی ضروریات میں انہماک۔"

فرمایا: "یہ کام یعنی کمانا، ان پر زیادہ لازم ہے۔"

حضرت مروزیؒ بتاتے ہیں کہ میں نے اپنے بعض اصحاب سے سنا، فرماتے: کہ میں نے جمعہ میں حضرت ابوعبداللہؒ کو دیکھا۔ ایک آدمی مانگ رہا تھا۔ ایک آدمی نے کپڑے کا ٹکڑا دیا تاکہ سائل کو دے دیا جائے۔ انہوں نے یہ پکڑ کر سائل کو دے دیا۔

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے کہا:

"میرا ایک پڑوسی ہے اور مجھے علم ہے کہ وہ بھوکا ہے تو کیا کروں؟"

فرمایا: "اس کی غمگساری کرو۔"

میں نے کہا: "اگر میرے پاس صرف دو روٹی ہوں تو؟"

فرمایا: "کچھ اسے کھلا دو، جو حدیث میں آتا ہے کہ یہ پڑوسی کے بارے میں ہے۔"

میں نے حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا:

"جب آدمی کے پاس دو قمیصیں یا دو جُبّے ہوں تو کیا اس پر مواسات لازم ہے؟
فرمایا "جب ایک قوم کے پاس اس قدر ہو کہ کپڑے پر کپڑا ڈال سکیں تو ان پر مواسات لازم کیوں نہیں؟"
حضرت مروزیؒ نے بتایا کہ میں نے حضرت یحییٰ جلاءؒ اور ابو طالبؒ کو فرماتے سنا:
"ہم نے یزید بن ہارون سے سنا۔ ان سے سُرمہ زدہ سکّہ کے بارے میں پُوچھا گیا۔ فرمایا: "حرام ہے، درست نہیں۔"
ان سے پُوچھا گیا:
"اے ابو خالد، اگر دونوں راضی ہوں تو؟"
فرمایا: "دونوں زانی راضی ہوتے ہیں تو کیا یہ حلال ہے؟"
بتاتے ہیں کہ انھوں نے یہ بتایا کہ میں نے عبدالوہابؒ کو یہ بتاتے سُنا کہ حضرت ابو اسامہؓ فرماتے ہیں:
"سرمہ زدہ میں ہاتھ کاٹا جائے یعنی جو ایسا غلط سکّہ بناتا ہے۔"
میں نے حضرت ابو عبداللہؒ کو کہا:
"میں نے ایک آدمی کو دس درہم قرض دیا۔ اس نے سُرمہ زدہ درہم واپس کیے اور میں نے وُہ درہم لے لیے۔"
فرمایا، "تو نے اپنا حق پُورا نہیں کیا۔"
میں نے کہا، "ایک آدمی نے مجھے سُرمہ زدہ دینار دیے اور میں انہیں صاف کر رہا ہوں۔"
فرمایا، "ان کی صفائی مالکِ دینار کے لیے بہتر بات ہے۔"
حضرت مروزیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے یحییٰ جلاءؒ کو سُنا، وہ شعیب بن حرب سے نقل کر رہے تھے۔ فرمایا،
"میں اپنے بیٹے کو ایک درہم صاف کرتا دیکھوں تو مجھے یہ اس کی اس بات سے زیادہ محبوب ہے، کہ وہ گھوڑے پر اللہ کی راہ میں سوار ہو کر جائے۔"
بتایا کہ حضرت ابو عبداللہؒ نے مجھے ایک دینار دیا اور فرمایا:
"اس کے کھرے دراہم لے آؤ۔"
میں دراہم لے کر آیا تو دوسرے روز ان میں سے ایک کھوٹا درہم نکل آیا۔ میں نے کہا:
"لائیے، میں بدل دوں۔"
فرمایا: "اس میں علماءؒ کا اختلاف ہے اور اس مسئلہ میں چار اقوال ہیں:
۱۔ سکّہ (خالص) معیوب ضرور ہوگا۔
۲۔ حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں، "جس قدر درہم ناقص ہو، دینار میں سے اس قدر اسے حصّہ ملے گا۔" میں اس قول

کا مطلب نہیں سمجھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے پوچھا،

"آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا، "مجھے امید ہے کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔"

۳۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے،

"اسے واپس کرنے کا حق نہیں۔"

حضرت ابوعبداللہؒ فرماتے ہیں:

"معاملہ ایسے نہیں۔" اس لیے کہ یہ قول کسی مجہول آدمی نے نقل کیا ہے۔

۴۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں:

"اسے واپس کرنے کا حق حاصل ہے۔"

پھر فرمایا،

"حضرت قتادہؓ کا قول اس لیے زیادہ وسعت رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرو اور واپس کر دو۔"

چنانچہ مجھے دیا اور میں نے بدل دیا۔

حضرت مغیرہؒ نے حضرت ابراہیمؒ سے روایت کیا کہ ان کے نزدیک دینار کے عوض دراہم لینا مکروہ ہے جبکہ دراہم کھوٹے دیے جائیں۔

حضرت وکیعؒ نے حضرت سفیانؒ سے، انہوں نے ایک آدمی سے اور اس نے حضرت حسنؒ سے پوچھا؟ ایک آدمی دینار خرچ کر رہا ہے اور کھوٹے درہم دے رہا ہے!!

فرمایا، "اسے بدلوانے کی اجازت ہے۔"

حضرت سفیانؒ نے فرمایا،

"اگر یہ کھوٹے یا جعلی ہوں تو واپس کر دے اور دینار میں وہ بقدر حصّہ شریک ہے۔"

حضرت محمد بن جعفر سے پوچھا گیا،

"ایک آدمی نے دینار کے عوض دراہم لیے اور یہ شرط لگا دی کہ کوئی درہم واپس نہیں کروں گا۔"

فرمایا، "ہمیں سعیدؒ نے حضرت قتادہؓ سے، انہوں نے حضرت حسنؓ سے نقل کیا کہ اگر کوئی کھوٹا درہم ہو گا تو واپس کر سکتا ہے۔ البتہ دونوں اس کی شرط نہ لگائیں۔"

حضرت ابوعبداللہؒ سے پوچھا گیا،

"ایک آدمی اجرت پر لکھتا ہے۔ ایک سو صفحات کا معاوضہ دس درہم مقرر ہوئے مگر اسے ایک دینار

دیا گیا۔"

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

"اگر ایک چیز کرایہ پر لے اور اسے دینار دے اور انہیں صرف کرے تو کچھ ہرج نہیں۔"

فرمایا، "البتہ اس زمانے کے نرخ پر دینار دیے جائیں اور ایک دانق کی زیادتی بھی نہ ہو۔"

میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پوچھا:

"گدی کی جگہ منڈانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

فرمایا: "یہ مجوسیوں کا فعل ہے۔"

فرمایا: "حضرت حذیفہؓ کو ایک دعوت میں بلایا گیا۔ انہوں نے وہاں عجم کی کوئی بات دیکھی تو وہاں سے نکل آئے اور فرمایا:

"جس نے جس قوم سے مشابہت کی وہ اسی میں ہے۔"

حضرت ابو عبد اللہؒ صرف پچھنے لگوانے وقت ہی گدی منڈواتے۔ میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پوچھا:

"چہرہ کو بالوں سے صاف کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "چہرے پر قینچیاں آیا کرتی ہیں" اور چہرہ سے موچنے کے ذریعہ بال لینے کو مکروہ جانا۔

فرمایا، "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشانی سے بال اکھڑنے والی عورتوں پر لعنت کی۔"

میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پوچھا،

"ایک عورت اپنے بالوں کے ساتھ موباف ملالیتی ہے۔" انہوں نے اسے ناپسند کیا۔

ایک عورت حضرت ابو عبد اللہؒ کے پاس آئی اور کہا،

"میں عورتوں کی کنگھی کرتی ہوں اور عورتوں کے سر کے بالوں میں موباف ملاتی ہوں تو کیا اس کمائی سے حج کر سکتی ہوں؟"

فرمایا، "نہیں۔"

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کمائی کو ناپسند کیا۔

حضرت ابو عبد اللہؒ نے فرمایا،

"حج تو پاکیزہ مال سے ہونا چاہیے۔"

میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ سے پوچھا،

"ایک بڑی عمر کی عورت اپنے سر کے بالوں میں موباف ملاتی ہے۔"

انہوں نے اجازت نہیں دی اور فرمایا:

"چاہے سفید بال ہو جائیں"۔ اور مسکرا دیے۔

میں حضرت ابو عبداللہؒ کے پاس گیا۔ ایک عورت اپنی لڑکی کو کنگھی کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا: "اس کے بالوں میں موباف ملا کر کنگھی کرو"۔

اس نے جواب دیا: "بچی کو اس کی اجازت نہیں"۔

اور اس بچی نے کہا: "میرے والد اس سے منع کرتے ہیں"۔ اور کہا:

"وہ ناراض ہوتے ہیں"۔

حضرت ابن جریجؒ بتاتے ہیں کہ ابوالزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا:

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے منع کرتے کہ کوئی عورت اپنے سر (کے بالوں) میں کچھ چیز ملائے"۔

ابوبکرؒ بتاتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو عبداللہؒ کو سر منڈوانے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اسے ناپسند کیا (یعنی استرا نہ پھروائے)۔ میں نے کہا:

"آپ اسے ناپسند کرتے ہیں؟"

فرمایا: "مجھے اس سے سخت کراہت ہے"۔

پھر فرمایا: "حضرت عمرؓ سر منڈانے کو ناپسند کرتے"۔

حضرت ابو عبداللہؒ، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال سے کرتے کہ انہوں نے ایک آدمی کو فرمایا:

"اگر میں نے محلوق (سر استرے سے منڈایا ہوا) دیکھتا تو میں اس پر مارتا جس میں تیری دو آنکھیں ہیں"۔

حضرت ابوبکرؒ نے فرمایا:

"میں نے اپنے اصحاب میں سے ایک آدمی کو حضرت ابو عبداللہؒ کے پہلو میں نماز پڑھتے دیکھا۔ اس کے بال جڑ سے صاف ہو چکے تھے۔ حضرت ابو عبداللہؒ نے سمجھا کہ اس کا سر منڈا ہے۔ انہوں نے رات کو اسے دیکھا تو مجھے فرمایا: "اسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں"۔

فرمایا: "میں نے چاہا کہ سر منڈانے کی وجہ سے اس پر سختی کر دوں"۔

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ کو حقنہ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: "اگر ضرورت ہو تو کچھ حرج نہیں"۔

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ کو دیکھا کہ انہوں نے ختنہ والے کے تھال میں دو درہم ڈالے۔ میں نے انہیں یہ فرماتے سنا:

"اگر کسی اخروٹ کے ساتھ سکے کھیلے ہوں تو اسے کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے پوچھا کہ درندوں کا چمڑہ بچھانا کیسا ہے؟"

فرمایا: "انہیں نیچے نہ بچھایا جائے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نیچے بچھانے کی ممانعت فرمائی۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"ایک آدمی نے اپنے سامانِ تجارت پر غلام کو بٹھا دیا۔ اس نے کسی نامناسب کمائی والے کے پاس کچھ کپڑا فروخت کیا اور وہ دراہم لے کر تھیلی میں ڈال دیئے۔ آدمی آیا تو غلام نے اس کی اطلاع دی اس آدمی نے تھیلی لی اور یوسف بن اسباط کے پاس گیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت یوسفؒ نے ثوریؒ اور ابنِ مبارکؒ سے نقل کیا۔ میرے دل میں یہی آتا ہے کہ اس تھیلی کو صدقہ کر دوں۔"

حضرت ابو عبداللہؒ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس میں برکت کرے۔"

حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا گیا:

"ایک آدمی محتاج ہے۔ اس کے بھائیوں میں سے ایک آدمی نے اسے کچھ چیز دی۔ اسے اگر قبول نہ کرے تو اسے ڈر ہے۔ اب کیا کرے؟"

فرمایا: "یہ مانگنے اور اشرافِ نفس کے بغیر مال آیا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر قبول نہ کیا تو اس پر تنگی ہوگی۔"

بتلاتے ہیں کہ میں نے ان کے پاس ایک مزدور سے آٹا اٹھوا کر لایا۔ فرمایا:

"تو نے اسے مزدوری دے دی؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

انہوں نے ایک روٹی نکالی اور کہا:

"یہ بھی اسے دے دو۔" میں نے اسے روٹی دی تو مزدور نے کہا:

"ارے تیرا ناس ہو، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی سے کچھ چیز قبول کی ہو۔ لیکن حضرت ابو عبداللہ کا ہدیہ واپس نہیں کروں گا۔ اس سے برکت حاصل کروں گا۔"

ایک بار دوبارہ میں ان کے پاس مزدور سے کچھ اٹھوا کر لایا۔ انہوں نے اسے روٹی دی تو مزدور نے کہا:

"میرے نفس پر اشراف پایا گیا ہے اب فرمائیے؟"

ابو عبداللہؒ مسکرا دیے اور فرمایا:

"اگر چاہو تو واپس کر دو لیکن ہمیں یہی پسند ہے کہ قبول کر لو۔" چنانچہ اس نے قبول کر لیا۔

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"باریک پنکھوں کے کاروبار کا کیا حکم ہے؟ بسا اوقات ایسے پنکھوں کی قیمت ایک درہم یا اس سے زیادہ بھی ہوتی ہے۔"

فرمایا: "یہ بمنزلۂ باریک کپڑے کے ہے۔"

میں نے کہا: "اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "جب اسے کسی تاجر کی جانب سے فروخت کرے تو کچھ ہرج نہیں۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"قرآن مجید بوسیدہ ہے۔ اس کے دفن کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "دفن کر دیا جائے۔"

میں نے کہا: "ایک آدمی کو اس کی والدہ بلا رہی ہے اور وہ نماز میں مشغول ہے۔ اب کیا کرے؟"

فرمایا: "حضرت ابن منکدرؒ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"اگر نفلی نماز میں مشغول ہو تو جواب دے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پوچھا:

"ایک آدمی کا کاغذ گر گیا جس میں احادیث اور کچھ فوائد ہیں۔ میں نے اسے اٹھایا۔ کیا اسے نقل کر لوں اور دوسروں کو سناؤں؟"

فرمایا: "نہیں، مالک کی اجازت کے بغیر ایسا نہ کرو۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے پرہیزگاری کے بارے میں ایک بات پوچھی تو اس نے سر جھکا دیا اور خاموش رہے۔ بسا اوقات کسی کے سوال پر ان کا رنگ متغیر ہو جاتا اور فرماتے: "استغفراللہ۔"

میں نے پوچھا: "اے ابو عبداللہؒ! آپ کی کیا رائے ہے؟"

فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے معاف رکھو۔"

میں نے کہا: "اگر میں آپ کو چھوڑ دوں تو کس سے پوچھوں؟ آج تو متکبرین اور اناڑی بھی علماء ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔"

فرمایا: "یہ معاملہ بہت سخت ہے۔"

فرمایا: "میں چالیس برس سے فقدان (کمی اشیاء) میں ہوں۔" اور فرمایا:

"دنیا جس قدر کم ہوگی حساب اسی قدر کم ہوگا۔"

میں نے کہا: "ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ احمد بن حنبل اور بشر بن حارث میرے نزدیک دونوں ہی زاہد نہیں۔ احمد کے پاس روٹی ہے اور وہ کھاتے ہیں اور بشر کے پاس خراسان سے دراہم آتے ہیں۔"

حضرت ابو عبداللہؒ یہ سن کر مسکرا دیے اور فرمایا:

"زاہدوں میں سے میں ہوں۔"

ایک بار فرمایا: "تیمی کو ایک شک ہوا چنانچہ اس میں انہوں نے بیس برس تک خیمہ لگائے رکھا۔" ایک مترف قوم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"ان کا قرب فتنہ ہے اور ان کے ہمراہ بیٹھنا بھی فتنہ ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا، کہ حضرت ابن مبارکؒ کے آزاد کردہ غلام نے مجھے بتایا کہ سعید بن عبدالغفار نے حضرت ابن مبارکؒ سے پوچھا:

"کرایہ پر ایک ناپسندیدہ کمائی والے کے مکان میں ٹھہرنا کیسا ہے؟"

فرمایا: "اس میں کچھ حرج نہیں۔"

میں نے حضرت ابو عبداللہؒ سے کہا:

"جب آپ نے ایک ناپسندیدہ کمائی والے کے مکان میں ٹھہرنے کی اجازت دی تو ایک غلہ کا کمرہ خریدے تو کیا کرایہ پر اس میں رہ لیں؟"

فرمایا: "نہیں۔"

حضرت ابو وہبؒ فرماتے ہیں کہ ابو عبداللہؒ یعنی ابن مبارک نے اس آدمی کے بارے میں فرمایا: "جو کسی سے لونڈی خریدتا ہے تو وہ لونڈی عیب دار ہے۔"

فرمایا: "جس کی لونڈی تھی اسے واپس کر دے اور اس کی طرف واپس نہ کرے جس سے خریدی تھی۔"

حضرت سفیان عباس عنبری نے ایک آدمی سے نقل کیا۔ وہ بتاتا ہے کہ میں عباد ان میں عبدالرحمٰن بن مہدی کے ہمراہ تھا اور ہم سیلاب کے پانی سے ہاتھ دھو لیا کرتے تھے مگر وہ ایسا نہ کرتے بلکہ اپنے غلام کو سمندر کا پانی لانے کا حکم دیتے اور اس سے ہاتھ دھوتے۔

عبدالصمد بن مقاتلؒ بتاتے ہیں۔ وہ نحر پر تھے تو سیلابی پانی سے بنے والے مکانات سے خشک نہ کرتے بلکہ

سمندری مٹی منگا کر اس سے خشک کرتے۔

فرمایا: "ابن خشرمؒ نے ہمیں مکتوب لکھا اور اس میں یہ تحریر کیا۔ حضرت بشرؒ عبادان کے ان تالابوں سے پانی نہیں پیتے جنہیں بادشاہوں نے بنوا رکھا ہے اور سمندری پانی پیتے ہیں۔"

حضرت سعید بن غنیمؒ نے محمد بن خالد سے نقل کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ایک اُون کاتنے والی عورت پر گزر ہوا جس کو ام بکر کہتے تھے اور یہ مراد سے تھی۔

انہوں نے فرمایا: "اے ام بکر، اب وقت نہیں آیا کہ اسے چھوڑ دے؟"

اس نے کہا: "اے ابو عمران، میں اسے کیسے چھوڑ دوں جبکہ میں نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا: "یہ پاکیزہ تر کمائی سے ہے۔"

میں نے حضرت ابو عبد اللہؒ کو کہا کہ حضرت ابن مبارکؒ کے آزاد کردہ غلام نے حضرت سعید بن عبد الغفار سے روایت کیا کہ انہوں نے حضرت ابن مبارکؒ سے پُوچھا:

"دو آدمی کسی مکروہ کاروبار میں گئے اور دونوں کو موقع ملا۔ ایک نے قبول کر لیا۔ ایک نے قبول نہیں کیا۔ جس نے قبول کیا جب وہ نکلا تو اس سے قبول نہ کرنے والے نے خرید لیا۔ اب آپ کی کیا رائے ہے؟"

حضرت ابن مبارکؒ خاموش رہے۔ ابن سعیدؒ نے کہا:

"آپ خاموش کیوں ہیں جواب کیوں نہیں دیتے؟"

فرمایا: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جواب دینا میرے لیے بہتر ہے تو جواب دیتا۔"

حضرت سعیدؒ نے کہا:

"اصل بات کراہت نہیں کیا؟"

حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا: "ہاں۔"

حضرت ابو عبد اللہؒ فرماتے ہیں:

"اس کی کس میں تاب ہے؟"

اُن سے پُوچھا: "ایک آدمی نے اس کی اجازت دی اور اس نے گھر خریدا تو کیا میں اس میں رہائش کر دوں؟"

حضرت ابن مبارکؒ خاموش رہے۔ انہوں نے کہا:

"جواب کیوں نہیں دیتے؟"

فرمایا: "یہ بڑی شدت کا مقام ہے۔ میں جواب دینا ناپسند کرتا ہوں۔"

میں نے کہا: "حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں کہ لشکریوں کے قبضہ میں جو کچھ ہے وہ حرام مال ہے۔" حضرت ابو عبد اللہؒ

نے اس پر انکار کیا کہ عبدالوہابؒ نے فرمایا:

"ایک آدمی کے لیے جائز ہے " پھر وہ دوسرے کو مال دیتا ہے تو یہ ایک ہی چیز ہوا۔ فرمایا: "یہ سخت سی بات ہے"۔

میں نے کہا: "آپ پہلے کے لیے مکروہ اور دوسرے کے لیے ہرج نہ ہونا بتاتے ہیں؟"

فرمایا: "پہلے کے پاس بطریق گناہ کے آیا تھا۔ اس لیے مکروہ تھا اور دوسرا پہلے جیسا نہیں۔"

فرمایا: "جس کے پاس مال آئے اور اس کے پیچھے کچھ گناہ کا نشان نظر آئے تو اسے قبول کرکے تقسیم کر دے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو کچھ مال بھیجا، انہوں نے تقسیم کر دیا۔ مروان نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بھیجا۔ انہوں نے بھی تقسیم کر دیا اور حضرت ابن عمرؓ کو بھیجا، انہوں نے تقسیم کر دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھیجا۔ انہوں نے بھی تقسیم کر دیا۔ میں نے پوچھا:

"حضرت ابن عمرؓ نے ان سے کس وجہ سے قبول کر لیا؟" اس لیے کہ ایک گروہ اس بات سے استدلال کرتا ہے کہ اگر یہ مباح نہ ہوتا تو وہ قبول نہ کرتے؛

انہوں نے اس پر انکار کیا اور فرمایا:

"جب انہوں نے گناہ سا دیکھا تو انہوں نے واپس کرنا پسند نہیں کیا اور برابر برابر تقسیم کر دیا۔"

میں نے کہا: "حضرت معاذؓ روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک دینار باقی بچ گیا اور ان کی بیوی نے مانگا۔ انہوں نے بیوی کو دے دیا، اب؟"

فرمایا: "وہ ضرورت مند تھی۔"

میں نے کہا: "آپ کا قول یہ ہے کہ جس پر ایسے مال کا ابتلاء آئے وہ اسے برابر تقسیم کرے۔" مگر جب حضرت ابن منکدرؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنا فقر بیان کیا تو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "اگر میرے پاس دس ہزار ہوں تو بھی تجھے (دے دوں اور) تیری مدد کروں۔"

جب وہ نکلے تو حضرت عائشہؓ کے پاس دس ہزار آ گئے انھوں نے ابن منکدرؒ کو دے دیے، اب؟

فرمایا: "حضرت عائشہؓ کا اس قول پر امتحان ہوا" چنانچہ جب دس ہزار آئے تو اس کے باوجود انہوں نے فوراً دے دیے اور حضرت عائشہؓ کے زہد و تقویٰ کا ذکر کیا اور فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ مثلاً حضرت ابو موسیٰ اشعری اور دوسرے صحابہؓ ان سے سوال کر لیا کرتے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں ان جیسی کوئی بھی صاحب علم و تقویٰ و سخاوت نہ تھیں اور اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔"

ابو یحییٰ ناقد نے ابو طالبؒ سے نقل کیا کہ مجھے عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر نے اپنے والد سے، انہوں نے انصار کے ایک آدمی سے روایت کر کے بتایا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کے کان سے منع فرمایا۔

فرمایا: "ہاں، حدیث میں ایسے ہی ہے جیسے کہا۔"

فرمایا: "قلب کا کان کھانے سے منع فرمایا۔"

فرمایا: "نہیں کھایا جاتا۔"

حضرت عبداللہ بن احمدؒ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا: "اور گلٹی کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

فرمایا: "نہیں کھائی جاتی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اوزاعیؒ کی واصل سے بواسطہ مجاہدؒ کے مروی حدیث میں ناپسند کرتے ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن یزیدؒ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اذنِ قلب کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے اسے پھینک دیا۔ فرمایا:

"تیری ہنڈیا عمدہ ہو گی۔"

یہ کتاب المعاش اور اس کے بارے میں آثار و روایاتِ تقویٰ کے آخری الفاظ ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

فصل ۴۸

حلال و حرام اور مشتبہ کا بیان

حلال کی فضیلت اور حرام کی مذمت

سود حرام ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ان میں کوئی بھی سود خور کے سوا باقی نہ رہے گا۔ جو یہ (سود) نہیں کھائے گا اس کو اس کا غبار پہنچے گا۔" یعنی واللہ اعلم، چاہے کاروبار میں سود نہ لے اور قصداً سود نہ کھائے مگر پھر بھی سود کی کثرت اور ہر مرحلہ پر سود کے پھیلاؤ اور اس سے پرہیز نہ کر سکنے کی وجہ سے سود کا غبار ضرور پہنچے گا جیسے کہ راہ گزر کے نتھنوں میں غیر ارادی طور پر غبار پہنچ جاتا ہے۔

حدیث میں ہے:

"سود کا ایک درہم اللہ عزوجل کے نزدیک (زمانۂ) اسلام میں تیس زنا سے زیادہ بڑا جرم ہے۔" سود خوری پر اللہ تعالیٰ نے جس قدر سخت وعید و زجر کی ہے کسی اور گناہ پر ایسی زجر نہیں کی۔ دو باتیں فرمائیں۔ یہ بہت بڑا جرم ہے اور اس کی سزا سے ڈرایا۔ پہلی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا کرنا گویا اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ

جنگ کرنا ہے اور آخر میں خلود فی النار کی دھمکی دی۔ فرمایا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (اے ایمان والو، جو باقی سود ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایماندار ہو)

پھر ترکِ سود کو شرطِ ایمان قرار دیا۔ یعنی اِنْ شرطیہ لگایا جو کہ شرط و جزا کے لیے ہوتا ہے۔ فرمایا:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ[1] (پھر اگر نہیں کرتے تو خبردار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے)

اسے ظلم بتانے کے بعد اس سے توبہ لازم قرار دی اور فرمایا:

وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (اور اگر توبہ کرتے ہو تو تم کو پہنچتے ہیں اصل مال تمہارے نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے)

پھر اس فرمان میں اس کی صراحت و نص کے ساتھ حرمت بیان کی۔

وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا[2] (اور اللہ نے حلال کیا سودا اور حرام کیا سود)

ان سب کے بعد اس کا دائمی دوزخ میں رہنا بتایا۔ فرمایا:

وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (اور جو کوئی پھر کرے وہی ہیں دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے)

تلاشِ حلال کی فرضیت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"حلال طلب کرنا (دوسرے) فریضہ کے بعد ایک فریضہ ہے۔" چنانچہ اس کے اور فرض میں علم کے درمیان برابری کر دی اور دونوں کو طلب کرنا لازم کر دیا۔ چنانچہ جاہل کے لیے جیسے طلب علم فرض ہے ایسے کمانے کے لیے تلاشِ حلال فرض قرار دیا۔

اور جب فرائض مشروع ہیں تو بہ قیامت ثابت بھی ہیں۔ جب ان کے طلب کرنے کا حکم دیا تو ان کا پایا جانا بھی ثابت ہوا۔ اس لیے کہ معدوم چیز کی طلب فرض نہیں کی جاتی۔

چنانچہ طلب حلال ہم پر فرض ہے اور اس کی تلاش کا حکم دیا گیا تو حلال یقیناً موجود ہے۔ البتہ یہ ذرا تنگی کی

---

[1] البقرہ ۲۷۹

[2] البقرہ ۲۷۵

راہ ہے۔ اس کی صورتیں دقیق ہیں اور ان کے ذرائع پُر مشقت ہیں اور کم مقدار ہیں اور تکلف سے خالی مقدار ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلال کی تلاش کرنے والے کم تر اور خال خال ہیں اور عام لوگ اس سے کتراتے ہیں۔

وَ عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔[1] (اور شاید تم بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تم کو)

پھر فرائض کے علوم و احکام بھی ہیں جو ان کے علوم سے آگاہ نہیں اور ان کے احکام کی پابندی نہیں کرتا گویا وہ ان سے جاہل ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار والوں کو درہ لگاتے اور فرماتے:

"ہمارے بازار صرف وہی کاروبار کرے جو علمِ تجارت سے آگاہ ہو ورنہ وہ سُود کھائے گا۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"تجارت کا علم حاصل کر پھر بازار میں جا کر خرید و فروخت کر۔" اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں۔ حلال و حرام اور خرید و فروخت کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔ جب انسان بازار میں جائے تو اس کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

تلاشِ حلال کی فضیلت

حدیث میں ہے:

"جس نے حلال (روزی) میں اپنے (اہل و) عیال پر محنت کی وہ اللہ کی راہ میں مجاہد کی طرح ہے اور جس نے سوال سے بچنے یعنی) عفت کی خاطر دنیا طلبی کی وہ درجۂ شہداء میں ہے۔"

بتاتے ہیں کہ جب انسان حلال کا پہلا نوالہ کھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیتا ہے اور جس نے تلاشِ حلال میں اپنے آپ کو ذلت میں ڈالا اس کے گناہ اس طرح جھڑ گئے جیسے کہ سرما کے موسم میں درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ جب وہ خشک ہو جائے۔

ایک عالم نے ایک مجاہد کو فرمایا:

"تم بہادروں والا کام کہاں کرتے ہو؟ یعنی حلال کمانا اور اہل و عیال پر خرچ کرنا۔"

حضرت شعیب بن حرب وغیرہ فرمایا کرتے تھے:

"حلال کمائی کے ایک دانق (پیسہ) کو حقیر نہ جان۔ تو اسے اپنے آپ پر یا اپنے عیال پر یا اپنے کسی بھائی پر خرچ کرے گا تو شاید ابھی وہ تیرے پیٹ تک نہیں پہنچے گا یا دوسرے کے پیٹ تک نہیں پہنچے گا کہ تیری بخشش

---

[1] البقرہ

ہو جائے گی۔"

حدیث میں ہے،

"جس نے چالیس روز حلال کھایا اللہ تعالیٰ نے اس کا دل منور کر دیا اور اس کے دل سے حکمت کے چشمے جاری کیے۔"

ایک روایت میں ہے،

"اللہ تعالیٰ نے اسے دُنیا میں زاہد بنا دیا۔"

کہتے ہیں کہ جس نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا وہ اس امت کے ابدال میں سے ہے۔ حضرت سہل فرمایا کرتے تھے،

"بندہ اسی وقت ہی حقیقی ایمان تک رسائی حاصل کرتا ہے جبکہ وُہ پرہیزگاری کے ساتھ حلال کھائے۔"

حضرت ابراہیم بن ادھم اور فضیل بن عیاض رحمہما اللہ سے مروی ہے،

"حج کے ساتھ نجابت و فضل حاصل نہیں ہوتی، اور نہ ہی جہاد، روزہ اور نماز سے وُہ نجابت حاصل ہوتی ہے بلکہ ہمارے نزدیک شرف و نجابت اس سے ملتی ہے کہ پیٹ میں جانے والی چیز سے آگاہ ہو یعنی روٹی حلال کی ہو۔"

حضرت یوسف بن اسباط نے حضرت شعیب بن حرب کو فرمایا:

"سمجھتے ہو کہ نماز باجماعت سنت ہے اور حلال کمانا فرض ہے۔"

انہوں نے جواب دیا: "ہاں۔"

ایک آدمی نے حضرت ابراہیم بن ادھم سے پُوچھا:

"میں بازار میں کام کرنے والا آدمی ہوں۔ جب کام پر ہوتا ہُوں تو لگا ہے جماعت رہ جاتی ہے۔ آپ کو کیا پسند ہے کہ نماز باجماعت ادا کروں یا کماتا رہوں؟"

فرمایا، "حلال کماؤ تو تم جماعت میں شریک ہو۔"

ماہِ رمضان میں حضرت ابراہیم بن ادھم اور ان کے رفقاء کھیتی کاٹنے کا کام کرتے اور حضرت ابراہیم نے انہیں فرمایا:

"دن کو اپنے کام میں نصیحت کرنے کی پابندی رکھو تاکہ حلال کھاؤ۔ اور ایسا کرکے چاہے رات کو نفل نماز نہ پڑھو۔ اس لیے کہ تمہیں باجماعت نماز اور رات کو نماز پڑھنے والوں کا سا اجر مل جائے گا۔"

بعض سلف کا فرمان ہے:

"تین اشیاء افضل ہیں:

۱۔ سنت کے مطابق عمل کرنا۔

۲۔ حلال درہم۔

۳۔ نماز باجماعت۔"

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"انسان اس (تصوف وتزکیہ) کی حقیقت تک اس وقت ہی رسائی حاصل کرسکتا ہے جبکہ وہ یہ چار باتیں پوری کرے:

۱۔ فرائض کو سنت کے ساتھ ادا کرے۔

۲۔ تقویٰ کے ساتھ حلال کھانا۔

۳۔ ظاہر و باطن میں ممنوعات سے بچنا۔

۴۔ موت تک اس کی پابندی کرنا۔"

فرمایا: "جس کا کھانا حلال نہ ہو اس کے قلب سے حجاب نہیں کھلتا اور اس کے دل سے سزا نہیں ہٹتی۔ اور وہ نماز روزے کی پرواہ نہیں کرتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کردے تو الگ بات ہے۔"

اور فرمایا: "جو یہ چاہے کہ اپنے دل میں خوفِ الٰہی دیکھے اور صدیقین کی علامات کا مکاشفہ حاصل کرے تو وہ حلال کے سوا نہ کھائے اور سنت یا ضرورت کے بغیر کوئی کام نہ کرے۔"

فرمایا کرتے: "دو چیزوں کی وجہ سے وہ مشاہدۂ ملکوت سے محروم رہے اور رسائی میں حجاب آگیا:

۱۔ برا کھانا۔

۲۔ مخلوق کو ایذا دینا۔"

فرمایا کرتے: "تین صدیوں کے بعد کسی کی توبہ صحیح نہیں ہوگی۔"

پوچھا گیا: "کیوں؟"

فرمایا: "روٹی خراب ہوجائے گی اور وہ (مشتبہ یا حرام) روٹی سے صبر نہیں کریں گے۔"

حضرت مرۃ الطیب نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے:

"جس جسم کو حرام کی غذا دی گئی وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (اور) آگ اس کی زیادہ مستحق ہے۔"

ایک روایت میں ہے کہ آپؓ نے اپنے غلام کی کمائی سے کھایا۔ پھر اس سے پوچھا کہ کہاں سے تھا؟

اس نے جواب دیا: "میں نے ایک قوم کے لیے جھاڑ کیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیا۔"

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"میں نے ان کے لیے فال نکالی تھی۔" چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے منہ میں انگلی ڈال کر قے کر دی اور آخری لقمہ تک قے کر کے باہر نکال دیا۔ پھر فرمایا:

"اے اللہ! رگوں میں جو چلا گیا اور جو انتڑیوں میں پہنچ چکا میں اس کی معذرت چاہتا ہوں۔"

روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی تو فرمایا:

"کیا تم جان گئے کہ صدیق کے پیٹ میں پاکیزہ کے سوا کچھ نہیں جاتا۔"

ایک روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ دعا کیجئے، اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔

فرمایا: "اے سعدؓ، غذا پاکیزہ رکھو، تمہاری دعا قبول ہوگی۔"

حرام کی سزا

ایک عالم کا فرمان ہے:

"غذا غلط ہونے کی وجہ سے انسان کی دعا آسمان سے ورے ہی اٹک جاتی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے کی دعا اسی وقت ہی قبول کرتا ہے کہ جب اس کی غذا درست ہو اور اس کا عمل پسندیدہ ہو۔"

سلفؒ کی ایک جماعت کا فرمان ہے:

"جہاد کے دس حصے ہیں، نو حصے حلال میں ہیں۔"

حضرت علی بن فضیل نے اپنے والد سے پوچھا:

"اے ابا جان! کیا حلال قلیل ہے؟"

فرمایا: "اے بیٹے! اگرچہ یہ قلیل ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ قلیل بھی کثیر ہے۔"

کہتے ہیں: "جس نے نماز پڑھی اور اس کے پیٹ میں حرام کا کھانا ہے یا اس کی پشت پر حرام کا کپڑا ہے تو اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"اے مسکین، جب تو نے روزہ رکھا تو دیکھ کس کے پاس افطار کر رہا ہے اور کس کا کھانا کھا رہا ہے"، اس لیے کہ کہا ہے ایک آدمی ایک غذا کھاتا ہے اور اس کا دل بدل جاتا ہے اور ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے چمڑہ خراب ہو جائے پھر وہ کبھی بھی اپنے حال پر واپس نہیں آتا۔ یہ دراصل حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی ایک تاویل ہے فرمان یہ ہے:

"کئی روزے دار ایسے ہیں کہ جن کو روزے کا حصّہ صرف بھوک اور پیاس ہی حاصل ہے۔"

فرمایا، "یہ وُہ آدمی ہے کہ جو حرام (غذا) سے روزہ رکھے اور افطار کرے۔"

ایک روایت میں ہے،

"جس نے فخر کرتے ہُوئے اور کثرت کرتے ہُوئے حلال دُنیا طلب کی۔ وُہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضبناک ہوگا۔"

آثارِ سلف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک واعظ اور نصیحت کرنے والا بیٹھ کر لوگوں کو وعظ کرے تو اہلِ علم کو اس کے بارے میں تین باتیں تلاش کرنی چاہئیں:

۱۔ اس کے عقیدہ کی صحت دیکھیں۔

۲۔ اس کی عقلی پختگی دیکھیں۔

۳۔ اس کی غذا دیکھیں کیسی ہے۔

اب اگر وُہ بدعتی ہوں یا عقیدہ میں خرابی ہو تو اس کے پاس مت بیٹھو۔ اس لیے کہ وہ شیطان کی زبان سے بول رہا ہے اور اگر اس کی غذا خراب ہو تو جان لو کہ وہ خواہشِ نفس سے بول رہا ہے اور اگر اس کی عقل پختہ نہیں تو درست باتوں کی بجائے غلط باتیں زیادہ کرے گا۔ اس کے پاس بھی مت بیٹھو۔ افسوس یہ طریقہ دنیا سے ناپید ہو گیا، جو اس پر عمل کرے گا، گویا اسی نے اسے زندہ کیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے حریص کا ذکر کرتے ہُوئے اس کی مذمت کی۔ پھر فرمایا:

"کئی پریشاں بال غبار آلود جو اطرافِ عالم میں دھتکارا ہے اس کی غذا حرام ہے۔ اس کا لباس حرام ہے۔ حرام کھانا دیا گیا، وُہ اپنی نماز میں ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہا ہے: اے پروردگار! اے پروردگار! اب اس کی دعا کیسے قبول ہو؟"

حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ بیت المقدس پر ہر شب کو آواز دیتا ہے۔ جس نے حرام کھایا اس کی کوئی نفلی اور فرضی (عبادت) قبول نہ ہوگی۔"

حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے:

"معدہ، بدن کا حوض ہے اور رگیں اس کی طرف آنے والی (نالیاں) ہیں۔ جب معدہ درست ہُوا تو رگیں اس کی طرف صحت کے ساتھ آئیں گی اور جب معدہ بیمار ہُوا تو رگیں اس کی طرف مرض لے کر آئیں گی۔"

جیسے عمارت میں بنیاد کو اہمیت ہے اسی طرح غذا کو دین میں اہمیت حاصل ہے۔ جب بنیاد پختہ ہوگی

تو عمارت بلند اور پختہ ہوگی اور اگر بنیاد کمزور اور ٹیڑھی ہو تو عمارت گر کر تباہ ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ۔ [1]

(بھلا جس نے دھری بنیاد اپنی عمارت کی پرہیزگاری پر اللہ سے اور رضامندی پر، وہ بہتر یا جس نے نیو رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر ایک کھائی کے۔ جو ڈھلنے پھر اس کو لے کر ڈھ پڑا دوزخ کی آگ میں)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"جس نے حرام کا مال کمایا اگر اس کا صدقہ کیا تو قبول نہ ہوگا اور اگر اپنے پیچھے چھوڑ گیا تو اس کا آگ کی زادِ راہ ہوگا۔"

فرمانِ الٰہی ہے،

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۔ (اور باطل کے ساتھ آپس میں مال نہ کھاؤ)

فرمایا،

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۔ (اور اپنی جانوں کو نہ مارو)

ایک قول یہ ہے کہ جس نے حرام کھایا اس نے اپنے آپ کو قتل کیا۔ اس لیے کہ یہ بات اس کی ہلاکت اور سزا کا باعث ہے۔

حضرت علی وغیرہ رضی اللہ عنہ سے مشہور اخبار میں ہے،

"حلال دنیا حساب ہے اور حرام دنیا عذاب ہے۔"

حضرت یوسف بن اسباط اور سفیان ثوری رحمہا اللہ فرماتے ہیں،

"مشتبہ کے اندر والدین کی کوئی اطاعت نہیں۔"

حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں،

"جو طلبِ حلال کے اندر مقامِ ذلت میں کھڑا ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کا حشر، صدیقین کے ہمراہ کرے اور قیامت کے موقع پر اسے شہداء تک بلندی درجہ عطا فرمائے گا۔"

حضرت ابو سلیمان یا ایک دوسرے عالم کا فرمان ہے،

"جس نے طلبِ حلال سے حیا کی، اس نے فلاح نہ پائی۔"

---

[1] التوبۃ ۱۰۹

فرمانِ الٰہی ہے،

فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا [1] (تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی)

اس کی توضیح میں ہے کہ جس نے حرام کھایا اس کی معیشت تنگ ہو گئی جیسے کہ فرمایا،

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً [2] (تو اس کو ہم زندہ رکھیں گے اچھی زندگی)

یعنی حلال کی وجہ سے۔

جیسے کہ فرمایا،

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا [3] (اے رسولو، کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا)

یعنی حلال کھاؤ۔ چنانچہ نیک عمل سے پہلے حلال غذا کا حکم دیا۔

ایک عالمؒ کا فرمان ہے،

"اعمال کی پاکیزگی حلال کھانے سے ہے، جس قدر کھانا حلال ہوگا۔ اسی قدر عمل پاکیزہ تر اور نافع تر ہوگا۔"

حضرت امام احمد حنبلؒ کا ذکر ہوا تو بشر بن حارثؒ نے فرمایا،

"انہیں مجھ پر تین فضیلتیں حاصل ہیں،

۱۔ انہوں نے اہل و عیال پر صبر کیا اور میں اس سے تنگی محسوس کرتا ہوں۔

۲۔ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے طلبِ حلال کی محنت اٹھاتے ہیں۔" اور فرمایا کہ "میں عمدہ اشیاء کو ان میں زہد کی خاطر نہیں چھوڑتا بلکہ اس لیے چھوڑتا ہوں کہ میرے پاس ان کے لیے صاف درہم نہیں۔ اگر عمدہ کے لیے صاف درہم ہوتا تو میں انہیں کھاتا۔"

حلال کی اقسام

علمائے ظاہر کا بیان ہے،

"حلال دس وجوہ سے ہے۔"

بعض کا فرمان ہے،

"یہ سات اشیاء سے پایا جاتا ہے اور ان سب کی اصل اشیاء کی طرف جاتی ہے،

---

[1] طٰہٰ ۱۲۴

[2] النحل ۹۷

[3] المؤمنون ۵۱

۱۔ صداقت کے ساتھ تجارت۔
۲۔ نصیحت کے ساتھ دستکاری۔
۳۔ حکم کے ساتھ عطا کرنا۔"
پھر عطیہ کی چار اقسام ہیں؛
۱۔ فی (   ) ہو۔
۲۔ میراث ہو۔
۳۔ بخوشئ خاطر ہبہ ہو۔
۴۔ احتیاج ہوتے ہُوئے بھی صدقہ کرنا۔"
ان سب کا مدار و قطب یہ ہے کہ حلال دراصل دو معانی کے لحاظ سے اس کے اسم سے مشتق ہے۔
۱۔ اس سے ظلم دُور ہو گیا۔ (انحل الظلم عنہ)
۲۔ حل العلم فیہ (اسے علم نے حلال کیا)
اب جس سے ظلم دُور ہُوا، اس سے مطالبہ بھی ختم ہُوا۔ اور جس کو علم نے حلال بتایا وُہ مباح و مامور ہُوئی۔
علما کے نزدیک حلال وُہ ہے کہ جس کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی معصیت نہ ہوتی ہو، بعض علمائے باطن کا قول ہے؛
" حلال وُہ ہے کہ جس کی ابتداء میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو اور آخر میں اللہ کو فراموش نہ کرے"۔ اور کھاتے وقت اللہ کو یاد کرے اور فارغ ہونے کے بعد شکرِ الٰہی بجا لائے۔
حضرت سہل سے جب حلال کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا؛ " یہ علم ہے"۔ اور فرمایا؛
" اگر انسان آسمان کی طرف مُنہ اٹھائے اور (بارش کے) قطرے پی لے"۔ پھر اس سے کسی نافرمانی پر قوت حاصل کرے یا اس قوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرے تو یہ حلال نہ ہوگا۔
اہلِ علم کا گروہ فرماتا ہے؛
" لوگوں کی خاطر تصنع کرنے والا حرام خور ہے اس لیے کہ اس نے عمل کے معاملہ میں اپنے مولا کریم پر دھیان نہیں دیا"۔
ایک موحد کا قول ہے؛
" اگر غذا میں صرف اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرے (کہ اس نے ہی دیا ہے) تو ہی وُہ حلال ہے اور اگر اس نے رزقِ الٰہی میں بندوں کو شریک کیا تو یہ مشتبہ روزی ہے۔ چاہے بطریقِ احکام اسے حلال کرے"۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے؛ " وہ روزی اللہ تعالیٰ کی کھاتے ہیں اور مخلوق کو اس میں اس کا شریک

بناتے ہیں۔"

ابدال میں سے ایک بزرگ کا فرمان ہے ،

"حلال وُہ ہے جو مخلوق کے ہاتھوں سے نہ لیا جائے اور مخلوق کی املاک کی طرف منتقل نہ ہو۔"

بعض بزرگانِ دین کا یہ طریقہ تھا کہ وہ غیر مملوکہ زمین میں اُگنے والی غذا ہی کھاتے ۔ اور ایک عاد لانہ قول یہ ہے ،

"حلال وُہ ہے جو ظالموں کے ہاتھوں سے نہ لیا جائے اور جو صرف پرہیزگاروں کے ہاتھوں سے ہی لیا جائے۔"

ایک طویل واقعہ میں ابدال میں سے ایک بزرگ سے مروی ہے ، انہوں نے بتایا کہ عوام میں سے ایک سیاح آدمی نے انہیں دیا۔ انہوں نے نہیں کھایا۔ سیاح نے کھانا نہ کھانے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا ، "ہم صرف حلال کھاتے ہیں اس وجہ سے ہمارے قلوب کو دنیا میں زہد رکھنے پر استقامت حاصل ہے اور ہم ایک ہی حالت میں ہمیشہ رہتے ہیں ۔ ہمیں ملکوت کا مکاشفہ حاصل ہوتا ہے اور آخرت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔" پھر فرمایا ،

"اگر تین روز تک ہم وُہ غذا کھائیں جو تم کھاتے ہو تو ہمیں جو علمِ یقین حاصل ہے اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور ہمارے قلوب سے خوف و مشاہدہ ہی ختم ہو جائے۔" طویل کلام میں یہ فرمایا۔

آخر کار سیاح نے کہا ،

"میں ہمیشہ روزے رکھتا ہوں (صومِ دہر کا عادی ہوں) ۔ ہر ماہ میں تین بار قرآن مجید ختم کرتا ہوں۔"

بدل نے فرمایا ، "دودھ کا یہ گھونٹ جو تُو نے مجھے پیتے دیکھا ہے میرے نزدیک یہ تیرے جیسے اعمال کے مطابق تیس ختمِ قرآن سے زیادہ پسندیدہ ہے۔" اور اس وقت وُہ ایک جنگلی بکری کا دُودھ پی رہے تھے ۔

ایک سیاح کا بیان ہے کہ ابدال میں سے ایک بزرگ اکلِ حلال کے بارے میں اسی طرح کا کلام فرمایا تو میں نے پُوچھا ، "آپ حلال حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے بھائیوں کو یہ حلال کھانا نہیں کھلاتے ؟"

فرمایا ، "ساری مخلوق کے لیے یہ مناسب نہیں اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا گیا ہے ۔ اس لیے کہ اگر تمام لوگ حلال کھائیں گے تو نظامِ سلطنت باطل ہو جائے گا ، بازار ختم ہو جائیں گے ، شہر اجڑ جائیں گے ۔ البتہ ایسے لوگ بہت ہی کم تعداد میں ہوتے ہیں اور خواص کو یہ شرف حاصل ہے ۔" یا اس کے ہم معنی کلام فرمایا۔

ایک عالم کا فرمان ہے ،

"میں ایسا حلال نہیں جانتا کہ جس میں کوئی شبہ نہ ہو ، سوائے قدرتی پانی کے گڑھوں کے یا وہ نباتات جو غیر مملوکہ زمین میں پیدا ہو یا کسی نیک بھائی کا ہدیہ یا صدق و نصیحت کے ساتھ ایک پرہیزگار آدمی کے ساتھ معاملہ کر کے حاصل کرے ۔" حضرت یحییٰ بن معین کئی برس تک احمد بن حنبل کے رفیقِ سفر رہے اور امام احمد ان کے ہمراہ کھانا نہ کھاتے ۔ اس لیے کہ انہیں ان سے ایک کلام پہنچا تھا کہ وُہ کہہ رہے تھے کہ ہم کسی سے چیز نہیں مانگتے اور اگر ہمیں شیطان بھی

خود دے تو کھالیں گے۔ احمدؒ نے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ وہ آ کر معذرت کرنے لگے کہ میں نے مذاق کیا تھا۔ فرمایا:
"تم دین کے ساتھ مذاق کرتے ہو، جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عمل پر اکلِ حلال کو مقدم فرمایا ہے۔ فرمایا:
كُلُوْا مِنَ طَيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ (پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو)

اہلِ تقویٰ فرمایا کرتے ہیں:

"چالیس برس گزر گئے، میرے پیٹ میں جو گیا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ کہاں سے ہے"۔

بعض کا فرمان ہے:

"ساٹھ برس سے میں نے جو کھایا میں اسے جانتا ہوں کہ کہاں سے ہے"۔

حضرت وہب بن وردؒ وہی کھاتے جس کا علم ہوتا یا دو قابلِ اعتماد گواہ گواہی دیتے۔

حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"جو محتاج رہا وہ بھوکا رہا، جس نے تغافل برتا وہ سیر ہو گیا"۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جس نے حلال دنیا محنت کر کے طلب کی وہ اس آدمی سے بہتر ہے جس نے بغیر طلب کے مشتبہ چیز کھائی"۔

ایک روایت میں ہے:

"جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ اس کی غذا کہاں سے ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہیں کہ دوزخ کے کسی دروازہ سے اسے اندر داخل کر دیا جائے"۔ بتاتے ہیں کہ یہ تورات میں لکھا ہے۔

حلال و مشتبہ کی مزید وضاحت

اس میں اصل نعمان بن بشیر کی حدیث ہے:

"حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان کے درمیان مشتبہات ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جس نے انہیں بھی چھوڑ دیا اس نے اپنے دین و عزت کو (گناہ) سے بچا یا اور جو چراگاہ کے گرد چرتا رہا اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ وہ اس میں گر پڑے گا اور ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ، اس کی زمین میں اس کے محارم ہیں"۔

بتاتے ہیں کہ یہ حدیث تہائی علم ہے۔ حلال وہ ہے جو واضح و ظاہر ہے اور تو اس کے بارے میں یقین پر ہو، اور ایک عالم مومن کو اس پر قلبی اطمینان ہو۔ اور حرام بھی ظاہر ہے جو یقین کے ساتھ واضح ہو اور کسی مسلمان نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو اور ایک مومن کو اس سے قلبی تنفر و کراہت نہ ہو اور کا ہے تقویٰ کی کمی کے باعث بعض قلوب کو

ایک چیز پر اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور گاہے کئی علم کے باعث کسی کو ایک چیز سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں دل غیر معتبر ہیں معتبر دل صرف رہی ہے جو کسوٹی ہو، جس سے ملکوتی معاون کو پرکھا جاتا ہے اور ایسا دل صرف عالم صاحب یقین مومن کا دل ہی ہے اور یہی قلب کیاب اور عزیز ترین قلب ہے۔

فرمان الٰہی ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [1]

(اور اسی طرح ہم ساتھ ملائیں گے گنا ہگاروں کو ایک دوسرے کا، بدلہ ان کی کمائی کا)

اس کی تفسیر میں بعض سلف سے مروی ہے۔ فرمایا:

"جب لوگوں کے اعمال خراب ہو جاتے ہیں تو ان پر ان کے اعمال جیسے حکام مسلط کر دیے جاتے ہیں" اسی مفہوم میں بعض علماء کا فرمان ہے:

"جب لوگوں میں ذہنی بگاڑ پیدا ہو جائے تو ان کی لوزبان بھی بگڑ جاتی ہیں۔"

مشتبہات کی کئی اقسام ہیں:

۱۔ جو ایک لحاظ سے حلال کے ساتھ مشابہت رکھتی ہو اور اس میں ایسا اختلاط بھی ہو کہ دونوں میں امتیاز نہ ہو سکے۔

۲۔ مشتبہ وہ ہے جس کو علم ظاہر مباح بتائے مگر علمائے باطن کو اس پر قلبی اطمینان نہ ہو اور اسے مکروہ بتائیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"تم اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو، شاید تم میں سے بعض آدمی دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ قوتِ استدلال (زورِ بیان کے ذریعہ) رکھتے ہوں اور میں اس سے سننے پر فیصلہ کر دوں اور اسے علم ہو کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب اگر میں اس کے بھائی کے خلاف اور اس کے حق میں (حقدار نہ ہونے کے باوجود) فیصلہ کر دیا تو میں اس کے لیے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹتا ہوں۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر معاملہ کے مطابق حکم فرماتے ہیں اور بندے کے صحیح علم کی طرف واپس کرتے ہیں۔ جو آنکھوں سے اوجھل ہے مگر اسے ذاتی طور پر تمام ماجرا معلوم ہے۔

جس میں اختلافِ دلائل کی وجہ سے اختلاف ہو۔ وہ چیز بھی مشتبہ ہے اور اس کا برابر ہی بدلہ دینا چاہیے۔ اور جب تک آنکھوں سے دیکھ نہ لے تب تک اس کے بارے میں قطعیت سے بات نہ کرے۔ حلال و حرام وہ ہیں کہ جن کے دلائل واضح ہیں اور ان کے حلال یا حرام ہونے پر اتفاق ہے اور وہ چیز بھی مشتبہ ہے کہ جس کا سبب حلال ہو

اسس میں حکم بھی لگ جائے مگر اس کا عین مجہول ہو اور اس کا حلال غیر یقینی ہو ، نیز وُہ چیز بھی شبہ کی ہے کہ جس میں بعض احکام کا خیال نہ رکھا گیا ہو یا اس کا کوئی سبب ناقص ہو جس کی وجہ سے بندے کو اس تک رسائی ملی ۔ یعنی جہالت یا کوئی نفسانی آفت آئی ہو ۔ یہ تمام مشتبہات کی اقسام ہیں ۔

پھر ٹھیک شبہات بھی جدا جدا ہوتے ہیں اور یہ بھی شبۂ حلال ہے اور شبۂ حرام ایسے ہے جیسے کدورت کا شبہ ہو اور یہ شبہِ متقارب (یعنی قریب قریب کام ہوتا ہے) ، اس لیے کہ علمائے باطن کے نزدیک تین مقامات پر حلال ہے ۔

١۔ بقدرِ کفایت حلال ۔ یہ عام ہے یعنی جو بطریق کسی حکم کے حلال ہو ۔

٢۔ صاف حلال ۔ یہ خاص ہے یعنی جس کے دلائل حلت واضح ہوں ، سبب حلال ہو اور اس میں سنّت پائی جائے ۔

٣۔ حلالِ شاف ۔ یہ خواص الخواص کا حلال ہے ۔ گویا یہ وُہ ہے کہ جس کی اصل اور اصل الاصل کا علم بھی ہو ۔ اہل تقویٰ کے ہاتھوں سے آئے اور جہالت کا کوئی اختلاط نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ حلال کے تفاوت کے باعث شبہات بھی مختلف ہیں ۔

حرام چیز فاسقوں کی غذا ہے ۔ اسس کا کھانا ہی فسق ہے ۔ اس کی تلاش فسق ہے اور اسس کا کھلانا بھی فسق ہے اور اس پر تعاون کرنا بھی فسق ہے اور اس پر دوام کرنے والا بھی فاسق ہے اور یہ کبائر میں سے ہے ۔ یہ اہل اسلام کی ضروریات میں سے نہیں اور نہ ہی انہیں غنا دے سکتا ہے ۔

حلال وُہ ہے جس کو کتاب وسنت حلال بتائے ۔ احکام وعلوم کے تمام اسباب و معانی سے اس کی حلت معلوم ہو ۔

مباح وُہ ہے جو علم میں تصرّف کی چیز ہو ۔ یہ اہل ایمان کا مطلوب ، اہل تقویٰ کی غذا اور صالحین کا مقام ہے اسس کا طلب کرنا ، جہاد ، اس کا کھلانا نیکی ، اس پر تعاون کرنا تقویٰ ۔ اسس کا کھانا عبادت اور اس پر دوام کرنا ایک پرہیز گار مومن کا کام ہے ۔

شبہ وُہ ہے کہ جس میں علماء کا اختلاف ہو ۔ اسس پر اجماعِ (جواز) نہ ہو یا اس کے باطن میں التباس پایا جائے اور دلائل کے غامض ہوئے یا خفائے استدلال کے باعث اس میں شبہ پڑ جائے اور واضح نہ ہو ، اور اہل ظاہر اور اہل تقویٰ اسس پر اتفاق نہ کریں جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

" اسے اکثر لوگ نہیں جانتے ۔" یہ عوام اہل اسلام کی غذا ہے ۔

اگر ایسی چیز کا ابتلا آن پڑے تو ہر چیز میں سے بقدرِ ضرورت لے لو ۔ ایسا کرنے میں فضیلت ہوگی ، اور مقامِ تقویٰ بھی ایسا کرنے سے ہی درست رہے گا ۔ اس کی کثرت مکروہ ہے اور اگر سکت ہو تو اسے ترک کرنا افضل بات ہے ، حدیث میں ہے ، " جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے اپنے دین کو (گناہ) سے بچا لیا ۔" یعنی اسس نے

دینی نظافت اور احتیاط حاصل کر لی۔

کہتے ہیں کہ دین طہارت و نظافت کا نام ہے۔ اس لیے طہارت و نظافت حاصل کرو۔ اور تنزہ کا مطلب ہے، بُری باتوں اور میل کچیل سے دُور رہنا۔

اس لیے کہا کرتے ہیں: "خرجنا نتنزہ۔ خرج فلان فی نزهة۔ یعنی جب وہ شہر سے دُور ہو جائے اور تمام لوگوں سے علیحدگی اختیار کرے۔"

پھر فرمایا: " وعرضہ یعنی اس نے اپنی عزت کی حفاظت کر لی۔ اب کوئی آدمی اس پر بدظنی نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی بد دیانتی و بُرائی کو اس کی طرف منسوب کرے گا۔ ہم نے بتایا ہے کہ مشتبہ چیز استعمال کرنا حرام میں پڑنے کی سیڑھی ہے۔"

حدیث میں ہے:

" جو چراگاہ کے گرد چرتا ہے اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ وُہ اس میں آن پڑے۔" یعنی جو شبہات پر دوام کرتا ہے اور خُوب کثرت سے مشتبہ چیزیں کھاتا ہے۔ اس کے حرام میں پڑ جانے کا ڈر ہے۔

بعض علماء کا فرمان ہے،

" جو ایک پرہیزگار عادل کے ہاتھ سے ایک حکم کے ذریعہ لیا جائے وُہ حلال ہے اور جس کا عدل و جرح معلوم نہ ہو اس کے ہاتھ سے لیا جائے تو یہ مشتبہ ہے اور جو ظالم یا بُرے آدمی کے ہاتھ سے لیا جائے وُہ حرام ہے، چاہے اسے جائز حکم کے ذریعہ ہی لے۔" یہ قول حق کے قریب تر ہے۔

اسی طرح ایک عالم کا فرمان ہے:

" جس کو معلوم نہ ہو کہ اس کے مال میں خیانت یا کسی ظالم کے معاملہ کا اختلاط ہے تو یہ حلال ہے اور جس کے مال میں ظالموں یا خیانت کے مال کا اختلاط ہو وُہ حرام ہے اور اگر اختلاط تو ہو مگر امتیاز نہ ہو سکے بعض ظالموں سے کاروبار کرتا ہو اور بعض پرہیزگاروں سے بھی کاروبار کرتا ہو تو یہ مشتبہ مال ہے۔"

حدیث میں ہے:

" جس کے بارے میں تجھے شبہ ہے اسے چھوڑ کر وُہ لے جس میں تجھے شبہ نہیں، اس لیے کہ اطمینان ہی بھلائی ہے اور شبہ بُرائی ہے۔" یعنی جس میں تجھے شک ہو اسے چھوڑ کر غیر مشتبہ مال حلال ہو۔ اس لیے کہ بُرائی شبہ ہوتی ہے اور یقین نہیں ہوتی۔

دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: " گناہ سینوں میں کھٹکا ہے۔"

دُوسری حدیث میں ہے، " گناہ دِلوں پر چھا جاتا ہے۔" یعنی جو قلب میں اثر کرے اور کھٹکا ہو کر دیکھو

بر گناہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے گناہ کا دل سے تعلق کر دیا اور اسے دل کا ایک وصف بنایا۔ فرمایا:

وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ[1] (اور جو کوئی وُہ چھپا دے تو گنا ہگار ہے دل اس کا)

ایک روایت میں ہے:

"نیکی وُہ ہے جس پر قلبی اطمینان ہو اور نفس اس کی طرف پرسکون ہو اور گناہ وہ ہے جو تیرے سینہ میں کھٹکے اور تو یہ پسند نہ کرے کہ لوگوں کو اس پر اطلاع ہو" اسے چھوڑ دو۔ اس لیے کہ فرمایا:

"اہل ایمان، اللہ کے گواہ ہیں۔" اور فرمایا:

"جس کو اہلِ ایمان اچھا سمجھیں وُہ اللہ کے ہاں اچھا ہے اور جس کو وُہ بُرا سمجھیں تو وُہ اللہ کے ہاں بُرا ہے۔" جیسے کہ فرمایا:

فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ[2] (پھر آگے دیکھے گا اللہ کام تمہارا اور اس کا رسول اور مسلمان)

اس لیے کہ اللہ کی تیری طرف کراہتِ نظر اس بات کی دلیل ہے کہ تیرے اندر شبہ ہے اور خلاصۂ کلام تو یہ ہے کہ بندے پر اس کی طاقت سے زاید لازم نہیں اور اس پر یہی پابندی ہے کہ اپنے علم کے مطابق اور وسعتِ علم واجتہاد کی رسائی کے مطابق دین پر عمل کرتا رہے اور دل میں کچھ بُرائی چھپاکر نہ رکھے اور خواہشِ نفس سے رخصت تلاش نہ کرے۔ اب اگر علم کم ہو تو دوسرے بڑے عالم سے استفادہ کرے اور اب بھی اگر کچھ خامی رہی تو معافی کی امید ہے۔

بعض اہل تقویٰ کا فرمان ہے:

"حلال وہ ہے کہ ظالموں کے ہاتھ اسے نہ لگیں۔"

بعض کا فرمان ہے:

"جب تک اس پر ظالم کا ہاتھ نہ چلے۔"

ایک عالم کا فرمان ہے:

"حلال وہ ہے جس کی وجہ سے دل میں کچھ خلجان نہ آئے اور اس پر قلبی اطمینان و سکون ہو۔"

ایک دوسرے عالم فرماتے ہیں:

"حلال وہ ہے کہ جب اہل ظاہر اور اہل باطن پر پیش کیا جائے تو کوئی بھی اس پر انکار نہ کرے، یہی حلال ہے۔"

اہل علم کے ایک گروہ کا اجتماع تھا اور یہ بحث ہو رہی تھی کہ کون سا عمل سخت ترین ہے؟

---

[1] البقرہ ۲۸۳

[2] التوبہ ۱۰۵

بعض نے جہاد کو سخت ترین بتایا۔ بعض نے روزہ و نماز کو سخت ترین بتایا۔ بعض نے مخالفتِ خواہش کو سخت تر بتایا اور بعض نے فرمایا:

"تقویٰ و پرہیزگاری سخت ترین ہے۔ آخر سب کا آخری قول پر اجماع ہُوا۔"

حضرت حسان بن ابی سنانؒ فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک ورع (پرہیزگاری) سے آسان تر کچھ چیز نہیں۔"

پُوچھا گیا، "وہ کیسے؟"

فرمایا: "میرے دل میں جس کے بارے میں کھٹکا ہوتا ہے تو اسے چھوڑ دیتا ہوں۔" اب جس کو اللہ تعالیٰ زہد کی توفیق بخشے اور اسے شہوتِ نفس پر قابو ہو تو اس کے لیے یہ بات واقعی آسان ہے جیسے کہ اس آدمی پر زہد آسان ہے جس کو یقین کی قوت و تائید حاصل ہو اور دنیاوی محبت کے شکار ہونے پر بھی آدمی بہتر و برتر ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"افضل ترین عمل اور ایسا عمل کہ جس کے ذریعہ ہم اللہ کے سامنے یہ چہرے لے جا سکتے ہیں وُہ ورع کا عمل ہی ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا:

"آپؓ نے سچ فرمایا۔" اور جب یقین پایا جائے اور زہد حاصل ہو جائے تو ورع و اخلاص آسان ہو جاتے ہیں۔ اور یہی دونوں، باقی تمام اعمال کی اساس ہیں۔

اہل شام کے عبادت گزاروں میں سے حضرت یوسف بن اسباط اور حذیفہ مرعشی وغیرہ رحمہم اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ ان میں سے ایک نے فرمایا:

"تیس سال سے میری یہ حالت ہے کہ دل میں جس کے بارے میں کھٹکا ہُوا، اسے چھوڑ دیا۔"

بعض نے فرمایا:

"چالیس سال سے میری یہ حالت ہے کہ کسی چیز کے بارے میں میرے دل میں توقف یا خلجان ہُوا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

بعض نے فرمایا:

"تیس سال سے میرا یہ حال ہے کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ لوگ مجھے کس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ ہاں اگر کوئی انسانی ضرورت ہُوئی۔" (مثلاً پیشاب، پاخانہ کی حاجت تو شہر سے باہر لوگوں سے پردہ کر کے جانا پڑا)

اہل ورع میں سے ایک بزرگؒ کا واقعہ ہے کہ ان کا دینار زمین پر گر گیا۔ وُہ اسے اٹھانے لگے تو دیکھا دو دینار پڑے ہیں۔ اپنا دینار پہچان نہ سکے۔ اس لیے دونوں کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ایک عبادت گزار اور اہل قلب

عورت نے حضرت ابراہیم خواصؒ سے پوچھا کہ میرے قلب میں کچھ تغیر نظر آتا ہے۔

فرمایا: "کھود کرید کرو۔ کیا بات ہے؟"

کہنے لگی: "میں نے کرید کی مگر کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

انہوں نے ایک گھڑی سر جھکایا۔ پھر فرمایا:

"تمہیں مشعل کی رات یاد ہے؟"

کہنے لگی: "ہاں"

فرمایا: "یہ تغیر اسی وجہ سے ہے۔"

اسے یاد آیا کہ وہ چھت پر (اون یا سوت) کات رہی تھی کہ دھاگہ ٹوٹ گیا۔ اسی وقت کہیں بادشاہ کی مشعل گزری۔ اس کی روشنی میں اس نے دھاگہ درست کرکے تکلے میں ڈال لیا اور اس سے کات کر قمیص بنائی اور اسے پہن لیا۔

بتاتے ہیں کہ اس نے قمیص اتار دی اور اسے فروخت کرکے اس کی قیمت صدقہ کر دی تو قلبی صفائی و چمک دوبارہ لوٹ آئی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس سے بڑھ کر منقول ہے۔ وہ قید ہو گئے اور کئی روز تک کچھ بھی کھایا پیا نہیں۔ ایک عابدہ عورت ان سے واقف تھی اس نے قید خانے میں کھانا بھیجا اور کہا:

"یہ حلال کھانا ہے۔" مگر وہ بھی نہیں کھایا۔ رہائی کے بعد اس عورت نے کھانا نہ کھانے کی وجہ پوچھی۔ فرمایا:

"وہ حلال تھا۔ مگر حرام طریق سے میرے پاس آیا اس لیے نہیں کھایا۔"

اس نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

فرمایا: "داروغہ جیل کے ہاتھ سے میرے پاس آیا وہ ظالم ہے اس لیے میں نے نہیں کھایا۔" یہ اہل ورع کے خصائل حمیدہ ہیں۔

اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ حلال سے ہی ابتدا کرے اور یہی اس کا مقصود و فکر ہو، ایسا کاروبار کرے جو پاکیزہ اور حلال ہو۔ حلال مال ہی لباس اور کھانے پر خرچ کرے اور اگر شبہ کا مال ہو تو لباس و غذا کو اس سے ہر طرح بچائے اور گھر کے باقی امور مثلاً لکڑیوں، مکان کا کرایہ وغیرہ پر خرچ کرے اور پوری تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو بیان کریں گے تاکہ یہ طریقہ سمجھ جاؤ اور اس میں رخصت بھی ہے۔ اگر اس انداز پر صبر سے کام لیا اور یہی اس کی فکر بن گئی تو اس کے لیے اس میں مجاہدہ و عبادت کا اجر بھی ہے اور جب اس نے ان باتوں پر محاسبہ رکھا اور اللہ کے دین کی خاطر احتیاط و تدبر کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی محنت کی قدر کرے گا اور خوب خوب اجر و ثواب

عطا فرمائے گا۔ یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی جانب رسائی دینے والا اور بہت سے گزشتہ گناہوں کا کفارہ بننے والا ہے۔ اسلاف کرام کی یہی راہ ہے۔ اب اگر انسان کو کسی بات میں شبہ ہُوا اور اس نے اس سے پرہیز کی تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کی قدر کرے گا۔ چاہے اسے مغالطہ ہُوا اور اللہ کے ہاں وُہ چیز حلال ہی ہو اور اگر بے پرواہی کی وجہ سے اس نے اسے استعمال کر لیا تو اسے بدنیتی کی وجہ سے گناہ ہوگا اور اگر اجتہاد و تدبر کے بعد اس نے حقیقت پالی تو اللہ کے ہاں وہ افضل ہے اور اس کے لیے دو اجر ہیں:

۱۔ علم کا اجر

۲۔ مقامِ توفیق

اور جس نے قصداً علم چھوڑ دیا (جہالت سے کام لیا) اور حقیقت تک رسائی بھی نہ پا سکا تو اس پر دو گناہ ہیں:

۱۔ جہالت کا گناہ

۲۔ بد پرہیزی کا گناہ

اور جس نے علم سے کام لیا اور پھر غلطی ہو گئی تو اس کے لیے ایک اجر ہے اور جس نے جہالت سے کام لیا اور صحیح بات تک پہنچا اس پر ایک گناہ ہے۔ چاہے فعل میں بے گناہ ہو مگر جہالت کا گناہ اس کے سر فرو رہے۔

حضرت وہب یمانیؒ نے زبور کے مرویات سے بیان کیا،

"اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

بنی اسرائیل سے کہہ دو! میں تمہارے روزے اور نمازوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ میں اس کی طرف دیکھتا ہُوں کہ جس کو کسی چیز میں شک ہُوا تو اس نے میری خاطر چھوڑ دیا، یہی وہ آدمی ہے جس کی میں اپنی مدد سے تائید کرتا ہُوں اور اپنے فرشتوں کے سامنے اس پر فخر کرتا ہُوں!"

ایک عالمؒ نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا،

"چراغ ہلکا رکھو، اس لیے کہ تم میرا گوشت اور خُون جلاتے ہو!"

پُوچھا گیا، "وُہ کیسے؟"

فرمایا! "تم میری کمائی سے جلاتے ہو اور میری کمائی میرے دین سے ہے اور میرا دین، میرے گوشت و خُون سے ہے۔"

کہا کرتے ہیں، "جس نے یہ خیال رکھا کہ وہ درہم کہاں سے کماتا ہے۔ وُہ یہ بھی دیکھے گا کہ کہاں خرچ کر رہا ہے اور جس نے یہ پرواہ نہ کی کہ کہاں سے کماتا ہے وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرے گا کہ کہاں خرچ کر رہا ہے!"

ایک عالمؒ نے اہل و عیالدار آدمی کو بے کار دیکھا تو فرمایا، "کچھ کام کرو۔ اس لیے کہ اگر تُو کمائے گا تو تیرے بال بچے

تیری دنیا کھائیں گے اور اگر تُو نے کوئی کاروبار نہ کیا تو وہ تیرا دین کھائیں گے۔"

بتاتے ہیں کہ ایک عابد کا ایک ٹکڑا گر گیا، وہ سارا دن اسے تلاش کرتے رہے۔ کسی نے کہا:

"آپ نے دنیا میں سب چیزوں میں زہد کر لیا مگر آپ اس ٹکڑے کی اس قدر تلاش کر رہے ہیں؟"

فرمایا: "میرا اس ٹکڑے کو تلاش کرنا بھی دنیا میں میرا زہد ہے۔ اس لیے کہ میں اس کے عوض دُوسرا نہیں لے رہا کیونکہ میں جانتا ہُوں کہ وُہ کہاں سے ہے اور میں وہی چیز کھاتا ہُوں جس کو جان لُوں کہ یہ کہاں سے ہے۔"

حضرت بشرؒ فرماتے ہیں کہ جب مشتبہ مال جمع ہو جائے تو وہ شہوات میں ہی خرچ ہوتا ہے۔

حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا:

"ترکِ شبہات پر وہ صبر کرتا ہے جو ترکِ شہوات پر صبر کرے۔" اور حدیث میں ہے:

"ایک آدمی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے (پچھنے لگانے والے کی) کمائی کے بارے میں پُوچھا، آپ نے اس کو اس سے منع فرمایا۔ اس نے دوبارہ پُوچھا اور کہا: "میرا ایک غلام پچھنے لگاتا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر اس کے بغیر چارہ کار نہیں تو اس سے اپنی اونٹنی کو چارہ دو اور اپنے غلام کو کھانا دو۔"

حدیث میں ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا گیا کہ گھی میں ایک چُوہیا گر کر مر گئی اب؟"

فرمایا: "اسے مت کھاؤ۔"

دُوسری حدیث میں ہے:

"اگر یہ منجمد ہو تو اس (چُوہیا) کو پھینک دو اور اگر پگھلا ہُوا ہو تو اس کے ساتھ چراغ جلا لو۔"

علمائے کوفہ کی ایک جماعت سے مروی ہے: کہ "مردار کی چربی سے کشتیوں پر روغن کیا جا سکتا ہے اور چمڑے رنگے جا سکتے ہیں۔" اور اس میں ایک مسند حدیث بھی مروی ہے۔

یہ اقوال و روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ مشتبہ مال کو کھانے اور لباس پر استعمال نہ کرے۔ ہاں اگر اضطرار کی صورت ہو تو بقدرِ حاجت استعمال کرے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ان کے پاس دُودھ آیا۔ آپ نے اس کی اصل دریافت کی تو بتائی گئی۔ پھر آپ نے اصل الاصل کے بارے میں پُوچھا تو یہ بھی بتا دی گئی۔ آخر جب آپ کو یہ اچھا لگا تو اسے پیا۔" حلال کا یہی حکم ہے کہ چیز کی اصل اور اصل الاصل کا علم حاصل ہو جائے تو کافی ہے اور اس کے بعد کی تحقیقات کی پابندی ساقط ہو چکی۔ اور اگر تو نے اسے خود نہیں دیکھا البتہ ایک پرہیزگار مسلمان نے ایسی گواہی دی تو

یہ بھی اسی کے قائم مقام ہے۔

حدیث میں ہے؛

"تم صرف پرہیزگار کا کھانا کھاؤ اور تمہارا کھانا بھی صرف پرہیزگار ہی کھائیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ پرہیزگار آدمی دین کی حفاظت کرے گا۔ علم سے اجتہاد کرے گا اور احتیاط سے کام لے گا۔ اب تجھ سے بحث و اجتہاد کی پابندی ساقط ہو گئی کیونکہ اس نے تیری نیابت کر کے تجھے مشقت میں پڑنے سے بچا لیا اور خود تحقیق کی مشقت اٹھائی۔ اسی مفہوم پر احادیث آتی ہیں: "جب تم میں سے کوئی آدمی اپنے بھائی کے گھر میں آئے اور وہ اس کے سامنے کھانا پیش کرے تو اس کا کھانا کھا لو اور کچھ نہ پوچھو اور اس کا پیش کردہ مشروب پی لو اور کچھ نہ پوچھو" اس لیے کہ وہ ہی کافی ہے، اور کفایت کے بعد سوال ایک تکلف ہے۔ اور ایک مسلمان کے لیے تکلف کرنا ایک لایعنی امر ہے۔

دوسری حدیث میں ہے،

"انسان کے حسنِ اسلام سے یہ ہے کہ وہ لایعنی کو ترک کر دے" اب ہم سے بحث کا معاملہ اُٹھ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین کا طریقہ تھا کہ وہ علماء اور صالحین کا کھانا، کھانا پسند کرتے تھے۔

اور جو آدمی اپنے لیے بھی احتیاط نہ کرے، اپنے دین کی حفاظت نہ کرے اور کاروبار میں تقویٰ اختیار نہ کرے۔ اسے کچھ پرواہ نہ ہو کہ کہاں سے کھا رہا ہے اور کہاں سے کمایا ہے اور یہ مال کہاں سے آیا ہے۔ یہ آدمی متقی نہیں۔ اس صورت میں لازم ہے کہ کھانے کی پڑتال کرے اور دین کی خاطر احتیاط و اجتہاد سے کام لے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے؛

"تیرا کھانا صرف پرہیزگار ہی کھائے اور تو بھی صرف پرہیزگار کا کھانا کھا" اور پرہیزگار سے مراد وہ ہے جو دین کے معاملہ میں ورع اختیار کرے، حرام سے بچے، گناہوں سے اجتناب کرے۔ فرمانِ نبویؐ میں صراحت ہے:

"صرف پرہیزگار کا کھانا ہی کھاؤ" اور ایک انسان کا تقویٰ تب ہی درست ہو سکتا ہے کہ جب وہ تجارت و صنعت میں کتاب و سنّت کی پابندی کرتا ہو۔ علمِ کتاب و سنّت اس کی سلامتی کی گواہ ہو اور اس کا دین خیانت سے پاک ہو معاملہ کرتے وقت جھوٹ اور فریب سے کام نہ لے۔ تجارت و صنعت میں غبن نہ ہو اور ہر جگہ پر نصیحت و صداقت کا خاص خیال رکھے۔ حتیٰ کہ ان کے عوض جو سبب ہو وہ بھی حلال ہو۔

اور جس تجارت یا صنعت میں انسان کتاب و سنت کے احکام کی خلاف ورزی کرے وہ حلال تجارت و صنعت نہیں۔ اگرچہ جس معنی کے حکم میں اسماء صحیح ہوتے ہیں۔ وہ اسم موجود ہو اس لیے کہ گاہے نام موجود ہوتے ہیں مگر غلط ہونے کی وجہ سے یہ بات کافی نہیں بنتی۔ اب اگر جاہل لوگ ایک کام کو تجارت یا صنعت کہہ دیں یا زبردستی حلال کرنے والے گمراہ عناصر کسی کام کو خرید و فروخت اور معاملہ کا نام دے دیں مگر وہ علم کے مطابق نہ ہو تو اسے تجارت و صنعت اور معاملہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس کے ذریعہ حاصل کردہ کھانا حلال ہے۔ اس لیے کہ یہ باطل ہے اور علماء کے

نزدیک ایسی باتوں کا نام تجارت کی بجائے خیانت، دھوکہ، حیلہ اور فریب وغیرہ کا ہے۔

ان طریقوں سے کمانا حرام ہے اور ایسے امور مذموم ہیں۔ ان کے ذریعہ کچھ حاصل کرنا حلال نہیں۔ اس لیے کہ علماء کو (تجارت یا صنعت یا معاملہ) کا نام رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان پر درست مفاہیم کے لحاظ سے کیا واقعی یہ نام صادق آتے ہیں مگر یہ آدمی ایسا معاملہ کر رہا ہے جس میں بظاہر نام تو ہے مگر معنی مفقود ہونے کے باعث یعنی کتاب و سنت کے احکام نظرانداز کرنے کی وجہ سے اس پر تجارت کا اطلاق نہیں ہوتا اور اگر معنی کے اعتبار سے نام پایا جائے (یعنی بظاہر ایسا ہو) اور علماء بھی اسے تجارت یا صنعت کہہ دیں لیکن اس میں حکم خداوندی کو نظرانداز کر دیا اور سُود یا فاسد بیع کی صورت پائی گئی۔ اس لیے یہ حرام ہی ہے اگرچہ خرید و فروخت مباح ہوتی ہے۔ اور اس میں احکام بھی آتے ہیں مگر جو عوض میں لیا اور خود دیکھا یا سچی خبر سے معلوم ہُوا وُہ حرام تھا اس لیے کہ یہ کمائی حرام ہُوئی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اس میں حرام موجود ہے۔ ہاں جب دو میں سے ایک طریقہ سے شبہ نکل جائے اور یہ مال صاف ہو جائے تو الگ بات ہے مثلاً یہ یقین ہو جائے کہ یہ اصل سے حلال ہے اور اصل الاصل سے حلال ہے۔ یعنی ہم اس چیز کی ذات میں نہ حرام دیکھیں اور نہ حرام کی ہمیں اطلاع دی گئی ہو۔ اس وقت اس کو کھانا حلال ہے مگر پھر اسے شبہ کہیں گے اور اسے شبہ حلال کا نام دیا جائے گا کیونکہ ہو سکتا ہے یہ لشکریوں کی طرف سے ہو یا ان کی طرف سے ہو جن میں تقویٰ کی کمی ہے۔ کیونکہ باطل اور مکروہ طریقوں سے حاصل کردہ اموال کے غلبہ کے باعث اس میں حرام آنے کا امکان موجود ہے اور پھر یہ مال صحیح املاک اور تجار و صنعت کار لوگوں کے اموال میں مل گیا۔ اب ہم اسے ظنی علم کی وجہ سے حلال کہیں گے مگر علم یقین مفقود ہونے کے باعث شبہ ضرور رہے گا۔

روایت میں ہے: "حضرت عقبہ بن حارث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: میں نے ایک عورت سے نکاح کیا ہے پھر ایک سیاہ فام عورت ہمارے پاس آئی اور وُہ یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ اس نے ہمیں دوُدھ پلایا ہے حالانکہ وُہ عورت جھُوٹی ہے۔"

آپؐ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دو۔"

عرض کیا، "وُہ تو جھُوٹی ہے۔"

فرمایا: "یہ کیسے جبکہ اسے گمان ہے کہ اس نے تم دونوں کو دوُدھ پلایا ہے؟ تیرے لیے اس عورت میں کچھ برکت نہیں اسے اپنے آپ سے دُور کر دے۔"

دوُسرے الفاظ یہ ہیں:

"یہ کیسے جبکہ یہ کہا بھی گیا؟"

حضرت عبداللہ بن زمعہؓ کی حدیث میں ہے: "ہونے والے لڑکے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے

نکاح میں لڑکے کا فیصلہ کر دیا اس لیے کہ وُہ اس کے نکاح میں پیدا ہُوا اور آدمی کا دعویٰ غلط ٹھہرایا۔ اگرچہ وہ اسی سے ہے۔ حبیب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح مشابہت دیکھی تو حضرت سودہؓ کو فرمایا: "اے سودہؓ اس سے پردہ کرو" حالانکہ وہ اس کی بہن تھیں۔

پھر فرمایا: "الولد للفراش"۔

تقوی کی خاطر فراش کے معاملہ میں بھی پرہیزگاری ضروری ہے۔ اگرچہ ظاہر کے مطابق احکام جواز ملتے ہیں مگر پرہیزگاری اس میں ہے کہ اسے ترک کر دے اور اہلِ تقویٰ کے نزدیک حلال کا مطلب یہ ہے کہ اس کے استعمال پر مواخذہ و مطالبہ نہ ہو اور علمِ شرع اسے حلال قرار دے دے۔

فرمایا،

وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ [1] (اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو تمہارے پشت سے ہیں)

اور حلائل کا واحد حلیلۃ ہے۔ عورت کو حلیلۃ الرجل اس لیے کہا جاتا ہے کہ جہاں وُہ اترتی اور قیام پذیر ہوتی ہے۔ مرد بھی اس کے ساتھ قیام پذیر ہوتا ہے اور دوسرے معنی میں عورت کو حلیلۃ اور مرد کو حلیل اس لیے کہا جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان سے گناہ اٹھ گیا۔ خاوند بیوی کے لیے حلال ہے اور بیوی خاوند کے لیے حلال ہے۔

اور علم میں حلال سے مراد وہ ہے کہ جس کو کتاب و سنت کسی جائز و مباح سبب کے باعث مباح قرار دیں اور حلال وہ ہے کہ جس میں تین باتیں پائی جائیں۔

۱۔ علم میں سبب مباح ہو۔

۲۔ مال اور اس کے عوض کی چیز کے اصل اور اصل الاصل کا علم ہو کہ یہ شبہ سے پاک ہے۔

۳۔ معاملہ کے اندر اللہ تعالیٰ کا حکم اس کی اجازت دے۔

اگر ان میں سے ایک کا فقدان ہُوا تو یہ شبہ کی چیز ہے البتہ حلال کے قریب تر ہے اور دو کا فقدان ہُوا تو شُبہ کی چیز ہے اور حرام سے قریب تر ہے۔ اگر یہ تینوں معنی مفقود ہوں حتیٰ کہ جس سبب سے مال اور چیز کا عوض ملا۔ وُہ مکروہ ہو یا درہم خود ہی مکروہ و مجہول ہو اور خرید و فروخت میں شرعی حکم کا لحاظ نہ رکھے اور بخوشی خاطر ہبہ نہ دے تو یہ بعینہٖ حرام ہے۔ حلال و حرام دو واضح ضدیں ہیں اور شبہ کی چیزیں یعنی شُبہ حلال اور شبہ حرام دونوں ہی مشتبہ ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے حلال سے مشابہ اور ایک اعتبار سے حرام سے مشابہ ہوتی ہیں۔ حلال و حرام ایسے ہیں جیسے سفید اور سیاہ کا فرق ہو۔ یہ دونوں کسی ایک چیز کی شاخیں نہیں اور نہ ہی ایک چیز سے پیدا ہونے والی ہیں بلکہ دونوں متضاد ہیں اور شبۂ حلال،

---

[1] النساء ۲۳

زردی کی طرح ہے۔ اس لیے کہ اس کا رنگ سفیدی سے پیدا ہوا۔ اب اگر زردی اور سبزی کے رنگ میں اجتماع ہو تو یہ ایک چیز میں شبہات کے اختلاط کا نام ہے۔

اگر تو زردی دیکھے تو یہ شبۂ حلال کی علامت ہے۔ اسے اسی طرف سمجھا جائے گا اور اس پر ویسا ہی حکم ہوگا جیسے کہ سبزی، سیاہی کے قریب تر ہے۔ اگر زردی اور سبزی میں اختلاط ہو جائے تو یہ اس چیز میں اختلاطِ شبہات ہے تو اس صورت میں غالب ترصنف کو دیکھ کر اسی کے مطابق حکم لگے گا۔

اگر زردی غالب ہو تو یہ شبۂ حلال کی دلیل ہے۔ اس میں سے کھا لے مگر زیادہ نہ کھائے۔ اس لیے کہ یہ صاف طور پر حلال نہیں۔ تاجروں اور صنعتکاروں کے اموال کی یہی مثال ہے کیونکہ ان کے اموال میں لشکریوں اور دوسرے معاملات کا مال اختلاط پذیر ہوتا ہے۔

اور اگر سبزی زیادہ اور غالب تر ہو تو یہ شبۂ حرام ہے اس میں سے بقدرِ ضرورت لے لو۔ اس لیے کہ یہ شبہ کی وجہ سے صاف نہیں ہوتا۔ بادشاہوں کے ملازمین کا مال ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ ان کے اموال میں حکام و امراء کا مال آمیز ہو جاتا اور جب خالص سفیدی دیکھے تو یہ حلال مال ہے۔ یہ جس قدر چاہو لو، اور خوب خُوب کھاؤ۔ اس کے حاصل کرنے پر کچھ گناہ نہیں البتہ اس مال کے ہوتے ہُوئے تم زاہد شمار نہ ہوگے۔ مشرکوں سے حاصل کردہ فئ کا مال اور اللہ کی راہ میں جہاد میں حاصل کردہ مالِ غنیمت، وراثت میں ملنے والا پاکیزہ مال اور غیر مغصوبہ زمین میں اگنے والی اشیاء، آسمان کا پانی، دریاؤں کا پانی اور سمندر و خشکی کا شکار حلال اموال میں سے ہے۔

اور اگر سیاہی دیکھے تو یہ حرام کی علامت ہے۔ اس سے پرہیز کرو اور اس میں سے کچھ بھی نہ لو۔ اگر تم نے یہ لیا تو تم فاسق ہو اور حرام کھانا کبائر میں سے ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا مال، غلط اور نافرمانی کے اسباب کے ذریعہ جو مال حاصل ہو اور جو بطیب خاطر ہبہ نہ ہو بلکہ (جبراً وصول کرے) یہی مال حرام ہے۔

یاد رکھیں حلال و حرام، دراصل تقویٰ و فجور اور علم و جہالت کی شاخیں ہیں اور اہل تقویٰ علماء کے لیے علم و تقویٰ ہی حلال ہے۔

جب پرہیزگاروں کی کثرت ہو، اہلِ ایمان زیادہ ہوں تو حلال زیادہ اور غالب ہوگا اور جب بدکار اور جاہل لوگوں کی کثرت ہوگی تو حرام غالب اور زیادہ ہوگا۔ جہالت اور بدکرداری دراصل جاہل بدکرداروں کے دو حال ہیں۔

اور سب جگہ میں حلال دراصل اسی وقت ہی ملتا ہے کہ حکام عادل ہوں، ان کے افسران میں اللہ کی راہ میں اوسے تعاون و اطاعت کا جذبہ ہو۔ دین اور اہل دین کی اصلاح کا خیال رکھیں۔ پھر سب جگہ اور رعایا میں حلال پھیل جائے گا لیکن اگر ان باتوں کی کمی ہو تو معاملہ برعکس ہوگا۔ حلال کم اور غائب ہو جائے گا، حرام غالب ہو جائیگا، اور پھیل جائے گا۔ اور اس وقت اللہ تعالیٰ جس مسلمان پر خاص رحمت فرمائے گا اسے عصمت و حفاظت کے مفہوم سے

جس طریقہ سے چاہے گا حلال عطا کرے گا۔

حدیث میں ہے:

"جب لوگوں کے ذہن میں بگاڑ ہوگا تو ان کی روزیوں میں بگاڑ ہو جائے گا۔"

فرمانِ الٰہی ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ (اور اسی طرح ہم ساتھ ملا دیں گے گناہگاروں کو ایک دوسرے کا بدلہ ان کی کمائی کا)

اس کی تشریح میں بعض مفسرین کا قول ہے کہ

"جب لوگوں کے اعمال بگڑ جائیں گے تو ان پر ایسے حکام مسلط کر دیے جائیں گے جو ان کے اعمال کے مطابق (بُرے) ہوں گے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے:

"مومن کی روزی دانوں کے قطرات کی طرح ہے۔"

یہ فرمان دو معنوں کا جامع ہے:

۱۔ "تنگی اور کمی

۲۔ صفائی۔"

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی مفہوم پر فرمایا:

"اگر ساری دُنیا خالص خُون بن جائے تو مومن کی اس میں سے پھر بھی حلال ہی خوراک ہوگی" اس کے دو مطلب ہیں۔

۱۔ مومن کو توفیقِ حلال حاصل ہے اور وہ حرام سے بچتا ہے۔ اس نے علم کے مطابق اللہ کی خاطر عمل کیا۔ اللہ نے اس کی حفاظت ان راہوں سے کی کہ اسے خبر بھی نہیں یعنی اس کے عمل کی برکت کے باعث حرام میں سے اس کے لیے حلال نکال کر الگ کر دیا۔ جیسے کہ اپنی لطفِ قدرت کے باعث وہ جہالت کے دَور میں اسے علم عطا کرتا ہے اور شرک کے شور و شغب میں اسے توحید عطا کرتا ہے۔ جس نے اس سے نصیحت و بصیرت حاصل کی وہ اس کی حکمت کے صدقہ مقامِ توحید میں ہے۔

۲۔ ان کے نزدیک مومن صرف فاقہ یا ضرورت کے موقع پر ہی کھاتا ہے۔ اب یہ کھانا اگرچہ دوسروں پر حرام تھا مگر اضطرار کے باعث اس پر حلال ہو گیا۔ اور یہی درست مفہوم ہے۔ حضرت ابن مبارکؒ سے کسی نے کہا کہ دو صدیوں کے بعد عدل نظر آئے گا۔

فرمایا: ہم نے حماد بن سلمہؒ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو وہ ناراض ہوئے اور فرمایا: "اگر دو صدیوں کے بعد

تو مر سکے تو مر جا۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں بدکار حکام، ظالم وزراء، خائن امانتیں رکھنے والے اور فاسق قاری پیدا ہو جائیں گے۔ باہم ایک دوسرے کو بُرا کہیں گے اور اللہ کے ہاں ان کا نام نجاسات ہے۔ بعض سلفؒ سے مروی ہے:

"میں دو صدیوں کے بعد اللہ تعالیٰ سے حلال روزی مانگنے سے حیا کرتا ہوں۔ البتہ میں یہ دُعا کرتا ہوں کہ ایسی روزی عطا کر جس پر تُو مجھے عذاب نہ دے۔"

ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"بنو فلاں نے ہمارے لیے کچھ حلال نہیں چھوڑا یعنی بادشاہوں اور حکام نے ایسا کیا ہے۔" اور بتلاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت اور مکانات لٹنے کے بعد صرف وہی چیز کھائی جس پر مہر تھی (یعنی حلال تھی اور اس میں لوٹ کا اختلاط نہ تھا)

ایک طویل روایت ہے جسے میں اختصار سے بیان کرتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صدقات جمع کرنے پر ایک عامل کو مقرر کیا۔ بتاتا ہے کہ ایک مہر زدہ برتن لایا گیا۔ میں نے سمجھا اس میں کوئی جوہر یا سونے کا ٹکڑا ہے۔ انہوں نے اس کی مہر توڑی تو اس میں جَو کے ستو تھے۔ وہ میرے سامنے بکھیر دیے اور فرمایا:

"ہمارے کھانے میں سے کھاؤ۔"

میں نے کہا: "اے امیر المومنین ایسی چیز پر بھی آپ مہر لگاتے ہیں!"

فرمایا: "میں نے یہ چیز اپنے لیے منتخب کر لی تھی اور مجھے خطرہ تھا کہ اس میں دوسرے کے مال کا اختلاط نہ ہو جائے۔"

مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکانات لٹ جانے کی وجہ سے اہل مدینہ کے اموال میں اختلاط سا ہو گیا۔ اس لیے صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ حضرت ابن عمر، سعد اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم انہی میں سے ہیں۔

حضرت یوسف اور وکیع بن جراح فرماتے ہیں:

"ہمارے نزدیک دنیا تین درجات پر ہے:

۱۔ حلال۔

۲۔ حرام۔

۳۔ شبہات۔"

اس کا حلال، حساب ہے۔ اس کا حرام، سزا ہے۔ اور اس کا مشتبہ، عتاب ہے۔ اس لیے دنیا اسی قدر لو جس کے بغیر چارہ کار نہ ہو۔ اگر یہ حلال ہو تو تم زاہد ہو۔ اگر یہ مشتبہ ہو تو تم پرہیزگار اور ہلکے عتاب میں ہو۔

انہی دونوں سے منقول ہے۔ فرمایا: "اگر ہمارے زمانہ میں کوئی آدمی زاہد بن جاتے اور ابوذر اور ابوالدرداء

رضی اللہ عنہا کی طرح زہد اختیار کرے۔ پھر بھی ہم اسے زاہد نہیں کہیں گے۔

پُوچھا گیا: "وہ کیوں؟"

فرمایا: "اس لیے کہ زہد تو حلال محض میں ہوتا ہے اور آج حلالِ محض کوئی سمجھتا ہی نہیں"۔ حضرت یُوسف اور حضرت وکیعؒ کا دو صدیوں سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔

حضرت وکیع بن جراح، علمائے سلف کے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مشابہت رکھتے۔ کمانے میں خوب سختی و تحقیق سے کام لیتے۔ ان سے حلال کے بارے میں پُوچھا گیا۔ انھوں نے جھڑک دیا اور فرمایا:

"حلال کہاں ہے اور مجھے حلال کیسے مل سکتا ہے؟"

پھر فرمایا: "اگر کوئی ہمارے علم سے رہنمائی چاہتے ہُوئے حلال کے بارے میں پُوچھے تو ہم اسے یہ کہیں گے: بیچ بُری کماؤ، اپنا کپڑا اتار دو اور دریائے فرات میں گھس جاؤ۔"

کہا گیا: "اے ابُو سفیان" آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟"

فرمایا: "میں اللہ کے رزق سے کھاتا ہوں اور اس کے عفو کا امیدوار ہوں۔"

متقدمین میں سے حضرت بشر بن حارثؒ سے حلال کے بارے میں کسی نے پُوچھا:

"اے ابُو نصر! آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟"

فرمایا: "جہاں سے تم کھاتے ہو مگر جو کھاتا بھی ہے اور روتا بھی ہے وہ اس جیسا نہیں جو کھاتا ہے اور ہنستا ہے"!

ایک روایت کے مطابق ایک بار فرمایا:

"مگر چھوٹے سے چھوٹا ہاتھ اور چھوٹے سے چھوٹا لقمہ۔"

ایک آدمی نے نشہ نہ لانے والے نبیذ کے بارے میں پُوچھا: اس درہم کی طرف نظر کر جس سے تُو نے کھجور خریدی کہ یہ کہاں سے ہے؟ اگر حلال کا ہے تو ٹھیک ورنہ تو برباد ہُوا۔ جو نشہ نہ لائے اسے بھی دُور کر دو۔"

حضرت سرّی سقطیؒ حلال کھانے کے بارے میں خُوب پڑتال کرتے اور جس کو ٹھیک سمجھتے ہوتے وہی کھاتے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے ان کا ذکر ہُوا تو انھوں نے ان کی تعریف کی اور فرمایا: "تمہاری مراد وُہ نوجوان ہے جو طیّب الغذاء کے نام سے مشہور ہے؟"

فرمایا کرتے: "ترکِ شبہات پر وہی قدرت رکھتا ہے جو ترکِ شہوات پر قدرت رکھے"۔ اور بتاتے ہیں کہ حضرت بشرؒ بن حارث جو قبول کرتے وُہ کھا لیتے۔ بتاتے ہیں کہ حضرت بشرؒ اپنے حلقے کے لوگوں میں کلام کر رہے تھے کہ حضرت سرّی سقطیؒ وہاں گئے اور اچانک کہا:

"اے بشرؒ! دو دانق کا جُوتا پہن لو تو اس نام سے آرام حاصل کر لینی بشر حافی (برہنہ پا) کے نام سے۔"

حضرت بشرؒ خاموش رہے، وہاں حضرت سریؒ کے اصحاب میں سے کچھ موجود تھے۔ انہوں نے حضرت بشرؒ کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے ابوالنصر، حضرت سریؒ کا مقصود بھلائی ہی کا تھا۔ (یعنی اعتراض مقصود نہ تھا)

انہوں نے فرمایا "سبحان اللہ، سری تو سری ہی ہیں جیسے کہ ان کا نام ہے۔" (یعنی بدظنی کی تردید کردی)

حضرت سری سقطیؒ نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے پاس کچھ مال بھیجا۔ اُنھوں نے واپس کر دیا تو حضرت سریؒ ان کے پاس گئے اور واپس کرنے کی آفات کے بارے میں کچھ علمی باتیں پیش کیں۔ پھر اس کے بعد وُہ ان کا مال واپس نہ کرتے۔

حضرت سریؒ کے بارے میں ہے۔ بتایا کہ میں حالتِ سفر میں ایک روز ایک تالاب کے کنارے پر پہنچا۔ کنارے پر اُگا ہُوا گھاس کھایا اور تالاب کا پانی پیا۔ اور اس سے کر سیدھی کی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آج میں نے حلال کھایا اس پر ایک غیبی آواز آئی:

"اے سریؒ! تجھے گمان ہے کہ تُو نے حلال کھایا؛ جس قوت نے تجھے یہاں پہنچایا، یہ کہاں سے آئی؟"

بتاتے ہیں کہ میں نے دل میں آنے والے اس خیال کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور استغفار کیا۔

حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے،

"آجکل کمائی خراب ہو چکی ہے۔ تمام تجارتیں اور صنعتیں مشتبہ ہیں۔ اس لیے ان کی کثرت و ذخیرہ اندوزی جائز نہیں کیونکہ دھوکہ اور عدمِ نصیحت موجود ہے۔" اور فرمایا: "مسلمانوں کو چاہیے کہ بس ضرورت کے مطابق ہی اس میں پڑیں۔"

فرمایا: "لوگ تو انبیاء علیہم السلام کے قاتلوں کی طرح ہیں۔ اس لیے کہ وہ سُنن انبیاء کو ختم کرنے اور انبیاءؑ کے طریقے مٹانے پر تعاون کرتے ہیں۔ جس نے نبی کی سنت کو مٹایا اس نے گویا اسے قتل کیا۔"

یہ بات ۵۰۵ھ میں کہی جا رہی ہے اس لیے اے مسلم، توحیدِ الٰہی پر یقین رکھنے والے، سلف صالحین کی وعیدیں اس قدر شدید تھیں اور آج تو معاملہ اس سے بھی بدتر ہے۔ آج تو دنیا میں زہد کرنا فرض ہے۔ تجھ پر واجب ہے کہ دنیا میں سے اس قدر لے جس کے بغیر چارہ کار نہیں اور اگر ایسی اشیاء کی کثرت یا ذخیرہ اندوزی کی تو یہ معصیت میں داخل ہے۔ اگر تجھے ذرا بھی عقل ہو تو یاد رکھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر آفت تجھے دنیا میں زہد کرنے اور جو چیز بھی تیرے قبضہ میں ہے اسے خرچ کر دینے کا حکم دیتی ہے۔ یہی بات اگرچہ تجھے بُری لگے مگر بہتر راہ یہی ہے۔

حدیث میں ہے:

"ابن آدمؑ نے پیٹ سے زیادہ بُرا برتن نہیں بھرا، چاہے حلال سے ہو اور اگر ضروری ہو تو ایک تہائی کھانا، ایک تہائی پینا اور ایک تہائی سانس لینا۔" چنانچہ ایک تہائی کھانا پیٹ بھرنے سے بہتر ہے اور برائی جس قدر کم ہو،

وہی بہتر ہے۔"

ایک روایت میں ہے :

" اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض ، بھرا ہُوا پیٹ ہے چاہے حلال سے ہو۔"

ایک روایت میں ہے :

" اللہ تعالیٰ اس بندے کو عذاب نہیں دے گا جس کی دنیا میں روزی بقدر کفایت کے ہو۔"

فرمانِ الٰہی ہے :

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۔ (اور تیرے رب کی روزی بہتر اور باقی رہنے والی ہے)

ایک قول کے مطابق اس سے مراد ایک ایک دن کی روزی ہے اور ایک قول میں قناعت مراد ہے۔

عدل کے وقتوں میں افضل ہونے کے باوجود۔۔۔۔ مسلمانوں کا طریقہ تھا کہ وُہ شبہات سے بُہت پرہیز کرتے۔

بتاتے ہیں کہ حضرت فضیل بن عیاض ، ابن عیینہ اور ابن مبارک رضی اللہ عنہم مکہ میں حضرت وہیب بن وردؒ کے ہاں جمع ہوئے اور تازہ کھجور کا ذکر آیا۔ حضرت وھیبؒ نے فرمایا :

" مجھے رطب (تر کھجور) سب سے زیادہ پسند ہے مگر میں اسے نہیں کھاتا۔"

پُوچھا گیا : " کیوں ؟"

فرمایا : " اس لیے کہ مکہ کی تر کھجوریں ان باغات سے آمیز ہو چکی ہیں جن کو انہوں نے خرید رکھا ہے" یعنی زبیدہ اور ان جیسوں نے۔

حضرت ابن مبارکؒ نے فرمایا :

" اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اگر ان باتوں کو دیکھو گے تو روٹی کھانا بھی تنگ ہو جائے گی۔"

انہوں نے پُوچھا : " اس کی وجہ کیا ہے ؟"

فرمایا : " مصر کے اصولِ زراعت جانتے ہو کیا ہیں ؟" ان میں بھی اختلاط آ چکا ہے۔

بتاتے ہیں کہ حضرت وھیبؒ پر غش آ گیا۔ حضرت سفیانؒ نے فرمایا :

" آپ کا کیا ارادہ تھا ؟ آپ نے ایک آدمی مار دیا۔"

حضرت ابن مبارکؒ نے کہا : " واللہ ، میرا ارادہ ان پر آسانی کرنے کا تھا۔"

بتاتے ہیں کہ جب حضرت وھیبؒ کو افاقہ ہُوا تو فرمایا :

" میں اللہ کے لیے عہد کرتا ہُوں کہ کبھی بھی روٹی نہیں کھاؤں گا۔" چنانچہ پھر وُہ دُودھ پیتے۔ ایک بار ان کی والدہ دُودھ لے کر ان کے پاس آئیں تو انہوں نے پُوچھا : " یہ کہاں سے آیا ؟"

کہا: " بنی فلاں کی بکری کا ہے۔"

فرمایا: " انہیں اس کی قیمت کہاں سے ملی؟"

انہوں نے بتایا کہ ایسے ایسے معاملہ ہے۔

جب پیالہ منہ کے قریب کیا تو فرمایا:

" ایک بات باقی ہے۔ یہ بکری کہاں چرتی ہے؟" وہ خاموش رہیں۔

فرمایا: "ضرور بتاؤ۔"

آخر معلوم ہُوا کہ وُہ بکری مکّہ کے حاکم ابن عبدالصمد ہاشمی کی بکریوں کے ہمراہ چرتی تھی۔ فرمایا: " یہ مسلمانوں کا دودھ ہے اس میں ان کا حق موجود ہے۔ اس لیے مجھ پر حلال نہیں کہ میں ان کا حق پی جاؤں۔" حالانکہ اس میں ان کا بھی حصّہ ہے۔

ان کی والدہ نے کہا: " اسے پی لو، اللہ تمہیں بخش دے گا۔"

فرمایا: " میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں یہ دُودھ پیوں اور اس پر اللہ مجھے بخش دے۔"

والدہ نے پُوچھا: " وہ کیوں؟"

فرمایا: " میں معصیت کے بدلہ میں اللہ کی مغفرت پسند نہیں کرتا۔"

حضرت طاؤس یمانی کا کچھ سرمایہ تھا اور ان سے کھجوروں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ان کی تجارت مضاربت کے طریقہ پر تھی۔ ان کے مضارب نے ان کے سرمایہ سے ایک بادشاہ کے کارندے سے چمڑا خریدا اور انہیں اس کی اطلاع دی۔ حضرت طاؤسؒ نے اسے لکھا: تم نے ہمارا مال خراب کر دیا۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس میں سے کچھ چیز کو بھی دُوسرے مال کے ساتھ ملاؤں۔ اس لیے چمڑے کو یمن میں فروخت کر کے اس کی قیمت خیرات کر دو اور اس میں سے ایک درہم بھی حرم کی طرف نہ بھیجنا۔ اور فقراء کو کھلانے کی وجہ سے میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہُوں اور امید وار ہُوں کہ برابر برابر چھُوٹ جاؤں۔ نہ اجر ملے اور نہ سزا ملے۔

بتاتے ہیں ان کے فقر کی یہی وجہ تھی اور اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ مال نہ تھا۔ چنانچہ اب ان کے پاس دنیا کا کچھ مال باقی نہ رہا۔

حضرت ابن زبیرؓ کے بعد جب خالد قشیری مکّہ کا حاکم مقرر ہُوا تو اس نے منیٰ سے مکہ کی طرف آنے والے راستہ میں نہر کھودی۔ حضرت طاؤس اور وھب بن منبہ رضی اللہ عنہما جب اس کے قریب پہنچتے تو اپنے چوپاؤں کو اس نہر سے پانی نہ پینے دیتے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: " ایک آدمی نے کسی بستی میں بھوک کی حالت میں رات گزاری، اور

اس حال میں صبح کی کہ وُہ بھوک کی وجہ سے مسجد میں بھی نہیں جا سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی میں رات بھر سب نماز پڑھنے والوں کے برابر اسے اجر دیا۔

پُوچھا گیا، "وُہ کیسے؟"

فرمایا، "اس نے حلال تلاش کیا مگر نہ پایا اور اس نے حرام کو پیٹ میں ڈالنا پسند نہ کیا۔ آخر کار بھُوکا رہا۔ اب اسے اس رات بھر نماز پڑھنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور یہ سلیمان تیمی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہوں نے گندم کھانی چھوڑ دی۔ کسی نے اس کی وجہ پُوچھی تو فرمایا:

"یہ ان پن چکیوں سے پیسی جاتی ہے۔" اور فرمایا:

"تمام مسلمان پانی میں شریک ہیں اور تمام لوگوں سے ہٹ کر یہ اس کا خراج لیتے ہیں۔"

ایک عورت نے حضرت بشر بن حارثؒ کی خدمت میں انگوروں کی ایک ٹوکری بھیجی اور کہا: "یہ میرے والد کے باغیچے کے انگور ہیں۔"

حضرت بشرؒ نے یہ ٹوکری واپس کر دی۔

اس عورت نے کہا، "سبحان اللہ! کیا آپ میرے والد کے انگوروں میں بھی شبہ کرتے ہیں اور اس کی ملکیت کی صحت اور میری وراثت میں آپ کو شبہ ہے حالانکہ خریداری کے کاغذات پر آپ کی گواہی موجود ہے۔"

فرمایا، "تُو نے سچ کہا تیرے باپ کی ملکیت ضرور ہے مگر تُو نے انگوروں کو خراب کر دیا۔"

عورت نے پُوچھا: "وُہ کیسے؟"

فرمایا: "تُو نے نہرِ طاہر سے اس باغ کو سیراب کیا۔" یعنی طاہر بن حسین بن مصعب بن عبداللہ بن طاہر کی نہر سے جو مامون کا مصاحب تھا۔ یہ نہر مغربی سمت میں چوڑی سی خندق کی طرح ہے۔ وُہ خندق سے پانی نہ پیتے اور نہ ہی اس پل پر چلتے۔

حضرت بشرؒ فرماتے، "تیس سال سے بھنے ہُوئے کی خواہش ہے اور میں نے زہد کرتے ہُوئے اسے نہیں چھوڑا بلکہ میرے پاس اس کے لیے صحیح حلال زائد درہم نہیں کہ اسے کھا سکوں۔"

حرفِ آخر

متقدمین اور اسلاف کی یہی سیرت ہے۔ جو اس پر چلا وُہ ان سے جا ملا اور ان میں سے ایک کی طرح ہُوا اور جس نے ان کے برعکس کیا وہ اسلاف کی سنت پر نہیں اور نہ ہی صالحین میں سے ہے۔ قولِ الٰہی کے باعث اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے۔ اس لیے بصیرت والو، ہوش میں آجاؤ۔

اہلِ ورع متقدمین کی ایک سیرت یہ ہے کہ وُہ اپنا مکمل حق نہ لیتے بلکہ سارا حق لیتے ہُوئے شبہ میں پڑ جانے سے ڈرتے۔ کہا کرتے ہیں: "جس نے حلال کا مل احاطہ کیا وُہ حرام کے گرد گھُوما۔" چنانچہ وہ اپنے اور حرام کے درمیان

کچھ حق چھوڑ کر ایک آڑ لگاتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جو چراگاہ کے گرد چرتا ہے خطرہ ہے کہ وہ اس میں پڑ جائے۔" اور بعض کا طریقہ یہ ہے کہ اس نیت کے علاوہ ایک دوسری وجہ سے اپنا کچھ حق چھوڑ دیتے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ۔ (اللہ تعالیٰ انصاف کرنے اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے)

عدل سے مراد یہ ہے کہ تو اپنا سارا حق لے اور مکمل حق ادا کرے اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ تو حق کا کچھ حصہ چھوڑ دے۔ اور جو تجھ پر حق ہے اس سے زیادہ دے تاکہ احسان کرنے والا بن جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی احسان کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا:

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (پرہیزگاروں پر حق ہے)

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ۔ (احسان کرنے والوں پر حق ہے)

افسوس آج یہ طریق غفلت کا شکار ہو چکا۔ جس نے اس پر عمل کیا اس نے اسے زندہ کیا۔
بعض سلفؒ نے بتایا کہ میں ایک متقی آدمی کے پاس آیا میں اس کا پچاس درہم کا مقروض تھا۔ انہوں نے ہاتھ کھولا اور میں نے دراہم گن گن کر ان کے ہاتھ میں رکھنے شروع کیے۔ جب انچاس درہم رکھ چکا تو انہوں نے مٹھی بند کر لی۔
میں نے کہا "یہ درہم ابھی آپ کے حق میں سے باقی ہے۔"
فرمایا "میں نے اسے تیرے لیے چھوڑ دیا۔ میں پسند نہیں کرتا کہ سارا حق لے لوں اور اس میں جا پڑوں جس کا حقدار نہیں ہوں۔"
حضرت عبداللہ بن مبارکؒ وغیرہؒ فرمایا کرتے:
"جس نے ننانوے اشیاء میں پرہیزگاری کی اور ایک چیز میں پرہیزگاری سے کام نہ لیا وہ متقی نہیں۔ جس نے ننانوے گناہوں سے توبہ کی اور ایک گناہ سے توبہ نہیں کی وہ توبہ کرنے والوں سے نہیں اور جس نے ننانوے اشیاء میں زہد اختیار کیا اور ایک چیز میں زہد اختیار نہیں کیا، وہ زاہدین میں سے نہیں۔"
حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہا نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا "آدمی اسی وقت ہی متقی ہوتا ہے کہ جب وہ بے حرج چیزوں کو بھی حرج والی اشیاء کے خطرہ کے باعث چھوڑ دے۔"
حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے:
"تقویٰ یہ ہے کہ بندہ ایک ذرہ ... میں بھی اللہ سے ڈرے، حتیٰ کہ بعض ان چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن کو حلال سمجھتا ہے اس ڈر سے کہ یہ حرام ہو۔ چنانچہ اس کو اپنے اور حرام کے درمیان حجاب کرلے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مفہوم کی ایک روایت آتی ہے:

"ہم حرام کے ایک دروازے کے ڈر سے حلال کے ستّر دروازے چھوڑ دیا کرتے ہیں۔"

افسوس، آج یہ طریق مٹ چکا۔ جو اس راہ پر چلا وہ اس کو زندہ کرنے والا ہے۔

یہ یاد رکھیے کہ آجکل تاجروں، صنعت کاروں اور عام کاروبار کرنے والوں کے اموال، جائز اسباب، مباح کاروبار اور کتاب و سنّت کی موافقت کے باوجود مشتبہ ہو چکے ہیں اور ان کی دو اقسام ہیں:

۱۔ جب تو اہلِ تقویٰ سے معاملہ کرے اور اہلِ ورع سے حاصل کرے تو یہ شبۂ حلال کا مال ہے۔

۲۔ اور جب تقویٰ و پرہیزگاری میں کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ معاملہ کر کے مال حاصل کرے تو یہ شبۂ حرام کا مال ہے اور ان کے علاوہ لشکریوں کا مال، احکام شرع کی خلاف ورزی اور فاسد اسباب کی وجہ سے حرام ہے اگر تجھے ان اموال کے بارے میں لوٹ کھسوٹ کا یا کسی ظلم یا جرم کا مال ہونے کا علم نہ ہو تو یہ ذرا آسان بات ہو جائے گی اور اگر تجھے علم ہو گیا کہ یہ مال غلط راہوں سے آیا ہے تو یہ نصِ حرام ہے اس لیے اللہ سے ڈرو اور اپنے آپ کو اس مال سے بچاؤ۔

اے انسان، اپنی آخرت پر نظر کر اور دین کی حفاظت کر، اس لیے کہ تیری کمائی بھی تیرے دین کا حصّہ ہے۔ تیرا کھانا بھی تیرے ایمان کا حصّہ ہے۔ اگر تُو نے ان کاموں میں تغافل سے کام لیا تو دین میں غفلت برتی۔ احکامِ شرع سے لاپرواہی کی اور آج اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔ کل کے لیے آگے پیچھے پر نظر نہ کی اور ہم بری قضا سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب شیطان انسان کو غلط کھانا کھلا دیتا ہے تو پھر وُہ انسانی اعمال کے بارے میں کچھ پرواہ نہیں کرتا اور کہتا ہے، میں نے اپنا کام کر لیا۔ اب جو چاہو، کرو۔ اور اب اس کے اعمال سے اسے ظلمت، قساوت، کم عزمی، تساہل، معصیت اور توفیق و عصمت سے دوری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اور اگر یہ آدمی بازار میں کاروبار کرتا ہے اور علمِ شرع کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کاروبار کر رہا ہے اسے پرواہ نہیں کہ کہاں سے آیا اور کس سبب سے ملا۔ کاروبار کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے احکام کا لحاظ نہیں کرتا، پرہیزگاری سے دُور ہے۔ ایسا آدمی باطل طریقہ سے مال کمانے والا ہے، اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہے، اپنا دین برباد کر رہا ہے۔ اہلِ اسلام کو دھوکہ دے رہا ہے اور اللہ تعالیٰ فسادیوں کے اعمال کو درست نہیں کیا کرتا، جیسے کہ اصلاح کرنے والوں کے اعمال ضائع نہیں کرتا اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وُہ اللہ تعالیٰ کی خاطر نصیحت نہیں کرتا مخلوق کے ساتھ غیر ناصحانہ برتاؤ رکھتا ہے تو وہ ظالم ہے اور خواہشِ نفس کا شکار ہے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اسے تمام امور میں توبہ کرنی چاہیئے اس پر ہر حالت میں اللہ کی طرف انابت لازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اچانک موت

آن دبوچے اور اسے ظالم اور خواہش پرست حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَ مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (اور جو توبہ نہ کرے سو یہی لوگ وہی ہیں ظالم)

اور فرمایا:

وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔ (اور ظالم لوگ عنقریب جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ پلٹتے ہیں)

ایک حکیم کا قول ہے کہ دنیا ایک بحرِ متلاطم ہے اور تاجر اس میں غوطہ زن ہیں۔ ایک آدمی غوطہ لگا کر موتی نکال رہا ہے۔ یہ لوگ ابنائے آخرت میں سے ہیں۔ اور آخرت کے لیے عمل کرتے ہیں۔ دوسرا آدمی غوطہ لگا کر اینٹ نکالتا ہے، یہ دنیادار لوگ ہیں، ان پر دنیا کا لالچ ہی سوار ہے۔ ایک آدمی مچھلی نکال رہا ہے، یہ مقتصدین (درمیانے) لوگ ہیں۔ اور ایک دوسرا آدمی سمندر کی گہرائی میں جا کر ڈوب گیا، یہ لوگ عبادتِ الٰہی سے مردود ہو کر بازاروں میں نکل گئے۔ جب بھی عبادت کا رُخ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو گاہک زیادہ آجاتے ہیں اور بازاروں میں جا کر انہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ گناہوں کے سمندر میں غرق ہیں۔ ایک گروہ ایسا ہے کہ جب ایک لہرا نہیں اُوپر اٹھاتی ہے تو انہیں نجات کی خواہش ہوتی ہے۔ پھر دُوسری لہر ان پر پڑتی ہے تو بربادی سے ڈرنے لگتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں استقامت کے متلاشی لوگوں کا یہ حال ہے انہیں توبہ اٹھا کر نجات کی طرف لاتی ہے اور عادت انہیں بربادی کی گہرائیوں میں گراتی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جائداد نہ بناؤ ورنہ تم دنیا کے راغب بن جاؤ گے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی علیہ السّلام کی طرف وحی کی اور فرمایا:

"سزاؤں کے دَور میں اہل اور مال حاصل نہ کرو۔"

ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ العلی العظیم، وصلی اللہ علی سیدنا محمد و علی آلہ وصحبہ وسلم، والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

ختم شد

اعلیٰ اور معیاری کتابیں

خطبات وادعیات

نہج البلاغہ : حضرت علیؑ کے خطبات وخطوط کا نادر نسخہ، ترتیب عبدالرزاق ملیح آبادی
رئیس احمد جعفری، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل ۱۵۰/- روپے

صحیفۂ کاملہ : بیاد کربلا کی ادعیہ کے علاوہ حضرت امام زین العابدین کی ادعیات کا
مکمل مجموعہ، ترجمہ نسیم امروہوی ۸۰/- روپے

صحیفۂ علویہ : حضرت علی ابن ابی طالب کی نایاب اور نادر دعاؤں کا مجموعہ ،
ترجمہ وحواشی : سید مرتضیٰ حسین فاضل ۵۰/- روپے

اسلامیات

احکام القرآن : چودھری نذر محمد ۱۸۰/- روپے

اسلام کا طول وعرض : غلام ربانی عزیز ۴۰/- روپے

اسلامی معلومات : زاہد حسین انجم ۴۵/- روپے

قوت القلوب : تالیف شیخ ابوطالب محمد بن عطیہ ، ترجمہ محمد منظور الوجیدی ،
صفحات ۲۰۰۰ ، دو جلدوں میں قیمت ۴۰۰/- روپے

مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا روم ۱۷ حصص ، ترجمہ وشرح مولانا محمد نذیر عرشی
فی حصہ ۷۰ روپے ، مکمل چھ جلدوں میں رنگین جلد مکمل سیٹ ۹۰۰/- روپے

تہذیب احیائے علوم : ترجمہ نذیر حسین ۸۰/- روپے

عوارف المعارف : ترجمہ رشید احمد ارشد ۶۵/- روپے

من کی دنیا : ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۴۰/- روپے

رمز ایمان : ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۴۰/- روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز ، چوک انارکلی ، لاہور نمبر ۲